CamScanner

ممتاز شاعر، ادیب اور "ماہنامہ تخلیق" کے مدیر

اظہر جاوید

کی مطبوعات جن پر انہیں 2012 میں "پرائیڈ آف پرفارمنس" دیا گیا

جناب اظہر جاوید اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب، مشہور شاعر اور معروف صحافی ہیں۔ آپ جنوری 1938ء سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب ابھی آپ سترہ سال کے تھے۔ سرگودھا میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے دوران آپ نے بعض ہفت روزہ اخبارات (ضرب مجاہد اور رفیق) کی ادارت کی۔ آپ نے مشہور شاعر جناب الطاف مشہدی کی مدد سے ہفت روزہ "خلوص" کا آغاز کیا۔ اس کے بعد آپ نے روزنامہ "امروز" میں ادبی صفحے کے انچارج کے طور پر شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی آپ نے ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کام لکھنے شروع کر دیے۔ 43 سال تک مدیر کے طور پر ادبی جریدے "تخلیق" کی بے لوث ادارت کرتے رہے۔ بطور شاعر اور ادیب بڑی تعداد میں آپ کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کو ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی جانب سے متعدد بین الاقوامی انعامات ملے ہیں۔

CamScanner

مسلسل اشاعت کا 52 واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصۂ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 52 — دسمبر 2021ء — شمارہ : 12 — CPL نمبر 96

قیمت : -/350 روپے ——— 1,600 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر — ہندوستان کے لیے 2,000 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt, (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل: ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نصیر جہاں (امریکہ) — ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 / فروری 2012ء کو اپنی جان — جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "عصری"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاءاللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

52 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کے امور کی ذمہ داری محترمہ منیر جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف -/2,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.	U.S.A.	INDIA	PAKISTAN
[illegible]	[illegible]	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
2794 South Barrington	[illegible]	[illegible]	[illegible]
AVE Los Angles	[illegible]	Delhi-110001, India	[illegible] Road, Lahore
C.A. USA	[illegible]	Ph: [illegible]	Ph: [illegible]
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Email: [illegible]	Cell: [illegible]
Email: [illegible]	Email: [illegible]		Email: [illegible]
[illegible]			

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات — اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — عزیز جبران — 7
نعت رسول مقبولؐ — سید ریاض حسین زیدی — |
نعت رسول مقبولؐ — بشریٰ رحمٰن — 7

تخلیق ایوارڈ 2021

تعارف و مدحت آغا گل — محمد حفیظ — 8

گوشۂ آغا گل

سرو بہاراں، رزم گاہوں سے ہم کلام — سرفراز سید — 11
عشق دا — غلام حسین ساجد — 16
آغا گل، ایک امتیازی تحریر — ڈاکٹر ایوب ندیم — 19
ایک آفاقی تخلیق کار ۔۔۔ آغا گل — آفتاب خان — 21

مضامین

تہذیب کیا ہے؟ — ڈاکٹر مبارک علی — 23
افسانے کی آخری کہانی، مسیح آ بجا — غلام حسین ساجد — 25
کلیات اقبال حسین — پروفیسر قیصر نجفی — 28
اوش، جہانِ فکر و دانش — مسلم شمیم — 32
فوزیہ مشتاق کی شعری کائنات — ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم — 38
ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کی آزاد غزل — خاور اعجاز — 43
جمالیات، شعر و ادب اور فنون لطیفہ — شجاعت علی راہی — 48
محمد حامد سراج: محبت میں فراق ۔۔۔ — ڈاکٹر جمیل حیات — 50
عکسِ فکر — سلطان احمد علوی — 55
بخشش ایکسپریس — انور ندیم علوی — 58

منظومات

کرامت بخاری، پروین شیر، طلعت سمیع، فوزیہ مشتاق — 61
ممتاز راشد، ادا اوری، آصف عمران، اظہر جاوید — 62

افسانے

کمک — شفیق ویدا — 63
چھوٹے شکنجوں کا موسم — طاہرہ اصغر — 66
زینت بوا ۔۔۔! — تحمل احمد خان — 68
اتائی — محمد اسلم — 71
دنیا جائے بھاڑ میں — رشی خان (کراچی) — 77
کچھ تو کہیں گے ۔۔۔؟ — ناصر حسن علی (جاپان) — 79
شارٹ کٹ — کاوش صدیقی — 81

غزلیں

آصف ثاقب، انور شعور، صابر ظفر، خالد اقبال یاسر، قمر رضا شہزاد، خاور اعجاز، ڈاکٹر ایوب ندیم، ربیع الدین زکی قریشی، رشید آفرین، سلطان ثمار، شہزاد نیر، ڈاکٹر فرحت عباس، عائشہ مسعود، آفتاب خان، اعظم سحاب ہاشمی، ماجد یزدانی، احمد صفی، ڈاکٹر اسحاق احمد وردگ، عاصم بخاری، انصور اقبال، اظہر جاوید، عامر منظور — 87–93

سفرنامہ

ہوزان کی ایک شام — تسنیم کوثر — 94

سرائیکی گوشۂ خاص

ناول "سوکھ" — بشریٰ رحمٰن — 110

یادیں

قرطاس و یکسوئی	اسلم کمال	104
پرانے شہر کے لوگ	سارہ ہاشمی	105

یادِ رفتگاں

احمد عقیل روبی کی یاد میں	ڈاکٹر غافر شہزاد	107
ہمہ جہت فنکار عمر شریف	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	110

طنز و مزاح

کرسیِ صدارت	ڈاکٹر عبدالرحیم	113
گنج نامہ	ڈاکٹر عبدالرحیم	
قطعہ بند	ڈاکٹر عبدالرحیم	113
دلبری	ڈاکٹر محسن مگھیانہ	114
چھلکوں کا سردار	علی رضا احمد	117

جائزے

جھوٹ کے گھر انجن	نصرت نسیم	120
"تخلیق" ستمبر 2021ء	اشرف ذکی اعوان	123
ماہنامہ "تخلیق" ایک تاریخ ساز جریدہ	عبداللہ نعیم	129
"اقبال کی غزل" ایک اہم کتاب	محمد نوید مرزا	133

پنجابی رنگ

صوفیانہ کلام	بشریٰ رحمٰن	135
وارث شاہ دے نال	سرفراز سید	
معروف کا گیت / احمد ایاز کیانی	لطیف ساحر	
کافی	بشریٰ رحمٰن	136

تبصرے آفتاب خان کے

مٹی میں مرگ	ڈاکٹر غافر شہزاد	137
کتابیں اور یادیں	غلام حسین ساجد	
لیاقت تب	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	
لفظوں کا لمحاں	عذرا اصغر	
نظم کے ساحل پر	اکمل شاکر	
تم جو چاہو کر سکتے ہو	عاصم بخاری	145

انجمنِ خیال

سلطان سکون، کرامت بخاری، آصف ثاقب، عذرا اصغر، 146
سید ریاض حسین زیدی، شبیر ... ، اشرف ذکی اعوان، آصف عمران،
محمد اسلم ... ، ڈاکٹر عبدالرحیم، فیصل شہزاد، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، تصور اقبال،
پروفیسر کاشف ... ، ... محمد طارق علی، ڈاکٹر ... 159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

علی اور تیر علی	160

سرورق

ادارہ "تخلیق"

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: حسین مجروح

مطبع: ... پرنٹرز گلشن راوی لاہور

مقام اشاعت

H. No. E/12, Shenaz Villas, Phase-4,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(ادارہ کے حقوق محفوظ)

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

پہلی بات

میں اپنے سابقہ اداریوں میں بار بار ادب کے سکے داروں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، ان تک اپنی بے اختیار آواز پہنچانے کی جرأت کرتا رہا ہوں، ان کو ادبی مسائل سے آگاہ رکھنے کی سعی کرتا رہا ہوں جب تک ادب سے سیاست کو دور نہ کیا جائے گا اس معاشرے، قوم کی پہچان اور شناخت ختم ہوتی جائے گی؟ ادب میں جو ہوتا ہے اس کے لیے تو میں اور آپ جواب دہ ہیں مگر کچھ سیاست والوں کا کیا دھرا ابھی ہمیں بھگتنا ہوگا۔ ادیبوں نے ادب کو بے توقیر کیا؟ سیاست والوں نے ملک کو بے توقیر کیا؟ اداروں کی حرمت لیر لیر کردی۔ صرف ایک ادارہ فوج بچا ہے اللہ ان شرپسندوں سے اس ادارے کو محفوظ رکھے آمین!

''کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا'' جس ملک میں ایکٹر، جب ہوکر ہی گرگئی معاملات پر اپنی رائے دیں۔ فلمی اداکارائیں ٹی وی شو میں سیاست پر بحث کریں۔ کم پڑھی لکھی اداکارائیں اپنے شاعری کے مجموعے کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے کتابیں شائع کریں۔ نام نہاد خواتین، مرد اور اشتہاری مجرم تک ٹاک کا سہارا لے کر لوگوں سے داد وصول کریں۔ اساتذہ اور ڈاکٹرز ماڈلنگ شروع کردیں تو ایسی نفسانفسی کے عالم میں تمام سنجیدہ لوگ چھپ جاتے ہیں اور اچھے دنوں کے انتظار میں وقت گزارتے ہیں۔ ان ہی بے ربط اور بے معنی کیڑوں کی وجہ سے کسی شعبے میں بھی معیاری کام نہیں ہو پاتا۔ اپنے پیشے سے مخلص اور سچے طالب علم گزرا ہوا کو بہت پیچھے دھکیل دیے جاتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب کو ان کا اصل حق کون دلوائے گا؟ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ادب مدلل اختلاف فکر و نظر کے نئے گوشوں کو سامنے لاتا ہے اور ادبی اختلاف بھی ذاتی اختلاف نہیں ہوتا۔ خوش قسمت وہ ادبائے کرام ہیں جو حقیقت اختلاف رائے کا احترام کرتے ہیں اور دوسروں کی بات بھی سنتے ہیں۔ میں نے ادبی دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر احباب کی حوصلہ شکن باتوں سے پریشان ہونا چھوڑ دیا مگر ان کے یادگار کارناموں کا تذکرہ صفحۂ قرطاس پر ہمیشہ تحریر کرتا رہوں گا۔ پچھلے دنوں تخلیق ایوارڈ حاصل کرنے والے بیشتر لکھاری کو جب تخلیق کے سلسلے میں کچھ قلمی تعاون کا کہا گیا تو وقت ان کے آڑے آ گیا جبکہ تخلیق ان کی ادبی خدمات کو بین الاقوامی طور پر جلوہ گر کرنے میں پیش پیش تھا۔ اسی طرح لدھیانہ سے ایک افسانہ نگار کو بھی اپنی کتاب پاکستان مجھے بھجوانا ضرور یاد تھا اور جب چوتھی اردو کانفرنس لاہور میں منعقد کرانے کا وقت آیا تو اس کی ذمہ داری کا بیڑا تخلیق کے سر پر ڈالنا بھی یاد تھا مگر بار بار ان کی پاکستان آمد پر میزبانی کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کرنا سب بھول گئے مگر جب اپنی کتاب میں لاہور کے میزبانوں کا ذکر کیا گیا تو سب فطرت ان کے قلم کی طاقت نے بیاد رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اسی طرح اپنے دوست جو دوسرے شہروں سے جب بھی لاہور کا رخ کرتے تو دفتر تخلیق کا ڈیرہ سالوں سال ان کی واحد پناہ گاہ ہوتی۔ غلطی سے کبھی ان کے شہر سے گزر ہو جائے تو ایسے لوگ پلٹ کر پوچھنا بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ شاید چند ٹیوں یا وقت کا ضیاع ان کی سادہ طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ ان تمام ذاتی تجربات نے مجھے اور میرے حوصلوں کو اور مضبوط بنا دیا۔ ایسے تمام دوستوں کو میرا دور سے سلام۔

''آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے''

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ تخلیق 53 سال سے ادبی محاذ پر تن تنہا اپنے وجود کی جنگ لڑ رہا ہے۔ نہ کسی سے مالی تعاون کی التجا کی نہ کوئی لالچ نہ کبھی اپنی ذات کے لیے تخلیق کا استعمال کیا اور نہ کوئی ذاتی تشہیر کا شوق۔ اب آتے ہیں اصل موضوع کی طرف ہر سال کی طرح

''تخلیق ایوارڈ'' کا حقیقی حقدار تلاش کرنا کسی امتحان سے کم نہیں۔ دسمبر کا مہینہ میرے لئے ہمیشہ خاص ہوتا ہے۔ تمام احباب اس بات سے متفق ہیں کہ ''تخلیق ایوارڈ'' غیر جانبداری کے ساتھ خالصتاً ادبی خدمات کے عوض دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ کمیٹی کے ممبران کا انتخاب ہوتا ہے جس کی ادبی یا علمی قابلیت پر کسی کو شک نہ ہو اور پھر وہ تین ناموں میں سے جس کو چاہے منتخب کر لیں۔ یاد رہے یہ تین نام بھی مختلف سینئر دوستوں سے مشورے کے بعد منتخب کیے گئے ہیں۔ اس دفعہ کمیٹی ان ممبران پر مشتمل تھی محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، محترم غلام حسین ساجد، محترم ڈاکٹر ایوب ندیم، محترم سرفراز سید اور خاکسار خود۔ یہاں پتہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اس دفعہ لاہور، اسلام آباد، راولپنڈی، کراچی جیسے بڑے شہروں کو چھوڑ کر جھنگ، سرگودھا، بلوچستان میں سے تین لوگوں کا انتخاب کیا گیا اور مجھے یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ اس دفعہ ''تخلیق ایوارڈ 2021'' جو کہ فروری 2022ء میں اظہر جاوید کی برسی کے دن دیا جائے گا۔ کمیٹی نے ''محترم آغا گل'' کو ان کی بے مثال ادبی خدمات کے عوض دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے آج بھی تخلیق ایوارڈ کی اہمیت کا اندازہ ڈاکٹر انور سدید، سرفراز سید، عذرا اصغر، بشریٰ رحمان کے کہے ہوئے جملوں کی بازگشت سے محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید جیسے قلم کار صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا ''تخلیق ایوارڈ میری ساری زندگی کا حاصل ہے اس ایوارڈ کے ملنے سے میری آدھی بیماری رفع ہو گئی۔''

عذرا اصغر نے کہا یہ میری زندگی کا حسین ترین تحفہ ہے کہ میری 55 سالہ ادبی خدمات کا تخلیق نے اعتراف کیا آج کا دن میرے لئے باعث رحمت ہے کہ میں ادب میں سرخرو ہو گئی۔ بشریٰ رحمان نے کہا کہ زندگی اللہ نے دی اور اعزازات دنیا نے۔ تخلیق ایوارڈ سب سے قیمتی ایوارڈ ہے۔ ''تخلیق ایوارڈ'' پا کر مجھے لگا کہ آج میں مکمل ادیبہ بن گئی ہوں۔ سرفراز سید نے کہا اظہر کے ساتھ میری رفاقت تقریباً 50 سال ہے مگر تخلیق ایوارڈ نے مجھے زندہ جاوید کر دیا۔ ''تخلیق ایوارڈ'' نے جہاں ادبی دنیا میں ملکی اور بین الاقوامی طور پر اپنا سحر برقرار رکھا ہے وہاں سب دوستوں میں امید کی نئی کرن بھی بن چکا ہے۔ میں نے اپنے والد کی محبت میں ادبی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے اپنی 'میں' کا خاتمہ کر دیا اور والد محترم کے تخلیق کو محبت اور حقیقی آزمائش سمجھا اور اب جب کہ میں اپنی ادارت کے دس سال مکمل کر چکا ہوں تو نظر آ رہا ہے کہ دوستوں کے ساتھ ساتھ مخالفین بھی اب دبے لفظوں میں ہی سہی مگر تخلیق کی ادبی کاوشوں کو سراہ رہے ہیں۔ یہ کامیابی آپ دوستوں کی مرہونِ منت ہے۔ آپ سب دوستوں کا اولین فرض ہے کہ ''محترم آغا گل'' کو اس ایوارڈ کے ملنے پر مبارکباد دیں اور دعا کریں کہ تخلیق آنے والے سالوں میں بھی غیر جانبداری سے ادبی ذمہ داریاں نبھاتا رہے۔

رب راکھا!

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

قواعد و ضوابط

(1) صرف غیر مطبوعہ تحریریں ہی ''تخلیق'' میں شائع کی جائیں گی۔ (2) ''تخلیق'' اپنے لکھاریوں کو جو بیک وقت ایک ہی تحریر کئی ادبی رسالوں کو بھیجتے ہیں ان کے نام بلیک لسٹ میں شامل کر دے گا۔ (3) الفاظ کی دولت و کفالت سے استعمال کریں۔ طویل مضامین اور غزلیں بھیج کر انتخاب میں مشکل نہ پیدا کریں۔ (4) واٹس ایپ، میسنجر اور فیس بک پر بھیجی گئی کوئی تحریر شائع نہ ہو گی۔ تحریر صرف ای میل یا بذریعہ ڈاک ہی قابلِ قبول ہے۔ (5) ''تخلیق'' کسی بھی قاری کو اس کی تحریر شائع ہونے یا نہ ہونے اور پر شائع ہونے سے پہلے بتانے کا مجاز نہیں۔

آپ کے تعاون سے ہی ''تخلیق'' آج اس مقام پر ہے۔ (ادارہ تخلیق)

حمد و نعت

نعت

شگفتہ ہو گیا ہے دل حزین و ملول
ہوئی نصیب ہمیں کیسی خواب میں جو رسولؐ

خوشا کہ اسوۂ خیرالوریٰ ہے فیض رساں
ملے بشر کو ہمیں زندگی کے ارفع اصول

بہار پر ہے عروجِ چمن کہ آپؐ آئے
ہر ایک سمت کھلے ہیں ہزار رنگ کے پھول

[illegible]
قیودِ رنگ و نسب مسترد ہیں، [illegible]

قریب آپؐ کے آیا شرف نصیب ہوا
وہی بشر کہ جو تھا اجنبی و ذلیل و جہول

سبق حضورؐ نے حسنِ عمل کا ایسا دیا
رگِ حمیت و غیرت میں ہو گیا جو حلول

یقین کا گنج گراں مایہ اپنے ہاتھ آیا
سراب جہاں سے اترتی چلی گئی ہے جو دھول

ریاضؔ حمد خدا نعت مصطفیٰؐ کیجے
یہی ہے صنفِ سخن بارگاہ دل میں قبول

سید ریاض حسین زیدی

ooo

حمد

[illegible]

عزیز جبران

ooo

نعت

[illegible]

بشریٰ رحمٰن

ooo

تعارف نامہ

آغا گل...... تخلیق ایوارڈ یافتہ 2021ء

سحر حفیظ

قلمی نام: آغا گل ۔۔۔ پورا نام: آغا نور گل ۔۔۔ والد کا نام: محمد اکبر خان ۔۔۔ تاریخ پیدائش: 19 نومبر 1951ء ۔۔۔ شہر پیدائش: ہرنائی، بلوچستان۔ آغا گل کے والد محترم محمد اکبر خان بلوچستان کے ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے نمایاں مقام رکھتے ہیں جبکہ والدہ ایک گھریلو خاتون تھیں۔

تعلیمی کوائف: ابتدائی تعلیم پرنس ہائی سکول سبی اور گورنمنٹ مڈل ہائی سکول زیارت سے حاصل کی۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول کوئٹہ سے پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ سے۔ بی۔ اے گورنمنٹ ڈگری کالج سریاب روڈ کوئٹہ سے مکمل کیا۔ 1972ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ 1981ء میں ایم اے انگریزی۔ 1983ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ 1979ء میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا۔ جرمنی سے ہیومن ریسورس مینجمنٹ میں ڈپلومہ کیا۔ تھائی لینڈ سے مارکیٹنگ سٹریٹجی میں ڈپلومہ کیا۔

ازدواجی کوائف: 1975ء کو رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ اولاد: 3 بیٹیاں اور 1 بیٹا ہے (بیٹا آغا محمد طاہر گل بحیثیت میجر پاک آرمی میں سرحدوں کی حفاظت پر مامور ہے)۔

پیشہ ورانہ تجربات: 1972ء میں گورنمنٹ کالج مستونگ میں بحیثیت لیکچرار ملازمت اختیار کی۔ شعبہ اردو بلوچستان یونیورسٹی میں تعینات رہے۔ سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے محکمہ پوسٹ پاکستان میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ بطور ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل پاکستان پوسٹ 18 نومبر 2011ء کو BS-21 آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ انتظامی امور، پلاننگ ڈویلپمنٹ، مستقبل کے ترقیاتی پلان اور بجٹ سازی سے متعلق امور میں تیس سال کا تجربہ ہے۔ محکمہ ڈاک کے کنٹری ہیڈ بھی رہے۔ بلوچستان کے صوبائی سربراہ کے طور پر دس سال کا تجربہ۔

تصانیف: (افسانوی مجموعے) 1۔ گورپج 2۔ آکاش ساگر 3۔ گواچن 4۔ دراکو 5۔ پرتھوی گوری 6۔ پرندے۔ مشین گردی 8۔ سونے پانی کی جھوک 9۔ آبِ حیات 10۔ بولان کے آنسو 11۔ پانیکان کا مطلب کیا 12۔ جنگل راجا

ناول: 1۔ دشتِ وفا 2۔ بیلہ 3۔ بابو 4۔ قصہ ہٰذا جنات ۔۔۔ **ناولٹ**: 1۔ دشت میں سفر

تاریخ: 1۔ قازق اور امیچنگ 2۔ بلوچی بائبل کی تاریخ ۔۔۔ **تحقیق و تنقید**: 1۔ اقوالِ زریں ابن ابی طالب 2۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی پیشگوئیاں 3۔ بلوچستان میں اردو فکشن کا تاریخی تناظر

بلوچی زبان میں کتاب : شد و مہر جان

انگریزی کتب :

1- Christions of Blochistan

2- Commentary on Shrimad Bhagwat Geeta

3- Quaid-e-Azam post office

4- 50 Research articles of the history of Balochistan

تراجم : آغا گل کی درج ذیل تصانیف کا بلوچی، براہوئی، پنجابی اور سندھی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

1۔ آزمان سوزین ساز (بلوچی) مترجم: غوث بخش صابر۔ 2۔ بلوچی بانگل ودیچ (بلوچی) مترجم: بے دس بلوچ۔ 3۔ مہر آتا ذے (براہوئی) مترجم: پروفیسر سوسن براہوئی 4۔ ظلیغ (براہوئی) مترجم: صلاح الدین مینگل 5۔ گنوک (براہوئی) مترجم: نادر شاہوانی 6۔ بیلہ (براہوئی) مترجم: پروفیسر سوسن براہوئی 7۔ میر گڑھ (براہوئی) مترجم: پروفیسر سوسن براہوئی 8۔ باجھوت (براہوئی) مترجم: ثناء اللہ تبسم 9۔ ودھاجو رت پٹ (سندھی) مترجم: شکر چند 10۔ گلی امیں یوں کیا کریوں (سندھی) مترجم: ستار پیرزادو 11۔ روپ امروپ (پنجابی) مترجم: ایڈوکیٹ قیوم شہزاد۔

کئی افسانوں کے پشتو، براہوئی، بلوچی، پنجابی، سندھی، انگریزی اور ہندی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ افسانہ ''دوسری بابری مسجد'' کے دو ہندی تراجم بھارت سے شائع ہوئے۔

آغا گل کے کام پر لکھی گئی کتابیں : 1۔ آغا گل کے فکشن کی دنیا اے بی جی (طفیل اختر) 2۔ آغا گل کے فکشن میں بلوچستان ثقافت (منزہ مبین) 3۔ صحرائی تخیل پہ دیا (آسناتھ کنول) 4۔ آغا گل کے ناولوں میں اردو کی تشکیل نو (حبیب الرحمن) 5۔ آغا گل، روایت آغا بانی (پروفیسر سوسن براہوئی)

جامعات میں ایم اے اور ایم فل کی سطح پر لکھے گئے تحقیقی مقالے :

1۔ آغا گل: فن و شخصیت (شیر دل غیب 2010ء) بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

2۔ آغا گل کی افسانہ نگاری کورپیج کے حوالے سے (نمرہ مسلم) نمل یونیورسٹی اسلام آباد

3۔ آغا گل کی ناول نگاری (نجمی ملک) نمل یونیورسٹی اسلام آباد

4۔ آغا گل کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ (اسما نورین) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

5۔ آغا گل کے فکشن میں بلوچستان کی تہذیب و ثقافت (منزہ مبین) بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

6۔ آغا گل کے ناولوں میں اردو کی تشکیل نو (حبیب الرحمن) یونیورسٹی آف سرگودھا

7۔ آغا گل کے افسانوی مجموعوں کی فرہنگ مع تعلیقات (گل بینہ) سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی کوئٹہ

8۔ آغا گل بطور افسانہ نگار (روبینہ بی بی) یونیورسٹی آف سرگودھا

9۔ آغا گل کے ابتدائی چار افسانوی مجموعوں کا تحقیقی مطالعہ (عابدہ اچکزئی) سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی کوئٹہ

10۔ آغا گل کے افسانوں میں براہوئی سماج کا تذکرہ (عارف شکرزئی) سردار بہادر خان ویمن یونیورسٹی کوئٹہ

11۔ آغا گل، حیات و ادبی خدمات (امتیاز علی شاہ گیلانی) اورینٹل کالج لاہور

12۔ آغا گل کے افسانوں میں بلوچستان کی معاشرت (رضوان اقبال) رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی فیصل آباد

13۔ آغا گل کے فکشن میں تہذیبی اثرات (عاصمہ سرور) یونیورسٹی آف سیالکوٹ

ادبی رسائل کا خراج تحسین : ماہنامہ "روشنائی" کراچی آغا گل نمبر 2011ء، ماہنامہ "سپوتنک" لاہور آغا گل خصوصی ایڈیشن جون 2014ء، سہ ماہی "روشنائی" کراچی "خراج تحسین آغا گل" خصوصی نمبر شمارہ اپریل تا جون 2013ء۔

اعزازات : بہترین لکھاری ایوارڈ 1992ء۔

◆◆◆

تبصرہ: آفتاب خان ——— خقل دما ——— مصنف: آغا گل

صفحات: 132 قیمت: -/400 روپے پبلشر: ایمل آفس سلوشنز کوئٹہ

آغا گل بلوچستان کے ادبی منظر پر ایک نمایاں نام ہے۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو کر پذیرائی سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے حال کی بجائے ماضی کا نوحہ ہیں۔ انہوں نے قدیم بلوچستان کی روایتی اور حقیقی کہانیوں کو اپنے افسانوں میں خمیر کی طرح شامل کر کے بہت اچھی طرح گوندھ کر پیش کیا ہے اس لیے ان کے افسانوں میں جہاں بلوچی، براہوئی اور پشتو کے الفاظ ملتے ہیں، وہیں اس خطے کے قدیم مقامات اور معتقدات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے سردار، خان، میر اور دیگر قوموں کی اہم ادبی شخصیات بھی ان کے افسانوں کے مرکزی کردار ہیں۔ وہ اس سارے منظر اور پس منظر کو نظر میں رکھ کر اپنے افسانوں کی بنت کاری کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں 12 افسانے شامل ہیں۔ ان کے عنوانات کی انفرادیت ہی انہیں الگ تھلگ اور منفرد ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ افسانوں کے عنوان یوں ہیں۔ کالی بٹ، جام گڑھی، منقلہ زبان خوشی، جنگی کاگ، معمورہ فرنگی، شوم کا مال، گدھے کی واپسی، کلام التوار، زروج، جارگل، خقل دما ..... ان کہانی نما افسانوں کی ایک اپنی مخصوص فضا ہے۔ اس کے کردار ایک خاص خطے کی پہچان دیا کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے موضوع روزمرہ کے تو ہیں لیکن ذرا مختلف انداز کے حامل ہیں۔ اس پر مستزاد آغا گل کے بیانیوں اور مکالموں میں طنز بھی خوب ابھرا ہے۔ وہ ہر کسی سے ناراض لگتے ہیں اور شاید اسی ناراضی نے انہیں افسانہ نگاری کی طرف مائل کیا ہے۔ وہ تاریخ کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اس لیے تاریخی واقعات ان کے افسانوں کو مواد فراہم کرتے ہیں۔ افسانہ "معمورہ فرنگی" کی چند سطریں ملاحظہ کریں: "ہندو مسلم فسادات کی ابتدا ہی 1920ء سے کرا دی گئی تھی۔ انگریز ہندوستان میں بہت سے اجزا سے بنا جانتا تھا کہ وہ اس سے اتحاد کر کے باہم ہو کر نہ رہیں۔ وہ مذہب کی بجائے اس نے وہ قومی کا پرچار کیا، جا بجا فسادات کو مزید ہوا دی گئی۔" اس طرح آغا گل ماضی، حال اور مستقبل کے دریچوں میں جھانک کر نئی نئی کہانیوں کو افسانوں کا روپ عطا کرتے ہیں۔ کافکا کی طرح وہ بھی اپنے خطے سے بڑی کہانی بیان نہیں کرتے۔ اس طرح وہ بلوچستان کے سب سے بڑے اور منفرد افسانہ نگار کے طور پر اپنی الگ پہچان قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

گوشۂ آغا گل

سرد ہواؤں، زرد خزاؤں سے ہم کلام...... آغا گل

سرفراز سیّد

مجھے 21 نومبر 1950ء کو ہرنائی میں پیدا ہونے والے آغا نور گل، یا آج کل "آغا گل" کے بارے میں بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ زیادہ باتیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں، یہاں بھی ہوں گی۔ ایک خاتون نے خاوند سے پوچھا کہ روٹی کے اوپر والے حصے پر بھی لگاؤں یا نیچے والے حصے پر؟ اس نے کہا کہ کسی بھی حصے پر لگا دو، میں دونوں حصے اکٹھے کھاتا ہوں۔ سو قارئین کرام! باتیں بے ترتیب ہو سکتی ہیں آپ خود ترتیب دے لیں۔ اور اب آغا نور گل خان، بعد میں صرف آغا گل، ایم اے اردو، انگلش، ایل ایل بی، جرمنی اور تھائی لینڈ سے ہیومن ریسورس اور مارکیٹنگ مینجمنٹ کی اہم ڈگریاں، 11 افسانوی مجموعوں، چار ناولوں، ایک ناولٹ، انگریزی کی چار، بلوچی میں ایک کتاب والے آغا گل کی!! ابھی بات ختم نہیں ہوئی۔ آغا جی نے فارسی "گورامینگل" اور بلوچی بائبل پر اہم تحقیقی کتابیں بھی لکھیں۔ 50 تحقیقی مقالوں پر مشتمل ایک کتاب بھی ہے۔ پشتو، پنجابی، اردو، سندھی میں بے شمار افسانے لکھے (11 مجموعے)۔ ان میں بہت سے افسانوں اور کہانیوں کے انگریزی، براہوی، سندھی، پنجابی، سرائیکی اور بلوچی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ اتنے ڈھیر سارے علمی و ادبی کام پر آغا گل کی شخصیت اور کام پر متعدد یونیورسٹیوں میں ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی سطح کے 18 مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں کراچی، پنجابی، کوئٹہ، فیصل آباد، اسلام آباد اور بھارت کی یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ ان 18 مقالہ نگاروں میں 9 خواتین کے نام شامل ہیں۔ یہ خاصی دلچسپ بات ہے۔ آگے چل کر اس کی خاص وجہ بتاؤں گا۔ چند مزید تعارفی باتیں کہ آغا گل نے پرائمری امتحان سبی میں، مڈل امتحان زیارت میں پاس کیا، انٹرمیڈیٹ، بی اے، ایم اے اردو، انگریزی کی ڈگریاں بلوچستان یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ قارئین کرام! تھوڑا سا اور تعارف، پھر اصل کہانی شروع ہو گی کہ آغا جی نے کب، کہاں، کیا کچھ کیا؟ کیا کچھ نہ کر سکے۔ ایک لق و دق وسیع صحرائی علاقے سے اتنی ڈھیر کہانیوں کے موضوعات کیسے تلاش کر لئے؟ اور ابھی تک کئے جا رہے ہیں؟ آغا گل اتنی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد 1976ء میں مستونگ کالج اور پھر بلوچستان یونیورسٹی میں لیکچرار ہو گئے۔ یہاں اہم بات کہ لیکچرار ہونے کے تین سال بعد شادی کی۔ دو بیٹیاں، ایک بیٹا فوج میں اعلیٰ افسر ہیں۔ آغا گل کے والد محترم محمد اکبر خان بلوچستان کے معروف ماہر تعلیم رہے۔ ان کے ساتھ جگہ جگہ گھومتے رہے۔ (تعارف ختم)

قارئین محترم! اب میں آغا جی کی زندگی اور ادبی کاوشوں پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ میں دو سال کوئٹہ میں رہا ہوں۔ زیارت اور سبی میں بہت سی راتیں گزاری ہیں اور بلوچستان کے مختلف حصوں میں بھی گھومتا رہا ہوں۔ اس لحاظ سے میں اور آغا جی کچھ عرصہ گرائیں (ہم قصبہ) بھی رہے ہیں۔ میں 73ء کے ابتدا میں کوئٹہ سے مشرق اخبار نکالنے والی ٹیم میں شامل تھا۔ ان دنوں آغا گل مستونگ میں لیکچرار ہونے کے لئے اس ویگن میں جایا کرتے تھے جس میں ایک خوش شکل خاتون لیکچرار بھی مستونگ جایا کرتی تھی (معذرت، نام نہیں بتا سکتا)۔ آغا گل

بلوچستان یونیورسٹی میں بھی استاد رہے جس کو یہ بڑا اعزاز حاصل ہے کہ برسوں تک پروفیسر کرار حسین جیسے عظیم استاد اور دانشور کی بطور وائس چانسلر رہنمائی حاصل رہی۔ پروفیسر کرار حسین جنہوں نے ایک تقریب میں علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کی صرف ایک جملے میں بے حد جامع تعریف کی تھی کہ ''اقبال بڑا استاد اور رہنما ہے، کہتا ہے کہ ''آؤ میرے پیچھے چلو'' فیض عوام سے کہتا ہے، آؤ مل کر چلیں!'' اس جملے کو سنے ہوئے عمر گزر گئی اب تک کانوں میں محفوظ ہے۔ میں آغا گل کے ناولوں، افسانوں پر بات کرنے سے پہلے ایک بات اکثر سوچتا رہا ہوں کہ آغا گل نے یونیورسٹی کے لیکچرار کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا۔ کسی بھی معاشرے میں استاد کا منصب کسی بھی بڑے سے بڑے عہدے سے بڑا ہوتا ہے، کوئی خاص وجہ ہوگی کہ آغا گل یہ منصب چھوڑ کر سول سروس میں چلے گئے اور پوسٹل سروس میں آ گئے۔ یہاں سے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ایک بات اچھی گی کہ آغا جی نے ڈاک بابو کی حیثیت سے بہت سے ''خطوں'' اور ''محبتوں'' کے لفافے مطلوبان تک پہنچائے! یا یوں کہیے بہت بڑا ''کارِ ثواب'' ہے!

اب آغا گل کی کہانیوں کی بات! ایک صاحب نے ایک بار سوال کیا کہ بلوچستان کا زیادہ تر وسیع علاقہ خشک صحرا پر مشتمل ہے جہاں دور دور تک پانی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔ بلوچستان کے پشتون اور بلوچ عوام سخت پرانی معاشرتی روایات اور پابندیوں کے حبس میں زندگی گزار رہے ہیں، مردوں اور خواتین میں بہت فاصلے اور پردے حائل رہتے ہیں۔ ایسے میں آغا گل نے کیا وہ افسانوی مجموعوں کے لئے اتنے سارے موضوعات کیسے تلاش کر لئے؟ میں اس عزیز کی بات پر ہنسا کہ عزیزم یہ دلوں، آنکھوں اور ذہنوں پر پابندیاں ہی تو دکھ درد کی سچائیوں کو جنم دیتی ہیں اور سنو کہ معروف محقق اور ادیب پروفیسر شیداللہ شاہ نے پاکستان بھر کی 29 معروف اور اہم لوک داستانوں پر مشتمل بہت اہم تاریخی کتاب لکھی ہے۔ اس میں سندھ کی 6، خیبر پختونخوا کی سات اور پنجاب کی چھ لوک داستانوں کے مقابلے میں بلوچستان کی 9 بہت اہم داستانیں شامل ہیں، یعنی بلوچستان میں محبت اور درد و غم کے جذبات کی زیادہ پرچھائیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے آغا گل نے یہ ساری داستانیں پڑھی ہیں، اس کے علاوہ ایسی بہت سی داستانیں بھی ہیں جو ایک دروازے سے شروع ہوئیں اور دوسرے دروازے تک نہ پہنچ سکیں۔ آغا گل کو یہ ساری کہانیاں بھی یاد ہوں گی!

بات اور آگے چلتی ہے۔ بلوچستان کا بڑا حصہ صحرا ہے مگر کوئٹہ میں پھلوں اور پھولوں سے لبریز خوبصورت وادیاں بھی ملتی ہیں۔ زیارت میں قائداعظم کی آرام گاہ کے ساتھ والے انتہائی سرسبز لان میں ہالینڈ سے آئے بے شمار بڑے بڑے Tulip، گلاب پھولوں کی پورے ملک میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ پھر کوئٹہ سے حنہ جھیل اور اس سے آگے ''اوڑک'' جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف سینکڑوں ہزاروں جھاڑیوں پر کھلے ہزاروں لاکھوں گلاب کس والہانہ انداز میں رنگ برنگے آنے والے مہمانوں کا استقبال کرتے ہیں۔ دامن پکڑتے ان گلابوں کے بارے میں بھی آغا گل نے ضرور کچھ نہ کچھ لکھا ہوگا۔ انتہائی پابند سخت روایات کے پابند گھروں کے اندر سے اہم راز اگلوانے والی تحریروں سے یہ کھلے منظر جانے کس طرح چھپے رہ سکتے ہیں!

اب ذرا بلوچستان کی ان اہم لوک داستانوں کے نام پڑھ لیجئے جو آغا گل کے افسانوں اور ناولوں کے لئے بنیادی مواد فراہم کرتے ہیں۔ نام یوں ہیں ––– ''ہانی و شہ مرید'' ––– ''شیریں اور دوستین'' ''شہداد اور مہناز'' ''سمو اور مست توکلی'' ''بیبگر اور گراناز'' ''عزت اور مورک'' ''للّہ گراناز'' ''کوک و دلشاد'' اور ''زیارت کے گھوڑ سوار منصور و شہزادے اور شہزادی کی داستان''۔

میں آغا گل جی سے براہ راست مخاطب ہو رہا ہوں۔ آغا جی! آپ نے زیارت میں مڈل سکول کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت نوجوانی کی عمر ہوگی۔ ممکن ہے آپ نے زیارت کے دنیا کے دوسرے بڑے صنوبر کے جنگل سے بھرے، بلند پہاڑوں میں صدیوں سے گھوڑے پر سوار دو افراد کو آج تک راستہ ڈھونڈ نکلنے کی داستان بھی ضرور سنی ہوگی۔ چلئے نہ سنی بھی ہو تو اپنے محترم احباب کے لئے مختصر درج کرتا ہوں۔ میں نے ایک رات زیارت کی ایک بہت بزرگ شخصیت سے پوچھا کہ یہ علاقے کی کوئی نہ کوئی لوک داستان ہوا کرتی ہے، آپ کے علاقے کی بھی کوئی داستان ہوگی؟ اس بزرگ نے دلچسپ اور عجیب کہانی سنائی کہ جب برف گرنے لگتی ہے اور موسم بہت سرد ہو جاتا ہے (11 فروری 2009 منفی 350 ڈگری تک گر گیا) تو گھر کے باہر اکثر رات کے وقت اچانک ایک سرپٹ دوڑتے والے گھوڑے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ہم سب بزرگوں کی ہدایات کے مطابق دعا مانگتے ہیں کہ اے خدا! ان دونوں کو گھوڑے پر دوڑتے صدیاں گزر گئیں اب انہیں راستہ دے دے۔ اس بزرگ نے بتایا کہ زیارت شہر کا نام پہلے "کوشکی" تھا۔ 1886ء میں یہاں ایک ولی صفت بزرگ عبدالحکیم دفن ہوئے اور بابا خرواری کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کے مقبرہ کی زیارت کے لئے عام لوگ آنے لگے تو "کوشکی" کا نام زیارت میں تبدیل ہو گیا۔ یہ زیارت گاہ بلند پہاڑوں کے درمیان بہت نیچے واقع ہے۔ بزرگ کے مطابق اسی علاقے میں ایک بادشاہ حکمران تھا۔ اس کی ایک نہایت خوبصورت بیٹی تھی (نام بھول رہا ہوں) اس کے حسن کی شہرت ایران توران تک پھیل چکی تھی۔ یہ شہرت سن کر خراسان (ایران) کا ایک شہزادہ گھوڑے پر منزلیں مارتا کوشکی آ پہنچا۔ وہ شہزادی کو اور شہزادی اسے دیکھ کر ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ شہزادے نے شہزادی سے شادی کے لئے ملکہ ماں سے درخواست کی۔ ماں نے بیٹی کو اتنی دور بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شہزادے اور شہزادی نے محل سے بھاگنے کا منصوبہ بنایا اور ایک رات شیکسپیئر کے ڈرامے کی طرح اندھیرے میں گھوڑے پر بھاگ نکلے۔ ملکہ ماں کو خبر ہوئی اس نے بددعا دی کہ تم دونوں اس جنگل اور پہاڑوں سے کبھی باہر نہ نکل سکو گے! یہ بددعا اب بھی جاری ہے۔ شہزادہ اور شہزادی گھوڑے پر سوار ان پہاڑوں میں مسلسل بھاگ رہے ہیں مگر انہیں راستہ نہیں مل رہا۔ ہم اکثر برفیلی راتوں میں اچانک گھوڑے کے تیز ٹاپوں کی آواز سنتے ہیں ان کے لئے راستے کی دعا مانگتے ہیں مگر یہ بیکار ہوتی ہے۔ ماں کی بددعا کو کون توڑ سکتا ہے!!!

آغا گل جی! آپ نے ایم اے انگلش کے نصاب میں شیکسپیئر کے ڈرامہ "Mid Summer Night" میں اسی طرح داستان پڑھی ہوگی ہے کہ یونان کے بادشاہ تھیسس اور ملکہ ہپولائٹا کی خوبصورت بیٹی ہرمیا ایک خوبصورت نوجوان "لائی سینڈر" کے عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بادشاہ اور ملکہ ہرمیا کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دیتے ہیں۔ ایسے میں ہرمیا کی سہیلی ہیلینا ایک منصوبہ بتاتی ہے کہ رات کے پچھلے پہر ہرمیا کا عاشق لائی سینڈر، اور خود ہیلینا کا عاشق ڈی میٹریس محل کی پچھلی دیوار کے باہر گھوڑے لئے کھڑے ہوں گے۔ ہم دونوں دیوار پھلانگ کر ان کے ساتھ بھاگ جائیں گے اور وہ اس طرح بھاگ نکلتی ہیں۔ عزیزی سوہان نے کہا تھا کہ ذرا لمبا مضمون لکھتا ہے۔ شاید زیادہ ہی لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ مختصر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بہت سی باتیں کر دیں مگر آغا گل کے ناولوں اور افسانوں کی کہانیوں اور ان کی تحریر کے اسلوب کی کوئی بات نہیں کی۔ میں سادہ الفاظ میں بیان کر رہا ہوں کہ میں نے آغا گل کی تحریروں ان کے پلاٹ اور کرداروں کو بہت پسند کیا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں دو سال تو ان علاقوں میں گھومتا پھرتا رہا ہوں جن کا ذکر آغا جی نے اپنی کہانیوں میں اکثر کیا ہے۔ یہ سارے علاقے اور ان کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں اور جہتوں سے بخوبی واقف ہوں۔ میں نے خطا شاہ اور آغا گل قصے کے ساتھ کوئٹہ کی

ادبی محفلوں میں شرکت بھی کی۔ آغا گل کا وسیع علمی و ادبی پس منظر کے ساتھ کہانیوں میں حکمت، دانش کا فلسفیانہ انداز بیان بہت متاثر کرتا ہے۔ مجھے ان کے بہت سے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہر افسانہ بھرپور صوفیانہ روایات کی گونج کے ساتھ روحانیت کے جلو میں آگے بڑھتا ہے۔ ان افسانوں میں ہواؤں، بارشوں، بادلوں، پھولوں کا عام ذکر ہوتا ہے۔

آغا کے منفرد اسلوب پر بہت تفصیل سے لکھا جا سکتا ہے لکھنا بھی چاہیے مگر میں نے ایک آسان راستہ ڈھونڈ لیا ہے کہ آغا گل کی تحریر خود پڑھتے ہوئے آغا جی کے مختلف افسانے اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ میں نے بہت سے پڑھے ہیں۔ ان میں ایک افسانہ گوریچ (گ وری چ) نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ یہ جس میں بند ایک نظریاتی کردار بابا کے بچے شنک اور ضعیف ماں کی کہانی ہے۔ گوریچ شدید سرد طوفانی ہوا کو کہتے ہیں۔ بچے کو دادی اماں روز ایک کہانی سناتی ہے۔ بچے کو بتایا گیا ہے کہ اس کا باپ کہیں بہت دور کام کر رہا ہے۔ بچہ باپ کی آمد کے انتظار میں ہر وقت دروازے پر باپ کی دستک کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ ایک رات شدید سرد طوفانی ہوا سے دروازے پر دستک جیسی آواز ابھرتی ہے۔ دادی اور بچہ گرم لحاف چھوڑ کر دیوانہ وار ننگے پاؤں دروازے کی طرف بھاگتے ہیں، دروازہ کھولتے ہیں تو کسی انسان کی بجائے اس سرد ہوا کے بے پناہ جھونکے اندر آتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے مگر آغا گل کچھ اور زیادہ اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ بڑی چابک دستی کے ساتھ کہانی کو ایک بہت چونکا دینے والے موڑ کی طرف موڑ دیتا ہے۔ آغا گل کی اس کہانی گوریچ کا ایک اقتباس پڑھیے اور خود آغا کے اسلوب فن کا اندازہ کر لیں۔ آغا لکھتے ہیں:

''دادی کہا کرتی، شمال میں آگے بڑھتے ہی چلے جائیں، ایک تیز رفتار اونٹ پر جو ''شاہ مریہ'' کے اونٹ کی طرح جوان، باہمت، ان تھک ہو تو سالوں کا سفر آگے بغیر طے کرنے کے بعد برف کی دنیا آتی ہے۔ وہاں زمین کا کنارا ہے۔ زمین اور آسمان آپس میں جا ملتے ہیں۔ بہت ہی بڑے بڑے برف کے صحرا ہیں۔ وہاں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام، بس ایک روشنی سی پھیلی رہتی ہے۔ یہ سرد ہوا جسے ہم ''گوریچ'' کہتے ہیں، انہی یخ بستہ صحراؤں کی رانی ہے۔ گوریچ اپنی آمد سے پہلے ہر سال لمبی گردنوں والے پرندے ''بیش مرغ'' بھجواتی ہے۔ ان کا ایسا رعب اور دبدبہ ہے کہ پودے زرد ہو جاتے ہیں۔ درختوں کے ہاتھوں سے پتے گر جاتے ہیں۔ انہی پرندوں کے عقب میں گوریچ چلی آتی ہے۔ سارا دن اور سیاہ کا دامن پر حملہ آور ہوتی ہے پھر تاراج کرتی ہوئی جنوب میں مکران تک پر ریل پیل کرتی ہے جہاں سمندروں کا ہزاروں برس پرانا مندر ہے۔ یہیں وہ اپنی بہن ''گمی'' سے ملتی ہے۔ گمی سمندروں کی رانی ساحلوں پر رہتی ہے جب ہی تو اسے گمی (نسیم بحری) کہا جاتا ہے۔ ان کی ایک نرم دل بہن ہے۔ لمبے لمبے بالوں والی، کوئی اسے سرگوات (پروائی) کہتا ہے، کوئی ''علیساری''۔ ہمارے ہاں اسے ''گرما'' کہتے ہیں۔ یہ مشرق میں رہتی ہے۔ اس کی ایک بے مہر منہ زور بہن کاتی سمندروں میں رہتی ہے۔ وہ بھی طوفان لاتی ہے، ساحلی علاقوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ان کی ایک بہن بڑی انسان دوست ہے۔ گوش (خوش گوار ہوا) کہتے ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن کا نام امیت گیرت (سرد مغربی ہوا) کہتے ہیں۔ جھک جیل جاتا'' ان کے ساتھ کوئی لڑکا نہیں ہوتا؟''

''ہاں کیوں نہیں ہوتا میرے جھک جیسا پیارا بچہ ہے جسے لوز (بگولی) کہتے ہیں۔ بڑا شرارتی ہوتا ہے، چیزیں الٹ دیتا ہے، دہقانوں کی گندم بکھیر دیتا ہے، بھوسہ دور اچھال پھینکتا ہے۔ اس دھرتی کی اصل سرداریہ ہوائیں ہیں۔ سب کے اپنے اپنے مزاج اپنے اپنے علاقے ہیں۔ تم چاہو تو انہیں سمجھ بھی سکتے ہو، ان سے باتیں بھی کر سکتے ہو مگر ہواؤں کی زبان سیکھنی پڑے گی۔ تب دادی اچانک غمگین

ہو جاتی ہے کہ ہمارے مقدر میں محض "گورنچ" ہی رہ گئی ہے، سرد ظالم، بے رحم، بے مروت، انسانی جذبات کو کچلنے والی — (اقتباس ختم)

قارئین کرام! آغا گل نے بہت کچھ لکھا ہے، بہت کچھ لکھتا ہے۔ ابھی سندھ کی "سسی" کے ساتھ بلوچستان کے کیچ کے شہزادے پنوں کے بارے اور بھمبور سے چند کلومیٹر دور بے شمار بزرگوں کے پیڑوں والے "سسی کے باغ" کے بارے میں لکھتا ہے جہاں سسی چاندنی راتوں میں اونٹنی پر کیچ کے شہزادے کے لئے دودھ لے کر جایا کرتی تھی اور جہاں کنارے پر اگی لمبی سنہری گھاس میں سے سائبیریا سے آنے والی دسمبر کی سرد ہوائیں گزرتی ہیں تو گھاس کے آپس میں رگڑنے سے "پنوں، پنوں" کی درد ناک آوازیں ابھرنے لگتی ہیں۔ تب اردگرد کی بستیوں میں بزرگ لوگ گھروں کے دروازے بند کر کے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ سسی کی روح کو سکون دے!! آغا گل نے تو ابھی یہ داستان لکھی ہے کہ کیچ کا شہزادہ نیند سے بیدار ہو کر سسی سے ملنے لسبیلہ کے علاقے میں پہنچا تو بتایا گیا کہ سسی نے پنوں سے نہ ملنے پر زمین پھٹ جانے کی دعا مانگی تھی، جب زمین پھٹ گئی اور سسی اس میں سما کر گم ہو گئی۔ یہ سن کر پنوں نے بھی زمین پھٹنے کی دعا مانگی۔ زمین پھر پھٹی اور پنوں اس میں سما گیا۔ کراچی سے 75 کلومیٹر دور حب کے علاقے میں سسی اور پنوں کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے مقبروں پر آنے والے بے شمار لوگ اب بھی دعا مانگتے ہیں "یا اللہ سسی کی روح کو سکون دے!"

معزز خواتین و حضرات! میں نے اس مضمون کی ابتدا میں ایک خوش گوار بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ آغا گل مع اپنی تحریروں کے خواتین میں بہت مقبول ہیں (از راہ کرم آغا صاحب کے اہلِ خانہ یہ پیرا نہ پڑھیں)۔ اب ذرا دیکھئے۔ آغا صاحب کے افسانوں پر 18 مقالے لکھے گئے ان میں سے دس مقالے خواتین کے ہیں۔ ان کے اصل نام لکھنے سے گریز کر رہا ہوں۔ کچھ چیدہ چیدہ نام یہ ہیں "ماہ گل، ماہ رخ گل، مہ جبین گل، زرجبین گل، سدا حسین گل، شہناز گل، مہناز گل" اور ہاں آغا کے بارے میں پانچ تحقیقی کتابوں میں بھی دو خواتین کی کتابیں شامل ہیں۔ اپنی اپنی قسمت!! ایک خاتون نے ایک محفل میں سوال کیا کہ آغا گل نے بے شمار افسانوں کے ڈھیر لگائے مگر شاعری کیوں نہ کی، کوئی روح پرور، روح افزا غزل، کوئی اشکبار نظم!! دوسری خاتون بولیں کہ بھئی اچھا کیا شاعری کی طرف نہیں آئے۔ انتظار حسین نے کون سی شاعری کی جو اس کے بغیر اتنے مشہور ہوئے؟ یہی صورت حال ادھر ہے۔ آغا گل کو ان کی باکمال تحریروں نے بقائے دوام کی شہرت بخش دی ہے۔ ویسے بھی وہ شریف آدمی ہے، گھر کے اندر یا باہر گھوم پھر کر سچ بول دیتا ہے۔ اس پر خواتین کے بھرپور اعتماد کی یہی توجیہ ہے کہ وہ شاعروں کی طرح فرضی محبوباؤں کی فرضی بے وفائیوں کے ایک جیسے قصے بیان نہیں کرتا اور پھر دماغ دیکھا شاعروں کا؟ ہر وقت چوتھے یا پانچویں آسمان پر بیٹھے ہوئے۔ آغا گل ایک شریف، بے ضرر، پیارا سا افسانہ نگار!! اتنی خواتین نے اس پر کتابیں لکھ ماریں، مجال ہے کسی ایک کا بھی شکریہ ادا کیا ہو! بہت سی باتیں رہ گئیں، پھر سہی۔ اب برادرِ اصغر آغا گل سے ایک دو گلے!! آغا صاحب! آپ "تخلیق ایوارڈ" لینے کے لئے فروری یا مارچ میں لاہور آئیں گے۔ پلیز ایک کام کیجئے۔ کوئٹہ سے خضدار تک جانے والی سڑک کے دونوں طرف بے شمار جھاڑیوں میں اُگے ہوئے گلاب کے بے شمار پھولوں میں سے ایک سفید گلاب لیتے آئیے گا۔ اس بارے میں کچھ نہ پوچھئے گا!! دوسری بات! آپ ہرنائی میں پیدا ہوئے ہیں وہاں کے عبدالرزاق ریسٹورنٹ میں بلوچی سجی کھائی! میں نے کھائی تھی، بہت مزیدار تھی۔ پتہ نہیں اب وہ ریسٹورنٹ ہے بھی یا نہیں؟

◆◆◆

حقل دما

غلام حسین ساجد

"حقل دما" آغا گل کا بارہواں افسانوی مجموعہ ہے اور اس میں بارہ افسانے ہیں۔ ساٹھ برس کی ریاضت، پانچ ناول، بارہ افسانوی مجموعے، دس تحقیقی کتب، دو کتابوں کے بلوچی، چھے کتابوں کے براہوی، دو کتابوں کے سندھی اور ایک کتاب کے پنجابی تراجم کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی حیثیت علاقائی ادیب کی ہے۔ یہ الگ بات کہ ان کے رہنے کا علاقہ بلوچستان ہے اور وہ اس کی اردو زبان لکھتے ہیں جو خالصتاً پاکستانی ہے اور جس کے بدن سے اس زمین کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔

ایگال نے کہا تھا "سارتر فرانس ہے اور میں فرانس کو گرفتار نہیں کر سکتا۔" آغا کو جس قدر میں نے پڑھا ہے مجھے بلوچستان لگا۔ پھولوں، پھلوں، لق و دق پہاڑوں، میدانوں، گھاٹیوں، روایت اور کہانیوں سے بھرا اور تھیم وہ بہت سی کتھائیں کہتا ہوا۔ وہ سچ کے ساتھ ہے اور سچ کا داعی ہے۔ اس لیے ان کی تحریریں بلوچستان کی تہذیب، معاشرت اور دکھ کا آئینہ ہیں۔ آئینہ ہی نہیں انھیں محضر نامہ کہنا زیادہ درست ہوگا۔ وہ "حقل دما" کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "بلوچستانی ادیب بھی حال کی بات نہیں کرتا بلکہ ماضی کی عظمت کے ترانے گاتا ہے۔ حال کی ذلت پر نہیں لکھتا۔ بے بسی، بے کسی پر نہیں بلکہ چاکر رند کی بہادری، قد و بند کی سخاوت، حانی و شہ مرید کے حسن، شاہ مرید مست کے عشق پہ لکھتا ہے۔ نصیر خان نوری کے گھوڑے کی ٹاپ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ادیب و شاعر ماضی کی کلاسیکی عظمت کی جھلک پاکر نوجوانوں کو مست رکھتا ہے۔ اپنا ادبی پنڈ و خانہ چلا کر کماتا ہے۔ آغا اس کی جیب گرم رکھتا ہے۔

ڈپلومیسی کی تعریف ہے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو کہ شیطان بھی ناراض نہ ہو۔ یہ بھی بلوچوں کے خون میں گوالے دیو کر کھاتے، جان ہارتے ہیں۔ یہ ادیب و شاعر نہیں، بادشاہ کے درباری (prompters) ہیں۔" اس بات میں جس قدر تلخی ہے اس سے کہیں بڑھ کر سچائی ہے۔ ہمارے عہد کے ادیبوں کی اکثریت اسی نوع کی ہے۔ ہماری اکثریت اپنے ہی خول میں بند ہے۔ ایک بڑی تعداد بادشاہ کے prompters کی ہے اور ان کی نظریں عہدوں پر، مراعات پر بھی رہتی ہیں اور جو حق گو ہیں وہ کسی شمار میں نہیں آتے۔ انھیں گوشۂ گمنامی میں دھکیل دیا جاتا ہے یا غائب کر کے قعرِ مذلت میں پھینک دیا جاتا ہے۔ سچ ہے ہمیں کشمیر اور فلسطین کا غم جینے نہیں دیتا مگر ہم اپنی زمین کے دکھ سے لاتعلق رہتے ہیں۔

آغا کے فکشن اور تحقیقی موضوعات کی نسبت اپنی مٹی سے ہے۔ اس کے لیے انھیں کسی تخیلاتی مکالمے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلوچستان نے ان کے وجود میں اپنی روح کو اس طرح سمو دیا ہے کہ یہ کیفیت تخلیقی ہیولا کا استعارہ بن گئی ہے اور "حقل دما" میں بھی یہ ساحری اپنے عروج پر ہے۔ آغا کے فکشن کے کلر بہت الگ ہیں۔ وہ راست بیانیہ کے آدمی ہیں مگر اسے اساطیری، معاشرتی، معاشی اور وجودی

زاویوں سے بامعنی بھی بناتے ہیں اور پُر تاثیر بھی۔ ان کے کردار محبت کے قتیل ہیں اور اپنی قبائلی روایت سے کم کم انحراف کرتے ہیں۔ اس کے باوجود روایتی محبت کے رنگ اور تاثیر میں یکتا ہیں۔ یہ یکتائی کہیں جنون کی بخشی ہوئی ہے تو کہیں قصے کی اساطیری جہت کی۔ مثلاً ''مشعل زبان'' کے پہلے ہی افسانے ''کالی پت'' کی فضا جدید حسیت کے ساتھ اساطیری رنگ بھی لیے ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار کی کون طرازی اور زرلونہ کی ذات دونوں کالی پت کے توسل سے اپنی معنوی سطح سے بلند ہو کر محبت اور ملال کی ایک ماورائی کیفیت میں بندھے نظر آتے ہیں، جہاں بے وفائی اور پچھتاوا مل کر ایک ٹریجڈی جیسی کیفیت کو جنم دیتے ہیں جو کہانی کے اسرار کو گہرا بھی کرتی ہے اور حکایت بھی بناتی ہے۔

یہی تکنیک اگلے افسانے ''چاند گرہن'' میں بھی برتی گئی ہے مگر یہاں بے وفائی کی بنیاد معاشی حالت میں تبدیلی ہے۔ کالی پت کے سلیم کے برعکس یہاں بے رزقی کا بوجھ بہانہ ہے اور سبب والد کی معاشی حالت میں اچانک پیدا ہونے والی تبدیلی ہے۔ کہانی کے ہیرو ناصر پر پڑنے والی ابتلا اس کے لیے دل شکنی کا سامان لاتی ہے جو قاری کے دل کو بھی کرچی کرچی کر دیتی ہے۔ یہاں یہ کہنا شاید ضروری ہے کہ آغا روایتی اور مثالی کردار تخلیق نہیں کرتا۔ اس کے کردار ہر نوع کی بشری کمزوریوں سے بھرے ہیں اور یہی ان کے انسان اور آج کی معاشرت سے متعلق ہونے کی دلیل ہے۔ وہ اپنی فطرت ہی نہیں اپنے جغرافیے اور قبائلی روایات کے بھی اسیر ہیں اور ان سے انحراف کرنے کی سعی میں کٹ جاتے ہیں یا جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔

''مشعل زبان'' کو اصطلاح میں فیکشن کہا جائے گا۔ اس افسانے میں کہیں مبالغہ نہیں اور یہ آغا کی ذات سے جڑی کہانی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ مکافاتِ عمل ایک حقیقت ہے اور وقت کی چکی دیر سے سہی مگر بہت باریک پیستی ہے۔ فیکشن کی تکنیک اب اردو فکشن کے لیے نئی نہیں۔ مرزا حامد بیگ نے ''جاگی بانی کی عرضی'' اور ''لالہ جسونت رائے کی حویلی'' میں اور یہی ماجرا عمر شیخ مرزا عرف شمس الرحمن فاروقی نے ''غالب افسانہ'' وغیرہ میں اسے بہت خوبی سے برتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں غافر شہزاد کا ناول ''مکلی میں مرگ'' بھی فیکٹ اور فکشن کے ادغام سے وجود میں آیا ہے مگر اپنی سوانح پر اس کا اطلاق آغا سے بڑھ کر کسی نے نہیں کیا اور یہ تکنیک اردو افسانے میں ایک لحاظ سے بلوچی سماج کی جاگیرداری کو افشا کرنے کا بہانہ ہی نہیں بنی فطرت کے سچاؤ کا استعارہ بھی بن گئی ہے۔ اس افسانے کا اختتامیہ دیکھیے جو ایک واقعی حقیقت کا بیان کس سہولت سے کرتا ہے: ''میں نے اخبار کا تراشا اوپر رکھ دیا۔ ایک دو کنکریاں اس کے اوپر رکھ دیں اور فاتحہ پڑھ کر لوٹ پڑا۔ گھٹتے ہوئے دیکھا، تصدیق نامہ یوں تو اپنی جگہ پیوست سا تھا مگر سرد ہوا کے جھونکوں کے باعث پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔ کسی اجنبی، ان جانی زبان میں سچائی پکارے جا رہا تھا۔ مجھے آگ شعلہ کی سی ہوئی زبانیں دکھائی دیں اور ان میں سے ہر ایک پہ آن پڑیں اور وہ غیر زبان بولنے لگے۔ خدا نے ان کو بولنے کی طاقت بخشی۔''

سچ پوچھیے تو کھلاوٹ اور رکھاؤ، رنج و غم، عیاری اور دلیری کا سارا کھیل اسی بولنے کی طاقت کا ہے۔ آغا گل کی زبان میں ثقافت ہے نہ اظہار میں۔ اس لیے وہ بولتا ہے تو اس کی زبان سے پورا بلوچستان بولنے لگتا ہے۔ وہ روح مجسم جاتی ہے اور جو مٹی پردے سے نکل کر سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ جا رنگوں کی پری کلام کرتی ہے اور گیجی کا ایک عام بچہ کا بن کر اپنی جیت کو رنج دیتا ہے۔ آغا گل نے بلوچستان کو اور حد دکھایا ہے تو ایک دنیا دیکھ رکھنے کی وجہ سے اس اختصاص کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اپنے علم، مسافت گردی اور تجربے کی بنا پر اس کی حیثیت

عالمی شہری کی ہے اور وہ جبر کی ہر صورت کا شناسا ہے۔ اس نے صارفیت زدہ معاشرے بھی دیکھے ہیں اور روایت کے شکنجے میں جکڑی ہوئی معاشرت بھی۔ جرمنی کی تہذیب و معاشرت میں گندھی کہانی ''مجیج کاگ'' ہو، برطانوی کلونیل دور سے متعلق ''معصومہ فرنگی'' یا دو قومی نظریے کی بنیاد پر بنے پاکستان کے صوبے بلوچستان میں تبدیل ہوتی اقدار کا نوحہ ''شوم کا مال''، اس کی عمیق بصیرت ہر جگہ اپنا رنگ خوب جماتی ہے۔ دیکھیے ان افسانوں کے انجام کے یہ ٹکڑے: ''اپنا پورا لباس پہنے میں تنگ کھڑا تھا۔ میرا چہرہ وہ تھا میرا ہی مجیج کاگ تھا۔ وہی لباس، کندھے پہ چادر اور سر پہ سفید چترالی ٹوپی۔ کئی روز اس مجیج کاگ کے ساتھ وہ کربیلی نے ورنہ چھوڑ دیا تھا وہی کر لی تھی'' (مجیج کاگ) ''خواتین شرما کر ادھر ادھر چھپ گئیں۔ وہ لیڈی سے بھی پردہ کر رہی تھیں۔ لیڈی نے مختلف نام پکارے تو ایک معمر خاتون اپنا نام سن کر چلی آئی مگر چادر ہی سے پردہ کئے رہی۔ ''تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟'' وہ متحیر تھی۔ لیڈی اس سے لپٹ گئی، میں ''معصومہ ہوں، معصومہ فرنگی۔'' دونوں کے آنسوؤں نے وقت کا فیتا پاٹ دیا۔ (معصومہ فرنگی) ''انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ شوم غدار تھا۔ چھپ چھپاتے جانے کہاں کھسک گیا۔ صبح ہوئی تو حویلی خالی تھی۔ برسوں گزر گئے وہ کبھی کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ وقت سائیں سائیں کرنے لگا۔ ''اب یہ حویلی کس کی ہے؟'' انھوں نے مسکرا کر قہقہہ لگایا۔ ایک بزرگ مسکرایا: ''آپ افسر ہو کر بھی نہیں جانتے کہ شوم کا مال غازی کھاتا ہے۔''

دیکھیے کس مہارت سے آغا گل نے انسانی نفسیات کے تین متضاد رنگوں کو ابھارا ہے۔ یہ کہ خوف پیدا کرنے والی شے کا ڈر نکالنے کے لیے اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ یہ کہ معاشرت کی تبدیلی باطنی شباہت پر غالب آتی ہے اور کسی کے محب وطن ہونے کا فیصلہ طاقت ور کی زبان کرتی ہے۔ ''مقتل دما'' ایسی ہی پیچیدگیوں کو پیدا کرتی اور سمجھاتی ہے۔ اس کی ہر کہانی ایک الگ ذائقہ لیے ہے مگر اپنی حقیقت میں جبر کی کسی صورت کو منتقل کرتی ہے۔ جبر کی صورت سے آگاہی ہی وہ ہتھیار ہے جس سے ہم جبر کی قوت کو کم زور بنا سکتے ہیں اور آغا گل اس کتاب میں یہی کام کرنے کی کوشش میں ہیں۔ آغا گل کی زبان پر اہل علم بار بار رائے دے چکے کہ وہ اردو کو بلوچی اور براہوئی لفظیات سے ثروت مند بناتے ہیں۔ میں اس رائے کے حق میں ہوں اور اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اس صورت میں جب آغا گل اس کام کو ایک جدلیاتی عمل سمجھ کر انجام دے رہے ہیں اور اس لیے بھی کہ میں خود زبان کے جامد ہونے کے حق میں نہیں۔ وہ اگر انگریزی، عربی اور فارسی لفظیات کا بوجھ اٹھا سکتی ہے تو دوسری پاکستانی زبانوں سے خوشہ چینی کرنے میں اسے کیا دقت ہے؟ بل کہ اس کی مقامیت کا رنگ پختہ ہوتا ہے اور اس طرح اس میں یہاں کی مٹی کی خوشبو ہی شامل نہیں ہوتی موسموں کے رنگ بھی اپنی جھلک دے جاتے ہیں۔ ''مقتل دما'' کئی کا ذائقہ لیے ہے۔ اسے ایسا ہونا بھی چاہیے۔ جب تک ہم صحیح معنوں میں انسان نہیں بن جاتے اور ہر طرح کی معصیت سے پاک نہیں ہو جاتے، آغا گل کی ''مقتل دما'' کی کڑواہٹ نہیں جائے گی۔

◆◆◆

اسلم کمال اور مصورانہ خطاطی شائع ہو گئی

رابطہ: 0300-4649400 —— اسلم کمال پبلی کیشنز

آغا گل ۔ ایک اجمالی نظر

ڈاکٹر ایوب ندیم

آغا گل سے میری کوئی بالمشافہ ملاقات نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ ایک افسانوی نثر نگار (Fiction Writer) ہیں۔ کسی تخلیقی شخص سے براہِ راست ملنا ضروری بھی نہیں ہوتا اُس سے اصل ملاقات تو اس کی تحریروں کے ذریعے ہو جاتی ہے۔ تخلیقات نثری ہوں یا شعری، تخلیق کار کی حیات، خیالات اور عصری حالات کا عکس ہوتی ہیں یہی عکس اس کا اسلوب بن جاتا ہے۔ اسلوب محض لفظ، استعارہ، علامت، آہنگ اور پیکر کا نام نہیں اس میں تخلیق کار کے افکار کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے، اسی لیے تو مغربی نقاد رومن جیکب سن (Roman Jakobson) کہتا ہے کہ اسلوب خود ایک مکمل شاعر یا نثر نگار ہوتا ہے۔ آغا گل اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے اپنی افسانوی نثر کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنایا۔ ان کی اصل پہچان تو ان کی افسانہ نگاری ہے تاہم انھوں نے ناول سے بھی ایسا رشتہ جوڑا اور یوں افسانہ نگار سے افسانوی نثر نگار بن گئے لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ان دونوں ادبی اصناف یعنی افسانہ اور ناول کی کونپلیں کہانی کے تنے سے ہی پھوٹتی ہیں۔ ان کا بنیادی رشتہ کہانی سے ہے اور یہ کہانی ہی ان کی تخلیقی شخصیت کو منکشف کرتی ہے۔

بلوچستان کی سرزمین سنگلاخ چٹانوں کی حامل ہونے کے باوجود بہت زرخیز ہے۔ کتنے ہی لالہ و گل اور قیمتی پھل ہیں، جو بلوچستان کی مٹی سے جنم لیتے ہیں، ادبی اعتبار سے بھی بلوچستان پیچھے نہیں ہے۔ آغا گل اس کی ایک روشن مثال ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی ادیب اور شاعر ایسے ہوں گے، جو اردو، دیگر پاکستانی (علاقائی) زبانوں میں لکھتے ہوں گے اور اپنے علاقوں میں اپنی شناخت رکھتے ہوں گے۔ یہ سب ادیب، شاعر اور فن کار بلوچستان اور پاکستان کا اثاثہ ہیں۔

آغا گل نے اپنے افسانوں کے موضوعات بلوچستان کی سماجی فضا سے کشید کیے ہیں۔ وہاں کا قبائلی نظام، جاگیردارانہ ماحول، رسم و رواج، طبقاتی ناہمواری اور معاشی مسائل ان کے مرغوب موضوعات ہیں۔ طبقاتی عدم مساوات کی بات کرتے ہوئے جہاں وہ قبائلی سرداروں اور مفلس و بے کس لوگوں میں موجود خلیج کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتے ہیں، وہاں مردوں کے معاشرے میں عورت کی حیثیت اور اہمیت کی بات بھی کرتے ہیں۔ یوں تو یہ ہمارے معاشرے کا ایک مستقل موضوع ہے، لیکن قبائلی نظام میں اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے، کیوں کہ وہاں کی عورت غیر قبائلی معاشرے کی عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ اپنے حقوق سے محروم ہے۔ آغا گل کا احتجاج بین السطور ابھرتا ہے۔ وہ جس طرح جاگیردارانہ نظام سے بےزار نظر آتے ہیں، اسی طرح عورت کے حقوق کی پامالی پر بھی بےقرار ہوتے ہیں۔ فن کار کے پاس یقیناً یہ طاقت تو نہیں کہ وہ سوسائٹی کو بزورِ شمشیر بدل دے، لیکن وہ اچھے دنوں کا خواب تو دیکھ سکتا ہے اور پھر اپنے خواب کو لفظوں میں ڈھال سکتا ہے۔ آغا گل کا خواب یہ ہے کہ طاقت اور اختیار دستِ قاتل سے دستِ عادل میں منتقل ہو جائے۔ یہ خواب ہر سچے فن کار کا خواب ہے، جس کی تعبیر کے لیے وہ لکھتا ہے اور لکھتا چلا جاتا ہے۔ شمع کی مانند جلتا ہے، پگھلتا ہے مگر تاریکی قبول نہیں کرتا۔

ایک تخلیق کار کو کہانی لکھتے ہوئے ایک ان دیکھی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آغا گل یہ قوت اپنی کہانی کے ہیرو سے حاصل کرتے

ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی کہانیوں میں ایسے کردار ابھرتے ہیں، جو اپنی صداقت اور شجاعت سے امید و رجائیت کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ ان کے یہ رسم و رواج، روایت کے دور سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور عہدِ حاضر سے بھی۔ آغا گل کبھی ماضی سے حال کی طرف سفر کرتے ہیں اور کبھی حال سے ماضی کی طرف۔ ان کا آئیڈیل وہ شخص ہے، جو ہر زمانے میں سچائی کا علم اٹھا کر چلتا ہے اور طاقت کے نشے میں چور اربابِ اقتدار کے ایوانوں میں لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ آغا گل نے بیشتر کہانیاں اپنے علاقائی تناظر میں لکھی ہیں۔ وہ جب اپنی ثقافت کی بات کرتے ہیں تو بلوچستان کے رسم و رواج، تہذیب و ثقافت اور لباس کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں لیکن وہ جزئیات نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ہو سکتا ہے اس کا ایک سبب یہ ہو کہ وہ مقصدیت سے دور نہ ہو جاتے ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی افسانوی نثر نگار جزئیات میں کھو جاتا ہے تو کہانی کا اصل مقصد صرفِ نظر ہو جاتا ہے۔ آغا گل کی تمام تر توجہ اپنے اظہار پر ہوتی ہے۔ وہ جو کہنا چاہتے ہیں، اسی کے گرد سارا تانا بانا بنتے ہیں۔ وہ اپنے خطے کے بہادر سپوتوں کو اس طرح منظرِ عام پر لاتے ہیں کہ ان کے یہ فرضی کردار دیانت داری اور حب الوطنی کی مثال بن جاتے ہیں۔ ان میں قبائل کے معتبر لوگ بھی ہیں اور بلوچستان میں بسنے والے نچلے طبقے کے افراد بھی۔ جرأت اور حمیت کسی خاص طبقے کی جاگیر یا میراث نہیں، یہ صفات کسی دولت مند میں بھی ہو سکتی ہیں اور کسی غریب میں بھی۔ اسی لیے آغا گل کے چنیدہ افراد کا تعلق بھی مختلف طبقوں سے ہے۔ میر تقی میر نے کہا تھا:

سرسری تم جہان سے گزرے　　ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

آغا گل کے افسانوں میں جہاں ''جہانِ دیگر'' سے ان کی بے اعتنائی محسوس ہوتی ہے، وہاں دو پہلو اور بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اول: یہ کہ وہ بعض اوقات اردو میں پشتو اور براہوی کے ایسے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، جو نامانوس ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے معانی بھی لکھ دیتے ہیں لیکن ایسے ''سپیڈ بریکرز'' سے قرأت کی رفتار میں جو کمی واقع ہوتی ہے، اس کا تدارک شاید ممکن نہیں۔ ایسے الفاظ کے استعمال کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ پشتو اور براہوی کے الفاظ سے اردو کو مزید وسعت دینے کے متمنی ہیں۔ جس طرح پنجاب اور سندھ میں پنجابی اور سندھی کے بعض الفاظ اردو میں بلاتامل استعمال کیے جاتے ہیں مگر پنجابی یا سندھی ہونے کے باعث ہمیں مانوس لگتے ہیں، اسی طرح وہ بھی بلوچستان کی مقامی زبانوں کے الفاظ اردو میں مستعمل کرنے کے خواہش مند ہیں اور یہ خواہش نہایت جائز ہے لیکن جب وہ کہیں کہیں کہانی میں وضاحت و صراحت کی طرف چلے جاتے ہیں یعنی ان کا بیانیہ انداز رمز و ایمائیت سے کنارہ کش ہو کر تشریح و توضیح کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو افسانے کا حسن قدرے مدھم پڑ جاتا ہے۔ رمز و ایمائیت محض شاعری کے لیے ضروری نہیں، نثر میں بھی استعارے، تشبیہ، علامت اور کنایہ کا اپنا لطف ہے۔ غیر ضروری تفصیل سے فن پارے کا حسن بہرحال متاثر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے کئی نامور افسانہ نگار اس توضیحی اسلوب سے بچ نہیں سکے اور تو اور احمد ندیم قاسمی جیسے قد آور ادیب اور شاعر کے افسانوں میں بھی یہ اسلوب موجود ہے، جو بعض اوقات قاری کی طبع پر گراں گزرتا ہے۔ بایں ہمہ یہ بات بلاجھجک کہی جا سکتی ہے کہ آغا گل ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں سے اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے۔ قدم قدم پر اپنے وطن سے محبت کا اظہار ملتا ہے، ایسی محبت جو بے لوث بھی ہے اور غیر متزلزل بھی۔ وہ اب تک اپنی کوئی ایک درجن تصانیف منصۂ شہود پر لا چکے ہیں اور یہ سفر ہنوز جاری ہے۔ آخر میں ان کے لیے میں اسی آرزو کا اظہار کر رہا ہوں، جس خواہش کا اظہار ڈاکٹر سلیم اختر مرحوم نے ایک مصرع نقل کرتے ہوئے میرے لیے کیا تھا: ''اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!''

◆◆◆

ایک آفاقی تخلیق کار۔ آغا گل

آفتاب خان

آغا گل ایک طلسماتی قلم کار ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ایک انوکھی سرزمین کی کہانیاں بیان کی ہیں۔ وہ زندگی بھر اپنے خطے سے، اپنے علاقے سے، اپنی جنم بھومی کی اردگرد کی فضا سے باہر نہیں نکلے۔ بلوچستان جس طرح ان کے دل میں دھڑکتا ہے اسی طرح ان کے افسانوں اور ناولوں میں بھی سانس لیتا ہوا بہت قریب سے محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے جو لکھا بلوچستان کے لیے لکھا۔ ان کے افسانے حال کی بجائے ماضی کا نوحہ ہیں۔ انہوں نے قدیم بلوچستان کی روایتی اور حقیقی کہانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اپنے افسانوں میں انہیں خمیر کی طرح بہت اچھی طرح گوندھ کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جہاں بلوچی، براہوی اور پشتو کے الفاظ ملتے ہیں، وہیں اس خطے کے قدیم مقامات اور کھنڈرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے سردار، رند، خان اور دیگر قوموں کی بڑی بڑی شخصیات بھی ان کے افسانوں کے مرکزی کردار ہیں۔

آغا گل کے افسانے موضوعاتی سطح پر بھی جدت کے حامل ہیں اور طرزِ تحریر میں بھی جداگانہ انداز رکھتے ہیں۔ وہ قاری کی نبض پر ہاتھ رکھ کر افسانہ لکھتے ہیں۔ اس لیے افسانوں کے عنوانات بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جو قاری کسی افسانے کا عنوان پڑھ لیتا ہے اس کا اشتیاق وہ افسانہ پڑھنے کے لیے بڑھ جاتا ہے لہٰذا آغا گل اپنے آپ کو پڑھوانے کا فن جانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ پڑھنے والا کس طرح ان کے دام میں آئے گا۔ اس لیے وہ اپنے افسانوں اور کتابوں کے عنوان ہی وہ رکھتے ہیں کہ بندہ کچے دھاگے سے بندھا چلا آتا ہے۔ ذرا ان کے چند ناولوں اور افسانوی مجموعوں کے نام ملاحظہ کریں اور پھر میری بات کی صداقت پر ایمان لائیں۔ عنوانات ہیں۔ دشت میں سفر (ناولٹ)، گورپچ، آکاش ساگر، کواگو، راسکوہ، پرتھوی نوری، شمشین کسری، سونے پا کی جھوک، بیلہ، بابو قسادہ بنات، غازی نور دہینگل، بلوچی بائبل کی تاریخ (تحقیق)، بلوچ ان کے آنسو، پاپیکان کا مطلب کیا، بلبل دامو وغیرہ۔

کافکا کی طرح آغا گل بھی اپنے خطے سے باہر کی کہانی بیان نہیں کرتے مگر ان کی کہانیاں پورے ملک کی کہانیاں ہیں، پورے معاشرے کی کہانیاں ہیں، کیوں کہ یہ انسانوں کی کہانیاں ہیں اور انسانوں کی کہانیاں پوری دنیا میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان میں انیس بیس کا تو فرق ہو سکتا ہے دس بیس کا فرق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے آغا گل بلوچستان کے تناظر میں پورے ملک کی، پورے معاشرے کی اور پوری انسانیت کی بات کرتے ہیں۔ ظلم اگر کوئٹہ میں ہوتا ہے تو لبنان میں بھی ہوتا ہے، یمن میں بھی ہوتا ہے، شام میں بھی ہوتا ہے، یروشلم میں بھی ہوتا ہے۔ اس طرح آغا گل کی کہانیاں آفاقیت سے ہمکنار نظر آتی ہیں۔ ان کہانیوں میں انسان کی بات کی گئی ہے۔ انسان کو درپیش مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ انسان کے دکھوں کا نوحہ لکھا گیا ہے۔ کہنے کا انداز الگ ہو سکتا ہے۔ الفاظ الگ ہو سکتے ہیں مگر انسانی مسائل تو پورے کرۂ ارض پر ایک جیسے ہیں۔ بھوک تو صومالیہ میں بھی ہے اور سندھ میں بھی۔ قتل و غارت تو کوئٹہ میں بھی ہے اور بھارتی گجرات میں بھی۔ تنگی تو

راجستھان میں بھی ہے اور پنجاب میں بھی۔ تو پھر ہم کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ آغا گل صرف بلوچستان کے ادیب ہیں۔ ہم یہ کیوں نہیں کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کہانیوں میں بلوچستان کو ایک علامت کے طور پر برتا ہے۔ یا ایک استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ہم انہیں صرف بلوچی ادیب کہہ کر ان کے کینوس کو محدود کیوں کرتے ہیں۔ اس کا پھیلاؤ تو ذات سے کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔ جیسے کسی ناول کا کینوس محدود ہوتا ہے۔ وہ پوری کائنات اور پوری انسانیت کی کہانی بیان کرتا ہے اسی طرح آغا گل کے افسانے اور ناول بھی اپنی موضوعاتی سطح پر ناول کی طرح وسیع کینوس و تنوع لیے ہوئے ہیں۔

آغا گل نے اپنی تحریروں میں اردو ادب کو ایک نئی ڈکشن دی ہے۔ انہوں نے اپنی مقامی زبانوں کے الفاظ سے اردو زبان کا دامن مالا مال کیا ہے۔ اس لشکری زبان میں اتنی لچک ہے کہ اس میں ہر زبان کا ہر لفظ سما جاتا ہے اور بُرا بھی نہیں لگتا اور اجنبی بھی نہیں لگتا۔ یہ آغا گل کا اردو زبان و ادب پر ایک ایسا احسان ہے جسے آنے والی نسلیں بھی نہیں اتار سکتی ہیں۔ آغا گل کے ناولوں اور افسانوں کے موضوعات روزمرہ کے تو ہیں مگر ذرا مختلف انداز کے حامل ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کے بیانیے اور مکالموں میں طنز بھی طنز بھرا ہے، سماج پر طنز، معاشرے پر طنز، حکومت پر طنز، روایات پر طنز، وہ ہر کسی سے ناراض لگتے ہیں اور شاید اسی ناراضی نے انہیں افسانہ نگاری کی طرف مائل کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جو گلے شکوے اور شکایات نظر آتی ہیں وہ بالکل بجا ہیں۔ معاشرے میں پنپنے والے حق دبے ہر حساس انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ قلم کار ان زیادتیوں کو برداشت نہیں کرتا اور اپنے دل کا غبار اپنی تحریروں میں نکالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا گل اپنے آس پاس ہونے والے ان تمام واقعات کو برداشت نہیں کر پاتے اور ان کا قلم خون اگلنے لگتا ہے۔

آغا گل نے ماضی کے کھنڈرات میں جھانک کر کئی اور نایاب کہانیاں تراشی ہیں۔ وہ ماضی کو حال کے ساتھ جوڑ کر مستقبل میں جھانکنے کا فن جانتے ہیں۔ اس لیے ان کی کہانیاں اپنے جداگانہ طرزِ نگارش سے دوسرے لکھاریوں سے الگ پہچانی جاتی ہیں ان کے باذوق قارئین ان کے اندازِ تحریر سے ہی یہ جان جاتے ہیں کہ یہ آغا گل کی لکھی ہوئی کہانی ہے چاہے اس پر آغا گل کا نام نہ بھی لکھا ہو۔

غرض یہ کہ آغا گل کے ناول اور افسانے وہ شہ پارے ہیں جو انہوں نے خونِ دل سے لکھے ہیں۔ ان میں فکشن بھی ہے، طنز بھی ہے اور حقیقت نگاری بھی ہے، لہٰذا انہیں سونا سمجھ کر ضرور سنبھالا جائے۔ بلوچستان میں افسانہ لکھنے والے اور بھی قلم کار موجود ہیں مگر وہ گمنام ہیں۔ ملکی سطح پر انہیں کوئی نہیں جانتا لیکن آغا گل کو اردو ادب کا ہر قاری، ہر طالب علم جانتا ہے۔ یہ ان کی مقبولیت کا ایک سیدھا سادا ثبوت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی رد کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا آغا گل جی آپ اس بات پر شکستہ نہ ہوں کہ آپ کو آپ کا جائز مقام نہیں ملا۔ آپ کو آپ کے کام سے زیادہ پذیرائی ملی ہے۔ حکومتی سطح پر بھی کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ عوامی سطح پر آپ کے فن کو سراہا گیا ہے اور آپ پر ایم فل کے مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ بھی اگر قسمت میں لکھا ہوگا تو مل جائے گا۔ بس انتظار کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اور اپنا کام خاموشی سے کرتے رہیں۔ آپ کا کام ہی آپ کا انعام ہے۔

◆◆◆

> ''اظہر جاوید کی ہر کہانی ان کی اپنی زندگی کی ایک سیرت ہے۔ نامہربان تجربوں کی یہ کہانیاں اظہر جاوید کی داستانِ حیات کے اوراق ہیں۔'' (ڈاکٹر انور سدید)

مضامین

تہذیب کیا ہے؟

ڈاکٹر مبارک علی

تہذیب کے معیار کو مختلف طریقوں سے مقرر کیا جاتا ہے۔ تہذیب یا سول ائیزیشن کا لفظ سب سے پہلے اٹھارھویں صدی میں فرانس میں استعمال ہوا۔ اس کے بعد سے دنیا کے مختلف حصوں کی ترقی کو تہذیب کی روشنی میں دیکھا جانے لگا۔ کچھ مورخوں کا نظریہ تہذیب کے بارے میں منفی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تہذیب نے انسان کی سادہ اور پرامن زندگی کو ختم کر کے اسے مختلف مسائل میں الجھا دیا لیکن وہ مورخ بھی ہیں جو تہذیب کو انسانی ترقی کے لئے لازمی سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں تہذیب انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے جب وہ کسی بحران میں مبتلا ہوتا ہے تو ضرورت کے تحت اپنی بقاء کے لئے نئی ایجادات کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو زندگی کی سہولتیں ملتی ہیں۔

تہذیب کی ابتداء مورخوں کے مطابق میسوپوٹامیہ سے شروع ہوئی 4000ACE میں یہاں شہر آباد ہونا شروع ہوئے جس کی آبادی 10,000 کے قریب تھی۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے مختلف دھاتوں کا استعمال شروع کیا۔ اس لئے تاریخ میں اسے کانسی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ کانسی کے استعمال نے نہ صرف اوزار اور ہتھیاروں کو بنانے میں مدد دی بلکہ اس کی وجہ سے زراعتی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔

جب انسانی سوسائٹی زراعت سے نکل کر تہذیب کے دائرے میں داخل ہوئی تو اس میں بنیادی تبدیلیاں آ گئیں۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ شہروں کی بنیاد پڑی اس کے ساتھ ہی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ ریاستی ادارے جن میں فوج، عدلیہ اور بیوروکریسی تھی، اس نے لوگوں کو آپس میں متحد کر دیا۔ شہروں میں کاریگروں کا پروفیشنل طبقہ پیدا ہوا جو معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ ریاست کے انتظام کے لئے جس رسم الخط کی ابتداء ہوئی تاکہ اس کے ذریعے نہ صرف علم کو محفوظ رکھا جائے بلکہ ریاست کے انتظام کو قانون کے دائرے میں لایا جائے اس مرحلے پر زراعتی اور شہری معاشرے جدا ہو گئے۔ زراعتی معاشرے میں کسان پیداواری عمل سے جڑے ہوئے تھے، جبکہ شہر کے لوگ اس پیداواری بنیاد پر اپنے شعبوں میں کام کر رہے تھے۔ شہروں کے قیام میں تاجروں کا ایک نیا طبقہ بھی پیدا ہوا جو دوسری قوموں سے تجارت کر کے ان کے کلچر کو روشناس کراتے تھے۔ میسوپوٹامیہ کی تہذیب میں چار بڑی تہذیبیں پیدا ہوئیں یعنی سومیرین، اکاڈین، اسیرین، بے بولونین اس علاقے میں سب سے پہلے بڑی امپائر بنی۔ اس کی ہم عصر تہذیبوں میں مصر، وادی سندھ کی تہذیب اور چائنا میں یونگ شی کی تہذیب وجود میں آئی۔ ان تہذیبوں کو دریائی تہذیبیں بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دریا کے کنارے وجود میں آئی تھیں۔ کچھ مورخوں کا ایک گروپ مغربی تہذیب کی ابتداء کو میسوپوٹامیہ، مصر، یونان اور روم کی تہذیبوں سے ملا کر تشکیل کرتے ہیں۔ اس عمل میں وہ دوسری

تہذیبوں کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خاص طور سے افریقہ کے براعظم کو اس لئے مغربی تہذیب کی یہ تعریف تنگ نظری پر ہے۔

تہذیب کے بارے میں یہ کہنا بھی درست نہیں کہ تہذیب کے لئے کسی ریاست کا وجود ہو یا رسم الخط بھی ہو، کیونکہ بہت سی ایسی تہذیبیں تھیں جن کا کوئی رسم الخط نہیں تھا، جیسے جنوبی امریکہ میں انکا تہذیب لیکن اس نے بڑی سلطنت قائم کی اور اپنا کلچر پیدا کیا۔ تاریخ میں عام طور سے جو قومیں خود کو مہذب سمجھتی تھیں، وہ دوسری قوموں کو غیر مہذب یا باربیرین کہتی تھیں۔ یہ خیال ان کی تنگ نظری کی بنا پر تھا کیونکہ وہ قومیں جنہیں یہ باربیرین کہتی تھیں ان کے بھی رسم و رواج اور کلچر کی بنیادیں تھیں۔ ان کی عادات اور رویوں میں شائستگی پائی جاتی تھی۔ اس لئے مہذب اور غیر مہذب کی اس تقسیم نے قوموں کو ایک دوسرے سے دور رکھا اور ان کے کلچر سے سیکھنا بے عزتی قرار پایا۔

اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں تہذیب کے بارے میں بہت منفی اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً تہذیب طبقاتی ہو کر حکمرانوں اور عوام میں فرق کو پیدا کرتی ہے اس میں مساوات نہیں ہوتی ہے بلکہ جس کے پاس طاقت ہوتی ہے وہ جبر اور تشدد سے لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کو زیر دست رکھنے کے لئے ایسے قوانین اور ضوابط بناتا ہے جن سے لوگوں کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ حکمران طبقے لوگوں سے ٹیکس وصول کر کے انہیں اپنی ذات کے لئے استعمال کرتے ہیں یہ چیزوں کو بھی فروغ دیتے ہیں تاکہ ان کے اقتدار میں اضافہ ہو۔ اپنے رہن سہن ادب آداب اور شائستگی کی وجہ سے خود کو برتر سمجھتے ہوئے اپنے ہی لوگوں کو غیر مہذب سمجھتے ہوئے ان کو حقیر گردانتے ہیں۔ لہٰذا تہذیب نہ صرف قوموں کے درمیان فرق کو پیدا کرتی ہے بلکہ خود اپنے معاشرے میں عام لوگوں کو تہذیب کے دائرے سے نکال کر انہیں جاہل کہتی ہے۔

قدیم تہذیبیں اپنے کردار اور رسم و رواج کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ مثلاً میسوپوٹامیہ کی تہذیب میں رسم الخط اور ادب کی تخلیق میں اسے ایک نیا کردار دیا۔ یہاں تخلیق کائنات کے بارے میں اسرار و خیالات ہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ مصری تہذیب اس لحاظ سے بہت وسیع ہے کیونکہ اس میں مرنے کے بعد نئی زندگی کا عقیدہ ہے جس کے لئے ممی کا فن ایجاد ہوا اور اہرام بنائے گئے۔ ان کا آرٹ تہذیب کی پختگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے برعکس وادی سندھ کی تہذیب رسم الخط کے نہ پڑھے جانے کے باعث راز میں رہی۔ اس کا زوال شاید اس وجہ سے ہوا کہ اس کا پھیلاؤ بہت ہو گیا تھا اس لئے ایک بڑی سلطنت کا انتظام ممکن نہیں رہا تھا۔ چائنا کی تہذیب بھی عروج و زوال کے مرحلوں سے گزری اور اپنے خاص کردار کو محفوظ رکھا۔ اس لئے تہذیبوں میں ہم شائستگی نہیں دیکھتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے سیکھتی ضرور ہیں مگر اپنی خصوصیات کو بھی برقرار رکھتی ہیں۔ تمام قدیم تہذیبوں نے اپنا ورثہ چھوڑا ہے جس کی وجہ سے ہم ان تہذیبوں کے تسلسل کو آج بھی دیکھتے ہیں۔ میسوپوٹامیہ کی تہذیب کا اثر مشرق وسطیٰ میں پایا جاتا ہے۔ مصر میں شمالی افریقہ اور یونان کو تہذیبی روایتیں دیں۔ وادی سندھ کی تہذیب اگرچہ گم ہو گئی تھی مگر اس نے ہندوستان کی موجودہ تہذیب پر اپنے اثرات ڈالے۔ چائنا اگرچہ دوسری تہذیبوں سے علیحدہ رہا مگر خود چین کے اندر ہو کر ایک وسیع ملک ہے اس کے جغرافیائی علاقوں کے اثرات ایک دوسرے پر ہوئے لہٰذا ہم قدیم تہذیبوں کے ورثے کو نظرانداز نہیں کر سکتے ہیں جس نے جدید تہذیب کی تعمیر میں حصہ لیا۔

◆◆◆

افسانے کی کڑی کمان۔ سمیع آہوجہ

غلام حسین ساجد

سمیع آہوجہ سے محبت اور مغائرت کے رشتے کو چالیس برس بیت چکے اور اس دوران میں کبھی میں نے اس تعلق کی بوالعجبی پر غور نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ میرے دل سے قریب رہا ہے مگر دماغ سے دور، اور اس کا سبب میری داخلی اور کوتاہی ہے۔ میں نے کبھی اس جسم کو کریدنے، تلاش کرنے اور محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جو اس کی روح میں بسا ہے اور جس کی وجہ سے اس کے افسانوں کے درجن بھر مجموعے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر بڑے ادیب کو سمجھنے کے لیے تنقیدی معیارات کو بدلنے اور از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تو اور مجھے خود اپنے بارے میں ادراک رہا ہے کہ مجھے موجودہ تنقیدی روایت کے تناظر میں ڈی کوڈ نہیں کیا جا سکتا مگر حیرت اس بات پر ہے کہ میں دوسرے لکھنے والوں کو اور خاص طور پر ایک اور ہی پیرائے پر بسر کرنے والوں کو سمجھنے کے لیے اپنے تنقیدی یا تحسینی معیارات کو بدلنے پر آمادہ نہیں۔ ایک طرح سے میں ایک خاص نوع کے تنقیدی Taboo کا شکار ہوں اور اسے حزرائیل کی چارپائی کی طرح ہر مطلب کے پیچھے بچھانے پر اتارو۔۔۔ اور تو اور یہ جاننے کے باوجود کہ ''جسم + میں'' سے ہی سمیع آہوجہ کو ڈی کوڈ کرنے کے لیے مجھے اپنے تنقیدی معیار کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ میں اب تک اسے کلینک اور مبہم سمجھ کر طاق نسیاں پر رکھتا آ رہا ہوں۔ حتیٰ کہ وہ تو ''بھارتیں'' ڈالنے کے مرحلے پر آ پہنچا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ بھارتیں کم عقل لوگوں کے لیے نہیں ہوتیں۔ خاص طور پر جب وہ تاریخی، سماجی، جمالیاتی اور سری کی مکاشفوں کی پروردہ ہوں۔

بہت پہلے سے میں یہ جانتا ہوں کہ سمیع آہوجہ کی ہنسی، اس کے چمکتے دانتوں، گلابی آنکھوں اور اجلے وجود میں چھپا ایک جنگل ہے جو بقول خالد سعید ''آبِ رواں'' کی صورت ظہور پذیر نہیں ہو سکتا کیوں کہ سمیع آہوجہ اپنے قاری کو اپنی شاتی میں غرق کر کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کرنے پر تیار نہیں۔ وہ تو سیلاب بلا کی طرح اچھالنے، چھٹنے، توڑ موڑ دینے اور ریزہ ریزہ کر کے بار دگر یکجا اور منتشر کرنے اور اس کی سوئی ہوئی قوت ادراک کو متحرک اور بیدار کرنے اور اس کے جمالیاتی شعور کو دو ہاتھ بلکہ دو ہاتھ کر کے بحال کیے رہنے پر مجبور کرنے کا شائق ہے۔ جس کی بیخ کو کبھی زبان کی رومانویت تیز کرتی ہے تو کبھی لفظیات کی دو دھاریں۔ کبھی اسرار اور ابہام کی نا آسودہ تشنگی جھلکتی ہے تو کبھی آسودگی اور صراحت کی تیز روی اسے کچھ راستہ ہی نہیں دیتی۔ یعنی سمیع آہوجہ کا اظہاریہ کو خیال سے اترتا ہوا تیز دھارا بھی ہے اور دشت جمال میں رقصاں ہوا سراب بھی۔ پھر مجھ سا روایت اور موجود کے جبر کی کنڈیشننگ کا شکار قاری اس کا بھید پائے تو کیسے!

کوئی پینتیس برس پہلے میں نے ایک مصرع کہا تھا ''تعلق ہے گفتگو سے گرہ پیچ و تاب کی'' مگر مجھے اپنے مصرعے کی افادیت کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ تو میں نے خالد سعید کی گفتگو سے جانا کہ سمیع آہوجہ کے پیچ و تاب کی گرہ کھولنے اور اس کی تہ داری، رمزیت، اسرار اور معانی کو جاننے کے لیے اس کی بلند آہنگ کے ساتھ خواندگی ضروری ہے کیوں کہ خاموش مطالعہ ہر تحریر کی قلعی نہیں کھولا کرتا۔ ''آبِ رواں'' کھنت کو محسوس کرنے اور اس کا لطف اٹھانے کے لیے ایک تو اید خاموشی کی ضرورت ہوتی ''ترجِ میر کھنت'' کی قیامت اساتی پیچیدگی اور

جزم بہ جزم پیکار سے آمیختہ ہونے کے لیے تخلیق میں بھی ویسا ہی جدل کا در آنا لازمی ہے اور مسیح آہوجہ کی تحریر بھی صدا اور صدمے کے بطنے خمیر سے گندھی ہے۔ اسے ڈی کوڈ کرنے کے لیے اس کے آہنگ سے ہم آہنگی اور اس کی چال کو خود پر آزمانا ضروری ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مسیح آہوجہ جدلیاتی پیکار کے رمز شناس ہیں۔ رشید امجد نے کیا خوب کہا ہے کہ "نوآبادیاتی شعور اور مظلوموں کی نمائندگی کرتے ان کے کردار جبر و تشدد کی فضا میں جدوجہد کرتے اپنے زمانے کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ برصغیر خصوصاً پنجاب کی نوآبادیاتی تاریخ کو افسانہ بنانے کا فن ان پر ختم ہے۔ اس کے ساتھ فلسطین کی جنگ آزادی، مقامیت اور ماورائے مقامیت ان کا خاص موضوع ہے۔ مگر میرے نزدیک مسیح آہوجہ کی عظمت صرف اپنے عصر سے تخلیقی وابستگی اور اس کی پیچیدگی اور شکست و ریخت کا اظہار نہیں۔ اس جبر کے نفسیاتی اثرات اور ان کے روح میں اترتے زہراب اور اس کی ہلاکت خیزی کو اجاگر کرنا ہے سو مسیح آہوجہ کی تفہیم کے لیے ہمیں اپنے آپ کو ایک بار پھر ریزہ ریزہ کر کے گوندھنا ہوگا اور اپنے اذہان اور سماعت کی تہذیب کرنا ہوگی۔

دو کتھائیں "ساری کہانیوں میں پھنسی ایک پہیلی" اور "بے سمت کڑی کمان" کے سوا اس مجموعے "بھارتیں نکار خانے کی" کے جن کا نام پہلے "میورل" تجویز ہوا ہوگا، کی ساری کتھائیں 2012ء کے آخری پانچ مہینوں میں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے ان کتھاؤں کے موضوعات، لسانی تموج، امتزاج اور معنوی تہ داری کے باوصف ان میں ایک پرشکوہ روانی اور جدلیاتی تندی کی سی کیفیت ہے اور تصویریں ایک خواب آلود غنودگی میں بھی تہہ در تہہ اور کبھی گریز کرتی ہوئی ایک ایسا میورل بناتی ہیں، جو قوت مشاہدہ کے ساتھ قوت ادراک اور وجدانی احساس کی موجودگی کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ یعنی اس میں بہت کچھ ہے جو ہمارے لیے نہیں ہے اور یہ بھی کچھ ہمارے لیے ہیں، بشرطیکہ ہم اپنے آپ کو بہتر اور کسی قابل بنا کر ایک جذب کرنے والے وجود میں ڈھال لیں۔

آپ جانتے ہیں "بھارتیں" دانش مندوں کے لیے دانش مندوں کی پیام رسانی کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ شاہ حسین نے کہا تھا، "میاں گل سی نہ جاندی تی ـــــ تیں گل سنیوے کیوں کر بھی پا اس وچ رتی"۔ یہی مشکل ان بھارتوں کی تفہیم میں بھی ہے۔ اگر لکھنے والا تاریخی شعور، جدلیاتی پیکار، لسانی رموز اور یکسر الگ اور منفرد طرز اظہار کا داعی ہے تو کیا اس کے قاری کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بھی اپنے آپ کو اس سطح پر لانے کے لیے اپنی کایا کلپ کی سعی کرے۔ اگر ہم لکھنے والے سے حد پہنچانے کی توقع کرتے ہیں تو کیا لکھنے والا ہم سے یہ توقع کرنے میں حق بجانب نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس کی سطح پر لانے کے لیے اپنے صبر اور شوق میں اضافہ کریں۔ اپنے مطالعے کے دائرے کو وسعت دیں۔ اپنے لسانی مرکزے کو وسیع کریں اور اپنے شعور کو مہمیز ـــــ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ مسیح آہوجہ کا فکشن ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اسے حرز جاں بنائے بغیر اور اس کی فکر کی کنہ تک پہنچے بغیر ہم اس کی تہہ کو نہیں پا سکتے۔

"بھارتیں نکار خانے کی" میں کل چودہ بھارتیں یا کتھائیں ہیں۔ کتھائیں عام طور پر علامتی ہوتی ہیں مگر مسیح آہوجہ کی کتھائیں تجریدی اور ابہامی ہیں۔ یہ باطنی پیکار اور لسانی جدل کو اس کے الوہی روپ میں منتقل کرنے اور اظہاری کفایت کو پوری قوت سے بروئے کار لانے سے ظہور میں آئی ہیں۔ اس لیے ان میں ایک اسرار بھری حیرانی ہے اور ایک خود کلامی میں جادو بیانی ہوتی مانوس اجنبیت۔ مسیح آہوجہ کی یہ کتھائیں غیر مرئی اور دور ازکار نفسیاتی جبر کا استعارہ ہیں اور انھیں ڈی کوڈ کر کے ہی ہم اس ماورائیت پسند آمریت کی تہہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ اردو فکشن اور خاص طور پر افسانے کی ایک سو دس (اور بعض کے نزدیک ایک سو تیرہ) سالہ تاریخ میں اسلوب کے لحاظ سے شاید ایک بھی افسانہ

نگار سیج آہوجہ کے مماثل یا ان کا متبادل نہیں ہے۔ اس نے کسی سے سیکھا ہے نہ کوئی اس سے سیکھنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ سو فکشن کا یہ حوالہ منفرد اور بے مثل ہے۔ اس لیے اس کی طرف توجہ اور اسے ڈی کوڈ کرنے کی اشد ضرورت ہے مگر ہمارے سہل پسند نقادوں میں یہ سب کچھ کرے کون؟"

سیج آہوجہ کی ان چودہ بجھارتوں یا کتھاؤں کا بنیادی حوالہ جبر ہے جس کی جڑیں تاریخ اور فکری روایات کے پاتال میں گڑی ہیں۔ یہ کتھائیں نوع انسان کے مکروہ اور بدہیئت چہرے کو منعکس کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انسان کس درجہ شقی القلب اور کوتاہ بیں ہے اور وہ جبر کی کیسی کیسی صورتوں اور کیفیتوں کا خالق اور موجد ہے۔ چوں کہ سیج آہوجہ کو اس شقاوت کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس لیے اس کی کتھاؤں میں ایک سحر آگیں تلخی اور ایک پُر تاثیر رنج کی حلاوت ہے جو کتھائی تجریدی کیفیت کو ایک مانوس شباہت بھی دیتی ہے اور زمانوں میں موثر کرتے رہنے کی طاقت بھی۔ "ساری کہانیوں میں پھنسی ایک پہیلی" اس مجموعے کی نسبتاً پرانی کتھا ہے جو اس کی دہائی کے لاہور میں شکست ہوتی ہے اور محسوس طور پر الٹے قدموں چلتی ہوئی زمانوں پر محیط ہو جاتی ہے اور جبر کی دائمی اور حرکی قوت کو مہمیز کرتی ہے۔ اختر احسن نے کہیں لکھا ہے کہ "جبر کی رسی کے ایک سرے پر جابر کی انگلیاں ہیں اور دوسرے پر مظلوم کی گردن، جسے رسی کے ایک اشارے پر بھاگتا ہوئے اپنی ناطاقتی اور ذہنی غلامی کا اظہار کرنا ہوتا ہے"۔ اس تعلق میں شقاوت، رحم دلی، پچھتاوے اور برتری کا نفسیاتی تشنج ایک الگ ہی کیفیت پیدا کرتا ہے جسے خالد سعید نے بجا طور پر "طاقت کے جوہر تلے تعلقات" کا نام دیا ہے۔ سیج آہوجہ کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس پیچیدہ اور گنجلک پیٹرن کو ایک علامت بنا کر طاقت کے بین الاقوامی ڈسکورس کا حوالہ بنا دیا ہے۔ یہ بھی کچھ دیگر شعور، نفسیاتی تحرک علمی اور لسانی پیش قدمی کے اتصال سے وقوع پذیر ہوا ہے اور خوب ہوا ہے۔ یہ سب اور سیج کے اکثر افسانے ایک نئے پیرایے کے ذریعے وحشت اور غضب گردی کے طلسم کو توڑنے کے لیے ہیں۔ اس طرح سیج آہوجہ کے افسانوں کا مرکزی حوالہ نوع انسان کو ذاتی اور فکری غلامی سے آزاد کرتا ہے اور کہانیوں کے طلسم کو زنجیر بناتا ہے۔

اس کتاب کی کتھاؤں یا بجھارتوں کے چند عنوان دیکھیے: "بے حالت کڑی کمان"، "غلاظت فطرت جنگل کی جڑ"، "آگ کی برہم دیوانگی میں منتشر"، "بولنے کے زرتر بھاؤ"، "جنگل ورثن پیاس"۔ کیا آپ ان عنوانات سے کسی قسم کی تجزیے کو شناخت کر سکتے ہیں؟ نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سیج آہوجہ نے ان بجھارتوں کی کلید انہی عنوانات میں رکھی ہے۔ سو کسی کتھا کی مسافرت بلند آہنگ قرأت اور پلٹ پلٹ کر اپنے فہم کو مہمیز کر کے ہی ہم اس کلید کی سرسری نائیدہ کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور سماج اور کائنات کے کارگہ عمل میں اپنے وجود کو پہچان سکتے ہیں۔

◆◆◆

معروف شاعر، ادیب اور تنقید نگار غلام حسین ساجد کی نئی کتاب

باغ وراغ (تنقیدی مضامین)

شائع ہو گئی ہے .... قیمت: -/600 روپے

ملنے کا پتہ: کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور (0333-4377794)

کلیاتِ اقبال حسین

پروفیسر قیصر نجفی

اردو کے مراکز سے دور رہتے اور ادبی دھارے میں شامل نہ ہونے کے باوجود ادبی لحاظ سے زندہ قرار پایا۔ اقبال حسین کا وہ اعزاز ہے جو خال خال قلم کاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ آج اس بہترین شاعر کی کلیات کا مسودہ ہمارے پیشِ نظر ہے جس میں اخباری قطعات کے ایک مجموعے کے علاوہ پانچ شعری مجموعے شامل ہیں۔ ہر چند ان مجموعوں کا معتد بہ حصہ غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے لیکن اکا دکا نظم بھی کہیں نہ کہیں دیکھنے کو ملتی ہے —— ہمارے نزدیک غزل کہنا کسی شاعر کے شاعر ہونے کی سند ہے۔ اس تناظر میں حسین ایک مستند شاعر ہیں۔ انھیں غزل کا شعور بھی حاصل ہے اور غزل کہنے کا فن بھی آتا ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ زبان اردو کے بعض دیگر اصنافِ سخن کی طرح اردو غزل بھی ایک مستعار صنف ہے جو ہیئت اور فنی لوازمات کے تناظر میں فارسی غزل کا عکس جانی ہے۔ تاہم امتدادِ زمانہ کے باعث یہ نقش بتقلیں طاقِ نسیاں نہیں بنا بلکہ میر و غالب ایسے استادانِ غزل گویانِ ہند کی مساعی جمیلہ کی بدولت نقشِ دوام کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ حسین نے غزل میں میر تقی میر سے جذبات نگاری اور مرزا غالب سے جدت طرازی کا فن سیکھا ہے۔ یہ بات بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ جذبات و احساسات کا وہ اظہار، جو موزونیِ طبع کی شہادت دیتا ہو، شاعری پر محمول ہوتا ہے —— اور اگر طبعِ موزوں کے محرکوں سے حریت، اپنائیت اور تہہ داری کا بھی گزر ہو تو شاعری غزل کے پیکر میں ڈھل جاتی ہے۔ اہلِ فن نے غزل کو ''سخن با زنان گفتن'' کہا ہے اور ایک معلیاتی زنگ سے خوفزدہ ہرن کی چیخ بھی قرار دیا ہے۔ بالفاظ دیگر غزل دو گونہ کیفیات کی مظہر ہے۔ ایک حسن و جمالیات، دوسرے احساسِ رنج والم —— حسین کی غزل بھی اساسی طور پر انھیں دو کیفیات سے عبارت ہے، اور یہی وہ کیفیات ہیں جن کی آغوش میں ان کے تمام تر عشقیہ جذبات کی تہذیب ہوتی ہے۔

اک ترے چہرے کی بدولت ہی ——— میرا ایمان ہے سخنوں پہ

ایسی تنہائی میں تو آن ملے ——— کیوں نہ جذبوں کو پھر زبان ملے

ان خوشی کے کہیں نہ آ جائیں ——— غم کی تاثیر اب دوا کی ہے

پھر کوئی درد جاگ اٹھے گا ——— پھر تجھے یاد کر کے سویا ہوں

آج احساس ہوا وقت بدلتا ہے حسین ——— اس کے غم آج لگے کتنے پرانے مجھ کو

ہر چند حسینؔ کی غزل روایت سے جڑی ہے لیکن اسلوبیاتی، مواداتی، موضوعاتی، ہر سطح پر انہوں نے اپنے رنگ و آہنگ کو بروئے کار لانے کی کارگر سعی کی ہے۔ ان کے یہاں توارد، اعادہ یا سرقہ کا کہیں گمان نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ایک ایسے تازہ کار اسلوب کا احساس ہوتا ہے، جس کی طرف ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اشارہ کیا ہے۔

''دراصل انسانی احساسات و جذبات کے بنیادی مسالے میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور عظیم کلاسیکی ادب میں بیشتر وہ عناصر مل جاتے ہیں جن پر بعد کا ادب کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے جدت طرازی دراصل انہی پابندیوں میں رہ کر کسی نئے زاویہ نظر کو برتنے کا نام ہے۔''

ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ حسینؔ کے یہاں تجربہ و مشاہدہ میں رنگارنگی اور فکر و خیال میں تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انسان، زندگی اور کائنات سے متعلق متنوع حقائق پیش کئے ہیں۔ ایسے حقائق جن سے زندہ احساس کا حامل کوئی بیدار مغز اور بالغ نظر فنکار صرف نظر نہیں کر سکتا۔ حسینؔ کا فنی اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے جو بات بھی کی ہے، بطرز نو کی ہے۔ بطرز نو سے یہاں مراد اپنا اسلوب بیاں ہے۔ حسینؔ کے منفرد انداز کا شاعر ہونے کی ان کا اسلوب بیان بھی چغلی کھاتا ہے اور اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو بعض اشعار میں وہ نئے نئے زاویہ ہائے فکر بھی سامنے لائے ہیں۔

ڈھال سلامت تھی اور جسم ہوا وہ لخت　　　مری صفوں سے ہی جب مجھ پہ وار ہوا

برسنے پہ ہی بہر طور کر اسے مائل　　　اٹھا کے پیاسی زمیں کو سحاب تک مت جا

تمہارا عشق وضاحت اگر مری نہ کرے　　　میں خلق کے لئے ابہام ہو کے رہ جاؤں
دل اور مجھ میں جو جنگ آج برپا ہے　　　دعا کرو کہ میں ناکام ہو کے رہ جاؤں

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سماج و معاشرہ کا ہر وہ فرد جو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس نے بقول فکر دنیا سے یکسر ایک مختلف دنیا اپنے تصور میں آباد کی ہوئی ہے اور اگر فنکار ہے تو اپنی دنیا کا عکس جمیل فن پاروں میں دکھانے کی کاوش کرتا ہے۔ حسینؔ کے یہاں بھی اس نوع کے فنی اور شعوری سے تخلیقی انسلاک کی شہادتیں ملتی ہیں۔

دیکھنا چاہتا ہوں میں کچھ اور　　　آنکھ کچھ اور ہی دکھاتی ہے

میری آنکھوں سے دیکھی دنیا　　　میرے کانوں سے ہی سنا ہوا

نیا طریقہ حسینؔ اب کوئی سخن کا　　　کہ ہو چکا ہے یہ انداز اب پرانا بہت

ملیں دیوار بھی جو دیکھتا ہو　　　میں ایسے شخص کو کہتا ہوں بینا

ہر بالغ نظر تخلیق کار اپنے عصر کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس طور سے وہ اپنے عصر میں سانس لینے کا یقین دلاتا ہے۔ نتیجتاً اس کی ذات تخلیق میں در آتی ہے اور تخلیق کو ایک دستاویز کی اہمیت بخش دیتی ہے۔ محسن کی غزل سر بسر عصری غزل کی فنی گرفت اور تاثر سے مملو ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے دور کی زندگی کے تلخ حقائق کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کیا ہے بلکہ اپنے تئیں انہوں نے خود کو ایک دور کا موجد قرار دیا ہے۔

میرے اشعار میرا مرثیہ ہے — میری حالت پہ رو لیا جائے

حقوق اپنی رعایا کے ہوں تجھے معلوم — خدا اگر کبھی تجھ پر تجھے حکومت دے

مجھے بھلانے کے کر لو جتن قیامت تک — چلا ہوں کر کے میں ایک یادگار دور ایجاد

اس کو دی تھی رہائی اسی جگہ میں نے — جس جگہ سے گرفتار ہو رہا ہوں میں

تھک جاؤ گے آخر تم اصول نہیں ہو — اب تو لوگوں کی جیبوں میں سر رہتے ہیں

فی زمانہ اردو غزل کی شعری لسانی تہذیب کا ایک مضبوط ستون کربلا ہے۔ شاید ہی جدید لب و لہجہ کا کوئی شاعر ہو جس نے حق گوئی و بے باکی، ایثار و قربانی اور انقلاب آفرینی کے مضامین کے لئے واقعہ کربلا اور اس کے کرداروں کے استعاراتی استعمال سے استفادہ نہ کیا ہو۔ محسن کی شعری و فکری عبادت کی سجدہ گاہ بھی خاک کربلا ہے۔ ان کے ہاں کربلا کا استعارہ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ موجود ہے۔

ہم تو پہنچے حسینؑ سے ہو کر — تھا خدا کربلا سے پہلے بھی

کتنا آساں کیا ہے اصغرؑ نے — کام توحید کا، رسالت کا

موت کے اندھیروں سے زندگی بچا لے جائے — تو کیا جس طرف، ہر شخص کو خدا لے جائے

ہے کامیاب معرکہ اس بات کی دلیل — فوج خدا ہمیشہ بہتر ہوا کرے

مؤخر الذکر شعری صداقت کی تائید تحریک آزادی ہند کے ایک واقعہ نے کر دی ہے۔ موہن داس کرم چند گاندھی اس تحریک کے صف اول کے رہنما تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے آدرشوں کی تکمیل کے لئے بہتر (72) نفوس پر مشتمل ایک لشکر کی تشکیل کا اعلان کیا۔ جب لوگوں نے لشکر میں شامل بہتر (72) نفوس کی تعداد پر سوال اٹھایا تو گاندھی جی نے جواب دیا ''حق پرست فوج کی تعداد بہتر نفوس پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔'' گاندھی جی (ایک غیر مسلم) نے حضرت حسینؑ کو جس طرح کا خراج عقیدت پیش کیا اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

حسینؔ نے اپنے ایک تعارفی نوٹ میں فیضؔ اور فیضیؔ سے متاثر ہونے کا اقرار کیا ہے مگر ہمارے خیال میں وہ متاثر ہیں مرزا غالبؔ کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالخصوص ان کے یہاں تجرید کی فکری روش اسی نہج پر ہے جسے غالبؔ نے استوار کیا ہے۔

اب اور کتنا ہے ترغیب و خوف کا عرصہ معاملاتِ حیات و ممات اب تک ہیں

میں نے آسان زندگی کی ہے تو بھی مشکل سے استفادہ کر

برائے زہد و عبادت ضرور ہونا وقف مگر نہ اتنا کہ بیزار ہو کے رہ جائے

مرزا غالب سے فکری ہم آہنگی کے باوصف حسینؔ نے اپنا لہجہ تراشا ہے۔ غزل میں اپنا لہجہ تراشنا ایک بڑا وصف ہے۔ جو بہت ہی معدودے چند شعراء کے حصے میں آتا ہے۔ امر واقعی یہ ہے کہ ہر شاعر اپنا لہجہ رکھتا ہے لیکن وہ لہجہ جو شاعر کی شناخت بن جائے اور اسے معاصرین میں ممتاز و ممیز کر دے، اپنا لہجہ قرار پاتا ہے۔ مندرجہ ذیل قبیل کے اشعار حسینؔ کے لہجے سے متعارف کراتے ہیں۔

کسی گماں میں نہ رہ زاویہ بدل کر دیکھ یہ خد و خال بھی آئینہ بدل کر دیکھ

فلک کو برتری کے خواب دیکھنے کے لئے مری زمین سے الحاق کی ضرورت ہے

جی رہے ہیں کچھ اس طرح سے لوگ جیسے احسان ہے خدا پر جو

بس ایک سانس کی حاصل مجھے سہولت ہے وہ ایک سانس بمشکل لیا گیا ہے بہت

آخر میں ایک عجب شعر — جن لوگوں نے اقبال حسین کو اساتی طور پر دیکھا ہے وہی اس شعر کی گہرائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں:

حریف آپ اسے تخفیف سے بچا لیجے کہ پیچھے سے بدن کا شمار آدھا تھا

◆◆◆

معروف ادیب اور مزاح نگار پروفیسر نور کمال شاہ کی طنز و مزاح کی کتاب

نمک زادے

شائع ہو گئی ہے .... قیمت-/400 روپے

ملنے کا پتہ: تخلیق مطبوعات، الحمد مینشن، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور (03004893100)

جوشؔ۔ جہانِ فکر و دانش

……2……

مسلم شمیم

حضرت جوشؔ نے ''خود کشائی'' کے باب میں، جو چند صفحات پر محیط ہے، اپنے جہانِ فکر و دانش کی تمام جہات کا انتہائی اختصار کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ ان کے جہانِ فکر و دانش میں انسان دوستی، آفاقیت اور سیکولرزم کے نظریات کی بھرپور عمل داری کرتی نظر آتی ہے۔ اس ضمن میں مذکورہ باب 'خود کشائی' سے ایک اقتباس لائقِ توجہ ہے:

''آج تو انسان اس قدر آفات میں گھرا ہوا ہے کہ دل چٹکیوں میں مل کرتا ہے۔ چھوٹے کنبے والے کے مصائب بھی چھوٹے ہوتے ہیں اور کنبہ جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے مصائب میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور مجھ نامراد کا کنبہ تو ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ غور فرمایئے کہ میرے مصائب کیا ہوں گے جب کسی مفلس کے گھر کے چولھے میں آگ روشن نہیں ہوتی، میرے سینے میں دھواں اٹھنے لگتا ہے، جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں، میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں، اور جب کسی گھر کے گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے، میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں، اور جب کسی گھر سے بھی جنازہ اٹھتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے گھر سے نکل رہا ہے۔ ہر چند امریکا ظالم ہے اور ویت نام کے مظلوم شہیدوں پر ہی نہیں امریکا کے ظالم مقتولوں پر بھی ماتم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اللہ کرے کہ کسی بدبخت کے سینے میں ابوالانسان کا دل دھڑکنے لگے!

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

''یادوں کی برات'' میں باب در باب انسان دوستی کی کہکشاں کے جلوے آنکھوں کو خیرہ کیے دیتے ہیں اور آفاقیت اور سیکولرزم کے مہر و ماہ راسخ العقیدگی اور بنیاد پرستی کی ظلمت کی بیخ کنی کرتے نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک جوشؔ کی ہمہ جہت شخصیت اور جہانِ فکر و دانش کا دائرہ اور کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے زندگی کی پہنائیوں اور اس کی بھول بھلیوں کا کائنات کی بوقلمونی کے تناظر میں مشاہدہ کر کے فانیؔ بدایونی کی طرح یہ کہہ کر صبر و قناعت کی چادر نہیں اوڑھی کہ

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

بلکہ تجسس و تفکر کے مراحل و منازل سے گزر کر انسانی معاشرے کے زمینی حقائق سے جڑے رہے اور مرزا غالبؔ کی فکری میراث کے وارث ہونے کے منصب پر فائز رہے۔ انھوں نے حیات و کائنات کے حوالے سے Confusion کو قطعی قبول نہیں کیا یعنی

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

وہ یا رہا عرصۂ تشکیک سے نکل کر عالمِ یقین میں نظر آتے رہے ہیں۔ ''یادوں کی برات'' میں انسان اور انسانی معاشرے کے حوالے سے مصائب و آلام کی تصویر کشی اور ظلم و استحصال پر مبنی نظامِ معیشت اور نظامِ حکومت پر سنگ باری کرتے ہوئے وہ قنوطیت کی اندھیری گلیوں میں زیادہ دیر نہیں رہے اور رجائیت کی شاہراہوں پر انسان دوستی، آفاقیت، امن، آزادی، حریت پسندی اور سیکولرزم کی مشعلیں لیے گامزن نظر آئے۔ درج ذیل اقتباس میں جہاں ان کی رجائیت کے مہر و ماہ کی ضیا پاشیاں نظر آتی ہیں، وہاں ان کی بصیرت و بصارت کی لامتناہی سرحدوں اور وسعتوں کا بھی اظہار ہوتا ہے:

> ''ہر چند مستقبلِ انسانی بے حد روشن ہے اور مجھ کو یقینِ کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی، یہ درندہ آدمی انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر رہے گا، نہ عدالتیں رہیں گی، نہ فوجیں، نہ پولیس، نہ اسلحہ سازی کے کارخانے، پیری مستقل جوانی بن جائے گی اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا، زندگی کی پیشانی پر حیاتِ ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا، جس وقت قمر ہمارے پاؤں چومیں گے، ہم مشتری میں اگر ناشتہ کریں گے تو زہرا میں رات کا کھانا کھائیں گے اور قوائے کائنات خدمت گاروں کے مانند ہمارے برآمدوں میں کھڑے رہا کریں گے، لیکن اس میں لگیں گے ابھی لاکھوں سال جبکہ ہماری ہڈیاں تک باقی نہیں رہیں گی۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں سماجی زندگی کے ارتقائی مراحل اور مستقبل کا جس رجائیت اور تیقن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کے باوصف گزشتہ چند صدیوں میں انسانوں کے کارناموں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جوشؔ کی بصیرت اور وسعتِ فکر و نظر کا اعتراف نہ کرنا دیانت شعور و دانش پر سوالیہ نشان کے مصداق ہوگا۔ خصوصیت کے ساتھ بیسویں صدی میں جو سائنسی تجربے ظہور پذیر ہوئے ہیں اور اکیسویں صدی میں انسان جس راہِ ارتقا پر گامزن ہے، اس کے نتائج اور حاصلات ہمارے سامنے ہیں۔ کرۂ ارض واقعتاً گلوبل ویلج بن چکا ہے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی کے عشرے صدیوں پر سبقت رکھتے ہیں۔ خلائی تسخیر کے باب میں جو کچھ انسان نے اب تک حاصل کیا ہے، اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو جوشؔ کی پیشین گوئیاں شاعرانہ تخیلات نہیں ٹھہرتیں اور نہ سائنس فکشن کے زمرے میں آتی ہیں۔ جوشؔ کی زیرِ حوالہ تحریر میں عظمتِ بشر پر جوشؔ کے یقینِ کامل کا اظہار ملتا ہے۔ ''عروجِ آدمِ خاکی'' کا اسے نثری رزمیہ (Epic) کہنا چاہیے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے مختلف شعبوں میں پیش رفت کا سفر طے کیا ہے جس میں ''کلوننگ'' بھی شاملِ فہرست ہے۔ جوشؔ کا بیان حیاتِ انسانی کے باب میں قطعی مبالغہ آمیز نہیں ٹھہرتا۔ مذکورہ اقتباس کے حوالے سے مزید کچھ لکھنے سے پہلے میں یہاں خلیق ابراہیم خلیق کا ایک جملہ پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک محلِ نظر ہے: ''جوشؔ کے تخیل میں جو بلندی ہے، وہی ان کے علم میں وسعت اور فکر میں گہرائی ہوتی تو وہ غالبؔ اور اقبالؔ کے ہم پلہ ہوتے، تاہم وہ بڑے ہی نہیں، بہت بڑے شاعر ہیں۔'' جوشؔ کے ''علم میں وسعت اور فکر میں گہرائی'' کی کم مائیگی اور محدودات کی بابت خلیق ابراہیم خلیق کی رائے جوشؔ فہمی اور جوشؔ شناسی کے باب میں ان کی نارسائی کی غماز ہے۔ جوشؔ بلاشبہ ایک نابغۂ روزگار تھے اور ان کا منبعِ علم اور گہرائیِ فکر نہ غالبؔ سے کم تر تھا اور نہ اقبالؔ سے۔

''یادوں کی برات'' میں اپنی پہلی تصنیف ''روحِ ادب'' پر، جو 1921ء، 1922ء میں شائع ہوئی تھی، مختلف حلقہ ہائے فکر کی جانب

سے قبیت وحتمی رد عمل کے اظہار کا ذکر کرتے ہوئے درج ذیل اقتباس میں جوشؔ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی "فکر کی گیرائی" اور "علم کی وسعت" کی سرحدوں کے نشانات کا پتا دیتا ہے:

"اسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرت اقبالؔ نے بھی ایک طویل خط لکھ کر میری شاعری کی مدح سرائی فرمائی اور دل کھول کر داد دی تھی اور پنجاب یونیورسٹی سے 'روحِ ادب' کے تین سو نسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ہر چند میرے ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ انھیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے، لیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہ بھی پرانی اس لیے مجھ کو چاہیے کہ میں حافظ و خیام اور ٹیگور کی پیروی ترک کر کے فطری شاعری کی طرف آ جاؤں اور حافظ و خیام کی طرح تھپک تھپک کر سلانے کے عوض انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں لیکن اس وقت میری تخیل کا دھارا بہت زور و شور سے تصوف کی پُر اسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑ بہہ رہا تھا۔ ان کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہو سکا لیکن شنیدہ اثرے دارد کے طور پر ان کی نصیحت غیر محسوس طریقے سے مجھ پر اثر کرتی رہی اور جب چند ماہ و سال کے بعد میری طبیعت 'روحِ ادب' کے مزاج سے مختلف ہونے لگی، تصوف سے روگردانی کر کے سیاسی شاعری کرنے لگا اور سیاست سے مڑ کر جس وقت میری شاعری تجسس اور تفلسف کی راہ پر گامزن ہو گئی تو میرے ناصح حضرت اقبالؔ کی شاعری اقوال و روایات اور عقائد کی طرف چل پڑی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جس تصوف اور مابعد الطبعیات سے انھوں نے مجھے روکا تھا، اس پر پکی کا تیل لگا کر وہ خود اسی طرف چلے گئے اور عقل کو بولہب اور عشق کو مصطفیٰ کا خطاب دینے لگے۔"

مذکورہ اقتباس کے مندرجات حضرت جوشؔ کے افکار و نظریات کے سفرِ ارتقا کی نشان دہی کرتے ہیں۔ 'شاعرِ انقلاب' اور 'شاعرِ حریت' کے القابات پر ان کے استحقاق کا معترف زمانہ کل بھی اور آج بھی ہے۔ ان کی شاعری سے قطع نظر ان کی بصیرت و بصارت کی سرحدوں کا تعین کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ان کے تجسس و تفلسف کا سفر طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی، ہر دو جہان کا سفر رہا ہے۔ ان کے معتقدات اور تخیلات و نظریات جن کا اظہار مذکورہ اقتباسات میں ہوا ہے، ان کی روشنی میں یہ الگ حقائق ہیں کہ کرۂ ارض پر معلوم عہد تاریخ میں کبھی ایک دین اور مذہب کی عمل داری نہیں رہی ہے، بلکہ کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں مختلف ادیان و مذاہب کے تحت انسانی معاشرہ سفرِ ارتقا پر گامزن رہا۔ بقول علامہ نیاز فتح پوری جب سے دھرتی پر انسان کا وجود پایا گیا ہے، مذہب انسان کا ہم قدم اور ہم سفر رہا ہے۔ ہر مذہب کا ماننے والا اپنے مذہب کی سچائی کا صدقِ دل سے قائل رہا ہے اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دیگر مذاہب اور ادیان اس کے نزدیک باطل ٹھہرتے ہیں۔ چھوٹے بڑے سیکڑوں بلکہ ہزاروں مذاہب و عقائد کے حق و باطل کے جلو سے یک وقت انسانی تاریخ میں صرف پائے نہیں گئے ہیں بلکہ بے شمار جنگ و جدال کے باعث بنتے رہے ہیں۔ تاریخ کا یہ چہرہ حضرت جوشؔ کے مطالعہ و مشاہدہ میں رہا ہے۔ سو ان کا بین المذاہب پُرامن بقائے باہمی کا نظریہ کتنی معنویت کا حامل ہے اس کا ادراک کرنا مشکل نہیں، اور ان کے سیکولر نظریۂ حیات کی تفہیم بھی کسی کے لیے مسئلہ نہیں بننا چاہیے۔ انھوں نے "یادوں کی برات" میں اپنے چند قابلِ ذکر احباب میں سردار روپ سنگھ، کنور مہندر سنگھ بیدی،

پنڈت جواہر لال نہرو اور سروجنی نائیڈو کے خاکوں میں ان کے مذہبی عقائد کو جس فراخ دلانہ انداز میں بیان کیا ہے، وہ ان کے سیکولر نظریۂ حیات کے روشن ترین شواہد ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بے محل نہیں ہے کہ سیکولرزم کو دہریت کا ہم معنی قرار دینے والے افراد و معاشرے کو گم راہ کرنے کی خدمت پر مامور ہیں۔ کیونکہ سیکولرزم مذہبی امور اور معاملات میں ریاست کی غیر جانب داری اور ریاست کے شہریوں کے حقوق کی یکساں پاس داری سے عبارت ہے۔ اس ضمن میں سیکولرزم کی مختصر ترین تعریف بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے یہ الفاظ ہیں جو 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کے اُس خطاب سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے بحیثیت سربراہِ مملکت اور مذکورہ دستور ساز اسمبلی کے منتخب صدر کی حیثیت سے کیا تھا:

''Religion has nothing to do with the business of the state.''

قائد کے تصورِ پاکستان کو جو مذکورہ خطاب میں غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا گیا تھا اور پاکستان کا جو ایک جدید ترقی پسند سیکولر جمہوری ریاست کا خاکہ پیش کیا گیا تھا، اس کی نفی بانیِ پاکستان کی وفات کے چند ماہ بعد قراردادِ مقاصد کے ذریعے کر دی گئی اور یوں پاکستان سیکولر جمہوری نظام سے محروم ہو کر آغاز سے جرنیلوں بلکہ امیوں سے دوچار ہوتا آیا ہے۔ بالفاظِ دیگر رجعتی طاقتوں خصوصی طور پر مذہبی جماعتوں نے جنھوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی، پاکستان کو ہائی جیک کر لیا نتیجے کے طور پر مسلکی ضد اور مذہبی انتہاپسندی اور عقیدہ پرستی کی راہ پر گامزن ہو کر ایک جدید سیکولر جمہوری ریاست تھیوکریسی کے ظلمات میں گم ہوتی چلی گئی۔ قراردادِ مقاصد کی عملی صورت گری 1956ء کے دستور میں ملک کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیے جانے پر سامنے آئی اور 1973ء کے آئین میں اسلام کو پاکستان کا ریاستی مذہب قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح جمہوری اقدار کے فروغ کے بجائے مذہبی فسطائیت کے لیے راستے ہموار ہوتے۔ قائداعظم ایک سیکولر مدبر تھے اور انھوں نے واضح طور پر 11 اپریل 1946ء کو دہلی میں منعقدہ مسلم لیگ کے کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''ہم کس چیز کے لیے لڑ رہے ہیں؟ ہمارا مقصد تھیوکریسی نہیں ہے اور نہ ہم تھیوکریٹک اسٹیٹ چاہتے ہیں۔'' یہ بات یہاں بڑی معنویت کی حامل ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس جس میں قائداعظم محمد علی جناح بھی موجود تھے، تلاوتِ قرآن کے بغیر شروع ہوا تھا اور ان کا تاریخی خطاب مورخہ 11 اگست 1947ء کے اجلاس میں ہوا تھا۔ 2 نومبر 1941ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا: ''آپ ہندوؤں اور سکھوں کو بتا دیں کہ یہ بات سراسر غلط ہے کہ پاکستان مذہبی ریاست ہوگی۔'' انھوں نے قیامِ پاکستان سے تیس برس پہلے تحریکِ خلافت میں شرکت سے انکار اس لیے کیا تھا کہ وہ تحریکِ خلافت کو سیاسی کی بجائے مذہبی تحریک سمجھتے تھے۔ ان جملہ ہائے معترضہ کے بیان کی غرض و غایت یہ ہے کہ پاکستان میں وقت کے ساتھ ایک ایسا معاشرہ ظہور پذیر ہوا جہاں روشن خیالی اور خرد افروزی کی جگہ راسخ العقیدگی کا فروغ ہوا اور ظلمت پرستی کی عمل داری بڑھتی گئی اور 1980ء کی دہائی سے اپنی بلندیوں کو چھونے لگی۔ بالفاظِ دیگر ایک ایسا معاشرہ جہاں منقولات سے انحراف کفر و الحاد کا ارتکاب کرنے کے مترادف ٹھہرا اور معقولات پر مبنی نظریات اور خیالات کو یاد دہریت کے زمرے میں داخل کیے گئے ایسے معاشرے میں حضرت جوش کے لیے کیا منصب و مقام متعین ہو سکتا تھا؟ ان کی پوری دنیائے فکر و دانش اس معاشرے

کے مخصوص Mind-Set، توہمات، آلودہ فضاؤں سے متصادم تھی۔ اور یہ معاشرہ جوش کو قبول کرنے کی بنیادی اہلیت سے بے بہرہ تھا۔ جوش کی روشن ضمیری سے ابھرنے والے اجالوں کی یہاں کی تاریک وادیاں کیونکر متحمل ہو سکتی تھیں؟ پاکستان کے چھ عشروں کے المیوں اور حادثوں کے ثمرات کی زد میں جہاں جمہوری اقدار و روایات رہی ہیں، وہاں بانیٔ پاکستان کے تصور کی قطع و برید بھی کی گئی ہے اور ان کے مقبرے کے سایۂ عاطفت میں بڑے بڑے اجتماعات اور اجلاس میں بیانگ دہل فرمودات قائداعظم کی من مانی تعبیر کی جاتی ہے۔

میری یادداشت ہے کہ جوش نے ترک وطن کر کے اپنے لیے المیوں کے تانے بانے اور پھندے ہی اپنے قلم سے خود کو مرحوم لکھنے کی روش اپنائی۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، پاکستان کی سرزمین نے انھیں قبول نہیں کیا اور وہ جب تک یہاں رہے، ان کی حیثیت اجنبی (Alien) کی رہی۔ بین الاقوامی شخصیت جواہر لال نہرو ان کی ناز برداری کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور یہاں جوش کو جانے کیسے کیسے درباروں کی حاضری کے لیے عرض گزار ہونا پڑتا تھا۔ "یادوں کی برات" کا وہ باب جس کا سرنامہ 'پاکستانی شہریت' ہے، اس کا ذیلی عنوان 'بادشاہزادوں اور حکام کا چوتھی طرف اور پھر پہاڑ اس کے آسیبوں کے نرغے میں' یہ الفاظ میری بیان کردہ روداد کی تفسیر ہیں۔ "یادوں کی برات" کے اگلے باب کا عنوان ہے 'میری موجودہ زندگی'۔ اس کا ابتدائی پیراگراف مذکورہ المیے کا اظہاریہ ہے:

"اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں۔ جان کی امان پاؤں تو زبان چلاؤں۔ اللہ اللہ! یہ آب و ہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بیزاری۔ یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں، یہ نئے ماحول کی آریاں۔ یہ مولاناؤں سے دوری، یہ غربت کی مجبوری۔ سینے میں گھٹی گھٹی سانسیں، یہ حالات کی اکھڑی سانسیں۔ یہ دل پہ چلتے بان، یہ سر پہ کڑکتی کمان۔ یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں، یہ حکومت کی سرگرانیاں۔ یہ دوستوں کا فقدان، یہ معاشی بحران۔ اور یہ چہرۂ زندگی پر گرد و غبار کا غازہ اور روش پر عزت نفس کا جنازہ۔"

حضرت جوش پر جو بیت چکی، وہ مذکورہ اقتباس میں کہہ دی گئی ہے اور "عزت نفس کا جنازہ" کو اظہار المیہ کا سرنامہ کہنا چاہیے۔ در اصل یہ سب کچھ ان کے لیے اپنے ایک تاریخی غمگین غلط فیصلے کرنے کا خمیازہ بھگتنے کے مترادف تھا۔ وہ سیکولر ہندوستان کو چھوڑ کر ایک بنیاد پرست معاشرے میں آ گئے جہاں اس فکر اور نظریے یعنی روشن خیالی، رواداری، خرد افروزی اور سیکولرازم جیسے نظریات کے پاس داروں کے ساتھ جو سلوک ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس سلوک کے سزاوار فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور تمام ترقی پسند اہل فکر و دانش ٹھہرے۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور اس کے ارباب حل و عقد نے پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ ایک عجیب روزگار فریضہ بھی اپنے فرائض منصبی کی فہرست میں شامل کر لیا ہے، یعنی "نظریاتی سرحدوں" کا تحفظ۔ اس کارِ خیر کی انجام دہی میں قائداعظم کی پوری سیکولر فکر اور سیکولر روایات کی بیخ کنی کی گئی۔ سپریم کورٹ میں بیان دیتے ہوئے شہید ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا "یحییٰ خان کے وزیر اطلاعات جنرل شیر علی خان کی ہدایت پر قائداعظم کی اس تقریر کو جلا دینے یا ریکارڈ سے غائب کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔" یہ وہ خطاب تھا جو انھوں نے 11 اگست 1947ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کیا تھا جس کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے جو ایک سیکولر ریاست کا مکمل خاکہ اور منشور تھا۔

اپنی "یادوں کی برات" یعنی اپنی خودنوشت میں انھوں نے اپنے شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی تمام تہ داریاں صفحۂ قرطاس پر

بکھیر دی ہیں اور اپنی ذہنی اور فکری زندگی کے تمام گوشے پوری دیانت داری اور جرأت اظہار کے ساتھ اجاگر کر کے اپنے قارئین کو دائرہ حیرت میں اسیر کر لیا ہے کیونکہ شاید ہی کوئی دوسری شخصیت جس کا تعلق مشرق سے ہو، اس نے اس نوعیت کی غیر منافقانہ اپنی شخصیت نگاری اور پیکر تراشی کی ہو۔ سو میرے نزدیک ''یادوں کی برات'' ایک نابغہ روزگار شخصیت کی فقید المثال تصنیف ہے۔

زیر نظر کتاب کے فلیپ کے اقتباسی کلمات بڑی معنویت کے حامل ہیں۔ ''یادوں کی برات'' جوش ملیح آبادی کے ستر سال کے تجربوں اور مشاہدوں کی برات ہے۔ اس برات میں فکر و الفاظ کی شہنائیاں بجتی ہیں، جنون و حکمت کے زمزمے گونجتے ہیں، رامش و رنگ کی محفلیں سجتی ہیں، لالہ رخوں کے لب و عارض کی دلکش حکایتیں بیان ہوتی ہیں، یاران مے کدہ کی محفلوں اور بے مہریوں کے قصے سنائے جاتے ہیں اور ارباب ثروت و سیاست کی تنگ حوصلگیوں کے تذکرے بکھرتے ہیں۔ شاعر امروز و فردا کی یادوں کا یہ قافلہ کبھی کہکشاں سے ہو کر گزرتا ہے اور کبھی ظلمات سے لیکن مسرت کی خیرہ سامانیوں سے ان کے ایمان و یقین میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ طوفان حوادث کی تیرگیوں سے ان کے پائے صداقت ڈگمگاتے ہیں۔

''یادوں کی برات'' ایک عظیم اور نابغہ روزگار شاعر کی آپ بیتی اور ایک تاریخ ساز عہد کی تہذیبی و تمدنی زندگی کا دھنک رنگ مرقع ہے۔ اس مرقع میں ہندوستان کے اہم ترین مرکز تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں نظر آئیں گی اور روایات و اقدار کی پاس داری کے ساتھ جدید و قدیم افکار و نظریات کی کشاکش و تصادم کے مظاہر بھی سامنے آئیں گے۔ ''یادوں کی برات'' کے ابواب کے مطالعے کے دوران میں سیاسی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور ان واقعات کے محرکات اور شخصیات سے شناسائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ آزادی ہند کی ایک انوکھی کہانی بھی ہے جس میں خود حضرت جوش مختلف حوالوں سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ آزادی ہند کی تحریک کے متعدد سرخیلوں خصوصیت کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور سروجنی نائیڈو سے ان کے بے تکلفانہ مراسم و روابط کی دلچسپ حکایات ''یادوں کی برات'' کے روشن ابواب ہیں۔

حضرت جوش ترقی پسند تحریک کے ایسے سرپرستوں میں سے تھے جن کی خلاقیت اس تحریک اور اس کے آدرش کے لیے قیمتی ورثہ ثابت ہوئی۔ ترقی پسند قبیلے کے تمام اہم و غیر اہم تخلیق کار اہل دانش ان کے مریدان باصفا کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ خود کو ترقی پسند ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کا پرچارک بھی کہتے تھے جس کا اظہار جگہ جگہ ''یادوں کی برات'' میں کیا گیا ہے۔ ان کا طبقاتی تعلق جاگیردارانہ پس منظر کا حامل ہے مگر اپنی نظریاتی اور فکری زندگی کے حوالے سے انھوں نے دیگر ترقی پسند عمائدین کی طرح خود کو De-Class کر لیا تھا اور مظلوم اور استحصال زدہ طبقات کے دکھ درد کو اپنے فکر و فن کا منبع بنا لیا تھا۔ وہ انسانیت دوستی پر مبنی آفاقیت کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ وہ ان کی حسیت اور تخلیقیت کا سرچشمہ تھی۔ ''یادوں کی برات'' میں ایک نابغہ روزگار خلاق شاعر نے اپنے ظاہر و باطن کی ایسی تصویر کشی کی ہے جو اردو کے خودنوشت سرمایے میں کمیاب نہیں بلکہ گوہر نایاب کہلانے کا استحقاق رکھتی ہے۔ ''یادوں کی برات'' میں ایک عظیم مفکر اور خلاق شاعر سے قاری کی ملاقات ہوتی ہے جس کی سرشاری و سرمستی اس کو عرصہ دراز تک بے ساختہ جوش میں تبسم و شکوہ پذیر رکھتا ہے۔

(ختم شد)

◆◆◆

فوقیہ مشتاق کی شعری کائنات

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

مدیر ماہنامہ "تخلیق" سونان اظہر جاوید کی کاوشوں سے یہ ادبی مجلہ پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں جہاں اردو اپنی بہار دکھا رہی ہے وہاں صاحبانِ ذوق تک رسائی کر چکا ہے۔ مشقِ سخن کرنے والے نوجوانوں کی بھرپور حوصلہ افزائی نے "تخلیق" کو تخلیقی اذہان کا ترجمان بنا دیا ہے۔ کئی عالمی شہرت یافتہ مصنفین، محققین، مفسرین اور ناقدین "تخلیق" کا مطالعہ کرتے ہوئے فیس بک اور واٹس ایپ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ "تخلیق" میں شائع ہونے والی نگارشات کی کشش کا کمال ہے کہ خواتین بھی "تخلیق" کا حصہ بننے کے لیے اپنی سعادت سمجھتی ہیں۔ دیارِ غیر میں مقیم اہلِ تخلیق کو "تخلیق" نے ہمیشہ نہ صرف خوش آمدید کہا ہے بلکہ ان کے گوشے اور خاص نمبر بھی شائع کیے ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ بیرون ممالک میں مقیم اہلِ قلم پاکستان کے سفیر کہلاتے ہیں۔ ان کا تخلیقی ذوق جنوں اور جوشِ جنوں اردو کے فروغ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیرونِ ملک سے آنے والے تخلیقی ہوا کے جھونکے پاکستانی ادب کو بھی نکھارنے کا باعث بنتے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں منعقدہ محافلِ مشاعرہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو اور پنجابی شاعری کی نشوونما کا عمل جاری ہے۔ اردو نسائی ادب نے بھی کئی ممالک میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ بیرون ممالک میں مقیم شاعرات کا کلام کئی رسائل و جرائد میں زیبِ قرطاس نظر آنے لگا ہے۔ فوقیہ مشتاق کہانیوں، افسانوں، مضامین اور شاعری کے حوالے سے شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ فوقیہ مشتاق نے اپنی مخفی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی شخصیت اور فکر و فن پر اہلِ وطن کو فخر ہے۔ فوقیہ مشتاق 20 جنوری 1968ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد گرامی سید مشتاق ترمذی بھی بہت اچھے شاعر تھے۔ فوقیہ مشتاق کو ادب گھٹی میں ملا ہے۔ فوقیہ مشتاق کے والدین کا تعلق غازی پور اور لکھنؤ سے تھا اس لیے وہاں کے ادبی اثرات ان کی شخصیت پر مرتسم ہوئے۔ سید مشتاق حسین ترمذی شعر و سخن میں کمال رکھتے تھے۔ کراچی کی ادبی تقریبات میں شریک ہوتے رہے۔ وہ پریس کلب کراچی میں ہونے والی علمی و ادبی تقریبات کا حصہ رہے۔ شہریار جلیس نے فون پر بتایا کہ سید مشتاق حسین ترمذی علمی و ادبی، صحافتی اور سماجی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ فوقیہ مشتاق کو زمانہ طالب علمی ہی سے نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ زندگی سمندر میں پھینکے ہوئے کنکر سے بننے والے دائرے کی طرح مختلف ہے۔ فوقیہ مشتاق نے ان دائروں کو جمع کر کے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا ہے۔ 1995ء میں ان کا کلام کراچی کے مقامی اخبارات کی زینت بنا۔

2010ء میں فوقیہ مشتاق افسانوں کی دنیا سے نکل کر شادی کے حقیقی رنگوں میں رنگی گئی۔ شادی کے بعد وہ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ امریکہ کی ریاست Rhode Island میں مقیم ہوئیں۔ امریکہ پہنچ کر انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ فوقیہ مشتاق کو سائنسی تحقیق اور ادبی جستجو نے ایک اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ یاد رہے کہ فوقیہ مشتاق نے کراچی یونی ورسٹی سے بائیو کیمسٹری (Neuropharmuncolge) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس لیے فوقیہ مشتاق کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوئی اور انھوں نے سبک رفتاری سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے بقائی میڈیکل یونی ورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے تک رسائی کر لی

۔ان کے تحریر کردہ ریسرچ آرٹیکل دنیا کے ممتاز ریسرچ جرنل میں چھپ رہے ہیں۔ پاکستان اور امریکہ کے سینکڑوں طلبا و طالبات ان کی تحقیق سے استفادہ کر رہے ہیں۔ فوقیہ مشتاق نے امریکہ سے Biotechnology میں بھی تعلیمی منازل طے کیں۔ یہ بات قابلِ فخر ہے کہ وہ آج کل Roger Williams University کے شعبہ کیمیا میں علم کے موتی بکھار رہی ہیں۔ ان کا شعور سائنسی تحقیق کے گرد گھومتا ہے جب کہ لاشعور شعروں کے محور میں گھرا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ سائنس اور ادب میں یکساں محوِ عمل ہیں۔ اردو کی مختلف اصنافِ سخن افسانے، کہانیاں، مضامین اور شاعری میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھا رہی ہیں۔ ڈاکٹر فوقیہ مشتاق اردو غزل اور نظم میں اپنی ایک منفرد جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکی ہیں۔ ماہنامہ ''تخلیق'' میں چھپنے والی فوقیہ مشتاق نے بہت سے قارئین کو اپنا مشتاق بنا لیا ہے۔ فوقیہ مشتاق غزل اور نظم ہر دو اصناف میں خوب لکھتی ہیں۔ ان کی نظموں میں عصرِ حاضر کے مسائل کا بڑی جزئیات نگاری کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ وہ بڑی حساس اور جرأت مند خاتون ہیں۔ خوف و خطر سے بالاتر ہو کر وہ گرد و نواح کے بدلاؤ اور دنیا بھر موت کے رقص سے گھروں میں چھپ کر بیٹھنے والوں سے کہہ رہی ہیں کہ ایسے ماحول میں وہ مزید کتنے دن جی سکیں گے۔ ایک نظم ''اے میرے پروردگارِ عالم'' کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

گھروں میں بیٹھے ہیں چھپ کے ہم سب / فضا تعاقب میں پھر رہی ہے / کہ سانس سینوں میں گھٹ رہی
ہے / فضاؤں میں زہر گھل چکا ہے / کہاں تلک ہم چھپیں گے ایسے / سو کتنے دن اور جئیں گے ایسے
نگار خانہ تباہ کیا ہے / ہر ایک چہرہ بگڑ گیا ہے / جگہ جگہ موت رقص میں ہے / کہ ہر طرف بھوک اگ رہی ہے

مذکورہ نظم کی چند سطریں پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فوقیہ مشتاق جس ماحول اور جس خوف کا ذکر کر رہی ہیں اس سے ہم سب نبرد آزما ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا دکھ اور کرب انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ فوقیہ مشتاق یہاں اجتماعی دکھ اور کرب کا ذکر کر رہی ہیں۔ جب کوئی شاعر انفرادیت کو چھوڑ کر اجتماعیت کی طرف آتا ہے تو اس کا کلام آفاقی حدود کو چھونے لگتا ہے۔ فوقیہ مشتاق کا کلام بھی آفاقی بنتا جا رہا ہے۔ وہ عالمِ انسانیت کی بات کر رہی ہیں اسی نظم کی اگلی سطروں میں وہ مزید لکھتی ہیں:

ہم اپنی دھن میں مگن تھے کتنے / غرور اور سرکشی میں حد سے گزر گئے تھے / گناہگاروں کی یہ سزا ہے
مگر تو غفار بھی ہے مالک / ہمیں بچا لے / ہمیں بچا لے / اے میرے پروردگارِ عالم

یہ دعائیہ کلمے فوقیہ مشتاق کا دینی تشخص بھی ظاہر کر رہے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ ملک میں ان کے سر پر مشرقی دوپٹہ ان کے مسلمان ہونے کی عکاسی کر رہا ہے۔ ان سطروں میں وہ اس سارے دکھ، کرب اور مشکلات کا ذمہ دار بھی خود حضرتِ انسان کو ٹھہراتی ہیں۔ فوقیہ مشتاق کا کہنا ہے کہ اس ساری صورتِ حال کے ہم خود ذمہ دار ہیں ہم نے غرور اور سرکشی کی ہے۔ عجز و انکساری میں انسانیت ہے جب کہ ہمارا تکبر ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ ہم نے اللہ پاک سے جس بغاوت کا اظہار کیا ہے اس کا نتیجہ ہم سب بھگت رہے ہیں۔ آخری سطروں میں دعائیہ لہجہ اپناتی ہیں جس میں وہ اپنے رب سے التجا کر رہی ہیں کہ ہمیں اس صورتِ حال سے بچا لے تو رحم کرنے والا ہے اور تو ہی ہر ایک چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ تیرے سوا کون ہے جو ہمیں اس مصیبت اور کرب کی کیفیات سے نکالے۔ ہمیں اس مصیبت سے اے پروردگار تو ہی نکال سکتا ہے۔ نظموں میں اکثر شعرا تجسیم نگاری کے استعمال سے غیر مرئی اشیا کو جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے نظم میں جب دلکشی اور رعنائی پیدا ہو جاتی ہے۔ فوقیہ مشتاق نے بھی اس حربے کو خوب برتا ہے۔ وہ ایک نظم ''Quarantine'' میں لکھتی ہیں:

کھڑکی کے اس پار وحشت کی تنہائیں / اپنی اندھی آنکھوں میں امید جگائے / یوں تکتی ہیں

جیسے وہ سب دیکھ رہی ہوں / کھڑکی کے اس پار / بصیرت آنکھیں موندے
لمحہ لمحہ حتمی آہٹ کے سامنے کو دیکھ رہی ہے۔

نظم کی ان سطور میں فوقیہ مشتاق صنعت تجسیم کا استعمال کر کے درخت کی اندھی شاخوں میں امید جاگے دیکھتی ہیں جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔ یہ وہ سطریں ہیں جو نظم کی خوبصورتی اور رعنائی و سلاست میں بے پناہ اضافہ کر رہی ہیں۔ تجسیم نگاری کا فن نہایت عمدگی سے اس نظم میں استعمال ہوا ہے۔ آخری سطر میں لفظ ''لمحہ لمحہ'' کی تکرار نے نظم میں عجب موسیقیت نے جنم لیا ہے۔ صنعت تکرار لفظی سے نظم میں صوتی آہنگ پیدا ہو جاتا ہے جو مصرعوں کو رواں کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ یہاں بھی فوقیہ مشتاق نے صنعت تکرار لفظی کا استعمال کر کے نظم کو بہت رواں کر لیا ہے۔ دیارِ غیر میں رہنے والے اقربا اپنوں سے دور روزگارِ معاش میں دن رات غلطاں رہتے ہیں۔ وہ خوشی میں بھی غم کے آنسو بہانے پر مجبور رہتے ہیں۔ وہ بظاہر ہنستے کھیلتے ہیں لیکن ان کا اندر بہت اداس اور دکھی رہتا ہے۔ اپنوں سے دوری کا دکھ غریب الدیار ہی جانتے ہیں۔ دیارِ غیر کے مقیم خوشیوں میں بھی غم کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے احساسات و جذبات کی بہترین عکاسی ان کی نظم ''دیارِ غیر میں'' محسوس کی جا سکتی ہے۔

میرے ہر سو رنگ اور خوشبو / جگ مگ جگ مگ کرتے چہرے / چاروں جانب یوں لگتا ہے
جیسے خوشیاں ناچ رہی ہوں / میں بھی عمدہ پیراہن میں / چہرے پر کچھ رنگ سجائے
رقص کے عالم میں رہتی ہوں / لیکن میرے اندر کوئی / چھوٹے سے بچے کی صورت
دل کا دامن کھینچ رہا ہے / مجھ سے کب سے پوچھ رہا ہے / میرے اپنے لوگ کہاں ہیں

فوقیہ مشتاق کی نظموں میں طربیہ رنگ کے علاوہ حزنیہ رنگ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہنستے ہنستے آنکھوں کو نم کر دینے کا ہنر جانتی ہیں۔ مذکورہ بالا نظم میں بھی ایسا ہی منظر ہے کہ ان کے چہار جانب خوشیاں رقص کناں ہیں لیکن ان کا دل بجھا ہوا ہے۔ اپنوں کی جدائی میں وہ اداس ہیں۔ اسی طرح وہ محبوب کی آنکھوں میں چھپی ہوئی کہانیوں اور داستانوں کو بھی پڑھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ساحل سمندر پر اپنے محبوب کے ساتھ بہت شاداں تھیں مگر انھوں نے جب محبوب کی آنکھوں میں دیکھا تو اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ ان کی نظم کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

کس قدر تم قریب تھے میرے / روح سرشار ہو رہی تھی بہت / کتنے ہی دل وہاں سمندر پر
اپنے عہد وفا میں تھے مصروف / ہاں بہت دلفریب تھا منظر / کر رہی تھی میں ناز قسمت پر
یک بیک میں نے مڑ کے دیکھا ہے / جانے کیا تھا تمہاری آنکھوں میں / دل میں کچھ چھن سے میرے ٹوٹ گیا
وقت کا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا

فوقیہ مشتاق چلتے چلتے رک جاتی ہیں۔ ہنستے ہنستے رونے لگتی ہیں۔ وہ خوشی کے لمحوں میں غم کی رمق کو بھی ہمیشہ یاد رکھتی ہیں اس لیے کہ خوشیاں عارضی ہوتی ہیں جب کہ غم ہمیشہ پاس رہتے ہیں۔ اگر غم نہ ہوں تو قلم کو تحرک نہیں ملتا۔ دیارِ غیر میں رہنے والوں کو اور کوئی غم ہو نہ ہو اپنوں سے دوری کا دکھ اور غم انھیں اندر ہی اندر کھانے لگتا ہے اور اس کا اظہار فوقیہ مشتاق کے ہاں اکثر ملتا ہے۔ وہ آزاد نظم کی بہت عمدہ

شاعرہ ہیں وہ قلبی واردات کو نہایت خوبصورتی سے نظم کے سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ وہ معاشرتی مسائل ہوں یا عصر حاضر کے اجتماعی دکھ اور غم سب کو بڑی جزئیات نگاری کے ساتھ نظم کا حصہ بناتی ہیں کہ قاری ان کا گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ فوقیہ مشتاق مشاہدے اور تجربے کی شاعرہ ہیں۔ خواب دیکھنا ہر انسان کا حق ہے لیکن خوابوں کی تعبیر کے لیے عذابوں کی رت سے گزرنا پڑتا ہے۔ خواب انسان کو تحرک دیتے ہیں۔ خواب حصول منزل کے سنگ میل ہوتے ہیں۔ خواب وہ نہیں جو ہمیں نیند کے دوران آتے ہیں، خواب تو وہ ہیں جو ہمیں سونے نہ دیں۔ بعض اوقات جب خواب ٹوٹتے ہیں تو ان کی کرچیاں آنکھوں کو ہی نہیں بلکہ پوری روح کو زخمی کر دیتی ہیں۔ ایسی ہی کیفیت کا اظہار فوقیہ مشتاق اپنی ایک نظم میں کرتی ہیں۔ ان کی نظم "خواب دیکھنے والو" کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

آرزو کی منزل کیا / جستجو کا حاصل کیا / خواب دیکھنے والو / نامراد ساحل پہ
کشتیاں ڈبوتی ہیں / اور پھر سمندر سب / آنکھ سے چھلکتا ہے / دل کا خون ہوتا ہے
ساری سیپیاں ٹوٹی / ریت چھپائے روتی ہیں / زندگی سسکتی ہے

پاکستان کے ریسکیو 15 اور ریسکیو 1122 کی طرح امریکہ کا ایمرجنسی نمبر 911 ہے۔ فوقیہ کا مشاہدہ اور احساس قابل ستائش ہے۔ حادثے کی صورت میں انسان بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نسیان کا شکار ہو جاتا ہے۔ فوقیہ مشتاق نے نفسیاتی کیفیات کا اظہار کمال ہنرمندی سے کیا ہے۔ انھوں نے حادثے اور سانحے کے وقت انسانی نفسیات کا کرب ایک نو سری صورت میں پیش کیا ہے۔ یہ قلبی ریاضت کے بغیر ناممکن ہے۔ فوقیہ مشتاق نے اپنی نظم "911" میں حساسیت پوری جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ انسان پریشانی کے عالم میں جب سب کچھ بھول بیٹھتا ہے اس کیفیت کو نظم کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن فوقیہ مشتاق نے "911" لکھ کر ثابت کیا ہے کہ وہ مشکل سے مشکل موضوع کو بھی نہایت آسانی سے نظم کے سانچے میں ڈھال سکتی ہیں۔ ان کی نظم "911" ملاحظہ ہو:

میرے جوتے برف میں کب سے دھنسے ہوئے ہیں / ایک کیکری درخت کی اونچی شاخ پہ چھتری لٹکی ہوئی ہے /
میرے ہونٹ پہ خواہش جم کے سوکھ گئی ہے / ہاتھوں کو میں دیکھ تو سکتی ہوں لیکن / محسوس نہیں کر سکتی ان کو
دور سڑک پہ اک کھمبے پر بیرے لال اور پیلے رنگوں کا / تیزی سے جلنا بجھنا دیکھ رہی ہوں / تیز ہوائیں شور مچاتی
جانے کس کو ڈھونڈ رہی ہیں / میری آنکھیں سردی اور حیرت سے اک دم / پھیلی ہوئی ہیں / پرس میں رکھے
موبائل کی آوازوں کو سن تو رہی ہوں / لیکن ذہن پہ سکتہ سا ہے / گاڑی پاس کھڑی ہے لیکن یاد نہیں یہ /
کس سے ملنے آئی ہوں یا کس سے ملنے جانا ہے / آس پاس میں کوئی نہیں ہے / اور ایمرجنسی کا نمبر ڈائل
کرنے کی / ہمت ہی کب ہے مجھ میں / نمبر بھی تو یاد نہیں ہے / 991 / ہے یا پھر / 191

خیال آرائی اور رعنائی فوقیہ مشتاق کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ تجربات کے حسن و زیبائی پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ بعد از تخریب ہونے والے ماحول پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ اردو نظم میں یہ ایک منفرد انداز ہے۔ وہ صرف پیش منظر کو ہی نہیں دیکھتیں بلکہ پس منظر پر بھی نگاہ رکھتی ہیں۔ ان کے سامنے تصویر کے دونوں رخ موجود ہوتے ہیں۔ وہ روشن اور خوشنما پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے اس کے بدنما اور تاریک

پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تقریبات کے حسن اور رنگینی کے علاوہ تقریب کے بعد کے منظر کا بھی جائزہ لیتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نہایت شاندار نظم "تقریب کے بعد کا منظر" ملاحظہ ہو:

میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں / مجھ کو ایسا لگتا ہے / جیسے مجھ میں / جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے
پڑے ہوئے ہوں / جوٹھے برتن / بکھرے پھول / میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں /
کچھ لمحے پہلے ہی جیسے / بہت سے لوگوں کے ہنسنے اور بولنے / کی آوازیں تھیں / اور اب گہری خاموشی
ہے / جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں / جوٹھے برتن / بکھرے پھول / اور ان انجانی
آنکھوں کا انجانا پیغام / میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں

مذکورہ بالا نظم کا موضوع انتہائی اہم اور منفرد ہے۔ انھوں نے اس نظم میں خود کو تقریب کے بعد کا منظر سے تشبیہ دے کر نظم میں ایک اور خوبصورتی پیدا کر دی ہے۔ غزل کہتے ہوئے وہ اس کی ساری نزاکتوں، لطافتوں، خوبصورتیوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ فنی محاسن کو بھی ملحوظ خاطر رکھتی ہیں۔ ان کی غزل میں ایک تہذیب اور شائستگی کا عنصر موجود ہے وہ روایت کو جس انداز میں لے کر آئی ہیں اس کی بھی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کے ہاں امید اور رجائیت کا چراغ روشن رہتا ہے۔ کسی کے لوٹنے کے لیے منڈیروں یا پھر دروازوں کے اوپر طاقوں میں دیے جلائے جاتے تھے تاکہ آنے والے کو کوئی دقت نہ ہو۔ گھر پہچاننے میں کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ صحرا میں ٹمٹماتا ہوا ایک دیا مسافر کو روشنی تو نہیں دے سکتا البتہ نشان منزل ضرور دیتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

وہ لوٹے گا نہیں یہ جانتی ہوں — دیا دہلیز پہ بس رکھ دیا ہے

مذکورہ بالا غزل کے شعر میں وہ پوری روایت موجود ہے جس پر ہماری اردو شاعری چل رہی ہے۔ غزل کہنے والے شاعر اس کے مفہوم اور مضامین سے اکثر نابلد رہتے ہیں لیکن بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جو غزل کہتے ہوئے اس کی روایت اور مضامین کو سمجھتے ہوئے شعر کہتے ہیں تو فوقیہ مشتاق ان لوگوں میں شامل ہے۔ وہ غزل کے میدان میں بھی اپنا آپ منوانے میں کامیاب و کامران ہوتی ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

ترے لہجے میں ایسا لگ رہا ہے — کہ کوئی اور بھی میرے سوا ہے

یقیں کی پھر حقیقت اور کیا ہے — گماں اب بھی اگر مجھ کو ہوا ہے

ان اشعار میں ذو بیتے سے فوقیہ مشتاق کی غزل کا ذائقہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹی بحر میں بھی کمال ہنر رکھتی ہیں۔ وہ غزل اور نظم میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ دیار غیر میں رہ کر بھی انھیں اپنے وطن اور اہل وطن کا احساس رہتا ہے۔ وہ سائنس میں ادب اور ادب میں سائنس تجربے کرنے کی خواہاں ہیں۔ میری دعا ہے کہ ان کا قلم شعروں کے ساتھ ساتھ سائنسی تجربات میں بھی وقت کے پروں پر محو سفر رہے۔

◆◆◆

اوّلین شاہدانِ بازاری کی اُردو غزل

خاور اعجاز

قدیم معاشرے میں خواتین پر اظہارِ خیال کی جو پابندیاں تھیں اُس کے پیشِ نظر بہت ہی ایسی خواتین کے جذبات کی ہمیں خبر نہیں جنھیں اگر تھوڑی سی بھی آزادیِ رائے میسر آ جاتی تو ہمارے سوانی شعر و ادب کا سرمایہ آج کے مقابلے میں کہیں وقیع ہوتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ خواتین کی شعری مساعی کو مشرقی تہذیب و اخلاق کے منافی خیال کرتے ہوئے ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ نظر انداز کیا گیا اور اس سرمائے کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں نہایت تساہل سے کام لیا گیا۔ میری اس گزارش کی تصدیق ان زنانِ بازاری کی شاعری سے ہوتی ہے جن پر معاشرتی پابندیوں کا وہ بوجھ نہ تھا جو ایک عام یا اشرافیہ کی خواتین پر تھا۔ اسی لیے ہمیں جتنی اوّلین شاعرات سے واسطہ پڑتا ہے اُن میں بیشتر زنانِ بازاری یعنی طوائفیں تھیں۔ طوائف دراصل طائفہ کی جمع ہے اور طائفہ رقص و موسیقی سے تعلق رکھنے والے افراد کی ٹولی یا جماعت کے لیے مستعمل رہا ہے۔ چونکہ اس جماعت کی سب سے زیادہ نظروں میں آنے والی ہستی وہ عورت ہوتی تھی جو گانے اور ناچنے کا فریضہ انجام دیتی تھی لہٰذا رفتہ رفتہ طوائف کا لفظ اس عورت کے ساتھ چسپاں ہو کر رہ گیا۔

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ زنانِ بازاری کا کلام اُن کا اپنا ہے یا اُن کے مداحین کا لیکن بعض اشعار کا لطفِ شرم و حیا سے گرا ہوا اور مائل بہ ابتذال و فحاشی ہونا کم سے کم ایک عورت کی زبان سے بھلا نہیں لگتا اور شکوک پیدا کرتا ہے تاہم اُن کے پیشے کے اعتبار سے ایسی زبان کی توقع کی جا سکتی ہے کہ خواتین کا یہ فرقہ کسی بلند ذوقی سطح کا حامل نہ تھا۔ ایسی شاعرات میں محمدی بیگم کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ نواب شجاع الدولہ (حکومت: 1167ھ۔1188ھ/1754ء۔1775ء) کے لشکر میں رسالہ اسماعیل خان میں زندگی گزارنے والی بذلہ گو، حاضر جواب لیکن بد دماغ، مغرور، عیاش اور قلاش عورت تھی۔

قفس میں مر گئی بلبل تڑپتی ۔۔۔ نہ دیکھی ہائے پھر گلشن کی بستی

صنوبر۔ چونی صنوبر جالندھری (م 1219ھ/1804ء) بھی یکے از طائفہ طوائفاں تھی۔

زندگی تک کے یار ہیں یہ لوگ ۔۔۔ مر گئے پھر یہ آشنا کس کے
دل نہ دے اُن کو تُو خدا کو مان ۔۔۔ اے صنوبر یہ بُت بھلا کس کے

زینت جان زینت دہلوی۔ ایک شاہدِ بازاری تھی اور مرزا ابراہیم بیگ متخلص اس کا عاشقِ جاں باز۔ دونوں دلّی سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔

شبِ مہتاب میں ہے کنجِ زینت ۔۔۔ خیالِ ماہ رو ہے اور ہم ہیں

چندا بی بی حیدر آبادی (1768ء۔1824ء) ماہ لقا بائی خطاب۔ شاگرد ایمان شیر محمد خاں، ابوالقاسم میر عالم۔ حیدر آباد دکن کی مشہور طوائف تھی لیکن ہر کس و ناکس پہ ملتفت نہ تھی۔ اس کے باپ صلابت خاں کو شاہ عالم کے زمانہ میں بسالت خاں کا خطاب ملا تھا۔ وہ

چندو لال کی منظور نظر رہی۔ راجہ راؤ رمبھا کی ملازمت میں رہنے کے علاوہ نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ عمر بھر شادی نہ کی۔ علم و ادب کا گہرا شوق تھا اور ایک وسیع کتب خانہ اس کی ذاتی ملکیت میں تھا۔ غلام حسین خاں جوہر نے اس کی ایما پر دکن کی تاریخ مرتب کی۔ گھڑ سواری، تیر اندازی اور موسیقی کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ وہ اپنے عہد کی نہایت متمول اور صاحب ثروت خاتون تھی۔ پانچ سو سپاہیوں اور متعدد جاگیروں کے علاوہ اندازاً ایک کروڑ کے لگ بھگ نقد و جنس کی مالکہ تھی۔ چندا کے اخلاق نہایت پسندیدہ تھے۔ اپنی خوش مزاجی، حاضر جوابی، شوق پسندی، بزم آرائی اور رقص و موسیقی سے رغبت جیسی خصوصیات کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ رؤسا اور نوابین کی محافل کو رونق بخشتی اور خوب شہرت پائی۔ بڑے بڑے امرا نے اس کی تعریف میں منظومات لکھیں۔

لطف النسا امتیاز کے بعد وہ اردو ادب میں دوسری صاحب دیوان شاعرہ ہے۔ چندا کا غالب رجحان اہل تشیع کی طرف تھا۔ حضرت علی سے عقیدت کے اظہار میں اس نے بیشتر غزلوں کے مقطعے مدح علی میں موزوں کیے ہیں۔ چندا کی غزلیں زیادہ تر روایتی ہیں جن میں تصوف و معرفت کے مضامین بھی ہیں مگر وہ بھی روایتی۔ دراصل گہرائی اس کے مزاج کا حصہ ہی نہ تھی جو زندگی کے تلخ تجربات کی مرہون منت ہوتی ہے اور چندا کی بیشتر زندگی سہولت اور عیش و آرام میں گزری۔ اس کی غزلوں میں نظم کا سا تسلسل اور موضوعات ملتے ہیں مثلاً کسی غزل میں بسنت، کسی میں اپنی سالگرہ اور کسی میں موسموں کا تذکرہ ہے۔ اپنی حاضر جوابی کی بدولت وہ مضامین غزل میں بات سے بات پیدا کر لیتی تھی۔

پہلے ہی سے چلا کے برے دل کو ستا مت ۔۔۔ اے مرغ سحر چپ رہ ابھی آنکھ لگی ہے
گل کے ہونے کی توقع پہ جیے بیٹھی ہے ۔۔۔ ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے

ماہ طوطی۔ حسین و جمیل عورت اور شہزادہ آشفتہ کی منظور نظر تھی۔ اپنے ہجر میں آشفتہ کے کالا کات لینے کے بعد نہایت ملول رہی اور چند روز بعد ہی دق میں مبتلا ہوئی اور لاعلاج ہو کر انتقال کیا۔ یہ عشق و محبت کا اپنی طرز کا الگ ہی قصہ ہے۔ اس کے درج ذیل اشعار میں اس کا کرب نمایاں ہے۔

چھوڑ کر مجھ کو کہاں اے بت گم راہ چلا ۔۔۔ تو چلا کیا کہ یہ دل بھی ترے ہمراہ چلا
بخت کیا غم سے مرا کشتہ امید مر کر ۔۔۔ اک چھری میرے گلے پہ بھی بری آہ چلا
میں سب غم سے جلوں اور یہ کریں دق کا علاج ۔۔۔ ہو جو اپنی طبیعوں کی تو اس کا کیا علاج
نہ تو موت آتی ہے نہ ذلت کا یارا مجھ کو ۔۔۔ ہائے آشفتہ ترے مرنے نے مارا مجھ کو

بیگم شیریں لکھنوی۔ شاگرد پیر میر مہدی رحمت شیخ امداد علی۔ از فرزند خاندان، خوش فکر، مختصر دیوان مرتب تھا۔

رات باقی ہے ٹھہر جا، ابھی جلدی کیا ہے ۔۔۔ دل شیدا! مجھے بے تاب نہ کر وصل کی رات
کیوں کر رہیں حواس جو قابو سے جائے دل ۔۔۔ اے کاش موت آئے، کسی پہ نہ آئے دل

پی کالی خانم نازک۔ شاہزادہ مرزا معظم شاہ و خرم بخت کی منکوحہ میں تھی۔ پہلے منا جان رنڈی کے ڈیرے میں آتی جاتی تھی پھر اپنا کوٹھا بنا لیا۔ نہایت چالاک اور پرفن عورت تھی۔ آخر کار کسی کے گھر بیٹھ رہی۔

کہتا ہوں تم سے خدا سے یہ اب ماجرائے دل　　ایسا نہ ہو کہ میرا کسی سمت پہ آئے دل
نازک شب فراق میں اتنا نہ روئیے　　اشکوں کی جا نکل نہ پڑیں لخت ہائے دل

موتی جان انداز دہلوی ایک طوائف تھی جو بعد میں لکھنؤ جا کر رہی۔ مصحفی کے 1794ء میں لکھے جانے والے ''تذکرہ ہندی گویاں'' میں یہ نام ملتا ہے۔

سیا گر تو نے چاک جیب ناصح　　تو پھر تار رفو ہے اور ہم ہیں
شب مہتاب میں تا کنج ساقی　　خیال ماہ رو ہے اور ہم ہیں
بلا سے گو نہ ہووے دل کو واشد　　ہجوم یاس تو ہے اور ہم ہیں

امۃ الفاطمہ بیگم صاحب جی۔ منظور نظر و شاگرد حکیم مومن۔ شاہ جہان آباد کے قیام میں بیمار ہو گئی اور حکیم موصوف کے علاج سے صحت پائی جس کے عوضانے میں ایک سال تک حکیم صاحب کے ہم پہلو رہی۔

گزر کیا صنم کے نظارے میں زاہد　　یہ جلوہ خدا نے دکھایا تو دیکھا
نظر ہے جانب اغیار دیکھیے کیا ہو　　پھری ہے مجھ سے نگہ یار دیکھیے کیا ہو

امیر جان شرارت (پ 1250ھ/1834ء قیاساً) شاگرد امیر خاں منیر اکبر آبادی۔ زمرۂ طوائفان سے متعلق۔ آگرہ، متھرا، ٹونک اور دہلی کی خاک چھانی۔

سایہ میرا متصل ہمرہ تجلی ہو گیا　　یہ نظر پہ اور مجھ پہ کس مہ کامل نے کی
بس نہیں چلتا ہے یارب کیا کریں ناچار ہیں　　جو نہ کرنی تھی ہمارے ساتھ وہ اس دل نے کی

بسم اللہ بیگم (ولادت 1256ھ/1840ء قیاساً) شاگرد انعام اللہ یقین۔ پہلے بازاری تھی پھر نکاح کر لیا۔

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے　　کہ مضطر ہے دل کاہے تپاں ہے
نہ کیجے ناز حسن عارضی پر　　نہ دیکھو، یہ بہار بے خزاں ہے

امراؤ جان دلبرا اکبر آبادی معروف بہ چھوٹی بیگم۔ حیدر آبادی نازک اندام اور خوش خرام رنڈی تھی۔ کلکتہ بھی گئی۔ کریم الدین پانی پتی کے تذکرہ ''گلدستۂ نازنیناں'' (1845ء) میں ذکر آیا ہے۔

ہر روز جو گم زلف کے تئیں ہو جاتے　　ہے جا تو ہمیں ناز اٹھانا نہیں آتا
قسمت میں ہماری نہ ہوا ہائے صد افسوس　　اک روز لیٹ کر شب مہتاب میں سونا

صاحب جان جان فرخ آبادی۔ حسن فروشان بازاری میں سے تھی۔ دلی میں بھی قیام کیا۔ خوب صورت اور خوش کلام عورت تھی۔ کریم الدین پانی پتی کے تذکرہ ''گلدستۂ نازنیناں'' (1845ء) میں ذکر آیا ہے۔

جان جاتی ہے دل ترستا ہے　　اس میں آ جا کہ مینہ برستا ہے
جان و دل بیچتے ہیں ہم اپنا　　ایک بوسہ پہ لے لو سستا ہے

گوہر جان گوہر سلطانپوری پرتاب گڈھی (پ 1265ھ / 1849ء قیاساً) شاگرد محمد سیارن پوری و منیر لکھنوی۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں دسترس تھی۔ عاشق مزاج تھی۔ پہلے پرتاب گڑھ کو رونق بخشی پھر ایک ٹھاکر صاحب کے گھر بھی جلوہ افروز رہی۔ ریلٹک کلب پرتاب گڑھ کی ممبر تھی، جانے کس کس نے اسے ورق ورق پڑھا۔

وہ کہتا ہے مجھ سے غربت میں — تم نہ گھبراؤ یار ہم بھی ہیں
سچ کہا ہے کسی نے اے گوہر — اپنے مطلب کے یار ہم بھی ہیں

ملکہ جان ملکہ (پ 1674ھ / 1857ء) شاگرد حکیم رضا صاحب ہلال، آرمینی خاتون تھی۔ اصل نام وکٹوریہ ہیمنگز (Victoria Hemings) اور والد کا نام ہارڈی ہیمنگز (Hardy Hemings) تھا۔ وکٹوریہ کی والدہ کا نام رکمنی تھا۔ وہ ہندو تھیں مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر سے شادی کی خاطر عیسائی مذہب اختیار کیا تھا۔ 1872ء میں وکٹوریہ کی شادی اعظم گڑھ کی ڈرائی آئس فیکٹری میں کام کرنے والے ولیم رابرٹ یوورڈ (Willaim Robert Yeoward) سے ہوئی جو عیسائی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ ایلین انجلینا یوورڈ (Eileen Angelina Yeoward) وکٹوریہ اور ولیم کی اکلوتی بچی تھی جو 1873ء میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئی۔ جب انجلینا چھ برس کی تھیں تو وکٹوریہ اور ولیم میں طلاق ہو گئی تھی جس کے بعد وکٹوریہ خورشید نامی ایک مسلمان صاحب زادے کے ساتھ رہنے لگیں جو بیمار انجلینا کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات وکٹوریہ کے جسم سے پورے کرتا تھا۔ انجلینا کو بیماری سے نجات دلانے کی کوشش میں وکٹوریہ رفتہ رفتہ بالا خانے کا رخ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ 1879ء میں یہ لوگ بنارس چلے جاتے ہیں جہاں دونوں ماں بیٹیاں اسلام قبول کر لیتی ہیں۔ قبول اسلام کے بعد وکٹوریہ کا نام ملکہ اور انجلینا کا نام گوہر رکھا گیا۔ دونوں نے کالے خان پٹیالے والے سے موسیقی اور علی بخش سے کتھک ڈانس کی تربیت حاصل کی اور پھر یہ ملکہ جان اور گوہر جان کے طور پر پہچانی جانے لگیں۔ بعد میں گوہر جان نے ہندوستانی موسیقی میں ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لی۔ گوہر تخلص کے تحت شاعری بھی کی۔ 1883ء میں دونوں کلکتہ چلی گئیں جہاں ان کے قدردان موجود تھے۔ ملکہ جان کا انتقال وہیں ہوا اور باگھ ماری قبرستان میں دفن ہوئیں۔ ملکہ جان کے دیوان میں غزلیات، گیتوں اور ٹھمریوں کے علاوہ ان کے قدردانوں کے تعریفی اشعار بھی موجود ہیں جن میں سب سے نمایاں نظم شمس اور محمد ابراہیم شاہ رسا کی ہے جن کا تعلق ٹیپو سلطان کے خاندان سے تھا۔ ملکہ نہ صرف مشاعروں میں شرکت کرتی تھیں بلکہ اپنے یہاں بھی مشاعرے منعقد کراتی تھیں۔

دیوان "مخزن الفت ملکہ" 1886ء کی 106 غزلیات سے انتخاب اشعار

حسرت نہیں ہوتی ہے کہ مالا نہیں ہوتا — جب تم نہیں ہوتے ہو تو کیا کیا نہیں ہوتا
خاکساری سے ہوئے دنیا میں ہم ہر دل عزیز — صورت نقش قدم دل کی زمیں میں گھر کیا
چپ ہے نالوں کا اعتماد نہ ملکہ — نالاں تک لب کے مٹائے ہوئے ہیں
دل کھل گئے ہیں زلف پریشان یار کے — مجنوں ہیں ہوائے سر رہگذار کے
تھی فنا اور بقا ایک ہی پردے کی عروس — زندگی آئی ہے دنیا میں عدم سے پہلے

نگین جان اقبال سہارن پوری ایک رنڈی تھی۔ عبدالغفور خاں نساخ اپنے تذکرہ ''سخن شعرا (1864-65ء)'' میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

خاک سے تک اٹھایئے اس کو | دل مرا پائمال ہے صاحب
جان کوئی خوشی سے دیتا ہے؟ | کیا انوکھا سوال ہے صاحب!

چھوٹی بیگم شرم لکھنوی۔ طوائف۔ عبدالغفور خاں نساخ اپنے تذکرہ ''سخن شعرا (1864-65ء)'' میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

مردے زندہ ہو گئے پازیب کی جھنکار سے | ہر قدم پہ حشر برپا ہے تری رفتار سے
ملے غیر سے یار آنکھوں کے آگے | مری جاں پہ کس کو گوارا ہوا ہے

حجاب بریلوی۔ طوائف۔ عبدالغفور خاں نساخ اپنے تذکرہ ''سخن شعرا (1864-65ء)'' میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

دل اٹھاتا ہے مرا جور و جفا کیا کیا کچھ | تو کرتا ہے وہ عیار دغا کیا کیا کچھ

بی بی جان ناز فرخ آبادی۔ شاید بازاری۔ عبدالغفور خاں نساخ اپنے تذکرہ ''سخن شعرا (1864-65ء)'' میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

زہرہ بلائیں لینے لگی آسمان پر | توڑا یا جو چرخ میں اس نے اٹھا کے ہاتھ

آرائش دہلوی (52) بازاری عورت تھی مگر کسی کے گھر بیٹھ رہی۔

جوانی میں بھلی معلوم ہوتی تھی یہ آرائش | بڑھاپے میں تو مہندی مَسّی کی ہے خاک آرائش

◆◆◆

سلسلے محبتوں کے

پیار نہیں

اظہر جاوید

کسی بھی غم سے محبت، خوشی سے پیار نہیں | تری قسم ہے مجھے اب کسی سے پیار نہیں
کہاں وہ دن کہ ترا پیار زندگی تھی مری | کہاں یہ وقت کہ اب زندگی سے پیار نہیں
ترے ہی دم سے بہت اپنے شعر پیارے تھے | جو تُو نہیں تو مجھے شاعری سے پیار نہیں
خوشا وہ وقت بڑا ناز تھا خرد پہ ہمیں | جنوں عزیز ہے اب، آگہی سے پیار نہیں
عیاں ہے تیرے تبسم کا بانکپن ورنہ | اداس رات کی اس چاندنی سے پیار نہیں
میں سوچتا ہوں کہ کس کی تلاش پیہم ہے | میں جانتا ہوں مجھے گمرہی سے پیار نہیں
کسی کے پیار نے اظہر کیا ہے خانہ بدوش | وگرنہ مجھ کو بھی آوارگی سے پیار نہیں

جمالیات، شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ

شجاعت علی راہی

جمالیات کی بحث سے ایسے سوالات پھوٹتے رہتے ہیں جن کا تعلق حسن، فنونِ لطیفہ اور تخلیقی عمل سے بنتا ہے۔ حیات و کائنات، زندگی اور فن کو سمجھنے اور سراہنے کے لئے جمالیات کی بینائی کے بغیر کام نہیں چلتا اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ حسن جمالیات ہی کی دین ہیں۔ ہمارے اندروں سے جمالی حس کو منہا کر دیا جائے تو کیسا شعر، کہاں کا افسانہ، کیا فنونِ لطیفہ، سب بے معنی اور بے رس کہلائیں گے۔ زبان و ادب کا سلسلہ کچھ یوں ہے کہ اس میں علم، ہنر، سائنس، وغیرہ، نفسیات، سماجیات اور عمرانیات، شعر، ادب، ڈراما سب کچھ سمایا جاتا ہے اور تمام علوم و فنون بالخصوص شاعری، ادب اور مصوری کو پرکھنے کے لئے جمالیاتی پیمانے درکار ہیں اور جمالیاتی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے۔

جمالیات تمام فنون کی روح ہے۔ تاج محل ہو یا مونا لیزا کی پورٹریٹ، میر کا شعر ہو یا شیکسپیئر کا ڈراما، موسیقی کا رس ہو یا بدھا کا مجسمہ، تمام فنونِ لطیفہ کا حظ اٹھانے اور ان کی معنویت و اہمیت کے ادراک کے لئے جمالیاتی کسوٹی پر انھیں پرکھے بغیر بات نہیں بنتی۔ یہاں تک کہ المیہ (ٹریجڈی) بھی اپنے حسن سے ہمیں مسحور کرتی ہے۔ نقاد اور قاری کی جمالیاتی بصیرت ہی شعر و ادب کے تخلیقی عمل سے وابستگی پیدا کرتی ہے اور شاعر و ادیب سے اس کے باہمی رشتے کو استوار کرتی ہے۔ وہ قیس ہی کیا جو لیلیٰ عام لیلیٰ کے حسن کو پرکھ سکے۔ لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔ ایک حسن تو وہ ہے جسے پورا عالم دیکھ کر مسرت کشید کرے جیسے قوسِ قزح اور اس کے رنگوں کا حسن اور دوسرا حسن وہ ہے جو پردوں میں تہ بہ تہ مستور ہو اور صرف صاحبانِ بصیرت پر اپنے جلوے نچھاور کرتا ہو۔ اس لئے جمالیات شناسی کے بغیر ادب و فن کا مطالعہ ایک بیکار عمل ہے۔ فنونِ لطیفہ کے اندر چھپا ہوا حسن اعتدال کی راہ سمجھاتا ہے۔ خیر کی قدروں کو اپنانے کی جانب مائل کرتا ہے۔ یہ آپ کو دل کش خواب دکھاتا ہے اور زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی دعوت دیتا ہے۔ جذبے کا بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ سچائی بھی سراپا حسین ہوتی ہے۔ خیر میں ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں حسن کا شیدائی ہو وہ ظلم، نفرت، جنگ، دہشت، وحشت اور ریاکاری سے گریزاں رہتا ہے۔ اس کی زبان میں اور اس کے کلام میں رس گھل جاتا ہے وہ شیریں بیاں بن جاتا ہے۔

انسانی جمالیات کا بہترین اظہار فنونِ لطیفہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ آدمی کو بہتر انسان، زیادہ حساس، زیادہ وقت سے واقف اور زیادہ باشعور انسان کا رتبہ عطا کرنے میں حیرت انگیز کردار ادا کرتے ہیں۔ حسن سے لطف اندوز ہونا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری بچی کوئی چند ماہ کی تھی تو وہ الماری کے اوپر سجے ہوئے ایک پھول کو دیکھ کر مسکراتی رہتی تھی۔ حسن چاہے داخلی ہو یا خارجی، انسان کو متاثر کرتا ہے۔ میر تقی میر کی خواہش تھی کہ وہ زندگی کے گنے چنے لمحات میں حسین اشیاء کی دید سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔

یہی گلوں کو تک دیکھوں، اتنی مہلت ہو
چمن میں اور تو کیا مجھ کو کام ہے صیاد!

جوش ملیح آبادی کو فطرت کے ایک جمیل عنصر نے ثبوت حق عطا کیا۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے — اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

بقول ڈیوڈ ہیوم حسن کی تعریف حتمی کی مانند نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ذوق اور احساس میں تبدیلیوں کا امکان رہتا ہے اس لئے حسن میں بھی عوارض ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں تغیر واقع ہوتا ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں (حالی)

بام گارٹن، جرمن فلاسفر نے Scientific Aesthtics میں حسن کی تعریف کرتے ہوئے اسے حسن ادراک کے علم، فنون لطیفہ کے اصول، خوبصورتی کے ساتھ سوچنے کے فن اور اشیاء کی مطابقت و مشابہت سے استدلال دینے کا فن قرار دیا ہے۔ ظفر مسعود حسن کو خارج میں ڈھونڈنے کی بجائے اسے فطرت سے وابستہ کرتے ہیں۔ مجید امجد نے حسن کو معروضی کی بجائے موضوعی حقیقت قرار دیا۔

گھٹا؟ نہیں، یہ مرے گیسوؤں کا پرتو ہے — ہوا؟ نہیں، مرے جذبات کی تھکن وہ ہے
جہان گل؟ نہیں، یہ میں ہنس پڑا ہوں میں — نسیم صبح؟ نہیں، سانس لے رہا ہوں میں

حسن ہمارے داخل میں بھی ہے اور خارج میں بھی ہے۔ حسن چیزوں کے جمال سے بھی تعلق رکھتا ہے اور ان کے جلال سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے کشمیر کے بارے میں کہا تھا: ''کشمیر ایک انتہائی حسین عورت کی طرح حسین ہے جس کے حسن کا کمال اسے غیر شخصی بنا دیتا ہے اور انسانی خواہشات سے بالاتر کر دیتا ہے۔ یہ ہے اس کے نسائی حسن کی جھلک، جو اس کے دریاؤں، جھیلوں، وادیوں اور حسین درختوں میں جھلکتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے جادوئی حسن کا ایک اور پہلو بھی ہے اور یہ ہے اس کا مردانہ جلال، جو اس کی چٹانوں اور گھاٹیوں، برف پوش پہاڑیوں، گلیشیئر اور ان بے رحم خوفناک ندیوں میں پایا جاتا ہے جو نشیبی علاقوں میں اپنا سر پٹکنے کے لئے بیتاب رہتی ہیں۔''

یعنی جواہر لال نہرو کی نظر میں حسن نام ہے قوت سلیمانی اور حسن داؤدی کے حسین امتزاج کا۔ چونکہ حسن کا کوئی ایسا معیار نہیں جو سب کے لئے قابل قبول ہو اس لئے فرانسیسی مفکر والیئر اس نتیجے پر پہنچا کہ حسن کی تعریف ممکن ہی نہیں ہے۔ تاہم میں یہاں غلام احمد پرویز کے چند جملے بیان کرنا چاہوں گا جو میری دانست میں معقولیت لئے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''حیوان اشیائے کائنات کے صرف فطری پہلو سے واقف ہے۔ اسے جمالیات کا احساس ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی تحسین حسن (appreciation of beauty) منطقی دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی یہ نہیں ہوا کرتا کہ پہلے چیز کے حسن کو عقلی دلائل سے اس نتیجے پر پہنچیں کہ وہ حسین ہے اور پھر اس کی طرف کھنچیں۔ حسن بلا دلیل اہل حسن شناس کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔'' (اس اقتباس میں میر تقی میر کا معروف شعر اپنی جانب سے بڑھانے کی جسارت کروں گا کہ

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

میری نگاہ میں حسن نام ہے صحیح توازن و تناسب کا۔ کہنے والے نے خوب کہا تھا کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا لمبی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

◆◆◆

محمد حامد سراج: محبت میں فراق لمحوں کا داستان گو

......2......

ڈاکٹر جمیل حیات

افسانہ "محبت میں فراق کے" ایک نئے جہاں کی سیر بھی کراتا ہے جہاں بدنصیب شوہر محسن کا خود اذیتی میں ہونے کے باوجود اس سے محض اس لیے سیراب نہیں ہو سکتا کہ شک کا بیج اس کے اندر پھل پھول کر تناور درخت بن چکا ہے۔ یوں وصال میں ہی اس نے فراق کا انتخاب کیا اور اریبہ کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی برباد کر لی۔ اسلوب کے ساتھ ساتھ تخیل کا جہاں آباد کیے بہت عمدہ افسانہ ہے۔ یہ سطریں دیکھیے:

> "میں نے اپنے اندر ایک تخیل تعمیر کیا ہے۔ ایک وجیہہ شخص کا تخیل۔۔۔ بالکل ایسے جیسے فرانسیسی ناول نگار ہیوگو کے عظیم الشان ناول افروڈائٹ کا مرکزی کردار۔۔۔ اب وہ مجھے چھوتا ہے تو میرے پورے وجود میں موسیقی کی لہریں اٹھتی ہیں۔ میرا پورا جسم موسیقی کے آلات میں بدل جاتا ہے۔ جب وہ میری زلفوں کے تار پر کوئی راگ چھیڑتا ہے تو میں دیوداسیوں سے کٹ جاتی ہوں۔ میرے ہونٹوں کے پیانو پر اس کی انگلیاں نئے اور انوکھے سروں کو جنم دیتی ہیں۔ میری آنکھوں کے بربط پر اس کا لمس راگ درباری میں بدل جاتا ہے۔" (چائے کی پیالی، مشمولہ برائے فروخت، ص 318)

"جرابوں کی تدفین" ایک اور عمدہ اور شہکار افسانہ ہے جس کا ایک ایک سطر لاجواب نثر نگاری کا ثبوت ہے اور افسانے کے تخلیقی میدان میں حامد سراج کی فنی مہارت کا مدلل ثبوت بھی۔ محبت کی چاشنی میں گھولے ہوئے الفاظ کسی کو بھی گھائل کر سکتے ہیں۔ وہ اس بھی محبت کے ان دیکھے تیر کا شکار ہوئی اور جب اس نے خود کو "ایک" کے لیے ایسے وقف کیا کہ اس کے پاؤں کی تعریف کرنے والے محسن کے مرکز نگاہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے پاؤں کو جرابوں کا اسیر کر کے دنیا والوں کی نظروں سے اپنے پاؤں کو اوجھل کر دیا۔ حامد سراج کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مجازی عشق کی فسوں خیزی کا شکار نوجوان کو اللہ تعالیٰ سے محبت میں مبتلا کر دیا۔ یوں قاری کو اس کی خوبصورتی بھول گئی لیکن اختتامی جملے یا اخباری سطح کے ایک تراشے نے محسن کو اپنی محبوبہ کی زندگی اور وفات کی ان مٹ داستان کی خبر سنا دی۔

حامد سراج نے محبت میں ہجر و فراق کے تپتے صحرا سے برہنہ پا گزرنے والی لڑکی کو وصال یار کی لذت کشید کرتے دکھایا ہے اور کمال کر دیا ہے۔ بہت کم افسانے ایسے ہوتے ہیں جن کا اختتام ایک نئے اور الم ناک المیے کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ افسانہ بھی ان میں سے ایک ہے اور نوجوان، بدقسمت لڑکی کے ان کہے بیتے لمحوں کی عکاسی ایک اور شہکار افسانے کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔ حامد سراج کے ہاں ایک اور بات دیکھی جا سکتی ہے، ایک ہی موضوع کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیکھنے کی قوت چنانچہ یہ بات قاری کو ایک خوشگوار حیرت سے

واضح کرتی ہے کہ حامد سراج نے لفظ ''محبت'' اور ''ہجر و فراق'' کو کیسے معانی پہنائے ہیں اور ہجر و فراق کے نئے جہانوں کی سیر کرائی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حامد سراج کا طلسم حیرت کا در وا کرتا قلم انہیں معاصر قلم کاروں سے بہت الگ ادبی جگہ پر متمکن کر دیتا ہے اور یوں فنِ افسانہ نگاری کا موجودہ عصر کا یہ سرخیل نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ حامد سراج نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی تبلیغ کرنے والوں کی خودداری اور عجز کی تصویر کشی بھی عمدگی سے کی ہے۔

ازدواجی زندگی کی ناہمواریوں، آسودگیوں اور شک کے ناگ کے ڈسے جانے کی داستان ''کتنے صبر دین'' میں رقم کی گئی ہے۔ جو لوگ کسی کی زندگی عذاب کرتے ہیں وہ پھر سود سمیت یہی عذاب وصول کرتے ہیں۔ اس افسانے کی کئی جہات ہیں۔ بے جوڑ شادی، قریبوں کا جسمانی، جنسی اور معاشی استحصال، عورت کی طرف سے وفا اور خلوص کی پیش کش اور ''جس پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے'' کی عکاسی کرتا عمدہ افسانہ ہے۔ محبت میں فراق کے مختلف رنگوں کو اجاگر کرنے کا فن حامد سراج کی افسانہ گری کا سب سے اہم نکتہ ہے۔ اسی ایک نکتے کے گرد حامد سراج کے افسانوں کی دنیا آباد ہے۔ کبھی محبت میں یہ فراق زندگی کو موت کے حوالے کرتا ہے اور کبھی موت کے گھاٹ اتار کر ابدی جدائی کے عذاب سے آشنا کرتا ہے تو کبھی مجازی محبت میں محبوب سے لمبی جدائی کی خون چکاں تحریر حامد سراج کے فسوں خیز قلم سے صفحۂ قرطاس پر جلوے بکھیرتی نظر آتی ہے۔ اس افسانے ''بھوتنا ہوا کا'' کا انجام محبت میں فراق کی ملاقاتی کو وصال یار کے لطف آگیں لمحوں سے آگہی بخشتا ہے۔ آخری سطریں ملاحظہ فرمائیں: ''ڈاکٹر عبداللہ کی موت کے تین دن بعد ایک صبح اس کے خاندان کے کچھ افراد اور وہ سب اس کے مزار پر گئے۔ وہاں کوئی ایک کتبہ لگایا گیا تھا جس پر تحریر رقم تھی۔ ''تمام وکھ بے'' اور کتبے پر ایک پھول رکھی ہوئی تھی۔''

یہ سطریں جہاں ایک طرف ڈاکٹر عبداللہ سے اس کے محبوب کی پاکیزہ محبت کی گواہی دیتی نظر آتی ہیں اور اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ کی محبوبہ اس سے دور ہوتے ہوئے بھی اس سے بہت نزدیک تھی۔ وہیں اس افسانے کی یہ اختتامی سطریں جمیلہ ہاشمی کے شہرہ آفاق ناول ''دشتِ سُوس'' کے ایک کردار ''اخول'' کی زندگی کے آخری لمحوں کی داستان خون چکاں کے مناظر کو بھی ذہن و دل کی کھڑکیوں کے واگوشوں سے عکس بند دکھاتی ہیں جہاں موت کی وادی میں اترتی ''اخول'' اپنے محبوب اور وقت کی ایک نابغۂ روزگار ہستی ''حسین بن منصور حلاج'' سے اپنے بے پایاں عشق کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ ''انہیں'' یہ بھی بتاتی ہے کہ پہلی ملاقات کے بعد گزرے جدائی کے طویل ترین عرصے میں بھی ''حسین'' کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ''اخول'' کی آنکھوں کے سامنے وارد ہا ہے اور یہ کہ موت کے بعد بھی ''اخول'' کی آنکھیں ''حسین'' کے احوال پر نگران رہیں گی۔ (جمیلہ ہاشمی، دشتِ سُوس، لاہور، سنگ میل پبلشرز، 2012ء) بہت عمدہ افسانہ ہے۔

''دھلن کو مانگے چاند'' بچھڑے ہوؤں کی جستجو اور وفا کے مقابلے میں مجبوری کے جیتنے کی داستان وار ہا ہے۔ عرصے بعد بھی ملنے کی صورت میں پہچان لینے کی یقین دہانی کرانے والی جب پچیس سال کے طویل عرصے بعد نظر آئی تو مرکزی کردار واحد متکلم نے تو اسے تو پہچان لیا لیکن وہ نہ پہچان سکی۔ حامد سراج کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''چوب دار'' ہے۔ اس میں دو افسانے ''مشک کہاں گیا'' اور ''1 راینگ روم اک کنز رکھو ہے'' ایسے افسانے ہیں جو محبت میں فراق کے نقشے بکھیرتے ہیں۔ ''مشک کہاں گیا'' اپنی طرز کا ایک انوکھا افسانہ ہے۔ ماں بیٹے کے ساتھ باپ بیٹے کی والہانہ محبت اور پھر ازلی جدائی اس افسانے کا موضوع ہے جسے حامد سراج نے کمال مہارت سے نبھایا ہے۔ یہ ان کی خوبی ہے کہ انہوں نے معاشرے میں بسنے والے کرداروں کا مثبت پہلو بھی دکھایا ہے۔ مولوی صاحب معاشرے کا ایک صالح کردار

اور اسی صالح کردار نے مرکزی کردار ''ملنگ'' کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ دوسری طرف آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے اعلیٰ اخلاق و کردار اور دیانت داری کا مظاہرہ کر کے سماج کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کا دل بھی ملنگ نے جیت لیا۔ بظاہر حامد سراج نے اس افسانے میں باپ کو بیٹے سے شاکی دکھایا۔ وہ دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اپنے بیٹے کی قابلیت کا تقابل کرتا اور اسے کم تر پا کر اسے حقیر گردانتا لیکن سعادت مند بیٹے نے مولوی صاحب کی بات گرہ سے باندھ لی کہ ماں باپ کے سامنے اف بھی نہیں کرنی۔ اس کی یہی خوبی باپ کے دل میں اس کی محبت کے پنپنے کا سبب بن گئی۔ افسانے کی اختتامی سطریں المیے کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں: ''ایک بوڑھا شخص ٹوٹی چارپائی دروازے کے سامنے ڈالے ہر آنے جانے والے سے سوال کرتا ہے۔۔۔'' اے بھائی۔۔۔ اے بابا۔۔۔ بیٹا۔۔۔ او بیٹا۔۔۔ بی بی۔۔۔ میری بات تو سنو'' ''ملنگ کہاں گیا۔'' [ملنگ کہاں گیا، ص480]

''ڈرائنگ روم اک گزرگاہ ہے'' محبت کے انوکھے جذبوں کی داستان سناتا بہت عمدہ افسانہ ہے۔ مجازی محبت کی سحر انگیزی کا ایک اور شاہکار۔ حامد سراج کے ہاں محبت کے مختلف پہلوؤں کا تنوع ہے۔ ''عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے'' کی تفسیر بیان کرتا دلگداز افسانہ ہے۔ انجام دلگرفتہ کر گیا۔

> ''ایک لمحے کو اس کی ڈوری کا سرا میں نے تھاما۔۔۔ شاید اسے کنفرمیشن ہوا اس SMS میں امید کی قندیل ٹمٹما رہی ہو۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے SMS کھولا۔۔۔ اور دھرتی کے سارے میپل ورگ جام ہو گئے۔'' سر۔۔۔ آپ نے ایک بار ڈرائنگ روم کا پوچھا ڈرائنگ روم تو اک گزرگاہ ہے یہاں تو روز بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن یاد رکھیے گا کہ میں صرف ایک ہی شخص سے ملی تھی اور مجھ سے بھی بس ایک ہی شخص ملا تھا جو آدھا آپ چھوڑ گیا ورنہ لوگ تو بہت آتے ہیں۔۔۔'' [ڈرائنگ روم تو اک گزرگاہ ہے، ص 512]

خالد قیوم تنولی لکھتے ہیں:

> ''محمد حامد سراج پورے ادب اور پوری زندگی کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ عملی طور پر جس عمل محبت کے قائل ہیں وہ ان کے فن میں بھی پوری طرح جھلکتی، چھلکتی اور اندلتی دکھائی دیتی ہے۔ شر اور خیر کے پہلو اگرچہ زندگی سے برتر جدا نہیں لیکن حامد سراج کی کہانیوں میں خیر کی دلکشی، گوندھ، مٹھاس اور معصومیت بدرجہ اتم موجود ہے۔'' [مجموعہ حامد سراج، ص29]

حامد سراج کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''برائے فروخت'' ہے۔ ''ایک اور دادا'' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ حامد سراج ملکی معاشرتی حیثیت سے مکمل طور پر آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ افسانہ لکھتے وقت مناظر کو اتنی عمدگی سے تشکیل دیتے ہیں کہ قاری خود کو ان مناظر کے سحر میں محو پاتا ہے۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں بلائے ناگہانی بن کر پاکستانی معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والی دہشت گردی نے ہماری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ بچوں اور بڑوں کے ذہن میں بھی خوف کی فصل بو ڈالی۔ اس کا خمیازہ وطن نے بہت بری طرح بھگتا۔ انہی عذاب لمحوں کے تناظر میں لکھا گیا دلگداز انجام کا حامل افسانہ جو سیدھا قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔ جہاں محبت ایک مرتبہ پھر اپنے فطری انجام یعنی ناکامی سے دوچار ہوتی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس بار نہ تو ظالم سماج دیوار بنتا ہے اور نہ ہی ذات پات اپنی سمت انگشت نمائی کا موقع دیتی ہے۔ اس بار محبت کو بارود کی دیوار کھا جاتی ہے۔

محبت میں ہجر کی تمازتوں کا شکار جاگیردار کی بدنصیب بیٹی کے ادھورے شب و روز کی داستان الم ناک کو حامد سراج نے عمدگی سے بیان کیا ہے۔ محبت ایسا جذبہ ہے جو آگ کے دریا میں سے گزر جانے کو سرمایۂ افتخار جانتا ہے۔ شائلہ نے شکیل کو پولیس میں بھرتی تو کروا دیا لیکن اس کی قسمت کو تہ بدل گئی اور وہ خودکش حملے میں جان ہار گیا۔ کیوپڈ کے تیر کا شکار ہونے والی شائلہ کی کیفیات و احساسات کو حامد سراج نے اپنے مخصوص اسلوب کے سانچے میں خوبصورتی سے ڈھالتا ہے۔ منظر نگاری کمال کی ہے۔

> ''مصطفیٰ نے پینترا ایسے انداز میں بدلا کہ ہزاروں تماشائیوں میں شائلہ کا دل اس کے داؤ سے نکل گیا۔ اس نے چور نظروں سے آس پاس دیکھا۔ سب انہماک سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ایک تماشائی کو مات ہو گئی ہے۔ شائلہ نے کن اکھیوں سے آس پاس دیکھا جیسے اس نے کوئی چوری کی ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ ماڈرن تھی، تعلیم یافتہ اور باوقار گھرانے سے لیکن مصطفیٰ کے نوکیلے نقوش، طلائی سرخی جان اور سرمے والی آنکھیں جانے کیسے اس کے دل کو چیر گئیں۔ اس کے سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔'' [ایک اور داؤ، بجلی گری، راولپنڈی، الفتح پبلی کیشنز، 2014ء، ص 28]

حامد سراج کا مشاہدہ گہرا ہے۔ وہ صرف تخیل کے بل بوتے پر کہانی نہیں بنتے بلکہ کرداروں کی نفسیات اور ماحول کے اثرات کو اپنے تخیل کا حصہ بناتے ہیں اور اس کے بعد کہانی افسانے میں ڈھلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار سانس لیتے اور چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں زندگی کی رمق واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ کامے، مزارے اور نوکرانیاں مخالف سازشوں کے تانے بانے بننے میں جہاں اہم کردار ادا کرتے ہیں وہیں شہزادوں اور شہزادیوں یا وڈیروں کی اولادوں کے ہمراز بھی ہوتے ہیں۔ مصطفیٰ سے شائلہ کی ملاقات کرانے میں اور پیغام رسانی کرانے میں نوکرانی کا کردار اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ [ص 32]

اختتام جہاں شکیل عرف مصطفیٰ کی خودکش حملے میں المناک موت کی تفصیل بتاتا ہے وہیں اس کے جنازے میں خوف کی لہر کے موجود ہونے کی وجہ سے معاشرے کے کھوکھلے ہونے کا اعلان بھی کرتا ہے جہاں ذہنوں کے بنجر ہونے اور نفسیاتی میدان میں جنگ ہارنے کی طرف اشارہ ہے۔

''ہوس کنارے'' کبھی ہجر کا عذاب سہنے والی کرماں ماری کی کتھا ہے۔ دولت کے مہیب دیو کی قید میں جانے والے واپسی کا راستہ بھول جاتے ہیں۔ محبت، من و تو میں صفائی و پاکیزگی کی طلب گار ہوتی ہے۔ من میں میل آ جائے تو محبت میں فراق کی گھڑیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن دولت اس گتھی کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ حامد سراج نے دو انتہاؤں پر چلنے والے عاشق و معشوق کے خال و خد کو عمدگی سے کہانی میں ڈھالا ہے۔ سلیم الرحمٰن کی محبت کو، اس کی یادوں کو عمر بھر جان بنا کر زندگی گزارنے والی رخسانہ، اس کی آخری ہچکی تک سینے سے لگائے اس کا انتظار کرتی رہی لیکن سلیم الرحمٰن کے لیے محبت سے بڑھ کر دولت کا حصول اہم تھا اس لیے اس نے محبت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرأت نہ کی۔ شاعرانہ اسلوب میں ڈھلا حامد سراج کا ایک اور شاہکار افسانہ جس کا انجام ہولناک ہے۔

''اکتوبر کے آخری دن'' ایک عمدہ افسانہ ہے۔ حامد کا کمال فن یہ ہے کہ وہ محبت کے ماروں کی پہلی پہلی کیفیات کو جس حسن و خوبی کے ساتھ پینٹ کرتے ہیں وہ ویژن کش میں اتنا مکمل ہوتی ہیں کہ قاری جملوں کی سحرکاری سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا۔ یہ جملے طلسم کو بڑھاتے افسانے کی مکمل قرأت پر قاری کو مجبور کرتے ہیں اور وہ اسی ترنگ میں پورا افسانہ پڑھ لیتا ہے۔ اس افسانے میں ایک اور بات جس کا تذکرہ

ضروری ہے کہ حامد سراج نے مکالمے کی تکنیک استعمال کی ہے اور مکالمے بھی دورِ جدید کی نئی دریافت ایس ایم ایس کے ذریعے افسانے کے بیانیے کا حصہ بنے ہیں۔

افسانے کا اختتام حیرت انگیز ہے۔ لوک کہانیوں کے عشاق کرداروں کی رسم کو نبھانے کا فریضہ صباحت نے نبھایا اور عمدگی سے نبھایا۔ عاشق کی موت کے ساتھ محبوب کی موت اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے آشنا کرتی ہے۔ یہ حامد سراج کا اختصاص ہے کہ ان کا تخلیق کار ذہن ایسے ایسے نکتے اٹھاتا ہے کہ جن تک معاصر ادیب کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ انجام سادہ ہے لیکن جس فنی مہارت سے حامد سراج نے اس سادہ انجام کو افسانے کے اختتام پر برتا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

''پانچ روپے کا متروک نوٹ'' خاتون کی گم گشتہ محبت کی داستان ہے۔ چونکا دینے والے انجام کے حامل عمدہ افسانے میں حامد سراج نے خاتون کی کہانی کو عمدگی سے بنا ہے جس کی محبت کو غربت کی دیمک چاٹ گئی۔ جسم بیچ کر سہولیات زندگی خریدنے والی سرِ راہ گم شدہ محبت کو پا کر روح پر ایسا چرکہ لگا کہ بیٹھی کر سنبھلنا محال ہو گیا۔ حامد سراج کے اچھوتے اسلوب کا حامل عمدہ افسانہ جس کی اختتامی سطریں ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ حامد سراج نے کتنی مہارت سے محبت میں بے قدری کی کیفیات کو الفاظ کا جامہ عطا کیا ہے:

''اس نے آہستگی سے لفافہ کھولا تو حیران رہ گئی۔ لفافے میں پانچ روپے کا متروک نوٹ رکھا ہوا تھا۔۔۔ اچانک نوٹ سے ایک لہر نکلی اور اس کے وجود کو چیر گئی۔۔۔ یہ نوٹ۔۔۔۔ یہ نوٹ۔۔۔ یہ نوٹ تو بچپن میں اس نے عادل کو دیا تھا۔۔۔ تو کیا وہ۔۔۔۔ سسکیاں کھلے چہرے اس کے اندر پھٹنے لگے اور وہ وہیں دہلیز پر ڈھیر ہو گئی۔۔۔!'' [پانچ روپے کا متروک نوٹ، ص 114]

''لمحۂ قصر'' میں باپ بیٹی کی محبت اور بیٹی کے بیاہ کے بعد فراق کے موسم کی آبیاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آپ بیتی کی تکنیک کے ذریعے حال میں ماضی کے مناظر کی عکس بندی عمدگی سے کی گئی ہے۔ ''سناٹا کہاں گیا'' کا موضوع بھی محبت ہے۔ یہ سطریں دیکھیں:

''اسے کیسے سمجھاؤں کہ جب عورت کسی پر مرتی ہے تو وہ اپنی نہیں رہتی، بس اسی کی ہو جاتی ہے، اسی میں سانس لیتی ہے، اسی میں جیتی اور مرتی ہے۔ اس کا محور قبلہ کعبہ مسجد مندر سب وہی ایک ہوتا ہے جس کا وہ تپتی دوپہر میں انتظار کرتی ہے۔'' [سناٹا کہاں گیا، ص 119]

محمد حمید شاہد کے الفاظ پر اس مقالے کا اختتام کرتا ہوں جو حامد سراج کو اسلوب پر صحیح معنوں میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

''وہ فطرت کی گپھاؤں اور انسانی بطون کے غاروں میں ایک ساتھ جھانکنے کی اور ان میں نہاں رازوں کو پڑھ ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس نے اپنے ہمہ گیر مشاہدے کی بے پناہ قوت، انتہائی جرأت اور تخلیقی توانائی سے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو اپنے پڑھنے والوں کو اندر سے بدل کر رکھ دیتی ہیں۔ محمد حامد سراج کو میں تخلیق کاروں کی اس پیڑھی کا اہم کہانی کار مانتا ہوں جنہوں نے فن پارے کے تخلیقی جمال، معنویت اور امکانات کو ایک ساتھ برت کر کہانی پر قاری کا اعتماد بحال کیا ہے۔'' [ایک طلسم، پیش گفتی]

(ختم شد)

◆◆◆

عکسِ مکرّر

سلطان احمد علوی

سرگودھا سے پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے بذریعہ فون مجھے بتایا کہ اظہر جاوید تخلیق والے کا 14 فروری 2012ء انتقال ہو گیا ہے۔ اس دن فروری کی 15 تاریخ تھی۔ چند دن بعد مرحوم کے فرزند ارجمند سونان نے مجھ سے براہ راست رابطہ کیا کہ وہ اپنے والد ماجد کی یاد میں "تخلیق۔ اظہر جاوید نمبر" نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا میں بھی ان پر کچھ لکھوں۔ چنانچہ اظہر جاوید سے طویل دیرینہ مراسم اور تعلق خاطر ہونے کے ناطے اپنے بھتیجے کی پہلی فرمائش و خواہش کی تعمیل میں میں نے "میرا ہم نفس" کے عنوان سے اپنی تحریر بھجوا دی جو کہ "تخلیق۔ اظہر جاوید نمبر" میں اشاعت پذیر ہوئی۔ جون 2012ء میں "تخلیق" کا یہ خصوصی نمبر شائع ہوا۔ جون 2021ء میں سونان نے مجھے فون کیا اور مطالبہ کیا کہ میں ان کے والد مرحوم پر مزید کچھ لکھوں۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔

کہنے کو تو سونان نے کہہ دیا لیکن مجھے مشکل میں ڈال دیا۔ تخلیق کا "اظہر جاوید نمبر" ضخیم پرچے کی صورت میں شائع ہو چکا ہے جس میں ملک اور بیرون ملک سے اہلِ قلم کاروں نے بہر جہت اور بہر صورت بہت کچھ لکھا ہے۔ مجھ سے بھی جو کچھ بن پڑا تھا پیش کر دیا تھا۔ اب لکھوں تو کیا لکھوں۔ آخر سوچا کہ اظہر جاوید کی ہشت رنگی شخصیت ان کے ادیبانہ، صحافیانہ، شاعرانہ اور دوستانہ وغیرہ اوصاف و محاسن پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ ان کا کوئی پہلو تشنۂ تحریر نہیں رہ گیا۔ میری اور اظہر جاوید کی ریاضی کے مضمون کی حالت بہت پتلی تھی اور اس وقت جو ایک مضمون میں فیل ہوتا اسے مکمل فیل تصور کیا جاتا۔ ہم دونوں میٹرک میں فیل ہو گئے پھر ادیب فاضل اور انگلش کا امتحان دے کر میٹرک کلیئر کر لیا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر شیخ فضل الٰہی ظہر کی نماز لازمی بچوں کو باجماعت پڑھاتے۔ میں اور اظہر اکثر نماز سے پہلے کھسک جاتے۔ یہ سکول گھوڑوں پر یا سائیکلوں پر آتے اور سکول کے بعد اکثر نہر پر جا کر بیٹھ جاتے۔ اظہر جاوید وہاں آنے والی پٹھانیوں پر اکثر نظر رکھتے اور کبھی کبھار تو ان سے کچھ خاص سننے کو بھی مل جاتا مگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آتے اور چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ سرگودھا میں جناح ہال میں ایک مشاعرہ ہوا تو خواتین کو ایک علیحدہ کمرہ میں بٹھایا گیا۔ اظہر جاوید آنکھ بچا کر اس کمرے میں جاتے اور باہر آ جاتے۔ شاکر کنڈانی نے مجھے کہا علوی دیکھو اظہر باز نہیں آ رہا مشاعرہ میں بھی۔ یہاں ایک پہلو جو ان کے قریب ترین جاننے والوں سے بھی اوجھل ہے، وہ ہے ان کا پچھوکڑ جو ان کے "ابی" ہونے سے منسوب ہے (بتاتا چلوں کہ لڑکپن میں اظہر جاوید کے ننھیال والے پیار سے 'ابی' کہتے تھے۔) اگرچہ کہ میرا ان سے قرب تھا ہم پڑوسی تھے، ہم جماعت تھے، ہم مشرب تھے، ہم جلیس تھے۔ اس لیے میں ان کے حالات و معاملات سے خاصا واقف تھا لیکن جب سونان بیٹے نے مزید معلومات کا تقاضا کیا تو میں نے نواز پٹھان سے رابطہ کیا۔ یہ بندہ 60-65 برس سے ان کے ننھیالی خاندان سے وابستہ چلا آ رہا ہے۔ نواز پٹھان سے جو معلومات فراہم ہوئیں سونان اظہر جاوید اور قارئین تخلیق تک مرسل ہیں۔

شیخ صالح محمد چک 81 جنوبی سرگودھا کے متمول زمیندار تھے ان کی تین مربع پر مشتمل زرعی نہری اراضی تھی۔ گاؤں میں سات

کنال کے رہائشی پلاٹ تھے۔ دو کنال احاطہ میں ان کی سکنی عمارت تھی جب کہ باقی پانچ کنال انہوں نے اپنے معین کاسے اور غیر مالک لوگوں کو رہنے کیلئے دے رکھی تھیں۔ شیخ صالح محمد (سب انسپکٹر پولیس بھی رہ چکے تھے) کثیر اولاد تھے۔ ان کے تین بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں، تینوں بیٹے اہم بالشان مقامات پر فائز تھے۔ بیٹیوں میں اظہر جاوید کی ماں بڑی تھیں۔ واضح ہو کہ یہ خاتون کافی حد تک پڑھی ہوئی تھیں جبکہ دوسری پانچوں بہنیں گریجوایٹ تھیں۔ گویا ان وقتوں بھی یہ گھرانہ علمی خانوادہ تھا۔ اظہر جاوید دو بھائی تھے بڑے کا نام مظہر سہیل تھا۔ اپنے طور پر میں یقینی کچھ نہیں کہہ سکتا تو از بیان کے مطابق اظہر جاوید کی والدہ بیوہ ہو گئی تھیں اس وجہ سے دونوں بیٹوں سمیت میکے آ رہیں۔

میرے بابا جی سرکاری ملازمت میں تھے جہاں جہاں تعیناتی ہوتے اپنی فیملی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ 19 جون 1951ء دوران ملازمت ان کا انتقال ہوا۔ ابا جی کی رحلت کے بعد ہم لوگ مستقلاً چک 77 جنوبی سرگودھا میں مقیم ہو گئے۔ 1951ء میں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بھاگٹانوالا نواحی چکوک کا مرکزی مقام ہے اس سے ہائی سکول صرف بھاگٹانوالا تھا۔ میں نے وہیں داخلہ لیا۔ داخل ہو جانے کے بعد جس کلاس روم میں اور جس ڈیسک پر مجھے سیٹ ملی وہاں پہلے سے ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ ساتھ والی خالی نشست پر میں بیٹھ گیا۔ وہ لڑکا مجھے آنکھ بھر کر دیکھتے ہوئے کہنے لگا، تھوں آئے او سوہنیو او میں نے کہا سوہنیاں دی وستی چوں آیا واں۔ کہنے لگا چنگا کر دیا ایں، میں نے کہا چنگیاں دے لڑ لگ کے چنگا ہو جائی دا اے۔ یہ تھی میری اظہر جاوید سے پہلی ملاقات پہلی گل بات۔ ہم عمروں میں سینکڑوں، زندگی میں ہزاروں لوگوں سے ربط شناسائی ہوتی ہے لیکن دوست ہونے کے لئے مزاج کی ہم آہنگی اور طبیعت کی مطابقت ہونا لازم ہوتا ہے۔ ہمارے حلقۂ احباب میں (اظہر جاوید اور میرے) اصغر علی کوثر وڑائچ، راجہ پرویز، مظفر ظفری، رحمت علی راہی، ملک زمان، اکبر ارشد وغیرہ شامل تھے۔ کم و بیش سبھی باذوق اور شعر و ادب کے رسیا تھے۔ ہماری محفلیں خوب خوب جمتی تھیں پر آہ!

وہی زندگی وہی مرحلے وہی منزلیں وہی قافلے مگر اب تو راہِ حیات میں کہیں تم نہیں کہیں ہم نہیں

اظہر جاوید کے بڑے بھائی مظہر سہیل بھی منظر سے ہٹ گئے وہ امریکہ چلے گئے اور وہیں مکین ہو گئے۔ میٹرک کر لینے کے بعد اظہر جاوید انہی فضاؤں میں اپنی چکاریں بکھیرتے رہے۔ پروفیسر بزمی ہم سے سینئر تھے۔ گریجوایشن کر لینے کے بعد وہ بھاگٹانوالا ہائی سکول میں بطور تربیت یافتہ (ان ٹرینڈ) ٹیچر تعینات ہوئے۔ ان کے ننھیال (بعد میں سسرال) چک 77 ج کے رہنے والے تھے جبکہ وہ خود چک 39 شمالی کے رہنے والے تھے۔ چک 77 ج بھاگٹانوالا سے صرف دو کوس کے فاصلہ پر ہے چنانچہ اس سہولت کے تحت انہوں نے چک 77 ج میں رہائش کر لی۔ بزمی جی میرے کزن بھی تھے، ہم مشرب بھی۔ چنانچہ میرے توسل سے اظہر جاوید کی بھی ان سے کھل ڈل ہو گئی۔ پروفیسر بزمی کے توسط سے ہم دونوں سرگودھا کے مشاہیر الطاف مشہدی، ڈاکٹر وزیر آغا، جوہر نظامی، اظہر سرحدی، رشک ترابی، غلام حسین قیصر وغیرہ کی مجالس میں باریاب ہوتے۔ میری نسبت اظہر جاوید ان مجالس کی شرکت میں زیادہ فعال رہے۔

اظہر جاوید چند برس گھونسلے سے نکل کر پڑوس کی ٹہنیوں پر پھدکتے رہے، چہکتے رہے۔ جب انہوں نے اپنے پروں میں اتنی سکت جان لی کہ وہ فضائے بسیط میں دور تک اڑان بھر سکتے ہیں تو پر پھیلائے اور شوقِ پرواز میں فضائے بیکراں کی وسعتوں میں جانے کون کون سی سمتوں کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس بارے میں میری جانکاری ناقص ہے۔ مجھے جب معلوم ہوا جب وہ

لاہور کے پھیلتار پر مستقل آشیانہ بنا چکے تھے یوں کہ 1969ء میں انہوں نے ماہنامہ ''تخلیق'' کا اجرا کیا اور پہلا پرچہ میرے نام بھی بھجوا دیا ------ انہیں تو شوق جہاں بینی کشاں کشاں وہاں لے گیا جہاں کا قیام ان کا مطمح نظر تھا، میں بہ عجلت ہی رہا خود کو چپلہ و فضا سے باہر نہ نکال پایا۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق　　او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

یہ کہ اظہر جاوید نے سرگودھا کی کسی حسینہ کو لوٹ کر جانا لیکن چاہت میں بار یاب نہ ہوئے تو اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ سرگودھا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ گلی گلی کا رس چوسنے والا بھونرا کسی ایک گل رعنا پہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا، واللہ اعلم۔ میں بہ شگفتگی روز دفتر تخلیق میں بھی گیا ہوں، بھگوان سٹریٹ والے دفتر میں بھی جانے کا بارہا اتفاق ہوا ہے، اندر سبھا کو ہر آن معمور پایا۔ اس چمن زار میں تتلیاں منڈلاتی دیکھیں۔ (شاید موصوف کے عاشقی معاملات بھی انہی بزم آرائیوں سے متاثر ہوئے ہوں) ------ سوہان بیٹے! آپ کی خواہش اور فرمائش کا مجھے احترام ہے لیکن اس عمر میں اپنی اور اپنے مرحوم بھائی کی ان شرارتوں کا ذکر کرنے سے حجاب آتا ہے جو عالم شباب کی نادانیوں میں سرزد ہوئیں۔ کیا روز حشر سے تحریری اعتراف کروں، کیا تمغہ امتیاز مل جائے گا۔ البتہ اظہر جاوید کی رنگا رنگیوں کا سلسلہ دراز ہے۔ گاؤں کے پنگھٹ سے لاہور کی محفل ہائے دفتر ''تخلیق'' کی اندر سبھا تک ان سب میں ان کی طبیعت کی جولانیاں آشکارا ہیں۔ بھگوان گلی کے بھاگوان، تخلیق سبھا کے پردھان اظہر جاوید معلوم نہ تھا

صبح کی پہلی کرن بن کر گزر جاؤ گے تم　　ہم کڑکتی دھوپ میں جانے کہاں رہ جائیں گے

حکایت بود بے پایاں ------

◆◆◆

دوستوں کا دوست......اظہر جاوید

نذیر ناجی

اظہر جاوید بنیادی طور پر خالص الادب انسان تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی ادب کی خدمت میں گزاری اور بے لوث گزاری۔ اپنے ادبی جریدہ ''تخلیق'' کے ذریعے وہ چاہتے تو اسے ذریعہ معاش بنا سکتے تھے اور چاہتے تو اس کے ذریعے بے شمار فوائد بھی حاصل کر سکتے تھے لیکن وہ صرف ادب کی خدمت کو ہی محنت کا صلہ سمجھ کر مطمئن رہے۔ بہت خوش رہنے والے انسان تھے۔ انہیں ان کی ہنسی سے الگ کر کے یاد کرنا مشکل ہے۔ دوستوں کے دوست تھے۔ ذاتی مسائل کسی کے سامنے بیان نہیں کرتے تھے۔ میری ان سے دوستی 45 سال پر محیط ہے۔ میرے ان کے درمیان ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ جب اکادمی ادبیات کا سربراہ بنا تو اس وقت ان کا اکادمی کے ساتھ ایک مقدمہ چل رہا تھا جو کئی سال پرانا تھا۔ اکادمی کا خیال تھا کہ اظہر جاوید یہ مقدمہ ضرور جیت جائیں گے جس سے اکادمی کی سبکی ہوگی۔ جب میں نے کہا کہ وہ میرے دوست ہیں اور میں انہیں مقدمہ واپس لینے پر آمادہ کر سکتا ہوں تو سب کا خیال تھا کہ وہ نہیں مانیں گے مگر سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میرے ایک ٹیلی فون پر ہی انہوں نے مقدمہ واپس لینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذاتی تعلقات کو وہ کتنی اہمیت دیتے تھے اور دوستوں کی خاطر اپنی انا کے سوال کو بھی نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔

بخش لائلپوری

انور ندیم علوی

ہمارے خواب چوری ہو گئے ہیں — ہمیں راتوں کو نیند آتی نہیں ہے

1997ء میں قیام پاکستان کو پچاس سال ہو رہے تھے اس لئے اندرون پاکستان اور بیرون پاکستان گولڈن جوبلی تقریبات کا انعقاد کیا جا رہا تھا۔ جولائی، اگست 1997ء ہم وزٹ ویزے پر برطانیہ گئے ہوئے تھے۔ ہمارا قیام لندن کے علاقہ ٹوٹنگ (Tooting) میں ایک دوست کے ہاں تھا۔ اس علاقہ میں ایشیائی لوگوں کی کافی تعداد تھی۔ ہمارے میزبان کو ہماری شاعری کا علم تھا کہنے لگے کہ ہنسلو (Haunslow) میں گولڈن جوبلی کے سلسلہ میں اردو مشاعرہ ہو رہا ہے۔ ہماری رضامندی کے بعد انہوں نے شمولیت کا کارڈ بطور شاعر بنوالیا۔ مشاعرے والے دن مجھے کہنے لگے، ہنسلو کے علاقہ میں تیز بارش کی پیش گوئی ہے۔ یہاں پاکستان میں ان دنوں موسم کے بارے میں پیشگوئی (Weather Forecast) کا اتنا خیال نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی ٹوٹنگ (Tooting) میں سورج نکلا ہوا تھا ہم مسکرائے اور کہا بارش کا تو کوئی چانس نہیں۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی۔ شام جب ہم مشاعرے کے لئے دوسرے دوستوں کے ساتھ نکلے تو تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہوگئی۔ پہلے ہلکی، پھر تیز پھر اور تیز۔ ہم شیشے سے باہر بارش کا اندازہ لگانے کیلئے دیکھتے تو ہمارے میزبان آنکھوں سے ہمیں دیکھتے اور ہلکا سا مسکراتے۔ میں ان کی طرف دیکھتا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگ جاتے۔ مقام مشاعرہ ہنسلو (Hounslow) تک پہنچتے پہنچتے جل تھل ایک ہوگیا۔ شاعر بھی بارش کی وجہ سے چند منٹ تاخیر سے پہنچے۔ اس لئے منتظمین نے فیصلہ کیا کہ مشاعرہ مقررہ وقت سے 30 منٹ لیٹ شروع کیا جائے۔ مشاعرہ میں ڈاکٹر سعادت سعید (لاہور) اور بخش لائلپوری (لندن) سے بھی ملاقات ہوئی۔ بخش لائلپوری نے (کمپوز / ٹائپ شدہ) اپنی نظم "پچاس سالہ جشن آزادی" پاکستان بچاؤ تحریک برطانیہ، لندن کی طرف سے ہمیں دی۔ ساری نظم ہی پاکستان کیلئے دردمندی سے لبریز ہے صرف ایک شعر لکھنے پر اکتفا کر رہا ہوں

ملک پاکستان کو سمجھو وراثت باپ کی — بے دھڑک لوٹو اسے اپنی بچت کرتے رہو

جناب بخش لائلپوری کافی دیر مجھ سے نواب شاہ، سندھ اور پاکستان کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ اور دوسرے پاکستانی جو بیرون ملک رہتے ہیں پاکستان کے بارے میں بہت فکرمند ہیں اور وہ اپنے ملک کیلئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے وہ اپنی تنظیم "پاکستان بچاؤ تحریک برطانیہ" کے بارے میں تفصیل سے باتیں کرتے رہے اور رابطے کا کہہ دیا۔ کچھ دیر تو یہ سلسلہ چلا پھر دوسری مصروفیات کی وجہ سے بخش صاحب سے رابطہ کم ہوگیا۔ تاہم ان کی ادبی کاوشوں نے ہمیں ہمیشہ متاثر کیا۔ آج کا مضمون اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ نام کریم بخش، قلمی نام بخش لائلپوری۔ والد کا نام محمد ابراہیم۔ گیارہ دسمبر 1934ء کپورتھلہ بھارت میں پیدا ہوئے۔ عرصہ ہوا لائلپور کا نام فیصل آباد رکھ دیا گیا ہے اور بخش بھی مدت ہوئی لندن چلے گئے تھے مگر انہوں نے اپنا نام بخش لائلپوری ہی رکھا۔ وہ ممتاز ترقی پسند شاعر تھے۔ ان کے پانچ شعری مجموعے "بادِ شمال"، "زندان شہر"، "ابھی موسم نہیں بدلا"، "ایک سمندر میرے اندر"، "اردو ماہیے"، "سوچ سمندر" شائع ہو چکے ہیں۔ مارچ 2002ء لندن برطانیہ میں وفات پا گئے۔ بخش لائلپوری کے اشعار ملاحظہ ہوں:

حرمتِ حرف پہ الزام نہ آنے پائے
تختِ حق کو سرِ دار سجائے رکھنا
بخش سیکھا ہے شہیدانِ وفا سے ہم نے
ہاتھ کٹ جائیں علم منہ سے اٹھائے رکھنا

ہمارے خواب چوری ہو گئے ہیں
ہمیں راتوں کو نیند آتی نہیں ہے
جس آزادی کے نغمے ہیں زباں پہ
وہ آزادی نظر آتی نہیں ہے

میں اپنے گھر کی ہر شے کو جلا کر
شبستانوں کو روشن کر رہا ہوں
وہی پتھر لگا ہے میرے سر پہ
ازل سے جس کو سجدے کر رہا ہوں

نہ حوصلہ ہے دعا کا نہ آہ پر ہے یقیں
کہ ہم سے روٹھ گیا ہے ہمارا رب کب سے
وہ ہم نے چن دیے تنقید کی صلیبوں پہ
مچل رہے تھے جو کچھ حرف زیرِ لب کب سے

اور اب چند اردو ماہیے بخش لائلپوری کی کتاب "سوچ سمندر" سے۔

(کیا ہے مکان اپنا/ گر پیار آنگن میں/ سارا ہے جہان اپنا)(وہ شخص فرشتہ ہے/ جس کا انساں سے/ اک پیار کا رشتہ ہے)(نیت کے کھوٹے ہیں/ شہرِ سیاست میں/ بے پیندے لوٹے ہیں)(رونے کا قرینہ ہے/ آنکھ سمندر ہے/ ہر اشک سفینہ ہے)(قسمت کے سکندر ہیں/ جیل کے باہر ہیں/ یا جیل کے اندر ہیں)۔

◆◆◆

ادیبوں کی نظر میں انور ندیم علوی

- انور ندیم کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور شعر کا مزاج پہچانتے ہیں۔ (رئیس امروہوی ۔۔۔ دسمبر ۱۹۸۷ء)
- انور ندیم نوخیز شعراء میں ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ وہ جدید رنگ میں ایسے خوبصورت مطالب بیان کرتے ہیں جو مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں۔ (صبا اکبرآبادی ۔۔۔ ۱۹۸۸ء)
- انور ندیم علوی نظم میں سوچ کا ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کا امتزاج ملتا ہے۔ (محسن بھوپالی ۔۔۔ ۱۹۸۸ء)
- انور ندیم کے کلام میں اس بات کی پوری شہادت موجود ہے کہ وہ امکانات سے بھرپور ذہن کا مالک ہے اور شاعری کے تقاضوں سے پورے طور پر شناسا رہتا ہے۔ ندیم علوی نے سندھ کے معروف شاعر شیخ ایاز کی شاعری کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے شیخ ایاز کے انقلابی لب و لہجہ کو پوری طرح قبول کر لیا ہے جو کہ اس کا شعری منہاج آراستہ کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔ (ظفر اقبال ۔۔۔ ۲۰۰۱ء)
- انور ندیم علوی، لطیف بھٹائی، سچل سرمست، شیخ ایاز اور فیض قبیلے کے بہادر اور حساس دانشور ہیں۔ ان کی شاعری اپنی زمین کے دکھ سکھ سے بھی جڑی ہے اور آفاقی اقدار سے بھی۔ انور ندیم علوی کی شاعری میں انسانوں کو توڑنے کی بجائے آپس میں جوڑنے کا پیغام ملتا ہے۔ (نذیر قیصر ۔۔۔ ۲۰۰۱ء)

تقریب کُچھ بھی سہی!
ہمیشہ شاداب
و شگفتہ رہئیے!
Tibet

منظومات

کرامت بخاری

اُمید

دریچہ تھام کر طاق کو تاکا پوری
کوئی آیا نہ گیا ہجر کے دروازے تک
کوئی دستک نہ ہوئی اور نہ کوئی آہٹ
عرصۂ عمر رہا یار سے خالی خالی
تیری یادوں کا شجر ہجر کا بید اور مرا
تیرے انکار کو سنا رہا اقرار مرا
درد کی چھاؤں تلے سو گئے آخر تھک کر
تیرے وعدے کا افسوں اور مرا ایک جنوں
کوئی آیا نہ گیا ہجر کے دروازے تک
دریچہ تھام کر طاق کو تاکا پوری

OOO

طلعت منیر

فہم بے بس ہے

(گوتم بدھ کی نذر)

ہم کسی بھی "ہونے"
کی تعریف کیسے کریں
اس میں تفصیل کے رنگ کیسے بھریں
قابلِ فہم معنی کو لفظوں میں تصویر کیسے کریں
کہ لغات سارے ــــ تصورات سارے
تو حیات کے ساتھ بندھے پڑے ہیں
کہ "ہونے" کے "ادراک" کا تو
زبان و بیاں حالتِ فہم سے
کوئی رشتہ نہیں

OOO

پروین شیر (امریکہ)

سرحدیں

خراشوں میں ڈوبا ہوا اس زمیں کا
بدن خوں چکاں ہے
دراڑوں کی لکیروں کے اندر
جہاں اور جہاں ہیں
تو بھری بجری کی اونچی فصیلیں
رعونت سے سر کو اٹھائے کھڑی ہیں
سمیٹے ہوئے وہ ان بدن پتھروں کا
خلا کے سمندر میں
کراں تا کراں ہے کشیدگی زمیں کی.....

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

چاند کا رستہ دیکھ رہی ہوں

اک مدت سے سوچ ہی میں الجھی
چاند کا رستہ دیکھ رہی ہوں
تیرے ہاتھوں اپنے آنچل کو ڈالے سے
روک رہی ہوں
ٹوٹ گیا اب کچھ جو آنکھوں نے دیکھا تھا
ایک یقیں کا دامن کب سے کھینچ رہی ہوں
ڈر لگتی ہے چاروں جانب
میں لفظوں سے کھیل رہی ہوں
ایک مسلسل ہجر ہے جس کو کھیل رہی ہوں

OOO

ممتاز راشد لاہوری

سپنے

(قطعات)

کچھ ہیں دریائی طوفاں سپنے
کچھ تباہی کا ہیں ساماں سپنے
کچھ ہیں دل سوز تو کچھ توبہ شکن
اف یہ غارت گر ایماں سپنے

کچھ ہیں فراغ و فراواں سپنے
اور کچھ جیب پریشاں سپنے
کچھ مہ و مہر کی پُرنور مثال
کچھ کہکشاؤں کا عنواں سپنے

کچھ ہیں گل رنگ بہاراں سپنے
کچھ ہیں شفاف چراغاں سپنے
فکر افروز ہیں کچھ سحر انگیز
راحت اطوار بداماں سپنے

OOO

اظہر جاوید

آصف عمران

تنہائی

میں تنہا
اور وقت کی بارش
قطرہ قطرہ دل کے اندر اتر رہی ہے
سوچ کے گہرے سائے اب
اپنے تعاقب میں لگے ہیں
ظلمتی آسیب کا منظر اترا
ہو گئی یاد کے بچپن کو
اداس لگی رہا ہے
ذہن کی بنجر دھرتی پر
چاند کی کرنیں اتر رہی ہیں
خوابوں میں ویران سے منظر
تھک ہار کر سو رہے ہیں
وقت کی بارش
آسیب کا ڈائنا
چاند کی کرنیں
ویران سے منظر روٹھ کر مجھ سے
دور کھڑے ہیں
اور میں تنہا
بکھر رہا ہوں
اس کرب کو جھیل رہا ہوں

OOO

مریضِ دل کی جھوٹی ٹوٹی آسیں!

اظہر جاوید

خود ہی میں فون کر کے لوگوں کو
خود ہی کہتا ہوں پوچھو میرا حال
وضع داری بھی کھو گئی ہے کہیں
آ گیا ہے رفاقتوں میں زوال
لوگ مصروف ہیں تو ہے بس تنہا
وہ حسد بھی نکال سکتے نہیں
گھر میں آ کر کریں عیادت کیا
وہ تو کر ایک کال سکتے نہیں
وائرل پیغام ہو اطلاعی ہو
ان کو رہتا ہے بس یہی اک دھیان
کوئی اہل قلم مرے گا کب؟
جاری کر دیں گے تعزیت کا بیان
کوئی شکوہ نہیں، شکایت کیا
بے رخی کے میں سہہ چکا ہوں عذاب
میں ہوں جب تک مدیر پرچے کا
میری تعریف کے کھلیں گے ابواب
دنیا داری کے سب تعلق ہیں
مر گیا میں تو کس نے رونا ہے
ہوتا آیا ہے کل بھی ایسے ہی
کل بھی ایسا ہی یار ہونا ہے

OOO

طالبِ سزا

مہرباں، دلنواز ادا
مانتا ہوں کہ مجھ سے ہوئی ہے خطا
تم جو چاہو مجھے دے دو اس کی سزا
عذر کوئی نہیں، کچھ بہانہ نہیں
کوئی مجبوریوں کا فسانہ نہیں
عشق کی یہ روایت، حکایت نہیں
رسم یہ کوئی بھی عاشقانہ نہیں
ہے عجب سانحہ
جو تمہارا ہے احسان بھلا دوں اسے
یہ تو ایسے ہے جیسے میں ایمان کو
رب کے فرمان کو
بے خیالی میں دل سے مٹا دوں اسے
آئینہ فکر کا بھی دکھا دوں اسے
اے مری نازنیں
جانِ جور و جفا
معاف کر دو خطا
یا جو چاہو وہ دے دو مجھے تم سزا
عذر کوئی نہیں، کچھ بہانہ نہیں

OOO

افسانے

کلجگ

ترجمہ: حنیف باوا

مصنف : سنتوکھ سنگھ

مختصر تعارف

حنیف باوا 1936ء کو اپنے ننھیال پاکل نامی قصبے میں پیدا ہوئے۔ یہ 1959-60ء سے مسلسل پنجابی اور اردو میں ادب تخلیق کر رہے ہیں ان کی اب تک 12 کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ معروف ادیب، صحافی اور شاعر اعظم جاوید کی پنجابی کہانیوں کا مکمل اردو ترجمہ کیا جو پچھلے آٹھ سال سے مسلسل تخلیق میں شائع ہو رہا ہے جسے قارئین کی غیر معمولی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے۔

کلجگ آ گیا ہے، کلجگ۔ آج کل کی بہو بیٹیوں کو کوئی شرم و حیا نہیں رہ گئی۔ جب دیکھو خصموں (خاوندوں) کی باہوں میں گھسی رہتی ہیں۔ نہ کوئی کام نہ کاج۔ بے بے ایسری اپنی چھڑی سے ٹٹولتی ہوئی کوٹھے کی چھت پر سے ہوتی ہوئی آ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر کوٹھڑی کے اندھیرے کونے سے روشن دان پر پڑی۔ "نہ جانے ہماری بہو اس وقت کس کمرے میں اکیلی ہو گی۔ شاید اس کے پاؤں سیڑھیوں سے اتر نہیں پا رہے تھے۔ اس نے فوراً آنکھوں پر موٹے شیشوں والی عینک چڑھائی اور روشن دان پر جھک کر جیسے اندھیرے میں کچھ تلاش کرنے لگی ہو لیکن شکر ہے کہ اسے دو جسم آپس میں الجھے ہوئے اور نہ باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ نہیں تو اس کا بڑبڑانا مزید بلند ہو جاتا تھا اور اس نے اس وقت تک خاموش نہیں ہونا تھا جب تک کہ کسی کے جسم پر لاسیں نہ ابھر آتیں۔

اب جب اس کا غصہ کچھ کم ہوا تو اس نے خود کو پر سکون محسوس کیا اور آہستہ سے نیچے اتر گئی۔ نیچے آ کر جب اس نے اپنی بہو کو باورچی خانے میں مصروف پایا اور رجندر کے ہاتھ میں کتاب دیکھی تو اس کے چہرے کی تنی ہوئی طنابوں میں قدرے نرمی آ گئی لیکن اس کے لب اب بھی تھرتھرا رہے تھے۔ کلجگ آ گیا ہے ـــــ کلجگ ـــــ بے بے ایسری آنگن میں پڑی ہوئی پیڑھی پر آ کر بیٹھ گئی اور اس کے بیٹے رجندر نے اس کے آگے چائے لا کر رکھ دی۔ اس نے آنکھوں سے عینک کو اتارا اور بڑبڑاتی ہوئی چائے کے گھونٹ حلق میں اتارنے لگی۔ "ہمارے دور میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اگر کوئی گھر میں بیمار پڑ جاتا تب ایک آدھ بار چائے بنتی تھی لیکن اب تو ہر وقت چولہے پر دیگچی پڑی رہتی ہے۔ اگر اس چائے کی وجہ سے یہ لالہ بک گیا تو مجھے کچھ مت کہنا۔"

رجندر نے جب ماں کو اس اچھے موڈ میں چائے پیتے دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے ہنستے ہوئے کہا

"ہاں یہ چائے کا نشہ بھی کیا ہے۔ یہ تو ویسے ہی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے پی لی جاتی ہے ورنہ آج کل اور کون سی خوراک رہ گئی ہے دنیا میں۔" بے بے ابسری کو بھی آج جب بیٹے کے چہرے پر امید سے زیادہ راحت اور خوشی نظر آئی تو اس نے اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا شروع کر دیں "بیٹا ہمارے زمانے میں تو دودھ اور دہی کی نہریں رواں تھیں لیکن آج کل مانگنے پر بھی کسی کا ایک گھونٹ تک نہیں ملتا۔ آج تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ بیٹے ___ کلجگ آ گیا ہے ___ کلجگ" "میں ابھی ابھی چھپی پیٹھوں سے سن کر آئی ہوں کہ ستھ رسیوں (سکھ) کی پوتی ایسی نکلی ہے کہ ابھی سے باپ دادا کی ناک میں مارنے لگ گئی ہے۔ ہمارے وقت میں تو بہوؤں اور بیٹیوں کو اس قدر شرم و حیا ہوتی تھی کہ مجال ہے کہ نظر اٹھا کر ادھر ادھر جھانکتی پھریں لیکن آج کل تو لڑکیاں جوان بعد میں ہوتی ہیں لیکن باپ دادا کی لاج کو پہلے مٹی میں ملانا شروع کر دیتی ہیں۔"

باتیں کرتی ہوئی کا دھیان رسولی کی طرف چلا گیا" ہمارے وقتوں میں بہو بیٹیوں کو تو ماں اور ساس کا ہر وقت ڈر رہتا تھا۔ جی جی کرتی ہوئی ہی زبانیں نہیں تھکتی تھیں۔ پاؤں دبانے کے لیے آگے پیچھے پھرتی تھیں لیکن اب تو زمانہ تباہی کے دہانے پر آ گیا ہے۔ پچھلا ادب تو اب رہا نہیں۔" اس طرح وہ اپنے بیٹے کو پرانے اور نئے دور کی باتیں بتاتی رہی لیکن بے بے ابسری کبھی کبھار اپنے بیٹے سے اتنی گہری باتیں کرتی تھی۔ تبھی تو اس کے ماتھے پر غصے سے بھری ریکھا ابھرنے لگتی تھی۔ وہ کچھ بولتی ہو یا خاموش بیٹھی ہو بڑبڑانا تو اس کا ہر وقت کا کام تھا۔ "کلجگ آ گیا ہے کلجگ" بے بے ابسری صبح شام عبادت کے وقت اپنے ہاتھ میں ایک سو ایک منکوں والی مالا پکڑے رہتی۔ مالا پھیرتے ہوئے اس کی آنکھیں بند رہتی تھیں۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرتے تھے لیکن درمیان میں کبھی کبھی اس کی آنکھیں یہ دیکھنے کے لیے کھل جاتیں کہ اس کا بیٹا اور بہو کیا کر رہے ہیں۔ اگر وہ اکٹھے نہ ہوتے اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تو اس کی آنکھیں پھر بند ہو جاتیں لیکن اگر وہ ایک ساتھ بیٹھے مسکرا رہے ہوتے تو اسے پاٹھ کرنا بھول جاتا اور اس کے چہرے کے تاثرات غائب ہو جاتے اور وہ بولنا شروع کر دیتی۔ "کلجگ آ گیا ہے کلجگ۔ آج کل شادی بعد میں ہوتی ہے اور میٹھی میٹھی باتیں پہلے شروع ہو جاتی ہیں اور جب تک وہ تکلیف دہ باتیں کر کے اپنی بہو کو رلا نہ دیتی تو پاٹھ میں اس کا دھیان واپس لوٹتا اور نہ ہی اسے چین آتا۔ گرو کا ہنستا مسکراتا چہرہ بھی اس کے سامنے نہ ظاہر ہوتا۔ عبادت کرتے وقت ہی نہیں رات کو بھی اس کا بڑبڑانا جاری رہتا بلکہ یہی نہیں رات کو اسے نیند بھی نہیں آتی۔ اگر تھوڑی بہت آتی بھی تو اسے پوری کرنے چارپائی پر پہلو بدلنا شروع کر دیتی۔ پھر چارپائی سے اٹھ کر چھت پر گھومنا شروع کر دیتی اور کہتی "کلجگ آ گیا ہے کلجگ" اتنی عمر گزر گئی بھگوان جانتا ہے کہ اتنی گرمی نہیں پڑی اور گھر کے مچھر چین سے سونے نہیں دیتے۔ اس کا رات کے وقت اٹھ کر پہرہ دینا بھی کبھار شعور کے اک اک میں وہم بٹھا جاتا اور اس کی بہو کی آنکھوں میں جیسے چنگاریاں چھوٹنے لگتیں اور وہ مشورے شروع کر دیتے کہ کیوں نہ کوئی کرائے پر مکان لے لیں۔ نرمل اس کے لیے کوشش بھی کرتا تھا لیکن اس مہنگائی کے دور میں اتنی کم تنخواہوں میں سے کرائے کے لیے پیسے کیوں کر بچا پائیں گے۔

کرائے پر مکان لینے کے متعلق باتیں کچھ دبی دبی سی ہوتیں لیکن پھر بھی بے بے ابسری کو اس کام کے متعلق معلوم ہو جاتا حالانکہ اس کی قوتِ سماعت بھی قدرے کم تھی پھر بھی اسے اس تمام کے بارے سب کچھ معلوم ہو جاتا۔ معلوم ہونے پر وہ بولنا شروع ہو جاتی ایسا بیٹا میں پیدا ہی نہ کرتی اس سے تو میں بانجھ ہی اچھی تھی لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ بس زمانہ ہی کلجگ کا آ گیا ہے۔

تیرے باپ نے ہزاروں روپوں کا قرض اتارا تھا لیکن اس نے کبھی اف تک نہ کی پر اب کے لیے تو ایک ماں کی روٹی کھلانا بھی دوبھر ہے۔ تم نے کرائے پر مکان لینا ہے تو بے شک آج ہی لے لو لیکن میں مانگنا شروع کر دوں گی تا کہ لوگوں کو پتا چلے کہ رحمدی کی ماں بھکارن بن گئی ہے۔'' رحمدی یہ سب دکھی دل کے ساتھ سنتا رہتا اور پھر گھر سے باہر چلا جاتا۔

جب کبھی رحمدی کی بیوی بیمار پڑ جاتی تو وہ اس کے لیے بازار سے دوائی لے آتا تو دوائی کو دیکھتے ہی چنگی بھلی بے بے لسری کو بیماری کا دورہ پڑ جاتا اور وہ ہو گھر میں مارنا شروع کر دیتی پھر وہ چادر اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ جاتی۔ ''ٹھیک آ گیا ہے ٹھیک۔ ماں بے شک چارپائی پر لگی بیماری سے مر رہی ہو اسے کوئی نہیں پوچھتا اور جورو کے لیے ہر تے دن کے ساتھ دوائی آ جاتی ہے اور اسے بار بار پوچھا جاتا ہے۔ ماں بے شک تڑپ تڑپ کر مر جائے، ہائے میں مر گئی۔ ایسا زمانہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔'' بے بے لسری کا اس گھر میں جب دل اداس ہو جاتا تو وہ دوسرے بیٹے کے پاس چلی جاتی تھی اس کے دلی چلے جانے پر رحمدی کی بیوی کچھ سکھ کا سانس لیتی اور گھر میں قدرے چین بھی جیسے کا احساس جاگ اٹھتا۔ گھر کی ہر شے اسے بھلی لگنے لگتی لیکن بے بے لسری کا دل دلی میں بھلا کیسے لگتا وہ تین چار روز کے بعد ہی واپس آ جاتی اور گھر میں پھر سے اس کا بولنا شروع ہو جاتا۔ ایک روز بے بے لسری اچانک بیمار پڑ گئی بوڑھی جان تھی۔ اس روز صبح کے وقت جب وہ نہانے گئی تو اسے ٹھنڈ لگ گئی اور چند لمحوں میں ہی اس کی طبیعت بدل گئی۔ گاؤں کے حکیم نے بتایا کہ وہ کل تک نہیں بچے گی۔ دلی اس کے بڑے بیٹے کو تار دیا گیا۔ جب وہ دلی سے آیا تو وہ اس وقت تو جیسے آخری دموں پر تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ دیر کی مہمان تھی کہ اچانک اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بیٹا اور بیوی ساتھ ساتھ بیٹھے کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ مسکرا بھی رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کا سانس واپس آ گیا اس کے چہرے کی ملائمیں پھر سے تن گئیں اور وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ بیٹھی ''ٹھیک آ گیا ہے ٹھیک۔'' اس کے بعد وہ چھ روز تک زندہ رہی لیکن ایک روز جب رحمدی اپنی بیوی پر کسی بات پر بڑبڑا رہا تھا اور وہ آگے سے سسکیاں بھر رہی تھی یہ دیکھ کر بے بے لسری نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ آخری وقت پر اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔

◆◆◆

بانو قدسیہ کا خراجِ تحسین

''تخلیق'' نے اظہر جاوید کو پہچان بھی دی، نام، عزت اور شہرت بھی۔ لیکن ''تخلیق'' کی آبیاری کے لئے اسے کتنی قیمت چکانی پڑی یہ کوئی نہیں جانتا۔ میں نے شروع سے ہی اظہر جاوید کو ایک درویش کے طور پر دیکھا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہماری ساری زندگی درویشوں کے ساتھ وابستگی میں گزری ہے اس لیے ہمیں ہر بندہ درویش ہی نظر آتا ہے بلکہ جب آپ حضرت رابعہ بصری پر لکھی ہوئی اظہر جاوید کی کتاب پڑھیں گے تو آپ بھی اس میں چھپے ہوئے ایک سچے اور کھرے درویش کو ضرور پہچان لیں گے۔

(بانو قدسیہ کے لکھے مضمون ''اظہر جاوید، چند تاثرات'' سے اقتباس)

پھوٹتے شگوفوں کا موسم

عذرا اصغر

مختصر تعارف

عذرا اصغر 22 دسمبر کو دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی پہلی کہانی 1962ء میں پندرہ روزہ "نیا پیام" لاہور میں شائع ہوئی۔ 5 سے زائد ناول، 7 افسانوی مجموعے جن میں "مسافتوں کی تھکن"، ناول اور افسانوی مجموعے "پت جھڑ کا آخری پتہ"، "چودھویں صدی کی لڑکی"، "کھڑکی میں بیٹھا وقت" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے، پنجابی افسانے، بچوں کا ادب، تراجم، انشائیے، خاکے، مضامین، تبصرے، نظمیں، ہائیکو اور ماہیے تحریر کیے۔ "تجدید نو" کے نام سے ادبی مجلے کی ادارت کے فرائض بھی ادا کرتی رہی ہیں۔

میں اداس بیٹھی تھی۔ خزاں آنے سے پہلے خزاں کا خوف مجھ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ مجھے اپنے حصار میں جکڑ لیتا ہے اور خزاں کا تصور ہی میرے وجود کو افسردہ و غمگین کر دیتا ہے۔ شاید یہ اس لئے تھا کہ میں بھرپور خزاں کے موسم میں پیدا ہوئی تھی۔ خزاں سے میرا قریبی تعلق اور رشتہ تھا مگر مجھے بہار پسند ہے اور یہ کائنات تو بہار و خزاں کا آمیزہ ہے اور اس لمحے میں اکیلی اور اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ میرا بیٹا کل ہی دور دراز کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ وہ جاتے ہوئے کس قدر مسرور تھا۔ اسے خوش ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ اپنی منگیتر کو جو ملنے جا رہا تھا۔ ایک نیا بندھن اسے کھینچے لئے جا رہا تھا اور پرانے رشتے غیر محسوس طریقے پر غیر مربوط ہو رہے تھے۔ بہاریں اس کی زندگی کی چوکھٹ پر کھڑی دستک دے رہی تھیں۔ اور یوں خزاں کے تصور نے میرے دکھ میں اضافہ کر دیا تھا۔ موسم خزاں گزارنا میرے لئے دوبھر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ اکثر مجھے یاد آتی ہے۔ وہ ــــ جسے بہار نا پسند تھی۔ اسے بہار کا موسم تکلیف دیتا تھا۔ جانے اسے کیا دکھ اس موسم نے پہنچایا تھا۔ اس کا کون اس موسم میں اس سے بچھڑا تھا اور موسم بہار آنے سے پہلے ہی وہ اپنے در و دریچے بند کر لیا کرتی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردے ڈال کر گھر سے میں خود کو مقید کر لیتی تھی۔ جانے اسے بہار سے الرجی تھی یا جانے کوئی غم اس کے دل میں جاگ اٹھتا تھا۔

مگر مجھے خزاں سے کوئی دکھ نہیں پہنچا تھا۔ میں تو خزاں کی پیداوار تھی۔ اسی موسم میں میں نے آنکھ کھولی تھی۔ درختوں سے جھڑتے پتے مجھے غمگین کر جایا کرتے ہیں۔ خشک چرمر کرتے پتے بے آب و گیاہ بھوبھل زمین تیز ہواؤں میں اڑتے پھرتے پتے قدموں تلے آ کر روندے جاتے جو کبھی درختوں کی زینت ہوتے تھے۔ پیڑ ننگے ہو جاتے ہیں۔ سوکھی ٹنڈ منڈ ٹہنیاں آپس میں سرگوشیاں کرتی ہیں اور اپنے بے لباس جسموں کو چھپانے کی بے سود کوشش کرتی ہیں۔ ایسے ہی اداس موسم میں میرا بیٹا سدھارا تھا اور جب وہ جو میری جیون جیوتی تھا۔ میرے جیون کی ڈور سے بندھا تھا۔ میرے قریب ہو کر کہا۔ "آؤ چلو سیر کرنے چلتے ہیں۔" "کہاں ــــ کہاں چلتے ہیں؟" میں نے اپنے خیالوں کے تانے بانے سے نکل کر پوچھا۔ "چلو گلاب جنگل باغ چلتے ہیں۔" "ایسے اجاڑ موسم میں باغ میں کیا رکھا ہوگا۔ نہ پھول ہوں گے نہ

پتے۔" میں نے جل کر کہا۔ "ایسی دھول اڑتی فضا میں سیر کا کیا خاک مزا آئے گا؟" "اچھو تو سہی" انہوں نے اصرار سے کہا۔ "خزاں میں بھی ایک قدرتی حسن ہوتا ہے۔" وہ مجھے بعد اصرار گلاب جنجبیلی باغ لے کر گئے۔ باغ کی روشیں سوکھے پتوں سے اٹی پڑی تھیں۔ زمین پر خشک پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا پیروں میں آ کر پیلے، بھورے پتے عجیب قسم کی آوازیں پیدا کرتے تھے۔ جیسے فریاد کر رہے ہوں مگر کہیں کہیں گلاب ابھی کھلے ہوئے تھے اور گویا لطف مند پیڑوں کو دلاسہ دیتے ہوں۔ فکر نہ کرو، ہم تو ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا۔

ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چر مر کرتے مرجھائے ہوئے پتوں کو قدموں تلے روندتے چلتے رہے اور تب اچانک میرے دل میں خوشی کا ایک گولا سا اٹھا اور میں نے محسوس کیا کہ واقعی خزاں کا بھی اپنا رنگ ہے اپنا روپ ہے۔ قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز میں حسن ہے۔ ہم ہی بے قدرے قدرے ہیں۔ یوں پہلی مرتبہ مجھے خزاں اچھی لگی۔ خزاں ہی تو ہے جو بہار کی آمد کا سندیس لاتی ہے۔ خزاں نہ ہو تو بہار بھی یکسانیت کا شکار ہو کر بے کیف لگے۔ اس وقت میرا دل ایک انجانی خوشی سے جیسے بھر سا گیا۔ جذبے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان کو بدلتے میں دیر نہیں لگتی۔ میں جو کبھی خزاں آنے سے پہلے خزاں کے خوف میں مبتلا ہو جایا کرتی تھی۔ اکتوبر کے مہینے میں خیالی اور جنگلی پڑتی دھوپ میرے وجود کو اداسی میں جکڑ لیتی تھی اب بدلتا موسم مجھے توانائی کا احساس دلاتا ہے اور جب میں نے خزاں سے سمجھوتہ کر لیا تو میری زندگی میں خزاں جیسے پیچھے کا ذکر بیٹھ گئی ہے اور میں تنومند درختوں کی مانند ہو گئی ہوں۔ وہ شخص جس نے مجھے خزاں کی آگہی سے آشنا کیا تھا وہ مجھے دائمی خزاں کے سپرد کر کے خود بہاروں کے دیس چلا گیا اور اب خزاں و بہار میرے لئے یکساں ہے۔ جبکہ میری زندگی میں بہت سی بہاروں کا نزول ہو چکا ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔ ننھے منے گل بوٹوں سے میرے گلستان کا آنگن بھرتا چلا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر شگوفے کے کھلنے پر مجھے اس کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ___ جس نے مجھے خزاں سے مانوس کیا تھا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ میری زندگی میں دائمی خزاں آنے والی ہے؟

میں اگرچہ خزاں رسیدہ ہوں   لوگ مجھ کو بہار کہتے ہیں

میں خزاں رسیدہ ہوتے ہوئے بھی بہاروں کے خواب بنتی ہوں۔ یہ ننھی منی کلیاں جب میرے گلے کی مالا بنتی ہیں تو میں ہر دکھ بھول کر جیسے مکمل انجان ہوں کہ نظام زندگی یہی ہے۔ پت جھڑ کے بعد ہی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ نو پنو شگوفے نئے رنگ و روپ کے ساتھ پھوٹتے نظام حیات کو بدلنے کی میں مجاز کب ہوں؟ چنانچہ میں نے اپنے آپ سے بھی سمجھوتہ کر لیا ہے۔ مجھے خزاں سے کوئی گلہ کوئی شکوہ نہیں، ہاں البتہ دل کے موسم الگ ہیں۔ ان کو ظاہر کرنا ضروری بھی کیا ہے۔ زخم سے کھرنڈ اتارا جائے تو زخم مزید رسنے لگتا ہے۔ تازہ ہو جاتا ہے لیکن زخم تو چہرے کے کینوس پر تصویر بن کر ابھرتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں ان تصویروں کو اپنے بشرے سے کھرچ کر پھینک دوں مگر ان کے رنگ بہت گہرے ہیں۔ بہار اپنا جوبن دکھا کر گزر چکی ہے اور خزاں پھر آ جاتی ہے۔ اللہ کے فضل سے میرا گلشن باغ و بہار ہے۔ میں خود کو اس بہار آفریں موسم میں گم کر دینا چاہتی ہوں لیکن میرے دل پہ چھائی یاس، غمگین فضا میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس بھرے پرے گھر میں بھی میں خود کو تنہا کیوں محسوس کرتی ہوں؟ کیوں میں اپنی اس گمشدہ بہار کی متلاشی ہوں؟ جو میرا ساتھ نبھا نہ سکے۔" آؤ گلاب جنجبیلی باغ کی سیر کو چلتے ہیں۔"

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد یہ معلوم   کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

◆◆◆

زمینی جوڑا......!

شکیل احمد خاں

مختصر تعارف

ڈاکٹر شکیل احمد خان 6 اپریل 1976ء کو حیدرآباد (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ 1993ء میں سندھ یونی ورسٹی سے ایم۔ اے اردو کیا۔ بعد ازاں 2011ء میں کراچی یونی ورسٹی سے اردو ادب میں پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ نوے کی دہائی میں افسانے لکھنے کا آغاز کیا۔ افسانوں پر مشتمل ان کا مجموعہ "خواب اور طرح کے" 2012ء میں منظر عام پر آیا۔ 1996ء میں ان کا ایک تحقیقی مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ وہ ایک ادبی رسالے "روحِ ادب" کراچی / حیدر آباد (1998ء) کے مدیرِ اعلیٰ اور سات کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔ افسانوں کے ساتھ ساتھ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین، خاکے، سفرنامے اور تبصرے بھی مشہور ہیں۔

"بیٹا اٹھ جا، پانچ بج رہے ہیں۔ ساڑھے چھ بجے وہ لوگ آ جائیں گے" قدوس صاحب نے اپنی سوئی بیٹی ثمرہ کا آہستہ سے کاندھا ہلایا۔ "جی ابا" ثمرہ اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے فوراً اٹھ بیٹھی۔ "اور دیکھ ٹھیک سے تیار ہو جانا، تیری ماں زندہ ہوتی تو مجھے یہ ہر بار کہنا نہیں پڑتا، تو خود سمجھ دار ہے۔ بس کوئی کسر نہ رہے" انہوں نے لجاجت سے کہا "تیری چھوٹی بہن اپنے سسرال سے آ گئی ہے، ان لوگوں کے لیے کچن میں ناشتہ تیار کر رہی ہے، ایک نظر وہاں بھی مار لینا" یہ کہہ کر وہ مڑے اور اسٹک کے سہارے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ ثمرہ پلنگ پر گم سم سی بیٹھی اپنے بوڑھے بیمار اور فالج زدہ والد کو مغموم اور بے بسی کی نظروں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ ان کی اس صورتِ حال کی ذمہ دار خود کو ٹھہراتی تھی اور یہ بات بہت حد تک درست بھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں بہت زیادہ دباؤ میں رہنے لگے تھے۔ پہلے بلڈ پریشر پھر شوگر اور ایک دن فالج کی زد میں آ کر بستر سے لگ گئے۔ پھر بیٹی کی تیمارداری اور اپنی خود اعتمادی نے انہیں دوبارہ بستر سے کھڑا کر دیا اور وہ اسٹک کا سہارا لے کر چلنے پھرنے لگے۔ فالج ہی کے سبب انہوں نے اپنی سرکاری ملازمت سے دو سال قبل ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ویسے بھی اب ان کو پیسے دھیلے کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ دونوں چھوٹی بیٹیوں کو وہ پہلے ہی رخصت کر چکے تھے، اب صرف بڑی بیٹی ثمرہ رہ گئی تھی، اس کے لیے انہوں نے مناسب پس انداز کیا ہوا تھا۔

وہ جب پچاس کے پیٹے میں تھے تو ان کی بیوی کا چھاتی کے کینسر جیسے موذی مرض میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی اور اپنی ساری توجہ تینوں بیٹیوں پر مرکوز رکھی۔ وہ ان کے لیے باپ اور ماں دونوں کا کردار ادا کرتے رہے اور اچھی تعلیم و تربیت کے ساتھ بہترین پرورش کی۔ ثمرہ کی شادی بھی وقت پر ہو جاتی لیکن وہ بڑی ہونے کے ناطے اپنے والد اور گھر کا سہارا بنی رہی۔ اس نے اپنی

بہنوں کی خاطر نہ صرف شادی سے گریز کیا بلکہ اپنی تنخواہ سے بہنوں کی شادی اور ان کا جہیز بنانے میں والد کی بھرپور مدد کی، اب جب کہ وہ شادی کی عمر پار کر رہی تھی اور تھائی رائیڈ نے چہرے کے نقوش اور بدن کو بھرا دیا تھا، اس کے مناسب رشتے آنا تقریباً بند ہو گئے تھے، سرکاری ملازم ہونے کی لالچ میں کچھ رشتے آئے بھی مگر اسے دیکھ کر وہ دوبارہ نہیں لوٹے، بڑی عمر اور دوسری شادی کے خواہش مند وہ تھیں، رشتے جو اپنے لیے کم عمر اور چھریری دلہن چاہتے تھے، اس لیے ان سے بھی کوئی بات نہیں بنی، یہی وہ فکرات تھیں جو قدوس صاحب کو چکرائے دے رہی تھیں۔ ان حالات میں نجمہ کا دل بھی شادی سے اچاٹ ہو چکا تھا، اس کے اندر شادی کی کوئی لے، کوئی امنگ، کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوتا تھا لیکن وہ والد کی پریشانی اور فکرات کو دیکھ کر جب بھی کوئی اسے دیکھنے آتا تیار ہو جاتی تھی، اس نے ان ہی کے کہنے پر اپنا وزن گھٹانے کے لیے شام کو قریبی پارک میں جوگنگ کا آغاز بھی کر دیا تھا اور وہ وہاں سے پسینے میں تر بتر ہو جانے کے بعد لوٹتی تھی، اس دوران اس نے کچھ پونڈ وزن کم کر لیا تھا مگر دلہن کے معیار پر پورا اترنے میں ابھی اسے سخت محنت درکار تھی۔

آج کا نتیجہ بھی پچھلے نتیجوں سے مختلف نہیں نکلا، حالاں کہ آج اس نے چھوٹی بہن کے کہنے پر غیر معمولی بناؤ سنگھار کے ساتھ موٹے بدن کو چھپانے کے لیے چست لباس بھی زیب تن کیا تھا لیکن وہ پھر رد کر دی گئی تھی، والد کے چہرے پر پھیلی مایوسی پڑھنے کے بعد اس نے غصے کی حالت میں پہلے میک اپ سے سجا اپنا چہرہ دھویا پھر لباس تبدیل کر کے پارک چلی گئی، وہاں پہنچ کر وہ کچھ دیر تک گم سم سی کھڑی رہی، ناکامی اور غصے نے اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو کر رہ گئی تھی، پھر اس کے من میں نہ جانے کیا آیا، وہ واک ٹریک میں بنی پگڈنڈی پر حسب معمول جوگنگ کرنے کے بجائے دوڑنے لگی، یہ سوچے بنا کہ آس پاس کے لوگ اسے کن نظروں سے دیکھ رہے ہیں؟ اس کے بارے میں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ سب کی پروا کیے بغیر بس دوڑے جا رہی تھی، دوڑتے دوڑتے جب اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں اور غصے کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تو اسے ہوش آیا، اس نے اپنی رفتار کم کر کے خود کو روکا اور لوگوں کی حیرانی سے دیکھتی نظروں سے بچنے کے لیے دیوار کی طرف رخ موڑ کر اپنی تیز چلتی سانسوں کو قابو کرنے کی کوشش میں لگ گئی، سانسوں کا اتار چڑھاؤ جب کچھ دھیما پڑا تو وہ گھر واپسی کے لیے دائیں بائیں دیکھے بغیر آہستہ آہستہ گیٹ کی جانب چل دی، گیٹ کے قریب پہنچتے ہی اس کی نظریں غیر ارادی طور پر کنارے پر بنی سیمنٹ کی بینچ کی طرف اٹھ گئیں، اتفاق سے آج بھی وہ شخص وہاں بیٹھا پان کلّا چباتے ہوئے اسے گھور رہا تھا، یہ اس کا روز کا معمول تھا، وہ نجمہ کو اپنے ہر چکر میں اسی بینچ پر بیٹھا اسے گھورتا اور مسکراتا ہوا ملتا تھا اور وہ اس حرکت پر اسے غصے سے دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیتی تھی لیکن آج اس کی نظر غصے سے عاری تھی۔

قدوس صاحب نجمہ کے نکاح پر بہت خوش نظر نہیں آ رہے تھے، ان کو جیسے داماد کی توقع تھی، وہ اس سے کہیں بہتر مل گیا تھا، خوش شکل، تعلیم بی اے، برسرروزگار اور سب سے بڑھ کر وہ نجمہ سے تین چار سال ہی بڑا تھا، البتہ اس میں بس ایک ہی کمی تھی، وہ ہم زبان نہیں تھا، نجمہ نے جب یہ معلومات انھیں دی اور ساتھ میں اپنی پسند کا اظہار بھی کیا تو وہ فوراً اس رشتے پر راضی ہو گئے، شادی کی مختصر اور سادہ تقریب بھی نجمہ نے اپنی مرضی چلاتے ہوئے گھر پر ہی رکھی تھی اور دولہا کی طرف سے صرف اس کے گھر والوں کو اور اپنی فیملی میں سے دونوں بہنوں اور بہنوئیوں کو اس تقریب میں مدعو کیا تھا۔

رخصتی کے وقت اُس کی بہنوں نے اُسے دلہے کے ساتھ صوفے پر لا کر بٹھا دیا۔ موٹی ہونے کے باوجود وہ دلہن کے رنگ روپ میں نظروں کو جھکائے بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اور کیوں نہ لگتی سب سے چھوٹی بہن نے جو ایک ماہر بیوٹیشن بھی تھی اپنی ماں جیسی پیاری بہن کا دل سے بناؤ سنگھار کیا تھا۔ دلہا بھی اُسے دیکھ کر نظروں نظروں میں واری واری جا رہا تھا۔ اُس کی ماں، بھابھی اور وہ بہنوں کی نظریں دلہن کے حسن سے زیادہ اُس کے گہنوں پر تھیں اور ان کے درمیان موضوعِ بحث تھا کہ یہ اصلی ہیں یا نقلی۔ جب کہ والد اور بڑا بھائی قدوس صاحب سے باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس دوران ان کی نظریں وقفے وقفے سے اپنی بیٹی نجمہ پر بھی اُٹھ جاتی تھیں۔ وہ اس کے چہرے پر ایک کرب، ایک بے چینی سی محسوس کر رہے تھے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اسے اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ ہے، مطمئن ہو گئے۔

اسے کار میں بیٹھنے سے پہلے وہ اپنی بہنوں اور بھابیوں سے بڑی خوش دلی سے ملی البتہ اپنے والد سے ملتے وقت اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں مگر چہرہ مسکراہٹ لئے تنا رہا اور وہ اسی حالت میں دلہے کے ساتھ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کار کے روانہ ہوتے ہی نجمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ اس نے اپنی شادی کے لیے جو کچھ کیا تھا وہ اس پر نادم تو تھی لیکن ساتھ میں مطمئن بھی تھی کہ اس طرح اس نے اپنے والد کو ان کے قرض سے سبک دوش کر دیا تھا۔ کار ابھی کچھ ہی دور چلی تھی کہ دلہا نجمہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "میری جان! جھوٹی اداکاری بہت ہو گئی" اس نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا "اب شدید طلب ہو رہی ہے، اگر اجازت ہو تو منہ میں گٹکا دبا لوں، قسم سے تین گھنٹے ہو گئے منہ میں ذرا سا بھی نہیں آیا"۔

◆◆◆

"تخلیق ایوارڈ" کے انتخاب کے لئے کمیٹی

"تخلیق ایوارڈ" خالصتاً ادبی ایوارڈ ہے جس کو اتفاقِ رائے سے دیا جاتا ہے ہمیشہ تین ناموں کا انتخاب کر کے ایک کو منتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس میں مدیر سمیت سب کمیٹی ممبران کو صرف ووٹ دینے کا حق ہوتا ہے اور زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے کو منتخب کیا جاتا ہے۔ 2021ء کے ایوارڈ کے لئے جو کمیٹی منتخب کی گئی وہ مدیر کی صوابدید پر ہے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

1- محترم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا 2- محترم غلام حسین ساجد 3- محترم ڈاکٹر ایوب عظیم

4- محترم سرفراز سید (تخلیق ایوارڈ یافتہ 2018ء) 5- محترم سونان اظہر جاوید

کمیٹی کے ناموں یا ان کی قابلیت پر کسی کو کوئی اختلاف ہو تو "ہمیں خیال" میں اظہار کیا جا سکتا ہے کیونکہ مثبت تنقید ہی اصلاح کا راستہ ہے۔ (ادارہ تخلیق)

نشانی

ترجمہ: محمد اسلم

مصنف: او ہنری

مختصر تعارف

محمد اسلم 6 جنوری 1943ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ "مرزی کا دیا" پنجابی ناول کا اردو ترجمہ ماہنامہ "ادب لطیف" میں اشاعت پذیر ہوا۔ انگریزی کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں۔ ترجمہ کے فن پر عبور حاصل ہے۔

مس لِنٹ ڈی آرمانڈے نے براڈوے (Broadway) کی طرف پیٹھ کر لی۔ یہ ادلے کا بدلہ تھا کیونکہ براڈوے نے اپنا اکثر مس لِن کے ساتھ کیا تھا۔ تاہم اس میں ادلے کا پلہ بھاری تھا۔ براڈوے کی Reaping the Whirlwind کمپنی کی سابقہ اگوان خاتون کو براڈوے سے شکایتیں تھیں نہ کہ براڈوے کو مس لِن سے۔ سو مس لِنٹ ڈی آرمانڈے نے اپنی کرسی کی پشت اس کھڑکی کی طرف پھیری جو براڈوے کی طرف کھلتی تھی اور وہاں بیٹھ کر کالی سلکی جراب کی ادھڑی رفو کرنے لگی۔ کھڑکی کے نیچے براڈوے کی چکاچوند اور ہنگامہ اس کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لئے کچھ پرکشش تھا تو وہ سڑک کے کنارے پریوں کے دیس کے ڈریسنگ روم کی وہ دم گھٹنے والی فضا اور ترنگ سے لبریز اس ماحول میں شوروغوغا کرتے تماشائی تھے۔ اس عرصے میں جرابیں توجہ چاہتی تھیں۔ سلک بھی پرانی ہو جاتی ہے لیکن اب اس کے علاوہ تجسس کی کیا چیز باقی بچی ہے؟

ہوٹل تھیلیا (Thalia) براڈوے کی طرف ایسے رخ کیے ہوئے ہے جیسے میراتھان (Marathon) سمندر کی طرف۔ اس کی مثال وہ عظیم شاہراہوں کی لہروں کے ٹکراؤ سے بچنے والے گرداب سے اٹھنے والی چٹان کی تھی۔ یہاں چیتھڑوں بھری آوارہ گردی کے بعد اکٹھے ہو کر اپنے پاؤں کو آرام دیتے اور جرابوں کی گرد جھاڑتے ہیں۔ ہوٹل تھیلیا کے اردگرد کی سڑکوں پر بکنگ آفسوں کی تھیٹریکل، ایجنسیوں کی سکولوں کی بھیڑ ہے اور ان کی طرف خاردار راستے جاتے ہیں۔ اندھیرے اور ٹی کی بو سے تھیلیا کے ان ہالز سے گزرتے ہوئے آپ کو کسی سمندری جہاز یا کاروان کا گمان ہوتا ہے جو کسی لمبے لہروں پر تیرنے لگے گا، پرواز کرے گا یا پہیوں پر آگے حرکت کر جائے گا۔ یہاں بے چینی، دوبارہ ابتدا، یہاں تک کہ ڈر اور توقف کی فضا چھائی رہتی ہے۔ ہالز بھول بھلیوں کا مجموعہ ہیں۔ کسی گائیڈ کے بغیر آپ سیم لائیڈ (Sam Lyod) کے معمے کی طرح بھٹک جاتے ہیں۔ آپ کوئی موڑ مڑتے ہیں اور بند گلی آ جاتی ہے۔ غسل کے لباس میں ملبوس آپ کو لوگ بدنام غسل خانوں کی تلاش میں ملیں گے۔ سینکڑوں کمروں سے باتوں کی اور نئے پرانے گانوں کی آوازیں

آتی ہیں اور اکٹھے ہوتے فنکاروں کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔

موسم گرما آ چکا ہے۔ ان کی چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں اور وہ آنے والے سیزن میں معاہدہ کرنے کیلئے تھیٹرز کو گھیرے ہوئے اپنی پسندیدہ جگہوں پر آرام کرتے ہیں۔ دوپہر کے اس حصے میں ایجنٹس کے دفتروں کے چکر لگانے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ گلی کی رو لیے ہال کمروں کے ارد گرد بغیر مقصد گھومتے ہوئے نقاب پہنے ستارہ آنکھوں والی حوریں، ریشمی لباس کی آواز پیدا کرتی، فرنگی پانی کی مہکار اور اپنی خوش دلی سے اداس برآمدوں کو معطر کرتی، آپ کو ملیں گی۔

تھیلیا میں زندگی کی اس ہماہمی میں غیر متعین وقتوں سے، بیزاری لوگوں کے کھلتے دشمن رجحان ڈالتے ہیں۔ یوں ان اوقات کے ساتھ تھیلیا میں زندگی کو سمجھنا آسان ہے۔ مس ڈی آرماڈ کا کمرہ چھوٹا تھا۔ اگر اس کی آئینے والی میز اور واش اسٹینڈ کو لیے رکھا جائے تو ان کے درمیان اسکی جھولا کرسی کی جگہ نکلتی تھی۔ میز پر معمول کی سجاوٹی چیزیں رکھی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اگر ان خاتون کی ذاتی یادگاریں جو سڑکوں پر کیے جانے والے پروگراموں میں اس کے حصے میں آئیں اور اس کے محبوب ترین اور بہترین ہم پیشہ دوستوں کی تصویریں تھیں۔ رفو کرتے ہوئے ان تصویروں میں سے ایک تصویر کو اس نے دو یا تین دفعہ چاہت سے دیکھا۔

''اس مجھے نہ جانے کی کہاں ہوگی'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اگر آپ اس تصویر کو دیکھ سکتے تو پہلی نظر میں آپ کو لگتا کہ کئی پتیوں والے سفید پھول ہوا میں، کسی طوفان نے بکھیر دیے ہیں۔ اس تصویر میں آپ کو مس روزالی رے، مختصر قلمی سکرٹ میں نظر آنے کی جو سٹیج سے دور بیٹھے کے سروں سے اوپر، دستار یا (رنگ برنگے پھولوں والی جھاڑی) میں جھنڈی یم والے کی شکل میں چھلانگ لگا رہی ہے۔ آپ کو کیمرہ وہ خوبصورت توانائی نہ دکھا سکے گا جس کی مدد سے وہ اپنی پھرتیلی ٹانگ سے زرد ریشمی موزے کا فیتہ ہوا میں اڑاتی اور ہر شام وہاں میں نیچے بیٹھے مجمع سے اوپر پھینکا کرتی تھی۔

آپ اس میں سیاہ کپڑوں میں ملبوس، جن کی اکثریت مردوں کی ہے، اس پتے ہوئے گروپ کے لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں جو کالونی، ڈانس اور مزاح کے ایکٹ میں کام کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ اس شاندار نشانی کو پکڑنے کیلئے اٹھے ہوئے ہیں۔ ان تھیٹرز کے چالیس ہفتوں میں، ہر دو سال میں، مس روزالی رے اس کا حصہ تھی۔ باقی کے بارہ ہفتوں میں وہ دوسرے کام کرتی۔ جیسا کہ کوئی ڈانس یا گانا، دو یا تین اداکاروں کی نقل اور بیزری اور بیوں کے دستر کے ساتھ توازن برقرار رکھنے کا ایکٹ لیکن جب پھولوں سے لدا جھولا تھیٹر کی چھت سے لٹکایا جاتا، اور مس روزالی اسٹیج سے دائرے کے جلو میں، جس نے تھوڑی ہی دیر میں نیچے اترنا تھا، مسکراتے ہوئے اس میں آکر بیٹھتی اور مجمع تشکر سے چیختا اور ایک ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا، اور یہ تمام باتیں مس روزالی کی شہرت کا باعث بن رہی تھیں۔ دو سال کے بعد مس روزالی نے اپنی پیاری دوست مس ڈی آرماڈ کو بتایا کہ وہ موسم گرما لانگ آئی لینڈ کے شمالی ساحل کے ایک بہت پیارے گاؤں میں گزارے گی اور یہ کہ اب وہ سٹیج پر کام نہیں کرے گی۔ اپنی پرانی دوست کے بارے میں جاننے کی خواہش کے سترہ منٹ بعد اس کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ شک نہ کریں کہ یہ روزالی رے تھی۔ درشت آواز میں اجازت ملتے ہی وہ تیزی سے اندر آئی۔ تھکی تھکی، اور اپنا چند یک فرش پر گرا دیا۔ یقین کریں، میلے کچیلے کوٹ میں، بے ڈول نقاب اوڑھے جس کے دونوں سرے لٹک جھک گز بھر کے ہوں گے، بھورے سفری سوٹ، آکسفورڈ کے جوتے اور زرد جرابوں میں ملبوس، یہ روزالی تھی۔

جب اس نے ہیٹ اور نقاب اتارا، اس کا خوبصورت چہرہ نظر آیا جو سرخ ہو رہا تھا اور کسی غیر معمولی جذبے سے بے چین تھا۔ بڑی بڑی نیلی آسودہ آنکھیں اس کے حسن کو ماند کر رہی تھیں۔ اس کے بھاری گھنگریالے براؤن رنگ کے بال، جنہیں جلدی میں بنایا گیا تھا، غیر ضروری پنوں اور کنگھیوں کی وجہ سے، گھنگریالے پن کھو چکے تھے۔ ان کی ملاقات سوسائٹی میں ان کی غیر پیشہ ور بہنوں کے برعکس فضولیات، اچھل کود، بناوٹی اور سوال و جواب سے پاک تھی۔ انہوں نے مختصر لیکن مضبوط معانقہ کیا۔ بیک وقت ایک دوسرے کو تھپتھپایا اور وہ دوبارہ سے پرانے وقتوں میں پہنچ گئیں۔ ان کی ملاقات ایسی تھی جیسے سپاہی ایک دوسرے کو مختصر سلام کرتے ہیں یا جنگل میں سفر کرنے والے مسافر راہ چلتے ایک دوسرے کو سرراہ ملتے ہیں۔

''میرا کمرہ تمہارے کمرے سے دو سیڑھیاں اوپر ہے'' روزالی نے کہا۔ ''لیکن اوپر جانے سے پہلے میں تمہیں ملنے آ گئی۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ تم یہاں...'' ''میں اپریل سے یہاں ہوں'' نینسی نے جواب دیا'' اور میں ٹور پر Fatal Inheritance کمپنی کے ساتھ جانے والی ہوں۔ اگلے ہفتے ہمارا پروگرام البنی میں شروع ہوگا۔ میرے خیال میں تم تو اسٹیج ترک کر چکی ہو۔ اپنے بارے میں بتاؤ۔'' مس روزالی نے چابکدستی سے اپنے آپ کو مس ڈی آرماطے کے کپڑوں والے بکس کے اوپر براجمان کر لیا اور اپنا سر کاغذ لگی دیوار کے ساتھ ٹکا لیا۔

''میں تمہیں بتاتی ہوں نن'' اس نے اپنے جوان، خوبصورت چہرے پر ایک مصنوعی لیکن صابرانہ تاثر لاتے ہوئے کہا'' ہو سکتا ہے کل میں براڈوے میں واپس آ جاؤں اور ایجنسی کے دفتروں کی کرسیوں کا رنگ گھسانا شروع کر دوں۔ آخری تین ماہ میں اگر کوئی مجھ سے آج دوپہر چار بجے تک کہتا 'اپنا نام اور پتہ چھوڑ دیں' تو میں اصلی مسز فسک کی طرح ہنستی۔ نن مجھے اپنا رومال دو گی لیکن وہ لانگ آئی لینڈ کی کاروان معصیت ہیں۔ اب میرے چہرے پر علام کو کسی راکھ کی ایسی تہہ جم چکی ہے کہ میں "ناپی" کا کردار شاہ بلوط کی لکڑی کی راکھ لگائے بغیر کر سکتی ہوں اور کارک کا ذکر آیا ہے تو نن تمہارے پاس کوئی شراب ہے؟''

مس ڈی آرماطے نے واش سٹینڈ کا دروازہ کھولا اور ایک بوتل نکالی۔ ''مین ہٹن (Manhattan) کا ایک پیگ ہے۔ گلاس میں سرخ رنگ کا پینٹ ہے لیکن...'' ''مجھے بوتل ہی پکڑا دو، گلاس رہنے دو۔ شکریہ، مزا آ گیا۔ تین ماہ میں پہلی شراب...'' ''مس نن آخری سیزن کے اختتام پر میں نے اسٹیج پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ میں اس زندگی سے بیزار تھی اور خصوصاً اس لیے کہ میں ان اور روح مردوں سے بیزار ہو چکی تھی۔ خاص طور پر وہ مرد جو اسٹیج شوز میں آتے ہیں۔

''اور شو کے اختتام پر ہمیں بدترین مردوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ان میں اسٹیج کے دروازے پر کھڑے ہونے والے لوگ، منیجر کے دوست جو شام کے کھانے پر لے جاتے ہیں، انہیں اپنے ہیرے دکھاتے ہیں اور ہم سے ملنے کے لئے 'ڈین'، 'ڈیو' اور 'چارلی' سے ملتے ہیں۔ ایسے لوگ جانور ہوتے ہیں اور مجھے ان سے نفرت ہے۔ نن میں تمہیں بتاتی ہوں ہم جیسی لڑکیوں پر ترس کھانا چاہیے۔ ہم جیسی اچھے گھرانے کی لڑکیاں جو اس شعبے میں اپنا معیار اس سے آگے جانا چاہتی ہیں لیکن نہیں جا پاتیں۔ لوگ کورس گانے والی لڑکیوں پر ترس کھاتے ہیں جو ہفتے میں صرف پندرہ ڈالر کماتی ہیں۔ حقیقت ہے! کورس والی لڑکیوں کے ظالم منتقل کرنے کے لئے تو ایک کھانا ہی کافی ہے۔

''اگر آنسو بہانے ہی ہیں تو ان ایکٹریس کیلئے بہائے جائیں جو ہفتے میں تیس سے پینتالیس ڈالر لیتی ہیں اور چوتھوں کی

نمائش میں آگے ہوتی ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی زندگی میں بہتری نہیں آئے گی لیکن وہ سالہا سال بھی رہتی ہے۔ اس امید پر کہ اسے بھی چانس ملے گا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

''لیکن مجھے سب سے زیادہ نفرت مردوں سے تھی۔ میزوں کے گرد بیٹھے ایسے مرد جو آپ کو کمینی نظروں سے گھورتے ہوئے فحش جملے بازی کرتے ہیں اور اپنے اندازے کے مطابق آپ کو وزیر کریا ایکسٹرا رائی کے عوض خریدنا چاہتے ہیں۔ پھر مجمع میں بیٹھے تالیاں بجاتے، آوازے کستے، غراتے، اسٹیج کی طرف لپکتے، پہلو بدلتے اور للچائی نظروں سے ٹکٹکی باندھے یوں جانوروں کی طرح دیکھتے ہیں جیسے اگر ہم ان کے پنجوں کی پہنچ میں آ جائیں تو وہ ہمیں کھا جائیں گے۔ مجھے ایسے مردوں سے نفرت ہے۔ اوہ! کیا بتاؤں میں ان سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔''

''میں تمہیں اپنے بارے میں تو بتا ہی نہیں رہی۔ ایسا ہے نا لن؟'' ''میں نے وہ سوداگر کے چیت کی تھی اور میں نے موسم گرما کے شروع میں اسٹیج کو خیرباد کہہ دیا۔ میں لانگ آئی لینڈ گئی اور وہاں ایک بہت پیارے گاؤں ساؤتھ پورٹ میں پہنچی جو لب سمندر تھا۔ میرا ارادہ وہاں موسم گرما گزارنے کا تھا اور موسم خزاں میں خطابت کرنے کے بارے میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہی تھی۔ ساحل کے پاس ہی ایک بیوہ حیائی کی جھونپڑی تھی جو کبھی کبھار صحت کی خاطر ایک دو کمرے کرایہ پر دیتی تھی۔ اس نے مجھے کمرہ دے دیا۔ اس جھونپڑی میں ایک اور مقیم ریورنڈ آرتھر لائل تھا۔

''وہ اخبار کی شہ سرخی لگتا ہے۔ لن تم سمجھ رہی ہونا۔ میں اس کے بارے میں ایک منٹ میں تمہیں بتا دوں گی۔ یہ ایک ایکٹ کا کھیل ہے۔'' پہلی مرتبہ ہی جب وہ میرے کمرے میں آیا تو اس نے مجھے پہلے جملوں ہی سے متاثر کر لیا۔ وہ مجمع والے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ لمبا، دبلا پتلا شخص تھا۔ کمرے میں اس کے آنے کی آواز نہیں آتی تھی بلکہ وہ آیا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ والٹ (Knight) کی تصویر تھی۔ وہ خاص لوگوں کی کلاس کا تھا۔ اس کی آواز مترنم تھی اور اس کے اطوار کیا کہنے!

''لن اگر تم اپنے بہترین ڈرائنگ روم میں جا اس ڈریو کی تصویر دیکھو اور پھر ان دونوں کا مقابلہ کرو تو تم ڈریو کو قتل ہونے کی پاداش میں گرفتار کرا لو۔'' میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گی لیکن ایک ماہ کے اندر ہماری منگنی ہو گئی۔ وہ میتھاڈسٹ (Methodist) گرجے میں واعظ کیا کرتا تھا۔ جب ہماری شادی ہوئی تو کمرے میں ہنی سکل (Honeysuckle) کے پھول اور مرغیاں تھیں۔

''آرتھر مجھے جنت کے بارے میں واعظ کیا کرتا تھا۔ لیکن میرا ذہن ہنی سکل اور مرغیوں میں گھرا رہتا تھا۔'' نہیں میں نے اسے اپنے اسٹیج کیریئر کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ مجھے اس شعبے سے نفرت ہو گئی تھی اور یوں وقت گزرتا گیا۔ میں اس پیشے سے ہمیشہ کیلئے علیحدہ ہو چکی تھی اور اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں ایک اچھی لڑکی ہوں اس لیے مجھے کسی اعتراف گناہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بجز اس کے کہ مجھے خطابت میں دلچسپی تھی اور اس بات کا میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔

''لن میں خوش تھی۔ میں کائر (Choir) میں گاتی تھی۔ سلائی کڑھائی سوسائٹی میں حاضر ہوتی تھی اور ہفتہ وار اخبار جو گاؤں سے نکلتا تھا کے مطابق میں پیشہ ور لوگوں کے جیسا اینی لاری (Annie Laurie) گاتی تھی۔ میں اور آرتھر کشتی رانی کرتے، جنگل میں گھومتے اور گھونگے پکڑتے اور وہ تنگ سا، چھوٹا گاؤں مجھے دنیا کی بہترین جگہ لگتا۔ میں وہاں رہ کر ہمیشہ خوش رہتی اگر۔۔۔'' لیکن

ایک صبح جبکہ میں بیوہ کے ساتھ عقبی پورچ میں لوبیا پھوڑ رہی تھی بیوہ باتیں کرنے لگی اور اس نے کافی معلومات اگل دیں۔ بالکل اسی طرح جیسے مالک مکان کرایہ داروں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ بیوہ کے نزدیک مسٹر ڈنکل ایک ولی تھا اور میرے لئے بھی۔ بیوہ اس کی خوبیوں کی تعریفیں کرتی رہی اور بتایا کہ آرتھر کا، کچھ عرصہ ایک طوفانی معاشقہ تھا جو ڈرامائی انداز میں ختم ہوا۔ اس کو اس کی تفصیلات کا علم تو نہیں تھا لیکن اسے اتنا معلوم تھا کہ اس سے آرتھر کو بہت صدمہ ہوا۔ شروع شروع میں وہ کمزور تھا اور اس کی رنگت زرد تھی۔ اس کے پاس اس عشق کی ایک نشانی بھی تھی جو وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں میز کی دراز میں مقفل رکھتا تھا۔

''کئی دفعہ'' وہ کہتی ہے ''میں نے اسے اس بکس کے پاس خود وہ بیٹھے دیکھا ہے اور جیسے اسے کسی کے آنے کا شک پڑتا ہے وہ اسے تالا لگا دیتا ہے۔'' ''تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں نے آرتھر کو کلائی سے پکڑ کر پوچھنے میں کتنی دیر لگائی ہوگی۔'' اسی دوپہر جب ہم کھاڑی کے کنارے، آبی للی کے پھولوں کے درمیان ایک کشتی میں دھیرے دھیرے بہہ رہے تھے۔ ''آرتھر'' میں نے کہا ''تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تمہارا کوئی اور معاشقہ بھی تھا۔ لیکن مجھے مسز گرلی نے بتایا ہے'' میں نے بات جاری رکھی تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ میں اس کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ مجھے جھوٹ بولنے والے شخص سے سخت نفرت ہے۔ ''تمہارے آنے سے پہلے'' اس نے بے باکی سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا ایک سابقہ عشق تھا۔ بہت مضبوط عشق۔ چونکہ اب تم اس کے بارے میں جان گئی ہو میں تمہیں سچ بتاؤں گا۔'' ''میں انتظار میں ہوں'' میں نے کہا۔

''میری پیاری آئلا'' آرتھر نے کہا ''ساؤتھ پورٹ میں میں اپنے اصل نام سے رہ رہا ہوں۔ دراصل یہ سابقہ معاشقہ ایک روحانی طرز کا تھا۔ اگرچہ اس خاتون نے میرے شدید ترین جذبات ابھارے، اور وہ میری مثالی عورت تھی۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا تھا، نہ ہی کبھی اس سے بات کی تھی۔ یہ ایک مثالی محبت تھی۔ تمہارے لیے میری محبت اگرچہ کم مثالی نہیں، لیکن مختلف طرح کی ہے۔ یہ بات ہمارے درمیان نہیں آنی چاہئے۔''

''کیا وہ خوبصورت تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ بہت خوبصورت تھی'' آرتھر نے جواب دیا۔

''کیا تم اسے اکثر دیکھتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ہاں تقریباً ایک درجن بار'' اس نے جواب دیا۔

''ہمیشہ فاصلے سے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ہاں! اچھے خاصے فاصلے سے'' اس نے کہا۔

''اور تمہیں اس سے پیار تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ میرے لیے خوبصورتی کی مثال تھی اور ۔۔۔ میری جان تھی'' اس نے کہا۔

''اور یہ نشانی جس کے اوپر تم پہرہ دیتے ہو کیا یہ اس کی یاد ہے؟''

''یہ ایک یادگار ہے جس کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔''

''کیا یہ اس نے بھیجی تھی؟'' ''یہ اس کی طرف سے آئی'' اس نے جواب دیا۔

''یہ بالواسطہ تم تک پہنچی؟'' ''کہہ سکتی ہو اور شاید بلاواسطہ۔''

''تم اس سے ملے کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا ''کیا زندگی میں تمہاری جگہیں اتنی مختلف تھیں؟''

''وہ مجھ سے بہت اونچے مقام پر تھی'' آرتھر نے کہا'' آ کٹا'' اس نے بات جاری رکھی۔ ''اب یہ ماضی کا قصہ ہے۔ امید ہے تم حاسد نہیں ہو گی۔ ایسا تو نہیں؟'' ''حاسد کیوں'' میں نے کہا'' تم کیا بات کر رہے ہو؟ پہلے کی نسبت اب میں تمہارے بارے میں کہیں زیادہ سوچوں گی۔'' ''اور ایسا ہی ہوا ـــ اگر تم سچ سمجھو تو۔ میرے لئے مثالی محبت کا یہ تصور بالکل نیا تھا کیونکہ یہ سن کر مجھے لگا کہ میں نے زندگی میں پہلے ایسی خوبصورت اور شاندار چیز کا نہیں سنا تھا۔ سوچو کہ ایک آدمی ایک عورت سے محبت کرتا ہے جس سے کبھی اس نے بات تک نہیں کی ہے اور اس کے ساتھ مخلص ہے کیونکہ اس کے دل نے اس کی ایسی تصویر بنا رکھی ہے۔ یہ بات مجھے بہت اچھی لگی۔ میں نے ہمیشہ ایسے مردوں کو جانا تھا جو بیویوں یا گھٹیا شراب اور یا گھوڑوں میں اضافے کے بل بوتوں پر تم پر مر مٹتے ہیں اور ان کے مثالی عورت کی کچھ نہ کہو۔'' ہاں اس بات کے بعد میں آرتھر کے بارے میں زیادہ سوچنے لگی۔ مجھے اس دور دراز کی عورت سے کسی قسم کا حسد نہیں ہوا جس کو آرتھر ابھی تک پوجتا تھا کیونکہ اب وہ میرا تھا اور اب وہ میرے دل میں زمین پر ایک ولی کی طرح گھر کر چکا تھا۔ جیسا کہ وہ بوڑھی گرلی کے دل میں سمایا ہوا تھا۔

''اس سہ پہر ایک آدمی آرتھر کو چرچ کے مریض کو دکھانے کیلئے لینے آیا۔ بوڑھی گرلی کاؤچ پر سہ پہر کا قیلولہ کر رہی تھی اور ہال میں اکیلی تھی۔'' آرتھر کی سٹڈی سے گزرتے ہوئے میں نے اندر جھانکا اور دیکھا کہ اس کی چابیوں کا گچھا اس کے ڈیسک کی دراز میں لٹک رہا تھا۔ وہ اسے پیچھے کو ساتھ لے جانا بھول گیا تھا۔ ہم سب لوگ اکثر اوقات کسی مسٹر بلیوبرڈ (Mr. Beueleard) کا شکار ہوتی ہیں ایسا نہیں!'' میں نے ارادہ کر لیا کہ میں آرتھر کی خفیہ نشانی دیکھوں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے اس کے چھپانے کی جگہ دیکھنی تھی بلکہ اس کی وجہ تجسس تھی۔'' دراز کھولتے ہوئے مجھے ایک دو چیزیں ایسی لگیں کہ وہ نشانی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی گلاب کا سوکھا پھول ہو گا جو اس کی محبوبہ نے بالکنی سے نیچے پھینکا ہو گا یا میگزین سے پھاڑی ہوئی اپنی کوئی تصویر کیونکہ وہ اونچی اعلیٰ سوسائٹی سے تھی۔
''میں نے دراز کھولا جس میں مردانہ کارڈ کیس کے سائز کی لکڑی کی ڈبیہ تھی۔ میں نے گچھے کی چابیوں میں سے ایک چابی سے اسے کھولا اور اس کا ڈھکنا اٹھا دیا۔'' میں نے نشانی پر ایک نظر ڈالی پھر اپنے کمرے میں جا کر بکس تیار کیا چھوٹے بیگ میں دو تین چیزیں ٹھونسیں، بالوں میں دوبارہ کنگھا کیا، سر پہ ہیٹ رکھا اور بڑھیا کو دیکھا۔ آرتھر کی وجہ سے میں نے وہاں اپنی زبان کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی لیکن پھر میں بے قابو ہو گئی۔'' خراٹے لینا بند کرو'' میں نے کہا'' اٹھو جاؤ ابھی وہ لمبا واپس آ جائے گا۔ میں جا رہی ہوں اور میں نے تمہارے آٹھ ڈالر دینے ہیں۔ ایکسپریس مین (Express Man) میرا صندوق لے جائے گا۔'' میں نے اسے رقم دی۔'' ''یا اللہ مس گرابی!'' وہ کہنے لگی'' کیا ہوا؟ میں تو سمجھتی تھی تم یہاں خوش ہو۔ ان جوان عورتوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ وہ تمہاری سوچ کے برعکس ہوتی ہیں۔'' ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو'' میں نے کہا'' کچھ ہوتی ہے لیکن یہ بات تم مردوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ انسانی نسل ایسی ہی ہے!!'' پھر میں نے 4.30 والی گاڑی پکڑی اور تمہارے سامنے ہوں۔''

''یہ تم نے بتایا ہی نہیں تھا کہ ڈبیہ میں کیا تھا'' مس ڈی آرما مطلب نے بے چینی سے پوچھا۔'' ان سستی فیتوں میں سے ایک فیتہ جو میں بالا سے پلٹتے ہوئے مجمع میں پھینکتی تھی! ان کی درجن 10 سینٹ کی ہے!''

◆◆◆

دُنیا جائے بھاڑ میں

رشی خان (جرمنی)

مختصر تعارف

رشی خان لاہور میں پیدا ہوئے۔ آج کل جرمن کے شہر برلن میں مقیم ہیں۔ صحافی، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ 10 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پہلی تخلیق ''ریزہ ریزہ کائنات'' 1977ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ترجمہ، شاعری، مائیگریشن اور کلچر پر متعدد کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ حال میں 10 کتب اشاعتی مراحل میں ہیں۔

جب گھر کے باقی تمام افراد اپنے اپنے کاموں کے لئے چلے گئے تو ماں نے باہر کا گیٹ بند کر دیا۔ پھر اندر آئی، کمرے کو لاک کیا، بیٹی کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''ہاں اب بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟''۔ بیٹی نے الٹا سوال کیا ''کاہے کا مسئلہ امی جان؟''۔

''ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آج کل کی بیٹیاں بڑی ہو کر یہ کیوں سمجھنے لگتی ہیں کہ وہ اپنے دکھ درد اپنی ماؤں سے بھی چھپا لیں گی؟''۔ ''میں نے کچھ نہیں چھپایا ہے آپ سے، آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟''۔ ''تم تین دن سے آئی بیٹھی ہو بیٹا، مگر اس دوران میں داماد صاحب کا ایک بھی فون نہیں آیا، کیوں؟''۔ ''میں نے انہیں خود منع کیا تھا''۔ ''مگر وہ تمہیں چھوڑنے بھی نہیں آیا، اس کی وجہ؟''۔ ''امی جان! اچانک پروگرام بنا تھا میرا۔ انہیں دفتر سے دیر ہو رہی تھی، اس لئے میں اکیلی آ گئی۔ اب یہاں آنے کے لئے بھی مجھے کیا اجازت لینی پڑے گی؟ یا آپ لوگوں کو پہلے سے اطلاع کرنا پڑے گا؟''۔

''بالکل نہیں، یہ تمہارے ماں باپ کا گھر ہے۔ اور میرے ہوتے ہوئے جب جی چاہے آ سکتی ہو، جب تک جی چاہے رہ سکتی ہو۔ مگر ابھی تمہاری شادی کو صرف چھ مہینے ہوئے ہیں اور تم اکیلی آئی ہو۔ پھر داماد کو کال کرنے سے بھی منع کر دیا ہے، اسی لئے سوال کر رہی ہوں''۔ ''تو سوال کرنا ہمیں بھی سکھا دیتیں۔ ہمیں تو بس یہ نہیں کرنا، وہ نہیں کرنا، ایسے نہیں چلنا، ویسے نہیں بیٹھنا، سر جھکا کے رکھنا ہے، بڑوں سے سوال نہیں کرنا وغیرہ وغیرہ ہی سکھائے ہیں آپ نے''۔ ''تم پر سکول سے لے کر یونیورسٹی تک کسی نے کوئی پابندی لگائی؟ تم نے ایم اے کیا، پھر ماشاءاللہ مقابلے کا امتحان پاس کیا، اب ایک سرکاری افسر ہو۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ روکا کہاں تھا تمہیں؟''۔ ''وہ تو آپ کی مہربانی ہے۔ خاص طور پر پاپا کی کہ اتنے مشکل معاشی حالات میں بھی تینوں بہنوں کی پڑھائی نہیں رکنے دی۔ لیکن شادی سے پہلے جس تربیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ تو نہیں دی نا آپ نے؟''۔ ''میں پہلے ہی کہتی تھی ضرور داماد سے جھگڑا کر کے آئی ہو گی''۔

''جھگڑا نہیں ہوا ہے امی جان! جس موضوع پر بات ہی نہیں ہوتی ہے اس پر جھگڑا کیسے ہو گا؟''۔

"وہ کون سا موضوع ہے جس پر میاں بیوی کے درمیان بھی بات نہیں ہو سکتی؟" ۔ "ہے نا امی جان! اب آپ کو کیسے بتاؤں؟ یہی تو ایک موضوع ہے، جس پر آپ سے کیسے بات کروں، یہ بھی نہیں آتا ہے مجھے۔ یہ تو ہمیشہ سے شجرِ ممنوعہ ہی رہا ہمارے لئے"۔ "تم خود پڑھی لکھی ہو۔ تیس سال تمہاری عمر ہو گئی ہے۔ داماد صاحب نے یورپ میں پڑھائی کی ہے۔ پھر بھلا کون سی بات ہے جو تم دونوں کے درمیان بھی نہیں ہو سکتی؟" ۔ "میں بھی تو یہی سمجھی تھی کہ اتنے سال یورپ میں رہے ہیں تو جو مجھے نہیں پتہ انہیں پتہ ہو گا۔ لیکن وہ تو کہتے ہیں کہ وہ پڑھائی کے دوران بھی نوکریاں کرتے رہے۔ انہوں نے یونیورسٹی، کام اور گھر کے علاوہ کچھ دیکھا ہی نہیں"۔

"یہ تو سچ ہے بیٹی! اس نے بڑی محنت کی ہے وہاں۔ پڑھائی کے ساتھ نوکریاں بھی کیں اور یہاں تین تین بہنوں کی شادیوں کا پورا پورا بندوبست اس اکیلے نے کیا۔ بہت شرافت سے گزارا ہے اس نے یورپ کا زمانہ بھی"۔ "اس سے تو اچھا تھا تھوڑا سا شرافت سے باہر نکل کر ہی دیکھ لیتے۔ کم از کم دنیا کی بھی کچھ سدھ بدھ آ جاتی۔ ہر بار میں اکیلی ہی تو اس عذاب سے نہ گزرتی"۔ "وہ تو اتنا سادہ اور تابعدار بچہ ہے۔ تم کس عذاب کی بات کر رہی ہو؟" "میں کیسے بتاؤں امی جان! یہی سمجھنے کے لئے تو یہاں آئی ہوں!"۔ "تم تھوڑی دیر کے لئے مجھے ماں کی بجائے اپنی پکی سہیلی سمجھ کر بتاؤ"۔ "ٹھہریے! مجھے مناسب الفاظ تلاش کرنے دیجیے پلیز"۔ "تم مجھے بے دھڑک بتاؤ بیٹی!"۔ "تو سنیے!" مگر وہ بتانے سے پہلے پھر کسی سوچ میں پڑ گئی۔

ماں بولی "بتاؤ بتاؤ۔ مجھ سے کچھ شرم مت کرو"۔ "امی! ہم شادی کے بعد سے ایک بیڈ پر سو رہے ہیں"۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم میاں بیوی ہو"۔ "میں نے انہیں کبھی انکار نہیں کیا، سوائے ان دنوں کے"۔ "تمہیں کرنا بھی نہیں چاہیے"۔ "لیکن امی جان! انہیں میرا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیے نا۔ میں کچھ کہتی نہیں لیکن جب تک میرے بدن میں طلب جاگتی ہے، وہ واش روم میں پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ اور بس! انہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ عورت بھی ایک انسان ہوتی ہے۔ اس میں بھی جذبات ہوتے ہیں اور جب اس کی خواہشات کو جگا کر پھر اس طرح کچلا جاتا ہے، تو وہ کس اذیت سے گزرتی ہے"۔ ماں کو جیسے ایک شاک سا لگا۔ وہ دھم سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی اور چند لمحے بالکل خاموش رہی، جیسے کچھ کہنے سے پہلے الفاظ تلاش کر رہی ہو۔ پھر بولی "لیکن۔۔۔۔ لیکن بیٹی! گھر بسانے کے لئے کچھ تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے نا!"۔ "کیوں؟ کیوں برداشت کرنا پڑتا ہے؟ اور پھر ایسی اذیت۔ کیوں کوئی انہیں بتا نہیں سکتا، سمجھا نہیں سکتا کہ وہ بیوی کا بھی کچھ خیال کریں؟ وہ بھی کچھ سیکھیں، اور اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر کے پاس جائیں"۔

"کہتی تو تم ٹھیک رہی ہو۔ بات تو کرنی چاہیے۔ لیکن بات کرے تو کون کرے؟"۔

"میں نہیں جانتی۔ لیکن جب تک انہیں کچھ نہیں آتی، میں واپس ان کے پاس نہیں جا سکتی"۔

"نہیں بیٹی! ایسا نہ کرو۔ ابھی چھ مہینے ہوئے ہیں تمہاری شادی کو۔ دنیا کیا کہے گی؟"۔

"دنیا جائے بھاڑ میں۔ میں کوئی اندھی ہوں؟ لولی لنگڑی ہوں؟ امی! میں پڑھی لکھی عورت ہوں۔ اچھا کماتی ہوں۔ صرف شادی شدہ نظر آنے کے لئے یہ اذیت کیوں برداشت کروں؟ اگر آپ نے مجھے ان معاملات کی تعلیم نہیں دی تھی، ان معاملات پر بات کرنا نہیں سکھایا تھا، تو وہ تو ایک مرد ہیں نا؟ انہیں تو یہ سب کہیں سے سیکھنا چاہیے تھا کہ نہیں؟"

◆◆◆

جگنو کہاں گئے......؟

عامر بن علی (جاپان)

مختصر تعارف

عامر بن علی یکم جنوری 1978ء کو جنوبی پنجاب کی تحصیل میاں چنوں میں پیدا ہوئے۔ B.Sc کرنے کے بعد ارادہ کیا کہ سائنس دان نہیں بلکہ ادب اور تجارت میں مستقبل تلاش کرنا ہے۔ 1999ء میں رسالہ ماہنامہ ''ارژنگ'' کا آغاز کیا جو اب تک جاری ہے۔ تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''گفتگو'' (انٹرویوز) اور ''آج کا جاپان'' (سفرنامے) اور ''کتاب جاپان'' (کالم) کی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور کئی کتب زیر طبع ہیں۔ اصل نام راؤ عامر حسین ہے جبکہ عامر بن علی قلمی نام ہے۔

جاپان کے مضافاتی علاقوں میں اس موسم کا سب سے مقبول میوزک، چاول کے کھیتوں سے مینڈکوں کی کورس میں ٹرانے کی آواز کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ تاروں کا تہوار گزر چکا ہے، جو اس ماہ کے کیلنڈر میں سب سے اہم ثقافتی موقع ہوتا ہے۔ اس اساطیری تہوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہماری کہکشاں "Milky Way" کے مخالف کناروں پر واقع دو ستاروں کی دھرتی پر دو پریمی رہتے ہیں۔ وہ پورا سال جدائی کا کرب جھیلتے ہوئے الگ الگ ستارے پر قیام پذیر رہتے ہیں، مگر ساتویں مہینے کی سات تاریخ کی شب اس پیار کرنے والے جوڑے کو ایک رات کے لیے ملنے کی اجازت ملتی ہے۔ ملن کی ان شبھ گھڑیوں میں آسمان کے تمام ستارے مسکراتے اور کھلکھلاتے ہیں۔

تاروں کے تہوار کو یوں منایا جاتا ہے کہ جگہ جگہ کرسمس ٹری کی طرح بانس سجائے جاتے ہیں، جن کی شاخوں پر محبت کرنے والے لوگ اپنی اپنی خواہشیں، منتیں اور پیار بھری شاعری، رنگ برنگے کاغذوں پر لکھ کر اس طرح باندھ دیتے ہیں، جیسے ہمارے ہاں بعض درگاہوں کے درختوں پر منت کے دھاگے، دھجیاں، کپڑوں کے لیر اور گھنٹیاں باندھی جاتی ہیں۔ یہ تہوار اس سال بھی روایتی جوش و جذبے سے منایا گیا۔ اس تہوار کے بعد کوئی اہم ثقافتی، سیاسی، سماجی پروگرام اس مہینے تو متوقع نہیں تھا، مگر ہفتے کی شب جب میں ایک ساحلی شہر کے چڑیا گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو وہاں پر رات ہونے کے باوجود گاڑیوں کا بے پناہ رش دیکھا۔ میں نے دور تک نظر دوڑائی مگر کہیں روشنیاں دکھائی دیں اور نہ فضا میں کسی ساز و نغمے کی آواز کے بجائے، بہت پراسرار خاموشی تھی۔ لوگوں کی بھیڑ مسلسل بڑھ رہی تھی اور وہ اندھیرے کی جانب چل رہے تھے۔ میں اکثر اس راستے سے گزرتا رہتا ہوں مگر اس جگہ پر ایسا رش پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ خاموشی اور اندھیرے میں لوگوں کا بڑھتا ہوا اجتماع دیکھا تو میرا تجسس بڑھ گیا۔ اختتام ہفتہ کی شب ہونے کے سبب میں بھی ذہنی طور پر فارغ تھا، اس لیے میں نے

وہاں رکنے کا فیصلہ کیا۔ گاڑی چڑیا گھر کی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی کہ یہ کس قسم کا میلہ ہے؟ اور یہ بات خلاف معمول ضرور تھی کہ چڑیا گھر کا مرکزی دروازہ رات کے اس پہر بھی کھلا ہوا تھا ورنہ سر شام ہی گیٹ بند ہو جاتا ہے۔ یا مظہر العجائب! یہ معاملہ کیا ہے؟ لوگ قطار در قطار چڑیا گھر میں داخل ہو رہے ہیں اور چڑیا گھر کے اندر گھپ اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ تمام بتیاں بجھی ہوئی ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ یہی دیکھنے کے لیے میں نے ٹکٹ گھر سے داخلے کا ٹکٹ حاصل کیا اور چڑیا گھر کے اندر گھس گیا۔

سبھی جانور حسب معمول اپنے اپنے پنجروں اور مخصوص احاطوں میں موجود تھے، لیکن حیرت انگیز طور پر لوگ کسی بھی چرند، پرند میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ سب لوگ پگڈنڈیوں پر خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ بہر حال میری سمجھ سے بالاتر معاملہ تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے پگڈنڈیوں کے گرد جگنوؤں کی موجودگی کو محسوس کیا۔ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جگنوؤں کی روشنی بڑا ہی مسحور کن منظر پیش کر رہی تھی۔ اب احساس ہوا کہ یہ ساری خلقت جگنو دیکھنے کیلئے یہاں جمع ہوئی ہے۔ بہت دیر تک منظر کی دلکشی میں کھویا رہا۔ ذہن میں سوال ابھرا کہ اب پاکستان میں جگنو نظر کیوں نہیں آتے؟ حالانکہ آج کل ہمارے ملک میں لوڈ شیڈنگ کی فراوانی کے باعث راتوں کو اندھیروں کی تو کوئی کمی ہی نہیں ہے۔

بچپن میں گرمیوں کی راتوں میں اگر کمرے میں لیٹے ہوتے تو کبھی کبھی بارش کے دوران جگنو سر چھپانے کے واسطے کمرے میں گھس آتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے ہم کمرے کے اندر نہیں بلکہ کھلے آسمان تلے ستاروں کی چھاؤں میں لیٹے ہوئے ہیں۔ اب کئی سالوں سے میں نے پاکستان میں کوئی جگنو نہیں دیکھا، حالانکہ میں تو رہتا بھی میاں چنوں میں ہوں، جس کا ماحول بڑے شہروں کی نسبت فطرت کے زیادہ قریب ہے۔ سونے سے پہلے یہ سوال ذہن میں گھومتا رہا کہ کیا واقعی ہمارے ہاں سے جگنو غائب ہو گئے ہیں؟ یا کہ میرا وہم ہے؟ دیر تک سوچتا رہا کہ جگنوؤں کو فقط میں نے فراموش کر دیا کہ وہ واقعی ہمارے دیہاتوں اور شہروں سے کوچ کر گئے ہیں۔ دوستوں سے اس بارے میں بات چیت ہوئی تو سب نے اثبات میں جواب دیا کہ جگنوؤں کو دیکھے عرصہ ہو گیا ہے۔ آخر جگنو کہاں چلے گئے؟ کیوں چلے گئے؟ منو بھائی کہتے ہیں کہ فصلوں پر زہریلی زرعی ادویات کے چھڑکاؤ نے مضر کیڑوں کے ساتھ ساتھ جگنوؤں جیسی خوبصورت مخلوق کو بھی ختم کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو یا پھر کسی دوسری وجہ سے جگنو ہماری بستیوں کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہم بڑے بڑے موضوعات پر بڑی بڑی باتیں کرنا پسند کرتے ہیں، اس لیے جگنو کا ناپید ہو جانا ہو سکتا ہے کوئی بڑا المیہ نہ ہو مگر میری نظر میں صرف ہمارے شاعری ایک حسین استعارے سے محروم نہیں ہوئے، ہمارے بچے ایک خوبصورت نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔

◆◆◆

معروف مزاح نگار ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی کتاب

کھیلن کو مانگے چاند

شائع ہو گئی ہے ---- قیمت-/2,500 (ملنے کا پتہ۔ سنگری ماڈل ٹاؤن۔2، فیصل آباد ---- 0322-4381192)

شارٹ کٹ

کاوش صدیقی

مختصر تعارف

کراچی میں جنم لینے والے کاوش صدیقی 1985ء سے لکھ رہے ہیں۔ سنجیدہ اور پاپولر ادب بیک وقت لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ افسانہ ان کی بنیادی دلچسپی ہے۔ دو کتابیں "خانقاہ" اور "خواب گزیدہ" شائع ہو چکی ہیں۔ کاوش صدیقی بچوں کے نہایت معروف اور پسندیدہ لکھاری ہیں۔ عنقریب ان کے افسانوں کے دو مجموعے "بکی عورتیں" اور "کھوکھلا مرد" شائع ہونے والے ہیں۔

آدمی جوان ہو تو اس کے سپنوں میں ساری ساری رات سندر ناریاں رقص کرتی ہیں، اپنی پازیب کی جھنکار سے دن کو جاگتے میں بھی مسحور رکھتی ہیں۔ ادھیڑ عمر کا ہو، جہاں دیدہ ہو، پھر اس کے خوابوں میں گورے گورے پاؤں میں بندھی پائل کی جھنجھناہٹ کے بجائے دولت کی چمک نگاہیں خیرہ کرتی ہے۔ بچہ ہو تو رنگا رنگ غباروں میں لپٹی ہوئی چاکلیٹیں اس کے خوابوں کا محور ہوتی ہیں مگر میں نہ بچہ تھا نہ جوان، بلکہ ان کے بیچوں بیچ حیران کھڑا تھا۔ لڑکی، دولت اور روپیہ میرے خوابوں میں گڈمڈ تھے بلکہ میرے سارے خواب ہی گڈمڈ تھے اس لیے کہ ابھی میں نے جوانی کا سفر شروع ہی کیا تھا۔ میرے اندر لڑکی، دولت اور دولت کو الگ الگ پرکھنے کا شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ مجھے ان گڈمڈ خوابوں میں صرف ایک ہی شبیہ واضح دکھائی دیتی تھی، ایک اونچی حویلی کی شبیہ! میرے خوابوں کی حویلی محض میرے خواب تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ایک حقیقت کی طرح سچ زمین پر اپنا سنگی سینہ تانے کھڑی تھی۔ باوجود ہزار چاہنے کے، حویلی کے اندر نہیں جا سکتا تھا، کیوں کہ میں انسانوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جسے نچلی ذات والوں کا خطاب دیا جاتا ہے، کمین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہم کمین ہیں، نیچ ہیں، تو ہمارے کمین اور غلیظ ہاتھوں سے دھلے ہوئے کپڑے اتنے اجلے کیسے ہو جاتے ہیں کہ بڑی ذات کے لوگ انھیں پہن کر معزز ہو جاتے ہیں۔ ویسے یہ لفظ "معزز" میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا آدمی بڑی بڑی عمارتوں میں رہنے اور لمبی لمبی چمکیلی کاروں میں گھومنے سے معزز ہو جاتا ہے؟ یہ ساری باتیں مجھے گڈمڈ کر دیتی ہیں۔ اگر میں کبھی ابا یا اماں سے پوچھتا، تو وہ مجھے پاگل کہہ کر میرے ہاتھوں میں میلے کپڑوں کا بڑا سا گٹھر تھما دیتے اور کہتے: "چل ہمارا دماغ نہ کھا، کپڑے لے کر گھاٹ پر چل۔"

مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا مگر میں نے اونچی حویلی کا خواب دیکھنا نہیں چھوڑا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ اونچی حویلی کی سنگی دیواروں کو پھلانگ کر اندر پہنچ جاؤں اور اندر سے حویلی کا چپہ چپہ دیکھ ڈالوں، اس کے ہرے بھرے باغ میں جو کبھی کبھار ہی بڑا دروازہ کھلنے پر نظر آتا تھا، دن بھر کے لیے بیٹھ جاؤں۔ اونچی حویلی میں ہمارے خاندان کا صرف ایک فرد جا سکتا تھا، اور وہ تھیں اماں... جو وہاں میلے کپڑے لینے جاتی تھیں۔ میں نے کئی بار اماں سے کہا: "اماں! مجھے حویلی دکھاؤ۔" مگر انھوں نے کبھی مجھے وہاں لے جانے کی حامی نہیں بھری۔ "آخر

میں وہاں کیوں نہیں جا سکتا؟" "پاگل ہوا ہے کیا؟" اماں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "وہاں کیا رکھا ہے تیرے لیے جو تو اُدھر جانے کے لیے بے چین ہوا جا رہا ہے؟" "مجھے اچھی لگتی ہے اونچی حویلی۔" میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ "میں ضرور جاؤں گا۔"

"ہونہہ! ضرور جاؤں گا۔" اماں نے حسبِ عادت میری نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "چوکیدار تجھے اندر گھسنے دے گا تب تو جائے گا تو، ایسا ذلیل کر کے بھگائے گا کہ ساری عمر کے لیے اُدھر کا رخ کرنا بھول جائے گا۔" "مگر میں تو تمہارے ساتھ جاؤں گا، پھر چوکیدار مجھے کیوں بھگائے گا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "تو نہیں جانتا میاں جی کا حکم ہے کہ اُدھر کوئی اور نہ آئے۔" "مگر تم تو جاتی ہو؟" میں نے اماں کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "میں..." اماں نے ہنس کر کہا۔ "بیٹا! میں وہاں اس لیے جاتی ہوں کہ انھیں میری ضرورت ہے، کیونکہ میں ان کی ضرورت پوری کرتی ہوں۔ اس لیے مجھے وہاں جانے کی اجازت ہے، مگر وہ بھی صرف برآمدے تک۔ اس سے آگے نہیں۔ اگر انھیں میری ضرورت نہ ہوتی تو میں بھی وہاں نہ جا سکتی۔ انھیں تیری ضرورت نہیں ہے، اس لیے تو وہاں نہیں جا سکتا۔" "میں نہیں جانتا ضرورت پورت!" میں نے غصے سے کہا۔ "میں ضرور جاؤں گا۔" "اچھا! بک بک نہ کر..." اماں نے میری ضد سے تنگ آ کر کہا۔ "میں جا رہی ہوں، اور تو گھر میں رہیو۔ تیرا ابا کھیت سے آتا ہوگا، اسے روٹی دے کر کہیں جائیو۔" یہ کہہ کر اماں نے دھلے کپڑوں کا گٹھڑ سر پر رکھا اور بڑی حویلی کی سمت چل دیں۔

میں اور بدلو پیچ لڑا رہے تھے۔ ہوا بڑی تیز چل رہی تھی۔ بار بار بدلو کی پتنگ کٹتے کٹتے میری پتنگ جھٹکا کھا جاتی۔ تیز ہوا پتنگ کاٹنے کی میری ساری کوششیں ناکام کیے جا رہی تھی۔ "ہوا تیز بنتا ہے، ذرا میری پتنگ کاٹ کے تو دکھا۔" بدلو نے فخریہ انداز میں کہا اور پتنگ کو جھکائی دے کر ایک دم اوپر اٹھایا۔ "ابے... ہوا تیز چل رہی ہے نہ، ورنہ تیری ساری استادی ایک منٹ میں نکال دوں گا۔" میں نے اس کی بات سہتے ہوئے کہا اور اسے باتوں میں لگا کے اپنی پتنگ کو جھکائی دی، پھر ڈور کو ڈھیل دے کر چھوڑا۔ تیز ہوا میں پتنگ نے تیزی سے غوطہ لگایا اور دوسرے لمحہ میں بدلو کی پتنگ کی ڈور میری پتنگ کی ڈور میں پھنس گئی۔ "اب بول..." میں نے بدلو کو متوجہ کیا تو وہ حیران ہو کر بولا۔ "ابے... تو نے کب پیچ لگایا؟" "اور یہ دیکھ..." میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تیری پتنگ تو گئی۔" یہ کہہ کر میں نے پتنگ کو جھٹکا دیا اور دوسرے لمحے ہی بدلو کی پتنگ اپنی ڈور سے کٹ کر فضا میں ڈولنے لگی۔ بدلو کا منہ ذرا سا ہو گیا۔

پتنگ فضا میں ڈولتی ہوئی ایک طرف جانے لگی اور کافی دور نکل گئی مگر جیت کے نشے میں، میں اس کے پیچھے دوڑتا رہا۔ پچھلے میدان کا چکر لگا کر جہاں ہم لوگ کپڑے سکھاتے تھے، پتنگ اس میدان پر ناچتی ہوئی سیدھی بڑی حویلی کی طرف جانے لگی۔ "ارے سالی!" میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ "کتنی دور دوڑائے گی۔" میں پتنگ کے پیچھے پیچھے بڑی حویلی کے سامنے جا پہنچا۔ پتنگ ڈولتی ہوئی بڑی حویلی کے اندر جا گری۔ یہ دیکھ کر میری ساری خوشی پر اوس پڑ گئی۔ بڑی حویلی کا بند دروازہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، مجھے وہ چوکیدار کہیں نظر نہ آیا جس کا اماں مجھے خوف دلایا کرتی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل خوف سے کانپا، مگر اندر پڑی پتنگ اور بڑی حویلی کے اندر جانے کا تجسس سارے خوف پر بھاری پڑ گیا۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا، دروازہ ایک ہلکی سی چرچراہٹ سے کھل گیا، دروازہ کھلتے ہی جنت جیسا منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ جیسا مولوی صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ جنت میں ہر طرف پھول کھلے ہوں گے، خوب صورتی ہوگی، جگہ جگہ فوارے ہوں گے، پھول ہوں گے جن سے خوشبو پھوٹ رہی ہوگی۔ غرض جنت ایسی جگہ ہوگی جہاں سے کبھی جانے کو جی نہیں چاہے گا۔ اگر جنت ایسی ہوگی تو پھر میں یقیناً جنت کے دروازے پر جا پہنچا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ پانی بکھیرتے ہوئے

فوارے پر ہی میری طبیعت مچل گئی۔ میں بے اختیار موتیوں جیسے پانی اچھالتے ہوئے فوارے کے نزدیک جا پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر پانی پکڑنے لگا۔ میرے ننگے پیروں کے نیچے بچھی ہوئی نرم گھاس میرے تلووں میں گدگدی کر رہی تھی۔ فوارے کے اطراف میں لال، پیلے، سرخ اور پیلے پھول دائرہ کی صورت میں لگے تھے۔ میں نے ایک پھول توڑ لیا اور اس کی ملائم پتیاں دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ میرے ہاتھوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ حویلی، خواب جیسی حویلی، جنت جیسی حویلی، میں اس حویلی کے اندر تھا جس حویلی کے خواب برسوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ آج میں اپنے خواب کے اندر تھا۔ میں پتنگ کو بھول چکا تھا۔ اچانک میری نگاہ فوارے کے اندر پڑی۔ فوارے کے ارد گرد بنے ہوئے حوض میں طرح طرح کے رنگین پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی دھوپ جب مخصوص زاویوں سے پڑتی تو پانی سرخ، نیلا، بنفشی نظر آتا۔ مجھے وہ پتھر بہت اچھے لگے۔ حوض زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں رنگین پتھر لینے کے لیے حوض میں اتر گیا۔ حوض میں اترتے ہی پانی کی پھوار مجھ پر پڑنے لگی۔ میں سارے کا سارا گیلا ہو گیا۔ میں نے اپنی قمیض کے دامن میں کئی رنگین پتھر بھر لیے۔ اچانک ایک آواز آئی: "او خوچہ۔ خانہ خراب ادھر کیا کرتی اے؟"

میں نے آواز کی سمت دیکھا۔ پٹھان چوکیدار موٹا سا ڈنڈا اٹھائے میری طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ پٹھان چوکیدار کو دیکھتے ہی میری تو سٹی گم ہو گئی۔ چند لمحے تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ میں کیا کروں۔ چوکیدار اپنا موٹا ڈنڈا لہراتے ہوئے حوض کے کنارے آ پہنچا اور چیخا۔ "اوے خنزیر کا تخم! ام تمہارا بھرکس نکالے گا۔" اس نے اپنا ڈنڈا لہرایا۔ میں پیچھے ہٹا اور فوارے سے لگ گیا۔ چوکیدار مسلسل مجھے گالیاں دے رہا تھا اور حوض سے باہر نکلنے کو کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی لال لال آنکھوں اور موٹے ڈنڈے سے خوف لگ رہا تھا۔ اگر میں اس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ یقیناً مار مار کر میرا بھرکس نکال دے گا۔ میں نے تیزی سے سوچا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ چوکیدار مسلسل مجھے گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے فوارے کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا۔ چوکیدار میرے ساتھ ساتھ گھومنے لگا۔ ایک مرتبہ میں نے تیزی سے الٹا چکر لگایا۔ چوکیدار اتنی تیزی سے پلٹ نہ سکا۔ دوسرے ہی لمحے میں حوض سے باہر تھا۔ چوکیدار میری طرف لپکا۔ میں نے بھاگنا شروع کر دیا۔

ہم دونوں دوڑ رہے تھے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ بجائے دروازے کی طرف جاؤں، میرا رخ غلط ہو گیا۔ اب میں آگے پیچھے لان میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ "خو... خنزیر رک جا، ام تمہارے کو چھوڑے گا نہیں۔" چوکیدار ہانپتے ہوئے چیخا۔ میں ایک بارہ دری پھلانگتے ہوئے اچانک اوندھے منہ گرا۔ اسی لمحے چوکیدار میرے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، زمین پر پڑے پڑے لاتیں چلانا شروع کر دیں۔ چوکیدار ایک دم جھجک کر پیچھے ہٹا۔ اچانک ایک آواز آئی: "یہ کیا شور ہو رہا ہے؟" چوکیدار آواز سنتے ہی خاموش ہو گیا۔ میں تیزی سے اٹھا اور آواز کی سمت تیر کی طرح لپکا۔ وہ کوئی پینتیس برس کی عورت تھی۔ میں تیزی سے اس سے جا کر لپٹ گیا۔ میں نے مضبوطی سے اسے پکڑتے ہوئے کہا: "بی بی جی! مجھے بچا لیجیے، نہیں تو یہ مجھے مارے گا۔" لمحے بھر کو وہ عورت گھبرا گئی، میرے گیلے کپڑوں سے ٹپکتے پانی نے اس کے کپڑے نم کر دیے تھے۔ وہ بولی: "پیچھے ہٹو!" "نہیں!" میں نے بدستور اسی لہجے میں کہا۔ "مجھے چوکیدار مارے گا۔" "تو چپ! ہٹو۔" چوکیدار چیخا۔ "دیکھیے!" میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "یہ مجھے مارے گا۔" "نہیں مارے گا۔" عورت نے سختی سے کہا اور بازو چھڑا لیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس نے پھر کہا: "مجھے چھوڑو، تمھیں چوکیدار نہیں مارے گا۔"

"اچھا!" میں نے اس کی یقین دہانی پر اسے چھوڑ دیا۔ عورت مجھ سے پوچھنے لگی: "تم اندر کیوں آئے؟" "میری پتنگ ادھر آ گئی تھی، میں اسے لینے آیا تھا۔" "نہیں بی بی! یہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ حوض میں نہاتا تھا۔" چوکیدار نے تیزی سے کہا۔ "کیوں؟" عورت نے

مجھے گھورا۔ ''تم حوض میں کیوں نہا رہے تھے، وہ کوئی نہانے کی جگہ ہے؟'' ''مجھے پتھر اٹھانے تھے، میں تو وہ لینے اترا تھا باپ میں۔'' میں نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''تمھیں چوکیدار سے پتنگ مانگنا چاہیے تھی۔'' عورت بولی۔ ''چوکیدار تو تھا ہی نہیں، دروازہ کھلا تھا، پھر اس نے مجھے گالیاں دینا شروع کر دیں۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''اچھا جاؤ اپنی پتنگ لے جاؤ، ہاں آئندہ تو اِدھر میں مت اترنا۔'' ''بی بی جی! وہ...'' میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ؟'' ''میں تھوڑے سے رنگین پتھر لے لوں؟'' عورت میری خواہش سن کر مسکرائی اور بولی ''کیا کرو گے؟'' ''مچھلیوں کے مٹکے میں ڈالوں گا۔'' ''اچھا۔'' عورت ہنس پڑی۔

مجھے خوشی ہوئی وہ عورت بہت اچھی معلوم ہوئی۔ وہ خوب گوری تھی، اس کے ہاتھوں میں کالے رنگ کی چوڑیاں تھیں اور گلے میں ایک باریک سی سنہری زنجیر جو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ جب وہ مسکرائی تھی تو اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے گول جھمکے بہت اچھے لگتے تھے۔ میں نے اس کی ہنسی سے ہمت پاتے ہوئے کہا ''لے لوں؟'' ''ہاں لے لو۔'' وہ بولی۔ ''بی بی جی! آپ بہت اچھی ہیں۔'' میں نے کہا اور بھاگ کر وہاں سے پتھر چننے لگا جہاں گرے ہوئے سارے رنگین پتھر بکھر گئے تھے۔ مجھے بہت سارے رنگین پتھر لیے ہوئے دیکھ کر اماں نے پوچھا ''کہاں سے لایا ہے یہ سارے...؟'' ''بڑی حویلی سے!'' میں نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''ارے کمینے! چوری کی ہے کیا؟'' اماں نے کچھ بے اعتباری کرتے ہوئے دھاڑ کر پوچھا۔

''چوری نہیں کرتا میں، مجھے خود گوری بی بی نے دیے ہیں۔'' میں نے ہنستا کر کہا اور مچھلیوں کے مٹکے میں رنگین پتھر ڈالنے لگا۔ ''تو وہاں کیسے گیا، کیسے تجھے اندر جانے دیا؟ کسی نے مارا تو نہیں؟'' اماں نے اسی بے اعتباری سے میرے قریب آتے ہوئے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ میں نے اماں کو سارا ماجرا سنا ڈالا۔ اماں سب سن کر سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔ ''کم بخت! کیوں روزی کے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ میاں جی کو پتہ چل گیا تو قیامت کر دیں گے۔ کمینے! اتنا بڑا ہو گیا، مونچھیں آ رہی ہیں، اور بچوں کی طرح اڑتا پھر رہا ہے۔'' اماں بڑبڑاتی رہیں اور میں ان کی بڑبڑاہٹ سے بے نیاز اپنی مچھلیوں کے مٹکے میں رنگین پتھر سجاتا رہا۔ تیسرے دن اماں بڑی حویلی سے واپس آئیں تو ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں، انھوں نے میلے کپڑوں کا گٹھڑ ایک طرف پٹختے ہوئے مجھے آواز دی۔

''ارے سلو! ادھر آ۔'' ''کیا ہے؟'' میں نے گلف کے پیڑوں پر پانی چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''ادھر تو آ۔'' اماں نے مجھے دوبارہ بلایا۔ ''کیا؟'' میں اماں کے پاس پہنچ گیا۔ اماں مٹکے سے پانی نکال کر پی رہی تھیں، میری ہونق شکل دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ ''کم بخت! حویلی جانے کو مرا جاتا تھا، اب منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ ارے بولتا کیوں نہیں، حویلی میں کام کرے گا یا نہیں؟'' ''کیا کام؟'' ''اوپر کا کام، صفائی ستھرائی، سودا سلف، اور کیا...'' ''پھر میں اندر سے حویلی دیکھ سکوں گا؟'' میں نے دھیرے سے پوچھا۔ ''ارے جب کام کرے گا تو کیا باہر رہے گا؟'' اماں نے مجھے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ''بول! کرے گا کام؟'' ''ہاں!'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔

بڑی حویلی واقعی بہت بڑی تھی۔ اس میں بارہ تیرہ خوب بڑے بڑے کمرے تھے، ہر کمرے میں رنگین تصاویر، جھاڑ فانوس لگے ہوئے تھے، قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے جن پر چلتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں ان کا رنگ نہ خراب ہو جائے۔ بڑی حویلی کا سب سے بڑا کمرہ جسے سب لوگ ڈرائنگ روم کہتے، اس میں ایک دیوار پر بہت بڑا قالین لگا ہوا تھا جس پر شیر بنا ہوا تھا... دھاڑتا ہوا منہ کھولے۔ پہلی مرتبہ تو میں اسے دیکھ کر ڈر گیا، مجھے ایسا لگا جیسے ابھی وہ شیر مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔ میری حالت دیکھ کر باورچی جو مجھے حویلی گھما رہا تھا ہنسنے لگا۔ ''اب ڈر گیا۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''یہاں تو بہت سی عجیب چیزیں نظر آئیں گی۔ کس کس سے ڈرے گا تو؟''

اتنی بڑی حویلی میں صرف چھ افراد رہتے تھے۔ میاں جی، ان کی بیگم جو ساٹھ پینسٹھ برس کی ہوں گی۔ سنہری کمان کا چشمہ لگائے، غرارہ پہنے بس پان کھایا کرتی تھیں۔ اور پہلے دن جو گوری بی بی مجھے ملی تھیں، وہ ان کی لڑکی تھیں، درخشندہ جہاں بیگم۔ مگر سب انھیں بی بی جی کہتے تھے۔ ایک بی بی جی کے بڑے بھائی تھے، نسیم جو اوپری منزل میں رہا کرتے تھے۔ ان کا چہرہ بہت بارعب تھا، وہ اکثر خاموش رہا کرتے تھے اور کم بولا کرتے تھے۔ ایک چوکیدار اور ایک باورچی۔ یہ اتنی بڑی حویلی کی کل آبادی تھی، اور اب میرے آ جانے سے اس حویلی کی آبادی سات افراد پر مشتمل ہو گئی تھی۔ میاں جی سارا دن چاندی کا حقہ پیا کرتے اور انگریزی اخبار پڑھا کرتے۔ پھر بڑی بیگم بی بی جی کی ماں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہا تھا کہ بی بی جی آ گئیں۔ "سلو! اچھا، دل یہاں لگ گیا؟" "ہاں بی بی جی!" میں نے کہا۔ "میرا تو بہت جی چاہتا تھا کہ میں اندر سے حویلی دیکھوں، مگر مجھے اماں آنے ہی نہیں دیتی تھیں۔" "کیوں؟" بی بی جی نے پوچھا۔ "اماں کہتی تھیں کہ بڑی حویلی میں ہم لوگ نہیں جا سکتے کیونکہ ہم لوگ نیچ ہیں۔" میں نے کہا تو بی بی جی نے ایک گہری سانس بھری اور بڑبڑاتے ہوئے بولیں: "جب ہی تو ہم لوگ خوشیوں کے لیے ترس رہے ہیں۔" "جی..." میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، وہ چونک کر بولیں۔ "کچھ نہیں، تم کام کرو۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔ حویلی کی صفائی ہو رہی تھی۔ بڑی بیگم سب کو ڈانٹ پھٹکار رہی تھیں۔ پتہ چلا شام کو مہمان آنے والے ہیں۔ میں، چوکیدار اور باورچی خوب بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے۔ بی بی جی نے کہا: "کیا فائدہ امی جان! ان سب کا؟ ہر مرتبہ یہی ہوتا ہے، پھر کچھ نہیں ہوتا!" "چپ رہو تم، درخشندہ!" بڑی بیگم نے سختی سے کہا۔ "ہمیں گستاخی پسند نہیں، تم جانتی ہو کہ ہم اپنے کاموں میں مداخلت پسند نہیں کرتے۔" "لیکن امی جان!" بی بی جی نے کچھ کہنا چاہا۔

"درخشندہ!" بڑی بیگم نے آنکھیں گھوریں۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ مہمان آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ لمبی لمبی کاروں میں آنے والے مہمانوں نے ہنستے مسکراتے کھانا کھایا، ہنسی مذاق کیا اور چلے گئے۔ میں بی بی جی کے کمرے میں دودھ دینے گیا تو وہ بستر پر اوندھی پڑی ہوئی تھیں، ان کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ "بی بی جی!" میں نے انھیں آواز دی مگر وہ بدستور اسی طرح لیٹی رہیں۔ میں نے دوبارہ انھیں آواز دی: "بی بی جی! اٹھیے، دودھ پی لیجیے۔" انھوں نے ایک جھٹکے سے میری طرف رخ کیا، ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ "بی بی جی! آپ رو رہی ہیں۔ کیا ہوا؟" میں انھیں روتے دیکھ کر پریشان ہو گیا، مجھے بی بی جی بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ میری بات سن کر بولیں: "میں روؤں نہ تو کیا کروں؟" میں نے حیرت سے پوچھا: "لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں، کیا کسی نے آپ کو کچھ کہا ہے؟" "ہاں!" وہ دھیرے سے بولیں۔ "میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، میں لوگوں کے لیے بے کار ہو گئی ہوں۔ ذات پات کی بندش نے مجھے بوڑھی کر دیا ہے۔ میں روؤں نہ تو کیا کروں، بتاؤ؟" انھوں نے مجھے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

دودھ چھلک گیا، میں نے جلدی سے اسے میز پر رکھ دیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بولا: "بی بی جی! آپ تو بہت اچھی ہیں، پھر انھوں نے آپ کو زیادہ عمر کا کیوں سمجھا؟" "تم نہیں سمجھو گے۔" بی بی جی بولیں۔ "جب لڑکی کی عمر زیادہ ہو جائے تو پھر اس کی شادی نہیں ہوتی۔" "اچھا!" میں نے حیرانی سے کہا۔ "جب ہی اماں نے زینو کی شادی چودہ برس میں کر دی تھی۔ اگر وہ بڑی ہو جاتی تو کیا اس کی بھی شادی نہیں ہوتی؟" "زینو کون؟" انھوں نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "میری بہن۔" میں نے انھیں بتایا۔ "ابھی پچھلے برس تو اس کی شادی ہوئی ہے۔ اماں نے آپ کو نہیں بتایا۔ زینو دلہن بن کر اتنی اچھی لگ رہی تھی، بالکل پریوں جیسی۔" بی بی جی میری بات سن کر مسکرا دیں۔ "پریوں جیسی گوری بھی؟ اور میں کیسی لگتی ہوں؟" "آپ؟" میں نے فوراً کہا: "آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں، میں..." میں کہتے کہتے رک گیا، وہ

بولیں: ''تم چپ کیوں ہو گئے؟'' ''اور میرا دل چاہتا ہے، آپ سے ہر وقت باتیں کرتا رہوں۔'' ''اچھا۔'' انھوں نے مجھے عجیب سے لہجے میں کہا: ''تمھیں سردی نہیں لگ رہی۔'' ''نہیں۔'' ''مجھے لگ رہی ہے، دروازہ بند کر دو۔'' میں نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ''ادھر آؤ، میرے پاس۔'' انھوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں جھجکا تو وہ بولیں: ''تمھارا دل مجھ سے باتیں کرنے کو نہیں چاہتا؟'' میں نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ انھوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے جھٹکا دیا۔ میں سیدھا ان کے اوپر جا گرا۔ انھوں نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''سلو! تمھیں پتہ ہے شادی کیا ہوتی ہے؟'' ''ہاں۔'' ''کیا؟'' ''شادی میں دلہن بنتے ہیں، خوب اچھے اچھے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ گانے ہوتے ہیں، کھانے پکتے ہیں۔ پھر دلہن اپنے گھر چلی جاتی ہے۔'' میں نے انھیں تفصیل سے بتایا۔ ''اوہ۔'' بی بی جی نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میرے گال پر ہاتھ پھیرا۔ ''اور کیا ہوتا ہے؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''مجھے تو بس اتنا ہی پتہ ہے۔'' ''تم بہت معصوم ہو، تمھیں تو کچھ بھی نہیں پتہ۔'' انھوں نے مجھ پر جھکتے ہوئے کہا اور میرے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے تیزی سے ان کی گرفت سے نکل جانا چاہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، میرے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ بی بی جی نے اپنی گرفت سے مجھے نکلنے نہیں دیا۔ انھوں نے پوری قوت سے مجھے بھینچتے ہوئے کہا:

''اتنے بڑے ہو گئے اور تمھیں عقل نہیں آئی۔ میں سمجھاتی ہوں۔'' ان کا لہجہ پھنکار مارنے کا سا ہو گیا۔ ان کے ہاتھوں کی گرفت بڑھ گئی۔ میں بی بی جی کے کمرے سے باہر نکلا تو نسیم کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے بے اختیار میرے قدم ٹھہر گئے۔ نسیم کے کمرے سے آنے والی آوازیں سن کر میں رکا تھا، وہ آواز میری جانی پہچانی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیے۔ اندر سے نسیم کی آواز آئی: ''تمھیں اتنی بار سمجھایا مگر تم کیوں ڈرتے ہو؟'' ''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' دوسری آواز بلاشبہ میرے دوست بدلو کی تھی۔ ''پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' نسیم کی آواز ابھری۔ ''کچھ نہیں ہو گا، بس اب میں کچھ نہیں سنوں گا۔'' ان باتوں نے میرا تجسس بڑھا دیا۔ میں دروازے سے بالکل لگ گیا۔ اندر کی آوازیں سننے کے دھیان میں میں یہ بھول گیا تھا کہ دروازے پر میرا دباؤ زیادہ ہو گیا ہے۔ دباؤ زیادہ ہوتے ہی اچانک دروازہ کھل گیا۔ شاید دروازہ اچھی طرح بند نہیں تھا۔ میں دروازہ کھلتے ہی اندر جا گرا۔ میرے اندر گرتے ہی کمرے کی محدود فضا میں بھونچال سا آ گیا۔ نسیم کے پہلو سے بدلو اچھل کر بھاگا۔ ''چھوٹے صاحب!'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے دیکھ کر نسیم کا رنگ یوں اتر گیا جیسے کسی نے ان کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ بہ مشکل تمام انھوں نے بستر کی چادر اپنے اوپر کھینچی اور بڑی لجاجت سے بولے: ''سلو! کسی سے کہنا مت، ورنہ...'' اس دن کے بعد سے آج تک میں نے بڑی حویلی کا رخ نہیں کیا۔ میری شادی ہو گئی، میرے بچے ہو گئے۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں۔ میں نے انھیں جلدی جلدی پڑھا لکھا کر ان کی شادیاں کر دیں۔ میری بیوی نے ہر بچے کی شادی پر یہی کہا: ''عجیب آدمی ہو تم بھی، اتنی چھوٹی عمروں میں بچوں کی شادیاں کر رہے ہو۔ ابھی ان کی عمریں ہی کیا ہیں۔ ذرا ان کی مسیں بھی نہیں بھیگیں، اور تمھیں بے چینی شروع۔ کون سی ان کی عمریں گزری جا رہی ہیں۔'' لیکن میں نے اس کی ہر بات ہنس کر ٹال دی، بڑی حویلی میں میں نے جو کچھ دیکھا تھا، اس کے بعد میں نہیں چاہتا تھا کہ میری اولاد بھی بڑھتی ہوئی عمر کے بہاؤ میں آ کر تہذیب کے طویل راستے پر کوئی شارٹ کٹ تلاش کرے۔ ہم تو دھوبی ہیں، کمی اور نیچ۔ مگر شارٹ کٹ پر اونچی ذات والے بھی مجبور ہیں، مگر ہم اپنے نیچ ہونے کی وجہ سے ابھی تک اس شارٹ کٹ سے محفوظ ہیں۔

◆◆◆

غزلیں

آصف ثاقب

○

میرے عرق پہ سادگی ہے بہت
ایک آنسو کی روشنی ہے بہت

کتنے جذبے لیے تھے لفظوں میں
میرے حصے میں خوش دلی ہے بہت

ایک میں تین غزلوں کے جوڑے
اک سمیٹے میں آ گئی ہے بہت

جانے پانی کہاں سے آتا ہے
اپنی آنکھوں میں لب کی ہے بہت

کیا کروں انجمن ستاروں کی
ایک شعلے کی پھلجھڑی ہے بہت

سوچتا ہوں کہاں کہاں جاؤں
سیر کرنے کو وہ گلی ہے بہت

کیا کروں یہ سوچ لوں ثاقب
میری دشمن سے دوستی ہے بہت

○○○

انور شعور

○

کیوں کہیں ہم، ہمیں خوشی نہ ملی
ہاں، بظاہر طلب کبھی نہ ملی

دل جلایا تھا روشنی کے لیے
بجھ گیا اور روشنی نہ ملی

عافیت کی کوئی گلی ہم نے
پوری دنیا میں ڈھونڈی نہ ملی

کر رہے تھے تلاش ہم جو چیز
اور سب کچھ ملا، وہی نہ ملی

آگ سے کھیلنا نہیں تھا کھیل
جلنے والوں کی راکھ بھی نہ ملی

دھوپ میں نکل پڑے ہو تم تو شعورؔ
چھاؤں کا کیا، ملی ملی نہ ملی

○○○

صابر ظفر

○

ہم اس کی یادوں کو دل کی کسک سے چھو لیں گے
کہیں ملا تو پلک کو پلک سے چھو لیں گے

اگر کبھی اسے چھونا پڑا وصال کے بیچ
بجیں گے ہجر تو کنگن کی کھنک سے چھو لیں گے

لکھا ہے کچھ اپنی آنکھوں سے اپنا مکاں
ہم اس کے نقش کو پھر اک نظر سے چھو لیں گے

حقیقت میں جس کے کسی کا وجود ہے عریاں
ہم اس اندھیرے کو اپنی چمک سے چھو لیں گے

ہمارے سامنے قول و جمال کچھ بھی نہیں
ہم ان لبوں کو تخیل کی لپک سے چھو لیں گے

جہاں بھی ہوں گے تخیل کے آئینے ان کو
وہ خوش جمال تو اپنی جھلک سے چھو لیں گے

فقیر کبھی نہ کبھی وہ وجود محرم
کسی اعتبار سے ہم کچھ جھجک سے چھو لیں گے

○○○

خالد اقبال یاسر

○

دروغ گوئی سند ہوئی تھی
کھری کھری مسترد ہوئی تھی

چلا گیا اور نہ کسی کو
قبول صورت تو رد ہوئی تھی

خدا نے دی تھی اسے جو خوبی
وہ خوبی وجہ حسد ہوئی تھی

مرا علی پست قامتوں سے
وہ جیسے خود سرو قد ہوئی تھی

خوش رہ کر یہ ساری دنیا
شریک غم جد ہوئی تھی

الجھن یا تھے تعلقوں میں
منافقت کی بھی حد ہوئی تھی

ذرا سی تھی کوئی بات یاسر
طویل کیوں رد و کد ہوئی تھی

OOO

قمر رضا شہزاد

○

کہاں کہاں سے کوئی دھیان میں نہیں بکھرے
بہت سے لوگ تھے لیکن نہیں کہیں بکھرے
یہ بھید جانتے ہیں ہوا زمیں بکھرے
مجھے پتہ ہے یہاں راستے نہیں بکھرے
میں ایک لرزتا مکاں اس لیے بھی تنہا ہوں
مرے قریب بھٹکتے نہیں مکیں بکھرے
مجھے بتاتا ہے ہر روز آئنہ میرا
کہاں کہاں سے نہیں نقش دلنشیں بکھرے
یہ حسن و عشق، یہ دنیا و آخرت صاحب
تمام لوٹ گئے ایک ان یقیں بکھرے

OOO

خاور اعجاز

○

نہ گھر دیوار ہی بچ پائے گی نہ در بچے گا
ہمارا گھر جلا تو کیا تمہارا گھر بچے گا
ہمارے تاج پہ نظریں ہماری ہیں لگی
انا کی جنگ میں کیا اس کا اپنا سر بچے گا
یہ کس نشے میں تم ہم سے الجھتے جا رہے ہو
سلامت ہوگا یہ خاور تو جب ساغر بچے گا
خزاں ترک دخل ہو گئی ہے جب زندگی کی رت میں
تو پھر کن موسموں کا ذکر کاغذ پہ بچے گا
اکیلا زندگی بھر میں کھڑا یہ سوچتا ہے
کہاں تک اور یہ سوکھے کا منظر بچے گا

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

○

کسی نے وہ آشیاں جلایا تھا
تنکا تنکا بچا بچایا تھا

میرا دشمن بھی ساتھ تھا میرے
میں نے جب دوست کو گنوایا تھا

کیا خبر تھی کہ اب جائے گا
چاند کو ہم نے گھر بلایا تھا

سوچتے رہ گئے ہمارے دوست
میں نے پہلا قدم اٹھایا تھا

ساری خوشیاں سمیٹ لیں اس نے
سارے غم ہمیں خرید لایا تھا

سوچتا تھا تو سوچتے اک دن
جب اسے بازوؤں میں پایا تھا

اس نے تجھ کو بھلا دیا ایوب
ہر گھڑی جو بھلایا تھا

OOO

رفیع الدین ذکی قریشی

O

سوچتا ہوں وہ تماشا آشنا کیوں کر ہوا
موم کا پتلا تھا کل تک آج کیوں پتھر ہوا

قتلِ دل دیکھتے ہی دیکھتے برہم ہوئی
مسکراہٹ پیش منظر تھا پس منظر ہوا

جس قدر کیں اس کے ہنسانے کی ہم نے کوششیں
قلب مضطر اور مضطر اور بھی مضطر ہوا

یہ تو اک کہکشاں پلکوں پہ لرزتی رہی
یاد میں اس کی تماشا خوب یہ شب بھر ہوا

لگ رہا ہے آشنا کو کس لیے دل دے دیا
جو نہ کرنا چاہیے تھا ہم سے وہ کیوں کر ہوا

ہم کو منا تھا منتے اس کا بھرم تو کھل گیا
جو ہوا اچھا ہوا جو بھی ہوا بہتر ہوا

دل میں تھا اک قطرۂ خوں اس کی کچھ قیمت نہ تھی
جب سرِ مژگاں جو چمکا رشکِ گوہر ہوا

چاند اس کے سامنے حق بات ہی کہتے رہے
سرفروشوں سے یہ کار ہمارا اکثر ہوا

یک گزری ہجر تو زخمی، ان کا انتظار ذکی
خلد شام ہوا یا کیوں آذر ہوا

OOO

رشید آفریں

O

جنوں حد سے گزرنا چاہتا ہے
علاجِ عشق جلنا چاہتا ہے

گماں کی سرحدوں کو چھو کے پیچھا
درِ امکاں پہ مرنا چاہتا ہے

نہیں دامن میں جس کے بوند پانی
وہ بادل بھی برسنا چاہتا ہے

ضروری تو نہیں وہ اب جلائے
کہ دیا تھکنا چاہتا ہے

بہت دوڑا ہے پہلو میں اب دل
سرِ عشق ٹھہرنا چاہتا ہے

طلب آتا چلا کیسا ہے
روش اپنی بدلنا چاہتا ہے

ادا کا آسماں ہو جس کا مسکن
زمیں پر آپ اترنا چاہتا ہے

وہ اک لمحہ ندامت ہے کہ جس میں
سمندر بھی سمٹنا چاہتا ہے

عجب ہے شوقِ آزادی کی فطرت
قفس میں بھی چہکنا چاہتا ہے

وہ رکھا ہے اس کو آفریں نے
اللہ جو بکھرنا چاہتا ہے

OOO

سلیمان خمار (انڈیا)

O

گزرتے لمحوں نے دل میں کیا ہے، نہیں پتا ہے
ہوا کے آنچل پہ کیا لکھا ہے، نہیں پتا ہے

سلگ رہی ہے کہاں پہ چنگاری نفرتوں کی
دھواں کہاں سے یہ اٹھ رہا ہے، نہیں پتا ہے

خلیج کس طرح پار اترتے ہیں یہ ہم سے پوچھو
سمندروں کا مزاج کیا ہے، نہیں پتا ہے

کہاں کہاں حادثے چھپے ہیں خبر ہے ہم کو
کہاں سے منزل کا راستہ ہے، نہیں پتا ہے

جو دے رہا ہے ازل سے معصومیت کی اپنی
وہی تو سازش کا سرغنہ ہے، نہیں پتا ہے

خزاں نے گلشن سے جاتے جاتے خمار صاحب
صبا کے کانوں میں کیا کہا ہے، نہیں پتا ہے

OOO

شہزاد نیّر

O

اس کی خوشبو اڑا کے لے آیا
رنگ بکھرانے کو خاک لے آیا

خود سے ناراض ہو کے دور گیا
خود ہی خود کو منا کے لے آیا

اس نے ملنے کی بات چلائی تھی
میں وہیں پہ گھما کے لے آیا

اک عجوبہ کھلا پڑا تھا جہاں
میں گیا اور چرا کے لے آیا

اس کو سمجھا کے تجھ سا
دل ملاتے ہوا کے لے آیا

اس کے ہونٹوں کا رس کماتے ہی
کوئی مدت کے فاقے لے آیا

تازگی کی تلاش تھی سب کو
سو میں جھونکے ہوا کے لے آیا

OOO

ڈاکٹر فرحت عباس

O

ہم نے لکھا ہے شمس، جاں غزل کاغذ پر
اب تو جینے کی مہک آن پہ گل کاغذ پر

کھولیں دل پہ پڑی ہیں جو دکھانے کی نہیں
بند مٹھی میں پڑیں جیسے کہ گل کاغذ پر

نام کاغذ پہ غلط میں نے لکھا تھا تیرا
پھر اٹھ آیا کسی صندلی دل کاغذ پر

اس کو جو شہر کی دیواروں پہ لکھتے پھرتے
اس کو پاگل ہی لکھا جائے گا کل کاغذ پر

ہم نے دیکھا ہے مہک بن کے ترا عکس یہاں
ہم نے دیکھے ہیں تری زلف کے بل کاغذ پر

آپ زمزم نے مری روح کو سیراب کیا
اس لئے [illegible] کاغذ پر

ہم تو تعمیر کیے جاتے ہیں اس کی دنیا
کاغذی لوگ کریں جنگ و جدل کاغذ پر

تو کسی شام مرے ساتھ اتر پانی میں
تو کسی صبح مرے ساتھ نکل کاغذ پر

عشق میں ذہن و دل آنکھیں ہیں کہ غزلیں جیسے
بکھری بکھری ہے حیاتی کی ازل کاغذ پر

آتش و میر و امیر، غالب و فرحت کا سخن
رقص کرتا ہے کئی رقصوں سے ازل کاغذ پر

OOO

عائشہ مسعود

O

اس مصیبت کو ٹالا تو ہے دوستو
غم کے سورج کو ڈھالا تو ہے دوستو

جس نے دنیا کو وحشت زدہ کر دیا
اک وبا جس سے لڑنا تو ہے دوستو

ہم کو اک دوسرے کو بچانا کہ سہی
ہم کو ایک ساتھ چلنا تو ہے دوستو

دوست جو بھی گئے ان کی یادوں میں اب
اپنے ہاتھوں کو ملنا تو ہے دوستو

ایک امید کی شمع جلتی رہے
ورد کرنا سکھانا تو ہے دوستو

آج کے دن کی خبریں بھی اچھی نہیں
آج کا دن بتانا تو ہے دوستو

OOO

آفتاب خان

O

اک دن جلا کے دے گی مجھے پردگی مری
مشہور شہر میں ہوئی دیوانگی مری

جس سے تمام عمر کا ناتا نہیں رہا پھر
تنہا مجھے بھی کر دے گی یکتائی مری

ہر اک مرحلے دل مرے اب علاج تھا
بدنام کر گئی ہے سنجیدگی مری

وارفتگی شوق نے رسوا بہت کیا
آخر ڈبو گئی مجھے بےچارگی مری

تقدیر نے پچھاڑ دیا ہر قدم مجھے
آئی کسی نہ کام یہ فرزانگی مری

کٹ ہی گئے شکوں سے ملاقات کی کے دن
دیتی رہی حوصلہ مجھے سادگی مری

خود اپنے دشت ہی میں بھٹکتا ہوں آفتاب
مجھ سے ہی جا ملی ہے یہ دیوانگی مری

OOO

اسلم سحاب ہاشمی

O

جلنا بھی تو جائے، تو جیسے تیر کا ڈر ہے
دستار فضیلت کو بھی مطلوب وہ سر ہے

ہر لمحہ یہاں کھلتا ہے اک خواب کا غنچہ
یہ آنکھ ہے میری یا کوئی خواب نگر ہے

بچھڑا ہے کوئی شخص جو محبوب تھا سب کا
اب ہجر کے عالم میں وہ بکھرا نگر ہے

ہر میل کے پتھر سے شناسا ہے مری آنکھ
وابستہ ہوا پیروں میں جو اک لمبا سفر ہے

آیا ہے خریدار تو قیمت بھی لگا ہے
مجھ سے تو زیادہ مرا سامان یہ گھر ہے

دیتے ہوئے دستک مرا شل ہاتھ ہوا ہے
کھلتی ہے کسی بام کی، دیوار ہوا در ہے

فرقت ہے سحاب اس کی یا پاؤں ہے غم کا
دیوانے شب تار میں کیا یہ سفر ہے

OOO

ماجد یزدانی

O

ہر غم فراق جو چھپاتے چلے گئے
ہم آنسوؤں کو اپنے چھپاتے چلے گئے

جاں سے عزیز لوگ بھی جاتے چلے گئے
دیوانہ زندگی کو بتاتے چلے گئے

یہ ستم وہ دل پہ چلاتے چلے گئے
ہم ہنسا تو ہم بھی ہنساتے چلے گئے

پوچھو تمہیں سے کیا ہو گئے، ہم وہ لوگ ہیں
خود اپنے گھر کو آگ لگاتے چلے گئے

لو جب چراغ عہد محبت کی کم ہوئی
ہم دل وہ وفا میں جلاتے چلے گئے

گم نام آج ہیں وہی دیوانے کل تلک
محفل میں جو کسی کو سجاتے چلے گئے

جن کی لگی ہو خوشی، پچھتے کے وہ شعر
اک یاد سے جن کو ستاتے چلے گئے

OOO

احمد صفی

O

بھلی تھی سارے عذاب یارو، ثواب یارو
پلٹ دیے کر، وہ ثواب یارو عذاب یارو

وہ کیا برستے میں چھت پہ آ کر برق چمکی
ہوا ہے باراں کا آب یارو، شراب یارو

کیا تھا اس نے کہ مجھ کو چاہا جہاں سے چاہو
ہر ایک اس کا تھا باب یارو، کتاب یارو

سفر پہ وقت طلب کا جانا کہ عذاب ہوتا
نہ ہوتے گر یہ سراب یارو، عذاب یارو

مرے سوالوں کا اس نے دیکھو تمسخر اڑا کر
دیا ہے کیا لاجواب یارو، جواب یارو

میں کہتے کہتے جو راز ہستی کا ہوا تھا
میں کہہ رہا تھا حباب یارو، حباب یارو

OOO

ڈاکٹر اسحاق احمد وردگ

O

عام بندہ بھی محلے میں اہم ہوتا تھا
اگلے وقتوں میں محبت کا بھرم ہوتا تھا

میرے بچپن کی تمناؤں کا تھا تیں میاں
کہ مری جیب میں ہر وقت قلم ہوتا تھا

شرک کا روپ بھی وحدت کی طرح تھا سا کبھی
دل کی مسجد میں فقط ایک صنم ہوتا تھا

بھائی بہنوں پہ بڑے مسئلے حل ہوتے تھے
پہلے اظہار کے لفظوں میں دم ہوتا تھا

زندگی پہلے توازن میں رہا کرتی تھی
ایک زمانے میں یہاں ذکر عدم ہوتا تھا

مانگی جیب سے ہم بھیک نہیں لیتے تھے
تو ریاست پہ خدا ہی کا کرم ہوتا تھا

اب تو نفرت کے کئی فرقے بنے ہیں اس میں
پہلے پہلے یہ محبت کا حرم ہوتا تھا

OOO

عاصم بخاری

O

کتنے زردار ہو گئے ہو تم
گھر کے سردار ہو گئے ہو تم

درد کی دیوار ہو گئے ہو تم
کیسا کردار ہو گئے ہو تم

فیصلے اپنے آپ کرتے ہو
اتنے مختار ہو گئے ہو تم

اور تو کچھ میں کہہ نہیں سکتا
یارو اظہار ہو گئے ہو تم

اپنی بھی کچھ خبر نہیں رکھتے
کتنے بے زار ہو گئے ہو تم

علم میں یہ کمی ہے تمہارے بچو
ویسے بیمار ہو گئے ہو تم

تم تو عاصم بخاری سادہ تھے
کیسے فنکار ہو گئے ہو تم

OOO

تصور اقبال

O

خود فریبی ہی سہی خود پہ یقیں اچھا نہیں
تجھ سا اک شاعر مگر گوشہ نشیں اچھا نہیں

جب کسی دل میں ملے رہنے کو تھوڑی سی جگہ
اس مکاں میں دوسرا کوئی مکیں اچھا نہیں

آستیں کا سانپ جو ثابت ہو اور وہ پھر بھی
آپ کا ہو رازداں یا ہم نشیں اچھا نہیں

دیکھنے والی آپ نے منظر حسیں ازبر کیے
جو نظر کے سامنے پر دلنشیں اچھا نہیں

جس طرح سوکھے شجر پہ پھل کبھی لگتا نہیں
جاہل و کم ظرف جو مسند نشیں اچھا نہیں

رہ گیا جو کارواں سے دو قدم آگے کہیں
قافلے میں اس طرح کا پیش بیں اچھا نہیں

ہاں کی عادت ڈالیے اب مدعا جو کچھ نہیں
آپ کے لب پر ہو یہ لفظ نہیں اچھا نہیں

رابطہ اس نے یہ کہہ کر منقطع مجھ سے کیا
ہم سفر میرا جو اک شاعر حزیں اچھا نہیں

خوبصورت ہو بھلے سادہ سہی کچھ بھی نہیں
ہاں غزل کی ہو مگر اپنی زمیں اچھا نہیں

OOO

اظہر جاوید

O

جتنی محفل میں ہیں ان کے ہیں روگ سارے
اب مجھ پہ ہنس رہے ہیں احمق کے لوگ سارے

تم پہلی بات چھوڑو دیکھو ان سے جا کے پوچھو
لے لے کے نام جن کا کرتے ہیں سوگ سارے

کیا تم کو اک مرض نے لاحق کیا ہے دل پہ
بیٹھے ہیں جب سے ہم ہوئیں گے لوگ سارے

دو دو الم میں ڈوبے جو کر رہے ہیں سوتے
بیٹھے ہیں اہل دل بھی لے لے کے روگ سارے

اک بار وہ لپٹ کر آنکھوں کو چوم لے تو
ہم توڑ دیں گے اپنی پل میں وہ روگ سارے

OOO

طاہر منظور

O

رہتا نہیں کچھ یاد مجھے جام سے پہلے
ہوتی نہیں صبح مری شام سے پہلے

تہمت بھی لگا دی ہے مرے چال چلن پر
ملزم بھی بنا ڈالا ہے الزام سے پہلے

یہ عشق بھی الفت بھی تو دین ہے رب کی
اک لفظ بھی لکھا نہیں الہام سے پہلے

آمد کا ترا یار بہاروں کی ہمیشہ
دیتی ہے سندیسہ ترے پیغام سے پہلے

وعدہ ہے کہ اک روز مری جان ترا
آئے گا ترا نام مرے نام سے پہلے

تم ساتھ تھے میرے تو ستاروں پہ کمند تھی
بیٹھا تھا دریچوں میں لب بام سے پہلے

اک تیرے بچھڑ جانے سے خوشی زندگی ہے
بیٹھا تھا کبھی موسم آرام سے پہلے

طاہر یہ وطیرہ ہے مرا روز ازل سے
کرتا ہوں ثنا رب کی ہر اک کام سے پہلے

OOO

سفرنامہ

پہاڑوں کی ایک شام

تسنیم کوثر

نور کے تڑکے بجتی ہوئی موبائل فون کی گھنٹی مجھے ان کی آمد کا پیغام دے گئی تھی۔ بہار کی خوشبو میں رچی بسی مارچ کی اس دلنشین صبح میں خوشبوؤں کے دوش پر سوار حسن آرا آئیں اور مجھے ساتھ لے کے سروسز میس کی طرف چل دیں گرین وڈز کلب آف لاہور شادمان کا قافلہ تفریحی دورے کے لئے یہیں سے روانہ ہونے والا تھا۔ رفتہ رفتہ ممبرز آتے گئے اور ڈاکٹر شاہینہ آصف کے کمرے کے اندر اور باہر کی فضا زندہ دلان لاہور کے قہقہوں سے گونجنے لگی اور پھر جونہی کورم پورا ہوا، دو آرام دہ کوسٹرز اس قافلے کو اپنے دامن میں سمیٹے سالٹ رینج کی طرف چل دیں۔ چہرۂ سحر نمودار ہو گیا تھا۔ لاہور اس وقت جادوئی پرسکون دکھتا تھا۔ سڑکیں تقریباً سنسان تھیں۔ شور اور دھواں نہ ہونے کے برابر تھا۔ رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ لاہور سے اسلام آباد کی طرف جانے والی یہ خوبصورت شاہراہ اور بہاریہ سورج کی نرم گرم کرنوں کی لپیٹ میں تھی اور کوسٹر کے اندر سفر کے ابتدائی مراحل میں ہی ناشتے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ علی الصبح گھروں سے بلا ناشتہ نکلنے والے ہم سب مسافر اس وقت حلوہ پوری، چنے، انڈے، پراٹھا، کیک، چائے اور جوس پر اپنی توجہ مرکوز کئے ہوئے تھے۔

موٹروے کی فضا سے غافل نہیں تھے جہاں سرسبز و شاداب درخت لہراتے تھے اور کھیت کھلیان اپنی خوبصورتیاں دکھاتے تھے۔ جہاں بہار کی خوشبو اپنے پر پھیلائی تھی اور مسافروں کا دل پر جاتی تھی۔ چند ہی لمحوں میں سے ہم گزرتے گئے اور دریائے چناب تک موٹروے کے دونوں طرف سفیدے اور شیشم کے درخت آنکھوں کو تراوت بخشتے تھے۔ لوک داستان والے اس دریا کے پار اترتے ہی سرگودھا کے کینو اور مالٹوں کی مہک فضا میں پھیل گئی تھی۔ اس مہک نے ہماری اشتہائے خورد و نوش بڑھا دی تھی اور پھر جھٹ پٹ قافلے کے سارے سامان سے کینو برآمد کر کے سب مسافروں تک پہنچا دیے گئے تھے۔ دریائے جہلم تک پہنچتے پہنچتے باہر کی فضا سے تو کینو مالٹوں کی مہک غائب ہو گئی تھی مگر کوسٹر کی فضا اب بھی مہکی ہوئی تھی۔ دریائے جہلم پار کرتے ہی موٹروے نے اپنا رنگ بدل لیا تھا۔

سڑک گہری سرمئی ہو گئی تھی اور خاکستری مٹی اب سرخی مائل دکھائی دینے لگی تھی اور بلند و بالا پہاڑوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے سڑک کے کنارے کیکر اور پھلاہی کے درختوں کی قطاریں اور فضا میں اڑتے پرندوں کی ڈاریں جب ساتھ دے رہی تھیں تو وہاں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی موٹروے ناگن کی طرح لہراتے، بل کھانے لگی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے دور سے ہیولے کی مانند نظر آنے والے پہاڑ اب واضح دکھائی دینے لگے تھے اور انہی پہاڑوں کے بیچوں بیچ بل کھاتی سڑک ہمیں مزید اونچائی کی طرف لے جا رہی تھی۔ ہمارا پہلا پڑاؤ (PMDC) پاکستان منرل ڈویلپمنٹ کارپوریشن کا ریسٹ ہاؤس تھا۔ پرانی طرزِ تعمیر کا، بلند و بالا چھتوں والا یہ ریسٹ ہاؤس انگریزوں نے 1876ء میں تعمیر کرایا تھا۔ وسیع رقبے پر پھیلے اس ریسٹ ہاؤس کی عمارت کو گھنے درختوں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

یہاں انتظامیہ کی طرف سے پرتکلف چائے کا اہتمام تھا۔ ہم کچھ دیر کو اس ریسٹ ہاؤس میں رکے، چائے پی، فوٹو سیشن کیا اور تازہ دم ہو کر اس سمت چل دیے جہاں سے تھوڑی دور صرف چند منٹوں کی مسافت پر کم گیج کی ریلوے لائن پر ایک چھوٹی سی ٹرین مہمانوں کی راہ تک رہی تھی۔ اس ٹرین کو جو انجن چلا رہا تھا وہ 1930ء میں لگایا گیا تھا۔

تقریباً دو کلومیٹر لمبے اس ریلوے ٹریک کے دائیں بائیں نمکین دیواریں اندھیرا اوڑھے کھڑی تھیں۔ اس ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ پتھروں پر لڑکھڑاتے ڈگمگاتے پیدل مارچ کر رہے تھے۔ کچھ ایک طرف کھڑے تصویریں بنا رہے تھے اور کچھ ٹرین میں بیٹھے ان مسافروں کو دیکھ کے مسکراتے اور ہاتھ ہلاتے جاتے تھے۔ مجھے دو کلازہ کا ریلوے اسٹیشن یاد آ گیا۔ کیا خوب تھا بچپن بھی۔ جب ہم سب بچے مل کر گھر کی چھت پہ کھڑے آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھا کرتے تھے اور انجان مسافروں کو اسی طرح ہاتھ ہلا کے اپنی اور متوجہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ یہ چھوٹی سی ٹرین اندھیری سرنگ سے ہوتی ہوئی ہمیں اب اس منزل پہ لے آئی تھی جہاں رب کائنات کی بے پایاں عنایات اور حضرت انسان کی تراشیدہ کرامات ہمارے سامنے تھیں۔ باہر ہم سنہری دھوپ چھوڑ آئے تھے۔ نمک کی اس بستی میں داخل ہوتے ہی پرسکون اندھیرا بہت بھلا لگ رہا تھا اور اس خوابناک اندھیرے میں سیاحوں کی حیرت زدہ سرگوشیاں ماحول کو اور بھی پراسرار بنا رہی تھیں۔ ہم اللہ کی شان ـــــ اور نمک کے لامحدود ذخائر والی اس کان کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جس کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ٹھنڈک کا فرحت بخش احساس ہونے لگا تھا۔

کہتے ہیں یہاں درجہ حرارت 18 اور 20 ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ اس وقت بھی یہاں خاصی ٹھنڈک تھی۔ نیم تاریکی نے مزید ٹھنڈا ٹھنڈا سا کر دیا تھا۔ کھیوڑہ مائنز کے ابتدائی رستے میں روشنی کا خاطر خواہ انتظام ہونے کے باوجود اندھیرے نے اپنے پاؤں پھیلائے ہوئے تھے مگر ـــــ کچھ دور آگے جاتے ہی یہ اندھیرا چھٹنے لگا اور آنکھیں جیسے چندھیا سی گئیں۔ اب میرے چاروں طرف روشنیاں تھیں۔ سفید، لال، گلابی، نارنجی، نیلی اور پیلی روشنیاں جنہیں نمکین پہاڑوں کے شفاف پتھروں میں برقی قمقمے نصب کر کے ماحول کو بہت دل کش اور رنگین بنا دیا گیا تھا۔ یہ ایسا طلسماتی نظارہ تھا جسے انسانی عقل ماننے سے انکاری تھی مگر ـــــ قدرت کی اس صناعی کو آراستہ اور پیراستہ انسانی ہاتھوں نے ہی کیا تھا۔ تبھی تو دور پار علاقوں سے آنے والے ملکی و غیر ملکی سیاح اس عظیم نمک میں آ کے رنگین جلوے سمیٹتے دکھائی دیتے تھے۔ ان پہاڑوں میں تو آگ دیا آیا تھی اور ہم اس وقت نمک کے حصار میں تھے۔

نمک کی اس کان کا انکشاف 326 قبل مسیح میں اس وقت ہوا جب ـــــ دریائے جہلم کے کنارے سکندر اعظم اور راجہ پورس کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ کے دوران سکندر اعظم کے گھوڑے یہاں پتھروں کو چاٹتے ہوئے پائے گئے اور یوں ـــــ سکندر اعظم کے یہ جنگجو گھوڑے نمک کے اس خزانے کی دریافت کا سبب ٹھہرے جسے کھیوڑہ سالٹ مائنز کہا جاتا ہے۔ نمک کی یہ کان رقبے کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی اور پیداوار کے لحاظ سے پولینڈ کے بعد دوسری بڑی کان ہے جو کھیوڑہ، ضلع جہلم تحصیل پنڈ دادنخان میں کوہستان نمک کے پہاڑی سلسلے میں واقع ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ پنڈ دادن خان سے شروع ہو کر میانوالی اور ضلع کرک (کے پی کے) تک چلا گیا ہے۔ کھیوڑہ کی یہ کانیں زیر زمین ایک سو دس کلومیٹر رقبے تک پھیلی ہوئی ہیں اور دہانے سے اندر پہاڑوں میں سات سو پچاس میٹر دور تک چلی گئی ہیں۔ ان تمام (Tunnels) سرنگوں کی مجموعی لمبائی قریباً چالیس کلومیٹر ہے اور اس کی کل سترہ منزلیں ہیں جن میں سے گیارہ منزلیں زیر زمین ہیں جبکہ

چھٹی اور ساتویں منزل سیاحوں کے لئے وقف کی گئی ہے۔

اس کان کی کھدائی کا بیڑہ ماہر انجینئر ڈاکٹر وارتھ نے 1872ء میں اٹھایا تھا جبکہ سائنسی بنیادوں پر نمک کی تلاش کا کام تو انگریز بہادر نے 1849ء میں شروع کر دیا تھا تب سے اب تک یہ کام مسلسل جاری ہے اور ان سترہ منزلوں سے تاحال نمک نکالا جا رہا ہے۔ ان منزلوں میں پچاس فیصد نمک نکال لینے کے بعد پچاس فیصد نمک کو بطور ستون چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ یہ ستون ان منزلوں کا بوجھ اپنے نمکین کندھوں پر اٹھائے رکھیں اور نمک کے یہ لامحدود ذخائر جو صدیوں سے استعمال ہو رہے ہیں مزید کئی صدیوں تک استعمال ہوتے رہیں۔ نمک کی اس دنیا میں پہلی بار میں اپنے ماموں جان کا ہاتھ تھامے داخل ہوئی تھی۔ غالباً ساٹھ کی دہائی کا آٹھواں سال تھا جب ماموں جان کی پوسٹنگ کھیوڑہ مائنز ہوئی تھی۔ ماموں جان کسٹم اینڈ ایکسائز انسپکٹر تھے اور ہم گرمی کی چھٹیاں گزارنے ان کے پاس آتے تھے تب کئی بار میں اس نمکین نگری میں آتی جاتی رہی تھی مگر یہ تو نصف صدی کا قصہ تھا، دو چار برس کی بات نہیں تھی۔ ان پچاس برسوں میں جہاں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ نمک کی یہ دنیا بھی بدل گئی تھی بلکہ بہت رنگین ہو گئی تھی۔ ہم کان کی چھٹی منزل پر تھے جو سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر تھی یہاں نمکین اینٹوں سے بنے بے داغ فرش کی ناہمواری ہمارے قدم ڈگمگانے پر تلی تھی مگر ہم سب قدرت کی اس جادوگری اور بشر کی اس کاریگری کو سراہتے ہوئے ان پتھروں پر سنبھل سنبھل کے چل رہے تھے اور چلتے چلتے اس جگہ پہنچے تھے جسے چاروں طرف سے نمک کی دیواروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس چوک کو چاندنی چوک کا نام دیا گیا ہے۔ نمک میں رنگوں اور روشنیوں کی آمیزش نے اس چاندنی چوک کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ کچھ اور آگے بڑھے تو ایک خوبصورت مسجد ہمارے سامنے آ گئی۔ اس بادشاہی مسجد کو نمک کی مختلف رنگوں کی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ نمک کی ان اینٹوں کو کھوکھلا کر کے ان کے اندر مختلف رنگوں کے بلب لگا دینے سے یہ رنگین اینٹیں خوبصورت منظر پیش کر رہی تھیں۔ شفاف نمک میں دلکش رنگ چھلکاتے ہوئے یہ روشن قمقمے دیکھنے والوں کو بہت مسحور کر رہے تھے۔ تھوڑا اور آگے گئے تو دائیں طرف استھما کلینک نظر آیا۔ جہاں دمے اور الرجی کے مریض لوگوں کا علاج نمک سے پھوٹنے والی شعاعوں سے تھراپی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس وقت بھی یہاں کئی لوگ زیر علاج تھے اور ان کا ایک سیشن چھ گھنٹوں کے دورانیے پر مشتمل تھا۔

استھما کلینک سے تھوڑا آگے بائیں طرف وہ مقام تھا جہاں پہاڑوں سے رسنے والا پانی ہر گھڑی قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا ہے۔ کئی جگہوں پر تو یہ ٹپکتا ہوا پانی جم کے جھرنوں کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جسے شاعر مزدور احسان دانش نے جب دیکھا تو ٹپکتے ہوئے قطرہ قطرہ پانی کو اشک نمک سے تشبیہ دی تھی۔ پانی کے اس قطرے کے ٹپکنے کی آواز کو انہوں نے گریۂ نمک کہا، قطرے کے جھرنی تک پہنچنے کی آواز کو آہ نمک سے منسوب کیا اور قطرے کے جھرنوں پر گر کے ان میں ضم ہو جانے کو وصال نمک کا نام دیا تھا۔ گائیڈ کی ان معلومات اور ایک شاعر کی خوبصورت تشبیہ سے یہ جگہ اور بھی خوبصورت لگنے لگی تھی۔ نمک کے اس دیس میں ہم نے ہر شے نمک کی دیکھی۔ ہر مقام نمک سے بنا ہوا پایا مثلاً پہاڑی، مال روڈ، چاغی پہاڑ اور مینار پاکستان کا ماڈل حتیٰ کہ دیوار چین اور دیوار محبت بھی جسے محبت کے تمنائی اور شیدائی چاٹتے ہیں اور من کی مرادیں مانگتے ہیں۔ چلتے چلتے اب ہم شیش محل تک آ گئے تھے جس کی چھت اور در و دیوار سب شفاف گلابی نمک سے بنے تھے۔ ان بام اور در پر روشنی کی کرنیں جب بکھرتیں تو در و دیوار شیشے کی طرح چمکنے دمکنے لگتے۔ ابھی ہم اس شیش محل سے پھوٹنے والی روشنیوں میں منہمک تھے کہ گائیڈ ہمیں پل صراط تک لے آیا، یوں تو جانے کتنی بار ہمیں اس زندگی کے پل صراط سے گزرنا پڑا تھا سو ہم

اس پل صراط تک بھی بخوشی جا پہنچے۔ یہ نمکین پل، جسے پل صراط کا نام دیا گیا تھا اس کان کے دو ایسے حصوں کو آپس میں ملاتا ہے جہاں گہری کھائی ہے۔ اس پل سے گزر کے ہم کان کے اس حصے میں جا پہنچے جسے عوام الناس کی پہنچ سے دور رکھا گیا ہے مگر روڑی سیاحوں کے لئے گائیڈ نے چابیوں کے وزنی گچھے میں سے ایک چابی نکالی ــــ چابی گھما کے بھاری بھرکم قفل کی قفل کشائی کی اور ہمیں اس جگہ لے آیا جہاں ــــ نیچرل سالٹ آرکیٹیکٹ (Natural Salt Arcitect) کا بورڈ لگا تھا۔

اس نمکین بادشاہی میں ہمیں انسانی ہاتھوں کی کاری گری نہیں بلکہ قدرتی نقش نگاری دیکھنے کو ملی۔ ایک طرف نمک کی قدرتی تراش خراش نے جلی حروف میں اسم "محمد" لکھ دیا تھا۔ کہیں قائد کے مجسمے پر علامہ اقبال کا پورٹریٹ نمک سے بنا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی مینار پاکستان کی شبیہ دکھائی دے رہی تھی۔ مینار پاکستان کا نمکین اور رنگین اینٹوں سے بنا ماڈل ہم اس کان کے ایک اور حصے میں بھی دیکھ چکے تھے جس کی چھت سے جا بجا چھوٹے چھوٹے مینار پاکستان کو منور کئے ہوئے تھیں۔ نمک کے اس پل کے نیچے نمکین پانی کے تالاب میں بلبلے اٹھتے اور روشنیاں ہمیں کسی طلسماتی دنیا میں لے آئی تھیں۔ مختلف چھوٹی چھوٹی سرنگوں میں دلکش روشنیوں کی اٹکھیلیاں دیکھتے دیکھتے ہم کرسٹل ویلی میں آ گئے تھے جہاں چاروں طرف نمکین ہیرے بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں کھدائی کے بعد نمک نے دوبارہ کرسٹل کی شکل اختیار کر لی تھی ان چھوٹی چھوٹی سرنگوں سے ہوتے ہوئے ہم باہر نکلے تو گائیڈ نے بتایا کہ اس کان میں بہت سی لمبی لمبی سرنگیں بھی ہیں۔ ایک اسمبلی ہال ہے جو تقریباً ساڑھے تین سو فٹ اونچا ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے پانچ سو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ جی تو چاہا کہ اسمبلی ہال تک جا پہنچیں مگر ــــ کئی گھنٹوں کی مسلسل مسافت اور گھنٹوں کی ذرا کت کے باعث ہم میں سے کوئی بھی پانچ سو سیڑھیاں چڑھنے اور پھر پانچ سو سیڑھیاں اترنے کی ہمت نہ کر پایا سو واپس مڑنے میں ہی عافیت جانی۔

وادیٔ نمکین کو الوداع کہتے ہوئے کیوڑہ وسائیز سے گزرتے ہوئے یونہی ــــ لمحہ بھر کو میں نے پیچھے پلٹ کے دیکھا تو ماضی کے دھندلکوں میں ایک شوخ و شنگ پاؤں والی بچی اچھلتی کودتی دکھائی دی جو ــــ برسوں پہلے یہاں ــــ انہی رستوں پہ کبھی اپنے پیار کرنے والوں کے ساتھ آتی جاتی تھی مگر اب تو وہ سب دور افق پار جا بسے تھے۔ وقت لمحوں کے قفل آ گیا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا یہاں تک کہ اب وہ بچی بھی بہت بدل گئی تھی۔ یہ دھندلی دھندلی یادیں مجھے رنجیدہ کر گئیں۔ اپنے کتنے ہی پیاروں کی دوری مجھے رلا گئی۔ نمک کی اس کان میں کچھ اور نمک کا اضافہ ہو گیا ــــ میرے بے تاب آنسو چھلکے اور ہمیں کہیں گم ہو گئے ان لمحوں کی طرح جنہیں واپس لانا کسی کے اختیار میں نہیں۔ میں نے ہتھیلی کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں صاف کیں اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے قافلے سے آملی۔

اب جانا تو ہمیں کلر کہار تھا مگر ــــ ہم میں سے بہت سوں کا کٹاس راج دیکھنے کو بھی جی کیا تھا۔ بس پھر دل کی مان لی گئی تھی اور کوسٹر کا رخ چوا سیدن شاہ کی طرف ہو گیا تھا۔ چوا سیدن شاہ ــــ وہ بستی جو حضرت سخی سیدن شاہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ حضرت سخی سیدن شاہ ــــ اللہ کے وہ برگزیدہ بندے جنہوں نے اس ویرانے میں چلہ کاٹ کے عبادت و ریاضت کی اور اپنے فیضان کا چشمہ جاری کیا۔ ہم نے حضرت سخی سیدن شاہ کو ہدیہ سلام پیش کیا اور چوا سیدن شاہ کے بازاروں سے ہوتے ہوئے بل کھاتے پر پیچ راستوں پہ آگے بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ہم ہندوؤں کے اس متبرک مقام پہ پہنچ گئے تھے جس کا ذکر قبل مسیح سے بھی کئی سو برس پرانی کتاب "مہابھارت" میں ملتا ہے۔ کٹاس راج ــــ شیو دیوتا کا آنسو ــــ ہندوؤں کا مقدس تالاب۔ برہمنوں کی روایت کے مطابق جب شیو دیوتا کی بیوی ستی سورگباشی

ہوگئی تو اس غم نے شیو دیوتا کو نڈھال کر دیا۔ شدت کرب سے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپکے جن میں سے ایک راجستھان (انڈیا) میں اجمیر شریف کے قریب گرا اور دوسرا یہاں کٹاس راج میں ضم ہو گیا۔ برصغیر پاک و ہند میں غم کے یہ چشمے تب ہی سے رواں ہیں اور ہندوؤں کے متبرک مقامات ہیں۔ بہت وسیع رقبے پہ پھیلا ہوا یہ تاریخی کٹاس راج اپنے اندر صدیوں کی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔

کٹاس راج میں بہت سے مقدس تالاب ہیں ــــ بہت سے محل ہیں۔ بدھ مت کے ستوپے ہیں۔ بارہ دری ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جرنیل ہری سنگھ نلوہ کی حویلی ہے اور اور ــــ بہت اونچائی پہ اشوکا دور کے وہ مندر بھی ہیں جن کی تعداد سات ہے اور جنہیں ست گھرہ مندر کہتے ہیں۔ کٹاس راج میں گام گام تاریخ کے اوراق بکھرے نظر آتے تھے جو ہمیں اپنی اور بلاتے رہے مگر ہمارے پاس وقت محدود تھا اور اس محدود وقت میں لامحدود تاریخ کے اوراق پلٹنا ممکن ہی نہ تھا۔ یہ وقت کا پہیہ بھی عجیب ہے کبھی تو تھم جاتا ہے، سرکتا ہی نہیں اور کبھی پلک جھپکنے میں گزر جاتا ہے اور یہ دل بھی کم پہ اکتفا نہیں کرتا۔ سب کچھ پا لینا چاہتا ہے۔ مچلتا جاتا ہے۔ یہاں آتے سے بھی دل نے کہیں قرب و جوار میں وہ جگہ دیکھنے کی ضد کی تھی جہاں مشہور مسلمان ریاضی دان ــــ جغرافیہ دان ابوریحان البیرونی نے قیام کیا تھا دل تو اس تجربہ گاہ کو دیکھنے کو بھی مچلا تھا جہاں البیرونی نے زمین کے قطر کی پیمائش کی۔ زمین کی گولائی کو پایا ــــ یہیں سنسکرت زبان سیکھی اور پھر اپنی معروف زمانہ کتاب الہند تصنیف کی مگر ــــ دل کی ہر بات ماننا ممکن نہیں وہ مچلتا رہا اور ہم ان سنی کرتے ہوئے کٹاس راج سے نکلے اور کلر کہار کی طرف چل دیے۔ رستے میں گام گام لوکاٹ کے درختوں نے صدائیں دیں ــــ پکے پکے ہوئے اور پیلے لوکاٹ اپنے جوبن سے ہمیں مائل کرتے رہے مگر ہم تاب رکنے والے تھے؟ کسی نے بھی ان تازہ لوکاٹوں کی صداؤں پہ کان نہ دھرے البتہ آنکھوں میں ان کے جلوے بھرتے رہے اور ما بیٹے پیچھا کر لوکاٹ تک رسائی نہ پانے کا غم غلط کرتے رہے۔ کوسٹر کی اندرونی فضا مردانہ اور زنانہ گائیکی سے گونج رہی تھی۔ دل دار راستے اس گونج کو لرزا تو رہے تھے مگر روک نہیں سکے تھے جو جتنی کوشش موزوں کا گی تھی ہماری آواز کا اتار چڑھاؤ اس کی رو میں آ جاتا تھا لیکن پھر سنبھل جاتا تھا۔ خم دار موڑ مڑتے ہوئے دل دار رستوں پہ چلتے ہوئے ہم کلر کہار کی حدود میں آن پہنچے تھے۔ یہیں وہ باغ صفا ہے جس پہ تاریخ نے بابر کے نام کی مہر ثبت کر رکھی ہے جسے مغلیہ دور کا پہلا باغ کہا گیا ہے۔

یہاں پیالہ نما جھیل تھی ــــ جھیل میں مرغابیاں تھیں ــــ کشتیاں تھیں ــــ بلندی کو چھوتے ہوئے اور پھر نشیب کی طرف پلٹتے ہوئے بچوں کے جھولے تھے اور یہیں قریب ہی اس دلنشیں، دلگداز فضا میں وہ ریسٹ ہاؤس تھا جس کے صدر دروازے پہ قاضی محمد اکبر اور ان کی بیگم شیریں قاضی، تاریخ کی ورق گردانی کرنے والے اس قافلے کے منتظر تھے۔ قاضی محمد اکبر ڈسٹرکٹ چکوال کی اہم شخصیت ہیں۔ پاکستان پولٹری ایسوسی ایشن کے چیئرمین ہیں۔ چکوال چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے سابق صدر اور موجودہ پیٹرن انچیف ہیں۔ کلر کہار میں وہ ہمارے میزبان تھے۔ ہمارے خوش مزاج میزبانوں نے ہمارا والہانہ استقبال کیا۔ یہاں ہم نے ایسی صحت مندانہ اور شاہانہ فضا دیکھی کہ بے اختیار اپنے وطن پہ پیار آیا ــــ دل رب کریم کا شکر بجا لایا جس نے ہمارے وطن کو اتنے خوبصورت نظاروں سے، کوہساروں سے مالا مال کیا۔

ہم کچھ تاخیر سے یہاں پہنچے تھے۔ ڈائننگ ہال میں انواع و اقسام کے کھانے ہمارے منتظر تھے ان کی مہک بھوک کی اشتہا انگیزی میں اضافہ کر رہی تھی۔ بھوک شدید تھی اور کھانا لذیذ، بے حد لذیذ۔ ہم تھکے ماندے مسافروں نے کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ دل

کمی کسر اس سویٹ ڈش نے پوری کر دی جسے ہماری پیاری دوست مسز فرزانہ رضا خورشید صبیح ساتھ میں سے بہت محنت سے بنا کر لائی تھیں۔ طعام سے فارغ ہوئے تو ہم اس ریسٹ ہاؤس کے عارضی قیام کا لطف لینے لگے۔ خوش رنگ پھولوں، جھومتے درختوں اور صاف ہوا کے جھونکوں نے ہمیں سرشار کیا ہم ریسٹ ہاؤس کے گرد و نواح میں گھومتے پھرتے رہے، گروپ فوٹو بناتے رہے پھر بالائی منزل سے ٹیرس پہ کھڑے ہو کر کلر کہار کا نظارہ کرتے رہے۔ سبزے کی چادر اوڑھے پہاڑ دل لبھاتے رہے۔ ہوا کے خوشگوار جھونکے ہم سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ لوکاٹ کے درخت جھومتے رہے، پرندے فضاؤں میں گھومتے رہے۔ مور پر پھیلائے رقص کرتے رہے اور ہم انہیں دیکھ دیکھ خوش ہوتے رہے۔ ہوا میں گنگناتی رہیں دل لبھاتی رہیں۔ گھوم پھر کے جب تھکن نے اپنا رنگ دکھایا تو ریسٹ ہاؤس کے خوبصورت لان میں آ بیٹھے۔ چائے ہم سب نے یہیں لان میں پی مگر اس سے پہلے اس دلنشین فضا میں چمن آرا کی بنائی ہوئی فروٹ چاٹ کے مزے بھی لئے اسی وسیع لان میں بیٹھے ہوئے دور دور تک کیبل کار کو بھی دیکھا تبھی نظر اپنے کچھ ساتھیوں پہ جا پڑی جو اوپر بلندی پہ بنے اک اللہ والے موراں والی سرکار کے مزار پہ حاضری دینے کیلئے جا رہے تھے۔ میں نے ان کی ہمت کو سراہا جی میں آئی مگر گھٹنوں نے اجازت نہ دی اور میں حسرت بھری نگاہوں سے بلندی کی طرف جاتی راہوں کو دیکھتی رہی۔

ساتھی واپس پلٹے تو ہم رخت سفر باندھ چکے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر شاہین آصف نے حسب عادت، حسب روایت میزبانوں کو تحائف دیے اس کے بعد ہم سب نے گروپ فوٹو بنوائے اور میزبانوں سے اجازت چاہی۔ پہاڑوں میں شام اترنے کا دلنشین منظر ہم نے اسی ریسٹ ہاؤس کے لان میں دیکھا اور اس سے پہلے کہ یہ خوبصورت شام ہمیں اپنے سحر سے نہ نکلنے دیتی ہم تاروں کی چھاؤں میں وہاں سے نکل آئے تھے اور یہ سرشاری، یہ کچھ تھکن لئے رات گئے اپنے گھروں کو پہنچ گئے تھے۔

◆◆◆

عبدالحمید رازی ادب کا ایک ستارہ

حمید رازی کا مقام اردو ادب کے ساتھ ساتھ پنجابی ادب میں بھی نمایاں ہے۔ اوائل عمری میں ہی کتب بینی کا شوق اجاگر ہو گیا تھا۔ رجحان سفر ناموں کی طرف زیادہ تھا۔ اس لیے اس وقت کے تمام مقبول سفر نامہ نگاروں کے سفر نامے پڑھ ڈالے۔ یونیورسٹی کے زمانے میں جب میاں محمد بخش کی کتاب ''سیف الملوک'' پڑھی تو بقول ان کے ''یہ کتاب پڑھ کر میری دنیا ہی بدل گئی'' اس کے بعد باقاعدہ پنجابی شاعری اور سفر نامہ نگاری کا آغاز کیا۔ حمید رازی کا کہنا ہے کہ ''سفر نامہ میرا پہلا ادبی عشق ہے''۔ ان کے پنجابی سفر نامے ''چندری توں ہیرو شیما تک''، ''پینگ فیر لاں گے'' اور ''خاب دھیان'' چھپ کر قبول عام ہو چکے ہیں۔ عملی زندگی میں ریلوے کے محکمے سے منسلک ہیں ایمانداری اور خوش اسلوبی سے اپنی ملازمت کے تمام فرائض ادا کرنے پر انھیں گریڈ 21 سے 22 میں پروموٹ کر دیا گیا۔ بہت بہت مبارکباد وصول کریں۔ سب دوستوں سے گزارش ہے کہ خوشی کے اس موقع میں ان کو فون کر کے الحمدللہ پڑھ کر ان کی کامیابی پر مبارکباد دی جائے۔

سرائیکی توشۂ خاص

ناول ''تانگھ''

……2……

بشریٰ رحمٰن

علی مرتضیٰ ویہ چاؤں پھوپھیر وو ڈٹھا۔ ''وڈی عجیب گالھ ہے اوں دل وچ سوچیا۔ ہرن دے تے پھوپھیر دیاں اکھیں کیڈیاں رلدیاں ہن! دوہیں کوں ہے رنگ دا رال اوندے ورگیاں ہن۔ فرق صرف اتی ہے جو پھوپھیر دے اکھیں وچ تھولا جیہاں ڈر ہا جیڑھا جو ہرن دے اکھیں وچ اوں ہا نہ ہائی! اصل ایہا ڈر اوں ہرن حل دے اکھیں وچ ہوندی اے ۔۔۔ اوں ہرن دا پال عالی وی اگوں دو تلا ہوئیا۔ ''کیا تھئے انگیوں؟'' علی مرتضیٰ پچھیا ہک دل پچھوں گھل ڈال اوں بال والد پھرا کر گھدا تے وت مٹ پچھیر تے گھلن گئی۔ ''ایہا مطلب، او وہوندی گالھ چنگی طرح اوں سمجھ نی پئی ہئی۔

''کیا توں میڈی بولی سمجھدیں؟'' علی مرتضیٰ نے پچھیا۔ پھوپھیر نے ''ہا'' وچ سر لوڈیا۔ ''وت بولیندی کیوں نہیں؟'' اوں انھیں وچ کالی توکار داکونا گھت کھڈا۔ ''کیا گونگی ہیں؟'' علی مرتضیٰ نے ڈال گونگی دا اشارہ وی کیتا۔ ایں تے اوہ ول پچھوں اندر وچ کھلی تے بولی۔ ''نمیں گونگی کا نگی۔ میڈا ابوں سوچیے سوچیے ایں پاسے بھیج آیا۔ میں اوندے پچھوں سمجھی سمجھی ایں پاسے آ گئی ہاں۔'' ''پچھوں۔ کتھاں ہے پچھوں؟'' علی مرتضیٰ تے اڈے اڈے ڈیہدے ہوئیں آکھیا۔ اوں وت آپنے ہوٹھاں دے ساڈ وچا ڈتے۔ ''میڈے ہرن دا ناں پچھوں ہے سمیں!'' ''اوں وت ہرن دا پال اوندے اگوں کر ڈتا۔'' ''ایہ میں ۔۔۔ میں سمیں تاں تھیں ۔۔۔ میڈا ناں علی مرتضیٰ ہے۔'' ''علی سمیں!'' ''ناں سمجھی چنگا علی!'' ''ایں کے پھوپھیر نے ہک واری وت کھلا لایا۔''

علی مرتضیٰ نے غور نال اوندو ڈٹھا۔ اوندے کھارے جیڑے ولیر تے بے چنتے ہن۔ اعلادی انھاں وچ خیالی ہئی۔ چاولاں توں بھرے ہوئے ہن۔ ہچے تے کنڑے کھارے ، جیڑیں بھوں سارے چاتری دے سکے ہک ہپے ڈال لگ کے وجھ سے ہپے ہودن، اوہ سٹ ملخ گھرپایا ہا۔ اوں ایڈی ٹھنڈی ڈکھاوے توں پاک تے صاف شفاف گھل کتھا ہیں نہ ڈٹھی ہئی۔ ''انجان ہیں۔'' اوں پچھیا۔ ''ہا، رستہ بھل گیاں۔'' ''کتھاں ونجنڑاں چاہیدہ؟'' ''میں قلعہ امروٹ ڈیکھناں چاہندا ہاں۔'' ''قلعہ امروٹ ۔۔۔؟ اوں حیریان تھی تے پچھیا۔ ''اتھاں کوئی قلعہ امروٹ کا نگی!'' ''ہا، ہک جاہ ہے جیکوں امروٹ آہدن۔'' ''امروٹ۔ امروٹ۔ ہاہا۔ اوہو۔ میں ایں جا وچیں گھن چلسیں؟'' ''ہا، گھن چلساں؟'' ''تھولا دور ہے؟'' ''انھوں ڈھیر دور ہے کا نگی!'' ''چل وت'' ''جیڑھے علی مرتضیٰ نے جگے تے چاہے تاں او بولی! ''جیپ وچ نہ جلسو سمیں!'' ''کوئیاں میڈا ڈرائیور رکھا ہے۔'' اگوں وو جھکے تے اوں ڈٹھا۔ ڈرائیور واقعی بے چنتا تھا پیا ہا۔ جیڑیں اور سینے تے نہیں بلکہ شکل دے بستر تے سٹا پئے۔ ''صحیح جیپ دا ہک مہمان وی ہے گئے۔ ایندے وچ کجھ نی خرابی وی

ہے۔ دارا ایویں ڈاڈھی کراہیں ایکوں ٹھیک کر لیسی۔ ایہہ وت چلسی۔ میں ہیریں ڈیکھداں۔'' ''تاں کیا تھکے ہیریں چلسو؟'' ''تیکوں وی تاں بھتی تھکیں پائی ہوئی'' اوہ وت کھلی۔ ''اساکوں ہیریں دا ٹے پھرن دی عادت ہے۔'' ''میکوں وی ایہہ ٹھنڈڑی ریت چنگی لگدی ہے۔'' ''جیہیں تھوڑی دیر بعد جیڑھے ایہہ ریت تتی تھی ویسی تاں تہاڈے پیراں تے چھالے پے ویسن۔'' ''کیا اکھاں دھپ نکلن توں پہلے ول نہ آسوں۔'' ''تساں احتیاط کریندے ہوئیں آپنی جتی نال چاتی چلو۔'' علی ہیر نے آپناں ہرن ڈوجھی ہتھ وچ پاتا۔ تے کجھ سوچیندیں ہوئیں بولی ''اتھوں میڈی جھوک نیڑے ہے۔ تساں پہلیں اتھاہیں چلو۔ اتھاں میڈا ابا تے ماں ہے۔ اوہ تہاکوں آپنے ہتھ تے پانی کراہیں گھن ویسن تے جلدی اتھاں چھوڑ ڈیسن۔'' ''تے کیا توں میں کنوں ڈردیں؟'' ''کونہ!'' ''اوہ سچائی نال مرا لڈیا۔''
''ایں واسطے میکوں بکریاں دا چھیڑو ہتے۔ جنگل میں ویٹے تے ڈاں ہنجیں۔ تاں اوشور مچایا تے سارا اسمان سر تے چا گھدس۔''

''تاں کیا کوئی بیا کائی۔ تیڈے گھر وچ جیڑھا بکریاں دا چھیڑو بن سگے؟'' ''میڈی بھین ہے، ماں ہے۔ میڈی بھین اپنی دا چھیڑو وی ہوندی ہے۔ میڈی ماں ڈھگاں دا چھیڑو ہوندی ہے۔ بکریاں کوں میڈی عادت ہے۔ تیکوں نیڑے ڈیکھ آون ڈیندیاں۔'' ''تہاں بکریاں بن جیڑے کوہیں؟'' علی مرتضیٰ نے اوہدے نال ٹردے ہوئے پچھیا۔ ''بس چار تھا۔'' ''بس۔ تے توں ایڈی فکر دیکھ کریندی پئی ہیں۔ میڈا خیال ہا۔ تیڈے کول بکریاں دا ہک اجڑ ہوسی۔'' ''نئیں۔ اساں بہوں غریب ہیں۔ ایں علاقے وچ کہیں کنوں ڈو دانہہ، ہک گاں تے کجھ بکریاں ہوون دی بہوں وڈی گالہہ ہے۔ اساں ایہہ گھر وچ کراہیں اپنا گزران کریندے ہیں!''

''اوہ! غربت۔ اوہا غربت۔'' علی مرتضیٰ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت تے اپنے مضبوط پیر رکھدے ہوئیں سوچن لگا۔ جیڑھے جیڑھے غریباں علاقے وچ اوگیا غربت نے اوکوں ہی آیاں توں آ گھیا۔ اوہ صوبہ سرحد دے پہاڑی علاقے ہوون یا پنجاب دے وستیاں، بلوچستان دے سوتے والیاں ہوون یا سندھ دے ریگی۔ ''غربت تے بیماری ہر جاہ ڈس پئی۔'' ''انہاں کوں گذران سوجھلا ملسی۔'' ''انہاں کوں اساں گذران حیاتی ڈیسوں؟'' ''گذراں بڑی بڑی موڑی دکھن آلیاں دا ایڑا۔'' ''بندے بن جیڑھے جیڑھے دے ڈیہہ دی ناگھو وچ!'' اوہ آپنے لیکچر کیتے عنوان سوچن لگیا۔ اوکوں اوں ویلے ہوش آیا جیڑھے اوہ ہک گندھ دی کار عجیب جیہیں گھر دے باہر کھڑا ہا۔ تے ہیر آپنے پیر دیاں کڑیاں ہیندی اندر بھج گئی ہئی۔ ''اگلے لمحے وچ ای اوں لمبے لمبے ساتو لے تے رتے بندے باہروں نکل آئے۔'' ہک بڈھا جھڑایا۔ کیوں جو اوہ دے وال چٹے ہن۔ ڈوجھا فقیر ہا۔ پر ڈوہاں دے منہ کوں جیہیں کرتے تے کھوڑے ہن۔ تنگ چھلے ہوئے ہن تے کوہے دی کار سخت ہن۔ ایویں محسوس تھیندا ہا جو ہندیں لارتوں ای اے بٹ بھنیندے وتین۔ ''انہاں پہلے تاں علی مرتضیٰ کوں ڈھنگیں طرا ہویں تو لیا پر کھیا۔ وت اکوں ودھ کراہیں اوہ دے نال ہتھ ملایو نے۔

علی مرتضیٰ انہاں کوں اپنے ہاں ڈسایا تے اتھاں آون دی وجہ بیان کیتی۔ انہاں وچوں فقیر بندے نے آپناں ہتھ اپنا پا تے بولیا ''میڈا ناں اللہ وسایا۔ تے اے میڈا بھرا ہے ایہدا ناں اے اللہ بھوایا۔ ایہہ ایں وستی دا نمبردار وی اے۔ تساں اندر تشریف گھن آؤ۔ تساں اساڈے ویس وچ پہلی واری تشریف گھن آئے وے۔ مہمان کوں اساں آپناں میت آ ہندے ہیں۔ اساں بے تو ٹیں جڈ پانی نہ کر گھلسوں۔ تہاکوں کتھاہیں ونجن نہ ڈیساں ـــــ اتھاں بہ کراہیں لسی پانی پیو۔ وت جیڑھا جاپا سو۔ اوہو کجھ تھیسی۔'' انہاں دی دعوت وچ ایڈا خلوص تے سادگی ہئی جو علی مرتضیٰ کوں انکار کرن کوں ول نہ آ گھیا۔

تھوڑی تھوڑی وتھ تے ڈاں کوٹھے بنے ہوئے ہن۔ اوہ بے نقشے تے سوڑے ہن۔ اوہدی سمجھ وچ نہ آیا جو اوہ کیوں ایہہ گنبد دے اندر وانگے کیوں ہن۔ ہک گنبد وچ ہی لنگھ گیا۔ اتے اوتھے وچ وڑ اوہ باہروں وچ تے کوں ڈیکھن بھالن لگیا۔ وچ تے وچ ڈاں اٹھ بنے ہوئے ہن۔ انہاں توں پرے دھری ہک بھورے رنگ دی گاں کھڑی ہئی۔ ڈاوتھے پئے چار پنج بھیڈاں دی کار کریاں منگدیاں رہیاں ہن۔ انہاں وچوں ہک بکری دے ہنجھوں وچ سر ڈتی رشایا اوہ بچہ ہر شے تکھی کھیڑ دو چیندی جنجھی ہئی۔ اوہ اپنے زور نال گھیڑ دو چیندی پئی ہئی۔ جو دھاراں نکلیں دی آواز علی مرتضیٰ کوں صاف سنیندی پئی ہئی۔

اوتھوں نکلے اللہ وسایا آپنے گنبد کنیں باہر نکلا اوہدے پچھوں ڈاں ترتیں دی ہن۔ ڈوہاں گھنگھرے پاتے ہوئے ہن۔ پر منہ ولیٹے ہوئے ہن۔ شاید انہاں کچھ کھاون پیون دیاں شیاں دی جاتیاں ہویاں ہن۔ اوہ اوں نکل کراہیں ول آئے گنبد وچ لنگھیاں گیاں اوت اللہ وسائے نے علی مرتضیٰ کو اندروں سدیا۔ علی مرتضیٰ کوں اپنی سرتوں کراہیں بوہے وچوں لنگھناں پیا۔ حالاں جو ایہہ لوک لمبے قد آلے ہن۔ پر وت وی ڈوہے تھے گئے ہن۔ علی مرتضیٰ اندر لنگھ گیا۔ ایہہ گھر دی دے منہ گھر اں توں وکھرا ہا۔ بلکہ وانجر وناتے آتے ہک خاص قسم دی کھاوا گول جیہاں گنبد بنیا ہویا ہئی۔ جیں چھت گنبد دی کار ہئی۔ تے اگوں ہر پاسوں رسیاں نال بدھیا ہویا ہا۔ کوٹھا اندروں کافی موکلا تے ٹھڈا ہا۔ مٹی دے فرش تے کپڑا کا مار ڈتا گیا ہا۔ کوٹھے وچ اوں کھڑے ہن۔ جیہاں دے پاوے موٹے تے رنگیل پھل بوٹیاں آلے ہن۔ کھڑیاں تے چار رضائیاں آلے سوہنے کھیس وچھے پئے ہن۔ ہک پاسے رنگیل شیشیاں آلے پلڑے پئے ہوئے ہن۔ جیڑھے شیشے کرسیاں دا کم ڈیندے پئے ہن۔ اللہ وسائے تے پاہوں کیتے چڑھیاں دا اشارت ڈتی۔ پر علی مرتضیٰ بے تکلف تھی تے کھڑے تے بہہ گیا۔ جیں تے اللہ وسایا مسکا پیا۔

جیڑھے اللہ وسایا باہر نکل گیا۔ تاں علی مرتضیٰ اوہدے وی ہر شے کوں ڈیکھن بھالن لگیاں۔ کوٹھے دے اندر دا ماحول ہا۔ جیہاں حالتی دے ہر گھر وچ ہوندے۔ کپڑے تکھن دیاں کلیاں اصطبل تے سکے پرانے زمانے دے ہتھاں۔ رنگیل ٹیتیں، رنگیل پر گیاں ادے صندوقڑیاں۔ اللہ وسایا۔ وت اہدو ڑیا ہن اوہدے ہتھ وچ ہک بھوں وڈا نیے واکلاس ہا۔ ایہہ گلاس اوں علی مرتضیٰ دے اگوں کر ڈتا۔ علی مرتضیٰ گلاس پیا۔ ایہ ٹھڈا ٹھار جیویں بھٹی طرح وچوں کڈھ کراہیں گھن آیا ہووے۔ اوہدی ٹھاڈل محسوس کر تے علی مرتضیٰ نے گلاس تے جھاتی پائی۔ یقیناً ایہدے وچ لسی ہئی۔ جیندے وچ چم چم دے وزن وچ مکھن دا اگرا تر دا ہوا ہا۔ اوہ دھنیاں دے طور طریقیاں توں چنگی طرح واقف ہا۔ وستی وچ مہماناں دی داری ایہو ای تھی ویندی ہے۔ بھاویں جو اوکوں ایں ویلے گرم چاہ دی طلب تھیندی پئی۔ چاہ دے بغیر اں اوہ آپنے سوہلیں وامنتر دا ای نہ بھد سکدا ہا۔ ایں کیتے اوہ شہری سامان چاہ وغیرہ جیپ وچ گھندا ہا۔ پر اوں ویلے انہاں دا دل رکھن کیتے اوکوں ایہہ لسی پیونی پئی۔ تیہوں اوسک کراہیں گلاس نال منہ لا گھندا ہا۔ بھوں چنگے ذائقے آلی مٹھی لسی ہئی۔ وچ وچ رک کراہیں اوہ تھوڑا جیہاں مکھن وی کھا گھندا ہا۔ اوکوں پتہ یا مکھن نہ کھاون بد تمیزی ہوسی۔ عجیب کالیہ تھی جو لسی پی کراہیں اوہ تر و تازہ تھی گیا ہا۔ جیویں ہک گھیں وچ تازی رت پے گئی ہووے۔ تھوڑی دیر کیتے اوہ چاہ دا اشتہاء بھل گیا۔

اللہ وسائے نے پچھیا۔ ''کجھ بیا کھاواں پیندا کریو تساں؟'' ''کوئیں، تھوڑیا، بھوں بھوں!'' علی مرتضیٰ کھڑا تھی گیا۔ ڈرائیور منگوں آتھاں شہ گھے تے پریشان ہوسی۔'' ''اساں پہلے اساں تہاڈی جیپ دو ٹیلہ سے ہیں!'' ''ٹھیک ہے۔'' ڈوہیں باہروں نکل

آ گئے۔ اللہ وسایا نے آپنی زبان وچ آپنے پیوکوں کجھ آکھیا۔ تے وت اوہدے نال اگوں ودھ گیا۔ علی مرتضیٰ نے کافی اکھ دا ل ڈٹھا۔ گھڑیاں تریکتیں ہوچیدے اوہدے لئے توں اوہناں ڈیہہ ڈیہاں پیاں سن۔ اللہ وسایا اگوں ودھ کراہیں ڈوویں اٹھ کھول آیا۔

''ایش ایش کر تے پہلے اوں یک اوں اٹھایا تے بولیا: ''ایہہ ڈاچی ہے تے بہوں شریف طبیعت دی اے تساں ایں تے بہہ ونجو۔'' علی مرتضیٰ ایں توں پہلے اٹھ تے کوپیاں بیٹھا ہا۔ اوہ حالی تئیں حیرت وچ ہا۔ اگلی ویر وچ اللہ وسایا ایہہ اٹھ کوں بٹھا تے اوں تو بہہ گیا۔ اوہناں ڈیہہ دے ای علی مرتضیٰ وی ہچ تے ڈاچی اتے بہہ گیا۔ اللہ وسایا نے اٹھن دی اشارت ڈتی تاں ڈوویں ڈاچیاں پہلے گوڈے کھڑے تھی گئے۔ جیویں جھٹ اتہ ڈاچی کھڑی تھئی اوں تے ووری کو ویر پہلے علی مرتضیٰ دا اوتوں دا ساہ اتے رہ گیا۔ تے ٹکوں دا لگے۔ ایہہ پہلا تے انوکھا تجربہ ہا۔ اوں ہر قسم دے ڈاچیاں تے چڑھ کیتا ہا۔ جیویں جہاز وچ وی بیٹھا ہا۔ پانی دے جہازاں وچ وی چڑھ کیتا ہا۔ پر ایہہ تجربہ ہر دواں ہا۔ پہلے چند سیکنڈاں وچ تاں اوہناں ایویں لگیا جو ڈاچی اوہناں منہ دے بھار ست ڈیسی۔ اکھیں بھواں ایں جو ایہہ وچ تارے آسن۔ پر جیویں اوہ یک ہوکری مار ٹال تے اتے لد دی کھڑی تھی گئی۔ تاں علی مرتضیٰ دی جان وچ جان آئی۔ ڈوویں ڈاچیاں اگوں پچھوں ٹرن لگے۔ کجھ قدم ٹرن تے ای اوہناں اندازہ تھی گیا جو ایں ڈاچی تے چڑھن تے اعصاب ڈوویں مضبوط ہووے چاہیدن۔ ایہہ تاں انگریزی مجبوری ہلا ڈیون پئے کافی ہا۔ پر تھی وی آ ہوں پئی سن۔ ہندا اچانک تے وی ہووے تے چڑھ وی گریندا پیا ہووے۔ سو ہتاں تجربہ ہے۔ اتے بہہ تے اوں ڈٹھا۔ ریت تے پیرے تو کئیں نشان ای نشان ہن۔ جیویں دے نشان ڈاچیاں دے ٹولیاں دے نشان۔ اتے ایہہ ڈیکھ کراہیں اوہناں پئی دی حیرانگی تھی۔ جو اللہ وسایا نے اٹھ کوں اوتھی راہ تے پا ڈتا۔ جیویں رستیوں علی مرتضیٰ تے اوہدی بھین ڈکراہیں آئے ہن۔ اوہ آپنے پیراں دے نشان ریت تے ڈیکھ کراہیں بہوں خوش تھیندا پیا ہا۔ تے ڈوویں ڈاور ڈیکھ دے ویندے ہن۔ جیویں ایں توں پہلو کوئی چنگاں مشغل نہ ہووے۔

واقعی اوہ اتہ ادھیک کٹا۔ مشغل دا مزہ دسا موڑی تھیا ہویا ہا۔ بستر و صحبت تے اوں ہک پاسے رکھ ڈتا ہا۔ اڈے اڈے پھر لٹے ہت چکیا ہا۔ منہ اتے بسر تے ریہہ دا ای ریہہ سی۔ منہ لتھا ہویا ہا۔ ہک پاسے سگریٹ پھوکیندا پیا ہا۔ جیویں ای اوں آپنے سامنے ڈوں اٹھ ڈٹھے، گھبر گیا۔ تے جیویں جلے اٹھ تیز تے آتے بیٹھے تے ہک تے اوں علی مرتضیٰ کوں ڈٹھا۔ تاں اچانک اوہدے وچ جان پے گئی۔ ''صاحب جی ۔۔۔ صاحب جی ۔۔۔ تساں کتھاں گئے ہا وے ما''

ایہہ علی مرتضیٰ واسطے ڈیون دی سجانے آپنے حواس بحال تھیندا پیا ہا۔ کیوں جو جیویں جلے ڈاچی بیٹھی تاں علی مرتضیٰ ہک واری وت لویں تجربے توں جانوں تھیا ہا۔ جیویں جلے اوں آپنے پچھلے ٹنگاں جوڑیں تے ٹکایاں تاں اوں گھبرایا۔ پس ہن اکھیں بھوائی ڈے تے ٹھکا سٹیں۔ پر آپنے ٹنگاں دے ٹھکو پے نال ٹھیک ہیں ڈاچی بہہ گئی۔ تیں اوہدی جند وچ جند ول آئی۔ کافی دیر تئیں اوہ جیویں تے ہے گھن دے قابل نہ تھیا۔ جیویں جلے مشغل نے اوہدا چہرہ تے جھکیا تاں اوہناں احساس تھیا جو اوہناں تے اچھیدا ہوون دی ہے۔ ''صاحب جی! صاحب جی ایہہ تساں کیا کیتے جی۔ تساں تھوڑی دیر ہور نہ آندے تاں میں فوت تھی ویندا۔'' علی مرتضیٰ کوں کھل آ گئی۔ ''تساں کتھاں گئے ہا وے جی ۔۔۔ میں تاں سمجھیا جو کوئی تہاکوں چا گئے!'' ''تاں بھرا انساں مرنا تاں کوں چھیدے تے ہتھ انہاں کوں آپنی جند جان توں ودھ عزیز رکھدے ہیں!''

(جاری ہے)

◆◆◆

یادیں

قرطاس و کینوس

اسلم کمال

قارئین محترم! سرگودھا شہر میں جس کے آسمان کے دفاع میں پاکستان کے ہوا باز بیٹے ایم ایم عالم، جنگ باز ہمسائے کے پانچ ہوائی جہاز پلک جھپکنے میں جلا کر راکھ کر دیئے تھے۔ اسی سرگودھا کے پاس خوشاب جس کے کیو اپنے رنگ اپنے سائز اور اپنے ذائقے میں دنیا بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ انہی شہروں کے قصبات و دیہات و مضافات میں عالمی سطح کے ادیب شاعر افسانہ نگار صحافی انشائیہ نویس ڈرامہ نگار اور ماہی فنون کے مدیر احمد ندیم قاسمی اور ماہی اوراق کے مدیر وزیر آغا پیدا ہوئے۔ یہ لوگ جس ماضی بعید کے جن سکولوں میں پڑھا کرتے تھے ان کی عمارات اکثر ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ ان سکولوں میں پڑھنے آنے والے بچے اکثر نامکمل لباس میں ہوتے اور بعض بچوں کے پاؤں میں کوئی ٹوٹا پھوٹا جوتا بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان ننگے پاؤں بچوں میں ایک بچے کا نام آصف محمود تھا جو کچی جماعت سے پکی جماعت اور پھر پہلی سے دوسری تیسری اور چوتھی سے آگے بڑھتا ہوا کشمیر کے آفیسر میڈیکل ڈاکٹر سوشل ورکر ایسا ہو گیا کہ اسے ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ پھر چیف کوآرڈینیٹر سنگر ہو گیا۔ اس کی قائم کردہ سنگر کیئر ہیلتھ سوسائٹی لاہور اسلام آباد اور تھرپارکر کے بے چارہ اور بے سہارا مریضوں میں شفا بانٹنے میں ایک بڑا نام بن گئی تو اسے حکومت پاکستان نے ستارۂ امتیاز اور ہلال امتیاز سے نواز کر اس کی عزت افزائی کی۔ قارئین! ڈاکٹر آصف محمود جاہ کی گاڑی اسلام آباد سے لاہور آتے یکدم چار پانچ گاڑیوں سے ایسی ٹکرائی کہ ڈاکٹر آصف محمود جاہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ اسے ایک ہسپتال سے دوسرے اور تیسرے پر منتقل کر کے بچا لیا گیا۔ الحمدللہ کیونکہ رب العزت نے اس ننگے پاؤں سکول جانے والے بچے آصف کو ابھی اور عظمت سے نوازنا تھا اور آصف محمود جاہ صاحب اس وقت میرے سٹوڈیو میں تشریف رکھتے ہیں اور میری بیگم کا تیار کردہ سوجی کا حلوہ مزے لے کر کھاتے ہوئے اپنی کہانی بھی سنا رہے ہیں۔ قارئین! ڈاکٹر صاحب بتا رہے ہیں کہ انہیں وزیر اعظم پاکستان جناب عمران خان کی ہدایت پر حکومت نے فیڈرل ٹیکس امبڈسمین چار برس کیلئے مقرر کیا ہے۔ وہ اپنی اس اللہ پاک کی بخشی ہوئی عزت و عظمت کی مسرت اپنے والدین سے شیئر کرنے سرگودھا شہر میں اپنے گھر پہنچے تو ان کے والد گرامی گھریلو بے تکلف کرتہ دھوتی میں ہی گھر سے باہر نکل آئے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو گلے لگانے سے پہلے اس کی کار پر لہراتے پاکستانی پرچم کو بازوؤں میں لے کر چوما تھا۔ قارئین! اس پرچم کے سائے تلے ہم ایک ہیں۔ مجھے یاد آیا 1986ء میں دوحہ قطر میں قطر کے محکمہ انفارمیشن اور فائن آرٹس کے تحت دوحہ شیرٹن میں راقم کی مصورانہ خطاطی کی نمائش کے افتتاح کی تقریب تھی۔ میرے دوست عدیل اکبر، حاجی مسلم ممتاز راشد اور محمد اکرم نعیم مدیر ماہی ”خیال و فن“ نے اس نمائش اور اس کے افتتاح کی تقریب کے لئے بڑی محنت کر رکھی تھی۔ قطر کے شعبہ فائن آرٹس کے ڈائریکٹر یوسف نے مجھے نمائش کی جانب توجہ دلا کر کہا سامنے دیکھیں ایک پوری قطار میں کن ہیں کہ مختلف ملکوں کے 27 سفیر حضرات آپ کو خوش آمدید کہنے کھڑے ہیں میں پاس کھڑے ان کی جانب بڑھنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر نمائش کے داخلی دروازے میں لہراتے پاکستانی پرچم پر پڑی تو میں نے یکدم راستہ بدلا اور پاکستانی پرچم کو چوم کر پھر سفرا حضرات کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

◆◆◆

پراگندہ طبع لوگ

سائرہ ہاشمی

میں نے سنجیدگی سے لکھا ہوا اپنا پہلا افسانہ حلقہ اربابِ ذوق میں 1973ء میں سنایا تھا۔ Y.M.C.A میں تمام لوگ اس گول کمرے میں بیٹھے تھے جو اپنے اندر زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا۔ افسانہ تمام ہوا۔ میں چند تعریفی الفاظ کی دل ہی دل میں منتظر بیٹھی رہی لیکن سب خاموش اور سنجیدہ بیٹھے رہے۔ وہاں کون کون تھا یاد نہیں۔ بس آغا سہیل اور انتظار حسین کی شکل یاد ہے۔ اجلاس برخاست ہوا۔ گھر میں ادبی زندگی کا آغاز کر چکی تھی۔ زندگی کے تیز دھارے میں بہنے والوں میں میں بھی تھی۔ سوچوں کے آغاز چند حادثوں میں زندگی کے کئی رنگ صفحوں پر بکھرتے رہے۔ کتابیں چھپتی رہیں۔ حیات کی گلی کے کانٹے سوچوں اور دل میں چبھتے رہے۔ دل کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ لوگ نظروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے انجانی راہوں کی طرف مڑ کر غائب ہوتے رہے۔ لیکن آج جب میں آغا سہیل صاحب کے بارے میں لکھنے بیٹھی تو پورا ایک جاندار زمانہ ادیبوں کے انبوہ کے ساتھ نظروں میں اتر آیا ہے۔ وہ سب جو ہم میں موجود تھے لیکن انجانی راہوں پر چلتے ہوئے وقت کی گلی میں گم ہو گئے۔ ان میں آغا بھائی بھی ہیں۔

میں اپنی دو بہنوں اور دو بھائیوں کی بہن تھی میری کوئی تمنا نہیں تھی کہ میں کسی کو اپنا بھائی بناؤں اور دل میں اس حسرت کو پورا کروں۔ یہ تو آغا بھائی کا طریقِ گفتگو تھا۔ میں تیز طرار نہیں ہوں اور تیز طرار ادیبوں سے واقفیت کی خواہاں۔ میں اچھائیوں اور سچائیوں کی عادی ہوں۔ اس لئے آج میں اداس ہوں۔ اس بھائی کے لئے جو ہم میں نہیں۔ مجھے بہت سی باتیں آپ کے سامنے دہرانی ہیں لیکن ایک بات پر اکتفا کروں گی۔ آپ میں سے بہت سے لوگ ”بزمِ ہم نفساں“ کے بارے میں آگاہ ہوں گے۔ پہلے اجلاس میں آغا سہیل بھی موجود تھے اور پھر پورے پندرہ برس ہم سب اجلاسوں میں موجود رہے۔ آغا سہیل، ڈاکٹر آغا سہیل بن گئے۔ نہ جانے کیوں بعض لوگ وقت سے پہلے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ بزمِ ہم نفساں کے ممبرز میں سے ہمیں بہت سے دوستوں سے محروم ہونا پڑا۔ یہ تمہید ہے ان پراگندہ طبع لوگوں کی جو ہم تھے، پیارے تھے، مشہور تھے، جن کے گہرے نقوش ہمارے دماغ کی دھرتی پر کھدے ہوئے ہیں۔ اور ایسے بہت سے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے آغا سہیل ایک شعر رقم کرتے ہیں:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　　افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

رام لعل کے بارے میں آغا سہیل کا لہجہ بہت نرم اور گداز ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں بے شمار انسانوں کے دکھوں سکھوں کی سچائی کو اس قدر رنگارنگی سے قلم بند کیا ہے کہ اردو کا کوئی دوسرا افسانہ نگار اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ آغا سہیل مردانہ رعنائی کو اس قدر رنگین سے بیان کرتے کہ وہ افسانہ نگاری کی بجائے نقاش لگتے۔ ”وہ کہتے ہیں رام لعل کے کرداروں کو جمع کیا جائے تو اس زنبیل سے بھانت بھانت کے کردار برآمد ہوں گے۔“ آغا سہیل نے حاجی سعید، زیتون بانو، اشفاق صاحب، ڈاکٹر سلیم اختر، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، ذکی شیرازی، بیگم خورشید مرزا کے خاکے بھی لکھے ہیں۔ انٹرویو کے دائرے میں ڈاکٹر حسرت نے صرف چار لوگوں کو یہاں کتاب میں شامل کیا ہے۔ وہ لوگوں کو میں بہت اچھی طرح جانتی اور مانتی ہوں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب اپنی شخصیت کے پہاڑ میں آغا سہیل کو بہا لے گئے

اور اپنے اندر کے انسان کو انٹرویو میں قاری کے سامنے تہہ در تہہ اور ادبی شخصیت کو بڑے کینوس پر اجاگر کیا۔ اس خاکے میں مجھے کئی نئے پہلو جاننے کو ملے جو بالکل نئے تھے۔ سب سے جاندار اور چلبلا خاکہ "ذکی شیرازی" صاحب کا ہے جس میں آغا سہیل صاحب کی ٹین ایجر دوستی کا والہانہ ذکر ہے۔ دراصل ذکی شیرازی کے وجود میں آغا سہیل صاحب کا وجود قہقہے لگاتا، گنگناتا اور زندگی کے نئے رنگوں کو انجوائے کرتا مکمل نظر آتا ہے۔ وہ کسی جمالی آرا حسینہ کی طرح ان کا یوں ذکر کرتے ہیں: "ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، چھوٹا سا دہانہ، خوبصورت ہموار دانت، مستی در مستی کے تیکھے انداز، دبلا پتلا، گندمی رنگ، دھنک کا یہ بانکا نوجوان" ذکی شیرازی تھا" ایک جگہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ آغا سہیل کے اندر کا عاشقانہ جذبہ اس نازنین لما ذکی شیرازی کی صحبت نے ابھارا۔ "لیکن" یہ لیکن بہت بامعنی ہے جس کوئی بھی ان کے خلاف اتنی بڑی تہمت نہیں لگاتا۔ میں بھی یہ تہمت نہ لگاتی اگر میں نے چند لوگوں کو یہ گپ شپ لگاتے نہ سنا ہوتا۔ ایک دعوت میں جمیل جالبی صاحب، آغا سہیل صاحب، عبدالعزیز خالد صاحب، دوسرے لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کسی نے کہا "یہ جوش ملیح آبادی کے حرم عشق بازیوں کا قصہ کوئی ناممکن بات نہیں" ممکن ہیں جمیل جالبی صاحب بڑے اعتماد سے بولے "اگر میں اپنے قصے سنانے بیٹھوں تو اس سے بڑھ جائیں گے" سب ہنسنے لگے۔ آغا سہیل بھی آہستہ سے بولے ہم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں، جناب اور سب حیرانی سے ان کو دیکھنے لگے۔ واہ واہ چھپے رستم ہیں آپ بھی۔ ویسے اپنے کانوں سے سننے کے باوجود مجھے آج تک یقین نہیں آیا۔ آغا سہیل کا گھر تو ایف سی کالج کی اردو پڑھنے والی قدرے گھبرائی ہوئی لڑکیوں کی پناہ گاہ تھی۔ وہاں جا کر انوکھی سی سادگی اور سچائی کا احساس ہوتا تھا۔ میں جو ان کے بچوں کی پھوپھو کا کردار ادا کر رہی تھی اندر سے اتنی مطمئن تھی اور اسی رشتے کی سچائی پر یقین رکھتی تھی۔ الطاف فاطمہ اور نشاط فاطمہ ان کو بھائی ہی تو کہتی تھیں اور بھی بہت سی خواتین ان سے اپنی تعلیم میں مدد لینے کے لئے ان تک پہنچتی تھیں اور اس چائے سے لطف اندوز ہوتی تھیں جو ان کی بیٹیاں بنا کر لاتیں اور میزبانی کرتیں۔ مسکراتے چہروں اور خوش آمدیدی الفاظ کے ساتھ۔ محمد خالد اختر صاحب کے بارے میں آغا سہیل یوں رقم طراز ہیں "خالد صاحب ہمیں یوں ہی ہر آواز کو سنتے تھے اور جذب کر لیتے تھے۔ ان کی ہر تحریر کے بین السطور جو شعور کارفرما ہے وہ دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے کی محتاج ہے۔ یہ متاع قارئین کے دل و دماغ پر دیرپا نقوش ثبت کرتی رہتی ہے۔" وہ طنز و مزاح اور ظرافت میں ہر شعبے کی وسعت و پہنائی کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ آپ صاحبان ہی کہیے اس سے بہتر تجزیہ کوئی اور نقاد کر پائے گا۔ آغا سہیل کے افسانوی انداز کو میں بالکل نہیں چھوؤں گی۔ وہ بھی ایسا جہاز ہے جو سنبھالے نہ سنبھلے گا۔ اسے دوسرے دوست ادیب ضرور زیر تحریر لائیں گے۔ محمد خالد اختر کے بارے میں اتنا اور ضرور لکھوں گی جس سے آغا سہیل کے لکھنے کو جانچنے کا سچا اور کھرا انداز قابل تعریف ہے۔ "وہ کہتے ہیں میدان ظرافت میں شگفتگی ان کی بذلہ سنجی سے پیدا ہوتی ہے۔" وہ ہر شعبے کی وسعت و پہنائی کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔ بیگم خورشید مرزا فلموں کی رینوکا دیوی، خوبصورت ہیروئن، باوقار اور رکھ رکھاؤ سے خطاب کرنے والی۔ میں نے ان کو ہم ہم نفساں میں آغا صاحب کے کہنے پر شامل کیا۔ وہ بہت پاک باز اور سادہ دل تھیں۔ تسبیح ہاتھ میں لیے سرگودھا پنچ سے اجلاس محفل میں بیٹھتیں اور رینوکا دیوی کے ذکر کو قطعی پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ اس فلمی دور کو جو وہ گزار چکی تھیں ذکر تو کیا سوچنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ وہ اپنے پیا کی پیاری ہو چکی تھیں اس لئے ان کو منانا قلم میں گئیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ بیگم خورشید مرزا ہی رینوکا دیوی ہیں۔" الغرض آغا سہیل ایک محبت کرنے والے دوست پرور اور قہقہے بکھیرنے والے زندہ دل انسان تھے جن کے ساتھ گزرے لمحات ان کے احباب کے لیے ناقابل فراموش ہیں۔

◆◆◆

یاد رفتگاں

احمد عقیل روبی کی یاد میں

ڈاکٹر غافر شہزاد

ہر سال جاتے جاتے ہم سے کیا کچھ چھین کر لے جاتا ہے، اس کا اندازہ ہمیں آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ اکتوبر 2021ء کے تیسرے ہفتے کے آغاز میں احمد عقیل روبی بھی رخصت ہو گئے۔ وہ ایک عرصے سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ ان کی قوت ارادی بیماری کے خلاف لڑ رہی تھی مگر جیت ہمیشہ موت کی ہوتی ہے۔ کینسر کا عطیہ ہے جب کسی کے جسم میں اپنے پنجے گاڑ دیتا ہے تو پہلے پہل تو اس کی خبر نہیں ہونے دیتا، تمام معمولات زندگی اپنی رفتار سے چل رہے ہوتے ہیں اور پھر ایک دن پتہ چلتا ہے کہ جس چھڑی کو حضرت سلیمان نے تھام رکھا تھا اس کو دیمک نے اندر ہی اندر سے چاٹ لیا ہے، بیرونی سطح ویسے ہی ہے مگر اندرونی سطح کھوکھلی ہو چکی ہے اور کوئی دم ہے کہ چھڑی گری کہ گری۔ ایسا صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے، یہیں سے انسان کی بے بسی کی کہانی شروع ہو کر یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ صدیاں گزر گئیں، انسان نے کیا کیا خوفناک بلاؤں کا سامنا نہیں کیا، اندرونی اور بیرونی ہر دو محاذوں سے، مگر جیت ہر مرتبہ موت کی ہوتی ہے۔ موت کو شکست دینے کے لئے انسان نے آب حیات کا تصور تراشا اور پھر حضرت خضر کہ جنہوں نے آب حیات پی لیا تھا، ہماری شاعری، داستان گوئی اور ادبیات عالیہ اس تصور سے بھری پڑی ہے۔ احمد عقیل روبی کہ جو اصل نام کی نسبت سے غلام حسین تھے، آب حیات کی تلاش میں نہیں نکلے اور نہ ہی ان پر اپنے آپ کو امر کر لینے کا خبط سوار ہوا۔ وہ تو عام انسان کی طرح ایک عام انسان جیسے جیئے اور انہوں نے پوری توانائی اور تخلیقی وفور کے ساتھ زندگی کا اور تخلیق کا سفر طے کیا۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ عام انسانی سطح پر ملتے اور پھر ملنے والے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ اس کو ہفت افلاک کی سیر کرواتے۔ ان کے علم اور تحقیق کے دریا ان کے وسیع اور عمیق مطالعے کے سمندر سے نکلتے اور اپنے ساتھ والے کو سیراب کر کے واپس اسی سمندر میں ڈوب جاتے۔

احمد عقیل روبی ایک بھرپور تخلیقی شخصیت کے حامل فن کار تھے۔ انہوں نے ڈرامہ لکھا اور پھر ڈرامہ کیا بھی، انہوں نے شاعری کی، فلموں کے لئے گیت لکھے، ناول اور کہانیاں لکھیں، بچوں کا ادب تخلیق کیا، خاکے لکھے بلکہ چند شخصیات پر تو انہوں نے کتابیں لکھیں، فلمیں اور ان کے ڈائیلاگ لکھے، کالم نگاری کی، آپ بیتیوں کے انداز میں بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات لکھے، اور سب سے بڑھ کر تمام عمر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ایسی بھرپور اور توانا تخلیقی شخصیت نے ایک سو کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کیں۔ وہ ہمہ وقت تخلیقی کاموں میں مصروف رہتے اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ یونیورسٹی آف لاہور اور روزنامہ جہان پاکستان کے ہی ہو کر رہ گئے۔ جہان پاکستان کے سنڈے میگزین میں فلمی دنیا کی تاریخ لکھتے رہے، کالموں میں اپنے علمی فکری انداز سے مختلف موضوعات کو سیراب کرتے رہے، بچوں کے صفحات پر کہانیاں لکھتے رہے، ان کا ناول قسط وار چھپتا رہا، جہان پاکستان کے ادبی صفحہ کو انہوں نے ایک بالکل مختلف رنگ دیا، اس ایک صفحہ پر کوئی نہ کوئی تخلیقی مضمون، بڑی شخصیات سے جڑی یادیں اور باتیں، ٹیلیفون پر کسی بڑی علمی و ادبی

شخصیت کا اظہار ویوتی اور قدیم شاعری کو آمنے سامنے شائع کرتے جس میں قدیم شاعری کا ان کا اپنا ترجمہ شامل ہوتا۔ گویا وہ ہر معاملے میں اپنے عہد کے لوگوں سے مختلف اور منفرد دکھائی دیتے تھے۔ ان کا کام اور مسائل بھی منفرد تھا۔ موسیقی کے حوالے سے ان کا علم تو اپنی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس پر وہ گھنٹوں بغیر کسی تیاری کے بات کر سکتے تھے۔ اب ایسے ورسٹائل شخص کو کہاں سے ڈھونڈیں گے۔ ان کی کوئی دوسری مثال نہیں ہے۔ لاہور کی ادبی محفلوں اور تقریبات کی وہ جان تھے۔ یہ محفلیں اب ان کی آواز کو نہیں سن سکیں گی۔ بات کسی کتاب پر ہو، کوئی موضوع زیر بحث ہو، شاعری کا تذکرہ ہو، وہ یونان کو بیچ میں ضرور لے آتے۔ کچھ سالوں تک تو یہ یونان ان کے لئے ایک چھیڑ بن گیا۔ دوستوں نے جب ان کو اس بات پر چھیڑنا شروع کر دیا تو انہوں نے یونان کا ذکر کم کر دیا مگر یار دوستوں کو بھی یونان سے جڑے قصے کہانیاں اور پھر ان کا یہاں کی معاشرت سے جڑا دو دلی صاحب کی زبان سے اتنا بھاتا کہ انہوں نے باقاعدہ مطالبہ شروع کر دیا۔ اس وقت تک ان کی گفتگو ادھوری اور نامکمل لگتی جب تک یونان کا ذکر نہ ہو جاتا۔ یونان کا پیوند کر وہ اپنی گفتگو میں اس مہارت سے لاتے تھے کہ بالکل اجنبی نہ لگتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے بغیر ان کی یہ بات مکمل ہی نہ ہو سکتی تھی۔

شاعری سے ان کا خصوصی لگاؤ تھا۔ خود بھی اچھے اشعار کہتے اور دوستوں کے اچھے اشعار پر خوب دل کھول کر داد دیتے۔ ساری زندگی صلہ و ستائش کی تمنا کے بغیر تخلیقی کاموں میں مصروف رہے۔ معیار اور مقدار میں ان سے بہت کم تخلیقی کام والوں کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی مل گیا مگر انہوں نے اس کی کبھی تمنا نہیں کی۔ ان کو یہ اعتماد تھا کہ وہ جب بھی چاہیں گے، یہ ایوارڈ لے لیں گے۔ ہر برس ان کا اسی اعتماد میں گزر جاتا، اور ہر برس یہ ایوارڈ کسی اور کو مل جاتا۔ ان کا نام تین چار مرتبہ صوبائی حکومت نے اپنی سفارشات کے ساتھ بھیجا بھی مگر مرکز میں جا کر یہ سفارشات کہیں راستے میں رہ جاتیں۔ گزشتہ برس جب ناموں کی سفارشات جا رہی تھیں تو ان کو کہا گیا کہ ان کا نام بھی بھیجا جا رہا ہے۔ مگر حتمی فہرست میں ان کا نام بوجوہ نکال دیا گیا جس کا ان کو بہت رنج تھا۔ وقت بہت گزر چکا تھا، اور ناموں کی فہرست آخری مراحل میں تھی کہ جب ان کو پتہ چلا۔ بس پھر تو انہوں نے طے کر لیا کہ صدارتی ایوارڈ انہوں نے لینا ہی لینا ہے اور اسی سال لینا ہے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اور جو دوست ان کا جنون جانتے ہیں، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتے تھے تو دنیا کی کوئی رکاوٹ ان کے قدم نہیں روک سکتی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ جب اعلان ہوا تو اس فہرست میں احمد عقیل روبی کا نام شامل تھا۔ یہ ایوارڈ ان کے لئے باعث افتخار نہیں تھا بلکہ انہوں نے اس ایوارڈ کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کر دیا تھا۔ بنیادی طور پر وہ یہی بتانا چاہتے تھے کہ ادب کے یہ جو ہے ان کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ وہ جب چاہیں، دریاؤں کی سرکش موجوں کی مخالف سمت میں تیر کر کوئی بھی دریا عبور کر سکتے ہیں۔

ان کے اندر انا پرستی اور خودداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے نہایت سادہ زندگی گزاری، کبھی کسی کے سامنے دامن نہیں پھیلایا، حالات کیسے بھی رہے، انہوں نے اپنی چادر سے باہر کبھی اپنا پاؤں نہیں نکلنے دیا۔ یہاں تک کہ جب ان کو علاج کے لئے شوکت خانم ہسپتال لے جایا گیا تو ان کو یہ بتایا گیا کہ ان کے لئے علاج اور ادویات میں رعایت کی جا سکتی ہے، کہنے لگے کہ ساری زندگی میری ماں زکوٰۃ شوکت خانم ہسپتال کو اس لئے تو نہیں دیتی رہی کہ میں اب اس میں سے اپنا حصہ لینے آ جاؤں، میرے پاس بہت پیسے ہیں جو میں نے ادبی اور تخلیقی کام کر کے کمائے ہیں، اس لئے مجھے ایسی کوئی رعایت نہیں چاہئے۔ رعایت اور مہلت تو انہوں نے زندگی سے بھی نہیں مانگی جب وقت آ گیا، چپ چاپ اپنی راہ لی، جیسے وہ اس زندگی میں شامل تھے ہی نہیں۔ آخری دنوں میں انہوں نے دوستوں کے فون سننا بند کر دیا

تھا۔ کوئی فون کرتا صرف اتنا پوچھتے، کس کا ہے؟ اور پھر خاموش ہو جاتے تھے۔ معلوم نہیں انہیں کسی خاص فون کا انتظار تھا یا وہ دوستوں کے مجھے سے تسلی آمیز کلمات سننا نہیں چاہتے تھے یا پھر ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کا رخت سفر باندھنے کا وقت آ گیا ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کا رویہ یا اپنے اندر بہت سے سوالات لئے ہوئے تھا اور وہ ایسی ہی کیفیت میں رخصت ہو گئے۔ ادریس مبارک نے چند دوستوں کو اکٹھا کیا اور انہیں یاد کیا مگر اتنے بڑے تخلیق کار کے لئے ابھی تک کسی سرکاری، نیم سرکاری ادبی ادارے کے سرکردہ لوگوں نے کوئی ادبی ریفرنس ان کی یاد میں نہیں کیا۔ کیا ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ احمد عقیل روبی کا آخری دنوں کا رویہ درست تھا اور وہ دوستوں اور زندگی دونوں کو سمجھ گئے تھے۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2021ء تک

ماہنامہ ''تخلیق'' اب تک 10 ''تخلیق ایوارڈ'' دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ نیر جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978
-5	2016ء	محترمہ عذرا اصغر صاحبہ	(لاہور)	0300-8839895
-6	2017ء	محترم پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب	(لاہور)	0345-4698398
-7	2018ء	محترم سرفراز سید صاحب	(لاہور)	0333-4148962
-8	2019ء	محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ	(لاہور)	0300-9438596
-9	2020ء	محترم رشید امجد صاحب	(راولپنڈی)	0334-5164855
-10	2021ء	محترم آغا گل صاحب	(کوئٹہ)	0303-3850099

میں اس لئے بھی محبت کا کھیل ہار گیا
کہ چال چلنے میں اس کو بہت مہارت تھی
(اظہر جاوید)

ہمہ جہت فنکار عمر شریف

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

لیجنڈ آرٹسٹ، بصیرت افروز انسان، نکتہ شناس، صاحبِ ذوق، چٹکلوں اور قہقہوں سے بھرپور، شریف النفس اور اسم با مسمیٰ، محمد عمر شریف طویل علالت کا مقابلہ کرتے ہوئے 2 / اکتوبر 2021ء بروز ہفتہ جرمنی میں موت سے شکست کھا گئے۔ وہ عارضۂ قلب اور گردوں کی بیماری میں مبتلا تھے۔ انھیں 28 ستمبر 2021ء کو ایئر ایمبولینس کے ذریعے امریکہ لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں ہی ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی جس کی وجہ سے انھیں کچھ وقت جرمنی کے ایک ہسپتال میں رکھنا پڑا۔ ڈائیلاسز کے دوران وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ 19 / اپریل 1955ء کو کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام محمد عمر رکھا۔ وہ بچپن میں معروف مزاحیہ اداکار منور ظریف کی فلمیں بہت شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ ان سے عقیدت کے طور پر انھوں نے اپنا نام عمر ظریف رکھا لیکن 1967ء میں منور ظریف دنیائے فانی چھوڑ کر عالمِ بالا منتقل ہو گئے تو وہ عمر شریف کے نام سے مقبول ہوئے۔ عمر شریف ایک ہمہ جہت آرٹسٹ ہی نہیں تھے بل کہ جذبۂ حب الوطنی اور انسان دوستی کی چلتی پھرتی کہانی تھے۔ وہ پاکستان کے واحد فنکار ہیں جنھیں ایک ہی وقت میں چار ''نگار ایوارڈز'' سے نوازا گیا۔ بہترین فلم ساز، بہترین اداکار، بہترین کہانی نویس اور بہترین مکالمہ نگار۔ انھوں نے کم عمری میں اسٹیج کا رخ کیا۔ متنوع فکری اظہار اور فنی مہارت کی وجہ سے وہ غیر معمولی طور پر فلم اور اسٹیج کی زینت بنے۔ مزاح کی دنیا کے بے تاج بادشاہ نے فلم اور اسٹیج کے حوالے سے وہ کچھ کر دکھایا جو عوام ایک فنکار سے کرتی ہے۔ ان کا پہلا اسٹیج ڈرامہ ''بی اے تک اندھیرا'' کامیاب نہ ہو سکا۔ عمر شریف نے اس ناکامی پر دل برداشتہ ہونے کے بجائے محنت کا دامن تھام کر قسمت آزمائی شروع کی۔ ان کی برجستہ گفتگو اور جگت بازی نے اسٹیج پر ان کی اداکاری کو بہت پسند کیا۔ 1969ء میں انھوں نے تھیٹر سے اداکاری میں قدم رکھا لیکن وقت گواہ ہے کہ انھیں اصل شہرت اسٹیج ڈرامہ ''بکرا قسطوں پر'' سے نصیب ہوئی۔ راقم السطور (ہارون الرشید تبسم) کو محمد عمر شریف سے ایک بار ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔ انھیں نہایت شفیق، ملنسار، تکبر اور غرور سے بالاتر انسان پایا۔ وہ جتنے بڑے فنکار تھے اتنے ہی درد دل رکھنے والے انسان تھے۔ ''بکرا قسطوں پر'' کی وڈیو ریلیز ہوئی تو عمر شریف گھر گھر قہقہے بکھیرنے لگے۔ اس ڈرامے نے اسٹیج شو کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ بات کہنا غلط نہ ہو گی کہ ڈرامے کو شرافت اور مقصدیت سے ہم آہنگ کرنے کا سہرا عمر شریف کے سر ہے۔ ''بکرا قسطوں پر'' کے چار حصوں نے عمر شریف کو عالمی سطح پر متعارف کروا دیا۔ معاشرتی انتشار، جہالت اور تعلیم و تجاہل کے حوالے سے یہ ڈرامہ گھر گھر میں مقبول ہوا۔ عمر شریف نے پروفیسر کمائی کا کردار اس انداز سے نبھایا کہ وہ لوگوں کے دل میں اتر گئے۔ ''بڈھا گھر پہ ہے''، ''دلہن میں لے کر جاؤں گا''، ''سلام کراچی''، ''انداز اپنا اپنا''، ''میری بھی تو عید کرواؤ''، ''کل بھی پاپا''، ''یہ ہے نیا تماشا''، ''یہ ہے نیا زمانہ''، ''مرغِ دو مرغیاں''، ''عید تیرے نام''، ''عمر باجوہ 007''، ''لاہور سے لندن''، ''انگور کھٹے ہیں''، ''پڑوسی پٹو''، ''لوٹ سیل''، ''ہاف پلیٹ''، ''عمر شریف ان جنگل''، ''چودھری پلازہ'' اور ایسے ہی دیگر ڈراموں

نے عمر شریف کو بامِ عروج عطا کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے 180 سے زائد اسٹیج ڈراموں نے عمر شریف کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ انھوں نے لاہور کے شمع سینما کو "شمع تھیٹر" میں تبدیل کر کے اپنے ڈراموں کو لازوال کر دیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے ایک ہی وقت میں بہت سے ایوارڈ حاصل کیے۔ 1984ء میں بہترین اسٹیج اداکار، 1988ء میں بہترین ڈائریکٹر، 1992ء میں فلم "مسٹر 420" کا بہترین ہدایت کار اور بہترین اداکار کا قومی ایوارڈ حاصل کیا۔ وہ 25 ایوارڈ حاصل کرنے والے اداکار بن گئے۔ مجموعی طور پر 10 نگار ایوارڈ اور 3 گریجوایٹ ایوارڈ ان کے نام ہوئے۔ ان کی تخلیقی اور فنی صلاحیتیں دنیا کے مختلف حصوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ 1992ء میں بولا گو ایوارڈ، 1996ء میں لاس اینجلس ایوارڈ اور دبئی میں انٹرنیشنل ایمرجنس ایوارڈ بھی سمیٹ لیے۔ عمر شریف کی زندگی کا ایک بہت بڑا اعزاز یہ ہے کہ انھیں کراچی شہر کی چابی بطور اعزاز پیش کی گئی۔ ان پر قسمت بہت مہربان ہوئی۔ فلم ہو یا اسٹیج وہ مسکراہٹوں اور قہقہوں کے نمائندہ ثابت ہوئے۔ جو بھی وہ اسٹیج پر نمودار ہوتے ہال تالیوں سے گونج اٹھتا۔ وہ قہقہوں کی فیکٹری کے اکلوتے ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے جو لکھا وہ حسن میں ادب کر لکھا۔ ان کی تحریروں میں پاکستان سے محبت کا عنصر غالب رہتا۔ ڈرامہ خواہ کوئی بھی ہو اس کا اختتام وطن دوستی اور انسانیت سے پیار کے پیغام پر ہوتا۔ وہ اداکاری کرتے طارق عزیز کی طرح جذباتی ہو جاتے اور لوگوں کو پاکستان سے پیار کرنے کا پیغام دیتے۔ عمر شریف نے معروف اداکارہ شکیلہ قریشی سے شادی رچائی۔ انھوں نے ان کے ساتھ کئی پروگراموں میں حصہ لیا لیکن یہ رشتہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا، طلاق کے بعد عمر شریف نے 2005ء میں زرین غزل خاتون سے دوسری شادی کر لی۔ ان کی تقریباً 30 سے زیادہ فلموں نے شہرت حاصل کی جن میں "مسٹر 420"، "مسٹر چارلی" اور "مس فتنہ" بہت مقبول ہوئیں۔ انھوں نے اسٹیج اور فلم کے علاوہ ٹیلی ویژن کے کئی پروگراموں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ عمر شریف بمقابلہ عمر شریف ٹی وی پروگرام نے مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر دیے۔ "[illegible]"، "ششی ششی"، "کوئی ہے جو ہمیں ہنسائے" اور "عمر شریف شو" (جیو ٹی وی) ٹی وی کی دنیا میں اپنا تعارف آپ ہیں۔ انھوں نے بھارتی ٹی وی کے ایک مزاحیہ شو میں بطور جج کام کیا۔ ان کے تحریر کردہ خاکے بہت سے دوسرے اداکاروں نے نقل کر کے شہرت پائی۔ بھارتی فلم میں "تم میرے ہو" کی بطور ہدایت کار کام کیا۔ انھیں گہرا علمی، ادبی اور مذہبی ذوق بھی تھا۔ قرآن پاک کی آیات اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مزین ایک کتاب آج بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ انھوں نے ایک دوسری کتاب بھی مرتب کی جس میں مشہور شاعروں کا کلام اور ان کے مشہور ڈراموں کے سکرپٹ شامل ہیں۔ عمر شریف دکھی انسانیت کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے جہاں نبی اقدس [illegible] ہدیہ کیا وہاں وہ پیرانِ القادر سے تعلق جوڑ کر کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے گرد پھیلی ہوئی تنگی دوراں کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی اداکاری میں حقیقی رنگ تھا۔ وہ بساطِ فن میں اسی لیے یکتا تھے کہ انھوں نے کسی کا رنگ اور انداز اپنانے کے بجائے اپنا راستہ خود تراشا۔ ان کے تحریر کردہ جملوں کو اتنی شہرت ملی کہ وہ عرفِ عام ہو گئے۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں اردو زبان بولی جاتی ہے وہاں عمر شریف کے مکالموں کا تذکرہ سننے کو ضرور ملتا ہے۔ عمر شریف کا قلم استحصالی قوتوں کے خلاف اٹھتا رہا۔ طبقاتی تقسیم کے خلاف ان کی آواز ہمیشہ بلند رہی۔ انھوں نے اپنے لفظوں اور اپنی اداکاری سے غمزدہ دلوں کو نوید مسکراہٹ دی۔ عمر شریف کی ویڈیوز دیکھنے والوں کو اندازہ ہو گا کہ وہ بسا اوقات جذباتی ہو کر مجلسی زندگی کو متعصبیت میں ڈھالنے کا پیغام دیتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ پاکستان کی سرزمین میں نفرتیں، کدورتیں اور تعصب کاشت

کرنے کے بجائے محبتوں، خلوص اور پیار کے بیج بوتے جائیں۔ انھوں نے فن کے ذریعے وقت کی عمارتوں پر پیغامِ انقلاب دیا۔ طنز و مزاح کے پس منظر میں وہ تیکھی اور کھری بات کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ ان کی شاعری اور نثر بھی سرزمین وطن کی آبیاری کے لیے تھی۔ عمر شریف جس محفل میں بیٹھ جاتے وہ کشتِ زعفران ہو جاتی۔ ایسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں جن کا ہر لفظ لوگوں کے دل میں اتر جاتا ہو۔ قدرت نے یہ ہنر عمر شریف کو عطا کیا تھا۔

ان کے لفظ احساس اور عزم کے پیکر تراشتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کے پسماندہ علاقے کورنگی ٹاؤن میں انھوں نے "ماں" نامی ہسپتال تعمیر کروایا اور ساتھ ہی "ماں فاؤنڈیشن" کا آغاز کیا۔ معین اختر، دلدار پرویز بھٹی، مرتضیٰ حسن مستانہ، رنگیلا، منیر اللہ صدیقی عرف لہری، امان اللہ خان، جمشید انصاری، منور ظریف اور ایسے ہی نامور مزاحیہ اداکاروں کے بعد عمر شریف کا انتقال دنیائے فلم و اسٹیج کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

◆◆◆

مختصر تعارف

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

شاہینوں کے شہر سرگودھا کو جن شخصیات پر بہت فخر ہے ان میں پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم آج سرِفہرست ہیں۔ ان کی 130 ادبی اور 27 نصابی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ یہ بات قابلِ فخر ہے کہ ان کتب میں تیس کتب کا تعلق پاکستان سے ہے۔ جشنِ آزادی 2021ء کے موقع پر ان کی دو کتب "وقارِ پاکستان" اور "قائداعظم شناسی" منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ماہرِ تعلیم، ماہرِ اقبالیات، مقرر، کمپیئر اور عسکری حوالوں سے اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ ادبی تقریبات میں انھوں نے اپنے جوشِ خطابت سے اپنا منفرد انداز منوایا ہے۔ گزشتہ 51 سال سے سرگودھا میں ہونے والی ملی و قومی تقریبات کی کمپیئرنگ ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔ تجزیوں اور تبصروں پر مشتمل ان کی بہت سی کتابیں ادبی حلقوں میں مقبولِ عام ہیں۔ مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے ادبی و قومی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پاکستان سے محبت ان کا اہم ترین وصف ہے۔ ان کی زندگی نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ وہ بحیثیت پروفیسر 20ویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے اور اب تحریر و تقریر میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ مرکز سے دور ہونے کے باوجود وہ سرگودھا سے علم و ادب کی جو آبیاری کر رہے ہیں اس پر ادارہ "تخلیق" انھیں مبارک باد پیش کرتا ہے۔ توقع ہے کہ ان کا تعاون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔

معروف شاعر آفتاب خان کا دوسرا شعری مجموعہ

اجاڑ میں پڑی ہے راکھ ...... شائع ہو چکا ہے

ملنے کا پتہ: دستاویز، آفس نمبر 6، بلاک نمبر 7، سیکنڈ فلور، میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور (فون نمبر 042-36280034)

طنز و مزاح

ڈاکٹر بدر منیر

قطعہ برید

کرسی صدارت

کرسیِ صدارت پہ جو بھی شخص بیٹھا ہو
اس پہ کیا گزرتی ہے دیکھا جا نہیں سکتا

خطبہ کر کے بیٹھے کا اختتام ہونے تک
کوئی بھی تقاضا ہو اٹھ کے جا نہیں سکتا

رونق کرسی رکھے گا اپنے ہاتھ اٹھنے سے
جس قدر بھی گھبرائے جو سر کھجا نہیں سکتا

سو گئے … سے سامعین بیٹھوں پر
نیند کی پری کو یہ پاس بلا نہیں سکتا

جو گوش ہوئی ہیں ہر طرح کی تقریریں
کوئی کچھ بھی کہہ جائے تلملا نہیں سکتا

سامنے جو بیٹھے ہوں کچھ حسین سے چہرے
شان بے نیازی سے مسکرا نہیں سکتا

ہولی کر سیدھی … کی مانند
لے کے ایک انگڑائی بھی … نہیں سکتا

سوچ کر جو آیا تھا خطبۂ صدارت میں
ہو گئیں وہ سب باتیں یہ بتا نہیں سکتا

○○○

گنج نامہ

ہاتھ میں کنگھی پکڑے عرصہ بیت گیا
سر کی کھیتی اجڑے عرصہ بیت گیا

نائی بھی ہم کو دیکھتا ہے اب حسرت سے
اس سے بال منڈائے عرصہ بیت گیا

بال کہاں بس چاند ہی چمکی جاتی ہے
تیل اور شیمپو خریدے عرصہ بیت گیا

رشتے مانگیں تو … ملتے ہیں
خواب میں دولہا بنتے عرصہ بیت گیا

ہم نے شوق سے کب یہ سر منڈوایا تھا
اولے پڑتے پڑتے عرصہ بیت گیا

پیچھے لگا کر … یہ الو بنتے ہیں
اپنا بال بھی دیکھے عرصہ بیت گیا

ہم تو گنجے قسمت والے ہوتے ہیں
اور بنتے ہی بنتے عرصہ بیت گیا

○○○

ماڈرن اپروچ

ہو گیا ہے جو مری جان یہ کشتی میں شگاف
تو کہتا ہے ترے ساتھ ہی مر جاؤں گی
تو کہاں جائے گا کچھ اپنا ٹھکانہ کر لے
میں تو تیراک ہوں پانی میں اتر جاؤں گی

تیرے لیے

کیا میں نے ہی لے رکھا ہے اس عشق کا ٹھیکہ
کیا تیرا گماں سود زیاں تک نہیں آیا
کچھ تو بھی پہاڑے کی بلندی سے اتر کر
"میں تیرے لیے چل کے کہاں تک نہیں آیا"

خاص عنایت

مجھ پہ کچھ اور ہے خاص یہ ان کی عطا
دل میں جو آتی نہیں میری نظر کے سامنے
شب کی تاریکی میں ان کی مہربانی دیکھیے
روز کوڑا پھینکتی ہے میرے گھر کے سامنے

محاورہ معکوس

جیبیں بھری ہیں خوب مگر اس عوام کی
محرومیوں کے تم نے ازالے نہیں کیے
ہنستے ہوئے دیا مجھے لیڈر نے یہ جواب
ہم نے یہ بال دھوپ میں کالے نہیں کیے

○○○

دو نمبری

ڈاکٹر نیاز علی محسن مگھیانہ

"سرخی آلو بخارہ" پہلے تو ہم چونکے کہ وہ ہمیں آلو بخارہ کہہ رہی ہے پھر احساس ہوا کہ وہ سامنے ریڑھی پر پڑے آلو بخاروں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ہمارے آلو بخارے کا سن کر بچپن سے ہی وہ بات کیوں یاد آ جاتی ہے کہ جس آلو کو بخار ہو جائے اسے آلو بخارہ کہتے ہیں۔ تاہم آلو کا رنگ بخار سے اس قدر تبدیل ہوتا تو ممکن نظر نہیں آتا۔ پھر سوچتے اس کا بخارہ کے شہر سے کوئی گہرا رشتہ ہوگا وہاں زیادہ تعداد میں اس کا جنم ہوتا ہوگا۔ بچپن میں ہم چھچھ کے قریب ایک دیہات بخاریاں میں پرائمری میں پڑھا کرتے تھے۔ ہم سوچتے کہ یہاں چھوٹے چھوٹے آلو بخارے پیدا ہوتے ہوں گے (ویسے یہاں کے لوگوں کو اکثر چھوٹا موٹا بخار ہو جاتا ہوگا) اسی لئے اس کا نام بخاریاں رکھ دیا گیا ہے جیسے گھوڑا ہوتا ہے اور گھوڑیاں چھوٹی۔ تاہم ہمارے سر کھپا کر سوچنے سے بھی یہ معمہ حل نہ ہوا۔ کبھی کبھی یہ بھی خیال آتا کہ مریض لوگ بیماری میں یا بخار میں آلو بخارے بہت کھاتے ہیں۔ معلوم نہیں اس کے نام کی وجہ سے کھاتے ہیں یا پھر بخار میں مبتلا مریضوں کا من بھاتا کھاجا ہونے کی وجہ سے اس کا نام آلو بخارہ پڑ گیا۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ دراصل اس میں غذائیت اتنی ہوتی ہے کہ بیمار لوگ اسے کھا کر اپنے آپ کو طاقت ور محسوس کرتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی کہ بیماری کے دوران انسان کا ذائقہ تبدیل سا ہو جاتا ہے تو ایسے میں اس کا بے مثال ذائقہ اس کی مقبولیت کی وجہ ہوتا ہوگا۔

خیر اس وقت تو ہمارا سارا دھیان ثمینہ کی طرف تھا جس نے کہا تھا "سرخی آلو بخارہ" ہم نے کہا "ہاں ہاں ہم بھی دیکھ رہے ہیں وہ بندہ ریڑھی پہ آلو بخارے سجائے بیٹھا ہے۔۔۔" "آپ نے ایک بات نوٹ کی ہے؟" "وہ کیا؟" "یہ آلو بخارے خاصے تگڑے ہیں اور سب کا رنگ بھی ایک جیسا ہے۔" "یہ تو ہے مگر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" "میں جو کہنا چاہ رہی ہوں وہ آپ کو سمجھ آ جائے گا آپ ذرا دو ساتھ والی ریڑھی پر پڑے آلو بخاروں کو غور سے دیکھیں۔" ہم نے آنکھیں جھپکا کے ذرا غور سے دیکھا تو دوسری ریڑھی والے آلو بخاروں کا آپس میں قد، رنگ اور نسل نہیں ملتا تھا۔۔۔ "ہاں ہاں یہ تو سب ایک جیسے نہیں ہیں۔"

"یہی میں کہنا چاہ رہی تھی۔" "آپ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔" "یہ کہ وہ تو ایک جیسے رنگ کے موٹے تازے آلو بخارے ہیں وہ دیکھنے میں تو بہت اچھے لگ رہے ہیں مگر ہیں دو نمبر۔" "دو نمبر۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" "ان کا ذائقہ پھیکا پھیکا سا ہے یہ چائنہ سے آئے ہیں۔" "ہاں یہاں ابھی تو سی پیک CPEC (چائنہ پاکستان اکنامک کوریڈور) پوری طرح آیا نہیں آلو بخارے پہلے آن پہنچے۔" ثمینہ بولی "اور بھی تو بہت ساری چیزیں چائنہ کی آ گئی ہیں۔ لیکن آپ خیال کیجئے گا وہ جو دوسری ریڑھی پر پڑے ذرا کمزور اور مختلف رنگوں کے نظر آ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کچھ کا رنگ زیادہ گہرا ہے اور کچھ کا تھوڑا گہرا تو دیکھنے میں یہ اتنے دلکش نہیں لگ رہے مگر ذائقہ ان کا کمال کا ہے۔"

تب ہمیں یاد آیا کہ ہم نے سعودی عرب میں پاکستانی کیلوں سے کم از کم چار گنا لمبے کیلے دیکھے تو بہت متاثر ہوئے فوراً آدھا

درجن خرید لئے (وہ تو ان کی قیمت زیادہ تھی ورنہ ہم کئی درجن خرید لیتے)۔ جب واپس اپنے حاجیوں والے کمرے میں آ کے بڑے اضطراب سے ایک کا پیرو وچاک کیا جس چھلکا اتارا تو ذہن میں یہی تھا کہ یہ تو ربر بھری کی طرح میٹھا ہوگا مگر ہمیں اس وقت بڑا دھچکا لگا جب وہ بالکل پھیکا نکلا۔ تب ہمیں اپنے پاکستانی کیلوں پر فخر محسوس ہونے لگا کہ جن کا ذائقہ بے مثال ہوتا ہے۔ حمیدہ نے ہمیں آلو بخارے کی شکل صورت و جسامت پر نہ جانے کا مشورہ دیا وہ قابلِ ستائش تھا۔ جب ہم اس سے کہنے لگے۔ ''حمیدہ دیکھو یہاں لوگ بھی تو ایسے ہی دو نمبر لگتے ہیں کہ اوپر سے کتنے میٹھے نظر آتے ہیں مگر اندر سے کتنے پھیکے لگتے ہیں۔'' تبھی ہمیں اپنا ایک شعر یاد آیا۔

کئی واقعوں مٹھے لوکی (گنے کی طرح میٹھے لوگ) — دیوں لگے پھوک میں جیسے (اندر سے جیسے پھیکے لگے)

ہم بھی کبھی چھوٹے ہوتے تھے۔ ویسے ہی جیسے جوانی سے پہلے سب چھوٹے ہوتے ہیں۔ تب کی بات ہمیں یاد ہے کہ امی جان فرش کو خوب دھویا کرتی تھیں جب اکثر فرش اینٹوں کے ہی ہوتے تھے بعد میں ٹائلیں اور اب ماربل نظر آتے ہیں تو فرش کو غسل دینے کے بعد نہایت اہتمام سے پانی میں ''فرشی رنگ'' ڈال کر غسل کا آخری مرحلہ طے کیا جاتا تھا یوں اینٹیں چمک بھی جاتیں اور ساتھ اپنا رنگ بھی دکھاتیں۔ جب ہم ننگے پاؤں فرش پر چلتے تھے یہ فرشی لال رنگ ہمارے تلوؤں کو بھی لگ جاتا۔ اب اس فرشی رنگ کا نیا استعمال وجود میں آ گیا ہے۔ جب سے پاکستان میں سٹرابری کی فصل اگنا شروع ہوئی ہے تو کئی اسے بیچنے والے انہیں اسی فرشی رنگ کا غسل دیتے ہیں۔ تاکہ ان کی اس دو نمبری سے سٹرابریاں خوشنما نظر آئیں اور گاہک کی منظورِ نظر بنیں۔ وہ الگ بات کہ جب وہ کھاتے تو اس کے ہونٹ، زبان اور سارا اندر لال و لال ہو جاتا۔ لال رنگ سے یاد آیا کہ اب تو تربوز بیچنے والے بھی ڈرگ (انجکشن) لگانے لگے ہیں وہ بھی مریضوں سے کر بیٹھے ہوتے ہیں اور تربوز کو سرخ رنگ کا ٹیکہ لگا کر اسے اندر سے لال و لال کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ بھی وہی ہوتا ہے جو رنگ کی ہوئی سٹرابری کھانے والوں کا ہوتا ہے۔ ہماری قوم کے لئے جب ایک نمبری کرنا مشکل ہوتا ہے تو وہ فوراً دو نمبری پر اتر آتی ہے۔ انھیں یقین ہے کہ بڑی محنت سے دو نمبر ہی تیار کرتے ہیں۔

لوگ دو نمبری میں بھی ایسا کمال کرتے ہیں کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ جعلی لائسنس سے لے کر جعلی پاسپورٹ بنانے تک کے کام یہاں لوگ آسانی سے کر لیتے ہیں۔ کسی جعلی کرنسی بنانے والے سے پکڑے جانے کے بعد کسی نے پوچھا۔ ''جناب آپ نمازیں تو پانچ وقت کی باجماعت پڑھتے ہیں مگر یہ جعلی نوٹ چھاپتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آتی۔'' ''وہ ویار شرم کا ہے کی۔ نماز ہم پر فرض ہے اور یہ ہمارا کاروبار''۔

ایک بار ہمیں ایک نامعلوم نمبر سے فون آیا۔ ''مبارک ہو! آپ کا انعام نکل آیا۔'' ''خیر مبارک مگر ہم نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ انعام نکل آئے۔'' ''نہیں یہ کام کرنے کی وجہ سے نہیں آپ ہیں ہی بہت خوش قسمت۔'' ''وہ کیسے؟'' ہم نے پوچھا۔ وہ بولے ''ہم نے فون کے مختلف نمبروں پر قرعہ اندازی پر انعام رکھا تھا آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کا پانچ لاکھ کا اول انعام نکل آیا ہے۔'' اب ہم روزانہ اس قسم کے دو نمبری انعاموں کی خوش خبریاں سن کر خوش نہ ہونے کے عادی ہو چکے تھے۔ ہم نے عرض کی ''جناب اللہ کا ہم پہ خاص کرم ہے۔ پہلے ہی ہمارے پاس بہت پیسہ ہے۔ ہماری طرف سے یہ انعام آپ خود رکھ لیجئے تحفہ سمجھ کر۔'' ''آپ ہم سے مذاق سمجھ رہے ہیں۔'' ویسے اصل مذاق تو ہماری بات میں تھا کہ ''پہلے ہی ہمارے پاس بہت پیسہ ہے'' تاہم حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے مزید بے وقوف بننے سے بچنے کے لئے کہہ دیا۔ ''جی ہم مذاق نہیں کر رہے۔ سیریس ہیں۔'' تاہم وہ ہمارے ساتھ جو مذاق کر رہے تھے۔ ہمارے جوابی مذاق کو

سہہ نہ سکے اور کوئی نیا قربانی کا بکرا تلاش کرنے کے لئے فون بند کر گئے۔

اسی طرح سے لاکھوں لوگوں کو بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے علاوہ مختلف پروگراموں میں بلا شمولیت کے انعامات کی خوش خبری سنائی جاتی ہے اور لالچ میں آنے والے بعد میں روتے ہیں کہ وہ اس دو نمبری میں کیسے آ گئے مگر اپنے آپ ہی کو کوستے ہیں مگر اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت بلکہ فراڈیے چک گئے مال ــــ دو نمبری کی تو مثالیں آتی ہیں کہ انہیں لکھنے کے لئے "ہاں یاد آتو نا" کے دفتروں دیے درکار ہیں۔ جس طرف آنکھ اٹھاتے ہیں یہی تصویریں نظر آتی ہے۔ کوئی بھی شعبہ اس ضمن میں محفوظ نہیں۔ تبسم بھرنے ہمیں بتایا کہ ایک نوجوان ان کے منعقد کروائے گئے جدہ کے مشاعرے میں ہماری غزل پڑھ کر داد لوٹ کر چلا گیا۔ چلیں اس دو نمبری میں اس نے ہمیں ادا (غزل سے) بطور بھی شکریہ کہ کوئی مال نہیں لوٹا۔ حد تو یہ ہے کہ ہماری اس بے چاری غزل کا پیچھا وطن بر طاب میں بھی ایک دعویدار نکل آیا۔ وہ تو لوگوں نے اسے سمجھایا کہ جب وہ موصوف ننھے منے ہوا کرتے تھے اور محض غوں غوں کیا کرتے تھے تب ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی یہ غزل بھنگڑے کے گلوکار محمد علی فریج نے ایک محفل میں سنائی اور داد حاصل کی تھی۔

دو نمبری کا رونا کہاں تک روئیے اب تو دلہنیں بھی دو نمبر نکلنے لگیں۔ یہاں تک تو خیر تھی کہ رات کو جو دلہن بیوٹی پارلر سے سج دھج کے آتی ہے وہی صبح منہ دھو کر دراتی ہے۔ شاید اسی لئے سیانے یہ کہتے ہیں کہ شادی سے پہلے لڑکی کا اصلی منہ دیکھ لیا جانا چاہیے تاکہ سہاگ رات کی صبح کسی ناگہانی صدمے سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ یہ بات اپنی جگہ بیوٹی پارلر سے چاہے جتنی دلہن ہو کم از کم سچی تو ہوتی ہے۔ اب تو کئی دلہنیں ایسی بھی دستیاب ہیں جو سہاگ رات کی صبح بھی دستیاب نہیں ہوتیں اور اس غم میں دولہا یہ بھی نہیں بتاتا کہ اس کی سہاگ رات کیا واقعی عملی طور پر ایسی تھی کہ اگلے دن ولیمہ کیا جا سکے جو حلال کیا اور کھایا جا سکے۔ خیر ان ایک رات کی ایسی دلہنوں کو اصلی سہاگ رات منانے میں بھی کوئی شرم مانع نہیں ہوگی۔ ہمیں نے یوں لگا ہے کہ ایسے لوگ ان لوگوں کی تاک میں رہتے ہیں جن کی ہزار کوشش کے باوجود شادی نہیں ہو رہی ہوتی اور ادھر ان کی جوانی سر چڑھ کر بول رہی ہوتی ہے۔ یا ایسے لوگ بھی ایسے گینگ کا نشانہ ہوتے ہیں جو رنڈوے ہو چکے ہوں اور کوئی انہیں لفٹ ہی نہ کروا رہا ہو۔ یوں یہ گینگ والے ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کا رشتہ لے کر آ جاتے ہیں اب بے چارہ جوانی کی وردوں کا مارا یا بے سہارا رنڈوا آتی خوبصورت دوشیزہ کا رشتہ آنے پر بھلا کیسے انکار کر سکتا ہے۔ جھٹ پٹ نکاح کی رسومات طے ہوتی ہیں نہ آگا دیکھا جاتا ہے نہ پیچھا (یاد رہے یہ کالا دوپٹہ ہے) اور سہاگ رات کا میدان سج جاتا ہے۔

سو ہمارے معاشرے میں دو نمبری کی ایسی ہزاروں مثالیں ہیں مگر یہ لوگ اتنے چابک دست ہوتے ہیں کہ یہاں ایک نمبر والے دو نمبر لگنے شروع ہو جاتے ہیں اور دو نمبری بالکل اصلی اور ویسی ہی کی طرح خالص۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ دو نمبر لوگ ایسے ہوتے ہیں تو دس نمبری کیسے ہوتے ہوں گے۔ اس کا تو آسان سا جواب ہے کہ تصور ہی تصور میں دو نمبری کو پانچ سے ضرب دیں تو دس نمبری نکل آئے گا۔ اب یہ آپ کی قسمت کہ دو نمبری سے پالا پڑتا ہے یا دس نمبری میں۔ تاہم یہ بھی اٹل حقیقت ہے کہ زندگی میں ایسے لوگوں سے کم از کم ایک دفعہ تو پالا پڑتا ہے جو آپ کے اندر کا "پالا" نکال کر گرمی بھر دے گا۔

⁂

چھلکوں کا سردار

علی رضا احمد

کیلے کے چھلکے کا ذکر ہو اور اس سرداری کا نہ ہو جس کی رنگت سڑک پر پڑے کیلے کے چھلکے کی طرح ہو جاتی ہے اور جس سے یہ لفظ بے لوثی آج پھر تکشیں کیں گی۔ سرداری بچپن سے ہی چھلکے کو دیکھ کر پھسلنا شروع ہو جاتے ہیں... دیکھا جائے تو یہ زندگی کیلے کے چھلکے پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑے ہونے کا نام ہے۔ سرداری جب بھی گھر میں بور ہو رہے ہوں وہ گھر والوں سے کہتے ہیں لوثی میں ذرا تازہ دم ہو کر آتا ہوں اور گھر سے باہر نکلتے ہی کسی چھلکے پر پاؤں رکھ دیتے ہیں گویا یہ ان کا comfort zone ہے اور اس "صحت مندانہ خودکشی" کو فریش ہونا قرار دیتے ہیں اس وجہ سے شاید ان کا سارا سسٹم ریفریش ہو جاتا ہے حالاں کہ یہ آنے سے پہلے اچھا خاصا قابلِ رشک انسان قابلِ اشک ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ کیلے کے چھلکے سے اسی بارے سوال کیا گیا کہ تمہاری سرداری سے کون سی دشمنی ہے کہ تم ہر دفعہ سرداری کو ہی اپنے غضب کا نشانہ بناتے ہو۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے بتایا یہ میرے اوپر پاؤں دھرنے والے باقی تمام لوگوں سے چند قدم آگے پائے جاتے ہیں میں تو ایک طرح کا ایکسیلیٹر ہوں سرداری کا منہ گھر کی طرف ہوتا آدھا راستہ ویسے ہی کافور ہو جاتا ہے۔ گر میں ویسے ہی بدنام ہوں کیونکہ ایک بیکار چیز ہوں کسی کے کام تو آ نہیں سکتا بس پاؤں کے نیچے آتا ہوں یا توبے کی پچ میں... حالاں کہ میرے اندر جو کوہ چھپا ہے کبھی اس پر بھی پاؤں رکھ کر دیکھیں۔ میں ایک مزاحیہ کردار کی طرح لوگوں کو تفریح فراہم کرتا ہوں۔ میری پشت پر ایک بیوقوف پاؤں دھرتا ہے اور پھر اس بندے اسے دیکھ کر تفریح لیتے ہیں۔ آپ ابھی بھی کچھ دیر انتظار کریں جیسے ہی سرداری میرے اوپر پاؤں رکھے گا پھر آپ دیکھیں کہ کیسے سب تماشائی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ "گنگنائے کہ ہم بھی دیکھیں گے ہم دیکھیں گے" میرے اوپر سے پھسل پھسل کر ان کی اتنی مشق ہو چکی ہے کہ بڑھاپے میں پھسل کے اور پھر یک دم کھڑے ہو کر یہ گنگناتے ہیں۔

بچی تو میں تیراں ہوں ابھی تو میں جوان ہوں

کیلے سے مزید پوچھا گیا کہ تمہارا تعلق کس خاندان سے ہے اس نے کہا باقی پھلوں کا تو کوئی نہ کوئی خاندان ہوتا ہے جیسے سٹرس وغیرہ لیکن یہ کیلا اپنی ذات میں اکیلا ہی ہے میں پھلوں کا راجپوت ہوں بلکہ میں وہ "بابا" ہوں جن کے دادا دادا سب کیلے ہیں، جھلکے وہ بابا ریپبلک کے ہوں۔ ایک بات اہم ہے جو اندر سے نرم ہوتے ہیں الزامات کی زد میں بھی وہی آتے ہیں۔ بہت کم چھلکے ایسے ہیں جو waterproof ہیں جیسے وقار مجروح کہتا ہے کچھوا اور مگرمچھ واٹر پروف چھپکلیاں ہیں وہ کچھ گھنٹے پانی میں رہ کر ڈوبے بغیر واپس کنارے پر لوٹ آتے ہیں۔ میں چونکہ پورا سال ٹھیلے کی زینت بنا رہتا ہوں اس لیے بدنام ہوں حالاں کہ آم تربوز کے کھوا اور تربوز کے چھلکے سے بھی لوگ "سلپ" ہو جاتے ہیں لیکن بیروں کے بیج سے زمین کا لگنا اس دنیز کی وجہ سے ہوتا ہے...

جتول سردار شیت سنگھ ایک دفعہ پولیس بھرتی کا ٹیسٹ دینے گیا تو پولیس والوں نے سب لڑکوں سے کہا کہ مستقبل کے چھلاو

اس کمرے میں آ جاؤ۔ ابھی کی برادری کے ایک سائنسدان نے ایک ایسے کیلے کا بیج تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس کا چھلکا سرخ ہو اور وہ دور سے اشارے کی طرح نظر آ جائے۔ پھر ہر چھلکا والی لائٹ کر دیا جائے لیکن بات گودے سے آگے نہ جا سکی ہے چنانچہ پھسل کر گرنے کا دورانیہ ابھی ایک دو سال کے لئے بڑھ گیا ہے۔ امریکہ میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق جب انسان قہقہہ لگاتا ہے تو وہ جب سب سے پہلے جس چیز پر نظر کرتا ہے وہ اس کی پسندیدہ ہوتی ہے بلکہ انسان پھسل کر گرے بھی صرف اسی کو دیکھتا ہے جو اس کا ٹارگٹ ہوتی ہے اور سردار جی دونوں حالات میں صرف کیلے کے چھلکے کو ہی دیکھتے ہیں سردار جی ہوش آ کر ساتھ ہو تو چھلکے کو دیکھ کر ان کے منہ سے یہ نکلتا ہے۔

پھسلوں گا میں اب شام سویرے / اور پاؤں کو تیرے کوئی موچ نہ آنے دوں گا / پر دھوکا میں نہ دوں گا

سردار جی کیلے کے اندر سے دشمن ہیں حالانکہ قصور صرف چھلکے کا ہے جیسے گودے سے کرنے والا ہمیار پر طنز کرتا ہے۔ وہ اکثر یہ بھی کہتے ہیں "میں کون کون؟ کھاں سجن کیوں کھاوے"۔ چنانچہ رگڑیں کھا کر ایک تیلی پر آرام کرتے ہوئے "منیت سنگھ" کو دیکھ کر ان کے کسی بزرگ نے نصیحت کی کہ اوہ! "آرام زادے" آج کے بعد تم کیلے سے کنارہ کش ہو جاؤ اب بائیکاٹ کر دو اس کا اور بس آم کھایا کرو اور تربوز بھی اس وقت کرو جب بارش ہو رہی ہو۔ وہ اس بات کے ایسے پکے ہوئے ہیں کہ بادل دیکھتے ہی ان کے منہ سے پانی کے ساتھ یہ نکلتا ہے لوہی پائی! آج پھر آم لانے پڑیں گے۔ اس مجبوری کی وجہ سے کئی دفعہ انہیں مار پڑتے پڑتے بچی ہے کیونکہ جب وہ بارش ہوتے ہی دکاندار سے وہ کھوا آم تو لے کا کہتے ہیں تو وہ ہاتھ میں بانس لے کر انہیں کاٹنے کو دوڑتا ہے اور ساتھ یہ کہتا ہے کہ ان کے پالے میں تیرے کیڑے پڑیں۔ سے آم ملتے ہیں! چنانچہ اس پالے کے موسم میں بھی ان کا کسی نہ کسی دکاندار سے پالا پڑا رہتا ہے۔

آم ہرگز ایک عام پھل نہیں جو ہر کرنچ چیک کے ساتھ آپ کو میسر آ جائے لہٰذا اب سردار جی بارش ہوتے ہی انگور سے آم کی آئس کریم سے گزارا کر لیتے ہیں۔ بقول علامہ الحق تھانوی "بہر حال انگور آم بھی آموں کی دوڑ میں شامل تو ہے" بلکہ پوری تن دہی سے ہر آتھن سیزن میں انہی ہی تو آخر تک کھڑا نظر آتا ہے۔ آم کا چھلکا بھی پھسلن کے لئے کسی کیلے کے چھلکے سے کم نہیں ہوتا جبکہ دیدی کی "عام" سردار کا ہو۔ اگر یہ آم کا چھلکا کسی کمپنی نے بنایا ہو تو اس پر لازماً چھلکے کے اوپر واضح لکھا ہو سکتا ہے اس پر پاؤں رکھنے سے پہلے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔ جیسے چہرے کو دھوپ سے بچانے والے مہنگے ترین سن بلاک پر لکھا ہوتا ہے "دوا کو دھوپ سے بچائیں" یقین مانیں جو دوا خود روشنی سے خراب ہو جائے وہ کسی کا رنگ روپ دھوپ سے سیاہ ہونے سے کیسے بچائے گی؟

کئی لوگوں کو بندر کی طرح چھلکے ادھر ادھر پھینکنے کی عادت ہوتی ہے مگر سڑک پار سے چلنے والا بے چارہ سردار اور شاہ سوار ہی اس میدان جنگ میں کیوں سلپ ہوتا ہے؟ ایک سردار جی کے بچے نے اسے کئی دفعہ سمجھایا چھلکے سے اتنا فاصلہ رکھا کرو۔ انہوں نے مزید واضح کیا کہ بیج اور چھلکے کا فزکس کے لحاظ سے سائنسی تعلق ہے کیونکہ دونوں کے نیچے تین نکتے ہیں حالانکہ ایسی بات ہوتی تو مگر مچھ اور کچھوے کے بچے بھی ایسے ہی تین ہیں وہ کبھی پھسلتے تو کیا پانی سے بھی نہیں پھسلتے۔ ایسے ہی ایک سردار جی سڑک پر گرے ہوئے تھے ان کا سر پھٹ چکا تھا لوگ ان کی مدد کے لیے ان کے پاس دوڑے آئے اور ان میں بھی زیادہ تر سردار جی تھے سردار جی نے ماتھے پر خون روکنے کے لیے ہاتھ رکھا ہوا تھا ساتھ کہہ رہے تھے حیرت ہے یہ کیلے کا چھلکا پڑا آپ کو نظر آ رہا ہے ان میں سے ایک بولا جی مجھے نظر آ رہا ہے وہ دوسرے سے پوچھا کیا تجھے نظر آ رہا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں وہ سامنے پڑا ہے وہاں موجود ایک عورت سے پوچھا کہ آپ کو بھی نظر آ رہا ہے؟ اس نے بھی کہا

کی سرداری جو سے اچھے طریقے سے نظر آ رہا ہے پھر سرداری نے علی الاعلان پوچھا کیا سب کو نظر آ رہا ہے ان میں سے ایک نے یہ بھی کہہ دیا کہ کس ''الو'' کو نظر نہیں آ رہا؟ سرداری کہنے لگے ''مجھے نظر نہیں آیا'' دراصل سرداری نے کیلے کے چھلکے سے بچتے ہوئے تربوز پر پاؤں دھر دیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ زبان کے پھسلنے کو کسی کیلے کے چھلکے کی ضرورت نہیں ہوتی حالاں کہ وہ اس کام میں چھلکوں کا سردار ہے۔ اس کا ارد گرد کا ماحول بھی اسے پھسلنے کا موقع فراہم کرتا ہے ہماری تیسری دنیا کے راستے میں بڑی طاقتیں کیلے یا دوسرے پھلوں کے چھلکوں کی طرح ہیں اور یہ تیسری دنیا سوچ کے سکھ ہیں جب تک یہ تیسری دنیا انہیں دیکھ کر گھبراتی رہیں گی یہ ترقی کی شاہراہ سے پھسلتے رہیں گے حالاں کہ ان کے پاس اپنے بھی کئی قسم کے چھلکے ہیں جن کی اپنی پھسلن بہت ہے لیکن کمزور۔

◆◆◆

آفتاب خان کا تبصرہ

مزاح مبین

مصنف : علی رضا احمد

صفحات: 160 قیمت: 400/- روپے پبلشر: القمر انٹر پرائزز، لاہور

مزاح لکھنا بہت مشکل اور باریکی کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ ادب میں مزاح نگاروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان میں علی رضا احمد کو بھی شامل کر لیں جن کے مزاحیہ یا شگفتہ مزاح میں لکھے مضامین کا یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ اس میں 34 مضامین شامل ہیں جنہیں شگفتگی اور مزاح کا جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے مگر ان میں پوری طرح مزہ اٹھانے کی فراہمی کم کم ہی موجود ہے۔ کہیں کہیں کوئی جملہ مسکراہٹ سے دوچار کرتا ہے۔ اکثر مضامین خشک اور بے رس ہیں اور ہنسنے ہنسانے کا موقع نہیں آنے دیتے۔ بہر حال کہیں کہیں ان میں شگفتگی کا عنصر در آتا ہے جو چند ساعتوں کے لیے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتا ہے۔ ایسے ہی چند جملے حاضر ہیں: ☆ ایک عورت نے کسی وجہ سے اپنے بچوں کو کوستے ہوئے کہا ''او دفعان ہو جاؤ تم! ادھر اپنے باپ پر ہی چلے جاؤ۔ (انہوں نے دفعان ہو جاؤ کو دفعان لکھا ہوا ہے) ☆ انہوں نے مقابلی رسم میں ایسا اہتمام کیا کہ آناً فاناً ریاض شروع ہو گیا۔ (رسم کو رزم لکھا ہے) ☆ ایک شادی کے دفتر میں لکھا تھا ''شادی شدہ جوڑوں کے زخموں پر مرہم رکھنا ہمارا کام ہے۔ ہم ہمیشہ جوڑوں کا درد محسوس کرتے ہیں۔ ☆ پاکستان میں شاعر آبادی کے تناسب سے کم ہیں حالاں کہ گلیاں عاشق مزاجوں سے اٹی پڑی ہیں۔ ☆ قلم اور سیاست میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی ہے۔

علی رضا احمد نے کچھ حقیقی کرداروں پر بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں اور مولوی رحیمہ واحدہ، آئن سٹائن، ارسطو، گاندھی وغیرہ کی بھی زندگی کو مزاح کا رخ کرتے ہوئے ان پر گہرا طنز کیا ہے۔ وہ بات سے بات نکالنے کے ماہر ہیں اور یوں لفظوں کو پھیلاتے ہوئے چار پانچ صفحات کا مضمون لکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ علی رضا احمد کا ایک کمال یہ بھی گردانا جائے گا کہ انہوں نے مزاح لکھتے لکھتے اپنے مضامین میں بعض سنجیدہ جملے بھی لکھ ڈالے ہیں جیسے کسی قلم کے مکالمے یا کسی سنجیدہ ناول میں کسی کردار کے جملے ہوں۔ ملاحظہ کریں: ''1۔ جو تاریخ پر نظر نہیں رکھتا وہ خود تاریخ کی ٹھوکروں میں آ جاتا ہے۔ 2۔ مخالف کی کامیابی میں بعض اوقات اپنی شکست بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ 3۔ جوتا پاؤں کو تکلیف دیتا ہے، پاؤں جوتے کو نہیں۔

جائزے

جو ٹوٹ کے بکھرا نہیں

نصرت نسیم

یوں تو یہ ساری کتاب رانی کی دھنک رنگ شخصیت کی طرح کے رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس میں خوشیوں کی پھوار بھی ہے تو آنسوؤں کی دھار بھی، شوخی و شرارت کی پھلجھڑیاں بھی، زندہ دلی اور محبت کی لازوال مہک بھی، حالات سے لڑنے اور مشکلات کو خندہ پیشانی سے سہارنے کا حوصلہ بھی، اور وضعداری کی دلداریاں بھی جب چھپکے کدو کے شوربے میں روٹی ڈبو کر کھاتے، اور رانی کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ اپنی کا نام رکھتے ہیں رانی کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ جب رنج کتاب پر اس کو قسط وار پڑھا تو سیاہ رنگ ہی ذہن پر چھایا رہا۔ رانی کی بیماری، رحلت، بچوں کا دکھ، مسیحاؤں کے کالے کرتوت، بیویوں اور گدی نشینوں کے اجلے لباس میں بیہودہ حقیقی کردار اور رویے، معاشرے کو اچھائی کا سبق پڑھانے والے منافق چہروں والے صحافی لیکن اب اس کتاب کو دوبارہ سے بار دیگر پڑھا تو اندازہ ہوا کہ قلم کے سیاہ رنگ اور دکھ نے کتاب اور صاحب کتاب کی خوبیوں کو ڈھانپ سے اوجھل کر رکھا۔ یہ کتاب تو مرزا صاحب نے رانی کی محبت اور 37 سالہ ازدواجی زندگی کے ایک ایک واقعے کو یاد کرتے ہوئے لکھی ہے مگر بین السطور ان کا اپنا کردار بھی روشنی کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ عورت کی عزت، بیوی کی حد درجہ تکریم، بیٹیوں کا احترام، دوستوں کے واسطے، برملا کلمہ حق کہنے والے، سچے عاشق رسولؐ۔

ایک اور چیز جو نظر انداز نہ ہوئی، وہ اس کتاب کا دلکش اسلوب، برجستگی اور کہیں کہیں ان کی نثر جو شاعرانہ رنگ لیے ہوئے ہے مثلاً ان کی رانی سے ملاقات اور شادی کا احوال اور رانی سے بارہ دنوں کی ناراضی کی روداد انتہائی دلچسپ اور گہری محبت کی غماز ہے۔ رانی اور چودھرانی کے موازنے والا باب بھی دلچسپ رہا اور دل آویز ہے۔ رقم طراز ہیں: "ہماری ساری زندگی چودھرانی کی یاد اور رانی کے حصار میں گزری۔ چودھرانی نے کرچی کرچی کیا۔ رانی نے تنکا تنکا سمیٹا۔ چودھرانی کی کاوشیں لائق تحسین تھیں اور رانی کا ساتھ قابل رشک رہا۔ چودھرانی زندگی کی کسک رہی اور رانی زندگی کا سنگھار ... جیسے دونوں کے بیچ تھے۔ چودھرانی ایک جھیل تھی۔ رانی ایک ہنگامہ پرور دریا تھی جو زندگی کے تپتے صحراؤں میں جھرنے کا روپ لئے رہی۔ دونوں ہماری قریب تر تھیں۔ ہم بے مول تھے وہ انمول کر گئیں۔"

جو ٹوٹ کے بکھرا نہیں وہ میں ہوں، وہ میں ہوں   جو ذہن سے اترا نہیں وہ تو ہے، وہ تو ہے

صاحب کتاب کو ٹوٹ کر بکھرنا بھی نہیں چاہیے کہ جن کے دامن میں چودھرانی کی خالص بے ریا محبت اور رانی کی والہانہ محبت و شیفتگی کے موتی ہوں۔ اس دور میں لوگ ساری عمر محبت کے ایک خالص بول کے لیے ترستے ہیں۔ آپ کو تو مالا مال کر دیا۔ چودھرانی اور رانی کی محبت نے۔ چودھرانی نے محبت میں پہل کی اور رانی مرنے میں پہل کر گئی۔ شہریار وحید پبلشرز نے نفیس کاغذ پر چھپی خوبصورت سرورق

کے ساتھ محبت کی سچی داستان پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ رہے نام اللہ کا!

دو دلوں کا جوڑا بچھڑ گیا، یہ گانا جب بھی ریڈیو سے سنائی دیتا، میری امی زار و قطار رونے لگتیں کہ ان کے حسین و جمیل پھوپھی زاد عین عالم شباب میں اپنی محبوب بیوی کو روتا چھوڑ کر چل بسے۔ پھر برسوں بعد میرا اپنا وجیہہ و شکیل بھائی دو کم سن بچوں اور خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملا۔ تو یہ گانا جب جب بجتا، آنسو رکنے کا نام نہ لیتے۔ محترم جبار مرزا نے اپنی محبوب بیوی رانی کی رحلت کے بعد اپنے بے پایاں غم کو تحریری شکل میں ڈھال کر اپنا دل کھول کر قارئین کے سامنے رکھ دیا۔ کچھ ایسے موثر انداز میں کہ بار بار گلا رندھ گیا اور آنسوؤں کی نمی نے تحریر دھندلا دی۔ تو کانوں میں اسی پرسوز گانے کی آواز گونجنے لگتی۔ دو دلوں کا جوڑا بچھڑ گیا رے

درد و غم، عشق، اور معاشرے کے ہر طبقے میں پائی جانے والی کالی بھیڑوں کے احوال پہلی اقساط ختم ہوئیں تو بہت جلد ان کی کتاب ''جو ٹوٹ کر بکھر نہیں'' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر سامنے آئی اور ہر خاص و عام میں مقبول ہوئی۔ یہ محترم جبار مرزا صاحب کی دریا دلی، محبت اور عالی ظرفی کہ انہوں نے مجھ نا چیز کو یاد رکھا اور بذریعہ ڈاک کتاب بھیجی جسے پا کر جہاں بہت زیادہ خوشی ہوئی، وہاں ایک بار پھر اداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی۔ کتاب میں رانی کی خوبصورت مسکراتی تصویریں دیکھ کر اور بار بار پڑھ کر اکثر یہ حال ہوا کہ مزید پڑھا نہیں گیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

یہ کتاب اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتی ہے جس میں غم جاناں اور غم دوراں پہلو بہ پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ شعبہ طب جیسے مقدس پیشے میں مافیا اور مفاد پرست، زر پرست مسیحاؤں کے جس طرح چہرے بے نقاب کیے گئے ہیں، وہ حیران کن ہے۔ بڑے بڑے ہسپتالوں اور بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کے اصل نام لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اور ایسی بے باکی و جرأت کے ساتھ صرف وہی لکھ سکتا ہے جس کا اپنا دامن صاف ہو کر اکل حلال و صدق مقال لازم و ملزوم ہیں۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان انہیں بجا طور پر تلوار کہتے ہیں کہ وہ زندگی کی تلوار کی طرح معاشرے کے ہر طبقے پر کڑے ہیں۔ چاہے وہ ان کے اپنے صحافی ہوں یا ادب مشکل میں آنکھیں پھیر لینے والے دوستوں کا بھی تذکرہ ہے اور ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ نام نہاد پیروں فقیروں اور بڑے بڑے خانوادوں کا بھی جو لوگوں کی مجبوریوں سے کھیلتے اور دولت بٹورتے ہیں۔ قصور والے اور بادشاہوں کے بارے میں پڑھ کر خون کھول جاتا ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے کہ کاش کبھی یہ لوگ قانون کی گرفت میں آ سکیں۔ بے رحم مسیحاؤں، بے دردیوں، طوطا چشم دوستوں، مفاد پرست صحافیوں کا جہاں احوال نام بنام مفصل بیان کیا ہے وہاں روشن چہروں اور اجلے کرداروں کا بھی ذکر خیر موجود ہے۔ جسٹس میاں نظیر اختر اور بریگیڈیئر بودلہ جیسے بلند قامت لوگوں کی روشن مثالیں بھی موجود ہیں جو چراغ سے چراغ جلانے پر یقین رکھتے ہیں اور جن کے ہونے سے یہ دنیا قائم ہے۔ اردو ادب حسن و عشق کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے مگر اپنی بیوی سے محبت کی داستان بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ میاں بیوی کے مقدس رشتے اور محبت کو ایسے بیان کیا گیا کہ جو قابل تقلید اور قابل رشک ہے۔

محترم فتح محمد ملک نے انہیں بجا طور پر جبار کی بجائے دلدار لکھا ہے۔ ایسی دلداری، دلجوئی اور فریفتگی کہ رانی کی ہر بات ان کے لیے حرف آخر، چاہے وہ بچی کے نام کا مسئلہ ہو یا علاج کا۔ اتفاقیہ مشق صحافی جو نام نہاد ہسپتالوں کی حقیقت جانتے بوجھتے ہوئے بھی رانی کی

خاطر پھونکیں اور دم کسی سادہ لوح انسان کی طرح کرواتا ہے۔ یہ ابواب پڑھتے ہوئے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ غصہ آتا ہے۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ عشق ہے۔ آگ میں کود جانے اور سود و زیاں سے بالاتر، جہاں عقل کے لگے بندھے اصول کام نہیں آتے۔ سو یہ وہ داستان عشق کی ہے۔ بہت عرصہ پہلے کہیں پڑھا تھا کہ شاہجہان کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو تاج محل کی شکل میں مجسم ہو کر امر ہو گیا۔ جبار مرزا صاحب اپنے عہد کی طرح تاج محل بنانے پر تو قادر نہیں مگر انہوں نے پیار کی روشنائی سے جذبۂ دل اور محبت سے ایک ایک لفظ صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر تاج محل تعمیر کر ڈالا ہے جو ہمیشہ رہے گا کہ لکھے ہوئے لفظ کی طاقت اور پائیداری مسلمہ ہے۔ وہ روئے نہیں مگر آنسوؤں کو ایسے لفظوں میں ڈھالا کہ پڑھنے والوں کے دل درد سے اور آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھیں۔ رانی کی شخصیت اور کردار کو یوں بیان کیا۔ محبت کے اتنے رنگ بکھرے کہ رانی قارئین کے دلوں میں بس گئی۔

رانی میری نظر میں ایک دھنک رنگ شخصیت ہیں۔ زندگی سے بھرپور، پیار سے مملو، متحرک، زندہ دل۔ محبت کرنے والی بیوی، ماں، رانی کے ساتھ ساتھ قرابت داروں و ہمسائیوں کا خیال رکھنے والی تھی، دریا دل، دوسروں کی مدد کے لئے ہر دم تیار، مناظر قدرت کی دیوانی۔ بارش اور پھولوں کو چاہنے والی کتاب دوست شخصیت جو سخت ضرورت کے وقت بھی کتابیں نہیں بیچنے دیتی۔ جسے ملک کے لئے شہید ہونے والوں سے پیار ہے۔ جامہ زیب رانی سراپا محبت ہے۔ رانی کی ہمہ رنگ شخصیت کو دلدار کے قلم نے اس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے کہ اس بیان میں جہاں رانی کا روشن چہرہ سامنے آتا ہے، وہیں مصنف کی سچائی، وفاداری اور گونا گوں خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔ چودھرانی کی کہانی میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پاسداری کرنا، ماضی کو نہ چھپانا اور سب سے بڑھ کر عورت اور بیٹی کی تکریم و تعظیم انہیں ایک بڑا انسان ثابت کرتی ہے۔ بقول سعادت حسن منٹو "بیٹی کا پہلا حق جو ہم کھا جاتے ہیں، وہ اس کے پیدا ہونے کی خوشی ہے۔" "اپنی تیسری بیٹی کی پیدائش پر زمین کو 5.5 سو کی دعوت دینا اور خوش ہونا ایک اور روشن پہلو ہے۔" "جو ٹوٹ کے بکھرا نہیں" محبت انسانی قدروں اور اعلیٰ اخلاق کے اسباق اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس پیغام کے ساتھ کہ دکھوں سے شکست کھا کر مر جانا کوئی کمال نہیں، غم کو ہنس کے جھیل جانا اور استقامت سے کھڑے ہونا یہ کمال ہے۔ تو فاضل مصنف نے اپنے غم کو طاقت بنا کر یہ خوبصورت کتاب جو بہترین چھپائی کے ساتھ رانی کی تصویروں سے مزین ہے۔ زبان و بیان کی خوبیاں لئے بعض ابواب شاعرانہ رنگ لئے ہوئے ہیں۔ بے ساختہ اور رواں دواں نثر میں محبت کی یہ سچی داستان پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

◆◆◆

معروف شاعر، ادیب جبار مرزا کی کتاب

جو ٹوٹ کے بکھرا نہیں

دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے —— قیمت-/1,000 روپے

ملنے کا پتہ: شہریار پبلی کیشنز، روش آرکیڈ، 9-G-6 مرکز، اسلام آباد (0300-5586192)

''تخلیق'' ستمبر 2021ء

اشرف ذکی اعوان

زیرِ نظر شمارہ سے پہلے والے تین شماروں میں بوجوہ نہ تو اپنی کوئی تحریر بھیج سکا نہ ہی ''انجمن خیال'' میں شمولیت ہو سکی۔ میرے ذہن میں آیا کہ درج بالا کوتاہی کا ازالہ ''تخلیق'' ستمبر 2021ء پر اپنے احساسات و محسوسات کا اظہار کیا جائے۔ ''تخلیق'' کو معرضِ وجود میں آئے 52 سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہ عرصہ ایک ناقابلِ فراموش مدت ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ تو اشاعت میں کوئی بے قاعدگی ہوئی نہ ہی معیار و مقدار میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ فروری 2012ء میں برادرِ محترم اظہر جاوید کے اس دارِ فانی سے کوچ کر جانے کے بعد ایک انتہائی مشکل وقت میں ان کے ''سپوت'' سونان اظہر جاوید نے اس مشکل بوجھ کو اٹھانے کے لیے اپنے کندھے پیش کر دیئے۔ جیسا کہ ہم سب آگاہ ہیں کہ ادبی جرائد کی اشاعت اور وہ بھی انتہائی باقاعدگی سے حالاتِ حاضرہ کے مدِ نظر اور حکومتی رویہ کے مطابق مکمل گھاٹے کا سودا اور ناقابلِ عمل نظر آتا ہے۔ سونان اظہر قابلِ صد ستائش ہیں کہ انہوں نے اپنے عظیم والد کے عظیم ورثہ کی شاندار انداز میں حفاظت کی۔ رب کریم توفیقات میں اضافہ کرے۔ اب آتے ہیں اصل موضوع ''تخلیق'' ستمبر 2021ء کی طرف۔ حمد و نعت کے ذیل شامل اشاعت ہونے والی حمد و نعت ہمیشہ کی طرح اپنے معیار کو پوری طرح قائم رکھے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے خالد اقبال یاسرؔ کی حمد اپنی تمام تر بنیادی خوبیوں کے ساتھ قاری کی نظر کو ملتفت کرتی ہے۔ بہت خوبصورت اشعار پر مشتمل ہے مطلع نذرِ قارئین ہے۔

ترا ذکر میری دوا میرے اللہ!   میں بیمار ہوں دے شفا میرے اللہ!

زمانے کو کچھ بھی کہا ہو تو مجرم   زمانے نے کیا کچھ کہا میرے اللہ

حسن عسکری کاظمی صاحب کی اشاعت شدہ نعتیہ کتب کو جب ہاتھ میں لیتے ہیں تو پھر یہی سوچ ہوتی ہے کہ مکمل مطالعہ کے بعد ہی ہاتھ سے رکھا جائے زیرِ نظر شمارے میں بھی آپ کی خوبصورت نعت شامل ہے۔ اپنی پسند کے اشعار نذرِ قارئین کر رہا ہوں۔

ذکرِ نبیؐ کا معجزہ دیکھا اذان میں   جیسے شہد کا قطرہ ٹپکتا ہے کان میں

کیسے لکھے گا ان کا عقیدہ کوئی بیاں   قرآں کا حرف حرف ہے آقاؐ کی شان میں

عہدِ نبیؐ کا تذکرہ اور مصطفےٰؐ کی بات   لگتا ہے یوں کہ تیر کھنچا ہے کمان میں

نسیم سحری خوبصورت نعت کا شعر:

اسی کے لیے وقف میرا قلم ہے   وہی ہستی ہے بے مثال عرب

مضامین کے حصے میں سب سے پہلا مضمون جناب انور سدید کا "میں قتیل شفائی کا احسان مند ہوں" سے ایک جملہ نقل کر رہا ہوں جس سے قتیل شفائی کے بارے میں جناب انور سدید کی سوچ کا بہت واضح اظہار ہوتا ہے۔ ''قتیل شفائی کے بارے میں پورے یقین سے یہ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی شاعری میں وہ سچائی موجود ہے جسے زمانہ گئے چنے شاعروں پر ہی منکشف کرتا ہے۔''
''احتی بستہ کھیل نہیں ہے'' میں ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں ''زراعتی معاشرے میں زیادہ بچوں کی ضرورت تھی اور وہ بھی لڑکوں کی۔ اس لیے عورت کا سارا رتبہ گھٹتا چلا گیا۔ گاؤں کی زندگی کے منفی نتائج بھی نکلے۔ کچے اور تنگ گھروں میں رہنے کی وجہ سے جانور بھی ان کے ساتھ ہی رہتے۔ بیماری کو فطری آفت سمجھا جاتا۔ انسان کی ضروریات بڑھتی چلی گئیں۔ رہنے کے لیے مکان، کھانا پکانے کے لیے برتن، پہننے کے لیے لباس کی ضرورت ہوئی لہٰذا کاریگروں کا طبقہ پیدا ہوا۔ یہ لوگ پتھر کے تیز دھار آلات بنانے میں ماہر تھے'' سید نصرت بخاری اپنے مضمون ''خطوط کی ترسیل کے ذرائع کا ارتقا'' میں کہتے ہیں ''منزلِ مقصود تک خطوط پہنچانے کے سلسلے میں انسانوں اور گھوڑوں کے علاوہ کبوتر بھی استعمال ہوتے رہے۔ کبوتروں کو تربیت دی جاتی اور ان سے نامہ بر کا کام لیا جاتا۔ اس کی پہلی مثال 816ء میں خلیفہ المعتصم کو خرّمی فرقے کے رہنما بابک کی گرفتاری کی اطلاع نامہ بر کے ذریعے پہنچائی گئی۔ ٹیپو سلطان نے بھی پیغام رسانی کے لیے کبوتروں کو استعمال کیا۔ ایک تیز رفتار گھڑ سوار ہرکارہ اگر لاہور سے مطلوبہ مقام تک جو پیغام چار دنوں میں پہنچاتا تو وہی پیغام قاصد کبوتر آٹھ گھنٹوں میں پہنچا دیتے'' محکمہ ڈاک میں مرکزی کردار ڈاکیے کا ہوتا ہے۔''

جناب مسلم شمیم کی ہر تحریر حکمت و دانش اور عمدہ ترین اسلوب کی حامل ہوتی ہے۔ یہی حیثیت ستمبر 2021ء کے شمارے میں شامل اشاعت ان کے مضمون ''جوش۔ جہانِ فکر و دانش'' کو حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں ''سرسید کو بھی اپنی تحریک اور علی پر مبنی تعلیم و دین کے حوالے سے فتوؤں سے نوازا گیا۔'''' ''لوگ پتھر سے چنگاری پیدا کرتے ہیں مگر یہ ایسے ہنرمند ہیں کہ تنکے سے آگ نکالتے ہیں۔'' ''اگر کسی کو موتیوں کا خزانہ دکھائی دے تو وہ کھلیان میں سے ایک بالی کیوں چنے۔ سرسید کی حیثیت ایک کہکشاں کی تھی جس کے سیارگان میں ایک بڑا سیارہ حضرت جوش تھے۔ فراق جو خود عظمت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں جوش کو شاعرِ اعظم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ تر و تازہ الفاظ و تراکیب اور محاورہ کار تشبیہات و استعارات جوش کے سامنے صف بستہ کھڑے رہتے تھے۔ الفاظ کا جو خزانہ ان کے پاس تھا وہ شاید ہی کسی اور کے پاس ہو۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی وہ ان کی فضول خرچی پر اتر آتے تھے۔ جوش کے اپنی شاعرانہ عظمت کے باب میں اس اظہار کو ان کے جہانِ فکر و دانش پر منطبق کیجیے اور کسی نتیجے پر پہنچیے کیونکہ ان کی تخلیقات یعنی شاعری کی دنیا میں دراصل ان کے متنازعہ افکار و نظریات کی گونج کا مربوط کام سنائی دیتی ہے جو تخلیقات جوش کی متاعِ بے بہا بھی ہے۔ حضرت جوش نے خود نمائی کے باب میں جو چند صفحات پر محیط ہے اپنے جہانِ فکر و دانش کی تمام جہات کا انتہائی اختصار کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ ان کے جہانِ فکر و دانش میں انسان دوستی، آفاقیت اور سیکولرزم کی بھرپور عمل داری نظر آتی ہے۔''

حسن عسکری کاظمی تسلیم شدہ بلند پایہ شاعری نیز اعلیٰ نثری تحاریر کے حامل بھی ہیں۔ شمارہ زیرِ نظر میں ان کا مضمون ''تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں'' اس دعویٰ کی مثال ہے۔ ان کے مطابق ''ماقاتی بعد حضرت ابراہیم ذوق کی شاگردی میں کیا کچھ سیکھا اس کا اندازہ ''گلزارِ داغ'' سے لے کر یادگارِ داغ تک بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ زبان میں نفاست، چابکدستی، رکھ رکھاؤ اور انسانی

اوصاف خصوصاً روزمرہ اور محاورہ بندی میں داغ نے ایک منفرد مقام پایا۔ قلعہ معلی میں عیش و نشاط، عشقیہ کاروبار اور آزادانہ میل ملاپ نے ان کی شاعری میں رنگ و آہنگ اور طرز احساس کی کارفرمائی سے عوام و خواص کے دلوں کو موہ لیا۔ ان کا کہنا اور کہنے کی طرف دھیان ہی نہ کیا۔ عام فہم اور سادہ زبان کی صحت کو پیش نظر رکھا۔ چند اشعار نذر قارئین

کہا ظالم نے میرا حال سن کر وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا

وصل کے باب میں کی عرض تو ہنس کر بولے کیوں مرے جاتے ہو ہو جائے گا، ہو جائے گا

داغ کا لہجہ جاتی رہا اور وہ ہمیشہ غزل کہتے ہوئے آسودہ رہنے کو ہی کامیابی تصور کرتے رہے۔

تم تو ہو جان اک زمانے کی جان تم پہ نثار کون کرے

ہجر میں زہر کھا کے مر جاؤں موت کا انتظار کون کرے

لوگ کہتے ہیں چپ لگی ہے تجھے حال دل بھی سنا کے دیکھ لیا

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

پروفیسر خلیل الرحمٰن کے —— "Nightingales Under the Snow" کا ترجمہ بعنوان "عندلیب تہہ برف" بہت پسند آیا۔ عنوان کا شاید اس سے بہتر کوئی اور ترجمہ ممکن نہ تھا۔ معروف جرمن سکالر پروفیسر ڈاکٹر این ماری شمل نے اپنی تخلیق سے خود کو آفاقی ادب کی شناخت کے طور پر تسلیم کروا لیا۔ یہ آفاقی ادب کی منفرد تحریر ہے۔ این ماری شمل پروفیسر ہمدانی کے تصور تصوف سے بہت متاثر ہیں۔ وہ ہر نئی کتاب ہمدانی صاحب کو عقیدت سے پیش کرتیں۔ اسی طرح ہمدانی صاحب بھی انہیں اپنی تصانیف ارسال کرتے۔ شمل کا کمرہ جسے وہ حجرہ کہتیں میں اسلامی کمال کے فن کے نمونے دیواروں پر آویزاں تھے۔ ان کی ملاقات دراصل دو صوفی مفکرز کا روحانی اتصال تھا۔ آئن سٹائن کے الفاظ "آدمی کسی چیز کو صرف اس حد تک سمجھ سکتا ہے جس حد تک اس سے محبت کرتا ہے۔" کیا وہ مسلمان تھیں یا نہیں؟ جواب دیتیں۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے "لوگوں کا حشر ان کے ساتھ ہوگا جن سے انہیں محبت ہوگی" پروفیسر این ماری شمل کی روحانی کائنات اسلامی تہذیب سے مکمل سرشار نظر آتی ہے۔ بہر حال ہم شعریت کے حسن کا ترجمہ نہیں کر سکتے۔ وہ نفسیاتی کیفیات جو ایک مرتبہ طاری ہوں دوسری بار انہیں صرف Recall کیا جا سکتا ہے طاری نہیں کیا جا سکتا۔

ظفر سہیل "ارنسٹ ہیمنگوے اور" وداع جنگ" میں بجا کہتے ہیں کہ امریکہ ہیمنگوے پر فخر کرتا ہے۔ ہیمنگوے اپنی زندگی میں ہی

عالمی شہرت کے ذائقے سے آشنا ہوئے۔ 1954ء میں اسے "The Oldman and the Sea" لکھنے پر ادب کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ یہاں پیشِ نظر مقتدر وہ ناول نہیں بلکہ "A Fare well to Ayms" ترجمہ بنام "وداعِ جنگ" ہے جو 1960ء میں معروف ادیب انتظار حسین نے ترجمہ کیا۔ ہیمنگوے کا انداز بیان ہمیشہ سادہ رہا اسے مختصر فقروں میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ بڑی اہم باتیں نہایت سہولت اور آسانی سے کہہ جاتا۔ وہ اپنی تلون مزاجی کے ہاتھوں مجبور تھا۔ بطور ایمبولینس ڈرائیور اس نے اٹلی کے محاذ پر جنگ میں عملی شرکت کی۔ جنگ کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انسانی جانوں کی بے قدری اور انسانوں کی جا بجا بے حسی کو بہت قریب سے دیکھا۔ خود بھی زخمی ہوا اور صاحب فراش رہا۔ عشق کے واقعوں سے لطف اندوز ہوا۔ یہی سب کچھ اس کے شہرۂ آفاق ناول "وداعِ جنگ" میں موجود ہے۔ اس نے انسانیت کی ناقدری اور موت کی ارزانی کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا۔ بقول ہیمنگوے "ہر ملک پر ایک خاص طبقہ حکومت کرتا ہے۔ اس طبقے کی جہالت اور بے وقوفی اس قدر بڑھی ہوتی ہے کہ انہیں کسی بات کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی۔ ان کی ہی مہربانی سے لڑائی کا دوام باقی رہتا ہے۔ وہ لوگ جنگ کے طفیل لاکھوں کماتے ہیں" جنگ، تشدد اور موت سے نفرت کرنے والے آرٹسٹ کا 1961ء میں موت سے آمنا سامنا ہو گیا اور وہ بھی اس کی اپنی مرضی سے۔ ڈاکٹر جمیل حیات نے "محمد حامد سراج: محبت میں فراق لمحوں کا داستان گو" دلکش تحریر شامل کی ہے۔ محمد حامد سراج کا سب سے مرغوب موضوع زندگی ہے۔ ان کی کہانیاں ہماری زندگی، سماج، ماحول اور معروض میں عبارت ہیں۔ "ماضی میں زندہ رہنے والے اجڑے ہوؤں کو اور کھوئے ہوؤں کو اپنے ذہن و دل میں بسانے والے کسی بھی حال میں ہوں ان کے اندر پورا جہان آباد ہوتا ہے۔ وہ کہیں بھی ہوں ماضی ان کے اندر بستا ہے۔" حامد سراج کے ہاں محض لفاظی اور صنعتوں کے استعمال پر ہی اکتفا نہیں ہے بلکہ ان کی تحریر میں بچھڑے ہوؤں کی شکستہ آرزوؤں اور تمام حسرتوں کا ذکر سمٹ آتا ہے۔ ان کے اندر یادوں کے قبرستان بسے ہیں کہ انہیں فراق سے انسیت ہو گئی ہے۔ "خوشبو اور پرندوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ انہیں کہیں بھی جانا ہو ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ عورت ایک گلک تھی ہے جسے سمجھنا اور اسے مکمل طور پر سمجھ جانا مرد کے لیے کسی طور پر بھی ممکن نہیں" "لگن سچی ہو تو منزل خود بخود دوڑ کر آنے والے کے قدم چوم لیتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ غم کے موسم میں انسان کو دکھ بانٹنے والے بھی نہیں بھولتے" اپنی تحریر "ڈاکٹر ڈیس آ ترک کہاں ہے" میں سرفراز تبسم (انگلینڈ) نے ایک بہت خوبصورت جملہ لکھا ہے جسے میں نقل کرتا ہوں نذر قارئین ہو جائے "اگر فن کار کے فن کو سراہا نہ جائے تو پہلے فن مرتا ہے اور پھر فنکار" عمران ستار کی تحریر "جون ایلیا" سے جون ایلیا کا ایک شعر:

؎ میں کہ رہتا ہوں بعد ناز گریزاں تجھ سے　　تو نہ ہوگا تو بہت یاد کروں گا تجھ کو

منظومات کے عنوان کے ذیل خوبصورت نظمیں پڑھنے کو ملیں۔ اسلم انصاری کی نظم "فرشتہ اِن مسیحاؤں کو سلام" میں سے ایک پسندیدہ شعر نذر قارئین

؎ تیماردار بھی ہیں، مسیحا بھی، دوست بھی　　خلقت کے آدمیتِ اعلیٰ وہی تو ہیں

محترمہ بشریٰ رحمان صاحبہ کی "نظم" سے چند پسندیدہ مصرعے نذر قارئین

چیتوں/ انگلیوں/ پھانسی پھندوں ــــ "دار یلوں" کو ہونٹ بھینچ کے پی لیتی ہوں/ من زخموں کو سی لیتی ہوں/ پیچھے پیچھے رو لیتی ہوں/ سولی پر بھی سو لیتی ہوں/ پھر بھی کرب کا دریا پیاسا/ پھر بھی میری چیخ ادھوری/ کب ہو گی یہ آشا پوری!! ــــ پروین شیر (کینیڈا) کی نظم

مجموعہ نظم سے آخری تین مصرعے۔ کچھ بھی نہ پاکر تھکے پیروں کی سکت کھو کر/ مایوسی میں لوٹ کے پھر مستول پہ آ کر/ بیٹھ گیا ہے۔ توقیر مشتاق (امریکہ) کی نظم "تقریب کے بعد کا منظر" میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں/ مجھ کو ایسا لگتا ہے/ جیسے مجھ میں/ جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہوں/ جوٹھے برتن/ بکھرے پھول/ میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں/ کچھ لمحے پہلے ہی جیسے/ بہت سے لوگوں کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں تھیں/ اور اب گہری خاموشی ہے/ جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں/ جوٹھے برتن/ بکھرے پھول/ او ران انجانی آنکھوں کا انجانا پیغام/ میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں۔

آغا گل میرے مطابق وہ افسانہ نگار عصر حاضر ہیں جن کا مطالعہ میرے لئے باعث صد افتخار رہتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ایک منفرد احساس دوسروں تک منتقل ہوتا ہے۔ مخصوص اسلوب میں مخصوص کہانی۔ یہی صورت حال ماہنامہ "تخلیق" ستمبر 2021ء میں شامل ان کی کہانی "سیاہ کار" کی ہے۔ وہ کہتے ہیں "ایمان اور عقیدے کے بغیر تو انسان بھی موبائل بن جاتا ہے۔ انسان دوسروں کی موت پر زندہ رہتا ہے۔" ان کی تحریر سے قاری خود ہی مزا اٹھا سکتا ہے۔ محترمہ عذرا اصغر کی "عجیب کہانی"، حنیف باوا کی "پھر وہ کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گئے"، محمد طارق علی کی کہانی "اک درد تنہائی" اور دیگر افسانے متاثر کن ہیں۔ طوالت آڑے آ رہی ہے لہٰذا کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ حصہ غزل ہمیشہ کی طرح خوبصورت ہے۔ اپنی پسند کے چند اشعار نذر قارئین:

؎ راحت اسی کے بے کراں لطف و کرم کا معجزہ — اس کا دیا ہوا یہ سر اور کہیں جھکا نہیں
(امین راحت چغتائی)

؎ گردنیں کتنی تہہ تیغ ستم بھی گئیں — اور کتنی ہی تہہ دار پہ سر دیکھے گئے
(صابر ظفر)

؎ غزل میں پیار کا ثاقب خیال رکھتا ہے — ہر ایک لفظ ہو بچوں کی مسکراہٹ سا
(آصف ثاقب)

؎ میں جنگ کے میدان میں یہ سوچ رہا ہوں — کیا ایک وفادار بھی زندہ نہیں میرا
(قمر رضا شہزاد)

؎ دل ناکام نئے دکھ پہ پریشاں کیوں ہے — فصل جب پکنے لگتے ہیں تو مل بیٹھے ہیں
(خاور اعجاز)

؎ چھاؤں جو غیر کی تھی دھوپ لگی — زندگی کی ہے بسر بے سایہ
(ڈاکٹر ایوب ندیم)

؎ جو دل کی بات تھی دل میں ہی رہ گئی آخر — وہ سامنے تھا مگر عرض مدعا نہ ہوا
(شہباز انور خان)

؎ جن کے لیے گرداب سجائے — ان کو پایا ساحل ساحل
(رشیدہ آفریں)

۔ ظلم پہ منتج نہیں ہوں گے — درد کو ظلم سے الگ کر کے دیکھ
(محمد عثمان)

۔ وہ جب بات کرے تو مجھ کو عجب گماں سا ہوتا ہے — جیسے کسی یاقوت کی چھ کے پتھروں نے راہ پا لی ہے
(اشرف ذکی اعوان)

۔ بہت سے کام کرنے کے ابھی باقی رہتے ہیں — مگر یہ زندگانی بھی کہاں تک ساتھ رہتی ہے
(جاوید عباس جاوید)

اسلام عظمی کی تحریر' وہ جو اجنبی نہیں تھا ___ اظہر جاوید' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ لاہور باہر سے آنے والوں کو اپنے سحر میں اسیر کر لیتا ہے۔ اظہر جاوید لاہور آئے اور لاہور کی پہچان بن گئے۔ لاہور کے نمایاں ادبی پرچوں میں سے ایک "تخلیق" تھا اور ہے۔ وہ دور تخلیق، اوراق اور فنون کا تھا۔ ان کے مدیران بالترتیب اظہر جاوید، ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ تمام کا تعلق سرگودھا سے تھا۔ میرے لئے باعث فخر ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی سے احترام و عقیدت مندانہ تعلقات تھے جبکہ اظہر جاوید سے سگے بھائیوں کی طرح۔ "تخلیق" کے پہلے شمارے سے راقم شامل رہا۔ اچھا وقت بہت جلد گزر جاتا ہے مگر پتھر پر لکیر کی طرح اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ میں نے بھی اظہر جاوید سے کسی کا گلہ نہیں سنا۔ تعلقات کو نبھانا اصل زندگی ہے۔ زیر نظر شمارے ستمبر 2021ء میں محترم پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب کے ملک کے نامور لکھنے والوں کی سات کتب پر تفصیلی تبصرے شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میری نظر میں ایک جناتی اوصاف کی حامل شخصیت ہیں۔ ان کی 130 ادبی اور 27 نصابی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ میرے لئے انتہائی باعث فخر ہے کہ میری ذاتی لائبریری میں ان کی تمام کتب بطور تحفہ موجود ہیں۔ آپ ملک کے نامور ترین ماہر تعلیم، ماہر اقبالیات، بے مثل مقرر اور کمپیئر، عظیم محب وطن، اتحاد بین المسلمین کے تمام فرقوں کے تسلیم شدہ داعی اور فرقہ پرستی کے بڑے مخالفین میں شامل ہیں۔ میرے نزدیک اس وقت وہ ہلال [illegible] سرگودھا کے بلا شرکت غیرے سربراہ ہیں۔ قدرت نے انہیں بہترین اسلامی اور اخلاقی اوصاف سے مزین کیا ہے۔ ایسے لوگ قوم کا عظیم سرمایہ ہوتے ہیں۔ خالق کائنات انہیں ہمیشہ پہلے سے زیادہ عزت، وقار اور شرف عطا فرمائے۔

◆◆◆

جب جاپان میں سونامی آیا اور اس کے بعد جاپانی ہوٹل تو بی بی سی نے ایک چھوٹا سا سروے کیا تھا۔ ایک بوڑھی جاپانی عورت جو وہاں بیٹھ کر الیکٹرک کا سامان بیچ رہی تھی جب نمائندے نے اس سے ریٹ پوچھا تو حیران رہ گیا کہ اس کی پراڈکٹ کا ریٹ مارکیٹ ریٹ سے بہت کم تھا۔ اس نے وجہ پوچھی، اس عمر رسیدہ عورت نے بتایا کہ "میں مارکیٹ جا کر ہول سیل پر سامان خرید لاتی ہوں اور اسی ریٹ پر میں وہی سامان اپنے مصیبت زدہ لوگوں کو بیچتی ہوں۔ نمائندے نے پوچھا کہ تم اس پر اپنا معاوضہ کیوں نہیں رکھتیں؟ تو اس بوڑھی عورت نے جواب دیا کہ "میں اپنی قوم کی مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتی۔ میں اپنے ملک کا کنٹری بیوشن کر رہی ہوں۔" (لطیف ابراہیم)

ماہنامہ "تخلیق" ایک تاریخ ساز جریدہ

زید اللہ فہیم

ماہنامہ تخلیق کا شمارہ دسمبر 2021ء میرے زیرِ نظر ہے۔ خوبصورت سرورق ادارہ تخلیق کی تخلیق ہے۔ مجلے کے مشمولات میں پہلی بات ایڈیٹر کا اداریہ ہے۔ حمد، نعت، مضامین، افسانے، غزلیں، کتابوں پر تبصرے اور انجمن خیال اور دیگر مضامین ہیں۔ حمد اور نعتیں خوبصورت ہیں اور عمدہ و معیاری۔ "پہلی بات" میں حکومت کی ڈاک پالیسی پر تنقید ہے۔ جب سے یہ حکومت اقتدار میں آئی ہے ہر طرف مہنگائی کا ایک طوفان امڈ آیا ہے۔ ڈاک کے ذریعے آسانی سے پیغام رسانی ہو جاتی تھی لیکن اب — 8 روپے کی بجائے بیس روپے کا ہو گیا ہے۔ رجسٹری جہاں 35 روپے میں چلی جاتی تھی وہ اب سو روپے میں جا رہی ہے۔ کتابیں ارسال کرنے پر مزید خرچہ بڑھ گیا ہے۔ آپ نے اس طرف نشاندہی کی تو ہے لیکن یہ مہنگائی اب حکومت سے کنٹرول نہیں ہو سکتی۔ یہ مزید مہنگائی میں اضافہ کریں گے۔

جہاں تک صدارتی ایوارڈز کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا بھی پتہ نہیں کہ کون سا پیمانہ ہے جس پر پرکھا جاتا ہے اور ایوارڈز دیے جاتے ہیں۔ پسند و ناپسند کی بات ہے۔ بہرحال ادب کی دنیا میں جس قدر بھی ایوارڈز دیے گئے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ حمد و نعت کے ضمن میں خالد اقبال یاسر کی حمد خوب ہے۔ مطلع ہی کمال ہے:

تیرا ذکر میری دوا میرے اللہ! — میں بیمار ہوں دے شفا میرے اللہ!

حسن عسکری کاظمی صاحب کی نعت خوب ہے:

فقر و فنا ہو یا اسے تیغ بلانا عزیز — کوئی تو وصف اُنؐ کا ہو اب حکمران میں

نعت کے مقطع کے مصرعِ ثانی میں کوئی حرف کمپوزنگ سے رہ گیا ہے۔ محترم نسیم سحر کی نعت بھی خوبصورت ہے۔ عقیدت کا یہ اظہار خوب ہے:

وہاں سے پلٹ کر تو آیا ہوں لیکن — نہیں بھولتے ماہ و سالِ مدینہ

مضامین میں محترم انور سدید کا قتیل شفائی صاحب کے لیے لکھا گیا مضمون خوبصورت عقیدت کا اظہار ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قتیل پر قلم اٹھانے سے وہ ڈرتے ہیں۔ ایک صفحہ بھی لکھنا مشکل ہے لیکن اظہر جاوید کا تقاضا ان کے سامنے ہے اس لئے وہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ قتیل کے زیرِ احسان اس لحاظ سے ہیں کہ رائٹرز گلڈ کے انتخاب میں ایک ادیب محمد طفیل صاحب کے گروپ میں صبح آتا اور شام کو قتیل شفائی کے دفتر میں ہوتا اور ان کے منصوبے قتیل شفائی کو بتا دیتا اور اس بات کا محمد طفیل گروپ کو محسوس بھی نہ ہونے دیتا۔ نہ جانے اس میں جعفر و قاسم کی لَو کہاں سے در آئی تھی۔ ان ہی دنوں میں قتیل شفائی کا یہ شعر انور سدید صاحب کو بہت اچھا لگ رہا تھا

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں　　　　کس نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

اس شعر کی تفسیر اس وقت انور سدید صاحب کو معلوم ہوئی جب قتیل شفائی نے سیکرٹری کا عہدہ سنبھالا اور ان کے ساتھ ہی ادیب نے (جو صبح محمد طفیل صاحب کے کیمپ سے اور شام قتیل شفائی کے کیمپ میں ہوتا) آنکھیں پھیرنا شروع کر دیں۔ انھوں نے دل ہی دل میں کہا کہ ظالم نے کیا خوب اور سچا شعر کہا ہے۔ انتخاب کے بعد تلخی کی بجائے محمد طفیل صاحب نے قتیل شفائی کو مبارک دی۔ جب محمد طفیل فوت ہوئے تو اس روز قتیل شفائی سب سے زیادہ دکھی اور غم زدہ تھے۔ انور سدید لکھتے ہیں کہ اکثر مشاعروں میں قتیل کی شرکت کے بغیر مشاعرے بے مزہ اور بے لطف رہ جاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں قتیل شفائی نے جو غزل سنائی اس کا یہ شعر انور صاحب کے لیے خضرِ راہ ثابت ہوا۔

معلوم نہ تھا کیا تجھے سقراط کا انجام　　　　ہاتھوں میں ترے ساغرِ سم ہے تو مجھے کیا؟

انور سدید لکھتے ہیں کہ قتیل شفائی کی شاعری میں وہ سچائی موجود ہے جو زمانے کے سچے شاعروں پر ہی منکشف کرتا ہے۔ اس زمانی حقیقت کو قتیل نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ مشکل وقت میں قتیل شفائی میری ضرورت بنا اور وہ میری مشکل آسان کرنے آ پہنچا۔ میں نے اس سے استفادہ کیا اور اس کے تجربے کو اپنا راہنما بنایا اور میں نے تمام رکاوٹوں کو عبور کیا۔ قتیل کا ان پر یہ احسان ہے اور اس کا اعتراف ضروری ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے ''ماضی بنا تخیلی تصیں'' میں گاؤں شہری زندگی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا بتدریج ترقی پانا اور ان کی سماجی طرزِ زندگی کا ذکر ہے۔ قدیم زمانے کے شہروں کی زندگی کا ذکر ہے۔

جوش ''جہانِ فکر و دانش'' مسلم شمیم صاحب کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں مختلف ادیبوں کی رائے کا ذکر کرتے ہیں۔ انور سدید صاحب کے مطابق جوش کا المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی پرجلال آواز سے گھن گرج پیدا کی۔ چھوٹے سے خیال کی وادی کے گرد الفاظ تشبیہات اور مترادفات کا ہالہ کھینچ دیا لیکن جب اس وادی میں جھانکنے کی سعی کی تو تخیل گہری کھائی کے پاس جو جلوہ مثال نہ ہو سکا اور یہ لفظوں کی گونج میں گم ہو گیا۔ خلیق ابراہیم خلیق کے مطابق جوش کے تخیل میں جو بلندی ہے وہی ان کے علم میں وسعت اور فکر میں گہرائی ہوتی تو وہ غالب اور اقبال کے ہم پلہ ہوتے تاہم وہ بڑے سے بڑی نہیں بہت بڑے شاعر ہیں۔ صاحبِ مضمون کو ادیبوں کے خیالات سے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جوش کی شاعری عظمت کا اعتراف جس پیمانے پر ہونا چاہیے تھا وہ ابھی تک نہیں ہوا۔ صاحبِ مضمون کے مطابق جوش کی شاعری کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ ہر نقاد و نقد و نظر نہ اس کے نظارہ کی تاب لانے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ اسے محیط کرنے کی جسارت۔

''تخلیق داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں'' حسن عسکری کاظمی صاحب کا مضمون ہے۔ داغ دہلوی حضرت ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ ان کی شاعری عام فہم سادہ اور زبان کی صحت کے ساتھ عوام اور خواص میں مقبول رہی۔ ان کی شاعری میں گہرائی بلکہ آفرینی یا فلسفیانہ خیالات کا شائبہ تک نہیں۔ جناب داغ کے خوبصورت اشعار کا حوالہ اس مضمون میں دیا گیا ہے۔

''Nightingale under the Snow'' ڈاکٹر این میری شمل کی انگریزی شاعری کی کتاب ہے جس کا ترجمہ پروفیسر احمد سعید ہمدانی صاحب نے کیا ہے اور اردو میں ''عندلیب زیرِ برف'' اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تصوف پر محیط ہے۔ ہمدانی صاحب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر این میری شمل کو جانتے ہیں۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو ڈرائیور نے پوچھا کہ کس طرح جانتے ہیں جس پر اسلم کمال صاحب کہتے ہیں کہ وہ فضل محمود اور عمران خان کے پاکستان کے خوش قسمت آدمی ہیں۔ اس پر ڈرائیور خوش ہوا اور کہنے لگا کہ وہ بھی فرست

کلاں کرکٹ کھیلتا رہا ہے اور اس کا والد بھی۔ اس کے والد نے اُسے بتایا تھا کہ فضل محمود تاریخ کے چند اعلیٰ باؤلروں میں شامل ہے۔ ڈرائیور نے یہ بھی بتایا کہ جب اوول میں پاکستان میچ جیتا تو اس کی والدہ نے فضل محمود کو تہنیتی بوسہ دیا۔ کرکٹ کی صحافت میں ایک عرصہ تک فضل محمود کا نام بطور Vcelb استعمال ہوتا رہا۔

کار سے جب اسلم کمال صاحب اترے اور ہوٹل میں جانے لگے تو اس خوش شکل خاتون نے آفر کی کہ وہ اس کے ساتھ چلیں تو وہ رات کی رہائش کے چالیس پونڈ وصول کرے گی جبکہ ہوٹل ان سے ڈیڑھ سو پونڈ وصول کرے گا۔ اسلم کمال صاحب نے معذرت کی اور ساتھ ہی پانچ پونڈ اس کو دیے اور وہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ اسلم کمال صاحب کی یہ یادنگاری خوبصورت ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ وہ اس خاتون کی تصویریں بناتے رہے اور اس کے چہرے کے نقوش اور اس کے پیکر کے خطوط کا مطالعہ اور مشاہدہ سے اپنی کوتاہی فن کا ازالہ کرتے رہے۔ "کارخانو بازار کا خفیہ گیٹ" ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب کی مزاحیہ تحریر ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام عظمی کی تحریر وہ اجنبی نہیں تھی۔ مجلہ تخلیق اور اس کے بانی جناب اظہر جاوید صاحب سے متعلق ہے۔ کس طرح ان کا رابطہ ہوا تخلیق میں ان کے افسانے شائع ہوئے۔ اوراق اور فنون میں بھی "پھر وہ کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گئے" حنیف باوا کا مختصر افسانہ ہے جس میں ایک سبق مل رہا ہے کہ اولاد والدین کی جائیداد کی تقسیم پر جب خوش نہ ہو تو تلخیاں بڑھنے لگتی ہیں۔ نیک اولاد ہو تو والدین کے تمام فیصلے خوشی سے قبول کرتی ہے۔ محمد طارق علی کا افسانہ "اک دردِ تنہائی" ایک خوبصورت پلاٹ پر قائم ہے۔ ایسے معاشرتی مسائل اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ خود غرضی جہاں ہوگی وہاں ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے منگنی کرتے ہیں جب کوئی اور موزوں رشتہ مل جائے تو پھر اس کو توڑنے میں دیر نہیں کرتے۔ "قرطاس و کینوس" اسلم کمال صاحب کی تحریر ہے۔ گیت وک تھدن کی ایئرپورٹ پر بیٹھے ہیں۔ اداس جا رہے لیکن خیالوں میں گم ہیں اور فلاسفی میں ہو جاتی ہے۔ خیالوں میں ٹولنٹن مارکیٹ جواب ہسٹری میوزیم لاہور ہے میں فضل محمود کرکٹ ہیرو آف اوول کو یاد کرتے ہیں جس کی تصویر اس میوزیم میں آویزاں ہے۔ اپنے ہیرو کے نام کی کوئی سڑک نہیں۔ ان کے مطابق آسٹریلین کرکٹر رچی بینو نے اپنی کتاب میں فضل محمود کا جو پورٹریٹ بنایا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اسلم کمال صاحب کمال کے لکھاری ہیں۔ وہ ہوٹل کی طرف جا رہے ہیں۔ کار ڈرائیور ان سے باتیں کر رہا ہے۔ راستے میں دو خواتین بھی سوار ہو جاتی ہیں۔ ایک پُر وقار اور حسین خاتون ہے اور دوسری سیاہ فام۔ ڈرائیور کہتا ہے کہ وہ فیلڈ مارشل کی بھتیجی ہے۔

"باکمال لوگ لاجواب کارنامے" یہ ڈاکٹر نور کمال صاحب کی تحریر ہے اس میں لوگوں کے رویوں کو پرکھا گیا ہے۔ اسلام کا حال بھی ہم نے اچھا نہیں کیا اور اپنے رویوں سے زراعت کا حال بھی خراب کیا ہے۔ کرونا کی وبا کے دوران ہر آدمی حکیم اور ڈاکٹر بنا ہوا تھا۔ یہ مضمون عمدہ ہے۔ "شہر میں گاؤں" محمد الاصفی کے شعری مجموعوں کا انتخاب ہے۔ سیفی سرونجی نے اس پر خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ محمد الاصفی کے کلیات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں کہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی شاعری میں زندہ رکھا ہے۔ سیفی سرونجی نے محمد الاصفی کے خوبصورت اشعار کو بھی تبصرہ میں درج کیا ہے۔ "سب سے الگ" سرمد صہبائی کی غزلوں کا انتخاب ہے جو معروف شاعر اشرف سلیم نے کیا ہے۔ محمد نوید مرزا نے اس پر تبصرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ سرمد صہبائی کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور جدید فکری و شعری آہنگ بھی ہے۔ نوید مرزا صاحب نے کتاب پر مختصر اور جامع مضمون لکھا ہے۔ اگر اشعار بھی درج کرتے تو اور بہتر ہوتا۔

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب نے محترم قمر رضا شہزاد کی کلیات پر خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ اسی طرح حسن عسکری کاظمی صاحب

کی کتاب "آثار بصر" پر بھی ان کا تبصرہ خوب ہے۔ کنول صابری صاحب کی تصنیف "یاس نظر" نعتیہ مجموعہ ہے۔ اس پر تبصرہ ڈاکٹر صاحب نے عمدہ کیا ہے۔ اس مجموعہ میں تین حمد ہیں 35 گلہائے عقیدت بحضور سرورِ کائنات قطعات اور سلام موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ اسی طرح عاکف گریانی کے مجموعہ کلام حاصل پر بھی تبصرہ موجود ہے۔ انور عدیم علوی کے کالموں کا مجموعہ "اصف صدی کا قصہ" پر ڈاکٹر صاحب نے تبصرہ کیا ہے۔ 37 کالموں پر مشتمل یہ کتاب ہے اور اس میں معاشرتی، قومی، شخصی اور ادبی نوعیت کے مضامین ہیں۔ اقبال فیروز کے ناول "ناہموار زمین" پر تبصرہ موجود ہے۔ یہ ناول دوسری جنگ عظیم سے متعلق ہے۔ خلدہ نواز ڈاکٹر بدر منیر صاحب کا شعری مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہارون الرشید صاحب کے شاگرد بھی ہیں اور ان کی حوالے شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے نازاں ہیں کہ خلدہ نواز کے شاعر ان کے شاگرد ہیں۔ بدر منیر صاحب کی شاعری خوبصورت ہے اور ان کی شگفتہ بیانی کے چرچے خاص و عام میں ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب نے سات کتابوں پر تبصرہ کیا ہے اور تفصیل کے ساتھ خوبصورت تبصرے کئے ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کس محنت سے اتنی کتابوں کا مطالعہ کر کے پھر ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سلامت رہیں اور ایسے ہی خوبصورت تبصروں سے ہمیں نوازتے رہیں۔ انجمن خیال میں جناب آصف ثاقب محبت سے یاد کرتے ہیں۔ وہ محبت شفقت کا مظہر ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے آمین۔ انتظار باقی صاحب کا مکتوب بہت خوب ہے۔ تاہم ان کے اعتراض میں جو محمود شام صاحب اور سلطان سکون صاحب کی غزلوں پر اٹھائے ہیں وہ میرے لحاظ سے صحیح نہیں۔ پہلے محمود شام صاحب وہ شعر دیکھیے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ردیف پہ حرف کی جائے پر حرف ہونا چاہیے۔ اشعار یوں ہیں:

بول اٹھتی ہیں تک اینٹیں بھی　　لوگ لکھتے ہیں سب مکان پہ حرف
جلنے والوں کے دل ہوئے چھلنی　　ہم چڑھا کے رہے کمان پہ حرف

یہ بحر ہے فاعلاتن مفاعلن فعلن (فعلات)

باقی صاحب نے مکان اور کمان لکھا ہے حالانکہ 'ن' میں تقطیع ہے۔ قافیہ کے بغیر پہ بھی درست ہے یہ بحر اور ہو جائے گی اور پھر وہ فاعلاتن مفاعلن مفاعیل ہو جائے گی۔ اب بحر کے لحاظ سے شعر درج کرنا چاہتا تھا لیکن مراسلہ ویسے بھی طویل ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس پر خط کو ختم کرتا ہوں۔

◆◆◆

پانچ باتیں پانچ لکھاری

(1) دنیا میں سب سے زیادہ سچ شراب خانے میں شراب پی کر بولا جاتا ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ جھوٹ عدالتوں میں مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر بولا جاتا ہے۔ (منٹو) (2) دنیا میں کامیاب بننا صرف ترازو کا ہے ایک کے باوجود اجنبی رہتا ہے۔ (مستنصر حسین تارڑ) (3) مجھ میں اور میری بیوی میں بڑا عجیب سا اتفاق ہے، یعنی کو میں وہ کھاتی ہے اور مجھ سے ہوتا ہے۔ (ابن انشاء) (4) ہم اتنے امن پسند ہیں کہ ہمارے سب سے بڑے اخبار کا نام جنگ ہے۔ (مشتاق احمد یوسفی) (5) پاکستان میں کھانے کا ادب صرف مرغ اعلیٰ اور وزیروں کو آتا ہے وہ خاموشی سے کھاتے ہیں۔ (انور مقصود)

اقبال کی منزل۔ایک اہم کتاب

محمد نوید مرزا

خرم علی شفیق نامور اقبال شناس ہیں۔انھوں نے اقبالیات کے حوالے سے کئی کتابیں تحریر و تالیف کی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے عمران سیریز کے خالق ابن صفی کے بارے میں بھی خاصی تحقیق کی ہے اور اس بابت ان کی تین کتابیں ''سائکلو منشن، رانا پیلس اور دانش منزل'' شائع ہو چکی ہیں۔ ''دانش منزل'' جو ابن صفی کی طویل جاسوسی داستانوں سے انتخاب ہے، کے بارے میں عامر اقبال اراعیں لکھتے ہیں:
''اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ابن صفی کی ''دانش منزل'' دراصل اقبال کے ''مرد مومن'' کا منی ایچر ورژن اور Proof of Concept ماڈل ہے اور خرم علی شفیق کی ''دانش منزل'' اسی نظریے کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک بھرپور کوشش ہے۔''

اقبالیات کے حوالے سے خرم علی شفیق کی نئی کتاب ''اقبال کی منزل'' بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے جو مصنف کے قلم سے لکھی ہوئی شاعر مشرق کی سوانح حیات ہے۔ بقول خرم علی شفیق: ''پندرہ سال پہلے جب علامہ اقبال کے بارے میں پہلی کتاب شائع ہوئی تو میرے سامنے صرف یہی مقصد تھا کہ اقبال کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہوا سے اکٹھا کر دوں۔ اس دوران میری بہت سی کتابیں شائع ہوئیں لیکن میری تحقیق کا سلسلہ صحیح معنوں میں گزشتہ برس مکمل ہوا ہے۔'' یہ کتاب اسی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ مصنف اسے علامہ اقبال کی پہلی مستند سوانح کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''مستند سے میری مراد یہ ہے کہ ہر ممکن حد تک دستاویزی شواہد سے معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ اب تک کسی سوانح میں یہ خیال نہیں رکھا گیا تھا بلکہ سوانح نگاروں نے زبانی روایات کو زیادہ اہمیت دی۔''

پہلی بات کے عنوان سے مصنف نے طویل دیباچہ لکھا ہے اور بڑے مدلل انداز میں ہمیں بتایا ہے کہ انھوں نے کس طرح کڑی سے کڑی ملا کر اس کتاب کو مرتب کیا ہے جس کے لیے وہ یقینی طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ اہم کتاب ''اقبال کی منزل'' شاعر مشرق کی زندگی کے آخری زمانے کا احاطہ کرتی ہے۔ بقول مصنف ''اقبال کی منزل'' اس سیریز میں سب سے پہلے پیش کی جا رہی ہے۔ اگرچہ اقبال کی زندگی کے آخری زمانے کے بارے میں لیکن اسے سب سے پہلے پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہماری تاریخ میں شاید سب سے زیادہ فیصلہ کن دور تھا یعنی 1927ء سے 1946ء کا عرصہ۔ اگرچہ اقبال کی وفات 1938ء میں ہوئی لیکن کتاب کو مزید آٹھ برس آگے تک لے جا کر تاریخ کے اس واقعے پر ختم کیا گیا ہے جسے صحیح معنوں میں ''اقبال کی منزل'' کہہ سکتے ہیں۔

مصنف اس سے پہلے واقعہ حیات اقبال کے عرصے کے حوالے سے دو اور کتابیں مرتب کرنے کی نوید بھی سنا رہے ہیں جو اقبالیات کے ضمن میں ایک بڑی خبر ہے۔ کتاب کا پہلا باب ''معرفت کی وادی'' جنوری سے جون 1927ء کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے کتاب کا آغاز کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے اور پڑھنے والے لفظوں کے خوبصورت چناؤ اور تحریر کی خوبصورتی میں گم ہو جاتے ہیں۔ علامہ کی زندگی کے مختلف واقعات، کتابوں کی اشاعت کی خبریں اور ان کے اپنے عہد کے مختلف شعرا، ادبا اور بڑی بڑی شخصیات سے

ملاقات کا احوال بھی اس کتاب میں بڑے اعلیٰ اور خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں اٹھنے والے بہت سے مسائل کی روداد بھی اس کتاب میں موجود ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح حضرت اقبال کی ذات سے بھی رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں اقبال کی زندگی کے آخری سالوں کی مکمل تصویر کشی کے ساتھ ساتھ اس وقت کی سیاسی، سماجی و معاشی صورتحال کی عکاسی کی گئی ہے۔ آٹھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ترتیب دینے میں مصنف نے جس عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اقبال کے چاہنے والوں کے لیے یہ ایک قیمتی تحفے سے کم نہیں، بقول ڈاکٹر اجمل شاہ دین: "علامہ اقبال ایک عظیم شخصیت تھے بلکہ عظیم شخصیات کس طرح کی ہوتی ہیں ان کی زندگی کیسی ہوتی ہے ہم انہیں عظیم کیوں کہتے ہیں، ان سب سوالوں کا جواب علامہ کی زندگی کے واقعات پڑھ کر ہوتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ خرم علی شفیق کے اعلیٰ تحقیقی کام کا میں پہلے سے مداح تھا، مگر اس کتاب کا مسودہ جیسے جیسے پڑھتا جا رہا تھا میرے سامنے علامہ کی زندگی کی حقیقی فلم چل رہی تھی۔ کیا عظیم آدمی تھے وہ! کیا ان کے اصول تھے اور کیا ان کی روایات تھیں۔"

آخر میں بس یہی کہوں گا کہ شاعر مشرق حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی زندگی کے مختلف واقعات کو ایک لڑی میں پرو کر کہانی کے انداز میں لکھنے کا فن خرم علی شفیق کے پاس ہے اور انہوں نے "اقبال کی منزل" لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ صرف اعلیٰ درجے کے اقبال شناس ہیں بلکہ فکرِ اقبال کے فروغ کے لیے نت نئی راہیں تلاش کرنے میں ہمہ وقت کوشاں و مصروف ہیں۔ اقبال کی سوانح حیات کے پہلے دو حصوں "اقبال کی جستجو" اور "اقبال کا راستہ" کی اشاعت کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آخر میں بیک سرورق خرم علی شفیق کی طرف سے تحریر کردہ "منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی" کے عنوان سے چند سطریں پڑھیں اور اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں کہ یہ اقبال کے چاہنے والوں کے لیے تحفۂ خاص ہے مصنف لکھتے ہیں: "یہ اس لحاظ سے علامہ اقبال کی پہلی مستند سوانح ہے کہ اس میں ہر ممکن حد تک دستاویزی شواہد سے معلومات حاصل کی گئی ہیں جبکہ پہلے کسی سوانح میں یہ خیال نہیں رکھا گیا اور زبانی روایات کو بھی حد سے زیادہ اہمیت دی جاتی رہی ہے اس کتاب میں علامہ اقبال کی زندگی کے بہت سے شاندار پہلو بالکل پہلی دفعہ سامنے آ رہے ہیں۔ پوری کتاب اس طرح مکمل لکھی ہے کہ آپ کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہے۔" اس کتاب کا "اقبال ایوارڈ" کے لیے نامزد ہونا بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ صحیح معنوں میں اس کی حقدار بھی ہے میری طرف سے مصنف کو ڈھیروں مبارکباد۔

◆◆◆

1990ء سے شائع ہونے والا پنجابی کا بین الاقوامی ششماہی جریدہ

کانگاں (مدیر: افضل راز)

پوری آب وتاب سے شائع ہو رہا ہے --- قیمت: -/800 روپے

ملنے کا پتہ: روزن بلڈنگ، ریلوے روڈ، گجرات (0300-9625108)

پنجاب رنگ

بشریٰ رحمٰن

صوفیانہ کلام

اوہنے پھڑ لیاں میریاں چوڑیاں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں

چوڑیاں وچ ساوا رنگ اے
ساوا رنگ میتھوں اُگھڑا اے
رنگ ساوا ہے جوبن والا
جیوڑا کھلوں کھلوں وسدا اے
میں کوڑا چکدی چوڑی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں!

چوڑیاں جمیاں سب رنگ رنگیاں
میرا تن ہے کھوٹ کپٹ بھرا
در در تے رلدی پھردی میں
میتھوں چنگا جھوٹ لیپ دا پیا
میں رلدی پھردی چوڑی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں!

میری ذات تے جیٹھی کالی اے
کالے عملاں دی رکھوالی اے
سب کرتوت نرالے میں
میرے متھے تے ٹھپ دی کالی اے!
میں چکڑ دا چکڑ چوڑی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں

میں تن کے جتیاں آلی ساں
کنڈ تیکراں تال لیالی ساں
باقی دا ماں گوایا تی
اک تھیسی ساں وی جالی ساں!
میں گونہیا تھیری چوڑی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں

میری ہوکر کنڈ کھلار دی اے
دلے تتی بیاڑی ہار دی اے
آسے پاسے لوکاں مار دی اے
خود اپنا آپ اُسار دی اے
میں جنگلی کملی چوڑی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں!

OOO

سلطان احمد علوی

O

پتہ کے گزرے موسم جیاتی پھر نہیں آیا
مرا ساون نہیں آیا ترا چیتر نہیں آیا
[illegible]
جیہڑا اک وی اک مرود شام میں گھر نہیں آیا
[illegible]
کھوں جر کے اج ہسے دا چتر نہیں آیا
[illegible]
ترے راہ وچ کوئی ویری کوئی نظر نہیں آیا
ویہڑے شہر دے کیتیاں تن ریشمی گھڑیاں
[illegible]
[illegible]
[illegible]

OOO

سرفراز سید

وارث جی دے نال

آل دوالے شہر دے اگ بلے ہے پر چھاویں دکھ
اوہ دیکھادے اج ہوئی دلوں لگ پئی دکھ

دل دریا تے اکھ سمندر [illegible]
اکھ اماں [illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

OOO

حنیف باوا

حدیقہ کیانی لئی ایک نظم

حدیقہ رانی
جدوں توں بولیں
اج تکوں آئے
میں تیرے سر تے رکھ چھاں
میکوں ولدے
کھل پئے گردے ہوون

جاں
دکھاوا دے تی
چھلی دی اکھ رانے اکھیں تیلی تیں
کوئی کوئی پلی کو کردی ہووے
حدیقہ رانی
جدوں توں
اپنے ہونٹاں نے
رکھے ہوئے کھول کے
کوئی سوہنا گیت الاپیں جیں
اج تکوں آئے بیٹھی
کئے دن راتیں گوری دی
سجا گیری دی جھیں جھیں جیں
کوئی اکھیں ہوکے لی سدا ہووے
حدیقہ نیلی جدوں توں
شاہ حسین جیاں لکھے شاہ دی

وی رنگ وچھوڑے دے وچ
کوئی کافی گئی ہووے

اوں
اج جھیں رنگ جاوا دے لیویں
اوہ صوفی تک
پھوراں جھیں ہوندے

پھر ساڈا دے
تے ویچ دے وچ
آ ونتے ہووان
اوں میں اکھواں رنگ رل کے
میری اس
ہنیرا کا تیجی دے
اصول سرلی دی جس نوں
چانواں مکھاں دے نال
پیار نہ ہووان
پھر توں ہے
لوک ٹیچیں دے آکھ رہیں نوں
اپنے گھمونی سر دی پالو دی پڑھ کے
اک لی ایک دے نال
ہووں وچ کھلارن کال
اج تکوں آئے بیٹھی
ایہہ پے وارے
تے گا کے گیت دی
قدم سنگ رل کے
کوئی گھوری دی پاں گئی بیٹھ سکے
سرلی دی والی حدیقہ ہی
توں تے ہی سال
توں تے بچیاں ایں

OOO

بشریٰ رحمٰن

کافی

ماہے نی!
میری تک پلی کرا دے
میرا ڈھولن گھر نہ آوے!
ماہے نی ——
میں کون ایہہ گل سمجھاوے
پلے پلڑ کے کوئی چند جاوے!
ماہے نی ——
کیوں چندرے لیکھ لکھائے
میں جاں بھرے روگ لگائے!
ماہے نی ——
میرا چاہن کھوا جانے
میں ڈنگھی رات ڈرائے!
ماہے نی ——
میرا جرم کوئی بتائے
کیوں پیار دے شہد چ جانے!
ماہے نی ——
میں جاں تھک گئی منتاں کردی
پانی اکھیں گئی ہو کے بھر دی!
ماہے نی ——
اک واری تو کے وَل جا
میرے چندے کیوں گئی کہے!

OOO

تبصرے آفتاب خان کے

مختصر تعارف

معروف شاعر، ادیب اور ماہر مبصر آفتاب خان کی شاعری کا مجموعہ ''شام'' شائع ہو چکا ہے اور متعدد کتابیں زیر طبع ہیں۔ متعدد تبصرہ ہائے کتب ''تخلیق'' کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ 2012 سے 2021ء تک 100 سے زائد کتب پر ان کے تبصرے ''تخلیق'' میں شائع ہوئے: ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم۔ شخصیت اور فن (ذوالفقار احسن)، ماضی اور حال (وحشی سعید)، حرفِ آغاز (ڈاکٹر اظہر جاوید)، تبصرے (پروین بخت قاضی)، سمندر میں ستارہ (عمران مشتاق)، بے قراری سی بے قراری (عزیز جبران انصاری)، اعتراف (اقبال ساجد)، آسمان میری مٹھی میں (وحشی سعید)، الاؤ کانہ کے چار درویش (مسلم شمیم)، بجھنگ قیرماں کے (حمید رازی)، گونگے کا خواب (طارق بلوچ صحرائی)، مراحل (امین راحت چغتائی)، ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت اقبال شناس (ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم)، پھر وہی دن کا اجالا (شاہین زیدی)، رشحاتِ نسیم سحر (نسیم سحر)، بازگشت (جمیل اطہر قاضی)، اشعار (حسین مجروح)، ریاستِ مدینہ اور پاکستان (ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم)، تجلیاں سے نور (ڈاکٹر ایوب ندیم)، علمی و ادبی جائزے (حسن عسکری کاظمی)، رنجِ رائیگاں (کرامت بخاری)، فرمودات عاصم بخاری (عاصم بخاری)، ایک تھیں چار پارہ (ڈاکٹر محسن مگھیانہ)، کلیات نسیم سحر (نسیم سحر)۔

مکلی میں مرگ (ناول)

مصنف : غافر شہزاد

صفحات: 207 قیمت: -/450 روپے ناشر: گلشن ہاؤس، لاہور

ڈاکٹر غافر شہزاد بنیادی طور پر ایک آرکیٹیکٹ ہیں۔ ان کا تعلق محکمہ اوقاف سے ہے۔ اس لیے وہ بے شمار مزارات کے ڈیزائن بنا چکے ہیں۔ قدیم آثار اور مزارات کا تذکرہ ان کے بیشتر افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ زیر نظر ناول میں بھی مزارات کے اردگرد گھومتی کہانی ہے جس میں آرکیٹیکٹ، صحافی، بابا مستان اور کچھ دوسرے کردار اپنی اپنی جگہ بہت مضبوطی سے کھڑے ہیں اور انہیں کے تانے بانے سے کہانی برق رفتاری سے آگے بڑھتی ہے۔ گرچہ ناول کے آغاز سے پہلے واضح طور پر یہ لکھ دیا گیا ہے کہ اس ناول کے تمام

کردار اور واقعات فرضی ہیں اور اسے صرف فکشن کے طور پر پڑھا جائے لیکن دراصل یہ بعض اصلی کرداروں کی کہانی ہے جسے فرضی نام دیے گئے ہیں اور ان جیسے بیشتر کردار ابھی ہمارے آس پاس موجود ہیں لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ناول یا افسانے اردگرد کے حقیقی کرداروں سے متاثر ہو کر لکھے جاتے ہیں۔ بہت سے کردار فرضی ہی تخلیق کیے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر کردار اپنے اردگرد سے لیے جاتے ہیں اور انھیں تھوڑا بہت تبدیل کر کے ناول کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ بھی اپنے ایک ناول میں لکھتے ہیں کہ "میں نے بھی انگریز ناول نگاروں کی طرح اپنے کتنے ہی چاچوں، ماموں، پھوپھیوں کو بیچا ہے۔ کتنے ہی دوستوں کو اپنے ناول کا کردار بنا کر ان ناولوں سے کمائی کی ہے۔" لہٰذا اگر عاقر شہزاد نے اپنے شہر میں موجود لوگوں کو فرضی نام سے پیش کیا ہے تو یہ کوئی مجرمانہ فعل نہیں بلکہ کسی ناول نگار کی ہنرمندی ہے کہ وہ زندہ جاوید افراد کو فکشن کا حصہ بنائے اور انھیں بہت خوب صورتی سے پیش کرے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا کہ اس ناول کی کہانی مزارات کے گرد ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں مرکزی کہانی تو دربار بی بی پاک کی ہے لیکن اس میں دیگر مزارات حضرت عثمان بن علی ہجویری، بابا فرید، شاہ حسین، میاں میر، عبداللہ شاہ بخاری، شاہ عنایت قادری، سید موج دریا، سرخ پوش، شاہ جمال کے علاوہ وارث شاہ کا بھی ذکر ہے۔ دیگر کئی ولی اللہ بھی کہانی کا حصہ بنتے ہیں مگر اصل کہانی بی بی پاک دامن کے مزار کی ہے کہ کس طرح یہ مزار بنا۔ اس میں کون مدفون ہیں اور گزشتہ کئی دہائیوں سے یہ کس مسلک کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر نو کے لیے ہونے والی کوششوں اور عدالتی کارروائیوں کی تفصیل بھی ناول کا حصہ ہے۔

اس کے علاوہ ناول میں کئی اور تاریخی واقعات بھی موجود ہیں مثلاً چند برس قبل بابا فرید کے مزار پر بہشتی دروازے سے داخل ہونے والے زائرین کے بھگدڑ سے ہلاک ہونے کا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے جس میں تقریباً سینتیس (37) افراد کی موت ہوگئی تھی۔ اسی طرح وارث شاہ کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں کہ کس طرح عقیدت مندوں نے ان کی قبر کو مزار کی شکل دے دی۔

"مٹی میں مرگ" دراصل ایک علامتی عنوان ہے۔ ناول کے کردار وہاں جاتے تو ہیں مگر کہانی کا مرکزی کردار آرکیٹیکٹ ارسلان وہاں تخیل میں ایک کردار ریاض صوف کی مرگ ہوتے دیکھتا ہے مگر وہاں ریاض صوف کی مرگ نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ ارسلان کی شکل میں وہ ایک بار پھر مزاحمت کے لیے زندہ ہو گیا تھا۔ ناول کی کہانی اسی کردار کی ذہنی کشمکش کے گرد گھومتی ہے اور اس کردار کا تعلق بھی آخر میں مزار بی بی پاک کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ ناول کے پہلے باب میں ناول نگار نے ایک سوال اٹھایا ہے جس کا ناول کے کرداروں سے بھی ربط پیدا کیا گیا ہے اور مزارات کی سیاست سے بھی اس کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عاقر شہزاد لکھتے ہیں کہ "صوفی کے لیے جسم اور روح دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک مرئی اور دوسرا غیر مرئی۔ ایک کے بغیر دوسرا جزو بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ روح اور جسم کے اس تعلق پر اختیار حاصل کرنے کے لیے صوفیا نے بے شمار ریاضتیں کیں، چلے کاٹے، وجد کیے، لیکن ابھی تک یہ راز سربستہ ہے کہ مر جانے کے بعد جسم فنا ہو جاتا ہے تو روح جسم کو چھوڑ کر کہاں جاتی ہے؟"

یہ سوال سارے ناول میں ساتھ ساتھ چلتا ہے اور تقریباً تین چوتھائی ناول ختم ہونے کے بعد یہ ایک اور طرح کے سوال کی جوابی شکل میں سامنے آتا ہے۔ عاقر شہزاد لکھتے ہیں کہ "مرنے والے کا وجود دفن ہو جاتا ہے لیکن اس کی زندگی کے متعلق ہونے والے لواحقین کے ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں۔ مرنے والا مرنے سے پہلے ایک ہوتا ہے مگر مر جانے کے بعد اس کے وجود کی شبیہیں لوگ اپنے ذہنوں میں

الگ الگ لیے پھرتے ہیں۔" اس سوال کے بارے میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر چوں کہ یہ مضمون نہیں تبصرہ ہے۔ اس لیے اسے یہ کہہ کر سمیٹ رہا ہوں کہ یہ ناول اس قدر دلچسپ ہے کہ اسے شروع کرنے کے بعد میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ اس کا ٹیمپو بہت تیز ہے۔ شروع کرنے کے بعد وقت کا احساس ہی نہیں ہوا کہ کب اس کا آخری صفحہ نمبر 207 آ گیا۔ صوفی ازم اور مزارات سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ ناول خصوصاً پسند آئے گا لیکن عام قاری بھی اسے پڑھ کر پورا پورا لطف اٹھا سکتا ہے۔

کتابیں اور یادیں

مصنف: غلام حسین ساجد

صفحات: 272 قیمت: -/600 روپے پبلشر: کتاب ورثہ اردو بازار لاہور

غلام حسین ساجد کا مستند حوالہ تو ان کے شاعر ہونے کا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی نثری کارکردگی خصوصاً تنقید نگاری بھی قابلِ ستائش ہے اس لیے یہ ان کی تنقید نگاری کی تیسری کتاب ہے۔ وہ خود کو تنقید نگار نہیں سمجھتے اسی لیے انہوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "میں کوئی بڑا نقاد ہوں نہ میں تخلیقات کو جدید ادبی تحریکوں کے تناظر میں دیکھتا ہوں۔ اس لیے یہ تمام تحریریں ایک خوش ذوق قاری کے ذہن پر مرتب ہونے والی کیفیت کی عکاسی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ میں نے کسی کتاب کو کیسا پایا۔"

حقیقت یہ ہے کہ کسی ادبی تحریک سے متاثر ہونے یا کسی ادبی تحریک کے تناظر میں نہ لکھنے کے باوجود ان کی تخلیقی صلاحیت بہت بلند سطح پر کھڑی ہے۔ وہ جس کتاب یا شخصیت پر لکھتے ہیں بالکل سچے دل سے اور خلوص کی گہرائی سے لکھتے ہیں۔ جو فن پارہ جس قدر معیار کا حامل ہوتا ہے اسے اتنا ہی بیان کرتے ہیں۔ نہ رتی بھر کم نہ ماشہ بھر زیادہ۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے اکتالیس مضامین لکھے ہیں جن میں کچھ کتابوں پر ہیں اور کچھ شخصیات کے اوپر لکھے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان اکتالیس افراد کے نام بتا دیے جائیں جو اس کتاب کا حصہ ہیں۔ کتاب کی ترتیب سے وہ نام یہ ہیں۔ محمد سلیم الرحمٰن، عبدالرشید، سعادت سعید، نجیب احمد، نسرین انجم بھٹی، ضیا اکرام، صابر ظفر، اشرف جاوید (2 مضمون)، ابرار احمد، جمیل الرحمان، محمود ناصر ملک، ضیاء الحسن، حمیدہ شاہین، فہیم شناس کاظمی، زاہد مسعود، شاہد ماکلی، احمد ساقی، عارفہ شہزاد، احمد خیال، رسائل نظامی، آفتاب جاوید، ابن حنیف، منیر نیازی، انیس ناگی، خان فضل الرحمان خان، مستنصر حسین تارڑ اور پروین شاکر۔

بلاشبہ ادب کی دنیا میں مندرجہ بالا شخصیات کا ایک اہم مقام ہے اور ان سب پر لکھ کر غلام حسین ساجد نے اپنا ادبی حق ادا کیا ہے۔ گرچہ اس کتاب کا ہر مضمون چار یا پانچ صفحات سے زیادہ نہیں لیکن محمد سلیم الرحمان کی نظموں پر تقریباً چھبیس صفحات کا مضمون ہے جس میں انہوں نے پینتالیس سال کی نظموں پر خیال آرائی کی ہے اور ان کے باطن میں اتر کر شاعر کے ویژن تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ واضح رہے کہ محمد سلیم الرحمان کی 1957ء سے 2001ء تک کہی گئی ایک سو چھتیس نظموں کا مجموعہ گزشتہ سال دسمبر 2020ء میں شائع ہوا

ہے اور غلام حسین ساجد نے اپنے مضمون میں ایک ایک نظم کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ایک پیراگراف میں وہ لکھتے ہیں کہ "اب تک کہی جانے والی نظموں کا لینڈ اسکیپ انسانی تہذیب کے بچپن سے مانوس ہونے کی کوشش کرتی ہوئی زمین ہے۔ بارش، ہار کی ڈگر سے گاؤں کو جاتی مسافت، کہانیاں، بکائی گاڑیاں، لالٹینیں، بدرنگ نیم اسیلے بچوں کی قبریں، دھندلے دن، ادھڑی کھیتیاں، رات الجھن اور سانس لیتی مٹی کی مانوس مہک"۔

غلام حسین ساجد نے اپنے مضامین میں لکھاری کی تحریر کو سامنے نظر آنے والی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ تحریر کے پس منظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھ کر اس کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ یوں وہ تحریر اور صاحب تحریر کو سمجھنے میں زیادہ کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے بارے میں حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں پڑھے گئے ایک مضمون میں وہ کہتے ہیں کہ "بہت سی عمومی باتیں اور اشیاء جو ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں آتی ہیں، تارڑ کی نوک قلم سے چھو کر اچانک خاص اور انوکھی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے میں نے طلسمی حقیقت نگاری کو بورخیس، مارکیز یا ایلو کو ایلو کے حوالے سے نہیں جانا یہ تارڑ کے یہاں پہلے سے موجود تھی۔"

غلام حسین ساجد کے لکھے گئے یہ مضامین نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کو وقار عطا کرتے ہیں بلکہ ان کی انفرادیت اور حسن و جمال کے وسیع نظریے رکھنے والے کو بھی اعتبار بخشتے ہیں اور ان مضامین سے یقیناً غلام حسین ساجد کے ادبی قد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

لیاقت کتب

مؤلف : ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

صفحات: 232 قیمت: 800/- روپے پبلشر: مثال پبلشرز فیصل آباد

سرگودھا کا دبستان اردو اپنے پختہ کار ادیبوں اور شاعروں کی بدولت ایک الگ پہچان رکھتا ہے اور ادبی لحاظ سے ایک زرخیز خطہ ہے جہاں علم و ادب کے شگوفے کھلتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اسی خطہ سرسبز و شاداب سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنی ہمہ جہت شخصیت کی وجہ سے ادب کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ ان کے ادبی کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ جہاں اور بہت سے تحقیقی و تخلیقی امور سرانجام دے رہے ہیں، وہیں ان کا یہ کارنامہ بھی ہے کہ وہ ہر سال موصول ہونے والی کتب پر بہت جامع اور مفصل تبصرہ کرتے ہیں جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے ہیں اور بعد ازاں انہیں کتابی شکل دی جاتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ان تبصروں پر مشتمل ہے جو کتابیں انہیں 2020ء میں ملی تھیں۔ ان میں سے جن شاعروں، ادیبوں کی کتابوں پر ڈاکٹر صاحب نے تبصرے کیے ان کے نام یوں ہیں: ڈاکٹر زاہد منیر عامر، مشفق خواجہ، محمد شمس الحق، ڈاکٹر سکندر حیات میکن، پروفیسر غازی علم الدین، ذوالفقار احسن، اکرم کنجاہی (پانچ کتابیں)، زاہدی بوجیراں، حمیرا اختر، فاروق عالم، محمد فیاض عادل فاروقی، محمد حسین ملک، ڈاکٹر محمد منور حسین، سید یحییٰ نقوی، ڈاکٹر محمد وسیم انجم (چار کتابیں)، مظہر محمود شیرانی، شاہ وحی الحق فاروقی (2 کتابیں)، محمد شرف حسین انجم، رفیع الدین ذکی قریشی (تین کتابیں)، پروفیسر ثاقب محمود گوندل، عثمان محمد

نیاز، کبیر بتول کھوکھر اور علی عباس چشتی۔ ان مصنفین کی کتابوں پر تو بعد میں بات کرتے ہیں پہلے مجھے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے پیش لفظ سے چند سطور نقل کر لینے دیجیے جو انتہائی اہم اور آج کے دور کا ایک بڑا المیہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ''آج سوشل میڈیا، کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی کے دور میں کتاب سے دوری پیدا ہو گئی ہے۔ ایسے قحط الرجال اور مادیت سے صرف نظر کرتے ہوئے کچھ اردو کے دیوانے ابھی مایوس نہیں ہوئے۔ حکومت کی طرف سے ادیبوں کے لیے کوئی حوصلہ افزا اقدام نظر نہیں آیا۔ وہ اپنی مدد آپ کے تحت گھر پھونک تماشا دیکھ رہے ہیں۔ کاغذ اور پرنٹنگ کا سامان بہت مہنگا ہو چکا ہے۔ یہی نہیں کتابوں اور رسالوں کی ترسیل کے لیے ڈاک خرچ تین گنا کر دیا گیا ہے۔ ایسے میں ادیب کو کتاب چھپواتے وقت سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عصر حاضر میں ایسے مصنفین کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اس مادی دور میں کتاب کی محبت اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔''

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے زیر نظر کتاب میں جن کتابوں پر بھی تبصرہ کیا ہے انہیں سرسری انداز میں نہیں دیکھا بلکہ ان کی روح کی گہرائی میں اتر کر ہر مصنف کی کتاب کے مافی الضمیر تک پہنچ کر اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور اتنی تفصیل سے کیا ہے کہ بعض تبصرے اپنی طوالت کی وجہ سے مضامین کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ مثلاً مشتاق خواجہ کی کتاب ''اردو کی مختصر آپ بیتیاں'' پر کیا گیا تبصرہ دس صفحات پر پھیلا ہوا ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے کتاب کا مکمل تعارف پیش کرنے کے بعد اس پر اپنی رائے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''4 جنوری 2000ء کو ان کے ایوان ادب کراچی میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ تین کمروں پر مشتمل ان کے گھر میں موجود لائبریری دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ کتابوں کی حسن آرائی اور ترتیب و تدوین وہاں آنے والے محققین کے لیے کسی لائبریری سے کم نہ تھی۔ پاکستان میں وہ لوگ جو اپنی ذات میں ادبی تحریک کا درجہ رکھتے ہیں ان میں مشتاق خواجہ بھی شامل ہیں۔''

اسی طرح ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے بعض دوسرے مصنفین کی کتابوں پر بھی طویل تبصرے کیے ہیں۔ اس کتاب میں سب سے زیادہ پانچ کتابوں پر تبصرہ اکرم کنجاہی کی کتابوں کو حاصل ہوا۔ اتفاق سے اکرم کنجاہی کی یہ پانچ کتابیں ان کی شفقت و محبت سے مجھ تک بھی پہنچی ہیں۔ اکرم کنجاہی کی کتاب ''نسائی ادب اور تانیثیت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہارون الرشید لکھتے ہیں کہ ''اکرم کنجاہی کا یہ تحقیقی کام دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ تاریخ نسائی ادب کے مؤرخ ہیں۔ انھوں نے ایک طرف نسائی ادب کی تاریخ مرتب کر دی ہے تو دوسری طرف ان خواتین کی تحریروں میں تانیثیت کو بھی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ تانیثیت اس وقت نہایت اہم موضوع ہے جس پر بہت سا کام ہو رہا ہے۔ اکرم کنجاہی نے عصر حاضر کی خواتین شاعرات اور فکشن رائٹرز کے ہاں بھی تانیثیت کو نہ صرف تلاش کیا ہے بلکہ اس پر نہایت مؤثر انداز میں تبصرے کیے ہیں۔ اس کتاب کی وجہ سے اکرم کنجاہی کی ادبی شہرت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔''

الغرض ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے تبصرہ نگاری ایک فریضہ سمجھ کر سرانجام دی ہے اور کسی بھی مصنف کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے [illegible] نہیں ہاری بلکہ ان خوبیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو خود مصنف کی نظر سے اوجھل تھیں۔ یہ تبصروں کی کتاب نہ صرف صاحب کتاب اور کتاب کا تعارف پیش کرتی ہے بلکہ یہ قاری کو ہر کتاب پڑھنے کی طرف راغب بھی کرتی ہے اور ان کتب کا مطالعہ کرنے کے شوق کو مہمیز بھی کرتی ہے اور یہ ڈاکٹر صاحب کے ادبی کام میں ایک اور اہم اضافہ بھی ہے۔

خاکہ گردی

مصنف : نسیم سحر

صفحات: 212　　قیمت: /500 روپے　　پبلشر: دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد

نسیم سحر بہت زود گو قلم کار ہیں۔ شاعری اور نثر دونوں میدانوں میں ان کی فتوحات بے تحاشہ ہیں۔ اس لیے شعری مجموعوں کے علاوہ ان کی نثری کتب کی تعداد بھی کافی ہے جن میں تنقیدی مضامین کے علاوہ زیر نظر کتاب خاکوں پر مشتمل ہے جس کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں 29 خاکے شامل ہیں۔ جن شخصیات پر یہ خاکے لکھے گئے ہیں ان میں سے چند بڑے نام یہ ہیں: ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خورشید رضوی، امجد اسلام امجد، سعید قیس، رؤف طاہر، اشفاق بدایونی، حامد اسلام خان، انورین طلعت، گلنار آفرین، پروین روحیلہ وغیرہ وغیرہ۔

نسیم سحر کے یہ خاکے گزشتہ پچیس برس میں لکھے گئے ہیں اور ان میں سے بہت سی شخصیات اب مرحوم بھی ہو چکی ہیں مگر وہ نسیم سحر کی تحریروں میں زندہ ہیں۔ ویسے تو خاکہ کا نام ذہن میں آتے ہی کسی مزاحیہ تحریر کا تصور ابھرتا ہے مگر نسیم سحر کی یہ تحریریں کہیں کہیں سنجیدگی کا رخ بھی اختیار کر لیتی ہیں اور بعض مقامات پر تنقیدی مضمون کا روپ دھار لیتی ہیں۔ پھر بھی انہیں خاکہ کہنا ہی مناسب ہوگا کہ ان میں بہر حال خاکوں جیسی شگفتگی اور لطافت بھی موجود ہے اور یہ خاکے پڑھتے ہوئے کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ جملے مختصر اور کاٹ دار ہیں اور مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے عمدہ الفاظ کا انتخاب کیا گیا۔ کتاب پر رائے دینے والوں میں ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، جمیل یوسف، ڈاکٹر معصوم الٰہی شیخ اور قمر الطاف شامل ہیں۔ جمیل یوسف اپنی رائے میں لکھتے ہیں کہ "میرے نزدیک کسی کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اگر آپ اسے پڑھنا شروع کر دیں تو پڑھتے ہی چلے جائیں۔ اس سے پہلے کہ مجھے پتا چلتا میں نسیم سحر کی کتاب کے ایک سو سے زیادہ صفحات پڑھ چکا تھا اور ابھی کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔"

جمیل یوسف کی بات سے سو فی صد متفق ہونا پڑتا ہے۔ ان خاکوں میں اس قدر روانی اور شگفتگی ہے کہ کوئی بھی خاکہ پڑھنا شروع کریں وہ آپ کو اپنے آخر تک بہا کر لے جائے گا اور آپ حیرت سے سوچ میں گم ہو جائیں گے کہ کب میں نے یہ خاکہ پڑھنا شروع کیا اور کب ختم کیا ہے۔ یہ کسی بھی نثر پارے کی بہت بڑی خوبی ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہ ہو اور اسے شروع سے آخر تک پڑھ کر دم لیا جائے۔ نسیم سحر کی یہ خاکہ گردی ان کی قلم پر مہارت اور نثر کی طہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق بھی ہیں اور ستائش کے حقدار بھی ہیں۔

لفظوں کا کھلیان (عذرا اصغر۔ شخصیت و فن)

مرتب : اشرف سلیم

صفحات: 336   قیمت: -/650 روپے   پبلشر: دستاویز مطبوعات، لاہور

عذرا اصغر عہد حاضر کی ایک مستند، باوقار اور مقبول افسانہ نگار، ناول نگار ہیں۔ ان کے اب تک سات افسانوی مجموعے، دو ناول اور یادنگاری پر ایک کتاب منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا ادبی سفر کم و بیش پچاس برس پر محیط ہے جس میں ان کے کام کے سراہنے والوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ ان میں ان کے قارئین کی داد و تحسین تو اپنی جگہ ہے اصل کام ان کے معاصرین کا ہے جنھوں نے ان کی تحریریں پڑھ کر اپنی رائے لکھت کی صورت میں عوام کے لیے پیش کی۔

نصف صدی کی یہ تحریریں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ کوئی دیوانہ اور اپنے کام سے لگن رکھنے والا ہی انھیں یکجا کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس کام کا بیڑا معروف شاعر اور پبلشر اشرف سلیم نے اٹھایا اور انھوں نے ادھر ادھر سے ان تمام مضامین کو سمیٹا جو مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک مشکل اور کٹھن کام تھا جسے اشرف سلیم کی ہمت و جرأت نے آسان کر دیا اور یوں یہ تمام مضامین یکجا ہو کر "لفظوں کا کھلیان" میں سما گئے۔ اب اس میں یوں بھی نہیں ہوا کہ اشرف سلیم نے تمام مضامین اٹھائے اور انھیں کتابی شکل دے دی بلکہ انھوں نے ان کی درجہ بندی کی، ابواب بنائے جس میں شخصیت، افسانہ نگاری، ناول نگاری، یادنگاری کے الگ الگ باب میں ان سے متعلق مضامین کا گلدستہ سجایا جس سے ایک خوبصورتی پیدا ہو گئی۔

عذرا اصغر کے فن اور شخصیت پر لکھنے والی ہستیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بڑے بڑے شاعر ادیب نے ان کے افسانوں پر سیر حاصل مضامین تحریر کیے، ناولوں کے پرت کھولے اور اپنی بساط کے مطابق بہترین رائے کا اظہار کیا۔ یہ سب اس کتاب کا حصہ ہیں لیکن سب کے نام درج کرنا ممکن نہیں۔ یہاں میں چند سینئر شاعروں ادیبوں کے نام لکھوں گا جنھوں نے عذرا اصغر کو خراج تحسین پیش کیا۔ ان میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر رشید امجد، میرزا ادیب، حیدر قریشی، اظہر جاوید، نشاط فاطمہ، منظور حسین یاد، سید رضی زیدی، الطاف فاطمہ، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، صبا اکرم، ستار طاہر، ڈاکٹر سعادت سعید، شاہد شیدائی، شہناز مزمل، جان کاشمیری، اسرار زیدی، غالب عرفان، جمیلہ شبنم، ملک مقبول احمد، قیصر طراز، عنبرینہ جاوید اور اشرف سلیم کے نام شامل ہیں۔ اتنی بڑی بڑی شخصیات کا عذرا اصغر کو خراج تحسین پیش کرنا ان کے ایک بڑی ادیبہ ہونے کی واضح نشانی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید جنھوں نے عذرا اصغر کی متعدد کتابوں پر دیباچے مقالے تحریر کیے۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ: "احمد ندیم قاسمی اپنی زندگی میں انھیں سند قبولیت ان الفاظ میں دے گئے تھے "عذرا اصغر کے افسانوں کی نمایاں خصوصیت ان کا گہرا مشاہدہ اور اپنے مشاہدات کے اظہار میں ان کی بے خوفی کے ساتھ ساتھ ان کا مہذب طرز بیان ہے" اسی مضمون میں آگے چل کر ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ "افسانہ 'پت جھڑ کا آخری پتا' میں یہ احساس حسرت بن کر ابھرتی ہے۔ میں نے بیلوں کے شیشوں سے باہر جھانکا۔ شام تیزی سے سیاہی ہو رہی تھی۔ فواروں کی ننھی ننھی بوندیں جیسے میرے وجود کو بھگونے لگیں۔ پانی کے بکھرتے چھینٹوں نے مجھے گدگدایا، میں نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔"

باقر اشرف سلیم نے یہ کتاب مرتب کر کے نہ صرف علامہ اصغر کو بہترین خراج پیش کیا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے تحقیق کے دروازے بھی کھول دیے ہیں۔ یقیناً علامہ اصغر کے بارے میں لکھے گئے کچھ اور مضامین بھی کہیں پوشیدہ ہوں گے۔ اشرف سلیم انہیں بھی تلاش کر کے کتابی روپ عطا کریں۔

نظم کے ساحل پر

شاعر : اکمل شاکر

صفحات: 176 قیمت -/500 روپے پبلشر: بک کارنر جہلم

اکمل شاکر پاکستان کے ایک دور دراز علاقے ناصلی سے تعلق رکھتے ہیں اور طویل عرصے سے شعر و ادب سے وابستہ ہیں مگر یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں نظموں کے ساتھ ساتھ چند غزلیں بھی شامل ہیں۔ انہوں نے نظم اور غزل ہر دو صنف میں اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے اور خوب صورت شاعری پیش کر کے ایک عمدہ شعری مجموعہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اکمل شاکر کی نظمیں زندگی دل کی آہیں بھی ہیں اور محبت میں سانس لینے کا سندیسہ بھی۔ وہ عصر حاضر پر بھی بات کرتے ہیں اور سماجی رویوں کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ ان کی ایک مختصر نظم ''پیاس'' ملاحظہ ہو ''میرے دل کے برتن میں / پانی جھمکار رہتا ہے / ایک کنواری پیاس مری ہمسائی تھی — / لیکن کل میں پانی بھرنا بھول گیا / ایک صدی تک مرنا بھول گیا۔ اکمل شاکر کی غزل بہت مضبوط ہے۔ اس میں استعاراتی سطح پر اور تخلیقی سطح پر تازگی کی لہر موجود ہے۔ ان غزلوں میں ماورائیت اور رومانیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ شاعر کے دل کی ہلکی ہلکی آنچ شعروں کو تپتی دھوپ میں سائبان عطا کر کے ایک الگ با نہ خوشبو فراہم کرتی ہے جس کے زیر سایہ ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں:

قضا سے جب مت گئیں آبادیاں / آنکھ میں اک وحشت منظر رکھ دیا

ایسے پڑے ہیں درد کے چھالے زمین پر / تارے کسی نے جیسے اچھالے زمین پر

زعفرانی لطف تھی کمرے کی / اس کی خوشبو تھی اور تھا وہ بھی

میں غزل کے شہر سے حرفوں کے موتی ڈھونڈ لوں / دیکھنا ہر شعر میرا معتبر ہو جائے گا

مجھے محسوس کر کے دیکھ لو تم / میں دھڑکن کی طرح دل میں بسا ہوں

تمہارا برف سے ہوں آج لیکن / بدن تو پھر بھی جلتا جا رہا ہے

اکمل شاکر کی غزل ان کی نظم سے بہت آگے کی چیز ہے۔ نظمیں بھی شاندار ہیں مگر غزل میں انہوں نے مضامین و خیال میں جدت پیدا کی ہے اور ہر غزل میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو معنوی سطح پر انفرادیت کے حامل ہیں اور ان سے تازگی کا احساس ابھرتا

ہے۔ ان کے ایک منفرد شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں

کون دے گا ہم کو شہرِ لامکاں میں اک مکاں　　　کل سنا ہے شہر سارا ہی فنا ہو جائے گا

تم جو چاہو کر سکتے ہو (بچوں کی نظمیں)

شاعر: عاصم بخاری

صفحات: 128　　قیمت: -/300 روپے　　پبلشر: ایم ارسلان پبلشرز، ملتان۔ لاہور

بچوں کے لیے لکھنا قدرے مشکل امر ہے کہ ان کے لیے کچھ لکھنے کے لیے ذہنی سطح پر بچوں کی ذاتی استعداد کے مطابق ہونا پڑتا ہے۔ تبھی سہل اور عام فہم شاعری لکھی جا سکتی ہے جسے بچے آسانی سے سمجھ سکیں۔ عاصم بخاری بچوں کے ایک ہر دلعزیز قلم کار ہیں اس لیے انھوں نے بچوں کو کتب بینی کی طرف راغب کرنے کے لیے یہ آسان اور عام فہم نظمیں کہی ہیں اور انھیں کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں بچوں کی اڑسٹھ (68) نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ یہ نہایت سبق آموز ہیں۔ اکثر نظموں میں کوئی نہ کوئی نصیحت کی گئی ہے یا پھر بچوں کو ان کے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر وطن کے حوالے سے اس میں کافی نظمیں ہیں جو جذبہ حب الوطنی کو ابھارتی ہیں اور بچوں میں اپنے وطن پاکستان کی محبت پیدا کرتی ہیں۔ ایک نظم ''پاکستان'' کے دو شعر دیکھیے:

اس کا کوئی بال نہ بیکا کر پائے　　　خونِ جگر سے اک تعمیر ہے پاکستان
قائد اعظم اور اقبال کے خوابوں کی　　　روشن چاہت کی اک تعبیر ہے پاکستان

ان نظموں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ہر موضوع پر نظم مل جاتی ہے۔ حمد اور نعتؐ کے علاوہ اس میں شامل چند نظموں کے عنوان ملاحظہ کر کے کتاب کی اہمیت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ نظموں کے عنوانات میں میں نادار اک بچہ، یتیم بچے کی فریاد، دعا، بیوہ کا دکھ، کام کی کے آنا، بیٹیو، پاک فضائیہ کے نام، دریا ابھی بچی ہے، عید قرباں آئی، بچو، بچوں کی تربیت، دادا، دادی، چھٹی گئے سکول، وطن ہمارا، زندہ قومیں، فوگ کا موسم، مزدوری ہی تو ہے، 23 مارچ، ماں کی باتیں، دریا کی سیر۔ عاصم بخاری کی یہ کتاب بچوں کے ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ انھوں نے بچوں کے بچپن کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نہایت سادہ اور دل کش نظمیں لکھی ہیں جنھیں پڑھ کر بچے لطف بھی اٹھا سکتے ہیں، کچھ سیکھ بھی سکتے ہیں اور اپنے ملک کے بارے میں بہت کچھ جان بھی سکتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''میں بچہ ہوں مجھ کو قلم چاہیے'' کے دو بند ملاحظہ کریں:

کرم مجھ پہ بس اس قدر کیجیے　　　کہ پڑھنے کی خاطر کتب دیجیے
میں بچہ ہوں مجھ کو قلم چاہیے
مری عمر تو ہوٹلوں کی نہیں　　　مجھے بھیجیے اسکول میں تم کہیں
میں بچہ ہوں مجھ کو قلم چاہیے

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ بہت عزیز و محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

"تخلیق" دسمبر 2021ء موصول ہوا اور اس میں رکھے ہوئے تین عدد خوبصورت ماسک بھی موصول ہوئے جو کرونا وائرس سے حفاظت کے لئے آپ کا نہایت قابل تعریف و قابل تقلید اقدام ہے۔ ہر دو عنایات کے لئے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ گزشتہ ماہ اگست سے میں ایک دکھ میں مبتلا، بیٹے کی وجہ سے کچھ لکھنے پڑھنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہو سکی۔ تاہم "تخلیق" میں شامل حمد و نعت اور خطوط (انجمن خیال) اور دو عمدہ تحریریں پڑھیں جو بہت پسند بھی آئیں۔ جن میں "قرطاس و کینوس" از محترم اسلم کمال جو میرے پسندیدہ لکھاری ہیں اور دوسری تحریر پروفیسر نور کمال شاہ کی "با کمال لوگ لاجواب کارنامے" اور یہ تحریریں نہایت پسند آئیں۔ ان کی پسندیدگی کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ مختصراً یہ اسلم کمال صاحب کی تحریر کا اختتامی پیرا بے حد پسند آیا اور نور کمال شاہ کی تحریر کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا گیا اور چٹکیاں لیتا رہا، ماشاء اللہ خوب لکھا ہے۔ محترم اسلم کمال کی تحریریں تو کمال ہوتی ہی ہیں اب اس فہرست میں ایک کمال اور شامل ہو گئے یعنی پروفیسر نور کمال شاہ اپنے نام کی طرح ان کی تحریریں بھی کمال کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے کتابوں پر تفصیلی تبصرے بھی پسند آئے۔ اب تک یہی کچھ پڑھ سکا۔ دراصل گزشتہ ماہ میری اہلیہ بقضائے الٰہی وفات پا گئی ہیں اور اب تک تعزیت اور فاتحہ کے لئے آنے والوں کی آمد و رفت جاری ہے جن کی پذیرائی کی مصروفیت بھی رہتی ہے۔ اس لئے لکھنے پڑھنے کا وقت نہیں ملتا لیکن آپ کی عنایات کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔

سلطان سکون (ایبٹ آباد)

﴿2﴾ برادرم سونان اظہر صاحب آداب!

مزاج گرامی قدر! آپ کا ارسال کردہ "تخلیق" باصرہ نواز ہوا۔ چیدہ چیدہ تخلیقات پر نظر پڑی۔ جناب حسن عسکری کی نعت اور ڈاکٹر انور سدید کا مضمون پسند آئے۔ جناب مسلم شمیم کا مضمون جو کہ جوش صاحب کے حوالے سے ہے بہت اچھی کاوش ہے۔ اگرچہ جوش صاحب کو بھلا دیا گیا ہے، ان کے حوالے سے کام نہیں ہوا اور نہ ہی ان کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام دوبارہ چھپ سکا ہے۔ ہمیں اپنے رفتگاں کو یاد کرتے رہنا چاہیے۔ برادرم آغا گل کا افسانہ "بیاہ کار" پسند آیا۔ آغا گل صاحب بہت اچھے اور سلجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں، خصوصاً بلوچستان کے حوالے سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ غزلوں کے حصے میں جناب انور شعور، صابر ظفر، آصف ثاقب، جناب ناصر علی سید اور ضیا حسین کی غزلیں پسند آئیں۔ یادیں، طنز و مزاح اور تجزیے کا حصہ بھی وقیع ہے۔ ڈاکٹر شفیق آصف اور نوید مرزا نے اپنا کام اور نام اپنی محنت سے متعارف کرایا ہے۔ ہارون الرشید صاحب کے تبصرے بہت جاندار ہوتے ہیں۔ وہ بہت ہی

پڑھے لکھے اور تحقیقی شخص ہیں۔ اس دفعہ "آغاز سخن" اور "بیاض نظر" پر ان کے تبصرے خوب ہیں۔ "انجمن خیال" کو مزید بڑھانا چاہیے کہ "Feed back" سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ پرچہ کتنا پڑھا جا رہا ہے۔ پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے اور انشاء اللہ مزید لکھوں گا۔ یہ مختصر تاثر قبول کیجئے۔ آپ نے جناب اکبر جاوید کی نشانی کو قائم رکھا ہوا ہے اور یہی آپ کی بڑائی اور آپ کے وقار کو معیار اور اعتبار بخشے گا کہ والدین کی خدمت اور انھیں یاد رکھنا عبادت ہے۔

کرامت بخاری (لاہور)

(3) پیارے سوہان اکبر جاوید صاحب!

تازہ "تخلیق" اپنی جملہ رعنائیوں اور توانائیوں کے ساتھ ملا۔ ٹائٹل کے سحر میں کھو سا گیا ہوں۔ اداریہ بکھرے سامنے بکھرے ہیں اسٹور پیچ کی باتیں کہہ گیا۔ آپ لاجواب لکھتے ہیں۔ حمد و نعت سر آنکھوں پر۔ مضامین، شاعری تخلیق کے مزاج اور اسباب کے عین مطابق ہیں۔ خدا کے فضل سے آپ نے "تخلیق" کے معیارات کی خوب پاسداری کی ہے۔ غنی خان، ہر دل عزیز پشتو شاعر کے خصوص میں خالد عبداللہ صاحب کا مضمون پیارا پیارا ہے۔ آپ جانیں پشتو شاعری تغزل، تصوف، تجسیم اور تفکر کی بادشاہ ہے۔ غنی خان منجھے ہوئے شاعر تھے۔ حق مغفرت کرے وہ پشتو کے مقبول شاعر تھے۔ اردو شاعری پر بھی ان کی اچھی نظر تھی۔ "تخلیق" کے افسانے دل کو لگتے ہیں۔ ایک سے ایک اچھا لکھنے والا موجود ہے۔ پر تبصرہ ڈاکٹر ہارون الرشید کے تبصرے پڑھنے کو ملے۔ دل "شاد کام" ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کی مجھ پر خاص نظر عنایت ہے۔ وہ اپنی کتابیں مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔ پاکستان، قائد اعظم اور علامہ اقبال ان کی دلی اور روحانی قدروں میں شامل ہیں۔ اشرف ذکی اعوان صاحب کی مہربانی ہے وہ مجھے نگاہ میں رکھتے ہیں۔ انتظار باقی صاحب نے میرے شعر میں کمپوزنگ کی نشان دہی کی ہے۔ حضرت باقی اشعار کی قدر و قیمت کو خوب جانتے ہیں۔ شعر کی غلطی برداشت نہیں کرتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کبھی کبھی اچھے سے اچھا تخلیق والا بھی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ اب کے بھی میرا ایک شعر کمپوزنگ کو دعائیں دے رہا ہے۔ مصرع ہے: "گھروں میں شور ہے چڑیوں کی چہچہاہٹ کا"۔ سرفراز تبسم نے ایلس آترک کی اٹک بھری یاد دلائی ہے۔ میں ایلس آترک کے ڈرامے باقاعدگی سے دیکھتا تھا۔ یہ ڈرامے بڑے اعتبار سے پسندیدہ تھے۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

(4) سوہان بیٹے! اجو! سدا سکھی رہو!

"تخلیق" تحفوں کے ساتھ موصول ہوا۔ تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔ اداریہ تم بڑا بھرپور لکھتے ہو۔ حقیقتاً معاشرے، خاص طور پر ادب میں پھیلی خامیوں کی طرف توجہ دینی چاہیے، آواز اٹھانی چاہیے۔ ڈاک کے بڑھتے ہوئے نرخ ہوشربا ہیں۔ ہماری کسی حکومت نے بھی ادب کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ ادب اور ادیبوں سے توقعات تو بہت رکھی جاتی ہیں مگر ادب کے فروغ اور ادیبوں

کی بہبود پر توجہ کوئی نہیں دیتا۔ بڑی ہی افسوس ناک صورتحال ہے۔ بہت خوشی ہوتی ہے تم ڈاکٹر انور سدید صاحب کو یاد رکھتے ہو۔ ادب پر ان کے بہت احسانات ہیں۔

عذرا اصغر (لاہور)

45۔ عزیزم محترم سلطان اظہر صاحب!

نومبر کے شمارہ میں میرے مکتوب میں مجھے ساہیوال کی بجائے جھنگ میں قیام پذیر دکھایا گیا ہے۔ ع ''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے''۔ ڈاکٹر انور سدید کے تذکرے کے بغیر تاریخ ادب اردو نامکمل اور ادھوری ہے۔ آپ نے قتیل شفائی کا ذکر چھیڑا تو اس کی شاعری کے احسانات گنوا کر نہ صرف قتیل کی عظمت کا اعتراف کیا بلکہ اس فیض شاعری سے اپنے آپ کو آسودگی فراہم کرنے کا ذریعہ بھی قرار دیا۔ افسوس کہ کچھ لوگ انور سدید کی بلند مرتبت شخصیت میں کیڑے تلاش کر کے اپنے کردار کی کسی کمزوری کو واشگاف کرتے ہیں۔ یہ غیر مجلسی رویہ ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے کلچر کے پس منظر کا جائزہ لے کر اپنے مخصوص ذہنی پس منظر کے تحت شہروں کے وجود کو انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی ایک شکل قرار دیا ہے۔ سید اسرت بخاری نے خطوط کی ترسیل کے ذرائع کا ارتقا، جیسا وقیع، جاندار اور نہایت جامع مضمون لکھ کر ہماری معلومات میں خاص اضافہ کیا ہے۔ ریشمی رومال کی تحریک، اللہ وقال اور اس کے مختلف مراحل کی نشاندہی کر کے احساس دلایا ہے کہ آزادی کی خاطر ہمارے بڑوں نے بڑی معرکہ آرائی کی ہے۔ مسلم شمیم صاحب نے جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی برات' میں اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے مذہبی معتقدات کے بیان میں غیر محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ کاش وہ یہ بھی بتاتے کہ انہوں نے اپنے چالیس عشق جس طرح مزے لے لے کر بیان کیے ہیں کیا وہ حد سے زیادہ غیر محتاط اور نہایت نامناسب طرز ادا کے ذیل میں نہیں آتے۔ اسلم انصاری صاحب کی نظم فرنٹ لائن سپاہیوں کو سلام میں فکری اور فنی اعتبار سے نہایت قابل تحسین ہے۔ اسے مقصدی شاعری کا مرقع قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج کل حسب معمول گراں قدر افسانوں میں اچھا حصہ مزید ڈالتے جا رہے ہیں۔ ''سیاہ کار'' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ اسلم سحاب ہاشمی نہ صرف ایک بہتر شاعر ہیں بلکہ اپنی افسانہ نگاری کے کمالات سے بھی ہماری داد و تحسین کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ آوازوں کی میزان میں تو نیز خودکش حملہ آوروں کی ذہنی کیفیت کو فکری و فنی خوبصورتی سے بیان کرنے کا حق ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر شکیل آصف نے میرے شاگرد رشید ڈاکٹر اکرم عتیق کی نظمیہ کائنات کا خوبصورت محاکمہ کیا ہے۔ الغرض نومبر کا شمارہ اچھی نگارشات نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ خدا کرے یہ تسلسل قائم رہے۔

سیّد ریاض حسین زیدی (ساہیوال)

46۔ برادر عزیز سلطان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ جب بھی آتا ہے، مجھے گویا ایک نشست میں دو کے مزے آ جاتے ہیں کہ جہاں آپ بھی اس کی ترتیب و تزئین میں ہر صفحے پر اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے ہیں وہیں اظہر جاوید مرحوم بھی اپنی یادوں کے ساتھ لازمی طور پر موجود محسوس ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ جہاں میرے دل میں پہلے کئی عشروں سے صرف اظہر جاوید کی جگہ ہوتی تھی وہ خالی تو نہیں ہوئی مگر اس کے ساتھ

ساتھ ہی بہت سی جگہ آپ نے بھی گھیر لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جگہ ایسے ہی نہیں بن گئی، آپ نے ''تخلیق'' کو اظہر جاوید کی پالیسی پر مزید بہتر انداز میں چلا کر ادب کی تخلیق اور ترویج کی ذمہ داری پوری تندہی سے ادا کر کے ہی یہ جگہ حاصل کی ہے۔

تازہ شمارہ نومبر 2021 کو اول تا آخر پڑھ چکا ہے۔ الحمد للہ بصارت کے مسائل کے باوجود درمیان میں کچھ عارضی سا تعطل رہا۔ تھے ایک بہت سینئر مہربان دوست نے ایک ادبی جریدے میں اپنے خط میں یہ لکھ کر حسب توفیق میرا دل دکھایا ہے کہ میری بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ختم ہو گئی ہے۔ شاید اپنے ان بچے اور خطوں میں دوسروں کی عزت کا خیال نہ رکھنے کے سبب وہ مدتوں سے 'تخلیق' سے محروم پا رہے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بصیرت اور بصارت دونوں میں اضافہ فرمائیں اور وہ ایسے ہی دوستوں کا دل دکھاتے رہیں۔ آج میں منظومات پر پسندیدگی کا اظہار تو کروں گا مگر خواہ مخواہ جگہ گھیرنے کے الزام سے بچنے کے لیے منتخب اشعار لکھنے سے گریز کروں گا۔ نظموں میں بشریٰ رحمن کی نظم کے علاوہ پروین شیر اور شمرو زوبیر کی نثری نظمیں اچھی لگیں۔ نثری نظم کو مقبول بنانے میں ایسی ہی تخلیقی زرخیزی والی نظمیں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ''فرحت اللہ بیگ کا سلام'' پیش کر کے ہم سب کی جانب سے قرض ادا کیا ہے۔ حصہ غزل میں انور شعور، صابر ظفر، محمود شام، آصف ثاقب، قمر رضا شہزاد، ڈاکٹر ایوب ندیم، ڈاکٹر اسحاق وردگ، عائشہ مسعود، ممتاز راشد لاہوری، ناصر علی سید اور نجمہ عثمان کی غزلوں کے کچھ شعروں نے مجھے اپنی جانب متوجہ رکھا۔ ''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'' پر عمل کرتے ہوئے یہاں آپ کی توجہ اداریہ ''پہلی بات'' میں دہرائے جانے والے ضابطے کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جہاں کہا گیا ہے کہ 'تخلیق' کو بھیجی جانے والی نظم یا غزل سات سے آٹھ اشعار تک ہی ہونی چاہیے لیکن اسی شمارے میں اس اصول کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ امین راحت چغتائی مرحوم اور صابر ظفر کی غزلیں چودہ چودہ اشعار پر مشتمل ہیں جبکہ ممتاز راشد لاہوری کی غزل کے اشعار 10، رشید آفرین کی غزل کے اشعار 9، انتظار باقی کی غزل کے اشعار 12 اور رفیق بھٹی کی غزل کے اشعار 9 ہیں۔ اگر آپ کوئی پالیسی یا اصول وضع کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ یہ ہر شاعر پر لاگو کیا جائے۔

ڈاکٹر انور سدید مرحوم کا غیر مطبوعہ مضمون ''میں قتیل شفائی کا احسان مند ہوں'' ماہنامہ ''تخلیق'' کے ریکارڈ روم سے نکال کر شائع کر کے آپ نے ایک اہم کام کیا ہے۔ اپنے خون جگر سے تحریریں لکھ کر فوت ہو جانے والے ادیبوں کی ایسی تخلیقات شائع کر کے محفوظ کرنا ایک بڑی ادبی خدمت ہے۔ جناب سرفراز تبسم نے انکشاف سے ''ڈاکٹر ڈینس آئزک کہاں ہیں ---؟'' کے عنوان سے ایک معروف ڈرامہ نگار کے بارے میں لکھ کر دکھ میں مبتلا کر دیا کہ یہ عظیم قلم کار ڈیمینشیا کی بیماری کے تحت اپنی یادداشت کھو بیٹھے ہیں۔ یادداشت کا کھو جانا عام انسان کے لیے بھی بہت بڑی محرومی ہوتی ہے مگر کسی قلمکار کے لیے یہ بیماری اس کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقات پڑھنے والوں کے لیے بھی محرومی کا سبب بنتی ہے۔ اس بیماری کے سنگین مسائل کا مجھے ذاتی احساس ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے میری اہلیہ بھی اسی بیماری میں مبتلا ہے، جس کا اثر خود میری تخلیقی زندگی پر بھی پڑا ہے کہ اس کے علاج کے سلسلے میں کافی وقت ادھر دینا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم تازہ شمارے میں سات کتابوں پر تبصروں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے لکھنے کی رفتار دیکھ کر مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے، اور یہ تبصرے پڑھنے کے بعد مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد ہی قلم اٹھاتے ہیں، اور تبصرے میں تنقیدی نوعیت کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ جب ان کی تصنیف کردہ یا ترتیب کردہ کتابوں کی تعداد دیکھتا ہوں تو مزید حیرت ہوتی

ہے کہ ایک آدمی کتنے متنوع موضوعات پر اور کس قدر کمال کے ساتھ لکھ رہا ہے۔ یہ لکھتے ہوئے مجھے آپ کا یہ اعلان یاد آ گیا کہ انجمن خیال میں تخلیق ایوارڈ 2021ء کے لیے ادبی شخصیت کا نام تجویز کیا جائے تو میرے خیال میں اب وقت ہے کہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو اس سال کا تخلیق ایوارڈ دیا جائے، کہ میری نظر میں پاکستانیت، قائد اعظم اور علامہ اقبال کے حوالے سے ان کی تصانیف کی تعداد ہی اس اہم ایوارڈ کا انہیں حقدار ٹھہراتی ہے۔ بشریٰ رحمن کے پنجابی ناول "چانگاں" کی پہلی قسط پڑھی اور مزہ آ گیا۔ اس قدر کہ اب دوسری قسط کا انتظار ہے۔ جناب سید ریاض حسین زیدی نے اپنے خط میں حمد و نعت کے لیے مختص صفحات میں اضافہ کرنے کا مشورہ دیا ہے اور اس کا جواز بھی انہوں نے بجا طور پر یہ دیا ہے کہ "یہ اصناف تمام اصناف پر حاوی ہیں، پسندیدہ ہیں اور ان کی طرف لکھنے کار رجحان فروغ پا رہا ہے لہٰذا ادارہ "تخلیق" وسعت کا مظاہرہ کرے۔" میں اس بارے میں حمد و نعت سے وابستہ ہونے کے حوالے سے اپنی آواز بھی ان کی آواز کے ساتھ ملاتا ہوں۔

نسیم سحر (اسلام آباد)

67) قابلِ فخر سونان اظہر جاوید، سلامتی ہو

بوجوہ یعنی کچھ ذاتی مصروفیات، صحت کے مسائل اور ملک سے باہر رہنے کی بنا پر گزشتہ دو تین شماروں میں شمولیت سے قاصر رہا، معذرت خواہ ہوں۔ شمارہ جون 2021ء ڈاکٹر رشید امجد توقع سے بڑھ کر ہے۔ گوشۂ ڈاکٹر رشید امجد نے محترم ڈاکٹر صاحب کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں محاسبہ کا تصور اگر سرے سے ناپید نہیں تو یہ سچ ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یا شاید اب بھی ایک کمرشل انڈسٹری کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایسے میں "پیسے لے کر لکھ دینے والے بہت سے مبصر حضرات کا محاسبہ کون کرے؟" کھوٹوں کی اس دنیا میں سچ کہنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔

رزق، ملبوس، مکان، سانس، قرض، مرض، دوا　　　منقسم ہو گیا انساں انہی افکار کے بیچ

جناب حسین عسکری کا بھی حمد یہ شعر

مجھ میں کیا وصف ہے ایسا بھی کہ تو نے یا رب　　　دل میں مخلوق کے ڈالی ہے محبت میری

محترمہ بشریٰ رحمن کا نعتیہ شعر

ہزار کوہاں تے عشق چڑھے　　　جنہاں نے ترنا اوہ تر ای چڑھے

بہت اچھے لگے۔

محترمہ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے بجا فرمایا "افسانہ واقعات و حوادث کے تسلسل کا نام ہے جس میں کردار، مکالمہ، ماحول، وقت، فضا اور منظر نگاری لازمی جزو ہیں۔" "انکشافِ ذات کا مرحلہ ہو یا تخلیق کا، تنہائی اور خاموشی میں جنم لیتی ہے" محترم رشید امجد کو اس کا بدرجہ اتم ادراک حاصل تھا۔ ان کے افسانوں کا اصل حوالہ علامتی ہونا ہے۔ بقول ان کے "دھند گہری ہو جائے تو چیزوں کے درمیان، کھو جانا تو ہو ہی جاتا ہے۔" آپ کے افسانوں کی پہلی شناخت، انسان کی عدم شناخت اور اس کے تشخص کے حوالے سے

ابھری۔ بسا اوقات رشید امجد کے اختتامی مکالمے کرداروں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ کائنات سے مکالمہ افسانے کی ذات میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بعض افسانے مکمل طور پر اور بعض جزوی طور پر ان کی ذاتی زندگی کی ہی روداد کا تاثر چھوڑتے ہیں۔ وہ حتی الامکان الفاظ کے کم سے کم استعمال کے حامی اور اس پر عمل پیرا رہے ہیں۔ جہاں ایک لفظ اپنا مفہوم بیان کر سکتا ہو وہاں جملے کی کیا ضرورت؟" ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب نے مختصراً ان کا سوانحی خاکہ خوبصورت انداز میں نذرِ قارئین کیا ہے۔ ان کی ادبی کارکردگی پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ بقول ڈاکٹر ہارون الرشید وہ افسانوں میں فلیش بیک کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں معاشرتی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے عصرِ حاضر سے ہم آہنگ اور عصری آگہی کے بیدار شعور کا حصہ ہیں۔ ان کا سفرِ زیست جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم سے عبارت ہے۔ بقول ڈاکٹر ہارون الرشید "ڈاکٹر رشید امجد ادب کا کوہِ ہمالیہ تھے"۔ فن کار مر جاتا ہے لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دیتا۔ ڈاکٹر رشید امجد کے حوالے سے آغا گل نے بڑی خوبصورت بات کی ہے "ہمارا فلیش بیک تو ہمزاد کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی پسند و ناپسند کی نظریاتی عینک لگائے رکھتے ہیں" دیگر مضامین بھی قارئین کے لئے اپنے اندر بہت کچھ سموئے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق کا "تزویج" بہت ہی خاصے کی چیز ہے۔ "ہر ایک کے پاس صرف خوف کی یا پھر خوراک کی حس موجود ہے۔" "کوئی عمل فائدہ حاصل کرنے یا نقصان سے بچنے کے دائرے سے باہر نہیں۔ نتیجہ یہ کہ 20 فیصد ذہین ترین اور طاقتور ترین لوگوں نے 80 فیصد کم ذہین، کند ذہن اور کمزور لوگوں کو اسفل السافلین بنا رکھا ہے" انہوں نے اس حوالے سے اپنی تازہ غزل درج کی ہے جس کے درج ذیل اشعار سیدھے دل میں اترتے چلے گئے۔

درندوں سے ابھی تک سوچ تاتاری نہیں نکلی ۔۔۔ مہذب ہو کے بھی اندر کی خونخواری نہیں نکلی

شہنشاہیں تو ہو گئیں دربار سے باہر ۔۔۔ مگر درباریوں کی خوئے درباری نہیں نکلی

یہ اور محترم اظہر جاوید کی غیر مطبوعہ بہت ہی خوبصورت غزل قارئین کی نذر کرنا قابلِ قدر ہے۔ دو شعر نذرِ قارئین

باقی بچے جو سال وہ گزریں گے اس طرح ۔۔۔ چہرے سے تیرے صبح لوں، زلفوں سے شام لوں

شہرت ہی کیا ہے پاؤں میں دولت کا ڈھیر ہو ۔۔۔ اظہر جو مصلحت سے کبھی میں بھی کام لوں

"کیوڈ سقمی" نے آغا گل کے ہر افسانے کی طرح میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ منفرد انداز، عام ڈگر سے ہٹ کر بہت ہی خوبصورت کہانی۔ محترمہ تسلیم کوثر نے اپنے افسانے "دیا" میں بہت ہی خوبصورت بات کی ہے۔ "گھر برابری سے نہیں، سمجھوتے سے چلتے ہیں۔ گھر ضد اور مقابلے سے نہیں برداشت سے بنتے ہیں۔" حصہ غزل ہمیشہ کی طرح بہت ہی جاندار ہے۔ اپنی پسند کے چند اشعار نذرِ قارئین:

اپنے حبیب و جز معاذ اللہ ۔۔۔ ہم خدا بندگاں ہیں کیا کیا کچھ

(انور شعور)

ہم اُن کے کچھ نہیں جنھیں مسند نشیں کیا
یوں گھر گئے ہیں اپنی پریشانیوں میں ہم
(امین راحت چغتائی مرحوم)

پہنچ گیا ہے مری خواب گاہ تک قیصر
کسی کے ہاتھوں دیے سے دیا جلایا ہوا
(نذیر قیصر)

پہنچنے کے لئے جو مجھ کو یہاں لائے ہیں
میں یہاں اُن کا قرضدار بھی ہو سکتا ہوں
(ممتاز راشد لاہوری)

اشرف ذکی اعوان (چکوال)

﴿8﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ستمبر 2021ء کا "تخلیق" قیس مالک کے تعاقب کے ساتھ ذاتی موصول ہوا۔ بہت شکریہ! ابھی تو ڈاکٹر رشید امجد نمبر (جون 2021ء) کے مضامین کی مسحور کن خوشبو کے حصار سے بھی نہیں نکلا تھا کہ تازہ شمارے کے سرورق نے مجھے ان کی مسرت سے آشنا کر دیا۔ سب سے پہلے حصہ مضامین پڑھنا شروع کیا۔ ڈاکٹر انور سدید، مسلم شمیم، ڈاکٹر جمیل حیات، ظفر سپیل اور اسلام عظمی کے مضامین نے میری معلومات میں بے تحاشا اضافہ کیا اور ادبی ذوق اور روح کو تسکین ملی مگر سرفراز تبسم (انگلینڈ) کا مضمون "ڈاکٹر ذکیس آخر کہاں ہیں؟" پڑھ کر مایوسی اور اداسی کی شدید دھند میرے چاروں طرف چھا گئی تو میں نے رسالہ بند کر کے آنکھیں موند لیں اور سوچنے لگا کہ اتنے اچھے اور مشہور ڈرامہ اور فلم کا رائٹر آج وطن کی مٹی سے دور کس حال میں پڑا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ انھوں نے 2000ء میں اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا ہجرت کیوں کی جبکہ یہ وقت ان کی شہرت کے عروج کا تھا۔ حالات کچھ بھی ہوں اور ہجرت جبری ہو یا اختیاری۔ ہائے ہجرت ___ ہجرت ہی ہوتی ہے۔ نئی سرزمین، نئے لوگ، نیا ماحول اور نئی روایات اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بسی ہوئی پرانی تہذیب، اپنا ماضی، اپنا ملک، اپنا شہر اور اپنے لوگ اور اپنی روایات اور مٹی کی خوشبو کی گہری جڑوں کو دیمک لگنا ___ انسان اندر سے توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ غور کریں اگر آج آپ کو اپنے وطن میں ضروریات زندگی معاشرے کے معیار کے مطابق دستیاب ہوں، سماجی انصاف اور جان و مال کو تحفظ حاصل ہو اور اردگرد کے ماحول میں امن اور سکون سے رہ رہے ہوں تو کس حساس آدمی یا فنکار کا دل چاہے گا کہ اپنا ملک، اپنا گھر، اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر دیارِ غیر میں تنہائی کا عذاب جھیلے۔ حالات کے جبر اور مجبوریوں کی وجہ سے ایک اور مشہور ڈرامانگار اور فلم ساز عاشر عظیم بھی کینیڈا میں اپنے وطن کی محبت میں تڑپ رہا ہے۔ فنکاروں کی ملک سے جلاوطنی کسی المیے سے کم نہیں ہے۔

ادب کے لیے حکومت کی انتہائی سرد مہری کے اس دور میں "تخلیق" کا ہر شمارہ تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوتا ہے اور اس کی مسلسل اشاعت کسی کارنامے سے کم نہیں ہے۔ اداریہ "اپنی بات" میں جس طرح آپ آج کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں وہ کسی کہنہ مشق مدیر کے مقام سے کم حیثیت کے بندے کا روگ نہیں ہے۔ افسانوں میں ابھی تک صرف آنا گل، محترمہ عذرا اصغر، نوین روما اور

وحشی سعید کے افسانے پڑھ سکا ہوں جو بہت پسند بھی آئے اور انھوں نے متاثر بھی کیا۔ ساتھ ہی ہارون الرشید تبسم صاحب کے سات نئی کتابوں پر زبردست تبصرے بہت ہی محنت اور لگن سے لکھے گئے ہیں جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ شمارے کے باقی مندرجات آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں۔ آپ کی صحت اور حوصلے کیلئے دعا گو۔

آصف عمران (لاہور)

﴿9﴾ محترمی سلام مسنون!

خوبصورت فیس بکس کے ساتھ ستمبر کا "تخلیق" موصول ہوا۔ شمارہ اول تا آخر یادگار تحریروں کا حامل ہے۔ حمد، نعت روح کو تازگی بخشتا ہے۔ اللہ لکھاریوں کو جزا دے۔ مرحوم ڈاکٹر انور سدید کا قتیل شفائی پر لکھا مضمون دونوں حضرات کے ادبی رشتوں پر ایک طائرانہ نظر ہے۔ باقی مضامین بھی اپنے اندر گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ خصوصاً پروفیسر محمد جلیل الرحمن کا این میری شمل پر لکھا مقالہ قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اس مضمون میں جہاں مصنف نے مس شمل کی تصوفانہ زندگی پر روشنی ڈالی ہے وہیں "Nightingales under the Snow" کے چیدہ چیدہ اقتباسات کے اردو ترجمے سے مضمون کو وزن دار بنایا ہے اور اس کے انگریزی ترجمے کی مہارت پر صوفی شکر پروفیسر احمد سعید کرمانی کی محنت کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ظفر جبیل کی "ارنسٹ ہیمنگوے اور وداع جنگ" بھی ایک خوبصورت تحریر ہے جس میں "A Farewell to Arms" کی سمری کے ساتھ ارنسٹ ہیمنگوے کی زندگی اور اس کی خودکشی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ The oldman and Sea کے ذکر نے اس مضمون کی قدر میں اضافہ کیا ہے۔ تمام افسانے خوبصورت ہیں۔ آغا گل صاحب کا "سیاہ کار" بلحاظ اسلوب منفرد افسانہ ہے۔ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔ انتظار باقی صاحب نے میری تحریر "میں ایک شکر خاتون کا شوہر ہوں" کو پسند کیا ہے۔ اس حوصلہ افزائی پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

محمد اسلم (لاہور)

﴿10﴾ محترم سلطان اظہر جاوید صاحب!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کا مبارک دن ہے۔ ہر طرف ایک جوش و ولولہ دکھائی دے رہا ہے۔ تمام مسلمان اپنے اپنے انداز سے رسول پاک کی شان میں نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اللہ ہمیں ان کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تخلیق ستمبر 2021ء ملک ادبی دلکشی کے ساتھ طلوع ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید مرحوم کا مضمون "میں قتیل شفائی کا احسان مند ہوں" تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے لیے یوں بھی دلچسپی کا باعث ہوا کہ میں نے کالج دور میں جو پہلی کتاب خریدی تھی وہ قتیل شفائی کا شعری مجموعہ "گفتگو" تھا۔ ان کے کئی اشعار میرے دل کے بہت قریب ہیں اور ہیں دیکھیے:

جھوٹا نہیں میں آج بھی آداب جوانی　　میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

دنیا میں قتیلؔ اس سا منافق نہیں کوئی — جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

کلام کی اشاعت اور اپنی کتاب ''شعور و نواز'' پر تبصرے کے لیے ممنون ہوں۔ 'تخلیق' میں شامل متنوع مضامین اور دیگر تخلیقات نظم ونثر نے بہت لطف دیا۔ آپ کی کاوشوں کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ سلامت رہیں!

ڈاکٹر بدر منیر (جوہر آباد)

(411) پیارے بھائی سونان!

تخلیق، تخلیق اور بس تخلیق۔ یہ اظہر جاوید مرحوم اور سونان اظہر جاوید کے لیے اللہ پاک کا خاص تحفہ ہے جس نے اظہر جاوید کو امر کر دیا ہے اور سونان اظہر جاوید کو باکمال بنا دیا ہے۔ ستمبر کا شمارہ 2021 نظروں کے سامنے ہے اور آپ سے ہم کلام ہوں۔ اس بات سے خوش ہوں کہ آپ مجھے یاد رکھتے ہیں اور پہلی فرصت میں شمارہ ارسال کرتے ہیں۔ شمارہ ہر لحاظ سے بھرپور ہے۔ حمد و نعت کا حصہ برکت اور رحمت سے لبریز حسب معمول دیدہ زیب ہے۔ مضامین میں ڈاکٹر انور سدید مرحوم کا مضمون سحر انگیز ہے۔ انھوں نے قتیل شفائی کے حوالے سے خوبصورت باتیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی نے تاریخ کے دریچے میں جھانکتے ہوئے تہذیبی سفر کا جائزہ لیا ہے۔ جوش ملیح آبادی پر مسلم شمیم کی فکر انگیز تحریر بھی خوب ہے۔ اگرچہ اس میں تنقید سے زیادہ تحسین کا عنصر نمایاں ہے پھر بھی ہمیں ایک بڑے شاعر سے متعارف کراتا ہے۔ جون ایلیا بھی ایک قابل ذکر شاعر ہیں لیکن اس مضمون میں محنت کی ضرورت ہے کسی بڑے شاعر پر لکھتے ہوئے مطالعہ کا گہرا اور وسیع ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر شکیل حیات نے جناب حامد سراج مرحوم کو محبت کے پھول پیش کیے ہیں۔ ہم سب کی محبتیں اور دعائیں حامد سراج مرحوم کے لیے ہیں۔ منظومات میں رنگین بھی ہیں اور پیچیدہ بکھر بھی۔ کہیں آزاد نظم آ جاتی ہے تو کہیں نثری، نثری نظم سے یک دم رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ذہن اور دل کی تان ٹوٹ جاتی ہے۔ غزلوں میں امین راحت چغتائی، صابر ظفر، قمر رضا شہزاد، شہباز انور خان، شبیر ناقد اور ڈاکٹر ایوب ندیم اور دیگر بہت سے اچھے نام۔ حصہ غزل میں جو اشعار بہت پسند آئے ان میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کبھی اشرافیہ گنگ اہل زبان — کھو چکا شہر کا شہر ہی بانکپن

(محمود شام)

فلک سے ایک اشارہ مجھے بلاتا ہے — جو اس کے پاس قرینہ ہے جھلملاہٹ سا

(آصف ثاقب)

ڈاکٹر ایوب ندیم کی پوری کی پوری غزل موجودہ دور کا نوحہ ہے۔ انسان کی بے بسی کا ثبوت ہے۔ لاچارگی جسم سے ہوتی ہوئے ذہن پر چھا چکی ہے۔ ڈاکٹر ایوب ندیم عام آدمی کی داخلی کیفیت کو زبان دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

سوچ کی راہ گزر بے سایہ — جیسے سورج کا سفر بے سایہ
اڑ گئے خواب پرندوں کی طرح — آنکھ میں اتری سحر بے سایہ

ڈاکٹر صاحب دعا گو ہیں رب جلال سے کہ ہم تو بے بس ہیں ہماری مدد فرما۔

اے خدا! چاہیے رحمت کا سحاب ہو گیا ہے یہ بنجر بے سحاب

یادیں کے حصے میں اسلام عظمی کا مضمون جو "تخلیق" کے بانی جناب اظہر جاوید مرحوم سے متعلق ہے۔ اگر چہ سرسری نوعیت کا ہے لیکن پھر بھی ان سے وابستہ چند یادیں ہمارے سامنے لاتا ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں اظہر جاوید کی حیات اور ادبی خدمات پر پی ایچ۔ڈی کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت کے ان ادبی کارناموں پر سنجیدہ اور عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے۔ ادبی گروہ بندیوں کی وجہ سے اتنی بڑی قد آور ادبی شخصیت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مگر اب ان کی تخلیقی شخصیت کے ہمہ گوشے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ میں آپ اور تخلیق دونوں کے لیے دعا گو ہوں۔

فیصل شہزاد (لاہور)

﴿12﴾ محترم جناب سونان اظہر صاحب!

امید ہے سب اہل خانہ و اہل ادب بالکل خیریت سے ہوں گے۔ آپ کی کاوشوں، محنتوں اور ادب پروری کے سبب "تخلیق" کی "تخلیق" کا عمل جاری و ساری ہے۔ یہ سارے عوامل آپ کو وراثت میں ملے ہیں جسے آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے سنبھال رکھا ہے اور ہمیں اسی بہانے اچھا اور معیاری ادب پڑھنے کو مل رہا ہے۔ ماہنامہ "تخلیق" کی آمد سے بہت دن ادبی حوالے سے اچھے گزر جاتے ہیں۔ جہاں دن اچھے گزر جاتے ہیں وہاں کیا کیجیے کہ ہمارے کئی ساتھی رفتہ رفتہ اس دنیا و جہان سے ایسے جہاں گزر جاتے ہیں۔ تخلیق میں بطور مزاح نگار ہمارا ساتھ دینے کو معین قریشی تھے وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہیں کے ہو گئے۔ ہم نے انہیں اپنی آخری (فی الحال) ہزاروی کتاب "مسکین کو مانگے چاند" (ہزاروی سے مراد ہزار صفحات پر مشتمل) بھیجی تو فرمانے لگے بھائی میں تو اس کو جب تک لفظ لفظ پڑھ نہ لوں تبصرہ نہیں لکھوں گا۔ یہ ان کی عادت بھی تھی جو ان کے تبصروں میں چاہے وہ انگریزی یا اردو میں ہوں سچائی اور انفاق بولتی تھی۔ تاہم ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ تبصرہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ہم سوچنے لگے کہ ان کا تبصرہ وصول کرتا تو کتاب کا سارا غم کر لیتے مگر اللہ کے حکم ماننے کا کیا پتہ کب آ جائے۔ ہم تو اس دوست کے لئے دعا گو رہے ہیں کہ ان کی مغفرت ہو جس کو آپ نے ہماری یہ کتاب تبصرے کے لئے بھجوائی ہے۔ معین قریشی نے بہت پہلے کراچی آرٹس کونسل میں محمود شام کی نگرانی میں ہونے والی ہماری کتاب (سفرنامہ جرمانیہ) "ذرا سی ان دا ایسٹ" کی تقریب رونمائی میں مضمون پڑھا تھا۔ اس تقریب کی صدارت سید ضمیر جعفری نے فرمائی تھی۔ وہ اکادمی ادبیات کے بین الصوبائی دورے کے وفد کے ساتھ ہمارے ہاں جھنگ میں ہمارے ہسپتال فیصل مگھیانہ میموریل ہسپتال میں بھی تشریف لائے تھے جہاں پورے وفد کی میزبانی کا ہمیں شرف حاصل ہوا تھا۔ ان کی وفات سے چند روز قبل ہم نے انہیں فون کیا تو کسی اور نے اٹھایا اور بتایا کہ وہ کینسر کے موذی مرض کا شکار ہونے کی وجہ سے شدید علیل ہیں۔ ہماری خواہش کے باوجود ان سے بات نہ ہو گی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

﴿13﴾ مکرمی و محترمی سوہان اظہر جاوید صاحب!

اللہ کرے آپ مع متعلقین خیریت سے ہوں۔ ''تخلیق'' کا نیا شمارہ ستمبر 2021ء نظر نواز ہوا۔ خوبصورت اور معیاری تحریروں سے آراستہ و پیراستہ تخلیقی دعوت مطالعہ دے رہا ہے۔ مندرجات میں ''پہلی بات'' توجہ طلب ہے۔ سوشل میڈیا کے اس دورِ جدید میں ڈاک کے اخراجات کا بڑھ جانا کسی حد تک سمجھ میں آتا ہے۔ مراسلت تو ویسے ہی کم ہو گئی ہے بالخصوص درسی کتب کی ترسیل بذریعہ ڈاک ختم ہو چکی ہے (بوجہ کرونا) جبکہ محکمہ ڈاک کے اہل کار تعداد میں پہلے سے قدرے زیادہ ہیں۔ اس تفاوت کی وجہ سے محکمہ ڈاک پر اضافی بوجھ پڑا یعنی آمدن کم اور اخراجات زیادہ (تنخواہوں کی مد میں) یوں دیگر محکمہ جات کی طرح یہ محکمہ بھی خسارے میں چلا گیا۔ تبدیلی اسی کا نام ہے۔ ابھی دو سال باقی ہیں آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا (سچی بات) آپ کا اداریہ بڑی حقیقت ہے۔ شرائط ساری قابل قبول ہیں۔ میں جناب ریاض حسین زیدی کی اس بات سے متفق ہوں اور اس کی بھرپور تائید کرتا ہوں کہ حمد و نعت کے صفحات بڑھائے جائیں (حمد و نعت تک) اگر زیادہ نہیں تو ایک کے بجائے دو کر دیں۔ جناب خالد اقبال یاسر کی حمد کے ساتھ پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب اور محترم نسیم سحر کی نعت ایمان افروز ہے۔ عقیدت و شیفتگی کے جملہ رنگ نمایاں ہیں۔ مضامین کا مطالعہ معلومات افزا ہے۔ استفادے کی مختلف صورتیں بہم ہیں۔ ہر تحریر کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ کہانیاں رنگا رنگ نقوش چھوڑتی ہیں۔ موضوعات اور عنوانات کی حسین ترجمانی نظم نگار حضرات کی خوبی اور عبارت کی صاف نکھائی ہے۔ تبصرے اور تجزیے صاحب کتاب اور تبصرہ نگار ہر دو اصحاب کے لئے باعث طمانیت و راحت ہیں۔ گویا خواب حقیقت کے روپ میں۔ ''گلشن خیال'' میں خیالات و تصورات، احساسات و جذبات اور اختلافات کی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ (دلچسپی اور دل بستگی سے معمور) غزلیات کے حصے میں البتہ آپ کا انتخاب اور اوراق اوصاف مات کھا گئے۔ ماہ جون کی پانچ غزلیں ہو بہو زیر نظر شمارے میں دیکھ کر تعجب ہوا یقیناً آپ اس کی وضاحت کریں گے۔ اس باب میں ممتاز و سکہ بند شعراء کا کلام غزل اپنی جبلی اور محبوب صنف سخن کو چار چاند لگا گیا۔ غزل کا حقیقی لطف اسی کو کہتے ہیں۔ افسانوی ادب پہ کسی دوسری رائے کا احترام کیا جائے گا۔ اب اجازت!

تصور اقبال (اٹک)

﴿14﴾ سوہان صاحب ——— السلام علیکم!

پروفیسر محمد جلیل الرحمن کا مضمون بعنوان ''شعلۂ تہہ برف'' ستمبر 2021ء کے شمارے میں شائع ہوا جو ڈاکٹر این میری شمل کی نظموں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ ہر پڑھنے والا یہ مضمون پڑھ کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کس کی تعریف کی جائے!! نظموں کی خالق ڈاکٹر این میری شمل کی، ان کے مترجم پروفیسر احمد سعید ہمدانی کی یا پھر پروفیسر جلیل الرحمن کی۔ ڈاکٹر این میری شمل کی لطیف جذبوں پر مبنی شاعری پر نظر جاتی ہے تو دل تعریف و ستائش کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔ پروفیسر احمد سعید ہمدانی کے تراجم دیکھتے ہیں یا ان کی علمیت اور روحانیت کے بارے میں پڑھتے ہیں تو سر بار عقیدت سے جھک جاتے ہیں لیکن اس مضمون کا تیسرا کونا پروفیسر محمد جلیل الرحمن ہیں جن کے ذریعے سے ہم ان دونوں شخصیات کے ان پہلوؤں سے متعارف ہوئے ہیں جو کچھ دیر پہلے تک ہمارے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھے۔ یہ پروفیسر محمد جلیل الرحمن کا سحر طراز قلم ہے جس کی بدولت ہم ڈاکٹر این میری شمل کے انداز گفتگو اور تصوف اور اسلام کے

بارے میں ان کے خیالات جان پائے۔ فارسی شاعری کی سرپرستی، مولانا روم، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور بلھے شاہ کی روحانیت نے کس طرح ڈاکٹر این میری شمل کے انداز فکر کو تبدیل کیا اور انہیں مغرب میں مشرق کا نمائندہ بنایا۔ یہ سب اس مقالہ نما مضمون کے نمایاں اوصاف ہیں۔ پروفیسر جلیل الرحمٰن فلسفے کے استاد ہیں اس لیے تخلیق ہو یا تخلیق کار، شخصیت ہو یا اس کا فن، وہ فلسفہ و منطق سے کام لیتے ہوئے کسی نہ کسی طور سے اس کے نہاں خانوں تک رسائی حاصل کرنے اور قاری کو بھی شریک سفر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے دل خواہ این میری شمل کی شاعری کے ساتھ دھڑکتے ہوں اور سر پروفیسر احمد سعید ہمدانی کی علمیت اور روحانیت کے سامنے خمیدہ ہوں لیکن ہم خود پروفیسر جلیل الرحمٰن کے سامنے سراپا سپاس ہیں کہ انہوں نے ہماری ضیافت طبع کے لیے آج عظیم شخصیات کا انتخاب کیا اور ہمیں ان کی شخصیت و فن کے تصوف اور روحانیت کے ذخیرہ گوں میں لپٹے ہوئے پہلوؤں سے، کہیں افسانوی اور کہیں تجزیاتی انداز میں متعارف کروایا ہے۔

پروفیسر کاشف نعمانی (فیصل آباد)

﴿15﴾ محترم و مہربان اظہر جاوید صاحب!

''تخلیق'' کا شمارہ ستمبر 2021ء کا موصول ہوا۔ کچھ طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اس کا مطالعہ کر کے اب ذرا طبیعت سنبھلی ہے تو اسے مطالعہ میں لایا۔ اس تازہ شمارے میں ادب کے رنگا رنگ پھول پڑھنے کو ملے جو ادبی فضا کو معطر کرنے میں اہم کردار ادا کر گئے۔ ہم جیسے ادب کے قارئین کے لئے اس سے بہتر اور معیاری ادب پڑھنے کو کہاں ملتا ہے۔ حصہ مضامین میں ڈاکٹر انور سدید، سید نصرت بخاری، مسلم شمیم، حسن عسکری کاظمی، عمران ستار اور پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن جیسے قلم کاروں کی تخلیقات نے متاثر کیا۔ حصہ افسانے میں سیج آہوجہ، آغا گل، محمد طارق علی، روحی سعید، اسلم سحاب ہاشمی کے افسانے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے افسانے جدید اور روایت کا سنگم ہے۔ ہر افسانہ دل و دماغ کے دریچے کھولتا ہے اور قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ افسانہ اپنا دیرپا اثر چھوڑ گیا۔ حصہ غزل میں غزلیات عمدہ بھی ہیں۔ چند اشعار نذر قارئین ہیں جو مجھے اچھے لگے:

حیرت ہے، دل میں گُل تمنا کیسے اُگا ہے　　　یہ بیج اپنے ہاتھوں سے ہم نے بویا نہیں تھا
(انور شعور)

یہ جگہ نہیں میرے، یہ قصبہ نہیں میرا　　　میں جس میں ہوں موجود وہ زمانہ نہیں میرا
(قمر رضا شہزاد)

خوابوں کی تعبیر ادھوری رہتی ہے　　　میری ہر تصویر ادھوری رہتی ہے
(اظہر جاوید)

ماجد وفا عابدی (راولپنڈی)

(16) کمرشل سوال ابھر رہا ہے!

ماہنامہ "تخلیق" / دسمبر 2021ء اپنے وقت پر نظر نواز ہوا۔ حسب معمول اچھی ادارت کا مظہر۔ اداریہ دو اہم نکات کو اجاگر کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ عام اور رجسٹرڈ ڈاک، دونوں کے نرخ ہوش ربا حد تک جا چکے۔ مزید برآں زیادہ ادائیگی کے باوجود عام ڈاک کی طرح رجسٹرڈ ڈاک کا بھی گم ہو جانے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ مہنگی شرح کا اثر خود ڈاک سسٹم کے خلاف بھی ہے۔ لوگ اس سسٹم سے خاصا دور ہو چکے کیونکہ باہمی رابطوں کے لیے موبائل ایسا سستا ذریعہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ یہ کہ ادبی رسائل کو حکومتی مدد حاصل نہیں۔ بیرون ملک کے لیے بذریعہ ڈاک کتب / رسائل کی ترسیل تو فلاں حد تک مہنگی ہو چکی ہے۔ راقم کو یاد ہے کہ مدیر محترم کئی بار پہلے بھی ان مسائل کو موزوں کے ساتھ اپنے اداریوں کا موضوع بنا چکے ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کی تجویز یہ ہے کہ تمام مدیران کرام کا ایک وفد گورنر / وزیر اعلیٰ سے ملے لیکن اس ملاقات سے پہلے ایک پریس کانفرنس بلائی جائے یا کسی اچھے برقی چینل پر مشترکہ آواز اٹھائی جائے۔ ادبی پرچوں / کتابوں کی اہمیت کو اجاگر کر کے ڈاک کے اخراجات میں ریلیف لینا چاہیے اور سرکاری اشتہاروں میں کوٹہ حاصل کیا جائے ورنہ جو ہو رہا ہے وہی ہوتا رہے گا اور ایک ایک کر کے ادبی پرچے بے موت مرتے جائیں گے۔

حصہ مضامین میں ڈاکٹر انور سدید مرحوم کا لکھا مضمون "میں تخلیقی شفافی کا احسان مند ہوں" قاری کے لیے تحفۂ خاص ہے۔ "غنی خان" پر دل عزیز پشتو شاعر" خالد عبداللہ کا لکھا ایک مختصر لیکن معلوماتی مضمون ہے۔ مرحوم کی شخصیت اور فن پر زیادہ کام ہونا چاہیے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ چیدہ چیدہ علاقائی / ملکی نابغہ ادیبوں / شاعروں پر تحقیقی مضامین لکھے جائیں جو پرچے کی رونق بڑھانے کا باعث بنیں گے۔ ایسی کاوشیں نہ صرف ادبی بلکہ قومی اہمیت کی حامل ہوں گی۔ اب ہمیں صرف اردو کے لیے ہی نہیں دیگر قومی زبانوں کے لیے بھی کام کرنا ہوگا اور اس سلسلے میں متعلقہ ادب نواز ہستیوں سے ہاتھ ملانے ہوں گے۔ قومی یکجہتی کا راستہ ادب سے ہو کر جاتا ہے۔

افسانوں میں آغا گل کا "سیاہ کاز" لاجواب ہے۔ حسب معمول بلوچستانی مٹی، آب و ہوا اور وہاں کی انسانی سرشت میں گندھا ہوا اس کا انجام قاری کی سوچ سے یکسر مختلف اور اختتامی پیراگراف کے جملے قاری پر "ضرب طلاق" کا سا کام کرتے ہیں۔ عذرا اصغر کی تحریر "عجب کہانی" میں ایک ایسا مسئلہ لے کر سامنے آئیں جس کا آج کل کے اکثر بزرگ پنشنروں کو سامنا ہے۔ انھوں نے پرچے کے صرف دو صفحات میں یہ حقیقت جملا بیان کر دی کہ بینکوں میں عام لوگوں سے بالعموم اور بزرگ پنشنروں سے بالخصوص بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ مصنفہ کو جو واقعہ پیش آیا، وہ بظاہر "معمولی" سہی لیکن اپنی سطور میں انھوں نے ایک تکلیف دہ مشکل کا اظہار کیا۔ ان کے قلم سے افسوس و دل شکنی جھلکتی نظر آتی ہے۔ بینکوں کی آن لائن ڈیلنگ مناسب تجربے کے بغیر ہر ایک کو دشوار لگتی ہے، خصوصاً اے ٹی ایم کا استعمال۔ بزرگ پنشنرز ہاتھ میں ٹوکن لیے ساتھ کھڑے نوجوانوں سے مدد کی درخواست کرتے نظر آتے ہیں جبکہ بینک کا کوئی کارندہ ان کی مدد کے لیے موجود نہیں ہوتا۔ منجھے ہوئے کہانی کار رحمٰن سعید قریب لکھتے ہیں۔ ان کی تازہ تحریر "نئی سڑک، نئے لوگ" سری نگر کے شہری ماحول سے نکلی خوب ہے۔ اس کا موضوع آف بیٹ ضرور ہے لیکن قاری کے لیے دلچسپی کا عنصر رکھتا ہے اور انجام اس کے لیے چونکا دینے والا ہے۔ ایسا ہی تحیر ان کی انجم سلیم سحاب ہاشمی کے خوبصورت افسانے "آوازوں کی ہجران" میں بھی نظر آیا جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

حصہ شاعری میں امین راحت چغتائی کی غزل ان کی پختہ گوئی اور مجلسی شخصیت کی یاد دلاتی ہے۔ ایک شعر / ایک گلدستہ ہے تو

جانے کہاں سے آ گیا! اب چوکی طلب نہیں رکوچے سے بھی گیا نہیں۔ آصف ثاقب کا شعر یاد ہے، نہیں گماں کہ جھوٹا ہوا کا آ گزرے، قیاس پہ دوں پہ ہوتا ہے سرسراہٹ سا۔ اور رشید طراز کا خیال، کشتوں کے دل خون کیے ہیں آنسو کتنے دکھ جھیلے خوشبو۔

محمد طارق علی (راول پنڈی)

(17) محترم سلمان اظہر! السلام علیکم!

علم و ادب اور فکر و سوچ کے روشن چراغوں سے معاشرتی اقدار اور رویوں میں تبدیلی لانے والے ادبی مجلوں میں ماہنامہ تخلیق ایک معتبر حوالہ ہے جو اب کم و بیش پچاس برس نہیں بلکہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ تخلیق کے بانی مدیر مرحوم جناب اظہر جاوید ایک خوبصورت انسان، ادیب، دوست اور نظم کے باکمال شاعر تھے وہ دبستان لاہور میں ایک مرکز کی حیثیت رکھتے تھے جو اہل قلم و نظر کے دلوں میں دھڑکن کی طرح دھڑکتے اور بستے تھے۔ تخلیق کا دفتر اہل قلم کے لئے ایک علمی و ادبی بیٹھک کی حیثیت رکھتا تھا جہاں شعر و ادب کی محفلیں برپا ہوتیں۔ خوشیوں، رنگوں، جگنوؤں اور تتلیوں جیسے رنگوں جیسی باتوں اور محفلوں سے تخلیق کی آبیاری ہوتی رہی اور آج تخلیق سائبان ادب کی صورت نوجوان ادب کو گھنی چھاؤں مہیا کر رہا ہے۔ اسی دفتر میں ہمارے انشائیہ نگار دوست اور ملک کے رابطہ افسر جناب سلمان بٹ مرحوم نے ہمارا جناب اظہر جاوید سے تعارف کرایا جو بعد کی ملاقاتوں میں ایک مضبوط تعلق میں بدل گیا۔ جناب اظہر جاوید کو ہم نے اپنے دوست جناب نسیم شاہد کی پہلی کتاب آئینوں کے شہر میں پہلا پتھر کی تقریب رونمائی میں جناب منو بھائی اور جناب اصغر ندیم سید کے ساتھ بطور خاص ملتان میں مدعو کیا ہم اظہر جاوید صاحب کو ملتان کینٹ کے ریلوے اسٹیشن پر تلاش کرتے رہے اور وہ ملتان سٹی کے اسٹیشن پر اتر کر براہ راست تقریب میں پہنچ گئے۔ یہ محبتوں، خلوص، وضع داری اور وعدے ایفا کرنے کا وہ دور تھا جب لوگ ہوائی سفری سہولتوں ایئر کنڈیشن بسوں اور سمارٹ فون کے عادی ہوئے بغیر ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شریک ہو جاتے تھے۔ نامساعد حالات اور ادبی قحط سالی کے دور میں بھی ادب اور کتاب دوستوں تک تخلیق باقاعدگی سے پہنچتا رہا اور زیادہ تر اعزازی ہی ارسال ہوتا رہا۔ جناب اظہر جاوید کے بعد ان کے فرزند ارجمند نے تخلیق کا بار امانت سنبھالا ہے اور اس چراغ کی لو کو اور بڑھا دیا ہے۔ سلمان اظہر آپ نے ایک سعادت مند بیٹے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے والد کے ادبی وارث ہونے کا حق بھی ادا کر دیا ہے اس دور میں جب انسانی قدریں اور رویے روبہ زوال اور تخلیقی جوہر ناپید ہوتے جا رہے ہیں آپ نے تخلیق کی علمی اور فکری رنگوں کی قوس و قزح کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے جس میں جناب اظہر جاوید کی خوشبو اور جگنوؤں، تتلیوں اور مسکراہٹوں جیسی باغ و بہار شخصیت کی جھلک پھر سے نمایاں ہو رہی ہے۔ سلمان اظہر صاحب ہم آپ کی مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کے لئے دعا گو ہیں۔ تخلیق کو اسی شان اور بھرپور انداز میں شائع کرتے رہیں یقیناً آپ کی صلاحیتیں اس کو مزید جلا بخشیں گی اس کی پذیرائی اور دوام کے لئے تعاون کے لئے ہم آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ ہمارے محترم دوست جناب اظہر جاوید کے بیٹے ہیں ہمیں تخلیق میں ان کی خوشبو اور آپ میں ان کی صورت نظر آتی ہے۔

اظہر مجوکہ (ملتان)

◆◆◆

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگِ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی ایڈیٹر: محمود شام 0300-8210636	سہ ماہی کاوش گجرات مدیر: افضل راز 0300-9625108
ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: طارق محمود 0323-4329344	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8430043

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	تم جو چاہو کر سکتے ہو	عاصم بخاری	0301-7865800	انتخاب پبلی کیشنز میانوالی	300/-
2	عزمِ سخن	علی رضا احمد	0300-9693743	القمر انٹرپرائزز اردو بازار لاہور	450/-
3	کتابیں اور یادیں	غلام حسین ساجد	0333-4377794	کتاب ورثہ اردو بازار لاہور	600/-
4	لیاقتِ کتب	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0300-6668284	مثال پبلشرز	800/-
5	سنگِ زیارت	سائرہ ہاشمی	0333-4344716	دستاویز مطبوعات لاہور	550/-
6	ظلم کے ساحل پر	اکمل شاکر	0321-5440882	بک کارنر شوروم جہلم	500/-
7	خاکِ گردِ دلی	نسیم سحر	0333-5415091	دوست اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد	500/-
8	چراغِ آخرت	رشیدہ آفرین	0300-6147077	ملک پبلی کیشنز	900/-
9	نقشِ دریا کے ہیں	انور حکیم علوی	0344-7448084	زربفت پبلی کیشنز، اردو بازار	500/-
10	جوتوں سے ٹھوکریں	ضیاء مرزا	0300-5586192	شعر یار پبلی کیشنز، اسلام آباد	1000/-
11	محاسنِ قمر رئیس (تحقیق و تنقید)	اکرم کنجاہی	0345-2610434	رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی	800/-
12	شذراتِ نسیم سحر	نسیم سحر	0333-5415091	دوست اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد	350/-
13	لفظوں کی کہانیاں	عذرا اصغر	0333-4344716	دستاویز مطبوعات لاہور	650/-
14	معاشرت	ممتاز راشد لاہوری	0331-4387871	خیال و فن پبلی کیشنز لاہور	300/-
15	باغ و راغ	غلام حسین ساجد	0333-4377794	کتاب ورثہ اردو بازار لاہور	600/-
16	اُمید	رانا خالد محمود قیصر	0302-8281838	تخلیق مطبوعات کراچی	300/-
17	نیمِ شب	حسن عسکری کاظمی	0345-4669398	رضا منشور پبلشرز لاہور	300/-

نوٹ: ادارہ "تخلیق" اپنی تمام پالیسیاں مجلسِ ممبران کی باہمی رضامندی سے مرتب کرتا ہے۔ ادارے کو بغرض تبصرہ کے لئے دو کتابیں ارسال کریں۔ کسی بھی موصول ہونے والی ایک کتاب پر ادارہ تبصرہ نہیں کروا سکتا۔ (ادارہ تخلیق)

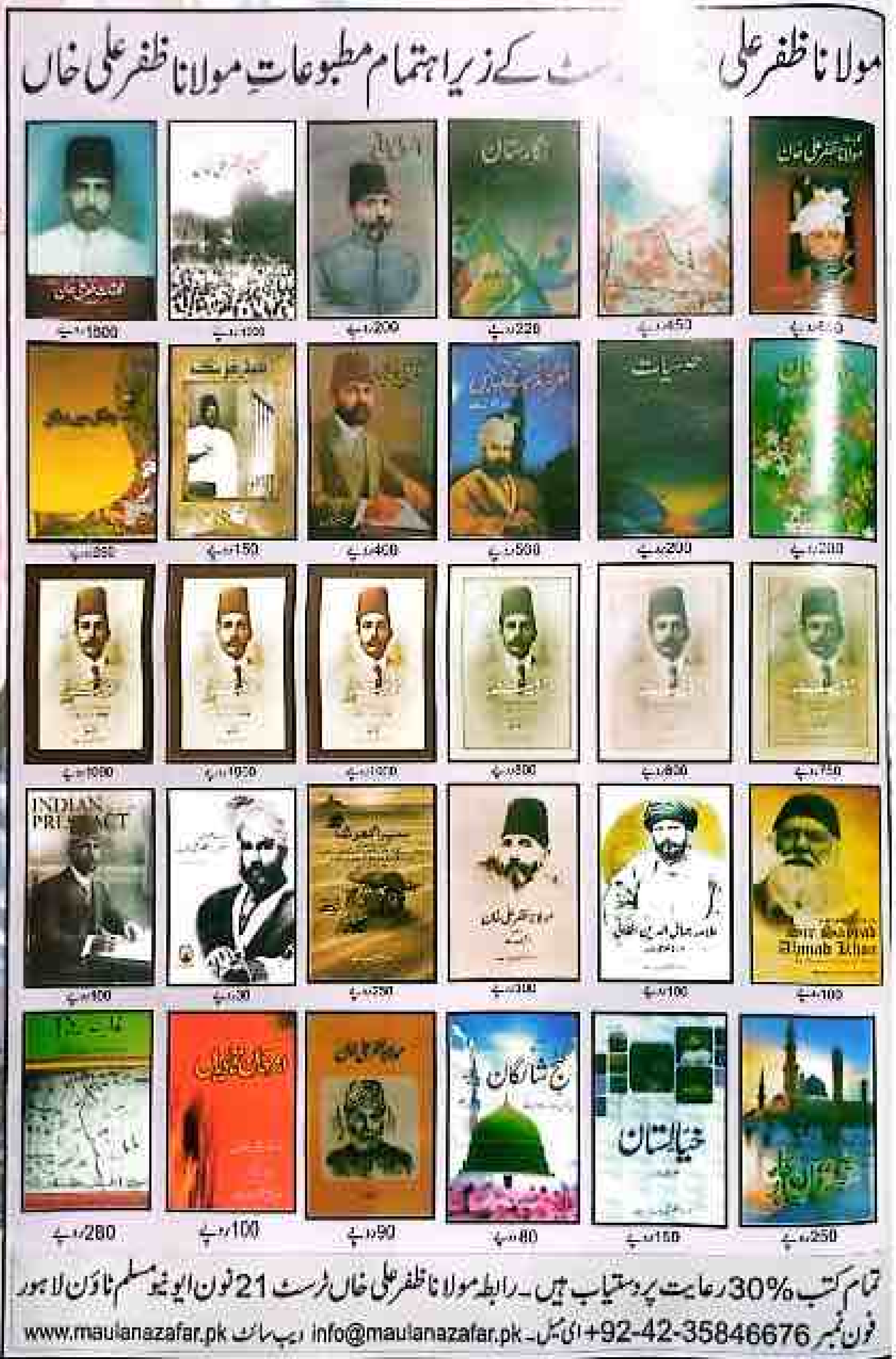

مولانا ظفر علی ...ٹ کے زیرِ اہتمام مطبوعاتِ مولانا ظفر علی خاں
خیالستان
250 روپے
150 روپے
80 روپے
90 روپے
100 روپے
280 روپے
تمام کتب 30% رعایت پر دستیاب ہیں۔ رابطہ مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ 21 نون ایونیو مسلم ٹاؤن لاہور
فون نمبر 35846676-42-92+ ای میل۔ info@maulanazafar.pk ویب سائٹ www.maulanazafar.pk

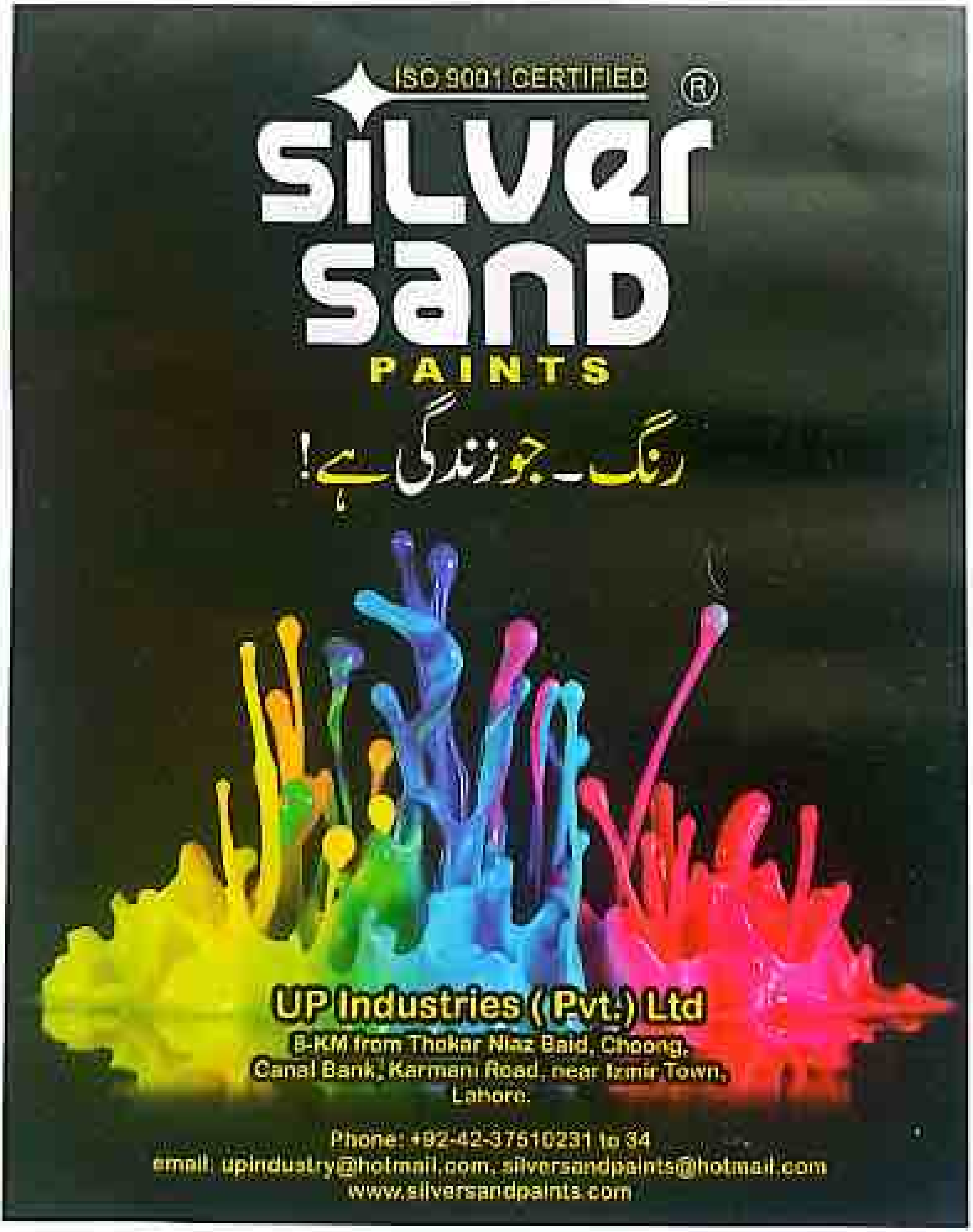
ISO 9001 CERTIFIED
silver sand
PAINTS
رنگ۔ جو زندگی ہے!
UP Industries (Pvt.) Ltd
8-KM from Thokar Niaz Baig, Choong,
Canal Bank, Karmani Road, near Izmir Town,
Lahore.
Phone: +92-42-37510231 to 34
email: upindustry@hotmail.com, silversandpaints@hotmail.com
www.silversandpaints.com

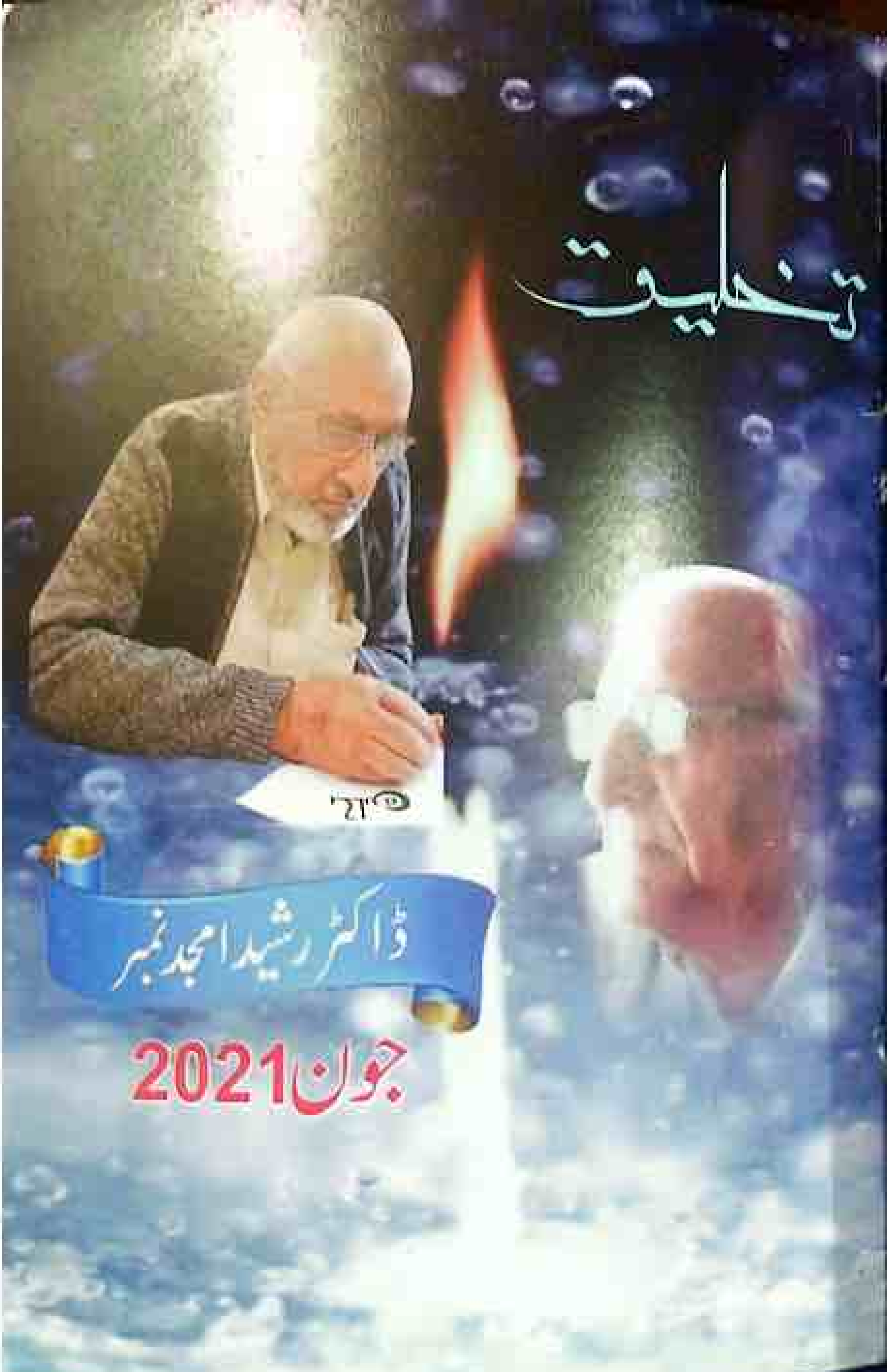

CS CamScanner

تخلیق ایوارڈ 2020 "ڈاکٹر رشید امجد"

اطلاعِ عام

2013، محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب

2012، محترم شفیع عقیل صاحب

2020 "ڈاکٹر رشید امجد"

2015، محترمہ منیر جہاں صاحبہ

2014، محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ

قارئین "تخلیق" آپ
سب احباب سے مخاطب ہوتے ہوئے
ایک حوالے سے اطلاعی گفتگو کر رہا ہے۔
آپ جانتے ہیں اب "تخلیق" اور سالانہ ایوارڈ
تقریب لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں امسال
بھی بانی مدیر اظہر جاوید کی برسی کے موقع پر مذکورہ ایوارڈ
تقریب کا انعقاد ۱۴ فروری کو طے شدہ تھا لیکن کورونا کی آفت
نے زندگی کو قدرے بے یقین کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ ......
البتہ حتمی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے یہاں پر طور تحدیث
نعمت یاد کیا جائے گا کہ "تخلیق" ایوارڈ کسی رسمی روایتی ایوارڈ کا نام
نہیں ہے۔ گزشتہ آٹھ برس سے ہر سال یہ ایوارڈ ملک کے کسی ایک
نامور ادبی شخصیت کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جس کا تعین ایک غیر
جانب دار جیوری کرتی ہے اس مرتبہ جو ان ناموں پر مشتمل تھی جناب
نجم لطیف، جناب آغا گل، جناب ہارون الرشید تبسم، جناب شہزاد نیر،
جناب خلیل احمد عریف منصفین نے 2020 کے "تخلیق ایوارڈ" کے
لیے ممتاز فکشن رائیٹر اور نقاد ڈاکٹر رشید امجد صاحب کا چناؤ کیا۔
ادارے کی طرف سے تمام تیاریاں مکمل تھیں مگر قضائے
الٰہی نے ڈاکٹر رشید امجد کو اتنی مہلت نہ دی اور وہ دنیا فانی
سے کوچ کر گئے جس کی وجہ سے وقتی طور پر اس تقریب
کو ملتوی کرنا پڑا ادارہ تخلیق اس تقریب کو بھرپور
طریقے سے منعقد کرنے کا اعلان جلد
کرے گا۔

2017، محترم حسن عسکری کاظمی صاحب

2016، محترمہ عذرا اصغر صاحبہ

2019، محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ

2018، محترم سرفراز سید صاحب

آپ کا دوست

سونان اظہر جاوید (مدیر ماہنامہ "تخلیق")

مسلسل اشاعت
کا 52
واں سال

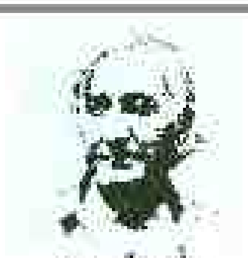

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصۂ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 51 | جون 2021ء | شمارہ : 6 | CPL نمبر 96

قیمت : -/350روپے .... 1,600روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100$ ڈالر — ہندوستان کے لیے 2,000روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt, (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نشتر جہاں (امریکہ) — ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید اظہر (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نو وارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رواں رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''عصریہ''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاءاللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

52 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے اعزازی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف -/2,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.
[illegible]
[illegible]
[illegible]
C.A. USA
Ph: [illegible]
Email: [illegible]
[illegible]

U.S.A.
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
Ph: [illegible]
Email: [illegible]

INDIA
K.L. Narang Saqi
[illegible]
Delhi-110001, India
Ph: [illegible]
Email: [illegible]

PAKISTAN
[illegible]
[illegible]
[illegible] Road, Lahore
Ph: [illegible]
Cell: [illegible]
Email: [illegible]

○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — حسن عسکری کاظمی — 7
نعت رسول مقبولؐ — خلیل ادا
نعت رسول مقبولؐ — بشریٰ رحمٰن — 7

تخلیق ایوارڈ یافتہ 2020ء

ڈاکٹر رشید امجد —— "تخلیق" ایوارڈ یافتہ 2020 — ادارہ "تخلیق" — 8

گوشۂ ڈاکٹر رشید امجد

رشید امجد —— ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ — 10
رشید امجد کی افسانہ نگاری — جلیل عالی — 21
ملی یاد — آغا گل — 29
ڈاکٹر رشید امجد کی افسانوی دنیا — ہارون الرشید تبسم — 30
رشید امجد ایک شخص، ایک عہد — تحسین محمد راج — 36
رشید امجد کے افسانوی مجموعے — حماد اظہار — 39
رشید امجد کے افسانوں میں موضوع — ڈاکٹر امجد طفیل — 42
ڈاکٹر رشید امجد ایک مثالی انسان — عذرا اصغر — 49
ڈاکٹر رشید امجد میرے لیے —— ڈاکٹر وسیم انجم — 52
رشید امجد، راولپنڈی کی رونق — نسیم سحر — 54
آواز رشید امجد — شاہین زیدی — 56
رشید امجد صاحب سے ایک ملاقات — ربیع اللہ نعیم — 58

مضامین

آزادی — ڈاکٹر انعام الحق جاوید — 61
محبت اور مزاح الست — غلام حسین ساجد — 63
تحقیق اختلافات (امیر خسرو کی نظمات) — ڈاکٹر ایوب ندیم — 69
کرونا وائرس سے مرے شاعر نفیس مرزا — کاشف خان — 73
محمد بابا اور کرشن چندر کی پکار — خالد عبداللہ — 75

افسانے

تکمیل کا تہم — سلمیٰ آ احمد — 77
گیدڑ سنگھی — آغا گل — 82
اکبری شب — جمیل احمد عدیل — 87
[illegible] — تسلیم کوثر — 91

غزلیں

انور شعور، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر ابرار احمد، محمود شام، آصف ثاقب، خالد اقبال یاسر، گلزار بخاری، سلطان سکون، احمد صغیر صدیقی، ناصر علی سید، ممتاز راشد لاہوری، رشید آفرین، اشفاق ورگ، ڈاکٹر آرزو عتیقی، ڈاکٹر محمد رفیق، طلعت صبح، سید ضیا حسین، ڈاکٹر عاصم بخاری، شیر افضل، صائمہ اسحاق، حافظ مسعود امجد، طاہر منظور، جاوید عباس جاوید — 95 تا 102

انشائیہ

میں ایک مجبور خاتون کا شوہر ہوں — محمد اسلم — 103

یادیں

سرشار	ڈاکٹر ابدال بیلا	106
شاہد کا نور ..... شاہد نور	پرویز انجم	110

یاد رفتگاں

نجیب احمد ایک خوبصورت شاعر	شہباز انور	113

طنز و مزاح

بچے ہم آپ کے ہیں	ڈاکٹر محسن مگھیانہ	117

موسیقی

استاد نصرت فتح علی خان	ڈاکٹر امجد طفیل	119

پنجاب رنگ

سلطے دی جاوہ	بشریٰ رحمن	127
پنجابی غزل	بشریٰ رحمن	
[illegible]	سلیم شہزاد	
نظم	سلیم شہزاد	127

تجزیے و جائزے

میرا عقیدہ و تکنیک کی رو سے	شعیب ...	128
... کے تازہ شمارے	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	132
سرائیکی گوشہ	قیصر ...	134
ماہنامہ ''تخلیق'' کا 20 سالہ	آفتاب خان	135

تبصرے ہارون الرشید تبسم کے

خواب زدے	کرامت بخاری	141
حضرت رسولِ مقبولؐ	شہزاد بیگ	143
چنگیاں	ڈاکٹر اقبال ...	145
نعم جاوید	عاصم بخاری	147

انجمن خیال

آصف ثاقب، سلطان سکون، آغا گل، اسلم انصاری، شجاعت ہاشمی، ڈاکٹر بدر منیر، تسلیم کوثر، ایم۔ اے۔ ملک، شاہین زیدی، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، محمد اسلم، نور کمال شاہد، خالد عبداللہ، محمد اقبال صمصام، محمد نوید مرزا، سیماب ...	149 – 159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

علمی اور ادبی ...	160

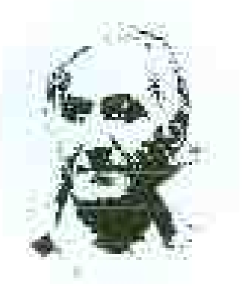

سرورق

ادارہ ''تخلیق''

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: حسنین مجروح

مطبع: ... پرنٹرز گلشن راوی، لاہور

مقام اشاعت

H. No. E/12, Sheriaz Villas, Phase-I,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(اڈیٹنگ کے حقوق محفوظ ہیں)

○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

پہلی بات

جب سے تخلیق کا گیٹ اپ بدلا ہے اور انداز میں جدت پیدا ہوئی ہے تخلیق کی ضخامت بڑھتی جا رہی ہے اور مشکل ہوتا جا رہا ہے نہ چاہتے ہوئے بھی ہر بار پرچہ تاخیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ رسالے کی اشاعت کا دورانیاتی وقفہ بڑھتا جا رہا ہے اس کی وجہ آپ احباب کی شفقت اور محبت ہے کہ آپ کی تخلیقات کا انبار لگا رہتا ہے۔ تخلیق کے معیار پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا جاتا کیونکہ کسی بھی معیار کو اپنے لیے طے کرنا اور پھر اس کو برقرار رکھنا بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ کچھ دوستوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ شاعری کا وہ معیار نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے مگر یہ اعتراض بہت کم دوستوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ ابھی چند دن پہلے محترم قیصر صاحب سے فون پر بات ہوئی تو فرمایا کہ شاعری کا معیار وہ نہیں جو آپ کے والد کے زمانے میں تخلیق کا ہوا کرتا تھا۔ میں ان کی اس شکایت کو بالکل درست سمجھتا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ مدیر کی حیثیت سے بہت جگہ آپ کو زردی کوئی بھی غلطی ہوتی ہے۔ ادب کا ادنیٰ سا طالب علم ہونے اور بقول کچھ افراد غیر معروف اور معمولی سے مرتبے کا مدیر ہونے کی حیثیت سے میری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ لکھنے والوں کو ایک خاص حد تک لکھنے کی آزادی ملنا ضروری ہے اس لیے میں خطوط اور غزلیں افسانے اور مضامین جیسے آتے ہیں چھاپ رہا ہوں اگر کبھی کسی مصرعے یا فقرے میں ردو بدل کیا جائے تو اختلافات شروع ہو جاتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چند کالم نگار لکھاری اور شاعر اور غیر دانستہ کوئی بے وزن تحریر کرے اس کی نشاندہی کر دی جائے تو وہ محترم ناراض ہو جاتا ہے۔ تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ان کی تحریر کو اسی طرح چھاپ دیا جائے؟ اور فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اس موضوع پر اکثر میرے ساتھی کے تجربات ہوتے ہیں جو غزلوں اور منظومات کی طرف میری توجہ مبذول کراتے ہیں کہ فلاں ادیب کا تو یہ نام ہے اس کی غزل کا یہ شعر بے وزن ہے یہ غزل فلاں تک بحر سے خارج وغیرہ وغیرہ۔ کئی ایسے بیشتر شعرا کو ان کی غلطی بتا چکا ہوں۔ اس طرح کچھ لکھاریوں کو اپنی ایک ہی تحریر ایک سے زائد پرچوں میں شائع کرانے کا شوق ہوتا ہے میں ایسے کئی لکھاریوں پر تخلیق کا دروازہ بند کر چکا ہوں کہ تخلیق صرف غیر مطبوعہ مواد ہی شائع کرتا ہے۔

تخلیق میں شامل غزلوں اور منظومات کے معیار پر سوال اٹھانے والوں کو یہ بتانا ضروری تھا کہ جو کچھ ہے وہ سامنے آ جائے اور فیصلہ پڑھنے والے کریں کہ ان کے نام کا جو بلند گنبد لوگوں کی نظر میں قائم ہوتا ہے کمزور تحریر یا غزل دیکھ کر وہ آپ کی نظر میں فوراً زمیں بوس ہو جائے گا۔ حیرت تو مجھے اور بھی بہت ساری باتوں پر ہوتی ہے یہ بھی سوچ کر ان نامور ادیبوں اور شعرا کے بارے میں کیا لکھا جائے کہ جو اپنے کام، نام اور مقام سے بد دیانتی کرتے ہیں۔ بہت سے معروف لکھاری خواتین و حضرات اپنی کتاب کے چھپ جانے پر یہ اصرار کرتے بھی نظر آتے ہیں کہ جو لکھا ہے اسے مستند مانا جائے کیونکہ ان کی کتب پر نامور ادیبوں شاعروں کے دیباچے موجود ہیں۔ چنانچہ اب سفارش کروا کر آپ کھیل کے میدان میں آ سکتے ہیں مگر یہ فارمولا کبھی نہ ہوگا لکھاری قلم میں جگہ نہیں بنا پاتا اور ایسا ہی کچھ حال ان خواتین و حضرات سے ہوتا ہے جو محض سفارشوں اور کچھ لکھاریوں کو پیسے دے کر کتابیں اپنے نام سے شائع کروا لیتے ہیں مگر جلد ہی گمنامی کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیسے لے کر لکھ کر دینے والے بہت سے ناموں کو میں جانتا ہوں ایسے بیشتر حضرات کا محاسبہ کون کرے گا؟ ادب میں بھی بددیانتی کے عنصر کو نے آئے۔ ادب بھی ایک کمرشل انڈسٹری کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بیشتر سے لکھاری تک یہ ایک قلم کا معاوضہ نوٹوں کی شکل میں وصول کرنا چاہتا ہے دھڑا دھڑ شائع ہونے والی کتابوں میں اہل قلم کی پہچان کون کرے گا؟ تخلیق کی تاریخ اور اس کی تعریف کا یہ کام کون کرے گا؟ بے وزن شاعری کی کتابوں کو شائع کرنے سے کون روکے گا؟ نامور ادیبوں اور شاعروں کو جو ادب سے کھلواڑ کر رہے ہیں ان کو ان کا اصل مقام کون دلائے گا؟ اور کئی اخبارات کے رنگین ادبی ایڈیشنوں نے پوری کی پوری ایک دو کتابوں کے مصنف خود کو معروف اور درجنوں معیاری کتابوں کے مصنفوں پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی کتابوں کے تبصرے شامل اشاعت کرانے میں

سفارشوں کے ذریعے تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر طرف تبصروں کی بھرمار ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس کتاب کا معیار کیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب سوال آپ سب کے ذہنوں میں بھی موجود ہوں مگر ان سوالوں کا جواب کب ملے گا؟ اصل بھی کسے کا پتا نہیں؟ ادیب اپنا اصل کردار کب ادا کرے گا؟ معاشرے میں ادب اپنی اصل حالت میں کب پہنچے گا؟ نئے لکھنے والے کب شعرا اور ادبی اساتذہ سے اصلاح لینے کی طرف راغب ہوں گے؟ یہی وہ وجہ ہے کہ دنیا میں [illegible] کے باوجود ہم آج بھی غالب، میر، سودا، ذوق، درد، انتظار حسین، احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، شہزاد احمد، انشاء جی، منیر نیازی، وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، فیض احمد فیض، اظہر جاوید، جون ایلیا، شورش کاشمیری جیسے کئی بڑے ناموں کی تحریریں اسی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

میں تب تک ان سب بے نام شاعروں اور بے نام لکھاریوں کو اگنور کرتا رہوں گا جب تک میرے عہد کے بہترین شاعروں اور اصل ادب کی پہچان میری آنے والی نسل کو نہ ہو جائے۔ اب آج کے دور کے اس دوسرے پہلو کی طرف آتے ہیں جس میں ہر کوئی مبتلا ہے۔ [illegible] سے ایک وائرس نے دنیا میں [illegible] زندگیاں ختم کر دی ہیں بہت سے پیارے ادبی دوست ہم سے جدا ہو گئے اور ہزاروں دوستوں نے اس مرض کو بہت قریب سے دیکھا۔ موت اور زندگی کی اس کشمکش نے یقین مانیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا کہ زندگی کتنی غیر محفوظ ہے اور ہم بھی اتراتے پھرتے ہیں۔ اللہ تمام دوستوں کو محفوظ رکھے یقین جانیے اب تو جانے والوں کے نام سن سن کر ہر وقت دل کو دھڑکا لگا رہتا ہے۔ [illegible] ہے اور فون کی ہر گھنٹی پر دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہو جاتی ہے ایسے میں تو [illegible] آتے ہیں کہ جانے وہ کیسے تھے ان کے [illegible] ایک وقت لے کر چلتے ہیں یہ بھی ان کا وہ عظیم کارنامہ ہے جسے ہم ادبی دوست یاد رکھیں گے۔ کوئی بھی معروف شاعر ادیب لکھاری صحافی [illegible] ایسا نہیں جو ان کی درسگاہ کی زیارت نہ کر چکا ہو۔ [illegible] ڈاکٹر صاحب کی شخصیت یقین جانیں [illegible] گفتگو اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں [illegible] بھی کسی کا تقاضا نہیں کرتے [illegible] اسلم کمال صاحب کا نام [illegible] دل [illegible] فون اٹھایا تو میرے [illegible] کی آواز سے دل خوش ہو گیا۔ [illegible] کے بعد ان کے پہلے لفظ نے ہی مجھے [illegible] رمضان میں مجھے بھائی صاحب [illegible] خواب میں ملے بہت واضح خواب تھا اظہر جاوید [illegible] حالت میں [illegible] لگتا تھا جیسے لحاف کے نیچے کوئی [illegible] ہے تو انھوں نے اپنے بیٹے سے [illegible] آپ بہت پرسکون حالت میں تھے اور مجھے دیکھتے ہی کہا اسلم کمال میں مطمئن ہوں کہ میرے بیٹے نے میرے نام کو زندہ رکھا ہوا ہے اور عزت والی ہوئی ہے۔ یہ خواب سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسلم کمال صاحب نے بتایا [illegible] آپ تک پہنچانا مقصود تھی [illegible] میرے والد اپنی [illegible] کی بات کر کے دل برداشت بھی نہیں حقیقت بیانی ہے کہ میرے بعد میرا بیٹا کسی سے کوئی گلہ نہیں کرے گا، کوئی شکوہ زبان پر نہیں لائے گا کیونکہ اس نے تخلیق جاری نہیں رکھنا اس نے کوئی جہاد بھی نہیں کرنا؟ [illegible] میرے والد نے بھی مان لیا کہ میرا بیٹا [illegible] ہے۔ اس نے تخلیق اور میرے [illegible] اس سے بڑا کوئی انعام نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے محسن اسلم کمال صاحب کا دل کی گہرائی سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس سال سے میری [illegible] اور کیفیت کو ختم کر دیا کہ میں ''تخلیق'' کو اور ان کے لگائے پودے کی آبیاری ٹھیک بھی کر رہا ہوں یا نہیں؟ آیا میں بھی صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہا ہوں یا نہیں؟ مجھے یہ خواب سنا کر زندہ جاوید کر دیا۔ میں والد کے اس عہد کو پھر دہراتا ہوں: ''ہم ہے تو تخلیق پیہم رواں دواں رہے گا'' ان شاء اللہ۔

دعا گو

سونان اظہر جاوید

•••

حمد و نعت

حمد

مائل حمد نگاری پہ طبیعت میری
سبب ارباب جہاں تو ہے ضرورت میری

مجھ میں کیا وصف ہے ایسا بھی کہ تو نے یارب
دل میں تخلیق کے اول ہے محبت میری

میں ہوں راستے میں جہاں پہ بھی کرم ہے تیرا
شکر ہے لب سے ٹلی سر سے مصیبت میری

دشمن جاں نے تو رستے سے ہٹانا چاہا
اے خدا تو ہی تو کرتا ہے حفاظت میری

میں گنہگار ہوں تسلیم مگر رب کریم
میرے چہرے پہ ہے تحریر ندامت میری

تو کہ ہے قادر مطلق تیری قدرت کے نثار
ناتواں ہوں تو بڑھاتا ہے ہمت میری

میں کہاں جاؤں بھلا کس کو پکاروں گا یہاں
تیری نسبت سے وابستہ ہے راحت میری

حسن عسکری کاظمی

OOO

نعتؐ

میں گنہگار
گناہواں بھریا
یا رسول اللہؐ
کیہڑے لفظاں اندر لبھیاں اکھاں نال
مدنوں تیکر تکاں تہاڈے اگے
جدوں وی بھولی ادوں راتاں دیہاڑے تکی جھولی
کدی نہ بھر جاوے
پر کیہ ہے مدینہ نال دا جاوے
ایہہ بھولی تاں
اوس کالکھ نال بھری اے
جیہدے وچ ساری حیاتی
اپنے آپ نوں بیٹھلاں دے ...
پیارے رسول اللہؐ / اوہ کی
ہاں تاں میں تیرا امتی اکھواندا
اپنے آپ نوں اکھواں ...
میں مدنے جاواں / آپ سرکار دے اگے
ہتھ جوڑ کے عرض کریاں ہو
میری جھولی گناہواں بھری بھولی نوں
اپنی رحمت دے / پاک پوتر پانی نال
دھو کے صاف کر دیو / ہاں تد
حشر دیہاڑے / جدوں
سب سامنے ہووے گے / حاضر ہو جاواں گا
ہاں فخر دا پالا کر کے / پورے قد نال
حاضر ہوواں

حنیف باوا

OOO

نعتؐ

نبیؐ دے در دی میں بن کے سائل
میں دل دے پھ کے چھان چلیاں
نبیؐ دی جوگن نبیؐ نوں سارے میں
اپنے دکھڑے سنان چلیاں
تمام عمراں اڈیکاں رکھیاں
کدی نہ سکیاں ایہہ سجناں اکھیاں
حسن دے ورقے بدل کے چہرے
ہا مدنی تکن نوں سجان چلیاں
مدینے جانے نصیب والے
نصیب تیں اے مدینے جا کے
نصیب سجناں وی لے کے چلیا
میں لکھ اپنے بنان چلیاں
ہزار کوہاں تے عشق چڑھدے
جتھاں لے ارنا ہو کر بی چڑھے
ہے سوالے مجھے دا معجزہ ایہہ
مرا وچھڑے تاں چان چلیاں
بشر روئے تو کملی والے
کہ تیرے لیدی توں سد لیا ہے
مبارکاں سجنوں دین سئیاں
میں اس دا چانن ودھان چلیاں
آکوں ویکھاں تے ہجر ویکھاں
ہن اپنا تیرے میں لکھ ویکھاں
بہتے چاہے بادشاہ دی
چلے اقبال میں وی تیران چلیاں

بشریٰ رحمن

OOO

تعارف نامہ

ڈاکٹر رشید امجد ــــ "تخلیق" ایوارڈ یافتہ 2020

(ادارہ تخلیق)

نام : رشید امجد ــــ اصل نام : اختر رشید ــــ والد کا نام : غلام محی الدین مونس ــــ والدہ : خورشید بیگم ــــ تاریخ پیدائش: 5 مارچ 1940ء سری نگر کشمیر ــــ تعلیمی کوائف: پی ایچ۔ڈی ــــ پیشہ : تدریس

والد پیشے کے اعتبار سے نقشی قالینوں کے ڈیزائنر تھے لیکن ادب سے بھی شغف رکھتے تھے۔ پنجابی، اردو اور فارسی زبانوں پر دسترس تھی اور ان زبانوں میں شاعری بھی کرتے تھے۔ والدہ خورشید بیگم گھریلو خاتون تھیں۔

ڈاکٹر رشید امجد نے ابتدائی تعلیم برن ہائی سکول سری نگر سے حاصل کی۔ میٹرک ڈینز ہائی سکول سے کیا۔ گھریلو حالات کے پیش نظر میٹرک کے فوراً بعد ملازمت شروع کر دی اور چھوٹے چھوٹے کئی کام کیے۔ ایف۔اے اور بی۔اے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے کیا۔ گورڈن کالج سے ایم۔اے اردو کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ "میرا جی فن و شخصیت" کے عنوان سے خواجہ محمد زکریا کی زیر نگرانی مکمل کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

پیشہ ورانہ تجربہ : ☆ صدر شعبہ اردو و پاکستانی زبانیں، ایئر یونیورسٹی اسلام آباد (جولائی 2013ء تا 2016ء) ☆ ایڈجنکٹ (Adjunct) پروفیسر شعبہ اردو، مدیر معیار (مارچ 2012ء تا 2013ء) ☆ ڈین / صدر شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد (مارچ 2010ء تا فروری 2012ء) ☆ صدر شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد (جولائی 2001ء تا فروری 2010ء) ☆ صدر شعبہ اردو، ایف جی سرسید کالج، راولپنڈی (اکتوبر 1968ء تا مارچ 2000ء)

اعزازات : ☆ پرائڈ آف پرفارمنس 2006ء، حکومت پاکستان ☆ ستارۂ امتیاز 2006ء، ساؤتھ ایشیا [illegible] ☆ بہترین یونیورسٹی ٹیچر ایوارڈ 2006ء، ہائر ایجوکیشن کمیشن حکومت پاکستان ☆ میاں محمد بخش ایوارڈ 2004ء، میاں محمد بخش اکیڈمی ☆ ایکسی لینس ایوارڈ 2004ء، راولپنڈی ایجوکیشنل کلب ☆ نقوش ایوارڈ 1993-94ء، ادارہ نقوش ☆ بہترین کالج ٹیچر ایوارڈ 1982ء، ایف جی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز جی ایچ کیو۔

جامعات میں لکھے گئے مقالات : (بیرون پاکستان) ☆ ایم۔اے، بیجنگ یونیورسٹی، بیجنگ چین ☆ پی ایچ۔ڈی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انڈیا (پاکستان) ایم۔اے 10 مقالات ☆ ایم۔فل 15 مقالات ☆ پی ایچ۔ڈی 1 مقالہ

کتابیں ..... افسانوی مجموعے : ☆ عام آدمی کے خواب (کلیات)، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2010ء ☆ لیمپ پوسٹ اور دوسرے افسانے، مصریہ پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء ☆ گملے میں اُگا ہوا شہر اور دوسرے افسانے، مصریہ پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء ☆ خدا بولتا ہے، مصریہ پبلی کیشنز، لاہور ☆ سمندر مجھے بلاتا ہے، مصریہ پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء ☆ دُکھ ایک چڑیا ہے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2016ء ☆ کہانی نے خواب دیکھا، مصریہ پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء

افسانوں کے انتخاب : ☆ گملے میں اُگا ہوا شہر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2015ء (مرتب مصنف) ☆ رشید امجد کے بے مثال افسانے، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2018ء (مرتب: ڈاکٹر امجد طفیل) ☆ کہانی کی کہانی، مثال پبلشرز، فیصل آباد، 2010ء (مرتب: احمد اعجاز)

یادداشتیں : ☆ عاشقی صبر طلب (1- سانجھ، لاہور، 2015ء 2- دستاویز مطبوعات، لاہور، 2019ء 3- مصریہ پبلی کیشنز، لاہور، 2020ء

تنقید : ☆ نیا ادب، تعمیر ملت پبلشرز، منڈی بہاؤالدین، 1969ء ☆ رویے اور شناختیں، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1988ء ☆ یافت و دریافت، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1989ء ☆ شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، لاہور، 1993ء ☆ میراجی شخصیت و فن، مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور، 1995ء (میراجی شخصیت و فن، [illegible]، راولپنڈی 2002ء، میراجی شخصیت و فن، مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد، میراجی شخصیت و فن، مصریہ پبلی کیشنز، لاہور) ☆ پاکستانی ادب کے معمار، میراجی، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، 2006ء ☆ پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات) پورب اکادمی، اسلام آباد، 2010ء ☆ عبارت برق کی (رپورتاژ) پورب اکادمی، اسلام آباد، 2010ء ☆ جدید ادبی تناظر، الفتح پبلشرز، راولپنڈی۔

ترتیب و انتخاب : ☆ پاکستانی ادب چھ جلدیں، ایف جی سرسید کالج، راولپنڈی، 1980-1984ء ☆ اقبال فکر و فن، ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی، 1984ء ☆ تعلیم کی نظریاتی اساس، ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی، 1984ء ☆ میرا ادیب شخصیت و فن، مقبول اکیڈمی، لاہور، 1991ء ☆ مزاحمتی ادب، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد ☆ مزاحمتی ادب، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد ☆ مزاحمتی ادب، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، 2009ء ☆ پاکستانی ادب (افسانہ): (1947-2008) اکادمی ادبیات، اسلام آباد، 2009ء ☆ پاکستانی ادب (شاعری) (1947-2009ء)، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، 2009ء ☆ پاکستانی ادب (شاعری) : 1947-2008ء، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، 2009ء ☆ میراجی شخصیت و فن: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2010ء

ادارت : ☆ دستاویز، دستاویز مطبوعات، راولپنڈی ☆ اقرأ، فیڈرل گورنمنٹ ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز، سی ایچ کیو، راولپنڈی ☆ دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد ☆ تخلیقی ادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد ☆ معیار، انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد ☆ ''تحقیقی زاویے'' الخیر یونیورسٹی (اے جے کے)

◆◆◆

گوشۂ رشید امجد

رشید امجد اور تخلیقی کائنات کے اسرار

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

افسانہ واقعات، حوادث کے تسلسل کا نام ہے جس میں کردار، مکالمہ، ماحول، وقت، فضا اور منظر نگاری جزو لازم ہیں۔ افسانے کا فن کہانی پن سے عبارت ہے لیکن رشید امجد کے افسانوں میں کہانی کہانی پن سے نہیں خیال کے تسلسل سے بنتی ہے۔ وہ کہانی کی بنیاد واقعہ سے جنم لینے والے خیال پر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا تعلق استعاراتی، علامتی و تجریدی نقطہ نظر سے ہے۔ وہ آزاد تلازمہ خیال، استعارہ، علامت، ابہام، اشاریت، تجریدیت، رمز و ایما، تمثیل، پیکر تراشی اور دیگر شعری وسائل سے کام لیتے ہوئے فرد کی کائنات میں پر اسراریت، لازوال تنہائی اور اس سے جنم لینے والے سوالات کے جواب کے متلاشی ہیں۔ ان کے افسانوں میں احساس تنہائی، ہولناک جانے والا، احساس محرومی کا تذکرہ موجود ہے لیکن گزرتا وقت اس کی منفی خصوصیات رد کر کے فرد کی رہنمائی اثبات کی جانب کرتا ہے۔ سارتر تنہائی کو نفی سے اثبات اور تخریب سے تعمیر کی جانب سفر سے تعبیر کرتا اور اسے ایک ایسی قوت گردانتا ہے جو فرد کو اپنے ہونے کا، اپنے کارآمد ہونے کا احساس دلاتی ہے اور اسے اس کے انفرادی وجود سے آگاہ کرتی ہے۔ رشید امجد بھی تنہائی کو ایک مثبت قدر جانتے ہیں۔ انکشاف ذات کا مرحلہ ہو یا تخلیق کا، انھیں اس امر کا ادراک ہے کہ اعلیٰ تخلیق، جو حقائق کی متلاشی ہے، تنہائی اور خاموشی میں جنم لیتی ہے۔

"تنہائی کو ہمارے ادب میں خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن تنہائی کی کئی سطحیں ہیں۔ فردی انفرادی تنہائی، اجتماعی تنہائی اور روحانی اور ازلی تنہائی۔ پھر اس کے اسباب بھی مختلف ہیں، انفرادی بے چارگی، طبقاتی و معاشی جبر، سیاسی، معاشی جبر اور ان سب سے مختلف ازلی و ابدی روحانی تنہائی۔ ان سب کی کیفیت اور اسباب مختلف ہیں، لیکن ان میں ایک ارتقائی سفر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، میرے فنی سفر میں شاید ارتقا موجود ہے۔ چنانچہ یہ روش انسان کی بے چارگی اور مجبوری نہیں بلکہ حقیقت کی تلاش اور اس کو پا لے جانے کی معنویت سے عبارت ہے۔" (1) رشید امجد کا بنیادی حوالہ ان کا علامتی افسانہ نگار ہونا ہے۔ تاریخ، تہذیب، مذہب، اساطیر، داستان، حکایات، فلسفہ، نفسیات اور سماجیات کا مطالعہ رشید امجد کی علامات کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ہر علامت شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ تحریر میں یوں در آتی ہے کہ پیچھے اس کے مدلولات آدھی ادھوری رہ جاتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعمیر میں شہر، باغیچہ، دروازہ، شام، سفر، دھند، دیوار، سمندر، دریا، وقت، پہچان، شناخت، خوف، ماں، کہانی، موت، قبر، تابوت اور لاش کے الفاظ و علامات بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھیں منہا کر دیا جائے تو یہ کائنات تہی دامن رہ جائے گی۔ رشید امجد کی مستعمل علامتوں میں دھند پراسراریت کی علامت ہے، واضح صاف و شفاف مناظر کی راہ میں حائل پردہ جو حقائق تک پہنچنے میں سد راہ ہے۔ یہ دھندلا پن ان کے افسانوں میں بار بار ان سوالات کی صورت در آتی ہے جن کے جواب کی تلاش انھیں سرگرداں رکھتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے متلاشی ہیں اور وہ جو کہیں دور دھند میں چھپا بیٹھا

ہے، وہ بھی ان کے ذہن میں استفہام کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔

''وہ کیا ہے، اور کون ہے، میرا اس سے تعلق کیا صرف خالق اور تخلیق کا ہے یا اس اسرار میں میرا بھی کوئی کردار ہے۔''(2)

دھند، دھند میں سے نکلا دن، دھندلکا، دھند ریت، دھند نظر میں رقص، کھلی آنکھ میں دھند ہوتی تصویر، یہ ان کے افسانوں کے چند عنوانات ہیں۔'' میرا باطنی سفر پیچ در پیچ ہے کہ یہاں کوئی منزل نہیں۔ ایک سرمئی دھند ہے جس میں چلتے رہنا، چلتے ہی رہنا ایک مبہم سی سچائی، ایک ایسا تجربہ جسے بیان کرنے کے لیے علامت اور استعارہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ درحقیقت یہ میری کہانی کا اثاثہ ہے یہ میری کہانی کا باطن ہے۔ اس کی اندرونی معنویت جو اسے ماورائے عصر بناتی ہے۔''(3)

یہ دھند رشید امجد کے افسانوں میں کس کس زاویے سے در آتی ہے اور اشیا کو، اشخاص کو اور مناظر کو کس طرح سے بے شناخت کرتی ہے۔ خصوصاً ابتدائی دور کے افسانوں میں دھند کی یہ دبیز علامت زیست کو نئے مفاہیم سمجھا رہی ہے۔ منافقت، رشوت ستانی، کذب و ریا کی دھند نے انسان کو سایوں میں بدل دیا ہے، بے چہرہ معاشرہ اسے عجیب انداز زیست سے تعبیر کر رہا ہے۔

''عام آدمی کے خواب'' کے بیشتر افسانوں میں دھند کی فسوں کاری، خوف، خاموشی، اجنبیت اور پر اسراریت کردار کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

''الٹی قوس کا سفر'' میں دھند ماں سے فرار اور ماں ہی جائے پناہ کی صورت سامنے آتی ہے:

آسمان پر سیاہی مائل پھیلی دھند دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔۔۔ دھند اب اتنی گہری ہو چلی تھی کہ ہم اب سایوں میں بدل گئے تھے۔۔۔ دھند چھٹ چکی تھی اور راستہ نظر آنے لگا تھا، میں نے ایک بار پھر جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور آہستہ آہستہ واپس چل پڑا۔۔۔ (ص 101)

منافقت اور کذب و ریا کے دور میں اپنی ذمہ داریوں کو ناروا بوجھ سمجھنے والے، بیزاری اور اکتاہٹ سے بھرا جسم لیے بے چہرہ انسان اپنے گرد و پیش میں پھیلی دھند میں سچ کا متلاشی ہے جسے سچ کی بشارت مانگتا ہے اور شدید اذیت سے گزرنے کے بعد اسے احساس ہوتا ہے اس کے اندر سے کسی نے سرگوشی کی سچ وہی ہے اور وہ آ رہا ہے اور ہم سب اس کے لیے کوشش کریں گے جو کبھی لاحاصل نہیں ہی منظور ہوگی۔

''تم سچائی کے کہتے ہو؟'' اس نے سر جھٹک کر اشیا کو پہچاننے کی کوشش کی، بجھتے ہوئے شیشے کی سی کوئی دھندلا چیز اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس دھندلاہٹ سے جھانکنے کی کوشش کی۔۔۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ابھرتے ڈوبتے رنگوں اور آوازوں کو سنا ہر شے بے چہرہ ہوئی جا رہی تھی۔۔۔ چمکتی زرد دھند ہر طرف چھپٹ رہی تھی۔۔۔''(ص 87)

ان کا افسانہ ''دھند'' مزاحمت اور سمجھوتے کی کتھا ہے۔ بدی کی جانب سفر و خوف، تشکیک و تذبذب کی دلدل میں پہلا قدم رکھنے کے مترادف ہے لیکن جب قدم اٹھ ہی جائے تو دھند ضمیر پر سمجھوتے کی چادر ڈال دیتی ہے۔

دھند بے پاؤں زینہ زینہ اس طرح اتری کہ شہر کا شہر اس کی لپیٹ میں آ گیا۔۔۔ گھر چلنا چاہیے، خیال آیا، لیکن دھند؟ وہ

اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا، دھند کی سطح آہستہ آہستہ اونچی ہو رہی تھی۔۔۔ دہلیز پر دھند اسے اپنی بغل میں لپیٹنے کے لیے موجود تھی۔۔۔ کس سانپ تک کھنچے کھنچے اسے لگا وہ بھی دھند کا ایک حصہ بن گیا تھا۔۔۔ وہ بڑے بڑے پکٹ اٹھائے جب وہ باہر نکلا تو دھند میں ایک عجیب سی آگ تھی یوں لگ رہا تھا کہ دھند اپنی لمبی زبان نکال کر چیزوں کو چاٹ رہی ہے۔۔۔ پاؤں کے نیچے بھی دھند تھی اس لیے پاؤں بار بار اکھڑ رہے تھے۔۔۔ دھند اور سردی کی تہ داریوں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر۔۔۔ گھر کے نمبر تک پہنچنے کی خواہش۔۔۔ باہر پھیلی دھند نے جواب دروازوں اور کھڑکیوں پر دستکیں دے رہی تھی، اسے ڈرا سا دیا۔۔۔ دھند اب۔۔۔ پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔۔۔ دھند نے اسے دبا کر دوبارہ بستر میں دھکیل دیا۔۔۔ دھند گہری ہو جائے تو چیزوں کے درمیان سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔۔۔(ص 591)

رشید امجد کے دیگر افسانوں میں دھند کی علامت مختلف کیفیات کے تناظر میں جلوہ گر ہے۔ دھند کہیں خوف و دہشت کی علامت ہے، کہیں سچائی کی معدومیت کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی اجتماعی بے حسی اور مصالحت آمیز رویوں کی شکل میں جنم لیتی ہے۔ سیاسی جبر اور مارشل لائی دور میں مزاحمتی رویوں کو ختم دیتی اور کہیں چپ سادھتی نظر آتی ہے۔ کہیں فرد کی داخلی اور خارجی دنیاؤں میں اس کی مادی و معاشی جبر و اکراہ میں زیست کی کہانی سناتی اور کبھی مرشد، شیخ، ہمزاد کے روپ میں اس کی روحانی تربیت کرتی نظر آتی ہے۔ معاشی، معاشرتی، سماجی و سیاسی سطح پر اس عدم مطابقت، کبھی غائب دماغی کی وجہ دھند میں مقید انسان اپنا نام اپنا گھر، اپنی ماں، اپنی قبر بھی پر گہری دھند چھائی ہوئی دیکھتا ہے۔ دھند کبھی بے چہرہ آدمی اور بے نام سایوں کی عکاس ہے تو کہیں مثبت مفاہیم کی دنیا لیے ہوئے ہے۔ گرد و پیش میں گہری دھند کے گرداب سے نکلنے کی سعی فرد کو متحرک رکھتی اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ دھند کے بعد منظر بہت واضح بہت روشن اور بہت اطمینان و سکون لیے ہوتا ہے۔ فرد کے شعور، تحت الشعور، لاشعور اور ان سب سے بلند تر سطح پر دھند نے مفاہیم کے ساتھ اپنا تعارف کروایا ہے۔ بے چہرہ فرد اس وقت کے انتظار میں ہے جب دھند چھٹ جائے گی اور صدق و صفا، محبت و یگانگت کی روشنی معاشرے کو مثبت اقدار سے روشناس کروے گی۔ "بے چہرہ آدمی" زیست کے لمحات کس کرب میں گزارتے ہیں:

اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس دھند لاہٹ سے بھاگنے کی کوشش کی۔۔۔ اس کے اندر کوئی چیز بے تحاشا ہاتھ پیر مار کر اس دھند کے غبار کو چیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے ابھرتے ڈوبتے رنگوں اور آوازوں کو سنا، ہر شے بے چہرہ ہوئی جا رہی تھی۔۔۔ کڑوی شے اس کے سارے حلق میں تیزی سے پھیل رہی تھی اور چپکتی زرد دھند ہر طرف چھٹ رہی تھی۔۔۔ وہ مرا سوچ چکا تھا اور دھندلی روشنی دم توڑ چکی تھی۔۔۔ اور جب اس نے آنکھیں بند کیں تو گہری سیاہی مائل دھند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔(ص 76-83)

چاروں طرف خوف کی دھند پھیل گئی۔(84) / خاموشی دھند کی طرح سارے کمرے میں پھیل گئی۔۔۔(155)

ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میری آنکھوں میں دھند، انھوں نے مجھے کہا لیے ہیں۔۔۔(251)

منظر اپنی وادی سمیت بھوک کی دھند میں لپٹا اپنی پہچان کھو رہا تھا۔۔۔(253)

موجود اور لاموجود کی سرمئی دھند میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وقت اور موسم اس سارے تماشے کو دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے۔۔۔(371) / سب کچھ گہری دھند میں گڈمڈ ہو گیا ہے۔(332)

فرق پڑتی وحدت میں ڈوب جانے کے لیے سامنے آتا ہے۔" راز اس وقت منکشف ہوتا ہے جب واصف، موصوف اور وصف میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔" (402)

"لاعلمی ایک نعمت ہے۔" "نہ جاننے میں بھی ایک اسرار ہے۔ خوابوں کے پیچھے بھاگتے جائیں۔ وحدت کے ساتھ وحدت ہو جائیں۔ تینوں سمتوں کی پہچان اور چوتھی سمت کا اسرار۔ (403) / وحدت کے اندر جھانکنے کی کوشش۔ اور وحدت اور وحدت (419)

رستے کے ایک طرف کھلکھلاتی دنیا ہے اور دوسری طرف سرمئی وحدت۔ میں اس وحدت میں اترنا چاہتا ہوں لیکن رستے کا دوسرا سرا نہیں چھوڑتا۔ (424)

بار بار خیال آتا کہ ابھی تک ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ہی تو پڑا ہوں۔ وحدت چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور چیزیں ایک دوسرے کی اوٹ میں چھپ گئی تھیں۔ (ص 332)

وحدت کی یادوں۔۔۔ صبح گھر سے نکلنا، درزی کی دکان، جنرل سٹور، پٹرول پمپ، پہلا دوسرا تیسرا اور پھر وحدت۔۔۔ ایک عجب وحدت ہے کہ جس میں دکھائی بھی دیتا ہے اور نہیں بھی۔ (ص 347)[4]

رشید امجد کے افسانوں کی پہلی شناخت انسان کی عدم شناخت اور اس کے تشخص کی تلاش کے حوالے سے ابھری۔ بے شناخت دور کی منافقتیں، رشتوں کی بے توقیری اور تنہائی کو جنم دے رہی ہیں جس کا شاخسانہ اپنی پہچان کی گمشدگی ہے۔ شناخت کی تلاش میں، میں، وہ اور دوسرے بھی اپنے آپ کو کھوجتے ہیں۔ اس سلسلے میں رشید امجد وضاحت کرتے ہیں:

"شناخت کا مسئلہ میرے یہاں تین سطحوں پر آیا ہے۔ ابتدا میں سیاسی، سماجی اور طبقاتی معاشرے میں فرد کی پہچان۔۔۔ دوم اپنی ذات کے حوالے سے باطنی خود آگہی کرتے ہوئے فرد کی پہچان۔۔۔ سوم کائنات کے وسیع تر تناظر میں فرد کی اہمیت اور شناخت۔ یہ سارے مسائل کسی حد تک تصوف کی فکری روایت سے منسلک ہیں۔ اس لیے ان میں بیان کرنے کی سطحیں بھی مختلف ہیں، مثلاً میرے ابتدائی افسانوں (بیزار آدم کے بیٹے) میں شناخت کا مسئلہ ایک طبقاتی معاشرے میں فرد کی بے بسی کے حوالے سے اس کی پہچان سے متعلق ہے۔ یہاں اسلوب میں ایک سطح ہے جہاں علامت اپنے ماحول کے حوالے سے معنی منکشف کرتی ہے، لیکن جب شناخت کا مسئلہ باطن سے جڑتا ہے (ریت پر گرفت) تو علامت میں وسعت آجاتی ہے اور تفہیم اتنی سادہ نہیں رہتی۔ شناخت کا یہی مسئلہ جب کائناتی ہوتا ہے (بھاگے ہے بیاباں مجھ سے) تو ساری علامتیں اور استعارے مختلف ہو جاتے ہیں۔ مرشد کی فلسفیانہ گفتگو اور تفکر بھرے جملے ساری فضا کو بدل دیتے ہیں۔ یہ میرا ارتقا بھی ہے اور میرے اسلوب کی مختلف صورتیں بھی۔"[5]

بے حسی اور زوال کی سب سے بڑی علامت معاشرتی بے چہرگی، بے نام ہجوم ہے۔ انسان زوال آمادہ ہی نہیں زوال پسند ہوتا جا رہا ہے۔ بے حسی، دکھ اور احساسِ زوال سے عاری معاشرہ بے نام کردار، ہیولے، بے چہرہ انسان اور سائے ہی جنم دے گا۔ انسان ہی نہیں اشیا بھی بے نام ہو جاتی ہیں۔ بے شناختی، بے الفرادی کبھی جذباتیت کی انتہا کے نتیجے میں سامنے آتی ہیں، کبھی معاشی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے میں اور کبھی سیاسی، دہشت زدہ جبر کی صورت میں۔ عصر موجود میں فرد اپنی بے نامی اور بے چہرگی کے دور سے گزر رہا ہے۔ تخلیق کار اور تیسری دنیا میں ہونے والی تباہ کن تبدیلیوں سے نبرد آزما ہے۔ تیسری دنیا کے عوام زوال کے تسلسل میں بے چہرہ

اور بے شباہت ہو رہے ہیں۔ پہلے جنگل کا سحر زدہ انسان، نیلے طوطوں کے غول کے غول اڑتے پنچھیوں اور لاتعداد آسیبوں سے بچنے کی کوشش میں پتھر کے نصف دھڑ کے ساتھ راستے کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ " تاحدِ نظر سیاہ جنگل یا تھیں مجھے گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہی تھیں۔ گلی گلی کرفیو زدہ تھی، ہر قدم پر جھاڑیوں کے پیچھے موت تھی، جگہ جگہ بارود کی بو اور گولیوں کا شور تھا۔ اس لیے کسی کو نام و نشان پوچھنے کی فرصت نہ تھی۔ میں بے ناموں کی بستی میں دھوئیں کی دیوار پھلانگتا آگے بڑھتا رہا۔ مکانوں کی روشنیاں گل ہو رہی تھیں اور ذہن میں سورج کا گھر بنی ہوئی تھی۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔۔۔ ہاں میں راستہ بھول گیا تھا۔"(۱۱)

بارود کا بے محابا استعمال، اسلحے کے کارخانوں میں تیار ہونے والے ہتھیار، استعماریت اور محکومیت کے درمیان کھیلا جانے والا کھیل خود کش حملوں کا مصار، وہ عالم گیر جنگوں اور قیام ملک کے لیے بہائے گئے خون کے سمندر کی سرخی کے رنگ ابھی مدھم نہ ہوئے تھے کہ ملک کے دو لخت ہونے کا سانحہ ہر محب وطن پاکستانی کے لیے انتہائی کرب کا سبب بنا۔ اکیسویں صدی کی ابتدا میں امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے جوابی وار نے دنیا کا نقشہ بدل کے رکھ دیا۔ شان و شوکت، قوت و سطوت کے بت پاش پاش ہونے پر فرعونیت کے مظاہرے ظلم و بربریت کے اژدہے نے تیسری دنیا کے کمزور، بے بس اور ملکوں کو ایک ایک کر کے نگلنا شروع کیا۔ افغانستان سے روس کو نکالنے کی، اس کے عروج اور طاقت کے زعم کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت برباد کرنے کی، بڑی طاقتوں کے درمیان پسماندہ اقوام کے کچلے جانے کی کہانی بار بار رقم ہوتی رہی لیکن سبق سیکھنا کوئی نہیں چاہتا۔ ہر عروج نے زوال آنا ہے لیکن یہ بات وہ عروج میں یاد نہیں رکھتی۔

" ہر قبر کے کتبے پر عروج و زوال کی پوری داستان رقم تھی۔ وہ ایک ایک قبر پر رکتا سارا کتبہ پڑھتا۔ "یا رب یہ کیا اسرار ہے کہ ساری داستانیں ایک سی ہیں، لیکن کسی نے کسی سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔" مرشد مسکرایا۔ "عروج ایک نشہ ہے اور نشے میں عقل کام نہیں کرتی۔" یہ عقل بھی عجب ایک ہی کیا معاملہ ہے کہ بھلائی باطن کو تو دیکھ سکتی ہے لیکن قلب کو دیکھنے سے محروم ہے اور قوموں کے فیصلے بھلائی کی بنیادوں پر ہوتے ہیں۔ یہ قبرستان بھی کیا عبرت کی جگہ ہے۔۔۔۔ مقابر کتنے عمریں بیت گئی ہیں۔ وہ تاریخ کے اس قبرستان میں کھڑا اپنی قبر اور اس کا کتبہ تلاش کر رہا ہے۔ وقت ایک ماہر گورکن کی طرح ایک تازہ قبر تیار کر رہا ہے اور زمانہ ایک ماہر سنگ تراش کی طرح ایک نیا کتبہ بنا رہا ہے۔ وہ دفنائے جانے کے انتظار میں کھڑا کھڑا شل ہو گیا ہے۔ مرشد جانے کب کا جا چکا ہے!"(۱۲)

فنا کا تصور رشید امجد کے ابتدائی افسانوں کے ساتھ ساتھ مختلف ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے آخری تحریروں تک اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ قبر، قبرستان، جنازہ، جنازہ گاہ، قتل، مقتول، موت، لاش، کفن، تابوت کی علامات ان کے لاشعور میں بہت اندر تک رچی ہیں۔ "سنسان راستوں پر موت دبے پاؤں ہمارا تعاقب کرتی ہے۔۔۔ اس نے رنگوں کی پیالی میں چھپ کر بیٹھی ہوئی لڑکی کے لیے خودکشی کر لی تھی، میں اس کی لاش کو کینوس میں لپیٹ کر اس کی دیوار پر ٹانک آیا تھا۔ اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے کفن اتارا اور بستر میں گھس گیا۔۔۔ وہ میری قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتی اور آنسو بہاتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ میں تو اس میں موجود ہی نہیں۔۔۔ کسی اسے بتا نہ دینا، ورنہ وہ میری تلاش میں قبرستان کی ایک ایک قبر کھود ڈالے گی اور وہاں بہت سی قبروں میں کوئی بھی نہیں۔"(۱۳)

ان کا افسانہ "ذات کی پہچان" زندگی میں ماں سے لاتعلقی، بے نیازی اور اس کی ذات سے اجتناب و بے پروائی کا نتیجہ ہوا ہے۔

اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کو گمنام ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ جیسے ہی ہاتھ میں پیسے آتے وہ اس کی قبر پکی کروا دیتا ہے لیکن دوسرے روز ہی عجب کشمکش و پیچ میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ جو قبر پکی کروائی ہے وہ واقعی ماں کی تھی بھی یا نہیں اور اسی تذبذب میں ایک ایک کر کے وہ قبرستان کی تمام قبریں پکی کروا دیتا ہے اور پھر خیال آتا ہے کہ کیا ماں اسی قبرستان میں دفن تھی، شہر میں تو بہت سے قبرستان ہیں۔ ''کیا معلوم یہ وہ شہر ہی نہ ہو جہاں اس کی ماں دفن ہے۔'' یہی اسطور تخلیق کار باور کرواتا ہے کہ ماں کے مرنے کے بعد اس کے آرام کا خیال کرانا اسے موسموں کی شدتوں سے بچانے سے کہیں بہتر ہے کہ ماں کی زندگی میں اسے زمانے کی چیرہ دستیوں سے، اپنی نافرمانیوں اور حکم عدولیوں سے محفوظ رکھا جائے۔ ''معروف معنوں میں قبر خوف و دہشت اور فنا کی علامت ہے لیکن ہمارے کہانی کار نے ''پیدا آدم کے بیٹے'' سے ''عام آدمی کے خواب'' تک قبر کو علامتی استعاراتی سطح پر معنی و مفاہیم کے جو نت نئے پیرہن عطا کیے ہیں اس کی معمولی سی نظیر بھی پوری افسانوی روایت میں نہیں ملتی۔'' (9)

رشید امجد کے افسانوی نسائی کرداروں میں ماں کا کردار ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ فرد کی زندگی میں ماں اور باپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ اولاد سے محبت لازوال ہے اور اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں لیکن شدت اور انتہا کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کی جا سکتی۔ رشید امجد ان خوش قسمت بچوں میں سے ایک ہیں جنہیں ماں کی بے پایاں محبت نصیب ہوئی۔ وہ اولاد جو بہت دعاؤں منتوں مرادوں کے بعد ملی ہو، ماں اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتی ہے۔ اسے زمانے کی ٹھوکروں سے بچا کر، سرد و گرم تھپیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی تمام تر طاقت استعمال کرتی ہے۔ مزاروں، درباروں میں حاضری، اس کے لیے اللہ سے حفظ و امان کی خواستگار ہے۔ ماں اسے ایک کامیاب انسان بنانے کے لیے ان تھک محنت کرتی ہے اور اپنے کسی خواب کو چکنا چور ہوتے دیکھنا نہیں چاہتی۔۔۔ اس محبت کی انتہا یہ ہے کہ ماں کا اپنے بیٹے کے بارے میں ملکیتی رویہ کہ وہ انہیں کسی سے بانٹ نہیں سکتیں بہت سے نفسیاتی مسائل کا شاخسانہ بنا۔ رشید امجد کی زندگی میں ماں کی شدید محبت، توجہ اور آرام و آسائش کا خیال اور کسی بھی دوسرے رشتے سے قربت نا قابل قبول۔ اس ماحول میں پرورش پانا، ماں کے لیے ان کے دل میں ایسی ہی شدید محبت کی بجائے برعکس صورت حال سامنے آتی ہے۔ یہ غلط بچپن اور پھر لڑکپن میں Love hated رشتے کو جنم دیتی ہے۔

''اس دور میں رشید کی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی۔ باہر غنڈہ گردی، آوارگی، اندر ماں کا دیوانہ وار لاڈ پیار، یہ لاڈ عام لاڈ پیار نہ تھا رشید کی آوارگی کی وجہ سے ماں ڈوب رہی تھی اس کے لیے رشید واحد تنکا تھا، وہ بری طرح اس تنکے سے چمٹی ہوئی تھی دونوں جانب شدت کے بھنور تھے۔۔۔ باہر بھی، اندر بھی، ماں کہتی بیٹا جلدی گھر آ، ماں کی بات رشید کے اندر عمل نہیں، رد عمل پیدا کرتی تھی وہ رات کے دو تین بجے گھر آتا تھا، ماں راہ دیکھتی رہتی، دونوں ہی مجبور تھے، معذور تھے، ماں کو راہ دیکھنے کی لت پڑ گئی تھی، رشید کو یہ کہ کوئی راہ دیکھے، ماں کا سارا زیور بک گیا تو رشید کو نوکری کرنی پڑی۔۔۔'' (10)

ماں سے محبت اور ماں سے گریز اکثر افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ماں کرۂ کائنات کا سب سے بڑا سچ، سب سے اہم رشتہ ہے تو معاشرتی و معاشی جبر اس رشتے کو ایک ذمہ داری نہیں بوجھ میں بدل دیتا ہے۔ ماں اور بہن کا رشتہ محبت اور رفاقت کے خمیر سے گندھا ہے لیکن مہنگائی، بے روزگاری، معاشی و معاشرتی بے انصافیاں، عالم بھر میں زیست کرتے فرد کو بے حسی اور جھنجھلاہٹ، وہ کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں، جن کا

عام حالات میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ غربت کے آکٹوپس میں جکڑا مسائل کے پنجے دبا کس میں الجھا کر بدلا کر صورت حال میں انسانی رشتوں کے انہدام کی مکروہ صورت سے نبرد آزما۔ فکر معاش اور معمولات زندگی کی تنگ دامنی کے سبب منفی سوچیں اور پھر خود ملامتی کی منزل۔ ''میں سوچتا ہوں اس بے چاری نے صرف ہمارے لیے اپنی زندگی برباد کر دی ہے۔ اچانک مجھے ماں پر بے حد غصہ آتا ہے اگر وہ دوسری شادی کر لیتی تو کم از کم میرا ایک بوجھ تو کم ہو جاتا۔ اچانک مجھے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہوتی ہے میں خود کو ایک گندی سی گالی دیتا ہوں اور لحاف کو اوپر کھینچ لیتا ہوں۔''(11)

''۔۔۔ ابھی نہیں، ابھی میری ماں گدھوں کی طرح کمرے میں منڈلا رہی ہوگی ۔۔۔''(12)

''۔۔۔ آج صبح دودھ والے نے مجھے بتایا کہ تمہاری بہن کو مجھے سے سامنے والے دکاندار کو اشارے کرتی اور ہنستے دیکھتی ہے۔ مجھے اپنے کندھوں سے بوجھ سا لٹکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دودھ والے سے جھگڑ کر کیوں نہیں لے جاتا میں کندھے جھٹکتا ہوں، لیکن دوسرے لمحے میرے اندر سے وہ کود کر باہر آتا ہے اور چیختے ہوئے کہتا ہے تم بڑے کمینے شخص ہو، میں سر ہلاتا ہوں ۔۔۔ ہاں میں واقعی کمینہ ہوں ۔۔۔۔۔۔ صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں ماں سے کہتا ہوں ۔۔۔ میں آج شام اغوا ہو جاؤں گا ۔۔۔ وہ سر اٹھائے بغیر کہتی ہے ۔۔۔ تمہاری تنخواہ کا کیا ہوگا۔ وہ تو مجھے ہر ماہ ملتی رہے گی نا ۔۔۔ میرے بدن پر ایک لمبی دراڑ پڑ جاتی ہے۔ میں سبزی کاٹنے والی چھری سے اپنا ایک ہاتھ کاٹ کر ماں کی جھولی میں پھینک دیتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر میرا کٹا ہوا ہاتھ اٹھا کر اپنے پرس میں ڈال لیتی ہے پھر کہتی ہے ۔۔۔ تمہارا دوسرا ہاتھ بھی اچھا ہے۔ لیکن یہ میرا مقدر کہاں، بہن کہتی ہے میرا کیا ہوگا۔ میں دوبارہ چھری اٹھا لیتا ہوں اور اپنا دوسرا ہاتھ کاٹ کر اسے دے دیتا ہوں وہ میرا کٹا ہوا ہاتھ پرس میں رکھ لیتی ہے ۔۔۔''(13)

رشید امجد کے بیشتر مرد کردار خود غرض، ظالم، خود مختار، رعب داب اور دبنگ انداز زیست رکھنے والے نہیں بلکہ بیشتر اوقات مظلوم و مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ معاشی و معاشرتی ۔ سماجی مسائل کی چکی میں پسے ہوئے، اپنوں کو مضبوط مادی و معاشی حصار کی فراہمی میں دیدہ و نادیدہ دشواریوں اور رکاوٹوں سے مقابلے کی سکت نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے فرض کی ادائگی میں کوشاں، اداسی و یاسیت، بے خوابی و تھکاوٹ، بے سکونی و اضطراب، جذباتیت اور جھنجھلاہٹ، موت یا خود کشی کے خیالات میں اسیر، خود کو بے وقعت اور حقیر سمجھتے زندگی کی گاڑی کھینچے لیے جاتے ہیں۔ تقدیر و تدبیر کی آویزش، اگر وقت کو واپس لایا جا سکتا، گذشتہ لمحے قبر میں دفن ہونے کی بجائے دوبارہ سامنے آ جاتے، فیصلے بدل لیے جاتے ۔۔۔ ''ہر پچھتاوے کے بعد یہی چاہتا کہ وقت کی قبر سے کسی ایک لمحے کو اٹھا کر واپس اپنی جگہ رکھا جائے اور دوبارہ سے سمت یا فیصلے کا تعین کیا جائے ۔۔۔۔ اگر وہ دن پہلے آ جاتی تو وہ بچ جاتے کی بجائے نکلس کے اس حلقے میں لاکھوں کا پکا ہوتا لیکن دو دن کے وقفے نے ساری صورت ہی بدل ڈالی تھی''(14)

شیزوفرینیا کی کیفیت، فکری انتشار کی انتہائی شکل، اس کی زندگی کو عمومی انداز زیست سے، عام لوگوں سے مختلف بنا دیتی ہے۔ کبھی وہ محسوس کرتا ہے کہ کسی بیرونی طاقت نے اس کے ذہن پر قبضہ جما لیا ہے۔ کبھی اسے لگتا ہے کہ اس کے خیالات و محسوسات چرا لیے گئے ہیں، کبھی یہ احساس جڑ پکڑ لیتا ہے کہ میں آج اغوا ہو جاؤں گا۔ کبھی وہ اشیا یا وہ انسان دکھائی دینے لگتے ہیں جو موجود نہیں۔ آوازیں سنائی دینا، خوشبو محسوس کرنا، کسی کے لمس کا احساس ہونا جبکہ کوئی بھی موجود نہ ہو، اپنے میں وا ہے اور ادراک کی خلل، اسے اپنے حصار میں مقید کیے

جاتے ہیں۔ خیالات کی یلغار میں سوچتا ہوں۔ اس لیے میں ہوں یا میں ہوں اس لیے سوچتا ہوں۔ خیالات کی بے ربطی بڑھتی جاتی ہے۔ دفتر میں کام کرتے ہوئے، عبادت کرتے ہوئے، اخبار پڑھتے، ٹی۔وی دیکھتے ہوئے خیالات بھٹکتے رہتے ہیں۔ چند لمحوں بعد بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا سوچ رہے تھے۔ تشکیک، تذبذب کی فضا میں زیست کرنا سہل نہیں لیکن ان حالات سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

رشید امجد کی تخلیقی کائنات میں ان کے کردار، میں، آپ، وہ کبھی یقین و بے یقینی کی فضا میں شک، شبہ، تذبذب، واہموں میں گرفتار، تشکیک گزیدہ معاشرہ میں زیست کرتے ہیں۔ گمان و یقین، معدوم و معلوم، حاضر و غائب، سایوں اور اجسام کے درمیان انکشاف ذات کے مرحلے طے کرتے، کبھی ماضی کی پنہائیوں میں گم، کبھی ماضی حال میں اور حال ماضی میں مدغم، عدم تحفظ کے احساس، اندرونی ٹوٹ پھوٹ سے شکستہ و ریختہ انتشار سے انتشار زدگی کا سفر کرتے ہیں۔ عدم توازن کا شکار معاشرہ فرد کو تنہا، سوگی، لایعنیت، خوف، دہشت، قنوطیت، یاسیت، زوال پسندی کے تحائف دیتا ہے۔ انسان کی بے توقیری ہر سطح پر جاری ہے۔ ہر ایک استحصالی قوتوں کا شکار اور ہر ایک خود سے کم تر پر ذہنی و جسمانی تشدد روا رکھتا ہے۔ علامت سے بیانیہ اور داستان نگاری کے اس سفر میں ان کے کردار وہ ہیں کہ جنہیں دنیا اپنی مرضی سے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کر پاتا اور جو نہیں کرنا چاہتا تمام عمر اسے وہی کرنا پڑتا ہے۔ الجھتی، جھجکتی، بے ربطی و بے زمانی کی کیفیت میں پیچھا کرتے ان جانے سایے، دہشت کے ساتھ دہشت ہو جانے کی لذت میں مبتلا، کھلی فضا، تازہ ہوا، روشن دن پر تاریکی، دھند اور ریت کی دبیز چادر کو اتارنے کے لیے شیخ، ہمزاد اور مرشد روحانی کا فریضہ سر انجام دیتے اور کردار جو دائرہ در دائرہ مایوسی اور تنہائی کی راہ پر گامزن ہیں انہیں مثبت راہ دکھاتے ہیں۔

رشید امجد کے افسانوں میں مکالمہ بسا اوقات پیچیدہ اقتباسی مکالمہ ایک کردار کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ایک فرد کی زندگی مکالمے سے عبارت ہے۔ دونوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی اگر یکطرفہ مشورے یا ہم نہ ہوں گے۔ اس میکانکی دور میں مکالمے کو درگزر کیا گیا ہے لیکن رشید امجد کی تخلیقات میں مکالمہ زندگی کا بنیادی حوالہ ہے۔ ابتدائی افسانوں میں یہ مکالمہ معاشرتی سطح پر سامنے آتا ہے، پھر اپنی ذات سے اور بعد ازاں کائنات سے۔ مکالمہ افسانے کی بنت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مرئی و غیر مرئی اشیا سے مکالمہ، درختوں، سڑکوں، کھمبوں سے مکالمہ، وقت اور موت سے مکالمہ، اپنی ذات سے مکالمہ، مکالمہ خود کو پالینے کی، جان لینے کی تگ و دو کا نام ہے۔ ہمزاد سے مکالمہ، مرشد سے گفتگو، عدم سے وجود، کشف و گیان کے مرحلے طے کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

"ذیلی خود کلامی کی کیفیت باطنی وجود کے احساسات اور تفکر کے تال میل سے سامنے آتی ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں مکالمے خارجی سطح پر ہوں، مابعد الطبعیاتی سطح پر ہوں یا باطن کی بازگشت لیے ہوں، موضوع کی وضاحت میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور ایک طلسمی فضا تشکیل کرتے ہیں۔" ..... لیکن یہ طلسم محض جمالیاتی سطح پر ہی متاثر نہیں کرتا بلکہ فکر انگیزی اور معنوی گہرائی کا بھی حامل ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں عام طور پر مکالمے مکمل ہوتے ہیں لیکن فکری گہرائی کی وجہ سے آدھے ادھورے معلوم ہوتے ہیں۔ مکالموں یا گفتگو میں ایسی خاموشی ہے جو سوچ اور احساسات کے نئی نئی سمتوں میں لپکنے کا پیش خیمہ بن جاتی ہے اور پھر گفتگو کا ایک طور خاموشی بھی ہے۔ سو رشید امجد کے مکالموں کو خاموشی کے مکالموں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سوچ اور فکر کی موٹی چادر میں لپٹے ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے افسانے کی معنوی فضا کا اسرار اور بڑھ جاتا ہے اور قاری کا ذہن متنوع مفروضات کی جانب سفر کرتا ہے۔"(15)

رشید امجد کے افسانوں کے مطالعے، ان کی تفہیم اور تجزیے کے لیے ان کی خود نوشت "تمنا بیتاب" اور "عاشقی صبر طلب" کا مطالعہ قاری کے لیے سہولت کاری کرتا ہے۔ ان کے بعض افسانے مکمل طور پر اور بیشتر افسانے جزوی طور پر ان کے بچپن، لڑکپن، نوجوانی، جوانی، ادھیڑ عمری یا زیست کے آخری دنوں کی روداد کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر ناول نگار کا پہلا ناول کسی نہ کسی حد تک سوانحی ہوتا ہے۔ رشید امجد کی زندگی کے بہت سے مناظر، حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ ان کے خواب، ان کے خوف، ان کا اضطراب، ان کی تشویش بھی ان افسانوں میں بین السطور جلوہ گر ہیں۔ مثلاً بچپن میں ایک مرتبہ وہ پل سے نیچے پانی میں اتری سیڑھیوں سے گر گئے۔ علیا چاچا نے لپک کر انھیں ڈوبتے پانیوں سے بچا لیا لیکن یہ خوف عمر بھر ان کے ساتھ رہا۔ پھر بچپن کا ایک اور خوف جس سے وہ تمام عمر نبرد آزما رہے کہ نیند میں کوئی بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچے چلا جا رہا ہے اور وہ زور زور سے چیخ رہے ہیں اور ماں کی پناہ میں آ جاتے ہیں۔ یہ خوف زندگی بھر ان کے ساتھ رہا جس کے سبب وہ کبھی کمرے میں تنہا سونے کا تصور بھی نہ کر سکے۔ ماں، بیوی یا چاچا کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہونا چاہیے۔ پھر سری نگر والے مکان کی تنگ اندھیری پیچ و خم کھاتی ہولناک سیڑھیاں، ہر رات ماں اپنے پہلو میں سلانا چاہتی ہے اور معصوم بچہ ہر رات ان خوفناک سیڑھیوں کا سفر طے کر کے نچلی منزل میں مقیم علیا چاچا کی پناہ میں پرسکون سو جاتا ہے۔ علیا چاچا نے جن سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا، کی توجہ اور محبت اس بچے کو اپنی جانب کھینچتی رہی اور ماں ان سے دور رکھنے کے جتن کرتی رہی۔ ماں کی دھمکی "جن تمھیں اٹھا کر لے جائے گا" کا خوف لاشعور میں بیٹھ گیا۔ ایسے میں بچپن کے کچھ خوف اور کچھ خواب ساری زندگی ان کے ساتھ ساتھ رہے اور ان کے ابتدائی دور سے آخر عمر تک کی تخلیقات میں دکھائی دیتے رہے۔ یہاں علامت اور بیانیہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دکھائی دیتے ہیں:

"ان سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں خلا سے ملتے جا رہا ہوں، یہ بوڑھی خاموش سیڑھیاں کئی سالوں سے یونہی اداس ہیں۔ زرد زینوں پر قدم رکھتے ہوئے خوف کی پرچھائیں مجھ سے لپٹ جاتی ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا وجود نیچے بہت نیچے پہلے زینے پر رہ گیا ہے اور میں ہوا کا لبادہ اوڑھے ان زرد سہمے ہوئے زینوں پر چڑھ رہا ہوں، ان زینوں پر دو موڑ ہیں۔ جو بے صدا ہونٹ لیے حیران، خاموش آنکھوں سے آنے والے کو یک ٹک دیکھتے رہتے ہیں اور جوں آنے والا قریب آتا ہے تو اندھیرے کے ہاتھوں سے پکڑ کر اسے چپکے سے نگل جاتے ہیں۔ میں ان موڑوں سے بہت ڈرتا ہوں۔۔۔ ان اندھے بے صدا موڑوں سے گھبرا جاتا ہوں۔ وہ اپنے اندھے ہاتھوں سے مجھے دبوچ لیتے ہیں۔ میں چیختا ہوں لیکن میری آواز کے دائرے ان موڑوں کی سرد نم آلود دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ جاتے ہیں۔۔۔ دوسرے موڑ کی کوٹھڑی ماں بانہیں پھیلائے مجھے دبوچنے کے لیے آگے بڑھتی ہے میرا جسم لہولہان ہو کر بن کر رہ جاتا ہے۔ سرد پڑتے ہوئے لہو کی بوند اور خوف بلوری برف کے ٹکڑوں کی طرح میرے جسم سے ٹپک جاتا ہے۔۔۔۔ لیکن اس کے پاؤں الٹے کیوں ہیں۔۔۔" (16)

گھر کا یہ حصہ ہمیشہ ہی نیم تاریک رہا جس کی وجہ سے ایک عجب طرح کی سیلن زدگی وہاں آنے والے کو اوپر جانے پر مجبور کرتی ہے۔ سیڑھیاں تنگ اور موڑ والی تھیں، ہر موڑ گزرنے کے بعد درمیان والا پلیٹ فارم یہاں تاریکی زیادہ گہری ہے، یہ حصہ سب سے زیادہ ڈراؤنا اور پراسرار ہے، یہاں پہنچ کر وہ ہمیشہ ڈر جاتا ہے اور خوف سے چیخنے لگتا ہے۔۔۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ حرکت کرتا پراسرار ہیولہ۔۔۔ وہ انگارہ آنکھیں اور ہاتھوں میں پڑی لوہے کے کڑوں کی آواز ڈر کے مارے چیخ نکل جاتی ہے۔۔۔ جیسے وہ

بیٹھا ہے پاؤں اوپر کیا ہے۔ پھر جیسے وہ اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔۔۔۔"(17)

کابوس، حالتِ خواب میں یہ احساس کہ جیسے کسی شخص، شیطان، چڑیل یا درندے نے جکڑ رکھا ہے اور اس کے خوف سے وہ اس کے بوجھ سے اپنا دم گھٹتا محسوس کرتا ہے۔ اس سے آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا چاہتا ہے اینٹھتا چلا جاتا ہے۔ اس کیفیت سے باہر آنا چاہتا ہے لیکن بے سود۔۔۔۔ یہ پانچ سات منٹ کا عذاب جھیلنا آسان نہ تھا۔ یہ خواب بہشت یا خواب عدن نہیں وہ دوزخ کی اتھاہ گہرائیاں ہیں۔ خواب اور ابتدائی جوانی میں مراقبے کی طرف توجہ نے اعصاب کو شدید طور پر متاثر کیا۔ سری نگر کے بے بیت گھر سے راولپنڈی والے مندر کے ایک حصے میں قائم آسیب زدہ گھر تک زندگی نے بار بار مابعد الطبیعیاتی کردار و واقعات سے روشناس کرایا۔ غیر مرئی زنجیریں، روحی نا آسودگی، جسم و روح کی تکان نے ہمیشہ اپنے حصار میں لیے رکھا۔ "اکثر رات کو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی اچانک آکر میرے اوپر بیٹھ گیا ہے۔ اس کے بوجھ سے میں کروٹ بھی نہیں لے سکتا، میں چیختا ہوں مگر آواز نہیں نکلتی۔ کچھ دیر یہ کیفیت رہتی ہے اس کے بعد شاید میں پوری طرح حواس میں آجاتا ہوں اور لگتا ہے اوپر بیٹھا اچانک غائب ہو گیا ہے۔"(18) افسانہ نگار، استاد، مرتب، نقاد، رشید امجد کی شخصیت اور فنی جہات متنوع ہیں۔ ان کے فن پر مختلف زاویوں سے بحث کی گنجائش ہے۔ ان کی تخلیقات کا اسلوبیاتی سطح پر جائزہ محقق کے لیے بہت سے بند دروازوں کو کھولنے کا سبب بن سکتا ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں اظہار کے لیے جن لسانی تشکیلات کو وضع کیا گیا ہے، اس پر سیر حاصل کام ہو سکتا ہے۔ شعری وسائل کی جستجو، اس ضمن میں انوکھی تشبیہات، استعارہ در استعارہ کا جا بجا خوبی سے استعمال، علامات کی نئی معنویت لیے ایک وسیع دنیا کا تعارف، تجریدی ڈھانچے، تجسیم کے نت نئے رنگ، پیکر تراشی کے نئے زاویے، امیجری میں جدت، حواس خمسہ کی بوقلمونی، تہذیبی، سماجی اور مذہبی تلمیحات، انوکھے اساطیری حوالے، حکایات کا استعمال، مکالمے کی اہمیت، علامت سے بیانیہ کی طرف سفر، غرض رشید امجد کے ساٹھ سالہ تخلیقی سفر میں اسلوبیاتی سطح پر ارتقائی جائزہ، انھیں ان تخلیق کاروں سے منفرد اور معتبر مقام عطا کرتا ہے جہاں کسی بھی مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی خواہش دکھائی نہیں دیتی۔

رشید امجد کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ ایک وسیع افق رکھتا ہے۔ افسانوں کی قراءت ایک سے زیادہ مفاہیم عطا کرتی ہے، انھوں نے بے تکان لکھا اور ان کے افسانے مختصر ہونے کے باوجود ایک گہرائی اور گیرائی کے حامل ہیں۔ رشید امجد مختصر افسانے لکھتے ہیں، مختصر لکھنا ایک کٹھن مرحلہ ہے لیکن رشید امجد کے نزدیک اگر ایک جملہ ابلاغ کا مسئلہ حل کر رہا ہے تو اس کے لیے پورا پیرا گراف لکھنے کی ضرورت نہیں یا جہاں ایک لفظ اپنا مفہوم بیان کر سکتا ہے تو وہاں وہ پورا جملہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔ افسانے کی بنیادی خوبی ان کا اختصار ہے۔ لفظ قیمتی ہوتے ہیں، انھیں بے دردی سے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایجاز اور کم سے کم الفاظ میں ابلاغ کے لیے سلیقہ اور ہنرمندی کے سبب ان کے افسانوں میں لفظوں یا خیالات کی تکرار موجود نہیں۔ ان کے افسانے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جس موضوع یا خیال پر چالیس صفحات پر مشتمل افسانہ لکھا جا سکتا تھا، عموماً وہ اسے دو چار صفحات میں سمیٹ لیتے ہیں۔ منظر کا تذکرہ ہو یا کردار کا یا واقعے کی پیش کش کم سے کم الفاظ میں بیان، ان کی اولین ترجیح رہی ہے۔ رشید امجد کے افسانوں میں وقت اور زمانے کی آویزش، ماضی، حال و مستقبل کا ادغام، عصر موجود میں زیست کرتے انسان کی شناخت کا مسئلہ، عدم تشخص، بٹی ہوئی شخصیت کے مسائل، انکشاف ذات کے مراحل، داخلیت کا سراغ، فلسفیانہ اور متصوفانہ تفکر، مابعد الطبیعیاتی عناصر، تجسیم، شہری زندگی کے مسائل، رشید امجد کا اختصاص رہے۔ رنگوں کی

طلسم گری، پرندوں اور جانوروں کی ہشت نگری، قلبی و ذہنی، الاقوامی سیاسی تناظر میں عوام کی بے بسی، انسانی کرداروں کا نفسیاتی و سماجی مطالعہ، جن میں سرفہرست ماں اور پھر بیوی اور بیٹی کا کردار ہے۔ کردار نگاری ہی کے سلسلے میں واحد متکلم، ہم زاد و مرشد کا کردار بھی قابلِ توجہ ہے۔ اردو افسانے کے فروغ میں دبستان راولپنڈی کا حصہ، دبستان راولپنڈی کے افسانہ نگاروں کا تقابلی جائزہ۔ خود نوشت، تمنا بیتاب، ماشتی میر طلب، حواشی و تعلیقات۔۔۔ تحقیق و تجزیے کا عمل رکتا نہیں ہے، ان موضوعات پر کام ہوا لیکن مزید کی گنجائش باقی ہے۔

رشید امجد ان چند ایک خوش قسمتوں میں شامل ہیں کہ جن کی شخصیت اور فن پر پاک و ہند کی جامعات میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی کام کیا جا چکا ہے، کام ہو رہا ہے اور آئندہ بھی واضح امکانات ہیں۔

فہرست اسناد محولہ:

1۔ ڈاکٹر رشید امجد سے مکالمہ، مشمولہ عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، جولائی 2010ء، صفحہ 17
2۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میں کیوں لکھتا ہوں، مشمولہ عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، جولائی 2010ء، صفحہ 15
3۔ رشید امجد، ڈاکٹر، میں کیوں لکھتا ہوں، مشمولہ عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، جولائی 2010ء، صفحہ 17
4۔ رشید امجد، ڈاکٹر، عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، 2010ء
5۔ گلزار جاوید، پیر اور است، مشمولہ چہارسو، جنوری فروری 1998ء، ص 9
6۔ رشید امجد، ڈاکٹر، دور کا چاند، مشمولہ عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، 2010ء، ص 73
7۔ رشید امجد، ڈاکٹر، بحال خواب، مشمولہ "عام آدمی کے خواب"، پورب اکادمی، 2010ء، ص 813
8۔ رشید امجد، ڈاکٹر، بھیگی شام کا تسلسل، مشمولہ "عام آدمی کے خواب"، پورب اکادمی، 2007ء، ص 152
9۔ احمد اعجاز، مرتب، رشید امجد کے منتخب افسانے، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2003ء، ص 14
10۔ مجاہد باقر، امتیاز حقی، مشمولہ ماہنامہ چہارسو، جنوری فروری 1998ء، ص 16
11۔ رشید امجد، ڈاکٹر، بوسیدہ ہڈیوں پر لرزتی زرد کونپل، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، راولپنڈی، 2002ء، ص 61
12۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ریت آدم کے بیٹے، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، راولپنڈی، 2002ء، ص 129
13۔ رشید امجد، ڈاکٹر، جلاوطن، مشمولہ عام آدمی کے خواب، پورب اکادمی، 2010ء، ص 160-161
14۔ رشید امجد، ڈاکٹر، تتلی کا دوسرا قدم، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، راولپنڈی، 2002ء، ص 105-106
15۔ مجید مضمر، ڈاکٹر، رشید امجد کی افسانہ نگاری، مشمولہ چہارسو، جنوری فروری 1998ء، ص 21
16۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پچھلے پہر کی موت، مشمولہ عام آدمی کے خواب، ص 90-91
17۔ رشید امجد، ڈاکٹر، بے منزل منزلیں، مشمولہ ست رنگے پرندے کے تعاقب میں، راولپنڈی، 2002ء، ص 93-94
18۔ رشید امجد، ڈاکٹر، تمنا بے تاب، راولپنڈی، حرف اکادمی، 2003ء، ص 16

●●●

رشید امجد کی افسانہ نگاری

پروفیسر جلیل عالی

☆ نوٹ: یہ مضمون آج سے بیس سال پہلے کسی جریدے میں شائع ہوا مگر جلیل عالی صاحب نے خصوصی طور پر ''تخلیق'' کو ڈاکٹر رشید امجد کے گوشہ کے لئے بھیجا!

''وحشت نظر سے آگے'' میں شامل افسانوں کے سات مجموعوں کے بعد رشید امجد کے نئے افسانوں کا ایک اور مجموعہ ''دشتِ خواب'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ان کے چودہ افسانے شامل ہیں۔ دشت کے استعارے کے ساتھ ساتھ بعض نفسیاتی، تہذیبی اور مابعد الطبیعیاتی تجربات و سوالات کی تکرار کے باوصف ان افسانوں میں رشید امجد کے فکری و ذہنی سفر کے چند نئے اور اگلے مرحلے بھی نمایاں ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ آیئے ذرا اس نگار خانے پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلیں۔

''پھول تمنا کا ویران سفر'' اس مجموعے کا پہلا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں رشید امجد نے ایک قدرے روایتی کہانی کو اپنے مخصوص علامتی و استعاراتی طریقِ کار کی بجائے بیانیہ انداز میں تحریر کیا ہے مگر اپنے اسلوب کے ایک اہم عنصر ''ایجاز و اختصار'' سے کچھ ایسا کام لیا ہے کہ افسانہ پڑھنے والے کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ ان کے ان افسانوں کی ذیل میں تو نہیں آتا جو حکمت و دانش کا کوئی سوال اٹھاتے ہیں یا شاعرانہ آگہی کے کسی پہلو کو روشن کرتے ہیں۔ کہانی تو وہی پہلی محبت کے حوالے سے آرزو کے خون ہو جانے اور نارسائی کا زخم کبھی نہ بھر پانے سے تعلق رکھتی ہے مگر رشید امجد کی ہنرمندی نے اسے ایک منفرد ذائقے سے آشنا کر دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کی روایتی کہانیاں بھی زندگی کے اندر چھپے حادثوں میں اتفاقات یا فطرت کے عمل دخل کے بارے میں انسان کو سوچنے پر مجبور کر ہی دیتی ہیں۔ اس شام وہ وقت آیا مگر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ لاہور سے آنے والی ایک بس سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت نکلی اور سیدھی اس بنچ کی طرف آئی۔ چند لمحے اس کے سامنے گم سم کھڑی رہی۔ پھر نڈھال ہو کر اس پر گر سی پڑی۔ بس سے ایک نوجوان اٹیچی لئے نکلا اور بنچ کے پاس آ کر کہنے لگا: ''امی! کیا ہوا!! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟! ارے آپ تو رو رہی ہیں؟'' عورت نے دوپٹے سے آنسو صاف کئے اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تیس برس پہلے ایسی ہی ایک شام میں یہاں سے لاہور گئی تھی۔'' وہ چپ ہو گئی۔ جیسے کچھ یاد کر رہی ہو۔ ''دو ہی دن کے لئے تو گئی تھی'' پھر بیٹے نے تجسس سے پوچھا ''ابو نے میری شادی کر دی ——— جھٹ پٹ ——— ایک ہفتے کے اندر اندر تمہارے ابو لندن جو جا رہے تھے'' پھر اداس رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تیس برس بیت گئے لیکن یہ بنچ یہیں پڑی ہوئی ہے'' پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بیٹے سے بولی۔ ''چلو'' ——— اور یہاں سے صرف دو فرلانگ دور اسی سڑک کے بائیں طرف والے قبرستان میں ایک تازہ قبر پر پڑے ہوئے پھول ہوا کے زور سے پتی پتی ہو کر دوسری قبروں پر بکھر گئے۔

''خواب رُت'' میں بڑی عمدگی سے ایک ہی چھت تلے ایک ہی بستر پر میاں بیوی کے رشتے میں بندھے ہوئے دو افراد کی مزاج

کی دوئی اور احساساتی فاصلے کی نشان دہی کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک ہی وقت میں جسمانی قربت کے باوجود دونوں وجود کس طرح دو مختلف زمانوں میں سانس لیتے گئے ہیں اور ایک کا زمان ومکان دوسرے کے زمان ومکان سے کیسے مختلف ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ کہ انسان کی اندرونی کیفیات کا سفر خواب رستوں سے ہوتا ہوا کیسی کیسی تحیر کن منزلوں تک لے جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں یوں تو سینکڑوں واقعات رونما ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی کوئی واقعہ ایک ایسے سنگ میل کی طرح سوچوں کے نہاں خانے میں نقش ہو کر رہ جاتا ہے جو کسی نئی سمت کا نقطہ آغاز بن جاتا ہے۔ ''گھر پہنچتے رات گہری ہو جاتی ہے۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے چپ چاپ اندر آتا ہے۔ بیوی گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔ وہ اپنے حصے کے آدھے بستر پر گر پڑتا ہے۔ سونے سے پہلے اسے خیال آتا ہے جانے وہ کہاں چلی گئی ہے۔ گھر کتے کی آخری چیخ اور اس کے منہ سے ابھرتا سرخ فوارہ ـــــ آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ یہ اس کا روز کا معمول ہے۔ اس سڑک سے گزرنے والے اس کے عادی ہو چکے ہیں اور روز دیکھتے ہیں کہ وہ گاڑی ایک طرف کر کے سڑک کے دونوں کناروں پر کچھ تلاش کرتا ہے۔ پھر جنگل میں سے ہوتا ہوا بڑی سڑک تک آتا ہے اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک دوسری طرف کی بستی کو دیکھتا رہتا ہے۔ بس کبھی کبھار کسی سے پوچھ لیتا ہے ـــــ ''تم نے اسے دیکھا تو نہیں!'' ''کسے؟'' راہ گیر پوچھتا ہے۔ ''وہ جو برسوں پہلے یہاں اتری تھی مگر لوٹ کر نہیں آئی'' پھر اپنے آپ سے کہتا ہے ـــــ ''اسے کیا خبر'' لیکن جاننے والے بتاتے ہیں کہ یہ سب اس کا واہمہ ہے۔ برسوں پہلے تو اس کے پاس گاڑی کیا سائیکل تک نہیں تھی۔'' ''نہیں تعبیر کوئی'' افسانہ نگار کی اپنی شخصیت سے شعری واردات کی صورت ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار معلوم سے نامعلوم اور نامعلوم سے معلوم کے درمیان سرگرداں رہنے کی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ رشید امجد کو سامنے کی حقیقتوں کے پاس پردہ پڑے اسرار اور مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں سے جو گہری دلچسپی ہے وہ اپنی غیر معمولی تخلیقی جستوں میں اس حوالے سے دور دور تک ان کا تعاقب کرتا ہے مگر زندگی کے ٹھوس حقائق اس گہری معنویت کے سارے سلسلے کو الجھا کر رکھ دیتے ہیں اور موجود کا جنون موجود کی آہنی گرفت میں دم توڑنے لگتا ہے اور فقط لاحاصلی کی گرد باقی رہ جاتی ہے۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی ایک پُر اسرار خاموشی چھا گئی۔ ڈھولک پر تھاپ لگاتی انگلیاں جہاں تھیں وہیں رہ گئیں۔ بول ہونٹوں پر ہی اٹک گئے۔ دولہا نے سر اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں لیکن اس سے پہلے کہ کچھ اور ہوتا ایک بوڑھی عورت دوڑتی ہوئی اس کے سامنے آ گئی اور چیختے ہوئے بولی ــــ ''کئی برس پہلے تم اسی طرح میری آشاؤں کو لوٹ کر لے گئے تھے اب بیٹے کو لینے آ گئے ہو۔''

وہ جہاں تھا وہیں کا وہیں رہ گیا۔ زمانے نے عورت کے چہرے پر جھریوں کا جال سا بن دیا تھا لیکن ان کے پیچھے چہرہ تو وہی تھا جس کے لئے اس نے برسوں خواب دیکھے تھے۔ ''بوبو۔ بوبو تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے؟'' عورت روہانسی ہو گئی۔ ''میں'' لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ عورت اس کی آواز سن کر چونکی۔ اس نے غور سے اسے دیکھا اور چند قدم پیچھے ہٹ گئی ''تم''

پھر کوئی کچھ نہ بولا۔ وہ خاموشی سے مڑا اور چند بل کھاتا ہوا اپنے راستے پر ہو لیا۔ کچھ دور جا کر احساس ہوا کہ کوئی پیچھے چلا آتا ہے۔ ''جوان لوٹ جاؤ'' اس نے مڑ کر کہا۔ لیکن وہ جوان نہیں تھا عورت کا لڑکا ادھ سایا تھا۔ اس کے سارے وجود میں ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ ''نہیں نہیں'' وہ چیختا ہوا دوڑنے لگا۔ اسے لگا ایک ہی لمحے میں اس مقام پر آ پہنچا ہے جہاں برسوں پہلے سفر کا آغاز کیا تھا۔ رشید امجد باہر اور اندر کے رواں منظر نامے کو ساتھ ساتھ بیان کرنے میں حیرت انگیز مہارت رکھتے ہیں ''شہر بدری'' میں باہر اور اندر کے منظر نامے کے درمیان

ایک پُراسرار رشتے کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ اس میں خواہشِ مرگ کی ایک روحانی اور مابعد الطبیعاتی جہت عجیب انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔ مرشد کا کردار دراصل رشید امجد کے اکثر افسانوں کے مرکزی کردار کی اپنی ہی ایک وجدانی سطح کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں یہ کردار جن حالات میں شہر بدر ہوتا یا جن حالات میں دوبارہ شہر آتا ہے وہ انسانی سائیکی کے بعض ایسے گوشوں کی پردہ کشائی کرتے ہیں جن کا مطالعہ بڑی حد تک پیراسائیکالوجی کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک صبح جب وہ دفتر جا رہا تھا، بڑے چوک میں اچانک اندھیرا شہر میں اتر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہر شے اندر باہر سے سیاہ ہو گئی لیکن وہ دوبارہ پہلے مرشد کے سامنے شہر کی فصیل عبور کر کے صحرا میں اتر گیا تھا۔ سارے رشتے، آوازیں، ہنگامے دور رہ گئے تھے۔ اس کی بیوی روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ گھر سے تو ٹھیک ہی گئے تھے مگر گیارہ بجے اطلاع آئی کہ ——— ''اس کا ایک ساتھی دوسروں کو بتا رہا تھا۔ دفتر سے پہلے والے چوک میں جب گڑگڑاہٹ کی آوازیں آئیں تو ہم سب دوڑ کر ادھر ادھر ہو گئے۔ اسے جانے کیا سوجھی کہ گاڑی سے اتر کر بالکل ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بس ———''

''شوقِ ہندوستاں کی آرزو میں'' زندگی کے بانکپن اور آرزو پسندی کی آخری سرحدوں پر بے معنویت کے دھندلکے کی تصویر کشی کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے دو جنگ آزما لشکروں کو ایک ہی فرد کی ذات میں اکٹھا کر دیا ہے یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک ہی فرد میں مارنے اور مارے جانے والے لشکری کو ابھار کر انسان کی اس اندرونی کشمکش کی عکاسی کی ہے جو کسی غیر جانبدار اور وابستہ لمحے میں ایک بنیادی سوال بن کر اس کا گھیراؤ کر لیتی ہے۔ ''لیکن یہ سب آخر کس لئے!؟'' دفعتاً ایک خیال سہمے ہوئے پرندے کی طرح اس کے من کے اجڑے درخت پر لمحہ بھر کے لئے پھڑکا۔ ڈھال پر ساتھی کی تلوار کا وار روکتے ہوئے اس نے سر جھٹک کر اس خیال سے پرندے کو اڑانا چاہا لیکن وہ درخت کی شاخوں میں چھپ گیا اور کچھ دیر بعد جب وہ اپنے دشمن کے سینے میں تلوار اتار رہا تھا، ننھا سا پرندہ پھدک کر ٹہنی پر آ بیٹھا۔

''آخر یہ سب کس کے لئے'' اگلی صبح جب دن شروع ہوا تو اس کے بازوؤں کا تناؤ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ وہ تین وار ہی روک سکا، دشمن نے اسے آ لیا اور ایک ہی بھرپور وار میں ڈھال اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ بند ہوتی آنکھوں اور اکھڑتی سانسوں میں اس نے آخری بار اپنے اوپر جھکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ اس کا اپنا چہرہ تھا۔

''ان صدیوں کی دوری'' تاریخ و تہذیب سے تشکیل پانے والی انسانی نفسیات کے تحت الشعوری اور لاشعوری پردوں پر متحرک رہنے والی تصویروں کی مدد سے بنا گیا تھا۔ اجتماعی تاریخ کے صحرا میں فرد کا وجودی ذرہ جس طرح اپنی بے ماضگی میں بھی ہر حیاتیاتی کل کا حصہ بنا رہتا ہے اور صدیوں کے فاصلے کسی ایک غیر معمولی لمحے کے پھیلاؤ میں کس طرح گم ہو جاتے ہیں۔ افسانہ ایسے ہی سوالات کی حیرتوں سے دوچار کرتا ہے۔ میں نے چونک کر کہا ——— ''انہیں پانی تو بھر لینے دو'' بیٹا میں نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا ——— ''وہ تو کب کی پانی بھر کر جا چکیں'' جوں جوں رات کی سیاہی صحرا کے وسیع صحن میں اترنے لگتی ہے خیموں سے اٹھتی ان کی مدھم آوازیں صحرا کی وسعتوں میں پھیلنے لگتی ہیں، اس کے ساتھ ہی کھنڈر بھی آباد ہونے لگتا ہے۔ پہلے ایک کمرہ یا فرش سنگ مرمر کی ملائمت میں بدلتا ہے۔ پھر در و دیوار روشن ہوتے ہیں۔ مراد خان کی مسند بچھتی ہے اور نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے امرا کھڑے ہو کر مراد خان کے بیٹھنے کا انتظار کرتے ہیں۔ خیموں سے بلند ہوتی آواز اور پائل کی جھنکار صدیوں کا فاصلہ طے کر کے لمحہ بھر میں ان دالان میں اتر آتی ہے۔

''یخ بستہ شام'' حالیہ تاریخ میں انسانی وجود کے جذبۂ ترحم کی نوعیت کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ اسے پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے

کہ ایک بے انت دوسری بے بسی کی حالت وتسکین کی خواہش ناکام میں ہاتھ پیر مارتی کس طرح عدم کے سمندر میں ڈوب جاتی ہے۔

دستک کی آواز پھر ابھری۔ دیر تک سنائی دیتی رہی۔ پھر معصوم، مایوس اور اداس آواز ابھری —— "دروازہ کھولیں —— پلیز دروازہ کھولیں" "میری آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی" کہتے ہوئے آہستہ آہستہ ساکت ہو گئے۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ یوں لگا جیسے پاؤں کی طرف ایک یخ بستہ پتھر تیزی سے اوپر کی طرف کھسک رہا ہے۔

دستک کی آواز میں نقاہت آ گئی۔ جیسے دستک دینے والے کے ہاتھ شل ہو گئے تھے۔

"درو —— زہ —— کھو ——" آواز ٹوٹ گئی۔ "خالی ہاتھ ستکاری اور تیز آہو" اس پُراسرار حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ بعض اوقات کوئی غیر معمولی لمحہ کس طرح انسان کو اپنی ہمہ گیر اور مضبوط گرفت میں لے کر اس کی قلب ماہیت کر دیتا ہے۔ ایسے میں جب اندر سب کچھ بدل جاتا ہے تو باہر کے سب حوالے بھی اپنی اپنی معنویت تبدیل کر لیتے ہیں۔ معمول کے منظر نامے سے ادھر کی دنیا کے غیر معمولی اور پُراسرار واقعے رشید امجد کو بہت راس آتے ہیں۔ جنگل ماستا کی طرح ہے جو سب کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے وہ جو گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی سوکن کو لانے نکلی تھی جنگل کے طوفان میں کہیں کھو گئی اور وہ جو اس روز گیان کی ایک نئی منزل سے آشنا ہوا تھا، وہ بھی جنگل میں ایسا گم ہوا کہ لوٹ کر نہ آیا۔ صبح کو صرف وہ آئی جس کا یہ سارا تماشا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ندی کنارے اسی پتھر پر جہاں وہ اکثر بیٹھا کرتا تھا ایک تازہ کھلا ہوا پھول پڑا ہے جو رات کے طوفان کے بعد بھی اسی طرح تر و تازہ اور محفوظ ہے۔ "وحشت کے ساتھ وحشت ہونے کی لذت" میں شاعرانہ احساس تنہائی کے سلسلوں کو بڑی فن کاری سے صوفیانہ واردات کی سرحدوں سے ملایا گیا ہے۔ علائق دنیا سے اوپر اٹھ کر ایک بے پایاں اور بے کنار وسعت کی روحانی سرشاری تک کا یہ سفر تو شاعری کے گنجلک ایمائیت بھرے پیرائے میں بیان ہو سکتا تھا یا پھر ایک طویل ناول سے تشکیل پانے والے پس منظر سے ابھر سکتا تھا۔ رشید امجد نے اسے مختصر افسانے کے قالب میں سمو کر خود افسانے کے نئے امکانات روشن کیے ہیں اور یہ عمل رشید امجد کے دوسرے افسانوں میں بھی اپنا کرشمہ دکھاتا ہے۔ کچھ دیر تو کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا منظر ہے لیکن جب آنکھیں آہستہ آہستہ چیزوں کو اپنی گرفت میں لینے لگیں اور حواس قدرے قائم ہوئے تو معلوم ہوا کہ کھڑکی کے آگے ایک طویل صحرا پھیلا ہوا ہے۔ حد نظر تک صحرا ہی صحرا۔ مگر اس کا گھر تو شہر کے مرکز میں ہے، پھر یہ صحرا میں کہاں آ گیا؟ بیٹا بیٹا اور بیوی دوڑتے ہوئے آئے اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگے، لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ صحرا اس کمرے کمرے اسے یوں لگا جیسے دور، بہت دور کہیں کوئی دستک دے رہا ہے اور اسے پکار رہا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے بیٹیاں، ان کی بیویاں، دونوں بیٹیاں اور پھر بیوی کے چہرے آنکھوں میں لہرائے لیکن بے نام ہو کر وحشت کے ساتھ وحشت اور ریت کے ساتھ ریت ہو جانے کی لذت غالب آ گئی۔

"میرا کوئی نام نہیں، کوئی رشتہ نہیں" اس نے شانے اچکائے اور تیز تیز آگے بڑھنے لگا۔ "بے منزل منزلیں" انسانی نفسیات کے دو بنیادی عناصر "امید اور خوف" کہ زندگی بھر اس کے ساتھ رہتے ہیں، کو ماں اور باپ کی علامتوں میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ماں امید کی علامت بنتی ہے اور باپ خوف کی۔ شاید انسان ابھی دونوں کے نقطۂ اتصال کا ایک امکان ہونے کے ناتے کسی قطعی منزل تک رسائی کے امکانات سے محروم رہتا ہے۔ "یہ سب کیا ہے؟" وہ خود سے سوال کرتا ہے "یہ خواب ہے یا وہ خواب ہے" لیکن کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ خواب کون سا ہے۔ یہ جس سے وہ گزر رہا ہے یا وہ جس کا تصور اس کے اندر کہیں موجود ہے۔ وہ شفیق باہوں کا حصار، ماتھے پر رس بھرے ہونٹوں کا بوسہ

اور ان سب کے درمیان کہیں دھندلی سی نیم تاریکی میں ایک پُراسرار حرکت کرتا ہیولہ جس کی لال انگارہ جیسی آنکھوں کو وہ کسی بھی وقت دیکھ سکتا ہے اور ہاتھوں میں پڑے لوہے کے کڑوں کی آوازیں سن سکتا ہے۔

''میسر ہی نہیں اپنے پاس ہونا'' میں منتشر اور منقسم رہنے والی انسانی ذات کو کبھی کبھار ایک وحدت و یکجائی سے ہمکنار کر دینے والے جوہر کو گرفت میں لینے کا جتن کیا گیا ہے۔ مگر آخر کار یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ جوہر تو گرفت میں آ ہی نہیں پاتا۔ بس چھیڑ چھوڑ کر گزر جاتا ہے۔ کثرت کے کرشمے ہمیں زیادہ دیر اپنے آپ سے ہم رشتہ نہیں ہونے دیتے۔ زندگی شاید خود سے ادھوری اور عارضی ملاقاتوں ہی سے عبارت ہے۔ مجھ سا یہ کوئی اور تو عرصے سے میرے اندر رہ رہا ہے۔ رہا میں —— تو میں مدتیں ہوئیں ڈوب کر کہیں کھو چکا ہوں۔ ہوا یوں کہ میں اور وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اٹکھیلیاں کرتے چلے جاتے تھے کہ —— وہ کون ہے؟ یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

میں اس کے چہرے کی پہچان نہیں رکھتا کیونکہ اس کا چہرہ بدلتا رہتا ہے۔ میں تو بس اس کے لمس اور لمس کی خوشبو سے واقف ہوں اور وہ جہاں بھی ہو جس روپ میں بھی ہو یہ خوشبو مجھے اس کا پتہ بتا دیتی ہے اور میں اسے ہجوم میں سے ڈھونڈ لیتا ہوں۔ مگر میری اس کی رفاقت کے لمحے بہت ہی محدود اور مختصر ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ رفاقت چند لمحوں کے لئے ہی ہوتی ہے۔ آخر پر ''توبہ'' کے عنوان سے تین افسانے ہمارے یا ہماری طرح کی کسی قوم کے بھی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زوال کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ''توبہ'' اقتدار کی بھوک سے جنم لینے والے جھوٹ اور دھوکہ وفریب کے تانے بانے کی نشاندہی کرتا ہے اور اقبال کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے کہ

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر　　پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

تاہم رشید امجد یہیں محدود نہیں رہا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایسی ساحری کے طول پکڑنے کے بھیانک انجام کی تصویر بھی دکھائی ہے۔ اگلے اس سے اگلے اور اس سے بھی اگلے پنڈال میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ سر اٹھایا۔ بے ہنگم آوازوں کو سنا اور پھر اپنی اپنی تالوں اور سُروں میں ڈوب گئے۔ شور ہنگامے اور مستی و سرور میں یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ باہر سے بھی کوئی اندر گھس آئے ہیں اور مارنے والے اپنے نہیں باہر کے لوگ ہیں۔ میلے میں قتل و غارت کا ایک بازار گرم ہے۔ سر کٹ کٹ کر گر رہے ہیں لیکن مستی و سرور میں سرشار کسی کو اندازہ نہیں کہ مارنے والے کون ہیں اور کب اندر آئے ہیں۔ ''توبہ 2'' قوموں کی تقدیر کے حوالے سے شمشیر و سناں اول اور طاؤس و رباب آخر کی داستان سناتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ سب اچھا ہے کی مسحور کن آوازیں فقط حکمرانوں ہی کے دن تھوڑے نہیں کرتیں بلکہ پوری قوم کو بھی زنجیریں پہنا دیتی ہیں۔

خلیفہ جس کے محل کی ایک بالکونی دریا کی طرف کھلتی تھی اپنے مصاحبین میں بیٹھا نئے منصوبوں پر گفتگو کر رہا تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے سے بھنتے گوشت کی مہک لہروں پر تیرتی محل کی بالکونی تک آ پہنچی۔ خلیفہ نے مہک کو محسوس کیا اور بالکونی میں آن کھڑا ہوا۔ دریا کے دوسرے کنارے شعلوں کا ایک کارواں حرکت کر رہا تھا۔ اس نے حیرت سے اس منظر کو دیکھا اور ایک مصاحب سے پوچھا ''یہ کیا ہے'' مصاحب نے دست بستہ عرض کی ''حضور یہ جنگلی لوگ ہیں'' ''لیکن یہاں کیوں آئے ہیں؟'' خلیفہ کو تشویش ہوئی۔ ''حضور یہ اپنی شہزادی آپ کے حرم میں رہنا چاہتے ہیں'' صبح سویرے جب ان کی عبادت گاہوں میں خوش الحانی کے مقابلے ہو رہے تھے، وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح بستی پر ٹوٹ پڑے اور —— ''توبہ 3'' میں تہذیبی نشوونما کے سارے راستے بند کر لینے اور اجتماعی زندگی کے شہر خموشاں میں بدلتے

چٹنے جانے کی افسوس ناک صورت حال کو پیش کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ بند تہذیبیں کس طرح ٹھہرے ہوئے پانی کی صورت گلنے سڑنے کے عمل سے گزرنے لگتی ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ ان دیواروں کے درمیان مقید ہو کر ہوا کی رفتار سست پڑنے لگی۔ اس میں ٹھہراؤ آ گیا اور ایسے ہی کسی ٹھہرے ہوئے لمحے میں ایک پتھر نے جنم لیا جو آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا اور اب ساری فضا پتھر ہے ایک نہ ٹوٹنے والا منجمد پتھر منظر! اس منجمد منظر میں سانس تو لے رہے ہیں لیکن زندگی کی حرارت نہیں۔ جنوں کا زیر و بم تو محسوس ہوتا ہے لیکن حرکت میں ایک عجیب بے بسی ہے کہ بستی کی فضاؤں میں ایک کینسر پھیل گیا ہے۔ جس سے ساری بستی اندر ہی اندر مر رہی ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ نہیں۔ سو اس بے بسی میں بھی ایک لذت آ گئی ہے۔ رشید امجد کے افسانوں سے برآمد ہونے والے بعض فکری و نظری نتائج سے تو شاید اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس کی فنی دسترس کا جادو ایسا سر چڑھ کر بولتا ہے کہ اس کی گرفت سے بچ نکلنا آسان نہیں۔

"دشت نظر سے آگے" میں رشید امجد کے افسانوں کے سات مجموعے شامل ہیں۔ ان میں سے پانچ مجموعے "بیزار آدم کے بیٹے"، "ریت پر گرفت"، "سہ پہر کی خزاں"، "پت جھڑ میں خود کلامی" اور "بھاگے ہے بیاباں مجھ سے" الگ الگ شائع ہو چکے ہیں جب کہ "کاغذ کی فصیل" اور "شہر عشق پہ یوں ہوا میرے بعد" پہلی بار اس کتاب میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ "کاغذ کی فصیل" اولین شائع شدہ مجموعے "بیزار آدم کے بیٹے" سے پہلے کے افسانوں پر مشتمل ہے اور "شہر عشق پہ یوں ہوا میرے بعد" میں اب تک آخری شائع شدہ مجموعے "بھاگے ہے بیاباں مجھ سے" کے بعد لکھے گئے افسانے شامل ہیں۔ یوں اس کتاب میں شامل ایک سو افسانوں کی یکجائی رشید امجد کے 1960ء سے 1990 تک کے فکری و فنی سفر کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر مجموعی نظر ڈالنے کی سہولت بہم پہنچاتی ہے۔

رشید امجد اردو افسانے کے استعاراتی و تجریدی مکتب فکر کا ایک ممتاز نمائندہ ہی نہیں بلکہ اس اسلوبیاتی دائرے میں اپنی بعض منفرد اور مخصوص جہتوں کے حوالے سے اپنے اثرات قبول کرنے والے بہت سے افسانہ نگاروں کے علاوہ چند ایک معتبر افسانہ نگاروں کا پیش رو بھی ہے۔ زبان و بیان کے حسن و دلکشی کے اعتبار سے تو کوئی دوسرا افسانہ نگار کم ہی اس کے معیار تک پہنچ پاتا ہے۔ اس کا انداز تحریر دراصل اس کی تخلیقی واردات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتا ہے۔ تخلیقی واردات کی اصطلاح اگرچہ زیادہ تر شاعری کے لئے استعمال ہوتی ہے مگر رشید امجد کے افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بے محل محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے افسانے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذات اور حیات و کائنات کے بارے میں ابتدا ہی سے کئی ایک سوالات اس کے متجسس ذہن کو گھیرے ہوئے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس کی پوری شخصیت کا مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ موجود و ناموجود کے بارے میں تشکیک اور انکشاف و دریافت اس کے ہاں بار بار ایک شعری واردات کی سی صورت اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ فکری و احساساتی اعتبار سے جنس، رومانویت، سیاسی و معاشرتی جبر اور مابعد الطبیعیاتی اسرار سبھی رشید امجد کی دلچسپیوں کے خصوصی منطقوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یوں تو ان سب منطقوں کی نشاندہی کرنے والی تحریریں اس کے ہر دور کے افسانوں میں مل جاتی ہیں مگر "دشت نظر سے آگے" کو شروع سے آخر تک پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں جنسیت کا عنصر غالب ہے اور اس دور کی رومانویت زیادہ تر جنسی تلذذ کے گرد گھومتی ہے۔

پھر کب آؤ گے؟ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔ مجھے وہ اس تتلی کی طرح لگی جس کے سارے پنکھ شریر بچوں نے ہلا ہلا کر گرا دیے ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی نرم نرم ہتھیلی کی نم آلود گرمی محسوس کرتے ہوئے

کہا۔" نئے پھول نکلنے سے پہلے لوٹ آؤں گا" میری بات سن کر اس کی حالت یوں ہو لی، جیسے کسی سلگتی لکڑی پر تیل چھڑک دیا گیا ہو اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور سانپ کی سی شوکتی آواز میں بولی۔ "تم حرام زادے ہو ـــــ تم سب حرام زادے ہو" اور بھاگتی ہوئی برآمدے میں چلی گئی۔ ("اندھی رات کا درد" صفحہ 68)

1977ء سے 1984ء تک کے افسانوں میں سیاسی و معاشرتی جبر کی عکاسی زیادہ ملتی ہے اس میں رشید امجد کی احتجاجی حیثیت کے ساتھ ساتھ اس دور کی معروضی صورت حال کی غیر معمولی گھٹن کا بھی دخل ہے۔ "اس گھٹن زدگی، دریچے پانی کی سرسراہٹ اور اس گیس دار اندھیرے ـــــ

"کیا ایک دوسرے کی باتیں سمجھنا ضروری بھی ہے؟ ہم سب زندگی کو اپنے اپنے دریچے سے گزرتے دیکھتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ یہ شرکت کیا اور کیوں؟ ایک تنہا ایک لمحہ یا مقام تو ضرور دیا ہے جو صرف اور صرف اپنا ہوتا ہے۔ جہاں کوئی دوست، ماں، باپ، بیوی، بچے شرکت نہیں کرتے، تنہائی کا ایک لمحہ اپنا لمحہ۔"

"میں اس ایک لمحے کی لذت میں گم رہنا چاہتا ہوں۔ زندگی کی سنسان سڑک پر خاموشی سے چلتے جانا اور ایک دن کسی تنگی کی دھند میں ڈوب جانا، لیکن یہ جو کبھی کبھی مڑ کر دیکھنے کی خواہش ہے، ماضی کے ہاتھ کی گرم گرم تھپک ـــــ"

("لمحہ جو صدیاں ہوا" صفحہ 634)

تجسس و جستجو، تشکیک و حیرت اور انکشاف و دریافت کے پھیلتے ہوئے عکس اب رشید امجد کے افسانوں پر حاوی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب حبس، داماں، سیاسی و معاشرتی گھٹن، تہذیبی بے چہرگی اور کشف و عرفان الگ الگ اور مجرد حقیقتیں نہیں رہ گئے۔ سب ایک دوسرے میں پیوست ہیں اور ایک دوسرے کے تعلق سے اپنی معنویت اجاگر کر رہے ہیں۔ معروض و موضوع کی دوئی ختم ہو رہی ہے۔ معاشرتی گرد و پیش کی روایتی تصویر کشی سے لے کر دانش و حکمت کی چاشنی کی طرف بڑھتی ہوئی تخلیقی واردات کا تیس سالہ سفر رشید امجد کے فکر و احساس کے ارتقا کی کہانی کہتا ہے جو تہ دار ذہانت سے کام لیتے ہوئے "دشت نظر سے آگے" کو ایک احساس دانش ور کے سوانحی ناول کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک رشید امجد کے اسلوبیاتی ارتقا کا تعلق ہے اسے تین واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ 1960ء سے 1966ء تک روایتی بیانیہ سے کام چلایا گیا ہے 1966ء سے 1978ء تک استعارہ در استعارہ گنجلک ہوتے ہوئے اور رجب علی بیگ سرور کی طرح مواد اور اظہار کی دوئی کا احساس دلاتے ہوئے پر تکلف انداز تحریر کا زمانہ ہے اور 1978ء کے بعد سے آج تک زیادہ سبک، رواں اور فکری و احساساتی واردات سے پوری طرح ہم آہنگ استعاریت اور تجریدیت کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں چھٹی دہائی کا زمانہ لسانی تشکیلات کے چرچے کا زمانہ تھا۔ شاعری میں افتخار جالب کی "ماخذ" اور ظفر اقبال کی "گلافتاب" غیر تخلیقی اور میکانکی ہونے کی بنا پر ناکام تجربات ثابت ہوئیں۔ شاعروں میں نئی لسانی تشکیل کا تخلیقی جواز پیش کرنے میں صرف جیلانی کامران کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ظفر اقبال نے غیر سنجیدہ انداز میں لسانی تجربے کیا اور اپنی بعض سنجیدہ و شائع شدہ غزلوں کی لسانی ساخت کو شعوری طور پر توڑ مروڑ کر اپنے تجرباتی مجموعوں میں شامل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تجربوں کا اس کے بعد کے تخلیقی سفر میں کوئی ـــ نہیں ملتا۔ اگر لسانی تشکیل تخلیقی واردات سے ہم آہنگ نہ ہو اور اس کے قدرتی تقاضوں کا نتیجہ نہ ہو تو اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ افسانوں میں بھی لسانی تشکیلات کے بہت سے تجربات ہوئے

مگر کچھ عرصہ ٹھوکریں کھاتے رہنے کے بعد ایک نیا لسانی مزاج تشکیل دینے میں کامیاب ہو جانے والوں میں رشید امجد کا نام نمایاں ہے۔ ''دشت نظر سے آگے'' میں موجود تینوں ادوار کی لکھائی کے لئے ذیل کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

بیانیہ اسلوب: ''موجے بائی اور دھنا وا کمہار نے ذرا ہٹ کر درخت کے سائے تلے چولہے بنائے اور آگ جلا کر دیگیں چڑھا دیں۔ صحن میں رونے دھونے کے ساتھ ساتھ زیورات، کپڑوں اور مختلف عورتوں کے بارے میں گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ کوئی اپنی بہو کی تعریف کر رہی تھی، کوئی بیٹے کی بے مروتی کا شکوہ لیے بیٹھی تھی۔ کسی کونے میں بیٹی کی شادی کے اخراجات کا تخمینہ پیش کیا جا رہا تھا۔ باہر دری پر موسم، فصل، موت اور قحط کمہاروں کی تنگیوں پر بات چیت جاری تھی اور درخت کے نیچے موجا بائی اور دھنا وا کمہار تیزی سے دیگوں میں چمچے پھیرتے ہوئے اپنے اپنے شاگردوں سے کہہ رہے تھے۔ ''او نے کھوتی دے پتر، دھیاں رکھنا، چاول نرم نہ ہو جائیں۔'' (''عکس کا بال'' صفحہ 22)

استعارہ در استعارہ جھلک ہوتا ہوا انداز تحریر: اس کی یادوں کی چتا صدیوں کے جنگل چہرے پر پھیلی ہوئی پہچان کو بہت دیر سے دانہ دانہ چگ رہی تھی لیکن جب بہت دیر کے بعد بھی شجر شناساؤں کے کوے یاد کے مہکتے بچے نے سر نہ اٹھایا تو اس کے دل میں رسوائی خوشی مرجھاہٹ کی کھردری مٹھیوں میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اس نے اپنا سر میز کی تختی پر ٹکا دیا اور اس کی آنکھوں کی ویران راہداریوں میں بجتی بے آسی رس رس کر میز کی شفاف سطح پر بہنے لگی۔ (''نارسائی کی مٹھیوں میں'' صفحہ 282)

مواد سے ہم آہنگ استعاراتی پیرایہ اظہار: اس دوران ماں بھی خواب کا ذکر کرتی تو چند دنوں کے لئے گھرانے کا تصور اسے ایک نئی گرماہٹ سے آشنا رکھتا۔ وہ موقع دیکھ کر مختلف لڑکیوں کی کھدائی کرتا رہتا۔ یا یوں ہوتا، چند دن بعد کسی دوسری جگہ کا انتخاب کرتا۔۔۔ کچھ دن گھرانے کا خواب اسے اپنی نرم بغل میں دبائے رکھتا پھر آہستہ آہستہ زندگی کی روا روی کی خشکی اس پر غالب آجاتی۔ (''دشت امکان'' صفحہ 617)

رات کی تنہائی میں جب چیزیں سو جاتی ہیں، میں اپنے وجود کی فصیل پر کھڑا ہو کر ایک لمبی زقند بھرتا ہوں۔ میرا اپنا آپ اکھڑ کر خلا میں پھیلنے لگتا ہے۔ (''دل زندہ ہے'' صفحہ 808)

ایک خاموش بہتا دریا سامنے ہے اور پار کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسے پار کیا ہی نہ جائے اور اسی کنارے چلتے چلے جائیں شاید کہیں کوئی راستہ مل جائے یا ادھر کا کنارہ کسی دوسرے کنارے سے ہم آہنگ ہو جائے لیکن کب تک؟ کبھی نہ کبھی تو پار جانا ہی ہوگا۔ (''دل دریا'' صفحہ 842)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ رشید امجد کا اسلوب اس کی تخلیقی واردات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکا ہے۔

◆◆◆

میں اس لئے بھی محبت کا کھیل ہار گیا — کہ چال چلنے میں اس کو بہت مہارت تھی
(اظہر جاوید)

بلی مار

آغا گل

نوٹ۔ (دہلی میں ملاح کو بلی مار (چپو مارنے والا) کہتے تھے۔ غالبؔ محلہ بلی ماراں میں رہتے تھے۔)

پروفیسر ڈاکٹر رشید امجد سے بہت سی یادیں وابستہ ہو گئیں۔ یوں تو ادبی رابطے تھے مگر میری پوسٹنگ کوئٹہ ہوئی تو ہماری دوستی بڑھ گئی۔ میں اسلام آباد کو پیار سے کوئٹہ پکارتا ہوں کیونکہ دیگر ملک سے اس کا برتاؤ کوئٹوں جیسا ہے۔ پروفیسر ایک درویش صفت انسان تھے۔ ان کی زندگی میں سادگی اور درویشی نمایاں تھی۔ لباس سادہ بلکہ عدم توجہ کا شکار رہتا جو کہ دانشوروں کی پہچان ہے۔ محمود سلم نے نمل یونیورسٹی میں میرے فکشن پہ ریسرچ کا بیڑا اٹھایا تو پروفیسر ہی نگران بنے یکطرفہ ان کی دوستی ہو اس پہ تحقیقی کام۔ علاوہ ازیں معروف ادیب محمد غلام کی اعوان بھی نمل میں ہی چلے آئے اور شعبہ اردو میں پڑھانے لگے۔ ان دونوں دوستوں کے باعث میں بھی موقع پاتے ہی شعبہ اردو میں چلا آتا۔ بعض اوقات ٹیکسلا یا آس پاس کے شہروں سے ہمیں مدعو کیا جاتا تو کئی گھنٹے ان کی رفاقت ملتی۔ چونکہ وہ ایک سینئر افسانہ نگار تھے۔ خوب ہی گفتگو رہتی۔ میں ان سے سوالات کرتا چلا جاتا۔ اتنی بہت سی کتابیں پڑھنے کی بجائے میں تساہل سے کام لیتے ہوئے شارٹ کٹ لیتا۔ پروفیسر نے اردو ادب کے لیے بہت کام کیا۔ انتخاب و ترتیب کی ذمہ داری سنبھالا کرتے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ ''پاکستانی ادب 1947ء سے 2008ء'' ہے۔ یہ انتخاب افسانہ انتہائی صبر آزما کام تھا۔ 61 برس کی ادبی تخلیقات کا جائزہ لے کر ان کا انتخاب پیش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اس کے علاوہ نمائندہ افسانہ منتخب کرنا، اختصار مد نظر رکھنا۔ بہت سے مرحلے تھے پروفیسر ڈاکٹر رشید امجد کا اپنا ایک انداز تھا۔ رواں دواں اپنا اسٹائل وضع کرنا دشوار ہے مگر انہوں نے اپنا ایک اسٹائل دیا اور منوایا بھی جب بھی ملاقات ہوتی وہی محبت وہی خلوص۔ میرا فکشن بھی دلچسپی سے پڑھا کرتے۔ یہی نہیں بلکہ چند بار کرم فرمائی ہوئی مجھ پہ لکھا بھی کرتے۔ ان کا آخری مضمون الحمرا میں میرے فکشن پہ شائع ہوا تھا۔ ان کی رائے کا میں بے حد احترام کرتا۔ مجھے حیرت بھی ہوتی کہ اس جلتی بلتی دنیا میں وہ صرف ادب اور ادیب کے بارے میں گفتگو کرتے۔ کیا مجال کہ زندگی کی ناہمواریوں کو دوستوں کی محفل میں پیش کرتے۔ ہمارا فیڈ بیک (Feed Back) تو ہمزاد کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی پسند و ناپسند کی نظریاتی عینک لگائے رکھتے ہیں۔ جبکہ پروفیسر کو میں نے بالکل ہی غیر جانبدار پایا۔ وہ میرٹ کی بات کرتے۔ ان کے پاس علمیت کی کسوٹی تھی۔ میں کالجوں یونیورسٹیوں میں پڑھاتا رہا۔ طلبا کی کامیابیوں پہ سوائے صدارتی ایوارڈ کے پروفیسر کو نوازا نہیں جاتا جبکہ پولیس کو چور پکڑنے پہ مجرم گرفتار کرنے پہ لاکھوں کے انعام دیے جاتے ہیں۔ پولیس کا یہی کام مجرم پکڑنا ہے۔ ہماری تاریخ میں آج کا غدار کہلانے والا کل میں مقدس ہیرو بن جاتا ہے۔ ہمارے ہاں شاہراہوں کے نام بھی حملہ آور فاتحین پہ رکھے جاتے ہیں۔ کسی دانشور، پروفیسر، صاحب علم کو فوقیت نہیں دی جاتی۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر نے ایک ملاح کی طرح ہزاروں طلبا کو کامیابی کی منزل پہ اتارا۔ مگر خود وہ پانی کے بیچ میں ہی رہا۔ اتنا بڑا المیہ صاف قوم نے محسوس نہیں کیا۔ پروفیسر رشید امجد جیسے اساتذہ و ادیب ہی ہمارا قومی سرمایہ ہیں ہمارے سفیر ہیں۔ انہیں خراج تحسین پیش کیا جائے۔

◆◆◆

ڈاکٹر رشید امجد، افسانوی دنیا سے عالمِ حقیقت منتقل ہو گئے!

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ادبی دنیا کے معروف جریدہ "تخلیق" کے مدیر عزیزم سونان اظہر جاوید نے فون پر بتایا کہ افسانوی دنیا کے بے تاج بادشاہ، ڈاکٹر رشید امجد 2 اور 3 / مارچ 2021ء کی درمیانی شب ہم سے بچھڑ گئے۔ ۳ مارچ ۲۰۲۱ء کو انھیں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر رشید امجد اُردو افسانہ کے جدِ امجد تو نہیں ہیں لیکن افسانوی دنیا کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ انھوں نے قدیم و جدید افسانہ نویسوں کا مطالعہ کیا ان کے اسلوب کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے لیے نئی راہ تلاش کی۔ والدین نے ان کا نام رشید اختر ڈار رکھا لیکن ادبی دنیا میں وہ رشید امجد کے نام سے مقبول ہوئے۔ اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ پہلی ملاقات معروف شاعر و ادیب اور پاکستان ٹیلی ویژن کے نامور پروڈیوسر افتخار مجازی کی بزمِ دوستاں اور ایک ٹی وی پروگرام میں ہوئی۔ دوسری ملاقات کا اعزاز اسلام آباد کے ادبی اجلاس میں ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے دردولت اور ان کے وصال پر وزیر کوٹ ۸ ستمبر ۲۰۱۰ء کو بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ عزیزم ذوالفقار احسن کی توسط سے "آفتابِ ادب ـــــ ڈاکٹر وزیر آغا" کا فلیپ لکھوانے کے سلسلے میں ان سے رابطہ ہوا۔ میری کتب کے حوالے سے بھی اُن سے مراسلت رہی۔ وہ جہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ انسان دوستی اور ادب شناسی میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ اُن کی ادبی رفعتوں کے بارے میں کئی جامعات میں تحقیقی مقالہ جات تحریر ہو چکے ہیں۔ جہدِ مسلسل اور فکری و فنی حوالے سے ادبی دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ اُن کا سفرِ زیست محنتِ شاقہ کا رہینِ منت رہا۔

ڈاکٹر رشید امجد 5 مارچ 1940ء کو سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والدین ۱۹۴۷ء میں سری نگر سے ہجرت کر راولپنڈی آ گئے۔ اس کے بعد مستقل سکونت راولپنڈی میں اختیار کی۔ اُن کے والد غلام محی الدین موتی تختی قالینوں کے ڈیزائنر تھے۔ کسی انگریز کی قالینوں کی فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنی بھی ایک چھوٹی سی فیکٹری کھول رکھی تھی۔ اُن کے پردادا ڈوگرا حکمرانوں کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اپنے خاندان سمیت امرتسر چلے گئے تھے۔ وہ پشتیں وہاں رہیں لیکن ان کے والد سارے خاندان کو چھوڑ کر دوبارہ سری نگر آ گئے۔ انھیں کشمیری زبان کے علاوہ فارسی اور پنجابی پر بھی دسترس تھی۔ فارسی اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اُن کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری شادی کے لیے وہ امرتسر گئے اور خورشید بیگم سے (رشید امجد کی والدہ) سے نکاح ہوا اور وہ انھیں لے کر واپس سری نگر آ گئے۔ اُن کی والدہ اولاد کے لیے مزاروں پر منتیں مانگتیں اور وظیفے کرتیں۔ رشید امجد کو اکثر کہا کرتی تھیں "تجھے بڑی منتوں سے پایا ہے"۔ ۸ جون 1960ء کو ان کے والد انتقال کر گئے۔ والد کی وفات کے بعد رشید امجد ورکشاپ پر بھی کام کرتے رہے۔ انہی دنوں ماجد الباقری جو اس وقت ویلفیئر آفیسر تھے سے ملاقات ہوئی۔ رشید امجد کی ٹرانسفر مین ورکشاپ چکلالہ میں ہوئی۔ سائیکل پر ورکشاپ جاتے اور اسی پر واپس آتے۔ یہاں ان کا تقرر لاگ کیپر کے طور پر ہوا۔ اُن کا کام ورکرز کی حاضری لگانا اور ان کی چھٹیوں کا حساب رکھنا تھا۔

یہ سارا کام گھنٹہ دو گھنٹہ میں ختم ہو جاتا۔ باقی وقت گزارنے کے لیے رشید امجد ایک آدھ جاسوسی ناول ساتھ لے جاتے اور فارغ وقت میں پڑھتے رہتے۔ اسی ورکشاپ میں ایک اور شخص بھی کتابیں لے کر آتا جس کا نام اعجاز راہی تھا۔ کتابوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اعجاز راہی کے نام سے کہانیاں لکھتا ہے۔ ایک دن اس نے ایک کہانی پڑھنے کو دی۔ رشید امجد نے کہا کہ ایسی کہانیاں تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ اعجاز راہی کے کہنے پر رشید امجد نے ایک کہانی لکھ کر دی جس کی اعجاز راہی نے خوب تعریف کی۔ اس کے بعد اس نے چند لکھنے والوں سے ان کا تعارف کروایا جن میں نثار ناسک، جمیم درانی، سید احمد اور حلیم الظفر شامل تھے۔ غلام رسول طارق نے رشید امجد کی ادبی تربیت کی۔ ان کے افسانوں کو دیکھتے، درست کیے، انھیں افسانہ لکھنے کا ڈھنگ سکھایا۔ وہ اکثر ان کے افسانے پھاڑ دیا کرتے اور کہتے اب اس افسانے کو درمیان سے شروع کرو۔ انھوں نے کہانی لکھنے کی ایسی مشق کرائی کہ رشید امجد لکھتے چلے گئے۔ غلام رسول طارق نے ان کے اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار کو جگایا۔ اس کی علمی و ادبی تربیت کی اور رشید امجد کو بتایا کہ اب وہ فلمی پرچوں میں اپنے افسانے بھیجنے کے بجائے "ادبِ لطیف"، "نقوش"، "اوراق"، "ماہِ نو"، "ادبیات" ایسے پرچوں کو افسانے بھیجا کریں۔ رشید امجد نے استاد غلام رسول کی ہر بات پر سرِ تسلیم خم کیا اور کامیابیوں کی منزلیں طے کرتے چلے گئے۔ ممتاز ادیب و معروف ممتاز افسانہ نویس اور ممتاز دانشور ممتاز مفتی نے ان کے فکر و فن کو ہدیہ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "بے شک رشید امجد ایک تخلیق کار کی حیثیت سے قیام حاصل کر چکا ہے۔ سانپ نکل گیا ہے لیکن لکیریں آج بھی رینگ رہی ہیں۔ اس نے ان رینگتے کیڑوں کو اپنے شعور سے نکال دیا ہے لیکن اس کے لاشعور میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی۔ رشید امجد آج بھی انجانے عالم میں حیرت زدہ ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ یہ ہونی کیا ہوتی ہے؟ کیوں آتی ہے؟ کیوں ہو جاتی ہے؟ یہ کیا بھید ہے؟ اس کی تخلیقات زندگی کی پر اسراریت سے بھری ہوئی ہیں۔ اس کے استعارے اور علامتیں اس پر اسراریت کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ حیران ہوتے ہیں کہ یہ رشید امجد کیسا افسانہ نویس ہے جو افسانہ سوچتا ہے، نہ اسے لاشعوری طور پر پالتا ہے، نہ کڑیاں جوڑنے کا تردد کرتا ہے، دوستوں کے ساتھ گپ بازی بھی کرتا ہے، ساتھ افسانہ بھی لکھتا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لاشعور کے زور پر افسانہ لکھتا ہے شعور کے زور پر افسانہ لکھو تو پہلے مرکزی خیال کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ پھر اس نقطے پر پہنچ کر اسے پہنچنا پڑتا ہے۔ رشید امجد شعور تک دوڑ سے بے پروا ہے جبھی اس کے افسانوں میں زندگی کی پر اسراریت کا عنصر موجود ہے یہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ لکیریں چل رہی ہیں!"

نثار ناسک کے کہنے پر ایک ادبی تنظیم "بزمِ میر" بنائی۔ نثار ناسک اس کے سیکرٹری، حلیم الظفر جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے جب کہ رشید اختر ناز اور اعجاز راہی کو مجلسِ عاملہ میں رکھا گیا۔ اس کے اجلاس باقاعدگی سے ہونے لگے۔ اس دوران رشید اختر نے دو تین مزید افسانے لکھ لیے۔ دوستوں کے کہنے پر "رومان" ایسے فلمی پرچوں کو بھیج دیے۔ اگلے مہینے ان کی کہانی چھپ گئی یوں وہ باقاعدہ طور پر افسانوی دنیا کا حصہ بن گئے۔ ابتدا میں انھوں نے رشید اختر ناز کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ ان کا ایک افسانہ "سنگم" غلام رسول طارق نے دیکھ کر انھیں شاباش دی اور اسے کسی اچھے پرچے کو بھیجنے کا مشورہ دیا اور کہا اسے "ادبِ لطیف" میں بھیج دو۔ "ادبِ لطیف" ان دنوں "نقوش"

کے بعد سب سے اہم رسالہ سمجھا جاتا تھا۔ میرزا ادیب "ادبِ لطیف" کے مدیر تھے۔ غلام رسول طارق نے ہی رشید اختر ناز سے انھیں رشید امجد لکھنے کا مشورہ دیا۔ ستمبر 1960ء کے شمارے میں رشید امجد کا افسانہ "سنگم" شائع ہو گیا۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ذوالفقار احسن لکھتے ہیں:

> "اردو افسانے نے تقسیم کے بعد جو ارتقائی مراحل طے کیا ہے اس پر نگاہ ڈالی جائے تو چند ایک نام ایسے بھی ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں جنھوں نے اپنا ایک خاص انداز منفرد و دلکش کو اپنایا ہے۔ افسانہ نگاروں کی اس کھیپ میں بے شمار نام سامنے آئے مگر ایک نام ایسا بھی ہے جس نے سب سے الگ، سب سے منفرد، سب سے جدا اور سب سے انوکھی راہ اختیار کی۔ نہ صرف راہ اختیار کی بلکہ کامیابی و کامرانی کے ساتھ اس پر رواں دواں بھی ہیں وہ نام ہے ڈاکٹر رشید امجد کا۔ ڈاکٹر رشید امجد نے جدید اردو افسانے کی دنیا میں جو نام کمایا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ انھوں نے افسانوں کے عنوانات سے لے کر افسانے کے مرکزی کرداروں تک کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے جدا رکھا ہے۔"

رشید امجد نے 1955ء میں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن پنجاب سے میٹرک اور 1962ء میں ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ایف اے لاہور بورڈ 1963ء اور بی اے پنجاب یونی ورسٹی لاہور (1965ء) سے کیا۔ رشید امجد نے 1967ء اور 1975ء میں بالترتیب پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ انھوں نے تدریس کا شعبہ اختیار کیا اور 1968-71ء کے دوران ایف جی سرسید کالج واہ کینٹ میں پڑھانے کے بعد 1971ء سے 2000ء تک ایف جی سرسید کالج راولپنڈی میں پڑھاتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کے عہدے تک پہنچے۔ 2001ء میں وہ نمل اسلام آباد کے شعبہ اردو میں وزٹنگ پروفیسر بن گئے۔ اردو ادب میں ان کی پہچان بطور افسانہ نگار، نقاد، محقق اور مرتب و مدیر کے علاوہ بطور استاد کی بھی ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق سے ان کا تعلق بہت گہرا اور دیرینہ ہے بلکہ حلقہ اربابِ ذوق کے پلیٹ فارم سے ہی انھوں نے اپنی تنقید کا آغاز کیا اور اپنی آرا حلقے (راولپنڈی شاخ) کی مجالس میں پیش کرتے رہے جس کا ذکر انھوں نے اپنی خود نوشت "تمنا بے تاب" میں جا بجا کیا ہے۔ جدید ادب کے نقاد کے طور پر ان کی ایک پہچان ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین مختلف ادبی رسائل و جرائد میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ ادبی مجالس اور مختلف کانفرنسز اور سیمیناروں میں بھی ان کی تنقیدی آرا ناقدین کے لیے سود مند ثابت ہوئیں۔ رشید امجد نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "تمنا بے تاب" کے نام سے تحریر کی۔ وقت چل رواں ہے ہر آنے والا وقت اپنے ساتھ تبدیلیاں لاتا ہے اس لیے ڈاکٹر رشید امجد نے خود نوشت میں اضافہ کر کے اس کا نام "عاشقی صبر طلب" رکھا۔ اس پر بھی افسانوی رنگ غالب ہے۔ ان کے افسانوں میں علامت نگاری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ دنیائے ادب کے ممتاز نقاد، انشائیہ نگار، شاعر، مدیر "اوراق" ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے قریبی دوست رشید امجد کے افسانوی مجموعہ "پت جھڑ میں خود کلامی" کے تاثر میں لکھا ہے:

> "رشید امجد کے افسانے واقعات اور کرداروں سے نہیں بلکہ خود کلامی کے دوران ہونٹوں سے لوٹ کر گرتے ہوئے انھیں لفظوں سے مرتب ہوتے ہیں۔ ہر لفظ کے ساتھ کوئی نہ کوئی شبیہ یا خیال منسلک ہوتا، لہٰذا کہہ سکتے کہ

> رشید امجد کا افسانہ خیال کو مرکز مان کر اس کے گرد ایک جال سا بُن دیتا ہے۔ بارش کے بارے میں سب کو علم ہے کہ فضا میں ذرات موجود ہوتے ہیں جب بادلوں میں نمی بڑھتی ہے تو ذرات جھک کر بوجھل ہونے لگتے ہیں تاآنکہ ہر ذرہ ایک موٹا سا قطرہ بن جاتا ہے جسے بادل سنبھال نہیں پاتے اور وہ زمین پر آن گرتا ہے بالکل اسی طرح اکثر افسانہ نگاروں کے ہاں کوئی واقعہ یا کردار ''مرکزہ'' بن جاتا ہے جس کے گرد افسانہ نگار کے تمام محسوسات گویا چمٹ جاتے ہیں اور وہ افسانے میں منتقل ہو کر زمین پر اتر آتا ہے۔ رشید امجد کا معاملہ قدرے مختلف ہے کیوں کہ رشید امجد کے افسانے کا مرکزہ واقعہ یا کردار نہیں بل کہ ''خیال'' ہے۔ اس کے ہاں غیب سے مضامین آتے ہیں۔ کوئی خیال یا استعارہ یا تشبیہ جو مرکزہ بن کر افسانہ نگار کے محسوسات کو اپنے گرد لپیٹ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں بالخصوص ''پت جھڑ میں خود کلامی'' کے افسانوں میں کوئی کردار بھی اپنے نام یا نسب کو ماتھے پر چپکائے ظاہر نہیں ہوا۔''

وہ تقریباً چار دہائیوں سے مسلسل افسانے لکھتے رہے۔ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد درجن سے زائد ہے۔ تنقیدی موضوعات پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ''نیا ادب''، ''رویے اور شناختیں''، ''یافت و دریافت''، ''شاعری کی سیاسی و فکری روایت''، ''میرا جی شخصیت اور فن''، ''پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)''، ''جدید ادبی تناظر'' شامل ہیں۔ جب کہ افسانوی مجموعوں میں ''بے زار آدم کے بیٹے''، ''ریت پر گرفت''، ''سہ پہر کی خزاں''، ''پت جھڑ میں خود کلامی''، ''بھاگے ہے بیاباں مجھ سے''، ''دشت نظر سے آگے''، ''کاغذ کی فصیل''، ''عکس بے خیال''، ''گم شدہ آوازکی دستک''، ''تمنا بے تاب'' (سوانح حیات)، ''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں''، ''افسانوں کا کلیات'' ''عام آدمی کے خواب'' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۶ء میں حکومت پاکستان نے تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا۔ علاوہ ازیں بہت سی ادبی تنظیموں نے انھیں کئی ایوارڈ دیے جن میں نقوش ایوارڈ بھی شامل ہے۔ عالمی شہرت یافتہ نقاد ڈاکٹر انور سدید رقم طراز ہیں:

> ''رشید امجد کا شعری لہجہ علامتی اظہار اور تجریدی ڈھانچہ سب مل کر اس کے فن کی ایک نمایاں جہت اور اس کا منفرد تشخص قائم کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رشید امجد تجربوں کے سیلاب رواں میں بہہ کر محض کہانی کو گرفت میں نہیں لیتا بل کہ اس تاثر کو پکڑتا ہے جو سیال صورت میں تجربے کے مرکزہ میں موجود ہوتا ہے اور صرف تخلیقی افسانہ نگار کے ذہن کی طرف خود بخود لپکتا چلا آتا ہے ''بے زار آدم کے بیٹے''، ''ریت پر گرفت''، ''سہ پہر کی خزاں'' سے لے کر ''پت جھڑ کی خود کلامی'' تک رشید امجد نے خاصہ طویل سفر طے کر لیا ہے۔ اس سفر میں اس نے اظہار و ابلاغ کے چند بے حد نادر تجربے کیے اور یوں اپنے تخلیقی ذہن کی جدت سے مشاہدے کی تکلیب کی۔ وہ موضوع سے لپٹنے کے بجائے اس جوہر کو تلاش کرتا ہے جو بالعموم فن کاری کی نظر سے اوجھل ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر رشید امجد نے اردو افسانے میں علامت کو اجاگر کیا۔ ان کے بیشتر افسانے علامتی انداز میں ملتے ہیں۔ کہانیوں میں مادہ پن اور نفسیاتی الجھاؤ نہیں ہے۔ ان کے موضوعات کی رنگا رنگی قابلِ ستائش ہے۔ کئی ایک افسانوں میں احساس کی خوشبو اور بہت سے افسانوں میں گداوٹ بھی ملتی ہے۔ ان کے تراشے ہوئے کردار قابلِ ستائش ہیں۔ وہ ہر کردار سے کام لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے ہاں

حقیقی زندگی کا رنگ چہروں پر پھیلی مسکراہٹ، ذوقی خواہشات، بکھرتے بیٹے، بدلتے ہوئے حالات، چپقلش پر نظر آنے والے حادثات حقوق وفرائض کا تعین عام ملتا ہے۔ انھوں نے گمنام کرداروں کو بھی نام عطا کیے ہیں۔ ان کا اسلوب نگارش نا صرف دلچسپ ہے بلکہ وہ کئی افسانوں میں فلیش بیک تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب افسانے ہیں لیکن حقیقت سے دور ہیں۔ رشید امجد کے ہاں معاشرتی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیاں معاشرے کے مشاہدے سے جنم لیتی ہیں۔ ان افسانوں میں ایک فکر بھی کارفرما ہوتی ہے اور علامت کا استعمال کر کے وہ افسانے کو صرف خوب صورت بنا دیتے ہیں بلکہ ہم عصر افسانہ نگاروں سے منفرد اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر بھی افسانہ لکھتے اس کے ساتھ بھرپور انصاف کرتے۔ انھوں نے قدیم وجدید تقریباً تمام افسانہ نگاروں کا مطالعہ کیا۔ کئی بہتر لکھنے والوں سے متاثر بھی ہوئے لیکن ان کے رنگ میں لکھنے کے بجائے ایک الگ راہ اختیار کی یہی ان کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل بھی ہے۔ معروف نقاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے: ''رشید امجد کا فن احساس کی ان سطحوں کو چھونے کی جانب سرگرم سفر ہے جو آسانی سے دسترس میں نہیں آتیں''

ممتاز انشائیہ نگار، شاعر، افسانہ نگار اور نقاد، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش رقم طراز ہیں:

> ''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں'' کے افسانے پڑھتے ہوئے ہمیں رشید امجد کے ہاں بیدار شعور اور انکشاف ذات کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ نظر آتا ہے جو ایک طرح سے The other Self کی تلاش سے منسلک ہے تاہم ان کے افسانوں میں Know thyself کا پہلو بھی اہمیت کا حامل ہے۔ خودی کی تلاش، شناخت یا پہچان کا عمل اس صوفیانہ مسلک سے رشتہ قائم کرتا ہے جس کی رو سے جس نے خود کو جانا اس نے گویا اپنے رب کو پہچانا۔ رشید امجد کے افسانوں کے متعدد کردار کسی خاص وقت یا زمانے کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی کی طرح نہیں ہیں بلکہ ابعاد ثلاثہ میں بیک وقت محو سفر رہتے ہیں۔ زمان مسلسل Duration کا پہلو ان کے افسانے کا ایک خصوصی امتیاز رہا ہے۔ علاوہ ان کے افسانوں میں قبر کا استعارہ موت کا اعلامیہ ہونے کے ساتھ ساتھ جون بدلنے یا قلب ماہیت کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔''

افسانہ کسی ایک نقطے پر مرکوز نہیں رہتا۔ حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ افسانے کا دامن وسیع ہوتا رہتا ہے۔ رشید امجد بھی افسانوی دنیا میں کسی ایک مرکز پر نہیں رکے ان کا ارتقائی سفر جاری رہا۔ ان سے اکتساب فیض کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ رشید امجد جدید اردو افسانے میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدہ بتول لکھتی ہیں:

> ''رشید امجد کے افسانوں میں معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات اور مستقبل کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ جو باتیں رشید امجد نے چند سال پہلے بیان کی ہیں آج حرف حرف سچائی کی دلیل ہے جس طرح معاشرہ ترقی کرنے کی بجائے زوال اور پستی کی طرف جا رہا ہے۔ وقت کی رفتار میں جس قدر تیزی سے پیچھے کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس صورت حال کا بہت خوب صورت بیان ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔''

ڈاکٹر رشید امجد کے افسانے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور عصری آگہی ان کے بیدار شعور کا حصہ ہے۔ وہ علامتی افسانوں میں اپنا اظہار نہایت آسانی اور سادگی سے کر جاتے ہیں کہ قاری جوں جوں ان کے افسانوں کے دیار میں حیران کھڑا رہ جاتا ہے

۔ڈاکٹر رشید امجد کے افسانے معاشرتی چاشنی اور احساس انتخاب کی کوکھ سے جنم لیتے رہے۔انھوں نے استحصالی قوتوں کے خلاف قلم سے جہاد کیا۔رشید امجد سب کے محبوب تھے۔اسلام آباد کو افسانہ نویسی کا مرکز بنانے کے لیے ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔۱۹۴۰ء سے ۲۰۲۱ء تک ان کی زندگی جہد و جہد میں گزری۔انھوں نے روزگار کی زلفیں سنوارنے کے لیے چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی عار محسوس نہ کیا۔ان کے ہاتھوں کی لکیروں پر محنت کی شکنیں عام نظر آتی تھیں۔ان کا سفر زیست جہد مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت تھا۔دوستوں کے دوست تھے۔کسی سے نفرت کرنا ان کی ذات سے کوسوں دور تھا۔دوستوں کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ان کی شخصیت کا اہم پہلو تھا۔ڈاکٹر رشید امجد اپنے گرد پھیلے ہوئے ادبی گروہوں کے خلاف تھے۔علم و ادب کی آبیاری کے لیے وہ تمام دوستوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لیے کوشاں رہے۔رشید امجد ادب کا کوہ ہمالیہ تھے۔ان کی ہمہ جہت شخصیت اور فکر انگیز خیالات ہمارے اذہان سے دور نہیں ہو سکتے۔مدیر "تخلیق" محترم سونان اظہر جاوید نے ۲۰۲۰ء کے لیے تخلیق ادبی ایوارڈ کا پینل تشکیل دیا تو راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) بھی اس پینل کا حصہ تھا۔پینل کے تمام ممبران نے اس ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر رشید امجد کا نام تجویز کیا۔سونان اظہر اس اعزاز پر انھیں مبارک باد دینے کے لیے ۱۸ نومبر ۲۰۲۰ء کو اسلام آباد تشریف لے گئے تو مجھے بھی ڈاکٹر رشید امجد سے بات کرنے کا موقع فراہم کیا۔ان سے میری یہ آخری گفت گو تھی۔قبل ازیں جب انھیں میری کوئی کتاب موصول ہوتی تو وہ شفقت بھرے جملوں سے میری حوصلہ افزائی فرماتے۔فنکار مر جاتا ہے لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دیتا۔آج ڈاکٹر رشید امجد ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی باکمال شخصیت کے نقوش ہمارے اذہان پر منقش ہیں۔یقیناً تخلیق ایوارڈ کی تقریب اب ان کی یاد میں ہی منعقد ہوگی۔سونان اظہر جاوید کی شخصی عظمت ہے کہ وہ دوستوں کو یکجا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ڈاکٹر رشید امجد کا پیغام ایک کہکشاں کی صورت آسمان ادب پر زندہ رہے گا۔ان کا قلم قرطاس وقت پر اپنے حقائق کی تازگی بکھیرتا رہے گا۔انھوں نے اپنے قلم اور زبان کو وقار عطا کیا۔اپنے طرز احساس اور جدید اسلوب کی وجہ سے ان کا نام صفحۂ قرطاس پر زندہ رہے گا۔ان کی تحریر میں جو شعور و ادراک، شائستگی اور اپنے معاشرے سے دلی وابستگی ہے وہ انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ان کا جمالیاتی احساس اور تجربات زندگی نئے لکھنے والوں کے لیے مینارۂ نور ہے۔تیشۂ فرہاد لیے ڈاکٹر رشید امجد نے افسانوں میں حقائق کی جوئے شیر لانے کے لیے لفظوں سے جو کام لیا وہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ڈاکٹر رشید امجد کا ادبی سرمایہ اس خلا کو پر کرتا رہے گا جو ان کے انتقال سے ادب میں پیدا ہو گیا ہے۔

کیا سوچ کے کرتا ہے وہ آغاز سفر کا   جو شخص یہاں واقف انجام نہیں ہے

◆◆◆

سنہری الفاظ

انسان پریشان ہوتا ہے تو راستہ بدل لیتا ہے، منزل بدل لیتا ہے، دوست بدل لیتا ہے، ارادہ بدل لیتا ہے، لباس بدل لیتا ہے حتیٰ کہ گھر بدل لیتا ہے مگر افسوس "خود کو نہیں بدلتا۔"

رشید امجد: ایک شخص، ایک عہد

حسین مجروح

رشید امجد اردو افسانے کے افق پر ساٹھ کی دہائی میں جلوہ گر ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو افسانے کا ماحول بیانیہ نصف النہار پر تھا اور راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر جیسے بڑے ناموں کی موجودگی سے اردو افسانے کا آسمان جگمگا رہا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب تقسیم کے زخموں سے لہو رس رہا تھا اور اردو افسانہ، رومانویت، حقیقت پسندی اور طبقاتی کشاکش کی ادبی نمود کے مراحل سے گزرنے کے بعد، ہندوستان اور پاکستان میں باقاعدہ آزادی کے سنگین سوالات کو اپنے بیانیے کا موضوع بنانے میں منہمک تھا اور اسی زمانے میں معروف افسانوی چلن کے پہلو بہ پہلو موجود سے مطمئن اور افسانوی اظہار میں نئے زاویے اور نئے شگوفے نکالنے کی للک نو آمدہ اردو افسانہ نگاروں کو علامت، تجریدیت کی ابہام پر مائل و ملتفت کر رہی تھی، جس کے عقب میں جدید تر مغربی تحریکات و تصورات کے اثرات واضح و صاف دکھائی پڑتے تھے۔ اردو افسانے کی لے بدروایت کے برعکس نیا افسانہ اور اس کے لکھنے والے تقسیم کی اتھل پتھل اور اس کے جلو میں بنتے بگڑتے سماجی، معاشی اور سیاسی منظرنامے کی ادبی تعبیر کے متلاشی تھے۔ جسے پاکستان میں ایوب خان کے مارشل لاء نے ایک مسموم اور جبریت پسند منظر نامہ فراہم کر دیا تھا۔

اس دورانیے پر رشید امجد افسانے کی جولان گاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک جانب ترقی پسندی کی مقصدیت اور سماجی انصاف پر استوار معاشرے کا خواب ان کی آنکھوں میں شرارے چھوڑتا ہے تو دوسری طرف نئے افسانے کی رمزیت اور ابہامیت ان کی تخلیقی لپک کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ کسی بھی نئے افسانہ نگار کے لیے یہ صورت حال خاصی آزمائش کا سامان رکھتی ہے۔ وہی غالب والا معاملہ کہ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر۔

لیکن اپنے پہلے افسانے سے ہی جو ساٹھ کی دہائی کے کسی برس، ادب لطیف میں شائع ہوا انہوں نے نئے رجحانات سے مفاہمت کرتے ہوئے کہانی پن کی اہمیت اور توازن فکر کو جس طرح مقدم رکھا اور وہ آخر تک نبھایا بھی، وہ حیرت انگیز ہی نہیں لائق ستائش بھی ہے۔ ہر چند کہ ان کا ذہنی میلان ترقی پسندی کی جانب تھا اور انہوں نے اپنی اس پسند کو کبھی چھپایا بھی نہیں لیکن وہ ہمارے ان معدودے چند ادیبوں میں شامل ہیں جنہوں نے ایک واضح سماجی، سیاسی نقطۂ نظر کے حامل ہوتے ہوئے بھی، انتہا پسندی کی راہ اختیار نہیں کی۔ چنانچہ ان کے افسانے، دیگر جرائد کے علاوہ 'اوراق' میں بھی تواتر سے شائع ہوتے رہے جو معروف معنوں میں جدیدیت کا علمبردار تھا۔ جن لوگوں نے ساٹھ، ستر اور اسی کی دہائی کے پاکستانی منظرنامے کا مشاہدہ کیا ہے، انہیں بخوبی اندازہ ہوگا کہ ان دنوں سیاسی اور نظریاتی کشمکش کا کیا عالم تھا اور ادیبوں کی دائیں اور بائیں کی تقسیم اس قدر گہری تھی کہ ایک کیمپ کے ادیب کا مخالف کیمپ کے پرچے میں چھپنا اس کی نظریاتی اور گروہی شناخت کے لئے مہلک سمجھا جاتا تھا لیکن رشید امجد نے اس انتہا پسندی سے ہمیشہ گریز کیا، اپنی تحریروں میں بھی اور شخصی تعلقات میں بھی، چنانچہ ان کی ادبی دوستیاں اور رفاقتیں ہر زاویہ نگاہ کے لوگوں سے رہیں، کسی مفاد اور مصلحت سے بالاتر ہو کر۔ ان

کا پہلا افسانوی مجموعہ "بیزار آدم کے بیٹے" 1974ء میں شائع ہوا لیکن اس کی اشاعت سے قبل ہی ان کا شمار نئے اردو افسانے کے علمبرداروں میں ہونے لگا تھا اور نئے افسانے کو جواز و تقویت دینے والے جملہ عناصر مثلاً علامت، ایمائیت، اجمال پسندی وغیرہ کے تو گئے ان کے افسانوں میں ابتدا ہی سے جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن اگرچہ وہ تجریدیت کی اس رو میں بھی، وہ نئے افسانے کی انتہائی صورتوں یعنی ابہام اور "ناکہانیت" سے اپنے افسانے کو صاف بچا لے جاتے ہیں کہ ان کی نظر میں تخلیق، مصنف اور قاری کے مابین رشتے کی اہم ترین کڑی ابلاغ ہے اور قاری کو معنی اور مفہوم کی بھول بھلیوں میں الجھانے سے کوئی ادبی مقصد حاصل ہو سکتا ہے نہ کسی خیر کی توقع وابستہ کی جا سکتی ہے۔

انھوں نے ایک بھرپور اور ہمہ جہت زندگی گزاری جس کا ایک ایک تار انھوں نے اپنے آزمائش اور مشقت کے تکلے پر کاتا اور جس کے شواہد ان کی خود نوشت "تمنا بے تاب" سے جھلک جھلک پڑتے ہیں۔ ان کا مختلف جہات میں پھیلا ہوا کام دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک حیاتِ مستعار میں اتنا سب کچھ اور اتنی بہت سی سمتوں میں کس طرح ممکن ہے۔ لیکن یہ سب غالباً اس لیے ممکن ہو پایا کہ زندگی اور اس کے متعلقات ہوں یا وظیفۂ تخلیق، وہ کسی پہلو ادھورے آدمی نہ تھے۔ تدریس سے ان کی معاش وابستہ تھی لیکن انھوں نے اسے کبھی ذریعۂ معاش نہیں سمجھا بلکہ کارِ پیغمبری کے طور پر علم بانٹنے کا وسیلہ ہی گردانا۔ جن خوش نصیبوں کو ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کا موقع ملا، وہ اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ روایتی استاد نہ تھے نہ محض نصاب کے اسیر بلکہ اپنے کثیر الجہت مطالعے اور زندگی کے گہرے مشاہدے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے لیکچرز کے ذریعے اپنے طالب علموں میں اس مضمون کی بابت گہرا شغف اور مذاق پیدا کر دیتے۔ اسی طرح مختلف دانش گاہوں میں انھوں نے اپنے زیرِ نگرانی ایم فل اور پی ایچ ڈی کے جن طلبہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ان کے تحقیقی کام کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فقط ڈگری کے حصول کے لیے کی گئی کدوکاوش اور تحقیقی علمی جستجو میں کیا فرق ہوتا ہے۔

انھوں نے خود بھی تحقیق و تنقید کے باب میں انتہائی قابلِ قدر کام کیا جس کا منہ بولتا ثبوت ان کی درجن بھر تحقیقی / تنقیدی کتب ہیں جن میں نیا ادب، روپے اور مباحث، بازیافت، دریافت، میرزا ادیب شخصیت اور فن، شاعری کی سیاسی اور فکری روایت، اقبال فکر و فن، تعلیم کی نظریاتی اساس وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں لیکن میرا جی کے فن اور شخصیت پر ان کا تحقیقی کام کلیدی نوعیت کا ہے اور شاید میرا جی کی تفہیم و تحسین میں ہونے والے تمام کاموں میں سب سے معتبر بھی۔ ان کتابوں سے کھلتا ہے کہ وہ فکشن ہی کے نہیں پورے ادب کے آدمی تھے اور ان کی ہم عصر ادب اور ادیبوں کے علاوہ اردو ادب بلکہ عالمی ادب کے جدید و قدیم پر بھی گہری نظر تھی۔ پھر چھ جلدوں پر مشتمل پاکستانی ادب کا انتخاب (اور اس کی تہذیب) نیز عراقی اردو ادب پر ان کی تحقیق ایسی معرکہ الآرا تالیفات ہیں جنھیں کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ مزید برآں مختلف دانش گاہوں سے وابستگیوں کے دوران ان کی ادارت میں شائع ہونے والے تحقیقی اور علمی مجلے مثلاً دستاویز، اقرا اور دریافت، تخلیقی ادب وغیرہ بجائے خود ان کی محنت، تحقیقی و تنقیدی دستگاہ اور ادارتی صلاحیتوں کا بین ثبوت ہیں۔

تاہم ان کی پہلی اور آخری محبت ہمیشہ سے ــــ افسانہ ــــ ہی رہی اور یہی وہ صنف ہے جس کا ان کا تخلیقی جوہر کس بھرپور انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے درجن بھر افسانوی مجموعوں کی قرأت سے کھلتا ہے کہ وہ کہانیاں لکھتے نہیں تھے بلکہ کہانیاں انھیں سوجھتی تھیں۔ اسی لیے بسیار نویسی کے باوصف ان کے ہاں کہیں کوئی دہرائے یا اول بدل کر پرانے خیال کو نئے افسانے میں منقلب کرنے کی چالاکی، انھیں کے ہاں کیے کو دہراتے یا اول بدل کر پرانے خیال کو نئے افسانوں میں لا اتنا دیا سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے موضوعات اور کرداروں

میں محوری حیثیت بالعموم روزمرہ کی زندگی اور عام آدمی کی رہی۔ ضرور ہے کہ انہوں نے انسان کو ازل سے درپیش مسائل و معاملات یعنی تقدیر، وقت، ازل و ابد اور آغاز و انجام کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا لیکن ان کے افسانوں کا مدار ہمیشہ آدمی ہی رہا اور وہ گلی محلے اور نکڑ کے آدمی، جو وہ خود تھے اور جس کی زندگی ہی سے وہ اپنے بیشتر تخلیقی ارمغانات بازیافت کرتے تھے۔ ان کے افسانوی سفر کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ ان کے چھوٹے موضوعات کو بنیاد بنا کر بڑی کہانیاں لکھیں اور درجنوں کی تعداد میں۔

رشید امجد کے جدا ہونے کا صدمہ ابھی تازہ تازہ ہے اور اردو افسانے میں ان کے قرار واقعی مقام کا تعین ہونے میں وقت کا مرہم درکار ہوگا لیکن ایک بات تو یادرکھنے کی ہے کہ ان کی رحلت فقط موت ہے۔ وہ عہد جو ان کی زندگی ہی میں ان سے منسوب ہو چکا تھا اور جسے گزرتے وقت کی گرد بھی ماند نہیں کر پائے گی۔ اردو کی علمی و ادبی میراث میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اردو افسانے کے کڑے سے کڑے انتخاب اور بڑے افسانہ نگاروں کی صف میں رشید امجد کی جگہ ہمیشہ موجود رہے گی۔ حق مغفرت کرے۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2020ء تک

ماہنامہ ''تخلیق'' اب تک نو ''تخلیق ایوارڈ'' دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحب	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ نیئر جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978
5-	2016ء	محترمہ عذرا اصغر صاحبہ	(لاہور)	0300-8839895
6-	2017ء	محترم پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب	(لاہور)	0345-4698398
7-	2018ء	محترم سرفراز سید صاحب	(لاہور)	0333-4148962
8-	2019ء	محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ	(لاہور)	0300-9438596
9-	2020ء	محترم رشید امجد صاحب	(راولپنڈی)	0334-5164855

رشید امجد کے افسانوی مجموعے

خاور اعجاز

پاکستان میں اب تک جن سے افسانے کی دنیا روشن تھی ان میں رشید امجد ایک انتہائی معتبر نام ہے۔ وہ محض فکشن رائٹر ہی نہیں تھے بلکہ ایک منجھے ہوئے دانشور اور نقاد بھی تھے۔ مدیر کی حیثیت سے ان کے مرتب کردہ بیشتر ادبی رسائل ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ ان کا ادبی سفر ساٹھ کی دہائی میں شروع ہوتا ہے۔ اس دہائی کے وسط سے وہ ایک عمدہ افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے ''بیزار آدم کے بیٹے'' کی اشاعت سے ہی اہلِ نظر نے بھانپ لیا تھا کہ ایک قابلِ توجہ افسانہ نگار کا ظہور ہو گیا ہے اور ایسا لگنے لگا تھا کہ خاموشی سے پیچھے پیچھے آنے والی زندگی کی پرچھائیں اب کسی بھی لمحے سامنے آ کر کلام کرنے لگے گی۔ آغازِ کار سے ہی ان کے یہاں ماضی کی آسیب زدہ رومانی فضا سے باہر نکل کر جدید عہد کی حقیقی انسانی مخلوق کے مسائل کو زیرِ بحث لانے کا رویہ کارفرما رہا ہے۔ ''بیزار آدم کے بیٹے'' میں موجود افسانوں کا بیشتر مواد کہانی کے دائرے میں آتا ہے جو فرضی اور افسانوی کرداروں کی بجائے چلتے پھرتے نظر آنے والے اور چھو کر محسوس کیے جانے والے کرداروں پر مبنی ہیں۔ یہی وہ پہلا وصف تھا جس نے رشید امجد کو ان کی پہلی کتاب کے منظرِ عام پر آتے ہی گذشتہ افسانوی روایت سے ذرا فاصلے پر کھڑا کر کے باقیوں سے نمایاں کر دیا۔ اس اتفاق نے جہاں ان کی ذات میں پہلے سے موجود تنہائی کے دکھ کو گہرا کیا وہاں انھیں افسانے کی صنف پر طاری جمود کو توڑنے کا حوصلہ بھی بخشا اور انھوں نے اپنے تخلیقی عمل پر بھروسہ کرتے ہوئے سات برس کی مدت میں اٹھارہ افسانوں پر مشتمل پہلا مجموعہ قارئین کے سامنے لا رکھا۔

دوسرے مجموعے ''ریت پر گرفت'' کا نام انھوں نے اپنے پہلے مجموعے میں شامل ایک افسانے کے عنوان سے لیا۔ یہ مجموعہ بھی موضوعات کے اعتبار سے ان کے نقشِ اول کا تسلسل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس مجموعے کے افسانے مروجہ اسلوبیاتی پیمانوں سے گریز کرتے ہوئے ایک نئی راہ کی تلاش میں لکھے ہوئے تخلیق کار سے متعارف کراتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی تک افسانے کی جو عمارت تعمیر ہو چکی تھی اس میں ترمیم و اضافے کی ابتدا کرنے والوں میں رشید امجد کا نام ہر اول دستے کی صفِ اول میں ہوگا جنھوں نے افسانوی طرزِ اظہار میں اپنے عہد کے فکری رویوں کی بتدریج تبدیلی کو موثر انداز میں سمویا۔ یہ ہر اول دستہ ایسے افراد پر مشتمل تھا جو پرانی نسل سے خلاصی پائے بغیر اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا رخ غیر روایتی طرزِ فکر کی جانب موڑنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی تازہ گروہ نے اس راہ پر قدم بڑھانا شروع کیے جس پر چل کر بعد کے افسانوی ادب نے اپنی منزل کو گذشتہ کے افسانوی ادب سے الگ کر لیا۔ ادب کا گہرا مطالعہ رکھنے والے میری اس گذارش سے اتفاق کریں گے کہ رشید امجد اور ان کے ہم عصروں نے افسانے کے رجحانات کو از سرِ نو مرتب کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ نئے رجحانات کے در آنے سے بعض کج ادبان محض ''نئے پن'' کا شکار ہوئے لیکن اس صورتِ حال کو سنبھالا دینے والوں میں بھی اسی گروہ کی

کاوشیں شامل ہیں جس کے نمایاں لوگوں میں رشید امجد کا نام بھی آتا ہے کہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ "ریت پر گرفت" اس بات کا شاہد ہے کہ انھوں نے "نئے پن" کے شوق میں اٹھائی گئی ریت کی دیوار کو اپنی مضبوط گرفت مہیا کر کے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ اس مجموعے کے افسانے لایعنیت میں چھپی ہوئی معنویت کے چہرے سے پردہ ہٹا کر زندگی کو بامعنی بناتے ہیں گویا تجریدی اوٹ سے اصل تصویر نکال کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

تیسرے مجموعے "سہ پہر کی خزاں" سے رشید امجد کی علامت نگاری کے کرشمے نمایاں ہونے شروع ہوئے اور یہیں سے ان کے بیانیے نے اردگرد کے افسانہ نگاروں سے الگ شناخت کے سفر کا آغاز کیا۔ ان کی تحریر میں گھلاوٹ بھی اسی مجموعے سے گہری ہوتی ہے اور ان کے موضوعات میں تنوع، اظہار میں پھیلاؤ اور نظر میں وسعت کا احساس ہونے لگتا ہے گویا بقول مہدی جعفری ان کی لکھت میں "ایک وقت کی جہتوں نے نشیب و فراز" سے گذرتے ہوئے وقت کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔ قومی موضوعات سے لے کر فلسفۂ وجودیت کے مباحث تک کیا نہیں جو ان افسانوں میں نہیں در آیا لیکن توازن کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ یہ افسانے رشید امجد کے عہد میں فرسودہ ہو چکے ہوئے مواد پر نہیں بلکہ جدید زمانے کے مسائل پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کائنات کی وسعتوں میں انسان کی کیا اہمیت ہے۔ یہ تمام تار و پود بنتے ہوئے وہ پاکستان کو فراموش نہیں کرتے۔ یہ خطہ ان کے افسانوں کا بنیادی کینوس ہے جس پر ابھرنے والی ہر تصویر کا چہرہ اس دھرتی کی روشنی سے منور نظر آتا ہے۔ یہ چہرے کبھی مجسم صورت میں اور کبھی تجریدی اوٹ سے جھانکتے ہیں اور اپنی روداد گوش گزار کر کے کسی نئے کردار کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ یہی اس کینوس کی شادابی ہے کہ کھلا ہوا پھول مرجھانے سے پیشتر نیا پھول کھل اٹھتا ہے اور رشید امجد کا باغِ حرف ہر دم لہلہاتا دکھائی دیتا ہے جس کا ہر شگوفہ اس سرزمین کے تشخص کو مزید واضح کر رہا ہے۔

چوتھے مجموعے "پت جھڑ میں خود کلامی" میں رشید امجد اپنے افسانوی کرداروں کے توسط سے آب و آدم میں انسان کی شناخت کے مرحلے سے دوچار نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں وہ ایک ایسا فکری نظام تشکیل دینے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں جو جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر انسانی تہذیب کی اصل تک ہماری رسائی کو سہل بنا سکے۔ یہ اس افسانوی ادب کا نقطۂ آغاز ہے جس میں خیالی کہانیوں کی بجائے عصری حقیقتوں پر مبنی علامتی اظہار نے راہ پانا شروع کی۔ علامتی اظہار کی جس طرز کو رشید امجد نے اپنایا وہ محض علامتیں ایجاد کرنے تک محدود نہیں بلکہ ہر علامت اپنے ہمراہ وحدتِ معنوی کا ہالہ لیے ہوئے ہے۔ اس وحدت سے بصیرت رکھنے والی آنکھ اپنی استطاعت کے مطابق حقیقت اخذ کرتی اور اپنی وسعتِ ادراک کے مطابق تصویر بناتی ہے۔ رشید امجد نے بنی بنائی علامتوں پر انحصار نہیں کیا اور افسانے کے ماحول سے ہی علامتیں تراشی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علامتیں بے جان اشیا کی طرح ادھر ادھر بکھری پڑی ہوئی نہیں بلکہ افسانوں کے کرداروں کے ساتھ متحرک دکھائی دیتی ہیں۔ یہ عمل قاری کو ایک ایسے کیف آور تحیر سے متعارف کراتا ہے جس کی مثال رشید امجد سے پہلے لکھے گئے افسانوں میں خال خال ہی ملتی ہے۔ وہ اکائی کے ساتھ اکائی کے کمال میل سے فرد کو معاشرہ کا مکمل بنا دیتے ہیں۔ ماضی کی ٹوٹی ہوئی زنجیر میں حال کی کوئی کڑی ملا کر وقت کو تسلسل فراہم کرنا اور بانجھ ہو چکی لغت الفاظ میں تازہ معانی کی فصل بو کر سرزمینِ خیال کو سرسبز و شاداب کر دینا انھیں خوب آتا ہے۔

پانچویں مجموعے "بھاگے ہے بیاباں مجھ سے" میں رشید امجد کی گرفت کہانی پر مضبوط تر ہو جانے کے واضح اشارے موجود ہیں۔ یہ

کہانیاں حقیقی ہوں یا فرضی لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ رشید امجد نے انھیں اپنے اردگرد کے معاشرتی ماحول سے ہی اخذ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ کہانی کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یوں لگتا ہے جیسے یہ ہمارا ہی تجربہ تھا لیکن شاید ہم اسے اس حسن اسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں ناکام رہتے جس طرح رشید امجد نے اپنے طلسماتی بیانیہ کے ذریعے بیان کر دیا ہے۔ ان کہانیوں کے کرداروں کے باہمی ربط وضبط سے رشید امجد معاشرہ کی وہ تصویر اپنے کینوس پر ابھار لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس پر ایک حساس مصور ہی قادر ہو سکتا ہے۔ ان کی نظر ہر کردار کے ظاہر و باطن/کہانی کے اتار چڑھاؤ اور اپنے دریافت کیے گئے منطقے کے اطراف و جوانب پر یکساں مرکوز رہتی ہے۔ فہم و ادراک کی یہ منزل کم ہی لکھاریوں کے حصے میں آتی ہے۔ رشید امجد اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ قدرت نے ان کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا ہے۔

بعد کے مجموعوں ''عکس بے خیال''، ''ست رنگے پرندے کے تعاقب میں'' اور ''ایک عام آدمی کا خواب'' وغیرہ کی کہانیاں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے شروع میں اختر رشید ناز کے نام سے لکھنے والے نوجوان نے کس سرعت، محنت اور لگن کے ساتھ خود میں چھپے کہانی کار سے ربط وضبط پیدا کر کے پہلے اسے کشمیری بازار راولپنڈی کے پارک میں اپنے ساتھ گھمایا، پھر پنڈی ہوٹل راجہ بازار میں کچھ لکھاری دوستوں کی صحبت فراہم کی اور بعد ازاں ایک ادبی بزم ترتیب دے کر اسے لکھنے لکھانے کی چاٹ لگا دی اور اختر رشید ناز سے رشید امجد بنا دیا۔ اس مرحلے پر رشید امجد کی پہلی کہانی ''لیمپ پوسٹ'' میرزا ادیب کی ادارت میں چھپنے والے رسالہ ''ادب لطیف'' کے شمارہ بابت ماہ ستمبر 1960ء میں شائع ہوئی جس کا ماحول یکسر استعاراتی تھا۔ تخلیقی سفر میں رشید امجد نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے سے لے کر آخری افسانوی مجموعوں تک علامت، تجرید اور تمثیل کی کئی منزلیں طے کیں اور اساطیری اسلوب نگارش کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کے افسانوں کے شاعرانہ انداز نے انھیں سفر کے آغاز ہی سے اپنے ہم عصروں کے خلف اور پچھلے طرز تحریر سے جداگانہ حیثیت کا حامل بنا دیا تھا اور وہ اس وقت کے ہجوم سے دور کھڑے دکھائی دینے لگے تھے۔ بعد کے افسانوی مجموعوں میں وہ اپنی پہچان کو واضح کرنے میں مصروف رہے جبکہ آخری افسانوی مجموعوں میں ان کی شناخت مستحکم ہو جاتی ہے اور وہ افسانوی ادب میں ایک مستقل اہمیت کے افسانہ نگار کی حیثیت سے خود کو منوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہ اعزاز اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک کسی دوسرے رشید امجد کا ظہور نہیں ہو جاتا اور ایسا ہونے کا امکان مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔ جس کا اعتراف ماہنامہ تخلیق نے کرتے ہوئے انھیں اولین تخلیق ایوارڈ سے نوازا جو خالصتاً ایک ادبی ایوارڈ ہے جو کسی گروپ کسی رنگ و نسل کی قید سے آزاد اور منصفانہ ایوارڈ ہے۔ ہم سب انھیں 2020ء کا تخلیق ایوارڈ دیتے ہیں جو یقیناً تخلیق کے لیے باعث اعزاز ہوگا۔

◆◆◆

ادارہ ''تخلیق'' کو طویل نظمیں اور لمبی لمبی غزلیں بھیج کر امتحان میں نہ ڈالیں۔ ہمیشہ 5 سے 7 اشعار کی غزل یا نظم ''تخلیق'' کو ارسال کریں۔ الفاظ کی دولت کو کفایت سے استعمال کریں۔ ادارہ طویل نظمیں یا مضامین شائع نہیں کرے گا۔

رشید امجد کے افسانوں میں متنوع رنگ

ڈاکٹر امجد طفیل

ڈاکٹر رشید امجد کی افسانہ نگاری کا جو تجربات کا آغاز 1960ء کی دہائی میں شروع ہونے والی نئے ادب کی تحریک سے کرنا چاہیے گا۔ نئے ادب کی تحریک اپنی مبادیات میں اگر ترقی پسند تحریک کے خلاف ایک احتجاج تھی تو جدید ادب سے بھی اپنے آپ کو الگ شناخت کروانے کی تگ و دو میں تھی۔ 1960ء کے آس پاس اردو ادب میں لکھنے والوں کا ایک ایسا گروہ سامنے آیا جو اس وقت کی ادبی صورت حال سے مطمئن نہیں تھا اور نئے راستوں کی تلاش میں تھا اس میں ایک طرف سارتر، کامیو اور کافکا سے متاثر وجودی فکر کے ادیب شامل تھے تو دوسری طرف یورپ میں چلنے والی لسانی تشکیلات سے متاثر ادیب، تیسری طرف فرانس میں چلنے والی سرئلزم، دادازم وغیرہ کی تحریکیں اور چوتھی طرف کی جمالیات کے فرانسیسی داعی ان چاروں فکری و فنی تحریکوں کے اثرات ادب میں نمایاں ہونے شروع ہوئے تو ہمارے ہاں "نیا ادب" کی بات ہونے لگی لیکن اس صورت حال کے ساتھ ایک غلطی بھی آغاز ہی سے خصوصاً اردو افسانے کے حوالے سے یہ وابستہ ہو گئی کہ ان الگ الگ تحریکوں کے اثرات کا مطالعہ کرنے کی بجائے مجموعی طور پر اسے علامتی و تجریدی افسانہ قرار دے دیا گیا جس سے اس افسانے کی تفہیم میں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ایک مدت تک اس افسانے کے حق اور مخالفت میں اتنی گرد اڑی کہ بیچارہ نیا افسانہ اپنی پہچان کھوتے کھوتے بچا۔

رشید امجد کے فنی سفر کا آغاز 1960ء کے اردگرد ہوتا ہے ابتدا میں انھوں نے روایتی یا نیم روایتی انداز کے افسانے لکھے جو نیا افسانہ نگار بننے کے بعد انھوں نے چھپا دیے لیکن ایک اچھی بات انھوں نے یہ کی کہ جب اپنا کلیات "دشتِ نظر سے آگے" مرتب کیا تو "کاغذی فصیل" کے عنوان سے 1960ء سے 1966ء تک کی تحریریں اس میں شامل کر دی ہیں پڑھنے والے کے لیے ان کی فنی سفر کو سمجھنا آسان ہو گیا۔ پاکستانی اردو افسانے میں نئے تجربات کے حوالے سے جو تین نمایاں نام ہمارے سامنے آتے ہیں وہ نام انتظار حسین، انور سجاد اور رشید امجد کے ہیں۔ انتظار حسین نے علامتی و تمثیلی آہنگ کو اس مہارت سے برتا ہے کہ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی دکھائی نہیں دیتا جبکہ انور سجاد نے علامتی، سرئیلسٹک طرز کو اپنے افسانوں میں سمایا جبکہ رشید امجد کے ہاں سرئلزمی رجحان اور Cult of ugliness کے رجحانات نمایاں تھے۔ ایک مدت سے ان کے بارے میں علامتی افسانہ نگار کا جو لیبل استعمال کیا جا رہا ہے میں اس سے مطمئن نہیں اور میرے خیال میں ان کے ہاں سب سے نمایاں رجحانات سرئلزم، Cult of Ugliness کے ہیں اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے لسانی کج پر تمثیل سازی Imagery کے خوبصورت استعمال سے نثری زبان میں شاعرانہ چاشنی پیدا کی جس سے ان کا افسانہ ایک منفرد چیز کا حامل بن گیا۔

سرئلزم کی تحریک کا آغاز فرانس میں آندرے بریتاں (Andre Burton) کے Manifesto on surrealism سے

ہوتا ہے۔ بروتن فرائیڈ کے تجزیاتی طریقے سے متاثر تھا اور اس نے Hypnosis کے زیر اثر (Automatic writing) کا تجربہ بھی کیا۔ سرئیلزم کی تحریک بنیادی طور پر ایک بغاوت کا درجہ رکھتی تھی یہ بغاوت تھی تخلیقی سرگرمیوں پر ہر طرح کی بندش کے خلاف اور اس میں منطقی استدلال، مروجہ اخلاقیات، سماجی اور فنکارانہ اعتقادات اور ادب پر کسی بھی طرح کے خارجی جبر کی مخالفت شامل تھی۔ اس تحریک کے داعی انسانی ذہن کی گہرائیوں میں موجود حقائق کو ہی اصل علم اور فن سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں تخلیق فنکار کا لاشعور کی عطا ہے اور یہ لوگ تخلیق کے ''خود کار تحریر'' ہونے کے قائل تھے۔ اس لیے ان کے ہاں ہمیں خواب کے مظہر کے بے پناہ استعمال، انسانی ذہن کے سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت ملتی ہیں اور یہ لوگ انسانی ذہن کے واہموں کو بھی تخلیق میں بنیادی جگہ دیتے ہیں۔ یہ سب کیفیات ہمیں رشید امجد کے افسانوں میں بہ وجہ اتم دکھائی دیتی ہیں۔ رشید امجد کے افسانوی کردار سائے ہیں۔ بے چہرہ افراد حالات کے ہاتھوں بے اس کٹ پتلیاں بنے ہوئے ہیں۔ نیم بیدار اور نیم خوابیدگی کی کیفیت ان کے بہت سے افسانوں میں نمایاں ہے جہاں حقیقت اور خواب ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بے یقینی کی کیفیت کو ابھارتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں آوازیں سرگوشیوں میں ڈھل جاتی ہیں اور سوتے جاگتے کردار ہیولوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذات سے مکالمہ اور خارجی احوال کا بیان ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اور ایک دوسرے کو یوں کاٹتے دکھائی دیتے ہیں کہ قاری ان دو کیفیات کے درمیان جھولتا رہ جاتا ہے۔

سرئیلزم کی اصطلاح Super Realism سب سے پہلے Guillemot Apollimaire نے استعمال کی لیکن باقاعدہ طور پر فلسفیانہ طور پر آندرے بریتاں نے لکھا سرئیلزم (Surrealism) ورائے حقیقت کو گرفت میں لینے کی کوشش تھی۔ حقیقت سے فرار نہیں جیسا کہ ہمارے ہاں ایک حلقے نے شد و مد سے اس الزام کو ابھارا۔ سرئیلزم ایک انقلابی تحریک تھی جس نے فرانس میں مصوری، مجسمہ سازی اور دیگر فنون کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی متاثر کیا۔ اکثر وہاں ہمیں اس تحریک کا اطلاق دیگر سیاسی و سماجی تحریکوں خاص طور پر وجودیت اور نیو مارکسزم کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ مصوروں میں اس تحریک کا سب سے نمایاں نام ڈالی کا ہے جبکہ انگریزی ادب میں ڈیلن تھامس (Dylan Thomas) کی شاعری، ہنری ملر Henry Miller اور ولیم بوروس (William Burroughs) کے ناولوں میں ملتا ہے۔ ہمارے ہاں ان اثرات کو سب سے پہلے انور سجاد اور پھر رشید امجد نے قبول کیا۔ رشید امجد نے دوسری طرف بودلیئر وغیرہ سے شروع ہونے والی نئی جمالیات کے اثرات بھی قبول کیے۔ یہ لوگ روایتی جمالیاتی معیارات سے مطمئن نہیں تھے اور نئی جمالیات کو نئے خطوط پر استوار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے دعویٰ کیا کہ ہر چیز اور ہر لفظ میں خوبصورتی موجود ہے۔ یہ تو دیکھنے اور رکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کسے خوبصورتی قرار دیتا ہے۔ اس معاملے میں یہ لوگ اس حد تک چلے گئے کہ انھیں Cult of Ugliness کا خطاب بھی برداشت کرنا پڑا۔ بودلیئر کی نظمیں جو ہمارے ہاں بھی ''بدی کے پھول'' کے نام سے ترجمہ ہوئیں اس سلسلے کی بہت عمدہ مثال ہیں۔ اس جمالیات نے لسانی اور فکری ایک دو سطح پر ادب میں نئی راہوں کی نشاندہی کی اس تصور کو رد کیا گیا کہ شاعری کی کوئی مخصوص زبان ہوتی ہے اور شاعرانہ اور غیر شاعرانہ لفظ جیسی کوئی تفریق ممکن ہے۔ فکری سطح پر ادب میں ہر طرح کے موضوعات، گندگی سے گندی چیز کو بھی ادب کا موضوع بنایا گیا۔ رشید امجد کے کئی افسانے اس رجحان کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ رفتہ رفتہ ان کے ہاں اعتدال کی رو ابھری اور پچھلے کچھ عرصے میں تو ان کے ہاں اس کے اثرات کم و بیش ختم ہو چکے ہیں۔

رشید امجد کے افسانوں کی ایک نمایاں بات ان کی زبان ہے۔ رشید امجد نے اپنی افسانوی زبان میں شعری لوازمات کو بڑی خوبی سے برتا ہے خاص طور پر Imagery کا استعمال تو ان کی منفرد پہچان ہے۔ ادبی زبان میں امیجری کا استعمال بھی سرئیلزم کی تحریک کے اثرات ہیں کیونکہ سرئیلسٹ بنیادی طور پر (ذہن کی آزادہ روی کے قائل تھے اور (Automatic Writing) کے اس درجے کو پہنچنا چاہتے تھے جہاں انسان شعور اور لاشعور کی درمیانی حدیں مٹ جاتی ہیں اس لیے وہ ذہنی تمثالوں Mental Images کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ رشید امجد کے حوالے سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں بھی تمثال نگاری کی طرف ان کے میلان کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح سرئیلزم جس ذہنی آزادہ روی کا پرچار کرتا ہے وہ رشید امجد کی شخصی اور تخلیقی ذات میں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رشید امجد اپنے افتادِ طبع کے حوالے سے ہی ان جدید رجحانات کی طرف مائل ہوئے ورنہ نقالی میں تو بہت سے نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن معیار اور مقدار ہر دو صورت بارے ان کی تحریریں رشید امجد کے پائے کی نہیں۔

رشید امجد کی افسانہ نگاری کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا دور کم و بیش 1960ء سے شروع ہو کر 1966ء تک چلتا ہے جس میں انھوں نے بیانیہ حقیقت نگاری کا حامل افسانہ لکھا دوسرا دور 1966ء سے لے کر 1980ء کی دہائی کے اوائل تک کا ہے جس میں رشید امجد نے جدید فکری و فنی تحریکوں کے اثرات قبول کیے اور نیا افسانہ تخلیق کیا جبکہ تیسرے دور میں ان کے ہاں افسانے کے جدید رجحانات اور بیانیہ کے درمیان ایک نیا توازن ابھرا ہے۔ تمثالوں کا استعمال کم ہوا ہے Cult of Ugliness اثرات معدوم ہو چکے ہیں اور سرئیلزم کے اثرات زیادہ سلیقے کے ساتھ اپنا اظہار کرنے لگے ہیں۔ ماورائے حقیقت کو گرفت میں لینے کی کوشش اب کی بار مابعد الطبیعات کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ تجریدی جبریت کو توڑنے کی کوشش میں مرشد کا تصور نمایاں ہوا لیکن حقیقت کے دائرے میں تصور کی گرفت پہلے سے زیادہ گہری ہوگئی ہے۔ پچھلے چند سالوں کے افسانے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اب افسانہ نگار افسانے میں وہ کاملیت پیدا کرنے لگا ہے جہاں افسانہ خود بخود ایک بڑی علامت میں داخل جاتا ہے۔ ''ست رنگ پرندے کے تعاقب میں'' اس رجحان کی ایک بہت کامیاب مثال ہے۔ رشید امجد کی افسانہ نگاری کے بارے میں ایک سوال اب بار بار اٹھایا جانے لگا ہے کہ وہ افسانے میں اپنے تجربات سے تائب ہو گئے ہیں اور دوبارہ بیانیہ اسلوب کی طرف پلٹ آئے ہیں۔ اگر بغور دیکھا جائے تو بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ رشید امجد نے اپنے فنی سفر کا آغاز بھی بیانیہ توصیت کے افسانوں سے کیا تھا۔ ایک بات کا احساس ان کے ''کاغذ کی فصیل'' میں شامل افسانے پڑھتے ہوئے بھی ہوتا تھا کہ ان کا ذہن اختصار کی طرف مائل ہے وہ بات کو بے جا طول نہیں دیتے اور ان کا ذہن حقیقت کو مجسم شکل میں ادراک کرنے کی بجائے مجرد آہنگ میں ادراک کرتا ہے۔ اس لیے وہ سیدھی سادی حقیقت نگاری میں اپنی ذہنی اور تخلیقی تشفی نہیں پاتے اور ادب میں نئے راستوں پر چلنے کے شائق ہیں۔ یہاں میں ان کے افسانے ''لیمپ پوسٹ'' کی مثال دوں گا کہ یہ ایک محبت کی کہانی ہے لیکن یہاں محبوب، محب، محبوب کے والد کے ساتھ ساتھ ایک اور کردار بھی موجود ہے اور وہ کردار ہے ''لیمپ پوسٹ'' کا۔ رشید امجد اپنے افسانوں میں زمان و مکان کے ساتھ بھی کھیلتے ہیں۔ جہاں ''لیمپ پوسٹ'' زندگی میں استقامت اور بقا کی علامت ہے مگر انسانی زندگی کے مقابل مادی اشیاء کی بقا انسانی زندگی کی عارضیت اور بے معنویت کو مزید نمایاں کر دیتی ہے۔

''بے چہرہ آدمی'' ان کرداروں کی کہانی ہے جو زندگی میں معنویت اور سچائی کی تلاش میں ہیں۔ اس افسانے میں دانشوروں کی

بخشیں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ رات دن ایک دائرے میں بے مقصد گھومتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کو Paid سمجھتے ہیں۔ اور انھیں انتظار ہے کسی آنے والے کا جو حالات کو تبدیل کرے گا۔ تبدیلی کی خواہش اور صورتِ حال کا یکساں رہنا، ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی کی المناک سچائی ہے۔ افسانہ نگار اس جبریت سے نبرد آزما ہے مگر اس سے رہائی کی کوئی صورت نہیں پاتا۔

اس حوالے سے ہم رشید امجد کے افسانے ''بجھی ہوئی پہچان'' کو بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں سات کردار ایک کمرے میں بند ہے۔ ساتواں کہتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کمرے کے باہر کی فضا ہولناک ہے۔ ایک بلا ہے جو ایک ایک کر کے سب کو نگلتی جا رہی ہے۔ ساتویں کے بعد چھٹا بھی اس بلا کی تلاش میں باہر نکلتا ہے۔ پھر پانچواں ہے جس نے چھٹے کو گرا دیا تھا۔ یعنی ہر ایک پر ایک درندے کا قبضہ ہے جو سب سے اپنی اطاعت کرواتا ہے۔ یہاں ساری فضا ایک دھند میں، ایک غیر یقینی کی کیفیت میں لپٹی ہوئی۔ پردے کے پیچھے پر خون کے نشان اس کے خون آشام ہونے کی دلیل ہیں اب یہ درندہ سیاسی سطح پر آمر بھی ہو سکتا ہے لیکن زیادہ وسیع تناظر میں وقت بھی کہ وقت سے زیادہ خون آشام بلا آج تک وجود میں نہیں آئی۔

''سمندر، قطرہ، سمندر'' میری رائے میں رشید امجد کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ''میں'' وقت میں ماضی اور حال کے درمیان جھول رہا ہے۔ ٹیکسلا میں موریہ دور کا کلاکار سے محبت کرتی کوشلیا، سکندر اور پورس کے معرکے کے پس منظر میں دھرتی کا بیٹا دھرتی کے تحفظ کی جنگ لڑتا ہے۔ دیا شنکر، مدن موہن کے کردار انسانی زندگی، گیان دھیان اور زندگی کی معنویت پر بحث کرتے کردار ماضی میں چلتے ہوئے بھی حال سے جڑے ہوئے ہیں۔ افسانہ نگار حال میں ٹیکسلا کو سانس لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ انسان گزرے وقت میں لوٹ نہیں سکتا۔ وقت اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے۔ ''وقت بڑا ظالم ہے، ہر جانے والے لمحے کا نوحہ اس کے ماتھے پر لکھا ہوا ہے۔'' سارے علاقے پر دھواں کی چادر ہے۔ فیکٹریوں نے علاقے کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ یہ یہاں شاید سکندر یونانی کے حملے کو تو سہار گیا تھا مگر موجودہ جدید عہد کے سامنے بے بس ہیں۔ عہد جدید کی علامت فیکٹری علاقے کے حسن کو داغ دار کر رہی ہے۔ ایسے میں رشید امجد کو سمندر میں قطرہ اور قطرہ میں سمندر دکھائی دیتا ہے۔ مکاں کو مستقل رکھتے ہوئے زماں میں آگے پیچھے کا کھیل وقت کے ہاتھ میں بے بس کٹ پتلیاں خود کو انسان سمجھتی ہیں۔

رشید امجد نے اپنے بعض افسانوں میں کرداروں کے نام الف، ب، ج، وغیرہ رکھے ہیں۔ ان کے افسانے ''بیزار آدم کے بیٹے'' میں کردار الف، ب اور ج ہیں۔ ان کرداروں کو اپنے گھر سے نفرت ہے۔ انھیں اپنی ماں گدھ معلوم ہوتی ہے۔ ہر کردار کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے گھر میں کئی گدھیں ہیں جو اس کا ماس نوچ نوچ کر کھا رہی ہیں۔ اس افسانے میں اصل تضاد اس وقت سامنے آتا ہے کہ جب محبت کا جذبہ محبوب کو قتل کرنے کی ترغیب بن جاتا ہے۔ علامتی سطح پر نسائیت کا قتل زندگی کی اعلیٰ اقدار سے روگردانی بن جاتی ہے۔ ان کرداروں کو ہر شخص میں ڈریکولا نظر آتا ہے۔ رشید امجد کے افسانے میں ہمیں ہر کردار اپنی قبر ساتھ لیے نظر آتا ہے گھر قبر کی صورت اختیار کر گئے ہیں ہر طرف کھوکھلا پن ہے۔ سب کی پٹاریوں کے سانپ ریشمی رسی بن گئے ہیں۔ اور وہ کردار کہتے ہیں کہ ''ہم سب ہیں منافقت کے سمندر کی مچھلیاں۔''

رشید امجد کے افسانوں میں یہ طرزِ احساس بار بار اظہار پاتا ہے۔ چیزوں کا اپنی اصل سے دور چلے جانا، ہواؤں کا اپنی پہچان

گھورتا ہے۔ اس حوالے سے "بیدار آدم کے بیٹے" "ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک طویل مکالمہ" اور "جاگتی آنکھوں کے خواب" خاص طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اب ذرا رشید امجد کے اسلوب کا نمونہ بھی ہو جائے۔ "جاگتی آنکھوں کا خواب" میں رشید امجد لکھتے ہیں کہ :

> "بے بسی کی اداس تنہائی کا چیتھڑا پہنے کمرے کی دیواروں سے نکلی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آئی تو وہ گھبرا کر دو سالان پانیوں میں تیرنے لگا۔ وہ آہستہ سے ہنسی اور پھر اس نے اپنے لمبے ناخن اس کی گردن میں گاڑ دیے ۔۔۔
> اور اداسی مایوسی تنہائی کا زہر قطرہ قطرہ اس کے بدن کے مشکیزے میں ٹپکنے لگا۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے قاری اندازہ کر سکتا ہے کہ رشید امجد اپنے افسانے کی زبان میں خاص طرح کا تمثیلی آہنگ پیدا کر رہے ہیں۔ وہ سیدھا سادہ جملہ لکھنے کی بجائے اسے ایک مخصوص لسانی انداز سے بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ موضوعات میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ زبان کو نئے ذائقے سے برتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تنہائی، اداسی اور مایوسی کے جدیدیت پسندانہ تصورات کو برتنے کے ساتھ ساتھ افتخار جالب کی لسانی تشکیلات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انسانی وجود کی بے معنویت رشید امجد کے افسانوں میں آغاز سے ایک اہم موضوع رہا ہے۔ ان کے افسانے "گمشدہ آواز کی دستک" کا مرکزی کردار مکان یا قبر کے لیے جگہ کی تلاش میں ہے۔ باپ کی موت کے بعد اسے لگتا ہے وہ خود بھی مرنے کے قریب ہے۔ مکان کے لیے زمین خریدنے کی خواہش اسے دیمک بن کر چاٹ رہی ہے آخر کار وہ کرائے کے مکان کے پیچھے اپنے لیے کچی چھوٹی قبر بنا لیتا ہے۔

اس تسلسل میں ان کے افسانے "ذاتی پہچان" کو بھی رکھا جا سکتا ہے کہ جس میں وادی میں بہت سے دریا بہتے ہیں مگر وادی پھر بھی بنجر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار آج سے پچیس تیس سال پہلے پاکستان میں آنے والے پانی کے بحران کی طرف ہماری توجہ مبذول کروا رہا تھا۔ اصل موضوع افسانے کا فرد کی گم ہوتی پہچان ہے کہ وہ اپنی ماں کی قبر کے بارے میں بھول گیا ہے اور آخر میں سوچتا ہے کہ کیا پتہ یہ وہ شہر ہی نہ ہو جہاں اس کی والدہ کی قبر تھی۔ فرد کی پہچان کے گم ہونے کی داستان ہمیں رشید امجد کا افسانہ "سپرد سے مکالمہ" بھی سناتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار "وہ" صبح گھر سے غائب پایا جاتا ہے اگرچہ گھر کے دروازے اندر سے بند ہیں۔ سب "وہ" کی تلاش کرتے ہیں لیکن اس کا کہیں پتہ ٹھکانا نہیں ملتا۔ آخر گھر والوں کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ آیا وہ رات کو گھر آیا بھی تھا یا نہیں۔ بے یقینی کا یہ احساس صورت حال کو مجسم نہیں رہنے دیتا اسے سیال بنا دیتا ہے اس سے رشید امجد کے ہاں حقیقت کو ادراک اور محسوس کرنے کا وہ مخصوص انداز ابھرتا ہے جس کی جانب مہدی جعفر نے بڑا اصولی اشارہ کر رکھا ہے۔

اپنی پہچان کے معدوم ہونے کا معاملہ "کھلے دروازے پر دستک" میں ذرا مختلف رخ اختیار کرتا ہے جب مرکزی کردار اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے خود کو کبوتر میں تبدیل ہوتا محسوس کرتا ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر پہلے شہر جو کبھی تہذیب کی علامت تھا ظلم اور جبر کی علامت بنا۔ مگر رشید امجد کے ہاں یہ معاملہ شہر سے گھر تک آ گیا ہے۔ گھر اب جائے امان اور تحفظ کی علامت نہیں رہا بلکہ جبر و استبداد کی جگہ کا روپ اختیار کر گیا ہے۔ قدیم داستانوں میں انسانی کرداروں کے ساتھ جو کچھ بیتی تھی وہ جنگل بیابان میں بیتی تھی۔ مصائب دیار غیر میں انسان پر نازل ہوتے تھے۔ مگر اب جدید زندگی میں سب بلائیں انسان کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں واقع ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار محسوس کرتا ہے کہ "موت بلی کی طرح انس کے کبوتر کا تعاقب کرتی ہے۔" گھر بلی اور کبوتر کا یہ کھیل اب نیا تناظر اختیار کر چکا ہے۔ ذرا دیکھیں رشید امجد انسانی وجود پر جبر

کے شکنجے کو کیسے بیان کر سکتے ہیں۔

"جبر اور ظلم طاقتور مقناطیس کی طرح چیزوں اور ماحول کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور انھیں اپنے پنجوں میں دبا کر توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ یہ تو ایک کیفیت ہے جو دکھائی نہیں دیتی صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔"

اس افسانے میں بلا ایک عظیم طاقت کے طور پر ظہور کر رہی ہے جو انسانی وجود کو ملیا میٹ کر دیتی ہے۔ افسانہ کا کردار بجا طور پر کہتا ہے کہ کبوتر کو تو اس کی چھٹی حس نے بلی سے بچا لیا تھا لیکن انسان ہونے کے باوجود اس کی چھٹی حس ختم ہو چکی ہے۔ جدید زندگی میں انسان بلا کے مقابل بالکل بے بس ہے۔ زندگی میں مادیت کو حتمی سمجھنے سے انسانی وجود کی بلا کے مقابل فرد کے پاس مکمل بے چارگی کے علاوہ کچھ نہیں بچتا یہاں سے رشید امجد کے افسانوں میں "مرشد" کے کردار کے حوالے سے ایک نئی جہت پیدا ہوتی ہے۔

"لمحہ جو صدیوں ہوا" میں مرشد خرقہ پوش اور شیخ کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ زمان و مکان اور فرد ایک دائرے کی قید میں ہیں۔ یہاں افسانہ نگار اپنے کردار کی زبان سے بعض باتیں کہلواتا ہے جو خود فرد اور انسانی صورت حال کے بارے میں افسانہ نگار کے موقف کی وضاحت کرتی ہیں۔ "میری خاک اس شہر کی مٹی میں دفن ہے اور میں نے خرقہ اتار کر حیرت کا کاسہ سنبھال لیا ہے کہ حق کی کوئی پہچان کوئی بھی لباس نہیں ہوتا۔" "مردوں کی جستجو میں تم کب تک پھرتے رہو گے۔ گھر جا کر خود کو تلاش کرو اور جب اپنے آپ کو پا لو تو اپنے نفس کی نگرانی کرو۔" "شیخ ایک لمحے چپ رہے پھر بولے --- "مٹی کی پکڑ بڑی سخت ہے لیکن سوال کی آواز عجیب چیز ہے اس کی لے میں جو بے کلی اور اضطراب ہے وہ آدمی کو کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔"

آپ نے ملاحظہ کیا کہ رشید امجد جدید فرد کے باطن میں اس کے اصل وجود کی تلاش میں جب نکلتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وجود سے زیادہ وجود کا احساس اہم ہے یہاں ہمیں غالب یاد آتے ہیں۔ خود غالب کے ساتھ رشید امجد ایک خاص ذہنی نسبت رکھتے ہیں جس کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کئی ایک افسانوں کے عنوانات غالب کے مصرعوں سے لیے ہیں۔ "لمحہ جو صدیوں ہوا" ان افسانوں میں شامل ہیں جن میں افسانہ نگاری کا فکری (Synthesis) کے ساتھ ساتھ اسلوبیاتی اور فنی رچاؤ بھی اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے رشید امجد کے افسانوں میں انسان کی جدید صورت حال اپنی پوری پیچیدگی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کے ہاں انسان کے وجودی مسائل مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں سیاسی اور معاشی پہلو بھی شامل ہیں۔ انسانی صورت حال کے معاشی پہلو کے حوالے سے ان کا افسانہ "وحشت امکاں" ہمیشہ میری توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے کہ گھر بنانے کا برسوں پرانا خواب، نسل در نسل معاشی محرومیوں کا استعارہ بن جاتا ہے۔ حقیقت اور تصور کی کشمکش اس افسانے میں بھی بہت نمایاں ہے۔ خارجی حقیقت اتنی تلخ ہے کہ اس کے دباؤ سے بچنے کے لیے افسانے کا مرکزی کردار تصورات میں پناہ لیتا ہے لیکن خود اس کے اپنے تصورات ہولناک شکل اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں کہ حقیقت سے چھٹکارا کسی طور ممکن نہیں ہے۔

"سمندر مجھے بلاتا ہے" میں رشید امجد اپنی معاصر معاشرتی صورت حال کے مقابل فرد کی بے چارگی اور بے بسی کو پیش کرتے ہیں۔ اس افسانے سے دو اقتباس ہمیں افسانے کے موضوع اور معاصر انسانی صورت حال کے بارے میں سب کچھ بتا جاتے ہیں۔

''انھوں نے ہی، لیکن اپنی مرضی سے نہیں بس ایک دوسرے کو دیکھ کر انھوں نے اپنے ہاتھ کھڑے کیے تھے۔ یہاں یہی ہوتا ہے۔ یہاں کسی کو معلوم نہیں ہوتا کیا کر رہا ہے بس جو دوسرے کر رہے ہیں وہ بھی وہی کرتا ہے۔''

''عجیب شہر ہے ـــــ ہر چیز کو اوپر سے چمکایا جا رہا ہے اور اندر سے وہ زنگ کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اجتماعی موت واقع ہو چکی ہے لیکن ابھی تک کہیں کہیں انفرادی احساس باقی ہے، اس لیے تو اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے سمجھ نہیں آتا کہ اصل کیا ہے اور عکس کیا ہے؟''

اب آپ ''سمندر مجھے بلاتا ہے'' کے ساتھ ''ایک گمنام سیاح کی ڈائری کے چند اوراق'' ملا کر پڑھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس افسانے میں پاکستان میں بار بار مارشل لا کے نفاذ کو تخلیقی سطح پر بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اس افسانے کے بیانیہ میں بالواسطہ اظہار ملتا ہے لوگ بظاہر چل رہے ہیں لیکن در اصل اپاہج ہو چکے ہیں۔ شہر کا شہر گفتگو کا رسیا ہے۔ ہر گفتگو اور بحث بے نتیجہ رہتی ہے کیونکہ کوئی بھی عمل جدوجہد میں سنجیدہ نہیں۔ محب وطنوں کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے اور غداروں کی برسیاں منائی جاتی ہیں۔ اس ساری صورت حال کا حاصل ایک پچھتاوا ہے جو سب کا مقدر ہے۔ ایسے میں افسانے کا اختتام افسانے کو مزید معنی خیز بنا رہا ہے۔

''اتنا عرصہ اس شہر میں رہنے کے باوجود معلوم نہیں کر سکا کہ اس طلسم کے پیچھے کون چھپا بیٹھا ہے۔''

محبت کا تجربہ رشید امجد کے تخلیقی وجدان میں بنیادی جوہر کے طور پر موجود ہے۔ کیپ پوسٹ کا تذکرہ تو اوپر ہو چکا ہے۔ ''شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد'' میں پنجاب کے ہر دل عزیز داستان ہیر رانجھا کے استعارے میں زمانہ حاضر کے محبت کے تجربے کو بیان کرنے کی اچھی کوشش ہے جبکہ ''وقت انتظار نہیں ہوتا'' میں محبت کا یہ تجربہ ایک لمبے زمانی وقفہ میں انسانی وجود کے تبدیل ہونے کی کیفیت کو گرفت میں لیتا ہے۔ محبت کے تجربے کو رشید امجد کے افسانوں کے تناظر میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ رشید امجد کے ہاں محبت بنیادی طور پر ہجر کا تجربہ ہے ایک ایسا ہجر جو ہمیشہ تشنہ رہتا ہے۔ مردانہ اور نسوانی کرداروں میں ابھی یہ جذبہ پوری طرح جڑ بھی نہیں پکڑتا کہ جدائی آن گھیرتی ہے اور پھر ہجر کے طویل وقفے کے بعد اگر ملاقات کا کچھ امکان پیدا ہوتا بھی ہے تو سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سارا منظر نامہ ہمیں بتاتا ہے کہ رشید امجد اپنے افسانوں میں موضوعاتی تنوع بھی رکھتے ہیں اور اسلوبیاتی رنگارنگی بھی۔ ان کے ہاں زبان کو مختلف انداز سے برتنے کا سلیقہ بھی ملتا ہے اور انسانی وجود کو مختلف پہلوؤں سے پرکھنے کی شعوری کوشش بھی۔ وہ حقیقت اور خیال کی آمیزش سے معاشرتی اور انسانی صورت حال کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور زمان و مکان کے معاملات کو افسانوی تخلیق کی شکل دینے پر بھی قادر ہیں تو ایسے میں ان کے بارے میں بعض حلقوں کا گمان کہ رشید امجد یکسانیت کا شکار ہیں کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس غلط فہمی کی طرف بعض نقاد اس لیے گئے کہ انھیں رشید امجد کے ہاں ایک ہی تجربے پر مختلف افسانے پڑھنے کو ملے۔ یہاں اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ رشید امجد ایسے تخلیق کار ہیں جو ایک تجربے کو بار بار گنگناتے ہیں۔ ایک لکھنے سے ان کی تشفی نہیں ہوتی وہ جب تک ایک طرف کو اس کی مختلف جہات سے پرکھ نہیں لیتے اسے اپنے افسانوں میں برتتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صرف تخلیقی مزاج کا معاملہ ہے اسے کسی طرح فنی کمزوری گمان کرنا درست نہیں۔

◆◆◆

"ڈاکٹر رشید امجد، ایک مثالی انسان"

عذرا اصغر

بعض قلمکار اتنے بلند قامت ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں ہم کچھ اظہارِ خیال کرنا بھی چاہیں تو ہمت جواب دے جاتی ہے اور ڈاکٹر رشید امجد تو ذاتی طور پر بھی بلند قامت یعنی کہ دراز قد تھے۔ ان کی دراز قد کا رعب، علم کا دبدبہ اور طبیعت کی سنجیدگی نے مجھے ان کے قریب نہیں ہونے دیا۔ پھر اپنی عادت بھی کچھ ایسی ہے کہ زبردستی یا بلاوجہ کسی سے ملنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اب جبکہ سونان جاوید ماہنامہ "تخلیق" کا "رشید امجد نمبر" نکال رہے ہیں تو ان کی دعوت پر ڈاکٹر رشید امجد پر اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں خامہ فرسائی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے رشید امجد کو کیسا پایا۔

رشید امجد نے 5 مارچ 1940ء میں بارہ مولا کے محلے شلوتوں اور جھیل ڈل میں تیرتے شکاروں کے خطے کشمیر جنت نظیر میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد غلام محی الدین مونس پیشے کے اعتبار سے منقش قالینوں کے ڈیزائنر تھے اور کسی انگریز کی قالینوں کی فیکٹری میں کام کرتے تھے اور اپنی بھی ایک چھوٹی سی فیکٹری کھول رکھی تھی۔ ڈاکٹر رشید امجد کے پردادا ڈوگرا کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اپنے خاندان سمیت امرتسر جا بسے تھے۔ وہ چند برس وہاں رہے لیکن والد خاندان کو چھوڑ کر واپس سری نگر آ گئے۔ ان کو کشمیری زبان کے علاوہ فارسی اور پنجابی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اور وہ فارسی اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے اور مونس تخلص کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ نمایاں تھا۔ طبیعت میں درویشی اور بے نیازی تھی۔ یہی چلن تمام زندگی رشید امجد صاحب کا بھی رہا۔ رشید امجد کے والد کی شادی سری نگر آنے سے پہلے ہو چکی تھی لیکن درویشانہ انداز زندگی کے سبب بیوی سے نباہ نہ ہو سکا اور طلاق ہو گئی۔ دوسری شادی کے لئے وہ پھر امرتسر گئے جہاں ان کا دوسرا نکاح ہوا۔ رشید امجد کہتے ہیں کہ یہ میرے علم میں نہیں ہے کہ طلاق کے بعد دوسری شادی کتنے عرصے بعد ہوئی۔ میری والدہ کا نام خورشید بیگم تھا۔ انہیں لے کر والد دوبارہ سری نگر واپس آ گئے۔ رشید امجد کے ننھیال کا تعلق بھی کشمیر سے ہی تھا جو کہ ڈوگرا کے ظلم و جور کے سبب امرتسر میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ کشمیر کے ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کشمیری مسلمانوں پر ظلم و جفا آج ہی نہیں ہو رہا یہ سلسلہ صدیوں پرانا ہے۔ کشمیر جس قدر قدرتی حسن کا نمونہ ہے اتنی ہی الم ناک زندگی وہاں آباد مسلمانوں کی ہے اور جانے کب ان بدنصیبوں کو آزادی میسر آئے گی۔

اگرچہ رشید امجد سے سلام دعا سے زیادہ میری واقفیت نہیں ہو سکی بس میں انہیں شوق اور لگن سے پڑھتی رہی ہوں مگر سلام دعا سے آگے کبھی بات نہیں بڑھی انہوں نے بھی عورت ہونے کے ناتے عام مردوں کی خصلت کی طرح کبھی قریب ہونے کی کوشش نہیں کی۔ لئے دیئے رہنے والے آدمی تھے۔

ڈاکٹر رشید امجد نہایت سادہ مزاج انسان تھے۔ ان کا لباس بھی سادہ ہوتا تھا۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا شلوار قمیض میں ہی

ملیں دیکھا۔ ان میں تکبر نام کی کوئی شے نہیں تھی اس کے باوجود ان سے بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ٹیلیفون پر البتہ ان سے دو چار مرتبہ رابطہ ہوا۔ میری یادنگاری کی کتاب ''تیری آنکھوں کے ساتھ — میں''۔ برخوردار اشرف سلیم نے انہیں بھیجی تو فوری ڈاکٹر صاحب کا خط بذریعہ ٹی سی ایس مجھے ملا۔ جس میں انہوں نے کتاب کو نہ یہ کہ بہت پسند کیا تھا بلکہ میری تحریر کو خوب سراہا تھا۔ مجھے یہ خط پا کر بے پایاں خوشی حاصل ہوئی اور میں نے فوراً ٹیلیفون پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ چند منٹ تک ہماری گفتگو جاری رہی اور وہ میری تحریر کی خوبیاں بتاتے رہے گویا میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ اس سے پیشتر انہوں نے میرے پہلے مجموعے ''پت جھڑ کا آخری پتا'' مطبوعہ 1980ء جس کی تقریب پذیرائی جناب اکبر جاوید کی کاوش سے پنجاب کے کئی شہروں میں منعقد ہوئی تھی اور راولپنڈی میں جناب سلطان رشک نے اس تقریب کا انعقاد کیا تھا جس میں رشید امجد صاحب نے ایک طویل خوبصورت مضمون پڑھا تھا جو کہ میری آنے والی کتاب ''لفظوں کی تتلیاں'' میں شامل ہے۔

رشید امجد نے 1960ء یا 62ء کی دہائی سے لکھنا شروع کیا۔ میری ابتداء کا بھی تقریباً یہی زمانہ تھا۔ اول اول رشید امجد کے افسانے علامتی، تجریدی ہوتے تھے۔ خالدہ اصغر جو بعد ازاں خالدہ حسین کے نام سے پہچانی گئیں اور منشا یاد بھی تجریدی افسانہ ہی لکھتے تھے۔ دو تین برس ادب پر تجریدیت کا زور رہا پھر منشا یاد کا رخ دیہاتی زندگی کی طرف مڑ گیا لیکن رشید امجد لاجا لکھتے رہے تاہم ان کی علامت نگاری سمجھ میں آسانی سے آجاتی تھی۔ کبھی بوجھ پہیلی والا معاملہ نہ تھا۔ رشید امجد کی ایک خوبی یہ بھی رہی ہے کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک لکھتے رہے اور جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ یہی نہیں وہ عام زندگی فارغ نہیں بیٹھے۔ پنشن پانے کے بعد بھی کسی نہ کسی تعلیمی شعبے سے وابستہ رہے۔ اکثر بلا معاوضہ بھی لیکچر دیتے رہے اور اپنا علم نئی نسل میں منتقل کرتے رہے۔ گویا یہ ان کا مشغلہ یا شوق تھا۔ آخر آخر میں تو ان کے افسانے خاصے ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ لیکن بات سے بات نکالنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔

ڈاکٹر رشید امجد کا بچپن از حد نامساعد حالات میں گزرا۔ چھ برس کے تھے کہ ہجرت کے المیے سے دوچار ہوئے۔ پاکستان آنے کے بعد راولپنڈی موہن پورہ کو والدین نے اپنا مسکن بنایا۔ رشید امجد تاعمر آخر راولپنڈی میں ہی سکونت پذیر رہے۔ پڑھنے کا شوق تھا ایم اے کیا اور پھر ''میرا جی'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور زندگی بھر تعلیمی شعبے سے وابستہ رہے۔ کئی اعلیٰ سطح کے اعزازات حاصل کئے۔ ان پر متعدد تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھے گئے۔ افسانوں کے تقریباً دو درجن مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ تحقیقی وتنقیدی مضامین الگ ہیں۔ ان کی سوانح حیات پہلی بار ''عاشق ہمہ طلب کے عنوان سے'' چھپی۔ نئے اضافے کے ساتھ ''عاشق ہمہ طلب اور تمنا بے تاب'' کے عنوان سے دوبارہ منصۂ شہود پر آئی۔ یعنی یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ ان کی سوانح عمری مبالغے سے پاک ہے۔ انداز تحریر سادہ مگر بے حد دلچسپ اور دلکش ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے بارے میں ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر بدر منیر کہتے ہیں کہ ''وہ پند و نصائح کے قائل نہیں تھے لیکن تہذیب و شائستگی کے تمام رنگ غیر محسوس طریقے اور سلیقے سے اپنے شاگردوں میں منتقل کرنے کا ہنر انہیں جیسے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔''

اصل بات یہ ہے کہ وہ اس انداز سے گفتگو کرتے تھے کہ بات دل میں اتر جاتی تھی۔ یہ بات الجھن سے خالی نہیں ہوگی۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ بچپن سے والدین بتاتے اور سمجھاتے آئے ہیں کہ پانی سیدھے ہاتھ سے پیو۔ میرا موقف تھا کہ جب دونوں ہاتھ اللہ

تعالیٰ نے بنائے ہیں تو دائیں اور بائیں کی تخصیص کیوں؟ جبکہ دایاں ہاتھ کھانا کھاتے ہوئے سالن سے عموماً خراب ہو جاتا ہے تو بائیں ہاتھ سے ہم گلاس پکڑ کر پانی پی لیتے ہیں۔ نہایت شرمساری کے ساتھ اعتراف کر رہی ہوں کہ میں والدین اور بزرگوں کی نصیحت پر پابند نہیں ہو سکی لیکن رشید امجد کی سوانح حیات "عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب" میں ان کا یہ بیان پڑھ کر جس میں انھوں نے اپنے والدین کی اس نصیحت کا ذکر کیا ہے کہ پانی دائیں ہاتھ سے پیو کر میں اب کھانا کھاتے ہوئے ہاتھ ٹشو یا نیپکین سے پونچھ کر گلاس دائیں ہاتھ میں پکڑتی ہوں۔ جانے ڈاکٹر صاحب نے کیسے انداز میں لکھا ہے کہ بات میرے دل میں اتر گئی۔

ڈاکٹر رشید امجد درویش صفت انسان تھے اور درویش جو باتیں کرتے ہیں وہ دل میں اتر جاتی ہیں۔ انھوں نے زندگی بھی درویشانہ شان سے گزاری۔ اعزازات حاصل کیے۔ تعلیم کے بڑے عہدے پر متمکن رہے۔ پیسہ بھی کمایا مگر محنت سے اور غرور و تکبر کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ جب تک جیئے سادہ اور پُر وقار انداز سے جیئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی روح کو شادمان اور آسودہ رکھے۔ آمین!

◆◆◆

طنز و مزاح — ڈاکٹر بدر منیر

مارا ہوا ہے

کوئی ماضی کا کوئی حال کا مارا ہوا ہے
کوئی فردا کے استقبال کا مارا ہوا ہے
بھلا محبوب پلے سے کرے کیوں تری چیٹس
بنے دیکھو وہی جس کال کا مارا ہوا ہے
حقائق کی طرف آنا بہت مشکل ہے اس کا
جو بندہ فیس بک کی ڈال کا مارا ہوا ہے
بنائے جو ترے چہرے پہ بیوٹی پارلر نے
یہ دل ایسے ہی خدوخال کا مارا ہوا ہے
ضمیر اپنی سیاست کا بھی زندہ تھا لیکن
نہ جانے اب یہ کتنے سال کا مارا ہوا ہے

دھوکے میں

خود کو مشکل میں ڈالا ہے آسانی کے دھوکے میں
اک انگیٹھی لے آئے ہیں اجالی کے دھوکے میں
عقد کے بعد بہت تھوڑی مدت میں یہ احساس ہوا
چینی مال آئی ہے جاپانی کے دھوکے میں
سر سہلانے والا اُلو سیدھا کر کے بھاگ گیا
ڈال کے ہم کو سارے گاما پا دھانی کے دھوکے میں
میڈیا جتنا بھی سوشل ہو لیکن اتنا دھیان رہے
آنکھ پہ پٹی بندھ جاتی ہے عریانی کے دھوکے میں
داؤ پیچ سیاست والوں کے دیکھے تو یہ راز کھلا
ایک سراب کے پیچھے بھاگے ہم پانی کے دھوکے میں

ڈاکٹر رشید امجد میرے لیے

ڈاکٹر بدر منیر

عباس تابش نے کہا ہے۔

کس طرح لوگ چلے جاتے ہیں اٹھ کر چپ چاپ ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ڈاکٹر رشید امجد کے جنازے میں شمولیت کے لیے خوشاب سے راولپنڈی روانہ ہوا تو گہری اداسی میری ہم سفر رہی۔ خاموشی مکالمہ کررہی تھی۔ استادِ محترم کی جدائی کو تسلیم کرتے ہوئے ایک عجیب طرح کا کرب رگ و پے میں سرایت کررہا تھا۔ ان سے جڑی ہوئی یادیں میرے اندر جگنوؤں کی طرح جل بجھ رہی تھیں۔ بس سے اترا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے بھرا شہر خالی ہوگیا ہو۔ سچ ہے کہ میرے لیے راولپنڈی کا دوسرا نام ڈاکٹر رشید امجد تھا۔ معروف علمی ادبی پرچے ''تخلیق'' نے ان کی ادبی خدمات کے لیے ''تخلیق ایوارڈ 2020ء'' کا اعلان کیا تو ذہن میں پروگرام بن رہا تھا کہ اس تقریب میں شامل ہونے کے لیے لاہور ضرور جانا ہے۔ قدرت کو کچھ اور منظور تھا اور میں ان کے جنازے میں شامل ہونے کے لیے گلستان کالونی راولپنڈی میں ان کے گھر کے سامنے سراپا غم کھڑا تھا۔

جب سفر سے لوٹ کر آتے تو کتنا دکھ ہوا اس پرانے بام پر وہ صورتِ زیبا نہ تھی

یہی وہ گھر تھا جہاں کبھی آنا ہوتا تو میری خوشی بھی دیدنی ہوتی اور ان کا مشفقانہ رویہ بھی دیکھنے کے قابل ہوتا۔ ایف جی سرسید کالج راولپنڈی کی فضا میں ان کے زیرِ سایہ گزارا ہوا وقت اور یادیں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ خوشاب ایک دیہات نما شہر ہے۔ میں یہاں سے جب سرسید کالج گیا تو مجھے ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑی مشکل پیش آرہی تھی۔ ڈاکٹر رشید امجد اور دیگر اساتذہ نے اس ماحول میں جذب ہونے میں میری کافی مدد کی۔ ڈاکٹر رشید امجد نے جب مجھے ''سرسیدین'' کا مدیر منتخب کیا تو مجھے ایسا سائبان میسر آگیا جس کا سایہ میں آج تک اپنے سر پر محسوس کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے جو کچھ سیکھنے کا موقع ملا وہ میرے ادبی سفر میں میرا راہنما ہے۔ بی اے اردو اختیاری میں ان کا اکلوتا طالب علم تھا لیکن مجال ہے کبھی کلاس چھوڑی ہو۔ اگر کالج سے باہر جانا ناگزیر ہوتا تو مجھے موٹر سائیکل پر ساتھ بٹھاتے اور نصاب کے کسی نہ کسی موضوع پر بات کرتے جاتے۔ کبھی کبھی اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی بتاتے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جب وہ یہاں آئے تو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دن اچانک راولپنڈی کے ایک علاقے میں موٹر سائیکل کو بریک لگائی اور بتانے لگے۔ میں نے اس مقام پر سائیکلوں کو پنچر لگائے ہیں لیکن ایک طمانیت آمیز مسکراہٹ ہمیشہ ان کے چہرے پر رہتی۔ وہ راضی برضا تھے۔ گلہ اور شکوہ تو ان کی لغت میں ہی نہیں تھا۔ بہت محنتی انسان تھے اور کوئی بھی کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ سرسیدین پاکستانی ادب نمبر کے لیے انھوں نے بے انتہا محنت کی۔ اداروں کے کرنے کا کام تھا جسے فردِ واحد نے اکیلے بہت خوبی سے انجام دیا۔ ادبی حلقوں میں اس کام کی بے حد پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ کام ہی انسان کی عزت بناتا ہے، باقی سب ماضی کی گرد میں چھپ

جاتا ہے۔ ان کے ساتھ رہنے والا غیر محسوس طریقے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ میں اگر کہوں کہ میں آج تک ان کی کئی چیزوں کو کاپی کرتا ہوں تو غلط نہ ہوگا۔ میں اپنے ادبی سفر میں جو کچھ کر پایا ہوں تو اس کا کریڈٹ بلاشبہ ڈاکٹر رشید امجد کو جاتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے بڑے افسانہ نگار، محقق، نقاد، دانشور اور ماہر تعلیم ہونے میں تو کسی کو شک نہیں، ان کی خدمات کا اعتراف ہر سطح پر ہوا لیکن وہ ایک بہت اچھے، سچے، مہذب اور صاف گو انسان بھی تھے۔ کج بحثی ان کے مزاج میں نہیں تھی، وہ دو ٹوک بات کرتے، چاہے مد مقابل کوئی بھی ہو۔ منافقت انہیں چھو کر نہیں گزری تھی۔ ان کی بے حد مقبول خودنوشت ''عاشقی صبر طلب'' (جس کے ابتدائی ایڈیشن تمنا بے تاب کے نام سے طبع ہوئے) ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے جو دلچسپ بھی ہیں اور چشم کشا بھی۔ یہ کتاب ان کے افسانوں کے برعکس نہایت سادہ اسلوب میں تحریر کی گئی ہے۔ جو بے ساختہ پن ان کی شخصیت میں تھا وہ ان کی خودنوشت کے مندرجات میں بھی موجود ہے۔ اس کتاب میں درج ایک چھوٹا سا واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایک فوجی افسر سرسید کالج کی انسپکشن کے لیے آئے، کلاس روموں کی طرف گئے، وہاں ڈاکٹر رشید امجد کلاس لے رہے تھے، آفیسر کمرے میں داخل ہوئے تو حیرت سے سوال کیا کہ آپ اردو میں پڑھا رہے ہیں!!! ڈاکٹر رشید امجد نے برجستہ جواب دیا ''اردو ہے تو اردو میں ہی پڑھاؤں گا'' وہ صاحب دورہ مکمل چھوڑ کر کالج سے چلے گئے۔ ''عاشقی صبر طلب'' کا شمار اردو کی بہترین اور منفرد سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ جس کے مندرجات پاکستان کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی پہلوؤں پر ایک تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرسید کالج میں جب میرا بی۔ اے مکمل ہوا اور میں ان سے اجازت طلب کر کے روانہ ہونے لگا تو ایک نصیحت میری گرہ میں باندھ دی ''بیٹا گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے کرنا ہے اور راوی کا مدیر بھی بننا ہے۔'' میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور راوی کا ایڈیٹر بھی بنا۔ یہ میرے استاد کی دعا کا اثر تھا۔ جب انہیں یہ خوش خبری سنائی تو بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ چائے پینے کے شوقین تھے۔ خود پیتے تو مجھے بھی ضرور پلاتے۔ ادب کے ساتھ چائے کا شوق بھی مجھے ڈاکٹر رشید امجد سے ملا۔ کتب بینی اور اپنی ذاتی لائبریری بنانے کا شوق بھی انہیں کے قرب میں پروان چڑھا۔ میں نے ہمیشہ ان کے ہاتھ میں کتاب اور آنکھوں میں کچھ کر گزرنے کا جنون دیکھا۔ جو سوچتے تھے وہ کر گزرتے تھے، یہی وجہ کہ انہوں نے ادب کے دامن میں لاتعداد بیش قیمت کتب کا اضافہ ڈالا، جو ادب کے میدان میں قدم رکھنے والوں کے لیے راہنما ہے۔ ان کا شمار ایسے اساتذہ میں ہوتا جو اپنا علم شاگردوں میں منتقل کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ڈاکٹر رشید امجد نئے لکھنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''مجھے پلکیں جھپکنے دو'' تیار ہوا تو میں نے ان سے دیباچہ لکھنے کی استدعا کی۔ چند ہی دنوں میں ان کی طرف سے دیباچہ موصول ہو گیا، جسے میں نے فخر کے ساتھ کتاب کا حصہ بنایا۔

ڈاکٹر رشید امجد کی خودنوشت میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ ایک واقعہ پر اپنی تحریر کا اختتام کروں گا۔ ڈاکٹر رشید امجد گاڑی چلانا نہیں جانتے تھے، کئی بار کوشش بھی ہوئی۔ ایک بار جب غلط گیر لگایا تو ان کے انسٹرکٹر نے کہا ''سر یہ آپ کے بس کی بات نہیں'' مدتوں بعد جب میں نے گاڑی سیکھنے کی کوشش کی تو ایک دن سکھانے والے نے مجھے کہا ''سر یہ آپ کے بس کی بات نہیں'' تو بے ساختہ مجھے استاد محترم یاد آ گئے، میں ہنس پڑا اور مجھے اپنی کوتاہی پر پیار آنے لگا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے، آخرت کی منزلیں آسان کرے۔ تخلیق کے مجلس ادارت کو خراج تحسین کہ انہوں نے اس عہد ساز علمی و ادبی شخصیت کا نمبر چھاپ کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

◆◆◆

ڈاکٹر رشید امجد......راولپنڈی کی رونق

نسیم سحر

رشید امجد ایک بے لوث انسان تھے انسانی ہمدردی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا وہ دوستی میں خلوص اور محبت کو اونچا مقام دیتے تھے۔ میری ان سے ملاقات 1998ء میں حلقہ ادب راولپنڈی میں ہوئی وہ سیدھے سادے انسان تھے۔ رشید امجد گندمی رنگ، موٹی آنکھیں، سر پر خال خال بال رہ گئے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، لمبے قد والے شخص تھے۔ عام طور پر وہ شلوار قمیض میں ہی ملبوس رہتے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے احوال اپنی مشہور زمانہ کتاب تمنا بے تاب میں خود ہی بیان کر دیے ہیں اس لیے میں شاید کوئی نئی چیز ان کے بارے میں نہ لا سکوں مگر ان کے تذکرے کے بغیر میرے شہر کے سخنوروں کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ راولپنڈی میں ڈاکٹر صاحب موہن پورہ اور دوسرے علاقوں سے ہوتے ہوئے گلستان کالونی میں مستقل رہائش پذیر ہوئے۔ سری نگر سے وہ پاکستان آئے نقشی قالینوں کے ماحول میں آنکھ کھولنے والے رشید امجد نے ان نقشی قالینوں کے خوبصورت نقش و نگار سے زندگی کے تانے بانے بنے۔ یوں جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو ان کے قلم سے یہی نقش و نگار لفظوں کی صورت میں صفحہ قرطاس کی زینت بنے وہ اکثر ذکر کرتے کہ وہ وہاں کی منتوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ جانے اس کے لیے کتنے چراغ منتوں کے جلائے ہوں گے کہ رشید امجد جیسا چمکتا ستارہ ان کے گھر پیدا ہوا۔ مجھے بتایا کرتے کہ وہ بچپن میں اکیلے نہیں سو سکتے تھے کیونکہ ایک انجانا ڈر ہمیشہ ان کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا ان کی یہ قدر مجھ سے مشترک ہے میں بھی انجانے سے خوف سے دوچار رہتا ہوں۔

رشید امجد خود کہتے تھے کہ وہ بے حد شرمیلے انسان تھے اس لیے وہ اپنا سوشل دائرہ ایک حد سے آگے نہ بڑھا سکے۔ پچھلے 25 سالوں سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ ان کو بڑی مشکل سے گھر سے نکالا جاتا تھا۔ ان کے رویے میں ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ وہ غالب سے بہت متاثر تھے یہ نام ان کے لاشعور میں بسا ہوا تھا۔ ان کا یہ لگاؤ کسی نہ کسی طرح منظر عام پر ضرور آ جاتا تھا۔ بے تاب کے پہلے صفحے پر غالب کا شعر اور اسی طرح استعاروں، باتوں اور اشاروں میں غالب اور حافظ کی میٹھی میٹھی شاعری کا احساس ان کے ساتھ گفتگو میں ہوتا رہتا تھا۔ رشید امجد جس محفل میں شریک ہوتے اس کی رونق دوبالا ہو جاتی وہ اونچی آواز میں بولتے تھے۔ دوسروں کی آواز دب جاتی تھی جس چیز سے اختلاف ہوتا برملا اظہار کر دیتے ناپسندیدگی کی صورت میں خاموشی اختیار کر لیتے خواہ مخواہ بحث میں داخل نہ ہوتے۔ رشید امجد یاروں کے یار تھے انگریزی میں کہتے ہیں Strong likes and dislikes کی ان کا رویہ ایسا ہی تھا۔

وہ خوش قسمت تھے انہوں نے اپنی والدہ کی محبت کو محسوس ہی نہیں عملی طور پر بھی دیکھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ صنف نازک کے سامنے یکدم موم ہو جاتے تھے وہ اپنی بیگم اور بیٹی سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے تھے۔ شاید یہ ان کا اپنی والدہ کی طرف رجحان کا فطری ردعمل تھا۔ رشید امجد مارشل لا کا دشمن تھا اسے ایسی آمریت سے نفرت تھی اسی لیے ان کے رویے میں مزاحمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی

کسی حد تک مجھے لگا کہ وہ عوامی آدمی تھے مگر نہیں اس کے اندر ایک بیورو کریٹ بھی چھپا ہوا تھا۔ بچپن کی یادوں میں گھر کر کہتے تھے کہ وہ بوقتِ ضرورت گھر کے قیمتی برتن بھی اونے پونے فروخت کر دیتے تھے۔ رشید امجد نے زندگی میں مقام محنت سے کمایا۔ انہیں منشا یاد، مظہر الاسلام، اعجاز راہی اور احمد داؤد نہیں بھولتے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دوستوں کے کس قدر گرویدہ تھے۔ دوسرا کردار جس کا وہ بہت ذکر کرتے تھے وہ استاد غلام رسول طارق کا تھا۔ غلام رسول طارق جس نے ان کو لکھنے کے گر سکھائے حاسدوں سے خبردار کیا ادبی دنیا کے یہ حاسد ہر دور میں موجود ہوتے ہیں وہ کہتے تھے کہ یہ حاسد نہیں ادبی گروہ ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو آپ ادبی سفر میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہی لوگ آپ کو پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

رشید امجد نے ایم اے گورڈن کالج سے کیا وہ گورڈونین تھے یہ میری اور ان کی ایک اور مشترک قدر ہے۔ صفی حیدر ان کے بھی استاد رہے اور وہ میرے بھی استاد تھے۔ رشید امجد مزاحمتی رویوں کے علمبردار تھے یہ ادبی حلقوں کی حد میں ان کی مزاحمتی حس تھی جس کی بنا پر انہوں نے راولپنڈی میں ایک ادبی گروپ کو فعال کیا۔ جس میں سعید احمد، داؤد رضوان، شعیب خالق، اختر عثمان، اشرف سلیم، جہانگیر عمران، تابش کمال، عابدہ سیال، جوہر حیات جیسے کئی ادبی ستارے شامل ہیں ان میں سے ہر ایک نے اپنے طور پر ادب کے حقیقی رویوں کو شکست دی۔ ڈاکٹر صاحب ساری عمر دوستوں کے حصار میں رہے۔ جمود ان کی زندگی کا حصہ نہیں تھا وہ ہمیشہ فعال لمحوں کو زندگی سمجھتے تھے۔ پچھلے 25 سالوں میں ہر روز ان سے تعلقات میں مضبوطی آتی رہی وہ اپنے اندر ایک ادارہ تھے میں نے حرف اکادمی سے ان کی کئی کتابیں شائع کیں جن میں ایک عام آدمی کا خواب ان کی شاہکار کتاب تھی اس میں ان کا افسانہ لنگی والا ہے جو معاشرے کے طبقاتی نظام کے خلاف ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور عالمی شہرت کا حامل ہے۔ کئی جگہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا وہ پلاؤ بڑے شوق سے تناول کرتے وہ سیدھے سادے ایماندار انسان تھے۔ راولپنڈی اور برصغیر کی ادبی تاریخ میں ان کا نام قطبی ستارے کی طرح دمکتا رہے گا۔ ان کی اچانک وفات سے ادبی حلقے شدید رنج و غم کا شکار ہوئے۔ اللہ کی ذات ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

◆◆◆

ادارہ ''تخلیق'' اور اس کے تمام قارئین کو معروف شاعرہ محترمہ ڈاکٹر فوقیہ مشتاق کو

Roger Williams University America

کے شعبۂ کیمیا میں بطور پروفیسر تقرری پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

آہ ......رشید امجد......!

شاہین زیدی

عذرا بی بی نے مجھے فون پر رشید امجد پر مضمون لکھنے کو کہا تو میں انکار نہ کر سکی۔ وہ ان سے وعدہ کیا کہ بہت جلد مضمون لکھ کر سونان کو بھجوا دوں گی۔ میرے لیے ان ہستیوں پر مضمون لکھنا ہمیشہ سے مشکل کام رہا ہے جو ہمیں چھوڑ کر بہت دور جا چکی ہیں۔ اس لیے کہ ان سے وابستہ یادیں ہمیں ماضی کی بھول بھلیاں میں دھکیل دیتی ہیں اور پھر بہت دیر تک تو کیا کئی دنوں تک طبیعت اداس رہتی ہے۔

خیر وعدہ جو کر لیا ہے اسے تو نبھانا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم اسلام آباد میں رہ رہے تھے۔ ایک روز میں اپنے شوہر مسعود زیدی صاحب (مرحوم) کے ہمراہ اپنے پیارے بھائی ڈاکٹر گوہر نوشاہی (مرحوم) کے گھر اپنا رسالہ (سہ ماہی نوادر) کا تازہ شمارہ دینے کے لیے گئی۔ رسالہ دیکھ کر بھائی صاحب بہت خوش ہوئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے گوہر بھائی فون پر کسی سے بات کی اور فون بند ہوتے ہی چہک کر بولے۔ چلو بھئی تمھیں آج لوگوں کو کسی سے ملوانا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی چپ چاپ گوہر بھائی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے اور گوہر بھائی مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے اچانک ایک گھر کے سامنے جا رکے۔ — ایسے ہی تھے گوہر بھائی جو دل میں آیا کہہ دیا، جہاں دل چاہا لے گئے۔ مسعود زیدی انھیں اپنا بڑا بھائی کہا کرتے تھے۔ گوہر بھائی کا احترام شاہ صاحب بہت کیا کرتے تھے۔ وہ بھی مجھے اپنی بہن کا درجہ دیا کرتے تھے۔

گھنٹی بجتے ہی گھر کا دروازہ کھلا اور پھر ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ لڑکا اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی جو شخصیت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اسے دیکھتے ہی گوہر بھائی نے بڑھ کر انھیں گلے لگاتے ہوئے مسعود زیدی صاحب سے کہا۔ بھائی یہ ہے میرا پیارا دوست رشید امجد، معروف افسانہ نگار، راولپنڈی کی مشہور ادبی شخصیت اور رشید یہ میرا بھائی مسعود زیدی اور میری بہن شاہین زیدی۔ رشید امجد صاحب بہت محبت اور احترام سے پیش آئے۔ پر تکلف چائے کے ہمراہ اسلام آباد و راولپنڈی کے شاعر، شاعرات ادیب، ادبی محفلیں، اکیڈمی آف لیٹرز اور جانے کس کس کا ذکر ہوتا رہا۔ رشید امجد کھل کر ان محفلوں کا حال بیان کرتے رہے۔ حکومت کی عدم دلچسپی کی وجہ سے گفتگو کا محور رہی کہ کس طرح ادبی رسائل بند ہو رہے ہیں۔ یہی نہیں نئے لکھنے والوں اور پرانے لکھنے والوں کے حالات پر بھی گوہر بھائی اور رشید امجد صاحب نے سیر حاصل تبصرہ کیا۔ بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور پھر ہم نے ان سے اجازت چاہی ہم نے انھیں سہ ماہی نوادر کا تازہ شمارہ پیش کیا جو انھیں بے حد پسند آیا۔ رشید امجد صاحب نے رسالہ لیتے ہوئے شکریہ ادا کرنے کے ساتھ اپنا تازہ افسانہ بھجوانے کا وعدہ بھی کیا اور بہت جلد انھوں نے وعدہ پورا کر دکھایا۔ اس کے بعد بھی انھوں نے کئی دفعہ نوادر کے لیے اپنے غیر مطبوعہ افسانے بھجوائے جو کہ ہم نے شائع کیے۔ مجھے یاد ہے میں اور مسعود زیدی دوبارہ ان کے گھر جب رسالہ دینے گئے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ محبت اور خلوص سے پیش آئے۔ وہی پر تکلف چائے، خاطر مدارات کے دوران ادبی نشستوں میں پڑھے جانے والے افسانے اور ان کے معیار پر بات چیت کرتے رہے۔

باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ انھیں تو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ افسانہ لکھ سکتے ہیں۔ یہ احساس تو رشید امجد کو ان کے آفس میں ایک کولیگ نے دلوایا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہے تھے کہ میری اس صلاحیت کا احساس میرے دوست کو کس طرح ہوا میں خود حیران ہوں۔ اس نے مجھ سے زبردستی افسانہ لکھوایا بس پھر کیا تھا وہ دن اور آج کا دن لکھتا چلا جا رہا ہوں — یہ ملاقات بھی بہت دیر تک جاری رہی۔ ان کی باتیں ہی اتنی اچھی ہوا کرتی تھیں کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ جب ہم اجازت لے کر جانے کے لیے اٹھے تو انھوں نے بہت محبت کے ساتھ اپنے افسانوں کا مجموعہ "ست رنگے پرندے کے تعاقب میں" ہمیں دیا جو کہ آج بھی ان کے ہاتھوں کی تحریر سے مزین میری ذاتی لائبریری میں موجود ہے۔ "مسعود زیدی کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا تھا۔ رشید امجد صاحب اشرف سلیم صاحب کے ہمراہ مصطفیٰ ٹاؤن والے گھر میں بھی تشریف لاتے رہے۔ جب ہم واپڈا ٹاؤن شفٹ ہو گئے تو مسعود زیدی کے انتقال پر انھوں نے فون پر مجھ سے تعزیت کی اور اب اکثر ان سے فون پر بات ہوا کرتی تھی۔

اشرف سلیم صاحب کی زبانی رشید امجد صاحب کی خیریت دریافت کرتی رہتی تھی کیونکہ اب ان کی طبیعت ناساز رہتی تھی۔ اب وہ زیادہ تر بیٹے کے پاس رہا کرتے تھے۔ وقت تو جیسے اڑا چلا جا رہا تھا مصروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کس سے رابطے ہوں کس سے نہیں — ادھر ظالم کرونا نے رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ زمانہ بھی تو بہت بدل چکا ہے خط و کتابت سے فون اور فون سے اب فیس بک ہی سے پیاروں کے بارے میں خیریت مل جاتی ہے ہر طرح کی معلومات اب فیس بک سے ہی ملتی رہتی ہیں۔ اسی فیس بک کے ذریعے مجھے رشید امجد صاحب کے دنیا سے چلے جانے کی خبر ملی — عذرا اصغر اور اشرف سلیم سے تعزیت کی — 2020ء سے لے کر 2021ء تک اردو کے بہت سے ادیب، شاعر، شاعرات اس موذی کرونا جیسے مرض کا شکار ہو کر شہر خموشاں میں جا بسے۔ اللہ تعالیٰ ان سب مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین) اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا کرے (آمین) ادیب، شاعر، استاد یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اپنی تحریروں کی شکل میں —

آج کی شام بہت اداس ہے۔ شامیں ویسے تو اداس ہی ہوا کرتی۔ میری امی کہا کرتی تھیں کہ جب دو وقت مل رہے ہوتے ہیں تو اسی لیے اداسی محسوس ہوتی ہے۔ میں اس وقت دل میں سوچا کرتی تھی بھلا ملنے کے وقت اداس کوئی کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ تو خوشی کا وقت ہوتا ہے — مگر اب مجھ میں آیا کہ بظاہر ملنے والے بچھڑ بھی تو رہے ہوتے ہیں — اندھیرا پھیلنے کا احساس تنہائی اور اداسی کو اور بڑھا دیتا ہے —
رشید امجد کے افسانے ان کے مشاہدے اور ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بظاہر وہ خاموش طبع تھے مگر ان کے افسانے پڑھ کر لگتا ہے وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ رشید امجد بات کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کا بیانیہ سیدھے سادے الفاظ پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیمپ پوسٹ، کہانی نے خواب دیکھا، سمندر مجھے بلاتا ہے، سناٹا بولتا ہے اور بہت سے افسانے ان کی شخصیت کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ تھے۔

◆◆◆

نوٹ: اپنی تحریر بذریعہ ای۔میل ارسال کرنے کے بعد لکھاری پر واجب ہے کہ بذریعہ ٹیلی فون کال ادارہ سے ای میل کی موصولی کی تصدیق کرے۔ بصورت دیگر ادارہ کسی بھی تحریر کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ (ادارہ "تخلیق")

رشید امجد صاحب سے ایک ملاقات

زید اللہ فہیم

دن دن میں زندگی کا سفر ہو گیا تمام   کتنا طویل لگتے تھے چھوٹی سی بات کو

اس شعر کے ساتھ ہی مجھے وہ لمحات یاد آ رہے ہیں جب ہم جناب رشید امجد صاحب سے ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ پر گئے تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے لیکن دن مہینوں میں ڈھل گئے ہیں۔ میں ایک دن ایک اخباری کالم پڑھ رہا تھا کہ اچانک مدیر تخلیق جناب سونان اظہر کا فون آیا کہ کل تعطیل ہے اور مصروفیات کیا ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ کل گھر پر ہی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کل راولپنڈی آ جاؤں وہاں جناب رشید امجد سے مل کر ان کو مبارک باد کہنا ہے کیونکہ تخلیق ایوارڈ بورڈ نے ان کو اس سال کے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا ہے۔

دوسرے دن میں اور میرا بھتیجا محمد عمر راولپنڈی کے لیے روانہ ہوئے۔ عزیزم ذوالفقار علی اسد بھی راولپنڈی جا رہے تھے چنانچہ ہم ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایوب پارک کے سامنے اتر کر ہم نے ذوالفقار اسد صاحب سے اجازت لی اور ٹوپی رکھ میریج ہال کے دفتر میں پہنچ گئے جہاں محترم ایم۔ ڈی ملک صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ جناب تسنیم عمر پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ جناب ملک صاحب نے چائے سے نوازا اور ہم گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر بعد لاہور سے جناب سونان اظہر، جناب شہزاد نیر اور جناب آفتاب خان بھی آ گئے۔ چائے اور سویٹ ڈش سے سب کی تواضع کی گئی۔ اسی اثناء میں شام ہو گئی ہم جناب رشید امجد صاحب کی قیام گاہ کی طرف قافلہ کی شکل میں روانہ ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں ان کے ہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر رشید امجد صاحب معروف افسانہ نگار، ادیب اور استاد ہیں۔ ان سے ذاتی طور پر کوئی شناسائی نہ تھی۔ ان کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی ان سے غائبانہ تعارف اس طور پر تھا کہ ان کے افسانے کبھی کبھار پڑھ لیتا تھا ان کے افسانوں کا Themes زیادہ تر معاشرتی اور تہذیبی رویوں سے متعلق ہوتا ہے اور افسانے کے آخر میں ایک تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔

ان کا ایک افسانہ جو میں نے پڑھا تھا اس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا کہ گھر میں پرانی چیزوں کو سنبھال کے رکھو۔ یہ پرانی چیزیں بھی بعض اوقات کام دے جاتی ہیں۔ ایک آدمی کا بچہ شدید بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کو خون کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ کوئی خون نہیں دے پاتا خون دینے کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ آخر دادا کا خون پوتے سے میچ کر جاتا ہے اور دادا خون دیتا ہے اور پوتا بچ جاتا ہے۔ ایسے افسانے قاری پر ایک ایسا اثر چھوڑتے ہیں جو ذہنوں میں نقش ہو جاتا ہے۔ رشید امجد صاحب کے افسانے ایسا ہی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے افسانے محض موجودہ دور کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر دور کے لیے ہوتے ہیں۔ معاشرہ کی اصلاح کرتے ہیں اور انسانی رویوں کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ بات ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی ہو رہی ہے تو جب ہم ان کے گھر پہنچے تو ڈاکٹر صاحب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ دعا سلام کے بعد مدیر تخلیق محترم سونان اظہر نے اور دیگر احباب نے ڈاکٹر صاحب کو مبارک دی کہ ان کو سال 2020ء کا تخلیق ادبی ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔

سوہان اظہر صاحب نے گلدستہ پیش کیا۔ باری باری ہم نے بھی پھول پیش کیے۔ مٹھائی سے منہ میٹھا کروایا گیا۔ یہ مٹھائی خاص طور پر سوہان اظہر صاحب لاہور سے لائے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے پُرتکلف چائے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ تمام حاضرین نے چائے نوش کی اور گفتگو بھی ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب گویا ہوئے کہ جب انہوں نے افسانہ نگاری شروع کی تو اپنے استاد صاحب کو دکھاتے تھے۔ وہ چار پانچ دفعہ بار بار لکھواتے اور آخر کار جب اس کو قابل کرتے تو کہتے کہ کسی رسالے میں بھیج دو اور وہ شائع بھی ہو جاتا تھا۔ دورانِ گفتگو ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ 81 سال کے ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ہر صنف تحریر میں محنت کرنا لازم ہے۔ محنت کے بغیر فن میں حُسن پیدا نہیں ہو سکتا اور جب تک تحریر میں حُسنِ بیان نہ ہو تو اس میں کوئی تاثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ ملاقات خوشگوار ماحول میں ہوتی۔ ہم ان کو سنتے رہے اور ان کی باتوں سے مستفید ہوتے رہے۔ افسانہ پر جناب شہزاد نیر اور جناب آفتاب خان نے بھی بات کی۔ ان کے ساتھ تصویر کشی کا دور ہوا۔ تمام احباب نے الگ الگ اور ایک ساتھ گروپ کی صورت میں فوٹو بنوائے۔ یہ ایک یادگار ملاقات تھی بعد میں ایک مختصر شعری نشست بھی ہوئی۔ جناب شہزاد نیر، جناب آفتاب خان، راقم زبید اللہ فہیم اور جناب تسنیم سحر صاحب نے اپنا کلام سنایا۔

ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں تخلیق ادبی ایوارڈ کی تقریب فروری 2021ء میں منعقد ہونا تھا لیکن کرونا وائرس کی وجہ سے یہ التوا کا شکار ہو گئی اور اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب ملکِ عدم کو سدھار گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر صاحب کی رحلت نے احباب کو دل گرفتہ کر دیا۔ یقین نہیں آتا کہ وہ اب ہم میں نہیں ہیں۔

دورانِ تعلیم فارسی کی کتاب میں ایک واقعہ پڑھا تھا۔ یہاں موقع کی مناسبت سے رقم کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ گزشتہ دور میں ایک بزرگ صاحبِ عرفان اپنی عمر کے آخری حصہ میں شہر سے باہر ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔ ان کے عقیدت مند روزانہ ان کو اسی مکان میں جا کر ملتے۔ ایک روز جب ان کے عقیدت مند لوگ ان کے گھر گئے تو باہر کا دروازہ بند پایا۔ کافی دیر تک باوصف دستکیں دینے کے بعد جب دروازہ نہ کھلا تو دیوار پھلانگ کر ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ دروازہ کھولا اور اندر کمرے کا دروازہ بھی کھولا گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ بزرگ سجدہ میں ہیں۔ لیکن کافی دیر تک جب وہ سجدہ سے نہ اٹھے تو انہیں ہلایا گیا جس پر ان کا جسم ایک طرف سرک گیا اور ان کے دائیں ہاتھ میں سے ایک کاغذ نکلا جس پر یہ رباعی درج تھی۔

رباعی

دی شب ز سرِ صدق و صفائے دلِ من ‏ ‏ ‏ در میکدہ آں ترسہ فدائے دلِ من
جامے بمن آورد کہ بستاں و بنوش ‏ ‏ ‏ گفتم نخورم گفت "برائے دلِ من"

جب خالقِ حقیقی بلاتے ہیں تو جانا پڑتا ہے۔ اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ جب کہا جاتا ہے کہ جام پی لو تو انکار نہیں ہو سکتا۔ جام پینا پڑتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ "نخورم" لیکن جب یہ کہا جائے کہ "برائے دلِ من" تو پھر راضی برضا والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ مقررہ وقت پر سفرِ آخرت لازم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے درجات بلند فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

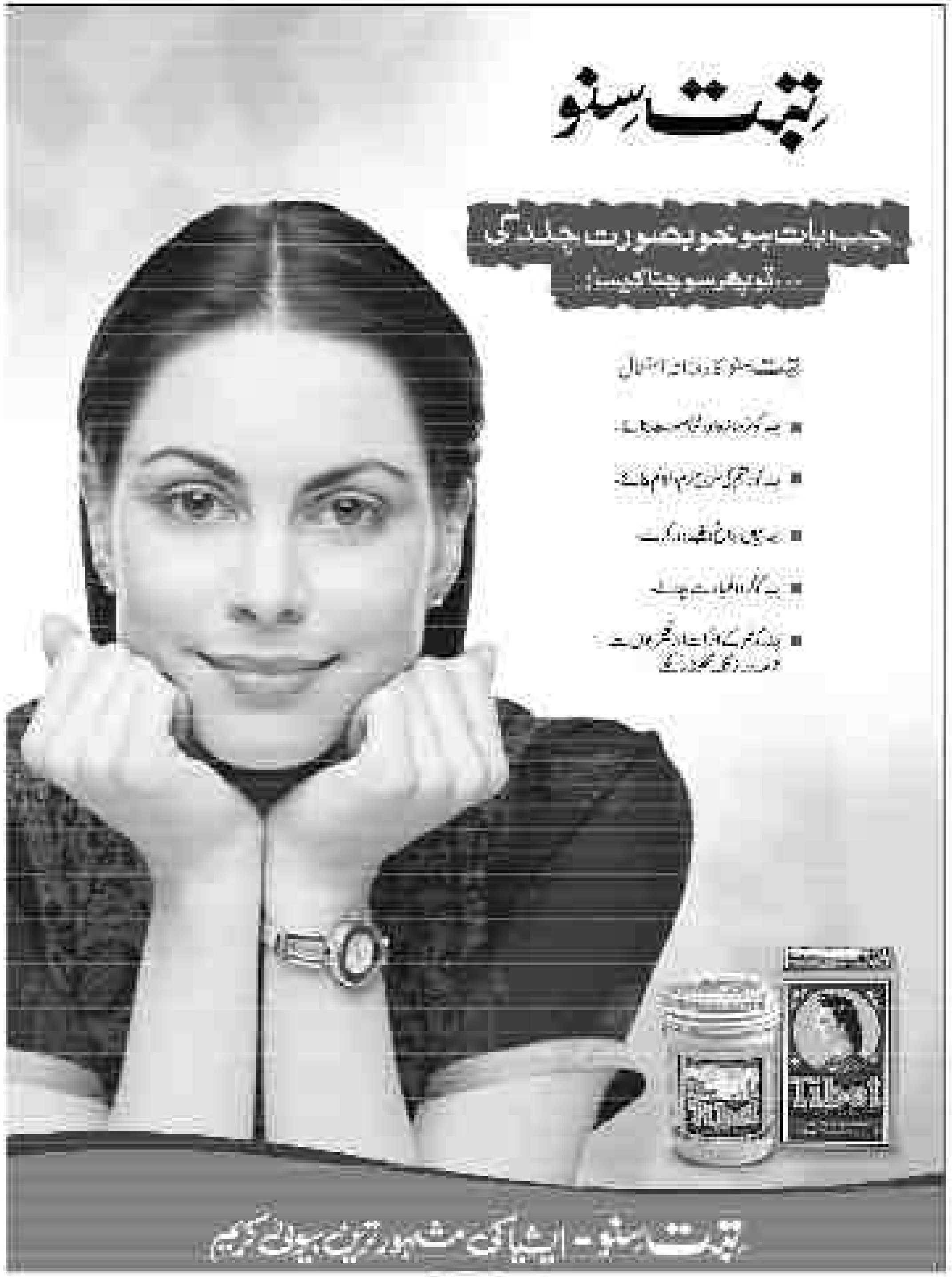
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

مضامین

ترویجہ

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ سوچ سکتا ہے۔ بُرے بھلے میں تمیز کر سکتا ہے اور بامعنی الفاظ بول سکتا ہے جب کہ باقی تمام مخلوق کو یہ تینوں صلاحیتیں ہو گئیں حالانکہ دماغ اور زبان ان کے پاس بھی ہے مگر وہ اسے انتہائی محدود پیمانے پر ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر ذی روح سوچ بھی سکتا ہے، سمجھ بھی سکتا ہے اور بے معنی آوازیں بھی نکال سکتا ہے تاہم وہ صرف بھوک کے بارے میں سوچ سکتا ہے کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کیسے شکار کرنا ہے۔ خوراک تک کیسے پہنچنا ہے۔ کون سی چیز کھانی ہے اور کون سی نہیں کھانی یا پھر یہ کہ دوسرے جانوروں سے اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ گویا ہر ایک کے پاس صرف خوف کی حس یا پھر خوراک کی حس موجود ہے۔ کچھ پرندوں اور جانوروں کے پاس البتہ ان دونوں پیدائشی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ دماغی صلاحیت ذرا سی زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً طوطا جو آپ کی بات دہرا سکتا ہے۔ بندر جو آپ کی نقل اتار سکتا ہے۔ کتا جو آپ کا اشارہ سمجھنے پر قادر ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض جانوروں اور پرندوں کے پاس یہ بات بھی ہوتی ہے کہ وہ دو چار عمل یا باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ پھر چند جانور کسی نہ کسی خاص وصف کے حامل ہوتے ہیں مثلاً گیدڑ ڈرپوک ہوتا ہے۔ شیر دلیر ہوتا ہے۔ لومڑی چالاک ہوتی ہے۔ کوا کائیاں ہوتا ہے۔ کتا وفادار ہوتا ہے۔ چڑیا بھولی بھالی ہوتی ہے۔ فاختہ بے ضرر ہوتی ہے۔ اسی طرح درندے صرف گوشت کھاتے ہیں گھاس نہیں۔ چرندے صرف گھاس اور چارہ کھاتے ہیں، گوشت نہیں اور پرندوں میں بھی ایک وہ ہیں جو دانہ چگتے ہیں اور دوسرے وہ جو گوشت خور ہیں۔ زمینی مخلوق کے علاوہ سمندری مخلوق کی بات بھی کچھ اسی نوعیت کی ہے تاہم اس سلسلے میں استثنا ضرور پایا جاتا ہے یعنی اکا دکا جانور، پرندے اور سمندری مخلوق مخلوط خوراک بھی استعمال کر لیتی ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ گوشت خور جانور یا پرندے دانہ چگنے والے جانوروں اور پرندوں سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں کیونکہ گوشت میں پائی جانے والی پروٹین دالوں، سبزیوں اور دیگر اشیائے خوردنی میں پائی جانے والی پروٹین سے کہیں زیادہ اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔

اب آتے ہیں حضرت انسان کی طرف کہ اسے اشرف المخلوقات کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ اس میں قبل ازیں بیان کی گئی تمام خوبیاں اور تمام خامیاں بیک وقت پائی جاتی ہیں مثلاً گیدڑ بہادر بھی نہیں ہو سکتا۔ شیر بزدل نہیں ہو سکتا۔ لومڑی بھولی بھالی نہیں ہو سکتی اور چڑیا بھی چالاکی نہیں دکھا سکتی کہ ان کے خمیر میں یہ وصف موجود ہی نہیں ہے۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو ان سب پر قادر ہے۔ وہ جب چاہے بہادر بن سکتا ہے اور جہاں چاہے ڈرپوک بن سکتا ہے۔ جب چاہے چالاک بن سکتا ہے اور جہاں چاہے بھولا بھالا بن سکتا ہے۔ ایک موقع پر یہ شیر کی طرح دھاڑ سکتا ہے تو دوسرے موقع پر یہ بکری کی طرح ممنا بھی سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک طاقتور دماغ اور بولنے والی زبان موجود ہے اسی لئے اسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی چرند، پرند اور حشرات الارض ہیں سب ایک دوسرے کی خوراک ہیں اور پھر ان میں سے 80 فیصد حضرت انسان کی خوراک ہیں تاہم اس انسان یعنی اشرف المخلوقات کی ذہنیت دیکھئے کہ یہ صرف اپنے

بارے میں سوچتا ہے۔ جب بولتا ہے اپنے بارے میں ہی بولتا ہے اور اگر کسی دوسرے کے بارے سوچتا یا بولتا ہے تب بھی دراصل اپنے ہی کسی فائدے کے لئے ہی سوچ اور بول رہا ہوتا ہے۔ اگر فقیر کو خیرات دیتا ہے تو اپنے کسی جذبے کی تسکین کے لئے اور اگر کسی سے پیار یا نفرت کرتا ہے تو وہ بھی اپنے ہی کسی جذبے کی آسودگی کے لئے۔ اس کا کوئی عمل فائدہ حاصل کرنے یا نقصان سے بچنے کے دائرے سے باہر نہیں۔ کل نتیجہ یہ کہ 20 فیصد ذہین ترین اور طاقتور ترین لوگوں نے 80 فیصد کم ذہین، کند ذہن اور کمزور لوگوں کو اسفل السافلین بنا رکھا ہے اور صرف آج سے نہیں روزِ ازل سے۔ صرف طریقِ کار بدلتا رہتا ہے۔ کبھی طاقتور لوگ بادشاہت کے نام پر، کبھی ڈکٹیٹرشپ کے نام پر، کبھی خلیفہ کے نام پر (خلفائے راشدین کے بعد) کبھی اشرافیہ کے نام پر، کبھی سوشلزم کے نام پر، کبھی کمیونزم کے نام پر اور کبھی جمہوریت کے نام پر تمام لوگوں کو اپنے گرد جمع ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ افلاطون کے ایک اہم قول کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ "اگر پڑھے لکھے اور عقلمند لوگ سیاست سے کنارہ کش رہیں گے تو کم ذہن سے کمتر لوگ حکومت میں آ کر ان پر راج کریں گے" اس نقطے پر فلسفیانہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں میری تازہ ترین غزل ملاحظہ ہو:

دماغوں سے ابھی تک سوچ تاتاری نہیں نکلی
مہذب ہو کے بھی اندر کی خونخواری نہیں نکلی

بدل ڈالے سبھی قانون اک اک کر کے جنگل کے
شفا تو مل گئی پر جڑ سے بیماری نہیں نکلی

شہنشاہیتیں تو ہو گئیں دربار سے باہر
مگر درباریوں کی خوئے درباری نہیں نکلی

جنوں کر کے نکالا ہر ہوائے حبِ باطن کو
ہوس نکلی پر آنکھوں سے ہوس کاری نہیں نکلی

شعوری طور پر انسانیت تو آ گئی لیکن
عقوبت خانۂ دل سے دل آزاری نہیں نکلی

گدھے کو باپ تک بھی کہہ دیا اہلِ تصرف نے
مگر اندر سے انسانوں کے خرکاری نہیں نکلی

بہت ضربیں لگائیں ہر بتِ نفرت کو نفرت کی
مگر ان میں کوئی اک ضرب بھی کاری نہیں نکلی

نکالا تو بہت کچھ ہم نے پچھلی سات صدیوں میں
نہیں نکلی تو عیاری و مکاری نہیں نکلی

اگرچہ مانتے ہیں سب گلوبل گاؤں دنیا کو
مگر قصبے سے اب بھی چار دیواری نہیں نکلی

دیارِ غرب والو! لاڈلی امن و محبت کی
تمہاری بھی نہیں نکلی ہماری بھی نہیں نکلی

◆◆◆

تردید ادارہ "تخلیق"

مارچ 2021ء کے پرچے میں صفحہ نمبر 96 پر ایک غزل جو طاہر منصور صاحب کے نام سے شائع کی گئی اس میں ایک غلطی تھی

غلط شعر

وہ کبرا ہے، مجرد ہے قادر مطلق
مسلّم ہے جہاں میں اسی کی یکتائی

درست شعر

وہ کبریا ہے، مجرد ہے قادر مطلق
مسلّم ہے جہاں میں اسی کی یکتائی

محبت اور مزاحمت کا شاعر۔ ایوب خاور

……2……

غلام حسین ساجد

یہ نہیں کہ اس کتاب میں اداسی اور حزن کا شائبہ بھی نہیں۔ کہیں کہیں نظموں اور عموماً نظموں میں ملال کی ایک زیریں لہر سانس لیتی محسوس ہوتی ہے جو زیادہ تر روایتی اور اکتسابی ہے کیوں کہ اردو شاعری کی روایت میں حزن رہا ہے یہ نہیں کہ اس کتاب میں اداسی اور حزن کا شائبہ بھی نہیں کہیں کہیں نظموں اور عموماً نظموں میں ملال کی ایک زیریں لہر سانس لیتی محسوس ہوتی ہے جو زیادہ تر روایتی اور اکتسابی ہے کیوں کہ اردو شاعری کی روایت میں حزن و یاسیت اور ملال چار سو برس کا سفر طے کر کے اس قدر خود پسند اور عمومی حوالہ بن گئے ہیں کہ ہر شاعر کے لیے ان سے علاقہ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ خواہ اس کی ذاتی زندگی سے اُسے کچھ خاص نسبت ہو کہ نہ ہو۔ اس روایتی نسبت کے کچھ حوالے دیکھیے۔

یاد رکھنے کے لیے اور نہ بھلانے کے لیے
اب وہ ملتا ہے تو اِس رسم نبھانے کے لیے

تو مجھ میں سما چکا ہے پھر بھی
میرے لیے سوچتا نہیں ہے

جس ڈھنگ سے میں نے تجھ کو دیکھا
اُس ڈھنگ سے تو ملا نہیں ہے

ہاتھ میں ہاتھ لیے تیرے خد و خال کے ساتھ
جانے کب آئینہ جاں سے لب پہ نکل آئے

تو نہیں تھا تو یہ دل اپنی جگہ تھا کسی طور
تو ملا ہے تو کسی ضبط کے پہلو نکل آئے

یہ اور ایسے بہت سے اور شعر اس کتاب کے عمومی مزاج پر حزن کی ایک ہلکی سی دھند ضرور بناتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ اس کتاب کی بعض نظمیں اور اشعار جمالِ عشق کے پسِ ملال میں لتھڑے ہیں مگر یہ کتاب حسرتِ وصل اور ناکامی کی ترجمان نہیں اور اس کتاب سے چھلکنے والا فخر و مسرت پڑھنے والے کو خاص مزہ بھی دیتا ہے اور حوصلہ بھی۔

"تمھیں جانے کی جلدی تھی" صباحتِ عشق اور اظہارِ عشق کے دل فریب تال میل سے وجود میں آئی ہے۔ اس لیے اس میں "گلِ موسمِ خزاں" جیسی گھٹن، جبر اور مزاحمت کی فضا موجود نہیں جو اس کتاب کی خصوصیت بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

ایوب خاور کی تیسری کتاب "بہت کچھ کھو گیا ہے" 2000ء میں شائع ہوئی —— اگرچہ "گلِ موسمِ خزاں" اور "تمھیں جانے کی جلدی تھی" میں شامل فیض، طاہرہ نقوی، اختر حسین جعفری، دلدار، نصرت فتح علی خاں کے نوحے اور ایک مرتے ہوئے آدمی کے لیے نظم ایک گہرے رنج اور ملال سے مملو ہیں مگر کھوئی ہوئی چیزوں، دوستوں اور آسائش سے محروم ہوتے چلے جانے کے دکھ کا عمومی پرتو اس کتاب کا خاصا ہے اور وہ اس لیے کہ شاعر نے یہ کتاب اپنی عمر کے اس مرحلے پر شائع کی ہے، جب ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی تمنا بہت قوی

ہوجاتی ہے اور کھوئی ہوئی چیزوں اور اقدار کا ملال احساسِ زیاں کو بے طرح بڑھا دیتا ہے۔

''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' کے دیباچے میں ایوب خاور نے لکھا تھا:

''حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری میری محبت ہے لیکن میں اس سے محبوبوں جیسا نہیں مجبوباؤں جیسا سلوک کرتا ہوں۔ شاعری کو میں نے اس وقت تک گلے نہیں لگایا جب تک اس نے ضدی بچے کی طرح تڑپ تڑپ کر اور مجھ سے لپٹ لپٹ کر مجھے اپنے جیسا نہ کر ڈالا۔ چنانچہ میں نے جو کچھ لکھنے کی کوشش کی، اس میں ''شدتِ اظہارِ ذات'' ہی کا مسئلہ رہا۔ کم لکھ پاتا ہوں کیوں کہ اظہار کی شدت لفظوں کے خول توڑ کر ان میں سانسیں بھر دیتی ہے۔'' (ص 12)

اس بات کا اعادہ شکیل عادل زادہ نے ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' کی تقریظ میں یوں کیا ہے:

''شاعری ان کے لیے پہلا مسئلہ ہے..... ان کی شاعری سے ان کے ہیجان و اضطراب کا احساس کچھ سوا ہوتا ہے۔ لگتا ہے، کہیں کچھ رہ گیا اور کہیں کچھ کھو گیا ہے، جس کی وہ تلاش میں ہیں۔ یوں ہر لحاظ سے وہ بڑے کامیاب ہیں مگر کامیابی سے مراد بامرادی نہیں ہے۔ جانے کیا خلش ان کے رگ و پے میں اٹک گئی ہے۔ کوئی حسرت جو پوری نہیں ہو پاتی۔ زندگی بظاہر کتنی ہی مہرباں ہو، لگتا ہے دھوکا ہوئی بھی کچھ کم نہیں۔ یہی کچھ تمام و ناتمام کی حالت، یہ ناآسودگی انھیں شاعری پر آمادہ کرتی ہے۔'' (ص 22)

حالیہ کتاب ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' ان بے چہرہ ہوتی ہوئی نعمتوں کو بازیاب کرنے کی ایک کوشش ہے، جو مرورِ زمانہ یا شاعری کی بے پروائی کے ہاتھوں معدوم ہو گئیں اور جن کا پلٹ پڑنا اب آسان نہیں۔ یہ درست ہے کہ اس کتاب تک آتے آتے ایوب خاور کے مزاج پر فقر و قناعت کی تمکین سی چھاؤں پڑتی دکھائی دیتی ہے جو احساسِ زیاں کی شدت میں کمی اور معدوم ہوتی ہوئی آسائش کے دکھ کو قابلِ برداشت بناتی ہے مگر اس سے راہوارِ زیست کی باگ پر کمزور پڑتی ہوئی گرفت کا رنج کم نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کتاب کا آغاز اس رنگ کی دعا سے ہوتا ہے۔

''مرے دامن میں خوشبو ہے/ بہت ہی ان کہی خوشبو/ جسے میں اپنی رستے میں بکھیر کرتا ہے/ لیکن کیا کروں مولا/ تھکن کی بوندیاں مجھ ناتواں کی روح میں/ تسلسل سے ٹپکتی جا رہی ہیں/ سو نظر آتا نہیں/ کس زاویے سے خود کو خود سے جوڑ کر دیکھوں/ ابھی تو مجھ کو اپنی ان کہی خوشبو کو بیچنا ہے'' (ص 33,32)

یہ دعا جس کا آغاز ''مرے مولا/ بہت مدت سے اپنے خواب لکھنے کا ہنر میں بھول بیٹھا ہوں'' جیسے شعری ترفع سے مملو مصرعے سے ہوتا ہے، ایک لحاظ سے ایک فکری آئینہ ہے، جس میں کھوئے ہوئے خواب، رنگ، مسرتیں، زمانے، تصورات، فراغتیں، آسائشیں اور محرومیاں اپنے اپنے ہونے کا پتا دے رہے ہیں۔ اس لیے اس کتاب کے اشاریہ کا تعین بڑی حد تک اس دعا سے ہو جاتا ہے اور اس رنج کے اسی اعادے کی خبر دیتا ہے جو شاعر کی روح کو اپنی مٹھی میں لے کر کھینچ رہا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ ایوب خاور عملی زندگی میں ویژول آرٹس کے آدمی ہیں۔ موجود اور موجود کے غیاب میں دیکھنے کو ان کا طرزِ عمل اپنے عہد کے اکثر شعرا سے مختلف ہے کیونکہ آنکھ اور دماغ کی مواصلت میں زندگی سے جڑی حقیقتیں اپنا خاص کردار ضرور ادا کرتی ہیں۔ ''اگلی

موسم خزاں" سے اپنی اب تک کی آخری کتاب "محبت کی کتاب" تک ایوب خاور اپنے ظاہری اور باطنی مظاہر اور مکاشفے کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے محسوس ہوتے ہیں اور اس حوالے سے وہ ہر نوع کے تخلیقی اقدام، ہیئت اور زاویے کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری موجودات اور تصورات کا ایک کلائڈوسکوپ ہے، جس کی گردش سے مانوس اشیا اور حقائق پل بھر میں ایک نئی صورت اور رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور منظروں اور جذبوں کی شباہت بدلتی اور ان دیکھی حقیقتوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ذرا دیکھیے:

"جنگلوں کی ڈھلوانوں پر خزاں کی میلی گیری ہو رہی ہے/ پیڑ کے نیچے بیٹھے رہ گئے ہیں/ اور مٹی میں سے گیتوں کی خوشبو محفوظ ہے ہیں ان کے سارے آشیانے/ اکتا اکتا ہو گئے ہیں/ جنگلی شیر اب شہری سڑکوں پہ، چوراہوں پہ/ دن بھر دندناتے پھرتے ہیں اور رات کی چادر میں لپٹی/ خواب گاہوں میں مزے سے ہرنیوں کو اپنی ٹانگوں میں دبوچے ہانپتے ہیں"
("گل موسم خزاں"/ پردے کے پیچھے کون ہے، ص142)

"محبت تم نے کب کی ہے/ محبت میں نے کی ہے جان جاں! تم سے/ تمھارے رنگ سے، رنگوں کی دنیا سے/ تمھاری خوب صورت ان سنی سی گفتگو کے خاص جادو سے/ تمھارے منفرد لہجے کی گہری دھند سے/ اس دھند کے اندر ٹھٹھرتے جھوٹ سچ سے جھوٹ سچ/ اور مصلحت سے، مصلحت کی سبز کائی سے کہ جس کائی/ کی گیلی، سرد سطحوں پر مری اس عمر کے سردار لمحے جمتے تھے اور اب ہواؤں میں خواب ان کرا رہے ہیں"
("تمھیں جانے کی جلدی تھی"/ محبت تم نے کب کی ہے، ص93)

"گل مہتاب، سورج اور ستارے ہیں/ کہ جو دیوار جاں کے ساتھ ٹوٹے آئینوں کی طرح ریزہ ریزہ ہونے لگے ہیں/ کسی آئینے کے ٹکڑے میں کوئی وصل کا لمحہ سلگتا ہے/ کسی میں ہجر کا زنگار/ حرف و سطر کی ترتیب سے عاری/ کسی ٹکڑے کی تہہ میں/ ادھ ٹوٹی خاموشی ادھوری پڑی ہے اور کسی آئینے کے بے وزن دروازے/ کی چوکھٹ سے کوئی بدنام تنہائی، خود اپنے ضبط کے ٹکڑے چباتی/ بے لباسی میں سوکھے جنگل کی ہواؤں کی طرح سنساتی ہے۔"
("بہت کچھ کھو گیا ہے"/ دعا، ص20)

"تو قیدی ہے/ تو اپنی ذات کی قیدی ہے/ تو خواب میں آئینے کے خواب میں چلتی ہے/ اور آئینہ/ تیرے عکسوں کا کولاژ لیے/ کئی رنگ بدلتا رہتا ہے/ کبھی قوس قزح/ کبھی رقص ہوا/ کبھی دل کی گرہ سے پھوٹتی نیلی پیلی روشنیوں کی آب سے کھیلتا رہتا ہے"۔
("محبت کی کتاب"، ص51)

"بہت کچھ کھو گیا ہے" تک آتے آتے آنکھ اور احساس کی لسانی یکجہتی بہت توانا ہو گئی ہے اور نظمیں شدت احساس سے مس ہو کر کہیں مصور اور کہیں متحرک ہوتی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تصویر کا کمال یہ ہے کہ وہ نقطہ میں ڈھل جائے اور لفظ کی معراج یہ ہے کہ وہ آواز میں منقلب ہو جائے۔ "بہت کچھ کھو گیا ہے" میں ایسی کرامتوں کا ظہور بار بار ہوا ہے۔

ایوب خاور نے "گل موسم خزاں" سے منظروں کو مجسم کرنے کی جس جادوگری کا آغاز کیا تھا "بہت کچھ کھو گیا ہے" میں وہ جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس کی نظمیں "دعا"، "سون سوتی رقص کے کچھ منظر"، "اداس"، "ایک رقاصہ سے"، "التجا"، "رقص گر"، "ایک مجسمہ دوداعی

نوحہ" اور "بہت سوگھے ہوئے دن ہیں" اس سحر کاری کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔

ایوب خاور نے شاعری سے محبوباؤں جیسا سلوک کیا ہوگا مگر شاعری نے اسے اپنے محبوب کے سوا کوئی اور صورت بھی نہیں دی۔ ایوب خاور کی پہلی دو کتابوں اور اس کتاب میں بھی فکر اور اظہار کی سطح پر ایک بے مثل ربط کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے خیال لفظوں کی شریانوں میں سمانے اور لفظ خیال کی پرتوں کو سنبھالنے کے لیے بے چین ہوں۔ ایوب خاور کی شاعری میں لفظ اور خیال کی یکجہتی ایک تخلیقی کرامت بن کر سامنے آتی ہے اور یہ خصوصیت اس کی غزلوں میں بھی اتنی ہی توانائی کے ساتھ موجود ہے۔

''بہت کچھ کھو گیا ہے'' کو ایوب خاور نے ''خواب سرائے''، ''گریہ''، ''عکس مہتاب''، ''رقص مہتاب''، ''زخم مہتاب''، ''حاصل لاحاصل'' اور ''لاریب'' کے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے طویل نثری حصے کے سوا باقی سبھی حصے سلسلہ وار نظموں اور آخری حصہ ایک طویل نظم ''لاریب'' پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں کچھ قسیم سا کچھ بھی شامل کیے گئے ہیں، جو شاعر نے ٹی وی ڈراما سیریلز کے لیے لکھے تھے۔ اسی طرح اس کتاب کی فارمیٹ پہلی دو کتابوں سے مختلف ہے اور ایوب خاور نے شعوری طور پر اپنے فکری رویوں کی تخصیص کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ اس کے قاری کو اس کی کھوئی ہوئی نعمتوں کی پہچان کرنے میں آسانی ہو۔ میں نے کہا تھا کہ ایوب خاور کی شاعری اپنے موجود سے جڑے اور اپنے عصر میں سانس لیتے ہوئے شاعر کی شاعری ہے، جس کی ایک ایک سطر سے ہم زمانیت کی مہک آتی ہے۔ اپنے عہد کی تاریخ، فکر اور حسی ادراک کو رقم کرتی ہوئی شاعری۔ گزرتے وقت کی ایک ایک کروٹ کو منتقل اور مصور کرتی ہوئی (جس میں یاد اور خواب کا حوالہ جو اس عہد کی شاعری کا عمومی اختصاص تھا، بہت کم ہے)۔ اس کتاب ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' تک آتے آتے اپنے بنیادی رنگ سے انحراف کرنے لگتی ہے اور اس میں یاد اور خواب کی طلسم کا رنگ گہرا ہونے لگتا ہے، خصوصاً اس کتاب کے پہلے حصے ''خواب سراب'' میں یہ رنگ خوب ابھر کر سامنے آتا ہے اور ماضی اور گم شدہ محبتوں سے ناسٹیلجیا کی سطح بلند ہونے لگتی ہے۔ اس کی نظموں "In the Absence of God"، ''انتظار''، ''تم نے کب یہ سوچا تھا'' اور ''بہت گہری اداسی ہے'' میں یہ رنگ خاص طور پر نمایاں ہے۔

اس کتاب کے دوسرے حصے ''گریہ'' کا موضوع یکجہائی اور قومی المیے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایوب خاور نے بعض معروف اور محبوب شخصیتوں کے بے مثل مرثیے کہے ہیں۔ فنی کمال اور سحر کاری کی یہ سطح ان نظموں میں بھی موجود ہے، جو ایوب خاور کے سچے اور محبت کرنے والے حساس آدمی ہونے کا پتا دیتی ہے۔

''عکس مہتاب'' سات نظموں پر مشتمل ہے اور اپنے اسلوب، علامتوں اور بصری تلازموں کے اعتبار سے ایک دلفریب منظر نامے کی ساری خصوصیات رکھتا ہے۔ اس منظر نامے کا مجموعی تاثر گم محبت کا شکست ہونا ہے، جو اب تک موجود کے ایہام اور وحدت کو دھیرے دھیرے معدوم کرتے ہوئے اجالے کی طرح چاروں اطراف دکھائی دیتا تھا مگر اعتبار رفاقت کی کوئی صورت بن پاتی تھی نہ باطنی مسرت کی لہر کو سر اٹھا کر نکلنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ ''عکس مہتاب'' کی نظموں میں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی وہ کسک ہے جو دھیرے دھیرے قوت پکڑ کر چراغ دل میں ڈھل جاتی ہے۔ شاعر نے ان نظموں میں کسی باطن سے معمور کرتی کسک اور لگاوٹ کا اظہار کیا ہے اور خوب کیا ہے جو آخری نظم تک آتے آتے ایک نئی داستان کی بنیاد بن جاتی ہے۔

''بہت کچھ کھو گیا ہے'' کے اگلے دو گوشوں ''رقص مہتاب'' اور ''زخم مہتاب'' میں چار چار نظمیں ہیں۔ پہلے حصے کی چاروں نظمیں

''رات'' اور دوسرے حصے کی نظمیں ''دن'' کا عنوان لیے ہیں اور اس طرح ان میں بیان کی گئی حکایت ان دونوں حصوں کو ملا کر پڑھنے سے مکمل ہوتی ہے۔ مجھے گمان تھا کہ ''رات'' کی نظمیں ''عکسِ مہتاب'' کی ساتویں نظم کی توسیع ہوں گی اور ''دن'' ان نظموں سے پیدا ہونے والے خمار سے بوجھل ہوگا مگر ان سبھی نظموں میں ہجر اور فرقت کی رفتہ رفتہ تیز ہوتی ہوئی آنچ کا بسیرا ہے جو دھواں تو دیتی ہے مگر شعلہ بن کر یک دم راکھ کر دینے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ دیمک کی طرح وجود کی ساعت کو چاٹتی ہوئی اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ساون کی طرح برس پڑنے پر تلی ہوئی موجِ نشاط پر فراق اور تنہائی کا یہ سموم عفریت کس طرح حاوی ہو گیا ہے۔

''رات کی گدڑی کے ہر بخیے سے/ چاندنی دھول اڑی جاتی ہے/ چاندنی دھول میں الجھا ہوا ہر تارۂ شام/ ریزۂ ریگ کے مانند سرِ چشمِ ملال/ اشکِ تابندہ کے مانند لرزتا ہے مگر/ حرفِ اظہار نہیں بن پاتا/ رات کی گدڑی میں/ کچھ سوکھی ہوئی نیند کے ٹکڑے ہیں/ اندھیرے کی کثافت ہے/ بہت خنکی ہے''۔ (دوسری رات، ص 161)

''دن ابھی ختم نہیں ہو سکتا/ میری پھیلی ہوئی ہر شاخ میں/ اور ادھڑی ہوئی کھال میں دھنستا ہوا دن/ ختم نہیں ہو سکتا/ جانِ جاں/ جب تلک راکھ مری خاک نہیں ہو جاتی/ اور پھر خاک مری/ چاند کے دامنِ صد چاک کی نیلاہٹ میں/ ریگ دھول کے مانند نہیں سل جاتی/ دن بھی ختم نہیں ہو سکتا''۔ (تیسرا دن، ص 174)

شاید یہی وجہ ہے کہ ''حاصل لاحاصل'' تک آتے آتے شاعر کو اپنی تنہائی، بے بسی اور کھوئی ہوئی نعمتوں کا ادراک پوری شدت سے ہونے لگتا ہے اور اسے اپنے گمشدہ اثاثے کو پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

''لا ریب'' ایک طویل نظم ہے جسے شاعر کے تخلیقی اور فکری سفر کا خلاصہ یا استعارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم اب تک کی پیش قدمی اور پیچھے چھوٹ جانے والی منزلوں کا احاطہ کرتے ہوئے شاعر کے رنجِ دلی کا حوالہ بھی ہے اور خوابِ فردا کی موہوم جنتوں کا استعارہ بھی۔ مجموعی طور پر ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' وقت کی پھسلواں گزرگاہ پر رک کر پیچھے دیکھنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اگرچہ کھوئی ہوئی نعمتوں کا شمار کرنا اور پلٹ آنا کبھی ممکن نہیں ہو سکتا اور وقت کا منقش پہیا الٹا گھومنے کے لیے گردش میں نہیں آتا۔ پھر بھی ایوب خاور نے اپنی تخلیقی اعجاز سے اسے کچھ عرصے کے لیے تھم ضرور دیا ہے۔

''محبت کی کتاب'' ایوب خاور کا چوتھا مجموعہ کلام ہے مگر یہ ایوب خاور کی پہلی تین کتابوں کی طرح نظموں/ غزلوں پر مشتمل نہیں، منظوم ڈرامہ ہے۔ جس کا منظرنامہ، مکالمے، ہدایات اور موضوعاتی مکالمے، سبھی کچھ نظم میں ہے۔ اس کتاب سے پہلے تک ایوب خاور کی تخلیقی اور عملی زندگی دو الگ الگ دھاروں میں بہہ رہی تھی مگر یہاں آ کر وہ دونوں دھارے پوری تخلیقی توانائی اور شناخت کو برقرار رکھ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ایوب خاور کے مجموعی تخلیقی کل کا اظہار ہے۔ جس میں ہم زمانیت کا جادو ایک بار پھر سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ شاعری، موسیقی اور ڈراما کے عناصر ایوب خاور کی اگلی کتابوں میں اپنے ہونے کی اطلاع دیتے ہیں کیوں کہ اس کی زندگی اپنی تخلیقی اصناف کے درمیان گزری ہے۔ ''محبت کی کتاب'' میں، جو ایوب خاور کی پہلی تجرباتی کتاب ہے، یہ تینوں اصناف آپس میں گندھ کر ایک ہو گئی ہیں۔ گلزار نے بجا طور پر اسے برتاؤ کے لحاظ سے کلاسیکی Ballet اور کرداروں کے حوالے سے جدید قرار دیا ہے۔ جسے ہم زمانیت اور جدید حسیت نے مزید پرلطف اور محبوب بنا دیا ہے۔

بعض تخلیقی تجربوں کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ انھیں کسی مخصوص شخص کے سوا کوئی اور گرفت کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ ''محبت کی کتاب'' کی تخصیص بھی یہی ہے کہ ہم عصر شعرا میں ماسوائے گلزار کے اسے کوئی اور نبھا پانے پر قادر نہیں۔ کیوں کہ زندہ اور بے روح کرداروں کو متحرک کرنے کا فن صرف وہ تخلیق کار ہی جانتا ہے، جو شاعری، موسیقی، ڈراما، وژول ایفیکٹس، ساکت اور متحرک لوازموں، مصوری، روشنی اور اندھیرے کے سُر تال میں سے بخوبی آگاہ ہو۔

''محبت کی کتاب'' بصری اور حسی تخلیقی اسالیب کی آمیزش سے وجود میں آنے والے ایسے بہت سے منظروں کا مجموعہ ہے جو اپنی تخلیقی رفعت کی بنیاد پر سب سے الگ اور منفرد ہے۔ جہاں تک زبان کے تنوع، ذخیرۂ الفاظ کی وسعت اور قدرتِ بیان کا تعلق ہے، ایوب خاور اپنے عہد کے چند قادر الکلام شعرا میں سے ایک قرار دیے جا سکتے ہیں۔ وہ شدتِ اظہار کے قائل ہیں اور جذبے کی بے مثل ترجمانی کے لیے الفاظ و تراکیب اور استعاروں کا ایک انتہائی حساس نظام وضع کرتے ہیں۔ جو مروجہ شعری لفظیات اور تراکیب سے الگ اپنی پہچان رکھتا ہے۔ ''گلِ موسمِ خزاں'' اور ''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' لفظیات اور لسانی مزاج کے حوالے سے کلاسیکی رویے کی نمائندہ تھی اور شاعر نے اچھوتی تراکیب وضع کرتے ہوئے استعاروں اور نئی علامتوں کے وضع کرنے کے سوا مروجہ شعری لفظیات کو تبدیل کرنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ یہ اور بات ہے کہ اس تخلیقی رویے کی بدولت اس کتاب کا مجموعی لسانی مزاج ایک نئی تخلیقی صباحت کا پیش رو قرار پایا تھا مگر ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' تک آتے آتے اس لسانی مزاج میں کچھ تبدیلی دکھائی دینے لگتی ہے، جس کی تکمیل ''محبت کی کتاب'' میں آ کر ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں روایتی شعری لفظیات میں موسیقی، مصوری اور بصری فنون سے جڑی لفظیات کی اعانت کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے اور شاعر کے تخلیقی تجربے کی بوقلمونی ایک نوزائیدہ کُل میں ڈھل جاتی ہے۔

''گلِ موسمِ خزاں'' سے ''محبت کی کتاب'' تک ایوب خاور کا منفرد فن اپنی یکتائی کی بھرپور خبر دیتا ہے۔ مصرعوں کی لچک، ہیئتی طوالت، ردیفوں کی چھل بل، لفظوں کی معنویت سے بھرپور تکرار اور ایک طویل سفر پر نکلے ہوئے مسافر کا سا ردھم ان نظموں کے آہنگ کو نیا اور انوکھا ہی نہیں بناتے، ایک الگ ذائقہ بھی دیتے ہیں۔

ایوب خاور تخلیقی اقتدار کے لحاظ سے ہر جہتی شاعر ہیں۔ ''گلِ موسمِ خزاں'' سے ''محبت کی کتاب'' تک کی شاعری اس کے تخلیقی اقتدار کا اجمال ہے۔ جس کی داد دینے میں کوئی حرج نہیں۔

◆◆◆

تازہ کلام

ڈاکٹر فوقیہ مشتاق (امریکہ)

آرسی مصحف

کوئی خوشبو میرے ہر سُو پھیل رہی ہے / لیکن میں خوشبو کا سواگت کر نہیں سکتی
کیونکہ میں تو آئینے میں تیرا چہرہ / دیکھ رہی ہوں—

تحقیقی انحطاط، احمد سعید اور ترجیحات

ڈاکٹر ایوب ندیم

اردو کی ادبی تحقیق میں یہ صورت حال اب ایک ایسی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے کہ ایم اے اور بی ایس کی سطح ہی کے نہیں ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کے تحقیق کار بھی اپنے تحقیقی موضوعات کی تلاش یا انتخاب کے لیے اپنے نگران کی طرف دیکھتے ہیں۔ نگران کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ نئے نئے موضوعات تلاش کرے، پرانے موضوعات کی نئی جہات پر اپنا سر کھپائے اور پھر انھیں طشتری میں رکھ کر اپنے ریسرچ سکالر کو پیش کرے۔ نگران کے پاس عموماً مقالہ نگاروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ بعض نگرانوں کی پھر بھی یہ تمنا ہوتی ہے کہ انھیں مزید مقالہ نگار مل جائیں تاکہ ان کی نگرانی کا معاوضہ مزید بڑھ جائے۔ غالبؔ نے شاید کسی ایسی ہی صورت حال پر کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس میں شک نہیں کہ موضوع کا انتخاب مقالہ نگار کی ذمہ داری ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایم اے اردو کرنے والوں میں اکثریت پرائیویٹ طلبہ وطالبات کی ہوتی ہے، مطالعہ اور مشاہدہ محض امتحان پاس کرنے تک محدود ہوتا ہے، پھر انھیں گھر کے اندر یا باہر بھی ایسا ماحول میسر نہیں آتا، جس میں ان کی ''گرومنگ'' ہو سکے۔ اس پر ستم یہ کہ ایم فل یا پی ایچ ڈی کے سکالرز عموماً ملازمت پیشہ ہوتے ہیں، انھیں اپنے فرائضِ منصبی اور ''امورِ گرہستی'' سے کم ہی فرصت ملتی ہے۔ ان حالات میں وہ بے چارے کریں تو کیا کریں۔ نقصان آخر تحقیق کا ہی ہوتا ہے۔ نہ تو مواد کی صحیح طور سے جمع آوری ہوتی ہے، نہ اسے جانچنے پرکھنے کا پورا موقع ملتا ہے، نہ کوئی نیا اور اچھوتا موضوع سوجھتا ہے، نہ مقالے کی تسوید احسن طریق سے انجام پاتی ہے اور نہ ہی اس پورے عمل سے اردو زبان وادب کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ وہی گھسے پٹے موضوع، وہی شخصیات طے کر لی جاتی ہیں، کم تر درجے کی شخصیات پر کئی کئی مقالے، وہی جیسے کسی طلبہ یونین لیڈر کی طرح محض تعریف وتوصیف سے بھرے ہوئے۔ نہ کوئی حقیقت، نہ انکشاف۔

اس غیر ذمہ دارانہ تحقیقی طرزِ عمل سے ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ اب نہ تو کوئی تحقیق کار (ماسوا چند ایک کے) کسی نئے فکری موضوع کی جستجو کرتا ہے، جس پر قبل ازیں کام نہ ہوا ہو مگر ضروری ہو اور نہ ہی کسی ایسی ادبی شخصیت کا متلاشی ہوتا ہے، جو درحقیقت لائق تحقیق ہو مگر وہ متحرک نہ ہو، خود ستائی نہ کرے یا خود پر مقالہ لکھوانے کے لیے تحقیق کار یا اس کے نگران سے رابطہ نہ کرے۔ ادبی تاریخ میں کتنے ہی نام ایسے ہیں، جو سچے تخلیق کار تھے، مگر انھوں نے ادبی محافل اور ادبی سیاست سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ تمام عمر تحریر وتصنیف میں منہمک رہے، گروپ بندی اور نعرہ بازی سے گریز کیا، نام ونمود پر گمنامی کو ترجیح دی مگر اپنا رشتہ تحریر وتحقیق سے قائم رکھا۔ آج بھی کئی کتب خانوں میں ان کی تصانیف اپنے تحقیق کاروں کی منتظر ہیں اور نہ جانے کب تک منتظر رہیں گی؟

یہ 2011-12 کی بات ہے، جب میں گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام

وابستہ رہا تھا۔ ان دنوں میرا بہت سا وقت تقریباً ہر روز کالج لائبریری میں گزرتا۔ انھی دنوں یہ بات میرے علم میں آئی کہ چند برس قبل لائبریری میں ایک بم دھماکہ ہوا تھا، جس کے باعث بہت سی کتابیں خاکستر ہو گئی تھیں۔ ان میں جو کتابیں مکمل طور پر جلنے سے بچ گئیں یا بوسیدہ حالت میں تھیں، انھیں ایک الگ کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے ایک روز اس کمرے کو کھلوایا تو وہ ایک کباڑ خانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر بھی جس بوسیدہ اور سوختہ کتاب تک ہاتھ پہنچا اسے ایک نظر ضرور دیکھا۔ اس کام میں کئی روز لگ گئے۔ ایک دن مجھے احمد سعید کی ایک ادھوری کتاب خستہ حالت میں ملی۔ یہ ایک ناول تھا۔ میں نے چند اوراق جستہ جستہ پڑھے تو مجھے ان کا موضوع اچھا لگا۔ یہ احمد سعید سے میرا پہلا تعارف تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ یہاں استاد رہ چکے ہیں۔ ان کے زمانے میں یہ کالج دیال سنگھ ٹرسٹ کے زیر اہتمام تھا اور اب تو کئی برس ہوئے ان کا انتقال بھی ہو چکا ہے۔ پورے ٹیچنگ سٹاف میں کوئی ایک آدھ شخص ہی ایسا تھا، جو ان کے نام اور قدرے کام سے واقف تھا۔ میرا مقصد احمد سعید کی تخلیقی شخصیت کو جاننا تھا تاکہ میں اردو ادب کے اس گم شدہ کردار کو ادبی دنیا سے متعارف کرا سکوں، جو عمر بھر ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہ کر اپنی دھن میں مگن رہا۔ احمد سعید کے بیٹے سلمان سعید کے ساتھ میرے تعلق کے اب ایک نئے دور کا آغاز تھا، جو خود بھی شاعر تھے۔

پروفیسر احمد سعید 18 مارچ 1918ء کو امرتسر کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ فیروز الدین برطانوی دور حکومت میں ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز تھے۔ اس دور میں مقامی باشندوں بالخصوص مسلمانوں میں سے خال خال افراد کو ایسے عہدوں پر تعینات کیا جاتا تھا۔ احمد سعید نے ابتدائی تعلیم امرتسر ہی میں حاصل کی۔ میٹرک کے بعد ہندو سبھا کالج امرتسر میں داخلہ لیا، جہاں انھیں فیض احمد فیض سے پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اسی کالج سے انٹر کیا اور پھر لاہور آ گئے۔ یہاں ایف سی کالج لاہور سے پہلے نفسیات اور پھر انگریزی میں ایم اے کیا۔

احمد سعید کی ابتدائی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بچپن ہی سے رسائل و جرائد سے شغف تھا۔ قیام پاکستان کے موقع پر جب ان کا خاندان ہجرت کر کے لاہور آیا تو وہ اپنے ساتھ بہت سے رسائل و جرائد بھی لائے، جن میں قلمی رسالوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لاہور آنے کے بعد وہ دیال سنگھ کالج سے پہلے بطور لیکچرار نفسیات اور پھر بطور لیکچرار انگریزی منسلک ہوئے اور 1976ء میں اسی کالج سے بہ حیثیت پروفیسر شعبہ انگریزی ریٹائر ہوئے۔ اپنی تدریسی زندگی کے دوران انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کو بھی جاری رکھا۔ ناول لکھے، افسانے تحریر کیے، خاکہ نگاری کی، مضامین قلم بند کیے، کلام لورکا کی تراجم کیے۔ بعض انگریزی رسائل سے معاون مدیر، مدیر اور مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے بھی وابستہ رہے۔ ریڈیو اور اسٹیج ڈراما لکھنے میں بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ انھوں نے چند فلموں کی کہانیاں بھی لکھیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو احمد سعید کی تخلیقی شخصیت قوس قزح کی طرح تھی، جس میں ان کی تحریر و تصنیف کے کئی رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی تصانیف کا حسن اور فکری تنوع اس حقیقت پر دال ہے۔

احمد سعید کی افسانوی نثر (ناول، افسانہ) میں تقسیم کے بعد جہاں خوابوں کی شکست و ریخت کا موضوع نمایاں ہے، وہاں نفسیاتی اور جنسی الجھنوں کے حوالے سے ان پر فرائیڈ اور یونگ کے نظریات کے پہلو بہ پہلو سعادت حسن منٹو کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ناول ''داغ داغ اجالا'' کا تو عنوان ہی فیض صاحب کے ایک مصرعے سے مستعار ہے، جب کہ ''کرنوں کے شکاری'' اور ''شکستہ پنجے''

معاشرے کے نفسیاتی پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یقیناً منٹو سے ان کی قربت کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چند شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ منٹو سے خاصے قریب تھے۔ منٹو صاحب کا ان کے کالج (دیال سنگھ کالج) اور گھر، دونوں جگہ آنا جانا تھا۔ چناں چہ جب منٹو پر مشہور زمانہ فحاشی کا مقدمہ چلا تو احمد سعید، منٹو کی جانب سے بطور گواہ عدالت میں پیش ہوئے۔ انھوں نے علم نفسیات کی روشنی میں اپنا بیان ریکارڈ کراتے ہوئے بتایا کہ منٹو نے جو کچھ لکھا، اس کا مقصد فحاشی کا فروغ نہیں، بل کہ انسانی نفسیات کے بعض گوشوں کو اجاگر کرنا تھا۔

احمد سعید کی تصانیف پر نظر ڈالی جائے تو ان کا خاکہ کچھ یوں بنتا ہے:

(1) ناول: کرنوں کے شکاری، داغ داغ اجالا، شکستہ آئینے یعنی تین مطبوعہ ناول اور ایک ناولٹ ''وحشت''۔ جب کہ ان کا ایک غیر مطبوعہ ناول ''بے خواب گھر'' ایک پبلشر کے پاس پڑا ہوا ہے۔

(2) افسانوی مجموعے: دو مطبوعہ مجموعے ''انسان، اس کا گھوڑا اور خدا'' اور ''تیسری دنیا'' جب کہ تیسرا مجموعہ ''اطلس کے پھول'' شائع نہ ہو سکا۔ اسی کا نام انھوں نے ''بند راستے'' بھی تجویز کیا تھا۔

(3) اردو تراجم: دو تصانیف ''تہذیب اور اس کے تجاہات'' اور ''چند ممتاز ادیبوں کے خطوط''۔

(4) مضامین: ان کے ہلکے پھلکے مضامین کا ایک ہی مجموعہ ''تعقل'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ جس کا فلیپ فیض احمد فیض نے لکھا۔

(5) نثری تصانیف: ''سلطان عبدالرحمان اول''، ''ٹیپو سلطان، اپنے خوابوں کی روشنی میں'' اور ''شاہ حسین، اپنی شاعری کی روشنی میں''۔ یہ تینوں تصانیف متذکرہ شخصیات کے نفسیاتی تجزیات پر مشتمل ہیں۔

(6) بچوں کا ادب: اونچی حویلی کا راز اور بندرگاہ کا راز، دونوں کہانیاں طبع ہو چکی ہیں۔

(7) انگریزی تصانیف: ٹیپو سلطان، سلیمان عالی شان، صوفیائے کرام و گنہگار اور شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ "Saints and Sinners"۔

(8) فلمیں: وطن، پرواز اور ''آج کل''۔ انھوں نے ان تینوں فلموں کے مکمل سکرین پلے تحریر کیے۔ یعنی کہانی، منظر اور مکالمے۔

(9) ڈرامے: ریڈیو اور اسٹیج کے لیے متعدد ڈرامے۔ اسٹیج ڈراموں میں ''کنوارے مصیبت کے مارے، الیوٹاؤن سوسائٹی اور ساون بیتا جائے'' خاص طور سے مشہور ہوئے۔

احمد سعید کے اس تصنیفی منظرنامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد ادبی اصناف میں طبع آزمائی کی، لیکن ان کے تخلیقی اظہار کا اصل ذریعہ ان کی افسانوی نثر ہی تھی۔ تینوں فلموں کی ناکامی کے بعد ان کی پہچان ان کے ناول اور افسانے ہی تھے۔ ان کے کئی افسانے ''نقوش'' میں بھی شائع ہوئے، جو اس دور کا ایک موقر ادبی رسالہ تھا اور اس میں چھپنے والے ادیب کو اعتماد کا درجہ حاصل ہو جاتا تھا۔ احمد سعید کی ادبی خدمات کا یہ سفر چالیس سال سے زائد عرصے تک جاری رہا۔ ان کا انتقال 13 جنوری 1988ء کو کیلیفورنیا (امریکہ) میں ہوا، جہاں وہ علاج کی غرض سے اپنے بڑے بیٹے طارق سعید کے پاس گئے ہوئے تھے۔ ان کا جسدِ خاکی پاکستان لاتے ہوئے چار روز لگ گئے

اور یوں 17 جنوری کو انھیں ماڈل ٹاؤن (مڑیاں) قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

احمد سعید کسی ادبی لابی/ گروپ سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود کوئی گمنام شخصیت نہیں تھے۔ ان کی زندگی میں کئی مشاہیر نے ان کے فن پر مضامین لکھے، جن میں فیض احمد فیض، صفدر میر، ڈاکٹر محمد طارق، مرزا ادیب، رحیم گل، اشفاق احمد اور ڈاکٹر آغا سہیل سمیت کئی دیگر اہلِ قلم شامل ہیں۔ اس کے باوجود قریباً نصف صدی گزر جانے کے باوجود کسی جامعہ نے ان پر ایم فل یا پی ایچ۔ ڈی کی سطح پر تو کیا ایم اے کے لیے بھی کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ کیوں؟ ظاہر ہے اس کا سبب وہی ہے، جس کا اظہار اس مضمون کے ابتدائی حصے میں کیا جا چکا ہے۔ کسی طاقت ور ادبی گروپ سے وابستگی یا جامعات کی موثر شخصیات تک رسائی۔ ورنہ آپ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ سیاسی اور ذاتی بنیادوں پر پسند ناپسند کا کلچر اب محض پبلک سیکٹر کی جامعات تک محدود نہیں رہا، پرائیویٹ یونیورسٹیاں بھی اس کی زد میں آ چکی ہیں۔ سبب یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کی یونیورسٹیوں کے ریٹائرڈ اساتذہ نے بھی پرائیویٹ جامعات کا رخ کر لیا ہے۔ سو یہاں کا کلچر وہاں بھی جا پہنچا ہے۔ اب اماں ملے تو کہاں ملے؟ ـــــ احمد سعید کی چالیس پینتالیس سالہ ادبی خدمات کا صلہ محض ایک تحقیقی مقالہ ہے، جو میری ترغیب پر میری نگرانی میں ایم فل سکالر سعدیہ رانا نے 2016ء میں لکھا اور یہ بھی محض ان کی ناول نگاری پر ہے۔ اس وقت تک ان کے محض دو ناول اور ایک ناولٹ دستیاب ہو سکے تھے۔ ایک احمد سعید ہی نہیں، ایسے کئی سچے اور حقیقی تخلیق کار ابھی اپنی دریافت کے منتظر ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ بے اعتنائی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ نہ جانے کب تک؟؟؟

◆◆◆

مختصر تعارف

ڈاکٹر ایوب ندیم

ڈاکٹر ایوب ندیم 28 نومبر 1964ء کو رحیم یار خان میں پیدا ہوئے۔ لکھنے کا آغاز 1980ء کی دہائی میں کیا، جب وہ ابھی سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی۔ شاعری، مکالمہ نگاری، ڈراما نگاری اور تحقیق و تنقید کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اب تک ان کی پانچ تصانیف شائع ہو چکی ہیں، جن میں شاعری کے دو مجموعے ''چاند میرا ہم سفر'' اور ''رات ڈھلتی نہیں''، بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''ہم پھول ہم ستارے''، نامور ادیبوں کے مکالمات کا مجموعہ ''ہوئے ہم کلام'' اور PTV سے نشر ہونے والے ان کے پنجابی ڈراموں کا ایک انتخاب ''ٹہنیاں تے ٹور'' شامل ہیں۔ اردو، پنجابی اور سرائیکی میں ان کے متعدد انفرادی اور حلقے وار ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ نیز ان کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی اور ایم۔ فل کی سطح پر کوئی 30 سے زائد تحقیقی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔

کرونا وائرس سے مریض نہیں مرتا

......1......

قاضی منشا

میں یہ بات وثوق اور پورے حقوق محفوظ رکھ کر لکھ رہا ہوں کہ کرونا وائرس سے مریض نہیں مرتا وہ بلاوجہ کی بے اطمینانی اور کرونا کے تنہائی کے خوف کے شکنجے میں دم توڑ دیتا ہے اور یہ کرب ناک اذیت اسے سب سے پہلے گھر سے ملتی ہے۔ جب گھر والوں کو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے والد، والدہ یا بہن بھائیوں کو کرونا ہو گیا ہے تو وہ خوف زدہ اور تشاد ہو جاتے ہیں اور مریض کو ہسپتال چھوڑ کر اس کی خبر گیری بھی نہیں کرتے۔ مریض کو نظر انداز کرنے سے مریض بھی دل چھوڑ جاتا ہے اور حوصلہ دینے والے بھی حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ اگر مریض کی نگہداشت اور اس کی پذیرائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے تو وہ حوصلہ پکڑ لیتا ہے اور یہ حقیقت ہے قوت اجمیری نے سچ کہا تھا "کرو حوصلے آگے بڑھ کر دبا دیتے ہیں" کرونا وائرس سے میں جس طرح نبرد آزما رہا ہوں وہ بے تجربہ میں بہت ساری اذیت سہہ رہا ہوں۔ بھاپ کرونا وائرس کے لیے زہر ہے اور اس سے وہ دور بھاگتا ہے۔ مجھے جب تکلیف ہوتی تو حکیم نے بتایا تو آپ آپ کو صحت مند اور ہلکا پھلکا محسوس کرتا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ کرونا وائرس میرے ساتھ فریب اور مکر کے جال بن رہا ہے اور وہ مجھے شکست دے دے گا۔ میں نے رمضان المبارک کے پانچ روزے رکھے تھے اس کے بعد عید تک مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں۔ لور ہسپتال فیروز پور روڈ پر بیٹا احسن قاضی جس نے سعادت مندی آداب فرزندی کی منتہا کو چھوا اس کی خدمت نے بڑا حوصلہ دیا۔ میری اولاد کی بیماری محبت کرونا وائرس کے خوف پر غالب رہی اور مجھے تسکین ملتی رہی میرے پاس تو مادی وسائل نہیں تھے کیونکہ میں نے پولز کے بھی دستے بہت کی اولاد تھی اور بے سروسامانی ہی میری کل پونجی تھی۔ ہماری بیٹی ارم قاسم نے مجھی کے بجڑوی اور دعاؤں کی انتہا کر دی۔ میرے ہم ادب ہم ادبی دوستوں۔ سابق سفارت کار سلطنت عثمان جناب جاوید اقبال صاحب کو دیا نے صحافت کی آبرو جناب الطاف حسین قریشی نے آپ کو میری علالت کے بارے فون پر اطلاع دی۔ آپ کے مسلسل رابطے نے مجھے دعاؤں کے حصار میں رکھا۔ پھر وہ بیٹے احسن قاضی کو دن قدر رقم فراہم کرتے رہے اور مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ میں بے سروسامان ہوں پھر جب ڈاکٹر آصف محمود جاہ نے ڈاکٹر کیوان قدر خان کو کہا کیا انہوں نے میرے لیے گھر میں ہی ایک کمرے میں ایمرجنسی نافذ کر دی اور سہولت اور ضرورت کی تمام وسائل فراہم کر دیے۔ دل بھی اچھی دی اور مجھے افطاری جو امت نوری کی خدمت کیئر سوسائٹی کی فرض شناسی اور ضرورت کی ہر شے مہیا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آکسیجن سلنڈر بھی تیار رکھا گر اس کی ضرورت نہیں پڑی میں اپنے ساتھ ہونے والے حسن سلوک اور پذیرائی کے نتائج بتانا چاہتا ہوں کہ مریض کے مردہ تن میں کس طرح مسیحائی کی قیمتی لہر دوڑتی ہے۔ میں نے ایک دفعہ لفٹ میں پھنس جانے کی وجہ سے لفٹ کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور مجھے میری ایک ادبی صباحت رفیق نے اپنے دفتر بلانے سے انکار کر دیا کہ میں آپ کو سیڑھیوں کے ذریعے اپنے دفتر جو پانچویں منزل پر ہے نہیں دیکھ سکتی۔ اگر آپ لفٹ کے ذریعے آئیں تو خوش آمدید۔ مجھے صباحت رفیق کی بات لور ہسپتال میں اس وقت یاد آئی جب مجھے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر جانا پڑا اور میری زندگی کا وہ شاید آخری دن ہوتا اگر ڈاکٹروں کی مسیحائی جواب دے جاتی۔ میری تو بیٹیاں نہیں رہیں تھیں۔ بڑی مشکل سے میرا سانس ترتیب میں آیا اور واپسی پر لفٹ استعمال کی اور اب ایک ذرہ بھی مجبور کرنے سے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتا۔ یہ اشعار جو میں عموماً اپنی تقریروں میں بھی استعمال کرتا رہا ہوں ان کی حقیقت کرونا وائرس نے دکھا دی

سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

کرونا مریض لاکھوں کی تعداد سے مرتا ہے اور قدرت اسے زندہ کر دیتی ہے۔ میرے چاہنے والوں نے تو انتہا کر دی اور میرے اندر جینے کی تمنا جاگ اٹھی اور روح کو توانائی ملی۔ اور آج میں خطرے سے باہر اور دوستوں کے دلوں میں زندہ ہوں۔ مدینہ منورہ میں ہمارے دوست، شہزاد آفاق نسیم شعر کے مطابق۔

تعلق جب تک وضو نہیں کرتے ہم تیری گفتگو نہیں کرتے

ڈاکٹر خالد عباس الاسدی صاحب نے مدینہ منورہ کی فضاؤں سے دعاؤں کے ارمغان بھیجے جنھوں نے مجھے شفا دی ہے اور آج انھوں نے مدینہ منورہ میں میرے لیے جشن صحت کی تقریب میں دعائیں مانگی ہیں، اور کہا ہے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

میرے لیے شہباز خان، فاروق نسیم، میرے استاد جواں سال قائد فہد عباس اور عاصم آفریدی سابق ڈائریکٹر ڈان گروپ آف نیوز پیپرز، محترمہ مریم شجاع، علامہ خلیق احمد یولان، محترمہ ام کلثوم، استنبول یونیورسٹی کی سابق انگلش ادب کی پروفیسر محترمہ نزہت آفاق، جناب شفیق فاروقی فضیلت مآب جناب مولانا عبدالرؤف ملک سے جناب ریاض اکبر، امیر علی خان ایڈووکیٹ، جناب ڈاکٹر محمد یونس اعوان، محترمہ آسیہ فیروز، جناب مدیر "تخلیق" سونان اظہر، جناب مسعود علی خان، محترمہ یاسمین ظفر، عمران نجمی جھنگ، عبدالغفور ناصر، ارشد نعیم بٹ، توقیر شریف، حکیم سلیم اختر، جناب سردار مراد علی خان، جناب صفدر علی خان، کفایت اعوان، جواں سال فوٹوگرافر فرحان یوسف کی بھاگ دوڑ اور ڈاکٹر وقار ریاض کے علاوہ لاکھوں انسانوں کے دلوں سے نکلنے والی دعاؤں کی تاثیر نے شفا بخشی اور ثابت ہو گیا کہ دعاؤں کی طاقت دواؤں سے زیادہ ہے۔ میری نئی زندگی دعاؤں کی رہین منت ہے۔ آخر میں اس ہستی کا ذکر کروں گا جنھوں نے میری رہائش گاہ پر عیادت کی جس کے بارے میں صرف یہ جانا تھا کہ یہ صاحب متحدہ عرب امارات کے شہزادوں کے رفیق ہیں مگر آج ان کے عمل نے ثابت کر دیا کہ وہ مجھ جیسے فقیر بے نوا کے تو صدیقی ہیں، مختار مسعود نے جلیل القدر انسانوں کو آبشار کہا تھا جو بلندیوں سے یہ کہتی ہوئی نیچے آ رہی ہوتی ہے کہ اگر آپ لوگ میری سطح تک بلند نہیں ہو سکتے تو میں خود ہی نیچے اتر کر تمہاری کشت ویراں کو سیراب کرتی ہوں یہ آبشار تھی ڈسکور پاکستان ٹی وی کے سربراہ جناب ڈاکٹر قیصر رفیق کی جو اپنے ساتھ چوہدری مختار احمد ڈائریکٹر لیگل اور پروڈیوسر جناب وقاص کو بھی لائے تھے۔ آپ کی پذیرائی نے مسیحائی کا کام دیا۔ آخر میں سونان اظہر جاوید کی پذیرائی نے مسیحائی کا کام دیا اور آج اس تحریر کی پہلی قسط تخلیق کی نذر ہے۔

(جاری ہے)

◆◆◆

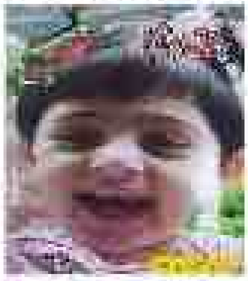

ماہنامہ "پکھیرو" پوری آب و تاب سے 26 سال سے
مسلسل اشرف سہیل کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے
پکھیرو
ملنے کا پتہ: محلہ تنویر آباد، تاج پورہ روڈ، مغلپورہ، لاہور

کچرا بابا اور کرشن چندر کی پکار

......2......

خالد عبداللہ

اہلِ قلم کی رائے میں کرشن چندر کا افسانہ ''کچرا بابا'' محض نفسیاتی اور معاشرتی عوامل پر مشتمل ہے۔ کرشن چندر نفسیاتی تجزیہ نگار نہ تھے۔ کچرا بابا میں چند ایک نفسیاتی مواقع سامنے آتے ہیں۔ لیکن وہ مصنف نے خود پیدا نہیں کئے بلکہ وہ کہانی کی ضرورت کے مطابق از خود وجود میں آتے ہیں۔ اور ان کا انسانی احساسات اور جبلت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمام کردار کہانی کے پلان کے مطابق حرکت کرتے ہیں اور وہ سب کرشن چندر کے آلۂ کار محسوس ہوتے ہیں۔ اپنا اپنا کردار ادا کرنے کے بعد صفحۂ تحریر سے غائب ہو جاتے ہیں۔

کچرا بابا میں زندگی کا شعور اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب کچرے کے ڈھیر سے ایک نوزائیدہ بچے نے اس کا انگوٹھا پکڑ لیا۔ اس کی گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ کچرا بابا اسے چھڑا نہ سکا۔ بلکہ بچے کی گرفت نے اس کے اندر زندگی کا عمل بیدار کر دیا۔ اسے یاد آ گیا کہ ''میں زندہ ہوں''۔ اس کے باوجود افسانے کا کوئی کردار ذہنی پیچیدگی کا مریض نہیں۔ تمام تر نفسیاتی عمل کرشن چندر کے اپنے اندر موجود ہے۔ جس کی جھلکیاں کرداروں میں ظاہر ہوتی ہیں لیکن کرشن چندر کے متعلق ہم اسی قدر جانتے ہیں جس قدر وہ افسانے میں خود کو ظاہر کرتے ہیں۔

''کچرا بابا'' میں نفسیاتی کلائمکس اس وقت نمودار ہوتا ہے جب ہسپتال میں فرم کا باس ''ولاری'' کو اس کے بیمار خاوند سے ملاقات کے لئے لے کر جاتا ہے۔ ''ولاری'' نئے لباس میں تھی اور خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ خاوند اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن واپسی پر باس کمرے کا دروازہ تو کھولتا ہے اور ذرا جھک کر ''ولاری'' کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے چلنے کو کہتا ہے۔ یہ منظر ولاری کے خاوند نے بھی دیکھ لیا۔ کرشن چندر اس کیفیت کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''جب فرم کا باس جانے لگا تو ولاری بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ آج ولاری کے قدموں کی چاپ میں ایک عجیب خود اعتمادی سی ہے۔ اس کا جسم کسی پھولدار شاخ کی طرح لچک رہا ہے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے باس نے ولاری کے لئے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور پھر وہ مؤدب ہو کر ''ولاری'' کو دروازے سے باہر جانے کی دعوت دیتے ہوئے ذرا سا جھکا اور ایک لمحے کے لئے اس کا دوسرا ہاتھ ولاری کی کمر پر ایک لمحے کے لئے رکا اور ولاری کے شوہر کو فرم کے باس کے پچھلے ہاتھ کی حرکت تو پسند آئی لیکن پھر اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ کبھی کبھی ایک ہاتھ جو کچھ کرتا ہے وہ دوسرے ہاتھ کو معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھوں کو دھوکا ہوا ہو محض ایک واہمہ۔ اس لئے اس نے اس اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔۔۔''

ولاری پر تو اب ''جوانی کے دن اور محبت کی راتیں'' غالب تھیں اور وہ زندگی کی طوفانی لہروں میں موجزن تھی لیکن شوہر کی دنیا اس بجلی نے جلا ڈالی جو تھوڑی دیر پہلے ہسپتال کے کمرے میں گری تھی۔ فوراً اس کے بعد ہسپتال کے ڈاکٹروں کو ایک بیڈ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے کچرا بابا کو لاوارث اور قریب المرگ جانتے ہوئے بیڈ خالی کرنے کو کہا۔ وہ لاچار اور بے بس تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کی ایک نہ سنی اور بیماری کی حالت میں اسے ہسپتال سے فارغ کر دیا۔ یہ سب کچھ ڈرامائی معاملہ بن گیا۔ جس نے اس کی آنکھوں کے سامنے کئی مناظر دہرا دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ کچرے کے ڈھیر

تھا لیکن جس طرح وہ کچرے کے ڈھیر تک پہنچا وہ حالت عبرت ناک تھی۔

''کچرا بابا'' کی حقیقت سے متعلق ہماری تحریر تشنہ تھی۔ ہم نے جان بوجھ کر اس نوزائیدہ بچے کا ذکر نہیں کیا جو کچرا بابا کو کچرے کے ڈھیر سے ملا تھا۔ کرشن چندر نے اس بچے کے ذریعے بظاہر کچرا بابا میں زندگی اور محنت کا شعور پیدا کیا۔ اسے زندگی کا احساس دلایا اور دوسروں کے لیے محنت کرنے کے لئے ترغیب دلائی ہے۔ ایسے میں یہی سمجھا جائے گا کہ جو بچے زندہ حالت میں کچرے کے ڈھیر سے ملتے ہیں ان کو زندہ رکھا جائے اور ان کے لئے زندگی کا سامان مہیا کیا جائے لیکن اس جاری عمل کو روکا جائے۔ کرشن چندر جو کی تہہ دار باتیں کرتے ہیں لیکن قاری حقیقی معنی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس واقعہ کے ذریعے کرشن چندر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کچرا بابا کے ہوش و حواس درست تھے اور وہ جان پہچان سے عاری نہ تھا بلکہ وہ حادثہ کچرے کے ڈھیر سے کھا کر پیچ رہا۔ اس کے اندر صرف جذبے کا فقدان تھا۔ جو بیماری کے تسلسل اور دواری کے جانے کی وجہ سے پیدا ہوا۔ وہ اپنی زندگی کو ایک بیکار شے سمجھ کر محنت اور تگ و دو سے دست بردار ہو چکا تھا لیکن بچہ ملتے ہی وہ محنت کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اگلے ہی روز سامنے زیر تعمیر عمارت کی اینٹیں ڈھونے میں مصروف ہو گیا کیونکہ اس بچے کے لئے زندگی کا سامان مہیا کرنا تھا۔ یہ کرشن چندر کی چالاک مہارت کا نتیجہ تھا جس نے اس ذاتی طور پر معذور شخص کو زندگی کی تگ و دو میں شامل کر دیا۔ ورنہ اس طرح کے بے شمار لوگ زندہ ہونے کے باوجود بھارت میں زندگی سے محروم ہیں۔

کرشن چندر کی پکار یہ ہے کہ کچرے کے ڈھیروں سے نوزائیدہ بچوں کا ملنا بھارت کے شہروں میں ایک معمول بنتا جا رہا ہے لیکن ہم اس موضوع کو اپنی تحریر میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ایک المناک مسئلہ ہے اور معاشرے کے لئے باعث توہین ہے۔ اس پر قابو پانا اخلاقی پہلوؤں کی ذمہ داری ہے۔ کرشن چندر کا خوف یہ ہے کہ یہ متذکرہ جو کر معاشرے کو بے بس کر سکتی ہے اور قدرتی آفات کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ کرشن چندر کی یہ سوچ درست تھی بلکہ یہ ایک سچ تھی جس کا بتانا ضروری تھا تاکہ اس کا سدباب ہو سکے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بھارت میں غربت کی وجہ سے چل رہا ہے۔ غریب لوگ بھارت میں بچوں کی پرورش کے اخراجات نہیں اٹھا سکتے اور معالجاتی سینٹروں میں انہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ پٹنہ کے ایک مضافاتی شہر سے روزانہ تین چار بچے کچرے کے ڈھیر پر پھینکے جاتے ہیں۔ جن کو ارجن ملک نامی آدمی جو اس ہسپتال کا کارندہ ہے باہر پھینک کر آتا ہے اور تین روپے فی بچہ معاوضہ وصول کرتا ہے۔ معالجاتی مرکز کے انچارج ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اکثر ماں باپ بچے یہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ جن کو ٹھکانے لگانا ضروری ہوتا ہے لیکن یہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک غربت ہے۔ جس نے غریب لوگوں پر تسلط جما لیا ہے اور ان کی زندگی کو کچرے کا ڈھیر بنا دیا ہے۔ ایسے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچرا بابا بھارتی معاشرے پر ایک گہرا طنز ہے۔ جہاں ایک بے سہارا اور لاچار شخص گندگی کے ڈھیر سے اپنا رزق تلاش کرتا ہے اور یہی رزق کھاتے کھاتے وہ زندگی کے پچیس سال گزار دیتا ہے۔ اور گزرنے والے لوگ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کی مدد نہیں کرتے۔ اس کو سہارا نہیں دیتے۔ اس کو گندگی کھانے سے منع نہیں کرتے۔ یعنی ایک ترقی پذیر یہ نام نہاد معاشرہ اسے دو وقت کی روٹی فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کے جیسے بے شمار، بے وسیلہ اور معذور لوگ بھارت میں موجود ہیں۔ جو زندگی اور معاشرے کے ہاتھوں گہرے گھاؤ کھا چکے ہیں اور محنت مزدوری کرنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ وہ اس کچرا بابا کی طرح گندگی کے ڈھیروں سے ٹکڑے چن چن کر کھاتے ہیں اور فٹ پاتھوں پر زندگی بسر کرتے کرتے سورگ باش ہو جاتے ہیں۔ جنوبی معاشرہ ایسے لاچار لوگوں پر طنز کرتا ہے اور انہیں کچرا بابا کے لقب سے پکار کر خوش ہوتا ہے جبکہ کرشن چندر خود بھی ان میں شامل ہے۔

◆◆◆

(ختم شد)

افسانے

تتلی کا جنم

سمیع آہوجہ

مختصر تعارف

8 دسمبر 1936ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ دہلی جامعہ ملیہ سے تعلیم حاصل کی۔ بیروت سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ میٹرک سے ہی لکھنے کا آغاز کیا۔ "تتلی کا جنم" پہلا مشہور افسانہ تھا۔ اب تک 13 افسانوں کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تازہ کتاب "منتخب کہانیاں گمشدہ" حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ 9 کتابوں کا مجموعہ "99 کے پھیر میں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

میں اس پہاڑی کی ڈھلوان سے دور کھیتوں میں لہلہاتی ہریالی پر نظروں کی کمند پھینک کر اس کے سینے میں اتر جاتا ہوں، کھجوروں کے چند درخت اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے نما گھروندے اور ان کے عقب میں دھواں دیتے چولہوں کی گڑگڑاہٹ، دیہاتی لڑکوں کی قرأت اور ان کے پس پردہ دھول کا شور۔

ان ہریالی میں نہاتی پہاڑیوں سے پیچھے ۔۔۔۔۔۔ جہاں آسمان اور زمین ایک دوسرے کی محبت میں سرشار گلے ملتے ہیں۔۔۔ وہاں۔۔۔ نیلی خیالی فضا میں جہاں دھوپ کی کرنیں ریت اور مٹی کی سرخی میں جذب نہیں ہو پاتیں اور ہر لمحہ برچھیاں چمکاتی ہیں۔۔۔ وہاں ۔۔۔ اسی دھیمی رفتار دریا کے ساتھ بہتے چلو۔۔۔ وہاں۔۔۔ وہاں میرا گاؤں ہے۔۔۔ چھوٹا سا گاؤں۔ مگر اب۔۔۔ "مگر اب۔۔۔؟"

دھول اڑاتی زندگی کے دائرے میں میں گاؤں کی دوسری سمت بارود کا ڈھیر اور ساحلی پولز کے محاصرے میں، لمبی طویل آمنے سامنے ٹینکیں، پھولوں کی کیاریوں میں گھرا سرسبز میدان اور زمین کے سینے کو ایک ہی رفتار سے روندتے قدم۔۔۔ ساحلی بکتر سے میڈیم رینج توپوں اور مشین گنوں کے دہانے کھلے دریا کے رخ پر اور پہاڑی کے دو پاٹوں میں پھنسا ہوا تنہا گاؤں، بیچ وسط میں۔۔۔۔

میں نے پلٹ کر دھول کے بگولوں میں لپٹے گاؤں کو دیکھا۔ کھلی کھلی سسکیوں کے جابجا بکس پڑے۔۔۔ ہاں میں اس گاؤں کا ہی گاؤں تھا، مگر اب مٹی کا ڈھیر ہوں۔ ہاہاہاہا ہوہوہوہو، کیا کھنڈر کے سناٹے میں گاؤں بستے ہیں۔ کیا آنکھیں میرے ہاتھوں اور چہرے کے داغ دیکھ کے نہیں رہتے؟ ہاہاہاہا، چیچک چھوٹ پڑی ہے۔ اور میرے پیٹ کو دیکھو۔ یہ بڑے بڑے غار نما شگاف۔۔۔ سرد آہوں کی مانند چھٹتے ہی میرے جسم کے چیتھڑے اڑتے چلے گئے۔۔۔ ہاں میں بہت ہی ہرا بھرا تھا۔ تمھاری نظروں کا جہاں تک گزروں سے تصادم نہیں ہوتا ۔وہاں۔۔۔ وہاں ان ان ان ان تک ہریالی تھی، میرا سینہ سونا اگلتا تھا اور اب۔۔۔!

اور اب۔۔۔" میری نظریں توپ کے گولوں سے بنے غاروں میں اتریں اور گولیوں سے چھدے، ٹوٹے در و دیوار پر بھٹکنے لگیں۔ یہ کھوئی ویران بھول بھلیوں میں بھٹکتے میرا دل مسلسل دھڑکنے لگا۔ چاروں طرف گمبھیر سناٹا اور گھپ اندھیرا۔ اور تاریکی میں غراتی، جھپٹتی۔۔۔

میں اس اذیت ناک تنہائی سے ہراساں بے تحاشا بھاگنے لگا۔ مگر راستہ۔۔۔؟ اب یہاں راستے کہاں۔ میل ہا میل ٹوٹی سڑکیں، گلی، ریت کا غبار، الزامات کے بے بنیاد نشتر۔۔۔ دیکھتے نہیں سارا گاؤں خالی پڑا ہے۔ اب ان دس گھرانوں کو کیا گاؤں کہو گے۔ ہاں تم نے اسے کچھ کہنا ہی ہے تو سال خوردہ درختوں کی جلی کھجوریں کہہ دو۔۔۔ جلی گٹھلیاں۔۔۔ ہاں تم کھجوریں تو کھاؤ گے ہی نا۔۔۔ ہاں ہاں لے لو بڑی ہی میٹھی ہیں۔ ہاں ہاں لو بھی۔ ہماری فیاضی کے دسترخوان صدیوں پر پھیلے ہیں۔

ہاں یہ سچ کہتا ہے۔ صدیوں کی اس فیاضی ہی کا تو صلہ ہے۔ یہ فیاضی کہتے ہیں اور میں بے وقوفی حماقت، ہاہاہاہا۔۔۔ اور میں چاروں طرف سے اٹھتے صداؤں اور قہقہوں سے وحشت زدہ، چاروں سمتوں میں نظروں کے بل دوڑتا ہوں مگر کسی بھی سانس کی آہٹ نہ پا کر مجبوراً سامنے پھیلی آنکھوں کے گھر میں کود گیا۔ اہلاً و سہلاً، اہلاً و سہلاً، اہلاً و سہلاً پہلے ایک آواز، پھر کئی آوازیں اور پھر ٹوٹے در و دیوار کا گنبد، گونجتا شور جیسا رسا بن کر لٹک جاتا ہے۔ رسے کا جھولتا دائرہ نگاہوں کو اپنی گرفت میں جکڑے جھولتا پنڈولم۔ اور اس کا حلقہ تنگ ہوتے ہوتے گلے میں اتر آتا ہے۔ اور یک لخت ہی جھٹکے کا شدید دباؤ۔ آواز بھی نہیں نکل رہی۔ آنکھیں حلقوں سے ابل ابل کر بین کرتی ہیں اور جسم بڑی بے چارگی سے دونوں پاؤں جھٹک رہا ہے۔ جسم کی نس نس سے چھوٹتی قوت، ہاتھوں میں خنجر۔۔۔ رسے پر انگلیوں کی گرفت۔۔۔ اور میں اپنے آپ کو چھڑانے کی سعی میں ناچ رہا ہوں۔۔۔ دھن اتری کٹ رہی تاتن تا، جھوں جھوں جھوں جھوں جھوں جھوں۔۔۔ اور کتوں کا ایک لشکر آنے والے سائے پر پلٹتا ہے۔۔۔ ہاں اب تو یہ گاؤں کے آبا و اجداد ہیں۔۔۔ تمہیں یہ بھی تمہارے ہی دسترخوان کی وسعت پر پھیلے ہیں۔۔۔ اہلاً و سہلاً۔۔۔ یہ جنگلی گلاب میری بیٹی نے اگایا ہے۔۔۔ ناک میں خوشبو کا ایک ریلا آتے ہی پیاسی آنکھوں نے ہریالی کو منہ لگایا، مگر مسلسل اتنی شدت تھی کہ لمحات سے شب و روز کی اکائیوں میں اترتا چلا گیا اور شب و روز سالوں سے صدیوں کے بطن میں پھیل گئے۔ میرے چاروں طرف وسیع و عالیشان محل، در و بام خوشبوؤں کے دائرے کھل گئے۔ قیمتی قالینوں پر جھومتے ساغر، جھاڑ اور فانوس تیز روشنیوں میں ہنستیں، ارغوانی رنگ میں غرق، شراب آلود لالی آنکھیں۔۔۔ خوش آمدید۔۔۔ کہاں۔۔۔؟ آؤ تم بھی دیکھو ان گول رانوں سے اٹھتے دھوئیں کو چیر کر دیکھو، رقص اور نغمگی کی دھنوں میں اترو۔۔۔ اور ان رقاصاؤں، ہوش ربا، بہم پر بہت تھکے جسموں پر تم بھی ہاتھ پھیر لو، جلدی کرو۔۔۔ سارے پتے یکدم گنوا دیتا ہوں۔۔۔ لیکن نظریں ساری آوازوں سے رشتہ توڑ کر ہیولی جسموں پر جھپٹ پڑیں اور فوراً ہی شدید پھسلن سے دوچار ہو گئیں۔ اور تعاقب میں گھوڑوں کی تیز ٹاپیں، تلواروں کی جھنکار اور شور و غل کا طوفان ٹوٹ رہا تھا۔ لینا، پکڑنا، جانے نہ پائے۔ اس کی یہ مجال! اس کے کانوں میں سیسہ۔۔۔ پگھلا سیسہ ڈالو۔۔۔ اس کی آنکھوں کو عقابوں کے حوالے کر دو۔ ہاتھی اس کا جسم روندے گا تاکہ پھر کوئی شکرا (?) کی طرف کوئی قدم اٹھا نہ سکے۔۔۔ سب کو عبرت ہو جائے۔۔۔ آنکھوں نے پوری قوت سے زقند بھری اور ہریالی پر آ بیٹھیں۔۔۔ اوہ اوہ۔ یہ دیکھو میری سندری نے کیا پہن لیا۔ اور دوسری ابھی دو چار دن اور لے گی۔ اوہ دیکھنا اب چند ہی دنوں میں پھولوں پر رنگوں کی بہار منڈلانے لگے گی۔۔۔ اچھا! ارکی (?) معذرت کہنا۔۔۔ یہ سب رنگ تیرے ہی لیے تو ہیں میرا کیا ہے۔۔۔

ہاہاہاہاہا، ہاں تم تو گھنٹہ ہو چکے۔۔۔؟ ہاں ہاں میں گھنٹہ رہوں مگر اس ملبے سے اٹھنے والے گھر تمہیں دیکھے تم نے۔۔۔؟؟
ابو، ابو، سلو نا ابو، یہ تم گلاب کی بیلوں کو کیوں گھورنے لگ گئے ہو۔۔۔ اچھا ابھی کہو بھی۔۔۔ ابو، وہ جو میری نئی استانی آئی ہے نا، وہی بڑی ٹیچر۔۔۔ اچھا اچھا، وہ لومڑی کی آنکھوں والی۔۔۔ یک دم چھوٹے سے دہانے سے جلترنگ کی تانیں ابل پڑیں۔۔۔ ہاں ابو، وہ کہتی ہے کہ تتلیاں غاروں سے نکل جاتی ہیں، سفید رنگ کی ہوتی ہیں۔ اور پھر انھیں چھوٹا سا گملا لگا کر پنجرے میں بند رکھو۔ یہ ابو میرا دل نہیں مانتا، تتلیاں تو رنگ برنگی ہوں اور بیلوں پر اڑتی پھریں، تب ہی اچھی لگتی ہیں نا ابو۔ ہاں، تو ٹھیک کہتی ہے۔ مگر اسے نہ کہو بیٹا۔ ورنہ۔۔۔ پدرم سلطان بود، پدرم سلطان بود اور لشکروں والے یہ لوٹ پڑا۔ ایسے لگتا ہے کہ تو ڈر چھوڑ کے جھوٹے میں بھی کھا جائیں گے۔۔۔ تمہیں یہ دن ان پر بھاری ہیں۔۔۔ پچھواڑے کے باغ سے ایک دھماکا ابھری اور فراق بھوگتی؟ وادیں دور ہوتی ہوتی فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں۔۔۔ اچھا، تیرے دونوں بھائی کہاں ہیں۔۔۔؟ چھوٹا تو پیال پر اپنی سیونگی چھلانگیں لگا رہا ہے اور۔۔۔ اور بڑے بھیا۔۔۔؟ وہ، وہ۔۔۔ پہاڑی کی طرف اس کے بازو کی نبض بھوسنے لگی۔۔۔ شی۔۔۔ ہونٹوں پر شہادت کی انگلی آ بیٹھی۔ اس کے دونوں بازوؤں کو ہاتھوں میں سمیٹ کر، اس کی آنکھوں کو جکڑ لیا۔۔۔ یہ کسی کو بھی کبھی مت بتانا، اچھا، جاؤ اب کھیلو۔۔۔ اور وہ وحشی لہروں کی بلبلاہٹ میں جھاگ اچھالتے، میری طرف لپکا۔۔۔ دیکھا تم نے، بارہ کا سن کی شقاوتی تمہیں، عمر کی ناگت جسموں کو کمان میں ڈھال رہی ہے۔ اور یہ غصیلی آگ میں کود رہا ہے۔ اس کا کیا جائے گا۔ ورنہ تو میرے سیاہ ہوں گے۔ اور شعلوں میں مٹتے درختوں کی لو میرے گرد اپنے دائرے بنے گی۔۔۔ تمہیں دھڑا جیسے بہتا ہے، بیٹے، دو چناؤ میں خود راستہ چھوڑ دیں گی۔۔۔ ہاں تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ گھوڑوں کی فصل کو اپنے صحنوں میں ہی محفوظ کرنا ٹھیک ہے۔ شاید کبھی ہزاروں قدم یہاں سے گذریں تو راستہ نہ بھولیں۔۔۔ تمہیں یہ تو یادوں کا رنگ محل ہے۔ اور اب کے یاد قافلہ پھر چلی تو۔۔۔ تو شاید۔۔۔ تو شاید یہ نشان بھی مٹ۔۔۔ نہیں نہیں نہیں، مردہ ڈھوروں سے بھلا زندوں کا کیا رشتہ۔۔۔ مر گئے تو پھر کیا۔۔۔؟

کوٹھی دھماکے کے فولادی پنجے سے کندھے پر لگی، بھوتی کا شگوف تو تھپتھپاتے، پہاڑی پر متحرک دس نقطوں سے نظریں کھینچیں اور غاروں والی اور جنت کے گھیوں پر جال پھینک دیا۔۔۔ ہم مر کر بھی زندوں میں ہی رہیں گے۔۔۔ سورج کی دم توڑتی سرخ شعاعوں میں دس دیوانوں کی تھرتھراہٹ میں گیارہویں لو شامل ہوئی تو قدم دریا کے رتھ بنے لگے۔ اس نے اسے آواز دینی چاہی مگر میں نے اندر ہی سے اس کی خواہش کو دبوچ لیا۔ بے تاب محبت نے اس کے خاموش لبوں کو کھول دیا۔ کھلا ہوا غار، سفید ہوتی، آنکھوں میں جھلملاتے ستارے، مدھم بھرائی آواز۔۔۔ فی امان اللہ۔۔۔ اور بے اختیار پیال پر دوڑتے، ہاتھوں کی کلاشگوف سے گولیاں برساتے، پیچھے لا کے کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔۔۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔۔۔؟ مشق کر رہا ہوں، دشمن پر ٹوٹ پڑنے کی مشق۔۔۔ یہ میرے ساتھی ہیں۔۔۔ اور اس کی انگلیاں گھوڑوں کے لیے تنوں کی طرف دائروں میں گھوم گئیں۔ لہلہاتے جھومتے درختوں میں، سرمئی شام، رقصاں ہوا، تالیاں بجاتی کھل کھلا کر ہنس دیں۔ ہاں ہاں تم آگے بڑھتے رہو۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔۔۔ لہلہاتے جھومتے درختوں میں اور بھی سرشاری آ گئی۔۔۔ ہاں تم ہمیں ہماری ہی صورتوں میں دیکھنا چاہتے ہو۔ مشق سے ہی تو ہم نے ہواؤں کے ساتھ کھیلنا سیکھا ہے۔۔۔ آؤ بیٹے، اب رات سر پر آ کھڑی ہے۔ جانے تمہارا بھائی کب لوٹے گا۔۔۔ ابو آپ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائیں تو یہ فکریں آپ کو کبھی نہ ستائیں۔۔۔ ہاں ہاں تم کیوں نہیں ہو جاتے شامل۔۔۔ کیا میرے ہونے سے کچھ فرق پڑے گا۔۔۔؟ فرق؟ فرق؟؟

اور زمین دھماکوں سے لرزنے لگی۔ میری آنکھیں آواز کے تعاقب میں دوڑنے لگیں۔ خاردار تاروں، سیمنٹ کے کھمبوں اور بجری کے سیاہ ٹیلے سے آگ کا طوفان ابل رہا تھا۔۔۔ شعلوں کی خوفناک آوازیں ہر شے کو چاٹ رہی تھیں۔۔۔ دوڑ رہے لوگوں کے سامنے دوڑتے قدم، چیخ و پکار، خوف و ہراس کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔ نہ صرف اس کے گھر کے دروازے کھلے بلکہ ہر مکان کے دروازے پر ہراساں اور سوالیہ نظریں، شعلوں اور ایک دوسرے کے آئینوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ ابو دیکھا دھماکا۔۔۔

چپ، چپ۔ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ چلو گھر چلیں۔ اسے دیکھتے ہی دھیمی دھیمی جھنجھلاہٹ پھیلی۔ لیکن اس کا دروازہ بند ہوتے ہی بچہ اور دروازے بھی چپ چاپ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ ہوں، تو تم دیواروں سے خوف زدہ ہو۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ لیکن پھر تم نے جواب نہیں دیا۔۔۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔۔۔؟ کیا تم نہیں جانتے۔۔۔؟؟ مگر۔۔۔؟؟؟ مگر میری بیوی، میرے بچے۔۔۔؟؟؟ ان کا کیا ہوگا۔۔۔ کیا ہوگا۔۔۔ کیا ہوا کرتا ہے، اور اب کیا ہوگا جب وہ آ جائیں گے۔۔۔ تو۔۔۔ تو تو۔۔۔ وہ نہیں نہیں یہ میرے جیتے جی کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے۔۔۔ اس نے بچے کی لے کو ہونٹوں میں دبا لیا۔ نظریں دیے کی مدھم لو میں، تینوں پلنگوں پر کمبلوں میں ڈھکے جسموں پر باری باری دوڑیں اور پھر ان کی سپر بن کر جم گئیں۔ خیالوں کی ادھی ادھی چنگاری نمودار ہوئی اور اس کے گلے میں داخل کر دیے۔۔۔ اس کا گلا مٹھی میں بھینچا گیا۔۔۔ اس نے کرب و بے چارگی سے دونوں ہاتھوں سے گلا ملتے ہوئے تھوک سے حلق میں چبھے کانٹوں کو توڑا اور ٹانگیں سمیٹ کر الٹی پالتی مارتے کمبل میں اپنے آپ کو سمیٹا۔ سرد آہ اس کے ہونٹوں سے آزاد ہو کر کمرے میں پھیلی سانسوں کی گرمی میں گھل گئی۔ دروازے میں دبی ایک اور کراہ اور پھر کئی ایک سوچیں بہتے ہے تھیں۔۔۔ ان گنت روپ بہروپ بھرتی لاشوں سے لڑتے لڑتے، مرغوں کی اذان کے ساتھ وہ بستر سے اترا اور غسل خانے میں گھس گیا۔ حمام چینی ٹنکی سے پلاسٹک کے لوٹے میں گرتے پانی نے شور مچایا۔۔۔ تو تم نے کیا سوچا۔۔۔ سر کا مسح کرتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔۔۔ ہاں ہاں، میں جاؤں گا۔ تم یہی چاہتے ہو نا۔۔۔ اور تم نہیں چاہتے۔۔۔ چاہتا ہوں مگر میری بچی، میری بیوی؟

اور زمین میں جڑے دور تک پھیلا سناٹا ابھری۔ گڑگڑاہٹ اور دھماکے صبح کی تکلفاتی خاموشی کو تار تار کرتے چلے گئے۔ اس کی بیوی اور بچے دوڑتے ہوئے باہر نکلے تو وہ بھی ان کے تعاقب میں لپک پڑا۔ دوسرے گھروں کے باسی بھی دروازوں سے جھانک رہے تھے۔ صبح کی دودھیا روشنی میں گھلتے جلتے نیلگوں اندھیرے میں شعلے اگلتے بھاری بھرکم ٹینک گاؤں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک دھماکہ زمین سے اٹھا اور مکان کی چھت دوسرے لمحے میں ہی بیٹھ گئی۔ گرد و غبار کے ہجوم میں ان کے چہرے گم ہو گئے۔۔۔ وہ دوڑ دوڑ دریا کی طرف بھاگ نکلا۔ ابو، ابو، میری تتلی۔۔۔ ارے بچی، بچو رے۔۔۔ مگر اس کے الفاظ ابھی ہونٹوں سے چھوٹے ہی تھے کہ وہ پلٹ کر گھر کی طرف بھاگنے لگی اور اس کے پیچھے بانہیں پھیلائے، اس کو پکارتی اس کی ماں۔۔۔ بچی، بچی۔۔۔ اس نے پہلا قدم ان کی طرف اٹھایا ہی تھا کہ یک دم آنکھوں میں ادھر سے ادھر نکل گئے۔ ایک دھماکا۔۔۔ اور گوشت کے چھوٹے بڑے پارچے، بارود کی بو، مٹی کے غبار اور ملبے کے ڈھیر میں غرق ہو گئے۔۔۔ میری بچی۔۔۔ مدد۔۔۔ اور اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔۔۔ ابو، ابو، ٹینک ادھر ہی آ رہے ہیں۔ سب لوگ چلے گئے۔۔۔ وہ اس کے جھنجھوڑنے پر لوٹ آیا۔ گرد و نواح میں نظریں گھومیں۔ دوسرے لوگ کھجوروں کا باغ بھی پار کر چکے تھے۔ اس نے جھک کر ریت اور مٹی کی مٹھی بھری اور اسے چومتے، آنکھوں سے لگاتے، ہچکیوں اور تسلی کی ہچکی میں بچے کی مٹھی کھول دی۔ اور دوڑتے ہوئے قدم باغ

کے فاصلوں کو سمیٹنے لگے۔ ابو ابو میں نے رات خواب دیکھا۔۔۔ اور اس نے اسے دوڑتے ہوئے گود میں بھر لیا۔۔۔ کیا کیا خواب ؟؟ کیسا خواب؟؟؟ ابو میں نے دیکھا کہ آپ مجھے اس کے پاس لے جا رہے ہیں۔۔۔ اس کے پاس۔۔۔؟ ہاں آپ نے کہا تھا کہ اس نے امانت واپس مانگی ہے۔۔۔ امانت۔۔۔؟؟ ہاں۔۔۔ ہوں۔۔۔ میں نے اسے اس کی گود سے اتارا اور دونوں ہاتھوں کی کٹوریوں میں اس کا چہرہ بھر کر اس کی چھلکتی آنکھوں میں اتر گیا۔ مگر تیرہ برتی شعاعوں کی کوئی انتہا ہی نہ تھی اور میں اس کی انگلی پکڑ کر پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔ اور وہ دوڑ دوڑ کر میرے ساتھ چل رہا تھا۔۔۔ پہاڑی کے قدموں میں پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔۔۔ شعلوں کے دہکتے الاؤ پر شور وغل کا طوفان مچل رہا تھا۔۔۔ میں نے آنسو بھری آنکھوں کو زور سے بھینچ لیا اور منہ دوسری طرف پھیر کر انگوٹھے سے گالوں پر چھلکتی خون کی بوندوں کو صاف کیا اور اسے پھر گود میں بھر لیا۔ گرد و غبار میں لپٹے، تیز تیز قدموں میں ننھے ننھے جلتے قلب کے کٹورے بکھر رہیں ڈال رہے تھے۔۔۔ دو دقی دم توڑتی آواز۔۔۔ ابو دیکھو میری تتلی، دیکھو ابو، تتلی خوبصورت ہے، رنگ تو دیکھو کتنے چمکدار ہیں۔۔۔ سیاہ پروں پر سرخ لکیریں، ایک منٹ بھی اسے چین نہیں، ایک ایک پھول پہ پر منڈلاتی پھرتی ہے۔۔۔ دیکھو ابو، دیکھو نا ابو۔۔۔ دیکھو نا ابو۔۔۔ نہیں نہیں، اب مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔۔۔ میں اس پہاڑی کی ڈھلوان سے دور، نیچے شعلوں اور دھماکوں سے چھپتے ہوؤں پر جھکی گنبد کاٹ رہا ہوں۔۔۔ اور میرے قدم۔۔۔ اور میرے ساتھ دوڑ دوڑ کر چلتا میرا بچہ۔

◆◆◆

غیر مطبوعہ

غزل

اظہر جاوید

لازم نہیں کہ پھر کبھی منزل کا نام لوں
تم ساتھ دو تو وقت کی رفتار تھام لوں

جب تک تمہاری آنکھ کی مستی ہے برقرار
میری مجال کیا ہے کہ ہاتھوں میں جام لوں

باقی بچے جو سال وہ گزریں گے اس طرح
چہرے سے تیرے صبح لوں، زلفوں سے شام لوں

اک عمر ہو گئی ہے خزاں کا اسیر ہوں
سوچا ہے اٹھ کے موسمِ گل کا سلام لوں

شہرت ہی کیا ہے پاؤں میں دولت کا ڈھیر ہو
اظہر جو مصلحت سے کبھی میں بھی کام لوں

(پرانے کاغذات سے بازیافت)

گیدڑ سنگھی

آغا گل

مختصر تعارف

آغا گل 10 نومبر 1951ء، بوستانی بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ 23 کتابیں فکشن پر لکھیں۔ 12 افسانوی مجموعے اور 3 ناولٹ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ناول ''دشتِ وفا'' اور افسانوی کتاب ''دوسری بابری مسجد'' کو خوب پذیرائی ملی۔ 2012ء میں شائع ہونے والی افسانوی کتاب ''پرندہ'' کو 2017ء میں بلوچستان حکومت نے بہترین کتاب کے ایوارڈ سے نوازا۔ آغا گل کے افسانے سماجی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی زندگی کے پہلوؤں کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی کہانی ہر دور کی کہانی ہے۔

غربت سے لڑتے فضل باپ سا گیا۔ بچپن سے ہی سن رکھا تھا کہ ایک پر اسرار چیز گیدڑ سنگھی ہوا کرتی ہے۔ جس کے پاس ہو اس کی قسمت کھل جاتی ہے۔ اس نے چند بار گیدڑ سنگھی خریدی بھی اسے لونگ اور سیندور میں رکھا۔ اس کے بال بھی بڑے ہوتے گئے مگر دولت نہ ملی۔ ایک بار تو بیچ اسے چاندی کی ڈبیا میں ہی دے دیا گیا۔ مگر سب بے محل تھا وہ تو مالی حالات ہی کچھ بہتر ہوتے۔ بن بیاہا تو وہ دوسری بات ہے۔ ضروریات بھی پوری ہو جائیں تو بات تھی۔ وہی کھوکھا باپ کے بعد فضل چلا رہا تھا۔ ٹافیاں، سوڈا، سستا سامان رکھ کر بیٹھ رہتا۔ گاہکوں کو پان اور سگریٹ دیتے ایک عمر بیت گئی۔ یوں تو سود حرام کے نعرے لگاتے مگر عالمی اداروں سے بھاری سود پہ قرض حاصل کرتے بیرون ملک جائیدادیں بناتے اور عوام سود کی رقم ادا کرتے گھس گھسا گئے تھے۔ فضل کی شادی بھی نہ ہو سکی غربت کی چادر کسی کی بیماری کی طرح ساتھ ساتھ اڑتی پھرتی۔ اس کا کھوکھا دیکھ کر انکار کر دیا جاتا۔ غربت اس کی ماں کو بھی سمیٹ کر ساتھ ہی چلتے وقت کے کنوئیں میں ڈال گئی۔ باپ کے علاج کے پیسے نہ تھے۔ ہسپتال میں دوائیاں نہ تھیں۔ ساری رقم سرکار لے جاتی کہ اس سے توپ، بم خرید کر ہم کفری طاقتوں کو خوب ماریں گے۔ حق کا بول بالا ہوگا۔ تینوں بڑی طاقتوں سے بیک وقت مارنے کا بیڑا تھا۔ اور گیدڑ سنگھی بھی نہیں مل رہی تھی۔ پڑوس میں ماسی رہتی تھی دبلی پتلی سی تھی مرچ جیسی۔ کھنڈر بتاتے کہ کبھی عمارت عظیم رہی ہوگی اب تو یہ حالت تھی کہ جیسے سگریٹ کا خالی پیکٹ جسے بے شمار لوگ روند کے گئے ہوں۔ اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ مگر وہ میر محلہ تھی۔ بجلی نہیں آ رہی۔ پانی بند ہے۔ گیس کا دباؤ کم ہے اس کے در پہ دستک دیتے۔ ماسی موبائل پہ جانے کس کس کو تار کر کے رکھ دیتی، اور کام ہو جاتا۔ اس کا شوہر ادھر ادھر گھومتا پھرتا دوستوں کے ہمراہ تاش کھیلتا اور گلے پھر کو سر پہ اٹھائے رکھتا۔ زور زور سے سگریٹ کے سوٹے مارتا۔ یہ لے دے کا جذبہ حرام اور بناوٹی تھا۔ فضل سے سگریٹ بھی مفت تھیا لیا کرتا۔ اہل محلہ کہتے کہ اس کے گھر میں ماسی کے علاوہ ہر چیز مفت کی ہے۔ کسی فوجی حکومت کی طرح ماسی ذات کے حق لوگ بھاگ کہتے کہ شوہر کے ہمراہ بھاگی اور نکاح کر لیا۔ تبھی تو کوئی ملنے نہیں آتا اور نہ ہی کوئی عزیز رشتہ دار تھا۔ جیسے زمین سے اگ آئے ہوں سپاہیوں کی طرح جو بے تحاشہ زمین پہ

آگے آتے ہیں حالانکہ بلوچستان خشک علاقہ ہے۔ گیدڑ سنگھی کے بارے میں فضل نے ایک بار ماسی سے بھی سوال کیا تھا کیونکہ بغیر کسی آمدنی کے اس کا گھر خاصا اچھے سے چل رہا تھا۔

''ماسی، تمہارے پاس بھی لگتا ہے کہ گیدڑ سنگھی ہے جو عزت سے رزق ہو۔'' ماسی نے کش کھینچ کر دھواں فضل کے چہرے پہ مارا ''بس کیا کہوں گیدڑ سنگھی تو ہے مگر اب کرامات ختم ہو گئی ہے اس کے کالے بال سفید ہو گئے گیدڑ سنگھی کی طرح۔ عمر نے میری گیدڑ سنگھی بھی بے کرامات کر دی۔'' فضل نے گیدڑ سنگھی کو اپنے صندوق میں رکھا تھا کہ گیدڑ سنگھی کے سفید بال سیندھوری ہو گئے مگر ایک روپیہ بھی نہ ملا۔ وہ دھیان بھی کہیں بھٹک گیا تھا اور نہ رقم کا تقاضہ کرتا۔ یوں تو بہت سے ان ہزاروں چیزوں کو خوش قسمتی کا سبب قرار دیا کرتے جیسے فضل یا ملک اکثر یہ بھی سنا تھا کہ گیدڑ سنگھی کو جو کالا بال رکھتے اور اپنے پاس رکھتے بلکہ وہ طلسم تھا کی ''ماسی اگر اتنے تعلقات والی ہو مجھے اصلی گیدڑ سنگھی تو لادو۔ زندگی بھر غلام رہوں گا۔ سگریٹ پان سب مفت دوں گا۔ ماسی نے نگاہوں میں تولا ''تم بچے اور گھر سے ہو میں کچھ کرتی ہوں۔'' فضل نماز میں بھی دعا کیا کرتا کہ کسی طرح گیدڑ سنگھی مل جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں سرکار چھکے کی دلالی کی کتنی کوشش تھی اس کا پیٹ ہی نہ بھرتا۔ ایک روز ماسی خوش خوش چلی آئی ''فضل تمہاری شادی کرا رہی ہوں لڑکی اس قدر خوب صورت ہے کہ پاگل ہو جاؤ گے، سمجھو کہ لاٹری نکل آئی ہے۔ گیدڑ سنگھی مل گئی ہے۔'' فضل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے مکان اور دکان پر نظر دوڑائی ''ایک کھوکھے والے کو خوبصورت بیٹی کون دے گا۔'' ماسی بدستور جذباتی تھی۔ ''وہ تیار ہیں تم ہاں کہہ دو۔'' فضل نے بے یقینی سے ہاں کہہ دی۔ ماسی نے موبائل نکالا ''جاوید کر کارڈ لے آ۔ ایک ہزار روپے کا۔'' فضل پل بھر میں کارڈ لے آیا۔ ماسی نے رقم ڈالی اور ادھر ادھر فون دوڑانے لگی، یہی نہیں بلکہ جمعہ کے روز نکاح بھی طے کر دیا۔ فضل سر پکڑ کے بیٹھ گیا ''ماسی واقعی تمہارے پاس گیدڑ سنگھی ہے۔ کیا جادو ہے۔ دیکھے بغیر ہی رشتہ طے ہو گیا۔ کیا تمہ منتظر ہے تمہارا۔'' سارے محلے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ماسی بہت خوش ہوئی ''کوئی تمہاری قسمت اچھی ہے۔ لڑکی کا باپ قتل کیس میں تھا۔ اسے عمر قید ہو گئی۔ ماں پہلے چل بسی غریب کا تو رشتے دار بھی نہیں ہوتا۔ باپ کہتا ہے کہ کسی شریف آدمی سے بیاہ دوں میں نے تمہاری ذمہ داری لی ہے۔ اب میرے غلام بنے رہنا۔'' فضل اس کے پیروں پہ جا گرا۔ ماسی جانے کس کس سے بیاہ کا رنگ ہی سے آئی محلے کی چند عورتیں اور مرد دولہا کی پھولوں سے تی کار۔ فضل نے بھی ساری رقم ماسی کے حوالے کر دی۔ شادی کے بعد وہ دلہن کو گھر لایا۔ ماسی نے جو دلہن کے چہرے سے چادری اٹھا کر رونمائی کی تو فضل دل تھام کر ڈھیر ہو گیا۔ اس قدر حسین عورت اس نے کبھی نہ دیکھی تھی کسی منگلیٹ سگریٹ کے پیکٹ کی طرح رنگین چمکتی دمکتی کہ ہاتھ لگانے سے ہی میلی ہو جائے۔ لگتا تھا دلہن کے اندر جاپان کی ایل ای ڈی بتیاں لگی ہیں۔ وہ اپنے آپ میں چمک رہی تھی۔ فضل کا دل تو چاہا کہ ماسی کے قدموں میں جا گرے عورت کیا فرشتہ تھی بلکہ فرشتی۔ دلہن مریم اگرچہ غریب گھرانے سے تھی۔ باپ نے کس بات پر قتل مار کا جواری کا سر توڑ دیا تھا اور خود بندی خانے سدھارا۔ مریم تو گھر میں گویا چاندنی دمک رہی تھی۔ چند ہی دنوں میں گھر سنبھال لیا۔ ایک ہی بات کا پتہ چلا کہ مریم کو فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ اور شوق بھی ایسا کہ سنیما میں بیٹھ ہی جاتی۔ تیسرے چوتھے روز جو فلم زیادہ پسند آتی تو آخری شو دیکھ کر ماسی کے ہمراہ گنگناتے رکشے میں چلی آتی۔ فضل کو یہ سب گوارا گزرا مگر ماسی نے یقین دلایا کہ آہستہ آہستہ سنبھل جائے گی۔ باپ عمر قید میں گیا گھر کی غربت پریشان کیے دیتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ چھوڑ کر ہی چلی جائے۔ فضل کا چہرہ اتر گیا۔ ایسی حسین رنگیلی رنگین کے ہیروں جیسی آپ گھر کے ہیروں جیسی! اس نے سوچا قسم دیکھ کر ممکن ہے کہ رقم غلط کرتی ہو۔ یہ بھی ارادہ کیا کہ رقم ہاتھ لگے

تو گھر میں ہی ٹیلی ویژن لگا دے یہ بڑا سا سیٹھ سا حیا۔ اکبر سیٹھ جانے کس ترنگ میں تھا کہ بجائے ملازم کے خود گریڈ کروزنگ سے نکل آیا۔ اور چار کارٹن پسندیدہ سگریٹ کے طلب کیے۔ کھوکھے میں تو جتنا مال تھا ٹھنسنے کی گنجائش نہ تھی فضل سراپا بے کس کے مسافر کی طرح بس ہل کر رہ گیا'' سیٹھ صاحب چار پیکٹ ہیں۔ کارٹن کی طاقت کہاں ہے۔ غریب آدمی ہوں۔'' لجاجت سے ممنایا۔ سیٹھ نے صدری میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کا تھیّا اچھال مارا۔'' یہ لے اکل میرے سگریٹ نہ ہوتے تو میرے ہاتھوں وہ حال ہوگا کہ یاد کرو گے۔ سیٹھ کو زیادہ ہی روسی ووڈکا چڑھا پکا تھا۔ یہ بھی نہ بتلایا کہ کیا یہ رقم بے جانے یا کر ادھار۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹ بھارہ کھا۔ بے تھے۔ پانچ لاکھ تو ہوگا آپ کا گیا۔ ہاتھوں میں رعشہ سا آ گیا۔ ہاتھ پہ کاٹ کے دیکھا۔ سچ تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ یہ خواب نہ تھا۔ حریم ہی گیدڑ سنگھی تھی۔ اس نے رقم حریم کے قدموں میں رکھ دی۔ ''میں تو زندگی بھر گیدڑ سنگھی ڈھونڈھتا رہا تم میری گیدڑ سنگھی ہو۔ تمہاری قسمت میری تقدیر سے جا ٹکرائی ہے۔ یہ رقم سنبھالو۔''

حریم نے رقم رکھ لی'' اگر تم مجھے خوش رکھو گے تو میں دعائیں مانگ مانگ کر ہی تمہیں امیر بنا دوں گی۔'' اگلی شام سیٹھ اکبر ترنگ میں آیا۔ سگریٹ مانگے۔ اس کے سیکورٹی گارڈز گاڑی کے ساتھ ہی کھڑے رہے۔ ''کل جو آپ نے مجھے رقم دی تھی وہ ـــــ '' فضل نے بولنا چاہا تو سیٹھ نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا'' کل میں ان تھا زیادہ پی گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔'' فضل کو سکتے کے عالم میں چھوڑ کر وہ دھواں اڑاتا چلا گیا۔ حرام والی پاگل بوتل میں دکھایا جن لا کر دوسرا عام بیچا چلا جاتا اور لوگوں کو علم نہ ہو پاتا۔ اس کا نشہ فضل کے لیے نعمت ثابت ہوا۔ یہ بھی قسمت کی بات ہے کہ ملک یاران کو فضل پہ ترس آیا۔ ''فضل کیا ان بوتلوں کے ڈبے میں بیٹھے رہتے ہو'' فضل نے گلوگیر لہجے میں درد بھری کہانی سنائی کہ باپ کے بعد غربت نے اسے ہانک رکھا ہے۔ ملک ایک رحم دل انسان تھا اس نے اپنی مارکیٹ میں ایک بڑی سی دکان دے ڈالی اور کچھ خاصی رقم بھی دی کہ مختلف قسم کا سامان رکھے۔ ملک میں مہنگائی بڑھ رہی تھی۔ زندگی کے علاوہ ہر چیز مہنگی ہوتی جاتی تھی۔ ''فضل تم کنفیکشنری، اسٹور یا کھانے پینے کی چیزیں رکھو۔ یہاں بکتا ہے۔ لوگوں کا دل جلتا ہے تو سنتے ہیں سگریٹ کے بغیر ہی ان کا سینہ جلتا ہے۔ یوں بھی سگریٹ کے خلاف مہم چل رہی ہے۔ تم کاروبار بدل لو۔'' فضل کو مشورہ پسند آیا۔ سیٹھ اکبر کو علم ہوا تو اس نے بلوا بھیجا۔ ''افسوس تم مجھے غیر سمجھتے ہو کاروبار بدلا اچھا کیا۔ کچھ مدد ہی لے لیتے'' اتنا آدمی بچا جاتا تھا۔ پھر اس نے ایک بڑی رقم فضل کے حوالے کر دی'' یہ مدد ہے ادھار نہیں۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ دوسرے مسلمان بھائی کا خیال رکھے۔'' فضل کو کیٹرنگ کے آرڈر بھی ملنے لگے۔ اس نے محلے کو خیرآباد کہا لیکن ماسی سے تعلقات بدستور رکھے۔ جب وہ امیروں میں جاتا تو خوشی نہ ہوتی۔ اسی محلے کے غریب غربا سے مل کر خوشی ہوتی جو اب اس کا نام عزت سے لیا کرتے۔ حریم ایک نہایت ہی شریف بیوی ثابت ہوئی۔ پردے کا خاص خیال رکھتی۔ ہمیشہ سر ڈھانپے رہتی۔ فضل نے کار ڈرائیور رکھ دی تھی ڈرائیور کے ساتھ آتی جاتی ماسی بطور محافظ کے ساتھ ہی رہتی۔ سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلتی۔ اتنی دولت کے باوجود حریم میں رعونت نہ آئی۔ ویسی ہی جس طرح اور منکسر تھی۔ دولت سے وہ اور بھی نکھر گئی۔ حسین لباس، زیورات، بڑھیا خوشبوئیں۔ کسی شادی بیاہ میں جاتی تو کشتوں کے پشتے لگا دیتی عابد و زاہد بھی دل تھام کے رہ جاتے۔ فضل پہ رشک کرتے کہ کیا قسمت پائی ہے۔ بعض دل جلے تو حریم کو بھی گیدڑ سنگھی کہتے جس نے ایک کھوکھے والے کو دیکھتے ہی دیکھتے صاحب حیثیت بنا دیا۔ ماسی اسے حسن قائم رکھنے کے گر سکھاتی۔ ہفتہ دس روز میں بیوٹی پارلر لے جاتی۔ ماسی تو اس کی ہمراز تھی۔ لیکن فضل کے آتے ہی وہ ماسی سے گفتگو بند کر کے

پوری توجہ فضل کو ہی دیتی۔ ایک وفا شعار بیوی کی طرح سمجھی جاتی۔ جس کے باعث فضل کو ماں کی کوئی خاص اہمیت محسوس نہ ہوتی۔ حریم کا باپ تو فضل کی مصروفیتیں برداشت نہ کر سکا۔ کالا گیت اسے زندہ نگل گیا تھا اژدھا کی مانند۔ حریم کی زندگی میں فضل کے بعد بس ماں ہی بچی تھی۔ ورنہ تو وہ اس بھری دنیا میں بالکل ہی اکیلی تھی۔ قدرت نے دو بیٹے بھی دیے اور جب سنہری بالوں نیلی آنکھیں والی بچی پیدا ہوئی تو خاندان مکمل ہو گیا۔ ڈاکٹر ہی نے فضل کو بتلایا تھا کہ حیرت کی بات نہیں ہے۔ جینز کا بھی عجب کام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو تین سو برس قبل کوئی نیلی آنکھوں سنہری بالوں والی دادی پڑدادی، نگڑدادی رہی ہو جس پہ بچی گئی۔ جیسے کہ ایک شہزادی کے ہاں کالا حبشی بچہ پیدا ہوا تو ڈاکٹروں نے آگاہ کیا تھا کہ چونکہ شہزادی اپنے غلاموں کو دیکھا کرتی، دماغ کی وہ تصویر اصل بچے کے روپ میں آ گئی۔ تبھی تو کہتے ہیں کہ ماں کو حبشیوں سے دور رکھا جائے۔

فضل کو لگتا کہ زندگی مکمل ہو گئی ہے۔ اس نے جس قدر سوچا تھا کہیں بڑھ کر اسے ملا پہلے تو وہ صرف مغرب کی نماز ہی باجماعت ادا کرتا کاروبار میں وقت ہی نہ ملتا۔ اب آسودگی بھی تھی، ملازم بھی۔ وہ فجر اور عشاء بھی باجماعت ادا کرنے لگا۔ سیٹھ اکبر اور ملک یاران کے علاوہ شہر کے دیگر روساء سے بھی فضل کے دوستانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ گولف کلب کا ممبر بھی بن گیا۔ اسے بتلایا گیا تھا کہ کنگ میکر وہیں آ کر بیٹھتے ہیں۔ ان سے میل جول کے باعث کیا عجب کہ کبھی وزیر یا مشیر ہی لگا دیں اقتدار کی دیوی گولف کلب میں رہتی تھی ڈولے کے اس پار!

انہی دنوں ایک معروف ایسٹرولوجسٹ شہر میں آیا تو قسمت کا حال جاننے والے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ فضل کو نجومی فراڈ لگے کہ ہاتھ کی لکیریں اور ستاروں کی چال سے قسمت ہی بتا دیں۔ تو یہ تو فضل کا ل پیدا لیتے۔ کیسے مکر کرتے ہیں۔ بادل کی طرح یہ شہر بھی الٹا نہ ہو جائے وہ من ہی من میں کانپتا رہتا۔ ایک مربی کے اصرار پہ وہ بھی بادل نخواستہ چل پڑا۔ نجومی ایک بڑے ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس سے ملنے کا باقاعدہ وقت لیا جاتا۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ نجومی نے کھلے دل سے استقبال کیا۔ اس کے مربی کا ہاتھ دیکھا۔ معلومات حاصل کیں کہ کب کہاں کس شہر میں پیدا ہوا۔ اس کا مربی زائچہ پیدائش اور اتا جاتا تھا جس کی فیس بھی زیادہ تھی۔ نجومی نے تین روز کا وقت مانگا۔ فضل محض تفریحاً ہی نجومی کے ساتھ آ بیٹھا۔ ہاتھ دکھایا وقت پیدائش وغیرہ طوطے کی طرح رٹے رٹائے الفاظ میں پوچھا گیا کریں، روپیہ پیسہ، عزت دولت ہے مگر قسمت میں اولاد نہیں ہے۔" نجومی نے تاسف سے سر ہلایا۔ فضل کا قہقہہ گونج اٹھا اگرچہ وہ آواز بلند ہنسنے سے خود کو روکے رکھتا کہ متانت کے خلاف ہے۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ نجومی کو حقارت سے دیکھا "میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ سب فراڈ ہے نجوم مجوم۔ میرے تین بچے ہیں، دو بیٹے ایک بیٹی۔ کیا لا کر بھی دکھاؤں۔"

نجومی کا چہرہ فرط جذبات سے سرخ ہو گیا۔ مگر اس نے جذبات پہ قابو پا لیا۔ ایک گلاس پانی بھی حلق میں انڈیل لیا۔

"یہ ہزاروں برس قدیم علم ہے۔ آپ میرا مذاق اڑا لیں مگر علم کی تحقیر نہ کریں" یوں تو نجومی مفاہمت پہ اتر آیا تھا، مگر کھول رہا تھا۔ فضل کے اندر کا کھوکھے والا جاگ اٹھا "کیوں نہ کروں میرے شہر والوں کو لوٹنے والے کا میں کیا ادب کروں۔ آپ سے تو فال نکالنے والا طوطا ہی بہتر ہے۔ جو ایک مونگ پھلی لے کر خوش ہو جاتا ہے۔" نجومی کو کمزور پا کر فضل اور بھی شیر ہو گیا ملبہ ہی ڈال دیا۔ نجومی کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ دونوں دست و گریباں ہونے کو تھے۔ کہ مربی نے تو ل رہے تھے "بہتر ہے کہ میرے شہر سے چلتے بنیں۔"
نجومی نے دروازہ کھول کر پانچ ہزار روپے کا نوٹ نکالا اور فضل کو دیا "جائیں اپنا اسٹ کرائیں یہ تمہاری قسمت کی فیس ہے۔ رزلٹ لے کر

سیدھا میرے پاس آئیں۔ میں نہ صرف چلا جاؤں گا بلکہ یہ کام چھوڑ دوں گا۔ ورنہ پھر چلتے پھرتے نظر آؤ گا۔"

فضل نے گھڑی دیکھی "میں ابھی واپس آتا ہوں، آپ اپنا بوریا بستر باندھ لیں۔" فرطِ غضب سے وہ دونوں پاگل ہوئے جاتے تھے اس کے ڈاکٹروں سے کافی تعلقات تھے۔ چچا اور دوست شام میں اپنی پریکٹس کرتا۔ اس کا ایک بڑا نام تھا۔ اس نے فضل کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ "اس کو زیادہ وقت نہیں لگے گا میں بھی جلدی کروں گا پھر بھی ایک گھنٹہ لگے گا ہی۔" مشینوں سے جانچا۔ فضل نے Specimen دیا۔ بڑا ہی غیر شاعرانہ انداز تھا اسے ندامت بھی ہوئی۔ مگر سوال اس کی آن کا تھا ضد کا تھا۔ فیس ادا کر کے وہ نکلتے چلا گیا۔ رش کے باعث کچھ دیر بھی لگی۔ اس کا لفافہ تیار پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے لفافہ دینا چاہا تو اس نے لوٹا دیا۔ "میں انگریزی پڑھا لکھا نہیں آپ ہی نتیجہ بتا دیں۔" ڈاکٹر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔ جیسے وہ مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ "آپ کی رگیں پیدائشی طور پر بند ہیں Sperm Release نہیں ہوتے اس قدر باریک آپریشن شاید امریکہ میں ہو سکے تبھی آپ صاحبِ اولاد ہوں گے۔"

◆◆◆

دنیا کی حقیقت اور اصل زندگی

کرسڈا روڈریگز

دنیا کی مشہور فیشن ڈیزائنر اور مصنف "کرسڈا روڈریگز" نے کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد اپنے انتقال سے پہلے یہ تحریر لکھی ہے: 1- میرے پاس اپنے گیراج میں دنیا کی سب سے مہنگی برانڈ کار ہے لیکن اب میں وہیل چیئر پر سفر کرتی ہوں۔ 2- میرا گھر ہر طرح کے ڈیزائنر کپڑے، جوتے اور قیمتی سامان سے بھرا ہوا ہے لیکن میرا جسم ہسپتال کی فراہم کردہ ایک چھوٹی سی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ 3- بینک میں کافی رقم ہے لیکن اب اس رقم سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ 4- میرا گھر محل کی طرح ہے لیکن میں ہسپتال میں ڈبل سائز کے بستر میں پڑی ہوں۔ 5- میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے دوسرے فائیو اسٹار ہوٹل میں جا سکتی ہوں لیکن اب میں ہسپتال میں ایک لیب سے دوسری لیب میں جاتے ہوئے وقت گزارتی ہوں۔ 6- میں نے سینکڑوں لوگوں کو آٹوگراف دیئے۔ آج ڈاکٹر کا نوٹ میرا آٹوگراف ہے۔ 7- میرے بالوں کو سجانے کے لئے میرے پاس سات بیوٹیشن تھیں، آج میرے سر پر ایک بال تک نہیں ہے۔ 8- نجی جیٹ پر میں جہاں چاہتی ہوں اڑ سکتی ہوں۔ لیکن اب مجھے ہسپتال کے برآمدے میں جانے کے لئے دو افراد کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ 9- اگرچہ بہت ساری کھانوں کی مقدار موجود ہے، لیکن میری خوراک دن میں دو گولیاں اور رات کو نمکین پانی کے چند قطرے ہے۔

"یہ گھر، یہ کار، یہ جیٹ، یہ فرنیچر، بہت سارے بینک اکاؤنٹس، اتنی ساکھ اور شہرت، ان میں سے کوئی بھی میرے کام کا نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی چیز مجھے کوئی راحت نہیں دے سکتی۔ بہت سارے لوگوں کو راحت پہنچانا اور ان کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھیرنا ہی اصل زندگی ہے۔" "موت کے سوا کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

انٹرن شپ

جمیل احمد عدیل

مختصر تعارف

محمد جمیل احمد — جمیل احمد عدیل کے قلمی نام سے ادبی دنیا میں متعارف ہیں۔ مختلف اصنافِ نثر میں ان کی تقریباً تیس کے قریب کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان دنوں وہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں تعینات ہیں، جہاں وہ تدریس کے ساتھ ساتھ صدر شعبہ اردو اور ڈین آف آرٹس کے فرائض منصبی بھی ادا کر رہے ہیں۔

یہ اس دور کا قصہ ہے، جب میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے انٹری ٹیسٹ کی بدعت کا نام و نشان تک نہیں تھا اور یہ عین اسی روز کا واقعہ ہے، جب حکیم عبدالعزیز ناگی نے مجھے اپنا دستِ راست بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو، جو بھی عطریات بیچ رہا ہے، وہ زمین پر خوشبوؤں کا تقسیم کار ہے۔ جو شہد کی تجارت کر رہا ہے، وہ حقیقتاً شفا بانٹ رہا ہے۔ یہ کسی طرح درست سوچ نہیں ہو گی کہ اپنے عطر، شہد، عرق ۔۔۔ کو خالص ثابت کرنے کے لیے دوسرے کی ان پروڈکٹس کو جعلی یا ناقص قرار دے ڈالا جائے۔ باقی عجز کے ساتھ کہتا ہوں، یہ میرا ایمان ہے: طبابت کے دشت کی سیاحی میں میری عمر بیتی ہے۔ سو، اس مناسبت سے شناسائیاں رکھی گئیں ہیں۔ اس کے باوجود میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اصلی مال خریدتا ہوں، بیچتا ہوں نہ خود استعمال کرتا ہوں۔ کسی کو جعل ساز کہنا میرے اعتقاد کے خلاف ہے۔ میری نظر میں سب مکرم، سب محترم ہیں ۔۔۔ علاوہ ازیں ذرا سوچو تو سہی کہ عطریات، عرقیات، خشک میوہ جات، دیسی گھی، زیتون کا تیل، کلونجی اور شہد فروخت کرنے والا، منشیات یا اسلحہ بارود کو بھی اپنا کاروبار بنا سکتا تھا۔ اگر اس نے اول الذکر نعمتوں کا چناؤ کیا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ فطرتاً مثبت طرزِ احساس کا مالک ہے۔ وہ دل سے ماحول کو مہکانے کا آرزومند ہے، وہ لوگوں کو توانا دیکھنے کی تمنا رکھتا ہے!!

مذکورہ نقطۂ نظر اپنی انفرادیت اور تعمیری صفت کے سبب ہی کچھ کم جاذب نہیں تھا۔ اس پر مستزاد حکیم عبدالعزیز ناگی کے لہجے میں خطابت کی تُندی بھی موجود نہیں تھی۔ یوں بادی النظر میں امکان نہیں تھا کہ ان کا تکلّم مخاطب کی سماعت کے لیے کسی قسم کی گرانی کا باعث بنے گا۔ مجسم تحمل عبدالعزیز ناگی ایک حاذق طبیب تھے۔ ستر برس کی عمر کو پہنچی ہوئی ان کی شخصیت کو مسحور کن پیکر عطا کرنے میں اگرچہ ان کی جادو بھری گفتگو بنیادی کردار ادا کرتی تھی لیکن ان کے بے ریش بیضوی چہرے کی معصومیت سے کہیں بڑھ کر ان کے سر اور بھنووں کے بالوں کی چمکتی سفیدی طلسمِ اعظم کا مفہوم سمجھاتی تھی۔ وہ مریضوں اور مریدوں سے کلام کرتے تو سانسیں تھم سی جاتیں کہ ہر آن کا نور ان کے پورے وجود کے گرد مستقل ہالہ قائم رکھتا۔ ذوقی استدلال پر معروضی استدلال ان کی اولین ترجیح تھی، جس پر مباحث کی کم کم گنجائش ہی ممکن

دکھائی دیتی۔ کچھ یہی وجہ بنی ہوگی کہ عمومی صبح کل رہاؤ کے باوصف فکر و نظر سے طبعاً اداس ان سے بھی دلاور ہی رہے کیونکہ روایت پسندوں کا نظر اس بحث سے توانائی پاتا تھا کہ عقلیت کو محور بنائے رکھنا ذہنی خلل کا شاخسانہ ہے۔ ان کی دانست میں حکیم ناگی نے اپنی فکر دیوں سے مامون رہنے کے لیے عمر بھر ''تعقل'' کو پلو کا وہ بنائے رکھا۔ ایسا نہیں کہ حکیم عبدالعزیز اس کشمکش سے بے خبر تھے۔ بس ان کا اپنا اسلوب حیات تھا کہ دو بیبیوں کے گھرے تھے، یوں رد عمل ظاہر کرنے کی جانب زیادہ میلان نہیں رکھتے تھے۔

اس زمانے میں ہم لڑکے بالے تھے۔ فراست کی اہمیت سے اس لیے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے کہ یہ ''کمیاب جنس'' فراوانی سے میسر تھی۔ ''مطلب ناگی'' کے نہایت لذیذ مقویات اپنی جگہ لیکن اصل کشش کا مرکز حکیم صاحب کا ہفتہ وار درس تھا جو ہم یاران تیز کو دیوانہ بنائے ہوئے تھا۔ اس لیے کم وبیش دو برس دھیان اور قدموں کے رخ میں کوئی مغایرت واقع نہیں ہوئی۔ جب دلچسپی میں اور اضافہ ہوا تو اپنے تنگی ساتھیوں کے ساتھ مل کر، باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے کئی بار حکیم عبدالعزیز ناگی کی 'ریکی' کی تاکہ یہ معلوم ہو سکے، ان کے کاروباری روابط کن لوگوں سے ہیں! اس مقصد میں جزوی کامیابی تو ہوئی لیکن نتیجہ بے سود سا رہا کیونکہ جو مال بھی یہ منگواتے اسے اپنے ''معمل'' میں کسی ادویہ ہی سے ضرور گزارتے ہوں گے کہ بہر حال اپنے اثر اور لطف میں وہ مختلف ہو جاتا تھا۔ اسی لیے ان کے دواخانے میں دستیاب۔ عرق، عطر، روغن، شربت، قہوہ، سرکہ، اچار، شہد، آش، سفوف، سرمہ، پھکی، خمیرہ، بام، منجن، جوشاندہ، خیساندہ، پھاکا، خضاب، مفرح، معجون، جوارش، مرہم، چورن، خشک میوہ، لوزینہ، مربا وغیرہ غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ لوگ پاس اور دور سے آتے، نہ صرف حکیم صاحب سے علاج معالجہ کراتے بلکہ اپنے شوق سے یہ دوائیں اور غذائیں وافر مقدار میں خرید کر اپنے ہمراہ بھی لے جاتے۔

حکیم ناگی کے دواخانے سے منسوب ایک تحفہ خاص الخاص سمجھا جاتا تھا اور وہ تھا لطافت کا سچا حرف عرق گلاب۔ ویسے تو شہد اور کلونجی بھی مشہور تھے مگر عرق گلاب کی کیا بات تھی! ایک بات ہے ہم نے بچشم خود بھی انھیں یا ان کے کارندوں کو گلابوں کی جمع کاری میں مصروف نہیں پایا تاہم ان سے یہ بات کئی بار سنی ہوئی تھی: جو گلاب موسم بہار میں سورج طلوع ہونے سے قبل ہاتھوں سے توڑے جائیں، ان کا حاصل عطر کی شکل میں ہو یا عرق کی صورت، اس کا جواب نہیں۔ یہی وجہ ہوگی کہ باذوق مرد و زن آنکھیں بند کر کے ان سے عرق گلاب منہ مانگی قیمت پر خرید کے لے جاتے تھے۔ عرق گلاب میں خواتین کی دلچسپی کا سبب یہ بھی تھا کہ حکیم صاحب نے اپنے اشتہارات کے ذریعے زنان مشرق کو یقین دلا دیا تھا! اگر تمھاری جلد شاداب نہیں تو مردوں کی نگاہوں میں تم بیکار مخلوق ہو! تیز جلد کی تازگی اور چمک کے لیے فرشتے اب تک صرف عرق گلاب کو مفید بتانے میں بامراد ہو سکے ہیں! اپنا نچہ اسے نوش جاں کرنا اور اس سے چہرے کو روزانہ دھونا مفید ہی نہیں اکسیر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کیل مہاسوں، چھائیوں جھریوں سے متاثر ہونے والی عورتوں کے لیے عرق گلاب، کھیرے اور لیموں کے رس سے الگ آمیزہ بھی تیار کر رکھے تھے۔ مختصر یہ کہ عرق گلاب کے لیے انھوں نے ''متقبل'' خوبصورت تقلیل اسکی مرعوب کن ذہنیں استعمال کرتے ہوئے جس طرح اس کو ابھار کر ہوا لٹریچر گھر گھر پہنچا دیا۔ یوں خلق خدا نے مان لیا تھا کہ زندگی کی سے لے کر لحد تک جملہ عوارض کا موثر وظیفہ بس آب زلال میں ہے جسے 'ناگی مارا وزن' کہا جاتا ہے۔

'مطلب ناگی' پر زیادہ آمد و رفت تو حکیم صاحب کے متاثرین کی تھی لیکن اجنبیوں کے لیے یہ در ہرگز بند نہیں تھا۔ بعض اوقات 'پامال تجربہ' کے مارے ہوئے بھی آن پہنچتے تو دلچسپ سا ماحول بن جاتا۔ مثال کے طور پر کوئی کلونجی کے چند دانے طلب کرتا اور انھیں

سفید کاغذ میں لپیٹ کر، دیکھتا کہ چکنائی کے دھبے ابھرے ہیں یا نہیں؟ کوئی اپنے دماغ میں ملاوٹ کی ساخت والی کو رام کرنے کے لیے موم بتی میں پروئے ہوئے کاٹن کے موٹے دھاگے کو شہد میں بھگو کر اسے جھٹکتا اور پھر ماچس کی تیلی کے ذریعے اسے شعلہ دکھاتا۔ اگر بتی جلنے لگتی تو اسے اعتبار آ جاتا کہ شہد خالص ہے۔ اسی طرح کوئی عرق گلاب کو سونگھ / چکھ کر اندازہ لگاتا کہ اس کی خوشبو ٹھیک ہے یا نہیں؟ ذائقہ بدمزہ ہے یا نہیں؟

یہ سارے کرتب دیکھتے ہوئے حکیم جی اندر ہی اندر مسکراتے ضرور ہوں گے کہ ایک تو مشتری کو داد دے، دوسرے یہ کہ اسے خود کو اپنی سمجھداری باور کرانے کا خبط لاحق ہے! لیکن اس تماشے میں وہ اپنی لاتعلقی پر حرف نہیں آنے دیتے تھے اور یہ وقتی تشخص کا یہ زاویہ بھی ان کی کامیابی کا ضامن تھا۔ یہاں یہ ذکر ضرور کیا جائے گا، کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ حکیم جی نے عرق گلاب فروخت کیا ہو اور گاہک کو ساتھ سوکھی پتیوں کا 'پڑا' نہ تھمایا ہو۔ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات تھی! ایک روز میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا: حکیم صاحب! اس عمل میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ اپنے خاص ملائم لہجے میں گویا ہوئے: یہ عرق گلاب کی اصل ہے۔ اسے جدا کر دیا گیا تو عرق کے بعض اجزا اپنی تاثیر سے محروم ہو جائیں گے!! میں نے بلاتوقف دلیل چھانٹی: جب پنکھڑیوں سے عرق کشید کر لیا گیا تو اس سے وابستہ پھوک کیا کرتا ہے؟

وہ ہلکا سا مسکرا دیے۔ بیٹے! یہ تو خودغرضی ہوئی نا کہ جس سے سب ملا اسے ہی الگ کر کے پھینک دیا جائے ___ مانا کہ جو لانے والا کردہ اہم ہے، پر جس راستے میں لائے۔ اس کی فضیلت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے ___ ظرف کی وقعت کو تسلیم کرنا صاحب ظرف کا حوصلہ ہے! اور تو اور ایک عہد کے طور ت پیلوں نے بھی فنون لطیفہ کی روحانیت کو واضح کرنے کے لیے گلاب اور خوشبو کے مابین زمرہ و رشتے پر انحصار کیا ہے۔ اس اٹوٹ ناتے کو مطلق سچائی کا وسیلہ بنایا ہے ___ ایسی لڑکے الاکالی پر رکھ دیکھو!!

باتیں بلاشبہ گہری تھیں مگر اپنی عمر بھی ایسی طوفانی تھی کہ گرگٹ کی طرح وقت کا خزینہ مانتے تھے۔ لیکن آپ ان خشک پتیوں کی افادیت بتا دیں! انھوں نے اپنا کپکپاتا ہاتھ میرے شانے پر رکھتے ہوئے دریافت کیا: تم کس کلاس میں پڑھتے ہو؟ میں نے سینہ پھلا کر بتایا: ایف ایس سی کر چکا ہوں، میڈیکل کالج میں میرا داخلہ ہونے والا ہے۔ وہ میرے سے لب کشا ہوئے: اس کا مطلب ہے تم بات کی تہ تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہو ___ مجھے بتاؤ! جب قطرہ سے عرق کھینچ لیتے ہو تو کیا وہ پھوک رہ جاتا ہے؟ ایک بار تو میں چکرا گیا مگر جلد ہی سنبھل گیا! تو اور کیا! اصل چیز بادام کی گری ہے، چھلکا نہیں!! لیکن حکیم جی نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے۔ برخوردار! تمہاری ذہانت دل کو لگتی ہے پر مغز اور قشر میں جو اساسی رشتہ ہوتا ہے اسے قائم رہنا چاہیے! تم شاید جانتے نہیں ہو، جن پتیوں سے عرق نکالا جاتا ہے وہی خریدار کے حوالے کی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عرق دیسی گلاب کی قسم 'گلابی مائل احمریں' ہلکی مہک والے 'صد برگ' کا ہو اور عرق مول لینے والے کے ہاتھ میں سیاہی مائل سرخ، تیز خوشبو کے مالک 'سندھی' کی سوکھی پتیاں دے دی گئی ہوں!

میرے لیے یہ انکشاف تھا۔ سو دم بخود ہو کر رہ گیا! لیکن معاً اپنے اندر کے 'منشی' نے ٹہوکا دیا:

پہلی بات تو یہ ہے کہ تاثیر عرق میں ہوا کرتی ہے، خشک پتیوں میں نہیں۔ دوسرے یہ کہ عین مین عرق والی پتیوں کا حساب کتاب رکھا کیا جا سکتا ہے؟ حکیم صاحب نے لطیفے اور حکمت کی آمیزش سے مجھے کی ٹوپی پہنا دی۔ ان کی آنکھوں کا رنگ آن کی آن میں بدلا اور بولتے چلے گئے: میں تمہاری باتوں کے ٹوکنے سے عاری وہ انکار کرنے والا مدعی نہیں ہوں، جس کے منتر: جھوٹا ہے تو آگ کھا اور پیاسا ہے تو پانی پی! سچے ہی خالص دام کے بھاگ جاتا ہے؟ سونے کا کے! مجھے خبر ہے تم ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے بعد اسپیشلائزیشن کرنے امریکا جاؤ گے۔

ایسا ہی خواب دیکھتے ہوئے!! میں نے بے اختیار 'ہاں' کہہ دیا حالاں کہ اس وقت ایسا کوئی سپنا میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا!۔۔۔ اگرچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔۔۔!

جب وہاں جاؤ گے تو دیکھنا امریکی اپنے قومی پھول گلاب پہ کیسے صدقے واری جاتے ہیں لیکن وہ فقط رنگ ہے، بالکل بے بو! ولایتی یا بوگی مانند! جو تیتی خوشبو میں نہایا ہوا ہے اسے 'گلاب دمشق' کہتے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران مغربی جنگجو وسط ایشیا سے جو علم، ہنر اور متعدد چیزیں یورپ لے گئے ان میں ایک گلاب دمشق بھی تھا۔۔۔ اب اپنی گلی یا اس میں بسا گلاب جنوب مشرقی یورپی خطے بلغاریہ میں آ گیا ہے۔۔۔ یہ تاریخ کے پنے ہیں میری کرامت نہیں! تم ان ماہرین نباتات کو کیا کہو گے جنھوں نے گلاب کی دس ہزار اقسام گنوائی ہیں!! کسی سرپھرے نے تو جا کر جنگلی گلاب کی پنکھڑیاں گن ڈالیں کہ پانچ ہوتی ہیں جبکہ چمن میں ایک جنگلی قسم چار پنکھڑیوں پہ بھی جا رہی ہیں۔ پانچ ایکڑ رقبے پر گلاب کاشت کیا جائے تو اس سے بمشکل گلاب کی بتیاں حاصل ہوتی ہیں۔۔۔ تو میں! ایک روایت ہم سے بھی نسبت رکھتی ہے، تھوڑی سی روایتی ہمیں بھی آتی ہے! بند ہونے کے قریب کی کہ پتا کھا ابھی کھلی ہے!!

حکیم ہاگی نے تو ایکدم میری بولتی بند کر دی اب میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ جواب آں غزل کے طور پر میں بولا تھا یا حکیم ہاگی کی طرح میری انا متکلم ہوئی تھی لیکن جو بھی ہوا برابری کی سطح پر ہوا! حکیم صاحب! اتنی ریسرچ کر کے یہ بھی بتا دیجیے کہ سوکھی پنکھڑیوں کی شمولیت سے عرق میں کون سی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ فی الوقت مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ نے لفظ اور معنی والا جو نکتہ پیش کیا تھا، اس کی بقیہ اصولی وضاحت بن لیں: ایک لفظ کے کئی کئی معانی ممکن ہیں!! اس پر وہ اور برہم ہو گئے، ایسا نہیں ہو سکتا! ایک لفظ کا ایک ہی اصلی معنی ہوا کرتا ہے۔ تم نئے لکھنے پڑھنے والوں کا یہی مسئلہ ہے کہ تم معنی پہلے سوچتے ہو، پھر اس کے حسب حال نیا لفظ ایجاد کر لیتے ہو! یوں چھلنی میں پڑوال کی جگہ پانی بھر لیتے ہو!! یہ جو کچھ ہو رہا تھا میرے لیے معمول سے ہٹ کر تھا کہ حکیم صاحب کے چہرے سے ان کی ذاتی حلیمی رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ طنز کی سطوت لے چکی تھی، سو یہ ساعت بہت نایاب تھی کہ وہ منکشف ہونے کے نزدیک پہنچ چکے تھے لہٰذا اس گھڑی کو ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا: حکیم صاحب! حیران اس لیے ہوں کہ ایک طرف فردوسی میدان سے آپ کی جرأت ضرب المثل بن چکی ہے، دوسری جانب یہ تفصیل کہ ایک نقطہ کی پنکھڑی سے اگر ایک سے زیادہ معانی کے عرق کشید نہ کیے جا سکیں تو کسی کو متلذذ نہ ہونے دینے والے اس ٹیڑھے پن کی کیا زیارت ہی مقصود ہے؟

یہ اس دور کا قصہ ہے، جب میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے انٹری ٹیسٹ کی بدعت کا نام و نشان تک نہیں تھا

اور یہ میں اسی روز کا واقعہ ہے جب حکیم عبدالعزیز ہاگی نے مجھے اپنا دست راست بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اس صورت حال پر میرے والد صاحب بہت خوش تھے کہ اس بہانے میڈیکل کالج میں کلاسز شروع ہونے تک ان کا لاڈلا آوارہ گردی سے باز رہے گا۔۔۔ اور حکیم ہاگی کو میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ انھوں نے مثالی اعتماد کرتے ہوئے اگلے ہی دن مجھے اس الماری کی چابی عطا کر دی جس کے زیریں خانے میں گتے کا ایک کالی پڑا ہوا تھا جس میں پورے ہندوستان کے ساتھ خشک پنکھڑیاں محفوظ تھیں!!

◆◆◆

وباء

تسنیم کوثر

مختصر تعارف

تسنیم کوثر 18 فروری کو ساہیوال میں پیدا ہوئیں۔ جہاں سے شادی کے بعد مستقل لاہور منتقل ہو گئیں۔ ان کی اب تک 4 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ''سرگوشی'' شعری مجموعہ، ''الجھن'' افسانوں کی کتاب، ''دو قطرے''، ''کہانی ان دنوں کی'' اور ''جہاں رحمت برستی ہے'' شامل ہیں۔

میں ہکا بکا رہ گئی تھی۔

اتنا بڑا فیصلہ یوں پل بھر میں۔

ابھی چند ماہ پہلے ہی تو ــــ ہم سب کے منع کرنے کے باوجود اس نے جو دل چاہا کیا تھا۔ ڈیڈی کی ناراضی مول لے کر کورٹ میرج کر لی تھی۔ ڈیڈی نے ثمین کی پسند کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا، بس ــــ اونچ نیچ سمجھائی تھی جو ــــ اس نے سمجھنی نہیں چاہی۔

ہمارے ڈیڈی ایک روشن خیال باپ تھے۔ ممی کے مرنے کے بعد ہم چاروں بہنیں ہی ان کی توجہ کا مرکز تھیں۔ دادی کے اکسانے ''وارث'' کے نہ ہونے کا احساس دلانے اور لوگوں کے سمجھانے کے باوجود ڈیڈی نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔

باپ کی شفقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہمیں ماں کی محبت بھی دی تھی۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھا تھا۔ ہمیں اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ اعلیٰ تربیت کی تھی اور ــــ پُراعتماد ماحول دے کر ہمیں جینے کا سلیقہ سکھایا تھا۔

میں بہنوں میں سب سے بڑی تھی جونہی مجھے لیکچرر شپ ملی۔ ڈیڈی نے میرے ہاتھ پیلے کرنے کی ٹھانی اور ــــ اپنے ایک دیرینہ دوست کے بیٹے سے میرا رشتہ طے کر دیا لیکن ــــ ایسا کرنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے میری رائے مانگی تھی۔ میری زندگی میں کوئی آیا ہی نہیں تھا ــــ میں نے یہ اختیار ڈیڈی کو سونپ دیا اور ڈیڈی نے سعد کو میرا ہمسفر بنا دیا۔ سعد انجینئر تھے۔ اچھے شوہر تھے۔ ہم دونوں جاب کر رہے تھے مل جل کر گھر چلا رہے تھے اور زندگی کی خوشیاں سمیٹ رہے تھے ایک دوسرے کی عزت اور محبت نے ہمیں مضبوط جڑت دی تھی اور خاندان بھر میں ہم ایک مثالی جوڑا جانے جاتے تھے۔

میرے بعد ماہین تھی۔ وہ ڈاکٹر تھی اور اسے اپنا ایک ساتھی ڈاکٹر پسند آ گیا تھا۔ ڈیڈی نے ماہین کی پسند کو اہمیت دی تھی اور تھوڑی بہت چھان بین کے بعد ماہین کا ہاتھ ڈاکٹر وقار کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ وہ دونوں بھی بہت خوش تھے اپنا ہسپتال چلا رہے تھے اور بہت خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔

تبین تیسرے نمبر پہ تھی۔ وہ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز ڈگری لینے کے بعد آج کل وہ ایک این جی او میں بطور پراجیکٹ آفیسر کام کر رہی تھی۔ جواد وہاں کو آرڈینیٹر تھا۔ گزشتہ دو برس سے دونوں اکٹھے کام کر رہے تھے اور یہ ساتھ ہی انہیں قریب لے آیا تھا۔ ڈیڈی آج کل تبین کے لئے رشتے کی تلاش میں تھے مگر ۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے تبین نے چھوٹی کے ذریعے ڈیڈی تک اپنے دل کی بات پہنچا دی تھی۔ ڈیڈی کو تبین کی پسند پہ کوئی اعتراض نہیں تھا مگر ۔۔۔

ایک باپ ہونے کے ناتے وہ جواد سے ملنا چاہتے تھے اس کے بعد اس کے خاندان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ تبھی انہوں نے اسی ویک اینڈ پہ جواد کو ڈنر پہ گھر بلا لیا تھا۔ اس روز گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ میں اور ماہین اپنے شوہر اور بچوں سمیت موجود تھیں۔ میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری تھی۔

تبین چہکتی پھر رہی تھی۔ جواد، وقار، سعد اور ڈیڈی سیاسی بحث میں الجھے ہوئے تھے اور تبین ان سب کے چہرے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد جب جواد کو گیٹ تک الوداع کہنے کے بعد ڈیڈی پلٹے تو ان کے چہرے کے تاثرات نے ہمیں ان کے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ جواد خوش شکل تھا، خوش اخلاق اور خوش لباس بھی تھا مگر ۔۔۔ وہ ڈیڈی کو تبین کے لئے موزوں نہیں لگا تھا۔ ڈیڈی کے خیال میں عورت کا مرد سے آگے نکل جانا اسے بھاتا نہیں بلکہ بری طرح کھٹکتا ہے جواد کا تعلیمی معیار تبین سے کم تھا۔ اس کا ماضی اندھیروں میں گم تھا اور حال ۔۔۔ بھی انہیں کچھ زیادہ روشن نہیں لگا تھا۔

ڈیڈی تبین کے مزاج کے اتار چڑھاؤ سے بھی واقف تھے۔ بیٹی کی خود سری، خود پسندی دیکھتے ہوئے ڈیڈی کی جواد کے لئے رائے نہیں بنی تھی اور جواد کے جانے کے بعد انہوں نے ہم سب کو بٹھا کر ٹھنڈے میٹھے لہجے میں تبین کو سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر ۔۔۔ تبین نہیں مانی تھی بلکہ ۔۔۔ اگلے ہی روز اس نے کورٹ میرج کر لی تھی۔ بچے ہٹ دھرم ہو جائیں تو والدین کو ہار ماننا پڑتی ہے۔

ڈیڈی نے بھی اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ کی تھی نہ کوئی ہنگامہ بلکہ ۔۔۔ اس روز جواد کو فون کر کے پندرہ دن بعد بارات لانے کو کہہ دیا تھا۔

ڈیڈی کے اس ہنگامی فیصلے نے ہم سب کو خوفزدہ سا کر دیا تھا۔ ہم ڈرے ڈرے سے شادی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ ڈیڈی بڑے تحمل سے ہر معاملہ نمٹا رہے تھے۔ سب عزیزوں کو تبین اور جواد کے اسکالرشپ پہ تعلیم کیلئے بیرون ملک جانے کی کہانی سنا کر مطمئن کر رہے تھے اور جلد شادی کا جواز بھی پیش کر رہے تھے۔

ڈیڈی نے اپنی حکمت عملی سے اپنی اور بیٹی کی عزت کم نہ ہونے دی تھی مگر ۔۔۔ ان کی سرد مہری نے تبین پر اس گھر کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند کر دیئے تھے۔ جواد پروگرام کے مطابق چند دوستوں کے ساتھ بارات لایا اور تبین کو بیاہ کر لے گیا تھا۔ تبین تو شادی کے بعد گم ہو گئی تھی۔ اس نے کسی سے بھی رابطے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بس کبھی کبھار ماہین سے ہیلو ہائے کر لیتی جس سے ہمیں بھی اس کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے جو چاہا پا لیا تھا۔ جواد اس سے بھی زیادہ خوش تھا۔ خوبصورت، کماؤ بیوی مل گئی تھی۔ دونوں اپنی زندگی میں مگن تھے۔ دونوں کی فیلڈ ایک تھی دونوں ایک ہی جگہ کام کر رہے تھے ساتھ گہرا اور مضبوط تھا۔ ہمارے سب وسوسے، سب اوہام پیچھے چھٹتے جا رہے تھے۔ تبین کی طرف سے آنے والی اچھی خبریں ہمیں نہال کئے ہوئے تھیں کہ ۔۔۔ عمیر کے فون نے میرے ہوش اڑا دیئے۔ ذہین

میرے پاؤں تلے سے سرک گئی۔ ایڈیٹی کا بے بس سراپا میری آنکھوں میں اشک بن کے تیرنے لگا۔ بیٹے کے دکھ اندر ہی اندر جلا کے بھسم کر ڈالتے ہیں۔ یہ دکھ تو اپنے آپ سے بھی چھپا کے جاتے ہیں میں بھی یہ دکھ چھپا رہی تھی۔ سعد سے … بچوں سے … مگر میں یہ دکھ ماہین سے نہ چھپا سکی۔ میری کپکپاتی ہوئی آواز نے اسے گھبرا دیا تھا۔ کیا بات ہے آپی؟

خیریت … کیا ہوا؟

وہ پوچھتی ہی رہی مگر … میں اسے کچھ نہ بتا سکی۔ میرے اندر کچھ بتانے کی ہمت ہی نہ تھی میں تو شرمساری کے بوجھ تلے یوں دبی تھی جیسے یہ سب کیا دھرا میرا ہی ہو!

جیسے ثمین نے جواد سے خلع لینے کا فیصلہ میری وجہ سے کیا ہو۔ ماہین آئی تو ہم دونوں انجمن سرجوڑ کے بیٹھ گئیں۔ ہوا کیا؟ انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ بس بات بگڑ گئی تھی۔ جواد اور ثمین کا ساتھ چھوٹنے کو تھا۔ مگر کیوں!

یہ جاننے کو ہم علیمہ کی طرف چلی آئیں۔ علیمہ میری کلاس فیلو تھی۔ اور وہ حقوق نسواں کی حامی وکلاء کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ کل ثمین ایڈووکیٹ راحیلہ قریشی سے اپنے کیس کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھی۔ اس کی روداد سننے کے بعد ایڈووکیٹ راحیلہ قریشی نے علیمہ کو بلا کے خلع کا کیس تیار کرنے کو کہہ دیا تھا۔ علیمہ ساری صورتحال جان گئی تھی۔ ثمین کی پوری کہانی کا اسے پتہ تھا مجھی۔ اس نے مجھے آگاہ کر دیا تھا۔ علیمہ کے ہاں سے ہم ثمین کی طرف چلی آئیں۔ ثمین ہمیں دیکھ کے چونکی نہیں شاید اسے ہمارے آنے کا اندازہ تھا۔ کیوں کر رہی ہو یہ سب؟ میں نے اسے گلے لگاتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں سرزنش کی وہ چپ رہی۔ میں نے پھر پوچھا۔ کچھ تو بتاؤ۔ یہ ساتھ اب چل نہیں سکتا آپی۔ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ مگر کیوں؟ ماہین نے اسے کریدنا چاہا۔ میں نے جواد کو سمجھنے میں غلطی کی۔ وہ ہولے سے بولی چلو اگر غلطی کر ہی لی پھر …؟ اب مزید غلطی تو نہ کرو۔ ماہین نے اسے سمجھایا آخر مسئلہ کیا ہے ثمین؟ کچھ تو بتاؤ۔ میں نے مداخلت کی۔ شکریہ آپی۔ مجھے اس مڈل کلاسیے کی اوقات جلد ہی پتہ چل گئی۔ وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکاری۔

کچھ ہی دنوں میں اس کا اصل روپ سامنے آ گیا۔ پیار کے دعوے کرنے والا حاکم بننے لگا تھا۔ مجھے بیوی نہیں باندی سمجھنے لگا تھا۔ بات بے بات روک ٹوک کرنے لگا تھا۔ آپ جانتی ہیں آپی۔ مجھے بیجا کی روک ٹوک قطعاً پسند نہیں۔

میں حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی وہ تمہارا شوہر ہے ثمین۔ اس کو حق ہے تمہیں ٹوکے۔ روک ٹوک کرے۔

Sorry to say آپی۔ وہ بے نیازی سے بولی۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ یہ تو گئے وقتوں کی باتیں ہیں جب شوہر مجازی خدا بن کے دھونس جمایا کرتے تھے اور بیوی باندی بن کے اس کے آگے پیچھے ہوتی تھی۔ اب تو برابری کا زمانہ ہے نہ کوئی کم نہ کوئی زیادہ۔ میاں بیوی برابر ہیں دونوں۔

نہیں! میں چلائی ہرگز نہیں۔ ہم برابر نہیں ہیں۔

اس برابری کی دوڑ نے جانے کتنے گھر اجاڑ دیے ہیں۔ خود کو مشکل میں نہ ڈالو کیونکہ گھر … برابری سے نہیں سمجھوتے سے چلتے ہیں۔ گھر ضد اور مقابلے سے نہیں برداشت سے بنتے ہیں۔

جواد ایک روایتی مرد ہے آپی وہ میری بات کاٹتے ہوئے بہت دھیرج سے بولی۔

بے وقوف مت ہو ثمین! میں نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ دنیا کا ہر مرد روایتی ہوتا ہے۔ ہمارا معاشرہ ایسے بہت سے روایتی مردوں سے بھرا پڑا ہے اور ہم ——— عورتیں خواہ گھریلو ہوں یا ملازمت پیشہ، انہی روایتی مردوں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہیں۔ مجھے دیکھو کماتی ہوں، گھر سنبھالتی ہوں، سعد کے ماں باپ کی خدمت کرتی ہوں پھر بھی ——— سعد کے آگے اونچی آواز میں نہیں بول سکتی۔ میرے گھر میں سعد کا حکم چلتا ہے۔ ماہین کو دیکھ لو کتنی سوشل ہوا کرتی تھی۔ وقار کو پسند نہیں تھا زیادہ گھومنا پھرنا اس نے گھر بسانے کو خود کو اس کی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ گھر بسانے کے لیے خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ ان روایتی مردوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے کہ ——— ان کے بنا ہم کچھ بھی نہیں۔

یہ رشتوں کے بندھن ہی تو ہمیں معتبر بناتے ہیں۔ ہمیں زمانے میں سر اٹھا کے چلنے کے قابل بناتے ہیں مگر ———

ثمین میری بات سمجھنے کو تیار تھی اور نہ ہی اپنا فیصلہ بدلنے کو۔ وہ کہہ رہی تھی میں اس تنگ نظر ساتھ سے تنہا بہتر ہوں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں چلائی۔ ہم برابر نہیں ہیں۔ نہیں نہیں ہم برابر۔ اس برابری کی دوڑ نے کتنے گھر اجاڑے ہیں جانتی ہو تم؟ گھر برابری سے نہیں سمجھوتے سے چلتے ہیں۔ ضد اور مقابلے سے نہیں برداشت سے بنتے ہیں۔ جواد ایک روایتی مرد ہے آپی۔ وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ میں ایسے تنگ نظر آدمی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتی۔ جسے میری خود اعتمادی، میری تعلیم کھٹکتی ہو۔ میرا ساتھ جسے محبت نہیں احساس کمتری دیتا ہو۔ جو میری خود مختاری دیکھ کے جلتا ہو۔ ایسے ساتھ سے میں تنہا بہتر ہوں۔ بے وقوف مت ہو ثمین۔ میں نے اسے پھر سمجھایا۔ دنیا کا ہر مرد روایتی ہوتا ہے۔ ہمارا معاشرہ ایسے ہی روایتی مردوں سے بھرا پڑا ہے اور ہم عورتیں، خواہ گھریلو ہوں یا ملازمت پیشہ انہی روایتی مردوں کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں کہ ان کے بنا ہم کچھ بھی نہیں۔ یہ رشتوں کے بندھن ہی تو ہمیں معتبر بناتے ہیں ثمین مگر ——— مگر ثمین ——— تو میری کوئی بات سننے کو تیار نہ تھی۔ برابری کی دوڑ نے ایک اور شکار کر لیا تھا ———

◆◆◆

معروف شاعر، فلسفہ نگار، ادیب ظفر سپل کی 20 سالہ محنت

فلسفۂ مغرب شائع ہو گئی ہے

ملنے کا پتہ: بک ہوم، لاہور (فون نمبر: 03008431855)

معروف شاعر، ادیب، حمد، نعت اور مرثیہ نگاری کے استاد

پروفیسر حسن عسکری کاظمی کی رباعیات کا مجموعہ

میزانِ فکر (مجموعۂ رباعیات) شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: 206-J، بلاک-III، واپڈا ٹاؤن، لاہور۔ 0345-4698398

غزلیں

انور شعور

○

ساز و ساماں جہاں میں کیا کیا کچھ
اور محرومیاں ہیں کیا کیا کچھ

آہ درویش ہے وہ ماہ سیم
تجھے خواہشیں ہیں کیا کیا کچھ

بن سے چھوٹے، بھرے پرے، سونے
بستیوں میں مکان ہیں کیا کیا کچھ

دلکش و دلفریب نظارے
بوستاں بوستاں ہیں کیا کیا کچھ

اپنے عیب و ہنر معاذ اللہ
ہم خدا بندگاں ہیں کیا کیا کچھ

اے مسیحا نفس! ابھی دل میں
حسرتیں نیم جاں ہیں کیا کیا کچھ

طرز غالبؔ میں مشکلات نہ پوچھ
اسداللہ خاں! ہیں کیا کیا کچھ

کیوں ہم انساں میں کسی کا شعورؔ
ایک تو مہرباں ہیں کیا کیا کچھ

OOO

امین راحت چغتائی

○

ساحل پہ وہ ہیں اور ہیں طغیانیوں میں ہم
آئے ہوئے ہیں ان کی نگہبانیوں میں ہم

ہم ان سے کچھ کہیں جنہیں مسند نشیں کیا
یوں گھر گئے ہیں اپنی پریشانیوں میں ہم

الجھے ہوئے ہیں دونوں ہی احوال کیا کہیں
دانائیوں میں ہیں وہ تو پشیمانیوں میں ہم

پھر ہیں الجھنوں کے سبب دل کی خواہشیں
رسوا ہوئے ہیں ان کی ثنا خوانیوں میں ہم

اب بے لباس ہونے میں کیا وقت رہ گیا
فاقوں تلک آ گئے تری سلطانیوں میں ہم

جتنی وہ رہی تھی طلب بے تمام جاں
بیٹھے ہوئے تھے کل یونہی رومانیوں میں ہم

راحتؔ وہ ہمسر جنہیں بیساکھیاں ملیں
گمنام ہو گئے ہیں ادب ویرانیوں میں ہم

OOO

نوٹ: (امین راحت چغتائی بھی چل بسے۔ ان کی چند غیر مطبوعہ غزلیں ادارہ "تخلیق" کے ریکارڈ میں موجود ہیں جنہیں امانت سمجھ کر آپ دوستوں کے لئے ادارہ شائع کرتا رہے گا۔ اللہ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!)

نذیر قیصر

○

لباس رنگ میں خوشبو سا جھلملایا ہوا
چراغ لے کے کوئی رات میں سے آیا ہوا
میں دیکھتا ہوں اندھیرے میں پھول کھلتے ہوئے
کسی نے آخر شب سے مجھے جگایا ہوا
مجھے بھی لگتا ہے شاید میں اس زمیں کا نہیں
وہ شخص بھی ہے کسی آسماں سے آیا ہوا
یہ ایک صبح مرے آئینوں میں شبنم سی
یہ ایک دن مرے آنکھوں میں مسکرایا ہوا
مرے خواب میں ہوں وہ کسی خواب میں ہوں
کہیں پہ جاگا ہوا میں کہیں سلایا ہوا
یہی نگاہیں اٹھی ہیں تیرے آنے کی
ہوا میں نور روشنی میں بھر آیا ہوا
یہ راستہ ترے قدموں کو چھونے والا ہے
ہوا بھرا کوئی خوشبو سا بچھایا ہوا
لپٹ گئی وہ مرے ساتھ موج گل کی طرح
مری سے چاند بھی لگا ڈھلا ڈھلایا ہوا
چھلک پڑے ہیں مرے ہونٹوں سے گل بوسے
ترے وصال کا موسم ہے مجھ میں آیا ہوا
بکھر گئے ہوئے ہیں مرے برگوں سے
کہیں کہیں کوئی خیمہ بھی ہے لگایا ہوا
میں اس اندھیرے میں بیٹھے سے جا نہیں سکتا
کہ سانس بجھتا ہے مجھ میں دیا بجھایا ہوا
میں شہر خواب کا دروازہ کھول سکتا ہوں
مجھے بھی رات نے وہ اسم ہے سکھایا ہوا
کوئی کرن مرے اوراق سے جھلکتی ہوئی
کوئی ستارہ مری شاعری میں آیا ہوا
پہنچ رہا ہے مری خواب گاہ تک قیصرؔ
کسی کے ہاتھوں دیئے سے دیا جلایا ہوا

OOO

محمود شام

○

کبھی لایا نہ جو زبان پہ حرف
جس سے آتا ہو خاندان پہ حرف

مانگتا ہیں دعائیں امت کی
کیوں اٹھتے ہیں آسمان پہ حرف

بول اٹھتی ہیں سنگ اینٹیں بھی
اُف نکلتے ہیں جب مکان پہ حرف

ملنے والوں کے دل ہوئے چھلنی
ہم لگاتے رہے گمان پہ حرف

دھیان میں جھلملائی اس کی چھب
آئے بے ساختہ زبان پہ حرف

ان سے سیکھی ہے الاماں زباں
سیکھے ہیں جو ہم زبان پہ حرف

آئی سلطان بخت نہ پائے کبھی
چھوڑ دوں کون سا نشان پہ حرف

خود ہی رخ موڑتے رہے طوفان
کشتی تھا لیا بادبان پہ حرف

OOO

آصف ثاقب

○

شاعری سے ہی گراں بار نہیں ہونے کی
زخم و آزار سے یہ گلزار نہیں ہونے کی

دل کی شاخ کی اک طرز طبیعت والی
گل کھلائے گی مگر بار نہیں ہونے کی

آپ اچھا ہے انھیں آج اجازت دے دیں
ہم سے اب خدمت سرکار نہیں ہونے کی

جاگ اٹھتی ہے یہ خود خواب سخن کے لے کر
شاعری زور سے بیدار نہیں ہونے کی

یہ اگر پہلی تو بتی ہے لہو کی سرخی
عاشقی سرخی اظہار نہیں ہونے کی

وہ تو جھک جاتے ہیں ہر در و زر کے آگے
جس کے سر پہ کوئی دستار نہیں ہونے کی

آپ کی چال پہ قربان ہو سب تک ثاقب
اب نظر "بلا رفتار" نہیں ہونے کی

OOO

خالد اقبال یاسر

○

ایسا انگیز برف اڑتی ہے
نقش تحریر دار اڑتی ہے

جاگ اٹھتا ہے جھٹ زار دل
شور انگیز برف اڑتی ہے

کاروانوں سے ساتھ آیا
ہوئے گرد برف اڑتی ہے

ہیں ساماں کی کمائی سے
جام بھر بھر برف اڑتی ہے

آمد آمد ہے پھر اداسی کی
پھر سے خوشبو برف اڑتی ہے

خامہ و قاصد و لفافہ برف
برف کی صورت برف اڑتی ہے

برف صحرا میں کوئی گلشن
کوئی خوشبو برف اڑتی ہے

اور دیکھو حسن کی آنکھیں
ہے اور تیز برف اڑتی ہے

باد یاسر ورائے عشق کے
دھوپ رنگ برف اڑتی ہے

OOO

گلزار بخاری

○

تجھ پہ یہ بھی نہ کھلا عمر بسر ہونے تک
دیکھیں عالم ہیں دیوار میں در ہونے تک
ذمہ داری بھی ہے یہ اور شرف بھی تیرا
پالا ہے تجھے پودوں کو شجر ہونے تک
خوش بھی ہو پھولنے پھلنے پہ نہ ہو غافل بھی
سنگ باری کا بھی امکان ہے ثمر ہونے تک
حوصلہ معرکے میں تجھ کو ملا کرے گا
کشمکش ذہن میں ہے سینہ سپر ہونے تک
چاند کے جسم پہ خواہش یہ عجب لگتی ہے
وقت بھی صرف نہ ہو بدر و قمر ہونے تک
اس قدر محو محبت کی علامت میں نہ ہو
تتلیاں کھلتی ہیں خیر و شر ہونے تک
مانگ خالق سے دعا وقت مشکل کے لیے
در پہ تیری ہیں موجیں کہ جسم ہونے تک
غم ہے غم میں ہے یہ تو جانا ہے لیکن
ڈر ہے مجھ کو تمنا ہے بشر ہونے تک
تتلیاں پانی لگاتے ہیں دروازوں پہ
چاہیے ہم بھی قفس کو گھر ہونے تک
تازگی شعر و سخن میں نہیں آسان اتنی
مشکل ہوتا ہے جو مصرعہ تر ہونے تک
زندگی ہے مری سانسوں کی مسافت گلزار
چلتے رہنا ہے تجھے ختم سفر ہونے تک

OOO

سلطان سکون

○

بہت نہ رنج کی حد سے گزر ہوا سو ہوا
اب اس کے ہجر میں اتنا نہ مر ہوا سو ہوا
جو بچھڑ کر اس سے ہوا خوش تو ہوا سو ہوا
اب اور خود کو تہ و بالا کر ہوا سو ہوا
جہاں میں کس سے کسی نے سدا وفا کی ہے
وہ اک جہاں کا تھا وہ بھی بشر ہوا سو ہوا
کوئی خطا تو ہوئی ہوگی تم سے بھی ہمدم
تمام تہمتیں اس پہ نہ دھر ہوا سو ہوا
ہر اک سے ذکر کی کرنے کا وضاحتیں کیا کیا
کسی کے سامنے آہیں نہ بھر ہوا سو ہوا
سنا ہے ہم سے بچھڑ کر نہیں ہے خوش وہ بھی
ہمارا وقت تو یوں ہوں گزر ہوا سو ہوا
نوشتہ ایسے تو تھی منزل مراد کوئی
مری تو عمر جو تھی میں در بدر ہوا سو ہوا
چلو کوئی تو پہنچ جائے گا سر منزل
جو ہم پہ گزری سر رہگزر ہوا سو ہوا
ہوا ہے جو بھی وہ ہونا ہی تھا سو ہو کے رہا
ہوا ہوا تو نہیں ہے مگر ہوا سو ہوا
چلو سکون نہیں اس کا حال پوچھ آئیں
ہمارے حال سے وہ بے خبر ہوا سو ہوا

OOO

احمد صفی

○

ہوئی ختم سارے عذاب یارو حجاب یارو
پلٹ دے گر وہ شباب یارو، گلاب یارو

وہ کیا برستے میں چھت پہ آیا کہ برق چمکی
ہوا ہے یاراں کا آب یارو، شراب یارو

کہا تھا اس نے کہ مجھ کو پڑھنا جہاں سے چاہو
ہر ایک اس کا تھا باب یارو، کتاب یارو

سفر پہ جتنے طلب کا جا کر عذاب ہوتا
نہ ہوتے گر یہ سراب یارو، سحاب یارو

مرے سوالوں کا اس نے دیکھو تو خوش ہو کر
دیا ہے کیا لاجواب یارو، جواب یارو

میں کیسے کہتے جو راز ہستی کا جانتا تھا
میں کہہ رہا تھا حباب یارو، حباب یارو

OOO

ناصر علی سیّد

O

سمندروں کی تہوں میں اترنے والا ہوں
فلک سے چاندنی اک بات کرنے والا ہوں

میں ساتھ والا ہوں تہذیب اپنے گاؤں کی
سو ہر جھلک کی سے گزرنے والا ہوں

تمہیں سے راس جھیلوں کا سرد پانی مجھے
میں اوک گاؤں کے بھرنے سے بھرنے والا ہوں

اندھیرے قبیلوں میں آسیب بن کے پھرتے ہیں
خود اپنے پاؤں کی آہٹ سے ڈرنے والا ہوں

ملے جو پیار بھری اک نظر جو تم سے
تو دیکھو کیسا میں کیسا سنورنے والا ہوں

اک ایسے موڑ پہ لائے ہو روز و شب مجھ کو
خطا معاف! میں تجھ سے مکرنے والا ہوں

لبوں پہ مہر خموشی ہی احتجاج مرا
کسی جلوس میں شامل نہ دھرنے والا ہوں

میں اجنبی ہوں محبت کے دیس کا ناصر
سو پیار پیار! فقط پیار کرنے والا ہوں

OOO

ممتاز راشد لاہوری

O

اپنے اظہار کا معیار بھی ہو سکتا ہوں
عشق ہوں، حسن سے مسمار بھی ہو سکتا ہوں

الجھنیں دور بھی کر سکتا ہوں، بے شک بھی
آپ کے ذہن پہ اک بار بھی ہو سکتا ہوں

بیچنے کے لیے جو مجھ کو یہاں لائے ہیں
میں یہاں ان کا خریدار بھی ہو سکتا ہوں

میری پابندیٔ اقرار کو حتمی نہ سمجھ
میں کہ انکار میں اقرار بھی ہو سکتا ہوں

بے کسوں کے لیے بن سکتا ہوں میں ڈھال مثال
قاتلوں کے لیے تلوار بھی ہو سکتا ہوں

تذکرے سے مرے کوئی الجھائے نہ مفاد
فکر کرتے ہوئے بیمار بھی ہو سکتا ہوں

سب نے مقدور بھر رکھا ہے مجھ کو راشد
میں فن کار کا شہکار بھی ہو سکتا ہوں

OOO

رشیدہ آفریں

O

گھر یہ وحشت بھی کرنے لگے ہیں
دیوانے شہر میں بکنے لگے ہیں

کوئی طوفان نہ کوئی آہ و نالہ
مگر تنہا کھڑے ڈرنے لگے ہیں

گھلے خوف کے ہر جا ہیں رقصاں
گرد کے بگولے اڑنے لگے ہیں

غضب ان مد بھری آنکھوں میں آنسو
ستارے ٹوٹ کر گرنے لگے ہیں

ارادہ فکر سے اٹھی ہیں لہریں
تخیل میں بھنور بننے لگے ہیں

یقیں سے ہم نے در رکھیں کے ہر تو
فضاؤں میں گجر بجنے لگے ہیں

جہاں کل اصل تھی تنہائیوں کی
وہاں میلے سے اب لگنے لگے ہیں

یہ اعجاز جنوں ہے یا فسوں ہے
در دل خود بخود بجنے لگے ہیں

یہ اعجاز شعر ہے کہ آفریں کے
لبوں سے پھول سے جھڑنے لگے ہیں

OOO

اسحاق وردگ

O

عام بندہ بھی مجھے ہیں اہم ہوتا تھا
اگلے وقتوں میں محبت کا بھرم ہوتا تھا

میرے بچپن کی تصاویر بتاتی ہیں میاں
کہ مری جیب میں ہر وقت قلم ہوتا تھا

شرک کا روپ بھی وحدت کی طرح تھا ماضی!
دل کی مسجد میں فقط ایک صنم ہوتا تھا

پھول قبروں پہ ہمارے مسئلے حل ہوتے تھے
پہلے اخبار کے صفحات میں دم ہوتا تھا

زندگی پہلے تو زنداں میں رہا کرتی تھی
اک زمانے میں یہاں ذکرِ عدم ہوتا تھا

مالی چیک سے ہم بھیک نہیں لیتے تھے
تو ریاست پہ خدا ہی کا کرم ہوتا تھا

اب تو نفرت کے کئی فرقے بنے ہیں اس میں
پہلے پہلے یہ محبت کا حرم ہوتا تھا

OOO

ڈاکٹر اکرم عتیق

O

زیر و زبر ہوئی تو کبھی در بدر ہوئی
پوچھے کوئی تو کہتے ہیں اچھی بسر ہوئی

اچھا ہوا کہ آپ نے پوچھا ہمارا حال
ہم کو ہمارے حال کی یوں تو خبر ہوئی

پھر میری سمت آپ نے دیکھا پلٹ کے آنکھ
پھر آپ کی نظر ہی مری راہبر ہوئی

تنہا سفر پہ جب تو نکلا ہی تھا مگر
رستے میں تیری یاد مری ہم سفر ہوئی

مجھ کو تباہ کر نہ سکی دشمنوں کی چال
سازش تھی میرے دوست کی جو کارگر ہوئی

محفل میں جو تھے وہ بھی مصروف لوگ تھے
لیکن کوئی نہ بات وہاں مختصر ہوئی

سہمی تھی جب تو تھی وہ انداز بھی عتیق
مجروح کر کے بات مری بے اثر ہوئی

OOO

ڈاکٹر محمد رفیق خان

O

کیا جانے کہ آج کس کی محفل سے آئے ہیں
راہ وفا کی کون سی منزل سے آئے ہیں

چھوڑا ہے ہم نے راستہ اِک اِک لہو لہو
لتھڑے خاک و خوں میں مقتل سے آئے ہیں

ہیں الم الم ہو تو سزا وحشت یا
دشمن کے آج مدمقابل سے آئے ہیں

شامل ہو تم بھی قاتلوں کی لسٹ میں حضور
یہ تیر تیری آنکھ کے کاجل سے آئے ہیں

دیکھو ہمیں جو دیدۂ فطرت شناس ہو
لیلائے دل کے پردۂ محمل سے آئے ہیں

کتنی عجیب سی بات ہے ہنگام آگئی
موجوں کے سنگ شوق سے ساحل سے آئے ہیں

تیری صدائے درد کو ہے سن رہا جہاں
نالے شبِ فراق کے کبل سے آئے ہیں

حیران ہو کے دیکھتے ہو کیوں ہمیں رفیق
رنج و فراق و درد کی دلدل سے آئے ہیں

OOO

طلعت منیر

(نذرِ آئن سٹائن)

○

عجب حیرت کا اک سماں ہے
نہ یہ زمیں ہے نہ آسماں ہے

دراصل موجود کچھ نہیں ہے
نظر جو آتا ہے بس گماں ہے

یہ کیسے دھوکے میں پھنس گیا ہوں
کہ جو نہیں ہے وہی عیاں ہے

نہ جانا ابھی نظر سے اوجھل
کہ جان بیٹھا ابھی سب نہاں ہے

ہے کار سازی کی خود فریبی
کہ دسترس میں رہا کہاں ہے

حقیقتیں سب ہیں فانی دو میں
سراب دنیا میں جو جہاں ہے

OOO

سیّد ضیاء حسین

○

صدیوں کا اگر ابہام نہیں ہوتا
دنیا کے جھمیلوں کا الزام نہیں ہوتا

باتوں میں اگر تیری ابہام نہیں ہوتا
پھر ایسا کہانی کا انجام نہیں ہوتا

یہ جو بھی تماشا ہے موسم ترے اندر کا
ورنہ تو مجھے کوئی الہام نہیں ہوتا

کرتے ہو عطا مجھ کو اکثر ہو جی ہی کر
آلام تو ہوتے ہیں آرام نہیں ہوتا

ایسا تو کبھی کوئی آیا ہی نہیں لمحہ
جب دل میں قیامت سا کہرام نہیں ہوتا

پھرتی ہے گھڑی تو ہر روز امیدوں کی
مفلس کی بھی قسمت میں انعام نہیں ہوتا

تسبیح جو ہاتھوں میں اوروں کی طرح ہوتی
چپ چاپ کے گزر کرتا بدنام نہیں ہوتا

وارفتگی وحشت سے بچتے ہو تم جس کو
کچھ اور تو ہوتا ہے اسلام نہیں ہوتا

ہستی پہ ضیا میری ہے کیف بہت ہوتی
گر تجھ پہ محبت کا الزام نہیں ہوتا

OOO

عاصم بخاری

○

بڑے شہروں میں رہنے سے بڑا کوئی نہیں ہوتا
بڑائی کے لیے کچھ اور بھی درکار ہوتا ہے

تشدد روز وحشت اس کی خاطر کرنا پڑتی ہے
ترقی کا ہر اک رستہ کہاں ہموار ہوتا ہے

دل ناداں تجھے کیوں کر کبھی میری نہیں آتی
ہر اک دکھ بانٹنے والا کہاں غم خوار ہوتا ہے

یہ کیسی ہے کس لیے ہے تیری دنیا میں خداوندا
جسے بھی سمجھا جاتا ہے وہی دیوار ہوتا ہے

اگر تحریر کھلی اتنی ٹھیک ہے تو گردش میں
وفاؤں کا زمانے میں کڑا معیار ہوتا ہے

کسی کا عیب اس کا مال و دولت ڈھانپ لیتی ہے
کوئی رسوا زمانے میں سر بازار ہوتا ہے

حقیقت ماننی پڑتی ہے ہر حال اور ہر صورت
حقائق سے مگر کس کو کہاں انکار ہوتا ہے

بظاہر تو نظر آتا نہیں ایسا مگر عاصم
محبت کا ہر اک رستہ بڑا پر خار ہوتا ہے

OOO

صائمہ اسحاق

شبہ طراز

○

ہم رم اور تتلی خوشبو
پھر بھی ایک پہیلی خوشبو

سارا بن مہکا دیتی ہے
پل میں ایک اکیلی خوشبو

آنکھوں میں وہ پھر آتا ہے
جو ان کی نویلی خوشبو

پاؤں گیا دہلیز پہ رکھا
آنگن اور حویلی خوشبو

خواب کا نیند جھنک جھنک
چندا، رات، چنبیلی، خوشبو

کتنوں کے دل خون کئے ہیں
خود کتنے دکھ جھیلی خوشبو

برسوں پھول کھلیں پاؤں کی
آنکھیں، پھول، ہتھیلی، خوشبو

○○○

○

خوف مجسم آہٹ میں تبدیل ہوا
صبر جب گھبراہٹ میں تبدیل ہوا

روشن روشن آنکھوں میں چلتے اترے
گجرا شرماہٹ میں تبدیل ہوا

شوخی اور شرارت کے معنی بدلے
لو بھی پھر ترواہٹ میں تبدیل ہوا

چھوٹی چھوٹی جانے سے پہلے کلیاں
اک بھولی چہکاہٹ میں تبدیل ہوا

شوق کا موسم رنگ بدل کر پہلے تو
عادت پھر اکتاہٹ میں تبدیل ہوا

وحشی روزی کا جھگڑا ان کے بیچ چھوڑ کر
ہنسی ہی غراہٹ میں تبدیل ہوا

دھیرے دھیرے جذبوں کے چھلکے اترے
مسکاہٹ غراہٹ میں تبدیل ہوا

ننھے ننھے شکووں کو الفاظ ملے
رونا جب شکاہٹ میں تبدیل ہوا

گھڑی گھڑی جو ہاتھ سے چھوٹا مشکل کا
پل وہ جھنجلاہٹ میں تبدیل ہوا

جسم کا چولا تو تنہائی کا ساتھی
اب جا کر وہ سرسراہٹ میں تبدیل ہوا

○○○

عائشہ مسعود

○

اس حقیقت کو کہنا تو ہے دوستو
ظلم کے سورج کو ڈھلنا تو ہے دوستو

جس نے دنیا کو دہشت زدہ کر دیا
اک وہ جس سے لڑنا تو ہے دوستو

ہم کو اک دوسرے کو بچا کر سبھی
ہم کو ایک ساتھ چلنا تو ہے دوستو

دوست جو بھی گئے ان کی یادوں میں اب
اپنے اشکوں کو ملنا تو ہے دوستو

ایک امید کی شمع جلتی رہے
اور گرنا سنبھلنا تو ہے دوستو

آج کے دن کی خبریں بھی اچھی نہیں
آج کا دن بدلنا تو ہے دوستو

○○○

طاہر منظور

○

ہاتھوں میں لیے پھرتے ہیں تدبیر کا کاسہ
اُٹھتا ہی چلا جاتا ہے تقدیر کا دھاگا

اس طرح چھڑا ہے غمِ حالات کا جادو
ہاتھوں سے پھسلتا ہی گیا وقت کا دھاگا

جب بھی کسی توقیر نے کی جلوہ نمائی
ہے بیٹھا بیٹھا ہی دل بہت الجھا

اندیشہ بہت ہجر نے کوئی تھا گماں ہے
مہکا ہے ترے دم سے چمن زار تمنا

شاداں تھے مگر زہرِ جدائی کی وجہ سے
بدلی ہے شکل ہی مری صورت دیکھا

کب آؤ گے بارش میں نہانے کے لیے تم
کھلتا ہی چلا جاتا ہے ساون کا مہینہ

زیبائی و رعنائی و معصوم سی ادا میں
عالم میں نہیں تجھ سا کوئی آئینہ جیسا

تازیست یہاں سادہ مزاجی کی وجہ سے
کھایا ہے ہر اک گام پہ ہر شخص سے دھوکا

جس شہرِ تمنا میں کئی سال گزارے
اس شہر میں طاہر کا نہیں کوئی بھی تو وہ

OOO

امجد بابر

○

اک جو جشن منانے کے لیے آتے ہیں
ریت میں پھول کھلانے کے لیے آتے ہیں

جو کبھی بے کار تو آئے نہیں محفل کی جانب
ہم تجھے زخم دکھانے کے لیے آتے ہیں

باغ کے سارے پرندے مرے دروازے پہ
آخری گیت سنانے کے لیے آتے ہیں

ہجر کی راکھ اٹھاتے ہوئے دہلیز پہ ہم
دل کی خوشبو کو بہانے کے لیے آتے ہیں

عشق قصہ ہے حوالہ ہے کہ تخلیق کوئی
ہم سوالات اٹھانے کے لیے آتے ہیں

گھر کے کونے پہ پچھاوا ہے معطل آخر
لوگ اپنے بھی ٹھکانے کے لیے آتے ہیں

ہم تو برباد ہوئے ذوقِ جنوں میں بابر
آپ کیوں دل کو جلانے کے لیے آتے ہیں

OOO

جاوید عباس جاوید

○

ہوا عشق سے شہرِ خاماں تک ساتھ دیتی ہے
زمینوں کی کہانی آسماں تک ساتھ دیتی ہے

سماعت منتظر ہے، گوش بر آواز ہیں لمحے
دلوں کی بات آ کر کب زباں تک ساتھ دیتی ہے

بچھڑ جانے دیا ہے فکر مرہتی کی موجوں میں
کوئی طاقت ہے جو ان درمیاں تک ساتھ دیتی ہے

اسے رخصت کیا ہے گاؤں کے پیچ رستوں پر
اسے دیکھوں کو بچپن جہاں تک ساتھ دیتی ہے

حقیقت کا اجالا پھیلتا ہے دورِ ظلمت میں
محبت روشنی ہے، کہکشاں تک ساتھ دیتی ہے

ہوائیں سنساتی ہیں کہیں شجر پہاڑوں پر
خموشی چلتی ہے بے کراں تک ساتھ دیتی ہے

بہت سے کام کرنے کے ابھی جاوید رہتے ہیں
مگر یہ زندگانی بھی کہاں تک ساتھ دیتی ہے

OOO

انشائیہ

''میں ایک سگھڑ خاتون کا شوہر ہوں''

محمد اسلم

مردوں میں پھوہڑ پن کا ہونا اتنا عیب نہیں جتنا عورتوں میں پھوہڑ پن کا نہ ہونا۔ سلیقہ مند خواتین کی مثالیں دی جاتی ہیں تو پھوہڑ عورتوں کے قصے بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ الحمد للہ میری اہلیہ بھی ایک سگھڑ خاتون ہیں۔ گھر میں صفائی ستھرائی کے اہتمام کے علاوہ چیزوں کو ٹھکانے لگانے کی فکر اسے دامن گیر رہتی ہے اور میں اس بات کو کوئی اور رنگ دوں تو میری کم ظرفی ہو گی۔ وہ یہ سب کچھ اپنے گھر کی بہتری اور میرے اطمینان و سکون کی خاطر کرتی ہے۔ تاہم میری زندگی اس سگھڑ پن سے کیونکر متاثر ہوتی ہے اس کا فیصلہ آپ نے درج ذیل معمول کے مناظر سے کرنا ہے۔ ابتدا میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں ستر کی دہائی میں گھسٹ رہا ہوں اور پنشنر ہوں۔

پہلا منظر : گرمیوں کا موسم ہے۔ دن کے تقریباً دس بجے ہیں۔ میں چلچلاتی دھوپ میں سودا سلف لے کر گھر لوٹا ہوں۔ میری چشم تصور میں ٹھنڈا پانی اور پنکھے کی ہوا ہے۔ بیل کی آواز پر میری اہلیہ دروازہ کھولتی ہے اور سودا سلف لے کر دروازہ بند کر دیتی ہے اور تھوڑی دیر بعد مجھے کرسی تھما کر کہتی ہے "ابھی باہر بیٹھو، ماسی صفائی کر رہی ہے" اور میں "گھر کے باہر" سایہ ڈھونڈ کر بیٹھ جاتا ہوں۔

صفائی کے دوران گھر میں کرفیو کا سماں ہوتا ہے۔ اس دوران اگر میں گھر کے اندر ہوں تو احکامات کچھ یوں ہوتے ہیں:

''ماسی جھاڑو لگا رہی ہے۔ ایک طرف بیٹھ جاؤ۔'' ''ماسی ٹاکی لگا رہی ہے ادھر سے مت گزرو۔'' ''ماسی نے کمرہ جھاڑنا ہے باہر جاؤ۔'' میں واش روم جانا چاہتا ہوں اور وہ کہتی ہے "ابھی گیلا ہے۔ صبر کرو۔" صفائی کے دوران میری اہلیہ ماسی کو ہدایات جاری کرتی رہتی ہے اور اس کی نالائقیوں کی نشاندہی بھی۔ دیکھو ادھر جھاڑو نہیں لگا ــــ بیڈ کے نیچے مٹی رہتی ہے ــــ یہاں ٹاکی ٹھیک نہیں لگی ــــ وغیرہ وغیرہ۔ نتیجتاً ہر ماہ کام والی بدل جاتی ہے۔

ماسی کام کر کے چلی جاتی ہے تو مجھے اس شرط پر اندر آنے کی اجازت ملتی ہے کہ میں ننگے پاؤں داخل ہوں۔

دوسرا منظر : میں السر کا مریض ہوں اور خالی معدہ ہونے پر درد محسوس کرتا ہوں۔ جس کا مطلب ہے کہ مجھے کچھ کھانا چاہیے۔ میرے کہنے پر میری اہلیہ ایک وفا شعار ساتھی کی طرح کچن میں چپاتی بنانے جاتی ہے۔ میں اخبار کی ورق گردانی شروع کر دیتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد کمرے سے آواز لگاتا ہوں۔ "کتنی دیر ہے؟" "صبر کرو۔ بن جاتی ہے" جواب آتا ہے۔ وہ سنک میں پڑے ناشتے کے برتن دھو کر انہیں کپڑے سے خشک کر رہی ہے۔

مزید دس منٹ گزرنے کے بعد معدہ کا درد بڑھتا ہے تو میں پریشان ہو کر کہتا ہوں:

''اب لے بھی آؤ۔ کتنی دیر لگے گی؟'' ''بس لا رہی ہوں'' آواز آتی ہے۔ وہ روٹی پکانے کے بعد اوون پر گرا آٹا صاف کر رہی

ہے اور جب کچن میں ہر چیز اس کی منشا کے مطابق ٹھکانے پر پہنچ جاتی ہے تو وہ رومال لے کر کمرے میں آتی ہے اور میری ''بے صبری'' پر میری سرزنش کرتی ہے۔

''تم تو بچوں سے بھی بڑھ کر ہو۔ اتنا وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔ صبر تو تم میں ہے ہی نہیں''

تیسرا منظر : سردیوں کا موسم ہے اور مجھے نزلے نے آن گھیرا ہے۔ بخار کی وجہ سے ساری رات سو نہیں سکا۔ صبح کے آٹھ بجے ہیں اور میں بدن ڈھیلا چھوڑے، رضائی میں پڑا ہوں۔ اہلیہ کچن سے آواز لگاتی ہے۔

''اٹھ جاؤ ناشتہ لا رہی ہوں'' میں بستر چھوڑ کر واش روم جاتا ہوں۔ واپسی پر معلوم ہوتا ہے کہ محترمہ نے رضائی بستر سے اٹھا کر الماری میں رکھ دی ہے۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں اور تم نے رضائی بھی لپیٹ دی ہے'' میں شکایت کرتا ہوں۔ ''یوں بستر میں پڑے رہو گے تو اور بیمار پڑ جاؤ گے'' وہ جواب دیتی ہے۔ میں بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر بستر پر بیٹھنے لگتا ہوں تو وہ بول پڑتی ہے ''ادھر نہیں۔ صوفے پر بیٹھ کر ناشتہ کرو''

ناشتے سے فارغ ہو کر میں بستر پر لیٹنا چاہتا ہوں میرا ارادہ وہ بھانپ کر وہ کہتی ہے۔ ''ادھر ہی رہو میں نے چادر اور تکیوں کے غلاف بدلے ہیں'' اس اول بدل سے فارغ ہو کر اہلیہ کی نظر صوفے پر پڑتی ہے اور وہ چلا کر کہتی ہے۔ ''صوفہ دیوار کے ساتھ لگا دیا ہے۔ بیٹھنے سے پہلے دیکھ تو لیجئے۔ رگڑ سے دیوار پر نشان پڑ جائے گا''

میں ہڑبڑا کر اٹھ جاتا ہوں اور وہ صوفے کو دیوار سے ہٹا کر ایک معماری نظر سے اس کا جائزہ لیتی ہے اور مطمئن ہو کر کہتی ہے۔

''اب بیٹھ جاؤ''

چوتھا منظر : ہم شام کی چائے پر کہیں مدعو ہیں۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں اہلیہ کے تیار ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ میزبان کے گھر تک دس کلومیٹر کا سفر ان میں طے کرنا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور میری بے چینی بڑھ رہی ہے۔

اللہ اللہ کر کے اہلیہ کی تیاری کا مرحلہ طے ہوتا ہے لیکن واش روم سے نکلتے ہی اس کی نظر میرے سلیپرز اور بدلے ہوئے کپڑوں پر پڑتی جو میں نے صوفے پر رکھ دیئے ہیں اور وہ ''اس گھر میں سلیقہ نام کی تو کوئی چیز ہے ہی نہیں'' بڑبڑاتے ہوئے، سلیپرز اور کپڑے وارڈ روب میں رکھتی ہے۔ کمرے سے نکلتے ہوئے میرا دل دھک دھک کر رہا ہے کہ اب اس کی نظر میں کوئی اور بے ترتیبی نہ آ جائے اور میرا اندیشہ حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ اس کی نظر کچن کے سلیب پر پڑتی ہے جہاں چائے کے مگ اور پلیٹیں ناشتے کے بعد پڑے ہیں اور وہ انہیں کیبنٹ میں رکھنے لگتی ہے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے اور میں تنگ آ کر کہتا ہوں ''یہ کام واپسی پر بھی تو ہو سکتا تھا'' ''تمہیں تو ہر وقت جلدی کی پڑی رہتی ہے۔ چھپکلیاں پھرتی ہیں اور یہ برتن باہر پڑے ہیں'' وہ ٹھٹک کر جواب دیتی ہے۔

برتن سمیٹ کر وہ ویسٹ پیپر والے ٹب کا ڈھکن کھولتی ہے اور اس کے اندر سے جھانکتی ہے۔

میرا حوصلہ جواب دے رہا ہے۔ کوڑا باہر چھوڑ گئی (اس کا اشارہ ماسی کی طرف ہے جو جاتے وقت کوڑے والا شاپر چھوڑ گئی ہے) اور وہ کوڑے والا شاپر اٹھانے چل پڑتی ہے لیکن میرے صبر کا امتحان ابھی باقی ہے۔ ٹی وی لاؤنج سے نکل کر وہ گیٹ کی طرف جاتے جاتے رک کر ہاتھ کی

گیلری کی طرف نظر ڈالتی ہے جہاں، منتشر کر دیوار پر ڈالے گئے ہمسایوں کے کپڑے سوکھ کر گر پڑے ہیں اور میری اہلیہ انہیں دیوار پر ڈالنے کے لئے ادھر مڑتی ہے۔ میرا صبر جواب دے جاتا ہے اور میں تقریباً چیخ کر کہتا ہوں۔ ''خدا کے لئے اب تو بس۔'' ''مجھے گند اچھا نہیں لگتا'' وہ صحن کی یہی جواب دیتی ہے۔

پانچواں منظر : میرے پوتے (عمر 5 اور 8 سال) مکان کے پہلے طبقے پر رہتے ہیں۔ سکول سے آ کر کھانا کھاتے ہی وہ سیدھے ہمارے پاس آ جاتے ہیں۔ یہاں وہ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے بچ کر پوری آزادی محسوس کرتے ہیں۔ میری اہلیہ کے لئے جہاں ان کا آنا خوش آئند ہے وہاں ایک چیلنج بھی ہے۔ آتے ہی وہ ہمارے بیڈ پر اچھلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس اچھل کود میں دھینگا مشتی بھی ہوتی ہے اور چیخنا چلانا بھی اور تھوڑی ہی دیر بعد میری اہلیہ ان کے چلانے میں شامل ہو جاتی ہے:

''میرے خدا کا ستیاناس مار دیا ہے تم نے۔ جگہ جگہ گدے پھٹ گئے ہیں ــــ یہ چادر میں نے کل ہی بدلی تھی۔ مٹی والے پاؤں سے تباہ کر کے رکھ دی ہے۔'' اچھل کود سے تسلی کے بعد وہ کمرے میں اپنی سائیکلیں چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ادھر سے فارغ ہو کر وہ فٹ بال پکڑ لیتے ہیں اور پھر ماں کی آواز پر اپنے جوتے، فٹ بال، سائیکلیں چھوڑ کر اوپر بھاگ جاتے ہیں۔

میری اہلیہ اس ''افراتفری'' کو سمیٹتے ہوئے بڑبڑاتی ہے:

''گند ڈال کر چلے جاتے ہیں'' وہ بستر کی چادر پر پڑ جانے والی سلوٹوں کو ہاتھ سے مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتی ہے ''میرے کمرے کو انہوں نے کباڑ خانہ سمجھا ہوا ہے۔'' اور ابھی وہ اس Disorder کو پوری طرح Order میں نہیں لا سکی کہ بچے پھر سے آ گئے ہیں اور انہوں نے معمول کا ''پروگرام'' ایک بار پھر شروع کر دیا ہے۔ حسبِ معمول میری اہلیہ چلا رہی ہے اور ــــ یہ کھیل بچوں کے سونے تک جاری رہتا ہے۔

چھٹا منظر : تھوڑی ہی دیر پہلے، کچھ مہمان ہمارے گھر سے رخصت ہوئے ہیں۔ گیٹ پر انہیں ''خدا حافظ'' کہنے کے بعد میری اہلیہ مہمانوں کی واحد نشست سے بکھرے ٹکڑوں نمکو، شامی کباب وغیرہ سمیٹتی ہے۔ چائے کے برتن، چمچے، کانٹے، گلاس سنک میں لے جا کر دھوتی ہے اور انہیں سکھانے کے لئے سٹینڈ پر رکھ دیتی ہے۔ واپس ٹی وی لاؤنج میں آ کر وہ میز اور کرسیوں کو ایک طرف کھسکا کر قالین پر گرے نمکو کے دانے، بسکٹوں کے ٹکڑے اور چٹنی چلنے کے بعد وہ مہمانوں کے جوتوں کی چھوڑی ہوئی مٹی کو صاف کرنے کے لئے پورے لاؤنج میں جھاڑو لگاتی ہے۔ میں اسے اس مشقت سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن اس کے لئے اگلی صبح ماسی کے آنے تک ''گند'' برداشت کرنا مشکل ہے۔

جھاڑو لگ جاتا ہے تو وہ میز اور کرسیوں کو دوبارہ ٹھکانے لگاتی ہے۔ صوفوں کے کشن اپنی جگہ پر جماتی ہے۔ سائیڈ ٹیبل پر بڑا مصنوعی پھولوں کے گلدان کا رخ صحیح کرتی ہے۔ دیوار پر لگی میری ناچیز پینٹنگ کا رخ درست، پینٹنگز کے کونے ایک آدھ نستعلیق میز اور پیچھے کر کے رکھتی ہے اور کمر کی پرچ ایر وہ درست کرتے کرتے نڈھال ہو جاتی ہے اور رات بستر پر لیٹتے ہوئے کہتی ہے۔

''میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ کمر بستر کے ساتھ نہیں لگ رہی ــــ پیناڈال کی دو گولیاں دے دو۔''

◆◆◆

یادیں

سرنڈر

ڈاکٹر ابدال بیلا

لاہور "اواری ہوٹل" کی لابی میں "اشفاق احمد" اور "بانو قدسیہ" مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ ان کے بیٹے کا ولیمہ تھا۔ میں مفتی جی کے ساتھ ہوٹل کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ جو بھی ادیب شاعر دانشور آتا، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ سے مل کے مفتی جی کے پاس آ کے دہرا ہوا کھڑا ہو جاتا۔ ایک تو آ کے سیدھا لیٹ گیا۔ مفتی جی کے پاؤں پکڑ کے چومنے لگا۔ مفتی جی ارے ارے، کہتے ایک دم سے پاؤں سمیت کے اٹھے۔ خواتین آ آ کے جھرمٹ ڈال کے ان کے گرد کھڑی ہو گئیں۔ مفتی جی بولے، جاؤ ذرا دیکھ کے آ، امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی کو پکڑ کے لا، بڑے خوش بیٹھے ہیں دونوں۔

میں اٹھا۔

چار دن پہلے ہی اشفاق احمد صاحب کے گھر سے مفتی جی کو لے کر آیا تھا۔ شادی اور ولیمے میں تین دن کا وقفہ تھا۔ ان دنوں میری پوسٹنگ گوجرانوالا چھاؤنی میں تھی۔ ایک میڈیکل کی یونٹ کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ مفتی جی کو ساتھ لیا اور گوجرانوالا کی طرف نکلنے لگا۔ آپا بانو قدسیہ ہاتھ پکڑ کے بولیں، ابدال، دیکھو، وقت پہ مفتی جی کو لے آنا ولیمے پہ۔ "پروین عاطف" ابھی لائے تو ہمارے بابے کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔ مفتی جی ہنسے۔ کیوں؟ اغوا ہونے کا سارا سواد تم تو تمہی نے ہی لینا ہوتا۔ کسی اور کو بھی کسی کے ساتھ بھاگنے کا مزہ لینے دو۔ مفتی جی کو لے کر گوجرانوالا آتے ہوئے جی ٹی روڈ پہ دو گھنٹے کا سفر تھا۔ ایسا ہی ایک دو گھنٹے والا سفر اور بھی تھا۔ اس وقت میں امی جی کو لے کر لاہور سے گوجرانوالا آ رہا تھا۔ بھائی جان کا فون آیا تھا، امی جی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔

میں راولپنڈی ہیڈکوارٹرز میں ایک رات کا "آؤٹ پاس" لے کے نکل آیا۔ رات گئے تک سی ایم ایچ، لاہور، امی جی کے دل کے ٹیسٹ ہوتے رہے۔ ای سی جی ہوئی۔ کارڈیو گرام ہوا۔ ایکسرے ہوا۔ انھوں نے داخل کر لیا۔ آدھی رات ہو گئی۔

بھائی جان "واسا" کے ایم ڈی تھے۔ گھر چھاؤنی سے ان کا دور۔ بولے، ادھر امی جی کے پاس تم ہو؟ عرض کی، مجھے تو صبح دفتر ہونا۔ بھائی جان سوچ میں پڑ گئے۔ بولے، ادھر امی جی کے پاس کون رہے گا؟ میں نے عرض کی، اگر آپ اجازت دیں تو امی جی کو سی ایم ایچ گوجرانوالا ٹرانسفر کرا لوں۔ ساتھ لے جاتا ہوں۔ ادھر علاج جاری۔ امی جی کی بستر پہ آنکھ لگ گئی تھی۔ ڈرپ چل رہی تھی۔ بھائی جان بولے، ہو سکتا ہے یہ ٹھیک ہو بھائی جان۔ میں نے ادھر بات کی۔ انھوں نے ٹرانسفر کے کاغذات بنا دیے۔ کہنے لگے، بس گھنٹے ڈیڑھ بعد ڈرپ پھر شروع کروا دیجئے تو صرف ایمبولینس پہ لے جانے والا کیس ہے مگر تم خود ڈاکٹر ہو۔ دھیان رکھنا۔ ویسے ہو فکر نہ کریں جی۔ بھائی جان کو بھی تسلی دی۔

امی جی کو گاڑی کی اگلی سیٹ کو تھوڑا پیچھے بچھا کے لٹا دیا۔ ان کی پھر آنکھ لگ گئی۔ میں نے گاڑی ''راوی'' کے پل سے پار کی۔ ابھی شاہدرہ موڑ ہی آیا تھا کہ نیند کا ایک زوردار جھونکا آیا۔ ساری رات کھڑے کھڑے گزاری تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ گاڑی ٹھنڈی تھی۔ شیشے بند۔ سٹیرنگ سے ہاتھ پھسل گیا۔ گاڑی ڈگمگائی۔ امی جی کی طرف دیکھا۔ وہ نیند میں۔ بائیاں ہاتھ گیئر سے اٹھا کے ان کی نبض دیکھتا۔ سامنے سے آتی چنگھاڑتی۔ چکا چوند کرتی ساری روشنیوں کے اوپر آسمان کی طرف دیکھ کے بات کی۔ اللہ جی۔ پوری کھول کے بات کی۔ دیکھو اللہ جی۔ تین چوائس ہیں میرے پاس۔ آنکھوں میں پھر نیند کے جھونکے۔ ڈگمگاتے۔ جھٹکے سے آنکھ کھولوں۔ گاڑی تو روکوں۔ بولا اللہ جی۔ پہلی چوائس یہ ہے کہ گاڑی کھڑی کروں اور سو جاؤں۔ یہ تو جانتا۔ امی جی بیمار۔ دل کا عارضہ۔ ڈاکٹر نے ادھر بھیجا۔ تم نے بھی سنا۔ میں خود بھی یہ جانتا۔ تم نے ہی ڈاکٹر بنایا۔ اب میری مجبوری کے فیصلہ کرو۔ کیا سو جاؤں؟ انہیں تو اونگھ نہیں آتی۔ مجھے تو آ رہی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ گاڑی میں تیز میوزک بجا دوں۔ ''مائیکل جیکسن'' لگاؤں۔ اس شور سے آنکھیں کھلی رہیں۔ پر امی جی ساتھ۔ بیمار۔ ان کی آنکھ لگی ہوئی۔ یہ اٹھ جائیں گی۔ گاڑی پھر ہاتھ سے پھسلے۔ سامنے ایک ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اللہ جی۔ تم سے کیا چھپا؟ امی جی کے سامنے بھی سگریٹ پی لیتا۔ تھوڑی دیر آنکھیں کھلی رہتیں۔ پھر شیشے بند۔ دل کی یہ مریض۔ دھواں ان کے لیے ٹھیک نہیں۔ اب بتاؤ میں کیا کروں؟ میرے پاس کوئی اور چوائس نہیں۔ اللہ جی۔ مجھے بس اتنی سی ہوئی باتیں یاد پھر نہیں کچھ کیا ہوا؟ مریدکے سے پہلے پہلے ساری بات کر لی۔ آگے کا معلوم۔ سوا گھنٹہ۔ اچانک آنکھ کھلی تو میں امین آباد کے آگے سے گزر رہا تھا۔ امی جی اسی طرح سیٹ پہ سو رہی تھیں۔

ہاتھ سٹیرنگ پہ کپکپائے۔ گوجرانوالہ پہنچ گیا۔ سر سے پاؤں تک ٹھنڈی گاڑی میں پسینہ آ گیا۔ یہ گاڑی کون چلا رہا؟ میرا سوچتا تیرے میں سٹیرنگ پہ ہاتھ ایک کے بعد کر دوں میرے سوتے کو گاڑی بھی چلاتی آئی۔ مسکین کو سلا دیا۔ کانوں سے سیٹیاں دل دھک دھک کرتا پاگل ہو، سیدھا سی ایم ایچ گیا۔ امی جی کی ڈرپ جاری ہوگی۔ مفتی جی اب اسی سیٹ پہ بیٹھے تھے۔ حیرانی سے میری بات سن کے بولے۔ جو چھوڑ کے جو اس کے ہاتھ دے دو تو ''نا'' نہیں دیتے دیا ہم ہی کھلے ہاتھ پیر آخر تک مارتے رہتے۔ کہنے لگے۔ شہاب کہتا تھا۔ بس دو بار کوشش کرو۔ تیسری بار اس کی چلنے تم نے تو تینوں پتے کھول کے دکھا دیے۔ اس نے گاڑی تو پھر سنبھالی تھی۔ سب طرف سے ''نہ'' ہو جائے تو پھر وہ لمحہ ہوتا۔ اس لمحے لوگ مایوس ہونے لگتے۔ وہی لمحہ تو ایمان لانے والا لمحہ ہوتا۔ اسی لیے مایوسی کو کفر کہا گیا۔ وہ تو امتحان کی گھڑی ہوتی۔ شکر ہے تم نے ڈھیری نہیں ماری۔ وہ پھر کیسے ڈھیری لاتے سب کچھ کر کے آتا۔ آتا وہ اسی وقت مدد کو جب ہم سارے جتن کر ایک دو بار جتن کرنے ضروری ہیں۔ دو بار تیسری بار کے بعد تو ٹل پھر خدا کو اپنی چال چلتے وہ ہمارے حق میں چال چلے گا۔ اگر ہم نے اس کے سامنے ''سرنڈر'' کر دیا۔ وہ اپنے سامنے ہاتھ کھڑے کرنے والوں کو قید نہیں کرتا۔ قید سے رہائی دیتا۔ کبھی پھر کیا سرنڈر۔ مفتی جی پوچھتے اس وقت تو مجھے یاد نہ گوجرانوالہ سے پوسٹ ہو کے میں آرمی میڈیکل کالج راولپنڈی پھر آ گیا۔

پھر مفتی جی کے پاس۔ ابھی دونوں پتہ نہیں کدھر سے۔ کہیں باہر سے شاید ٹیور کرائی، کسی سفر میں۔ گردوں پہ سے بن گئے۔ تھوڑی سے پہلے گول گول سکن پیچ خلست کے پاس بولا سے ''وارڈن'' میں داخل ہوتے۔ ان کو ''کرائیو سرجری'' سے اڑا اس نے ایک ڈبے سے شوں شوں کرتے دھواں سلنڈر سے منسلک ہجاودے بھی ساتھ تھے تین سو ڈگری نیچے ٹھنڈی کی ہوئی ''مائع نائٹروجن'' ڈھیری کو نکالی۔ وہ شعلے کی طرح لگی، وہ ایک ایک کر کے وارٹ پہ لگاتا، وارٹ شرشر کر کے جلنے لگے۔ چند دن بعد وارٹ اترا اور پگھل گئے۔ ساتھ سفید نشان کا داغ بھی ہر

وارث پہ۔ سکن اسپیشلسٹ نے کہا یہ تھیں دوسرا طریقہ۔

ہر وارث کی "الیکٹرک" اسے ایسے چھوتے جیسے گرم "کاویا" کرکے تار پہ لگاتے۔ آگ بنا چنگاری لیے وہ ہر "وارث" پہ لگاتا۔ درد سے روح کانپتی اور چہرے کی جلد سے جلنے کا دھواں سا اٹھتا۔ ساتھ ایسی مہک آتی جیسے بکرے کی سری جلاتے ہوئے آیا کرتی۔ اک اک کرکے سینکڑوں وارٹس پہ وہ گرم نوک رکھی جاتی۔ کچھ دن ادھر کا نشان بن جاتا۔ کچھ وارٹ جل جاتے۔ ساتھ اور بھی پیدا ہوگئے۔ میں گردن پہ کارف لپیٹ کے دفتر جاتا۔ لوگ سمجھتے فیشن ایبل ہوگیا ہوں۔ ادھر سے میں ایک دن سب سے بڑے "سکن اسپیشلسٹ" کے پاس گیا۔ اسے سارے ہوئے علاج کا علم تھا۔ بولا دیکھو تم بھی ڈاکٹر ہو۔ وارٹس کا ابھی علاج دریافت ہونا ہے تم نے دیکھ لیے۔ آج تیسرا اور آخری طریقہ آزماتا ہوں۔ یہ "بلیومیسن" کو مارنے کا انجکشن ہے۔ جدھر آتی جگہ وہ اپنی ہاتھوں میں لیے مجھے اٹھائے۔ ٹیکے لگائے۔ ایک ایک وارٹ کو سوئی سے چھو کے اس کے اندر انجکشن لگاتا رہا۔ اس بار درد سب سے زیادہ۔ زبان دانتوں میں دبی ہوئی۔ اف تک نہ منہ سے نکلے۔ آنکھوں سے آنسو بہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ وہ ایک ایک سے سو پچاس کے ٹیکے لگاتا رہا۔ رات سونے لگا۔ غسل خانے میں گیا۔ آئینے میں اپنے چہرے پہ نگہ پڑی دل ڈوب گیا۔ غسل خانے کی اندر سے کنڈی لگی ہوئی میں کھڑا سجدے میں تھا۔ اللہ وہ دارا سب سے بڑا سکن اسپیشلسٹ ہے۔ اس نے کہا ان تین طریقوں کے سوا اور کوئی علاج نہیں دیکھے۔ میں اللہ کو دکھانے اللہ جی آپ کو تو آئینے کے بغیر بھی سب دکھتا۔ دیکھ۔ جگہ جگہ کالے بھدے نشان۔ جدھر جدھر ٹیکے لگا ادھر سوزش بھی اللہ سوجا سوجا تو ہے۔ مجھے جیسا بنایا۔ بندہ ویسا ہی رہنے دے۔ میں رو پڑا۔ آنسو گالوں سے پھسل کے ٹھوڑی کے نیچے کے بدنما مسوں سے لگنے لگے۔ میں آنسو پونچھے بغیر روتا رہا۔ آنکھ خواب میں دیکھا۔ دن چڑھا ہوا ساتھ والے کمرے میں دونوں بیٹوں کے کھیلنے کی آواز آرہی ہے۔ میں آواز دیتا ہوں۔

بیٹا عارث تمہارے پاس سبز پتھر بیٹا کہاں ہے۔ وہ لے میں اٹھ کے پھر آئینے کے روبرو ہوا۔ وہ سبز پتھر ٹھوڑی سے نیچے گردن پہ ملتا۔ آئینے میں وارٹ کم ہوئے گردن صاف اجلی دکھنے لگی۔ دل خوشیوں سے اچھلنا تھے میں ارن ارن کرکے کھنچی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کہ بستر پہ ہوں۔ باہر دروازے پہ گھنٹی بجے جا رہی پاؤں میں سلیپر پہنے۔ اٹھ کے باہر آیا۔ لاہور سے چھوٹا بھائی "بلال" آیا ہم لوگ اسے "گڈو بادشاہ" کہتے۔ بادشاہ تم میں خوشی سے اس سے بہت پیار۔ اس کی آنکھوں میں امی جی کی آنکھیں۔ دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگتے۔ گلے لگا کے اسے پچکارے اندر آیا۔ یار خیر تمہیں لینے اسٹیشن پہنچ صبح کی گاڑی پہ اترا تھا۔ بس بھائی جان دو دن شوق لگ گیا۔

بچے ساتھ والے اپنے کمرے میں کھیلنے لگے۔ ابا یک ناشتہ کرتے کرتے "گڈو" کی نظر میری گردن پہ پڑی۔ وہ کچھ سا چپ ہوتا کے کہنے بھائی جان یہ مجھے ایک دم خواب یاد بالکل خواب والی جیسے پہلے سے نیپ ہوئی دوبارہ پوچھا۔ بیٹا تمہارے پاس سبز پتھر کمرے سے بیٹا بولا۔ یہ میرے دل کی اک بات ہے۔ مس گڈو آنکھیں پھاڑے حیرانی سے بیٹے نے لا کے سبز پتھر میرے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ ابھی آیا۔ کہہ کے میں پھر باتھ روم میں۔ آئینے کے سامنے جا کے کھڑا ہوا۔ چہرے پہ وہی رات دیکھے سارے بھدے مسے کے میں سبز پتھر ان پہ بسم اللہ کہہ کے پھیرنے لگا۔ میری چیخیں نکلتی نکلتی رہی۔ آنکھیں ابل کے باہر۔ آئینہ جیسے کرچی کرچی ہو کے شور مچائے۔ ادھر میں نے پتھر رگڑنا شروع کیا۔ وہ چھوٹے مسے سے سارے اذیت ناک علاج برداشت کرکے تھے چپکے ہوئے بولا۔ بہ حیرت سے نشان یوں مٹنے لگے۔ جیسے کوئی پنسل سے لکھے پہ ربڑ پھیر رہا ہوں۔ جیسے خواب میں میرے ہاتھ بیچ کا پلٹ گیا ہو اور دواس صفحوں میں لیا ہو۔ گردن سب شیشے کی طرح بالکل

صاف گردن اتنی اجلی، جیسے پہلے بھی نہ تھی۔

میں نے غسل خانے میں ہی سرزمین پہ اللہ کو سجدہ کیے، پتہ سجدہ شکر کی تھا آنکھوں سے دروازہ کھول کے میں دیوانہ وار باہر گئی وہ، دیکھو۔ "اللہ بادشاہ" کا وہ بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا وہ جمعہ کا دن تھا۔ اتوار لگے دن میں سر جھکائے، بغیر عارف لگائے اس سب سے جڑے سکن سپیشلسٹ کے سامنے کھڑا اپنی قمیض کے اوپر والے بٹن کھول کے پوری گردن دکھا رہا تھا۔ وہ ہاتھ ادھر اُدھر ہلاتا ہوئے بے یقینی سے "ہری ان علاج میں نے اسے وہ سبز پتھر بھی دکھایا۔ اس پہ بس رچ اس میں "آئی وائرل" خصوصیت ہے۔ شاید یہ ہو، کینسر کا علاج اس سے نکل آئے۔ وہ سر ہلاتا جائے۔ "ہری بولا، ادھر ریسرچ کی کوئی ٹیم آ کے مطلق ہی کو جا کے ساری بات سنائی۔ وہ پھر وہی بات کرنے لگے۔ جب لاہور سے گوجرانوالہ آتے ہوئے گاڑی میں پاس بیٹھے کہہ رہے ہے بس دروازہ کھلتا ہے۔ اسی وقت، جب ہاتھ اوپر کر کے سر جھکا دیا جائے۔ اللہ کے حضور سر نذر کر دیا وہ پھر ضائع نہیں ہونے دیتا۔

◆◆◆

شاہ کا نور......شاہ نور

پرویز کلیم

فیس بک نے 5 برس پرانی ایک تصویر لگا کر سید شوکت حسین رضوی صاحب کی یاد تازہ کر دی۔ شوکت صاحب وہ صاحب تھے جنھیں صاحب کہنے کو جی چاہتا ہے کیونکہ صاحب کہلوانے اور ہونے میں بہت فرق ہے۔ آج میں ان ہی کے صاحب کی شخصیت کے حوالے سے اس لیے لکھوں گا کہ میں نے برسوں صاحب ہی کو دیکھا، سنا اور سمجھا ہے۔ سینیئر اور سینئر فلمی فنکار اور پرانے حضرات جانتے ہیں کہ چند نابالغ بچے آج کل فلمی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں اور کوئی سینئر ان کو نوٹس بھی نہیں کرتا۔ پارٹیشن سے پہلے شاہ نور سٹوڈیوز کا نام روپ کے شوری سٹوڈیوز تھا۔ ہجرت کے بعد یہ تقسیم کی آگ میں جل چکا تھا۔ سٹوڈیوز شوکت حسین صاحب کی محنت اور مادام نور جہاں کی چاہت کے نور سے شاہ نور کہلایا۔ سچ پوچھیے تو شاہ نور فلمی دنیا کا تاج محل ہے جسے گردش زمانہ نے کل کے محل کی شکل اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ یہ سٹوڈیوز تو فلم نگری کی تاریخ ہے وہ آئینہ ہے جس میں فلم نگر والے اپنا حسین ماضی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ مضمون لکھتے ہوئے میں سید شوکت حسین رضوی کو شاہ نور کے اندر والی سڑک پہ چلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ان کی جاہ و جلال میں ڈوبی گرجدار آواز میری سماعت میں گونج رہی ہے۔ یقین کیجئے شاہ جی کی ذات کا احاطہ کوئی ایک مضمون نہیں کر سکتا جو لوگ تاریخ ساز ہونے کے ساتھ خود تاریخ ہوں ان کے گرد چند حروف کا دائرہ لگا کر ان کی شخصیت کو بیان کرنا ناممکن ہے۔ شاہ جی گھڑی ساز سے فلم ایڈیٹر، فلمساز، ہدایت کار، سٹوڈیوز اونر، عمدہ ورکر صاحب، ایک رومانٹک فنکار، ایک ذمہ دار شوہر، ایک بہترین باپ، شاعر نواز، فنکار پرور جن کے دستر خوان پر فن ادب کے مارے بہت سے نام پرورش پاتے رہے ہیں شاہ نور کے در و دیوار گواہ ہیں۔

ایک مدت سعادت حسن منٹو اور جوش صاحب جیسے لوگ بھی صاحب کی دریا دلی سے مستفیض ہوتے رہے۔ لقمان میاں اور اکبر لقمان صاحب اور بیگم ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے پر وہ بھی آنکھیں بند کیے ملک عدم سدھار گئے کوئی کیا لکھے اور کتنا لکھے صاحب سے شروع کر کے صاحب تک پہنچنا دشوار ہے۔ ایک موٹی سی کتاب شاید ان کی آپ بیتی کو کسی حد تک بیان کر سکے بہر حال راقم تو نئی نسل کو شوکت صاحب سے متعارف کروانا چاہتا ہے چونکہ ہمارے یہاں فلمی معماروں کی یادوں کی تجدید مروج نہیں یہاں بھول جانا عادت ہے۔ حد تو یہ ہے کہ 1999ء میں سید شوکت حسین رضوی کا انتقال ہوا، فلم کے اس قد آور کی میت پہ اسلام آباد کلچر منسٹری سے پھولوں کا ایک گچھا بھی نہیں بھیجا گیا۔ شاید وہ لوگ جانتے ہی نہیں تھے کہ فلم نگر کا کتنا بڑا معمار اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔ پھر بھی آج راقم ارباب اختیار سے ملتمس ہے کہ فلم خاندان، زینت، عاشق، دوست اور جگنو جیسی فلمز کے خالق، لیپ کو لیپ کمار بنانے والے استاد ہدایت کار محمد رفیع کو شناخت دینے والے جوہر شناس (یہاں بندہ خاکا بے وفائی کے سوا کیا ہے) رفیع صاحب کا پہلا گیت بے بی نور جہاں کا ہاتھ پکڑ کر ملکہ ترنم کے تخت پر بٹھانے والے سید شوکت حسین رضوی مرحوم کو مکمل اعزازات سے نوازا جائے۔ یاد رہے ایسے جینوئنوں کے پاس جا کر ایوارڈز بھی معتبر

ہو جاتے ہیں۔ شاہ جی کی شادیاں، پارٹیاں، رونقیں شہر کے بچے بچے بوڑھے لوگوں کو یاد ہوں گی۔ ان کی محفلوں میں میڈم نور جہاں ان کی بیوی کی حیثیت سے بیٹھ کر فریدہ خانم کی کلاسیک غزلیں سنا کرتیں۔ شاہ جی اتنے حسین تھے کہ ـــــ ان پر زمانہ مرتا تھا ـــــ خوبصورت ترین خواتین بھی ان دنوں ملک کے شاہ جی سے عشق فرمانا اپنے لیے اعزاز سمجھتی رہی ہیں۔

شاہ جی قربت راقم کے لیے فلم کی اکیڈمی کا درجہ رکھتی تھی۔ 1968ء میں پاؤ ساحلی نامی ہدایت کار نے راقم کو شوکت صاحب سے متعارف کروایا تھا۔ محترم استاد رشید چوہدری سینما فوٹوگرافر کے پاس بطور اپرنٹس راقم کو شوکت صاحب نے رکھوایا تھا۔ دونوں بے حد تکلف تھے۔ چوہدری صاحب اور شوکت صاحب ڈسکشن کرتے تو شاگرد پیشہ لوگ فلمی علوم سے جھولیاں بھر کے گھر لوٹا کرتے تھے ـــــ ان کے دو بیٹے اکبر میاں اصغر عرف اچھو میاں یعنی ظل شاہ یہ تینوں بچے مادام نور جہاں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ شہنشاہ میاں عرف چھوٹے عرف بچو میاں جو شوکت صاحب کی زندہ تصویر ہیں یہ دونوں صاحب کی دوسری بیوی میڈم یاسمین کے یہاں پیدا ہوئے۔ آخری ایام میں شوکت صاحب کو شوگر اور دیگر بیماریوں نے آن گھیرا۔ یاسمین بیگم نے ان دنوں صاحب کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ راقم اس کا چشم دید گواہ ہے ان دنوں صاحب گھر میں بور ہو جایا کرتے تھے۔ شوکت صاحب کے ایک پرانے نمک خوار نسیم خان جو شفٹ انچارج کم منیجر بھی تھے انھوں نے یاسمین بیگم کو مشورہ دیا کہ صاحب کو مصروف کرنے کے لیے کوئی ڈومیسٹک ڈرامے کی کہانی پہ فلم شروع کرنی چاہیے وہ کرسی پہ بیٹھ کے ہدایات دیں گے کہ پاس بڑے بھاگ دوڑ کریں گے۔ میڈم یاسمین نے شوکت صاحب سے بات چیت کرنے کے بعد پروگرام طے کیا اور اب ایک نئی کہانی کی تلاش کا آغاز ہوا۔ بہت سے فلمی غیر فلمی رائٹرز سے نشست ہوئی پر صاحب مطمئن نہ ہو پائے۔ آخر کار نسیم خان نے راقم کا ذکر کیا۔ صاحب نے کہا میں نے اس کی فلم بازارِ حسن دیکھی ہے اسے بلاؤ۔ راقم ان دنوں بہت زیادہ مصروف تھا پر میں صاحب جی کے بلاوے کو اپنے لیے اعزاز سمجھ کے حاضرِ خدمت ہوا۔ بات چیت میں تین دن اور وقت کا تعین صاحب جی کے حسبِ منشا طے پایا اور روزانہ ایک بجے دوپہر سے تین بجے تک سکرپٹ کے کام کا آغاز ہو گیا۔ مصروفیات کی وجہ سے کبھی کبھار مجھے دیر ہو جاتی تو صاحب کا موڈ سخت خراب ہو جایا کرتا۔

ایک دن راقم پون گھنٹہ لیٹ تھا۔ صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے منتظر تھے جیسے ہی صاحب نے مجھے دیکھا تو بچوں کی طرح ناراضگی سے منہ پھیر لیا۔ یاسمین بیگم نے اشارے سے مجھے بتایا کہ صاحب تم سے سخت ناراض ہیں ـــــ میں چپ چاپ بیٹھ گیا اور معذرت طلب کی۔ صاحب چپ نہ رہ سکے اور بولے ہم نے خواجہ احمد عباس، مرزا وجاہت علی کے ساتھ کام کیا ہے تم کس کھیت کی مولی ہو میاں ہمیں انتظار کرواتے ہو تمہیں شرم آنی چاہیے پھر گھوم کر میری طرف دیکھا تو میرے چہرے پہ کوئی ملال نہیں تھا کچھ دیر بعد صاحب نے پھر مجھے دیکھتے ہوئے کہا میاں تمھیں برا تو نہیں لگا ہو گا۔ ہم اپنی عادت سے مجبور ہیں ہم نے آج تک کسی رائٹر کا انتظار نہیں کیا میں نے لجاجت سے بولا صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں جس کی عزت کی جائے اس کی بات کا برا نہیں منایا جاتا۔ صاحب نے اپنی گردن گھماتے ہوئے کہا آئندہ معافی نہیں ملے گی۔ چلو اب وقت ضائع کیے بغیر کام شروع کرو ابھی اس جملے کی بازگشت ختم نہ پائی تھی کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پہ دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا تو نعمان صاحب، نسیم خان عارف بھی ایک معروف اخبار کے فوٹوگرافر عاشق چوہدری پیچھے ساز و سامان اور دلیپ کمار تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ میں حیران ششدر سا خواب کی حالت جیسا کھڑا رہ گیا پھر ـــــ میں نے ایکشن ری پلے دیکھا شوکت صاحب نے صوفے پہ بیٹھے ہوئے دلیپ کمار کو دیکھ کر ویسے ہی منہ پھیر لیا جیسے مجھے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ میں نے دیکھا

دلیپ صاحب نے فرش پہ بیٹھ کے صاحب کی منک پکڑی اور بولے آپ کی ناراضگی بجا ہے میں نے پچھلی بار آپ کے سٹوڈیوز میں آنے کا وعدہ کیا ایک ناگوار واقع کی وجہ سے میں آپ سے ملے بغیر سرکاری پروٹوکول کے ساتھ واپس چلا گیا۔ آج آیا ہوں تو بغیر پروٹوکول آپ کی خدمت میں حاضر ہوں سچ پوچھیے تو جگنو سے لے کر آج تک کا وقت اذیت ہو گیا ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں بطور ہیرو کام (بلکہ آج پھر جگنو کے سیٹ پہ شوٹنگ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ یہ بھی تو نہیں بدلا اور سب کچھ بدل گیا یہ میری آنکھوں میں آج بھی وہی آنسو ہیں جو مجھے میری مسلسل ناکامیوں نے بخشے تھے۔ منظر دیدنی تھا یاسمین اور چھوٹا سے شہنشاہ و چھوٹو میاں سائرہ جی کے ساتھ صوفے کے پاس بے بسی کے عالم میں کھڑے تھے اور دلیپ کمار ـــ صاحب جی کی منک تھامے بیٹھے تھے مجھے اس دن یہ احساس ہوا کہ دلیپ کمار بننے کے لیے باادب ہونا کس قدر ضروری ہے۔ آخر کار سائرہ جی نے کہا یوسف صاحب اب بس کیجئے صوفے پر آ جائیے۔ دلیپ صاحب نے کہا یہ استاد اور شاگرد کا معاملہ ہے مت جانے دیں یہ کہہ کر دلیپ صاحب نے شوکت صاحب کی طرف دیکھا تو وہاں بھی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ دلیپ صاحب بولے معاف کیجئے صاحب غلطی ہو گئی صاحب بس پھر صاحب نے اٹھ کر دلیپ صاحب کو گلے لگا لیا اور بولے یوسف میاں ہم تم سے بہت ناراض تھے۔ تمہارا شاہ نور کو دلہن کی طرح سجا ہوا چھوڑ کے چلے جانا ـــ بہت دل دکھا تھا ہمارا ـــ دونوں کتنا رس کرتے رہے اور ـــ گجی صاحب ہر زاویے سے تصویریں بناتے رہے۔ خوش قسمت ہم نے بارہا وہ تصاویر گجی صاحب سے مانگیں انھوں نے ہر بار وعدہ کیا اور فراموش کر دیا۔ کاش ہم کوئی فلمی عورت ہوتے تو گجی صاحب اپنا وعدہ وفا کر چکے ہوتے۔ صاحب نے چائے کے دوران راقم کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا میاں یہ ہماری آخری فلم بھولی کے مصنف ہیں۔ آج ان کی بھی کلاس ہم لے چکے۔ حضور کو دیر سے آنے کی عادت ہے۔ شوکت صاحب ہم آپ کو نہیں بھولے ـــ آپ نے فلم نگر کے ابتدائی دور میں جو فنی خدمات سرانجام دیں ہیں وہ فلمی تاریخ کا عنوان ہیں یوں تو اس جہان فانی سے ایک دن سب کو چلے جانا ہے پر یاسمین بیگم کو ایک ملال ہے کہ آپ نے بحیثیت ایک باپ جن پودوں کی آبیاری کی ان کے پھل پھول آپ نہ دیکھ پائے۔ کاش شنو میاں اور چھوٹو میاں کے بچے آپ کی گود میں کھیلتے اور وہ یہ منظر دیکھ پاتیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

اللہ جی سید شوکت حسین رضوی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو ـــ آمین!

◆◆◆

ضروری اطلاع

پاکستانی روپے کی قدر کم ہونے اور ڈالر کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے رسائل کی طباعت واشاعت اور پوسٹیج کے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ "تخلیق" کے لیے استعمال ہونے والا کاغذ، سیاہی، ڈاک ٹکٹ اور دیگر اشیاء درآمدی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے جنوری 2021ء سے "تخلیق" کے ایک شمارے کی قیمت -/350 روپے اور سالانہ (ڈاک خرچ سمیت) -/1,600 روپے مقرر کی جا رہی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اہل ادب گرانی کے اس دور میں "تخلیق" کے اس اضافے کو قبول فرمائیں گے۔ ہم ان کے تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ درحقیقت "تخلیق" ان کے تعاون سے ہی چھپ رہا ہے اور سب لکھنے اور پڑھنے والے "تخلیق" کی ادارت میں شامل ہیں۔ (ادارہ)

نجیب احمد ایک خوب صورت شاعر، خوب سیرت انسان

شہباز انور خان

یہ 1980ء کے کسی مہینے کی بات ہے جب میں نے وفاقی حکومت کے ایک ادارے واپڈا آڈٹ میں ملازمت اختیار کی۔ شملہ پہاڑی کے قریب سی وی اسٹیٹ میں دفتر واقع تھا۔ یہ مرکزی دفتر تھا جو کئی بلاکس پر مشتمل تھا جہاں مختلف شعبہ جات قائم تھے۔ میری تعیناتی ایڈمن سیکشن میں ہوئی تھی اس لیے تمام سیکشن کے لوگوں سے شناسائی اور رابطہ ایک فطری بات تھی۔ میں نے اس ادارے میں کم و بیش دو ڈھائی سال کام کیا اور اس کے بعد استعفیٰ دے کر اس ادارے کو خیر باد کہہ دیا اور روزنامہ ''جنگ'' کی لاہور سے اشاعت شروع ہونے پر اس سے وابستگی اختیار کر لی۔ اپنے عرصہ ملازمت کے دوران میری جن لوگوں سے صاحب سلامت رہی اور بعض کے ساتھ دوستی بھی ہو گئی ان میں دو بھائی بھی تھے جو اسی دفتر میں بطور آڈیٹر خدمات انجام دے رہے تھے۔ دونوں عمر اور عرصہ ملازمت کے اعتبار سے مجھ سے سینئر تھے۔ بڑے بھائی کا نام محمد طفیل تھا اور چھوٹے بھائی کا نام محمد طاہر تھا۔ دونوں بھائی ہنس مکھ تھے البتہ بڑے بھائی نسبتاً کم گو تھے اور ہر ایک کے ساتھ میل ملاپ نہیں رکھتے تھے۔ ان کی رہائش نسبت روڈ پر تھی جہاں معروف شاعر خالد احمد بھی ان کے محلے دار تھے۔ محمد طفیل سگریٹ بھی خوب پیتے تھے اور چائے بھی خوب نوش جان کرتے۔ چونکہ شاعرانہ مزاج رکھتے تھے اس لیے زیادہ تر اپنے آپ ہی میں گم رہتے تھے نجیب احمد ان کا قلمی نام تھا اور دفتر سے باہر اسی نام سے معروف تھے۔ ایک ہی دفتر میں ملازمت کی وجہ سے میری ان کے ساتھ گپ شپ بھی رہتی تھی۔ پھر ادب سے رغبت بھی اس تعلق خاطر کی ایک بڑی وجہ تھی۔ دفتر سے باہر ادبی محفلوں میں بھی نجیب احمد سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ان کی دوستی خالد احمد سے تھی اور یہ دوستی ایسی کہ یک جان دو قالب تصور کیے جاتے تھے۔ یوں کہ دن کا بڑا حصہ یہ ایک ساتھ گزارتے تھے۔ خالد احمد سے میری بھی دوستی تھی۔ اس کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ وہ میرے ماموں جناب حسین شیخ کے دوستوں میں سے تھے دوسرے خالد احمد واپڈا کے پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ میں انفارمیشن آفیسر تھے۔ جبکہ اسی آفس میں میرے ایک دوست نعیم حیدر رشید ان کے کولیگ تھے۔ نعیم حیدر رشید کے چھوٹے بھائی نسیم حیدر رشید جنگ میں میرے کولیگ تھے۔ سو ان دو وجوہات کی بنا پر بھی خالد احمد سے دوستی رہی۔ میں اکثر ان کے دفتر (واقع واپڈا ہاؤس، گراؤنڈ فلور) جایا کرتا تھا اور ان کے ساتھ چائے پیتا کہ یہ ان کی مستقل آفر ہوتی تھی جس سے انکار ممکن نہ ہوتا۔ کبھی کبھی کھانا بھی کھاتے تھے۔ خالد احمد بھی بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ چنانچہ نجیب احمد اور خالد احمد کی مثالی جوڑی کی وجہ سے میری بھی دونوں کے ساتھ دوستی پروان چڑھتی گئی۔ روزنامہ ''جنگ'' کا یہ ابتدائی عرصہ تھا۔ لاہور میں ان دنوں روزنامہ ''مشرق''، ''امروز'' اور ''نوائے وقت'' عوام میں مقبول تھے۔ ان کی موجودگی میں نئے اخبار کو جگہ بنانے کے لیے بہت سے جتن کرنے پڑے۔ صفحات بھی دیگر

اخبارات کے مقابلے میں زیادہ کر دیے گئے تھے۔ ہر روز رنگین ایڈیشن شائع ہوتے صفحات بھی دیگر اخبارات کے مقابلے میں زیادہ

کر دیے گئے تھے۔ خالد احمد ان دنوں بچوں کے صفحہ کے انچارج ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ ہر روز اخبار کے دفتر آتے وہ فائل ہاتھ میں پکڑے واپڈا ہاؤس سے فراماں فراماں دفتر آتے۔ یہ دفتر ان دنوں علامہ اقبال روڈ پر جاوید منزل کے قریب کرائے کی ایک عمارت کی بالائی منزل پر قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہاں بھی ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں۔ خالد احمد سے دوستی نجیب احمد کو اس دور کے بڑے شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے قریب لے گئی۔ جو ماہنامہ ''فنون'' کے مالک و مدیر بھی تھے۔ یہ دونوں دوست روزانہ ''فنون'' کے دفتر جاتے جہاں ادبی محفل جمتی اور ادب کے ساتھ ساتھ سیاست اور سماجیات کے موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی۔ لطیفہ بازی ہوتی اور تازہ تخلیقات بھی پیش کی جاتیں۔ جن میں شہر کے بڑے بڑے ادیب، شاعر اور دانشور حصہ لیتے تھے۔ خالد احمد، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے بھائی تھے۔ یہ دونوں بہنیں قاسمی صاحب کی منہ بولی بیٹیاں اور خالد احمد منہ بولے بیٹے تھے۔ چنانچہ نجیب احمد بھی اسی نسبت سے قاسمی صاحب کے منہ بولے بیٹے کا درجہ رکھتے تھے۔ قاسمی صاحب ہی کی تربیت میں نجیب احمد کی شاعری میں نکھار آتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ وہ بھی مشاعروں کی جان تصور کیے جانے لگے۔ ادبی محفلوں میں خالد احمد اور نجیب احمد ہمیشہ اکٹھے شریک ہوتے۔ ان کی ادبی جوڑی تمام ادبی حلقوں میں مشہور و معروف جوڑی قرار دی جاتی تھی۔ تنقیدی اجلاسوں میں خالد احمد کی جملہ بازی اور فقرے بازی کمال کی ہوتی تھی۔ وہ چوٹ بھی زبردست کرتے تھے۔ نجیب احمد اگرچہ کم بولتے تھے لیکن جو فقرہ یا جملہ وہ اچھالتے تھے اس کا لطف شرکائے محفل کے ساتھ وہ بھی اٹھاتے تھے جن کو ہدف بنایا گیا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ جوڑی جس کا جانے ''بچالا'' ازادی تھی اور کسی کو بھی جوابی وار کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس جب کچھ عرصہ کے لیے بند ہوا تو یار لوگوں نے احمد ادبی بیٹھک کو ٹھکانا بنا لیا۔ یہ بیٹھک اس وقت کے گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) خالد مقبول نے قائم کی تھی۔

نجیب احمد ایک عاجزی پسند، ملنسار المزاج، درویش صفت اور بے ضرر انسان تھے۔ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے انسان بھی تھے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک خوب صورت شاعر اور خوب سیرت انسان تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ عشق و مستی میں ڈوبے ان کے نعتیہ اشعار ان کی حب نبی کی علامت ہیں۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے لیکن دوسری اصناف مثلاً حمد، نعت اور سلام میں بھی وہ یکساں کمال و مہارت رکھتے تھے۔ انہیں ''ز رملال'' پر احمد ندیم قاسمی ایوارڈ کے علاوہ خالد احمد لائف اچیومنٹ ایوارڈ دیا گیا جبکہ حکومت کی طرف سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ ان کی شاعری کی تحسین ملک کے نامور شعراء اور ناقدین فن نے بھی کی ہے۔'' ''مبادا''، ''ز رملال''، ''ازل'' اور ''گریزاں'' ان کی شاعری کے مجموعے ہیں اور ان کے تمام شعری مجموعوں نے ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کی۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے فن کے حوالے سے سہ ماہی جریدے ''کاروان'' سمیت متعدد جرائد نے ''نجیب احمد'' نمبر بھی شائع کیے جن میں ان کی شاعری کی بھرپور تحسین کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ خالد احمد کی وفات نے ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا بالکل اسی طرح جس طرح افتخار مجاز کی وفات نے مجھے ادھورے پن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ خالد احمد کی وفات نے نجیب احمد کی فکر، سوچ اور پوری زندگی پر جو اثر ڈالا تھا اس کا اظہار ان کی ان غزلوں اور نظموں میں واضح طور پر ملتا ہے جو انہوں نے اپنے دوست کی رحلت کے بعد تخلیق کیں اور ان میں تنہائی، دل شکستگی اور بے ثباتی کا نوحہ جا بجا ملتا ہے۔ خالد احمد کے انتقال کا غم انہیں اندر ہی اندر سے کھا رہا تھا یہی دکھ دل

میں لیے یہ خوب صورت شاعر اور پیارا انسان اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ نجیب احمد بلاشبہ ایک بڑے شاعر تھے لیکن افسوس ان کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ حقدار تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ وہ درویشانہ مزاج رکھتے تھے اور عمر بھر پروپیگنڈے سے گریزاں رہے۔ عین ممکن ہے مستقبل قریب ان کی شاعری کی جب صحیح طور پر تفہیم ہوگی تو ان کو بھی وہ مقام میسر آ جائے جو ان کا استحقاق ہے۔

نجیب احمد نے 75 سال کی عمر پائی اور 9 اپریل **2021**ء کو جمعۃ المبارک کو ان کا وصال ہوا اور لاہور کے مقامی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیے گئے۔ ان کی وفات سے اردو ادب ایک خوب صورت شاعر اور ملک ایک عاشقِ رسول ﷺ اور ایک خوب سیرت انسان سے محروم ہو گیا ہے۔ نجیب احمد کی شاعری سے کچھ منتخب حمدیہ، نعتیہ، غزلیہ اشعار اور چند نظمیں نمونے کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں۔

حمدیہ اشعار:

نقش آپ رواں رب کریم — کچھ تو ہو میرا نشاں رب کریم
عرش پہ ہے جہاں والوں پہ — ہو کرم، رب جہاں، رب کریم
دور کرتا ہے کسی تو، ورنہ — چوری پڑتی ہے کہاں رب کریم

نعتیہ اشعار:

تو نے وہ دیا جلا دیا ہے — ذرات کو جگمگا دیا ہے
آیا ہے جہاں بھی ذکر تیرا — قرآن بھی مسکرا دیا ہے
کوئی نہ کبھی بھٹک سکے گا — اپنا رستہ دکھا دیا ہے
آپ ﷺ کے ہاتھ نے جو بچہ تھا مدینے میں شجر — اس گھنے پیڑ کی چھاؤں مرے گھر تک آئی

غزلیہ اشعار:

ازل سے آج تک اک اک تپی نے — ہماری زندگی خیرات کی ہے
وجود ان کا ہے سورج ڈوبنے تک — یہ انساں ہیں کہ سائے جا رہے ہیں
ٹھنڈا سا ایک سانس لیا اور چل دیا — اس نے کسی سے کچھ نہ کہا اور چل دیا
آیا نہ آئینے کے مقابل تمام عمر — اپنے سوا وہ سب سے ملا اور چل دیا
پہلے تو اس نے غور سے دیکھا ادھر ادھر — پھر مجھ کو اپنے ساتھ لیا اور چل دیا
بجھانا چاہ گئی ہے رحم دیا — سو اب ہم خامشی سے جل رہے ہیں
کھلنڈرا سا کوئی بچہ ہے دریا — سمندر تک اچھلتا جا رہا ہے
نہ کچھ کہتا، نہ کچھ سنتا ہے کوئی — فقط پہلو بدلتا جا رہا ہے

ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں
ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے

تماشا ایک دن دیکھے گی دنیا
ابھی تو ہم سدھائے جا رہے ہیں

اک تری یاد گلے ایسے پڑی ہے کہ عجب
آج کا کام بھی ہم کل پہ اٹھا رکھتے ہیں

کس نے وفا کے نام سے دھوکا دیا مجھے
کس سے کہوں کہ میرا گنہگار کون ہے

سب نے گلے لگا کے گلے سے جدا کیا
پہچان ہی نہیں کہ ریاکار کون ہے

پھر یوں ہوا کہ مجھ پہ ہی دیوار گر پڑی
لیکن نہ کھل سکا پس دیوار کون ہے

ہم اپنے گھر سے بہ رنگ دعا نکلتے ہیں
کسی کے حق میں کسی کے خلاف چلتے ہیں

ترا رنگ بصیرت ہو بہو مجھ سا نکل آیا
تجھے میں کیا سمجھتا تھا مگر تو کیا نکل آیا

ذرا سا کام پڑتے ہی مزاج اک خاک زادے کا
قد و قامت میں گردوں سے بھی کچھ اونچا نکل آیا

عجب اک معجزہ اس دور میں دیکھا کہ پہلو میں
یہ بیٹھا تھا، مگر کانٹا نکل آیا

کتنے کھلونا تھے گلی کوچے
جن فصیلوں پہ چوبدار نہ تھے

تین نظمیں

(1) ''ہوا کب قید ہوتی ہے''

ہوا کب قید ہوتی ہے / الف گلی میں ہوا کب قید ہوتی ہے / سر اوراق گل احکام کندہ ہیں / تہہ محضر اسے خوشبو کی مہریں ہیں / مگر احکام کی تعمیل مشکل ہے / کہ یہ احکام اک دن کی عدالت سے نکلتے ہیں

(2) ''خواب گاہ''

غرض کی مخملی دراز چادر لپیٹ کر وہ / منافقت کے سیاہ بستر پہ سو رہی تھی / مری برہنہ نگاہ میں دست جگنوؤں کی سرخی بھی ہوئی تھی / پہاڑ سی رات ریزہ ریزہ بکھر رہی تھی

(3) ''یہ دن سورج کے ساتھی ہیں''

یہ اک دن بھی / ہر اک دن کی طرح سورج کا ساتھی ہے / کہ جب گیلی ہوا سورج ڈھلے اپنا سفر آغاز کرتی ہے / ہوا کب قید ہوتی ہے / '' کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں '' / وہ عورت تھی / مگر خود کو ابھی لڑکی سمجھتی تھی / وہ اک ماں تھی / مگر بچی کے مٹی کے کھلونوں سے بہلنے کی تمنا میں / وہ خود بھی اک کھلونا بن چکی تھی / بھول بیٹھی تھی / کھلونے صرف بچوں کی رفاقت میں مہکتے ہیں، چہچہاتے ہیں / کھلونے کھردرے ہاتھوں میں جا کر ٹوٹ جاتے ہیں / اسے سب کاش کوئی بتاتا اب

◆◆◆

طنز و مزاح

بچے کم تو خرچے کم

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

کئی لوگ بھی ایسی ایسی درفطنیاں چھوڑتے ہیں کہ بندہ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پہلے زمانے میں یہ تو رواج عام تھا کہ جہاں کسی بچے کی پیدائش کی اطلاع ملی تو وہیں خواجہ سراؤں کی ایک ٹولی اپنی ڈھولکی اور مبینہ ہم جولیوں کے ساتھ پہنچ جاتی تھیں تاہم اب ایسے منظر کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پھر بھی پچھلے دنوں ایسے ہی ایک بچے کی پیدائش والے گھر میں خواجہ سراؤں سے ملتی جلتی مخلوق نہایت انہماک اور جذبہ حق سے رقص کرتی پائی گئی تو ایک شخص دوسرے سے پوچھتا ہے۔ ''یار بڑے عرصے بعد ہم نے خواجہ سراؤں کا یہ سین دیکھا ہے۔ ویسے یہاں تو بچے کی پیدائش پر کیا خوب ڈانس کر رہے ہیں۔'' دوسرا بولا ''یار کچھ تو شرم کرو، تم تو حد ہی کرتے ہو۔۔۔'' ''کیوں کیا ہوا؟'' ''یار یہ تمھیں خواجہ سرا نظر آتے ہیں۔ یہ تو اچھے خاصے معزز اساتذہ ہیں۔ کیا ہوا کہ یہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ڈانس میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔'' ''ہائیں'' پہلے والے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''یہ اساتذہ ہیں؟'' ''جی ہاں'' دوسرا بولا ''دراصل یہ کسی نجی سکول سے آئے ہیں۔ انہیں پتہ چلا کہ یہاں کسی کے بچے کی پیدائش ہوئی ہے اور یہ یہاں پہنچ گئے ہیں۔'' ''لیکن نجی سکول تو قریب میں بہت سارے ہیں'' ''وہ تو ٹھیک ہے مگر ان کا مواصلاتی اور جاسوسی نظام سب سے تگڑا ہے۔ انہیں سب سے پہلے پتہ چل جاتا ہے۔۔۔'' ''مگر یہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟''

''بھولے بادشاہ یہ والدین کو مبارک دینے کے بعد اس بچے کی 'پلے گروپ' کی کلاس کے لئے رجسٹریشن کر لیں گے۔۔۔''

اب کی بار پہلے کے منہ سے دوبارہ 'ہائیں' نکلا۔ ویسے بھی اتنے زیادہ پرائیویٹ سکول کھل گئے ہیں کہ ان کا آپس میں مقابلہ بڑا سخت ہو گیا ہے اور پیدا شدہ نوزائیدہ بچے کو ہر کوئی سب سے پہلے رجسٹر کرنا چاہتا ہے۔

اس مقابلے کا سرکاری سکولوں پر بہت ہی گہرا اثر پڑا ہے اور ان میں داخلے کم ہو گئے ہیں۔ سرکاری اساتذہ تو یوں گھر گھر جا کر اپنے رقصانی فن کا مظاہرہ نہیں کر سکتے مگر ان بے چاروں کے لئے بھی مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ حکومت نے ہر سرکاری سکول کے لئے نئے داخلوں کا ایک ٹارگٹ رکھ دیا ہے۔ ایک ہیڈ ماسٹر بے چارہ تو روتے روتے ہم سے کہنے لگا ''سر دیکھئے ہمارے اس گاؤں میں تو اتنی پیداواری صلاحیت نہیں ہے۔'' ہم حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے تو بولے ''پیداواری صلاحیت سے میری مراد بچوں کے پیدا کرنے کی رفتار ہے۔ ہمیں حکومت نے داخلوں کا اتنا زیادہ ٹارگٹ دے دیا ہے وہ ہم کہاں سے پورا کریں۔۔۔ اوپر سے ایک اور دکھ ہے۔۔۔''

''وہ کیا؟'' ''ادھر ہمیں زیادہ سے زیادہ نئے داخلوں کا کہتی ہے اور ادھر ہماری ہی گاؤں میں خاندانی منصوبہ بندی کا دفتر بھی بنا دیا ہے جو کہتے ہیں بچے کم خوشحال گھرانا۔۔۔ یہ تو اللہ بھلا کرے ہم مسلمانوں کا جو ان کی بات پر توجہ نہیں دیتے ورنہ ہم سکول والے تو مارے جاتے۔ اتنے بچے کہاں سے ڈھونڈ لاتے۔ تاہم اب بھی اس پیداواری صلاحیت کے باوجود ہم ٹارگٹ پورا نہیں کر پا رہے۔''

ایک وہ زمانہ تھا کہ خاص طور پر دو چیزوں کے لیے بچوں کی معصومیت اور کم عمری پر رحم کھایا جاتا تھا۔ ایک سکول داخلہ اور دوسرا ختنے۔ ان دو ضروری ذمہ داریوں کی جب بات ہوتی تو والدین کہتے ''ابھی تو یہ بے چارہ اتنا معصوم ہے ابھی سے اسے سکول کیسے داخل کروا دیں۔ بچی تو اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔'' ایسا ہی حال ختنوں کو بھی موخر کیا جاتا ''کوئی بات نہیں ابھی تو اتنا چھوٹا سا تو ہے ذرا بڑا ہو جائے تو اسے مسلمان کروا دیں گے'' جب مسلمانی سے مراد اس کے ختنوں سے ہوتی ہے حالانکہ مسلمانی کی ابتدا تو تب سے ہو چکی ہوتی ہے جب اس کے دونوں کانوں میں پیدا ہوتے ہی اذان دے دی جاتی ہے۔ یوں یہ معصوم خاص طور پر دیہاتی ماحول میں سات آٹھ سال کی عمر میں بامر مجبوری سکول داخل کرا دیے جاتے۔ تب بھی جب ان کا باپ سکول داخل کروانے جا رہا ہوتا تو ماں گھر میں بیٹھی رو رہی ہوتی ''میرے معصوم بچے کو ابھی سے سکول داخل کروا دیا گیا ہے۔ جانے اس کے والد کو معصوم پہ رحم کیوں نہیں آیا۔'' ایسے میں بعض تو دوسری ضروری ذمہ داری یعنی ختنوں کے عمل کو اتنی دیر ہو جاتی کہ بعض اوقات اس کو منگنی کے وقت یاد آتا کہ اس کا وہ عمل تو ادھورا رہ گیا ہے۔

پچھلے دنوں ہمیں ایک مریضہ کہنے لگی ''ڈاکٹر صاحب اب تو ہماری بس ہو گئی ہے۔'' ہم ذرا سے مسکرائے۔ اس کے پیٹ کی طرف دیکھا جہاں سے امکانی طور پر پانچواں بچہ ایک ہفتے بعد بذریعہ اپریشن برآمد ہونے والا تھا۔ ہماری مسکراہٹ کے معانی سمجھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''نہیں ڈاکٹر صاحب آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں اس پانچویں اولاد کی وجہ سے نہیں کہہ رہی۔'' تب ہمیں ذرا شرمندگی محسوس ہوئی کہ ہم ان اور ان کے شوہر بے چارے کی جسمانی صلاحیتوں پر خیالوں میں ہی کیوں انگلی اٹھانے لگے تھے۔ ہم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا ''تو پھر کس وجہ سے بس ہو گئی ہے۔'' بولیں ''پہلے ہمارے چاروں بچے مشہور پرائیویٹ سکول میں پڑھتے ہیں۔ ان چاروں کی فیسیں اور پرائیویٹ سکول کے آئے روز نت نئے فنکشنز کے چندہ دینے سے میرے ان کی تو ساری تنخواہ ادھر چلی جاتی ہے۔ اب چار بچیوں کے بعد یہ پانچواں بیٹا پیدا ہونے چلا ہے۔ جہاں بیٹے کی آمد کی خوشی ہے وہاں معاشی طور پر ہم دونوں بہت پریشان ہیں۔''

تب ہمیں یاد آیا کہ ہمارے ایک دوست جن کی بڑی بیٹی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتی تھی اور اللہ نے بہت سالوں بعد دوسری بیٹی عنایت کی جو ابھی پرائمری میں مشہور انگریزی سکول میں پڑھتی تھی تو وہ ایک روز ہم سے ہنستے ہوئے اپنا دکھ بیان کرنے لگے ''یار یہ کیسی سرکاری میڈیکل کالج میں پڑھنے والی بیٹی کی ماہانہ فیس ادھر انگریزی سکول میں پرائمری میں پڑھنے والی بیٹی سے بہت کم ہے۔'' ہم کہنے لگے ''ہمیں تو قریہ قریہ کوچے کوچے ان پرائیویٹ سکولوں کے نمائندے یہ جاسوسی کرتے پھر رہے ہیں کہ کہاں کہاں سے عنقریب پیدائش کی خوشخبری ملنے والی ہے۔'' دوست بولا ''بھائی وہ تو پیدائش کے اندراج کے دفتر سے بھی اپنا رابطہ رکھتے ہیں۔ اور بچے کی پیدائش پر گھروں میں مبارک کے کارڈ کے ساتھ پھولوں کا تحفہ اور داخلے کا فارم بھی احتیاطاً بھیج دیتے ہیں۔'' ہم نے ایک لمبی سانس لی اور دوست سے بولے ''یار وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ ہمارا سرکاری سکول میں داخلہ مفت ہوتا تھا۔ سب امیر غریب ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔ سکول میں بیٹھنے کے لیے بوریا بھی گھر سے لے جاتے تھے تا کہ ننگے فرش پر نہ بیٹھنا پڑے۔''

دوست کہنے لگے ''یار اب اچھے سے اچھے انگریزی سکول میں بچے کو داخل کروانا ایک سٹیٹس سمبل ہو گیا ہے۔ امیر اور غریب کے بچوں میں تعلیمی فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔'' ہم ماحول میں پھیلی افسردگی کو کم کرنے کے لیے کہنے لگے ''چلیں یار اسی بہانے محکمہ بہبود آبادی کا کام آسان ہو گیا ہے۔'' ''وہ کیسے؟'' ''لوگ خود ہی بچے کم پیدا کرنے کا سوچنے لگے ہیں۔ بچے کم تو خرچے کم۔''

◆◆◆

موسیقی

اُستاد نصرت فتح علی خاں

بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکار۔ موسیقار اور قوال

.......2.......

ڈاکٹر امجد پرویز

احمد عقیل روبی۔ قلمکار: احمد عقیل روبی پاکستان کے مشہور شاعر اور قلمکار تھے۔ آپ کے لکھے ہوئے بے شمار فلمی گیت اپنے دور میں مشہور ہوئے تھے۔ آپ نے استاد نصرت فتح علی خاں پر 1992 میں ایک کتاب "نصرت فتح علی خاں۔ ایک عہد" کے عنوان سے تحریر بھی کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "عام طور پر ان لوگوں سے جو موسیقی کو ایک جزوی مشغلہ سمجھتے ہیں، سے متضاد، نصرت اوپر سے نیچے تک، چوٹی تک موسیقی کے تمام اصناف کے مکمل فنکار تھے۔ ان کا یہ عالم تھا کہ نیند لیتے ہوئے بھی ان کی انگلیاں آپس میں سُر دان کو چھوتے ہوئے حرکت میں رہتی تھیں۔ یہ ان کا عروج کمال تھا۔ وہ ہر وقت اپنی موسیقی، اپنی دُھنیں تخلیق کرنے میں گُم رہتے۔ یہی ان کی زندگی تھی۔ وہ ایک سیدھے سادے انسان تھے۔ وہ اپنی کاوشیں تخلیق کرتے اور ان کو شائقین کے آگے پیش کرتے۔ کسی کاروباری لحاظ سے غرض نہیں تھی۔ ان کے منیجر کو اکثر انہیں یہ مشورہ دینا پڑتا کہ ان کو کمرشل سائڈ کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کیونکہ کئی اور لوگ ان کی تخلیقات کو کاپی کر کے اپنا نام بنانے کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فقط اٹھارہ روپے میں چند گانے بالی وڈ کے لیے بنائے اور ان کو کوئی گلہ شکوہ نہ تھا۔ موسیقی ان کے خون میں تھی اور ان کے لیے یہی کافی تھا"۔

وجہ شہرت: مندرجہ بالا گزارشات سے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ 1990 کی دہائی میں استاد نصرت فتح علی خاں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے۔ ان کی شہرت کی ایک بڑی وجہ تھی کہ وہ 1992-93 میں امریکہ کی واشنگٹن یونیورسٹی کے ایتھنو میوزیکالوجی (Elnomusicology) ڈیپارٹمنٹ میں وزٹنگ (visiting) پروفیسر کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ اپنے کیریر (career) کے دوران ان کی درجنوں البمز، سی ڈیز (CDs) کی شکل میں منظر عام پر آئیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بین الاقوامی سطح پر کئی مغربی فلموں کے ساؤنڈ ٹریک پر بھی کام کیا تھا۔ 1990ء میں انہوں نے کینیڈا کے موسیقار مائیکل بروک (Michel Brook) کے اشتراک سے البم 'مست مست' ریلیز کی۔ دوسری البم کا نام نائٹ سانگ (Night Song) تھا جو 1996ء میں منظر عام پر آئی۔

نصرت فتح علی نے پاکستانی اور بھارتی فلموں کی موسیقی پر بھی کام کیا۔ انہوں نے بھارتی فلموں کیلئے گانے "کوئی جانے کوئی نہ جانے"، "سایہ بھی ساتھ جب چھوڑ جائے" اور "دولہے کا سہرا" گائے۔ بھارت کے جشنِ آزادی کے سلسلے میں انہوں نے گانا (Gurus of peace) امن گورو کیلئے، البم "وندے ماترم" کے لئے بھی پیش کیا تھا۔ استاد نصرت فتح علی خاں کے ہر فن مولا (versatile) ہونے پر مختلف لوگوں کی مختلف آرا ہیں۔ کچھ لوگ انہیں معیاری قوال، کچھ انہیں معیاری موسیقار گردانتے ہیں۔ چند شائقین ان کی اونچے سروں میں آواز کے باریک ہونے کو ایک خامی کہتے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ کی ذات ان پر بھی بہت مہربان تھی۔ وہ جہاں بھی گئے اندرون ملک یا بیرونی ممالک میں، انہوں نے پاکستان کا نام روشن رکھا۔

نصرت اور بالی وڈ: استاد نصرت فتح علی خاں، بھارتی شائقین موسیقی میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ خاص طور سے جب ان کی ایک پاپولر دھن "تو چیز بڑی ہے مست مست"، بھارتی موسیقار وجو شاہ نے اپنی فلم (موہرا) 1994ء کیلئے چوری کیا۔ صرف شاعری میں تھوڑا بہت ردوبدل تھا۔ اس کا مکھڑا تھا "دم مست قلندر مست مست"۔ بھارتی شائقین موسیقی نے اس چوری کو کچھ زیادہ پسند نہیں کیا کیونکہ قوالوں کا یہ گانا اور طبلہ اور تالی کا استعمال سننے والوں پر وجد طاری کرتا تھا لیکن فلم میں اس سے متضاد تاثر، رقص اور کلب (نائٹ club dancing) کا دیا گیا تھا۔ دراصل نصرت فتح علی خاں کو سب سے پہلے موسیقار خیام نے اپنی فلم "ناخدا" میں متعارف کروایا تھا۔ یہ فلم "موہرا" سے تیرہ برس پہلے بنی تھی۔ یہ تعارف کچھ زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر سکا تھا کیونکہ یہ فلم باکس آفس پر پٹ گئی تھی۔ دلچسپ بات کہ اس فلم کا ایک "حق حق علی" بین المذاہب کی تقسیم پر بنی تھا۔ جس میں ایک نوجوان اور ناخدا کا ڈائیلاگ تھا۔ نصرت نے یہ قوالی اپنے عزیز مجاہد علی کے ہمراہ پیش کی تھی اور ریکارڈ پر نصرت علی نام درج ہے۔ اس سے پیشتر نصرت فتح علی خاں نے رشی کپور اور نیتو سنگھ کی شادی پر بھی پرفارم کیا تھا۔ سو، نصرت کا پہلی مرتبہ تعارف 20 جنوری 1980ء کو ہوا تھا۔ رشی کپور نے ایک چاہنے والے کی درخواست پر tweet پر اپنی شادی کی تصویر مع استاد نصرت فتح علی خاں پوسٹ کی تھی۔ فلم ناخدا اس موقع کے ایک برس بعد ریلیز ہوئی تھی۔ لیکن نصرت "شہرت کی بلندیوں پر جب پہنچے جب وجو شاہ نے شاہی چوری (grand theft) کی۔

اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل، نصرت فتح علی خاں نے تین عدد بالی وڈ کی فلموں کیلئے، موسیقی دی تھی۔ ان فلموں کے نام تھے:

- اور پیار ہو گیا (اس فلم میں نصرت فتح علی خاں نے مقبول گیت "کوئی جانے کوئی نہ جانے" گایا تھا۔ سکرین پر وہ مالوی جوڑا بھی نظر آیا۔
- کارتوس۔ (اس فلم میں نصرت کے گانے "عشق دا رتبہ" اور "پیمانہ آنسو" تھے مع ادت۔ اس فلم کی ریلیز سے کچھ عرصہ پہلے، ان کا انتقال ہو گیا تھا)
- کچے دھاگے، یہ نصرت کی بحیثیت موسیقار آخری فلم تھی۔ یہ فلم 1999ء میں نصرت کی وفات کے دو برس بعد ریلیز ہوئی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ نصرت فتح علی کی موسیقی سے الساوی گلوکارائیں لتا منگیشکر اور آشا بھوسلے بھی مستفید ہوئیں۔ اداکار سنی دیول کی فلم "دل لگی" کیلئے ان کی آخری کمپوزیشن، "سایہ بھی ساتھ جب چھوڑ جائے" تھی۔ یہ گانا بھی 1999ء میں ریلیز کیا گیا تھا۔ فلم "دھڑکن" کے لئے نصرت نے "دولہے کا سہرا" گایا تھا۔ یہ فلم 2000ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ موسیقار اے۔ آر۔ رحمن کی البم "گوروز آف

میں" (Gurus of Peace) کیلئے استاد نصرت فتح علی خان نے اپنا آئیٹم "اللہ ہو" پیش کیا تھا۔ یہ تحفہ بھارت کی پچاس سالہ آزادی کے جشن کے موقع پر ریلیز کیا گیا تھا۔ رحمان، استاد نصرت فتح علی خان کے فن کا بہت معترف تھا۔ ان کی کمپوزیشن "تیرے بنا" بھی استاد نصرت فتح علی خان کو نذرانے کے طور پر پیش کی گئی تھی۔

نصرت کی بے وقت وفات: استاد نصرت فتح علی خان، لندن کے ایک ہسپتال میں اڑتالیس (48) برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ گردوں اور جگر کے عوارض میں مبتلا استاد نصرت فتح علی خان کو گردوں کے transplant کیلئے انگلینڈ لے جایا جا رہا تھا لیکن راستے میں کراموبل (Cromwel) ہسپتال، لندن میں دل کے دورے پڑنے پر 16، اگست 1997ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے لواحقین میں ان کا بھائی فرخ فتح علی خان اور بیوی ناہید شامل ہیں۔ ناہید، نصرت کے انکل سلامت علی خان کی دختر تھیں۔ نصرت کی شادی 1979ء میں ہوئی تھی۔ ان کی اولاد میں صرف ایک بچی ندا ہے۔ نصرت کے سیکرٹری اقبال نقیبی، انگلستان میں مقیم ہو گئے۔ اب نصرت کا نام اور کام، ان کے بھتیجے راحت فتح علی خان نے سنبھالا ہوا ہے۔ موصوف فرخ فتح علی خان عرف فرخی کے فرزند ہیں۔ بیگم ناہید نصرت فتح علی خان کی وفات اونٹاریو، کینیڈا کے (Credit Vally Hospital) Missisuga میں 2013ء میں ہوئی۔ وہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد کینیڈا منتقل ہو گئی تھیں۔

نصرت کے چند یادگار نغمے: ابھی تک وہ نسلیں نصرت کے گائے ہوئے اور ان ہی کی موسیقی میں کمپوز کئے ہوئے گیت انٹرنیٹ، کیسٹوں اور CDs میں سنتی ہیں۔ چند یادگار نغمے مندرجہ ذیل ہیں۔

- آفریں آفریں (اس نغمے کو راحت فتح علی خان نے کوک سٹوڈیو میں ری مکس کیا ہے)
- دولہے کا سہرا سہانا لگتا ہے؛ سجرا آ گیا DJ Laddi Man نے ری مکس کیا ہے۔ ◆ یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے (قوالی کے انداز میں)
- پیارے، پیارے، تیرے بن نہیں لگدا دل میرا ڈھولنا ◆ غم ہے یا خوشی ہے تو (غزل۔ ناصر کاظمی)
- اکھیاں اڈیکدیاں دل واجاں مار دا (پنجابی) ◆ تمہیں دل لگی بھول جانی
- سادگی تو ہماری مست نظروں سے اللہ بچائے ◆ ہے کہاں کا ارادہ
- کیویں مکھڑے تو نظراں ہٹاواں، سجرا آ گیا (پنجابی دوگانا) ◆ کسے دا یار نہ وچھڑے
- سانسوں کی مالا پہ سمروں میں پی کا نام ◆ بن تیرے سنا ◆ اس کرم کا کروں شکر کیسے
- وہ ہٹا رہے ہیں پردہ ◆ ایہہ جوڑا ودھا مبارک ◆ عشق دا رتبہ ◆ بے وفا سے بھی پیار ہوتا ہے
- تم اک گورکھ دھندا ہو ◆ وچھڑ ویسیاں دے ◆ اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو ◆ ساون کی بھیگی راتوں میں
- پلا دو ساقی ◆ کبھی عشق دا روگ نہ لانا چاہیئے

نصرت فتح علی کی چند مشہور ویڈیو البم کے نام ہیں۔

- مست مست ◆ The Day, The Night
- The Dawn, The Dusk ◆ راست سانگ (Night Song) ◆ ختم

ایوارڈ اور سنگِ میل کارنامے: نصرت فتح علی خان کو صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی 1987ء میں دیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کو UNESCO میوزک کا انعام 1995ء میں ملا۔ ان کو Grand Prix des Ameriques ایوارڈ سے مانٹریال فلم فیسٹیول سے نوازا گیا۔ اگست 2010ء میں ان کو CNN '20 زبردست' اور مثالی (iconic) لسٹ میں شامل کیا گیا۔ ان میں تمام اقوام کے یادبود ایک آرٹسٹ اپنی وفات کے بعد جتنا کام چھوڑ کر جاتا ہے' اپنے شائقینِ موسیقی کے لئے' اس سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کی البم Intoxicated Spirit کو 1997ء میں (Grammy) کی بہترین لوک البم کے لئے nominate کیا گیا تھا۔ اسی برس ان کی البم نائٹ سانگ بھی Grammy ایوارڈ کیلئے نامزد کیا گیا تھا لیکن انعام The Cheiftains کی البم Santiago کے حق میں گیا۔ 1995ء میں نصرت فتح علی خان نے Unesco میوزک پرائز حاصل کیا۔ 1996ء میں نصرت نے Grand Prix des Ameriques ایوارڈ مانٹریال ورلڈ فیسٹیول میں حاصل کیا۔

یہ انعام ان کی سینما کے لئے معمول سے بہت زیادہ ہٹ کر کام کرنے پر دیا گیا تھا۔ اسی برس نصرت کو آرٹس اور کلچرل ایوارڈ Fukuakoa asian Culture Prizes کی طرف سے ملا تھا۔ 2005ء میں نصرت خان کو Legends ایوارڈ' انگلستان کے ایشین میوزک ایوارڈز کی طرف سے دیا گیا۔ ٹائم میگزین نے اپنے نومبر 2006ء کے شمارہ نمبر 6 میں "ساٹھ سال کے ایشین ہیروز" کی لسٹ میں استاد نصرت فتح علی خان کو پہلے 12 ہیروز اور thinkers میں شامل کیا جو کہ پاکستانی فنکار کے لئے ایک بڑا اعزاز تھا۔ اس کے علاوہ 2006ء میں' استاد نصرت فتح علی خان NPR کی عظیم آوازوں میں شامل کئے گئے۔ اسی طرح اگست 2010ء میں وہ گزشتہ پچاس برسوں کے 20 نمائندہ ایشین موسیقی سے وابستہ فنکاروں میں شامل ہو گئے۔ 2008ء میں UGO کی بہترین گلوکاروں میں چودھویں (14th) نمبر پر گردانے گئے۔ اس کے علاوہ نصرت فتح علی خان کو اپنے 25 سالہ سفرِ موسیقی میں کئی اور اعزازات سے نوازا گیا۔

استاد کا لقب: نصرت فتح علی خان کو ان کی لاہور میں اپنے والد کی برسی پر ایک شاندار پرفارمنس کے بعد "استاد" کے لقب سے نوازا گیا۔ ان کے آبائی شہر میں آرٹس کونسل کے آڈیٹوریم کو ان کے نام سے معنون کیا گیا۔ نصرت فتح علی خان کے چند پاکستانی فلموں کو بھی اپنے فن سے مستفید کیا ہے۔

بین الاقوامی نشریاتی اداروں کی رائے: بین الاقوامی سوشل میڈیا میں استاد نصرت فتح علی خان کا کئی برس تک ڈنکا بجتا رہا۔ ان کو دنیائے موسیقی کا ایک نمائندہ (بین) آرٹسٹ (progenitor) کہا جانے لگا۔ ان کی خصوصیات میں روحانی شخصیت اور distinctive exuberence کا ہونا شامل ہیں۔ مغربی شائقینِ موسیقی کے لئے وہ ایک اصول روحانی روایت کے مالک تھے۔ یورپ میں' ان کی ان محفلوں کی متواتر اور مسلسل پرفارمنس پر وہاں کے شائقینِ موسیقی میں ایک craze چھا جائے گا۔ الیگزینڈرا اے سینو (Alexandra A. Seno) نے میگزین' ایشیاویک' میں استاد نصرت فتح علی خان کی آواز کو ایک وقتی اور' سالوں سے آخری آواز' کہا۔ 25 برسوں میں ان آواز میں 'صوفی موسیقی کا نور' نے ان کے شائقین کی نفسیات بدل ڈالی۔ اس مثبت اثر کے علاوہ' انہوں نے اپنی گائیکی میں قوالی کے انداز کو اپنایا تاکہ روحانی اثرات پھیلائے جا سکیں' خاص طور سے جب کہ ان کی نسل میں ان کا اور کوئی ہم پلہ فنکار موجود نہ تھا۔ ان کی آواز کا پھیلاؤ' ان کی جدت (improvization) اور مضبوط اثر' بلا مقابلہ بہترین تھا۔ جیف بکلے (Jeff

(Buckley) نے کہا کہ نصرت فتح علی خاں کی شخصیت اور فن نے ان کی نفسیات بدل ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ وہ میرے لئے ایلوس پریسلے (Elvis Presley) کا درجہ رکھتے تھے۔ خاص طور سے جب وہ قوالی اتنگ میں اپنے 'آلم' 'یہ جو ہلکا ہلکا سرور ہے' کے پہلے چند منٹ گزار لیتے۔ اس دور کے چند اور فنکاروں نے کہا کہ نصرت فتح علی خاں نے ان کے فن اور شخصیت پر گہرے اثر چھوڑے ہیں۔ ان فنکاروں میں' کراچی میں پیدا ہونے والی پاکستانی نژاد امریکن خاتون نادیہ علی' پیٹر گیبریل' اے۔ آر۔ رحمن' شیلا چندرا' حلیم کا سمو اور گھارزی اور روحانی علاج کے سائنس دان Sam Harris شامل ہیں۔

پال ولیمز (Paul Williams) نے 2000ء میں شائع ہونے والی کتاب' صدی کے نمایاں نغموں میں چالیس انتہائی مقبول موسیقی میں نصرت فتح علی خاں کی ایک زندہ پرفارمنس شامل کی تھی۔ پال ولیمز نے آرٹ' فلمیں' موسیقی' نثر میں فکشن' non-fiction اور سائنس فکشن شامل کی تھیں۔ اسی طرح ڈیوڈ ولک بینڈ نے نصرت فتح علی خاں کے دو ٹریک اپنی سٹوڈیو البم میں شامل کئے۔ ان کی 2002ء والی البم Joyfull Noise میں "مستی قلندر" جو کہ نصرت کے بھتیجے راحت فتح علی خان نے گائی ہیں' شامل ہیں۔ جن کے بول ہیں: صاحب تیری بندی ہاں اور گی مدنی۔ یہ medley سب سے پہلے بینڈ کی جیمز تھیمز کی زندہ (Live) پرفارمنس میں 2004ء میں شامل تھا۔ 2004ء میں ہی نصرت خاں کی موسیقی پیش کرنے کے لئے ایک قوالی پارٹی' بروک لن قوالی پارٹی' کی بنیاد ڈالی۔ اس 13 فنکاروں کے گروپ میں Jazz کے آرکسٹرا استعمال کیا جاتا ہے جو نصرت خاں کے قوال ساتھیوں کی بجائے ان کے اپنے بینڈ گروپ کے سازندے استعمال کئے جاتے رہے۔ فل سوینی (Phil Sweeny) نے اپنے مقالے The fourth tenor جو کہ اخبار The Independent میں 29۔ مارچ 1996ء میں شائع ہوا' کہا کہ انہوں نے قوالی کی صنف کو پوپ (Pop) صنف میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ پاکستانی فنکار نصرت فتح علی خاں کا نام اور کلام زیر مباحثہ رہتا ہے۔ ان کی مختلف آواز پیشتر فلمی بیک گراؤنڈ موسیقی میں نظر آتی ہے۔ یہ فلمیں ہیں:

- (Natural born Killer) پروڈیوسر: Oliver Stone
- (Dead Man Walking) پرل جیم: (Pearl Jam) کے (Eddie Veddar) کے ہمراہ دوہرا گانے۔

موسیقی کی صنف قوالی کا بنیادی مقصد' اسلام کا پھیلانا ہے۔ لیکن اسلام کے وہ عناصر جو اس خوبصورت صنف کو اسلام مذہب کے منافی سمجھتے ہیں' کے عقیدوں کے خلاف لڑا جاتا ہے۔ برصغیر میں بھی قوالی کا آغاز ہوا ہے۔ جس کے ذریعے ہم اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دیگر انبیائے کرام کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ جہاں تک کلام کا تعلق ہے' وہ صوفیانہ کلام یا حضرت امیر خسرو (تیرھویں صدی کے صوفی شاعر) سے لیا جاتا ہے۔ قوالی عموماً کھلی فضا میں پیش کی جاتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے سینکڑوں صوفیوں کے مزاروں پر ہزاروں عقیدت مند قوالی کے فن سے محظوظ ہوتے ہیں اور کئی پرستاروں پر وجد کا عالم چھا جاتا ہے۔ عموماً چند لائنیں بار بار گانے سے' شائقین قوالی وجد (trance) میں چلے جاتے ہیں۔ نصرت کلاسیکل موسیقی میں تربیت یافتہ فنکار ہیں۔ انہوں نے یہ فن اپنے والد سے سیکھا۔ انہوں نے اردو اور فارسی کے علاوہ یہ پیغام دیگر مقامی زبانوں جیسا کہ پنجابی' میں بھی پیش کیا۔ ان کی قوالی میں غیر مذہبی کلام بھی شامل ہیں۔ مگر یہ تبدیلی اور اس کے اثرات روایتی زبانوں میں زیادہ اثر انگیز دکھائی دیں۔ دراصل قوالی کے فن کے

نصرت نے World Organization اور اس کے Real World Record Lable کے ذریعے، مغرب میں متعارف ہوئی۔ 1979ء میں یورپ کے سفر کے دوران، برطانیہ میں world music میں وہ متعارف ہوئے۔ وہ برطانیہ میں اپنے فن کے حوالے سے سٹیج شوز اور محافل برپا کرنے کی غرض سے وہاں گئے تھے۔ 1983ء کے Third Womad Festival میں انہوں نے شرکت کی۔ 1990ء میں Real World سے ان کے تعاون کا آغاز ہوا۔ جہاں سب سے زیادہ ریکارڈ مغربی دنیا کیلئے پروڈیوس کی گئی۔ پاکستان میں بھی انہوں نے کئی سب سے زیادہ بکنے والی البم کے لئے کام کیا۔ ایشیائی ٹریڈ تارکین وطن کیلئے اور شعل ساز انجینئر کے CEO محمد ایوب نے بھی برمنگھم سے ان کا کام ریلیز کیا۔

پہلی Real World Release' کینیڈا کے پروڈیوسر مائیکل بروک کے ساتھ تھا، الیکٹرک گٹار (synthesizers) اور کمپیوٹر سے مستعار لئے گئے ردھم کے سازوں کا استعمال کیا۔ اسطرح ری مکس (Re-mix) قوالی "مست مست" دنیائے موسیقی میں متعارف ہوئی۔ نصرت کی آواز کی جگہ جگہ (cut and paste) تکنیک کے ذریعے استعمال کیا گیا۔ ان کی آواز کے کمرشل استعمال کا تجربہ کامیاب رہا۔ یہ البم پاکستان میں بھی ریلیز ہوئی اور اسے پوپ (Pop) قوالی کے تجربے سے دیکھا گیا۔ اس کے بعد "مست مست" کی دیگر اشکال میں heny fuzz guitar' clarinet breaks اور لڑکیوں کی آواز میں کورس کا استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد "مست مست II" ریلیز کی گئی۔ جس میں Synthetic glockenspiels' Sergio Leone Choruses' اور سکوفنک (disco funk) کے urns کا استعمال نمایاں طور پہ استعمال کیا گیا۔ ٹائٹل میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں کی گئیں کہ کاپی رائٹ کے مسئلے سے بچا جا سکے۔ اس کے بعد وہی ریئل ورلڈ ماڈل (Real World Model) کی البم' نائٹ سانگ (night song) مختلف مجموں کے گانوں پہ مشتمل ریلیز ہوئی۔ یہ قوالی کی شکل میں نہیں تھے۔ ان کے ساتھ انگریزی میں ترجمے بھی شامل تھے تاکہ مذہبی لوگوں کے اعتراضات سے بچا جا سکے۔ قوالی میں fusion کا تجربہ کتنا دیرپا ہو سکتا ہے' اس کا اندازہ لگانا ابھی قبل از وقت ہے۔ عزیز میاں قوال نے بھی لندن میں hip hop لوگوں fun-da-mental کے ساتھ شراکت کی۔ مشہور زمانہ صابری برادرز نے صرف ایک کمپوٹ کے لئے نرم میشینوں کے ساتھ تجربہ کیا تھا۔ The Real World ان کے کام کے ساتھ تبدیلیاں اور گنگنانے والا کرسپی صوفی کے مزاج کے مطابق کام کرنے کا سوچ رہی ہے تاکہ مغربی پرستاروں کی مارکیٹ کو تشکیل جا سکے۔ اس کے بعد چوتھا کام' Luciano Placido and Jose پہ کیا جا رہا ہے۔

گوادی (Guadi) اور رحمت ریکارڈنگ کمپنی کے نصرت فتح علی خاں کے گانے: 2007ء میں میوزک پروڈیوسر اور پرفارمر گوادی کو نصرت فتح علی خاں کے فن پہ' جو کہ ان کی پہلی کمپنی' رحمت ریکارڈنگ کمپنی' دسترس حاصل ہوئی۔ انہوں نے استاد نصرت کے تمام نغموں پہ مشتمل ایک البم ریلیز کی۔ یہ البم "Dub Qawwali" بہ عنوان 'Six Degrees Records' کے طور عام پہ آئی۔ کافی عرصہ تک یہ البم itunes Us Charts میں دوسرے نمبر پہ' UK میں چوتھے نمبر پہ اور Amazon.com کے الیکٹرانک میوزک سیکشن میں اول پوزیشن پہ براجمان رہی۔ اس کام کو گوادی نے BBC World Music Award-2005 کے لئے' nominate کیا۔ گوگل (Google) نے 13۔ اکتوبر 2015ء کو ان کی 67th سالگرہ کے موقع پہ جشن منایا' خاص طور سے جاپان' ہندوستان اور پاکستان کے شائقین کے لئے۔ ان کی صوفی موسیقی کو دنیا سے موسیقی میں متعارف کروانے کے لئے تھا۔

"Thanks to his legendary voice Khan
helped bring 'world music' to the world"

فروری 2016ء میں گنجی Red Hot Chilli Pappers نے 1998ء میں ایک مخصوص ریکارڈنگ Circle of the Noose کے عنوان سے جاری کردہ البم انٹرنیٹ پر ڈال دی۔ گٹار بجانے والے Dave Navarro نامی سازندے نے کہا کہ یہ ریکارڈنگ پاپ (Pop) موسیقی، شاعری، کورس، برج (bridge) اور ہک (hook) کے اعتبار سے، کی جا سکتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس البم سے بہت خوش تھا جس میں نصرت فتح علی خاں کی آواز کا 'loop' عطا کیا گیا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ وہ اس موسیقی کو کوئی موسیقی کا لیبل (label) نہیں دے سکتا کیونکہ یہ 1960ء کی دہائی کی pepped up لوک موسیقی کا 1990ء کی دہائی کی موسیقی سے ملاپ لگتا ہے۔

فلمیں اور ڈاکومنٹری: وڈیو پر مندرجہ ذیل تفصیلات درج ہیں:

- ہدایتکار Jeronse de Missolz کی البم Nusrat Fath Ali Khan: le dernier prophete (1996ء)
- 20 منٹ پر محیط ڈاکو ڈرامہ، جو کہ استاد نصرت فتح علی خاں کے ابتدائی دور کے کام کو مدنظر رکھ کر، ہدایتکار فرجاد نبی (Farjad Nabi) کی پیشکش Nusrat has left the buiding-but when?
- A voice from Heavens (1999ء)، ہدایتکار Giuseppe Asaro کی 75 منٹ دورانیے کی ڈاکومنٹری، جو کہ New York کی کمپنی Winstar TV and Radio نے VHS اور DVD کی اشکال میں نمائش پذیر ہوئی۔
- جیو ٹی وی کی ڈاکومنٹری، دورانیہ: 75 منٹ، ٹائٹل 'سحر میں مسحور'، (2007ء)
- مختصر دورانیے کی ڈان نیوز کی فلم "دی آرٹ آف قوالی" (2009ء)

کنسرٹ فلمیں: دی جے وی سی اینتھالوجی آف ورلڈ میوزک اینڈ ڈانس، والیوم 14 (ساؤتھ ایشیائی وی) ہے۔

فلمساز 'Ichikawa Katsumoi'، ہدایتکار 'Nakagawa Kunikiko' اور 'Ichihashi Yuji'

1. تعاون: National Museum of Ethnology, Osaka, Tokyo
2. JVC Victor Company of Japan, Cambridge, Massachusetts
3. Rounder Records

اس ریکارڈنگ میں سٹوڈیو پرفارمنس، خان اور پارٹی (دو اردو زبان میں گانے)، ایک حمد باری تعالیٰ اور ایک خواجہ معین الدین چشتی کی منقبت، شامل ہیں۔ اس البم کا میٹیریل، ٹوکیو، جاپان میں 20 ستمبر 1987ء میں ایشین روایتی پرفارمنگ آرٹس کے زیر اہتمام کیا گیا تھا۔

- Nusrat Live at Meany (1998ء)

یہ ریکارڈنگ، نصرت فتح علی خاں کی 23 جنوری 1993ء کی میٹی ہال، یونیورسٹی آف واشنگٹن، Seattle میں، نصرت کی ethno-musicology میں رہائش (residency) کے دوران کی گئی۔

- Live in concert in UK (DVD, Vols. 1-17, by OSA) 1983ء سے 1993ء تک کی ریکارڈنگ۔
- اکھیاں اڈیک دیاں۔ DVD۔ ٹورنٹو ریکارڈز ◆ سجن تیرے بن سجدہ۔ DVD۔ ٹورنٹو ریکارڈز
- یاداں وچھڑے سجن دیاں آئیاں۔ DVD۔ ٹورنٹو ریکارڈز ◆ رنگ نصرت (DVD-Vols. 1-11) میوزک ٹوڈے
- OSA- آڈیو ٹیپ' VHS 'Vols. 1-21 ◆ 'Luxor Cinema' برمنگھم (VHS, Vol. 1, 1979)
- Digbeth Birmingham (VHS, Vol. 2, 1983)
- 'St. Francis Hall' برمنگھم (VHS, Vol. 3, 1983)
- رائل اوک' برمنگھم (Royal Oak) '(VHS, Vol. 4, 1983)
- پرائیویٹ محفل' ('Wallace Lawley Center, Lozells) برمنگھم۔ نومبر 1983 (VHS Vol. 5)
- پرائیویٹ محفل (VHS Vol. 6 1983) ◆ اے مارچ سینما لیسٹر (Leicester) (VHS, Vol.07, 1983)
- ساؤتھ ہال (Live in South hall)' (VHS, Vol.8)
- بریڈفورڈ (Live In Bradford) (VHS, Vol.9, 1983)
- برمنگھم (Live In Birmingham)' (VHS, Vol. 10, 1985)
- ٹاؤن ہال (VHS, Vol. 11, 1985) ◆ 'Harrow Leisure Center (VHS, Vol. 12, 1985)
- یونیورسٹی آف ایسٹن (Aston) (VHS, Vol. 13-14, 1988)
- WOMAD فیسٹیول' 'Bracknell (VHS, Vol.15, 1988)
- پیرس (Live in Paris) (VHS, Vol. 16, 1988)
- 'Poplar Civic Center' لندن (VHS, Vol. 17)
- امپیریل ہوٹل' برمنگھم (VHS, Vol. 18, 1985)
- گوردوارہ (Slough Gurdowara)' 'SHABDS (VHS, Vol.19)
- عمران خان کینسر ہسپتال (VHS, Vol. 20) ◆ ٹاؤن ہال' برمنگھم (VHS, Vol. 21, 1993)

مزید مطالعہ: 'Natural Mystics Verum Soni
'Figuerora Press (The Prophetic Lives of Bob Marley and Nusrat Fateh Ali Khan)
مذہبی رنگ اور فنکار کی زندگی اور انہوں نے کس طرح ٹیکنالوجی کو استعمال کیا۔ (ختم شد)

ادارہ تخلیق: محترم ڈاکٹر امجد پرویز کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اتنی اعلیٰ تحریر ماہنامہ ''تخلیق'' کے قارئین کے لئے لکھی۔ ادارہ ''تخلیق'' اور اس کے تمام قارئین کی طرف سے انہیں ایسی عمدہ تحریر رقم کرنے پر دلی مبارک باد جو کہ ہمیشہ کے لئے ادارہ ''تخلیق'' کے ریکارڈ پر آ گئی۔

◆◆◆

پنجاب رنگ

بشریٰ رحمٰن

مکے دی چاہ؟

سچیاں گھڑیاں، گھڑیاں دہاڑاں!
نصیب جاگے، میں مکے جاواں!
طواف کردی، کعبے دے تھاں
میں کردی جاواں، میں مردی جاواں!
کدی اسے چھپے، گراں دوجے
میں جھجکدی جاواں، میں لبھدی آواں!
مقام ہے ابراہیم آوے
نفل پڑھاں تے مراد پاواں
حطیم وچ نے دیہہ کے جاوے
میں ٹھنڈیاں نال وضواں تھاواں
میں حجرِ اسود نوں رج کے چماں
تے رنگ دل دے سکے ملاواں
میں ملتزم دا پکڑ کے کونا
میں اپنے رب نوں پئی پکاراں
میں کالے پردے دا پلہ پھڑ کے
نظر بچا کے تے بیٹھ جاواں
میں آبِ زم زم دے گھٹ بھر کے
پیاسی تن من دی اگ بجھاواں
کدی ستوناں نوں چمدی جاواں
حرم دی مٹی نوں متھے لاواں
سویرے ویلے میں سجدے اُٹھاں
تے رات ساری میں رو گزاراں!

OOO

بشریٰ رحمٰن

پنجابی غزل

کیہ جاناں میں عشق دی بازی کیہ جاناں میں کھیڈے کون؟
گل رانجھن تخت ہزارے دی اے آ کے ویکھے کون؟

اوہ ویکھیں جے پتہ نہیں کیوں لوکاں نوں عشق جیہا لگے
چاہواں دا دل روندا جیہڑے چار چفیرے کون؟

اکھیاں روشن، اکھیاں پیاسیاں، سارا جگ اکھیاں دا
اکھیاں دے وچ اوہدا ہی سجے، اکھ دے ویکھے کون؟

لیکاں لیکاں لیکاں اونہاں عشق دے دیوے بال گئے
دل دا حال اوہدے کول تے اجے عشق سمجھے کون؟

ساہواں کتاباں دے پڑھیاں، ہن ساہواں ہون لگے جیہڑے
پیر پئی اک گل ای آکھاں، دے اندر روکے کون؟

انہاں راہواں دے کے نے جاڑے، اوہناں نے لیکاں رنگیاں میں
اج لیکاں نوں ویکھے، بشریٰ دی آکھے کون؟

OOO

سلیم شہزاد

سورج ڈُنگ رَین

کاواں ساتھی
پوری گئی
ڈوہاں لگے دین
اُٹھن جھوکی
کجلے پوّے
ویلے ڈھلے
کیں
نکے آ کے تریاں ویاں
ہنیری چھائی کیں
ہوئی مٹی
اُتوں اُتوں
بجھے
سورج ڈگی رَین

نظم

کوئی گل دی
ہوئی کندھے
ٹھنڈی ہوا دی
بوہے مولے
شہر بند اے
ہر کسے دے ہوئی گلیاں ٹھیکریاں
واہی گل دی
ٹھپّی پوے
ہوئی بچیاں مولے

OOO

تجزیہ و جائزے

میرا عقیدہ تشکیک کی زد پر ہے

شہزاد نیّر

نظم: جواز جعفری

جدید اردو نظم کو معانی کی ترسیل کے لیے استعارہ اور علامت مرغوب ہیں۔ نئی نظم راست بیانیہ اور اکہرے معنی سے گریز کرتے ہوئے تہ داری اور کثیر المعنویت کا اہتمام کرتی ہے۔ کہیں کہیں نئی نظم میں ایسی پیچیدہ امیجری اور مبہم علامتیت بھی نظر آتی ہے جو نظم کو چیستان بنا دیتی ہے۔ ایسی گنجلک نظم سے جمالیاتی حظ تو دور کنار، مفہوم بھی ہاتھ نہیں آتا۔ ظاہر ہے قاری پر ''خلقتِ معانی'' کا بوجھ ایک حد تک ہی ڈالا جا سکتا ہے۔ متن کو خود بھی ابلاغ و ترسیل کی ذمہ داری اٹھانی ہوتی ہے۔

بہت سی نئی نظمیں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے، مناسب تخلیقی ابہام رکھ کر اپنی بات کہتی ہیں۔ جواز جعفری کی نظم بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ تشبیہ و استعارے اور علامت و تمثیل کا استعمال تو کرتے ہیں لیکن نظم کی ابلاغیات کو مقدم رکھ کر۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم قاری سے مکالمہ کرتے ہوئے قدم بقدم اس کے ساتھ چلتی ہے، اجنبی کی طرح پاس سے نہیں گزر جاتی۔

زیرِ تجزیہ غیر عروضی نظم کا پہلا حصہ سات سطروں پر مشتمل ہے:

وہ اجنبی / رات کے آخری پہر / میری خاک پر آ اترے / اور اپنی تلواریں / میرے پہلو میں گاڑ دیں / میرے پہلو
میں بہتے چناب کا چہرہ سیاہ ہو گیا!

یہ سات سطریں ایک کہانی سناتی ہیں۔ کسی سرزمین پر اجنبی دشمن کی آمد، قتل، جنگ کی تباہ کاری جسے شاعر نے چناب کا چہرہ سیاہ ہونے کے شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اسم معرفہ ''چناب'' استعمال کر کے شاعر نے اس واقعے کو ایک خاص جغرافیے (پاکستان اور کشمیر) سے جوڑ دیا۔ اب ان سات سطروں میں تاریخ کا ہر حملہ آور سما گیا ہے۔ چناب کی جگہ دریائے اردن رکھ لیں یا دریائے دجلہ۔ اگر چناب اور پنجاب کی بات کریں تو وہ شمال سے درۂ خیبر عبور کر کے آنے والے متعدد غارت گر ہوں یا سمندر پار کر کے آنے والے فرنگی، وہ طالبان دہشت گرد ہوں یا ایبٹ آباد میں رات کو اترنے والے اجنبی، یہ سات سطریں شب خون مارنے والے ہر حملہ آور کی سفاکی کا قصہ ہیں۔

کیا میں اس لیے زندہ ہوں کہ غیر فطری موت مجھ پر دسترس حاصل کر لے؟
میری آنکھ کنارے پڑا خوشحال دنیا کا خواب دریائے گریہ کی زد پر ہے

اس حصے میں شاعر نے جنگ اور جنگی ماحول کے خلاف بھرپور شاعرانہ آواز اٹھائی ہے۔ جنگ و جدال قطعی غیر فطری انداز میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی دردناک موت کا سبب بنتے ہیں۔ اسے شاعر نے ''غیر فطری موت کی دسترس'' سے تعبیر کیا ہے۔ اجل کی اس

یہیں سے شاعر کا خواب "گریہ زدہ" ہو جاتا ہے۔ خواب جو متبادل دنیا دے سکتا ہے۔

متبادل دنیا جس میں جنگوں کی ہولناکی نہ ہو۔

پہلی دو سطروں کا استفہام ایک نیا سوال بن کر سامنے آتا ہے۔

کیا میری زندگی کا یہی مقصد ہے کہ میں جنگ میں مارا جاؤں؟

اب اس کا کیا کیجیے کہ ہزاروں سال سے الہیاتی اور غیر الہیاتی متون جنگ میں قتل کرنے اور قتل ہونے کو مقدس عمل کہتے چلے آئے ہیں بلکہ وہ پیکار میں مرنے کو زندگی کا اعلیٰ و ارفع مقصد گردانتے ہیں۔ ایسی موت کے لیے انہوں نے ایسے خوش نما الفاظ وضع کر رکھے ہیں کہ ہر کوئی اس موت کی تمنا کرے۔ یونانی اساطیر ہوں یا عہد نامہ قدیم (دیکھیے باب خروج) مہابھارت یا پھر بعد کے ادوار میں آنے والے مذہبی متون، سب نے جدال، قتال، پیکار، جہاد اور جنگ کو اپنے اپنے "مقدس" مقاصد کے حصول کا قابلِ تحسین و آفرین ذریعہ بتایا ہے۔ اپنی ایک کتاب کے پیش لفظ میں جواد جعفری نے لکھا ہے "جب تک جنگجویانہ ذہنیت اور مہلک ہتھیار زمین پر موجود ہیں، جنگ نہیں رک سکتی"۔ مجھے لگتا ہے جب تک ذہنوں میں حق و باطل کے جھگڑے پالنے موجود ہیں، جنگ نہیں رک سکتی۔ ایسے ہی جیسے "جب تک باورچی خانے میں چھری موجود ہے قتل کا امکان موجود ہے۔"

تو کیا واقعی مکمل امن ناممکن ہے؟

شاعری سے پوچھتے ہیں۔ کہنے کو تو شاعر امن کے گیت گانے والے ہوتے ہیں لیکن شاعری جنگی رجز، ترانے، واریں اور حماسے لکھتے رہے ہیں جن میں دلیری اور شجاعت کے پردے میں قتل و غارت کے قصیدے درج ہیں۔ اب وہ ہومر ہو، عمرو بن کلثوم ہو یا میر انیس، سب نے جنگ برپا کرنے، ابھارنے کے علاوہ دشمنوں کے پشتے لگانے کو دلیرانہ مستحسن عمل سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں نظم کے عنوان پر غور لازم ہے۔ "میرا عقیدہ تشکیک کی زد پر ہے"۔ کیسے نہ ہو۔ جب قریہ قریہ عبادت گاہوں میں "مقدس" جنگوں کا احوال یوں بیان ہو کہ "اہلِ حق" کی تلواریں منکر سروں کو اڑاتی صاف نظر آئیں ایسے میں جنگجویانہ ذہنیت ضرور پنپے گی۔ جنگ مخالف، امن پسند انسان کا عقیدہ ضرور تشکیک کی زد پر آئے گا۔

تاریخ میں یہی تو ہوتا آیا ہے۔ "ہماری" جنگ منصفانہ اور جائز جب کہ "ان" کی جنگ ظلم، تعدی اور عدوان ہے۔ ویت نام پر برستے امریکی بموں کا نوحہ پڑھنے والے لوگ، پیپل گوریا اور سٹالن کی خونخوار جنگی کارروائیوں کو مبنی برحق سمجھتے ہیں۔ صلیبیوں کی غارت گری پر لعن طعن کرنے والے، فتح قسطنطنیہ پر شادیانے بجاتے ہیں۔ حقیقی امن پسند اور خالص جنگ مخالف انسان بنانا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ "ان جنگوں کا کیا کریں جو بقول شخصے حق و صداقت کا بول بالا کرنے یا پھر مظلوم انسانیت کو مظالم سے نجات دلانے کے لیے مسلط کی گئیں؟" اکیسویں صدی کے "باشعور" انسانوں نے تاریخی جنگوں کے فاتح سپہ سالاروں میں سے اپنے اپنے ہم عقیدہ ہیرو چن لیے ہیں۔ ایک میزائل کا نام پرتھوی (راج چوہان) ہے تو دوسرے کا (سلطان محمود) غزنوی۔

کیا تاریخ کا انہدام ممکن ہے؟ کیا واقعی مکمل امن ناممکن ہے؟

اسلم سراج الدین کہا کرتے تھے: "دس ہزار سالہ معلوم انسانی تاریخ دراصل انسان کی قوس ریزی کی تاریخ ہے"۔ مجھے لگتا ہے کہ

انسان ماضی میں جیسا رہا ہے اگر وہ ویسا ہی مستقبل میں رہا تو جنگیں ہوتی رہیں گی۔ کوئی اساسی حیاتیاتی کیمیائی تبدیلی (Fundamental Biochemical Change) آئے تو ممکن ہے انسان جنگ سے باز آ جائے۔

میرے راستے مسدود کر دیے گئے / میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے / جس پر موت کا پہرہ ہے!

جواز جعفری کی مندرجہ بالا لائنیں اُس فکری المیے کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کا سامنا ہر مطلق امن پسند اور خالص جنگ مخالف فرد کو ہے۔ امن پر یلغار کرتی شمشیری داستانیں، رگوں میں جنگی جنون دوڑاتے بارودی ترانے، قتل کرنے اور مرنے پر اکساتے آ جاتی رہی ہیں۔ تہذیبوں کے تصادم کو برانی قوتوں کی تو اولیٰ فراہم کرتی تحریریں، انسان پر عقیدے کو مقدم ٹھہراتی تحریریں، قتلِ انسانی پر جشن مناتے لوگ — شاعر کو یوں لگتا ہے امن و حیات کے سب راستے مسدود ہیں۔ صرف موت کا راستہ کھلا ہے۔ شاعر نے اختصار کے جادو سے کم لفظوں میں زیادہ معانی بھر دیے ہیں۔ شاعر کہتا ہے میں کشت و خون سے جتنا بچتا ہوں، یہ اتنا ہی میرے سامنے آتا ہے۔ شاعر فطری زندگی کے راستے چل کر فطری موت سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے نہ کہ تلوار کی دھار اس کی حیات کی راہ قطع کرے۔ دوسری طرف جنگ پسند قوتیں اس کی امن پسند زندگی کو دھکیل کر موت کے راستے پر لے جا رہی ہیں۔

نظم کی اگلی سطریں بھی اسی مضمون کو آگے بڑھاتی ہیں:

میں زندگی کی تلاش میں ہوں / کہ روشنی سے ہاتھ ملا سکوں / وہ سورج کے لیے زندان تعمیر کر رہے ہیں!

روشنی کا استعارہ وضاحت و صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ روشنی زندگی ہے جس کی شاعر کو تلاش ہے لیکن "وہ" (اسلحہ ساز و اسلحہ فروش) امن کی روشنی کو قید کر کے تباہی کا اندھیرا پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے نہایت تخلیقی انداز میں نظم نگار نے سورج کے لیے زندان تعمیر کرنے کا استعارہ برتا ہے۔

ہمارے حصے کے کھیت / ہتھیا لیے گئے!

ہتھیار کی قوت سے علاقے فتح کرنے اور ذرائع پیداوار اپنے قبضے میں لینے کے عمل کو بھی اندھیرا پھیلانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ یہاں "ہتھیا" کے لفظ میں "ہتھیار" صاف دکھائی دیتا ہے۔ کھیت کو پیداوار کا استعارہ بنا کر استعمال کرنا دلکش شاعرانہ اختراع ہے۔

ہماری وراثت میں صرف عقیدہ رہ گیا ہے / جو تکنیک کی زد پر ہے!!

عالمی اقتصادی استحصالی قوتوں نے ہماری معاشی آزادی چھین کر ایک تکنیک زدہ عقیدہ ہمارے پاس رہنے دیا ہے (عقیدہ، مذہب کے مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے)۔ واقعہ یہ ہے کہ سب عقیدے نئے انسان کے سوالوں کا جواب نہیں دے پا رہے۔ ایسے میں امن کو عزیز رکھنے اور خون ریزی کو برا جاننے والا انسان عجیب تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ تذبذب سے جواز جعفری نے "تکنیک" کے نہایت مناسب لفظ سے نشان زد کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جواز جعفری کی یہ نظم اپنے تخلیقی بیانیے، کثیر المعنویت استعاروں اور علامتوں کے مربوط نظام کے باعث اہم ہے۔ نظم میں وہ شعری دل کشی موجود ہے جو قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے۔ شعری آہنگ، سطروں کا بہاؤ اور لفظی حسن کاری اضافی خوبیاں ہیں۔ یہ نظم چند اہم سوال وضع کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ان سوالوں کا تعلق ہمارے عہد کے جنگی بیانیوں کی غارت پسندی، امن کے

موضوع پر قدیم متون کے تضادات اور آج کے انسان کی امن پسندی کو لاحق فکری خطرات سے ہے۔

کیا کبھی یہ الجھاؤ سلجھ سکے گا؟ کیا ہم تصادم، دہشت گردی، غارت گری اور قتلِ انسانی کے ہر سانحے کو ایک جیسی نفرت سے دیکھ سکیں گے؟ کیا ہم جنگ کو جنگ کا جواز بنا کر پیش کرتے رہیں گے؟ کیا ہم گذشتہ و موجود دور کی ہر خوں ریزی سے یکساں اور مطلق نفرت کر سکیں گے؟ کیا ایسا ہو گا کہ ہم گولہ بارود کے حصول اور مہلک جنگی ایجادات پر فوقیت نہ دیں؟ اور آخری سوال ـــ کیا ایسا ہو گا کہ ہم حق و باطل کے اپنے پیمانے سے جانچ کر جنگوں کو مقدس و منصفانہ قرار نہ دیں؟

ایسا شاید نہ ہو سکے گا کیونکہ دوسری طرف بھی ہم جیسے لوگ ہیں وہ اپنے جنگ بازوں کو ہیرو قرار دیتے ہیں۔ ان کے اپنے خیر و شر ہیں اور اپنا حق و انصاف۔ ہماری طرح ان کے بھی عقائد ہیں اور مفادات بھی۔ ان کا اپنا سچ ہے جو ہمارے لیے شاید جھوٹ ہو۔ ایسے ہی ہمارا سچ ان کے لیے جھوٹ ہے۔ یہاں تو صورت یہ ہے۔ "خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد" کہنے والا اپنی طرف والوں سے کہتا ہے "کتنے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت"۔ نظم "میرا عقیدہ تشکیک کی زد پہ ہے" دراصل ایسے ہی فکری سوالات ابھارتی ہے جن کے جواب میں شاید امن کا امکان واضح ہے۔ جب تک نفرت اور تقسیم کی جڑیں نہیں کاٹی جاتی، جنگ کا درخت پھلتا پھولتا رہے گا۔ جب تک کثرت کو وحدت میں پیوند کر کے نہ دیکھا جائے، اکائی کی مالا کے دانے بکھرے ہی رہیں گے۔ جب تک ہم خوں پسند نظریوں سے جڑے رہیں گے، ہماری آنکھوں میں خون اترا رہے گا۔ جب تک معاشی مفادات اور سیاسی چالبازیاں مذہب و وطن کے نام پر ہمیں خون بہانے کی ترغیب دیتی رہیں گی، جنگیں ہوتی رہیں گی۔

ایسے میں ساحر لدھیانوی کی آواز ہمیں امن یاد دلاتی رہے گی۔

خون اپنا ہو یا پرایا ہو　　نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں　　امنِ عالم کا خون ہے آخر

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے　　جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی　　بھوک اور احتیاج کل دے گی

جنگ سرمائے کے تسلط سے　　امن جمہور کی خوشی کے لیے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف　　امن پر امن زندگی کے لیے

◆◆◆

اگر کوئی کسی کے تخیل میں آ جائے لیکن زندگی میں نہ آئے تو کیا تمہارا خیال ہے وہ گھر ایک بسا ہوا گھر رہ جاتا ہے؟ شاید نہیں۔ آنکھیں بند کر کے جب کوئی عورت کسی اور کا چہرہ یاد کرتی ہو لیکن آنکھیں کھول کر کسی دوسرے کا مقدر بنتی ہو تو اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو گیا ہے۔ (امرتا پریتم)

ماہنامہ "پکھیرو" کے تازہ شمارے پر ایک نظر

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

بچوں کے لیے چھپنے والے رسالوں میں "پھول" "تعلیم و تربیت"، "تتلی"، "بچوں کی دنیا"، "کھلونا" اور دیگر رسائل شامل ہیں جو بچوں کی ذہنی استعداد کے مطابق ان کو تفریح اور معلومات مہیا کر رہے ہیں۔ پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے اکلوتا پنجابی رسالہ "پکھیرو" بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے کہانیاں اور شاعری مہیا کر رہا ہے۔ "پکھیرو" گزشتہ ۲۹ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ "پکھیرو" کو ادارہ پنجابی بال بورڈ لاہور ہر ماہ اس کی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے جب کہ اس کی مالی اعانت کے لیے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد اور محکمہ اطلاعات اور ثقافت حکومت پنجاب شامل ہیں۔ مجلس ادارت میں پروفیسر محمد جنید اکرم، اشرف سہیل، محمد سہیل قیصر ہاشمی، شاہد احمد راؤ شامل ہیں۔ جن کی محنت شاقہ سے "پکھیرو" بچوں کے ادب کی پہچان بن گیا ہے۔ بچوں کے لیے لکھنا انتہائی مشکل اور دقیق کام ہے۔ موجودہ شمارہ جون ۲۰۲۱ء، جلد نمبر ۲۹، شمارہ ۶ منظر عام پر آ چکا ہے۔ "پکھیرو" کے سرورق پر جہاں ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر سونان اظہر جاوید کی عزیزہ لمائسہ عثمان بٹ کی ہنستی مسکراتی ہوئی تصویر ہے وہاں اندرون صفحہ تبصرے پر "پکھیرو" کے روح رواں پروفیسر محمد جنید اکرم کی ہم سے جدا ہونے کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہوئے کہ وہ ۱۴ اپریل ۲۰۲۱ء کو داغ مفارقت دے گئے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے بچوں کے پنجابی ادب کے سر سے سایہ اٹھ گیا ہو۔ جون ۲۰۲۱ء کے "پکھیرو" کے مندرجات پر نگاہ ڈالی جائے تو سب سے پہلے عبدالجبار غوری کی تحریر کردہ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول ﷺ نظر نواز ہوتی ہے۔ ایم وائی قیصر، معروف احمد چشتی، علی اکمل تصور، مرزا ادیب، اشرف سہیل، کرامت علی مغل، ڈاکٹر مبارک علی، زیب عباس، ڈاکٹر ورتن سنگھ آشٹ، سہیل قیصر ہاشمی، ڈاکٹر سعید الفت، رگھویر سنگھ گلو، ایس اولو کووچ، مندیپ رومی، بیربرگی ٹالکو اور احمد حیات خان بلوچ کی نگارشات اس شمارے کا حصہ ہیں۔ "پکھیرو" میں بعض نگارشات ایسی ہیں جو دنیا بھر کے ادب سے لے کر ان کو پنجابی زبان میں ترجمہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کے ساتھ بڑے بھی "پکھیرو" کی وساطت سے مختلف قسم کی تحریروں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اداریہ میں امن اور بھائی چارے کا درس دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کو شجرکاری کی طرف مائل کیا گیا ہے تا کہ سرسبز پاکستان کا خواب پورا ہو سکے۔ درخت ہماری قومی دولت اور بہترین دوست ثابت ہوتے ہیں۔

ایم وائی قیصر کی لکھی ہوئی کہانی "مشاہدہ" میں گاؤں کے رہن سہن، رسم و رواج اور وہاں کے لوگوں کی محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گاؤں کی پرخلوص، سادہ اور پرسکون زندگی کی عکاسی عام نظر آتی ہے۔ "گلاب دے بوٹے" معروف احمد چشتی کی لکھی ہوئی اس کہانی میں ایک بیٹا اپنے والد کے پیسے چوری کر کے مونگ پھلی خرید لیتا ہے اور باقی پیسے بچ جانے پر ایک گلاب کا پودا لیتا ہے جو کھلنے کے بجائے مرجھانے لگتا ہے۔ پھول چوری کر کے حرام کمائی سے خریدا گیا تھا اس لیے وہ پھلنا نہیں چاہتا اور ایک دن بیٹا اپنے والد عباس صاحب سے کہہ کے وہ پودا

باغ سے جڑ سمیت اکھاڑ دیتا ہے۔

''وفا'' علی اکمل تصور کی لکھی ہوئی ایک کہانی ہے جس میں ایک گدھا فطرت سے ہٹ کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیتا ہے کہ اس کا مالک بھی اس کی وفا کے آگے ہار گیا۔ مالک رونے لگا تو اس کے گدھے کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ محمد جنید اکرم نے حکیم الامت، شاعر مشرق حضرت ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی مشہور نظم ''بچے کی دعا'' کا منظوم پنجابی ترجمہ کر کے کمال کر دیا ہے ان کے منظوم ترجمے کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں:

دل دے چاہ میرے ہونٹاں تے بن کے آن دعا ۔۔۔ ربا! میتھوں لوکاں دے وچ شمع وانگ جلا
میں ہوواں تے دنیا وچوں دور ہنیرا ہووے ۔۔۔ چار چوفیرے میرے چمکن نال سویرا ہووے
دکھیاں اتے غریباں دے میں پالے گلے سیوان ۔۔۔ دردی ماریاں دے درداں دا دارو بن کے جیواں

پرم بیر کور کی لکھی ہوئی کہانی ''گھر سے سادا آلا دوالا'' کو اشرف سہیل نے پنجابی میں ترجمہ کیا۔ اس کہانی میں ماحولیات کے عالمی دن منانے پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس جوش و خروش سے سکول کے بچے ماحولیات کا عالمی دن مناتے ہیں اور اپنے ارد گرد کے ماحول کو صاف رکھنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ محمد جنید اکرم کی نظم ''دو دا پہاڑا'' بچوں کے لیے انتہائی اہم اور مفید ہے۔ وہ نظم یاد کرتے ہیں تو انھیں دو کا پہاڑا بھی ساتھ ہی یاد ہو جاتا ہے۔ پہلے ایسا ہی ہوا کرتا تھا کہ ہمارے شاعر کوئی ایسی نظم لکھتے جس کی وجہ سے بچوں کو اخلاقی سبق بھی ملتا اور وہ نظم بھی یاد کر لیتے تھے۔ اسی طرح گنتی اور پہاڑا یاد کرانے کے لیے بھی ایسی نظمیں لکھتے رہے ہیں۔ جنید اکرم نے بھی ایسی ہی ایک شاندار نظم لکھی ہے جس میں بچے غیر شعوری طور پر دو کا پہاڑا یاد کر لیتے ہیں۔ اردو ادب کے معروف افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، سفرنامہ نگار اور بچوں کے ادب میں بہت زیادہ خدمت کرنے والے میرزا ادیب کی ایک کہانی ''تتلی'' شائع کی گئی ہے۔ اس میں ایک تتلی کی پھول سے محبت اور پھول کی تتلی کے لیے عقیدت کا اظہار موجود ہے۔ ''پنگھیرو'' میں غیر ملکی کہانیوں کو پنجابی میں ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا ہے اس حوالے سے تازہ شمارے میں ''کیا چوتے اوہدیاں پچھلیاں'' فلورنس پرسٹورڈ کی کہانی کو کرامت مغل نے پنجابی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ درشن سنگھ آشٹ کی کہانی ''ودے وزیراں دی شکایت'' کا پنجابی ترجمہ اشرف سہیل نے کیا ہے۔ پروفیسر حلوہن سنگھ تیر کی کہانی ''محنت دی کمائی'' کو بھی اشرف سہیل نے پنجابی روپ دیا ہے۔ روسی ادب تو اک کہانی سیر برگی مالکووی کی بعنوان ''شیشہ'' کو بھی اشرف سہیل نے پنجابی میں ڈھالا ہے۔ مسن دیپ رکھی کی کہانی ''کتاباں دی دنیا'' کو بھی اشرف سہیل نے پنجابی میں ترجمہ کر کے بچوں کے لیے پیش کیا ہے۔ ''پنگھیرو'' میں کچھ قسط وار کہانیاں، مضامین اور کتابوں کو شائع کیا جاتا ہے اس شمارے میں بھی ڈاکٹر درشن سنگھ آشٹ کی کتاب ''بچیاں دے من بھاؤندے کارٹون'' کو قسط وار پنگھیرو کی زینت ہیں۔ اس کا ترجمہ بھی اشرف سہیل نے کیا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب ''تہذیب دی کہانی پہلی کتاب'' پتھر دا زمانہ'' کا پنجابی ترجمہ زاہدہ عباس نے کیا اس شمارے میں اس کی آخری قسط شائع کی گئی ہے۔ کرشن چندر دی کہانی ''الٹا درخت'' کا پنجابی ترجمہ سہیل قیصر ہاشمی نے کیا اور اس کی قسط نمبر ۱۲ شائع ہوئی ہے۔

کہانیوں کے علاوہ کچھ مضمون ایسے بھی ہیں کہ جن سے بچوں کو مفید معلومات ملتی ہیں۔ ایسا ہی ایک مضمون ڈاکٹر سعید الفت کا بعنوان ''اسیں بیمار کیوں ہونے آں'' شامل ہے۔ محمد جنید اکرم کی نظم ''ہمالہ'' نذر حسین آزاد کی نظم ''شرارتی بچے'' بھی شامل ہیں۔ گورمیت سنگھ

کلو دی کہانی "رشتے دا گھو" بھی شامل ہے۔ اس میں ایک دادی اور پوتی کے پیار اور محبت کی کہانی کو نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ رسالے کے آخر میں محمد رمضان شاکر کی نظم "بالاں دی فریاد" اور احمد حیات خان بلوچ کی نظم "ککڑو گھوڑے" شائع ہوئی ہے۔ دونوں نظمیں بچوں کے لیے ہیں۔ "پکھیرو" بچوں کا ایسا رسالہ ہے جو نہ صرف پنجابی ادب کے لیے تاریخی خدمات انجام دے رہا ہے بلکہ بچوں کی کردار سازی اور شعوری انقلاب کا فریضہ بھی انجام دے رہا ہے۔ غیر ملکی مضامین کا پنجاب میں ترجمہ ایک بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ "پکھیرو" کو بچوں اور بڑوں کے لیے ایک اہم ترین ادبی کاوش قرار دیا جا سکتا ہے۔

◆◆◆

سرائیکی گوشہ

مرثیہ : درحال حضرت حُر علیہ السلام

قیصر نجفی

(1)

[illegible]

(2)

[illegible]

(3)

[illegible]

(4)

[illegible]

(5)

[illegible]

ماہنامہ تخلیق کا ایک جائزہ

2001ء تا 2020ء

......2......

آفتاب خان

14 فروری 2012ء کو اظہر جاوید کی وفات کا ادبی حلقوں میں جہاں افسوس اور سوگ برپا ہوا وہیں اہلِ ادب کو یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اب "تخلیق" کا کیا بنے گا۔ ہم ایک اچھے اور اعلیٰ ادبی پرچے کے مطالعے سے محروم ہو جائیں گے۔ کیوں کہ اس وقت تک "اوراق" اور "فنون" جیسے جریدے بھی بند ہو چکے تھے اور ادبی رسائل انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ ان حالات میں اہلِ قلم کا یہی گمان تھا کہ اب ہم تخلیق جیسے رسالے میں شائع نہیں ہو سکیں گے مگر اظہر جاوید کے ہونہار فرزند سونان اظہر جاوید نے ان تمام مفروضوں کو غلط ثابت کر دیا اور جون 2012ء میں "تخلیق" کا اظہر جاوید نمبر نکال کر ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ 364 صفحات پر مشتمل شمارہ تھا جس میں تخلیق اور اظہر جاوید سے وابستہ ہر فرد نے ان کی شخصیت پر بھرپور انداز سے اپنے خیالات قلمبند کیے تھے اور بہت سے شاعروں نے انھیں منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا تھا۔ اس شمارے میں یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ تخلیق آئندہ بھی تسلسل سے شائع ہوتا رہے گا اور سونان اظہر اپنے اس ارادے پر ثابت قدم رہے ہیں۔ تخلیق کی اشاعت کا ان کی زیر ادارت یہ نواں (9واں) سال جاری ہے۔ اس دوران تخلیق کے ابتدائی شماروں میں اظہر جاوید کے حوالے سے ایک گوشہ مخصوص رہا جس میں ان کے چاہنے والوں نے ان کی شخصیت اور فن پر اپنی محبت کا اظہار کیا اور اب تک اظہر جاوید کے حوالے سے یا ان کی تحریر کردہ تخلیقات تخلیق میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ سونان اظہر نے تخلیق کی لے آؤٹ کو نہ صرف بہتر کیا بلکہ اس کی پرنٹنگ اور کاغذ پر بھی توجہ دی اور اسے خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے والد کے دور کے قلم کاروں کو تخلیق میں جگہ دی بلکہ ان لوگوں کو بھی تخلیق کا پلیٹ فارم مہیا کیا جو کسی وجہ سے اس سے دور تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے نئے قلم کاروں کی تحریروں کو بھی تخلیق میں مناسب جگہ فراہم کی۔ یہی وجہ ہے کہ اب تخلیق ملک اور ملک سے باہر اپنی ایک منفرد پہچان بنا چکا ہے۔ آئیے ان برسوں کا مرحلہ وار جائزہ لیتے ہیں کہ اس دوران کون کون سے قلم کار تخلیق کا حصہ بنے بلکہ ادبی تاریخ کا حصہ بنے۔

سرورق:

2012ء سے 2020ء تک تخلیق کے سرورق بہت اعلیٰ اور دلکش انداز کے حامل رہے اور انہیں بنانے والے مختلف آرٹسٹ تھے۔ انجم یعقوب نے زیادہ تر سرورق بنائے اس کے بعد سلیمہ ہاشمی، پروین شیر، انجم خالد، ریا ٹھاکر واگیانڈ (انڈیا)، محمد جاوید اسلام، ادارہ تخلیق

اور حذیفہ سوہان اپنے اپنے انداز کے خوبصورت سرورق تخلیق کے لیے پیش کیے۔

تصاویر :

سوہان اظہر کے دور میں فرصت لو یک کی کوشش ہے اس طرح تصاویر شائع نہیں ہوتی ہیں جیسے اظہر جاوید کیا کرتے تھے بلکہ اس میں جدت پیدا کر کے سوہان ان تقاریب کی تصاویر لگاتے ہیں جو تخلیق کے زیر اہتمام منعقد ہوتی ہیں۔ خصوصاً ہر سال فروری میں ہونے والی اظہر جاوید کی برسی اور تخلیق ایوارڈ کی رنگین تصاویر نمایاں کر کے کئی صفحات پر شائع کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں دفتر تخلیق میں ہونے والی نشستوں کی تصاویر بھی اہتمام سے لگائی جاتی ہیں اور سوہان اظہر کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی تقریب میں شامل ہونے والے کسی بھی فرد کی تصویر رہ نہ جائے اس لیے تخلیق میں ہر قلم کار اور ہر مہمان کی تصویر چھپ چکی ہے۔

اپنی بات :

اپنے والد اظہر جاوید کی طرح سوہان اظہر کی اپنی بات میں بھی اپنے باپ جیسی گھن گرج اور تلخی موجود ہے۔ یہ بھی اپنے اردگرد ہونے والے معاملات و واقعات پر کڑھتے ہیں اور اپنی بات میں اس کا برملا اظہار کرتے ہیں لہٰذا سوہان اظہر کی اپنی بات بھی اظہر جاوید کی طرح بے لاگ کھری اور حقائق پر مبنی ہوتی ہے جسے تخلیق کے حلقوں میں پذیرائی ملتی ہے۔

نظمیں، گیت، رباعیات :

اس حوالے سے لکھنے والوں کی ایک لمبی قطار ہے اور سبھی اپنے اپنے انداز سے قلم فرسائی کرتے ہیں۔ آیئے 2012ء سے یا ماہ جیب 2020ء تک ان ناموں کا ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے ان شعبوں میں تخلیق کو ثروت مند کیا۔ ان کے نام یوں ہیں، ڈاکٹر وزیر آغا، حلیم صبا نویدی، شباب للت، علی عباس امیدی، قیصر نجفی، توقیر مشتاق، شاہین سلمیٰ سروسی، کرشن پرویز، طور، انور سدید، غلام الثقلین نقوی، شہزاد نیّر، صفدر صدیق رضی، عمر ندوی، نیّر رانی شفق، ناویدہ تحسین، نسیمہ سید، نسرین نگہت، جبار واصف، اسلام امجد، اعزاز احمد آذر، سرور حسین، سلیمان خمار، آفتاب راجا، نورزمان ناوک، شہزاد احمد، حسن عسکری کاظمی، ناصر زیدی، حلیم شہزاد، سجاد مرزا، سلطان کھاروی، خالد ناز، آفتاب خان، اقبال کراچی، ثروت زہرا، ایوب خاور، یونس ساحر، طاہر سعید ہارون، کرامت بخاری، گلزار بخاری، ارمان نجمی، احمد رئیس، آصف نقاش، ایوب ندیم، بشریٰ رحمن، ارشد محمود ارشد، شائستہ رعنان، بشیر احمد، مظفر ایرج، منظر ایوبی، پروین شیر، ظفر علی راجا، جاوید زیدی، ستیہ پال آنند، عزیز جبران، رشیدہ آفرین، مشرق صدیقی، ارشد ملک، کشور ناہید، ثمرین فاروق، رضا اطہلی، ناصر بشیر، ناصر علی سید، سیما پیروز، غلام نبی خیال، جلیل عالی، سرفراز سید، آغا سلیم قزلباش، محمد علی راجا، غالب عرفان، سعدیہ شمسی، سیماب ظفر، امجد بابر، شعلہ چنگیزی، ام حبیبہ، کرن اجالا، ممتاز راشد لاہوری، شائستہ مفتی، ثمرین اشفاق، ام عمارہ، شہباز انور خان، یونس شرر، میر گل، فراست بخاری، عمیر اظہر، احمد عدنان طارق، عبدالعزیز چشتی۔

مضامین، جائزے :

مختلف ادبی موضوعات پر تحریر کیے گئے مضامین اور کتابوں پر لکھے گئے جائزوں کے اس باب میں بہت سے سینئر اور جونیئرز کے

نام شامل ہیں جن کے نام یوں ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید، خواجہ محمد زکریا، مسلم شمیم، سکندر حیات میکن، مظفر نیلی، جمیل آذر، شفیع ہمدم، مامون ایمن، خیال امروہوی، خورشید بیگ میلسوی، جمال نقوی، عامر عبداللہ، فصیح الدین، حسن عسکری کاظمی، محمد متین ندوی، غلام شبیر رانا، صائمہ نورین بخاری، اقبال بیلا، ابن سلطان، منور عثمانی، ناصر مستحسن، محمود الحسن جعفری، محمد ساجد، سلیم آغا قزلباش، سید مبارک علی شمسی، نجم الحسن رضوی، ہارون الرشید تبسم، پرتو روہیلہ، علی اختر، افتخار عظیم چاند، روبینہ کرمانی، میر رانی شفق، میر گل، ہرچرن چاولہ، منور سلطانہ بٹ، جمیل احمد عدیل، فرحین اعجاز، عارف شفیق، نثار احمد صدیقی، نذیر قیصر، اسلم گورداسپوری، جمیل صابری، اسلم ملک، یونس شرر، شہباز انور خان، سعید نقوی، شیدا طراز، صدیق تبسم، خالد عبداللہ، محمد رفیق خان، مراد خان، شہباز گردیزی اور راقم الحروف۔

افسانے :

اس شعبے میں زیادہ تر پرانے لکھنے والوں کے نام ہی بار بار سامنے آتے رہے مگر چند نئے لکھاریوں کے افسانے بھی تخلیق کی زینت بنے۔ زمانی اعتبار سے ان سب کے نام درج کیے جا رہے ہیں۔ نجم الحسن رضوی، عطیہ سید، بشریٰ اعجاز، سرور سکھیرا، شمیم احمد، عزیز میرٹھی، مراق مرزا، نجیب عمر، اقبال بیلا، حمیدہ سید، زہیر حسن علی، روزانہ گوشین خان، پروین عاطف، عذرا اصغر، خاقان ساجد، زین السالکین، شفیع ہمدم، رشید امجد، اظہر جاوید (پنجابی افسانوں کا اردو ترجمہ حنیف باوا)، محمد عباس ثاقب، سلمیٰ اعوان، پیرزادہ بخت قاضی، محمد طارق علی، آصف نشاط، عزیز جبران انصاری، سلمان ذار، سلیم آغا، محمد عثمان، طارق بلوچ صحرائی، نثار احمد صدیقی، سیما پیروز، یاسمین کرن، بشریٰ رحمن، احمد زین الدین، صائمہ نورین بخاری، تسنیم کوثر، اسلم سحاب ہاشمی، آغا گل، دیپک بدکی، جمیل حیات، دیپک کنول، خالدہ آفتاب، حامد سعید اختر، مشتاق مشمی، عشرت صدف، ابدالی محمد حامد سراج، زبیر کنجاہی، احسان بن مجید، گوہر رحمان نوید، شیخ خالد محمد اسلم، آمنہ مفتی، کلدیپ جوشی، جبران علی، رمشی سعید، صوفیہ بیدار، شعلہ چنگیزی، علی اکبر ناطق، ممتاز راشد، عامر بن علی، آصف عمران، امداد حسین خان ترکوی، محمد شعیب مرزا، قویہ تبسم، حنیف سید، سعدیہ قول، شائستہ مفتی، نویں روپ، اقبال فیروز، عاصم بخاری۔

غزلیں :

غزل کہنے والے شعراء کرام کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر پھر بھی بائیس کروڑ کی آبادی والے ملک میں ان کی تعداد ایک لاکھ سے بھی کم ہے۔ اسی حساب سے دوسرے ممالک میں آباد شعراء کی تعداد کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بہرکیف تخلیق میں جن شعراء کرام کی غزلیں شائع ہوتی رہی ہیں ان کے ناموں کی یہ مختصر فہرست حاضر ہے۔

انور سدید، حسن عسکری کاظمی، سعید احمد اختر، جمیل صابری، ظفر علی راجا، محمد سبطین شاہ جہانی، سلیمان خمار، رفیع الدین ذکی قریشی، عمر زمان، تسنیم سحر، کرامت بخاری، زمان کنجاہی، انوار فیروز، وصی عرفانی واحدی (فیصل)، کشمیری لال ذاکر، اعزاز احمد آذر، آفتاب خان، شہیدہ سید، قرات جاوداں، شمیم راہی، عبدالجبار اثر، کرشن کمار طور، عقاب ملت، رتپال سنگھ بیتاب، مجیب راہی، خان پرویز، ذکاءاللہ فہیم، بیدار سرمدی، وصی شاہ، شفیق احمد فاروقی، باقر رضا، جعفر علی آغا، ندیم ہاشمی، شہزاد نیر، امتیاز کاظمی، روبی جعفری، حنیف انجم، کریم تمری، امین راحت چغتائی، اخلاق عاطف، منظور حسین یاد، مامون ایمن، محمود شام، ناصر زیدی، ریاض حسین زیدی، آصف ثاقب، وشال کھلر، ایوب ندیم، حسنین زیدی، ارشد محمود ارشد، روما رضوی، عمران مشتاق، ایم زیڈ کنول، رشیدہ عیاں، ہاشمی تمیمی، اسعد اعوان، نجمہ شاہین کھوسہ، طفیل عامر محمد

افضال انجم، ظفر اقبال، اسلم گورداسپوری، امجد اسلام امجد، زبیر کنجاہی، قیصر نجفی، شیخ محمد اقبال، خورشید بیگ میلسوی، خالد اقبال یاسر، عرفان صادق، ناصر علی سید، نجمہ عثمان، اکرام تبسم، مرزا شہیم بھیروی، فرزند علی شوق، پروین گل، آسناتھ کنول، بلی ڈی کالیہ ہمدم، عرش صہبائی، مظفر حسن منصور، ساحر شیوی، تسنیم کوثر، اطہر جعفری، مسرت زہرا، ریاض ندیم نیازی، بشریٰ رحمٰن، مقصود حسین، گوہر کریم گھرگی، ممتاز راشد لاہوری، محمد نصیر ہمایوں، فرحین چودھری، منور سلطانہ بٹ، غلام شبیر اسد، قمر علوی، اعظم بخاری، احمد مجازی، قاسم خیال، رؤف ایاز، شبیر طراز، علی عباس امید، مظفر ایرج، مظہر بخاری، کنول فیروز، حسن اعزاز، طاہر شیرازی، شاہین زیدی، انعام تقوی، سعید باقر رضا، مسعود تنہا، ایم ایم عدیل، وقاص عزیز، اکبر مدحت، یاسمین کنول، ارشاد قمر، افضل شاہین، ایم رفیق ارم، اصغر قسیم، شجاعت علی راہی، بشریٰ نورہم، سعید محمد سعید، مرزا احمد نور طاہر، ضیاء اللہ ظاہر، راشدہ ماہین ملک، وصف وفا، لطیف لطیف، نور کمال شاہ، شہباز گرویزی، بشیر جعفر، کائنات احمد، کرن اجالا، حسین مجروح، مسعود عثمانی، منظور حسین رضوی، جاوید عباس جاوید، حسن عباسی، خالد شریف، جواز جعفری، جبار واصف، امر سنگھ، جلیل عالی، فرحت عباس، جاوید صدیق بھٹی، محمد سلیم ساگر، صوفی بیدار، صدیق شاہد، ابن عظیم فاطمی، سعدیہ سیفی، حمیدہ شاہین، عاصم بخاری، فرخ محمود، اسد رضا سحر، اکرم عتیق، امداد حسین ترگوی، شائستہ مفتی، انور شعور، عارف شفیق، ام عمارہ، سحر تاب رومانی، ایم ارشد، دلشاد احمد، اکرم کنجاہی، شہباز انور خان، شہباز حسین تاب، قربان علی ملک، فراست بخاری، حمید اظہر، محمد نعمان نواب، سید ضیاء الحسن، عباس تابش ان میں سے بہت سے شاعر ایسے ہیں جن کی صرف ایک بار کی غزل چھپی مثلاً وصی شاہ، ایم زبیدہ کنول، حمیدہ شاہین، عباس تابش، جبار واصف اور بہت سے دوسرے۔

اظہارِ خیال :

یہ بھی اگرچہ مضامین کے زمرے میں آتا ہے لیکن اسے الگ عنوان کے تحت اس لیے شامل کیا جا رہا ہے کہ ایسی تحریریں شعرا اور ادبا کی شخصیت کو مزید نمایاں کرنے اور ان کی صلاحیتوں کا بار یک بینی سے جائزہ لینے کا محرک ثابت ہوتی ہیں لہٰذا اپنے ہم عصر اور رفقاں کے فن اور شخصیت پر لکھنے والوں میں تخلیق کے یہ قلم کار شامل ہیں۔ تسنیم سحر، امین راحت چغتائی، جمیل یوسف، غالب عرفان، لطیف احمد قریشی، عذرا اصغر، نسیم اللہ عالی (انڈیا)، اشرف ذکی، ناصر علی سید، رضا بخشائی، علی عثمان باجوہ، مرزا ادیب، مبارک علی، جواز جعفری، حسن جعفر مبارک، حنیف باوا، محمد علی چراغ، ذرا رنگ ساقی، حفہ کشور، کرم جمیل الرحمان، خورشید رضیہ، محمود شام، حامد سراج، سرور حسین (انڈیا)، اسلم کمال، حسین مجروح، ایم ذی ملک، کیول دھیر، اقبال فیروز، منشا قاضی، گوہر رحمان نوید، اجمل نیازی، اظہر وحید، قاصر شہزاد، مسعود عثمانی، خالد یزدانی، تنویر ظہور، فیصل شہزاد، شیریں فاروق، یاسمین کرن، سحر حفیظ۔

یادنگاری :

اپنے پیاروں کو یاد کرنے کی رسم ابھی دنیا سے ختم نہیں ہوئی لہٰذا قلم کار بھی خود سے جدا ہونے والوں کو کسی نہ کسی بہانے یاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہر شمارے میں جاری رہتا ہے اور مختلف لکھنے والے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ 2001ء سے 2020ء تک اپنے پیاروں کو یاد کر کے ان کے بارے میں لکھنے والوں کے نام کچھ یوں ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید، رشید امجد، بشریٰ رحمٰن، سرفراز سید،

اعزاز احمد آذر، اعتبار ساجد، فخر زمان، حسن عسکری کاظمی، مستنصر حسین تارڑ، محمد اسلم، غلام یحییٰ اعوان، محمد صغیر خان، عارف شفیق، ممتاز راشد لاہوری، جمیل اکرم، اقبال فیروز، اختر شمار، ایوب ندیم اور نور کمال شاہ وغیرہ۔

آپ بیتی :

اظہر جاوید کے دور میں شروع ہونے والی عزیز میرٹھی اور نذیر فتح پوری کی آپ بیتیاں تسلسل سے اگلے برسوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے علاوہ جن قلم کاروں کی آپ بیتیاں قسط وار شائع ہوئیں ان کے ناموں میں علی سفیان آفاقی، فرخندہ لودھی، محمد حامد سراج اور طارق محمود وغیرہ شامل ہیں۔

سفرنامہ / رپورتاژ :

اس صنف میں لکھنے والوں کی تعداد کم ہے مگر جس قدر بھی ہے غنیمت ہے۔ سلمیٰ اعوان مسلسل سفرنامہ کی صنف سے جڑی ہوئی ہیں لہٰذا ان کے سفرنامے تسلسل کے ساتھ تخلیق کا حصہ بنتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان برسوں میں جن اصحاب کے سفرنامے یا رپورتاژ تخلیق کا حصہ بنے ان میں اقبال ببلا، نیلم احمد بشیر، حمید رازی، فرخ سہیل گوئندی، سرفراز سید اور سحر حفیظ شامل ہیں۔

طنز و مزاح :

اس شعبہ میں بھی لکھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ تخلیق میں ان برسوں کے دوران ایس ایم معین قریشی اور محسن مگھیانہ کی مزاحیہ و طنزیہ تحریریں سب سے زیادہ شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ لکھنے والوں میں اعتبار ساجد، نجم الحسن رضوی، فصیح الدین، حسین احمد شیرازی، محمد عثمان، ایوب ندیم اور نور کمال شاہ شامل ہیں۔

خاکے :

دوسروں کی شخصیت پر خاکہ مرتب کرنا قدرے مشکل امر ہے مگر کچھ اہل ہنر یہ کام بخوبی سرانجام دیتے ہیں۔ مختلف شخصیات پر خاکے تحریر کرنے والوں کے نام یہ ہیں۔ اظہر جاوید، جوہر نظامی، علی سفیان آفاقی، صابر لودھی، غلام یحییٰ اعوان، اقبال ببلا، عذرا اصغر، اخلاق عاطف، ملک مقبول احمد، عمیر رانی، شفیق آغا، گل محمد اقبال، صمصام، ابوالخیر مجاری، حسن عسکری کاظمی، انتظار رضوی، فیروز علی، ملک راشد محمود، ناصر نقوی، زمران راحیل۔

انشائیہ :

یہ صنف اب معدوم ہوتی جا رہی ہے اور اس پر اب ادیبوں نے لکھنا کم کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان برسوں میں صرف چار قلم کاروں کے انشائیے شائع ہوئے جن میں منظور حسین یاد، جمیل آذر، سلیم آغا قزلباش اور صوفی بیدار کے نام شامل ہیں۔

موسیقی :

موسیقی کے حوالے سے لکھنے والے تو بہت سے لوگ ہیں مگر تخلیق میں صرف ڈاکٹر امجد پرویز نے یہ شعبہ سنبھال رکھا ہے وہ اب

تک جن فنکاروں پر اپنے مضامین لکھ چکے ہیں ان کے نام یوں ہیں ۔ زبیدہ خانم، غلام علی، موسیقار خیام، ناہید نیازی، موسیقار لال محمد اقبال، موسیقار رفیق علی اور مادام نور جہاں۔

پنجاب رنگ :

پنجابی نظمیں، غزلیں، دوہے، بولیاں، ماہیے وغیرہ اور بعض نثری تحریریں اس شعبے کا حصہ ہیں اور ان برسوں میں جن کی پنجابی تخلیقات شائع ہوئیں ان میں الطاف قریشی، سلیم شہزاد، منزہ شاہد، محمد جنید اکرم، حنیف باوا، حسن اعزاز، انوار فیروز، شگفتہ نازلی، شوکت علی (گھوکار)، مامون ایمن، حسن عسکری کاظمی، نور زمان ناوک، پیرزادی، اختر جاوید، شائستہ رمضان، احسان رانا، اسد بیگ، جاوید احسن، انعام نقوی، بشریٰ رحمن، مشتاق احمد، سلطان کھاروی، کرشن پرویز، طور نصیر آصف خان، آمنہ تحو کول، حسین مجروح، محسن مگھیانہ، طاہرہ سرا، ضیاء اللہ طاہر۔

انور سدید نمبر :

20 مارچ 2016ء کو ڈاکٹر انور سدید کی وفات کے وقت تخلیق کا ماہ مارچ کا شمارہ آ چکا تھا اور بقول سونان اظہر، انور سدید صاحب کو جب میں نے فون کیا تو ان کا پہلا سوال یہی تھا کہ تخلیق آ گیا یا نہیں۔ بستر مرگ پر بھی انہیں صرف تخلیق کی فکر تھی۔ ان سے محبت اور عقیدت کو نبھاتے ہوئے سونان اظہر نے ماہ جون 2016ء کا شمارہ انور سدید نمبر نکالا اور شاعروں ادیبوں سے خصوصی طور پر ان کے لیے مضامین لکھوائے لہٰذا اس خصوصی نمبر میں جن کی تحریریں شامل تھیں ان میں سے کچھ نام یہ ہیں۔ ملک مقبول احمد، منور عثمانی، سکندر حیات میکن، سلمیٰ اعوان، ہارون الرشید تبسم، حسن عسکری کاظمی، خواجہ زکریا، نجم الحسن رضوی، سعادت سعید، قیصر تمکین، نذیر فتح پوری، سرفراز سید، سلیم آغا قزلباش، شاہد شیدائی، مظفر حسن منصور، اشرف ذکی اعوان، جمیل آذر، شفیع ہمدم، سونان اظہر، محمد علی چراغ، قمر ریاض، قمر زمان، شاہد بخاری، مسعود انور (صاحبزادہ)، اخلاق عاطف۔

تبصرے :

ڈاکٹر انور سدید جب تک حیات رہے، کتابوں پر تبصرے کرتے رہے اور تخلیق میں ان کے تبصرے تسلسل سے شائع ہوتے رہے ان کے ساتھ ساتھ سونان اظہر نے یہ اعزاز راقم الحروف کو بخشا کہ انور سدید کے ساتھ راقم کے تبصرے بھی مسلسل شائع ہوتے رہے۔ 2016ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا اس کے بعد راقم کے ساتھ دوسرے قلم کاروں کو بھی تبصرے کرنے کا موقع ملتا رہا۔ ان کے ناموں میں شفیع عقیل، محمد متین ہاروی، ظہیر جاوید، قیصر تمکین، اقبال راہی، انور جاوید ہاشمی، خالد عبداللہ، نسیم سحر، جمیل احمد عدیل، منظر سلیم بجوکہ، محمد طارق علی، فیصل شہزاد شامل ہیں۔

اس طرح تخلیق کا سفر بہت شان و شوکت سے جاری ہے اور امید ہے کہ سونان اظہر جاوید تخلیق کو اسی طرح کامیابی سے نکالتے رہیں گے اور اہل قلم اس میں شائع ہونا اپنا اعزاز سمجھتے رہیں گے۔ (ختم شد)

◆◆◆

تبصرے ہارون الرشید تبسم کے

مختصر تعارف

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم 2/ اکتوبر 1955ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ اردو گورنمنٹ کالج اٹک سے 35 سالہ تدریسی خدمات کے بعد بحیثیت صدر شعبہ مسلم کالج سرگودھا سے 20 ویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے۔ تحریر و تقریر اور کھیل کے حوالے سے سرگودھا اور سرگودھا سے باہر بہت سی قومی تقریبات میں حصہ لیا۔ اب تک ان کی 125 ادبی اور 27 نصابی کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ انھیں کئی حوالوں سے انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ چار مضامین میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے علاوہ انھوں نے اقبالیات میں ایم فل AIOU سے 1993ء میں جب کہ پنجاب یونیورسٹی سے 2002ء میں اپنے تدریسی مضمون اردو میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پاکستان ادب اکادمی، پاکستان اکیڈمی، سول ڈیفنس اور ریڈیو پاکستان سرگودھا میں آج بھی خدمات جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر کا محور نظریہ پاکستان، مشاہیر پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا پیغام ہے۔ انھوں نے اقبالیات کے حوالے سے 34 کتب تحریر کی ہیں۔ ماہنامہ ''تخلیق'' میں بھی ان کے تحریر کردہ مضامین منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ ان کے مختلف کتابوں پر تحریر کردہ تبصرے پیشِ خدمت ہیں:

خواب ریزے

مصنف: کرامت بخاری

صفحات: 256 قیمت: 500 روپے ناشر: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

اردو غزل صدیوں کا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچی ہے۔ کئی ادوار ایسے بھی آئے کہ غزل دم توڑتی ہوئی محسوس ہوئی مگر ہر دور کے چند نابغۂ روزگار شعرا نے اسے خونِ جگر دے کر اس کی بقا کا وسیلہ کیا ہے۔ اردو غزل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے گاہے گاہے بہت خوبصورت لب و لہجے کے شاعر میسر آتے رہے ہیں۔ کرامت بخاری بھی شعرائے کرام کی اسی فہرست میں شامل ہیں، جنھوں نے غزل کے دامن کو وقار بخشا ہے۔ ان کی غزل کے بارے میں افتخار عارف لکھتے ہیں:

> ''کرامت بخاری اپنی زندگی میں اپنی شخصیت اور اپنے لفظ میں ایک ارتباطِ معنوی کے مستحکم کرنے میں منہمک شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں اور یہ ایک بڑی بات ہے۔ سیف، ندیم، ناصر، جون اور انور شعور کے بعد آنے والی نسل میں کرامت بخاری شاید سب سے نمایاں تخلیق کار ہیں جنھیں اس قبیلے میں رکھا جا سکتا ہے۔''

کرامت بخاری نے اردو غزل میں جو کرامت دکھائی ہے وہ انھیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ کرامت بخاری کا کمال یہ ہے کہ اس نے گھسے پٹے موضوعات کے بجائے نئے اور تازہ موضوعات کو اپنی غزل کا حصہ بنایا ہے۔ یعنی اس نے افکار تازہ سے غزل کی نمو کی ہے اسی لیے اس میں چاشنی اور رعنائی موجود ہے۔ انھوں نے ایک طرف روایت کا دامن بڑی مضبوطی سے تھام رکھا ہے تو دوسری طرف جدت کی اقلیم میں بھی قدم رکھ لیے ہیں۔ کرامت بخاری کے ہاں روایت اور جدت دونوں کا سنگم دیکھا جا سکتا ہے۔ معروف نقاد ڈاکٹر سجاد نقوی کی رائے سے بھی اتفاق کرنا پڑتا ہے۔

''اردو شاعری میں ایک تازہ وقعت پیدا کرانے والے نوجوان شاعر کرامت بخاری جذبے کا خلوص، احساس کی صداقت اور حیاتی تجربے کی تازگی سمیٹے پختہ عزم کے ساتھ اور پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں آپ کو وہ نئی لطافتیں ملیں گی جس کی سوندھی سوندھی مہک نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔''

غزل اساتذہ کی نظر میں ایک مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اس کے باوجود برتنے والے کی محبوب ترین صنف بھی رہی ہے۔ کرامت بخاری نے غزل کے ناقدین اور اہل فن پر طنز کے نشتر چلاتے ہوئے کہا ہے کہ غزل کو ناقدین کہاں سمجھ سکے ہیں یہ تو اہل دل ہی ہیں جو غزل کی نزاکتوں کو سمجھتے ہیں۔ جنھیں قلم کو تھامنا بھی نہیں آتا وہ خود کو کاتب عصر رواں سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک ایسی طنز ہے جو کرامت بخاری نے غزل کے ناقدین کے لیے کی ہے۔

غزل کو ناقد و ناسخ کہاں سمجھتے ہیں — یہ اہل دل ہیں جو دل کی زباں سمجھتے ہیں
قلم کو تھامنا بھی جنھیں نہیں آتا — وہ خود کو کاتب عصر رواں سمجھتے ہیں

معروف شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس، مدیر ''فنون'' احمد ندیم قاسمی نے بھی کرامت بخاری کی غزل کو سراہا ہے۔ کرامت بخاری چھوٹی بحر میں نہایت عمدہ شعر کہتے ہیں۔ ان کے شعروں میں کوئی مشکل اور ثقیل لفظ نہیں ہوتے بلکہ سادہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بھری بحر کم تر ایک سے بھی گریز کرتے ہیں۔ سیدھے سادے انداز میں شعر کہہ کر سب کو متحیر کر دیتے ہیں گویا ان کے شعر سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں:

غم کو تحریر کر لیا میں نے — اپنی جاگیر کر لیا میں نے
آسماں سے اتار کر دل میں — چاند تسخیر کر لیا میں نے

بعض غزلوں میں فٹ نوٹ بھی شامل ہیں۔ یہ فٹ نوٹ نہایت ضروری تھے اس لیے کہ اساتذہ تو یہ فنی کلاس سمجھتے ہیں لیکن بعض جو لوگ اس سے نابلد ہیں ان کی وضاحت کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔ خاص طور پر صوتی قافیوں کے حوالے سے ان کے فٹ نوٹ یا پھر ''ہ'' کے ساتھ ''الف'' کا قافیے کے اعلان کے حوالے سے وضاحت ضروری تھی۔ اس ضمن میں ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہاتھ میں کاسہ رہ جاتا ہے — خواب ذرا سا رہ جاتا ہے
جدائی کے بعد کرامت — ایک دلاسہ رہ جاتا ہے

یہاں کرامت بخاری نے اپنے فن کی کرامت دکھاتے ہوئے ''کاسہ'' کے ساتھ ''ذرا سا'' کا قافیہ باندھا ہے۔ بعض غزلیں

انھوں نے غیر مردف کہی ہیں۔ ایسی غزلوں کے نیچے بھی فٹ نوٹ میں اس کی وضاحت دی گئی ہے۔ وہاں "غیر مردف" لکھا گیا ہے۔ اس کی دو مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

چڑیوں کی چہکار رکھتی ہے بیدار
پائل کی چھم چھم سکوں کی جھنکار

کہاں سکھ کا سایہ کہاں باہم / فقط اک فریب نگاہ تم / یونہی لکھتے لکھتے حکایات غم / مری انگلیاں ہو گئی ہیں قلم

کرامت بخاری ایک نہایت عمدہ غزل گو شاعر ہے جس نے غزل کے دامن کو وسعت اور کشادگی عطا کی ہے۔ وہ نت نئے تجربات کر کے غزل کے وقار میں بے پناہ اضافہ کر رہا ہے۔ "خواب رہ نے" کرامت بخاری کا تازہ شعری مجموعہ غزلوں کا گلدستہ ہے۔ مختلف رنگوں کے پھول تغزل کی خوشبو بکھیر رہے ہیں۔ ان کا حسن تخلیق منفرد اور لفظ و اختراع تر ہے۔ شاہراہ غزل پر کرامت بخاری اپنا راستہ خود تراش رہے ہیں۔

کرامت بخاری غزل کہتے ہوئے غزل کے فنی محاسن اور لوازمات کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ وہ فن غزل کے ایسے شہسوار ہیں جنھوں نے کئی معرکوں کو سر کیا ہے اور خود اس سفر پر گامزن ہے۔ دعا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح تازہ دم رہیں اور غزل کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہیں۔

نعت محمد ﷺ صلی علیٰ

مصنف: شہزاد بیگ

صفحات: 176 قیمت: ندارد ناشر: اکادمی فیصل آباد، لاہور سن اشاعت: 2019ء

جب من کی دنیا میں عشق حقیقی کی آبیاری ہونے لگتی ہے تو حمد و ثنا لبوں کی دہلیز پر موجزن ہو جاتے ہیں۔ عشق حقیقی کے بغیر نعت کہنا ممکن نہیں ہے۔ شاہ اقلیم فراست محمد مصطفیٰ ﷺ کے حضور دل کی حضوری کا ہونا ضروری ہے۔ دل کی گہرائیوں سے مدحت رسول ﷺ کے لیے نکلنے والے لفظ طیبہ کی فضاؤں میں خوشبوئیں بن کر بکھر جاتے ہیں۔ من کا قاری شہنشاہ کائنات ﷺ کے ذکر سے ہمیشہ سرشار رہتا ہے۔ شہزاد بیگ نے اپنی شاعری کو توصیف فخر عالم محمد ﷺ تک محدود کر کے اپنی ذات کو لا محدود کر لیا ہے۔ فیصل آباد کو اس پر فخر کرنا چاہیے کہ عظیم ثنا خوان رسول ﷺ شہزاد بیگ کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ ولایت کے اس شہر پر جنھوں نے رحمت نعت کے لفظوں کی چھاؤں بنا رکھی ہے۔ وہ فیصل آباد کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت متحرک ادبی شخصیت ہیں۔

شہزاد بیگ بہت خوبصورت لب و لہجے کے شاعر ہیں ان کی کتابوں میں "شہر خاشاک" (1995ء)، "میری آنکھیں" (2008ء) اور "تہمت" (2016ء) شائع ہو چکی ہیں اور ابھی ان کا نعتیہ مجموعہ کلام "نعت محمد ﷺ صلی علیٰ" کے نام سے منصۂ شہود پر آیا

ہے۔ ان کے اس نعتیہ مجموعہ کلام پر معروف شاعر و دانشور افتخار عارف لکھتے ہیں:

''اردو ادب کی صدیوں پر محیط شاعری کے سفر میں قیام پاکستان کے بعد شعرائے کرام نے حمد و نعت و منقبت و سلام کا جو سرمایہ تخلیق کیا ہے پوری تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اپنے وجود کی بنیادی شناختوں میں عقیدہ و عقیدت کا اظہار تقدس و حرمت و معنویت عطا کرتا ہے۔ شہزاد بیگ کی ترسیٹھ (63) نعتیں سرکارِ دو عالم آقا ﷺ سے ان کے تعلق خاص کو ظاہر کرتی ہیں۔ ترسیٹھ (63) کا عدد نبی کریم ﷺ کی اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے برسوں سے ماخوذ ہے۔ اسلامی دنیا اپنے اپنے طور پر حضور ﷺ کی نسبتوں کا احترام کرتی ہے۔''

علاوہ ازیں اظہار خیال میں ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، محمد اقبال ساجد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، جلیل عالی، ناصر علی سید، سید زیب مسعود شاہ بخاری، تنویر سحری، کوثر علی، زاہد فخری، سرور حسین نقشبندی، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، پروفیسر محمد طاہر صدیقی اور پروفیسر ریاض احمد قادری کی قیمتی آرا بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ ایسے ادبی ستاروں کی قابل قدر معتبر آراء کے سامنے میری یہ چند سطور سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہیں۔ شہزاد بیگ نے فیصل آباد کو ''شہر نعت'' کا نام دیا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پروفیسر ریاض مجید نے سب سے پہلے نعت پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور قومی و صوبائی سطح پر ایوارڈ یافتہ نعت گو شعراء کرام کی کثیر تعداد کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ شہزاد بیگ ''مدعا شاعر'' میں لکھا ہے:

''ویسے تو میں نعت مصطفیٰ ﷺ شروع سے ہی کہہ رہا تھا مگر جب میری پہلی ملاقات صاحبزادہ علامہ نصیر الدین نصیر گولڑوی مرحوم سے ایک مشاعرے میں ہوئی تو میرا میلان نعت کی جانب زیادہ ہو گیا مجھے ان کی صدارت میں چار نعتیہ مشاعرے پڑھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میری ملک کے نعت کے ممتاز شعرائے کرام سے بھی قربتیں رہی ہیں۔''

یہ نعتیہ مجموعہ 176 صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی نعت صفحہ 45 سے شروع ہو رہی ہے۔ شہزاد بیگ کا اسلوب سادہ اور دلکش ہے۔ ان کے کلام کا بہت سا حصہ پڑھتے ہوئے فطری نغمگی کا ساتھ بن جاتا ہے۔ کئی نعت خواں حضرات نے ان کا کلام متعدد محافل میں پیش کر کے ان کی اپنی حاضری بارگاہِ رسالت ﷺ میں لگوائی ہے۔ ان کی ہر نعت موضوع کے اعتبار سے نہ صرف سلیس فن کا جادو ہے بلکہ سرکارِ کائنات ﷺ سے لازوال محبت کا اظہار ہے۔ ریاست مدینہ سے اسلامی جمہوریہ پاکستان تک پھیلے ہوئے تمام مسلمانوں کے لیے حضور ﷺ کی بارگاہ میں شہزاد بیگ نے کاسۂ التجا پیش کیا ہے۔ شہزاد بیگ سے واقفیت میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ ہم دونوں کا تعلق مغل خاندان سے ہے۔ مغلوں کی ادب دوستی اور ادب پروری سے کون واقف نہیں۔ شہزاد بیگ کی نعتیہ شاعری مدحتِ سرورِ کائنات ﷺ میں ہمہ وقت مصروفِ عمل ہے۔ کتاب کا ہر صفحہ ایک تازہ اسلوب رکھتا ہے۔

میرے نبیؐ نے ہر خطے میں دستک دی　　عربی، عجمی ہر لہجے میں دستک دی
ساری دنیا سوئی ہوئی تھی جب شہزاد　　شاہِ اممؐ نے ہر کونے میں دستک دی

ہر ذی روح اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جس ذات پاک ﷺ کا ذکر خالق کائنات قرآن پاک میں خود بلند کرے اس عظیم

ذات کی مدحت انسان کے بس میں نہیں ہے۔ کائنات میں ایسا جامع لفظ موجود نہیں ہے، جو رونقِ کائنات ﷺ، مقصودِ کائنات ﷺ، سیدالکائنات ﷺ کی تعریف پر پورا اتر سکے۔ مسلمان شعرائے کرام کے علاوہ غیر مسلموں نے بھی محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں گل ہائے نعت پیش کر کے آپ ﷺ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ شہزاد بیگ اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ انھیں اذنِ حضوری سے نعت کہنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ وہ عاشقِ رسول ﷺ ہیں اور اس کا اظہار ان کے نعتیہ کلام میں جا بجا موجود ہے۔

رکھا جو مری آپؐ نے غربت کا بھرم　　　یہ آپؐ سے آقا مری چاہت کا بھرم ہے

شہزاد بیگ کے نعتیہ مجموعہ کلام "نعت محمد ﷺ صل علیٰ" میں ان کی نبی معظم ﷺ سے محبت اور عقیدت کا اظہار، ان کی عاجزی و انکساری کا پتہ دیتا ہے۔ وہ نہایت سادگی اور سلاست کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ "نعت محمد ﷺ صل علیٰ" ان کی تخلیقات وجدان کا اظہار ہے۔ خوش بیانی، خوش کلامی اور خوش روانی نے ان کے حسنِ تخیل کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کا یہ نعتیہ شعری مجموعہ ان کے لیے توشۂ آخرت ہے۔

چسکیاں

مصنف : ڈاکٹر ذوالفقار علی

صفحات: 256　　قیمت: 500 روپے　　ناشر: محمد عابد، مثال پبلشرز، فیصل آباد

مزاح لکھنا دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے۔ مزاح زندگی کی حرارت بھی ہے اور جراحت بھی۔ انسان اس دنیا میں اکیلا ہنستے اچھا لگتا ہے اور تنہا روتے ہوئے۔ اسے ہنسنے کے لیے روبرو چہرہ درکار ہوتا ہے جب کہ رونے کے لیے ایک کندھے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مزاح انسان کے من سے پھوٹتا ہے۔ بسا اوقات انسان تنہائی میں خود پر بھی مسکرا لیتا ہے۔ اردو ادب میں مزاح نگاروں کی ایک پوری کہکشاں طنز و مزاح کے ہتھیاروں سے لیس منظرِ عام پر ہے۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی شعری مزاح نویس ہیں۔ ان کے قہقہوں کی دنیا اور تحریر کے چوکے چھکے مقبولیت کی باؤنڈری پر ہیں۔ ان کا آبائی علاقہ فیصل آباد ہے جہاں وہ 13 مارچ 1977ء کو پیدا ہوئے۔ 2009ء میں سہرا سجایا۔ اب ایک بیٹا اور دو بیٹیاں انھیں چٹکیاں بھرنے کے ساتھ ساتھ اٹکھیلیاں کرتی ہیں اور چھیڑ چھاڑ میں بھی پیچھے نہیں رہتیں۔ انھی بچوں نے ان کی چسکیوں میں بھی اضافہ کیا ہے۔ یہ پھول جیسے بچے ان کے لفظوں کو پیالے کی چسکیوں کے ساتھ محبت کی حرارت عطا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی نے اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ایم اے اور ایم فل اردو کی ڈگریاں حاصل کیں جب کہ پی ایچ ڈی، جی سی یونی ورسٹی لاہور سے مکمل کی۔ گورنمنٹ کالج جہلم سے 2005ء میں تدریس اردو کا آغاز کیا۔ گورنمنٹ سائنس کالج فیصل آباد میں بہار اردو بنے۔ 2013ء سے تا دمِ تحریر (6 جون 2021ء) گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج اصغر مال راولپنڈی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر اردو، طالب علموں کے اذہان قومی زبان کی شائستگی سے معطر کر رہے ہیں۔

قارئین ان کی ہر تحریر کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ ان کی کتب "اٹکھیلیاں" (2002ء)، "چھیڑ چھاڑ" (2007ء) اور "چٹکیاں"

(2012ء) کے بعد 2021ء میں ''چسکیاں'' عوام الناس کو گدگدا رہی ہیں۔ علاوہ ازیں تحقیق و تنقید میں نثر انگیزی میں بھی مقبول ہیں۔ ''اردو سفرنامے میں عکس نگاری کا رجحان'' اور ''اردو سفرنامے میں یورپ کی معاشرت'' نے انھیں مزید شہرت عطا کی ہے۔ ممتاز ماہرِ تعلیم، ماہرِ اقبالیات اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''ہم عصر مزاح کا منفرد مجموعہ'' کے عنوان سے کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ موضوعات ہم سب کے جانے پہچانے ہیں لیکن ہمارے عہد کے اکثر مزاح نگار یا تو ان کے قریب نہیں پھٹکتے یا سرسری اشارے کر کے گزر جاتے ہیں لیکن اس قدر تفصیلات اور جزئیات سے کوئی انھیں بیان نہیں کرتا۔ ہم عصر مزاح سے بھرپور یہ تحریریں کہیں بھی سرسری اور روا روی میں لکھی ہوئی محسوس نہیں ہوتیں۔ ہمارے ہاں زیادہ تر شوخیٔ طبع کی حامل تحریریں یا تو کالم کے طور پر لکھی جاتی ہیں یا ان پر کالموں کا گہرا پرتو ہوتا ہے لیکن اس کتاب کے تمام مضامین بڑی توجہ اور بڑی محنت سے لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

ڈاکٹر ذوالفقار علی چیزوں کا مشاہدہ اور ماحول کو ایک مشاق مزاح نگار کے طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ چیزوں کو سرسری دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ ان سے مزاح کشید کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ معمولی اور عام سی چیزوں سے بھی مزاح اٹھانے میں کامیاب و کامران دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ان کے مشاہدے اور تجربے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مزاح لکھنے والے تخلیق کار دوسروں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے کے لیے طولانی کی رات سے گزرتے ہیں اور آنکھوں کے کرب سے گزر کر مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ذوالفقار علی کا شمار ہمارے ملک کے ممتاز مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی مزاحیہ تحریروں سے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ عوام الناس سے لے کر خواص پسند طبقے تک ان کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مزاح کے حوالے سے ڈاکٹریٹ کرنے والے ڈاکٹر رؤف پاریکھ ان کے اس طنز و مزاح مجموعے پر لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ذوالفقار علی مزاح کے میدان میں نئے نہیں ہیں۔ اس کتاب سے قبل ان کی کئی مزاحیہ نگارشات نظر سے گزری ہیں۔ زبان درست لکھتے ہیں۔ شعر و ادب کا اچھا مطالعہ ہے۔ لفظوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔ سماجی و سیاسی شعور بھی تحریر میں جھلکتا ہے۔ حسِ مزاح بھی رکھتے ہیں گویا کامیاب مزاح نگاری کے تمام لوازمات ان کے پاس ہیں۔ اگر مزاح نگاری کا ایک اور گُر پلے باندھ لیں تو زیادہ کامیاب رہیں گے۔ وہ گُر ہے Brevity is the Soul of Wit. کسی نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے ''اختصار جانِ ظرافت ہے'' اس مجموعے میں شامل ان کے تین مضامین کا گُر ہی بازیاں، خود ساختہ تنقید اور حلقۂ اربابِ ذوق ادبی بین مختصر لکھے ہیں۔ بشمول ان مضامین کے ان کی جملہ نگارشات کے مطالعے سے قاری خود کو مسکراتے ہوئے پاتا ہے اور یہی مزاح نگاری کی کامیابی کا سب سے بڑا پیمانہ ہوا کرتا ہے۔''

ڈاکٹر ذوالفقار علی لفظوں کی قطع و برید سے بھی مزاح کشید کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ دلچسپ لفظوں سے آگہی اپنے قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ معاشرے میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہائیڈروجن زائل کرنے کے لیے ان کا قلم تازہ ہوا کے جھونکے خارج کرتا ہے۔ وہ بعض اشعار کی پیروڈی کر کے اپنے مضمون میں قاری کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر اس کتاب میں شامل چند ایک مضامین کے

عنوانات پر ہی غور کریں تو ڈاکٹر ذوالفقار علی کی حسِ مزاح شگفتگی کی صورت محسوس ہوتی ہے جیسے انھوں نے ''ساختیاتی تنقید'' کو انھوں نے ''خود ساختیاتی تنقید'' کا نام دیا ہے، اسی طرح ''حلقہ اربابِ ذوق'' کو ''حلقہ اربابِ جوک'' کا لبادہ پہنا دیا ہے۔ وہ ادبی محافل، تعلیمی اداروں، معاشرتی رویوں سے مزاح کشید کرتے ہیں۔ کورونا وائرس کو انھوں نے جس انداز میں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اس پر وائرس بھی ہاتھ ملتا رہ گیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کرکٹ کے کھیل کی طرح ہیں، چشمِ زدن میں نہ جانے گیند کا رخ کس طرح ہو جائے۔ وہ مزاح کے بلے باز بھی ہیں اور باؤلر بھی وہ لفظوں کی پچ پر بڑی احتیاط سے بیٹنگ کرتے ہیں۔ گراؤنڈ میں کھڑے وہ ایمپائر تو کیا تھرڈ ایمپائر بھی انھیں آؤٹ نہیں کرسکتا۔ ''چسکیاں'' کا عمیق مطالعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کی قبل ازیں شائع شدہ کتب ترقی کے زینوں پر ہیں۔ ''چسکیاں'' طنز و مزاح کی شاہراہ پر بھاگے دوڑے جا رہی ہے۔ یہ کتاب یقیناً صاحبانِ ذوق کے لیے فکر و آگہی اور تزکیہ تبسم کا باعث ہوگی۔

تم جو چاہو کرسکتے ہو (بچوں کی نظمیں)

مصنف : عاصم بخاری

صفحات: 128 قیمت : ندارد ناشر: ایم ارسلان پبلشرز لاہور

بچے ہماری معاشرتی ترقی کے لیے اساس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بچوں کی کردار سازی اور ان میں شعوری انقلاب پیدا کرنے کے لیے گھریلو ماحول کے بعد تعلیمی سرگرمیاں بہت ضروری ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیاں بھی لازم و ملزوم ہیں۔ ایک وقت تھا جب بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے قبیلے سے تعلق رکھنے والوں نے بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ اخلاقی تربیت میں بچوں کا ادب مقبولِ عام تھا۔ ادبی اعتبار سے خیالات کا اظہار بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے سنگِ میل ثابت ہوتا رہا۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ ہر محلے کی ایک گلی لائبریری کرائے پر کتابیں فراہم کرنے کا فریضہ انجام دیتی تھی۔ محلے کے لوگ چند (آنوں) کی کتاب کرائے پر لایا کرتے تھے اور باری باری اس سے فیض حاصل کیا کرتے تھے۔ بچے بھی اخلاقی کہانیاں پڑھنے میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کر کے اپنے ادبی ذوق کی تسکین کرتے۔ موبائل کے آتے ہی بچے تو کیا بڑوں کا ادب بھی ''بے ادب'' ہو گیا ہے۔ بچوں کے رسائل ادبی دنیا سے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ موبائل کے وائرس نے کورونا سے کہیں زیادہ بچوں کی صحت پر برا اثر ڈالا ہے۔ بچوں کی اخلاقی شمع ادب کو بادِ مخالف سے جو لوگ بچانے کی کوشش میں ہیں ان میں عاصم بخاری کا نام بھی شامل ہے۔ کتاب کی افادیت و اہمیت کا بخوبی ادراک کرنے کے لیے اہم معروف شاعر و ادیب، مدیر اسالیب سرگودھا ذوالفقار احسن کے زریں خیالات پر نظر ڈالتے ہیں :

> ''اردو کے ابتدائی دور میں امیر خسرو کی پہیلیاں ملتی ہیں پھر آگے چل کر اردو ادب میں میر تقی میر کے ہاں بچوں کی چند نظمیں ملتی ہیں ان میں موہنی بلی قابلِ ذکر ہیں۔ اس حوالے سے ایک طویل فہرست موجود ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے عاصم بخاری نے کمال ہنرمندی سے ادبِ اطفال میں اپنا حصہ ڈالتے ہوئے بچوں

کے لیے نہایت خوب صورت اور ان کی کردار سازی سے متعلق نظمیں ''تم جو چاہو کر سکتے ہو'' کہی ہیں ان کی یہ نظمیں بچوں کے لیے بڑی مفید اور اہمیت کی حامل ہیں۔''

بچوں کے لیے عاصم بخاری کی یہ نظمیں جہاں بچوں کی کردار سازی کرتی ہیں وہاں ان کے لیے اخلاقی تعلیم کا ذریعہ بھی ہیں۔ عاصم بخاری نے کمال محنت اور لگن سے نظمیں کہی ہیں جن میں مشاہیر تحریک پاکستان سے واقفیت کے ساتھ ساتھ قومی ہیروز سے بھی رشتہ جوڑا ہے۔ بچوں کو اپنے دینی و قومی تہواروں کا بھی علم ہونا چاہیے۔ عاصم بخاری نے اس فرض کی تکمیل کے لیے محنت شاقہ سے کام لیا ہے۔ انھوں نے یہ قومی فرض قرض سمجھ کر ادا کیا ہے۔ جناب شاکر کنڈان نے عاصم بخاری کی اس کاوش کو بجا طور پر سراہا ہے کہ ہمارے بزرگ شاعروں ادیبوں نے جس طرح نونہالوں کی آبیاری کی۔ عاصم بخاری ان روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش میں ہیں۔ عاصم بخاری نے بچوں کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ ان کے جذبہ حب الوطنی کا اظہار ہے۔ پروفیسر علی اعظم بخاری بھی اسی طرح رقم طراز ہیں:

''یہ عاصم بخاری کی کتاب بچوں کے بارے شاعری سے متعلق ہے اچھی نسل اور خاص کر انسانوں کی اچھی نسل وہ بنیادی ضرورت ہے جس کے بارے میں قرآن مجید اور رسول کریم ﷺ کے فرامین میں بہت اہمیت ہے۔ اصل میں انقلاب انقلابیوں سے نہیں اعلیٰ انسانوں سے آتے ہیں۔ اس بات کو زمانہ نہیں سمجھ پایا۔ فرمان نبوی ہے بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے یا اس کے والدین ہی ہیں جو اس یہودی، نصرانی اور منافق بناتے ہیں۔ مسلمان نہ سہی اچھا انسان ہی ہو۔ اس کے بغیر ناممکن ہے۔''

بچوں کے ادب کے حوالے سے بات کریں تو عاصم بخاری کا نام پوری شد و مد کے ساتھ سامنے آنے لگا ہے جنھوں نے ادب اطفال میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا ہے۔ بچوں کے لیے نہایت عمدہ اور با مقصد نظمیں کہہ کر ثابت کیا ہے کہ وہ بچوں کے اذہان تسخیر کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ شاعری میں کوئی ثقیل لفظ یا بھاری بھرکم ترا کیب سے بھی گریز کیا گیا ہے۔ عموماً چھوٹی بحروں میں یہ نظمیں کہی گئی ہیں۔ ان میں روانی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ عاصم بخاری نے بچوں کے ساتھ بچوں کو دوپ دھار کر ان کی انگلی پکڑ کر تعلیم و تربیت کے گلستان کی سیر کروائی ہے۔ زندگی کے حقیقی معیاروں اور ضرورت وقت سے وابستہ اہم فرائض کا احساس دلوایا ہے۔ بچوں کو کہانیوں اور نظموں کے ذریعے ان کی ذہن سازی کرنا نہایت مشکل اور دقیق کام ہے مگر جو لوگ ارادہ کر لیں وہ اس مشکل کو بڑی آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔ یہ ہنر ہر کسی کے پاس نہیں ہے کہ وہ بچوں سے مخاطب ہو سکے۔ بچوں سے مخاطب ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہاں پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار انجم، ڈاکٹر شاکر کنڈان، ڈاکٹر ریاض احمد قادری اور محمد شعیب مرزا نے بھی عاصم بخاری کے فکر و فن کو خوب سراہا ہے۔ عاصم بخاری کی نظموں میں بلا کی روانی اور نغمگی موجود ہے۔ یہ نظمیں گنگنائی جا سکتی ہیں بل کہ بعض نظمیں تعلیم نصاب کا حصہ بنائی جا سکتی ہیں۔ کچھ نظموں کا تقاضا ہے کہ انھیں گروپ کی صورت میں ساز و آواز کے ساتھ پیش کیا جائے۔ عاصم بخاری کی یہ کتاب ''تم جو چاہو کر سکتے ہو'' بچوں کے ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ پیارے تخلیق نما سونان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم۔ تخلیق مارچ 2021 شعر و ادب کے موتی لے کر آیا۔ ذوق و شوق والا مال ہوا۔ رمضان المبارک کے وسیلے سے دعا ہے کہ خدا آپ کو اور توفیق دے۔ اب کے تخلیق میں ہم دم دیرینہ سلطان سکون کی ''دید و شنید'' سے۔ اسعد علی۔ سکون صاحب کی شاعری روایت کی خوشیاں سمیٹنے والی شاعری ہے۔ غزل کے رسیا ہیں اور بلا کے سخن فہم۔ ''کرشن چندر اور گجرا بابا'' خالد عبداللہ کے قلم کے سائے سے نکلا ہوا تحفہ ہے۔ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کرشن چندر کی افسانوی حیثیت خاص محترم ہے۔ ان کا افسانہ زندہ رہنے والا کارنامہ ہے۔ ہم عصر بھی اس وقت کے افسانے میں بڑا نام رکھتے تھے۔ خالد عبداللہ پرانے لکھنے والے ہیں۔ تخلیق کے ایک پرانے شمارے میں ان کا افسانہ دیکھا تھا۔ ناصر علی سید نے ''تتلیاں اڑتی ہیں اور'' میں بڑے حسن سے تتلی تتلی کی دنیا پر پرواز کی۔ آپ دو رنگ اور پھر ناصر علی سید کی معصوم نثر کا ارژنگ۔ خوشی کی بات ہے محترم پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی دل ربا تحریر بھی تخلیق کا حصہ ہوتی ہے۔ پاکستان، علامہ اقبال، اور قائداعظم کے تناظر میں ڈاکٹر صاحب کی بیش قیمت کتابیں بعد شوق پڑھی جاتی ہیں۔ ان کی جو کتاب شائع ہوتی ہے وہ میرے نام ضرور آتی ہے۔ ان کی کتاب ''دریاب'' جذبہ لطف و کرم سے بھرپور ہے۔ کتاب مجھ سے ایک صاحب لے گئے ہیں تاایں دم لوٹائی نہیں۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ مجھ کو بھی پوچھتے رہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ پرویز حسن عسکری کا گلہ تھی نے انجم رومانی کے سے بڑے شاعر (بڑے انسان) کا ذکر کیا ہے۔ حسن عسکری صاحب کی اخلاص مندی اور محبت مجسم ہو وہ واقعی صدق صیف ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز موسیقی کے باب میں دست و قلم ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے متنوع موضوعات معلومات افزا ہوتے ہیں۔ استاد نصرت فتح علی خاں ایک ممتاز موضوع ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلم کی شائستگی اور متانت سے سرخ رو کیا ہے۔ موسیقی کی بہت سی باریکیاں ''تخلیق تصدیق'' ہیں۔ ذرا دیکھئے تو نعت کا یہ شعر ''دل جگر شکار'' سے کیا کہئے۔

آپ نے وار دی کی مجھ پہ نظر کرتے ہیں — میں نے بے مری تکرار سے آمین کہا

کمال ہے یہ سر!''

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

﴿2﴾ **پاکستان سلامت رہے**

بہت عزیز و محترم سونان اظہر صاحب سلامت رہیں خوش رہیں آمین۔ مارچ کا تخلیق وصول ہوا بہت بہت شکریہ اور دعا گو نیک تمنائیں۔ غزل اور خط کی اشاعت کا مزید شکریہ! اس شمارہ میں میرے بہت مہربان اور محترم نسیم سحر صاحب نے مجھ پر لکھی گئی کتاب معمار ادب پر نہایت محبت اور تفصیل سے بھرپور تبصرہ لکھ کر میری پرخلوص دعاؤں کے مستحق ہوئے ہیں۔ میری یہ حیثیت تو نہیں کہ میں موصوف

کو اپنا دوست کہہ سکوں کیوں کہ آپ ایک بہت نامور ادبی شخصیت ہیں۔ بے شک ہم نے شاعری کا سفر ایک ساتھ ہی شروع کیا لیکن آپ اپنی محنت اور لگن سے بہت بلند مقام پر فائز ہو گئے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید بلند مقامات سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔ مجھے حیرت بھی ہوتی ہے۔ کہ محترم نسیم سحر لکھنے پڑھنے کے علاوہ شاید ہی کوئی اور کام کرتے ہوں گے جیسا کہ اسی شمارہ میں چھ کتابوں پر تفصیلی اور خوبصورت تبصرے لکھے ہیں جنہیں پڑھ کر متعلقہ کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ چشم بددور آپ فی الواقعہ ایک چلتہ ہیں۔ وطن میں شائع ہونے والے ہر معتبر و مستند ادبی مجلہ میں آپ کی تخلیقات اور خطوط شامل ہوتے ہیں۔

تخلیق میں شامل ہر تخلیق لائق مطالعہ ہے۔ سب لکھنے والے معتبر مستند شخصیات ہیں۔ کس کس کی نام بنام تحسین کی جائے۔ آپ کی محنت اور حوصلہ بھی قابل تحسین ہے۔ پر خلوص دعاؤں کے ساتھ۔ خوبصورت کیلنڈر کا بھی اجازت چاہتا ہوں۔ بہت شکریہ

سلطان سکون (ایبٹ روڈ)

3 جون ڈیئر سونان!

السلام علیکم۔ تخلیق کا قافلہ نامساعد حالات میں بھی لیے جاتے ہو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دنیا میں ادب کی مختلف تحریکیں چلیں، پیروتعیّن ازم اور ادا گیلوت، ترقی پسند ازم وغیرہ وغیرہ جبکہ وطن عزیز میں Brulleism تحریک سرکار چلا رہی ہے کہ ادیبوں شاعروں کے منہ میں لگام ڈال کر سواری کی جائے۔ اسے اپنے راستے پر سرپٹ دوڑا دیا جائے۔ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی سے ہوتے ہوئے اشفاق احمد تک پہنچی۔ پھر سرکار نے خود یہ کام سنبھالا۔ ٹیلی ویژن کا شادی دفتر بھی اسی کا مظہر ہے۔ شادی شادی شادی اور پھر دو منٹ بعد ایک نعرہ گونجتا ہے تو تم شادی کرلو۔ میں شادی کرلوں۔ برصغیر تو 1857 سے سو برس قبل ہی غلام بن چکا تھا اور ہم لوگ اور حکمران محض وظیفہ خوار تھے۔ انہیں صرف عشق و محبت کی آزادی تھی اور اردو شاعری بھی کالونیئل دور کی پیداوار ہے۔

وطن کہاں جا رہا ہے شعر و ادب کس رخ پر رواں ہے۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ طوائفوں کا ملک تھائی لینڈ کہاں جا پہنچا اور بنگلہ دیش کہاں جا نکلا۔ ہم شادی شادی کھیلنے برباد ہو گئے۔ نسیم درانی معروف و معتبر افسانہ نگار بتلاتے ہیں کہ جب تیار ہوتا تو مصنف سی آئی ڈی کو فون کرتے۔ وہ حوالدار جیپ کا ملاحظہ کرتے اور فرماتے کہ فلاں فلاں فقرے حذف کریں۔ فلاں مکالمہ کاٹ دیں۔ جنرل ضیاء نے اسلامستان بنانے کیلئے ادیبوں کے منہ بھی لگام ڈال رکھی تھی۔ جس کے باعث پاکستانی قوم نے پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ ورنہ گلی محلے میں علمی لائبریریاں ہوا کرتیں۔ خود میں بھی اپنے دوست فیاض رضوی کی لائبریری پر بیٹھا کرتا۔ ادب اور ادیب بدوؤں کے اونٹ نہیں ہیں جن پر غریب مسلم ملکوں کے بچے باندھ کر ایک خاص سمت میں دوڑایا جائے۔ مشاعرہ بھی بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے دوست نسیم احمد بادینی کو دس لاکھ روپیہ دیا جاتا کہ سیرینا ہوٹل میں جنرل ناصر جنجوعہ کے زیر صدارت مشاعرہ ادبی تقریب کریں۔ پھر اس کی تصویریں پورے ملک میں پھیلا کر دعوے کرتے کہ بلوچستان میں امن قائم ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے سیرینا ہوٹل میں تو امن ہی رہتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں قلم کی کوئی وقعت نہیں۔ اسی شہر میں ادیب بلا علاج ایڑیاں رگڑتے مر گئے۔ وادی، وانا، قلات پر فوج کشی ہوتی تھی تو اگلے ہی چند روز میں وہاں مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ سوات میں شاعر تھر کرائے گئے جن کے سبب جنگل میں منگل ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر ہی نے گزشتہ برس دیکھا کہ پچیس لاکھ واپس جا رہا ہے تو جون میں ایک ہی دن ڈگری میں مشاعرہ برپا کر دیا۔ یہ FATF کی گرے لسٹ والی قوم کیا کر

رہی ہے۔ یہ صاحب دل دیکھتا ہے۔ ادیب شاعر تو صرف لکھ ہی سکتا ہے۔ اسے لکھنے کی اجازت دی جائے۔ شادی شادی میں ڈوب کے عظیم کو باہر نکالا جائے۔" مالک" ڈی قلم بنانے والا کوئٹہ کا سمجھتی ڈرامہ نگار کشمیر کی اصل علامت چھوڑ کر کینیڈا میں لگ چلا جانے پہ کیوں مجبور ہوا۔ یہ سب ہمارا ادبی المیہ ہے۔ جسے ہم توجہ کیوں نہیں دیتے۔ ڈاکٹر عظیم گل کیوں کینیڈا اسے چھپانے پہ مجبور ہیں۔ مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ میرے دوست اظہر جاوید کی ادبی پالیسی برقرار رکھیں۔ ان کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ میں نے ایک بار خط میں لکھا کہ آپ کہتے ہیں نیا افسانہ ہو گیا افسانہ سبزی کی دکان ہے کہ باسی ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ آپ کا تجربہ پرانے پادشاہوں سے ملتا ہے جو باہر رہ گئے تھے۔ میں ششدر رہ گیا کہ اگلے شمارے میں میرا ادبی خط شائع کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ اظہر جاوید دلوں پہ راج کرتا ہے۔

آغا گل (بلوچستان)

﴿4﴾ محترمی جناب سونان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم، ورحمۃ اللہ امزاج گرامی! مجھے ماہنامہ تخلیق کا مارچ 2021ء کا شمارہ ملا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔

یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنے والد گرامی کے نام اور کام کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ بلکہ آپ ان کے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ مذکورہ شمارے میں متنوع اور قابل قدر مواد جمع کیا گیا ہے۔ ممتاز شاعر انجم رومانی کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں جناب حسن عسکری کاظمی کا مضمون بہت اہم ہے۔ افسوس ہے کہ انجم رومانی کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ حسن عسکری کاظمی صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس موضوع پر توجہ کی۔ اور کچھ بنیادی معلومات فراہم کیں۔ اس طرح استاد نصرت فتح علی کے بارے میں ڈاکٹر امجد پرویز کا مضمون بھی بہت وقیع ہے اور فنی بصیرت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اگر مضمون کے آخر میں بعض غیر معروف فنی اصطلاحات کی تشریح بھی کرا دی جاتی تو بہتر ہوتا۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی کوئی تحریر برائے اشاعت ارسال کروں۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام

اسلم انصاری (ملتان)

﴿5﴾ محترم سونان اظہر!

ماہنامہ تخلیق ملا۔ پڑھا روح میں بہار آ گئی۔ حیران ہوں چمکتے ذہنوں کے اتنے لوگ آپس کے دانوں کی طرح ہیں۔ جسے آپ نے پرو کر تخلیق کو تخلیق کیا ہے۔ ایسا کرنا سونان اظہر آپ ہی کا کام ہے۔ آپ جیتے رہے میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

شجاعت ہاشمی (لاہور)

﴿6﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم۔ امید ہیں مزاج بخیر ہوں گے۔ یہ 2006ء کا تذکرہ ہے جب میری ظریفانہ شاعری کا پہلا مجموعہ "اناروانے" شائع

ہوا تو میں اس کا ایک نسخہ اظہر جاوید کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ان کے دفتر حاضر ہوا۔ بہت محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ اور اپنے پرچے تخلیق میں ان کا تبصرہ بھی چھپا۔ جس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ ادب کے لیے بلاشبہ ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے تخلیق کی اشاعت کا سلسلہ جس کامیابی سے جاری رکھا ہوا ہے۔ اس کے لیے آپ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ دعا ہے کہ ادب کی خدمت کا یہ سلسلہ یوں ہی رواں دواں رہے۔

تخلیق مارچ 2021ء اپنے دامن میں بہت سے ادبی ذائقے لے کر نظر نواز ہوا۔ متنوع مضامین کے مطالعے نے بہت لطف دیا۔ جاوید عباس کا مضمون ''پہلی اردو ادب کی بھولی بسری صنف تھی'' بہت اچھا لگا۔ برادر عزیز ڈاکٹر اختر شماری ''پی ایچ ڈی یاترا'' کا پسند آنا تو یقینی بات ہے کیونکہ جی سی یونیورسٹی میری بھی مادر علمی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر اختر شمار سے میری شناسائی ہوئی اور وہ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کے نگران بھی بنے۔ شاعری کے حصے میں بہت سی غزلوں اور نظموں نے دل کو چھوا۔ محترم نسیم سحر کی امت کی وادت دینا اضافی ہوگی۔ انھوں نے کتب پر مختصر لیکن جامع اور خوبصورت تبصرے تحریر کیے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے لیے تخلیق ایوارڈ کا اعلان ہوا تو سے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ ایوارڈ کی اس تقریب کے نہ ہونے کا بہت افسوس ہوا لیکن یہ فیصلہ طمانیت کا باعث ہے کہ آپ تخلیق کا ڈاکٹر رشید امجد نمبر شائع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد میرے استاد محترم ہیں۔ سرسید کالج میں ان سے چار سال پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ حسب ارشاد تخلیق کے لیے طرحیہ کلام حاضر ہے۔ آپ کی محبت اور توجہ کا بہت شکریہ۔ سلامت رہیں۔

ڈاکٹر بدر منیر (جوہر آباد)

47) دعا گو ہیں۔ دسمبر اور مارچ کے دوبارہ بھیجے گئے تخلیق موصول ہوئے کہ پہلے بھیجے جانے والے شمارے میرے بے ادب ڈاکیے کی بے توجہی کی نذر ہو گئے تھے۔ تمہیں خبر ہوئی تو دونوں شمارے حسب تعلق محبت سے رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج دیے۔ جیتے رہو ۔۔۔ رہیت روایات سے جڑے رہو کہ یہ سب تمہیں وراثت میں ملا ہے۔

ایک بات ہمیشہ کی طرح حمل اور مدلل مخالفتی اداروں کے بعید کھوتی رہی۔

یاران اظہر جاوید لکھتے ہی جی بھر آیا۔ ہائے ۔۔۔ کیسے کیسے لوگ زمین اوڑھ کے سو گئے ان دو برسوں میں کتنے روشن چراغ گل ہوئے۔ اردو ادب سونا سونا لگنے لگا اس پر کرونا کے موذی مرض نے چاروں اور دہشت پھیلا دی۔ لوگ ایک دوجے سے اور دور ہو گئے ایک دوسرے سے منہ چھپانے پھرنے لگے۔ اس ظالم وبا نے تو وہ تقریب بھی نہ ہونے دی۔ اہل علم و ادب جس کا سال بھر انتظار کیا کرتے تھے اس پہ ستم یہ کہ اس برس کے صاحب ایوارڈ بھی عدم سدھارے جن کے اعزاز میں جشن تخلیق 2021 منایا جانے والا تھا۔

رشید امجد ہمارا اثاثہ ہمارا فخر تھے۔ ایک بے مثال انسان، باکمال استاد عمدہ نثر نگار، جو لفظوں سے تصویر بنانے کا ہنر جانتے تھے۔ جن کا بڑا افسانہ میں وحدۃ الوجود کے پرچم تھی تخلیق میں ''عاشق صبر طلب'' سب سے پہلے توجہ کا مرکز بنی تھی۔ اللہ غریق رحمت کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ گوشہ طفیل اختر نے آبدیدہ کر دیا۔ بہت نفیس ہستی، بہت بردبار شخصیت، ہلکی ہلکی مسکراہٹ، دھیما دھیما لہجہ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے سنگت زیادہ دن بھی رہی ہو مگر وہ دل پہ نقش ہو جاتے ہیں۔ طفیل اختر ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ میری ان

سے آخری ملاقات زرین پنا کے گھر ڈنر پہ ہوئی تھی۔ پروین عظیم نے ''دادا شفیق اختر کے نام خط'' میں دل کا درد لفظوں میں بھر دیا ہے خاص طور پر خط کے یہ جملے

''یہ خبر سن کر مجھے ایک چپ سی لگ گئی ،میری آنکھیں نہیں چھلکیں ،آنسوؤں نے آپ کی موت پر احتجاج کر دیا اور ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہ ٹپکا''۔

پینتالیس برس کا ساتھ ہو تو درد لفظوں سے چھلکنے لگتا ہے چاہے آنکھ سے آنسو نکلیں نہ نکلیں۔ آفتاب خان نے بھی زندگی کے ایام کے روبرو بیٹھ کے یادوں کی راکھ کریدی ہے اور اپنے نوحے کو ''رنگ گہرے ہیں تیری یادوں کے'' کا نام دے کر اپنے اور دادا شفیق اختر کی پینتالیس برسوں کی سنگت کو لفظوں کا پیراہن دیا ہے۔ اس شمارے کے مضامین خوب ہیں محترم غلام حسین ساجد نے ایوب خاور کی شاعری کی پرتیں دھیمے سروں میں کھولی ہیں۔ ایوب خاور یوں تو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں مگر غلام حسین ساجد کے مضمون کی پہلی قسط میں ایوب خاور کی شاعری کے ادوار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور خوبصورت نظموں کے اقتباسات میں ان کی شاعری کو دوبارہ پڑھنے پر اکسا گئے۔ حسن عسکری کاظمی ہمارے عہد کا ایک معتبر نام ہیں۔ انجم رومانی پر ان کا مضمون خاصے کی چیز ہے۔ ناصر علی سید نے ''تتلیاں اڑتی ہیں اور ان کے پکڑنے والے'' میں ہمیں ماضی کی ان آوازوں کی بازگشت سنا دی ہے جو کہ اب معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ جاوید عباس جاوید کی ''کھچڑی'' ہمیں چار دہائیاں پیچھے لے گئی ہے جب رشتہ داروں میں محبت ہوا کرتی تھی اور بچوں کی دنیا موبائل تک محدود نہیں تھی بلکہ نانی، دادی سے کہانی سنے بغیر سونے کا تصور ہی نہیں تھا جب گھر کے لوگ، گھر میں ایک دوسرے کے ساتھ رہا کرتے تھے اور بڑے بوڑھے ذہنی آزمائش کے لئے بچوں سے پہیلیاں بجھواتے تھے۔

افسانوں میں نسیم آ ہجہ کا افسانہ ''عشق دی جگی وچ سور بلیندا'' لفظوں کی حسین تصویروں میں پہلا عشق و محبت کی کلاسک داستان سنا رہا ہے۔ عطیہ سید کے افسانہ میں ایک فیشن ایبل خود پرست حسینہ موت کے خوف سے ادھ موئی نظر آتی ہے۔ باقی افسانے ابھی نہیں پڑھ سکی کہ تسنیم رشید بٹ کا ضروری تھا ابھی خط لکھ رہی تھی کہ ہماری پیاری نیلم احمد بشیر کی بہن سنبل شاہد کی موت کی خبر تمہارے صبح سے ملی اف!

اٹھ گئی ہیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں روئیے کس کے لئے کس کس کا ماتم کیجئے

آتش کا یہ شعر آج کل کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہوا احمد بشیر کے لواحقین کے لئے ایک اور دکھ کی گھڑی ''چار چاند'' نیلم کے چمن میں سے ایک گہنا گیا۔ اللہ رب العزت مرنے والی کے درجات بلند کرے اور نیلم کے خاندان کو صبر عطا کرے۔ آمین

ساری دنیا اس کرونا کے خوف کے حصار میں ہے ہر طرف بے سکونی ،بے چینی ،بے اطمینانی اور بے یقینی کی کیفیت ہے جو اس موذی مرض کے ہاتھوں جان ہار گئے اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور جو اس وبا سے حالت جنگ میں ہیں ان پر اپنا خصوصی کرم فرمائے ان کی زندگی بخش دے۔ آمین! ایک نظم انہی بے اطمینان دنوں میں تخلیق ہوئی بھیج رہی ہوں پروف ریڈنگ کا دھیان رہے کہ مارچ کے شمارے میں دی گئی میری چھوٹی سی نظم میں پروف کی کئی غلطیاں نظر آ رہی ہیں۔ جیتے رہو۔

تسنیم کوثر (لاہور)

عزیزم سوہان اظہر سدا سلامت رہو!

السلام علیکم! مارچ کا تخلیق ماہ مئی کے آخری دنوں میں ملا اور کرونائی فرصت کے باعث ایک ہفتے میں ہی پڑھ ڈالا۔ سب سے پہلے حذیفہ سوہان کے تخلیق کردہ دل آویز سرورق پر نظر پڑی تو بڑی خوشی ہوئی۔ برخوردار نے لفظ تخلیق کو چار چاند لگا کر بڑی خوبصورت تخلیقی تجسیم کی ہے۔ اس عمدہ کاوش پر میری طرف سے اسے خصوصی شاباش دینا۔ ''کھلی بات'' میں آپ نے تخلیق کی ''گولڈن جوبلی'' پر بجا طور پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ آپ کا یہ عزم کہ ''دم ہے تو تخلیق پیہم رہے گا'' انتہائی قابلِ ستائش ہے۔ محترم ڈاکٹر رشید امجد کی موت کا سن کر دلی دکھ ہوا۔ اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آپ نے جون میں ان کے خصوصی نمبر کے لیے بڑی اچھی نظم کا انتخاب کیا ہے۔

نامہ پرویز پڑھی بنام اظہر جاوید پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ گوشۂ شکیل اختر میں پرویز عظیم اور آفتاب خان نے ''راوی'' کو بڑے من موہنے انداز سے یاد کیا ہے۔ مضامین سبھی دلچسپ اور معلوماتی تھے۔ غلام حسین ساجد نے ''محبت اور مزاحمت کا شاعر: ایوب خاور'' کے عنوان سے ان کی شاعری کو بڑے احسن انداز سے اجاگر کیا ہے۔ مسلم شمیم نے اکیسویں صدی، ادب اور ادیب کا مختصر مگر ایک جامع تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی نے اپنے مضمون میں انجم رومانی کی فکری بصیرت کو اعلیٰ اشعار کے ساتھ بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ڈاکٹر ندیم شفیق ملک مرحوم اور یحییٰ سروش نے جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور شب خون کے حوالے سے اردو ادب کے مہا گرو کو ان کی ادبی کاوشوں کی روشنی میں انھیں بہترین خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ناصر علی سید نے اپنے مضمون میں اردو انگریزی کے بارہ ناول میلی پر اچھی بحث کی ہے۔ محترم خالد عبداللہ کے مضمون ''کرشن چندر اور پیرا بابا'' کا پہلا حصہ پسند آیا۔ جاوید عباس جاوید نے چکوال کی بڑی دلچسپ تاریخ بیان کی ہے۔ سیج آہوجہ کے افسانے ''عشق دی جگی وچ مور بولیا'' کی بھول بھلیوں بھری کہانی پسند آئی۔ خاقان ساجد کے افسانچے، عطیہ سید کے افسانے ''لڑکی اور کروٹ'' اختر سعید کے ''صبرِ جمیل'' محمد اقبال فیروز کے ''ابا'' ایسے افسانوں کی کہانیاں اور زبان و بیان خاصے پُرکشش تھے جبکہ محمد اسلم کا افسانہ ''سراب'' اور حنیف باوا کے افسانے ''بوڑھا چوکیدار'' اور اشرف ہاشمی کے افسانے ''گرداب میں پھنسے لوگ'' کی کہانیاں تو ہماری ہی زندگی کے قصے دکھائی دیے۔ شائستہ مفتی اور آغا شاہد کے افسانوں کے اچھوتے عنوان اور کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔ ڈاکٹر اختر شماری یادیں اور ڈاکٹر امجد پرویز کا نصرت فتح علی خان کی شخصیت اور فن پر لکھے مضمون خاصے کی چیز ہے۔ آقاشف خان کا تخلیق کا دس سالہ جائزہ بڑی عرق ریزی سے تیار کیا ہوا دکھائی دیا۔ جناب نسیم سحر نے دسمبر کے تخلیق اور کتب پر بڑے جاندار تبصرے لکھے۔ حصہ نظم و غزل بھی شوق سے پڑھا گیا۔ اس مرتبہ انجمن خیال کی محفل میں بائیس خطوط شامل تھے۔ ان میں سے ڈاکٹر اجمال بیگ، خالد عبداللہ، نور کمال شاہ، ماجد وفا عابدی، رشیدہ آفرین کے قدرے طویل خطوط میں گذشتہ شمارے کی تحریروں پر نقد و نظر کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ صد افسوس کہ اس انجمن کے سینئر رکن اور ممتاز شاعر جناب امین راحت چغتائی کی سناؤنی بھی آ گئی۔ ان کی موت کا دلی دکھ ہوا۔ اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔

ایم ڈی ملک (راولپنڈی)

﴿9﴾ السلام علیکم!

سلطان اظہر آپ خیریت سے ہوں گے۔ اس سے پہلے بھی ایک عدد خط اور دو غزلیں رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوائی تھیں۔ جو آپ کو نہ مل سکیں۔ اب کیا کہا جائے اس نظام کو۔ خیر اب رشید امجد صاحب پر مضمون لکھ کر بھجوا رہی ہوں خدا کرے یہ آپ کو مل جائے ۔۔۔ یہ بھی رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے بھجوا رہی ہوں۔ آپ کا رسالہ بہترین تحریروں سے مزین ہوتا ہے رسالے کے ٹائٹل سے لے کر ہر چیز آپ کے اعلیٰ ذوق اور معیار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ رسالے کی کامیابی کی ضمانت اس کا بروقت آنا ہے۔ آپ اور حسین مجروح یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں آپ تخلیق کو اور حسین مجروح (ادب لطیف) کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اللہ پاک آپ کو ہمت دے (آمین) سلطان آپ نے ادیبوں کو ایوارڈ دینے کا جو سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ کسی ادیب کو اس کی زندگی میں ایوارڈ مل جانے سے اس کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے۔ آپ کی محنت رنگ لے آئے گی۔ ہر ادبی محفل میں آپ کی اس کاوش کو سراہا جاتا ہے۔ جانتی ہوں رسالہ نکالنا کوئی ایسا آسان کام نہیں ہے۔ پھر آپ اتنی شاندار تقریب کا اہتمام کرتے ہیں اور ادیبوں کو ایک جگہ جمع کرنا یہ سب مشکل کام آپ احسن طریقے سے سرانجام دیتے ہیں اللہ پاک آپ کو مزید ہمت عطا کرے۔ (آمین) میری طرف سے آپ اور آپ کی ٹیم کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

شاہین زیدی (لاہور)

﴿10﴾ محترم جناب سلطان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم۔ مزاج بخیر! امید ہے آپ سب اہل خانہ، اہل ادب بالکل خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کے تخلیق میں سرورق کے اندر یاران اظہر جاوید اور اظہر جاوید کی اپنی تصویر دیکھ کر دل افسردہ تو ہوا مگر یہ امر باعث مسرت ٹھہرا کہ آپ نے ان کے دوستوں کو بڑے اہتمام سے یاد رکھا۔ آپ نے پچھلی بات میں جس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح سے ادبی رسائل معاشی مسائل کا شکار ہوتے ہیں تو یہی باتیں اظہر جاوید بھی ''قبیلہ والو تو سنو'' کی طرح کیا کرتے تھے۔ بہر حال لکھاریوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کا رویہ ابھی بھی بے نیازی کا سا ہے آپ جس ہمت سے یہ ادبی علم بلند کیے ہیں وہ لائق ستائش ہے۔ یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ آپ ادب کی مختلف جہتوں کو شامل اشاعت کرتے ہیں جن میں حمد و نعت، دعا، باب تو رقی، گوشہ خلیل اختر، مضامین، منظومات، افسانے، غزلیں، یادیں، موسیقی، پنجاب رنگ، سرائیکی گوشہ، انشائیے، طنز و مزاح، جائزے، تبصرے، تیسم تحریر کے، انجمن خیال کے علاوہ تخلیق کو موصول کتب و رسائل ملکی و غیر ملکی شامل ہیں۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

﴿11﴾ مکرمی و محترمی تسلیمات! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ مارچ 2021 کا ''تخلیق'' اپنی رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ سرورق سے لے کر آخری صفحے تک تمام تحاریر دامن دل کھینچتی ہیں۔

حصہ حمد و نعت روحانی واردات سے مالا مال ہے۔ حسن عسکری کاظمی، خالد اقبال یاسر اور شہباز انور خان کے نگینے عقیدت قابل تحسین ہیں۔ چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں۔

دنیا میں رہ کے یاد خدا میں کمی نہ ہو ۔۔۔ رحم و وفا کا اب بھی دل و جاں سے پیار ہو

التجا یہ مری کس پیار سے آمین کہا   بار بار آپ نے اصرار سے آمین کہا

خدا کے بعد درجہ ہے انہی کا   وہی محبوب رب العالمین ہیں

'نایاب تو شہ' واقعتاً نایاب ہے۔ پرویز بزمی کے 9 مئی، 2008 کے اس مکتوب نے جاوید اظہر اور انور سدید کی رفاقتوں کا ذکر پر اثر انداز میں کیا ہے۔ خط کے آخری پیرے میں پرویز بزمی صاحب نے جس فراخ دلی کا اظہار کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔

مسلم شمیم کا 'اکیسویں صدی، ادب اور ادیب' پر مختصر مقالہ ہے۔ اس میں ادب کے ارتقائی مدارج کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے فن اور ادب پر سہیل سروش کا مضمون (شمس الرحمٰن فاروقی اور شب خون) ایک معتبر کوشش ہے۔ افسانوں میں علیہ سید کا 'لڑکی اور کروٹ' خاصے کی چیز ہے۔ باقی افسانے بھی خوب ہیں۔ حصہ غزل میں انور شعور، صابر ظفر اور ڈاکٹر ایوب ندیم خوب ہیں۔ اپنی جگہ پر باقی شعراء بھی کچھ کم نہیں۔ حسب روایت ڈاکٹر امجد پرویز نے استاد الفرت فتح علی خان کے فن پر سیر حاصل گفتگو کر کے قارئین کیلئے دنیائے موسیقی کے اس شہنشاہ کا خوب تعارف کرایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ وہ آئندہ بھی قارئین کو ایسی تحریروں سے نوازتے رہیں۔

محمد اسلم (لاہور)

﴿12﴾ محترم سلمان اظہر صاحب!

السلام علیکم! 2015 میں محترم ناصر علی سید صاحب کی وساطت سے تخلیق تک پہنچا تھا چنانچہ اسی وقت سے تخلیق کا مستقل قاری ہوں۔ ان چھ سات سالوں میں مدیر محترم کے اہداف کا تعین ہو چکا ہے۔ اپنے عظیم والد جناب اظہر جاوید صاحب کے مشن کو پورا کرنا انہوں نے اپنا مقصد بنا لیا۔ کسی بھی مقصد تک بہترین انداز میں پہنچنے کے لئے پرواز میں کوتاہی سے بچنا ضروری ہوتا ہے۔ سلمان اظہر نے کام کو اپنا شوق بنا لیا اور یہی سبب ہے کہ اب انہیں کام کرتے ہوئے مزہ بھی آ رہا ہے اور بلند پروازی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مگر میں ادبی رسالے کو زیادہ پسند کرتا ہوں کیوں کہ یہاں آپ کو ایک نشست میں کئی مزے دیکھنے کو ملتے ہیں اور آپ کے ذوق کا ہر سامان یہاں میسر ہوتا ہے۔ تخلیق بھی ان ہی خوبیوں سے متصف ایک شاندار ادبی جریدہ ہے۔ مارچ کا شمارہ حسب معمول اپنی سج دھج کے ساتھ وقت مقررہ پر شائع ہوا۔ اپنی باتیں میں محترم مدیر نے جو نکات اٹھائے ہیں ان سے اختلاف کی گنجائش کہاں۔ کاش کہ ہم سمجھ جائیں۔ حمد و نعت کے نذرانے کے بعد پرویز بزمی کا اظہر جاوید کے نام خط شامل رسالہ ہے۔ طفیل اختر صاحب کی خدمات کے اعتراف کے طور پر گوشہ طفیل اختر رکھا گیا ہے جس میں دو مضامین شامل ہیں۔ محمد پرویز عظیم اور آفتاب خان نے طفیل اختر کی خدمات و کارہائے نمایاں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ حصہ مضامین میں اس دفعہ آٹھ مضامین شامل ہیں۔ غلام حسین ساجد، مسلم شمیم، حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، سہیل سروش، ناصر علی سید، خالد عبداللہ، اور جاوید عباس جاوید جیسے بڑے بڑے قلمکاروں کے مضامین شامل اشاعت ہیں۔ ان عظیم ادیبوں کا نام ہی ان کے معیار کا ثبوت ہے۔ تخلیق نے جانے کیسے اتنے بڑے اور روشن ستاروں کو تخلیق کی آسمان پر یکجا کیا ہے۔ ان کا ایک ساتھ ایک ہی فورم پر اکٹھا کرنا کارنامہ ہی کہلایا جا سکتا ہے۔ نظم کے حصہ میں بھی بڑے بڑے نام چمک رہے ہیں۔ جمیل احمد عدیل، شہزاد نیر، تسلیم کوثر، شبیہ

طراز ظفر نیل، عاصم بخاری اور اظہر جاوید کی تخلیقات شامل ہیں۔ افسانے بھی خوب ہیں اور تجسس کو ابھارتے ہیں۔ ملکہ ترنم نور جہاں سے متعلق بیش بہا معلوماتی خزانہ پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر امجد پرویز نے حضرت فتح علی خان سے متعلق نیا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کی پہلی قسط اس شمارے میں پیش کی گئی ہے۔ طنز و مزاح کے حصے میں دو مزاحیہ تحریروں کے ساتھ مزاحیہ شاعری بھی شامل ہے جو لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتی ہے۔ ڈاکٹر اختر شمار کی جی سی یونیورسٹی سے متعلق یادیں بھی کافی دلچسپ ہیں۔ آفتاب خان نے تخلیق کا تین سالہ جائزہ بہت خوبصورتی اور عرق ریزی کے ساتھ تحریر کیا ہے اور اس کی پہلی قسط اس رسالے میں شامل ہے۔ غزلیات بھی حسب معمول بہترین ہیں اور دلوں کے تار چھیڑتی نظر آتی ہیں۔ نسیم سحر صاحب نے سات کتابوں پر جاندار تبصرے پیش کئے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے اور قارئین کے خطوط پر مشتمل انجمن خیال حسب سابق میگزین کا حصہ ہیں۔ جاندار شمارہ پیش کرنے پر مدیر محترم سونان اظہر صاحب ادارہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ دعا ہے کہ تخلیق کی بلند پروازی کا سلسلہ اسی طرح جاری و ساری رہے۔

نور کمال شاہ (پختونخواہ)

(13) محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون! آپ کا محبت نامہ ''ماہنامہ تخلیق'' کی صورت میں موصول ہوا۔ آپ ایک دلیر طبع لکھاری اور قابل قدر مدیر ہیں۔ پہلی بات میں آپ کے عمدہ خیالات دل کو بھاتے ہیں۔ مرحوم اظہر جاوید کے زمانے میں بھی عرض کیا تھا کہ جو مزہ ''ماہنامہ تخلیق'' خرید کر پڑھنے میں ملتا ہے وہ رسالہ مفت حاصل کرنے میں نہیں ملتا۔ پھر بھی لوگ رسالہ مفت حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ پھر بھی رسالہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ صرف دیکھنے کا شوق پورا کرتے ہیں۔ جناب عالی! موجودہ شمارے کے مشمولات میں حمد اور نعتیں ہماری روحانی تسکین کا سامان تھیں۔ محترم ڈاکٹر حسن عسکری صاحب کی حمد باری تعالیٰ کا ہر شعر قدرت کے در بالطف سے پیش کرتا ہے۔ اسی طرح دونوں نعتیں قلب و نظر کی روشنی اور مدحت سرائی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ تمام مضامین بھی عمدہ اور دلچسپ ہیں۔ شکیل اختر دادا پر محترم آفتاب خان کا مضمون بہت پسند آیا۔ انہوں نے شکیل اختر دادا کو جس طرح ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ صرف انہی کا حصہ ہے۔ ''اکیسویں صدی، ادب اور ادیب'' جناب مسلم شمیم صاحب کا اعلیٰ فکر انگیز مقالہ ہے۔ ان کی تمام سوچ کے انداز قابل قدر ہیں۔ اس طرح محترم ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی صاحب کا مضمون ''انجم رومانی'' میری خاص پسند کا مضمون ہے۔ ان کا انداز تحریر بہت دلکش ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بہت مناسب اور بہت بہترین اشعار شامل کئے ہیں۔ جو حقیقت میں انجم رومانی کی فکری بصیرت کے مظہر ہیں۔ غزلیں سب اچھے اور بلند خیالات سے معمور ہیں۔ جناب رحمت امین چغتائی صاحب کی غزل استادانہ انداز سخن کی بہترین مثال ہے۔ اس طرح جناب سلطان سکون صاحب کی غزل اپنے دلکش انداز اظہار کے لحاظ سے ایک انمول شعری تخلیق ہے۔ خاص کر یہ شعر تو بہت دل کو لگتے ہیں۔

بہت ہی سست تیرے انتظار کی گھڑیاں گھڑی گھڑی جو ہم اپنی گھڑی کو دیکھتے ہیں

اس طرح پروفیسر رشید آفریں کی غزل موجودہ ملکی حالات پر شاندار شاعرانہ تبصرہ ہے۔ انہوں نے دکھ بھرے خیالات عمدہ الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں۔

اک طرف ہیں تمدن کے آتش فشاں اک طرف خون انساں کی ندیاں

چاند سے چہرے کے ابر چھائے ہیں — ظلم کی کوندتی ہر طرف بجلیاں
سب زبانِ تفکر کی تحسیں علی — کاوشِ جذبوں کی ہیں آفریں کرچیاں

یہ اشعار فکر انگیز ہیں۔ اور قابلِ داد ہیں۔ یہ اشعار قابلِ غور ہیں۔ ان اشعار کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کا مکمل اعادہ ضروری سمجھا ہے۔ جناب نسیم سحر کے تبصرے بھی خوب ہیں، اور انجمن خیال کے تمام خطوط شمارے کی زیبائی میں اضافہ کرتے ہیں۔ عمدہ الفاظ کے ساتھ تنقیدی اور تعریفی خیالات مطالعے کے لطف میں اضافہ کرتے ہیں۔ آخر میں آپ کی اور آپ کے تمام رفیقانِ کار کی خدمت میں ہدیہ عید مبارک پیش کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر مرحوم اظہر جاوید ضرور یاد آتے ہیں۔ والسلام

خالد عبداللہ (راولپنڈی)

14 جون ”تخلیق“ کا مارچ 2021ء کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق سادہ مگر کتاب، گلدان اور پھولوں سے سجا ہوا، بہت اچھا لگا۔ سادگی اور فطری حسن میں اپنا ہی مزہ ہے۔ لطف ہے۔ کتاب اہلِ علم و فکر کی پہچان ہے۔ پھول جمالیاتی ذوق کی جان ہے۔ ہر تحریر گلہائے رنگ رنگ کی تعبیر بن کر چمنستانِ زیست کی زینت ہے۔ گھپ اندھیروں میں امید کی کرن ہے۔ عجز و انکساری اور سادگی سے زندگی خوشگوار اور حسین بن جاتی ہے۔ چکا چوند روشنیوں اور مصنوعی رنگینیوں میں قوسِ قزح رنگ بھرنے والے بھلا ان فطری رعنائیوں اور بہاروں کو کیا جانیں۔

”تخلیق“ کی حسین اور خوشگوار زندگی کا سفر جاری و ساری ہے اور اس نے اپنی گرانقدر ادبی خدمات کے باعث اپنے منفرد وجود اور افادیت کا لوہا منوایا ہے۔ سونان صاحب! آپ اور آپ کی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے کہ جن کی بے لوث علمی و ادبی خدمات دنیائے علم و ادب میں نمایاں ہیں۔ اعلیٰ معیار کی بدولت ”تخلیق“ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ آپ کا حسنِ انتخاب لاجواب ہوتا ہے۔ بلاشبہ آپ لوگوں نے تخلیق (اس نے تخلیق) کو تخلیق بنا دیا ہے۔ ”تخلیق“ مقناطیسی اثر رکھتا ہے اور اس نے اپنی کشش سے اپنے ارد گرد علم و ادب کے روشن اور چمکتے ستاروں کی ایک کہکشاں سجا رکھی ہے۔ ”تخلیق“ کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے اور نت نئے قارئین میسر آ رہے ہیں۔

نااہل وارث اپنے گروہ بندی کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں اور اپنی پہچان بھول جاتے ہیں۔ وہ اپنے بڑوں کی روایتوں اور طور طریقوں کو بھی لاوارث کر دیتے ہیں۔ اس حوالے سے آپ ”تخلیق“ کے حقیقی وارث ہیں کہ آپ نے اپنے والد صاحب کی روش کو برقرار رکھا اور اسے آگے بڑھایا ہے۔ تخلیق ایوارڈ بھی ”تخلیق“ کی پہچان بن چکا ہے۔ ایمان داری، دیانت داری، غیر جانبدارانہ رویہ اور سچے جذبے تخلیق ایوارڈ کے رہبر اصول ہیں۔ ایوارڈ کا اعلان ہونے سے پہلے تک ایوارڈ حاصل کرنے والے کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ یہ ایوارڈ اسے ملے گا۔ تخلیق ایوارڈ عدل و انصاف کا مظہر ہے۔ کاش! دیگر ادارے بھی تخلیق کے نقشِ قدم پر چلتے اور ذاتی تعلقات، ترجیحات، مصلحتوں اور دھڑے بندیوں کا شکار نہ ہوتے۔

تخلیق ایوارڈ کا انتخابی عمل دیگر اداروں کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے۔ یہ ایک غیر محسوس طریقے سے ان کی تربیت بھی ہے۔ ضروری ہے کہ اس طرزِ عمل اور طریقہ کار کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھی جائیں اور اپنے ضمیر کو مرنے نہ دیا جائے کہ اسی میں انسانیت کی حیثیت ہے۔ عزت ہے۔ بڑائی ہے۔ کسی انسان کو بھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی خود غرضانہ حرکتوں کو کوئی سمجھ نہیں پاتا۔ وقت کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ بھی وقت پر بولتا ہے اور انسان کی غلط حرکتوں کے باعث اسے شرمسار کر دیتا ہے۔ ہر انسان اور ادارے کا ایک

طریقۂ واردات ہوتا ہے جو کہ عشق اور مشک کی طرح ڈھکا چھپا نہیں رہتا۔ اس لئے شرمندگی اور پچھتاوے سے بچنے کے لئے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بعض اوقات انتہائی زیرک اور جہاندیدہ لوگ بھی اپنی صاف دلی اور نیک نیتی کے باعث اجلے اجلے چہروں والے لیکن من کے کالے لوگوں کی بظاہر اور دروغ بیانی اور صحافتی باتوں میں آ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اخلاقیات کا درس دینے والوں کی اکثریت خود اس خوبی سے عاری ہوتی ہے۔ ان کے قول و فعل میں واضح تضاد ہوتا ہے۔

اس فن میں شعراء اور ادباء ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں چوریاں ہی چوریاں ہوتی ہیں لیکن باتیں کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی کرتے ہیں۔ ہمیں کھلے دل سے ان باتوں کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ صاحبِ کردار اور سچے لوگ ہی ہمارے لئے مینارۂ نور ہیں۔ وہ دہکتے انگاروں پر ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ ان کے طرزِ عمل سے صداقتیں ٹپکتی نظر آتی ہیں۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل بھی کر کے دکھاتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد صاحب اور ڈاکٹر ندیم شفیق ملک صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! اس شمارے میں حمد و نعت، شاعری اور نثر سراپا انتخاب ہے۔ تخلیق میں نامور لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے اور ان کی تخلیقات ذہن و دل میں اتر جاتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال صمصام (مردان)

﴿15﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

سلام بخیر۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ تخلیق کا تازہ شمارہ (مارچ) ملا۔ اس عنایت کے لیے شکریہ۔ پچھلے شمارے پر یوٹیوب چینل پر تبصرہ کیا تھا۔ اس شمارے پر بھی پروگرام کتاب کہانی میں تبصرہ ہو گا۔ اظہر جاوید صاحب کے جاری کیے ہوئے جریدے کو آپ جس لگن سے شائع کر رہے ہیں اس کے لیے آپ کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ میرے والد بشیر رحمانی بھی شاعر تھے اور میں بھی اسی طرح ان کی یادیں تازہ کرتا رہتا ہوں اس حوالے سے ایک شعر بھی کہا تھا۔

اس کے اندر فقیر ہوتا ہے باپ بھی ایک پیڑ ہوتا ہے

محمد نوید مرزا (لاہور)

﴿16﴾ ڈئیر سونان اظہر جاوید صاحب!

دعائیں۔ امید ہے آپ بمع اہل خانہ خیریت سے ہوں گے۔ ایک مدت کے بعد تخلیق نظر نواز ہوا۔

ماشاءاللہ وقت کے ساتھ اس کی آب و تاب میں بے حد اضافہ ہو چکا ہے۔ پرچہ دیکھ کر عزیز دوست اظہر جاوید کی یاد تازہ ہو گئی اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین! اظہر جاوید کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے آپ لائق تحسین ہیں۔ حذیفہ سونان کا سرورق بہت خوبصورت اور بامعنی ہے۔ ماشاءاللہ سلامت رہے۔ میرے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ میرے سفرنامے پر تبصرہ تخلیق میں ہوا۔ اتنے شاندار اور بھرپور تبصرے کے لیے میں آپ کی اور نسیم سحر صاحب کی بے حد شکر گزار ہوں۔

سیما پیروز (لاہور)

•••

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ تیرگی خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک 0333-5692521	ماہنامہ اطراف کراچی ایڈیٹر : محمود شام 0300-8210636	ماہنامہ شاہکار کراچی مدیر : ریحان احمد فاروقی 0336-2479501
ماہنامہ ادب لطیف لاہور ایڈیٹر : ناصر زیدی 03014096710	ماہنامہ حکایت لاہور مدیر : عارف محمود 0323-4329344	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر : شاہد علی خان 0301-4001844
ماہنامہ ہمدرد صحت کراچی مدیر اعلیٰ : سعدیہ راشد 021-36610039	سہ ماہی [illegible] لاہور مدیر : اشرف کمال 0300-4224210	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر : عمران منظور 0300-8430043
ماہنامہ [illegible] سرگودھا مدیر : پروفیسر شیخ محمد اقبال 0300-4489390	ماہنامہ ہلال راولپنڈی مدیر : یوسف عالمگیرین 0333-5255465	سہ ماہی [illegible] سرگودھا مدیر اعلیٰ : یوسف چوہان 0301-6791402
[illegible] لاہور چیف ایڈیٹر : [illegible] 042-36367573	ماہنامہ [illegible] فیصل آباد مدیر اعلیٰ : پروفیسر [illegible] 0333-6665331	سہ ماہی [illegible] لاہور مدیر اعلیٰ : بیگم شاہین زیدی 0333-4722999

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	[illegible]	حسن عسکری کاظمی	0345-4698398	[illegible] لاہور	-
2	اردو افسانہ تخلیق تنقید	شکیل احمد صدیقی	0300-6991126	[illegible] پبلی کیشنز لاہور	260/-
3	[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	0300-6668284	[illegible] پبلشرز فیصل آباد	500/-
4	[illegible]	عاصم بخاری	0301-6765314	[illegible] پبلشرز لاہور	-
5	[illegible]	[illegible]	0332-4381192	[illegible] پبلشرز فیصل آباد	500/-
6	[illegible]	[illegible]	0302-7844097	[illegible] پبلی کیشنز لاہور	400/-
7	[illegible]	اقبال [illegible]	0333-5900103	[illegible] پبلی کیشنز لاہور	500/-

نوٹ: ادارہ ''تخلیق'' اپنی تمام پالیسیاں مجلس مشاورت کی باہمی رضامندی سے مرتب کرتا ہے۔ ادارے کو ہمیشہ تبصرے کے لئے دو کتابیں ارسال کریں۔ کسی بھی وصول ہونے والی ایک کتاب پر ادارہ تبصرہ نہیں کروا سکتا۔ (ادارہ تخلیق)

ممتاز شاعر، ادیب اور ''ماہنامہ تخلیق'' کے مدیر

اظہر جاوید

کی مطبوعات جن پر انہیں 2012 میں ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' دیا گیا

[illegible] اظہر جاوید [illegible] اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب، مشہور شاعر اور معروف صحافی ہیں۔ آپ جنوری 1938ء سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ نے [illegible] آپ [illegible] وہاں کے تھے۔ سرگودھا میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے دوران آپ نے ہفت روزہ [illegible] کی ادارت کی۔ آپ نے مشہور شاعر جناب الطاف مشہدی کی مدد سے ہفت روزہ ''خلوص'' کا آغاز کیا۔ اس کے بعد [illegible] میں ادبی حلقے [illegible] طور پر شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی آپ نے ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کالم لکھنے [illegible] آپ 43 سال تک مدیر کے طور پر ادبی جریدے ''تخلیق'' کی بے لوث ادارت کرتے رہے۔ اظہر شاعر اور ادیب بڑی تعداد میں [illegible] شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کو ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی جانب سے متعدد بین الاقوامی انعامات ملے ہیں۔

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE

JUNE 2021

CS CamScanner

یارانِ اظہر جاوید

ڈاکٹر رشید امجد
1940-2021

ڈاکٹر انور سدید
1928-2016

[illegible]
1925-2017

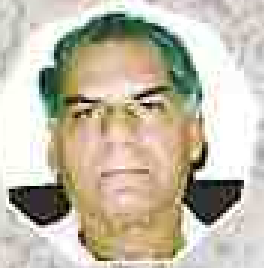

شفیع عقیل
1930-2013

[illegible]
1945-2015

حامد سراج
1958-2019

[illegible]
1940-2019

[illegible]
1944-2017

اظہر جاوید 1938-2012

[illegible]
1920-2019

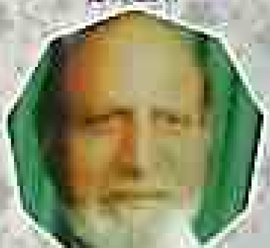

پروفیسر جمیل آذر
1930-2018

افتخار مجاز
1953-2019

ملک مقبول احمد
1930-2019

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش
1958-2019

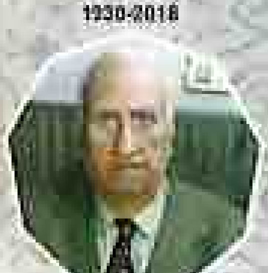

[illegible]
1929-2019

مسلسل اشاعت
کا 52
واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 51 | مارچ 2021ء | شمارہ : 3 | CPL نمبر 96

قیمت : -/350 روپے .... 1,600 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر — ہندوستان کے لیے 2,000 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt. (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نصیر جہاں (امریکہ) ...... ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان ـــ جان آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نو وارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رواں رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

51 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد وآباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِتعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِسالانہ صرف -/2,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

PAKISTAN	INDIA	U.S.A.	U.S.A.
Javed Manzoor	K.L. Narang Saqi	Fouzia Mushtaq	Nayyar Jahan
78-Islam Block, Azam Garden,	C-4-Connaught Circus, New	9 Industrial Court	2700 South Barrington
Multan Road, Lahore	Delhi-110001, India	River Side Rodhe	AVE Los Angles
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Island	C.A. USA
Cell: [illegible]	Email: narangsaqi@gmail.com	Ph: 001-[illegible]	Ph: [illegible]
Email: [illegible]@hotmail.com		Email: [illegible]@gmail.com	Email: [illegible]@hotmail.com
			[illegible]@urdu-markaz.com

○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — حسن عسکری کاظمی — 7
نعت رسول مقبولؐ — خالد اقبال یاسر
نعت رسول مقبولؐ — شہباز انور خان — 7

نایاب توشہ

نامہ اظہر جاوید — پرویز بزمی — 8

گوشۂ طفیل اختر

طفیل اختر کے نام خطوط — محمد پرویز علیم — 12
طفیل اختر دادا..... رنگ گہرے — آفتاب خان — 15

مضامین

محبت اور مزاحمت کا شاعر —— غلام حسین ساجد — 19
اکیسویں صدی، ادب اور ادیب — سلیم حکیم — 25
انجم رومانی —— حسن عسکری کاظمی — 31
ڈاکٹر ندیم شفیق ملک — ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم — 35
شمس الرحمٰن فاروقی اور —— شکیل سروشی (انڈیا) — 37
تتلیاں اڑتی ہیں اور ان... — ناصر علی سید — 42
کرشن چندر اور ''پکڑا گیا'' — خالد عبداللہ — 44
شکیل، اردو ادب کی بھولی بسری... — جاوید عباس جاوید — 49

منظومات

شہزاد نیر، تسنیم کوثر، پروین شیر، اسحاق وردگ، جمیل احمد عدیل، — 51
ایف طراز، اظفر نیل، محمد سلیم ساغر، عاصم بخاری، اظہر جاوید — 53

افسانے

عشق دی گلی وچ کوئی نہ جاوے — سمیع آہوجہ — 54
بے زبان — خاقان ساجد — 64
لڑکی اور کرونا — عطیہ سید — 65
صبر جمیل — اختر سعید مدان — 68
اکیلا — محمد اقبال فیروز — 75
سراب — محمد اسلم — 81
بوڑھا ظفر — لطیف بابا — 83
گرداب میں پھنسے لوگ — اشرف آثاری (انڈیا) — 84
کہانی — 1 — شائستہ مفتی — 87
وہ عکس دو روپ میں — آغا شاہد — 89

غزلیں

انور شعور، امین راحت چغتائی، سلطان سکون، ضیاء ظفر، — 91
آصف ثاقب، نجیب احمد، سید ریاض حسین، ڈاکٹر ادیب ندیم،
احمد علی، ماجد یزدانی، رشیدہ قریشی، طلعت عتیق، توقیر مشتاق،
اسحاق وردگ، محمد سلیم ساغر، خالد ندیم شانی، شبیر ناز، طاہر شفیق،
احمد یار، جاوید عباس جاوید، جسارت خیالی، اقبال ندیم گرگ — 97

یادیں

جی سی یونیورسٹی کی یادیں — ڈاکٹر اختر شمار — 99

موسیقی

استاد نصرت فتح علی خان — ڈاکٹر امجد پرویز — 102

پنجاب رنگ

گلیاں رت تُوں بھلیاں	حنیف باوا	110
محراں نا ہیں محراں جھڑیاں	سلیم شہزاد	
پنجابی غزل	ماجد وفا عابدی	110

سرائیکی گوشہ

سرائیکی کافی	بشریٰ رحمٰن	111
بھوک	بشریٰ رحمٰن	
صوفیانہ کلام	بشریٰ رحمٰن	111

انشائیے

2 جولائیاں	سید تحسین گیلانی	112

طنز و مزاح

انکشافات	ڈاکٹر انعام الحق	114
محو حیرت	ڈاکٹر بدر رحیم	114
گردن	ڈاکٹر محسن مگھیانہ	115
میرے سرتاج	نور کمال شاہ	117

جائزے

ماہنامہ "تخلیق" کا 50 سالہ جائزہ	آفتاب خان	120
"تخلیق" دسمبر 2020ء پر ایک نظر	نسیم سحر	128

تبصرے نسیم سحر کے

پاسبان کا مطلب کیا؟	آغا گل	130
کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے	قیصر نجفی	
میزان نظر	حسن عسکری کاظمی	
اُردو افسانہ: تخلیقی تنقید	جمیل احمد عدیل	
میرے راستے اُدھوری ملاقات	سیما عابدی	
سلطان سکون: شخصیت و فن	قمر زمان	
سنگِ زیست	ساجد ہاشمی	
تخلیق دسمبر 2020ء	ناصر علی سید	140

انجمن خیال

امین راحت چغتائی، سلطان سکون، آصف ثاقب، بشریٰ رحمٰن، سید ریاض حسین زیدی، عباس رضا، شہزاد نیّر، شجاعت ہاشمی، ایم ڈی ملک، ڈاکٹر اشرف آجاری، شہباز انور خان، تسلیم کوثر، خالد عبداللہ، نور کمال شاہ، ماجد وفا عابدی، رشید آفرین، محمد اسلم، جاوید عباس جاوید، محمد اقبال صمصام، خالد عبداللہ، ڈاکٹر محسن مگھیانہ 141 — 159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

ملکی اور غیر ملکی 160

خصوصی پینل "ڈاکٹر رشید امجد نمبر"

محترم نسیم سحر (اسلام آباد)، محترم شہزاد نیّر (لاہور)، محترمہ عطرا اصغر (لاہور)، محترم منظر علیم کرک (لاہور)، محترم آفتاب خان (لاہور)

سرورق

حذیفہ سونان

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: حسین مجروح

مطبع: نگینہ پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقام اشاعت

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(ایڈیٹنگ کے حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی بات

"تخلیق" کو الحمدللہ شائع ہوتے 51 سال مکمل ہو گئے۔ "تخلیق" نے ہمیشہ سے نئے لکھنے والوں کو پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں سے وہ نقطۂ عروج تک پہنچے اور سب سے بڑھ کر تخلیق نے جس "ادبی ایوارڈ" کا اجرا 2012ء سے کیا اس کا ذکر ہر خاص و عام کی زبان پر ہے اور یہ "تخلیق ایوارڈ" اب سب سے بڑا ادبی ایوارڈ تصور کیا جانے لگا ہے۔ اس ایوارڈ کی اہمیت کا اندازہ اس کو حاصل کرنے والے وہ نام ہیں جو خود کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ جناب شفیق عقیل، ڈاکٹر انور سدید، محترمہ بانو قدسیہ، محترمہ منیر جہاں، محترم عطاء الحق، محترم پروفیسر حسن عسکری، محترم سرفراز سید، محترمہ بشریٰ رحمٰن اور اب محترم ڈاکٹر رشید امجد۔ سچ تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایوارڈ بخوشی قبول کر کے اس "تخلیق ایوارڈ" پر مہر لگا دی کہ ادب کی دنیا میں خالصتاً میرٹ کی بنیاد پر دیا جانے والا واحد ایوارڈ صرف "تخلیق ایوارڈ" ہی ہے۔

ان 51 سالوں میں نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے ادبی جرائد بھی بند ہو گئے۔ "تخلیق" کی مسلسل اشاعت کا سہرا ان تمام اصحاب کے سر جاتا ہے جو اندرون و بیرون ملک اپنی محبتوں کے دامن میں سموئے "تخلیق" کو ہر جگہ لیے پھرتے ہیں اور ادب کی دنیا میں نئے قاری سے متعارف کرواتے ہیں۔ یہ انہی احباب کی محبتوں کا ثمر ہے کہ "تخلیق" ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ ادبی رسائل کے خریدار اور ان کے لئے اشتہارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ اچھے اور معیاری رسائل بھی اپنے مدیروں کی عظمت سمیت اشتہارات اور خریداروں سے محروم رہے اور آخر کار بند ہو گئے۔ ادبی رسائل کو حکومتی سرپرستی نہ ہونا ادب کا زوال ہے اور دوسرا المیہ یہ ہے کہ اچھے خاصے خوش حال ادیب اور شاعر بھی مفت پرچہ لینا فخر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا اعلیٰ ذہن کی تصدیق اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انھیں تمام کتابیں، جرائد مفت ان کے پتے پر باقاعدہ وصول ہوتے رہیں انھیں شاید وہ کھول کر پڑھنے کی بھی زحمت نہ کرتے ہوں۔ یہ سوچ انفرادی طور پر ہر ایک کو تبدیل کرنا ہوگی بلکہ کئی معزز لکھاری جو اخلاقیات کا درس دیتے نہیں تھکتے یہ زحمت بھی نہیں کرتے کہ اگر پتہ تبدیل ہو تو اطلاع دے دیں۔ اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ اگر گھر کا پتہ بھی تبدیل ہو جائے تو کئی ماہ بعد شکایت نامہ کی صورت میں ایک کال وصول ہوتی ہے کہ آپ کا پرچہ نہیں ملا گویا یہ بھی مدیر کی ذمہ داری ہے کہ وہ گھر تبدیل ہونے یا پرچہ کسی بھی وجہ سے نہ ملنے کی صورت میں ذمہ داری کو قبول کرے۔ میں پہلے ان چیزوں سے جھنجھلا جاتا تھا، چڑچڑاہٹ کا اظہار کرتا تھا لیکن اب میں ان سب چیزوں کو سہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ سوچتا ہوں مجھے تو قدرت نے مافوق الفطرت طور پر "تخلیق" کو جاری رکھنے اور والد کے نام کو تاحیات زندہ جاوید رکھنے کے لئے چن لیا ہے۔ ہر وہ مدیر اور ادیب کامیاب ہے جو اپنی جیب سے جریدہ یا کتاب کا خرچہ برداشت کر سکے اور پھر خود جیب سے پیسے لگا کر انہیں پوسٹ کرنے کی استعداد بھی رکھتا ہو۔ خداوند کریم کا یہ شکر ہے کہ "تخلیق" کسی کا محتاج نہیں۔ کسی ادیب، شاعر اور مخصوص گروپ کے زیر اثر بھی نہیں اور رہی میری ذات تو مجھے نہ کسی کا چسکا ہے نہ شہرت کا لالچ۔ بس دعاؤں کا طلب گار ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ میرا یہ عمل میرے بیٹے کی طاقت بن جائے کہ میرے بعد میرا بیٹا "تخلیق" جاری رکھ سکے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ حکومتی ادارے کب تک سوتے رہیں گے؟ صرف اداروں کے سربراہ تبدیل ہونے سے کیا نظام تبدیل ہو جائے گا؟ اکادمی ادبیات پاکستان کے کیا فرائض ہیں کوئی بتائے گا؟ مقتدرہ کس حال میں ہے؟ مجلس ترقی ادب، بزم اقبال، بزم ثقافت، نیشنل بک کونسل، اردو سائنس بورڈ یہ سب ادارے جس مقصد کے لئے وجود میں آئے کیا اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان سوالات کے جواب آپ پر چھوڑ دیے

جاتے ہیں؟ جہاں ادب کا کام ہونا چاہیے وہ تو ہو نہیں رہا! ہمیں نظر نہیں آ رہا! ادب میں بھی "پکڑو اور پکڑ دو" کی رسم اتنی گھمبیر ہو چلی ہے کہ لگتا ہے ہر شخص نے خود ہی اپنی شہرت کا علم پکڑ رکھا ہے۔ جیسے وطنیے یا تو خود کو اس دوڑ سے الگ کر چکے ہیں یا اسی سوچ رکھنے والوں سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں۔ کوئی بھی راہ حق پر چلنا چاہے یا غلط ہونے والے کام پر آواز بلند کرے تو لوگ انہیں پاگل کہتے ہیں۔ اب ایسے میں کون خود کو پاگل کہلانا پسند کرے گا؟ انہی دیوانوں میں ایک نام اظہر جاوید کا تھا جس کے نام سے کون واقف نہ ہوگا۔ غلط کو غلط کہنے کی پاداش میں ہمیشہ نقصان اپنے ترازو میں ڈالا اور چپ چاپ اس دنیا سے چلے گئے۔ 43 سال تک ادب کی شمع کو اپنے خون سے جلائے رکھا اور اس عہد کو نبھاتے چلے گئے کہ "ہم ہے تو تخلیق ہے، ہم رہے گا" اور پھر دنیا نے اس دیوانے کے چلے جانے پر دیوانہ وار کہا "کسی عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" اب ادب میں ایسے عاشق کہاں سے آئیں گے؟

ارشاد ہے "اپنے مرنے والوں کو اچھے لفظوں میں یاد رکھو" "ادب چاہے جتنی مرضی بلندی پر پہنچ جائے اور نیا لکھنے والا چاہے ستاروں کو چھو لے یہ اعتراف بہرطور ہوگا کہ قد آور عظیم لوگوں کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے پُر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اسی صف کا آخری نام موجودہ عہد کے معتبر افسانہ نگار ڈاکٹر رشید امجد تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ "تخلیق ایوارڈ" کی مبارک باد دینے اسلام آباد جانے والے دوستوں کی یہ ان کے ساتھ آخری نشست ہوگی۔ کاش کہ کرونا کے جن سے جان چھوٹ جاتی اور یہ تقریب ان کی زندگی میں فروری 2021ء میں ہی منعقد ہو جاتی؟ کرونا کی صورت حال اور ڈاکٹر امجد رشید کی رحلت کے صدمے کو دیکھتے ہوئے کمیٹی سے مشاورت کے بعد اس تقریب کو اگلے سال تک منسوخ کر دیا گیا ہے اور کمیٹی کی مشاورت سے جون 2021ء میں ادارہ "تخلیق" نے "رشید امجد نمبر" نکالنے کا اعلان کیا ہے۔ ہم سب دوستوں کا فرض ہے کہ رشید امجد کی محبت کا اظہار قلم کی طاقت سے کریں اور اس نمبر کو "اظہر جاوید نمبر" اور "ڈاکٹر انور سدید نمبر" کی طرح کامیاب بنانے میں پورا حصہ ڈالیں۔ اس نمبر کی تکمیل کے لئے باقاعدہ ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو اس نمبر کی تکمیل کرے گی۔ اس کمیٹی کے نام اور فون نمبر نیچے دیے گئے ہیں۔ اللہ آپ کو آپ کے اہل خانہ کو کرونا جیسے وبائی مرض سے محفوظ رکھے اور آنے والے رمضان المبارک کی خوشیاں بار بار دیکھنا نصیب فرمائے۔ آمین!

رب راکھا!

سونان اظہر جاوید

●●●

ضروری اطلاع

جون 2021ء میں "ڈاکٹر رشید امجد نمبر" کی تیاری کی ذمہ داری مندرجہ ذیل رفقا نے بخوشی قبول کر لی ہے لہٰذا اب قارئین سے گزارش ہے کہ کمیٹی کے ارکان سے تعاون کریں اور کسی بھی طرح کی تفصیل یا رہنمائی کے لئے رابطہ کریں۔

نمبر شمار	نام	شہر	فون نمبر
-1	میجر شہزاد نیر	لاہور	0321-8110989
-2	محترمہ عذرا اصغر	لاہور	0300-8839895
-3	محترم نسیم سحر	راولپنڈی	0333-5415091
-4	محترم مظہر سلیم مجوکہ	لاہور	0333-4377794
-5	محترم آفتاب خان	لاہور	0306-4564755

حمد و نعت

حمد

عرفان و آگہی کا جو ساماں ہے چار سُو
کھولا ہُوا خدا نے دبستاں ہے چار سُو

قدرت نے گل کھلائے ہیں صحنِ بہار میں
صحرا کی وسعتوں میں گلستاں ہے چار سُو

خلقت تمام حشر سے پہلے ہے بے قرار
ہر لحظہ جیسے دید کا ساماں ہے چار سُو

دنیا میں رہ کے یادِ خدا میں کمی نہ ہو
ذکرِ وفا کا اب بھی درماں ہے چار سُو

منظر تو شب کا میرے تصور کا ہے کمال
گویا فلک پہ ایک چراغاں ہے چار سُو

گلی حرم میں زندہ رہے گا یہ معجزہ
صبح و مسا تلاوتِ قرآں ہے چار سُو

پہچان اس کی کب رہی دشوار اے حسنؔ
ذروں میں اس کا نور تو رقصاں ہے چار سُو

حسن عسکری کاظمی

ooo

نعت

التجا جو مری کس پیار سے آمین کہا
بار بار آپ نے اصرار سے آمین کہا

آپ نے دیر نہ کی مجھ پہ نظر کرنے میں
میں نے بے صبری میں تکرار سے آمین کہا

جب دعا رد ہوئی آپ کی ہر کار نفس
میں نے اک بار سے کی اک بار سے آمین کہا

آپ نے میری شفاعت میں کمی کوئی نہ کی
میں نے بھی جذبۂ بیدار سے آمین کہا

آپ ہر طور مرادوں کو مری بر لائے
صرف لفظوں نہیں کردار سے آمین کہا

آہ و زاری مری خود آپ نے سُن کر ہر بار
دل سے قبل ہوئی گفتار سے آمین کہا

آرزو فتح کی جب کی سرِ میداں میں نے
آپ نے غضب کی جھنکار سے آمین کہا

خالد اقبال یاسر

ooo

نعت

محمدؐ رحمت اللعالمیں ہیں
وہ رونق آسماں، رونقِ زمیں ہیں

انہیں کا ذکر فرش و عرش پر ہے
کئی سارے انہیں کے خوشہ چیں ہیں

ہیں ان کے دم سے گلشن میں بہاریں
وہی تو رونقِ دنیا و دیں ہیں

نبیؐ کوئی نہیں ہے بعد انؐ کے
قیامت تک وہی مسند نشیں ہیں

عمل معیارِ حق اعمال اُن کے
وہ خود تفسیرِ قرآنِ مبیں ہیں

خدا کے بعد رتبہ ہے انہی کا
وہی محبوبِ رب العالمیں ہیں

وہ جن کے دل میں عشقِ مصطفیٰ ہے
مدینے میں ہیں وہ چاہے کہیں ہیں

شہباز انور خان

ooo

نایاب توشہ

نامہ اظہر جاوید

پرویز بزمی

نوٹ : اظہر جاوید بانی ''تخلیق'' کے پرانے کاغذات سے پرویز بزمی صاحب کا ایک خط برآمد ہوا جو ادبی امانت سمجھ کر ادارہ تخلیق شائع کر رہا ہے۔

محترم جناب اظہر جاوید صاحب! السلام علیکم! تخلیق نوازی کا شکریہ۔ تخلیق کے ایک گزشتہ شمارے میں میں نے 1913ء میں ٹیگور کو نوبل ادبی انعام دیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ 2009ء کا نوبل انعام سنتے پال آ تھے، ڈاکٹر وزیر آغا کو ملنا چاہیے۔ وہ شمارہ کوئی صاحب لے گئے ہیں تخلیق کی فائل میں تو ہوگا۔ اب تخلیق اپریل 2008ء میں میرے مطبوعہ خط میں ''1913ء کے نوبل ادبی انعام'' کو نشان زد کرتے ہوئے آپ نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے۔

''اس سن کا حوالہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا۔ پہلے بھی 1909ء لکھا گیا تھا جسے 2009ء کر دیا ہے۔ واقعی پرویز بزمی ضعیف اور نحیف ہو چکے ہیں۔ (ادارہ)''۔ فٹ نوٹ پڑھ کر چلتے چلتے میرے پیٹ میں گول (بل) پڑ گئے۔ میں نے اسی خط میں لکھا ہے ''میرے پاس لکھنے اور کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن کچھ ذاتی مجبوریوں اور خراب صحت کی وجہ سے لکھ نہیں پا رہا۔ اگر صحت نے اجازت دی تو چند ایک خاکے ضرور لکھوں گا''۔ حیرت ہے ان سطور پر آپ کی نگاہ کیوں نہ پڑی۔ جن میں خود اپنے ضعیف اور نحیف ہونے کا اقرار کر رہا ہوں اور آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ چلتے چلتے پیٹ میں گول اسی وجہ سے پڑے کہ آپ کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی تصنیف ''خطوط کے آئینے میں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے الف۔ جیم (اظہر جاوید) نے صفحہ 135 پر بتایا ہے کہ ''عبدالرحمان چغتائی کے خطوط میں انہوں (انور سدید) نے رسالہ ''کارواں'' کا ذکر کیا ہے۔ انور سدید نے اس میں نظم

ذرا سن حسینہ نازنیں مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں

کے شاعر کا نام بادر کا کوروی لکھا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کسی سینئر نے شاعر کا نام کرنل مجید ملک بتایا تھا اور مصرع یوں تھا: ''مگر اے حسینہ نازنیں''۔۔۔ طاہر وحید قریشی یا خواجہ محمد زکریا اس کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ کوئی اور صاحب مطالعہ بھی میری مدد کر سکتا ہے۔ میں صاحب مطالعہ نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میرے ذاتی قویٰ مضمحل نہیں ہوئے لیکن میرا حافظہ اتنا کمزور نہیں ہوا کہ اس پر بھروسہ نہ کیا جا سکے۔ ''مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں'' بادر کا کوروی کی نہیں کرنل مجید ملک کی تصنیف ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں ''وار سانگ ڈیپارٹمنٹ'' میں حفیظ جالندھری، کرنل مجید ملک، ضمیر جعفری اور چراغ حسن حسرت وغیرہ دہلی میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ حفیظ جالندھری کا یہ گیت بہت مشہور ہوا تھا۔

''اک دن چڑواسن سو کہے میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے''

کرنل مجید ملک نے کیپٹن چوہدری حسن حسرت کا تبادلہ کلکتے کردیا۔ وہ کلکتے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن حکم حاکم تھا، تعمیل کرنا پڑی۔ وہاں گئے تو بنگال کے جادو یعنی زلفِ بنگال کے اسیر ہو گئے۔ واپس دہلی آنے کا حکم ہوا تو انجانی سے دلی اور دل گرفتگی کے عالم میں دہلی آئے۔ جنگ ختم ہوگئی تو مجید ملک کو مخاطب کرتے ہوئے یوں دل کی بھڑاس نکالی۔

جرمنی بھی ختم اس کے ساتھ جاپانی بھی ختم — میری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

کرنل مجید ملک کی نظم "مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں" میں نے رسالہ "قندیل" میں پڑھی تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے۔ اپنے بوڑھے حافظے پر انحصار کرتے ہوئے تحریر کرتا ہوں۔

مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں — مگر اے حسینہ نازنیں
تو ہو دور مجھ سے اگر کبھی — تجھے ڈھونڈتی ہو نظر کبھی
تو جگر میں اٹھتا ہے درد سا — مرا رنگ رہتا ہے زرد سا
مگر اے حسینہ نازنیں — مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں
مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں — مگر اے حسینہ نازنیں
تو اگر ہو مجمع عام میں — کسی کھیل میں کسی کام میں
تو میں چھپ کے دور ہی دور سے — تجھے دیکھتا ہوں غرور سے
مگر اے حسینہ نازنیں — مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں
مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں — مگر اے حسینہ نازنیں
تو کہے یہ مجھ سے اگر کبھی — ہمیں لا دو لعل و گہر کبھی
تو میں ذرہ دور کی سوچ لوں — میں فلک کے تارے بھی نوچ لوں
یہ ثبوت شوق کمال دوں — ترے پاؤں میں انہیں ڈال دوں
مگر اے حسینہ نازنیں — مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں

میں حلقہ ارباب ذوق سرگودھا کا سیکرٹری تھا۔ انور سدید صاحب کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے پر میں نے "ہوٹل دلکشا" میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی تھی۔ میں نے انہیں "ادبی جن" کہا تھا۔ آپ ان کی کتاب "خطوط کے آئینے میں" پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ـــــ کیا یہ سب جادوگری نہیں ہے ـــــ پتا نہیں وہ کیا کچھ مقرر کرتے ہیں؟ یعنی آپ بھی انہیں ادبی جن کہہ رہے ہیں۔ میں اضافہ کروں گا کہ اب وہ مہا ادبی جن بن چکے ہیں۔ زود نویسی اور بسیار نویسی میں سہواً بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں کے لہا یعنی واجب الاحترام ادیب "زاویے تکمیل کرنا" لکھ رہے تھے۔ میں نے توجہ دلائی تو "طے" "تہہ" ہو گیا۔ توسنِ خیال کو "مہمیز لگائی" جا رہی تھی۔ توجہ دلانے پر "مہمیز کرنا" لکھنے لگے۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب روزنامہ "پلیٹ فارم پر کھڑا آخری آدمی" کے بارے میں لکھتے ہوئے یوں تحریر کر گئے ہیں: "وہ کیک ہد کی کی خوبی یہ ہے کہ افسانے کا پہلے سے معلوم انجام بھی سوچ کو "مہمیز لگاتا" ہے۔"

کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو اخیر عمر تک بھی نہیں بھرتے۔ اشفاق نقوی نے اپنی سرگزشت "باپ بیتی" میں جن خواتین سے اس کے جنسی مراسم رہے ہیں نام لے کر ذکر کیا ہے۔ ان میں سے کچھ خواتین بال بچوں والی ہیں اور زندہ ہیں مثلاً ڈاکٹر حفیظہ جالندھری وغیرہ۔ تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ ان کی عائلی زندگی کو ان کے نام لکھ کر تباہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جمیل یوسف اور ڈاکٹر انور سدید کے کشیدہ تعلقات بر کسی کے علم میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس عمر میں بھی جمیل یوسف کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اور انہیں یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ وہ خاتون بھی بدنام ہوگی۔ فرماتے ہیں: "نسرین عباس بھی اسی شاعری ذہنی ہوئی ہے"۔ جمیل یوسف کی اہلیہ کو "بچھڑی ہوئی بڑی" کہا۔ جمیل یوسف کے علاوہ دوسری شخصیت احمد ندیم قاسمی کی ہے جن کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے اور ڈاکٹر انور سدید صاحب موقع بے موقع انہیں کریدتے رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی ندیم کے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ "مشاہیر کے خطوط بنام سرفراز کے نام" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا حامد علی خان کے حوالے سے لکھتے ہیں: "آج کے ایک بزرگ نے تو اپنی غزل کے ساتھ پانچ روپے کا نوٹ منسلک کر کے غزل کی اشاعت کی درخواست کی تو مولانا کو اس ندیم کاری پر غصہ آ گیا اور انہیں سخت سرزنش کی۔" "تخلیق پچیس برس پہلے" میں ندیم پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اظہر جاوید اور یہ ناچیز انور سدید بھی اس حقیقت کا شاہد ہے کہ قاسمی صاحب نے زندگی کے آخری لمحات تک وسیع القلبی کا عملی مظاہرہ کیا اور اپنے کردار کے حسن روشن نقوش چھوڑے۔" "مظفر وٹ گئے" میں ندیم کا ذکر یوں کرتے ہیں: "کوئی بوڑھا عاشق جب تازہ کیک سے کر کے محبوب کے ہوٹل میں پدرانہ مروت کا روپ دھار کر جاتا ہے۔" ذرا آگے چل کر قتیل شفائی کا ذکر کرتے ہوئے ندیم کو یوں (گھیرتے ہیں) کہ "انہوں (قتیل شفائی) نے اپنے کسی سابقہ دوست (اظہر جاوید) سے ناراض ہو کر اسے عدالت میں نہیں کھینچا اور منصف کے مزاج پر اپنی شہرت سے اثر انداز ہو کر ڈگری حاصل نہیں کی۔" اس قسم کے چٹکلے بھی ڈاکٹر صاحب کی نوک قلم سے ٹپک پڑتے ہیں —— "قتیل شفائی نے ندیم کی طرح لڑکیوں کو بہنیں اور بیٹیاں بنا کر رشتوں کا تقدس مجروح نہیں کیا"۔ لطیف احمد قریشی صاحب سے ایک کاروباری ملاقات عمروں کے مراسم پر پھیل گئی۔ انہیں کی تحریک پر حلقہ ارباب ذوق سرگودھا کا قیام عمل میں آیا۔ حلقہ کے اجلاس کی کارروائیاں اور تصویریں مختلف اخبارات اور جرائد میں اس تسلسل سے چھپنے لگیں کہ ملک کے ادبی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ کوئی بھی قابل ذکر ایسا ادیب نہیں تھا جس نے حلقہ کے کسی نہ کسی اجلاس میں شرکت نہ کی ہو۔ اس کی تفصیل حلقہ کی سالانہ مطبوعہ رپورٹوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس دوران میں کچھ ادیبوں کے خود غرضانہ رویوں اور چھچھورپن کے مظاہروں سے میں آزردہ خاطر بھی ہوا۔ ایسے مظاہرے اب بھی ہو رہے ہیں۔ اس کی تازہ مثال خرم خان کا مضمون "لکیر کے فقیر" مطبوعہ تخلیق اپریل 2008ء ہے۔ جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ "بہت سے غزل نگار شاعری کے بجائے شہرت کو مقصد بناتے ہیں اور ظفر اقبال اور احمد فراز بننے کی کوشش میں مبتلا نظر آتے ہیں (حالانکہ خود ان دونوں کی شاعری میں کوئی مقام بلحاظ الفاظ نظر نہیں آتا)۔ اکثر نقادوں نے چند مشہور نام چن رکھے ہیں —— "مثلاً غالب اور اقبال وغیرہ یا پھر اپنے حلقہ کے بتوں کو دیوتا بنانے کا کام جاری رہتا ہے۔ مثال کے طور پر احمد ندیم قاسمی کو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر قرار دینے والا حلقہ۔" "سیاست کے شعبے میں اس کیفیت کا نتیجہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کو "امیر المومنین" بنانے کی کوشش ہوئی، پرویز مشرف کو "روشن خیال" قرار دیا گیا اور چوہدری شجاعت کی سطح کے لوگ "قومی رہنما" کہلانے لگے۔" "مثال کے طور پر اے۔ ٹی۔ جوش جیسے لوگ مدیر ادب، بین الاقوامی شاعر اور معروف دانشور کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ اور حقیقی دانشوروں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں —— تقریباً ہر ادبی اہم شخصیت ان

کی (جوش) شان میں قصیدہ لکھ چکی ہے۔ پاکستان کے علاوہ بھارت، لندن، مشرق وسطیٰ اور امریکہ کے مشاعروں میں انہیں خصوصی دعوت پر بلایا جاتا تھا۔ اب جبکہ اسے...سی۔ جوش مرحوم ہو چکے ہیں اور کسی کو اپنے گھر کھانے پر نہیں بلا سکتے ان کی شان میں کالم لکھنے والے۔۔۔ کسی اور طرف لوٹ جائیں گے''۔ ''فیض پسند لابی کی طرف سے مسلسل کئے جانے والے پروپیگنڈہ کے نتیجے میں حفیظ جالندھری جیسا بے مثال شاعر بھی تقریباً گمنام ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح ذاتی شہرت کے لئے بعض ناموں کو ضرورت سے زیادہ بڑا کر کے دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کی مثال آج کل مجید امجد کے بارے میں لکھنے والے نقاد ہیں۔''

''لکیر کے فقیر'' جیسی متعفن تحریروں سے میں نہایت آزردہ خاطر ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے جب میری رگوں میں گرم خون موجزن تھا اور میرا قلم رواں تھا اور میں 58 سالہ لائنز کے ادبی مقاصد کے لئے استعمال ہو رہا تھا۔ میری تحریروں کے بارے میں آپ (اظہر جاوید) نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ ادیب کو اپنی لڑائی لڑنی چاہیے دوسروں کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے۔ اب جب میں عمر کی آٹھویں دہائی عبور کرنے کے قریب ہوں تو سوچتا ہوں ستار طاہر، عطاء الحق قاسمی، ساقی فاروقی اور ندیم قاسمی صاحب وغیرہ سے میری ذاتی لڑائی کیا تھی؟ تو سخت شرمندگی ہوتی ہے۔ لہٰذا میں بذریعہ ''تخلیق'' اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام تحریریں جو میرے نام سے نوائے وقت، سویرا، اظہر عشق، فنون، سیارہ ڈائجسٹ، ادب لطیف، جنگ، امروز، اردو زبان، مرد میدان، وفاق، تخلیق، تمثال، ارتکاز، اوراق، افکار، فرنٹیئر پوسٹ اور قرطاس وغیرہ میں چھپیں، جن سے بہت سے زندہ اور مرحوم ادیبوں کو سخت صدمہ پہنچا، میں ان سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اور درخواست گزار ہوں کہ کوئی بھی صاحب میری زندگی میں یا مرنے کے بعد ان تحریروں کو میرے حوالے سے کسی بھی طرح استعمال نہ کریں۔ میں تمام متاثرہ حضرات سے معافی مانگتا ہوں۔ راجپوتی خون کی طرح میرے اعوانی خون میں بھی ابال آ سکتا ہے۔ کوشش تو یہی ہوگی کہ حد اعتدال سے نہ بڑھے۔ اور ندیم علوی صاحب نے میری پنجابی کہانی ''پرڑ پکھ'' پسند فرمائی، ان کا شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ دیپک کنول صاحب پنجابی جاننے کے باوجود ''پرڑ پکھ'' نہ سمجھ سکے۔ مزید کوشش فرمائیں۔

نیاز مند ــــ پرویز بزمی، چک 39 شمالی سرگودھا (09-05-2008)

◆◆◆

معروف ادیب، مزاح نگار حسین احمد شیرازی کی کتاب

''بابو نگر'' کی ریکارڈ کامیابی کے بعد

''دعوتِ شیراز''

بھی شائع ہو چکی ہے.......... قیمت:-/1,000 روپے

ملنے کا پتہ: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ 042-37220100, 042-37228143

گوشۂ طفیل اختر

دادا طفیل اختر کے نام کھلا خط

محمد پرویز کلیم

دادا آپ کی مسکراہٹ دل تراشی کرنے کے فن سے اس قدر آشنا تھی کہ آپ کی قربت میں بیٹھ کر جو بھی اپنے گھر جاتا وہاں جا کر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے دل کی جیب کترے بھی ہے اس کی سماعت میں آپ کی میٹھی باتوں کی گونج باقی ہوتی۔ سمجھ نہیں آتا کہ آپ کے زندگی سفرنامے کو کہاں سے شروع کروں اور کہاں اختتام پذیر کروں۔ آج پہلی بار لکھتے ہوئے میں مخمصے کا شکار ہوں۔۔۔ وجہ یہ ہے آپ کی شخصیت کے گرد لفظوں کا دائرہ دکا کر اس کی وضاحت کرنا دشوار ہے اور 45 برس کے تعلق کو اک مضمون میں بند کرنا بھی آسان نہیں۔ آپ کو یاد ہوگا مدت پہلے قلی مارکیٹ مال روڈ اوپر والی منزل پہ ایک امپورٹ ایکسپورٹ کا آفس تھا جس کا آنر فیصل آباد کا اک خوش شکل نوجوان انور چودھری تھا جو ایکٹر بننے کا بھی شوقین تھا اس کے آفس میں آپ سے اور حسن نثار سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ آپ دونوں اس وقت ''دھنک'' میں لکھتے تھے میں قلم کا آدمی تھا اور آپ قلم کے رپورٹر۔۔۔ بس چولی دامن کا ساتھ شروع ہو گیا۔

سب شوبز قلم کار جانتے ہیں کہ آپ نے دھنک، مصور، تصویر، ممتاز اور دیگر بہت سے فلمی پرچوں میں لکھا۔ فلمی اخبارات میں رپورٹنگ بھی کی پھر اپنا پرچہ جس کا نام آپ نے ۔۔۔ اپنے ہونٹوں سے اٹھا کر اپنے رسالے کے ٹرسٹ پہ سجا دیا اور اپنے اس ادبی مجلے ''مسکراہٹ'' میں آپ نے قلم اور ادب کو یکجا کرنے کا جو بیڑہ اٹھایا تھا وہ ''مسکراہٹ'' کے قاری جانتے ہیں۔ آپ اپنے نیک عزائم میں کس حد تک کامیاب رہے آپ کا یہ احسان کہ ''مسکراہٹ'' میں چھپنے والے بہت سے بے نام لکھاریوں کی شناخت آپ کی زیر ادارت ہوئی۔ آپ کے پبلشنگ ہاؤس سے کئی فلمی غیر فلمی کتابیں چھپ کر عوام الناس کے ہاتھوں تک پہنچیں۔ آپ نے جو لکھا جامع لکھا آپ کا قلم منٹو اور ریاض شاہد کی طرح اک حد تک کاٹ دار تھا آپ لفظوں کے نشتر سے۔۔۔ پڑھنے والے کو گدگدی کرنے کے عادی تھے اس کے باوجود آپ کی تحریروں سے کسی کو اختلاف رائے نہ تھا اس لیے کہ آپ کڑوی گولی کو شوگر کوٹڈ کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ آپ کی اس خوبی کو ادبی رسالے ''تخلیق'' کے بانی سونان اظہر کے والد محترم اظہر جاوید بھی دوستوں میں بیٹھ کر بیان کیا کرتے تھے۔ ایک اچھے لکھاری کی طرح بھی بات کو مختصر کرنے کے فن سے بھی اچھی طرح آشنا تھے۔ ساجد یزدانی نے جب پہلی بار آپ کو دادا کہہ کے پکارا اس وقت آپ نہیں جانتے تھے کہ یہ اضافت آپ کے نام کا جزو لازم بن جائے گی۔ آپ کو چاہنے والے آپ کی قربتوں کے اسیر اور آپ کے جونیئر سب کی متفقہ رائے ہے کہ آپ نے میزان کا دامن تھام کر اپنی زندگی اعتدال سے گزاری مگر مجھے معلوم ہے اس میزان اور اعتدال نے آپ کو وہ کچھ نہیں کرنے دیا جو آپ کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی وضع داری آپ کے لیے ایک عذاب تھی آپ اپنی ذات کے کائنات میں کئی بار مجھے گھٹے گھٹے محسوس

ہوئے۔ آپ کی میانہ روی نے آپ کی مسرتوں کو ہمیشہ قائم رکھا آپ عمر بھر محبتیں بانٹتے رہے زندگی بھر مشکل اپنی مجبوریاں برداشت کرتے رہے لیکن آپ کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپا ہوا کرب کم کم دوستوں نے دیکھا۔ لوگ آپ کی شخصیت کی اک پرت سے سمٹ رہے کسی نے بھی دوسری تیسری پرت اٹھا کر آپ کے احساسات اور خواہشات کی تلاش نہیں کی۔ جوانی میں اک مدت گھریلو ذمہ داریوں سے نبرد آزما رہنے کے بعد جب آپ کو مرضی سے سانس لینے کی فرصت ملی تو آئینے نے سچ بول کے آپ کو پیرانہ سالی کی اطلاع دیتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ابھی تو تم جوان ہو مگر دادا ماں کے کھینچے ہوئے حصار سے آپ نے باہر آنا مناسب نہ سمجھا۔ بھائی کی موت نے آپ کو محبت کے جذبے سے تہی داماں کر دیا تھا کیسے سے ہو کے رہ گئے تھے آپ ---- حیران ہوں ٹوٹ پھوٹ کے اس دور میں بھی آپ کی تحریروں کی سلامت برقرار رہی اور ہاں مجھے معلوم ہے آپ کے نرم لہجے کے پیچھے ارادوں کی پختگی اور چند اصولوں کی سختی ہمیشہ موجود رہی۔ قلم لکھنا آپ کا شوق تھا پر قلم لکھوانے والوں کا رویہ آپ کے مزاج کے برعکس تھا۔ آپ بولنے سے زیادہ لکھنے کا ہنر جانتے تھے۔ اس لیے گفتگوؤں سے آپ کا نبھا نہ ہو سکا۔ آپ قرطاس پہ قلم کی کہانی نہ سہی قلم گر کے لوگوں کے قصے لکھتے رہے۔

دادا ہم نے نشست و برخاست کی 45 سال اگرچہ گزرے ہیں جب بھی ملے درمیان سے وہ وقت ایلیٹ ہو گیا جس میں ملاقاتیں نہ ہو پائیں۔ آپ کی میری قربتوں میں کچھ سرگوشیاں ہیں جو آپ نے کہیں اور میں نے سنیں آپ کی وضع داری نے ہم جیسوں کو بھی باتوں اور گھاتوں کو امانت کی طرح دل میں خاموش دفن کر دینا سکھا دیا ہے۔ آپ کے جنازے پہ آپ کے ہر دو وسعت اور ملنے والے کی زبان آپ کی تعریفیں اور قصیدے بیان کرتی رہی یوں تو ہمارے یہاں مر جانے والے کے لیے جو حاصل حال کے بیان کرنے کو سچ سمجھا جاتا ہے مگر میرے کانوں نے ..... جو سنا وہ سچ تھا...... پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے اس وقت یوں لگتا رہا جیسے آپ کی موت کی خبر ایک خواب ہے جو ٹوٹ جائے گا اور میں فون پر آپ کی خیریت دریافت کروں گا۔ آپ کے چہیتے احتشام ہمدردی عرف شام بابو نے فون پر بتایا کہ آپ کا انتقال ہو گیا ہے تو یہ خبر سن کر مجھے اک چپ سی لگ گئی۔ میری آنکھیں نہیں جھکیں آنسوؤں نے آپ کی موت پہ احتجاج کر دیا اور اک قطرہ بھی آنکھ سے نہ ٹپکا۔ شام بابو گاڑی لے کر آیا تو ہم نارمل باتیں کرتے ہوئے دادا کے فلیٹس تک جا پہنچے مصلحت کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے تاکہ مجھے تکلیف نہ پہنچے۔ دادا کے بارے کم بولا اور مجھے شاید یقین ہی نہ تھا دادا طفیل اختر مر گیا ---- جس کا قلم عمر بھر قلمی آگہی لکھتا رہا وہ لکھاری ملک عدم سدھار گیا جو سچ کی روشنائی سے قلمی تحریریں لکھا کرتا تھا...... لیکن سید ساجد یزدانی جب میرے گلے لگ کے روئے تب مجھے یقین آیا کہ کچھ دیر بعد ہمیں دادا کا جنازہ اٹھانا ہے۔ خالد ابراہیم، معین بٹ گلستان سینما کے اونر عارف صاحب اور چند صحافی دوستوں کے کاندھے پہ سوار دادا کا جنازہ قبرستان پہنچا۔ شام بابو، رانا نوید عارف صاحب چپ چاپ کھڑے مٹی سے لارجر طفیل اختر کو مٹی میں دفن ہوتا دیکھتے رہے۔ اک بے بسی کا عالم تھا سب ایک دوسرے سے آنکھیں چرائے دادا کو منوں مٹی تلے دبتا ہوا دیکھتے رہے۔ مجھے یقین ہے پروین رتی خان اسامہ سعد ریار آپ کی موت پہ ماتم کناں ہو گا۔ دادا اس نے سوشل میڈیا پہ لکھا کہ وہ ایک بار پھر سے یتیم ہو گیا تھا اس کے اس جملے سے میں نے لاکھوں آنسو چھلکتے ہوئے دیکھے ہیں۔ پھر قبر تیار ہونے کے بعد اک 10 سالہ بچہ قبر پہ پھول پاشی کرتے دکھائی دیا تو میں نے پوچھا یہ کون ہے بابو نے بتایا کہ یہ دادا کا پوتا ہے۔

بس پھر تو آنکھیں زور شور سے بہنے لگیں۔ اشک ماتم کرنے پہ اتر آئے۔ بے اختیار رو رو کے دل چاہا۔ قبرستان سے میں

اور اختتام آپ کے گھر آ کے آپ کے بڑے بیٹے سے اجازت طلب کی اور گھر جانے کے لیے مڑے تو آپ کے ایک باریش بزرگ نے تعزیتی جملوں کے چھوڑنے کے بعد کہا بھائی جان طفیل اختر نے 55 برس قلم کی خدمت کی ہے۔ نماز جنازہ میں قلمی حضرات دکھائی نہیں دیئے۔ میں نے خالی نظروں سے اس بڑے میاں کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر بابو کی گاڑی کی طرف چل دیا جب سے اب تک باریش بزرگ کا جملہ میرے کانوں پہ منہ رکھ کے چیخ رہا ہے اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ زندگی بھر جو قلم اور قلمی لوگوں پہ لکھتا رہا وہاں سے اس کے بچوں کو پرسا دینے کوئی نہ آیا — کیوں — یہ سوال ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ قلمی لوگوں سے گلا کیسا — امید ہے عالم برزخ میں آپ کی ملاقات قلم قبیلے کے معتبر لوگوں سے ہوگی اور آپ کا وقت اچھا گزرے گا اور یہاں آپ کے سب اپنے لوگ آپ کی کمی محسوس کریں گے۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2020ء تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک نو "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحب	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ صغریٰ جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978
-5	2016ء	محترمہ عذرا اصغر صاحبہ	(لاہور)	0300-8839895
-6	2017ء	محترم پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب	(لاہور)	0345-4698398
-7	2018ء	محترم سرفراز سید صاحب	(لاہور)	0333-4148962
-8	2019ء	محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ	(لاہور)	0300-9438596
-9	2020ء	محترم رشید امجد صاحب	(راولپنڈی)	0334-5164855

طفیل اختر دادا......رنگ گہرے ہیں تیری یادوں کے

آفتاب خان

چلتی ہوئی سانس کا سہارا لیے ہوئے زندگی کے اجالے (آتش دان) کے روبرو بیٹھ کر میں نے یادوں کی راکھ میں انگلی پھیری۔ راکھ کی سیاہ و سفید سطح پر ایک تصویر ابھرنے لگی جس نے طفیل اختر دادا کا روپ اختیار کر لیا۔ اس تصویر کے نقش پوری طرح واضح ہیں اور اس کے رنگ اتنے گہرے ہیں کہ جنہیں وقت کی گرد بھی دھندلا نہیں کر سکی۔ تصویر دیکھتے ہوئے میرے خیال کی رو فلیش بیک میں چلی جاتی ہے اور ذہن کے پردے پر دادا کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات کسی فلم کی طرح چلنے لگتے ہیں۔ اس فلم کا منظر نامہ اور اس سے جڑے دیگر واقعات آپس میں گڈمڈ ہو کر قرطاس پر بکھرنے لگے ہیں۔ کاغذ کی سکرین پر دادا کے ساتھ ساتھ اور بہت سے لوگوں کے نام اور چہرے دکھائی دے رہے ہیں جن میں سے کچھ نے زندگی کے سفر میں میرا ساتھ چھوڑ دیا اور جو باقی بچے ہیں میں اُن کی زندگی کی دعائیں مانگتا ہوا ساری یادوں کو قلم بند کرنے میں مگن ہو چکا ہوں۔

طفیل اختر دادا کا نام میں بائیس برس قبل میرے سامنے آیا جب اُن کی کچھ تحریریں ویکلی نگار، فلمی ٹی وی کا فنکار اور ماہنامہ "محور" میں پڑھنے کا موقع ملا۔ ان کے جملوں کی کاٹ اور لفظ برتنے کی ہنرمندی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ دل میں خواہش بھی جاگی کہ اُن سے ملاقات ہو جائے۔ قدرت نے اس کا سبب بھی پیدا کر دیا۔ اُن دنوں میرا یسین گوریجہ کے دفتر میں بھی کبھار آنا جانا ہوتا تھا۔ لکشمی چوک کا یہ دفتر فلمی لوگوں کی آماجگاہ تھا۔ اسی دفتر میں غالباً 2002ء میں جب ایک دن میں پہنچا تو یسین گوریجہ کے دائیں پہلو والے دروازوں کے بیچ پڑی ایک کرسی پر جو صاحب بیٹھے تھے وہ طفیل اختر دادا تھے۔ یسین صاحب نے میرے بیٹھنے کے بعد جب اُن کا تعارف کروایا تو میں خوشی سے کھڑا ہو گیا اور اُن سے مصافحہ کر کے اُن کے حوالے سے چند جملے کہے جس کا انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کر کے یسین صاحب سے کہا کہ اس نوجوان کا تعارف بھی کروا دیں۔ یسین گوریجہ نے میرا نام بتاتے ہوئے کہا "یہ نوجوان آج کل طارق نوری صاحب کے ویکلی "فلمی پرچہ" کا ایڈیٹر ہے اور شاعر بھی ہے۔"

اس پر دادا نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا "شاباش لگے رہو محنت سے کام کرو گے تو نام بھی بن جائے گا۔"

دادا سے یہ پہلی ملاقات اگلی ہزاروں ملاقاتوں کے لیے ذریعہ ثابت ہوئی۔ پھر تو اکثر کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ گوریجہ صاحب کے دفتر میں، رائل پارک میں کہیں آتے جاتے ہوئے یا کسی فلمی تقریب میں آمنا سامنا ہو جاتا۔ رسمی علیک سلیک کے علاوہ بھی فلم و ادب کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہتی۔ ہر ملاقات میں ایک دھیمی مسکراہٹ ان کے چہرے کا طواف کرتی رہتی تھی شاید اسی لیے انہوں نے اپنے رسالے کا نام بھی "مسکراہٹ" رکھا تھا۔ یہ رسالہ بھی ان کی ایک پہچان تھا۔ خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ وہ یہ رسالہ پچیس برس تک نکالتے رہے۔ گزشتہ دو برسوں سے انہوں نے خود ہی یہ نکالنا بند کر دیا تھا۔ "مسکراہٹ" کا انداز بھی دیگر رسائل سے قدرے مختلف تھا۔ اس میں فلم

کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی نمایاں جگہ دی جاتی۔ شاعری، افسانے، کتابوں پر تبصرے اس کا اہم حصہ ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ گلزار، قتیل شفائی، سعید قیس، بابا یحییٰ خان پر انہوں نے مسکراہٹ کے خصوصی نمبر بھی نکالے۔ مجھے بھی بطور قلم کار مسکراہٹ میں کافی لکھنے کا موقع ملا۔ شاعری کے علاوہ مختلف مضامین اور کتابوں پر تبصرے مسکراہٹ کا حصہ ہے۔ یہاں میں ایک وضاحت کردوں کہ تبصرہ نگاری کی طرف مجھے اظہر جاوید نے لگایا۔ ایک دن مجھے چند کتابیں دے کر حکم صادر فرمایا کہ "تخلیق" کے لیے تبصرے لکھ کر دے دیں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو بولے "یار نخرے نہ دکھاؤ آپ لکھ سکتے ہیں بس لکھ کر لے آئیں" چنانچہ میں نے لکھ کر دے دیے اور وہ چھپ بھی گئے۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ "تخلیق" میں ہی میرے تبصرے دیکھ کر ایک دن دادا نے دو کتابیں میرے آگے رکھ دیں اور ایسے ہی حکم صادر فرمایا "تخلیق کے لیے آپ تبصرے لکھتے ہی ہو مسکراہٹ کے لیے بھی لکھ دیا کرو" چنانچہ وہاں بھی چھپنے شروع ہو گئے۔ یہ غالباً 2007ء کی بات ہے۔ دیکھیں نا اگر ایڈیٹر الجھن ایک آگے پیچھے فٹ کر دے تو قلم جیوں کے سر چکرا کر رہ جاتے ہیں۔ کہانی ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں بھی کہاں کر بیٹھا ہوں۔ ہوا یوں کہ 2006ء میں جب یسین گوریجہ وفات پا گئے تو ان کا دفتر دادا کو مل گیا اور وہ باقاعدگی سے وہاں بیٹھنے لگے۔ اس دوران میرا آنا جانا وہاں جو ہو گیا اور وقت میں ایک دو بار ان سے ملاقات ہونے لگی اور جو تھوڑے بہت فاصلے تھے وہ قربتوں میں بدلتے چلے گئے۔ اگلے برسوں میں ان میں اور زیادہ شدت آ گئی۔ میری ہر شام ہی ان کے دفتر میں گزرنے لگی۔ وہاں قلم اور ادب کے اور بھی بہت سے لوگ آتے تھے۔ کچھ سے میری پہلے سے شناسائی تھی، کچھ سے وہیں پہلی بار ملاقات ہوئی ان میں شاعر افضال عاجز، اور روزنامہ "دنیا" کے میگزین ایڈیٹر عبدالحفیظ ظفر، صحافی ریاض شاہد شامل ہیں جو پہلی بار دادا کے دفتر میں ملے ویسے میں ان کے نام سے پہلے سے واقف تھا۔ یہ ملاقاتیں 2013ء، 2012ء میں ہوئی تھیں۔

دادا اپنے دفتر میں سب کے ساتھ نہایت خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ملتے اور چائے پیے بغیر جانے نہیں دیتے تھے۔ میرا خیال ہے جتنی چائے میں نے دادا کے دفتر میں پی ہے کہیں اور نہیں پی۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا اور ان میں سے اکثر کا ان کے دفتر میں آنا جانا تھا جہاں دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ قلم اور ادب کے علاوہ سیاست اور مذہب کے حوالے سے بھی تبادلہ خیال ہوتا تھا اور سب اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے تھے۔

دادا اور میرے دلچسپی کے امور ایک جیسے تھے۔ ہم اکثر فلمیں ایک ساتھ دیکھتے اور ادبی تقریبات میں بھی ایک ساتھ جاتے تھے۔ کوئی اچھی کتاب ان کے پاس آتی تو مجھے پڑھنے کی دعوت دیتے یا میرے پاس کوئی اچھی کتاب آتی تو انہیں پڑھنے کے لیے دیتا تھا۔ یسین گوریجہ کی وفات کے بعد وہ ہر سال ان کی برسی کا اہتمام کرتے اور "پاک" میں شاندار تقریب منعقد ہوتی تھی جس کے مستقل کمپیئر اعزاز احمد آذر تھے ——— یاد آیا کہ اظہر جاوید، اعزاز احمد آذر اور افتخار مجاز بھی ان کے نہایت قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ دادا اگر کوئی تقریب منعقد کرواتے تو یہ تینوں لازماً شامل ہوتے اور اگر اظہر جاوید یا اعزاز احمد آذر کسی تقریب کا اہتمام کرتے تو دادا ضرور شامل ہوتے اور دادا کے ساتھ یہ بندہ بھی ہر جگہ موجود ہوتا۔ 2013ء میں ہی میں نے دادا اور افضال عاجز کے ساتھ مل کر ایک ادبی تنظیم "بزمِ احباب ادب" بنائی جس کے تحت ڈاکٹر ذکاء اور الحمرا ادبی بیٹھک میں چند مشاعرے بھی منعقد کروائے مگر یہ سلسلہ کسی وجہ سے زیادہ دیر نہ چل سکا۔

کہتے ہیں کہ کسی شخص کو پرکھنا ہو تو اس کے ساتھ سفر کرو۔ اس حوالے سے دادا بہترین ہم سفر تھے۔ مجھے ان کے ساتھ دو شہروں میں

جانے کا موقع ملا۔ پہلی بار ہم اکٹھے فیصل آباد گئے۔ وہاں ہمارے مشترکہ دوست ڈاکٹر نعیم کے کلینک کا افتتاح تھا۔ دوسری تقریب روزنامہ ''امن'' کی سالگرہ کی تھی، وہاں بھی شرکت کی۔ اس سفر میں روزنامہ ''امن'' کے بیورو چیف زوار کامریڈ بھی ہم دونوں کے ہمراہ تھے۔ دادا کی معیت میں یہ سفر بہت خوش گوار گزرا۔ دوسری بار میں اور دادا 2016ء میں سرگودھا کی تحصیل ساہیوال گئے۔ وہاں ہمارے دوست مسعود تنہا نے میرے شعری مجموعہ ''شام'' کی تقریب پذیرائی اور مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ دادا نے تقریب پذیرائی کی صدارت کی تھی۔ میرا یہ شعری مجموعہ ''شام'' شائع بھی دادا کے ادارے پرائم ٹائم پبلی کیشنز سے ہوا تھا۔ ساہیوال کی یہ تقریب رات دیر گئے ختم ہوئی۔ یہ پہلے سے طے تھا کہ رات کو ہم نے واپس نہیں آنا اور رات ہم مسعود تنہا کے مہمان تھے۔ اس کے گھر میں رات کے کھانے پر کچھ اور شاعر دوست بھی آ گئے اور کافی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ اس کے بعد ہم صحن میں چارپائیوں پر سو گئے کیوں کہ گرمیوں کا موسم تھا۔ صبح دیر سے جاگے اور ناشتے کے بعد کچھ دیر ساہیوال کی سیر کی جس کے بعد ہم بس میں واپس لاہور آ گئے۔ سفر میں انہوں نے کسی بزرگ کی طرح خیال رکھا۔ یہ کھا لو، وہ کھا لو، نیند آئی ہے تو سو جاؤ۔ اس طرح کی باتیں کرتے رہے اور سفر کا پتا بھی نہ چلا۔

یہ تو کچھ ذاتی یادداشتیں تھیں جنہیں مختصر بیان کر دیا ہے۔ بہت سی باتیں لکھنے سے رہ بھی گئی ہیں جنہیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ اب ذرا اُن کی فنی زندگی اور کام کا جائزہ بھی لے لیں۔ 1960ء میں انہوں نے فلمی صحافت میں قدم رکھا اور مختلف فلمی پرچوں کی ادارت کے علاوہ فری لانسر کے طور پر بہت کچھ لکھا۔ انہیں اصل شہرت سرور سکھیرا کے ماہنامہ ''دھنک'' سے ملی جس میں اُن کی تحریروں نے تہلکہ مچا دیا۔ اس رسالے میں ان کے ہمراہ محسن نثار، رخسانہ نور، رضیہ ساجد، جاوید اقبال کارٹونسٹ اور ندیم علیمی بھی کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ ڈائریکٹر، ٹی وی ٹائمز، ہفت روزہ فیملی، نگار، سکرین لائٹ وغیرہ سے بھی وہ منسلک رہے یا اُن میں لکھتے رہے۔ 90ء کی دہائی میں انہوں نے ماہنامہ ''مسکراہٹ'' کا آغاز کیا جس کی اعزازی مدیر رخسانہ نور تھیں۔ اسی عرصہ میں اُن کی شوبز کے حوالے سے کچھ کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ جن میں دیکھئے، ایک تھا نذیر، چاند چہرے، صورت یاسمین، نور جہاں کی زندگی، اب تک وغیرہ شامل ہیں۔ آخرالذکر کتاب افسانہ نگار آغا گل کی کتابوں کے بارے میں تھی۔ ''صورت یاسمین'' (صورت نجمی) یاسمین گوریجہ کے بارے میں تھی۔ ''دیکھئے'' وفات پانے والے فلمی فنکاروں اور ہنرمندوں کے مضامین پر مشتمل تھی جبکہ چاند چہرے ''فلمی پریوں'' کے خاکے تھے۔ لکھنے لکھانے کا شوق انہیں فلمی کہانی نویسی کی طرف بھی لے گیا۔ انہوں نے اداکار رحمان کی ایک فلم کے مکالمے بھی تحریر کیے جبکہ چند اور فلموں کے سکرپٹ بھی لکھے جو بوجوہ مکمل نہ ہو سکیں البتہ سٹیج ڈرامے لکھنے میں انہیں بھرپور کامیابی ملی اور اُن کے پندرہ سولہ ڈرامے الحمرا، ہنر کدہ اور اوپن ائیر تھیٹر باغ جناح میں پیش کیے گئے۔ پبلشرز کے طور پر بھی انہوں نے بہت سی کتابیں شائع کیں۔ بابا یحییٰ خان کی پہلی کتاب موم کی عورت، رخسانہ نور کا شعری مجموعہ الہام، منیر راز کی کتابیں، زاہد عکاسی، رشی خان، افضال عاجز، عزیز میرٹھی، سعید قیس، سرور سکھیرا، پرویز کلیم، فردوس علی، فدا احمد کاردار، خورشید عالم کی کتابوں کے علاوہ اور بھی کئی سو لوگوں کی کتابیں اُن کے ادارے سے شائع ہوئیں۔ انہیں متعدد بار بھارت جانے کا بھی موقع ملا جس میں اُن کے ساتھ مشہور شخصیات بھی شامل تھیں جیسے منیر نیازی، فخر زمان، اعزاز احمد آذر، روزی پیا اور دیگر بے شمار شاعر و ادیب شامل تھے جو مختلف وفود کی شکل میں بھارت کے مختلف شہروں میں گئے تھے۔ گلزار سے اُن کے قریبی مراسم تھے اور اکثر وہ اُن سے فون پر گفتگو کرتے۔ جب گلزار پاکستان آئے تو خصوصی طور پر دادا سے ملاقات کی۔ گلزار صاحب ''مسکراہٹ'' کے لیے اپنی تحریریں اور خطوط اکثر ارسال

کرتے تھے جنھیں دادا بہت اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ اسی طرح جرمنی میں اُن کے بہت قریبی دوست رشید احمد خان المعروف رشی خان تھے جن سے ان کی اکثر فون پر بات ہوتی اور میری بات بھی کروا دیتے تھے۔ وہ شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار ہیں اور ان کی متعدد کتابیں دادا نے شائع کی تھیں۔ تین سال قبل جب وہ پاکستان آئے تو دادا اور میں نے ادبی بیٹھک میں اُن کے اعزاز میں ایک تقریب بھی منعقد کی تھی جس میں خالد چودھری، سوہان اظہر جاوید، کامران نذیر، رانا نوید، ساجد یزدانی وغیرہ شریک ہوئے۔ باتوں سے بات نکل آتی ہے۔ رانا نوید کا نام آیا تو یادوں کا ایک دریچہ کھل گیا۔ گزشتہ کئی سال سے دادا قلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری اور ساجد یزدانی صدر چلے آ رہے ہیں۔ رانا نوید بھی اس کے عہدے دار ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے دوستوں کو اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے اظہر جاوید کی وفات سے دو دن پہلے رانا نوید نے ایک فش پارٹی کا اہتمام کیا جس میں دادا کے علاوہ اظہر جاوید اور اعتصام سہروردی وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کے بعد رانا نوید تسلسل سے گلستان سینما میں دوستوں کو جمع کرتے رہتے۔ کبھی کسی کی سالگرہ کبھی کسی دوست کی کوئی اور خوشی ہوتی تو سب کو جمع کر لیا جاتا۔ گلستان سینما کے اونر عارف خان میزبان کے طور پر پیش پیش ہوتے تھے اور اب بھی ہیں۔ دادا کی وفات کے چند دن بعد اُن کی یاد میں پہلی تقریب گلستان سینما ہی میں منعقد کی گئی۔ نیز گزشتہ چند سالوں میں ان محفلوں میں جو لوگ شریک ہوئے ان میں دادا کے علاوہ پرویز کلیم، سید نور، ساجد یزدانی، عبدالحفیظ ظفر، اعتصام سہروردی، ریاض شاہد، اقبال عاجز، عامر ظفر، خالد ابراہیم، حسنین بٹ، ڈاکٹر ایم ابرار، فراست بخاری، طاہر سرور میر، طاہر بخاری اور یہ ناچیز شامل ہیں۔ ان محفلوں کے اصل میزبان رانا نوید ہوتے ہیں جو اپنی جیب سے کھانے پینے کے لوازمات لے کر آتے ہیں اور دوستوں کی خدمت کرتے ہیں۔

دیکھیے میں باتوں ہی باتوں میں پھر کہاں سے کہاں نکل گیا۔ نہ طفیل بیگ کا خیال رکھا ہے نہ ہی کسی ترتیب کا مگر صاحبانِ ذی وقار اس بے ترتیبی میں بھی ایک حسن ہے کیوں کہ اس میں کسی کی یادیں ہیں، کسی کی باتیں ہیں۔ کسی کے ساتھ گزرے ہوئے شب و روز کے قصے ہیں۔ ان میں کوئی ربط ہے یا نہیں، ان میں کوئی تسلسل ملتا ہے یا نہیں لیکن ان واقعات میں محبت کے دیپ روشن ہیں اور دیپ کہیں بھی اٹھا کر رکھ دیں، وہ ایک جیسی ہی روشنی دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں یادوں کے یہ دیپ روشن رہیں۔ ماضی کی چنگاری محبت کے آتش دان میں بھڑکتی رہے اور اس کی راکھ سے اپنے پیاروں کی تصویریں ابھرتی رہیں جن کے رنگ گہرے اور نقش لازوال ہیں۔ آخر میں دادا کے لیے اپنے دو اشعار پیش کر کے اجازت چاہتا ہوں۔

رنگ گہرے ہیں تیری یادوں کے   دل سے تصویر مٹ نہیں سکتی
اس میں شامل ہے میرا خونِ جگر   میری تحریر مٹ نہیں سکتی

(دس فروری 2021ء)

◆◆◆

میں اس لیے بھی محبت کا کھیل ہار گیا
کہ چال چلنے میں اس کو بہت مہارت تھی

(اظہر جاوید)

مضامین

محبت اور مزاحمت کا شاعر: ایوب خاور

……1……

غلام حسین ساجد

"نئی پاکستانی غزل۔ نئے دستخط" (1981ء) مرتب کرتے وقت میں ابھی انیس برس کا تھا اور میرے وہم وگماں میں بھی نہیں تھا کہ اردو شاعری کے مستقبل کے حوالے سے میرا گمان کس قدر سچ ہونے کو ہے۔ آج پاکستانی اردو شاعری کے تناظر میں غلام محمد قاصر، شبیر شاہد، ثروت حسین، افضال احمد سید، محمد اظہار الحق، جمال احسانی، صابر ظفر، سلیم کوثر، محمد خالد اور ایوب خاور کو ستر کی دہائی کی شاعری کے حوالے سے ایک مثال سمجھا جاتا ہے اور ان میں سے چار شاعروں غلام محمد قاصر، ثروت حسین، جمال احسانی اور شبیر شاہد کی وفات کے بعد بھی اس فہرست کے ہر شاعر کا جادو اب تک سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ایوب خاور نے ثروت حسین اور محمد اظہار الحق کی طرح اسلامی تہذیبی حوالوں کو موضوع بنایا ہے نہ ہی غلام محمد قاصر اور جمال احسانی کی طرح دشتِ ماضی میں بھٹکتے ہوئے خوابوں کو حیات نو دینے کی سعی کی ہے۔ اس نے صابر ظفر، شبیر شاہد اور اس دہائی کی طرح تمثیلیت پسندی کے شوق میں یک موضوعی کیفیت کو لے کر نکلنے کا تجربہ کیا ہے نہ ہی سلیم کوثر کی طرح ان فکر محبت کی بے سمت روایت کی تقلید کی۔ اس کی شاعری کا غالب حوالہ محبت کا ہے جو موجودہ معاشرے سے فطری نسبت کے باعث پچھلے پچاس برس کی فکری، سماجی اور ثقافتی جدوجہد کا استعاراتی آئینہ بن گئی ہے۔ جس کی روشنی میں ہم اپنی تاریخ کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی۔

ایوب خاور نے اب تک چار شعری مجموعے "گل موسم خزاں"، "تمھیں جانے کی جلدی تھی"، "بہت کچھ کھو گیا ہے" اور "محبت کی کتاب" شائع کیے ہیں۔ اس کی پہلی کتاب "گل موسم خزاں" پہلی بار 1991ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت تک اس کی نسل کے کم و بیش تمام شعرا اپنی اپنی پہلی کتاب شائع کر چکے تھے اور ستر کی دہائی کے شعرا کی شاعری کا مجموعی رنگ اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس رنگ میں خوابوں کی شکست و ریخت اور غبارِ ماضی کی دھند سے صبحِ نو کے شگفتہ مزاج مستقبل کی تعبیر کرنے کا مزاج غالب تھا۔ ایوب خاور نے ان سب سے الگ اپنی راہ نکالی۔ اس نے ذاتی مسائل کی گتھیوں سے آغاز کر کے ایک بڑے آسمانِ محبت کے سایے میں چلتے ہوئے خود کو اپنے عہد کے مزاج سے اس طور ہم آہنگ کیا کہ ہم آج اس کی شاعری کو اپنے عہد کی گھٹن اور استبداد کی واحد نقیب کہہ سکتے ہیں۔ 1977ء سے 1988ء کا زمانہ پاکستان کی فکری اور سیاسی تاریخ کا ایسا تاریک دور ہے، جس نے اس عہد کے شعرا کی نفسیات ہی بدل کر رکھ دی تھی۔ اس عہد کے زیادہ تر شعرا نے دروں بینی اور عہد حاضر سے مجہول و باندا لاتعلقی کو شعار بنایا مگر ایوب خاور نے ایک سچے شاعر کی طرح مزاحمت کی اور اپنے وجود کو طاقتوں اور بے وضع بنانے والی استبدادی قوتوں کے خلاف کھل کر کلمۂ حق کہا، جس نے اس کی فکری جہت کو سلامت اور اس کی خوش فکری کو توانا اور فعال رکھا۔

"گل موسم خزاں" کا آغاز ذاتی بلکہ نجی نوعیت کے حوالوں سے ہوتا ہے، جن پر محبت، اخلاص اور ایثار کا غلبہ ہے مگر ستر صفحات کے اندر ہی یہ نجی حوالے مزاحمت اور جدوجہد کا چولا پہن لیتے ہیں، تاہم یہ کیفیت بہت دیر تک برقرار نہیں رہتی اور اس کتاب کے اگلے ڈیڑھ سو صفحات میں ایک بار پھر گل محبت اپنی تمام تر توانائی اور رنگینی کے ساتھ مہکتا نظر آتا ہے۔ جس سے یہ کتاب اپنے نام کی طرح عہد خزاں میں خواب و خوشبو کا استعارہ ہی نہیں بنتی، اپنے عہد کے مجموعی شعری مزاج سے الگ بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے ذرا اس کتاب کی نظموں کے یہ ٹکڑے دیکھیے جو میری بات کے پہلے دو حصوں کی تصدیق کرتے ہیں:

"اے دیار رنج آ دیدہ کی ہجرت زدہ ہوا / لوح مہتاب سے اترے کوئی صبح تحریر / مگر اس وحشت عجب رزم کے سناٹے میں / وہ اندھیرا ہے کہ ان ہاتھوں سے گرتے ہوئے لمحے نہیں دیکھے جاتے / چشم حیراں پہ برستے ہوئے تیر نے نہیں روکے جاتے / ایک اندوہ مسلسل کے سوا / برزخ جاں میں کوئی سنگ سزا ہے نہ کوئی ساعت اجر / اے اطراف آ دیدہ تجھے حرف ملامت سے گیا ہے آغاز"۔ (ملال کی ایک رات / ص43)

"ماں! اترے قدموں تلے / جب راکھ اڑتی ہے تو سینے میں خلا جیسی کوئی شے گونجتی ہے / میری جدائی کے حصے میں تو اب تک صرف تیرے چپ / لبوں کا زہر آیا ہے، مری جدائی جس نے آج تک تیرے / لہو روتے ہوئے قدموں کے پیچھے / راکھ دیکھی ہے۔" (ماں / ص38)

"تجھے کس یاد کی نسبت سے ہم کو یاد کرنا ہے / نہ ہم نے تیری آنکھوں میں ستاروں کی چمک دیکھی / نہ ہم نے تیرے ہونٹوں کی لرزتی پتیوں پر ان کے لفظوں کی شبنم تیرتے دیکھی، نہ ماتھے پر کوئی / مہتاب دیکھا اور نہ کانوں میں جھلکتی بالیوں کے رنگ میں / مہتاب کرنوں کا ہنر دیکھا / اترے آنچل کا ریشم سید عالی سے لپٹا ہے / کہ تیرے موم ہاتھوں کی دھنک پوروں کا جادو ہی / اہتمام جاں میں آترا ہے / بس اک خواب گریزاں کی طرح پلکوں کو چھو کر لوٹنے والے / تجھے کس یاد کی نسبت سے ہم کو یاد کرنا ہے" (تجھے کس یاد کی نسبت سے ہم کو یاد کرنا ہے / ص38,37)

"خواب کوئی سمت ہی نہیں ہے / سفر کا امکان بھیگی نیندوں کا خواب / جھلملاتے ہوئے رستوں پہ ابھر آتا ہے / کہ جس کے آسمان پھیلے ہیں، دشت گاہ حیات میں / اک دیا جو روشن تھا، اپنی لو سے بچھڑ رہا ہے / جو صبح روشن طلوع ہوتی تھی / اس کی تقدیر کا ستارہ اب اپنا منظر اتار رہا ہے / اب آسماں اور زمیں سب ایک ہو رہے ہیں"

(بھیگی نیند کی وحشت، ص75,74)

ہوا دریچوں میں بند ہے اور خواب آنکھوں میں قید ہیں / اور آنچلیں راستوں میں زنجیر ہو گئی ہیں / اجل سرا کے تمام دیوار و در منقش سکوت اوڑھے ہوئے کھڑے ہیں / گزشتہ عمروں کی دھول معمول طاقوں / میں چراغ کی بے لباس

ٹوٹے گر رہا ہے اور آ بیٹھے / بے صفات و معتبر کی تمنت و ایوان کے تسمیم کو دوام تمس ملال / کا تسلسل دے رہے ہیں /
ابھی جنازہ اٹھا نہیں ہے۔" (ابھی جنازہ اٹھا نہیں ہے، ص 77,76)

اور یہی وہ مرحلہ ہے، جس سے شاعر کا رُخ ایک بار پھر اپنے باطن کی طرف ہو جاتا ہے۔ یہاں کیا رو برس کی قلّت کا حصار ٹوٹتا اور شاعر کے وجود کی صباحت رجوع کرتی دکھائی دیتی ہے جو اس کتاب کی تکمیل تک ساتھ نبھانے کے بعد اگلی کتاب اور پھر اس کے بعد کی دونوں کتاب میں دکھتی نظر آتی ہے اور اس طرح ایوب خاور کی شاعری کا مجموعی حوالہ محبت قرار پاتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور بھی نیا اور انوکھا ہوتا جاتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ایوب خاور محبت اور مزاحمت کے شاعر ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ محبت اور مزاحمت زندگی کرنے کے دو متضاد رویے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ محبت بذاتِ خود مزاحمت کی ایک شکل ہے۔ زندگی اور زندگی کی سچائی سے محبت کرنے والا شخص ہی ظلم، ناانصافی اور بربریت کے خلاف مزاحمت کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ ایوب خاور اپنے موجود، اپنے عصر اور اپنے آپ سے بے پناہ محبت کرنے والا شاعر ہے، اس لیے اس کے یہاں موجود کی بیر عطا سے قدم ملا کر چلنے کا رجحان غالب ہے۔ ہم قدم فکر اور زمانے اس کی شاعری میں روح بن کر دھڑکتے ہیں۔ اس لیے وہ کئی دوسرے مزاحمتی شاعروں کی طرح بلند آہنگ اور تلخ تو نہیں اور اس نے علامت اور استعارے کی تہیں روایت اپنے لہجے کی توانائی کو وہ چند کیا ہے تاہم اس کی وضع کردہ علامتیں اور استعارے مبہم نہیں اور ان کے تناظر میں عہدِ حاضر کی کروٹ اور سمت کا تعین کرنا بہت آسان ہے۔ اس جہت نے ایوب خاور کو گھٹن اور یاسیت کا شکار ہونے سے بچائے رکھا ہے کہ اس نے ثروت حسین کی طرح حالاتِ زمانہ کو اپنی روح کا بوجھ بنایا ہے نہ خالد اقبال یاسر کی طرح اُسے اساطیری مکاشفوں کی وحدت میں لپٹا کر ناقابلِ شناخت رہنے دیا ہے۔ ایوب خاور کی شاعری میں ہم زمانیت کی خوشبو قاری کے سر چڑھ کر بولتی ہے اور ہم اس کی شاعری کے ذریعے سے اپنے عہد کے جبر اور اختیار کا نہایت واضح ادراک ہی نہیں کر سکتے بلکہ اس کی روشنی میں اپنے فکری رویے اور نفسیاتی ردِعمل کی پہچان بھی کر سکتے ہیں اور یہ جان سکتے ہیں کہ ہمارا عہد کس نوع کے جبر و تشدد کا شکار ہے اور یہ کشمکش ہمارے باہمی رویوں میں کس طرح کی معاشرتی تبدیلی لانے کا سبب بن رہی ہے۔

ایوب خاور کی محبت اور مزاحمت یک سطحی اور یک رنگی نہیں۔ وہ اپنے آپ سے، اپنے موجود سے، اپنے خوابوں سے اور اپنے وطن سے یکساں محبت کرنے والا شاعر ہے اور "گل موسم خزاں" میں محبت کے یہ سبھی رنگ خوب ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس لیے اس کی شاعری نفسیاتی کشمکش کا شکار ہے نہ اس پر کسی طرح کی یاسیت اور پچھتاوے کا غلبہ ہے۔ کیوں کہ وہ شاعر کے رنج اور خوشی کو ایک جیسی توانائی سے ظاہر کرنے پر قادر ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی محبت اور توانائی پر اس کے ایقان میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ذرا دیکھیے:

"زمانہ ایک پہیے کی طرح چالاک ہے / ہونی کو انہونی میں، انہونی کو ہونی میں کچھ ایسے ہی ہوتا ہے کہ جس کے دُکھ
میں آنکھوں کے بھرے ساون پیالے ٹوٹ جاتے ہیں / ہوا سوچوں میں گرہیں ڈال دیتی ہے / روح کے اندر اُترنے
والے ساتھی بچھڑ جاتے ہیں / اور ایسے دُکھ کی چھاؤں اوڑھ کر ہم نے / یہ کتنی بار سوچا ہے / گلی کے موڑ تک پھیلے
ہوئے کچھ زمانوں سے / اُتری آنکھوں میں کاجل کی طرح بجھنے کی خواہش تک / ہمیں اک واہمے جیسی حقیقت / اور
کچھ پھولوں کی خوشبو ہی بہت تھی۔" (گھروں میں ایک گھر اپنا بھی تھا، ص 103)

''اے خدائے شمس و قمر مجھے کوئی عمر دے / مری نیم باز نگاہ میں یہ جو خواب ہے / یہ جو سبز خط خواب ہے / یہ جو میری تھوڑی سی زندگی کا نصاب ہے / یہ جو میری ساری رتوں کی فصلِ بہار ہے / اے خدائے شمس و قمر مجھے کوئی عمر دے کہ میں اس / نصابِ بہار کو دلِ خستہ جاں کی دھڑکنوں میں دھڑکنے والے / دعاؤں کا وہ مزاج دوں، وہ مزاج دوں جو کبھی ملالِ خزاں / کی زد میں نہ آسکے جو کبھی بلائے زوال و قحط کی دسترس / میں نہ آسکے مگر ایک امن کا پھول اس میں کھلا رہے۔'' (وطن کے لیے ایک پھول، ص 72,71)

''گلِ موسمِ خزاں'' بلا کے زوال و قحط کی دسترس سے باہر کھلا ہوا وفا کا یہی پھول ہے جو جبر و استبداد کی مسموم فضا میں اپنی معصوم مہک سے آزادیٔ فکر کی نوید بن کر ظاہر ہوا ہے۔ ''گلِ موسمِ خزاں'' جبر اور جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نفسیاتی تشنج کا استعارہ ہے جس کا اظہار اس کتاب کی ہر نظم اور غزل سے ہوتا ہے۔ اس کتاب کا شاعر اپنے عہد کے مسائل اور مشکلات سے بے خبر ہے نہ ان سے منہ موڑ کر ذات سے رہتے پر شاکر۔ اس لیے اس کتاب کے ہر مصرعے میں ایک خاص طرح کی مزاحمت اور موجود کی بے کلی کو رد کرنے کا رویہ غالب ہے۔ یہ کتاب ایک سچے شاعر کے ہونے کی اور اپنے عصر سے پیوست ہو کر زندگی کرنے کے طرزِ عمل کی بھرپور ترجمان ہے اور یہ خصوصیت ایوب خاور کے ہم عصر دیگر شاعروں میں کم و بیش نایاب ہے۔ ''گلِ موسمِ خزاں'' زندگی اور اس کے تشدد سے جڑی ہوئی کتاب ہے۔ یہ کتاب ایوب خاور کی زندگی کے پچھلے چالیس برس کے ذاتی سفر اور فکری رویوں کی امین ہے۔ ایک سچے مزاحمتی شاعر کی طرح ایوب خاور نے اس کتاب میں جبر کی ہر صورت کے خلاف آواز بلند کی ہے، جس سے یہ کتاب اس عہد کا استعارہ بن کر اس نفسیاتی کشمکش، جبریت اور جینے کی کوشش کو بڑی دیانت داری سے واضح کرتی ہے، جس کی جھلک اس عہد کے دوسرے شاعروں کے یہاں اپنے ہونے کی خبر کم کم ہی دیتی ہے۔ اس کتاب پر ملال اور حزن کی چھاؤں کے باوجود اگر اسے امید اور صبحِ نو کی بشارت قرار دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ احمد ندیم قاسمی نے اسی بنیاد پر اسے بے کیفیتوں، اداسیوں اور شکستوں کا فاتح کہا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

''ایوب خاور کا رجحانِ طبع بیشتر اثبات کا ہے۔ گر اس کے ہاں کہیں کہیں نفی کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے تو یہ شر کی نفی ہے اور شر کی نفی ہی خیر کے اثبات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ایوب خاور بے کیفیوں، اداسیوں اور شکستوں کا فاتح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں اور غزلوں میں انتہائی کرب کے موثر اظہار کے باوجود اس افق کی کیفیت مسلسل موجود رہتی ہے جو طلوعِ آفتاب کی پذیرائی کے لیے آہستہ آہستہ روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔'' (ص 14)

ایوب خاور کی دوسری کتاب ''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' 1998ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس نے یہ کتاب محبت کے نام معنون کی ہے اور اس کتاب کے مجموعی مزاج کے حوالے سے یہ انتساب بہت بامعنی اور برمحل ہے۔ ایوب خاور کی یہ کتاب محبت اور متعلقاتِ محبت کی رمز کشائی کا مرقع ہے، جس کی اجمالی کیفیت شاعر کی اس نظم میں سمٹ آئی ہے:

''مری نظم گاہ کے دشت میں / کوئی صبح رنگِ ملال سی / کوئی شام زلف مثال سی / کوئی اطلسِ حسن کا / کوئی نقشِ عطر مزاج سا / کوئی عکس آئینہ فام سا / کوئی حرف حرفِ دوام سا / کہ ہجومِ عجمت و درد سے کوئی خواب مثلِ مہِ تمام طلوع ہوا / مری نظم گاہ کے دشت میں ترے تبسمِ لب سے مکالمہ تو شروع ہوا'' (ایضاً، ص 22)

''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' (کلام مجلت دار) سے مثل ماہ طلوع ہونے والے اسی خواب کی کتھا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ گلزار نے لکھا ہوا ہے جو ایوب خاور کی شاعری ٹی وی پروڈکشن اور ڈائریکشن کے بے مثل مداح ہیں۔ میں نے، جو انہی اوصاف کی بنا پر گلزار کے تخلیقی کل کا مداح خواں ہوں، ''گل موسم خزاں'' کی چند اور اس کتاب کی اکثر نظموں میں ایوب خاور اور گلزار کے تخلیقی اظہار میں ایک پُر لطف مماثلت محسوس کی ہے۔ اگرچہ یہ مماثلت شعوری اور اکتسابی نہیں تاہم ان دونوں تخلیق کاروں کے رجحان طبع کی ہم آہنگی کی خبر ضرور دیتی ہے۔ ذرا دیکھیے! ''گل موسم خزاں'' اور ''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' سے بعض نظموں کے یہ اقتباسات:

''ابھی کچھ دیر پہلے/ صبح تازہ کی نسوں میں موسم گل کا دھواں گھلنے سے کچھ پہلے/ یہاں اک نظم رکھی تھی/ بہت سے بے سروپا خواہشوں/ بے کار رنجشوں، رت جگوں اور وسوسوں اور کارِ دنیا کے/ ابھرے تیکھے کے نیچے نظم رکھی تھی''

(''گل موسم خزاں''/ یہاں اک نظم رکھی تھی، ص108)

''ابھی اس شام کے ریوڑ کو صبح زرد کی چھتی تک/ اک بوڑھے گڈریے کی طرح سے ہانک کر لانا ہے/ یہ بھی/ دیکھنا ہے میرے ریوڑ سے کوئی ننھا ستارہ ٹوٹ کر آفاق تک/ پھیلے ہوئے اندھے سفر کی دھول میں غائب نہ ہو جائے/ ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں/ کسی کے پاؤں کو مٹی کے جوتوں سے چھڑانا ہے، کسی کے حلق میں بولی کی پھیلی رتوں کی پیاس فصلیں کاٹنی/ ہیں اور کسی خاکستری تن پر کوئی ہرا اس گل کھینچنا ہے/ اے اسیرانِ قفس/ مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں''۔ (''گل موسم خزاں''/ ابھی مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں، ص134)

''اور تمھیں معلوم ہے/ کپڑوں کی الماری ہمیشہ سے کھلی ہے/ سیف کی چابی تو تم نے خود ہی گم کی تھی/ سو وہ جب سے کھلا ہے اور اس میں کچھ تمھاری/ چوڑیاں، اک آدھا انگوٹھی اور ان کے بیچ میں کچھ زرد خط/ اور ان خطوں کی گرہوں میں بندھی کچھ لمس کی/ گرمیں/ نظر کے زاویے، پوروں کی شمعیں اور سنہرے رنگ کی ٹوٹی ہوئی سانسیں ملیں گی اور وہ سب کچھ جو/ میرا اور تمھارا مشترک سا اک اثاثہ ہے، سب پائے/ تو نے چاہا، مجھے جانے کی جلدی ہے''۔

(''تمھیں جانے کی جلدی تھی''، ص34)

''کوئی بات کرو/ کوئی سونے جیسی بات کرو/ مرے پاگل اس دل کو/ کسی سچے حرف کی دھڑکن دو/ یہ جو تیری جھوٹ بھری آنکھیں/ مری آنکھوں میں/ پانی سے لدے ہوئے بادل گھیر کے لاتی ہیں/ ان جھوٹ بھری آنکھوں سے کہو/ مری آنکھوں کو شبنم سے ڈھلے خوشبو سے لدے/ کسی خواب گماز کا موسم دیں''۔

(''تمھیں جانے کی جلدی تھی''/ کوئی بات کرو، ص64،67)

یوں لگتا ہے، جیسے گلزار اور ایوب خاور کے مابین ہمسایگی سی کیفیت کی نمود ہے مگر ہم آہنگی کی اس زیریں لہر کے علاوہ ان دونوں

تخلیق کاروں میں فکری ہم آہنگی کی شرح بہت کم ہے۔ ایوب خاور کی شاعری کا غالب حوالہ ہم زمانیت ہے۔ اپنے عہد کی تاریخ، فکر، اثرات اور حاصلات کو رقم کرتے ہوئے، عہد رواں کی ایک ایک کروٹ کو منقش اور متحیر کرتی ہوئی شاعری۔ جس میں یاد اور خواب کا حوالہ (جو اس عہد کی شاعری کا عمومی تجربہ تھا) بہت کم ہے۔ ''گل موسم خزاں'' کی طرح ''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' کی شاعری کی بنیاد اور تخصیص بھی موجود سے یکگت ہے جو عصر رواں کی قباحت اور ابعاد کو نمایاں کرتے ہوئے موجود کی جبریت اور اسے محسوس کرتے ہوئے غلو اور تضاد کے خلاف اعلان جہاد نہیں کرتی، سچائی اور فکر حق کی نقابت کا حق بھی ادا کرتی ہے۔ یہ شاعری اس امر کا بخوبی احساس دلاتی ہے کہ شاعر کے لیے بہت نرم گفتار رہ کر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے مکالمہ کرنا کس قدر آسان ہے۔ ''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' کی شاعری میں محبت اور متعلقات محبت کی تشکیل کری ایک الہامی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کتاب میں ظہور کرتے ہوئے جذبوں کی شدت اس لیے حیران کن ہے کہ شاعر نے یہ کتاب کم و بیش پچاس برس کی عمر میں شائع کی ہے۔ جب وفور عشق پر تفکر غالب آنے لگتا ہے اور محبت کی آنچ مدھم پڑ کر دور کے کسی دوست ستارے کا روپ دھار لیتی ہے، جس کی ومک اپنی طرف بلاتی تو ہے مگر جس کی طرف قدم بڑھانے کی توفیق کم ہی ہوتی ہے۔ ایوب خاور نے اس کتاب میں کار عشق کو ایک دوامی استعارہ بنا دیا ہے اور اس کی تابانی کو نا قابل یقین حد تک برقرار رکھا ہے۔ ذرا دیکھیے:

آئینہ سامنے رکھیں تو نظر تو آئے / / تجھ سے جو بات چھپائی ہو کہاں کس سے کریں ''/ / زلف سے چشم و لب و رخ سے
کہ تیرے غم سے / بات یہ ہے کہ دل و جاں کو رہا کس سے کریں / ''مرے دشمن / میں تجھ سے اور ترے لشکر سے بچ کر
کس طرف نکلوں / کہیں پر تیری پلکیں خیمہ زن ہیں / اور کہیں زلفوں کے سایے ہیں / گل رخسار کی آتش صفت رعنائی
/ اپنے تیر و ترکش سے مزین ہے / کہیں ہونٹوں کی قسمیں ہیں / کہیں آنکھیں ہیں / بے حد خوبصورت اور گہری اک
طلسم خاص میں ڈوبی ہوئی آنکھیں'' ("مجھے تم سے محبت ہے"، ص 37)

''میرے شہر زاد / یہ روز و شب / یہ خیال و خواب / یہ چشم و لب / ترے جسم و جاں کے سبک سراب کی نذر ہیں / میری
انگلیوں کی ہر ایک پور میں / تیرے نام کی جتنی آنچ سلگ رہی ہے وہ ک رہے ہیں / ترے لیے جو چراغ وہ بھی
تیرے حسن صبا خرام کی نذر ہیں''۔ ("تمھارے لیے ایک نظم"، ص 64)

یہ نظمیں اور دوسری نظمیں جیسے ''Obression''، ''تم کلھتی ہو مجھے''، ''محبت آپ وادانے کی طرح ہے''، ''پہیلی''، ''دو ہاتھوں کی ایک نظم''، ''تم قیدی ہو''، ''اعتراف''، ''محبت تم نے کب کی ہے''، ''ایک دعا''، ''اجازت''، ''التماس''، ''برزخ'' اور ''اندیشے'' بے عشق کی ایک ایسی جادو اس آنچ میں گندھی ہیں جو ہم عصر شاعری میں کم و بیش ناپید ہو چکی ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ''تمھیں جانے کی جلدی تھی'' میں سود عشق کی دہائی تو ہے، شکست انا کی کسک اور حسرت وصل کی چبھن اور حزن تو نہیں۔ اس لیے کہ ایوب خاور کی شاعری کسی ناکام محبت شخص کی شاعری نہیں، لذت وصل سے شاد کام اور اس لذت کو دوام دینے کی کوشش کرنے والے شخص کی شاعری ہے۔ اردو شاعری میں اظہار عشق کا یہ ڈھنگ نیا بھی ہے اور الگ بھی۔ (جاری ہے)

◆◆◆

اکیسویں صدی۔ ادب اور ادیب

مسلم شمیم

اکیسویں صدی میں اردو ادب کو درپیش چیلنجز کیا ہیں؟ تاریخ کے اس مرحلے میں یہ سوال بڑی معنویت کا حامل ہے اور اس سوال پر تفکر کیے بغیر اور کچھ مثبت اور حتمی نتائج حاصل کیے بغیر اردو ادبی دنیا کو پیش آنے والے چیلنجز کا ادراک ممکن نہیں۔ یہ 1992ء کی بات ہے کہ دہلی میں بین الاقوامی پیمانے پر انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ پاکستان کا وفد شوکت صدیقی مرحوم کی قیادت میں شریک اجلاس تھا۔ اس وفد کا حصہ میں بھی تھا۔ افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر مونس رضا سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے یہ بات کہی تھی کہ سرد جنگ کے خاتمے اور 1991ء میں سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں ایک نئی دنیا ہمارے پیش نگاہ ہونی چاہیے یہ وقت سوالات اٹھانے کا ہے۔ سوالات اٹھانے کے بعد جوابات اٹھانے کی نوبت آئے گی۔ پروفیسر مونس رضا کی بات کا اطلاق اکیسویں صدی کے تناظر میں بھی صادق آتا ہے۔

ادب کا منصب روح عصر کی ترجمانی بھی ہے اور ضمیر وقت کی آواز سننا اور سنانا بھی۔ ادب کا بنیادی فریضہ زندگی کے جمالیاتی بیان کے احوال واقعی اور اس کے مسائل اور تقاضوں کا ادراک و شعور معاشرے میں عام کرنا ہے۔ زندگی کی تفسیر کے ساتھ زندگی کی تنقید بھی ادب کے جدید تصورات سے وابستہ ہے۔ یہ زندگی جو سماج کی عطا کردہ اور پروردہ اور سماج سے جڑی ہوئی ہے۔ یعنی سماجی زندگی کے ظاہر و باطن کی تصویر کشی کرنا ادب کے دائرہ تخلیق میں شامل ہے۔ تصویر کشی کے عمل میں ادب کے جمالیاتی تقاضوں کی تکمیل تخلیق کار کی ترجیح اول ٹھہرتی ہے۔ ادب میں سماجی شعور کا اظہار جس میں جذبہ و احساس کی تپش بھی شامل ہو ادیب کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ ماضی و حال کے تناظر کے ساتھ مستقبل کی پیش بینی بھی سماجی شعور کا جزو لاینفک ہوتی ہے۔ ادب کو اپنی فطرت اور طینت میں آفاقیت اور سیکولر نظریہ حیات کا حامل ہونا چاہیے۔ واضح کرتا چلوں کہ سیکولرزم کو دہریت اور لادینیت کا ہم معنی کہنا فکری بددیانتی اور گمراہی ہے۔ کیونکہ سیکولرزم کا بنیادی تصور ریاست کا مذہب کے باب میں غیر جانبداری ہے۔ کیونکہ مذہب اور عقیدہ فرد کا ذاتی معاملہ اور مسئلہ ہے اور فرد کی ضمیر کی آزادی کی ضمانت صرف ریاستی اداروں کی مذہبی امور میں عدم مداخلت سے عبارت اور مشروط ہے۔ ادب کی دنیا کے وسیع تر مذکورہ پس منظر میں ہم عصر زندگی اور سماج کے مسائل و مراحل اور مسلسل روز و شب کے ادراک و تفہیم اور ہم عصر زندگی کو درپیش تقاضوں کا اظہار کرنا آج کے ادیب کا فرض اولیں بنتا ہے اور سماجی زندگی کے سفر ارتقا کے گہرے شعور و ادراک کے حصول کو اس باب میں شرط اولیں کہنا چاہیے۔ اکیسویں صدی کا ایک عشرہ گزر چکا ہے۔ مگر اکیسویں صدی کے آغاز کو گزشتہ صدی یعنی بیسویں صدی کی آخری تاریخ کے بعد کیلنڈر کے ورق کے پلٹنے کے تناظر میں سمجھنا غیر سائنسی انداز فکر اور تاریخی شعور سے محرومی کا مظہر ہوگا۔ تاریخ کا سفر ارتقا جاری و ساری عمل مسلسل کا نام ہے اور اس کے تانے بانے ماضی قریب اور ماضی بعید سے ملے ہوئے ہیں۔ لہٰذا رواں صدی کے آغاز کی تفہیم اور اس کے مسائل اور تقاضوں کے صحیح ادراک کے بغیر ادیب اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکام رہے گا۔ عہد جدید کی یہ موجودہ صدی اپنی گوناگوں خصوصیات

کے ساتھ فکر و شعور کے نئے زاویوں اور نئے انداز تفکر و تجسس کی متقاضی ہے۔ عہد جدید کی موجودہ صدی کی تفہیم کے لیے عہد جدید، جو چودھویں صدی یعنی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بطن سے پیدا ہوا، کے تاریخی پس منظر اور تناظر کا ادراک نہایت ضروری ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے فروغ اور کامرانیوں میں جرمنی میں چھاپہ خانے کی ایجاد جوہان گیوٹن برگ (Johann Gutenberg, 1400-1466) کا عظیم کارنامہ تھا اور اس میں اس کا اساسی اور تاریخ ساز کردار ہے۔ نشاۃ ثانیہ یعنی Rebirth of Learning کے زیر اثر فکر و نظر کی دنیا میں دور رس تبدیلیاں رونما ہوئیں، فنون لطیفہ میں انقلاب آفریں رونما ہوئی اور سائنس اور طب میں پیش رفت کا آغاز ہوا۔ چودھویں صدی سے شروع ہونے والی تحریک اصلاح (Reformation) سولھویں صدی میں یورپی معاشرے میں کلیدی تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ہزار سالہ عہد تاریک (Dark Ages) کا خاتمہ رومن کیتھولک چرچ کے زوال کے نتیجے میں ہوا جو مغربی یورپ پر واحد حاوی مذہبی ادارہ تھا۔ تحریک اصلاح کے نتیجے میں چرچ دو حصوں یعنی Catholic and Protestant کی صورت میں منقسم ہوا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں یورپ کی قومی ریاستوں کا ظہور ہوا اور چرچ اور ریاست کی ایک دوسرے سے علیحدگی ہوئی، جمہوریت کے لیے جدوجہد شروع ہوئی اور موروثی بادشاہت کے نظام کی شکست کا آغاز ہوا۔ 1789ء میں انقلاب فرانس سے بورژوا انقلابات کا سیل رواں جاگیری باقیات کو بہا لے گیا۔ خرد افروزی کی تحریک The Enlightenment سترھویں صدی سے شروع ہوئی۔ اٹھارویں صدی تک اس کا تسلسل رہا۔ اس عہد کو Age of Reason کہا گیا، کیونکہ یہ وہ عہد تاریخ ہے جس میں معاشرے کے باشعور طبقے نے فطرت کے رموز و اسرار (Natural Phenomena) کی تفہیم کے لیے مذہبی نقطۂ نظر کے بجائے سائنسی نقطۂ نظر کی روش اپنائی۔ اس تحریک کے مبلغین اس عہد کے عظیم فلاسفہ اور سائنس دان (Scienetist and Philosophers) تھے جن میں گیلیلیو (1442-1564ء)، جوہانس کپلر (1571ء۔ 1630ء)، آئزک نیوٹن (1642ء۔ 1727ء)، روسو (1712ء۔ 1778ء) اور والٹیر (1694ء۔ 1778ء) کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔

عہد جدید کے سفر ارتقا میں کرسٹوفر کولمبس (1451ء۔ 1506ء) کی نئی دنیا یعنی امریکا کی دریافت ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نئی دنیا کو 1492ء میں دریافت سے یورپ کی توجہ خصوصی رفتہ رفتہ اس کی جانب ہوتی گئی۔ یاد رہے کہ چودھویں صدی کے آخر سے اور سولھویں صدی تک یہ خطہ ارض ایک وسیع و عریض عظیم ویرانہ تھا جہاں تہذیب و تمدن کا سفر گویا اہل یورپ کی آمد سے شروع ہوا اور وہ ویرانہ آج کرۂ ارض کا سب سے ترقی یافتہ اور سب سے طاقت ور ملک بلکہ بلا شرکت غیرے سپر پاور ہے۔ اس خطہ ارض کے حوالے سے آگے کے صفحات میں مزید کچھ اور اہم ترین حقائق پیش کیے جائیں گے جو موجودہ صدی کے تناظر میں بڑی معنویت کے حامل ہیں۔ یہاں اس حد تک بیان کرنا کافی ہے کہ امریکی جنگ آزادی (1776ء۔ 1783ء) تاریخ عالم کا اہم ترین واقعہ ہے اور 1976ء کا اعلان نامہ اہم ترین تاریخی دستاویز ہے۔ 1789ء میں تحریری امریکی آئین کی تدوین اور ترویج اور 1789ء ہی کے انقلاب فرانس کا وقوع پذیر ہونا اور The Declaration of the Rights of Man نے دنیا کے سفر جمہوریت کے لیے مشعل راہ کا کام کیا۔ اس انقلاب فرانس کا نعرہ Liberty, Equality and Fraternity عہد جدید کے لیے ایک منشور عظیم ثابت ہوا۔ انقلاب فرانس کا مذکورہ اعلان نامہ اور نعرہ گویا 1948ء میں منظور کیا جانے والا اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا اعلان (Charter of Universal Human Rights) کا پیش رو اور پیش نامہ تھا۔ مذکورہ بالا تاریخی واقعات کی اہمیت عہد جدید کے تناظر میں اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے مگر اٹھارویں اور

انیسویں صدی میں رونما ہونے والے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کی اہمیت سب سے زیادہ اور کلیدی ہے اور اس پر اتفاق رائے ہے کہ عہدِ جدید اور جدید دنیا (Modern World) کا حقیقی نکتۂ آغاز اسی انقلاب سے عبارت ہے۔ اس انقلاب کا کلیدی کردار جیمس واٹ (Jamfs Watt 1736-1819) تھا جس نے اسٹیم انجن (Steam Engine) ایجاد کیا تھا۔ انیسویں صدی میں مائیکل فیراڈے (Michael Faraday, 1791-1867) اور جیمس کلرک میکس ول (James Clerk Maxwell, 1831-1879) کی بجلی (Electircity) کی ایجاد اور دریافت نے مذکورہ صنعتی انقلاب کے سفرِ ارتقا کو تیز تر کر دیا۔ انیسویں صدی کا اختتام ایک نئی دنیا تخلیق کر رہا تھا، یہ آواز کی دنیا تھی۔ ایک جانب امریکا، اسکاٹ لینڈ، جرمنی اور فرانس میں براڈ کاسٹنگ کے نظریے کے خال وخط ابھر رہے تھے اور دوسری جانب امریکا میں تھامس ایڈیسن (Thomas Edison, 1847-1931) نے آواز ریکارڈ کرنے کا آلہ ایجاد کر لیا تھا۔ ریکارڈنگ اور براڈکاسٹنگ کے تال میل سے آج کی دنیا پچھلی صدیوں کی دنیا سے کتنی مختلف ہے اور سائنسی معجزوں کی بنیاد پر کرۂ ارض کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ اس باب میں الیگزینڈر گراہم بیل (Alexander Gram Bell, 1847-1922) کا نام لیا جانا، جس نے ٹیلیفون ایجاد کیا تھا، ناگزیر ہے۔ اس ایجاد نے انسانی سماج کو کس قدر مربوط اور انسانی رشتوں کو کیسی کمیتی اور کیفیتی تبدیلیوں سے ہم کنار کر دیا۔ بیسویں صدی کا آغاز ایک دھماکہ خیز ایجاد یعنی ہوائی جہاز سے ہوا جو دو بھائیوں Orvill Wright (1871-1948) اور Wilbur Wright (1867-1912) کا عظیم الشان مشترکہ کارنامہ ہے۔ ان دو بھائیوں کے مذکورہ کارنامے نے کرۂ ارض کے فاصلوں کے پیمانے تبدیل کر دیے۔ اب فاصلوں کی پیمائش سیکڑوں اور ہزاروں میلوں کے الفاظ سے نہیں کی جاتی بلکہ اب فاصلوں کا تعین اور پیمائش گھنٹوں سے کی جاتی ہے، یعنی کرۂ ارض کے کس گوشے میں کتنے گھنٹوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس ایجاد نے کرۂ ارض پر بسنے والوں انسانوں کے درمیان جغرافیائی فاصلوں کو وقت گزرنے کے ساتھ کم سے کم کر کے اور پھر انفارمیشن ٹیکنالوجی (IT) نے دنیا کو واقعتاً ایک گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے۔

انیسویں صدی کے مسائل اور سماجی حالات اور تقاضوں کے ادراک و شعور کے لیے عہدِ جدید کے سفرِ ارتقا کا جو طائرانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے، اس میں کلیدی کردار آلات و اوزار پیداوار میں تبدیلی کا ہے جو کارل مارکس کے مطابق آغازِ تہذیبِ انسانی سے سماجی نظام کی تبدیلی اور ترقی کا محرک رہا ہے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں طریقہ پیداوار اور آلات و اوزار پیداوار میں بنیادی تبدیلی آئی اور انسانی سماج تیز سے تیز تر تبدیلیوں کی طرف گامزن ہو گیا۔ اس حوالے سے بنیادی تبدیلیاں درج ذیل ہیں:

(A) Hand To Machine Manufacture (B) Home To Factory Production

(C) Natural Power To Steam Engines

انسانی سماج کی اقتصادی ہیئت یکسر تبدیل ہوتی گئی، جاگیردارانہ نظام رفتہ رفتہ روبہ زوال ہوتے ہوتے معدوم ہو گیا اور اس کی جگہ اس سے زیادہ ترقی یافتہ سماجی نظام صفحۂ تاریخ پر جلوہ گر ہوا یعنی سرمایہ دارانہ نظام۔ سرمایہ دارانہ نظام کے جلو میں جمہوریت پروان چڑھتی گئی اور موروثی بادشاہت تاریخ کا حصہ بنتی گئی۔ صنعتی انقلاب نے نت نئے دریافتوں اور ایجادات کے لیے راہیں ہموار کیں جن کا اختصار کے ساتھ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ 1789ء میں انقلابِ فرانس اور اسی سال ریاست ہائے متحدہ امریکا میں پہلے تحریری آئین کی تدوین و ترویج نے کرۂ ارض کے سیاسی نقشے پر دوررس نقوش مرتب کیے۔ پوری انیسویں صدی میں یورپ میں انقلابی اتھل پتھل مذکورہ عوامل کا منطقی

نتیجہ تھی جس کا اظہار کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کی مشترکہ انقلابی دستاویز یعنی کمیونسٹ مینی فیسٹو (1848ء) کے پہلے فقرے سے ہوا تھا: "ایک آسیب یورپ پر منڈلا رہا ہے، کمیونزم کا آسیب"۔ اسی تاریخی تناظر میں بیسویں صدی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا بھی موجودہ صدی کے مخصوص حالات اور تقاضوں کے ادراک کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ بیسویں صدی کا آغاز Wright Brothers کے حوالے سے ہوا تھا، تیز انداز سے ہوا۔ گزشتہ صدیوں میں سرمایہ دارانہ نظام اُس مقام پر پہنچ گیا جس کے بارے میں انقلابِ اکتوبر 1917ء کے بانی لینن نے کہا تھا کہ Imperialism is the Highest Stage of Capitalism۔ سو اٹھارویں صدی سے سرمایہ دارانہ نظام کے بطن سے نوآبادیاتی نظام کا ظہور ہونا شروع ہوا اور انیسویں صدی میں ایشیا اور افریقہ کے درجنوں ممالک یورپی ممالک کی نوآبادیات بن گئے جن میں سب سے بڑا سامراجی ملک بن کر برطانیہ ابھرا جس کے حوالے سے یہ بات کہی جاتی تھی کہ سلطنتِ برطانیہ پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ بیسویں صدی میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں کے درمیان کشمکش وقت کے ساتھ تصادم کی شکل اختیار کر گئی۔ پہلی جنگِ عظیم (1914ء۔1918ء) اسی کشمکش اور تصادم کا گویا بھیانک اظہار تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ میں فسطائیت کے جن کا جنم ہوا اور ایک عشرے کے اندر اندر وہ بھیانک شکل میں دنیا کے لیے پہلی جنگِ عظیم سے سوگنا ہلاکت خیز عالمی جنگ (1939ء۔1945ء) کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ بیسویں صدی میں 1917ء کا اشتراکی انقلابِ اکتوبر ایک عالمی واقعے کی حیثیت سے وقوع پذیر ہوا اور اس کے اثرات کرۂ ارض کے چپے چپے پر مرتب ہوئے۔ جان ریڈ (John Reed) نے اس حوالے سے اپنی کتاب میں لکھا کہ The ten days that shook the world۔ دوسری جنگِ عظیم میں فسطائیت کے خلاف فیصلہ کن کردار سوویت یونین کا رہا تھا۔ برطانیہ عظمیٰ کو بھی دوسری عالمی جنگ کا فاتح کہا گیا مگر برطانیہ عظمیٰ اس جنگ کے خاتمے پر مفلوج اور شکست و ریخت سے دوچار ہوا اور اس کی نوآبادیاتی دنیا کلیتہً بکھر گئی اور تاریخ کا حصہ بن گئی، البتہ یادِ ایامِ ماضی کی یادگار British commonwealth of nations کا ادارہ آج بھی قائم ہے۔ دوسری عالمی جنگ کا سب سے بڑا Benificiary بن کر ریاست ہائے متحدہ امریکا ابھرا اور جدید نوآبادیاتی نظام کا وہ بلا شرکتِ غیرے Custodian ہے۔ سوویت یونین نے سب سے بڑی انسانی قربانی دی یعنی دو کروڑ انسانوں کی ہلاکت برداشت کی اور سب سے زیادہ تباہی سے دوچار ہوا مگر سوویت یونین مذکورہ جنگِ عظیم کے خاتمے کے چند سال کے اندر امریکا کی ہم مقابل عالمی طاقت بن کر ابھرا، چنانچہ ایک نئی عالمی جنگ کا آغاز ہو گیا، یعنی سرد جنگ (Cold War)۔ یہ جنگ 1991ء میں سوویت یونین کے انہدام پر ختم ہوئی۔ سرمایہ دار دنیا کے اہلِ دانش نے سوویت یونین کے انہدام کو سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں اشتراکیت کی شکست قرار دیا اور [illegible] اس حوالے سے End of History کا اعلان کیا۔ سوویت یونین کے انہدام کو اشتراکیت کی ناکامی قرار دیے جانے کے تصور کو کلیتہً عالمی سطح پر مسترد کیا جا چکا ہے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بہت سے عوامل اور اسباب و علل تھے جن کی وضاحت یہاں غیر ضروری ہے مگر اسے انقلابِ اکتوبر کے آدرش یعنی اشتراکی نظریے کا انہدام قرار دیا جانا تاریخی شعور سے عاری ہونے کے مصداق ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین نے سوویت یونین کے انہدام کو سوویت ریاست کی Management کی ناکامی قرار دیا تھا۔ بہرحال سرد جنگ کے خاتمے کے بعد غیر اشتراکی حلقوں کی یہ خوش فہمی جلدی دور ہو گئی کہ اب دنیا میں جنگ کے امکانات معدوم ہو گئے اور دائمی عالمی امن کے قیام کے لیے راہیں ہموار ہو گئیں اور حالات سازگار ہو گئے۔ سرد جنگ کے اختتام کو دو عشرے بیت چکے ہیں اور اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ شروع ہو چکا ہے مگر آج کی دنیا پچھلی صدی کے مقابلے میں جنگ کے

بھیانک خطرات سے کہیں زیادہ دوچار ہے۔ War on Terror کے نام سے ایک نئی عالمی جنگ کا آغاز ہوئے بھی ایک عشرے کا عرصہ ہو گیا ہے مگر اس کے شعلے بجھتے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ شعلے وقتی بجھ گئے تو آج دنیا کے متعدد ممالک کے پاس جو مہلک ترین نیوکلیئر ہتھیار ہیں، ان کے پیشِ نظر کرۂ ارض کو ہیروشیما اور ناگاساکی سے ہزار گنا بھیانک خطرات کے اندیشے لاحق ہیں۔ گویا انسانی تہذیب و تمدن کی تمام تر کامرانیوں اور حاصلات کے معدوم ہونے کے خدشات بے سروپا خواب نہیں ہیں۔ اس کا بھرپور ادراک ہونا آج کے ادیب کے شعور، حسیت اور طرزِ احساس کے لیے بڑے چیلنج کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں یہ بات بے محل نہیں بلکہ بڑی معنویت کی حامل ہے کہ جب دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی عمل داری رہے گی، اس کے بطن سے جنگ کے کوہِ آتش فشاں پھٹتے رہیں گے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام کے رگ و پے اور اس کی طینت میں جنگ کے جراثیم گردشِ خون میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوویت یونین کے انہدام اور سرد جنگ کے خاتمے کے باوجود امریکہ کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی وہاں کی جنگی صنعت (War Industry) ہے۔ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی اساس استحصال اور لوٹ کھسوٹ پر استوار ہے، لہٰذا استحصال پر استوار نظام میں امنِ عالم کا خواب دیوانے کے خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی عطا کردہ جمہوریت، جمہوریت نہیں لوٹنے کی صدا آبادی کے لیے سراب سے زیادہ معنویت کی حامل نہیں۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بیسویں صدی کے عشرے صدیوں کے برابر کیے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اس تاریخی تناظر میں اکیسویں صدی کے عشروں کی تاریخی حیثیت کا تعین کیا جانا چاہیے۔ یہ بات تبدیلی کی رفتار (Pace of change) کے حوالے سے کی جا رہی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد یعنی بیسویں صدی کی دوسری نصف صدی یعنی 1950ء سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جو پیش رفت اور کامرانیاں سامنے آئی ہیں، ان کی روشنی میں اسے ایک نئے انقلاب کا نام دیا جانا درست ہوگا، یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کا انقلاب (STR) جس کے بطن سے ایک اور انقلاب کا جنم ہوا یعنی انقلابِ اطلاعات (Information Revolution)۔ ان دونوں انقلابات کے نتیجے میں کرۂ ارض کو گلوبل ولیج کے نام سے یاد کیا جانا کلیۃً برحق ہے۔ آج I.T. کے وسیلے سے علم کے ان خزانوں تک رسائی حاصل ہو گئی ہے جو پہلے تصور سے بعید بات تھی۔ چونکہ تہذیب و تمدن کا سفرِ ارتقا Knowledge-Base رہا ہے، لہٰذا اکیسویں صدی میں انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کے مدارج کے بارے میں سوچا جانا چاہیے۔ ہمارے ادب میں اس سوچ اور فکر و شعور کے واضح نقوش نظر آنے چاہئیں۔ ہمارے لیے سب سے بڑا امتحان اکیسویں صدی کے Pace of change کا تعاقب کرنا ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی دنیا میں گلوبل ولیج کے ساتھ عالم کاری (Globalization) کا غلغلہ بلند ہونا شروع ہو گیا اور عالم کاری کے حوالے سے منفی اور مثبت آرا کی صدائے بازگشت میڈیا کے ساتھ ادبی دنیا میں بھی سنائی دے رہی ہے، بلکہ یہ صدائے بازگشت زیادہ بلند آہنگ ہوتی جا رہی ہے۔ عالم کاری کو کچھ حلقے نئی سامراجی حکمتِ عملی کا نام دے رہے ہیں، کیونکہ آج سرمایہ دارانہ نظام ایک سنگین بحران سے دوچار ہے۔ کچھ ممالک اس بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ڈوبتی ہوئی سرمایہ دارانہ معیشت کو Bail out کی بیساکھی پر کھڑی رکھنے کی سعی نامشکور کر رہے ہیں مگر سرمایہ دارانہ نظام کے باطن میں تضادات کی موجودگی میں یہ نسخۂ کیمیا ثابت نہیں ہو سکتا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا یہ پہلا سنگین بحران نہیں ہے۔ 1928ء-1932ء کے عرصے میں اس قسم کے بحران سے سرمایہ دارانہ نظام دوچار ہوا تھا۔ یہ بحران وقتی طور پر دب گیا اور دوسری عالم گیر جنگ کی گرد میں چھپ گیا ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ موجودہ بحران دنیا کے لیے کوئی بہت

بھیانک خواب ثابت نہ ہو۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف Occupy wall street کی تحریک ایک روشنی کی کرن بن کر افق عالم پر ابھری ہے اور ماضی قریب میں اس تحریک کے پرچم تلے یورپ میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا تھا "ہم 99 فی صد ہیں (We are 99%)"۔ یہ تحریک عالم گیر سطح پر مثبت تبدیلیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ یقینی طور پر اشتراکی نظام کی راہیں ہموار کرے گی۔ مستقبل میں رونما ہونے والے اشتراکی انقلابات انقلاب اکتوبر 1917ء اور انقلاب چین 1949ء سے مختلف حالات اور مختلف حکمت عملی کے تحت ظہور پذیر ہوں گے جن میں جمہور کی بھاری اکثریت کی عملی شرکت ہوگی، کیونکہ انسانیت کا مستقبل بہر صورت اشتراکیت سے وابستہ ہے۔ اس سیاسی اور اقتصادی منظر نامے سے قطع نظر ادب کے آج کے موضوعات کیا ہیں اور ہیئت اور طرز احساس کا سرچشمہ کیا ہے، اس کا جاننا گویا "مکتب میں عاشق کے پہلا سبق ہے"۔ حسن و عشق ادب سے خارج نہیں ہو سکتے مگر حسن و عشق کے معاملات آج قطعی مختلف ہیں۔ نامہ و پیام کے باب میں الیکٹرانک آلات نے تمام روایتی مراحل کو ختم کر دیا ہے۔ ثقافت اور سماجی زندگی میں انقلابی تبدیلیوں کے نتیجے میں جو آزادی فرد کی زندگی میں آئی ہے، اس کے نتیجے میں روایات اور اقدار کی نئی صورتیں ابھر رہی ہیں، لہٰذا فراق و وصال کی واردات بھی یکسر مختلف ہوگی ہے۔ امن اور جمہوریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندگی کی ترجمانی اور ہم سفری کے دعوے دار ادب کے لیے امن اور جمہوریت کے موضوعات آج ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ معنویت کے حامل ہیں۔ کیونکہ سائنسی اور تکنیکی ایجادات اور دریافتوں نے جہاں زندگی کی ثروت مندی میں اضافہ کیا ہے، وہیں نئے خطرات سے بھی دوچار کر رکھا ہے۔ غرض یہ کہ میرے نزدیک اہم عصر عہد اور عشروں کا ادراک و شعور حاصل کرنا ادب کا فرض اولین ٹھہرتا ہے اور Pace of change کا تعاقب کرنا سب سے بڑا المیہ بنتا ہے اور اس کے کامیاب تعاقب کے بغیر اکیسویں صدی میں ادب کو درپیش چیلنجز کی تفہیم دلوانے کا خواب ثابت ہوگی۔

اکیسویں صدی میں رونما ہونے والے حالات، مسائل اور چیلنجز (Challenges) کے ادراک اور شعور کا اظہار ادب میں کس قدر موثر انداز میں ہوتا ہے اور ادیب اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ بہر حال سماج کو بدلنے کے عمل میں ادب کے کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جانا چاہیے۔

◆◆◆

اشفاق احمد

میں نے زندگی میں چند باتیں سیکھیں۔

- ماں باپ کے علاوہ کوئی وفادار نہیں۔۔۔
- عزت صرف پیسے کی ہے انسان کی نہیں۔۔۔
- غریب کا کوئی دوست نہیں بنتا۔۔۔
- انسان جس شخص کے لئے دل سے مخلص ہو وہ دھوکہ دیتا ہے۔۔۔
- لوگ اچھی سیرت کے بجائے اچھی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔۔۔

- ہم لوگوں سے جب تک لڑتے ہیں جب تک ہمیں ان سے پیار کی اُمید ہوتی ہے جس دن وہ اُمید ختم ہو جاتی ہے تو لڑنا بھی ختم ہو جاتا ہے۔

انجم رومانی

(غزل میں فکری بصیرت کا نمائندہ شاعر)

حسن عسکری کاظمی

شعر و ادب سے شغف اور تخلیقی ہنر مندی کو ہم فطرت کا انمول تحفہ کہہ سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ بہت پڑھا لکھا شاعر ہو یا کم تعلیم یافتہ انسان سخن وری میں یکتا ہو، اسی طرح کوئی کسی پیشے سے وابستہ ہو بظاہر شاعری اور پیشے میں کوئی مناسبت نہ ہو مگر آدمی کے اندر چھپا ہوا تخلیق کار کسی مرحلہ زیست میں ظاہر ہو جائے۔ پیدائشی نام غیر شاعرانہ ہو مگر بحیثیت سخن ور وہ خود ایسا تخلص اختیار کرنے کا حق رکھتا ہے جو اصل نام سے کہیں زیادہ معتبر کہلائے مثلاً شبیر حسن خان نام پیچھے رہ جائے اور جوش ملیح آبادی بحیثیت شاعر شہرت کی بلندیوں پر نظر آئے اسی طرح قتیل شفائی کو ہم سب جانتے ہیں لیکن اورنگ زیب سے کوئی واقف نہیں حالانکہ یہ قتیل شفائی کا حقیقی نام ہے۔ انجم رومانی کو بحیثیت شاعر سب جانتے ہیں، ان کا اصل نام فضل دین تھا۔ وہ ریاضی کے پروفیسر تھے جو بالکل غیر شاعرانہ پیشہ ہے لیکن قدرت نے ان کے اندر ایک ایسی تخلیقی شخصیت چھپا رکھی تھی کہ جب ظاہر ہوئی تو ان کا نام اور پیشہ چھپ گئے اور انجم رومانی ہمعصر شاعروں میں نمایاں نظر آئے ان کے شعری مجموعے "کوئے ملامت" نے دھوم مچادی۔ اسی طرح "دنیا کے کنارے" اور "شے اور طرح کی" "نعتیہ مجموعہ قابل ذکر ہیں اور اس سے بڑھ کر "اقبال کا منتخب فارسی کلام "منظوم اردو ترجمہ" انجم رومانی کی تخلیقی ثروت مندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

وہ ریاست کپورتھلہ (مشرقی پنجاب) میں 28 ستمبر 1920ء کو سلطان پور لودھی میں پیدا ہوئے۔ "کوئے ملامت" میں اپنا تعارف منفرد انداز میں پیش کیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــــ میرے قالب کا پیکر جوانی میں سفید بالوں والی اس عورت کا نام دولت بی بی تھا ہاں دولت بی بی۔ اس کے پاس بہت دولت تھی ــــ علم و ادب کی دولت ــــ درویش صفت، کم گو، امی معمار کا نام عطا محمد تھا اس کے بعض ہم عصر اسے سائیں بھی کہتے تھے ــــ دونوں 1894ء میں پیدا ہوئے اور دونوں 28 ستمبر 1947ء کو ایک ساتھ شہید ہوئے۔

میں 14 محرم الحرام 1339 کو سلطان پور لودھی میں پیدا ہوا اور ان دونوں نے میرا نام فضل الدین رکھا مجھے ان دونوں سے ورثے میں جو کچھ ملا اسے ان کی طرف سے بطور صدقہ جاریہ "کوئے ملامت" کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

انجم رومانی کی شام پاک ٹی ہاؤس میں گزرتی اور دن دیال سنگھ کالج میں عزیز طلبا کے درمیان بسر ہوتا۔ وہ ریاضی کے استاد ہونے کے ناتے ہر کام میں توازن اور اعتدال کی روش پر قائم رہے۔ انہیں اپنے پیشہ ورانہ فرض سے مکمل آگہی حاصل رہی اور ریاست فن میں بھی ریاضی کے اصول پیش نظر رہے کہ جو کہا اسے صفحہ قرطاس پر اتار کر دیکھا۔ پہلے قاری اور پہلے نقاد خود بنے پھر اپنا کلام حوالۂ قارئین کیا۔ اگرچہ "کوئے ملامت" کا آغاز حمد اور نعت سے کیا مگر تغزل کا حسن اور کومل لفظوں نے حمد اور نعت کو منفرد اور انوکھا اظہار بنا دیا۔

حمد:

ستم رسیدہ و مظلوم کی دعا کے قریب　　　ملا وہ مجھ کو دلِ درد آشنا کے قریب
کوئی تو ہے کہ جو ہمت مری بڑھاتا ہے　　　دلاسا دے کوئی غمخوار جیسے آ کے قریب
اس امر پر بھی توجہ کبھی کبھی انجم!　　　وہ ہے قریب ترے تو نہیں خدا کے قریب

نعت:

تنہا اسے دیکھا ہے اے غارِ حرا تو نے　　　پایا ہے اسے تو نے اے کوہِ صفا تنہا
تنہا نہیں سکتی تھی نعمت کوئی دنیا کی　　　اللہ سے باندھا تھا پیمانِ وفا تنہا
پیغام لئے پہنچا اسلام لئے پہنچا　　　دنیا کے بیابان میں اک آبلہ پا تنہا

انجم رومانی کی شاعری میں حزن و ملال اور زمانے اور اہل زمانہ کی بے اعتنائی کا سبب ایسا ماحول ابھر کر سامنے آیا ہے کہ وہ ہم عصر شاعروں میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انہیں شدت سے یہ احساس ہے کہ ان کے مقام و مرتبے سے متعلق لوگوں میں وہ آگہی نظر نہیں آئی جس کی صرف آرزو کی جاسکتی ہے۔ وہ بحیثیت تخلیق کار اپنا مخصوص انداز نظر رکھتے ہیں۔ انہیں اجنبیت اور ناشناسائیت کا دکھ تھا کہ ان کو سمجھنے میں کم ظرفی حائل رہی ورنہ وہ دوسرے شاعروں سے قد و قامت کے اعتبار سے کہیں بلند تر تھے۔

بنیادی طور پر انجم رومانی کلاسیکی غزل تخلیق کرنے کا ہنر جانتے ہیں لیکن وہ روایت میں جدت پسندی کے رجحان اور نئے تخلیق کاروں کی ریاضت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے موضوعات میں عشق و محبت، غمِ زمانہ، غمِ آفاق، غمِ ذات اور غمِ کائنات کی پذیرائی ملی، وہ اپنے گرد و پیش سے باخبر رہے اور ملکی و قومی مسائل کو غزل میں سمونے کا منفرد انداز اپنا کر فن اور مقصد کے حسین امتزاج کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ طرزِ احساس اور شعری سچائی ان کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

گریز کرتے ہیں سائے بھی مرے احباب　　　کہیں ادھر بھی نہ یہ آشفتہ سر نکل آئے
جب تنگ کر دیں زمانے میں ہم سے شراب لوگ　　　مسجد کہیں، کہیں کوئی مے خانہ چاہیے
رکھتے ہیں انجم آپ جو اوروں کے واسطے　　　اپنے لئے بھی تو وہی پیمانہ چاہیے
دن ہو کہ رات، کنجِ قفس ہو کہ صحنِ باغ　　　آلامِ روزگار سے حاصل نہیں فراغ
کرتے ہیں کسبِ نور اسی تیرگی سے ہم　　　انجم ہیں دل کے داغ کہ ہائے شب چراغ
موسم کا آہ و نالہ سے اندازہ کیجئے　　　تازہ ہوا پہ بند نہ دروازہ کیجئے

انجم رومانی کی غیر معروف غزل بھی معنوی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہونے کے باوصف اپنے عہد میں قدر سے قراءت کا ہدف رہی اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نئے آدمی کے فکر و تجربے کو غزل کا موضوع بناتے ہیں جب کہ غزل میں حسن و عشق اور عام روز مرہ زندگی کے حوالے عام ہیں مگر انجم رومانی کا زاویہ نظر مختلف ہے وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت تک رسائی کی خاطر دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔

یاروں کو یعنی ہم سے شکایت کچھ اور ہے
ہے واقعہ کچھ اور روایت کچھ اور ہے

تاریخ جو لکھے گی حکایت کچھ اور ہے
کرتے ہو جو بیان تم انجم بجا مگر

ہر ایک شخص یہاں اک فسانہ رکھتا ہے
دکھی دلوں کے لئے تازیانہ رکھتا ہے

مگر زندگی پھر بھی ہے خستہ حال
مجھے تیرا تجھ کو ہے میرا خیال

وہ شعراء جو پاکستان کی تشکیل کے وقت عہد شباب میں قدم رکھ چکے تھے اور اپنی آنکھوں سے قتل و غارت گری اور نقل مکانی کے وقت بے سروسامانی میں مبتلا لوگوں کے مصائب دیکھ رہے تھے اور ان میں وہ ادیب اور شاعر بھی تھے جو خود بھی اس عذاب جاں کنی کا ہدف بنے تھے انہیں اظہار کی مہلت ملی تو ان کا قلم وہی کچھ لکھنے لگا جو ان پر گزر رہی، ان میں ناصر کاظمی سر فہرست نظر آتے ہیں اور انجم رومانی بھی ان شاعروں کی فہرست میں شامل ہیں جو کپور تھلہ (مشرقی پنجاب) سے خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے، وہ آزادی کی فضا میں عہد غلامی کی تلخیوں کو یاد کرتے مگر انہیں دکھ تھا کہ آزاد ہونے کے باوصف ہمارا طور طریقہ، ہماری فکر و نظر پر غلامی کی مہر ثبت ہے ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ

ہے خانہ دل اب تک ارژنگ غلامی کا
ہر نقش میں پیدا ہے اک رنگ غلامی کا
دن رات بجا لائے جو مرونگ غلامی کا
کہتے ہیں یہاں انجم فنکار فقط اس کو

انجم رومانی کا سیاسی شعور ایک آزاد شہری کی زندگی میں بے حسی اور عمل سے بیگانگی دیکھ کر انہیں رنجیدہ کرنے لگا، ان کے ہمعصر ضمیر کاظمی اور سجاد باقر رضوی ان کی طرح معاشرتی حالات میں خود غرضی، منفعت کوشی اور ہوس مال و زر کے عملی مظاہر دیکھ کر کڑھنے لگے اس لئے ان کی غزل میں ایسے اشارے ملنے لگے جو ان کی ذہنی اذیت کا برملا اظہار کہلائے۔ انہوں نے حالات کی بہتری اور زوال پذیری کا منظر و نامہ دیکھ کر روایتی غزل سے دامن چھڑایا اور حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزل میں نئے موضوعات شامل کئے۔

رستہ دکھائی دے نہ مسافر دکھائی دے
ہم ہیں کہ اک غبار تنہا سفر میں ہے

پیر مغاں کو برسر منبر ہی لے چلیں
مسجد کے زیر سایہ خرابات کب تک

زباں بندی ہے اور اہل سخن کی آزمائش ہے
ہنر کی آزمائش ہے، نہ فن کی آزمائش ہے

انجم رومانی کی طویل زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے۔ 1920 سے 2001 کا زمانہ اور اس میں کیا کچھ نہیں دیکھا۔ وہ حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سیکرٹری بھی رہے۔ پنجاب کی سرزمین ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ محققین اور ناقدین کی نگاہ کا مرکز و محور رہی۔ وہ وہاں میں رہ کر کبھی خوش اور کبھی ناخوش رہے۔ بہر حال ان کا تخلیقی سرمایہ بظاہر مختصر ہے لیکن وہ غزل جیسی صنف سخن میں مضامین زندگی کے انبار لگا کر رخصت ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ زمانہ بے تیار ہے اور اہل زمان لاپرواہیں مگر ان کی خاکساری اور خود نگاری کا سلسلہ دراز رہا، وہ لکھتے رہے اور علاج غم زندگی کرتے رہے۔

جہاں میں 17 پینا محال ہے انجم ۔۔۔ کہ خاک ہوتے ہوئے بھی تو خاکسار نہیں

میں سمجھا تھا کہ گھل جاؤں گا رود زمانہ میں ۔۔۔ مگر بعد میں ایک مدت کے کنارے پر جا نکلا

آسودگی نصیب ہوئی یا نہ ہو سکی ۔۔۔ تیری دوا نہ اے دل دیوانہ ہو سکی

ہر بڑا شاعر تسخیر کائنات کی بات کرتا ہے جب کہ وہ خود اپنی ذات کا عرفان پانے میں کمال جہد مسلسل کے باوصف ابھی اپنی ذات میں گم ہے۔ شاعری کھلی آنکھ خواب دیکھتی ہے مگر تعبیر سے محروم خواب اس کا مقدر قرار پایا ہے۔ یہی حال انجم رومانی کا نظر آیا۔ وہ ایک طرف ریاضی کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں جہاں ہر مسئلہ کو حل کئے جانے کا قوی امکان موجود ہے۔ دوسری طرف شاعری میں خیال و خواب دیکھنے سے فرصت نہیں اور امکانات کے پیش نظر صدقے تجربے کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں تغزل یا رچاؤ سے جو ہر کر فکری بصیرت اور تصور کی عورت نمایاں ہے وہ ''کوئے ملامت'' میں ایک فقیر بے نوا بن کر صدا کرتے ہیں۔

زندگی سر بسر آوارگی ہوش و حواس ۔۔۔ کچھ نہ کہئے تو اسے خواب پریشاں کہئے

کیا کیا نہ ہست و بود سے پردے اٹھا گئے ۔۔۔ پر مطمئن نگاہ تماشا نہ ہو سکی

اسی کی گود میں ہر انقلاب پلتا ہے ۔۔۔ فشار جور زمانہ کو ناتواں نہ سمجھ

انجم! کہو تمہارا ہے اس میں خیال کیا ۔۔۔ کہتے ہیں ''کائنات'' عجیب اتفاق ہے

پہنچا نہ کوئی راہنما دشت شوق تک ۔۔۔ تھی شہر تک ہی راہگزاروں کی روشنی

اے ساکنان منزل شب جاگتے رہو! ۔۔۔ ماحول سازگار نہیں خواب کے لئے

◆◆◆

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور حکومتی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی گئی کہ عالمی شہرت یافتہ، ماہرِ تعلیم، محقق، نقاد اور ماہرِ اقبالیات، ڈاکٹر ندیم شفیق ملک 24 دسمبر 2020ء بروز جمعرات ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ انھیں 25 دسمبر 2020ء بروز جمعۃ المبارک، ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ پہلے اُن سے فون پر بات ہوئی، وہ کہنے لگے "میں 1965ء میں پیدا ہوا اور آپ 1955ء میں، قدرت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہماری تاریخِ پیدائش میں دس سال کا وقفہ رہے گا۔"

میں، اُن کی شخصیت اور کتابوں کے حوالے سے کئی مضامین لکھ چکا ہوں۔ ڈاکٹر ندیم شفیق ملک، پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان کے ڈائریکٹر تھے۔ اُن کے انتقال سے ہم ایک محبِ وطن تخلیق کار سے محروم ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں محبِ وطن لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایسے ہی احباب کی وجہ سے پاکستان میں رونقِ بہاراں ہے۔ ڈاکٹر ندیم شفیق ملک یکم جنوری 1965ء کو پیدا ہوئے۔ 1965ء کی جنگ کا جذبہ اُن کی شخصیت میں اُمڈ آیا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے ہر لمحے کا حساب چکاتے ہوئے کم عمری کے باوجود بہت سا علمی و ادبی کام کر دکھایا۔ وہ ہمہ وقت مصروفِ عمل رہتے۔ کام کرنے کا جنون، اُن کی شخصیت کا طُرۂ امتیاز ثابت ہوا۔

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو اسلام، پاکستان، پاکستانیت، مشاہیر اور اُمتِ مسلمہ کے بارے میں مسلسل لکھتے رہے۔ وہ بین الاقوامی تعلقات، قومی سلامتی اور زبان و ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ تعلیمی ڈگریاں لیتے ہوئے وہ تادمِ مرگ اقبال شناسی اور حالاتِ حاضرہ میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ انھوں نے قائداعظم یونی ورسٹی سے تاریخ میں ایم ایس سی، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پنجاب یونی ورسٹی سے پنجابی میں ایم اے کیا۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے "پاکستانی دنیا میں وادب" میں ایم فل کی ڈگری لے کر پنجابی ادب میں ماہر بنے۔ اقبالیات میں اُن کی دلچسپی فطری تھی اس لیے انھیں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے اقبالیات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لینے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اوپن یونی ورسٹی ہی سے وہ دفاعی حکمتِ عملی میں ایم ایس سی اور نیشنل ڈیفنس یونی ورسٹی سے بین الاقوامی تعلقات میں ایم فل کرنے کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔ انھیں سول سروس میں بھی نمایاں مقام حاصل رہا۔ حیران کن بات ہے کہ وزارتِ خزانہ میں ملازمت کرنے والے ڈاکٹر ندیم شفیق ملک سب دوستوں کے شفیق رہے۔ اُنھوں نے کچھ عرصہ بحیثیت وفاقی سیکرٹری قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن بھی کام کیا۔ اکادمی ادبیات سمیت قومی ورثہ و ثقافت ڈویژن سے متعلقہ اداروں میں اُن کا اثر و رسوخ قابلِ تعریف رہا۔

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک کے علمی و ادبی سرمایہ میں "اقبال اینڈ دی انگلش پریس آف پاکستان۔ دی پالیٹکس آف ایجوکیشن ان پاکستان۔ ریسرچ پیپرز ان پاکستان۔ دی پولیٹیکل سکیپسٹی آف اقبال۔ دی آل انڈیا مسلم لیگ۔ 1906ء آل انڈیا مسلم لیگ اینڈ علامہ

اقبالز الہ آباد ایڈریس۔ 1930ء علامہ اقبال کا خطبہ الہ آباد۔ 1930ء مصادرے باہم و ثقافتی زبان و ادب و معاشرت پر ایک نظر: آ سوشیو لنگوسٹک سٹڈی آف دی لنگوئج آف ماڈرن پاکستان۔ علامہ اقبال اینڈ انگلش نیوز پیپرز آف پاکستان 1958ء ۔1947ء علامہ اقبال کی تابندہ یادیں۔ انڈیا ورسس جاپان۔ آزادی آف دا کمیونٹی یا وزڈ دا پیوپ۔ دی چلڈرنس کارو پٹرس ویلہ دی قائداعظم محمد علی جناح 48ء۔۔۔۔۔ علامہ اقبال کے چند نادر و نایاب خطوط۔ نوادرات علامہ اقبال۔ چند معاصرین اقبال۔ علامہ اقبال کے چند احباب۔ بریڈرین ان لیجنڈ ہوئی آل انڈیا مسلم لیگ اینڈ دی پاکستان موومنٹ (1917-47ء)۔ گولڈن امپریشن اینڈ امیجی نیشن آف علامہ اقبال۔ دی قائداعظم محمد علی جناح۔ آل انڈیا مسلم لیگ اینڈ موومنٹ آف پاکستان (1917ء۔1947ء)۔ علامہ اقبال اینڈ ریورنڈ ان دی پولیس اینڈ کرنٹ آف انٹیلی جنس پنجاب (1984-35ء)۔ پریس پیکٹوز اون علامہ اقبال: اے ورلڈ سروے آف اقبال سٹڈیز۔ ہمارے بہت ہی پیارے قائداعظم بچوں کے قائداعظم محمد علی جناح کے نام خطوط (1939-48ء)۔ علامہ اقبال: پنجاب پولیس کی خفیہ معلومات کے تناظر میں (1984-35ء)۔ اقبال ڈے سیلیبریشن آبرز (1948-2000ء)۔ دی اطلس وار تھ۔ 1960ء گیلٹ اینڈ اطلس۔ دی یو ایس اے کینیڈا اینڈ دی قائداعظم محمد علی جناح (اے کلیکشن آف دی نیوز۔ ریویو اینڈ کومنٹس اپیئرڈ ان دی ماڈرن امریکن پرنٹ میڈیا آن دی ڈیتھ آف قائداعظم محمد علی جناح)۔ ائیر مارشل (ریٹائرڈ) محمد اصغر خان۔ دی تحریک استقلال اینڈ دی پولیٹکس آف اپوزیشن ان پاکستان (77-1971ء)۔ دی اینول رپورٹس آف دی آل انڈیا مسلم لیگ (25-1919ء) اور دی آل انڈیا مسلم لیگ۔۔۔۔ اینڈ ایکل پر پیگنڈا (1919-1906ء) شامل ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کی والدہ سے منسوب کتب خانہ "صفیہ رفیق" ان کی ذاتی لائبریری تھی۔ مختلف موضوعات پر ایک لاکھ سے زیادہ کتب اس لائبریری میں دستیاب ہیں۔ انھیں اسلامی مشاہیر سے دلی لگاؤ تھا۔ خصوصاً قائداعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے فرمودات اور ان کی تابندہ یادوں کو نسل نو تک پہنچانے کے لیے انھوں نے تاریخی کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر محمد منیر شفیق ملک کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ سب کے "محرم" تھے۔ تخلیق کار ایک نہ ایک دن آسودۂ خاک ہو جاتا ہے لیکن اس کا فن اسے ہمیشہ زندہ رکھتا ہے۔

◆◆◆

تعارف

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم۔۔۔۔۔اُردو ادب کی شان

ولدیت: محمد ایوب مغل۔۔۔۔ تاریخ پیدائش: 2 اکتوبر 1955ء۔۔۔۔ ریٹائرمنٹ: یکم اکتوبر 2015ء (گریڈ 20)۔۔۔۔ کتب: ادبی 120، نصابی 27۔۔۔۔ ذمہ داریاں: ۔ صدر بزم علم و فن سرگودھا، صدر نظریہ پاکستان اکادمی سرگودھا، صدر پاکستان ادبی اکادمی سرگودھا، چیئرمین پاکستان لٹریری کونسل، جنرل سیکرٹری سرگودھا رائٹرز اکیڈمی، ڈپٹی چیف وارڈن سول ڈیفنس سرگودھا، اینکر ریڈیو پاکستان سرگودھا۔۔۔۔ فون نمبر: 048-3711717۔۔۔۔ ایڈریس: 319۔ اے، علامہ اقبال کالونی سرگودھا۔۔۔۔ خواب: شہادت۔

(ادارۂ "تخلیق")

شمس الرحمٰن فاروقی اور "شب خون"

سیفی سرونجی (انڈیا)

کسی بھی ادبی رسالے کی اہمیت اور اس کا معیار ایڈیٹر کی قابلیت اور صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ نیاز فتح پوری کا دبدبہ صرف اس لئے تھا کہ نیاز فتح پوری ایک عالم فاضل اور نہایت ہی قابل شخصیت کے مالک تھے۔ آج ادبی دنیا میں جو چند معتبر ادبی رسائل نکل رہے ہیں ان میں "شب خون" کی اہمیت اور معیار اعلیٰ درجہ کا صرف اس لئے تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی جیسے دانشور، نقاد ہیں۔ جس طرح ہر پرچہ میں ایڈیٹر کی بھی کچھ مختلف تحریریں شائع ہوتی ہیں اور ان تحریروں کو پڑھ کر اس کی شخصیت، علمیت اور قابلیت اجاگر ہوتی ہے، اس کے تبصروں سے، اداریوں سے اور دیگر ادبی و تحقیقی مضامین سے، اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی کی قابلیت، شخصیت اور علمیت ان کے ہر مضمون اور ہر تحریر میں نمایاں ہے، چاہے وہ اداریے ہوں یا وہ کسی اور نوعیت کے مضامین ہوں۔ ان کے ایک ایک لفظ سے ان کی ساری علمیت اور قابلیت نمایاں ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں ان کا رعب اور ان کی قابلیت کی دھاک اس طرح بیٹھی ہوئی ہے کہ کسی چھوٹے موٹے شاعر ادیب اور نقاد کا تو ان کے دربار میں گذر تک نہیں ہوتا اور ان کے سامنے کسی کو منہ کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی، اس لئے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی عالمانہ نظر اتنی گہری ہوتی ہے کہ کوئی بھی ادبی موضوع ہو، کوئی واقعہ ہو، یعنی تاریخی، ادبی اور زبان سے متعلق کوئی بھی لسانی خامیاں یا کوئی پہلو ہو، ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا اس لئے کہ وہ کئی زبانوں پر نہ صرف پکڑ رکھتے ہیں بلکہ ان کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ باریک سے باریک اور نازک سے نازک معاملات میں بھی وہ اپنے علمی دلائل سے اس طرح بحث کرتے ہیں جیسے اس موضوع پر انہوں نے برسوں تحقیق کی ہو۔ "شب خون" میں چند کالم ایسے ہوتے ہیں جو دیگر ادبی رسائل میں نظر نہیں آتے، مثلاً سوانحی گوشوں کا انتخاب اور کسی بھی شعری یا ادبی موضوع پر ان کے مدلل جواب جو وہ "شب خون" کے مکتوبات کے کالم میں دیتے ہیں جنہیں پڑھ کر بڑے سے بڑے نقاد و شاعر ادیب نہ صرف حیران رہ جاتے ہیں بلکہ ان کی قابلیت کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اگر کسی شعر پر کسی نے غلطی سے کوئی اعتراض کر دیا تو اس کے جواب میں شمس الرحمٰن فاروقی سو دو سو سال پرانے شاعروں کے درجنوں اشعار اردو کے ہی نہیں فارسی کے بھی سند کے طور پر پیش کر دیتے ہیں اور اعتراض کرنے والے کی قابلیت کا بھانڈا پھوڑ دیتے ہیں اور وہ اپنی خفت مٹانے کے لئے سوائے شرمندگی کے کچھ نہیں کر پاتا۔ "شب خون" کے یہی چند صفحات فاروقی صاحب کی قابلیت اور شخصیت کا سب سے بڑا ثبوت ہوتے ہیں، ورنہ "شب خون" کی عام تحریریں مثلاً غزلیں، نظمیں، افسانے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ قاری جمائی اٹھانے کے بعد بور ہو کر انھیں ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ جہاں ایک طرف شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی تحریروں نے "شب خون" کو اعلیٰ معیار بخشا ہے وہیں دوسری طرف ایسے ایسے خشک مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے چھاپ کر قاری کو بھی الجھن میں مبتلا کر دیا ہے، اس لئے "شب خون" کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ پڑھے لکھے شاعروں، ادیبوں کے لیے ہی وجود میں آیا ہے اور

ویسے بھی بڑے بڑے لوگوں نے ادب کو بھی مخصوص پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ہی قرار دیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایک بار لکھا تھا کہ میر، غالب کچھ نہیں بلکہ عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی شاعر ہے لیکن چند برسوں میں ہی پتہ چل گیا کہ میر، غالب کیا ہیں اور نظیر اکبر آبادی کیا ہیں۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ادب پڑھے لکھے لوگوں کے لئے ہی زیادہ سمجھا گیا ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی اسی نظریے کو پیش کرنے میں کوشاں رہے ہیں ان کے نزدیک ادب سے ذرا بھی دلچسپی رکھنے والے کو پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہے اور ''شب خون'' اس کی تازہ مثال ہے۔ ''شب خون'' کے وہ کالم جن میں فاروقی صاحب کی طبیعت اور ان کے گہرے مطالعہ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، وہ کالم ہیں ''شب خون'' کے خطوط اور ان میں فاروقی صاحب کے ریمارکس جو ان کے رسالہ ''شب خون'' میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے سب سے زیادہ معلوماتی ہوتے ہیں۔ دوسرا کالم سوانحی گوشے جن میں وہ دنیا کی ان عظیم ہستیوں کے کچھ خاص پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن سے اردو حوالے نا آشنا ہیں وہ ''شب خون'' کے وہ اداریے جن میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوتی ہے جسے اگر اردو والے پڑھتے رہیں تو ان کی شاعری ان کی سوچ اور ان کی تحریروں میں یقیناً ایک نمایاں تبدیلی آ جائے مثلاً ''شب خون'' کے شمارہ نمبر 215، 1995ء کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جس کی چند سطریں یہاں پیش کی جا رہی ہیں۔

''(علامت)۔ ''بشری علوم کے میدان میں علامت ایک ایسی اصطلاح ہے جس پر معنی اور معنویت کے بہت سے بوجھ لاد دیے گئے ہیں۔ اگر وسیع ترین مفہوم میں دیکھا جائے تو علامت یعنی Symbol اور نشان یعنی Sign میں کوئی فرق نہیں۔ اس مشکل کے باوجود کہ علامت کی اصطلاح بذات خود ایک مبہم اصطلاح ہے لیکن اس کی جو تعریفیں باریکی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں ان کو تین شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ علامت رسومیاتی قسم کا نشان ہے۔ دوسرے یہ کہ علامت تصویری قسم کا نشان ہے اور تیسری شق یہ کہ علامت معنی خیز اور معنی کی طرف اشارہ کرنے والا نشان ہے۔ آخری دو تعریفوں کی روشنی میں علامت کو جمالیات اور ثقافتی مطالعات کے میدانوں میں کلیدی تصور کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میدانوں میں علامت کا مفہوم کچھ اور معنی کو بھی محیط ہے۔ مثلاً لفظی نشان کے طور پر علامت یا علامتی نشان کے طور پر علامت (مثلاً 0 علامت ہے عدم کی) یا ٹریڈ مارک کے طور پر علامت (لوگو Logo) ہے۔ جھنڈے (Banner) اور مہر (Signet) کے طور پر علامت اور پھر آریہ (Emblem) کے طور پر علامت۔ یعنی علامت اس تصویر کو بھی کہیں گے جس سے کوئی مخصوص معنی مستفاد ہو سکتے ہیں۔ (مثال کے طور پر اگر کسی تصویر میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہاتھ میں ہنسیا لئے ہوئے دکھایا گیا ہے تو یہ علامت ہے موت یا موت کے فرشتے کی) علامت کی ایک اور شق تمثیل (Allegory) بھی ہے۔''

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فاروقی صاحب اپنے ''شب خون'' کے لئے کیسا قاری چاہتے ہیں۔ اس میں چھپنے والے شاعروں اور ادیبوں کی بات تو دوسری ہے ''شب خون'' کے قاری کو کتنا ذہین ہونا چاہیے یہ بات فاروقی صاحب کے اداریوں میں، ان کے مضامین اور مکتوبات کے جوابات میں محسوس کی جا سکتی ہے کہ ''شب خون'' کے قاری کو علامت، استعارات اور دنیا کے دیگر علوم و فنون کی پوری معلومات ہونا چاہیے۔ وہی ادب کی بات کریں، وہی مضامین اور دیگر علمیات، لسانیات یا دیگر موضوعات پر

گفتگو کریں ورنہ شاعری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر بلا وجہ لادنے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں۔ ان کے اسی نظریے کو دیکھتے ہوئے بیشتر کم پڑھے لکھے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ مخالفت پر اتر آتے ہیں لیکن ان سے مقابلہ کرنے کے لئے جس قابلیت کی ضرورت پڑتی ہے وہ کسی میں نظر نہیں آتی تو گھٹیا ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں حالانکہ ان تمام باتوں سے شمس الرحمٰن فاروقی کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ویسے بھی وہ ہر کس و ناکس کا نوٹس نہیں لیتے نہ کسی کو جواب دیتے۔ یہی ان کی علمیت اور قابلیت کی نمایاں پہچان ہے۔ ویسے حسب ضرورت "شب خون" میں اس طرح کے خطوط کے جواب میں وہ ایک دو سطروں میں ہی اتنا کچھ کہہ دیتے ہیں کہ پھر کسی کو یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ کچھ لکھ سکے وہ سامنے والے کو اپنے علمی دلائل سے اس طرح مطمئن کرتے ہیں کہ اسے ان کی بات تسلیم کرنا پڑتی ہے چاہے وہ مسئلہ زبان کا ہو یا کسی پرانے سے پرانے شاعر کے شعر کا ہو یا کسی افسانے یا مضمون کا ہو۔ "شب خون" کے شمارہ نمبر 217 میں گیان چند جین کا ایک خط شائع ہوا ہے۔

فروری 1998ء کے "شب خون" میں آپ نے مجھ صفر الشعرا کی غزل کو سب سے پہلے جگہ دے کر مجھے نوازا بھی اور محجوب بھی کیا۔ میں اس مقام کے لائق نہیں۔ غزل میں کتابت کے چند سہو راہ پا گئے ہیں۔ ساتویں شعر میں "مطلوب" دراصل "مطلوع" اور آخری شعر میں "زمن" کی جگہ "چمن" ہونا چاہیے۔ آپ نے عنوان دیا ہے "جنت سے جنت تک"، "قیامت سے قیامت تک" کی یاد آ گئی۔

میرے لئے نہ ہندوستان جنت ہے نہ امریکہ۔ میں نے اس غزل کا ایک مصرع اصلاً یوں کہا تھا:

ہوئی ہے جنتِ ارضی بھی میرے واسطے دوزخ

لیکن نے مستقر کو دوزخ کہنا ناشکرا پن معلوم ہوا۔ اسے بدل کر "بے رس" کر دیا۔ میں نے اس قماش کی ایک اور غزل میں یہ دو شعر کہے ہیں:

یہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہیں، سمجھتا تھا دلِ سادہ ۔۔۔ یہاں آ کر طبیعت رہتی ہے افتادہ افتادہ
دکھائے سیمیا گر کی طرح کیوں سبز باغ اتنے ۔۔۔ تری دنیا فقط اک خواب ہی نکلا ترا وعدہ

بدیں وجوہ یہ عنوان میرے عندیے کا عکاس نہیں۔

آپ نے اپنے تجزیے کے آخر میں لکھا ہے:

"معائب سخن کی وہی اہمیت ہے جو مقدمہ شعر و شاعری اور ہماری شاعری کی یعنی ان کتابوں سے اختلاف ممکن، بلکہ ضروری ہے۔ لیکن ...... الخ ...... (ص 33) آپ کی سیر چشمی سے شہ پا کر میں بھی آپ کے عالمانہ مضمون سے کہیں کہیں اختلاف رکھتا ہوں لیکن ایسے مقامات کم ہیں۔"

گیان چند جین

یہ خط امریکہ میں مقیم مشہور نقاد گیان چند جین کا ہے جن کا مقام و مرتبہ بھی سب کو معلوم ہے۔ اس خط میں گیان چند جین نے ایک چھوٹے سے عنوان سے متعلق صرف اتنا لکھا تھا کہ آپ نے جنت سے جنت تک کا عنوان کیوں لگایا جب کہ یہ عنوان میرا لکھا ہوا نہیں ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے گیان چند جین صاحب کو بہت خوبصورت طریقے سے اس عنوان کی اہمیت کو سمجھا دیا اور ساتھ میں نوٹ بھی لگا دیا وہ لکھتے ہیں:

''عنوان ہمارا لگایا ہوا تھا۔ آپ نے ہم نے ایک طرح سے شاعر کی طرف سے طنزیہ اشارہ دیا تھا۔ ہندوستان کو جنت نشان کہتے ہی تھے اور امریکہ خاص کر کیلیفورنیا کو دنیا میں جنت کہا جاتا ہے۔''

اس طرح کے سینکڑوں مسائل علمی، ادبی، لسانی اور دیگر علوم و فنون سے متعلق فاروقی صاحب کے جوابات ایسے ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑے عالم فاضل کو بھی ان کی بات تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ اس وقت اردو دنیا میں ایسے کتنے ایڈیٹر ہیں جو فاروقی صاحب جیسی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اب ظاہر ہے جس رسالہ کے ایڈیٹر شمس الرحمٰن فاروقی ہوں گے اس کا معیار کیسا ہوگا اور کیسا ہونا چاہیے۔ آج ہندوستان میں درجنوں اردو رسائل نکلتے ہیں اور ان رسائل میں چھپنے والے مضامین، اداریے، تبصرے پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اردو رسائل کی ان دنوں ایک ایسی ہوڑ جاری ہے کہ ہر ایڈیٹر جلد سے جلد شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں کئی ایڈیٹروں کی صلاحیتوں کا بھانڈا بھی پھوٹ جاتا ہے۔ اس لئے کہ صرف رسالہ نکالنے سے ہی بڑا شاعر ادیب نہیں ہو جاتا لیکن آج کل ہر ایڈیٹر کے پاس تبصرے کے لئے درجنوں کتابیں آتی ہیں اور وہ ان پر چھوٹے موٹے مضامین اور تبصرے لکھ کر نقادوں کی فہرست میں شامل ہونا چاہتا ہے اور وہ چار سال ادھر ادھر سے قرض لے کر یا اپنی ذاتی پونجی لگا کر ایڈیٹروں کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے لیکن ایک اچھے رسالہ کے لئے ایڈیٹر کو اتنی معلومات ہونا چاہیے کہ وہ کسی کے ادبی مقام و مرتبہ کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ عالمی ادب پر بھی اس کی گہری نظر ہو تا کہ وہ یہ دیکھ سکے کہ اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب میں کیا کچھ لکھا جا رہا ہے اور کیسا لکھا جا رہا اور پھر اس میں تجزیہ کرنے کی یہ صلاحیت ہونا چاہیے کہ کیا اچھا ہے، کیا برا ہے اور یہ ساری صلاحیتیں مل کر شمس الرحمٰن فاروقی میں یکجا ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رسالہ ''شب خون'' میں عالمی ادب سے متعلق مضامین اور دیگر تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں اور فاروقی صاحب کے اداریے ان کے مضامین اور مخصوص شخصیات پر گوشوں کی اشاعت اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ کبھی وہ کسی اداریے میں لکھتے ہیں کہ انگریزی ادب میں جس طرح تبصرے کتابوں پر آتے ہیں اگر اس طرح کے تبصرے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر آنے لگیں تو لوگ تبصروں کے لئے کتابیں بھیجنا ہی بند کر دیں، اس لئے کہ ان میں سچ کو برداشت کرنے کی ہمت ہی نہیں ہے۔ ہر مصنف، شاعر، ادیب اپنی کتاب پر صرف اپنی تعریف پڑھ کر خوش ہوتا ہے، حالانکہ یہ خوشی کتنی عارضی ہوتی ہے اس بات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فاروقی صاحب سوانحی گوشوں کے کالم میں سینکڑوں برس پرانے انگریزی، عربی، فارسی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں کے بڑے بڑے ادیبوں شاعروں کی مختلف اور بڑی معنویت لئے ہوئے پوشیدہ گوشوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ''شب خون'' کے شمارہ نمبر 217 میں جیمس جوائس اور سیموئل بکٹ کا ایک مختصر واقعہ شائع ہوا ہے، ملاحظہ ہو۔

''جیمس جوائس جن دنوں پیرس میں مقیم تھا اور اپنے ناول Fennegans wake پر کام کر رہا تھا۔ سیموئل بکٹ وہاں پہلے سے موجود تھا اور بکٹ کا اس سے رابطہ کسی عقیدت مند شاگرد اور حاضر باش کی طرح کا تھا۔ جوائس کی آنکھیں اس وقت بہت خراب ہو چکی تھیں اور وہ اپنا ناول روزانہ بکٹ کو املا کراتا تھا۔ ایک دن املا کے دوران کسی نے دروازے پر دستک دی۔ بکٹ اپنے انہماک کے باعث دستک کو نہ سن سکا تھا لیکن جواب میں جب جوائس نے اسی عام املائی لہجے میں کہا ''آ جاؤ'' (Come in) تو بکٹ نے گمان کیا کہ یہ بھی املا کا حصہ ہے اور اس نے وہ فقرہ یعنی Come

in بھی ویسے ہی لکھ دیا۔ بعد میں جب جوائس نے املا کئے ہوئے اوراق بکٹ کی زبانی سنے اور بکٹ نے Come in پڑھا تو جوائس نے چونک کر پوچھا ''یہ کیا ہے''؟ بکٹ نے جواب دیا کہ آپ ہی نے لکھوایا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ فقرہ Come in جوائس نے کس وقت بولا تھا۔ جوائس کچھ دیر تک چپ چاپ غور کرتا رہا، پھر بولا ''ٹھیک ہے اسے رہنے دو۔''

کہنے کو تو یہ واقعہ ایک معمولی واقعہ ہے کہ املا بولتے وقت ایک لفظ (Come in) تھا جو بے خودی میں لکھنے والا لکھ گیا لیکن اس واقعہ کی تہہ میں کتنی معنویت اور کتنی گہرائی چھپی ہوئی ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بادشاہ کو ایک اچھے منشی کی ضرورت پیش آئی تو اس نے اپنی پڑوسی ریاست سے ایک منشی کو بلوانے کے لئے اس کی تحریر نمونے کے طور پر منگوائی۔ اتفاق سے جس منشی کو بلوایا گیا تھا وہ اتنا تنگ دست تھا کہ اپنے نمونے کی تحریر میں بھی ایک لفظ ایسا لکھ گیا کہ گھر میں آٹا نہیں ہے۔ نمونے کی تحریر لکھتے وقت اس کے گھر میں فاقہ تھا اور بچے اس سے یہی کہہ رہے تھے کہ گھر میں آٹا نہیں ہے۔ وہی تحریر اس نے نمونے کے طور پر اس بادشاہ کو بھیج دی۔

یہ تحریر پڑھ کر اس بادشاہ نے لکھا کہ جب تمہارا منشی ہی خوش حال نہیں ہے تو تمہاری رعایا پر کیا گزر رہی ہوگی۔ بعد میں کیا ہوا اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا، کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح ایک لفظ آٹا نہیں ہے اور جس طرح جیمس کا بولا ہوا لفظ Come in آگے چل کر ایک تاریخ بن گیا اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے ادارئیے، ان کے پیش کئے ہوئے سوانحی گوشے اور مطبوعہ کے کالم میں دیئے گئے مختصر نوٹ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی فاروقی صاحب نے غلط لکھ دیا تو وہ مستند تسلیم کر لیا جاتا ہے جس طرح جیمس کے ناول میں لفظ Come in غلطی سے لکھ دیا گیا تھا لیکن وہی مستند بن گیا اس لئے کہ یہی تو اہلِ زبان ہوتے ہیں جن کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے بلاشبہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ برسوں پہلے شاید میر تقی میر نے ان کے لئے ہی یہ شعر کہا تھا:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا   مستند ہے میرا فرمایا ہوا

لیکن آج شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے بیچ نہیں رہے۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ ان کے جانے سے اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اور جو نقصان ہوا ہے اس کی بھرپائی ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہمیں ذاتی صدمہ بھی پہنچا ہے، چونکہ 'انتساب عالمی' کو ہمیشہ سے ہی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

معروف مزاح نگار ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی کتاب

کھیلن کو مانگے چاند

شائع ہو گئی ہے —— قیمت -/2,500 (ملنے کا پتہ: مگھیانہ ہاؤس، ماڈل ٹاؤن۔2، فیصل آباد —— 0322-4381192)

تتلیاں اُڑتی ہیں اور ان کے پکڑنے والے

ناصر علی سیّد

ان دنوں روزمرہ کی گفتگو میں جو الفاظ کل تک بہت زیادہ استعمال ہوتے تھے اب ان الفاظ کے متبادل کچھ نئے الفاظ غیر محسوس طریقے سے ہماری بول چال کا حصہ بن گئے ہیں، ظاہر ہے اب ہم بیک وقت کئی زبانوں کی زد میں ہیں، اگرچہ یہ سلسلہ پہلے بھی ہوتا تھا کہ گھر میں، سکول میں اور بازار میں ہمیں مختلف زبانوں سے واسطہ پڑتا تھا، لیکن وہ زبانیں بہت دور دراز سے نہیں آئی تھیں، وہ ہمارے ہی ماحول میں سانس لیتی تھیں، پشاور، ہفت زبان شہر کہلاتا تھا مگر یہ سب زبانیں اسی ماحول کی پروردہ تھیں سب زبانیں اپنی ہی تھیں پشاوری یہ ساری زبانیں بولتے اور سمجھتے تھے، پھر یہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ ہوا کہ ان زبانوں کے الفاظ بھی غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کی زبان میں شامل ہو گئے، یہ انگریزی کی عملداری سے پہلے کا پشاور تھا، جب تجارتی قافلے شہر میں گرد و پیش سے آتے، قیام کرتے اور اپنی شاموں میں قصہ خوانوں سے داستانیں سن کر بتاتے تھے، پھر پشاور میں عالمی زبانوں نے یلغار کی۔ پہلے پہلے انگریزی آئی تھی اور پھر تعلیمی اداروں کی حد تک ہی سہی فرانسیسی، جاپانی اور جرمن زبانوں کے شعبے بھی سرکاری اور نجی درسگاہوں میں کھل گئے، ایسا دنیا بھر میں ہوتا ہے مگر یہاں اپنی ماں بولی کی قیمت پر انگریزی کا چلن عام ہوا اور روزمرہ کی بول چال میں تیزی سے انگریزی کا عمل دخل بڑھ گیا، اور اب تو اس کی جڑیں بہت دور تک پھیل گئی ہیں، راز الہ آبادی نے کہا ہے کہ :

آشیاں جل گیا گلستاں لٹ گیا ہم قفس سے نکل کر کہاں جائیں گے
اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

یہاں تک بھی بات رہتی تو گوارا تھا اب ایک نیا ماحول بن رہا ہے کل تک جن بچوں کو انگریزی کے قریب لانے کی شعوری کوشش ہم نے کی تھی اب پڑوسی ملک کے بڑوں نے بچوں کے لئے ٹی وی چینلز اور کمپیوٹر کے یوٹیوب کی طرح کے سائٹس پر انگریزی کی کارٹون کہانیوں کو ہندی میں ڈب کر کے نشر کرنا شروع کر دیا ہے، دیکھا دیکھی کہ اب بچے بڑی سہولت کے ساتھ شستہ ہندی زبان میں گفتگو کرنے لگے ہیں، ''میں نے رات سمندر پہاڑ دیکھا'' یا ''میرے اندر اب شکتی آ گئی ہے'' قسم کی بات چیت ہر گھر میں سنائی دینے لگی ہے، بچوں کے ساتھ یہ ہوا اور بڑے انگریزی کے جن الفاظ کے عادی ہو چکے تھے اب ان الفاظ کے ساتھ بھی کھلواڑ شروع ہو گیا، کل تک کا شیڈول اب سکیجول ہو گیا ہے، ایڈیو اب ایڈیوز ہو گیا ہے اور کل تک جس ہاؤ آر یو کا جواب ''آئی ایم فائن'' تھا اب ''آئی ایم گڈ'' ہو گیا ہے، مجھے یاد ہے کہ میرے ایک ٹی وی سیریل میں باہر سے آیا ہوا ایک اسحاق کردار ایسے سوال کے جواب میں جب آئی ایم گڈ کہتا ہے تو میرے پروڈیوسر نے کہا یہ کیا ہے، میں نے کہا اب یوں کہا جاتا ہے اور یہ کردار چونکہ امریکہ سے آیا ہے تو اب وہاں احوال پرسی کا جواب اسی طرح دیا جاتا ہے تو پروڈیوسر نے کہا یار کوئی مسئلہ نہ بن جائے، یہ اس گیارہ برس پرانی بات ہے جب تک یہ امریکن انداز عام نہیں تھا، ہم چونکہ برطانوی راج کے ہوا ہی کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اس لئے امریکیوں کے انگریزی کے ساتھ کئے گئے سلوک سے عادی ہونے میں وقت لگا کل کی

بات ہے کہ مجھے معروف افسانہ و انشائیہ نگار مشتاق احمد کا فون آیا، پشاور کے باسی مشتاق احمد گزشتہ پچاس برسوں سے فینکس امریکہ میں ہیں، وہ بھی انگریزی کے ساتھ ہونے والے اس برتاؤ سے زیادہ خوش نہیں ہیں ساٹھ سال وہاں رہے اور چیف انجینئر کے طور پر خدمات انجام دیے اور امریکن انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنانے کے باوجود وہ پاکستان کی سیکھی ہوئی اور انگلینڈ میں بولی ہوئی انگریزی ہی کو عزیز رکھتے ہیں مشتاق احمد کہہ رہے تھے کہ اردو نثر لکھتے ہوئے جب انگریزی کا کوئی لفظ استعمال کیے بغیر چارہ نہ ہو تو اسے کس طرح لکھا جائے، یعنی انگریزی ہجوں کے ساتھ یا پھر اردو کے ہجوں کی مدد سے لکھا جائے، میں نے انہیں کہا کہ میں تو ہمیشہ اردو کے ہجوں کے ساتھ لکھتا ہوں کیونکہ اس طرح وہ پڑھنے والے بھی آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، جنہیں انگریزی پڑھنے میں دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ ویسے تو آج کل انگریزی لکھنا ایک فیشن اور بڑی حد تک سٹیٹس سمبل بن چکا ہے، اور یار لوگ بھلے سے خود انگریزی نہ سمجھیں نہ سمجھیں شادی کارڈ سے لے کر وزیٹنگ کارڈ تک انگریزی میں ہی لکھواتے اور بناتے ہیں، اور دستخط تو خیر ہوتا ہی انگریزی میں ہے۔ ہر چند میرے پاسپورٹ، شناختی کارڈ پر اور سرکاری کاغذات پر دستخط انگریزی کے ہیں جو نہ جانے کب سے چلے آ رہے ہیں، لیکن اس کے علاوہ میں دستخط اردو ہی میں کرتا ہوں، مجھے یاد ہے کہ کالج میں جب کوئی سرکاری اطلاع اطلاع کے لئے پروفیسر صاحبان کے پاس آتا تو میں ہمیشہ اردو میں دستخط کرتا رہا ہوں، میں مشتاق احمد سے کہا کہ اردو نثر میں بھی بہت سے دوست انگریزی کا لفظ انگریزی حروف تہجی میں لکھتے ہیں اس لئے دونوں طریقے درست ہیں، وہ کہنے لگے اصل میں میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کمپیوٹر پر "ورڈ" میں افسانہ یا انشائیہ لکھتا ہوں تو جب انگریزی لفظ انگلش حروف میں لکھوں تو اردو کے لفظ دائیں بائیں ہو جاتے ہیں، میں نے کہا کہ یہ مسئلہ یونی کوڈ کے ساتھ ہے، جب آپ فون پر بھی کسی کے فون نمبر کے ساتھ اس کا نام اردو فونٹ میں لکھیں تو سارے ہندسے الٹ پلٹ جاتے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ انگریزی لفظ اردو ہجوں کے ساتھ لکھے جائیں میں خود ان پیج میں لکھتا ہوں حالانکہ "ان پیج" میں انگریزی کی سہولت موجود ہے کہنے لگے انگریزی کا یہ رونا میں نے ایک انشائیہ میں چھیڑا ہے، میں نے کہا جی مجھے یاد ہے، جس میں آپ نے اپنے سکول ٹیچر ماسٹر بشیر بلوچ کا بھی ذکر کیا ہے۔ کہنے لگے بالکل وہی اور پھر وہ چپ ہو گئے میں نے کہا خیریت کہنے لگے ایک منٹ پلیز میں بات کرتا ہوں، میں چپ ہو گیا تو کہنے لگے باہر کیا فروخت ہو رہا ہے، میں نے پوچھا کہاں، کہنے لگے ابھی مجھے گلی سے کسی کی آواز آئی، میں نے کہا سبزی والا ہے روز اس وقت آتا ہے، بس اس کے بعد انگریزی کا بستر لپیٹ دیا گیا اور وہ پچاس ساٹھ برس پہلے پشاور کی گلیوں میں پھیرا لگانے والوں کی آوازوں میں بہہ گئے اور مجھے بھی سنانے لگے "کھوتے والی اے، لال گلاب اے، چھلیاں چھلائیاں چڑیاں نے لوآ نے دی دو" اور بہت سی ایسی آوازیں ان کے حافظے میں موجود تھیں، یوسف خان (دلیپ کمار) کی وجہ سے محلہ خداداد کے مشہور زمانہ سکول میں یہ بھی پڑھتے ہیں اس لئے اس کے آس پاس گلیوں کا ذکر بھی چل پڑا، اب وہ ذہنی اور قلبی طور پر فینکس کی بجائے پشاور میں تھے میں نے سوچا کہ انہیں پشاور نہیں بھولتا تو یہاں کی پڑھی اور سیکھی ہوئی انگریزی بھلا کیسے بھول پائیں گے، میں چپ تھا اور وہ تھے کہ اپنے محبوب شہر کی ایک ایک گلی اور ایک ایک بازار کو آوازیں دے رہے تھے، مجھے مصطفیٰ زیدی کا وہ شعر یاد آ گیا جو میں نے یوسف خان (دلیپ کمار) شو کی کمپیئرنگ کرتے ہوئے ان کو ڈائس پر آنے کی دعوت دیتے ہوئے پڑھا تھا:

گلیاں اداس ہیں اور ان کے بچھڑنے والے
سنگ ناکام میں اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں

◆◆◆

کرشن چندر اور "کچرا بابا"

(پہلا حصہ)

خالد عبداللہ

اسلام آباد کے ایک اخبار کے سنڈے میگزین ایڈیشن میں کرشن چندر کا افسانہ "کچرا بابا" شائع ہوا تھا۔ کرشن چندر نے بے شمار افسانے لکھے ہیں۔ جن کی تعداد اور حجم سے غالباً کوئی بھی واقف نہیں ہے۔ ان تمام افسانوں کا معیار بھی یکساں نہیں ہے۔ ستر کے قریب افسانے معیاری تصور کیے جاتے ہیں۔ جن میں ان کے شاہکار افسانے بھی شامل ہیں۔ جن میں کرشن چندر کے اندر کا انسان بولتا ہے۔ وہ انسانی برائیوں کو مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ لیکن کسی جگہ احتجاج نہیں کرتا۔ نہ ہی برائی کرنے والے کو برا کہتا ہے بلکہ وہ برائی کو اپنے سوشل سسٹم کا لازمی حصہ تصور کرتا ہے۔ یہ افسانے پہلے پہل ماہنامہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوئے۔ اور کرشن چندر نے "ادبی دنیا" کی وساطت سے شہرت اور کامیابی حاصل کی۔ ان کے تقریباً تمام افسانوں کا مرکزی خیال غربت اور غربت سے پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل ہیں۔ ان میں انفرادی الجھنوں کا بھی ذکر ہے۔ اسی وجہ سے ان پر مارکس پرچار کا شبہ بھی ہوا لیکن بعض افسانوں میں نفسیاتی عوارض سے پیدا ہونے والے قصے بھی بیان ہوتے ہیں جن کی تہہ میں ایک خاص نظریہ کام کرتا ہے۔

کرشن چندر برہمن تھے اور برہمنوں کی اولاد تھے۔ انہوں نے سارے وید، پران اور متعدد اپنشد پڑھ رکھے تھے، اس طرح انہیں ہندو مت اور ہندو سماج کے کئی ہولناک قصوں اور قضیوں کی روداد بھی زبانی یاد تھی۔ بریں وجہ انہیں ہر طرح کی تاویلات کو بیان کرنے کا ملکہ حاصل تھا اور ہر طرح کی کہانی کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر بھی عبور رکھتے تھے۔

پڑھنے والے ان کی تاویلوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہوں نے "وقار ملک" بن کر ایک مسلمان عورت "سلمیٰ صدیقی" سے شادی کر رکھی تھی۔ ان کی رہائش اچھی تھی لیکن تھوکتے بہت تھے اور اپنے گھر میں ہر جگہ تھوکتے رہتے تھے۔ ان کی بیوی نفرت نہیں کرتی تھی۔ صرف صفائی کرتی تھی۔ تاہم ان کی آمدنی کے ذرائع بہت وسیع تھے جن کی وجہ سے وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ کھاتے بہت تھے اور لکھتے بھی بہت تھے۔ وہ ایک ہی نشست میں ایک اعلیٰ معیاری افسانہ لکھ دیتے تھے۔ ممتاز شیریں نے کرشن چندر کے اندر فوری اظہار کا یہ رویہ دیکھا "تو اسے صحافیانہ قرار دیا"۔ بعض دوسرے احباب کا بھی یہی خیال ہے کہ "کرشن چندر کے بیانات کی زبان ادبی نہیں ہے۔"

کرشن چندر نے پسے ہوئے طبقوں اور مظلوم لوگوں کی حمایت کو اپنا شعار بنایا اور سماجی اور انقلابی حقیقت نگاری کی حیثیت سے افسانے لکھے۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ نیچ ذاتوں کے لوگ ہمیشہ نیچ حرکتیں کرتے ہیں اور معاشرے کی تذلیل کا سبب بنتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار ان کے بعض افسانوں میں ملتا ہے لیکن یہ چیزیں اب نچلے لوگوں تک محدود نہیں ہیں۔ یہ سلسلہ اب بہت وسیع ہو چکا ہے جس کے مظاہر

آپ روزمرہ زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں لیکن "کچرا بابا" کی بساط کچھ اور ہے۔

"کچرا بابا" کا مرکزی کردار ایک شادی شدہ بیمار شخص ہے جس کے گردوں کے تین آپریشن ہو چکے ہیں اور وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔ اس شخص کی امیدیں ختم کرنے اور اسے کچرا بابا بنانے میں اگرچہ ڈاکٹروں کا بھی حصہ ہے، لیکن نمایاں کردار اس فرم کے باس کا ہے جہاں اس کی بیوی /200 روپے ماہوار پر کام شروع کرتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک گرہستن ہے اور وہ اپنے پتی کی زندگی بچانے کا عزم رکھتی ہے لیکن فرم کا باس چند روز میں اپنے پتی کی سیوا کرنے والی اس عورت کا ذہن بدل دیتا ہے اور اسے روشن خیالی سے معمور زندگی کی تصویر دکھاتا ہے۔ وہ ایک نوجوان عورت ہے۔ جس نے شادی کے بعد ابھی تک دکھ درد اور رنج و الم کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اس کے جذبے بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی کی لہروں میں بہہ جاتی ہے اور فوراً ہی اپنے خاوند کو بھول کر نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے اور فرم کے باس کے ہمراہ دار جلنگ چلی جاتی ہے۔ کرشن چندر ایسا کرنے میں "دلاری" کی حمایت کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"آخر کوئی کب تک صبر کر سکتا ہے۔ زندگی مختصر ہے اور زندگی کی بہاریں اس سے بھی مختصر ہوتی ہیں۔ جب جذبے بلاتے ہیں اور آنکھوں پر چاند اتر آتے ہیں۔ جب انگلیوں میں شعلوں کا سا لمس محسوس ہوتا ہے۔ جب بوسے ستاروں کی طرح لبوں کی پنکھڑیوں پر گرتے ہیں اور گردن کے صراحی دار خم کسی کی گرم گرم سانس کی مدھم مدھم آنچ کو ترستے ہیں۔ ایسے میں کوئی کب تک فینائل اور پیشاب کی بو سونگھے، تھوک اور پیپ لہو کا رنگ دیکھے اور موت کے دروازے تک جاتی ہوئی اور واپس آتی ہوئی سسکیاں سنے۔ آخر قوت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور بیس برس کی لڑکی کی قوت برداشت بھی کیا؟ جس کی شادی کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے اور جس نے اپنے شوہر کے ساتھ مصیبتوں کے سوا اور کچھ دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ اگر اپنے سپنوں کی ڈور سے بندھی بندھی دارجلنگ چلی جائے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟"

یہ منظر پیش کر کے کرشن چندر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ برائی کسی شخص کی انفرادی سوچ کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ یہ سماج کی اجتماعی بُری روش کا نتیجہ ہوتی ہے اور حالات کی تنگی سے جنم لیتی ہے جس کیلئے کسی کو کوتاہ نہیں دیا جا سکتا۔ ہم بیمار اور لاچار لوگوں کی زندگیاں برباد کرنے میں ڈاکٹروں کا حصہ ضرور ہے لیکن ایک خاتون ورکر کے ساتھ اس فرم کے باس کا کردار زیادہ دکھاتا ہے جو دلاری کو اپنے مشن سے روک دیتا ہے۔ اُسے اپنے خاوند سے الگ کر دیتا ہے اور اپنی عیاشی کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ ایسے عوامل کئی لوگوں کی زندگیاں برباد کرنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن کرشن چندر اس کی ذمہ داری کسی ایک فیکٹر پر نہیں ڈالتا بلکہ وہ پورے معاشرے کو اس کا موجب قرار دیتا ہے۔ وہ کسی کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ نہ وہ کسی کے برے کام کی مذمت کرتا ہے۔ یہ کام وہ قاری کیلئے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اپنے بیان سے صرف طنز کا کام لیتا ہے۔ ایسے مناظر پیش کرنا کرشن چندر کا خاصہ ہے۔ وہ جذباتی رو کو آگے بڑھانے کیلئے ایسے مناظر استعمال کرتا ہے۔ اور نوجوانوں کو ایسی ترغیب دینا اور جنسی آگ سے اُن کے بدن کو گرم رکھنا اس کا خاص شیوہ اور پسندیدہ مشغلہ ہے۔

چنانچہ "کچرا بابا" ایسے ہی کٹھنیوں کا مجموعہ ہے۔ جو بھوک افلاس اور بیماری کے ہاتھوں کچلا جا چکا ہے لیکن اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ دنیا تہذیبی اعتبار سے بڑی ترقی کر چکی ہے اور روشن خیالی کے مدار میں گھوم رہی ہے لیکن کچرا بابا کا وجود ایسی ترقی کے ماتھے پر ایک بدنما داغ ہے جو اپنے پیچھے کئی اور داغوں میں ایک اضافہ ہے۔

اپنا مطلب پورا کرنے کے بعد کرشن چندر نے کچرا بابا کے مفہوم کو ایک بڑی سکرین پر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اس

صاف ستھری اور روشن دنیا کو گندگی کا ڈھیر کہا ہے جہاں تمام لوگ اپنے اپنے مطلب کے ٹکڑے چن چن کر کھانے میں مصروف ہیں اور اس گندگی پر رشک کر رہے ہیں۔ اس نے یہ کہہ کر کہ "اس دنیا سے نیکی ختم ہو سکتی ہے۔ رفاقت ختم ہو سکتی ہے لیکن یہ غلاظت اور گندگی کبھی ختم نہیں ہو سکتی"۔ ہندو معاشرے کی بے حسی اور ستم کاری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کرشن چندر نے ان الفاظ میں اپنی اصل خواہش کا اظہار کر دیا ہے لیکن یہ ایک نا قابل قبول فیصلہ ہے جس کے ذریعے رزق حلال اور انسانی عظمت کی بھی نفی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود "کبڑا بابا" بھارتی معاشرے کی اخلاقی کمزوری کا عکس پیش کرتا ہے۔ جہاں کار خیر کا مکمل طور پر فقدان ہے۔ بے حسی اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ یہ کرشن چندر کی اپنی سوچ ہے لیکن دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ انسان کی نیکی ہی ایسی چیز ہے جو آخر تک رہے گی۔ نیکی اور رفاقت دنیا سے کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ یہ خیر کے اجزا ہیں اور خیر دنیا میں کثیر ہے۔ دراصل "کبڑا بابا" ایک بیمار شخص تھا۔ جو ذہنی طور پر معذور تھا۔ وہ گندگی کے ڈھیر سے جو کچھ کھاتا تھا اسے خود معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کھا رہا ہے اور کہاں سے کھا رہا ہے۔ اس پر کیا گزری یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ وہ نہ تو بات کرتا تھا اور نہ ہی کسی سے آنکھ ملاتا تھا۔ نہ ہی وہ اپنا نام بتا سکتا تھا۔ اسی لئے کرشن چندر نے اس کا نام نہیں لکھا۔ نہ کوئی اسے جانتا تھا۔ صرف کرشن چندر ہی اس کو جانتا تھا یا پھر فرم کے پاس نے "ولاری" کے ہمراہ اسے ہسپتال میں دیکھا تھا اور دل ہی دل میں کہا تھا کہ یہ شخص اسی جگہ پڑا رہے تو بہتر ہے۔ کرشن چندر نے اس پاگل شخص کو گندگی کے ڈھیر سے کچھ کھاتے دیکھ لیا۔ بس پھر اس کے پس منظر میں کام کرنے والے عوامل کا ایک سلسلہ مرتب کر کے کہانی بنا ڈالی۔ اور اسے "کبڑا بابا" کا نام دے کر عوامی تحقیر کا نشان بنا دیا۔ "کبڑا بابا" کرشن چندر کے شاہکار افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ معاشرتی بے حسی پر مبنی عوامل کی روداد ہے جسے ایک بے سہارا اور بے کس و بیمار اور افلاس زدہ شخص پر چسپاں کر دیا ہے۔ آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ افسانے کے فن اور اس کی جدید تر تکنیک سے ہمارا تعلق نہیں ہے۔ ہماری توجہ کبڑا بابا کے مرکزی خیال تک محدود ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ علت و انجام کا سلسلہ انتہائی خوبصورتی اور مہارت سے اختتام کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ فطری روانی کا کرشمہ ہے۔ کسی مقام پر شتر گربگی یا غیر ضروری لوازم کا اہتمام نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے قاری کو یہ کہانی ایک حقیقی واقعہ محسوس ہوتی ہے اور لگاتار پڑھنے میں مزہ آتا ہے جبکہ حقائق ایک نقطے پر جمع ہیں اور اسی نقطے کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں لیکن لطف اپنے کل پر قائم رہتا ہے۔ یہی کرشن چندر کا فن ہے۔ کامیابی کا راز تحریر کی خوبصورتی اور موزوں الفاظ کی ترتیب میں مخفی ہے جو اپنے معنی کے ساتھ تصورات کو اجاگر کرتے ہیں۔ اور قاری کے شوق میں اضافہ کرتے ہیں لیکن ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔

◆◆◆

معروف شاعر آفتاب خان کا دوسرا شعری مجموعہ

اجاغ میں پڑی ہے راکھ

شائع ہو چکا ہے

ملنے کا پتہ: دستاویزہ آفس نمبر 6، بلاک نمبر 7، ڈیکشنری ظفر، میاں چیمبرز، 3۔ ٹیمپل روڈ، لاہور (فون نمبر 042-36280034)

پہیلی، اردو ادب کی بھولی بسری صنفِ سخن

جاوید عباس جاوید

آج سے برسوں پہلے جب جدید سائنسی ایجادات نے زندگی کو پیچیدہ، دشوار اور کٹھور نہیں بنایا تھا۔ جب گھروں کے اردگرد ٹریفک کا بے ہنگم شور نہیں ہوتا تھا۔ جب موبائل، ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر جیسی چیزوں نے انسان کی زندگی اجیرن نہیں کی تھی۔ جب لوگوں کے دماغ پُرسکون، عادات سادہ اور رویے پُرخلوص ہوتی تھی۔ ان دنوں لوگ دن بھر کی تھکن کے بعد رات پڑتے ہی آنگن میں پانی چھڑک کر اور کولرز، اے سی اور برقی پنکھوں سے بے نیاز چارپائیوں پر سوتے تھے۔ اوپر تاریک آسمان میں جگمگاتے روشن اور بے ترتیب ستارے سب کی توجہ کا مرکز ہوتے تھے۔ ایسے میں نیند آنے سے پہلے گھر کے بزرگ یا تو سب کو بادشاہوں اور طلسماتی کرداروں والی لمبی کہانیاں سناتے تھے یا پھر گھر کے سب لوگ ایک دوسرے کی ذہانت اور معلومات جانچنے کے لئے پہیلیاں پوچھتے اور بوجھتے تھے۔ یہ پہیلیاں کئی اقسام کی ہوتی تھیں جن میں اشارے کنائے، مترادف الفاظ، ایہام، علامات اور کئی قسم کا لفظی ہیر پھیر استعمال میں لاتے ہوئے سوال کا جواب بوجھا جاتا تھا۔ اس کے لئے زیادہ تر شاعرانہ بحر، ردیف اور قافیہ کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ عام طور پر پوچھی جانے والی پہیلیاں روزمرہ استعمال کی اشیا، مظاہر فطرت، سامان خانہ داری، مختلف جانوروں، لباس، زیورات، موسموں، اوزاروں اور سواریوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ مخصوص الفاظ میں پوچھی جانے والی پہیلیوں پر غور کرنا، جواب ڈھونڈنا اور اس میں ہار جیت اس وقت نہ صرف ایک سماجی اور ثقافتی مشغلہ تھا بلکہ ایک ادبی اور اردو زبان دانی کا ذریعہ بھی تھا۔

اردو زبان میں پہیلیوں کی ابتدا بھی اردو زبان کے ساتھ ہی ہو گئی تھی اور دیگر اصناف کی طرح ابتدائی پہیلیوں کی بناوٹ میں مختلف دیسی اور بدیسی زبانوں کی آمیزش واضح نظر آتی ہے۔ چونکہ پہیلیوں کی ابتدا، غیر ارادی اور کھیل ہی کھیل میں ہوئی تھی اس لئے ان کے ابتدائی بنانے والوں کے نام نامعلوم رہے ہیں۔ 1918ء میں شائع ہونے والی کتاب جواہر خسروی میں امیر خسرو کی دیگر شاعرانہ اصناف کے ساتھ ان کی تخلیق کردہ پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں بھی موجود ہیں۔ محمد نعیم مرحوم کی مرتب کردہ کتاب چندو کی پہیلیاں ۱۹۳۶ میں شائع ہوئی جس میں کئی نادر اور دور دراز پہیلیاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ گل رعنا، شعر العجم، فرہنگ آصفیہ، آب حیات، نگارستان فارس اور اردو کی ابتدائی تواریخ میں پہیلیاں ملتی ہیں۔ سودا اور انشاء کے کلیات میں ان کی بنائی ہوئی پہیلیاں موجود ہیں۔ ۱۹۷۸ میں سید یوسف بخاری کی کتاب ہماری پہیلیاں شائع ہوئیں جس میں انہوں نے بڑی محنت کے ساتھ پہیلیوں کی تاریخ، اقسام اور اس وقت تک کی اہم پہیلیاں جمع کر کے تاریخی ادبی کام کیا ہے۔

سوال پوچھنے اور جواب بوجھنے کے اس دلچسپ ادبی مشغلے کو قدیم اردو اور مقامی زبانوں اور فارسی و عربی کی حلاوت سے تشکیل دیا گیا۔ کئی پہیلیوں میں دکنی اور بہاری زبانوں کی آمیزش بھی پائی گئی ہے اور اکثر کے تخلیق کار گوشۂ گمنامی میں مستور رہ گئے ہیں۔ اس قبیل کے سوالی جوابی کلام کو چھ بڑی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ اقسام اپنی بناوٹ اور ادغام کی مناسبت سے الگ الگ رنگ رکھتی ہیں۔ امیر خسرو کا

تاہم ان تمام اقسام میں پہیلی بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور ان میں سے اکثر کا موجد بھی امیر خسرو کو ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔

پہیلی قسم کو پہیلی کہا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ ذو معنی جملے اور مصرعے ہیں جن کے ذریعے کسی چیز کی علامات بیان کر کے وہ چیز بوجھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ سوال چھوٹے مصرعوں میں کیا جاتا ہے لیکن مصرعوں کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ پہیلی بوجھنے کے لئے کسی کو مخاطب بھی کیا جاتا ہے جیسے سکھی، ساجن، بھیا، رانی، ناری وغیرہ۔ اس میں شاعری کی صنعت تجنیس، ایہام اور لف و نشر کا استعمال بھی سامنے آیا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا پہیلی کی زبان آسان تر ہوتی گئی اور اس کے کثرت استعمال سے بوجھنے کا شوق اور موضوعات بھی ختم ہوتے چلے گئے جس سے پہیلی کی صنف پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ چند مشہور پہیلیاں ان کے جوابات اور بنانے والوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

ایک تھال موتیوں سے بھرا / سب کے سر پر اوندھا دھرا / چاروں اور وہ تھال پھرے / موتی اس سے ایک نہ گرے

یہ پہیلی امیر خسرو کی ہے اور اس میں آسمان اور تارے پوچھے گئے ہیں۔

بیسیوں کا سر کاٹ لیا / نہ مارا نہ خون کیا

یہ بھی امیر خسرو کی پہیلی ہے اور اس میں ہاتھ پاؤں کے ناخن پوچھے گئے ہیں۔

چڑھ چوکی پر بیٹھی رانی / سر پر آگ بدن پر پانی / بار بار سر کاٹیں واکا / ہے کوئی اردھ بتاوے واکا

یہ پہیلی سودا کی تخلیق ہے اور اس میں چراغ کا پوچھا گیا ہے۔

پانی ماں اور پانی باپ / اس کا اشارہ بوجھیں آپ

یہ انشاء کی بنائی ہوئی پہیلی ہے اور اس میں پانی کو پوچھا گیا ہے۔

ایک تابوت اور کتنے مردے / کتنے کاٹے سب دل گردے / نالی میں بیویں کالا پانی / ہے ظفر صاف ان کی نشانی

یہ پہیلی بہادر شاہ ظفر نے بنائی اور اس کی بوجھ ہے قلم دوات۔

ایک پرکھ کا کالا رنگ / سندر ناری اس کے سنگ / آگ سے کھیلے جل میں نہائے / آخر دن بیٹھے نکال بجائے۔

یہ پہیلی یوسف بخاری دہلوی کی ہے اور اس میں توے کا پوچھا گیا ہے۔

پہیلی کی دوسری قسم کہہ مکرنی ہے۔ یہ خسرو کی ایجاد ہے۔ اس کے چار مصرعے ہوتے ہیں۔ اس میں ایک سکھی دوسری سے سوال پوچھتی ہے۔ پہلے تین مصرعوں میں جو علامات بتائی جاتی ہیں وہ عام طور پر لڑکیوں کو ان کے محبوب کی طرف توجہ دلاتی ہیں چنانچہ چوتھے مصرعے میں جس سکھی سے پوچھا جاتا ہے وہ بے اختیار ساجن کہہ اٹھتی ہے لیکن پوچھنے والی سکھی ناں کہہ کر اصل جواب بتاتی ہے۔ اس طرح آخری مصرعے میں سکھی اور ناں کے الفاظ آنا ضروری ہوتے ہیں۔ پہلے دو مصرعوں اور آخری دو مصرعوں کی ردیف الگ ہوتی ہے لیکن بحر ایک رہتی ہے۔

رات سمے وہ میرے آوے / بھور بھئے وہ گھر اٹھ جاوے / یہ اچرج ہے سب سے نیارا / اے سکھی ساجن ناں سکھی تارا۔

امیر خسرو کی اس کہہ مکرنی میں تارا پوچھا گیا ہے۔

سانجھ بھئی تو لیا اتار / اداسوں ہوا سب گھر اجیار / اس بن مجھ کو سب گھر اندھار / اے سکھی ساجن ناں سکھی چاند

یہ کہہ مکرنی جارج مشوم کی ہے اور اس میں چاند پوچھا گیا ہے۔

وا بن پیا سب ہی سنگار / سوتی بھاگ جگاوں بار / سو سر چڑھ موہی لاگے پیار / اے سکھی ساجن ناں سکھی ٹیکا

عزت دہلوی کی اس کہہ مکرنی میں ٹیکا پوچھا گیا ہے۔ کہہ مکریاں عام طور پر امیر خسرو کی ہی اس صنف کے تاریخی ذخیرے میں موجود ہیں۔ پہیلی کی تیسری قسم کو دو سخنہ کہتے تھے۔ یہ بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ دو سخنہ بھی پوچھنے کے انداز میں ہوتا ہے۔ اس میں دو یعنی دو باتیں ایسی لکھی جاتی ہیں جن کا جواب الفاظ میں ایک جیسا آتا ہے اور اختصار کے ساتھ بات کی خوبصورتی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ دو سخنے صرف امیر خسرو اور عزت دہلوی کے بنائے ہوئے تاریخ میں موجود ہیں۔

انار کیوں نہ چکھا؟ وزیر کیوں نہ رکھا؟ دانہ نہ تھا (امیر خسرو)

سموسہ کیوں نہ کھایا؟ جوتا کیوں نہ پہنا؟ تلا نہ تھا (امیر خسرو)

روٹی کیوں جلی؟ گھوڑا کیوں اڑا؟ پان کیوں سڑا؟ پھیرا نہ تھا (عزت دہلوی)

پہیلی کی چوتھی قسم نسبت کہلاتی تھی۔ اس میں مطابقت اور مناسبت سے دو چیزوں میں مشترک تعلق تلاش کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ امیر خسرو نے پڑھے لکھے خاندانوں کے بچوں کے لئے ایک تعلیمی کھیل بنایا تھا جس میں دو چیزوں کی مشترک نسبت والا لفظ پوچھا جاتا تھا۔ بعد میں انشاء اللہ خان انشاء اسے رباعی کی شکل میں لے آئے تھے۔

گوشت اور آفتاب میں کیا نسبت ہے؟ (جواب۔ کرن) امیر خسرو

زیور اور درخت میں کیا نسبت ہے؟ (جواب۔ پتا) امیر خسرو

کل کر کے غصے وہ پری مجھ سے یہ بولی دن رات سے نسبت کیوں کر نہ تجھے ہو

تو لا تجھے ان آنکھوں کے کانٹے میں تو ٹھہرا تولہ ہے کہ ماشہ دکھایا تماشا (انشاء)

تولہ یعنی تولنا اور تولہ وزن کی ایک اکائی کا نام۔

پہیلی کی پانچویں قسم کو ڈھکوسلا کہتے تھے۔ یہ خالص امیر خسرو کی ایجاد تھی۔ اس میں صوتی جوڑ توڑ اور بے جوڑ الفاظ کی کشش سے لطف اٹھایا جانا مقصود تھا۔ اس کا لفظی مطلب بے جوڑ فقرے بازی ہے۔

بھادوں کی پکی پہیلی، جھجر جھجر ہے کپاس بی مہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں

پہیلی کی آخری اور چھٹی قسم کا نام چیستاں ہے۔ یہ خالص فارسی میں ہے اور امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ فارسی الفاظ چیست آں (وہ کیا ہے) کو ملانے سے چیستاں کا لفظ بنایا گیا ہے۔ اس میں بھی دو یا چار فارسی مصرعوں میں نشانیاں دے کر کوئی چیز پوچھی جاتی ہے اور اس کا آغاز چیست آں کے الفاظ سے ہوتا ہے۔

چیست آں جانور کہ جانش نیست خلق ہا می کند دہانش نیست

گریہ ہا می کند ندارد چشم نعرہ ہا می زند زبانش نیست

امیر خسرو دہلوی نے اس میں بادل کی نشانیاں بتا کر بادل کی پہیلی پوچھی ہے۔

چیست آں درج زمرد رنگ تا پیدا دہاں — چوں صدف یکتا ودے ناسفتہ دارد درمیاں
تیرے وارم کہ چوں آں درج بشگافد کسے — افگند آں گوہر ناسفتہ از کف رائگاں

(فیضی کی اس چیستاں میں آم کا پوچھا گیا ہے۔)

چیست آں تحفہ ایہا الاحباب — کز فلکہا بر آید آتش و آب
روز انکشافاں بود لاریب — ناگہاں می رسد ز عالم غیب

(انشاء نے اس چیستاں میں بارش کا پوچھا ہے)

پہیلی کا دور گزر گیا، اب نہ وہ بھولے بھالے اور معصوم اذہان رہے ہیں۔ نہ وہ فرصت رہی ہے اور نہ وہ محبت اور یگانگت رہی ہے۔ اس دور کے لوگ الفاظ کے کھلونوں سے بہل کر نیند کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔ آج کے انسان کو نیند کے لئے کئی ادویات اور مشینی آلات تعیش کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ انسان بہت زیادہ سیانا ہو گیا ہے۔ پھر بھی لگتا ہے بازخواں آں قصہ پارینہ را۔

◆◆◆

ساغر صدیقی ایک عہد جو گزر گیا

ساغر صدیقی کے والد نے ساغر کی پسند کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ ہم خاندانی لوگ ہیں کسی ایرے غیرے کی بیٹی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے۔ غصے میں اس لڑکی کے گھر والوں نے لڑکی کی شادی پنجاب کے ایک ضلع حافظ آباد میں کر دی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن ساغر اپنے گھر کی تمام آسائش و آرام چھوڑ چھاڑ کر داتا کی نگری (داتا دربار لاہور) میں رہنے لگے۔ جب اس کی محبوبہ کو پتا چلا کہ ساغر داتا دربار پہ ہے تو وہ داتا صاحب آ گئی۔ کافی تلاش کے بعد آخر تلاش کرتے ہوئے ایک ملنگوں کے جھرمٹ میں ساغر مل ہی گیا۔ اس نے ساغر کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور یہ بھی بتایا کہ مجھے میرے خاوند نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور ہماری داستان محبت سن کر مجھے طلاق دے دی ہے۔ اب اگر تم چاہو تو مجھے اپنا لو۔ ساغر نے کہا [illegible] ہم ولیوں کا صدقہ کھاتے ہیں۔ [illegible] ساغر صدیقی کے آخری چند سال نشے میں گزرے اور وہ بھیک مانگ کر گزارہ کیا کرتے تھے۔ گلیوں میں فٹ پاتھ پر سویا کرتے تھے لیکن اس وقت بھی انہوں نے شاعری لکھنا نہ چھوڑی۔

میری غربت نے میرے فن کا اڑایا ہے مذاق — تیری دولت نے تیرے عیب چھپا رکھے ہیں
زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے — جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں — لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

کہتے ہیں کہ جنرل ایوب پاکستان کے صدر تھے تو ان دنوں جنرل ایوب کو بھارت میں ایک مشاعرے میں مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا۔ شاعری سننے کے بعد صدر ایوب نے کہا یہ غزل بھارت کی نے خون کے آنسو سے لکھی ہوگی۔ شاعر داد لینے کے بعد مسکرایا اور کہا جناب عالی اس غزل کا خالق آپ کے ملک پاکستان کا شاعر ہے۔ جناب عالی اس دور بھر کے شاعر کو ساغر صدیقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنرل ایوب نے واپس آ کر ساغر صدیقی کو تلاش کیا تو ساغر نے صدر کے بھیجے ہوئے وفد سے ملنے سے انکار کر دیا۔ صدر ایوب خود چل کر ساغر صدیقی کو ملنے گئے تو انہوں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے [illegible] نشے میں مست ساغر نے مصافحہ کرنا چاہا تو ساغر صدیقی نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ پیچھے کر لیا کہ

جس عہد میں لٹ جائے غریبوں کی کمائی — اس عہد کے سلطان سے کوئی بھول ہوئی ہے

منظومات

شہزاد نیّر

اَن چاہے جیون کی کتھا

میں نے صبح کا گھونٹ بھرا اور کلی کر لی
کلیوں کی باس نے حلق میں کڑواہٹ بھر دی
میں نے شام کے گھونٹ سے خاموشی کا وضو کیا
جو ایک چیخ سے ٹوٹ گیا
ایک خنجر وہیں سے پہلو میں چبھنے لگا
میں نے اُسے نکال پھینکا
روشنی کے نیزے مجھ تک آتے آتے ٹوٹ گئے

اب اُن کی چمک دراڑیاں
میرے بدن کی مٹی میں اُبھر آتی ہے
میں نے مٹی سے مٹھی بھری اور سر پر ڈال لی
میں نے زندگی کا پیالہ پیا اور قے کر دی

OOO

تسنیم کوثر

سوچ پرندہ

اب مجھے بکھرا رہنا ہے
الٹ پلٹ سامان پڑا ہے
سوچیں بے ترتیب بکھر گئی ہیں
انسانوں کو چپ سی لگی ہے
ذہن دریچے پاس نہیں اور
دل بے چارہ گریہ کناں ہے
گلی پہ ٹکی یادوں نے
ہر سو شور مچا رکھا ہے
سوچ پرندے کی چونچوں نے
دل میرا ادھلا رکھا ہے

OOO

پروین شیر (امریکہ)

ہوا کا درد

مری خوابیدہ آنکھوں پر
ملائم ریشمی آنچل نے دی دستک
جو میں نے کھڑکیاں کھولیں
کھڑی تھی سامنے پروا
مجھ سے گلے لگ کر بہت رو لی
وہ اپنے درد کے بوجھ کو چہرے پہ اٹھائے تھی
کہا اس نے ......
"فضاؤں میں بہت بارود ہے بہنا
دلوں میں بھی بہت نفرت بسی ہے
لبوں سے ہنسی کو چھین کر
اُڑے ہیں ہر طرف بادل دھوئیں کے
کہ اب تو دم گھٹا جاتا ہے
گھٹن کی آس کی آہٹ
کبھی لالی سے بچپن کی بہت سی داستانیں تھیں
سب کی سب ملبے کی ڈھیروں میں دبی ہیں"
کہا اس نے ......
"چلو اب دور کہیں ہم بھی چلے جائیں
پرندوں کو ساتھ لے جائیں
کسی انساں کی ان کی شاخ کی لالی کھلی ہو
کسی میں زندگی کی لہر ہو
ہوں کے وہ منتظر ساون کی بارش کے
انہیں جو شوق سے ملنے کو بے تاب ہوں
کسی بستی میں جو ٹیلے ہیں
جو اس کے بعد پھول کھلتے ہیں
کسی کے جسم و جاں پر درد کی چادر بنی ہے جس کو لرزاں ہو
اسے
آنکھوں سے لپٹے ہوئے لوگوں کے آنسو کم ہوں
چلو اب تم بھی دامن میں بھر لو
کہ اب "آگئی" کے سب ہیں ...!

OOO

استوتی اگروال (انڈیا)

حیرت انگیز دنیا

(انگریزی سے اُردو میں ترجمہ)

عظیم، وسیع اور خوبصورت، حیرت انگیز دنیا،
چاروں طرف سے نیلے پانی سے گھری ہوئی ہے
ہر طرف حیرت انگیز سبزہ وادیاں ہیں
دنیا تم بہت ہی خوبصورتی سے ملبوس ہو
حیرت انگیز ہوا میرے اوپر ہے،
اور حیرت انگیز ہوا درختوں کو لرزا رہی ہے
چلتے ہوئے پانی پر چلتی ہے
اور خود سے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بات کرتی ہے
اے وسعت دنیا! تم کس حد تک جاتی ہو؟
گندم کے کھیتوں کے ساتھ جو سر ہلا رہے ہیں
اور دریا ہیں جو بہہ رہے ہیں،
شہروں اور باغات، ریگستانوں اور جزیروں کے ساتھ
اور لوگ تم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہیں،
او دنیا! تم بہت عظیم ہو اور میں بہت ادنیٰ،
میں تمہارے بارے میں سوچ کر کانپ جاتا ہوں
اور پھر بھی، جب میں دعا کرتا ہوں
میرے اندر ایک سرگوشی کا کہنا تھا کہ
لگتا ہے
"تم زمین (Earth) سے زیادہ ہو
اگرچہ ایک تنکے کی طرح ہو
تم محبت کر سکتے ہو اور سوچ سکتے ہو
اور زمین نہیں!"

OOO

جمیل احمد عدیل

سفید کبوتر

کبھی دریچے وا کرتے تو
بدن کے آستانے سے نکل کر
خود کو دور سے دیکھتا
ویرانی اور گھٹن کے بیچ
گھٹن کی صدا تھی
یوں ملیں گے
جیسے
خواب کے بے وجود جسم کے لیے
حدودِ تعبیر کی قید لگا دوں
ممکن ہے تم
لوٹ کے قفس میں جانا چاہو
کہ
ریاست کا کلیدی منصب
فرمان کی شوکت بیچ گئی
ترغیب کو جال بنا لائیں
طلائی سکوں کے عوض
معمول کا وہی اکیلا عامل
لوٹ کے سال میں
حرمت کے معنوں کا تعین کرنے لگے
مگر
ایک بدصورت آزمائش ہے کہ
بے حرمت مادہ کا بیٹا کیا ہے؟
کیچلی سے شروع
مسلسل عمل ہے
کیا عجب
رنگ و نور میں ڈالی
کوئی وادی، جہاں پرواز ہو جائے
اس کے بیچوں بیچ
پھوٹ سارے لمحے گھٹن ہو
اور تم
علی الصباح
وینٹی لاؤنج کی منڈیر پہ جا بیٹھو
آتے جاتے اجنبی مسافروں کو
آنکھ مارا کرو

OOO

رقیہ طراز

جیون رس

آنکھیں طوفاں
باتیں طوفاں
سانسیں طوفاں۔۔۔
رنگ بہاری
روپ کنواری
لمس نرالا
امرت دھارا۔۔۔
ہوش گنوایا
رنگ سنبھالا۔۔۔
پھر۔۔۔
جیون کی لمبی چپ۔۔۔!
اور۔۔۔ دکھوں کی چھایا۔۔۔!

OOO

ظفر سپل

سورج نہیں نکلا

کئی دن ہوئے سورج نہیں نکلا
جنگلوں کی پگڈنڈیوں میں وہ اپنا راستہ بھول چکا ہے
وہ کسی کالے غار میں گر چکا ہوگا
یا کالا ہو گیا ہے
خاموشی کا پھول آسمانوں پر لٹکتا ہے اور چہروں پر
دراڑیں ڈال دیتا ہے
وحشی تاریکیوں کا لشکر سیاہ پرچم لئے سنسان
گلیوں میں گشت کرتا ہے
وہ بے آواز گھروں میں لیٹے بے سدھ لوگوں
کے کانوں میں
پراسرار سرگوشیاں کرتا ہے
یہ لمحہ خاموشی اور تاریکی سے بہت گہرا ہے
وہ کہیں چھپا اپنی سانس درست کر رہا ہوگا
جس کے گدھ نے پورے شہر پر اپنے پر پھیلا کر
دیئے ہیں
لوگ "عذاب" کی چادر تانے بے خبر سوئے ہیں
ان کی سانسوں کے کالے لمبے سانپوں نے ان
کے جسموں کو جکڑ رکھا
زبانوں پر دبا کر رکھے وہ لفظوں کی قوت سلب
کرتے رہتے ہیں
(اور اب تو عجیب بھی نہیں لگتا)
گلے کے گرداب کے بنائے ہوئے پھندے کا
گھیرا تنگ ہوتا چلا جا رہا ہے
اور اب لوگ چیخ کر یہ شکایت بھی نہیں کرتے
سورج کیوں نہیں نکلا

OOO

محمد سلیم ساحر

تلاش

تجھے کس خدا کی تلاش ہے؟
یہاں اور کوئی خدا نہیں
وہی ایک ہے
ہمیں آج تک جو ملا نہیں
جو کریم ہے جو علیم ہے جو حکیم ہے
جو کبیر ہے جو بصیر ہے جو قدیر ہے
اسے اس کے حجرۂ خاص سے کبھی ڈر کے مجھ سے
سنا دیا
تو کلام لے کے بتا دیا
اسے کب دیا!
تو اک ایسی دنیا ہو جو مرے بدن کا ملال ہو
مجھے تیری دید عطا کرے جو مری نظر پہ حلال ہو
وہ خدا ہے جس کا وصال ہے کوئی اور اس کا خیال
ہے
اسے میں تو اپنے خیال سے کبھی منتقل نہیں کر سکا
تجھے ملتفت نہیں کر سکا
تجھے کس خدا کی تلاش ہے؟
یہاں اور کوئی خدا نہیں!

OOO

عاصم بخاری

اے حوا کی بیٹی مرے سامنے

ترے ارادوں میں کیوں یہ دم نہیں
تجھے اب یہ فیشن بے دم نہیں
اے حوا کی بیٹی مرے سامنے
یہ عریانیت ہے ترقی کہاں
یہ فحاشی ہے کردار کی بے کراں
اے حوا کی بیٹی مرے سامنے
یہ تہذیب ہے سب کی سب مغربی
مگر تو تو بیٹی ہے اک مشرقی
اے حوا کی بیٹی مرے سامنے
ذرا سوچ کیوں مختصر ہے لباس
تجھے کیوں نہیں اپنی عزت کا پاس
اے حوا کی بیٹی مرے سامنے
نمائش ہے یہ جسم کی برملا
اسے نام فیشن کا تو نے دیا
اے حوا کی بیٹی مرے سامنے
میں اک باپ ہوں ایک بھائی بھی ہوں
تجھے اب بیٹی میں کیسے کہوں
اے حوا کی بیٹی مرے سامنے

OOO

اظہر جاوید

دو چاند

یوکلپٹس کے پیچھے بیٹھے چاند نے
ہنس کے مجھ سے کہا
میں تو کچھ بھی نہیں
اس تمہاری زمیں پہ کئی چاند ہیں
ایک وہ چاند جو
اس شجر کے تلے
چاندنی کی طرح شگفتہ ہے
سامنے جس کے جلوے بھی ماند ہیں
جس کی زلفوں کے گھیرے سے ہوتے ہوئے
وہ کہ جس کے جہاں جسم سے چھوتے ہی مسکرائے
اجالوں کی ہریالی ہے
مانگ کر بھیک رکھتے ہیں اپنا بھرم
آسماں پہ چمکتے ہوئے ستارے بھی ماہ و خورشید بھی
(اور مجھ جیسے ماہتاب بھی)
وہ تمہاری زمیں کا حسین و نفیس چاند جو
بس تمہارا ہی ہے
اس کو دیکھو فقط اس کو دیکھو
اس کو چاہو اسی کو سراہو
میں تو کچھ بھی نہیں
یوکلپٹس کے پیچھے بیٹھے چاند نے
ہنس کے مجھ سے کہا ——

(نوٹ: غیر مطبوعہ۔ محترم مرحوم اظہر جاوید صاحب نے بھجوائی۔ ان کے پرانے کاغذات سے یہ نظم دستیاب ہوئی۔)

OOO

افسانے

عشق دی جھگی وِچ مور بولیندا

سمیع آہوجہ

مختصر تعارف

8 دسمبر 1936ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ دہلی جامعہ ملیہ سے تعلیم حاصل کی۔ بیروت سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ میٹرک سے ہی لکھنے کا آغاز کیا۔ ''آگہی کا جنم'' پہلا مشہور افسانہ تھا۔ اب تک افسانوں کی 13 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تازہ کتاب ''معتبر پلکہ گمشدہ'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ 9 کتابوں کا مجموعہ ''99 کے پھیر میں'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ایف سیون فور کی لین دس میں سڑک کے دونوں جانب ڈھلوان کو چھوڑ کر سب بنگلے چار چار کنال کے تھے، اور آٹھ ڈھلوانی بنگلے چھ سات کنال کے رقبے پر تعمیر کیے گئے تھے۔ اس کی قیام گاہ بھی انہی ڈھلوانی بنگلوں میں سے آخری سے پہلے بنگلے میں تھی اور کافی عرصے سے خالی پڑا ساتھ والا بنگلہ جھاڑ پونچھ رنگ روغن کے بعد کھلا اور ٹرکوں سے اترتے سامان نے کاروں میں آتے جاتے ساکنین کی آنکھوں میں نئے ہمسائے کی خبر اتار دی۔ بنگلے میں افغانی سفارت کار کی اپنے اہل خانہ اور مسلح ذاتی سیکیورٹی کے ساتھ آمد سے وہاں پہلے سے مقیم رہائشیوں میں کوئی ہل چل ہی نہ ہوئی۔ سب ہی سرکاری تربیت میں پلے اپنے اپنے مراتب کے کروفر میں غرق کہ ہر اک سکوت کے رنگ بڑھتے میل جول میں قلعی کھل جانے کا خوف بیچ میں حائل۔ اسی سبب اندر کی خبریں کیا منتشر ہوتیں، لیکن ملازمین کی بے مہار فوج کی سنی سنائی باتوں کو گھر کی نوکرانیاں اپنے بیٹھے بٹھائے پنکھا جھلاتے مالکان خواتین کے کانوں میں اتار دیتیں اور اس میں سے ہی ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے کو مرچ مصالحہ لگا کر سہ پہر کے اوقات میں چائے کی چسکی تری اور سنیک کی کرمراہٹ میں ملاقاتیوں کو سنایا جاتا۔ ان ساری کن چینلوں کی لائی ڈور میں اس کے لیے کوئی کاٹ دار اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ لیکن اسے تشویش تو اس دن ہوئی جب ساتھ کے بنگلے کے گراؤنڈ فلور کی اونچی کھڑکی کے پیچھے تاریک گیلری سے زدوکوب کرنے اور دری میں گالیوں کی بوچھاڑ میں چیختی واویلا کرتی نسوانی کرلاتی، ڈکارتی، چیختی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ ایم بی بی ایس کا نتیجہ آئے تو دس بارہ دن ہو چکے تھے مگر وہاں جاب شروع ہونے سے قبل اپنے کلاس فیلوز کی طرح پڑھائی کو بوجھ کئے حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا، اور اسی لیے فارغ اوقات میں دوستوں کے ساتھ تفریح گاہوں کے طواف کرنے کی بجائے اوپری منزل کے اپنے کمرے میں کالج کے اسباق کی تمرین سے پورے انہماک سے چپکا رہتا تھا مگر نسوانی آواز کا

سے یک دم جلدی اُٹھا اور اُٹھ کر کھلی کھڑکی کی سلاخوں پر جا پہنچا، حجاب اور ہیجان بھری آنکھیں اُچھل کر نیم تاریک گیلری میں اتر گئیں۔ قلبی تاریکی میں جب آنکھیں رنگی گئیں تو روبرو۔۔؟

سانپ کی طرح بل کھاتے، چیختے، کراہتے، مبہم نسوانی پیکر پر برستے چابک۔۔؟ ایک ہی کڑک سے مبہم سوال رگ پار بجلیاں گرا تا۔ آخر مرد کو ہی نے اپنی آواز کی رنگینی سے کیوں رنگا۔۔؟ اگر بیوی سے جنسیت کا رحجاب کا دخل آ تا تو۔۔؟ ذہن میں منطقات اکتا دینے والے آپ جواب تراشتا اور خود ہی برساتا چابک۔ ہر ضرب کے ساتھ ہی کلبلاتا بل کھاتا نسوانی پیکر۔۔؟ اس کے لبوں سے اُبھرتی، گونگی سی معافی کی بنا کا ہی تراشتی چیخ۔ اور چند ہی دنوں بعد جلا وطن زدہ کوئی کا قتل اس کی مجرمانی نے ہی اپنی ہم کاروں پر کھولا کہ روئی اخبار والا اپنی بیوی کے ساتھ لگا تار از دو بیوی سنبھالے جعفری کے روبرو اختیار رکھتا رہا۔ سفارت کار کی بیوی اور اس کی بیٹیں تو باہر نہ آگئیں نہ کوئی سوال جواب کیا، اس اندر چھائے گھپ اندھیرے سے تکتی رہیں، بواہر بیٹیں کورٹ میں دو نوکرانیاں ٹوٹی پھوٹی اردو پنجابی میں قول سول پر لڑتی جھگڑتی رہیں۔ جانے والے میاں بیوی نوکرانیوں کو ادائیگی کرتے، اور بچوں کے نام پر وہ وقت کا کھانا بعد کر، روٹی سے بھری پوری اٹھائے چلے گئے۔ اگلے روز دفتر سے واپسی پر وہ تھر سے بھرا ہوا پلٹا۔ رائیور نے سنی سنائی خبری اس کے کانوں میں ڈال کر حق نمک ادا کیا تھا اور وہ کھڑکی کی سلاخوں سے چپکا ہر شے پر اپنی بے قابو چیخوں کو زنجیر ڈالے لپ مگر پوری قوت سے دونوں ہاتھوں میں جکڑی سلاخوں کو جھنجھوڑنے لگا، اور اپنے ہی وجود میں گالیاں دیتے، اتفاقی تومندہ کا قیمہ کرنے کے لیے بے قرار مگر مجبور، وہ کہ الفاظ میں سوال اگلنے سے بھی مرعوب تہذیبی معاشرتی جبلی سلاخوں میں محصور۔!

اگلے روز فجر کی اذان ہوئی مگر اس کی کسمپرسی تمام نہ ہوئی، جبکہ چابک زن زورآور خود اپنے قہر، تکبر اور خودی کو اعلیٰ تفاوت پر تولتا، بے دم جھوکا پیاسا ہی اندر اپنے اخلاقی خواب میں ہوجاتے، اپنی تنگی پر اپنے آپ کو کوستے، اپنی زن زورآوری کو ملامت کرتے پلنگ پر ڈھیر ہوگیا۔ لیکن گیلری کے جھروں کرے سے نکلتے ہی بلکتی نسوانی پیکر کی آواز میں دو اور بھی گریہ زار آوازیں شامل ہوگئیں، اور دھیرے دھیرے سسکیوں میں بدلتے بالکل معدوم ہوگئیں اور پھر نصف ساعت تک نہایت ہی مہین آوازوں میں سرگوشیوں کی لہریں بھی ساکت ہوگئیں۔ مگر سناٹا چھانے کے باوجود وہ گم صم کھڑا اپنی بے چینی کو سے کی تیز ناخوں بھری ہر فلی ہواؤں سے بیچ پاتے، برف کی سل بنے، فجر کی نماز کے بعد بھی وہیں کھڑا رہا، تھکاوٹ سے چور، چاہتا تھا کہ پلٹ کر اپنے بستر پر جا پڑے اور تکیے میں اپنے آنسو نچوڑے، کرب کو اپنا ہم راز بنائے کہ اچانک ہی سفارت کار کا مرکزی کار پورچ بیدار ہوگیا، تین چار ڈرائیور اور سات آٹھ مسلح چاق و چوبند محافظ قطار بنا کر گیراج کے سامنے جم کر کھڑے ہوگئے۔ ایک پجارو اور محافظوں کی دو جیپیں آگے پیچھے گیراج سے نکل کر مرکزی کار پورچ میں لگ گئیں اور وہ شٹل کاک برقعے میں لپٹی راحیل جعفری کے پیچھے سے نکلی اور انتہائی مدہم آواز میں سسکتی ہوئی کار پورچ کی جانب چل دی۔ اس کے پیچھے بڑی عجلت سے دراز قامت، اس کی آنکھوں کا رنگوں بھرا نگار ختان، جوانی کے بعد رپورٹ کے درمیان منسوب ہوا، وہ جعفری کی سیڑھیوں پر رکی اور کالی چادر سر پر لگاتے، لمبی گردن کو جھکا دیتے سر اٹھایا تو خوبصورت جیسے نقش و نگار میں سجا چہرہ اور اس پر موتی موتی سیاہ سو گوار مرگ آنکھوں نے اسی لمحے کھینچ کر اپنے اندر اتارا۔ پھر وہ اس کے اندر ہی دیکھوڑے کے گیتوں سنگ اسے رلاتی، خود بھی روتی، کالی چادر سر پر جمائے، اس میں اپنے آپ کو لپیٹتی گیلری کی سیڑھیاں اتری تو۔۔؟ اس کی آنکھوں میں چند جھگڑوں میں غضب تیرہ وقار نے آ دیرہ لگایا اور؟

دل دہکر رہا تھا، بکھال الجھیاں اور پھر دائیں بازو کے ساتھ لگی نو دس سالہ بچی، بچی دہشت زدہ، چھوٹی لڑکی اور۔ ملازم عورتوں کا ایک گروہ مبہم پیکروں میں لپکتا، بچارہ میں معدوم ہو گیا اور وہ۔۔۔

چلتے دل دہکر اور جسم پر آب سنگ سا کت۔۔۔اور وہ شدت سے پیاسا تخت کی رات گنوا بیٹھا۔ اتفاق سفارتکار کا سارا بنگلہ تو روز اول سے ہی سکوت کی چادر اوڑھے رہتا تھا مگر ان کے جانے کے بعد ویرانی کی سی کوئی ویرانی تھی۔ اس پر تو فلک بھی پہاڑوں پر دور کر کتا، مسلسل آنسو بہا رہا تھا مگر وہ تو اپنے آنسو بھی کسی کو دکھانے کے قابل بھی نہیں تھا، بس اپنے اندر کے کھولتے لاوے کو شخشار رکھنے کے لیے کتابوں میں بسیرا۔ اساتھ ہی ملازمت کی شروعات پر تلاش شروع۔ اس کی اپنی دلگیری کے روبرو وجود کے روئیں روئیں میں بندھا قول وقرار تھا۔

سفارتکار کی اہلیہ جب تک اس بنگلے میں مقیم تھی مہمان داری تو عام تھی مگر جب بھی ہوتی عجب کروفر کے ساتھ ورنہ ایک سناٹے کا پہرا رہتا۔ چپ مسلح سیکیورٹی گارڈ اندر اور باہر کی گشت پر ہوتے اور ان کی عورتیں اور دس سے پندرہ سال کے بچے اندر، کسی نہ کسی کام میں جٹے ہوئے۔ بنگلے کے اندرون میں کسی بھی بالغ مرد کو جانے کی اجازت نہ تھی اور باورچی بھی باورچی خانے اور پینٹری تک محدود تھا، کاریڈور سے ملحق میں چوتھی چار سیڑھیاں اور پھر کھلتی جعفری، اسی کے دروازے کے آگے چوڑائی بار دو کا صحن اور وہیں سے پیچھے اترتی سیڑھیوں کے ساتھ منسلک دو کمروں کے کوارٹر میں وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ مقیم تھا۔ کھانا پکانے میں باورچی کی مددگار اس کی بیوی جو کھانے کی میل پر خانساماں کے فرائض بھی سرانجام دیتی۔ گھر کی صفائی، جھاڑ پونچھ، کپڑوں کی دھلائی، استری، خانم اور آقا کے جوتوں کی پالش، اور خانم کی مشاطگی پر معمور عورتیں جن کے شوہر سیکیورٹی گارڈ تھے اور بنگلے کی پشت پر بنے کوارٹروں میں ہی رہتے تھے۔ صرف پائیں روشوں اور مین گیٹ کے اندر کی دھلائی صفائی کے لیے ایک کرسچین جمعدارنی اور اندر باہر کے لانوں اور درختوں اور گملوں کے پودوں اور موسمی پھول پھلواری کی دیکھ بھال کرنے والا مالی، صرف وہی دونوں مقامی تھے۔ صبح آتے اور رات کے کھانے کے بعد ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے تھے اور ان دونوں کی شناس مقامی اخباری تھی۔

مہینے بھر کا سودا سلف تو تھوک منڈی سے آتا ہی تھا مگر روز کی تازہ سبزی، سلاد و فروٹ اور تازہ ذبح کیے گئے دنبے کے گوشت کے علاوہ چھوٹے موٹے ضرورت کے سودے کی خریداری کے لیے جب بھی پاس والی مارکیٹ کی طرف باورچی نکلتا تو وہ مسلح پہرے داروں کی معیت میں ہوتا جن کی کلاشنکوف اور بدن سے بندھا ہوا کمر پیچھا اسلحہ سفید لٹھے کی چادر یا مہین اونی نما اونی چادر، جو موسم کے مطابق ہوتی، اس کی ڈھیلی بکل میں پوشیدہ ہوتا مگر چادروں کی مختلف جگہوں کا ابھار اسلحے کی نشان دہی کرتا رہتا اور ان کی نگاہیں چاروں جانب گھومتی اور پرکھتی رہتیں۔ باورچی کی واپسی اور گیراج والے گیٹ کے روبرو ولیسی راہداری سے لان کے ساتھ چلتے گیراج کو لگتے ڈرائیوروں کو ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا نا کوئی بات کیے باورچی خانے والی جعفری کی کنڈی ہلاتا اور دروازہ کھلنے پر سودے سمیت خاموشی سے اندر گھس جاتا اور بلا بات چیت اور میل ملاپ یا کہیں آنے جانے کی اس پر سخت پابندی تھی۔ دروازے گیٹ کی راہداری میں لمبی چوڑی، لان کے ساتھ چلتی، کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر قد آدم سے اونچی مہندی کی گھنی باڑ والی دیوار تک ختم ہو جاتی۔ آگے کنکریٹ کے پلر اور دیوار کے ساتھ چھ دو فٹ گیٹ، یہ بند کاریڈور پشت کی دیوار تک پھیلا ہوا تو محرز کیوں کے بیڈ منٹن کے لیے کورٹ مختص تھا۔ سفارت کار کی اہل خانہ کی بھی

جھنجری سے باہر دیکھتی رہتی، بس وہاں کی گیلری میں کرسی ڈالے دیکھتی یا پھر کسی کو کوئی ہدایت دینے کے لیے بھی وہ سرگوشی میں ہی پیغام بھجوا دیتی۔ سہ پہر کو اس کی دونوں بہنیں ضرور، بیڈ منٹن، باسکٹ بال یا ٹیبل ٹینس کھیلنے کے لیے نکلتیں تو ان کے ساتھ نوکرانیوں کے مختلف عمروں کے بچے اپنی ماؤں کے ساتھ نشان زدہ لکیر کے ساتھ بیٹھ کر دونوں کے کھیل کو دیکھتے اور اچھے شاٹ پر تعریفی کلمات کے ساتھ زور زور سے تالیاں پیٹتے اور۔۔۔ اور ایسے ہی تعریفی شوخ و شنگ فقروں کے شور سے گھبراتا، تیزی سے بھاگتا کھڑکی کی سلاخوں سے جھانکتے ہوئے، چاہتا تھا کہ شور مچاتے بچوں کو ڈانٹ دے مگر ٹیبل ٹینس کی گیند پر اک زوردار شاٹ لگاتے ہی پیچھے سے شرفو دھکا دے کر چہرہ بھی گردن پر لیے آتا، جھٹکا، کھلے بالوں کو جھٹکا دے کر پیچھا اٹھاتا تو ہرن کی چشم سیاہ سے نظر بھر کا سحر اس سے آلپٹا، اور وہ اسی ریشم میں پھنسا کھڑکی کی سلاخوں سے چپکا ہی رہ گیا۔ مگر میں ساقی، مسکراہٹوں میں تحمل کرتا، مسکراتا، ہوش ربائی، مستی کی مئے نایاب کے خم کے خم اس کے اندر انڈیلتا رہا۔ اور۔۔۔؟

ابھی اسے اس دلبر دلربا کی مئے کے نشے میں غرق ہوئے سات ماہ ہی ہوئے تھے کہ حکومت افغانی۔ سفارت کار کی شوریدہ پشتی کے سبب وہ کابل کے نواح میں اپنے باپ کے گھر چلی گئیں اور وہ آشفتہ سر اپنی شوریدہ دماغی کو مشکل اندر چھپائے رہا مگر اک لمبی چپ کے زندان میں بند۔ سرکاری ہسپتال میں ملازمت ملنے پر بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی اک کرن تک طلوع نہ ہوئی۔ بوڑھے ماں باپ نے اس کی تنہائی اور افسردگی کو توڑنے کے لیے شادی کے لیے پوچھا تو وہ اٹھنے سے اکھڑ گیا اور ملک چھوڑ کر باہر چلے جانے کی دھمکی دی تو وہ بھی حیرانی میں گھٹنے چپ ہو گئے، لیکن پھر بھی بڑے رنج سے اس کی خاموشی کا سبب جاننے اور توڑنے کے لیے اسے مختلف بہانوں سے مسلسل کریدتے رہے مگر اس کے تالا دے کو لیک کہتے چل دیے۔ بڑے بھائی بھابھی اور فلسطین شوخ دس سالہ بھتیجی نے جب شادی پر زور دیا تو وہ آنا فانا میر بختر شپ کے نام پر اپنے کلاس فیلوز کے ہمراہ آئر لینڈ پہنچ گیا مگر اپنے دیس میں چپ کا قفل ڈالے دو سال اور پھر آئر لینڈ میں چھ سال جس کرب و درد کی شدید گھٹن کو سہتے اس نے گزارے وہ اس کے اندر بھی آشفتہ سری ہی اس چپ پالی کو جانتی تھی، جو صرف تنہائی میں ہم کلام ہوتی تھی لیکن بکھرا کے کاٹنے، شکایت سے پکار پکار رکھنے پر سر رکھتا تو اک جز ناطاقی یا زور بند نمودار ہوتا، کبھی نزدیک آتے آتے پلٹ کر دور نکل جاتا، کبھی جز ڈالا جورو یا زمرد کے کانوں میں جھولتے آویزے، ایسی زردی مائل سبز روشنی سے اس کے چہرے پر نقاب ڈال دیتی۔ کبھی لوگوں کے ڈھول اور تاشے پیٹتے ہجوم غفیر، دلہن ماہی پر ہاتھی دانت کے کام سے سجا دلہن کا تخت اٹھائے لیے جا رہے ہوتے، اور کبھی وہ برف زار میں گھڑ سوار محافظوں کے سنگ، سر دھوائے سر اور بدن کو سیاہ سموری لبادے میں چھپائے اور اک ہاتھ میں ڈھیلی لگام اور سینے تک اٹھے دو بے ہاتھ سے گاؤ ذری کلائی تک چہرے کے ویز عرصے ہانے پر سفید باز، برفانی خرگوش کا شکار کرنے نکلی ہوتی۔ کبھی خطائی ریشم کے زرق برق لباس میں ملبوس، زرکار پاپوش پہنے، لونڈیوں کنیزوں کے جلو میں آتی جن کے ہاتھوں پر شہد بھی کی سینیاں، اور خصوصاً اورک کی مٹھائی ضرور ہوتی۔ یہ جب وہ انجانی بے بسی کے شکنجوں میں جکڑا اپنی آشفتہ سری سے ہار جاتا تو اچانک ہی وہ نمودار ہوتی اور ٹیبل ٹینس پر مشکل شاٹ لگاتی تو گزرے زمانے کے جھال سے لکیر پر بیٹھی نوکرانیاں اور ان کے بچوں کے تعریفی شوخ جملوں کی تیز آوازوں میں وہ بلند محمل رکواتی اور دور سے آتی رسیلا ابریا لحم اپنے شہد کے قطرے کانٹوں بھرے خشک حلق میں ٹپکاتی۔

بس اتنی ہی چیدہ شناسائی تھی جو وقت کے ساتھ معدوم تو ہو رہی تھی مگر۔۔۔؟ یادوں میں رعنائی کیسی؟ شوریدہ سری کا زندان اور بھی شوریدہ پشتی ہو جاتا۔ نجانے کیسی گھڑی تھی جب وطن آنے کی چاہ اس کے دل میں چھ سال کے بعد اچانک ہی جاگی۔ اسلام آباد والا بنگلہ اچھے

کرایے پر اٹھا ہوا تھا اور اُسے بھائی بھابھی اور سب سے زیادہ اکلوتی بھتیجی سے ملنے کا خیال لاہور کھینچ لے گیا۔ صبح شام ناشتے کھانے اور شام کی چائے پر ملاقات ہو جاتی تھی مگر رات کا کھانا تو وہ پرانے کلاس فیلوز کی دعوتوں میں رات گئے تک ہنگاموں میں چہکتا رہا۔ مگر پندرہ دن بعد پھر تنہائی کے سنگ، خاک چھانتے دن میں پرانا منزل، سمگل شدہ قالین اور کاسمیٹکس، بجلی کا سامان، افغانی و ایرانی قدیم کانچ کی سنگت میں زحرے میں لہریے لیتی مردوں اور عورتوں کی ہیجان انگیز آوازیں اور تصاویر بیچتے افغانیوں کے چھاروں میں اُس کی تلاش میں رہتا جاتا سارا شہر اور مٹی کی آرزو میں گھر واپسی ہوتی کہ یہ طلسم کی آس تو سہی مگر اک جھلک تو نکھار دیں کر برحق مگر یہ تمنا کہاں بار آور ہوتی۔ شب بیدار طلوع ہو دھیا سویرے تک ماگن کی ذاتی ۔۔!

وہ لاہور کیا آیا تھا کہ پھر سے نئے عذاب کن جھگڑوں میں گھر کر رہ گیا۔ بھائی کا اک پرانا گورنمنٹ کالج فیلو کمشنر افغان مہاجرین ہونے کی خبر کان پڑتے ہی، بھائی کو بتائے بنا، کسی پرانے کلاس فیلو کو پتے کے لیے کرید اور اس کے دفتر پہنچ گیا۔ تعارف میں کوئی لمبے چوڑے رکھ رکھاؤ کی ضرورت بھی نہ پڑی اور وہ سرکاری ٹور کے نام پر اُسے لیے وہ کیمپوں میں پہنچ گیا۔ اُس کے مرحوم والد آغا جنت آدم کے نام کے حوالے سے دونوں جگہ ڈھونڈ لگاتے، عزیز و اقارب کا ریکارڈ دیکھتے کئی ایک سینئر افغانوں کو ٹٹولا بھی مگر سب کوششیں بے سود، اس کے وجود میں پھیلی مٹاشا تیج دھوپ وارا اک اپنی شدید تپش میں جلاتی، جھلاتی اور اُن ہی راکھوں ورق بے آب ویرانوں نے اس پر پیاس کی شدت اور اضطراب دی۔ جمعہ کا دن اور سر پر کاسے اور لمبی جاگوں والے تیتیوں میں خواب آئے بھی مگر وہ آئے بھی تو کیسے تھکاوٹ سے ٹوٹتے بدن کے لیے استراحت کہاں، مٹی کی سیاہ و سفید یادوں کی رنگینی کہاں، بس یادوں کی تپش کو ٹھنڈا کرنے کا واحد حل، راگ داری۔ صوفے کی پشت پر ٹکی کمر، مندی آنکھیں، کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے پرانکسر کی سرگم کا تیکھی، راگ ویسی ٹوڈی میں ہولارے لیتے گم شدہ دلبری کی تھکی آنکھوں سے جام پہ جام پیتے، درد و کرب کی تیز چبھن پر، چھاتی مستی کی مرہم کا لیپ لگواتے، مینڈ ہندی کی گھنڈیاں الگ رہا ہوتا تو جب ہی کرو یادوں کی نمدی ساری استراحت لوٹ کرتے گی۔ بھائی کے بند دروازے کو دستک دیتی بھتیجی کی فرمائش نے اُسے جکڑ لیا مگر ہمیشہ کی طرح اس کے لیے چہرے پر کھلتی مسکراہٹ، بے وقت خلل ہونے کی تلملاہٹ میں بجھ کر رہ گئی۔ اس کی ہی اداسی تمری کی کہ اس کا بڑا بھائی اور بھابی کسی کے ہاں عزا داری پر گئے ہوئے ہیں۔ اور اُسے لبرٹی مارکیٹ لے جانا ہے، افغانی زیورات اور پتھر دکھانے کے لیے۔ کار پورچ میں صرف اُس کی ڈرائیور سمیت رہ جانے والی کار موجود، اجازت کی طلب گاری اور لے جانے کے لیے گھر میں اب وہی بچا باقی اور پھر پرس بھی تو اس کا ہی خالی ہونا تھا۔ افغانی کا لفظ بیدار کر گیا مگر اس کو تو محبت سمیٹنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اپنی آرزو، تلاش اور اس کی لجاجت اور معصوم لہجے اور بچلی کا احترام ملحوظ رکھنے کی فرمائش، بولا اور لگیری کے نام پر اسے لپیٹا ہوا پڑا۔ لبرٹی کی پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک ہونے کے بعد اُتر کر سڑک پر پہنچا تو گول چکر کی دکانوں کے ستونوں سے لپٹے فٹ پاتھ پر خریدار عورتوں اور لڑکیوں کی چہکار سے بھرا لہریے لیتا جمگھٹ، ان کے رنگ برنگے ملبوسات میں کھپے کندھوں، گردنوں اور سر کے بکھرے بالوں کے دونوں سے گھیراؤ میں پھنسی میزوں پر کوئی دس بارہ شوکیسوں میں زیورات اور قیمتی پتھر اور تراشیدہ گھڑ اور ان کی پکارتی، جستہ جستہ دعوت دیتی جھلکیاں۔

اسی جمگھٹ میں گھریں شوکیس سے زیورات اور پتھر نکال کر دکھاتی عورتیں اور ہر اک، اپنے اپنے شوکیس سے جڑا اور نظارہ تھیں، پورے انہماک سے نوجوان خریدار لڑکیوں کو قائل کرنے کا اک نیا روپ اس کی آنکھوں کو رنگین کر گیا۔ ان ہی جھلکیوں میں اس کے چہرے

کو پیرتو پوری آب و تاب سے چمکا اور پھر دگمگ چہروں میں غصب کیا۔ وہ جناب کھلے بالوں کے جنگل میں منعکس متلاشی رکی اسی کے چہرے کے مختلف زاویوں کی تجلیوں نے باہم سمٹتے دائرے اپنی مٹھوں میں باندھا اور کھینچتے فوراً اسلام آباد کے ایف سیون ٹو کے اطلواتی بنگلے کی کھڑکی سے جاچپکا یا۔ اور نتاشا اور گل رخ آمنے سامنے۔ وہ بچوں اور نوکرانیوں کے اٹھتے شور اور مچلی جینس کی گیند پر اک زوردار شاٹ لگاتے دیکھتے سے شرابور دمکتا چہرہ دھیما گردن پر لہراتا ٹھمکتا۔ کھلے بالوں کو جھٹکتا۔ ترچھا اٹھا تو ہرگ کی چشم سیاہ سے زقند بھرتا ہوا اس سے آلپٹا۔ اور وہ وا سی دشنہ میں چھپا ڈالے سمٹتے ہوئے دوری اور پرانے لمحوں کی بوسیدگی کو تازگی میں نہاتے دائرے مسرت و انبساط سے شرابور کرتے اٹھ گدازے سوالوں کی بے قراری کے پھنسے جال کو توڑتے اسے بیدار کیا۔ اور وہ وہیں ان ہی قدموں پر ہما ششدر یک دم کھل اٹھا۔ ہاتھ اٹھا کر اسے متوجہ کرنا چاہتا تھا کہ بھتیجی اور کیلی اس کے بازو پکڑے جھگڑتے میں راہ بناتے اس کے پاس جا پہنچیں تو۔؟

پہچان کے سارے فریم کیے بعد دیگرے اس کی آنکھوں تلے گھوم گئے۔؟

بچپن میں آٹھ سال کا زمان حائل تھا۔ وہ تو چھوٹی بہن گل رخ تھی۔ جو۔! جواب سولہ سترہ سال۔ اسی کا روپ دھارے۔ جوانی کی دہلیز پر کھڑی تھی مگر۔؟ وہ کہاں۔؟ شوکیس میں نکالے ہوئے پتھر اور زیورات رکھتے جیسے ہی وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی تو بھتیجی کے لیے لرزاں لبوں میں پذیرائی کے الفاظ منتظر کربند ہو گئے! اس کے چہرے پر نگاہیں پڑتے ہی یک دم مبہوت۔ ایک لمحے کے بعد چونکی۔!! آغا اشاں۔؟ تم اسلام آباد والے ہی ہو نا۔!! اس نے مسکراہٹوں کے پھول نچھاور کرتے تائید میں سر ہلایا تو وہ بھی کھل اٹھی میں چھوٹی بہن گل رخ ہوں اور مچلی بہن نتاشا ادھر بیٹھی ہے۔ ایملا حساب دار۔! اٹھے ہوئے بازو کی اشارہ کرتی انگلی کے ساتھ سفر کرتی اس کی جناب آنکھیں دو بے ستونوں کیساتھ اک میز کے گرد چار گی کرسیوں پر جا پہنچیں۔ وہ بھتیجی اور اس کی کیلی کو چھوٹی کے سپرد کرتے اس کی طرف پلٹنا چاہتا تھا کہ بھتیجی بازو سے لٹک گئی۔؟

کہاں چلے چاچا۔! گل اغوا ہونے اور متواتر بردہ فروشوں میں بکتے انکشاف میں کھنچے وقت اور کابل کے مجاہدین کے خون ریز گروہوں کی آپس کی طوفان انگیز جنگ کی کہانی سے تھل گل رخ۔ اب لیور شہر میں پناہ گیر! آٹھ سال پرانی کھنڈلاوں سے آپ ہی کی حتمی درخواست میں ربی۔ سب بکھری گئے بجسم زدن میں ٹھریٹی زنجیروں میں مزین ملبوس فیروزوں کی لمبی سی اک تھتی والا شوکیس سے نکالی۔

چاچا کہیں نہیں جارہے، یہاں ہی حساب دار کے پاس جا رہے ہیں، وہ ان کی پہچان والا ہے۔! آپ یہ دیکھیے۔! اور بالا میں فیروزوں کی چمک دمک دونوں کو اپنے حصار میں کھینچ کرلے گئی۔! اسے آپ کمربند کے طور پر باندھیں یا گلے کے لیے اک چار یا پانچ لڑا ہار بنالیں۔ دونوں سہیلیوں کے ہاتھوں اور گلے کے بیچ ہار سے کھیلتے، دیکھتے ہی وہ مسلسل بولتے ہوئے اسے ملتے کھچے کا اشارہ کیا تو حساب دار کی جانب جاتے ہوئے گل کے آخری الفاظ دوری میں معدوم ہو گئے۔ ایسا کمال تحفہ زیور کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

لڑکیوں کی چہکاری جھرمٹ میں گھری میز کے گرد بچھی کرسیوں میں سے ایک پر کیشئیر کے پاس بیٹھی خریدار لڑکی جس کے سامنے میز پر پڑی اک منقش روبی قاب میں رکھے ہوئے زیور اور پتھروں کی بتائی گئی قیمت کی پرچی پر لکھی ہوئے قیمت با آواز بلند پڑھتے، قیمت وصول کرتے، زیور اور پتھروں کے ساتھ آئی خاتون سے پیک کروا کر کے کیش میمو کے ساتھ خریدار کے حوالے کر رہا تھا۔ وہ بے چ گل میز پر رکھے لیپ ٹاپ پر حساب میں مگن، باقی کی دونوں کرسیوں پر خریدار لڑکیاں اور ان کے ساتھ خریدا ہوا سامان پکڑے ساتھ آئی

عورتیں اور وہ خریداری کے جھنجھٹ کے چھٹنے کے انتظار میں دکان کی راہداری میں اُس کے شوروم کے ساتھ کھڑا میز کے گرد لگے عورتوں اور لڑکیوں کے ہجوم پر شست باندھے ہوئے تھا کہ آخری تین خریداروں اور اُن کے ہمراہیوں تک بات پہنچی ہی تھی کہ قوی ہیکل سادہ کپڑوں میں ملبوس، چادر کی بُکل مارے پہلے ایک، پھر کوئی دو تین منٹ کے وقفے سے دو چار اور پھر اگلے چار پانچ منٹوں میں ہی اُن کی تعداد چار ہو گئی۔ خریداروں کی کرسیاں خالی اور ہنگامہ چھٹنے پر وہ خالی کرسی کی طرف بڑھا ہی چاہتا تھا کہ اک پائیوں اُس کے روبرو آ کھڑا ہوا اُس نے پہلو بچا کر آگے بڑھنا چاہا تو وہ پائیوں فصیل بن کر تن گئے اور چاروں کے چہروں پر چھائی خشونت مگر پائیوں نے بہت ہی مہذب لہجے میں وہاں کھڑے ہو کر کیشیئر کو گھورنے کا سبب جاننا چاہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

میں؟ میں بھی خریدار ہوں، اور خالی کرسی پر بیٹھ کر بیبیوں کے آنے کا انتظار کروں گا!" اور انگلی سے چھوٹی کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں سے محافظ دستے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشاراتی بات ہوئی تو وہ معذرت کرتے بکھر گئے لیکن حساب دار کی مجبل مداخلت کے لیے تیار نظر آئی۔ کیشیئر کہیں اور منتقل ہو چکا تھا اور اُس کی دائیں کلائی ٹیبل پر بچھی ہوئی تھی اور دارا سے اُٹھے ہوئے ہاتھ پر چڑھے رومال سے بوندی کی نال جھلک رہی تھی اور وہ بے انتہا شاپ ٹاپ کو بند کیے چھوٹا سا ریوالور ہاتھ میں لیے، چوکس فصیل کے بکھرنے کی منتظر!

لیکن اُس پر نگاہ پڑتے ہی وہ بے قراری سے اُٹھی، اور اسی اضطراب میں ریوالور کو بھی بھول گئی کہ جس کی نال کا نشانہ اُس کے سینے کی جانب، اور اللہ کی قربت محسوس کرتے ہی اُس کی مسکراتی، آشنائی سے بھرپور آنکھیں متوجہ گئیں۔ آٹھ سال کی پرانی تصاویر کے علاوہ خال میں نئے رنگ چڑھنے نے اور اُک کو جھنجھوڑا اور وہ مضطرب اُسی لمحے میں کرسی پر گر پڑی۔ زخم خوردہ ہرگ اندر ہی اندر تڑپی مگر حجاب حلاوت چشم ہائے سیاہ گریہ نے میں مصروف گل رخ اُس کی بھتیجی اور تنکی کے پسندیدہ پتھروں اور زیورات کو سمیٹتے، اپنا شوکیس دوجی عورت کے حوالے کرتے، اُٹھی ہی تھی کہ حساب دار کی جانب کا ہنگام دیکھتے ہی وہ چلا اُٹھی اور منتاشا کو مخاطب کرتے صرف اتنا کہا، ؟

دلبر جانی! اور وہ چھوٹی کی بات سنتے ہی حیرانی سے شرابور رہ گئی اور ریوالور اپنے لبادے کی جیب میں ڈالتے، حساب دار کو بھی ریوالور سنبھالنے کے لیے کہتے پھر اُٹھی اور خوشی اور حیرت میں رقصاں آنکھوں نے شست باندھی اور وہ کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی مگر اجنبی عجب بیقرار بدن کا روں روں مچلتا سیماب، بات کرنے کو لرزاں ہونٹ مگر آواز موقوف کر چلنے میں پھیا ہم کلام ہو، دُکھ سکھ کا شریک، وہی تو سامنے موجود ہو گیا۔ لیکن اب دل کا بند در کیسے کھولے...؟ وہ بھی چپ ٹکٹکی باندھے اُس کی آنکھوں میں اُترا منتاشا کے اضطراب پر مسکراتے، پھولوں کی چھاؤں نچھاور کر رہا تھا۔ گل رخ پہلے ہی سب کچھ سمیٹے، بکی پیکنگ میں رکھتے، حساب دار کی میز پر پہنچی۔ اندر کی چلبلاہٹ اور بیتابی کو سمیٹے، اور ان دونوں کو آنکھوں کی بندش میں اک دوجے سے قریب انتظار میں پا شروع آٹھ سال کی منگنی، اندر ہی اندر کھاتی جلن کو طمانیت کی ٹھنڈک بخشتے دیکھا تو گل رخ کے اپنے اندر بھی چلبلاہٹ اور بیتابی ہم ساز ہے اور بھی مشکل گی اور پھر ان کی جانب چلی، اور ساتھ ہی اُس کی بھتیجی اور تنکی کی حیرانی کو طمانیت سے کھینچتی کھینچتی حساب دار کے پاس، اور سب کچھ اُس کے آگے پھیلاتے انگڑو سمجھاؤ میں کھل گئی۔ دھیان سے دیکھو یہ سارا کھاتا ہم دونوں بہنوں کا ہے۔ یہ ہماری ہی بھتیجی ہے!

اور حساب دار کی حیرت و استعجاب میں ڈوبی آنکھیں باری باری دونوں کے چہرے ٹٹولتے، منفعت بخشی کو بھولتے لاگت کے اعداد سے کھیلنے لگا لیکن بھتیجی کا لفظ اُن دونوں کو جھنجھوڑتے بیدار کر گیا۔ کھاتا اور بھتیجی تو اُس کی ذمہ داری ہے، وہ یک بارگی چونک اُٹھا!

نہیں نہیں، آغائے حساب دار، اس طوطی خوش الحان کی بات مت سُنیے، آپ پوری قیمت بتایئے، ادائیگی میری ذمے داری ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ یہ دونوں یہاں مل جائیں گی اور بڑی ہی مدھم سرسراتی آواز میں ساری بات مختار شاہ کے کانوں میں اُتار دی۔ جان ولم، مجھے تو تمہارا اور تمہاری دونوں بہنوں کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ سفارت کار اور ملازمین کے لشکر کو بھی کریدا نہیں جا سکتا تھا مگر میری تلاش کی پیاس کبھی نہ بجھی، اور بڑی جستجو کے بعد تمہارے ماموں اور کابل کے نواح میں تمہاری قیام گاہ کی خبر مہترانی سے ملی اور بس؟

وہ اپنے گھر والوں سے احوال دل پوشیدہ رکھتے، ملازمت کے بعد یہاں اور آئرلینڈ میں مختلف افغانیوں کے ہاتھوں اُن تینوں کی تلاش میں سرگرداں، بھٹکتا پھرتا رہا تھا مگر صرف ایک بار ایک شریف النفس غلزئی سردار، جس کا قبائلی علاقہ دریائے کابل کے جنوب میں کوہ سفید اور کوہ سلیمان کے بیچ میں تھا، وہ مجاہدوں کے کابل کو مقبوضہ بنانے والے تباہ کن تصادم اور اپنی بیماری کے معالجے کے لیے ڈاکٹروں اور ادویات نہ مل سکنے کے سبب، انتہائی کسمپرسی کے عالم میں آئرلینڈ میں اپنے ہی قبیلے کے ایک ڈاکٹر کے پاس پناہ لی تھی۔ اور وہی مریض مخلص علاج کے لیے اُس کے ذمے۔ سال بھر میں ہی وہ مکمل صحت یاب ہو گیا۔ ہم کار کے عزیز ہونے کے سبب نہ کوئی فیس اور گھر کے ساتھ گیسٹ ہاؤس بلکہ اشفاق کے لیے اک تعیناتی نرس اور تمام خوراک، ادویات کے اخراجات نہ لینے پر متعدد انکار۔ اُس کے شدید اصرار کے باوجود بھی جب کوئی پیسہ دھیلا نہ لیا گیا تو احسان مندی کے جذبے سے غلزئی رئیس اُس کی ہر خواہش پر اپنے آپ کو قربان کرنے پر مستعد دیکھتے ہی وہ اپنے راز کو پنہاں نہ رکھ پایا اور وہ بیماری اور گروہی جنگ میں موت سے بچتے بچاتے خبر نکال ہی لایا کہ گل رعنا کی طلاق پر اُس کا پدر بہم اپنے غیظ پر قابو نہ پاتے بیٹی سمیت اُس کے سُسرال اور اپنے ہم پلہ سردار کے ہاں جا پہنچا اور تیغ کلاہی کی انجانی بچی کہ بندوقیں نکل آئیں اور بیٹی، اُس کے ہمراہ آئے سارے محافظوں کے سنگ وہ بھی مارا گیا۔ اور ان ہی دنوں کابل اپنے تسلط میں لینے کے لیے انتہا پسند گروہوں میں شدید جنگ کے دنوں میں کسی گروہ کے جنگجوؤں نے اُن کا گھر بار لوٹتے محافظوں کو ختم کرتے محل نما مکان کو آگ لگاتے، گھر کی عورتوں کو ان دونوں کے ہمراہ اغوا کر کے بردہ فروشوں کو بیچ ڈالا اور پھر مختلف بردہ فروشوں کے ہاں بکتی رہیں۔ بڑی احتیاط اور باریک بینی کے ساتھ تین ماہ کی تمام تلاش میں اتنی ہی کھوج ملی کہ قادر خان اسمٰعیل کے منگر کے پاس لاہور یا اسلام آباد میں دونوں زندہ سلامت موجود ہیں اور وہ دل میں بچھے، جدائی کے زخموں سے بھرے بھیدوں کو اس کے سامنے کھولنے سے محجوب رہیں اک چاہت بھرے فقرے میں اُس کے دل پہ مرہم رکھتے اندر ہی اندر اُسے کلاوے میں بھر لیا۔ اب مل ہو تو؟ اور اس نے انگلی اٹھا کر کاش کے پھڑپھڑاتے ہونٹوں پر رکھ دی۔ کیا تم ہم دونوں بہنوں کو اپنے گھر لیجا سکتے ہو؟ ہاں ہاں، کیوں نہیں، زندگی بھر کے لیے۔ اچھا تو پھر اب چپ ہو جاؤ، میرا مالک آنے والا ہے۔ اُسی سے مول تول کے لیے مال بچا کر رکھو! اور بھتیجی کو بگھی سمیت ڈرائیور کی معیت میں گھر بھجوا کر وہ ملکیت کے دعویدار کا منتظر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر شام سارا کچھ سمیٹ کر تین گاڑیوں میں جانے لگا تو وہ دونوں ملنے کے لیے آئیں اور اُس کے گھر کا پتہ لیتے ہوئے، احتیاط ساتھ لوٹ گئیں کہ مالک نہیں آیا۔ اور کل گھر پر ہی رہنے کی تاکید کرتے وہ گاڑی میں سوار ہوتے سوگوار آنکھیں اُن کا جلوہ سمیٹے محافظوں کے پہرے میں لوٹ گئیں۔ یاد رہے، مالک کل شام چار بجے ضرور آئے گا!

اُس کے لیے رات انتظار کا پہاڑ بن گئی جسے کاٹنے کے سارے ہتھیار کند پڑ گئے۔ لے دے کر صرف کلاسیکل گائیکی اور کانوں پر چڑھے ہیڈ فون اور بالکنی میں آرام کرسی پر لیٹے آسمان پر چھپاں ستاروں کی نشست و برخاست میں یا ابھی نکلا رگی کہ فجر کی اذان کے ساتھ ہی

اُسے اکا دکا مسجد کو جاتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ اِسے تشویش تو ہوئی مگر وہ دم سادھے لیٹے لیٹے ہی دونوں کانوں کے ساتھ بنے ہوئے چھتے کیبنوں کے دیدبانوں سے باہر نگاہ مارتی چوکس سیکیورٹی دیکھتے ہی مطمئن، اپنے کانوں میں اترتے آہنگ سنگ پھر محوِ پرواز ہوگیا۔ دوسرے چوک کی مسجد سے جب نمازی فارغ ہوکر اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے تو کافی اُجالا نکل پڑا تھا اور اب باہر مین سڑک کے پہلو اور چھوٹی سڑک کے پار والے پارک میں ٹہلنے اور جاگنگ کرتے لوگوں کی بہت ہی مدہم باتوں کی ہمہماہٹ سے تازگی سی اُترنے لگی تھی۔ آزری تو بھی سانپ کروٹوں میں بیتائی اور مشغل کرتی بے چینی یک دم معدوم۔ اپنے ہی لان میں دس پندرہ منٹ ہلکی پھلکی ورزش کرنے کے بعد اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔ ناشتے کی ٹیبل پر اتنی جلدی پہنچ جانے پر تینوں کو ہی حیرت ہوئی۔ بھائی اور بھابھی نے تعجب سے باہم سوالیہ نظریں اُٹھائی تو وہ مسکرا دیا اور اس کی مسکراہٹ نے انہیں مبہوت کر ڈالا۔

چند لمحوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے جو اچھال چھت پڑا کیوں بھئی آج ہی کیوں ہم پر اتنی حیرتوں کی بمباری کر رہے ہو۔ خیر تو ہے؟ نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ا نہیں نہیں بھئی ہنستا مسکراتا اور وقت پر ہمارے ساتھ ناشتے کی ٹیبل پر آجاتا ہے۔؟ یہ سب کچھ تو حیرانی کے سمندر میں ہمیں غوطے کھلانے والی باتیں ہیں، اب اپنی اس نئی گرہ کو کھول دو۔'' اچھا تو سنیے۔ آج ہمیں افغانیوں سے کچھ خریدنے لگا ہوں۔ کیا؟؟ آخر ہمیں بھی تو پتہ چلے۔ لیکن بھتیجی ایلی چاچو پر بند نہ باندھ پائی، پہلے سے کھل کی پاپا میں بتاتی ہوں، آپ لوگ حیران نہ ہوں۔ بس مہمان کی آمد پر پذیرائی کی تیاری کریں۔ ا آخر کونسا مہمان۔؟ اس بات کا کوئی سر پیر بھی ہے یا آپ پہیلیاں میں بند کر رہے ہو۔ اور اس نے کل کے زیور اور پھر دا انگشت ٹیبل پر لگا دیے۔ میں تو پہلے ہی بتانے والی تھی، اسی لیے کل کے تحفے ساتھ لائی تھی مگر چاچا کے آنے سے بات کسی اور رخ پر چل نکلی۔ یہ دیکھیے۔ ا یہ سب میری چاچی نے پہلی ملاقات کا تحفہ دیا ہے۔ حیرت کا اک اور زنانا آیا اور تمام حواس کو جھنجھوڑتا نکل گیا بھابھی لاکٹ اور سلسلہ فیروزے کی تحریر میں مڑی لمبی مالا کو خوبصورت آنکھوں سے پرکھتی اب کچھ اپنے شوہر کی طرف بڑھا دیا۔ لاکٹ تو بلاشبہ بہت قدیمی ہے، یہ داغ لاجورد میں جڑا ہوا۔ بیچ لڑی مالا کے فیروزے نہایت ہی عمدہ اور نیلم کے دونوں نگینے بھی بہت ہی نایاب اور قیمتی ہیں۔ بھئی وہ کون اور کہاں ہے، اور خریداری کی کیا بات ہے۔ ذرا کچھ تو کھل کر بتاؤ کہ کیا ماجرا ہے۔؟

''بھائی آپ کو یاد ہوگا کہ اسلام آباد میں ایک افغانی سفارت کار اپنے اہل خانہ کے ساتھ آکر ٹھہرا تھا۔'' ہاں ہاں کچھ یاد ہے، کچھ مار پیٹ ہوئی تھی اور اس نے اگلے ہی دن اپنی بیوی کو کابل بھجوا دیا تھا۔ ماں کو تو مجبورانہ نے یہ ہی بتایا تھا۔ اُس کا باپ اور سفارت کار کی اہلیہ اور کچھ محافظ سفارت کار کے گھر میں تصادم میں مارے گئے اور یہ منجھلی اور چھوٹی دونوں بہنیں اغوا ہو گئی تھیں۔ تین جگہ مختلف عورتوں کے ساتھ بیچی گئیں۔ آج شام چار بجے جو افغانی آرہا ہے، یہ تو پتہ نہیں کہ وہ اغوا کنندہ ہے یا کہیں سے دونوں کو خریدا ہے مگر ہے وہ سمگلر ہی۔'' چلو کوئی بات نہیں اسے بھی دیکھ لیں گے۔ کچھ سیکیورٹی کا انتظام ہو جانا چاہیے گا۔ خیر یہ آپ کا شعبہ ہے مگر میرا خیال ہے کہ آج آپ میرے ساتھ ہی رہیں، اور زیادہ مناسب ہوگا کہ بھابھی اور بیٹی اپنے بھائی کے گھر چلی جائیں اور موبائل پر بے شک رابطہ رکھیں مگر کسی کو کچھ بتانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کچھ بھی بات اوپر نیچے نہیں ہوگی۔ فکر مت کریں وہ فروش کنندہ ہے اور ہم خریدار۔ او واہ کمال واہ آج تم نے دل خوش کر دیا اور سب شک و شبہات کو آگ دکھا دی، اب بالکل وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو اور اپنی بیوی اور بیٹی کی طرف چہرہ کرتے ہنس دیا۔ بھائی میرے چھوٹے بھائی کی شادی ہے، ذرا دھوم دھام سے دلہن کا ڈولا گھر میں آئے گا۔

سب انتظامات ویسے ہو گئے، جیسے اس کی خواہش تھی۔ چار بجے تک وہ انتظار کی گھڑیاں اندر ہی اندر گنتے انتہائی مضطرب رہا اور وہی کامل جو ساری رسم پرسی کو اپنی چپ کا قفل ڈالے، کبھی کسی کو ہوا بھر خبر نہیں لگنے دیتا تھا۔ وہی آج اپنی انتظار بے چینی کی ساری تپش کی ہر اک آنچ تک کو چھپانے سے قاصر۔ بھائی نے اُسے تسلی دیتے کھانے تک کھینچا اور جب دو لقمے لینے کے بعد ہاتھ کھینچا، بھائی مسکرایا۔ کیا تمہارے بھوکا رہنے سے گھڑی کی سوئیاں فوری چار بجا دیں گی اور مسکراتے ہوئے وہ بھائی کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا اور گھڑی کی سوئیاں چار بجنے تک وہ اُس کی دل جوئی کرتے تلاش کے سلسلے میں اس کی ساری کوششوں کو رپیٹ کرتا رہا۔ کلاک کی چار گھنٹیاں بجتے ہی وہ جھپاک اٹھا اور ٹیرس سے ہر آنے جانے والی گاڑی پر نظریں جما دیں اور اس کا بھائی اس کے درد کو گھٹے پیار سے اُس کا کندھا سہلاتا اُس کے ساتھ ہی جڑا رہا مگر جب وہ پانچ بجے تک بھی نہ آیا تو وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ دونوں بہنوں سے ان کے چاچا قادر خان کا موبائل نمبر ہی لے لیتا۔ جب بھائی نے اُس کا واویلا سنتے ہی ریسٹورانٹ والے ڈرائیور کو لبرٹی بھیجا۔ واپسی پر اس کی جھولی بھی خالی تھی۔ آج لبرٹی میں کسی بھی افغانی نے کوئی شوکیس نہیں لگایا تھا۔ دکانداروں نے تو انہیں سورہ ہے روز ہر اپنے فٹ پاتھ پر شوکیس لگانے کی اجازت دی ہوئی تھی اور سکیورٹی بھی ان کی اپنی ہی تھی مگر آج کی غیر حاضری کی وجہ اُسے بھی معلوم نہیں تھی۔ فرنیچر سروس والا بھی ان کی غیر حاضری پر حیران تھا۔ گشت والے سپاہی کو بھی جا پکڑا مگر اُسے بھی ان کا اتا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اسے دکھ تھا تو آج کا جتنہ مرنے پر۔!

وہ تین دن صبح سے شام تک ان کی تلاش میں سرگرداں، جس وقت بھی گھر لوٹتا انتہائی تھکا ہارا اور دل آزار۔ ان کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ جو اب بھائی بھی اس کے درد میں پوری طرح شریک ہو چکا تھا مختلف آشناؤں کو مختلف حوالوں سے دستک دے ڈالی۔ چوتھے روز رات کے کھانے پر کسی خفیہ محکمے کا کوئی بڑا، کسی بلند قامت مضبوط جثے والے خوش پوش افغانی کے ساتھ آیا جنرل گفتگو کرتے ڈائننگ ٹیبل پر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ وہ بھی آ گیا، سخت تھکا ہوا، مرجھایا ہوا۔ بھائی میں کل واپس جا۔ اس نے اُسے ٹوکا۔ یہ مہمان تم سے ہی ملنے آئے ہیں۔ تمہارے طغرائی رئیس کے ہی عزیز اور جڑواں بہنوں جات کے نواح میں رہتے ہیں۔ طغرائی کا حوالہ آتے ہی وہ بیدار ہو کے تن وتن سے متوجہ۔ ان کو بھی تمہارا مریض اور لاپتہ گان کی سلسلے میں کریدا چکا ہے، مگر بات نہیں کھولی تھی۔ جتنی مجھے پتہ تھی میں نے بتا دی۔ اور وہ اس کے بھائی کی بات کاٹتے ہوئے بول پڑا۔ میرا نام رحیم خان ہے اور میں سمگلنگ کے ہر شعبے کی اونچ نیچ سے آشنا ہوں اور آپ کے بھائی کے دوست کے احسان کا میں مقروض ہوں اور آج وہ قرض اتارنے کا موقع آپ نے دلا دیا۔ ویسے بھائی کے توسط سے میں بھی اب آپ کا دوست بھی بن چکا ہوں مگر میرا ایک بڑا واضح سوال ہے کہ کیا آپ کے دل میں ان لڑکیوں کے لیے کوئی جگہ ہے یا آپ کوئی پرانی دشمنی نکالنا چاہتے ہیں۔؟ اور کامل یک دم کھلکھلا کر ہنس دیا۔ نہیں میں بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں، کیونکہ جس زمانے سے آپ متلاشی ہیں۔ اس کی دوستی یا تمیں ہوتی ہیں۔

جی میں دونوں کو اپنے گھر کا فرد بنانا چاہتا ہوں اگر مل جائیں تو۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کس کے پاس ہیں، کیونکہ آپ بتا دیں گے تو شاید دو چار روز میں ہی کام بن جائے ورنہ تلاش میں کچھ وقت تو درکار ہوتا ہی ہے۔ جی۔ وہ قادر خان ہے لگتا تو وہ سگا ہی ہے، ہو سکتا ہے کہ بردہ فروشی بھی کرتا ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لبرٹی میں اس کی عورتیں اور چند محافظ افغانی سمگلڈ زیورات اور پتھر بیچتے ہیں۔ اور۔؟ اس نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹی۔؟ آپ کے بھائی کی بات سن کر مجھے صرف شبہ سا ہوا تھا مگر قادر خان کا نام سنتے ہی مجھے پتہ چل

کیا کیا آپ کن لڑکیوں کی بات کر رہے ہیں۔ آپ آنا جنت آور مرحوم کی بیٹیوں کی تلاش میں ہیں۔ مشہور تو یہ ہے کہ بڑی سے وہ شادی کر چکا ہے اور چھوٹی کے لیے کسی اچھے گاہک کی اسے تلاش ہے مگر بردہ فروش کے روبرو تو مال ہونا چاہیے۔ شادی بیاہ تو بس اک رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ میں وہ دونوں چاہتا ہوں۔۔۔ انھیں میں ہر قیمت پر لے آؤں گا۔ یہاں۔۔؟ یہاں اسی اسی گھر میں مگر۔۔؟ مگر میری بھی ایک شرط ہے۔۔؟ کہ آپ کوئی مال پانی کی بات نہیں کریں گے۔ ابے بھائی نے یک دم ٹوکا۔ رحیم خان، جو تمہارا خرچ آئے تو وہ تم لینے کے حقدار ہو۔ نہیں صاحب کے منہ میں ہاتھ ڈالنے والا کسی مال پانی کا محتاج نہیں رہتا۔ مال پیدا کرنے کے میرے پاس ہزاروں راستے ہیں۔ لیکن۔۔؟ احسان کا بدلہ احسان کے ترازو میں تل کر ہی سر سے اترتا ہے۔ اور پیسے سے نہیں اترتا اور۔۔؟ اور کی آخری بات لالہ۔۔؟ لڑکے والے جو دیتے ہیں۔۔۔وہ۔۔؟ وہ سب کچھ لڑکی کو دیتے ہیں۔۔! لڑکی والوں کو کچھ نہیں۔۔!

◆◆◆

افسانچہ

بے زبان

خاقان ساجد

نماز فجر کی امامت اور تلاوت کے بعد مولوی صاحب تسبیح پھیرتے صبح کی سیر کو نکلے۔ گاؤں کے آخری سرے پر جیدے کمہار کی آوی کے سامنے پہنچ کر دائیں مڑے اور چودھری نذیر کی حویلی کے قریب نہر کی پلی پر بیٹھ کر وظیفہ "ربالفوف سلطانا وکانا" پڑھنے لگے۔ وہ آج کل چودھری نذیر کے زیر عتاب تھے۔ وہ زیر دستوں کے لیے زرا فرعون تھا۔ سورج طلوع ہونے والا تھا۔ مشرقی افق پر اجالا پھیل رہا تھا۔ ابھی وظیفہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ انہیں دور سے چودھری کا دو چیر منشی عبدالمنان موٹر سائیکل پر اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ مولوی صاحب کا دل زور سے دھڑکا، جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو۔ "سلام علیکم مولوی جی"۔ وہ ان کے پاس آ کر رکا۔ "چودھرانی نے نیاز دی ہے۔ زردے کی دیگ پکی ہے۔ حوالی ہے۔ آپ تھوڑی دیر تک حویلی آ جائیں، دعا پڑھنے۔۔۔" "آیا جی آیا۔۔۔" مولوی صاحب کا اختلاج قلب رفع ہو گیا۔ زردے کا سن کر چہرے پر رونق آ گئی۔ پیغام دے کر منشی واپس چلا گیا تو مولوی صاحب اٹھ کر جیدے کمہار کی آوی کی طرف بڑھے۔ اس کا چھوٹا لڑکا رمضو جو ان سے سیپارہ پڑھتا تھا، ڈنڈے سے اپنے لاغر گدھے کو بڑی بے دردی سے پیٹ رہا تھا۔ "کیوں مار رہے ہو بے زبان کو؟" انہوں نے سرزنش کی۔ "استاد جی۔ یہ رات میں منہ مار کر سارا آٹا کھا گیا ہے، گوندھا ہوا۔۔۔ اب ہم کیا کھائیں گے اس کا سر؟" "چل چھوڑ، بھوکا ہے، شہرے کو بھوک لگی ہوگی۔ اب جان لے گا بے زبان کی؟ اسے چھوڑ دے۔ میرے ساتھ حویلی چل۔ چودھرانی نے نیاز بانٹی ہے زردے کی۔ گھر سے دو کوری کنالیاں لے آ۔۔۔ ایک اپنے لیے، ایک میرے گھر کے لیے۔۔۔" خوشی سے نہال رمضو گدھے کی جان بخشی کر کے کنالیاں لینے دوڑا۔ استاد شاگرد دونوں حویلی کی جانب چل دیے۔ راستے میں رمضو نے پوچھا:

"استاد جی، گدھا بے زبان کیسے ہے۔ اس کی تو اتنی لمبی زبان ہے منہ میں"۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے۔ "جانوروں کو بے زبان اس لیے نہیں کہتے کہ ان کے منہ میں زبان نہیں ہوتی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ ظالم کے سامنے بول نہیں سکتے۔ ظلم پر احتجاج نہیں کر سکتے۔۔۔"

رمضو سوچنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد بولا: "استاد جی! جو بندہ کسی ظالم کے سامنے نہیں بولتا، کیا اسے بھی بے زبان کہتے ہیں؟" مولوی صاحب سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ بات بدلنے کو بولے۔ "تیرا ابا بیمار تھا۔ اب وہ کیسا ہے؟"

لڑکی اور کرونا

عطیہ سید

مختصر تعارف

عطیہ سید 1980ء کی دہائی میں منظر پر اُبھرنے والی ایک منفرد فکشن نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوعات اور خوبصورت انداز بیاں سے دنیائے ادب میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے۔ اب تک ان کے افسانوں کے تین مجموعے اور ایک ناول شائع ہو چکا ہے۔ ''شہر ہول''، ''حکایت جنوں''، ''وحشت''، ''بارش اور غبار''۔ ناول ''شہر ہول'' کو 1995ء میں ہیرالڈ (کراچی) نے Favourite Fiction of the Year قرار دیا۔ ان کے افسانوں کے غیر ملکی زبانوں میں بھی تراجم ہو چکے ہیں۔

نرگس نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور دیکھتی ہی چلی گئی۔ یہ جسمانی خود بینی اس کا محبوب مشغلہ تھا اور سہیلیاں لینا بھی۔

اس وقت بھی اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا اور داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ رنگے ہوئے سنہری بال جو بالوں کی ایکسٹینشن کے ذریعے قدرے لمبے دکھائی دیتے تھے، کھلتی ہوئی رنگت، متناسب نقوش، لمبا قد۔ یہ سچ تھا اس کا جسم فربہی مائل تھا اور کئی حصوں پر ضرورت سے زیادہ گوشت تھا اور اسی لیے وہ اپنے وزن کے بارے میں حساس تھی اور عنفوانِ شباب سے بہت کم کھاتی تھی۔ دن میں صبح صرف چائے کی پیالی، دوپہر میں صرف جوس اور ایک سلائس (Slice) اور رات کو آدھی چپاتی اور برائے نام سالن۔ وہ دن بھر وقفے وقفے سے قہوہ، چائے اور کافی پیتی تھی، لیکن بنا چینی اور دودھ کے تاکہ جسم کی بے جا چربی پگھل جائے۔ مگر اسے تو سادہ پانی بھی سیراب کرتا تھا——— کیلوریز تھیں کہ یکدم پھولتی پھلتی تھیں۔ بہرحال اس نظام ِ ضبط سے اس نے جسم کے منظم تیز پھیلاؤ پر تو کسی حد تک قابو پایا——— لیکن غذا کی کمی سے فشارِ خون (بلڈ پریشر) مستقل طور پر کم ہو گیا جس کے باعث اس پر سستی اور نیند کا غلبہ رہنے لگا۔

نرگس کو کسی گھریلو یا دفتری کام سے دلچسپی نہیں تھی——— سوائے بننے سنورنے کے۔ اس کا گھر کی صفائی ستھرائی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، نہ کھانا بنانے سے——— خود تو کھاتی نہیں، دوسروں کی بھوک کا احساس نہیں تھا۔ البتہ جلد کے لیے طرح طرح کے نسخے اور ٹوٹکے..... نت نئے——— اِدھر اُدھر سے جمع کر کے ان کو آزمانے میں مستعدی——— اور چستی نظر آتی تھی۔ شاید کسی نے بتایا کہ گوار گندل سے جلد نفیس ہو جاتی ہے——— اور پھر کیا تھا ٹومب ریڈرز (Tomb Raiders) کی طرح ساری نرسریاں اور باغ چھان مارے۔ آنکھوں کی بینائی کی درستگی کے لیے کھلوں بند آنکھوں کے پپوٹوں پر کھیرے کے قتلے رکھے جاتے تھے۔ یوگا کا سنا تو جسمانی فٹنس (Fitness) کے لیے اس کے پس منظر کے عقیدے اور فلسفے کو جانے بغیر یوں——— آلتی پالتی مارے زمین پر پوز بنا کے بیٹھے رہے۔

نرگس کا سانس، شاید زیادہ وزن کے باعث پھول رہا تھا یا کسی اعصابی دباؤ کے باعث، مگر اس امریکی طبی تحقیق یا ڈاکٹر سے مشورہ کیے بغیر یوگا کا سہارا لے لیا، کیوں کہ طبقۂ اعلیٰ کی بیگمات کے حلقوں میں اس کی پذیرائی تھی امریکہ کے ثقافتی غلبے کے سبب ویسے بھی اسے مقابلۂ حُسن کے علاوہ اسے اعلیٰ طبقات سے مطابقت اور ان کے اندازِ حیات اپنانے کی شدید آرزو تھی۔ اسی لیے وہ کہتی تھی کہ مجھے اردو نہیں آتی اور بولنے بھی تو یوں کہ سو فی صد انگریزی کے الفاظ اور بیچ میں اردو کے چند نام انگریزی لفظوں کو جوڑنے کے لیے اس زبان کو کیا کہا جائے سوائے منگلش (Minglish) کے۔ وہ کیوں ایسا کرتی تھی، کیوں کہ اعلیٰ طبقہ اردو سے لاواقفیت کو باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ اس کو سارا وقت فیس بک دیکھنے اور خصوصاً مشہور ریٹائرڈ اشخاص کے فیس بک اکاؤنٹس دیکھنے کا کریز (Craze) تھا، بلکہ ایک نشہ تھا جس کی وہ بُری طرح سے عادی ہو چکی تھی۔ حسین دکھائی دینے کے علاوہ اس کا دوسرا جنون یہی تھا کہ وہ مشاہیر وادیوں کے خاندانوں، ان کی بیگمات، بہن بھائیوں اور بیٹوں بیٹیوں کے مشاغل، مصروفیات اور سکینڈلز کی تمام تر تفصیلات جان سکے یعنی وہ ان موضوعات پر ایک مکمل انسائیکلوپیڈیا تھی۔

نرگس نے فیس بک پر ایسی لڑکیوں سے بھی دوستی کی کوشش کی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ معاشرہ تو انھیں ان کے طبقاتی فرق کو بھی برداشت نہیں کرتا، چہ جائے کہ رام گلی یا شاہ کی بستی والوں سے رابطہ یا دوستی۔ بہرحال نرگس کی دنیا تو وہی تھی ـــ یعنی امراء کے فیشن، انداز اور سکینڈل فالو (Follow) کرتی اور ایک رومانوی دنیا میں بستی تھی۔ ایک دو بار اس نے ٹی وی کی دنیا میں بھی داخل ہونے کی کوشش کی ـــ لیکن دال نہ گلی۔ ویسے وہاں چند دن کے لیے اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ جس دنیا کے خواب دیکھتی تھی وہ سچ مچ وہاں موجود ہے، جیسے جہاز تصویر میں نہ ہو واقعی سمندر میں چلنے لگا ہو یا سنڈریلا کو شہزادے کے ساتھ رقص کرنے کا موقع مل گیا ہو اگرچہ چند گھنٹوں کے لیے۔ نرگس ثمینہ کی کزن کی بیٹی تھی اور ثمینہ سے متاثر بھی تھی۔ ثمینہ کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ Lady of Shakott ہو جو صرف آئینوں میں اپنا عکس دیکھتی ہو اور خوابوں میں سانس لیتی ہو ـــ اور جس دن اس نے کھڑکی سے باہر دیکھ لیا تو تمام آئینے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ پھر ایک دن اچانک اس کی خوبصورت دنیا میں بدصورت کرونا آن دھمکا ـــ اور نوجوان ہونے کے باوجود نرگس کو اندیشوں نے گھیر لیا، حالاں کہ ڈاکٹر بتا رہے تھے ـــ دنیا بھر میں کرونا زیادہ خطرہ کمزور صحت اور بڑی عمر والوں کو ہے ـــ مگر ان معلومات کے باوجود نرگس کے ذہن میں اندیشوں کے جزیرے پھوٹنے لگے۔ جوں جوں دنیا کے چاروں کونوں سے وبا کے پھیلاؤ کی خبریں آ رہی تھیں، اس کے ذہن میں اندیشوں کے جزیرے پھیلنے پھولنے لگے۔ کسی کرونا کے مریض کا اس کے یا کسی مریض کے مرنے کی خبر اس پر لرزہ طاری کر دیتی تھی چاہے وہ سات سمندر پار کسی اجنبی کی موت ہو۔ موت، اموات ـــ نہیں...... ابھی نہیں۔

وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتی ـــ اپنا حُسن ـــ اور افسردہ ہو جاتی۔ "ثمینہ خالہ! یہ حسن انسان کو اداس کیوں کر دیتا ہے؟"

ثمینہ ہنس کر بولی۔ "نرگس ایک یونانی فلسفی تو کہتا ہے کہ انسانی روح اس دنیا میں آنے سے پہلے دنیائے امثال کی باسی تھی جہاں ہر چیز مکمل اور کامل تھی...... اور اس لحاظ سے حسین تھی۔ روح کو جب ایک دنیا یعنی ہماری دنیا میں آنا پڑا جو نامکمل اور ناقص تو وہ بھی کیوں، لیکن اب بھی جہاں اسے مکمل حسن دکھائی دیتا ہے تو اسے دنیائے امثال یعنی حیاتِ حسن و کاملیت کی یاد ستانے لگتی ہے اور وہ اداس ہو جاتی ہے۔"

نرگس کو شیزہ کی بات بہت ہی ماورائی اور خیالی محسوس ہوئی...... یہ بات اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس رات جب سب گھوڑے بیچ کر سو گئے اس نے اپنے رنگے ہوئے سنہری بال شیمپو سے دھوئے، بعد میں استری کر کے سیدھے کیے کہ اسے اپنے قدرتی گھونگھریلے بال پسند نہیں تھے۔ ہیئر اینڈ لولی فیس واش کے استعمال کے بعد اپنی رنگت نکھاری، آئی لائنر (Eyeliner) اور مسکارے سے آنکھیں خوبصورت بنائیں، بلیک سلاکس (Slaks) کے ساتھ میرون بلاک پرنٹ کا بلاؤز پہنا اور اونچی ایڑھی والی جوتی، تو چاند جو بنا یہ تھا۔ اس نے پہلے برقی قمقموں کی چکا چوند کر دینے والی روشنی میں اور بعد میں بیڈ سائیڈ ٹیبل کی سافٹ لائٹ میں اپنا سراپا دیکھا تو غیر متناسب جسم کا تناسب بھی دلکش محسوس ہوا..... اور وہ اپنے ہی جمال سے مسحور ہو گئی۔ اسی وقت نظارہ ٹی وی سے خبریں نشر ہو رہی تھیں کہ دنیا کے مختلف ممالک میں کرونا کی وبا پھیل چکی ہے جس کا فی الحال کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا۔ ہر عمر کے لوگ سینکڑوں کی تعداد میں دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں...... خصوصاً چین، امریکہ، برازیل، انگلستان اور ایران میں۔ "ایران...... ایران تو ہمارا ہمسایہ ہے..... سرحد سے سرحد جڑی ہے۔" اس کے اندیشے درست ثابت ہوئے کہ انہی خبروں کے آخر میں بتایا گیا کہ یہ بلا افغانستان کے راستے پاکستان میں داخل ہو چکی ہے۔ نرگس کے ذہن میں اندیشوں کے جڑے وال تن کر لہرانے لگے۔ کرونا کے مریضوں کا احوال پی ٹی وی سے کتنی تفصیل اور درد سے بیان ہو رہا تھا۔ نرگس کو یوں محسوس ہوا کہ تاریک سایوں نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا۔

اس نے چودھویں کے چاند کا روپ دیکھا...... آئینے میں اپنے دلکش سراپا اور غیر متناسب مگر بے سروپا تناسب اعضا کا جائزہ لیا تو بے اختیار اس کے لبوں سے آہ نکلی۔ اسے کسی مثالی دنیا کی یاد نہیں آئی...... ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس کے دل میں ٹیس اٹھی...... "اب کوئی حسن پرست...... کوئی شہزادہ نہیں آئے گا..... اور اس کا یہ بے پناہ حسن رائیگاں جائے گا..... اس کا سراپا کون سراہے گا...... کوئی نہیں...... موت کتنی تیزی سے اپنے امکان کو بڑھا رہی ہے..... اس کا وجود مٹی میں مل جائے گا اور اس کا انگ انگ اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت کسی آئسولیشن وارڈ کی نذر ہو جائے گا۔ یہ تمام لوگ جو اس وقت زمین کے سینے پر چل پھر رہے ہیں..... زمین دوز ہو جائیں گے..... اور اس کا حسن جو قدرت کی صناعی کا شاہکار ہے..... وہ بھی۔ لاک ڈاؤن سخت سے سخت تر..... آئسولیشن..... سماجی فاصلے جو بڑھ رہے ہیں...... اب یہاں کون آئے گا اور کیسے آئے گا..... اسے سراہنے کے لیے..... خاک میں مل جائیں گے ان کو خبر ہونے تک..... اور اپنے حسن بے مثال کو دیکھ کر بے اختیار نرگس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے..... فرش پر جہاں ایک اور آئینہ بن گیا جس میں ہر عکس گدلا تھا۔

◆◆◆

جب جاپان میں سونامی آیا اور بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی تو بی بی سی نے ایک چھوٹا سا کلپ نشر کیا تھا۔ ایک بوڑھی جاپانی عورت پر جو وہاں بیٹھ کر الیکٹرک کا سامان بیچ رہی تھی جب نمائندے نے اس سے ریٹ پوچھا تو حیران رہ گیا کہ اس کی پراڈکٹ کا ریٹ مارکیٹ ریٹ سے بہت کم تھا۔ اس نے وجہ پوچھی۔ اس عمر رسیدہ عورت نے بتایا کہ "میں مارکیٹ جا کر ہول سیل پر سامان خرید لاتی ہوں اور اسی ریٹ پر میں وہی سامان اپنے مصیبت زدہ لوگوں کو بیچتی ہوں۔ نمائندے نے پوچھا کہ تم اس پر اپنا معاوضہ کیوں نہیں رکھتیں؟" تو اس بوڑھی عورت نے جواب دیا کہ "میں اپنی قوم کی مصیبت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتی۔ میں اپنے حصے کا شکر ادا کر رہی ہوں۔ (لطیف ابو ایم)

صبرِ جمیل

اختر سعید مدان

مختصر تعارف

اختر سعید مدان 12 نومبر کو ننکانہ صاحب میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے شائع ہونے والے رسالے "سیارہ ڈائجسٹ" میں ان کا پہلا افسانہ 1983ء میں شائع ہوا۔ اب تک ان کے 3 افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "سمندر میں بارش"، "جنگلی ہوا" اور "سوتیلے لوگ"۔ اس کے علاوہ ایک ناول "کوئی خریدار نہیں" ایک افسانے اور ناولٹ کی کتاب "شب بے سحر" زیرِ طبع ہے۔ "تخلیق" میں یہ دوسرا افسانہ شائع ہو رہا ہے۔

مرکزی لاؤنج میں پہنچ کر بیگم آصف ایک وقار اور تمکنت کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی صوفہ بج گیا بلکہ بھر سا گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صوفہ پہلے سے موجود تھا مگر اس کی موجودگی کا کسی کو احساس نہ تھا۔ جیسے وہ ایک بانجھ عورت کی طرح خالی گود لیے بیگم آصف کا ہی منتظر تھا۔ بیگم آصف کے بغیر بھرا پُرا گھر خالی خالی سا لگتا۔ جیسے کوئی اجاڑ حویلی یا کوئی سونا محل ___ جیسے ملکہ کے بغیر کوئی محل سرا اور اس کے آتے ہی گھر مکمل ہو جاتا۔ بیگم آصف نے ایک باوقار ملکہ کی طرح بوجھل پلکیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ کھڑکی کے بھاری بھرکم دبیز پردوں کے درمیان نکلی ہوئی مانگ میں سے ابتدائی دنوں کا چاند کسی فنکار کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح گرمیوں کی اوس ہوئی گہری شام میں لٹکا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی۔ آسمان صاف تھا۔ چاند کے گرد پھیلتی ہوئی روشنی اداس تھی۔ بیگم آصف لمحوں تک اس نظارے کو مبہوت بیٹھی دیکھتی رہی، پھر اپنے آپ میں لوٹ آئی۔ دائیں دیوار پر لگی وینس کی بھاری تصویر میں فنکارانہ انداز میں نصب کلاک شام کے آٹھ سے چند منٹ اوپر کا وقت ظاہر کر رہا تھا۔ بیگم آصف کی دونوں بیٹیاں آسیہ اور لائبہ سامنے کھڑی بیگم آصف کے حکم کی منتظر تھیں۔ بیگم آصف چند ایک لمحے سوچتی رہی پھر اپنی چھوٹی بیٹی آسیہ سے مخاطب ہوئی۔ "ماں سے کہو کہ جو تھوڑے بہت کپڑے دھلنے والے رہ گئے ہیں... وہ ابھی دھو لے۔ تھوڑی دیر میں آصف بھی پہنچنے والے ہیں۔ انہیں کچھ دیر آرام کرنا ہے اور پھر چینج کر کے پرل کانٹی نینٹل جانا ہے، کسی اہم میٹنگ کے لیے ___ اس سے کہنا کہ ساتھ اپنی بیٹی کو بھی لگا لے بلکہ اسے یہاں بلاؤ میں خود بات کرتی ہوں اس سے ___!!"

آسیہ خاموشی سے ملازموں والے کوارٹروں کی طرف چلی گئی۔ ایک لمحے بعد بیگم آصف نے چاروں طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور جیسے خود سے مخاطب ہوئی۔ "سارے شوخ رنگ کے پردے لٹک رہے ہیں۔ یہ بھی تبدیل کروا کر سفید حریری لگوا لینے چاہئیں ___ اور لائبہ ___ تم ڈرائیور سے کہو کہ گاڑی نکالے۔" "مگر مم..... ڈرائیور تو چلا گیا ہے!" لائبہ نے اپنی ماں کو یاد دلایا۔ "اوہو ___ اسے بھی آج ہی جلد چھٹی کرنا تھی۔ خیر تم گاڑی نکالو ___" "مم ___ میرا خیال ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ نہ ہی جاؤں تو اچھا ہے۔" لائبہ نے اپنی رائے

دی۔" "کیوں ۔۔۔!!" بیگم آصف کی حاکمانہ حس بیدار ہو گئی۔ "اماں گھر میں اکیلی ہوں گی ۔۔۔ ویسے بھی میں اپنی نگرانی میں اس سے کام کروا لوں گی۔" "کیا اماں پہلے کبھی گھر میں اکیلی نہیں رہی ۔۔۔؟ اور تم نے اپنے ہاتھ اور گردن دیکھی ہے؟ کتنی کالی ہو رہی ہے؟ تمہاری ایڑیاں اور کہنیاں بھی میل سے سیاہ ہو گئی ہیں۔ تم اپنا خیال کیوں نہیں کرتی ہو ۔۔۔؟ انگیج ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے آپ سے ہی لاتعلق ہو جاؤ ۔۔۔!!" "مم ۔۔۔ مگر ۔۔۔" لائبہ نے ہلکا سا احتجاج کیا۔ "مگر وگر کچھ نہیں۔ چلو جا کر گاڑی نکالو" بیگم آصف دھیرے دھیرے اپنی جبروتیت اور قہاریت میں واپس آ رہی تھی۔ ۔۔۔ بیگم آصف ایک شاندار عورت تھی ۔۔۔ وہ اونچے قد کاٹھ اور فربہی مائل جسم سے بھی کوئی حکمران لگتی تھی، لیکن باطن نہایت سمجھدار اور رقیق القلب واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر اور بچوں کے لئے ایک سائبان تھی۔ وہ بچی تھی تو نہایت معصوم اور کسی کھلونے کی مانند معلوم ہوتی تھی۔ جوان ہوئی تو ہلکا سا فربہی مائل جسم کسی سنگتراش کے فن کا نمونہ نظر آتی تھی۔ جسمانی وجاہت کی بنا پر اس کا حسن ایک مثالیہ تھا۔ اس کے تیکھے نقش تصوراتی محسوس ہوتے تھے۔ پہلا بچہ ہوا تو اس کا بدن مزید گندھ گیا۔ دوسرے اور پھر تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد وہ سراپا ماں دکھائی دیتی تھی۔ ایک مکمل ماں، کسی پھل دار چھتنار پیڑ کے مانند، سکھی اور خوشبودار چھاؤں والی ایک ایسی عورت جس کو دیکھ انسان کے اندر مقدس جذبات جاگ اٹھتے تھے۔ اس کی کسی بات سے اختلاف کے باوجود بھی انسان انکار کی سکت نہیں پاتا تھا۔ اولاد جوان ہوئی تو اس کی صفات دن بدن دو چند ہوتی گئیں۔ اس کے تیور اور لہجہ دیکھ کر اس کے حکم سے انحراف کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ اولاد تو ایک طرف خود میاں آصف بھی بیگم آصف کے آگے پر مارنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اس کا ہر فیصلہ آنکھ بند کر کے تسلیم کر لیتا تھا۔ اس لمحے لائبہ نا چاہتے ہوئے بھی گاڑی نکالنے کے لئے باہر چلی گئی۔ یکدم جیسے بیگم آصف کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے موبائل سے اپنے بیٹے میاں قیصر کا نمبر ملایا۔ "ہیلو ۔۔۔ قیصر ۔۔۔ کہاں ہو اس وقت؟" "مم ۔۔۔ میں اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ تھیٹر میں ڈرامہ دیکھنے جا رہا ہوں۔" میاں قیصر نے جواب دیا۔ "کیا یہ پروگرام کینسل نہیں ہو سکتا ۔۔۔؟" بیگم آصف نے پوچھا۔ "او ۔۔۔ نو ماما ۔۔۔ ہم سب اچھے موڈ میں ہیں۔ کافی دنوں کے بعد ہم سبھی دوست اکٹھے ہوئے ہیں ۔۔۔ پلیز ماما ۔۔۔!" "اچھا ۔۔۔ تو کب تک واپسی ہوگی؟" بیگم آصف نے رعب دار مخصوص بھاری بھرکم لہجے میں پوچھا۔ "مم ۔۔۔ ڈرامے کے بعد ڈنر تو بہر حال کرنا ہوگا۔ کیوں خیر تو ہے؟" "ہاں خیر ہے ۔۔۔ رات دو بجے سے پہلے آ جانا ۔۔۔" بیگم آصف کا لہجہ حتمی تھا۔ "کوشش کروں گا ۔۔۔" "کوشش نہیں ۔۔۔ احمق بچے جب میں کہہ رہی ہوں تو تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا ۔۔۔!!" اس کا لہجہ کرخت ہوتا جا رہا تھا۔ "او کے ۔۔۔ ماما" میاں قیصر نے ہار مان کر جان چھڑائی۔ اس اثناء میں گھر میں کام کرنے والی اماں آ گئی تھی۔ بیگم آصف نے اماں کو سارا کام سمجھایا اور آسیہ کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اتنی دیر میں لائبہ گاڑی نکال چکی تھی۔ بیگم آصف ایک کروفر کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ آسیہ اپنی ماں کے اشارے کی منتظر تھی۔ وہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ بیگم آصف نے ڈرائیونگ سیٹ پر حکم کی منتظر لائبہ کو دیکھا۔ "لبرٹی چلو ۔۔۔" لائبہ نے آہستہ سے گاڑی بڑھا دی۔ لبرٹی پہنچ کر بیگم آصف نے دونوں لڑکیوں کو "میری بیوٹی پارلر" کے سامنے اتارتے ہوئے کہا۔ "میری سیٹ بھی رکھنا ۔۔۔ اور دیکھو اپنا حلیہ درست کروانا ۔۔۔ گہرا میک اپ نہ ہو ۔۔۔ لپ اسٹک کا شیڈ بھی ہلکا رکھوانا ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ میں آؤں اور تم بھوتنیاں بن کر بیٹھی ہوئی ہو۔ میں ابھی کچھ دیر میں آتی ہوں۔" بیگم آصف نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور چل دی۔ اس نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی نہیں کی بلکہ "نیو فیشن کلاتھ ہاؤس" کے سامنے جا روکی۔ دکان کے مالک نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ اپنی مستقل گاہک کا استقبال کیا۔ مگر بیگم آصف اس کو

نظر انداز کرتے ہوئے سیدھی سیل کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ سیل بوائے اس کا جانا پہچانا تھا۔ اس کا نام سلیم تھا۔ وہ اس وقت کسی دوسری عورت کو کپڑے دکھا رہا تھا۔ اس نے بیگم آصف کو فرشی سلام کیا۔ "آپی ۔۔۔ آپ کیسی ہیں ۔۔۔؟ کیا لیں گی؟" "نہیں ۔۔۔ کچھ نہیں ۔۔۔!!" بیگم آصف نے بردباری سے کہا۔ منع کرنے کے باوجود سلیم نے کوک منگوا لیا۔ "آپ تھوڑا انتظار کریں گی یا میں اصغر سے کہوں ۔۔۔ آپ ادھر آ جائیں۔" اس نے ساتھی سیل مین کی طرف اشارہ کیا۔ "نہیں ۔۔۔ میں انتظار کرتی ہوں۔" بیگم آصف نے کسی دوسرے لڑکے کے پاس جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بوتل پینے لگی۔ اس کے اعصاب پُرسکون ہونے لگے۔ وہ سلیم کی پکی گاہک تھی۔ سلیم کو اچھی طرح پتہ تھا کہ بیگم کس طرح فراخ دلی سے خریداری کرتی ہے اور اس کی کمیشن کتنی بنتی ہے! اس نے جلدی جلدی عورت کو فارغ کیا اور دوسرے لڑکے کو تھان لپیٹنے کا کہہ کر بیگم آصف کی طرف متوجہ ہوا۔ "جی ۔۔۔ آپی ۔۔۔ کچھ اور منگواؤں؟" "نہیں ۔۔۔ آج مجھے کچھ صوفیانے سے کپڑے چاہئیں ۔۔۔ ہلکے رنگوں کے ۔۔۔"

بیگم آصف کا اتنا کہنا تھا کہ سلیم نے پلک جھپکتے ہی اس کی پسند اور ضرورت کے مطابق تھانوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اس کو کپڑے منتخب کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ اس نے کل بارہ سوٹ اتروائے۔ کپڑے لینے کے بعد اس نے کریڈٹ کارڈ دیا۔ دکاندار نے پیسے کاٹے اور شکریہ ادا کیا۔ بیگم میاں آصف کپڑے لے کر اپنے مخصوص درزی کی دکان پر پہنچی۔ اسے کپڑے دیے۔ تینوں ماں بیٹیوں کے ماپ پہلے درزی کے پاس تھے۔ درزی بھی اس کے لیے ٹھنڈا منگوانا چاہتا تھا۔ مگر بیگم نے سختی سے منع کر دیا۔ درزی نے تابعداری سے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ آپ کو کپڑے کب چاہئیں ۔۔۔؟" "کوئی چار گھنٹے بعد ۔۔۔" بیگم آصف نے تحکمیہ لہجے میں کہا۔ "بیگم صاحب ۔۔۔ چار دن تو بہت تھوڑے ہیں۔ پہلے ہی کام کا بہت دباؤ ہے۔" درزی نے عذر پیش کیا۔ "میں نے چار دن نہیں ۔۔۔ چار گھنٹے بعد کہا ہے۔" بیگم آصف نے وضاحت کی۔ "جی ۔۔۔ جی چار گھنٹے بعد کیسے ممکن ہے ۔۔۔؟" درزی نے حیرت سے کہا۔ "کیوں ممکن نہیں ۔۔۔؟" بیگم آصف نے پُروقار اور سخت لہجے میں کہا۔ "ان میں سے یہ تین سوٹ لازمی چار گھنٹے بعد مجھے مل جانے چاہئیں۔" اس نے کپڑوں میں سے تین سوٹ الگ کر دیے۔ "جی ۔۔۔ جی ۔۔۔ ٹھیک ہے" درزی ایک لمحے میں مان گیا۔ وہ بیگم آصف کی شخصیت کے جادو کے زیرِ اثر آ چکا تھا۔ اسے ابھی لگا کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ "سب کام چھوڑ دو۔ کوئی چار گھنٹے بعد میں آؤں گی ۔۔۔ کپڑے لینے۔" اس نے اپنی بھاری بھرکم کلائی پر بندھی قیمتی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "اس وقت کوئی ساڑھے دو ہوئے ہیں۔ میں رات ڈیڑھ بجے آؤں گی۔"

"جی ۔۔۔ بالکل ٹھیک ۔۔۔!!" "جی ۔۔۔ اچھا" وہ کھسیا سا گیا۔ دکان میں موجود کاریگر کے عجیب سی نظروں سے اپنے استاد اور بیگم آصف کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر بیگم آصف گاڑی لے کر "میری گولڈ بیوٹی پارلر" کی طرف بڑھی اور گاڑی پارلر کے باہر پارک کر کے خود اندر گھس گئی۔

☆☆☆

پرل کانٹی نینٹل کے بکس "میپل ہال" میں کیف آگیں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہال میں لگی میزوں پر الگ سے برقی شمعیں بھی روشن تھیں۔ ہال میں ایک خوشبو سی ہوئی تھی، ایک مقدس درباری مہک ۔۔۔ ہال میں قدم رکھتے ہی ماحول انسان کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور انسان کی چال ڈھال میں بے اختیار نفاست اور شائستگی در آتی تھی۔ لوگ سرگوشیوں میں محوِ گفتگو تھے۔ جیسے ذرا اونچی آواز نکلی تو کوئی

گستاخی سرزد ہو جائے گی۔ ان سرگوشیوں میں کبھی کبھار چمچ اور چھری کی پلیٹوں کے ٹکراؤ سے ایک ارتعاش پیدا ہوتا اور پھر وہی با ادب تہذیب طاری ہو جاتی۔ ہال میں میزوں کی جگہوں کو سرخ و سبز قالین کی پٹیاں بچھا کر برابر تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ سرخ و سبز قالین باوردی مہذب بیروں کے لئے راہداریوں کا کام بھی دیتے تھے، جو بڑی مستعدی سے مہمانوں کے حکم کی بجا آوری میں مگن تھے۔ جیسے کسی کی ذرا سی کوتاہی پر ان کی کھال کھینچ لئے جانے کا ڈر ہو۔ ہال کی دائیں دیوار کے ساتھ لگی شیشے کی گول میز پر میاں آصف اور اس کے کاروباری مہمان بیٹھے ڈنر کر رہے تھے۔ ان کے درمیان میں کاروباری معاہدہ تکمیل پا چکا تھا۔ ان کے درمیان وقتاً فوقتاً ہلکی پھلکی نوک جھونک ہو جاتی تو بھی کفایت شعاری سے مسکرا دیتے۔ شاید انہیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ کھل کر مسکرانے یا اونچی آواز میں بات کرنے سے ماحول کی ناموس مجروح ہو جائے گی۔

میاں آصف کے مہمان وفد میں ایک سرکردہ آدمی نے سرگوشیانہ لہجے میں سوال کیا۔ "میاں صاحب ـــــ آپ کی کوالٹی کنٹرولر کی کوالیفکیشن کتنی ہے اور وہ کس کس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں ـــــ؟؟" میاں آصف نے ہلکی سی مسکراہٹ سے سرکردہ آدمی کو دیکھا اور اسی لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارا کوالٹی کنٹرولر میٹرک فیل ہے!"

کسی نے ایک ساتھ شائستہ اور بے جان قہقہہ لگایا۔ "میاں صاحب آپ اچھا جوک کر لیتے ہیں۔" "میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ـــــ!!" میاں آصف نے اصرار کیا۔ "رئیلی ـــــ!!" "یس ـــــ" میاں آصف نے الوداعی لقمہ منہ میں رکھا۔ "میرا خیال ہے ـــــ ہم کھانا ختم کر کے نشست گاہ میں بیٹھ کر اس کی تفصیل سنتے ہیں، بلکہ ہمارے ذہن میں کچھ اور سوالات بھی ہیں۔ ان کا جواب بھی ہم آپ سے سننا چاہیں گے۔" وہ بھی کھانا کھا چکے تھے۔ اس لئے ایک ساتھ اٹھ گئے۔

نشست گاہ میں ہر ایک کو اس کا پسندیدہ مشروب پیش کیا جا چکا تو سرکردہ آدمی نے اپنا سوال دہرایا۔ میاں آصف اپنی جھونک میں بولا۔ "عبدالجبار ـــــ ہمارا خاندانی ملازم ہے۔ وہ گزشتہ پینتیس سال سے ہماری فیکٹری میں کام کر رہا ہے۔" "ویری گڈ ـــــ ناقابل یقین ـــــ کتنی پے لے رہا ہے وہ آپ کا میٹرک فیل ـــــ؟" کسی نے طنز سے پوچھا۔

"ساڑھے چھ ہزار روپیہ ـــــ!!" "کیا اب بھی جوک نہیں ہے ـــــ!!" "ہرگز نہیں ـــــ" "ویری سٹرینج ـــــ آج آپ ہمیں حیران کرنے کے موڈ میں ہیں۔ لیکن میاں صاحب ـــــ آپ یہ تو فرمایئے کہ اس قدر اہم کام اور اتنی قلیل تنخواہ ـــــ؟" "آج سے ـــــ پینتیس سال قبل ابھی ہم نے فیکٹری لگائی نہیں تھی کہ وہ کوئی تین ہزار روپے میں ہمارے ہاں ملازم ہوا تھا۔ اس نے ہمیں کبھی تنخواہ بڑھانے کا کہا ہی نہیں!" "مگر اس کا گزارا اتنی کم تنخواہ میں کیسے ہوتا ہے؟" "اب میں آپ کو ذرا تفصیل سے عبدالجبار کے بارے میں بتاتا ہوں ـــــ" میاں آصف اپنا خاص مشروب پینے کے بعد موڈ میں آ چکا تھا۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ "دراصل فطرت ہر آدمی کو ایک خاص مقصد کے لئے دنیا میں بھیجتی ہے۔ اپنے کام کی شناخت ہی آدمی کی کامیابی ہے۔ خدا نے کسی کو مالک بنا کر دنیا میں بھیجا ہے تو کسی کو نوکر بنا کر ـــــ خوارج وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں ہم خود آگہی سے محروم ہوتے ہیں۔" "عجیب فلسفہ ہے ـــــ!!" سرکردہ آدمی اب بھی حیران تھا۔ "فلسفہ نہیں یہ ایک حقیقت ہے ـــــ کیا آپ نے کبھی دیکھا نہیں کہ ایک آدمی ساری زندگی بیسیوں جگہ ملازمت کرتا ہے اور کہیں ٹک نہیں سکتا۔ زندگی کے آخری حصے میں کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرتا ہے اور دنوں میں اتنا کما لیتا ہے کہ بڑھاپا آسودگی سے گزر جاتا ہے۔ بلکہ وہ اولاد کی نظروں میں بھی نہایت محترم ٹھہرتا ہے۔ عبدالجبار دراصل ایک اچھے نوکر کی فطرت لے کر پیدا ہوا ہے اور ہم نے صرف اُسے شناخت کیا ہے۔ دوسرے

لے کر پاؤں تک ایک سچا ملازم ہے۔ اس کی تنخواہ ساڑھے چھ ہزار ہے ——— اور آج تک کبھی اس نے تنخواہ مانگی نہیں ہے۔ دوسری طرف آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ساڑھے چھ ہزار کی تنخواہ والے اس ملازم پر گزشتہ سال ہماری کمپنی نے نو لاکھ سات ہزار سے زائد رقم خرچ کی۔"

"میاں صاحب ——— آج تو آپ ہمیں حیران و پریشان کرنے پر تلے ہوئے ہیں"۔

"دیکھیے ——— جس آدمی کی رہائش ——— وی آئی پی ٹائپ ——— یعنی دس مرلے کی کوٹھی کمپنی نے بنا کر دی ہو ——— جس کی بجلی کا بل، ٹیلیفون کا بل، پانی کا بل، بچوں کی فیس کے ساتھ ساتھ میڈیکل کمپنی کے ذمے ہو، گاڑی کمپنی کی ہو اور ڈرائیور کی تنخواہ دس ہزار روپے ہو...... جس کی بیٹی کی شادی کمپنی نے خود کی ہو ——— اس کے گھر کی سالانہ گندم ہم خود خرید کر دیتے ہیں۔ سبزی، گوشت اور پھل ہمارے ساتھ آتے ہوں ——— جسے جینے مرنے کی فکر نہ ہو...... اسے ساڑھے چھ ہزار روپے تنخواہ بھی زیادہ ہے۔"" لیکن میاں صاحب ——— آپ اپنے ملازم پر ماہانہ ستر اسی ہزار روپے خرچ کرتے ہیں...... اور تنخواہ دکھاوے کی دیتے ہیں۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اور نہ اس کا کوئی فائدہ سمجھ میں آتا ہے!"" اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ عبدالجبار کے پاس کبھی بھی رقم یکمشت اکٹھی نہ ہو سکے گی اور نہ وہ کہیں جانے اور نہ اپنا کاروبار کرنے کے بارے میں سوچے گا ——— لیکن خیر ——— یہ تو ایک ضمنی سی بات ہے۔ اصل میں ہم اپنے مرشد جی کو ماننے والے ہیں۔ ان کی کہی ہوئی بات ہمارے لئے ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے ہوئے ہم نے فرش سے عرش کو چھوا ہے۔ ہم نے عبدالجبار کو ان کے کہنے پر ملازم رکھا تھا۔ انھوں نے پہلے دن حکم دیا تھا کہ عبدالجبار کی تنخواہ تین ہزار ہوگی اور ہر سال ہم نے سو روپے بڑھاتے جانا ہے۔ عبدالجبار بھی انہی کا عقیدت مند تھا۔ نہ عبدالجبار نے پوچھا کہ حضرت کل کلاں میرا گزارا کیسے ہوگا؟ اور نہ ہم نے سوال کیا۔" میاں آصف ایک ماہر داستان گو کی طرح یہ باتیں سنا رہا تھا۔ "حد ہوگئی ——— ہم پہلی بار ایسی باتیں سن رہے ہیں۔ ایک ان پڑھ آدمی...... اتنی تنخواہ ——— اور اتنا اہم کام ——— لیکن بات تو یہ ہے کہ آپ کی کوالٹی میں کبھی کوتاہی نہیں ہوئی...... کبھی درآمد کنندگان نے کوالٹی پر اعتراض نہیں کیا ———"" یہ اس وجہ سے ہے کہ عبدالجبار کے ذہن میں سوائے فیکٹری کے کام کے کوئی اور خیال آتا ہی نہیں۔ وہ ہر فکر سے آزاد ہے۔ وہ رات کو سوتا ہے تو اسے خواب بھی کام کے بارے میں آتے ہیں ——— اور وہ اتنا وفادار ہے کہ رات بیوی سے کی ہوئی بات بھی صبح آ کر ہمیں بتا دیتا ہے۔ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ وہ واش روم کتنے بجے گیا تھا۔" وفد کا ایک رکن جو کافی دیر سے پہلو بدل رہا تھا، بولا۔ "میاں صاحب ——— آج لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دیجیے کہ کیا کبھی آپ نے اپنے سرجیکل آلات خود امپورٹ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا؟"

میاں آصف نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے مرشد پاک فرمایا کرتے تھے۔ اپنی روزی دیکھا کرو...... دوسرے کے لقمے گننے سے برکت اڑ جاتی ہے۔ یعنی جب خدا ہمیں اسی طرح ہی اتنا کچھ دے رہا ہے تو ہمیں کسی دوسرے کی روزی چھیننے کی حرص کیوں ——— ؟ انسانوں کی روٹی ایک دوسرے کے ساتھ بندھی ہے ——— اپنے سامنے بھری ہوئی چنگیر پڑی ہو تو دوسروں کا لقمہ کتے ہی چھینتے ہیں۔ ایک کہاوت ہے ناں ——— جس کا دودھ بکتا ہو اسے دہی بنانے کی کیا پڑی ہے۔ آخر ایک آدمی اپنی زندگی میں کتنے کام کر سکتا ہے؟" سرگروہ آدمی بھی ترنگ میں آ گیا تھا۔ "آپ کی باتوں میں ماشاءاللہ تصوف کا رنگ بہت ہے حالانکہ آپ سر سے پاؤں تک دنیا دار لگتے ہیں۔"" مرشد جی کہا کرتے تھے ——— "کھائیے من بھاتا اور پہنئے جگ بھاتا" ——— یعنی آدمی کو وہی کھانا چاہیے جو اس کا جی چاہے، اور پہننا وہ چاہیے جو معاشرے میں دیکھنے والوں کو اچھا لگے۔ میں تھری پیس پہنتا ہوں ——— کہ آپ لوگوں جیسا معتبر لگوں ——— مگر کھاؤں گا اپنی مرضی کا ———"" میاں صاحب ——— یہ سرجیکل انسٹرومنٹ کا کاروبار کیا آپ کا خاندانی کام ہے ——— ؟ میرا مطلب ہے آپ کے باپ دادا

بھی یہی کام کرتے تھے؟" میاں آصف کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ "ن ــ نہیں ــ م...... میرے دادا میاں اعظم تو ایک محلے میں لون تیل کی دکان کیا کرتے تھے...... اور میرے والد صاحب ــ قبلہ میاں معظم ــ نے پینتیس سال قبل ایک دوست کے کہنے پر کاٹن جیننگ کا کام شروع کیا تھا...... اور پھر ــ "میاں معظم برجینگ" کی بنیاد انہوں نے ہی ــ" میاں آصف کہیں کھو سا گیا۔ چند لمحے بعد بے چینی سے کلائی گھڑی پر نظر ڈال کر بولا: "میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے......" "نہیں نہیں...... میاں صاحب ابھی تو ہم نے آپ سے اور بھی بہت سی باتیں پوچھنا ہیں...... ایسے مواقع روز روز نہیں ملتے ــ آپ تو جی بھائی محفل کو یوں پریشان نہیں کر سکتے!!" "ن ن نہیں مجھے ایک لمبا سا ہی ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ یہ باتیں پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔" میاں آصف جلدی سے اُٹھ گیا۔ اس نے وضعداری کو ایک طرف رکھتے ہوئے باہر کی راہ لی۔ جاتے جاتے وہ کاؤنٹر پر پڑے بل پر دستخط کرنا نہیں بھولا۔

☆☆☆☆

بیگم آصف تین نشستوں والے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صوفہ اس کے وجود سے مزین تھا۔ سامنے والی یک نشستی صوفوں پر آسیہ اور لائبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ تینوں نے کپڑے بدل لئے تھے۔ تینوں نے ہلکا مگر پُر وقار میک اپ کیا ہوا تھا۔ آسیہ اور لائبہ نے وہ کپڑے نہیں پہنے تھے جو تھوڑی دیر پہلے بیگم آصف ان کے لئے سلوا کر لائی تھی۔ تاہم موقع کی مناسبت سے اُن کا انتخاب بھی بہتر تھا۔ بیگم آصف نے لاؤنج کی سیدھے ہاتھ والی دیوار پر لگی ہوئی وینس کی بھاری تصویر پر نظر ڈالی جس کے اندر کسی فنکار نے بڑی مہارت کے ساتھ ایک ٹائم پیس نصب کیا ہوا تھا۔ تین بجنے والے تھے اور میاں آصف کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ میاں آصف ایسا غیر ذمہ دار ہرگز نہیں تھا۔ اسی لئے بیگم آصف نے فون کر کے میاں آصف کو کاروباری میٹنگ میں منتشر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آج میاں آصف سے تو میاں قیصر نے ہی ذمہ داری کا مظاہرہ کیا تھا، جو ٹھیک دو بجے گھر پہنچ گیا تھا۔ میاں قیصر اس وقت اپنے کمرے میں غسل کر کے کپڑے بدلنے میں مصروف تھا۔

اس وقت گرمیوں کی گہری شام کے کوئی آٹھ بجے کا عمل ہوگا جب اس نے میاں آصف کو فون کیا تھا۔ زندگی کے مصروف لمحوں میں جب میاں آصف کو موبائل پر اپنی بیگم کی کال موصول ہوئی تو موبائل پر بات سنتے ہی بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "او...... نو"۔

اس کے لہجے میں ایک احتجاج تھا۔ اس نے اپنی گاڑی سے باہر جھانکا۔ اس کی گاڑی بھیڑ کے لیے چوڑے ریلے میں پھنس چکی تھی۔ اس نے اپنی کلائی کو مخصوص انداز میں حرکت دی۔ کلائی پر بندھی قیمتی رادو کا رخ سامنے ہو گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ دوبارہ موبائل پر اپنی بیگم سے مخاطب ہوا "بیگم...... اس وقت شام کے آٹھ بجے ہیں ــ تم ان لمحوں کو کسی طرح بھی آٹھ گھنٹوں کے لیے روک لو۔ میری گاڑی لبرٹی کے گول چکر میں ٹریفک کے اژدحام میں پھنس چکی ہے۔ ابھی مجھے گھر آ کر کپڑے بدلنا ہیں اور پھر آج رات بارہ بجے پرل کونٹی نینٹل میں ایک پارٹی سے فائنل میٹنگ ہے۔ اگر میں نہ گیا تو ڈیل نہیں ہو سکے گی ــ اور ڈیل نہ ہونے کا مطلب کروڑوں کا نقصان ہے۔"

پھر وہ اپنے کان سے موبائل ہٹا کر ڈرائیور سے مخاطب ہوا "علی...... کیا ہم ادھر ادھر کسی گلی سے نہیں نکل سکتے؟"

"سر......" علی مستعدی سے بولا۔ "یہاں سے نکل جائیں تو میں کوئی سنسان سڑک ڈھونڈتا ہوں"۔ میاں آصف نے اپنی بے بس نگاہیں ساتھ والی گاڑیوں پر ڈالیں اور دوبارہ پیچھے۔ ایک لمحے بعد اس نے دوبارہ فون کان سے لگا لیا۔ "آ...... ہاں ــ دیکھو بیگم ــ بہت مجبوری ہے ــ ہاں ــ یس ــ یس ــ میں پہنچ جاؤں گا ــ یس ــ یس ــ بالکل ــ او کے" اس نے فون بند کر کے خطری

سانس لی۔ دوسری طرف بیگم آصف نے بھی فون بند کر کے اطمینان کی سانس لی۔ آگے بڑھ کر ایئر کنڈیشن کا ٹمپریچر آخری درجے تک کر دیا اور نڈھال قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ یہ کمرا ساری کوٹھی سے الگ تھلگ ایک کونے میں واقع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سٹور تھا۔ اس کے ساتھ آسیہ اور لاریبا بھی آہستہ روی سے اپنی ماں کی پیروی میں کمرے سے باہر آ گئیں۔ بیگم میاں آصف نے نہایت احتیاط سے، بے آواز انداز میں کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ آسیہ اور لاریبا کی ہمراہی میں بوجھل قدموں سے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے لاؤنج میں آ کر بڑے صوفے پر براجمان ہو گئی۔ اور ـــ اب بیگم آصف، اپنے میاں کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر آصف جیسے اپنا وعدہ بھول گیا تھا۔ بیگم آصف نے، آصف سے بات کرنے کے لئے اپنا موبائل اٹھایا ہی تھا کہ میاں صاحب کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ بیگم آصف نے اپنے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیئے اور ایک پُرسکون سانس کھینچ کر خاموشی سے اپنا موبائل دوبارہ سامنے میز پر رکھ دیا۔
دو ایک منٹ بعد میاں آصف لاؤنج میں داخل ہوا اور آتے ہی معذرت کرنے لگا۔ ''سوری بیگم ـــ میں لیٹ ہو گیا۔ وہ قیصر گھر میں ہی ہے کیا ـــ ؟؟'' ''وہ اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہا ہے۔'' بیگم آصف نے مختصراً کہا۔ ''آپ بھی لباس تبدیل کر لیں۔''

میاں آصف انکاری خواہش کے باوجود انکار نہیں کر سکا اور بیگم کی بجا آوری کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے واپس آنے میں دیر نہیں لگی۔ میاں آصف نے نظروں ہی نظروں میں بیگم سے بہت کچھ پوچھا اور بیگم کو مطمئن دیکھ کر بیگم آصف اور دونوں بیٹیوں کو لے کر سٹور کے ساتھ والے الگ تھلگ کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ فجر کی اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ جب انہوں نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور دبے قدموں کمرے میں داخل ہوئے۔ میاں آصف نے اپنے باپ کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ بیگم آصف اپنے سسر کی نعش دیکھ کر یکدم دھاڑیں مارتی ہوئی بیڈ کی پٹی پر گر گئی۔ آسیہ اور لاریبا نے بیڈ کی پائنتی والا تختہ پکڑا اور سسکنے لگیں۔ میاں آصف نے موبائل سے بھائی کا نمبر ملایا اور گلوگیر ہو کر نہایت کربناک لہجے میں بتانے لگا۔ ''بھائی صاحب ـــ ابا جی فوت ہو گئے ہیں ـــ جی جی ـــ میں ابھی ابھی میٹنگ سے فارغ ہو کر گھر پہنچا ہوں ـــ آپ کو تو پتہ ہے، جب سے ابا جی بیمار ہوئے ہیں ـــ مجھے ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا ہر وقت ـــ جیسے جیسے ـــ کچھ ہونے والا ہو ـــ گھر آتے ہی میں سب سے پہلے ابا جی کی خبر گیری کرتا ہوں ـــ مگر آج ـــ آج ـــ'' اس کے ساتھ ہی میاں آصف کی ہچکیاں بندھ گئیں!!!

●●●

ضروری اطلاع

پاکستانی روپے کی قدر کم ہونے اور ڈالر کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے رسائل کی طباعت و اشاعت اور پوسٹنگ کے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ''تخلیق'' کے لیے استعمال ہونے والا کاغذ، سیاہی، ڈاک ٹکٹ اور دیگر اشیا درآمدی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے جنوری 2021ء سے ''تخلیق'' کے ایک شمارے کی قیمت -/350 روپے اور سالانہ (ڈاک خرچ سمیت) -/1,600 روپے مقرر کی جا رہی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اہلِ ادب گرانی کے اس دور میں ''تخلیق'' کے اس اضافے کو قبول فرمائیں گے۔ ہم ان کے تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ درحقیقت ''تخلیق'' ان کے تعاون سے ہی چھپ رہا ہے اور سب لکھنے اور پڑھنے والے ''تخلیق'' کی ادارت میں شامل ہیں۔ (ادارہ)

ایمیلا

محمد اقبال فیروز

مختصر تعارف

اقبال فیروز کا تعلق چکوال کے متوسط گھرانے سے ہے۔ افسانہ نگاری میں ایک مخصوص طرزِ تحریر اور اچھوتے پن کے باعث ادبی حلقوں میں ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کے افسانے اردو کے کئی میگزین میں شائع ہو چکے ہیں۔ 2014ء میں جنگِ عظیم اول کے پس منظر میں ان کا لکھا ہوا ناول ''پس سلاسل'' بہت مقبول ہوا تھا۔ چکوال میں ایکسپورٹ اور امپورٹ کے کاروبار سے منسلک ہیں آج کل ایک دوسرے ناول کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو جنگِ عظیم دوم کے پس منظر میں لکھا جا رہا ہے۔

بالٹک سمندر جس کی خاموش اور پرسکون لہریں جرمنی کے شہر کیل کی بلند و بالا عمارتوں سے دل لگی کرتی نظر آتی ہیں اپنی وضع کے اعتبار سے ایک خوب صورت سمندر کہلاتا ہے۔ اس کے مشرقی کنارے پہ اوسلو کا ہی بندرگاہ کا ایک حصہ بھی ہے جہاں سے بیلجیم اور ناروے کے لیے فیری سروس چلتی ہے۔ ان دنوں سمندر کے اندر بنی ہوئی شیشے کی راہداری کے اندر سمندر کی نیلگوں لہروں میں فراٹے بھرتی ہوئی لانچوں اور مسافر بردار جہازوں کو دیکھنے کے لیے لوگوں کی ایک خاصی تعداد وہاں جمع ہو جاتی تھی۔ شیشے کی دیوار کے ساتھ کرسیاں رکھی تھیں جن میں بیٹھ کر بوڑھی بوڑھیاں سمندر کے گہرے پانیوں سے اپنے ماضی کی یادوں کے سیپ اور موتی چنتی رہتی تھیں۔ اس دن ناروے جانے والا جہاز اپنی برتھ کو چھوڑ رہا تھا۔ گیلری کے اندر بھاگتی ہوئی ایک نوجوان لڑکی برتھ کی طرف بڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وقت اس کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا وہ بس وہ وہیں رک گئی تھی جہاں اپنے پیچھے پانی کا ایک اچھلتا کودتا ریلا چھوڑتا اپنی منزل کی طرف چل دیا تھا وہ دھڑام سے میری ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ کر اپنی سانسوں کو درست کرنے لگی۔

''مجھے ہر صورت اوسلو پہنچنا تھا اُس کی کل برتھ ڈے تھی اب وہ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا۔'' وہ مجھ سے زیادہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی اور شاید مجھے یہ سنا کر اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''لیکن تمھیں وقت سے پہلے آنا چاہیے تھا تمھیں شاید معلوم نہیں جرمنی کی ٹرانسپورٹ اور وقت کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہے دونوں کسی کا انتظار نہیں کرتے۔'' وہ خاموش رہی۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ اوسلو کی طرف جانے والے جہاز کو افق میں اوجھل ہوتا ہوا دیکھنے لگی، وہ خاموش رہی میری اس بات کا کوئی جواب بھی تو نہیں بنتا تھا۔ ''آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں کیا کسی کو الوداع کرنے آئے تھے۔'' اس کے چہرے پہ سنجیدگی تھی آنکھوں سے آنسو گرنے کے لیے بےتاب دکھائی دے رہے تھے۔ ''جی میں تو کبھی کبھی ویسے ہی یہاں آ جاتا ہوں سمندر میں تیرتے ہوئے سٹیمر اور جہاز مجھے بہت اچھے لگتے ہیں ہاں بالٹک سمندر میں سورج کے غروب ہونے کا نظارہ بہت خوبصورت ہوتا ہے جب

سورج ڈوب رہا ہوتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے سمندر کی لہریں اس سے گلے مل رہی ہوں۔“ ”کبھی اوسلو جانے کا اتفاق ہوا تمہیں سمندری سفر کیسا لگتا ہے بہت دلچسپ یا بور“ اب کے بار اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور وہ وقت گزارنے کے لیے گپ شپ لگانے کے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ ”جی ہاں ایک دفعہ بہت بور اور خطرناک سفر تھا اس کے بعد سے میں نے سمندری سفر سے توبہ کر لی تھی۔“

”آخر کیوں میں نے تو سنا ہے کہ سمندر کا سفر بہت دلچسپ ہوتا ہے اور پھر جہاز کے اندر مسافروں کے لیے موجود ہر طرح کی تفریحات اسے اور زیادہ خوشگوار بنا دیتی ہے۔“ ”دراصل یہ میرا پہلا سفر تھا جس میں شدید روکنگ تھی مسافر سخت پریشان تھے، جہاز ایک تنکے کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ واش روم کے باہر لوگوں کی لائنیں لگی تھیں۔ ڈائننگ روم میں رکھے برتن ٹوٹ رہے تھے، کھانا کھانے کی تو کسی کو حاجت ہی نہیں تھی عملہ اپنی پریشانی میں ادھر ادھر بھاگ رہا تھا اور میں ——“ ”اس کا مطلب یہ سمندری سفر اتنا خطرناک ہوتا ہے میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا؟ اُف اللہ یہ میں کیا سن رہی ہوں“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ لیے اور مجھے گھورنے لگی۔

”ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا دوسرے معنوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سمندری سفر بہت دلچسپ اور فرحت بخش ہوتا ہے۔ اگر طوفانی ہواؤں نے اس کے تیور نہ بدل دیے ہوں، ویسے لگتا ہے تمہارا ابھی یہ پہلا سفر تھا، کیا تمہارا دوست ناروے کا رہنے والا ہے“ میں نے بات کا رخ پلٹ کر اس سے ذاتی سوال کر دیا۔ ”نہیں تو وہ جرمن ہے وہ ریسرچ میں انجینئر ہے۔ کسی پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے لیے پانچ ماہ سے وہاں مقیم ہے۔ بس ایک ماہ کا اور کام رہ گیا ہے ویسے وہ ہر دو ہفتوں کے بعد گھر آتا ہے وہاں جانے کا یہ میرا پہلا موقع تھا اور یہ میرا ابھی پہلا سمندری سفر تھا۔“ ”لگتا ہے تمہیں کبھی جرمنی سے باہر جانے کا اتفاق نہیں ہوا“ ”میں نے تو دنیا کے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی ہے؟“ ”ایسا نہیں ہے میں نے بیس سے زیادہ ملکوں کا سفر کیا ہے اور یہ سارے سفر یا تو ٹرین یا ہوائی جہاز سے کیے ہیں۔ میں نے ہیمبرگ یونیورسٹی سے آرکیالوجی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ میں نے کچھ سفر یونیورسٹی کے خرچے پہ کیے ہیں اور کچھ اپنے پیسوں سے اب اس فیلڈ میں پی ایچ ڈی کر رہی ہوں۔ تھامس میرے ساتھ بہت تعاون کرتا ہے وہ بہت اچھی سیلری لے رہا ہے۔ مجھے بھی کبھی کبھی کوئی پارٹ ٹائم جاب مل جاتی ہے۔ دو سال کے بعد جب میرا پی ایچ۔ ڈی مکمل ہو گا تو میں کسی یونیورسٹی میں پروفیسر کی جاب کروں گی۔

”بہت خوب میرا نام لیون ہے دو بچوں کا باپ ہوں میری بیوی کچھ عرصے کے لیے برلن چلی گئی ہے اپنے والدین کے پاس اسے پچھلے ہفتے آنا تھا مگر ماں کی اچانک بیماری کے باعث مزید کچھ عرصہ کے لیے وہاں رک گئی ہے۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں اس سال کے آخر تک انہیں کنڈرگارٹن میں بھیجنے کا سوچ رہے ہیں۔ یہاں ہولسٹن سٹریٹ پہ ہماری ٹکٹنگ کی چھوٹی سی ایجنسی ہے جسے دو ملازم چلا رہے ہیں۔ بچوں کے ذکر سے اس کے چہرے پہ ناگوار سے اثرات پیدا ہوئے جس کی وجہ میں تو سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن اپنا موضوع بدلنا میرے بس میں ضرور تھا۔ ہاں میں نے تمہارا نام پوچھا ہی نہیں ہے بات کرتے ہوئے مجھے بار بار فرولائن کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں میں نے ایک ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے اس کا نام پوچھا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی جیسے اپنا نام بتانے سے پہلے وہ اپنے ذہن پہ زور دے رہی ہو۔ ”مجھے ایملا کہتے ہیں میرا گھر تمہاری ٹکٹنگ ایجنسی سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے ملس ڈورف۔ ویسے جب میں ایک ہفتے کے لیے گئی تھی تو ایئر ٹکٹ تمہاری ایجنسی سے لیے تھے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی اور پھر ایک بھرپور مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ تمہارے پاس گاڑی ہے تو کیا تم مجھے گھر تک چھوڑ سکتے ہو، مجھے تھامس کو فون کرنا ہے کہ میں نہیں آ رہی، مجھ سے

شب مس ہو گیا ہے۔" "ہاں میرے پاس گاڑی ہے سورج غروب ہو چکا ہے اب اوسلو کا ہی میں زیادہ کشش نہیں رہی بس کہیں کہیں سمندر میں لنگر انداز کشتیاں دکھائی دیتی ہیں ہم نے باتوں باتوں میں کافی وقت گزار لیا ہے۔ اوسلو کا ہی سے ٹلس ڈورف تک پچیس منٹ کے سفر میں وہ میرے ساتھ کچھ اور فری ہو گئی تھی وہ اپنی عائلی زندگی سے بہت مطمئن تھی صرف ایک بات میں اس کا تامس سے جھگڑا رہتا تھا وہ ایک بچے کا باپ بننا چاہتا تھا اور اسے ماں بننے سے نفرت تھی۔ ایسا کیوں تھا اس بارے میں جاننا میرے لیے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا تاہم باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے میں نے ایمیلا سے اس کی وجہ پوچھ ہی لی، وہ چند لمحوں تک میرے چہرے پہ نظریں جمائے کچھ سوچتی رہی اور پھر ایک پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ "کچھ سوالوں کا جواب مانگنے کے لیے بھی اجازت درکار ہوتی ہے میں کچھ شرمندہ سا بات کا رخ دوسری طرف موڑنے کے لیے موضوع تلاش کر رہا تھا کہ اس نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مجھے کیفے سون میں کھانے کی دعوت دے دی۔ "تامس گھر میں نہیں ہے اور تمہاری بیوی بھی موجود نہیں ہے ہم دونوں کو کھانا تو گھر سے باہر ہی کھانا ہے کیوں نا ہم آج رات کا کھانا اکٹھے کھا لیں اور پھر آج میں کچھ پریشان بھی تو ہوں وہاں تمہارے اس سوال کا جواب بھی دوں گی جو تم نے ابھی ابھی مجھ سے کیا ہے۔ ہاں یہیں سے میں تامس کو فون بھی کر لوں گی۔" "یہ آفر ایک لڑکی کی طرف سے ہوئی ہے میں اسے ٹھکرا تو نہیں سکتا۔ میں کھانا کیفے سون سے کھاتا ہوں لیکن آج ہم جاپانی ریسٹورنٹ سے کھانا کھائیں گے اور پھر میں نے گاڑی کا رخ ایمیلا کے گھر کی بجائے جاپانی ریسٹورنٹ کی طرف موڑ لیا۔ ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا ہمیں کچھ وقت مل گیا ہے چلو ہم ایک دوسرے کی زندگی میں جھانک لیتے ہیں۔ بات وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں مجھے تمہاری بات کا جواب خاموشی میں ملا تھا تو پھر بتاؤ کیا زندگی بچوں .... بالکل نہیں ہم اگر بچے پیدا کر سکتے ہیں اور نہیں کرتے یہ قانون قدرت کی خلاف ورزی ہے۔" "میں اس بات کو درست نہیں مانتی زندگی بچوں کے بغیر بھی گزاری جا سکتی ہے اور بہت بہتر انداز میں گزاری جا سکتی ہے۔ مجھے دنیا کے خوبصورت اور رنگین مقامات دیکھنے کا جنون ہے۔ میں نے اپنی زندگی سیاحت کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ دنیا کے بیس سے زیادہ ملکوں کے اہم اور مشہور مقامات کا دورہ کر چکی ہوں، ہندوستان کا تاج محل، لندن کا البرٹ وکٹوریہ میوزیم، اٹلی کا وینس، سپین کا الحمرا، پاکستان میں لاہور کا شاہی قلعہ اور کتنے دوسرے مقامات جن کی ایک لمبی فہرست ہے، میرا ملک بھی کسی دوسرے ملک سے کم خوبصورت نہیں ہے لیکن اٹلی کے رنگین مقامات کے نظارے تو بھلائے سے بھی نہیں بھولتے۔ سمندر کے بیچوں بیچ پھیلا ہوا رنگ برنگی کھڑکیوں والی عمارتوں کا شہر پوسیٹانو اور دلکش پہاڑی سلسلوں میں گھرا ہوا ساحل بیچارا یا سمندر میں جیسے تیرتی ہوئی پہاڑی قدیم دور کی قطاریں اور سمبیڈ و ساحل۔ سسلی کی شاندار پہاڑیوں کے درمیان رومیوں کی پرانی عمارتیں یہ نظارے میری روح میں سما چکے ہیں۔ میں جب بھی اٹلی سے واپس آتی تو ایسا لگتا جیسے میں اپنا وجود وہیں چھوڑ کر آ رہی ہوں۔ میرا باقی سب کچھ تو وہیں کہیں رہ گیا ہے۔"

"لیکن ان باتوں سے بچوں کا تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ دنیا کی سیر تو اپنی جگہ اور بچوں کی اپنی حیثیت اور پھر بچے بھی تو قدرت کا ایک حسین شاہکار ہیں۔ سامنے ہوں تو ہر نظارہ ہیچ معلوم ہوتا ہے۔" "میں تمہارے ساتھ متفق ہوں بچوں کی ایک اپنی دنیا ہے۔ بچے پیدا نہ کرنے کا مقصد بچوں سے نفرت نہیں ہے لیکن اگر بچے کسی اعلیٰ مقصد کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں تو زندگی کے اطوار اور نظریات ضرور تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میں تاج محل کے عین سامنے ایک بوڑھے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس طلسماتی عمارت کو بغور دیکھ رہی

تھی میں تصوراتی تصویر میں اسے بنتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ سینکڑوں ننگ دھڑنگ ہندوستانی مزدور کام میں جتے ہوئے اس حقیقت سے لاعلم کہ ان کے ہاتھوں سے کتنی عظیم عمارت تخلیق ہونے جا رہی تھی اور پھر اسی تاج محل کے دامن میں گھومتے، چلتے کودتے خوش گپیاں لگاتے ہوئے سینکڑوں انسان اس کی عظمت، اس کے لازوال حسن اور اس کی سحر انگیز صفات سے بے خبر صرف اور صرف تفریح کے لیے یہاں آئے تھے۔ وہ اپنے بچوں کی انگلیاں پکڑے کس شان بے نیازی سے ان کی مسکراہٹوں کو اپنے سینے میں جذب کر رہے تھے۔ اگر میرے ساتھ بھی بچے ہوتے تو کیا میں اس عمارت کے ماورائی حسن کو محسوس کر سکتی تھی، میں نے ایک ایسی یورپی عورت کو الحمرا میں دیکھا تھا جو اپنے بچے کی انگلی پکڑے اس عمارت کے مرکزی حصے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ بچہ اس کی انگلی چھڑا کر بھاگ جاتا تو وہ اپنی توجہ عمارت سے ہٹا کر اسے پکڑ کر اپنے ساتھ کھڑا کر لیتی اور پھر الحمرا کے حسن میں کھو جاتی۔ کئی دفعہ تو اسے خبر بھی نہ ہوتی اور بچہ اس سے الگ ہو کر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو جاتا اور اسے ڈھونڈنے کے لیے وہ ادھر ادھر بھاگتی پھرتی۔

"میں تمہارے نظریات سمجھ چکا ہوں" موضوع بدلنے کے لیے میں نے معمولی سی کوشش کی۔ سچی بات یہ کہ میرے لیے یہ موضوع بالکل فضول تھا، بیکار سے خیالات سے جڑا ہوا یہ غیر فطری فلسفہ کوئی بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہمارے سامنے کھانا آ گیا اور ہم خاموشی سے اس سے انصاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ "کبھی میرے گھر تشریف لے آنا" میں نے کھانا کھاتے ہوئے اسے دعوت دے دی جو اس نے خوش دلی سے قبول کر لی۔ "ضرور، لیکن ٹامس کے واپس آنے کے بعد ہم دونوں اکٹھے تمہارے گھر آئیں گے۔" میں نے ایمیلا کو اس کے گھر کے باہر ڈراپ کیا تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سڑکوں پہ ٹریفک کی روانی میں کمی آ چکی تھی۔ میں نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو آنکھوں کے سامنے بچوں کی تصویریں ابھرنے لگیں۔ دل چاہا اسٹریٹ کو فون کروں مگر آدھی رات گئے اس کی نیند میں خلل ہونا مناسب نہ سمجھا اور بستر پہ لیٹے لیٹے ایمیلا کے بارے میں سوچنے لگا اور پھر نیند میں ڈوبنے سے پہلے میں اپنے ذہن کو یہ باور کرا چکا تھا کہ حالات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس میدان میں یہ لڑکی اکیلی نہیں ہے۔ دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اسٹریٹ ابھی تک برلن میں ہی تھی اس کی ماں کی طبیعت کچھ بہتر نہیں تھی لیکن وہ جلد از جلد گھر آنے کے لیے تیار تھی۔ اتوار کی صبح مجھے ایمیلا نے ٹیلی فون پہ پیغام دیا کہ وہ ٹامس کو لے کر میرے گھر آ رہی ہے چونکہ گرمی کی شدت ہے لہٰذا ہم سب اپنا سارا دن رانس ڈیو گارڈن میں گزاریں گے۔ اس وقت دن کے دس بجے تھے جب ہم تینوں کھانے پینے کا مختصر سا سامان لے کر گارڈن میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر اس چھوٹی سی جھیل کا نظارا کر رہے تھے جس کے اردگرد بچوں اور بوڑھوں نے ڈیرے جما رکھے تھے کچھ بوڑھی عورتیں آبی پرندوں کو دانے اور بریڈ کے ٹکڑے کھلا رہی تھیں جب کہ بچوں کی ایک کثیر تعداد چھوٹے چھوٹے جال پکڑے پانی سے مچھلیاں اور مینڈک پکڑ کر مرتبانوں میں ڈال رہے تھے۔ ٹامس ایک بہت سادہ اور پرکشش سے خدوخال کا لمبے قد کا نوجوان تھا اس کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ اسے ایمیلا سے بہت محبت تھی۔ ہر بات میں بیوی کی تائید کرنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ اچانک چھپاک کی آواز سے ہم چونک اٹھے۔ جھیل کے اردگرد بیٹھی عورتوں کے شور وغل سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بچہ جھیل میں گر گیا ہے۔ سب سے پہلے ٹامس بھاگ کر جھیل تک پہنچا اور اس نے اپنا لمبا ہاتھ بڑھا کر ایک پانچ چھ سال کے بچے کو پانی سے کھینچ کر باہر نکالا۔ اس کے کپڑے پانی سے شرابور تھے، آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اس کے سر کے لمبے بالوں سے گرنے والے پانی کے قطروں میں مدغم ہو رہے تھے وہ رحم طلب نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا اور اشارے سے اپنے مرتبان اور جال کو تلاش کرنے میں ہماری مدد کا طلب گار تھا۔ ایمیلا نے اس کے بالوں کو اپنے سر پہ اوڑھے ہوئے رومال سے

خشک کیا اور کپڑوں کو نچوڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''تمہارا نام کیا ہے'' میں نے اس سے پوچھا تو اس نے روتے ہوئے دھیمی سی آواز میں جواب دیا ''ٹامس۔'' ''اچھا تو تم بھی ٹامس ہو'' دونوں میاں بیوی اسے پیار اور حیرت سے دیکھنے لگے۔ ''ٹامس کہاں رہتے ہو اور تم ادھر اکیلے کیوں آئے تھے تمہاری ماما کدھر ہے۔'' ''ماما گھر میں ہے ہمارا گھر پارک کے اس طرف ہے ادھر دیکھو یہاں سے نظر آ رہا ہے۔ میں ہر روز ادھر آتا ہوں ماما مجھے منع نہیں کرتی۔ پاپا تو ادھر ہوتا ہی نہیں وہ اتوار کو گھر آتا ہے کبھی کبھی آتا بھی نہیں ہے۔'' ''اچھا ٹامس یہ بتاؤ تمہارا پاپا کیا کرتا ہے۔'' ایمیلا نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔'' ''وہ بحری جہاز کا کپتان ہے ماما کہتی ہے وہ پانی میں رہتا ہے گھر آتا ہے تو مچھلیاں اور جوس لے کر آتا ہے۔'' ''تمہاری ماما گھر میں ہی رہتی ہے یا کام پہ جاتی ہے۔ ٹامس نے اس سے پوچھا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔'' میں نے جزا دو فقہ کیا ہے ماما گھر میں ہی رہتی وہ اب بھی گھر میں ہی ہے۔''

''ٹامس تم بھاگ کر گھر جاؤ اور اپنے کپڑے تبدیل کر کے آؤ ہم تمہارے واپس آنے کا انتظار کریں گے۔ ایمیلا نے اس کے گیلے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا جن میں سے اب بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک دم گھر کی طرف بھاگا اور پندرہ منٹ کے بعد نیکر ٹی شرٹ اور سر پر پی کیپ پہن کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''ٹامس تمہارا گھر تو بہت خوبصورت ہے اب تمہارے گھر میں کون تھا؟ ٹامس کے اس سوال پہ وہ دوبارہ سنجیدہ سا ہو کر کہنے لگا۔'' جزا دو فقہ بتایا ہے میرا گھر وہ سامنے ہے ماما گھر میں کھانا پکا رہی ہے۔''

''تم میرے ساتھ مل کر مچھلیاں پکڑو گی'' اس نے ایمیلا کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا جھیل کی طرف چل دیا میں اور ٹامس بڑی دیر تک انہیں لگاتے رہے اور ایمیلا اس کے ساتھ تالاب سے مچھلیاں پکڑنے میں اس کی مدد کرتی رہی۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس آئی تو ٹامس بھی اس کی انگلی پکڑے ہمارے درمیان بیٹھ گیا۔'' تم بہت تھک گئے ہو ٹامس یہ دیکھو تمہاری بھی تو بہت تھکی تھکی لگ رہی ہے اب تمہارا کیا پروگرام ہے کیا اب گھر جاؤ گے۔ ٹامس نے اس سے ایسے پوچھا جیسے وہ اب اس سے اکتا سا گیا ہو اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور کچھ کہے بغیر گھر کی طرف بھاگ گیا ہمیں اس کے اس طرح بھاگ جانے پہ افسوس ہوا۔ ایمیلا نے ٹامس کو گھورتے ہوئے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس نے معذرت کا تاثر دیتے ہوئے سر کو جھکا لیا۔ ہم کچھ دیر تک خاموش رہے اور اس چھوٹے سے گیٹ کو دیکھتے رہے جو ٹامس کے گھر کی طرف کھلتا تھا اس نے جاتے ہوئے لوہے کے دروازے کو زور سے بند کیا اور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ ہم میں سے ہر ایک گفتگو شروع کرنے کے لیے کوئی مناسب موضوع تلاش کر رہا تھا کہ ٹامس گیٹ کھول کر پھر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا اس کے ہاتھ میں آئس کریم کے دو چھوٹے کپ تھے اس نے ایک کپ ایمیلا کے ہاتھ میں دیا اور دوسرا خود کھانے لگا۔

''ٹامس تم ہمارے لیے آئس کریم کیوں نہیں لائے۔ ہمارا دل بھی تو کھانے کو چاہ رہا ہے۔ میں نے شرارت کے انداز میں اس سے شکایت کی تو وہ ایک دم پھٹ پڑا۔'' ''میرے گھر میں کوئی دکان کھلی ہوئی ہے ہمارے فریج میں بس دو ہی تو تھیں میں لے کر آ گیا۔'' ''ماما نے پوچھا نہیں دوسری آئس کریم کس کے لیے ہے۔''

''جزا دو فقہ بتایا ہے ماما کچن میں کھانا پکا رہی ہے۔ اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ایمیلا کے ساتھ اسی انداز سے ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا جیسے وہ بیٹھی ہوئی تھی خود بھی آئس کریم کھاتا رہا اور اسے بھی کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔'' ''اب تم میرے ساتھ تالاب تک چلو گی ہم پھر مچھلیاں اور مینڈک پکڑیں گے۔ ٹامس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی جگہ سے اٹھا لیا۔ دونوں ایک دفعہ پھر تالاب کے ارد گرد چکر لگا رہے

تھے۔ ایک گھنٹے سے اوپر کا وقت ہو گیا۔ دھوپ میں چلتے چلتے امیلیا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے اس کا ساتھ دے رہی تھی لیکن تھامس ہشاش بشاش اور فریش تھا۔ چلو تھامس ہم تھوڑی دیر سستا لیتے ہیں وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر ہمارے سامنے لے آئی۔

''آپ لوگوں کو پتہ بھی ہے پارک کا وقت ختم ہو گیا ہے۔'' تھامس نے ہمیں یاد دلایا اور وہ اس چھوٹے گیٹ کو دیکھنے لگا جو تھوڑی دیر پہلے بند کر دیا گیا تھا لوگ تیزی سے بڑے گیٹ کے راستے سے گھروں کو جا رہے تھے۔ ''میرا کیا بنے گا میں اب گھر کیسے جاؤں گا۔ پارک کے سارے گیٹ چار بجے بند کر دیے جاتے ہیں'' اس کی آنکھوں سے آنسو امنڈ آئے اور وہ رحم طلب نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ ''ہم تمہیں گھر چھوڑ کر آئیں گے تھامس اس میں رونے کی کیا ضرورت ہے۔ امیلیا نے اسے تسلی دی اور وہ ہمارے ساتھ ساتھ بڑے گیٹ کی طرف چل دیا۔ ہمیں بڑی سڑک سے تین فرلانگ کا راستہ طے کر کے پورے پارک کے ارد گرد چکر لگا کر تھامس کے گھر تک پہنچنا تھا۔ وہ امیلیا کی انگلی پکڑے فٹ پاتھ پر کنکروں کو ٹھوکریں لگاتا اچھلتا کودتا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستے سے گزرنے والوں کو ذرا سی بھی شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دونوں کا ماں اور بیٹے کے علاوہ کوئی اور رشتہ بھی ہو سکتا ہے۔ چند منٹ کے بعد تھامس کی نشاندہی پر ہم پارک کے اس چھوٹے گیٹ کے پاس کھڑے تھے جہاں سے وہ سایہ دار درخت دکھائی دے رہے تھے جہاں بیٹھ کر ہم نے کچھ وقت گزارا تھا۔ ''یہ میرا گھر ہے'' تھامس نے ایک خوبصورت ولا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیلیا کی انگلی چھوڑ دی اور بھاگتا ہوا اپنے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ ایک ہاتھ سے گھر کی گھنٹی بجا رہا تھا اور دوسرے سے امیلیا کو الوداع کہہ رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک ہاتھ اسے اندر کھینچ کر لے گیا اور دروازہ پھر سے بند ہو گیا۔ امیلیا کتنی دیر بند دروازے کو گھورتی رہی اور جب واپس مڑی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے ایک دفعہ پھر مڑ کر بند دروازے کی طرف دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتی تھامس کے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!!

◆◆◆

بلوچستان کے نمائندہ افسانہ نگار آغا گل کے افسانوں کی نئی کتاب

''لگتا ہے جو سرکش جن حضرت سلیمان نے کوہ سلیمان کی غاروں میں بند کیے تھے ان میں سے آغا گل آزاد ہو چکا ہے (آفتاب میمن)

پاسنیگان کا مطلب کیا!

شائع ہو گئی ہے

ملنے کا پتہ: مہر در انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، کوئٹہ۔ 0333-7832323

سراب

محمد اسلم

مختصر تعارف

محمد اسلم 6 جنوری 1943 کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ ''مٹی کا دیا'' پنجابی ناول کا اردو ترجمہ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' میں اشاعت پذیر ہوا۔ ماہنامہ ''تخلیق'' میں بہت افسانے لکھ چکے ہیں۔ انگریزی کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں۔ ترجمہ کے فن پر عبور حاصل ہے۔

ملازمت کے پینتیسویں سال میں حامد ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گیا۔ اب اس کی ریٹائرمنٹ میں چند ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ ایک دن وہ حسبِ معمول اپنے کام میں مصروف تھا کہ آفس سپرنٹنڈنٹ جعفر میز کی دوسری طرف پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے تیس پچیس پروفارموں (Proformao) کا پلندہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا:

''شیخ صاحب آپ کی ریٹائرمنٹ کی باقاعدہ کارروائی شروع ہو گئی۔ جتنی جلدی ممکن ہو یہ مکمل کر کے دے دیں تاکہ آپ کا کیس پنشن آفس کو بھجوایا جا سکے۔'' آفس سپرنٹنڈنٹ کے جانے کے بعد حامد نے ایک سرسری نگاہ پروفارموں پر ڈالی اور دو تین دنوں میں مطلوبہ معلومات دفتر میں پہنچا دیں۔ حامد یکسوئی اور لگن سے کام کرنے والا افسر تھا۔ تاہم اس کی ریٹائرمنٹ کے کاغذات جمع ہوتے ہی اس کے ساتھیوں نے اس کے پاس یوں آنا شروع کر دیا جیسے کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہو گیا ہو۔ وہ اس کی ممکنہ پنشن پر گفتگو کرتے۔ اسے ملنے والی گریجوایٹی (Gradauity) کا حساب لگاتے اور اسے ملازمت میں توسیع (Extension) یا کہیں اور نوکری (Re-Employment) کے لئے مشورے دیتے۔ حامد ان کی دلجوئی کی خاطر ہوں ہاں کرتا اور بس۔ حامد کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا لیکن ستم ظریفی کہ اسے دلچسپی فنونِ لطیفہ میں تھی اور فنونِ لطیفہ روزی روٹی کی ضمانت نہیں دیتے۔ اپنے ذہنی رجحان کے برعکس اس نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی۔ لیکچرر شپ اس کی ترجیح تھی لیکن اسے نوکری ملی ایک تحقیقی ادارے میں اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر کی اور اس نے اپنی اور اپنے کنبے کی ضرورتیں پوری کرنے کی خاطر یہ نوکری قبول کر لی۔ حامد ایک محنتی اور مستقل مزاجی سے کام کرنے والا شخص تھا۔ اس کی محنت رنگ لائی اور وہ پینتیس سال کے عرصے میں جونیئر آفیسر اور پھر سینئر آفیسر ہو گیا اور یوں باعزت ریٹائرمنٹ کے مرحلے تک آ پہنچا۔ اکثر اوقات جب اس کے ساتھی اس کی نوکری اور تعلیم کے بے جوڑ ہونے کی بات کرتے تو وہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لا کر مختصر جواب دیتا: ''مالک نے میرے لیے یہی روزی لکھی۔'' اگرچہ اس کی زندگی مثالی نہ تھی تاہم وہ ایک قانع شخص تھا۔ گلہ گزاری اس کے ہونٹوں پر کم ہی آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب جبکہ وہ ریٹائرمنٹ کے بالکل قریب تھا اور اسے نوکری میں توسیع کا مشورہ دینے والوں کی کمی نہ تھی اس نے کبھی اس مشورے کو وزن نہیں دیا تھا۔ اللہ نے اسے ایک بیٹا دیا تھا جس کی شادی اس نے حال ہی میں کر دی تھی۔ دورانِ ملازمت اس

نے محلے سے قرض لے کر پانچ مرلے کا ایک گھر لے لیا تھا جس کی بقیہ قسطیں وہ گریجویٹی سے ملنے والی رقم سے یکمشت ادا کر دے گا۔ آج دفتر میں اس کا آخری دن تھا۔ اس کے لیے الوداعی پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ پارٹی میں اس نے افسروں کی رہنمائی اور ساتھیوں کی معاونت کا شکریہ ادا کیا اور بوجھل دل سے انہیں الوداع کہا۔ چھٹی کے وقت وہ کمیونٹی وین (Community Van) کی طرف چلا تو اپنے آپ کو سبک پایا۔ آج وہ ایک بہت بڑی ذمہ داری سے آزاد ہو گیا تھا۔ کمیونٹی وین دفتر سے نکل کر مقررہ راستے پر چلی تو ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ارشد نے اس سے پوچھا: "حامد صاحب فراغت میں کیا کریں گے؟ کیا پروگرام ہے؟" "کیا کریں گے" حامد نے مسکراتے ہوئے کہا "سوئیں گے اور کیا؟" پھر قدرے سنجیدہ ہو کر کہنے لگا: "بہت ساری ایسی کتابیں ہیں جو میں پڑھنا چاہتا ہوں ـــــ وہ پڑھوں گا ـــــ پینٹنگ کروں گا ـــــ" کمیونٹی وین میں بیٹھے دوسرے لوگوں کی توجہ ان کی گفتگو کی طرف تھی۔ باتوں باتوں میں وین کینال روڈ پر پہنچی۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر وہ کتنے عرصے سے آتا جاتا رہا تھا لیکن آج یہ اجلی اجلی لگ رہی تھی۔ جاڑے کی خنک ہوا میں اس کے کنارے کھڑے درختوں کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ سڑک کے موڑ پر بیٹھی مکئی بھونے والی کالی کلوٹی عورت میں ایک دلکشی آ گئی تھی۔ سڑک چھوڑ کر گلی کو جانے والا راستہ صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ پان سگریٹ کی دکان پر کھڑے لڑکے اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی تھی۔ گھر پہنچنے پر اس کی بیوی راشدہ نے اس کا استقبال کیا۔ جب تک اس نے کپڑے بدلے راشدہ میز پر کھانا لگا چکی تھی۔ راشدہ متناسب قد و قامت والی ایک ادھیڑ عمر خاتون تھی۔ وہ گورے رنگ کی ایک خوش شکل لیکن سخت عورت تھی جو زندگی میں ہر قدم ناپ تول کے رکھنا چاہتی تھی۔ وہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی اور رکھ رکھاؤ اس کی فطرت میں شامل تھا۔ میاں بیوی کھانا کھا چکے تو راشدہ نے بات شروع کی: "تو آپ ریٹائر ہو ہی گئے!" "ہاں بھئی یہ دن تو آنا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ نوکری خیر خیریت سے انجام پا گئی!" تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ راشدہ نے سکوت توڑا: "آپ کو دوستوں نے ایکسٹینشن (Extension) کا مشورہ بھی تو دیا تھا۔" "ہاں دیا تو تھا" حامد نے جواب دیا۔ "پھر ـــــ" "پھر؟ ـــــ اس بے روزگاری کے دور میں اول تو ایکسٹینشن مشکل ہے اور ـــــ کیا یہ اچھا نہیں کہ میری جگہ پر کوئی اور آ جائے گا اور یوں ایک اور آسامی پُر ہو جائے گی۔" "ایک تو ساری عمر آپ کو اوروں کی فکر نے نہیں چھوڑا ـــــ" راشدہ بولی۔ "اللہ کی بندی پہلے تو ایکسٹینشن لینا ایک مشکل عمل ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم دو جیوں کے لئے پنشن کیا کم ہو گی؟ صبر شکر سے گزارہ کریں تو بہت ہے" حامد نے بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔ "پیسے کی ضرورت تو مرتے دم تک ہوتی ہے اور آپ صبر شکر کی باتیں کرتے ہیں ـــــ بلقیس کے میاں کو دیکھیں۔ وہ آپ سے دو چار سال پہلے ریٹائر ہوئے تھے لیکن انہوں نے ایکسٹینشن لے لی ـــــ" "بھئی اپنی اپنی ضرورتیں ہیں ـــــ بہر حال میں نہیں سمجھتا کہ مجھے ایکسٹینشن لینی چاہیے تھی" حامد نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر راشدہ وہاں بیٹھی رہی اور پھر وہ بھی کمرے میں چلی گئی۔ دن گزرتے گئے۔ حامد اب بعد از ریٹائرمنٹ زندگی گزار رہا تھا۔ وہ صبح آرام سے اٹھتا۔ اخبار دیکھتا۔ اطمینان سے ناشتہ کرتا۔ دوپہر کو سبزی گوشت لینے کے لئے باہر نکلتا اور پھر باقی وقت کوئی کتاب پڑھتا یا پینٹنگ کرتا۔ وہ رات گئے تک پڑھتا رہتا اور صبح عموماً دیر سے اٹھتا۔ راشدہ اس کے اس عمل سے بیزار رہنے لگی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ رات بھر جاگتے ہیں اور صبح کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو سو جاتے ہیں۔" وہ تنک کر کہتی۔ حامد کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ریٹائرمنٹ کے فوری بعد کے عرصے میں حامد کچھ عرصہ تو باقاعدگی سے شیو کرتا رہا لیکن پھر وہ سست سا ہو گیا۔ اب وہ تین تین دن داڑھی بڑھ جانے پھرتا رہتا تھا اور راشدہ اسے ٹوکتی رہتی: "یہ کیا حلیہ بنائے پھرتے ہیں آپ۔ یا تو داڑھی رکھ لیں اور یا

باقاعدگی سے شیو کیا کریں۔ آپ کو ایسی حالت میں الجھن نہیں ہوتی؟" اب راشدہ اُسے روزانہ کٹہرے میں کھڑا کرنے لگی تھی۔ کبھی شیو نہ کرنے پر، کبھی دیر سے اٹھنے پر، کبھی وقت پر کپڑے نہ بدلنے پر اور کبھی پنشن کا ایک خاصہ حصہ کتابوں اور پینٹنگز کا سامان خریدنے پر۔ حامد کو محسوس ہونے لگا کہ اُس نے ریٹائرمنٹ کی بعد کی زندگی کا جو نقشہ بنایا تھا وہ غلط ثابت ہونے لگا تھا۔ وہ ایک سراب تھا۔ اب اُسے دفتر کی وہ زندگی یاد آنے لگی تھی جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر دوپہر کی چائے پیتا تھا، اپنے ساتھیوں کی ترقی اور تبادلوں کی باتیں کیا کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر ریٹائرمنٹ کے بعد کی خوشگوار زندگی کے تصور میں خیالی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ اور پھر ایک دن وہ اپنے محلے میں رہنے والی عظمت پراپرٹی ڈیلر کے دفتر جا پہنچا۔ کچھ عرصہ پہلے کی ملاقات میں عظمت نے اُسے اپنے کاروبار کے بارے میں بتایا تھا اور یہ عندیہ بھی دیا تھا کہ اُسے ایک مددگار کی ضرورت ہے جو دفتر میں بیٹھ کر ٹیلیفون کے ذریعے اس کے موکلوں کے کوائف نوٹ کر سکے۔ اگلی صبح حامد علی الصباح بیدار ہوا، شیو بنائی، ناشتہ کیا اور کتاب بغل میں دبا کر گھر سے نکل گیا۔ وہ عظمت پراپرٹی ڈیلر کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ دروازے پر کھڑی راشدہ کا چہرہ جذبات سے عاری تھا!!!

◆◆◆

افسانچہ

بوڑھا پینشنر

حنیف باوا

فلاں پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اس کے ایک ویران سے ریلوے اسٹیشن پر رات کے اندھیرے میں ٹوٹے پھوٹے ہوئے ایک چھوٹے سے بنچ پر بیٹھا ایک بوڑھا ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے کہ شاید اُسے کوئی ذی روح نظر آ جائے جس کی موجودگی اسے کچھ ڈھارس دے—لیکن وہاں تو سوائے ویرانی کے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلا بیٹھا سوچوں میں گم اس گاڑی کا انتظار کر رہا ہے جو اُسے اس بیٹے کی طرف لے جائے جو اُس کا اپنا نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا پن کر دکھائے اور وہ اس کے تینوں بیٹوں سے قطعی طور پر الگ دکھائی دے جو اس کی تمام پنشن ہڑپ کرنے پر بھی تلے رہتے ہیں۔ "ابا تو جانے اپنی ساری پنشن کسے دیتا ہے۔ ہمارے پلے تو کچھ بھی نہیں پڑتا۔ اب تو وہیں جا کر رہ، جا کر جہاں تیرے سارے پیسے ہضم ہوتے رہتے ہیں۔" ایسے میں رات کا اندھیرا مزید گہرا ہو جاتا ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تو دائیں جانب سے ایک مسافر گاڑی سیاہ دھواں اگلتی ہوئی آہستہ آہستہ اس پرانے اور ادھڑے ہوئے پلیٹ فارم پر آ کر رک جاتی ہے۔ اس کی آخری منزل نہ جانے کہاں ہے۔ وہ گاڑی چند لمحے وہاں ٹھہرتی ہے اور بوڑھا پنشنر اس کے پچھلے ڈبے میں سوار ہو جاتا ہے۔ گاڑی کی روانگی کی سیٹی بجنے سے پہلے وہ بوڑھا اپنی جیب سے تمام پنشن نکالتا ہے۔ پہلے وہ کچھ دیر تک اسے غور سے تکتا ہے اور پھر اسے جھٹ پٹ ہاتھ پر بکھیر دیتا ہے اس امید پر کہ اُسے اپنا ضرور مل جائے گا—جب اس کی سوچ یہاں پہنچتی ہے تو اس کے چہرے پر ایک روشنی سی آ جاتی ہے جس کی رو میں گاڑی قدم الٹاتی ہوئی رفتہ رفتہ اس پرانے ریلوے اسٹیشن کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ جب وہ بوڑھا پنشنر گاڑی کی کھڑکی سے پیچھے کی طرف دیکھتا ہے تو گاڑی کا چھوڑا ہوا کالا دھواں اسٹیشن پر ابھی تک منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے پر اس کے چہرے کی روشنی اسی طرح برقرار رہتی ہے۔ اب وہ عقب سے منہ موڑ کر کشادہ آنکھوں سے سامنے کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ گاڑی حسب سابق کالا دھواں اگلتی ہوئی آگے کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے اور وہ بوڑھا پنشنر اپنی نشست پر بیٹھا سوچوں میں گم ہو جاتا ہے۔

گرداب میں پھنسے ہم......؟

ڈاکٹر اشرف آثاری (انڈیا)

مختصر تعارف

محمد اشرف شاہ نام ہے اور اشرف آثاری قلمی نام۔ میڈیکل موضوعات پر اردو میں کئی تصانیف ہیں جو ہندوستان بھر کی لگ بھگ ہر لائبریری کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ اردو میں اب تک دو افسانوی مجموعے، اقبالیات اور اردو تنقید پر ایک کتاب منظر عام پر آ چکی ہے۔ کئی کتب زیر ترتیب بھی ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو ''ڈاکٹر اشرف آثاری اور اس کی افسانہ نگاری'' پر ایم۔ فل کی ڈگری دے چکی ہے اور ایک یونیورسٹی میں بھی تحقیقی مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ ہندوپاک کے معروف رسائل و جرائد میں میری شاعری، افسانے، تبصرے، تجزیے، تنقیدی اور علمی مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ شاعری میں مرحوم عشرت کرتپوری کے شاگرد ہیں جو خود پہلے جگر مرادآبادی اور پھر قبلہ احسان دانش کے شاگرد تھے۔ اس لیے اپنے آپ کو ''احسان اسکول'' سے وابستہ کہہ سکتے ہیں۔ دو رسائل (ادبی اور علمی) کے مدیر اور ''...'' کی کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل ہیں اور ان کے کئی ضخیم نمبر بھی ترتیب دے چکے ہیں جنہیں ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔

لگ بھگ چالیس سال تک ہسٹری جیسا خشک سبجیکٹ پڑھانے کے بعد ریٹائرمنٹ پر یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب اطمینان کے ساتھ زندگی گزرے گی۔ نہ یونیورسٹی جانے کی جلدی ہوگی، نہ روز روز کسی نئے موضوع پر لیکچر دینے کے لیے گھنٹوں لائبریری میں کتابوں کے اندر سر کھپانا پڑے گا، نہ نئے ریسرچ اسکالروں سے میٹنگ اور نہ امتحانی پرچے سیٹ کرنے یا مارکنگ وغیرہ کی کوئی پریشانی یا جھنجھٹ ہی ہوگا؟ جو جی میں آئے گا کروں گا، گھوموں پھروں گا، سیر سپاٹے کروں گا، اطمینان سے لیٹے رہوں گا یا پھر حسب دستور اپنی لائبریری میں کتابوں کی ورق گردانی کروں گا یا پھر لکھوں گا۔ مگر معروف یونیورسٹیز کے پروفیسروں کو، خاص طور پر اگر انہوں نے نام بھی کمایا ہو، ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آرام کہاں نصیب ہوتا ہے؟ سکون نام کی شے سے وہ واقف ہی نہیں ہوتے؟ کوئی نہ کوئی کام، کوئی نہ کوئی مصروفیت کہیں نہ کہیں سے نکل ہی آتی ہے اور اگر اچھی رقم بھی ملنے والی ہو تو پھر سونے پہ سہاگا۔ کام کا کام اور مصروفیت کی مصروفیت اور ہاتھ بھی گرم۔ اب کے بار میری اسائنمنٹ پبلک سروس کمیشن میں ہائر ایجوکیشن میں ہسٹری کے لیکچراروں کی اسامیوں کے انٹرویو ہے۔ بحیثیت انٹرویو ممبر میرا تقرر صیغۂ راز رکھا گیا ہے تاکہ سفارشی فون آنے نہ شروع ہو جائیں۔ انٹرویو بھی ایک ہی دن میں ختم ہونے والا ہے۔ انٹرویو چیمبر میں جانے سے قبل میرے ساتھ دیگر دو انٹرویورس کو اپنے موبائل فون جب تک سوئچ آف رکھنے ہوں گے جب تک وہ انٹرویو سے فارغ نہ ہو جائیں اور لسٹ بھی اسی وقت فائنل کرنی ہوں گی۔ میرے ساتھ دیگر دو اشخاص کو بھی انٹرویو میں شامل رہنا ہے ان میں ایک پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین اور دوسرے

کمیشن کے ایک سینئر ممبر ہیں متعلقہ مضمون میں ماہر بس میں ہی ہوں اس لیے اس میں مجھے ہی سوال کرنے ہوں گے وہ دونوں جنرل بات پر سوال پوچھ سکتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ تیس کے قریب امیدواروں کی لسٹ فائنل کی گئی ہے اور منتخب امیدوار سخت مقابلے کے بعد ہی یہاں تک پہنچے ہیں اور کافی ذہین ہیں۔ ان میں بھی صرف بارہ کا ہی قابلیت اور میرٹ پر انتخاب ہونا ہے کیونکہ کل بارہ ہی پوسٹ ہیں جن میں بھی چار پوسٹ رزیرو کیٹگری کے امیدواروں کے لیے مختص ہیں۔

گو کہ میرے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بہت محتاط رہنا پڑتا ہے کیونکہ اکثر طالب علم بڑے ذہین وفطین ہوتے ہیں سنا ہے کہ کچھ اسٹوڈنٹ ملکی اور غیر ملکی علمی اداروں سے بھی فارغ التحصیل ہیں اور پھر آج کل نیٹ کا زمانہ ہے کہ ہر سبجیکٹ کے متعلق مکمل آگہی گھر میں ہی دستیاب ہے وہ بھی بالکل آسانی کے ساتھ۔ انٹرویو میں ایک دن رہ گیا ہے اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ میں بھی اس سہولت کا فائدہ اٹھاؤں اور اپنی انفارمیشن ذرا اپ ڈیٹ کروں موضوع **Freedom Struggle of India** ہے۔ اتوار کو ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے ریڈنگ روم میں اطمینان کے ساتھ داخل ہو گیا حسب معمول اپنا لیپ ٹاپ آن کر کے میل چیک کرنے کے بعد اس موضوع پر سرچ شروع کر دی۔ دنیا بھر کا اس موضوع سے جڑا مواد آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور کتابوں کے اوراق یکے بعد دیگرے کھلنے لگے جن کا تعلق مختلف ممالک کی جنگ آزادی سے ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھیں 1940ء کے برطانوی جاسوس رچرڈ ایمرسن کی کتاب پر مرکوز ہو گئیں بنیادی طور پر یہ ایک کتاب نہیں بلکہ ایک ذاتی ڈائری ہے جسے اس وقت کے برطانوی جاسوسی محکمہ کے ایک انتہائی قابل اور پڑھے لکھے آفیسر رچرڈ ایمرسن روزانہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ لکھا کرتے تھے جو اس وقت ہندوستان میں محکمہ سراغرسانی میں تعینات تھے اور برطانیہ کی تعینات تھے اور اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس کتاب یا ڈائری میں ہندوستان کی **Freedom Struggle** کے بارے میں وہ حیرت انگیز اور ناقابل یقین انکشافات کیے گئے ہیں جن کا اس موضوع پر آج تک لکھی جانے والی کتابوں میں کہیں پر کوئی سرسری تذکرہ تک نہیں ملتا۔ خود میں نے بھی ان واقعات میں سے اکثر کو ہسٹری کے اپنے طالب علمی کے زمانے سے لے کر آج تک کہیں نہیں پڑھا یا سنا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ برطانیہ کے سراغ رساں محکمے کے چیف کی ذاتی ڈائری پر رقم یہ واقعات اس کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے حقائق ہیں اس لئے ان کی صحت کے متعلق سوالات کھڑے نہیں کیے جا سکتے۔ ان کی اس ڈائری میں فوج، پولیس، سراغرسانی، عدلیہ اور دیگر اہم محکمہ جات کے ذمہ داروں کی میٹنگوں کا احوال بھی درج ہے۔ مسائل ومعاملات، فیصلوں اور تجاویز وغیرہ کا، جن کی مکمل واقفیت سے مجھ جیسا عمر بھر ہسٹری پڑھانے والا شخص تک بہت پریشان ہو جاتا ہے جس کے لئے لگ بھگ نصف صدی تک یہ موضوع اوڑھنا اور بچھونا رہا ہو۔ اس ڈائری کے مصنف کی پوری ڈائری ہی انکشافات سے بھری پڑی ہے میں بطور خاص اس ایک واقعے کا ذکر کرنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں، لکھتے ہیں: ''—— ملک میں ہر جگہ ہندوستان چھوڑو دو کی تحریک نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ گولیاں، گرفتاریاں، مار دھاڑ، اقتصادی بدحالی، ظلم وجبر یا بھی رسہ کشی کو ہوا دینا اور مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے اور جھگڑوانے کے فرقہ وارانہ فسادات برپا کروانے، لیڈروں اور عام لوگوں کو پیسے اور منصب کا لالچ دینے اور اس طرح کے دیگر حربے مکمل طور پر ناکام ہو گئے تو سب ذمہ داروں نے ایک خاص میٹنگ میں ہاتھ کھڑے کر کے اپنی نظریں میری طرف کر لیں اور سراغرسانی محکمے کی چیف مسٹر رچرڈ ایمرسن کو عاجزی اور انکساری کے ساتھ کچھ کرنے کی گزارش کی تاکہ برطانیہ سرکار کا اقتدار اعلیٰ قائم رہ سکے۔'' مسٹر رچرڈ ایمرسن اس سے قبل اپنی اس ڈائری پر ایک مختصر نوٹ کے ذریعے سے وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے ماتحت اس سے قبل اندھیرا ہوتے ہی ڈرائی اور

ہیبت ناک صورتیں بنا کر گاؤں اور شہروں کی مختلف آبادیوں میں نمودار ہو کر اور رات کی تاریکی میں مکین کی چھتوں پر سنگباری کر کے لوگوں کو کافی ڈرا چکے تھے تاکہ ان کی توجہ کسی اور جانب مبذول کی جا سکے اور ہر طرف خوف و دہشت پیدا کی جا سکے لیکن ان حربوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ یہ سب آپریشن ٹیچ اینڈ کِل اور آپریشن آل آؤٹ جیسے انتہائی سنگین اور سخت اقدامات کے علاوہ تھے۔ رچرڈ ایبرسن لکھتے ہیں کہ جب سب افسروں نے ہاتھ کھڑے کر کے بال میرے کورٹ میں پھینک دی اور سب لوگ میری طرف بے بسی سے تک رہے تھے تو میں نے بھی انہیں تسلی دیتے ہوئے بڑے اطمینان و فراخدلی سے کہا کہ "آپ سب لوگ یہ معاملہ میرے اوپر چھوڑ دیجئے، میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔" میرے اس جواب سے میٹنگ میں موجود سب ذمہ دار افسروں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے اور ان کے چہروں پر بشاشت سی دوبارہ لوٹ کر آ گئی اور میٹنگ برخاست کی گئی۔

رچرڈ ایبرسن لکھتے ہیں کہ اس میٹنگ کے تیسرے دن، شہروں اور گاؤں سے عورتوں کی چوٹیاں کاٹنے کی خبروں نے ایک کہرام سا بپا کیا اور چاروں سو ہیبت سی پھیلا دی اور سب لوگ عورتوں کی چوٹیاں کاٹنے کو غیرت کا معاملہ سمجھ کر اپنے لیڈروں کے ساتھ سڑکوں پر آ گئے اور ہر طرف ایک ہی ہاہاکار مچ گئی۔ سیاسی لیڈروں کی تقریر بازی شروع ہو گئی، سڑکوں اور چوراہوں پر جلسے جلوس ہونے لگے اور اخبارات میں مذمتی بیانات شائع ہونے لگے۔ سرکاری مشینری متحرک ہو گئی، پولیس اور سراغرساں ایجنسیوں کی یقین دہانیاں اخبارات کی زینت بننے لگیں کہ وہ مجرموں کو بہت جلد منظر عام پر لا کر، کیفر کردار تک پہنچائیں گے۔ سرکاری کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، انتظامیہ کو خصوصی ہدایات دیئے گئے اور کئی بے گناہوں کو مارا پیٹا بھی گیا اور بھی بہت کچھ کیا گیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ تھا اور اس طرح کی مسلسل وارداتوں کے باوجود بھی کوئی Culprit حاکموں کے ہاتھ نہیں لگ سکا اور نہ کوئی قصوروار ہی سامنے آ سکا۔ اب تک لوگوں کے اذہان سے اصل معاملے سے توجہ عارضی طور پر ہی سہی ہٹ گئی تھی۔ اس ڈائری کا آخری ورق 30 اکتوبر 1942ء کا لکھا ہوا ہے۔ انٹرنیٹ پر برطانیہ کے بدنام زمانہ جاسوسی محکمے کے چیف کی ذاتی ڈائری کے اوراق کو لاتعداد لوگوں نے پڑھا ہے ان میں سے بہت لوگوں نے طرح طرح کے منفرد و مخصوص، مخالف و متضاد، اچھے اور برے تاثرات بھی رقم یا ریکارڈ کروائے ہیں میں صرف دو لوگوں کے تاثرات کی بات کروں گا ان میں سے ایک برطانوی اور دوسرا ہندوستانی شہری ہے۔ "۔۔۔۔اس جانباز کا دل، واقعی ملک و قوم کے لئے کچھ کرنے کے جذبے سے سرشار تھا اور پھر اس قوم پرست مرد مجاہد کا انتقال 24 اکتوبر 1942ء کو اچانک Cardic arrest سے ہو گیا۔ خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے! حکومت برطانیہ نے رچرڈ ایبرسن کو اسی سال اپنے سب سے بڑے فوجی ایوارڈ سے بھی نوازا!!   رابرٹ پارکے ہندوستانی شہری تھورام نے اپنے تاثرات یوں دیئے تھے۔ "۔۔۔۔ اور پھر اس کے باوجود بھی 1947ء میں برطانوی سامراج سے ہندوستان آزاد ہو گیا اور غلامی، محکومی، جبر و استبداد کا سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا اور آزادی کی صبح طلوع ہو گئی۔۔۔!" مجھے لگا کہ کمپیوٹر کے اسکرین پر پیچھے کرسر جیسے کچھ زیادہ ہی بے قرار ہو کر تڑپ تڑپ کر، میرے تاثرات جاننے کے لئے ٹھہر رہا ہے۔ میں بھی جیسے بے بس سا ہو گیا، میری شہادت کی انگلی جیسے ہی تاثرات رقم کرنے کے لئے اوپر اٹھی ۔۔۔ پھر جیسے وہ معلق سی ہو کر رہ گئی، بہت کوشش کرنے کے بعد، جب میرے گرداب میں پھنسے دل و دماغ نے، اسے تاثرات رقم کرنے کے لیے آمادہ کر لیا تو لیپ ٹاپ کے اسکرین پر ایک کیپشن آ گیا۔ Sorry وہ تعمیل کرنے سے قاصر ہے آپ کے پاس ایک ہی آپشن بچا ہے کہ آپ اپنے لیپ ٹاپ کا سوئچ آف کریں!

◆◆◆

گرہن......1

شائستہ مفتی

مختصر تعارف

شائستہ مفتی 21 ستمبر کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ "ہوا کے ہاتھ" کے نام سے پہلا شعری مجموعہ 2009ء میں جبکہ 2018ء میں دوسرا شعری مجموعہ "محبتوں کے شہر میں" شائع ہوا۔ افسانوں کی کتاب پر کام کر رہی ہیں جو کہ "رات کی کتاب" کے نام سے جلد شائع ہو رہی ہے۔ شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ مصوری بھی کرتی ہیں۔

سنا ہے سورج کو گرہن لگا تھا جب وہ اس دنیا میں آیا تھا۔ صلو کی پیدائش کا واقعہ خاندان کی بڑی بوڑھیوں کو آج بھی ازبر تھا— جب بھی خاندان کے سب لوگ کہیں جمع ہوتے اور کسی حوالے سے صلو کا ذکر آتا، ساری خواتین بڑے زور و شور سے صلو کی پیدائش کا تذکرہ چھیڑ دیتیں۔ صلو کو یہ بار بار کا تماشہ سخت ناپسند تھا۔ "آخر ان لوگوں کو کسی کا مذاق بنانے کا اتنا شوق کیوں ہے؟" زچ ہو کر سوچتا— ایسے موقعوں پر صلو فوراً گھر سے باہر نکل جاتا۔ ادھر اُدھر سنسان گلیوں میں تنہا تنہا پھرتا رہتا۔ ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا پہنے، دور سے دیکھنے میں کوئی بھوت ہی لگتا تھا— کبھی کبھی جب دل بہت دکھی ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑی سی لگ جاتی تھی— مگر کسی کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ سب کو اپنے ہنسی ٹھٹھول سے مطلب تھا۔

سنا تھا کہ سورج گرہن میں پیدا ہونے والے بچوں میں کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی ہے۔ اماں بتاتی ہیں کہ جب صلو پیدا ہونے والا تھا تو وہ بہت ڈری ہوئی تھیں۔ صلو پہلوٹھی کا بچہ تھا اور عین اس کی پیدائش کے دن سورج گرہن کی پیشن گوئی کی گئی تھی۔ سارا گھرانہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ صحت مند اولاد دے۔ صلو کی ماں کا رو رو کر برا حال تھا۔ سب سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے کہ وہم دل میں نہ لاؤ مگر ماں کے دل کو کسی طرح بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ سورج گرہن کی مٹیالی روشنی میں صلو اس دنیا میں آیا۔ گھر والوں نے اطلاع دی کہ لڑکا پیدا ہوا ہے اور الحمدللہ کوئی خرابی نہیں ہے۔ سرخ سفید، گول مٹول سا خوبصورت بچہ۔ گھر والوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ صلو بالکل نارمل بچہ تھا۔ صرف ایک بات جو صلو کی ماں کو پریشان کرتی تھی وہ یہ تھی کہ صلو رو رو کر اپنا برا حال کر لیتا تھا۔ روتے روتے صلو کی ہچکی بندھ جاتی تھی مگر رونا ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اسی طرح روتے بسورتے صلو بڑا ہونا شروع ہو گیا۔ جانے کیوں جب سب گھر والے مل جل کر بیٹھتے اور گھر بھر میں ہنسنا بولنا ہوتا، عین اسی لمحے صلو کو رونا دھونا یاد آ جاتا۔ گھر والے اپنی باتیں چھوڑ کر صلو کو چپ کرانے میں لگ جاتے۔ ایسے موقعوں پر صلو کی ماں ایک پُراسرار سناٹے میں گم ہو جاتی۔ صلو کی ماں صلو کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگتی۔ ماں کی آنکھوں کو وہ کچھ نظر آ جاتا جو شاید کسی

کو بھی نظر نہ آتا۔

اسکول پہنچنے کی عمر تک صلو ہر وقت نظر جھکائے، منہ لٹکائے چپ چاپ کہیں گم صم رہتا۔ یوں لگتا جیسے وہ اپنے آپ سے خوش نہیں ہے۔ پیدائش کے وقت صلو ایک خوبصورت بچہ تھا مگر دن بدن صلو کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔ صلو کے چھوٹے بہن بھائی ہر وقت ہنستے بولتے رہتے مگر صلو پر ہر وقت ایک انجانی اداسی چھائی رہتی اور پھر صلو کی ماں کو یاد آ جاتا کہ وہ جب پیدا ہوا تھا تو سورج کو گرہن لگ گیا تھا۔ صلو کی ماں دل ہی دل میں کڑھتی رہتی مگر کچھ بھی نہ کر پاتی۔ پورے چاند کی تاریخ پر صلو کو جانے کیا ہو جاتا۔ سب سے چھپ کر چھت پر جا بیٹھتا اور چپکے چپکے آنسو بہانا چاہتا تھا۔ کوئی بھی صلو کی اس کیفیت کو نہیں سمجھ پاتا۔ یونہی ناراض اور ناخوش صلو جوان ہو گیا۔ جوانی کی دستک بھی صلو کے لیے ہجر کا عذاب لے کر آئی۔ ماں چاہتی تھی کہ صلو باقی لڑکوں کے ساتھ کھیلے کودے۔ محلے پڑوس میں دوستیاں کرے مگر صلو کو صرف تنہائی پسند تھی۔

کوچہ و بازار کی رونقوں سے صلو خوفزدہ ہو جاتا۔ عید آتی تو عید کی گہما گہمی سے پریشان ہو جاتا۔ بازار سجتے، خوش باش لوگ عید کی خریداری کرنے نکلتے۔ لڑکیاں رنگ برنگی چوڑیاں خریدتیں۔ سب کے کھلے کھلے چہرے دیکھ کر صلو کا چہرہ دکھ سے سیاہ ہو جاتا۔ صلو چاہتا تھا کہ جس طرح وہ اندر سے دکھی ہے سب لوگ دکھی ہو جائیں۔ سب اس درد سے آشنا ہوں جس سے وہ ہر لحظہ نبرد آزما رہتا ہے۔ صلو کی ماں ٹھنڈی آہ بھر کر دل ہی دل میں سوچتی "ہائے میرے صلو——!! تجھ کو گرہن لگ ہی گیا——" ماں کو صلو کی آنکھوں میں گرہن صاف نظر آتا!!! اور پھر اچانک گرہن پوری دنیا کو لگ گیا۔ ایک عالمگیر وبا نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دنیا جیسے تھم گئی، بالکل اسی طرح جیسے سیل ختم ہونے پر گھڑی رک جاتی ہے۔ سب کچھ تھم گیا، لوگ خوفزدہ ہو کر اپنے گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اس اچانک تبدیلی پر صلو کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ گلیاں سنسان ہو گئیں، بازار ویران ہو گئے۔ اس ویرانی میں صلو گھر سے نکلتا اور شہر آشوب میں کسی بادشاہ کی طرح گھومتا پھرتا۔ بند بازاروں اور ویران سڑکوں پر صلو کی مسکراہٹ جگنوؤں کی طرح اندھیرے میں چمکتی...... آخر کار قدرت کو صلو پر ترس آ ہی گیا...... صلو شاید یہی چاہتا تھا۔ اپنی ذہنی سوچ پر صلو بہت نازاں تھا۔ "کیا ضرورت ہے خوش ہونے کی؟؟؟ آخر کار ہم سب کو مر ہی جانا ہے۔ ہم سب کو رونا چاہیے۔ بین کرنا چاہیے جیسے یہ ہوائیں رو رہی ہیں، ستارے کسی کے پلکوں سے ٹوٹے ہوئے آنسو لگ رہے ہیں اور یہ چاند!!! اس چاند کو تو ہمیشہ کے لئے گرہن لگ جانا چاہیے۔ میں بھی تو گہنایا ہوں——!!"

گھر والے حیران تھے کہ صلو کو کیا ہو گیا ہے؟ ہر وقت اداس اور نامراد رہنے والے صلو کی مسکراہٹ چھپائے نہ چھپتی تھی۔ سب لوگ پریشان تھے مگر صلو کے چہرے پر گہرے اطمینان اور سکون کی چھاپ تھی۔ آٹھ مہینے گزر گئے مگر وبا تھی کہ قابو میں ہی نہ آ رہی تھی۔ آخر کار وقت آیا کہ حالات معمول پر آنے کی امید چمکنے لگی۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ صلو نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا مگر صلو نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں لوٹ آئیں۔ صلو کو تو رنج و غم سے ٹوٹے ہوئے لوگ ہی اچھے لگتے تھے۔ گرہن کے مارے ہوئے گرہنی کو صرف ویرانہ ہی پسند تھا۔ وقت کی گردش کو روکنا گرہنی کے بس میں نہ تھا۔ سورج پھر سے آب و تاب سے چمکنے لگا مگر گرہنی تو گرہنی ہی رہتا ہے۔ کوچہ و بازار پھر سے سج گئے۔ لوگوں کے چہرے کھل اٹھے اور صلو اپنے اندھیروں میں لوٹ گیا۔

◆◆◆

دولھن دو روپے میں

آغا شاہد

مختصر تعارف

10 دسمبر کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔ 1977ء میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا جو تا حال جاری ہے۔ اردو اور پنجابی زبانوں میں افسانے تحریر کرتے ہیں۔ اخبارات میں کالم بھی تحریر کرتے رہے ہیں۔ ڈراما ڈائریکٹر ہیں۔ بچوں کے فیسٹیولز بھی ڈائریکٹ کرتے ہیں۔ "منٹو" کے نام سے ڈراما ڈائریکٹ کیا جس پر بھارت میں رادھیکا تھیٹر کا بھی ایوارڈ حاصل کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے ایوارڈز سے نوازا گیا۔

بچپن بھی کیا چیز ہے۔ معصومیت بے خوف و خطر شرارتوں سے بھرپور احمد کا بچپن بھی اسی طرح کا تھا۔ اس زمانے میں کسی کسی کے پاس گاڑی ہوتی تھی۔ زیادہ تر لوگ سائیکل پر سفر کرتے تھے یا تانگے پر۔ احمد کے والد کے پاس اس زمانہ میں گاڑی تھی اور اکثر شام کو احمد کے والد محلے کے بچوں کو گاڑی میں سیر کرواتے۔ اس وقت لوگوں میں احساس، بھائی چارہ، محبت خوب تھی۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کا خیال رکھتے۔ اخلاق تو کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ احمد کے والد کاروبار کرتے تھے اور ان کو ہر اتوار والے دن فروٹ منڈی جانے کا شوق تھا۔ منڈی سے فروٹ اور سبزی سے گاڑی بھر لیتے اور واپس آ کر بہت سا فروٹ اور سبزی محلے میں بانٹتے۔ یہ بانٹنے کا کام احمد سے کرواتے۔ احمد کی عمر اس وقت تقریباً چھ سات سال ہو گی اور تمام محلے والے احمد سے بہت پیار کرتے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی گھر والا احمد کو اپنے گھر بلا لیتا۔ اس وقت سب لوگ ایک فیملی کی طرح رہتے تھے۔ احمد کے گھر کے بالکل سامنے ایک شاہ جی کا گھر تھا۔ شاہ جی کی عمر کوئی زیادہ نہیں تھی بس ان کی شادی ہونے والی تھی۔ احمد شاہ جی کے ساتھ بہت کھیلتا۔ اکثر شاہ جی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر چکر لیتا اور بار بار شاہ جی سے کہتا کہ پھر سے چکر دیں اور خوب ہنستا۔ احمد کی والدہ بہت نفیس اور نیک خاتون تھیں۔ تمام محلے کے بچے ان سے قرآن پاک پڑھنے آتے بلکہ احمد نے بھی اپنی والدہ سے ہی قرآن پاک پڑھا۔ اس زمانے میں لوگوں کی تفریح سیر کرنا، شام کو کھیلنا اور مغرب کے وقت واپس گھر لوٹ آنا۔ محلے کے سب بچے مل کر گراؤنڈ میں کھیلتے۔ فٹ بال اور ہاکی بہت کھیلتے تھے اور شام کو اکثر گلی ڈنڈا کھیلتے اور آٹھ بجے رات کا کھانا کھا کر 9 بجے سو جاتے اور صبح صبح چھ بجے احمد کے والد ورزش کرنے باہر نکل جاتے۔ والدین صبح کی سیر کرتے۔ تازہ ہوا لیتے اور درخت سے تازہ مسواک توڑ کر کرتے۔ دیسی گھی کے پراٹھے کھاتے۔ سادہ زندگی کا عروج اور تھا۔ محلے میں کسی کی شادی ہوتی سب لوگ احمد کے والد کو اس شادی کا انتظام سونپ دیتے۔ محلے کے اور بھی لوگ ان کی مدد کو لگ جاتے۔ اس وقت شادیاں دوپہر کی ہوا کرتی تھیں اور رات سے ہی کھانا پکانا شروع کر دیتے۔ احمد کے والد رات بھر اپنے سامنے کھانا پکواتے اور حلوائی کی جان مصیبت میں آ جاتی۔ بارات والے دن کھانا ورتانے کی ذمہ داری احمد کے والد خود سنبھالتے اور محلے کے نوجوانوں کو ایک لائن میں کھڑا کر کے کھانا ورتاتے۔ سب لوگ پوری

ذمہ داری سے کام کرتے جن کے گھر شادی ہوتی ان کو علم بھی نہ ہوتا کہ سب کام کس طرح ہوئے۔

اُس زمانے میں نہ تو اے سی ہوتا اور نہ ہی کولر۔ لوگ صحن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے۔ پہلے پورے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا پھر چارپائیاں بچھائی جاتیں اور ایک پنکھا ہوتا وہ لگا کر سب سو جاتے۔ احمد اپنے والدین کا لاڈلا بیٹا تھا وہ اکثر اپنے والدین کے ساتھ ہی سوتا مگر لاڈ پیار میں احمد کی تربیت بھی ایسی کی کہ جو بھی اُس کو ملتا اُس کی اور اس کے والدین کی تعریف ضرور کرتا۔ اس عمر میں بچے کا سلجھا ہوا ہونا ایک عجیب سی بات تھی۔ کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ شاہ جی کی شادی کا رشتہ ہو گیا اور ایک ماہ بعد شادی ہے۔ شاہ جی نے احمد کے والد سے کہا کہ میں احمد کو اپنا سربالا بناؤں گا۔ ایک ماہ گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا اور شادی کے دن شروع ہو گئے۔ بارات والے دن شاہ جی نے احمد کو سربالا بنا دیا۔ احمد کو نئے کپڑے اور گلے میں ہار پہنائے گئے۔ احمد جو کہ شاہ جی کے ساتھ سربالا بنا شاہ جی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دودھ پلائی کی رسم کا وقت ہو گیا۔ پہلے شاہ جی نے دودھ پیا پھر دلہن کو دودھ پلایا گیا۔ احمد یہ سب بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب دونوں نے دودھ پی لیا تو احمد اچانک سے بولا "میری باری"۔ یہ سن کر سب کی ہنسی نکل گئی۔ جب احمد کو دودھ نہ دیا گیا تو اُس نے رونا شروع کر دیا۔ اُس کو بہت سمجھایا کہ بچے یہ دودھ نہیں پیتے مگر وہ بضد تھا کہ میں نے یہ دودھ پینا ہے۔ آخر احمد کو بھی دودھ پلانا پڑا تو اُس کا رونا بند ہوا۔ رخصتی کا وقت ہو گیا بارات واپس آنے لگی سب لوگ چل پڑے۔ شاہ جی اپنی دلہن لے کر گھر آ گئے۔ گھر آ کر عورتیں دلہن کے پاس بیٹھ گئیں اور محلے کی عورتیں شاہ جی کی دلہن دیکھنے آنے لگیں اور سلامی دے رہی تھیں۔ شاہ جی کی بہن دلہن کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ احمد بھی گھر کے اندر ہی پھر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد احمد نے دیکھا کہ سب عورتیں دلہن کے پاس جاتیں اور اُس کا گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھتیں۔ احمد بھی دلہن کے پاس چلا گیا اور دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر دیکھنے لگا تو شاہ جی کی بہن نے اُسے روک دیا۔ احمد نے حیرانی سے باجی کی طرف دیکھا تو وہ بولیں پیسے دو تو دیکھ لو۔ احمد سوچ میں پڑ گیا وہاں بیٹھی باقی خواتین بھی مسکراتے ہوئے احمد سے کہنے لگیں دلہن کو پیسے دو گے تو وہ شکل دکھائے گی۔ اس وقت احمد کے پاس تو پیسے نہیں تھے وہ وہاں سے سیدھا اپنے گھر آیا اور معصوم سی شکل بنا کر والد سے کہا کہ مجھے دو روپے دیں۔ مجھے دلہن دیکھنی ہے وہ مسکرائے اور انہوں نے احمد کو نئے دو روپے کے نوٹ دیے۔ احمد خوشی خوشی واپس دلہن دیکھنے گیا تو شاہ جی کی باجی نے پھر کہا پیسے ہیں۔ احمد نے جلدی سے دو روپے دکھائے وہ دو روپے دلہن کی گود میں رکھے اور اُس کا گھونگھٹ اٹھا کر اُسے دیکھنے لگا۔

◆◆◆

بانو قدسیہ کا خراج تحسین

"تخلیق" نے اظہر جاوید کو پہچان بھی دی، نام، عزت اور شہرت بھی۔ لیکن "تخلیق" کی آبیاری کے لئے اسے کتنی قیمت چکانی پڑی یہ کوئی نہیں جانتا۔ میں نے شروع سے ہی اظہر جاوید کو ایک درویش کے طور پر یاد کیا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ان کی ساری زندگی درویشوں کے ساتھ تنگی میں گزری ہے اس لیے مجھے یہ بندہ درویش ہی نظر آتا ہے بلکہ جب آپ حضرت رابعہ بصری پر لکھی ہوئی اظہر جاوید کی کتاب پڑھیں گے تو آپ بھی اس میں چھپے ہوئے ایک سچے اور کھرے درویش کو ضرور پہچان لیں گے۔ (بانو قدسیہ کے لکھے مضمون "اظہر جاوید۔ [illegible]" سے اقتباس)

غزلیں

انور شعور

O

[illegible] کے بتا دیں گے
[illegible] کے بتا دیں گے

[illegible]
[illegible] کے بتا دیں گے

[illegible]
[illegible] کے بتا دیں گے

[illegible]
[illegible] کے بتا دیں گے

[illegible]
[illegible] کے بتا دیں گے

[illegible]
[illegible] کے بتا دیں گے

[illegible]
[illegible] کے بتا دیں گے

OOO

امین راحت چغتائی

O

جنھیں ہو شوقِ خدائی، انھیں خدائی دے
ہمیں تو اتنا ہی کافی ہے کچھ دکھائی دے

جہاں دی ہے بصارت دے بصیرت بھی
چلیں تو راستا سیدھا ہمیں دکھائی دے

لگا رہا ہے جہان سروں کی جو قیمت
ہمیں بھی اس کے تن و جاں تلک رسائی دے

جو سیرِ گل کو نکلتے ہیں صبح دم، ان کو
ہمیں گلی سے بھی تھوڑی سی آشنائی دے

ذرا زمیں پہ اتر کر بھی دیکھ دنیا کو
کہ بامِ اوج سے غفلت کہاں دکھائی دے

اُسے عروج و زوال مقام بھی تو نہ
ذرا سی دیر لگے حسن خود نمائی دے

کبھی ہیں گردشِ گرداب کے حصول میں
کہاں کسی کو کسی کی صدا سنائی دے

اسی سے پوچھ یہ تقدیرِ صبح و شام ہے کیا
کسی کو وصل، کسی کو سزا جدائی دے

صدا لگاتے ہوئے سوچتے رہے راحتؔ
کبھی تو وہ بھی گلی میں کہیں دکھائی دے

OOO

سلطان سکون

O

نگاہِ شوق سے کب ہر کسی کو دیکھتے ہیں
کہ جب سے دیکھا ہے تم کو تمھی کو دیکھتے ہیں

لبوں سی نازکی ہے پھر پنکھڑی میں کہاں
ہم ان لبوں کو بھی پنکھڑی کو دیکھتے ہیں

بہت ہیں سست ترے انتظار کی گھڑیاں
گھڑی گھڑی جو ہم اپنی گھڑی کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھ لیں کبھی اس کو تو دیکھتے رہ جائیں
جو طنز سے مری دیوانگی کو دیکھتے ہیں

ہمیں یہ غمزہ و ناز لگے ہے بے مصرف
جب اس کی سادگی شائستگی کو دیکھتے ہیں

اگر ہجوم میں بیٹھے ہیں خوش جمال کئی
کسی کو دیکھ لے سب پھر اسی کو دیکھتے ہیں

یہ تعزیت تو ہے رسمِ جہاں وگرنہ لوگ
کہاں خوشی سے کسی کی خوشی کو دیکھتے ہیں

کسے پڑی ہے کہ اندر کا حال بھی جانے
یہ لوگ ظاہری حالات ہی کو دیکھتے ہیں

کوئی جو راہِ محبت میں رکھ رہا ہو قدم
عجیب دکھ سے ہم اس آدمی کو دیکھتے ہیں

وہ سب سے مل کے بھی تو یوں دیکھتا ہے مجھ کو سکونؔ
کہ جیسے لوگ کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں

OOO

صابر ظفر

O

یہاں آ کے رُک گیا ہے، یہ گرد و ملال اداس
کوئی یاد آ رہا ہے، سرِ قتل گاہ اداس

مرے لوگ پوچھتے ہیں مرے روگ پوچھتے ہیں
یہاں آئے گا پھر کیا کوئی سوہنا یار اداس

کہاں صلہ صبح میں ہے، کوئی درد صبح میں ہے
سرِ شام کس کو پکارے یہ ہجوم بادہ خوار اداس

نہیں تو کس حساب ان کے، وہ ہم رکاب ان کے
کہ امید بخت تو ہے، یہ وجود شہسوار اداس

مرے ہر نفس کو کھینچے مجھے اپنی سمت کھینچے
یہ علاقہ شہیداں، یہ مزار سوگوار اداس

وہاں بکھرے بال پاؤں، وہاں پر نہ کھل پاؤں
کہ کہیں ہوں اس قفس کا، جہاں یار ہے نہ دیار اداس

ظفر اور چاہوں کیا میں کہ اسیرِ غم رہا میں
مجھے اپنے ساتھ لے لے، کوئی یادِ غم گسار اداس

OOO

آصف ثاقب

O

ہوش آتا تو وہیں چھوڑ کے سنبھل جاتا ہے
کوئی دیوانہ گھر گھر سے نکل جاتا ہے

مجھ کو محتاط طریقے سے بچائے رکھنا
کھوٹا سکّہ بھی تیرے شہر میں چل جاتا ہے

اس کو الزام نہ دو درد کی بے تابی کا
دل مرا دل ہی تو ہے پل میں مچل جاتا ہے

جب فرشتوں کی طرح سوچ نہیں ہے اپنی
پھر تو انسان ہی انسان سے جل جاتا ہے

اپنی جرأت میں کبھی وہ بول لیتے ہیں
ان کا تیور بھی، چہرہ بھی بدل جاتا ہے

میری راتوں کی مناجات ہے تاثیر بھری
ایک آنسو سے بڑا سیل بھی ٹل جاتا ہے

میں تو احساس کی شدت میں پڑا ہوں ثاقب
میرا دل پیار کے لفظوں سے بہل جاتا ہے

OOO

نجیب احمد

O

رنگ غم دل میں گھر نہیں ہوا
اتنا روشن یہ گھر نہیں ہوا

برق خائف یہ چاہتی ہی نہیں
آشیاں شاخ پر نہیں ہوا

اب تو رُک رُک کے پاؤں اٹھتے ہیں
اب مسلسل سفر نہیں ہوا

اس نے ایسا طلسم پھونکا ہے
میں اِدھر سے اُدھر نہیں ہوا

سب دیے تو جلا نہیں کرتے
ہر صدف میں گہر نہیں ہوا

جانے تم کس سے مل کے آئے ہو
اِن دنوں میں تو گھر نہیں ہوا

زندگی یوں تو کٹ رہی ہے نجیب
ویسے ایک پل بسر نہیں ہوا

OOO

سیّد ریاض حسین زیدی

O

قلق ہوا گیا سلسلہ وفاؤں کا
نتیجہ نکلا ہوا سامنے جفاؤں کا

سہانی یاد سے کلی پھول لہلہاتی ہیں
کرشمہ ساز ہے منظر تری اداؤں کا

دلوں میں بڑھتے گئے فاصلے گراں بہ گراں
عجب مزاج تھا تیری مری اناؤں کا

زمیں سے رشتہ قلم نے سرخرو رکھا
قلم کی روشنی میں سر جھکا ہواؤں کا

دل شکستہ میں بھی جینے کی لو آئی
شعور زیست میں رستہ چلا خلاؤں کا

ہمارے گھر سے کناروں پہ گو شمائل ہے
فلک نے پھیر دیا رخ ادھر ہواؤں کا

ہماری سمت بھی آئے کبھی تو باد شمال
گزر ادھر سے بھی ہوگا مگر ہواؤں کا

وفائے عہد بھی ہے مرے مقدر میں
نفس نفس میں نشہ چھا گیا دعاؤں کا

ریاض ہی سے جواہر کی رونمائی ہے
ہنر کمال دکھاتا ہے خوش اداؤں کا

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

O

اس واسطے وفا میں تمہارا ملا مجھے
جو دل ملا، وہ پیار کا مارا ملا مجھے

دیکھا تو ہر گلاب سا چہرہ تھا آئینہ
ہر آئینے میں عکس تمہارا ملا مجھے

وہ راکھ جس کو اہلِ جہاں نے اڑا دیا
اس راکھ میں بھی ایک ستارا ملا مجھے

میں نے جسے حیات کا محور سمجھ لیا
وہ شخص کہیں نہ دوبارا ملا مجھے

اے عشق! مجھ پہ تیری عنایت کا شکریہ
ہر گام میں تجھ سے کنارا ملا مجھے

ہر آرزو تھی نقطۂ پرکار کی طرح
ہر آرزو میں عکس تمہارا ملا مجھے

ایوب! مجھ سے زیست بھی کیا ہاتھ کر گئی
میں نے تو پھول چاہا، شرارا ملا مجھے

OOO

احمد صفی

O

کاروبارِ حیات وحشت ہے
دن بھی وحشت ہے رات وحشت ہے

بات کرنے کی بات مت کیجے
اب یہاں بات بات وحشت ہے

کچھ سکوں ہے تو قبر میں ہے اب
اور سب کائنات وحشت ہے

گردشِ مستقل ہی رحمت ہے
اور قیام و ثبات وحشت ہے

اک تری سمت ہے سفر کرنا
اور سب شش جہات وحشت ہے

سر میں سودا ہے اور اس دل میں
اب سکوں کو جو مات وحشت ہے

OOO

ماجد یزدانی

(نذرِ فراز)

O

مقامِ عشق ذرا پھر سنور کے دیکھتے ہیں
بہت حسین ہے چلو اس پہ مر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے چاند بھی اس کو سلام کرتا ہے
سنا ہے اس کو ستارے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے رب نے تراشا ہے اپنے ہاتھوں سے
سنا ہے اس کو فرشتے اتر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس کی ادا میں عجیب جادو ہے
گزرنے والے بھی اس کو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے یاد بھی اس کی کوئی عبادت ہے
اگر ہے یوں تو اسے یاد کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے دیکھنے سے اس کو سکوں سا ملتا ہے
اگر ہے یوں تو چلو آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

خدا کی شان ہے وہ احترام لازم ہے
اسی لئے تو نظر پاک کر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے اس نے پھر آنے کا عہد باندھا ہے
اسی بہانے چلو پھر سنور کے دیکھتے ہیں

بپا ہے شور سا کیسا یہ شہر میں یارو
اشارے پھر سے کوئی اک نظر کے دیکھتے ہیں

جو آ گیا ہے بھلا کر پرانی باتوں کو
تو ہم بھی اپنی انا سے اتر کے دیکھتے ہیں

فراز ہو کہ وہ ماجد سبھی یہ کہتے ہیں
کرشمے اس کی قلم میں ہنر کے دیکھتے ہیں

OOO

رشید آفریں

O

دل گلی آرزو کی چھپے چھپیاں
ساحلِ وقت پر یاد کی سیپیاں

جیسے بھٹکی کوئی امڈتے طوفان میں
آنچل کی بکھری ہوئی تتلیاں

ریت پر سیلِ فردا کا غم بھول کر
کھیلتی ہوں گھروندوں سے بھولی بچیاں

قصرِ تخلیق کی تیرہ و بے صدا
صحن، ادراک میں اور کھلی کھڑکیاں

لب جہاں سے ہی خشک تشنہ زباں
اور باراں لیے آنکھ کی پتلیاں

گلستاں میں گلِ تازہ کے ہاتھ پر
شاخ در شاخ نوحہ کناں تتلیاں

کلی تو ہنسے پہ پھول آتش بجاں
دشت و صحرا میں بے سمت کی آندھیاں

اک طرف ہیں تمدن کے آتش فشاں
اک طرف خون انساں کی عیاں

چار سو جبر کے ابر چھائے ہوئے
ظلم کی کڑکتی ہر طرف بجلیاں

فکر احساس میں رحمت جاں کو لیے
روح کی تیرگی، الجھی گتھیاں

خواب کے جنگلوں میں سدا پریاں
زندگی کی حقیقت کی تختیاں

سب زوالِ فکر کا عکس بھی
کاش جذبوں کی ہیں آفریں کرچیاں

OOO

طلعت منیر

O

دریا پلٹ سکوں نہ سمندر اٹھا سکوں
ہونی نہیں کہ معجزہ کوئی دکھا سکوں

تو خود کو بخش دے مجھے اعزاز کی طرح
شاید میں اس طرح تجھے اپنا بنا سکوں

اتنا پرست ہوں میں ترا بن نہیں سکا
یہ اور بات ہے کہ تجھے نہ بھلا سکوں

بارش کے شور میں مری آواز دب گئی
موسم کی خود سری میں تجھے کیا سنا سکوں

کوئی ہے جو بھاگتے پلوں کے تل تھمے
فرصت نہ تھی کہ فرش پہ ایڑی لگا سکوں

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

O

ترے بچھڑنے سے ایسا لگ رہا ہے
کہ کوئی اور بھی میرے سوا ہے

یقیں کی پھر حقیقت اور کیا ہے
گماں اب بھی اگر مجھ کو ہوا ہے

یہ لگتا ہے کہ دل صدیوں سے تنہا
سمندر کے کنارے جل رہا ہے

وہ کھڑکی نہیں باقی رہی اب
کوئی میرا تعلق لے گیا ہے

وہ ٹوٹے گا نہیں یہ جانتی ہوں
دیا دہلیز پہ بس رکھ دیا ہے

OOO

محمد سلیم ساگر

اسحاق وردگ

O

عام بندہ بھی محلے میں اہم ہوتا تھا
اگلے وقتوں میں محبت کا بھرم ہوتا تھا

میرے بچپن کی تصاویر بتاتی ہیں میاں
کہ مری جیب میں ہر وقت قلم ہوتا تھا

فرق کا رب بھی وحدت کی طرح تھا سائیں
دل کی مسجد میں فقط ایک صنم ہوتا تھا

چھوٹی خبروں پہ بڑے مسئلے حل ہوتے تھے
پہلے اخبار کے صفحات میں دم ہوتا تھا

زندگی پہلے توازن میں رہا کرتی تھی
اک زمانے میں یہاں ذکر عدم ہوتا تھا

عالمی بینک سے ہم بھیک نہیں لیتے تھے
تو ریاست پہ خدا ہی کا کرم ہوتا تھا

اب تو نفرت کے کئی فرقے بنے ہیں اس میں
پہلے پہلے یہ محبت کا حرم ہوتا تھا

OOO

O

وہ آنکھ عجب زد میں بہا لے گئی ہم کو
اک موج تھی ساحل سے اٹھا لے گئی ہم کو

کب شوق سے جاتا ہے کوئی راہِ جنوں پر
لیکن تری نظروں کی خطا لے گئی ہم کو

اس شہر میں ہم جرمِ محبت کے لیے آئے
اور دشت میں کھینچ وفا لے گئی ہم کو

ہم کوئی قلندر تھے؟ کہ جا بیٹھتے خدا سے
یہ اک شبِ کافر کی دعا لے گئی ہم کو

اک زیست ہمیں جس نے کہیں کا نہیں رکھا
اک موت کے پیچھے سے لگا لے گئی ہم کو

لے جاتا تھا ہر بار ہمیں اپنا سمجھ کر
پھر یوں ہوا اک روز قضا لے گئی ہم کو

خوشبو ترے آنچل کی تھی یا موجِ نفس کی
سنگ اپنے بہرحال اڑا لے گئی ہم کو

ہم دل تھے وہ اک دل کے لیے آئے تھے ساگر
یہ موج تھی دور بہا لے گئی ہم کو

OOO

خالد ندیم شانی

O

جیسے چادر سینے کے لیے ہوتے ہیں
دوست احباب تو جینے کے لیے ہوتے ہیں

عشق میں کوئی تماشا نہیں کرنا ہوتا
اشک جیسے بھی ہوں پینے کے لیے ہوتے ہیں

سارے احباب کو مخلص نہ سمجھنا یارو
ان میں دو چار تو کینے کے لیے ہوتے ہیں

زندگی بھر میں جتنے بھی ابھرے لمحے
یاد رکھنا کہ وہ جینے کے لیے ہوتے ہیں

ویسے جذبات ہیں لینے کے لیے میرے بھی
جیسے گلزار کے زینے کے لیے ہوتے ہیں

دل میں جلتی ہیں دیوں کی لاشیں خالد
آنکھ میں خواب مدینے کے لیے ہوتے ہیں

OOO

شبہ طراز

O

ہم دم اور گیلی خوشبو
پھر بھی ایک پہیلی خوشبو

سارا آنگن مہکا دیتی ہے
مٹی میں ایک اکیلی خوشبو

آنکھوں میں وہ بھر لاتا ہے
ہر دن نئی نویلی خوشبو

پاؤں گیا دہلیز پہ رکھا
آنگن اور حویلی خوشبو

خواب کا نیر جھلک جھلک
چندا، رات، چنبیلی، خوشبو

پھولوں کے دل خون ہوئے ہیں
تھوڑے کتنے دکھ جھیلی خوشبو

یادوں پھول تمہیں پاؤں گی
آنکھیں، پھول، ہتھیلی، خوشبو

OOO

طاہر منظور

O

ملتا درد ہے لاحق فراواں تنہائی
یہ کس مقام پہ تب حیات لے آئی

یہ دن بھی دیکھنا لکھا تھا خوش قسمت
تھے حبیب تھا سمجھا وہ نکلا ہرجائی

معاشرے میں معزز مقام تھا میرا
تمہارا پیار بنا میری وجہ رسوائی

وہ کرتا ہے، مجزہ ہے قادر مطلق
مسلمہ ہے جہاں میں اسی کی یکتائی

کسی دیے کی مرے گھر کو احتیاج نہیں
چمکتا رہتا ہے ہر دم چراغِ تنہائی

علاج دل کا نگاہوں سے جواب لیتا ہے
عطا ہوئی ہے اسے خاص چشم بینائی

رہے گا نام ابد تک حسینؓ کا زندہ
ہزاروں لاکھوں ہیں دنیا میں اس کے شیدائی

بچھڑ چکیں محبت سے ہی رہیں طاہر
جہاں میں اچھی نہیں ہے محاذ آرائی

OOO

امجد بابر

O

دعا ہے خاص کوئی کام بھی نہیں لیتے
تمھارے شہر کا اب نام بھی نہیں لیتے

یہ کون لوگ یہاں رات پیچھے آئے
ادھار میں تو کوئی شام بھی نہیں لیتے

دکان دل کو سجایا ہے یوں محبت میں
نگاہ یار سے تو دام بھی نہیں لیتے

میں سادہ شخص تکلف سے دور رہتا ہوں
سو پیار داری کا الزام بھی نہیں لیتے

تمھارا خواب محبت اٹھائے پھرتی ہے
تمھارا نام ہے پیغام بھی نہیں لیتے

OOO

جاوید عباس جاوید

O

خشک چشمے کے کنارے صبح کا ہنگام ہے
زندگانی کا سفر جاری بطرفِ شام ہے

جو زمانے تھے بہاروں کے وہ رخصت ہو گئے
اب خزاؤں کی ہوا اور تلخیِ ایام ہے

بے قراری ہے ابھی اور سر دلوں کا تذکرہ
روز و شب کا سلسلہ مجموعۂ آلام ہے

ہو گیا دشوار جینا عہدِ امرا کے طفیل
ہر غریبِ شہر پھر بھی موردِ الزام ہے

لوگ بیکاری کے ہاتھوں خودکشی کرنے لگے
بامِ سرداراں میں جاری شکوہ و دشنام ہے

عمر بھر لکھتے رہے ہم زہد و طاعت کے خطوط
دل ہمارا ہے کہ پھر گرویدۂ اصنام ہے

زندگی اک خوش گماں ہے مست سرشاری کا نام
موت کیا ہے زندگی کا منطقی انجام ہے

OOO

جسارت خیالی

O

غمِ دل کو زمانے سے چھپایا بھی بہت ہے
اپنوں نے مگر مجھ کو رلایا بھی بہت ہے

پھولوں کی رفاقت سے ہی محروم رہا ہوں
ہر خار کو سینے سے لگایا بھی بہت ہے

ظلمت کی پرستش سے ہوا کب ہے اجالا
احساس یہ ناداں کو دلایا بھی بہت ہے

بے آس مسافر کو دیا کس نے دلاسا
صرصر کے بگولوں نے جلایا بھی بہت ہے

جاگے نہ مگر خواب سے غفلت کے جسارت
قسمت کے ہی ماروں کو جگایا بھی بہت ہے

OOO

اقبال ندیم فروکہ

O

لاتی مستیوں سے چمن کی آواز
دے رہا ہوں گلی گلی آواز

اپنی اپنی پڑی تھی یاروں کو
کون سنتا یہاں مری آواز

ایک وحشت فضا میں پھیلی تھی
سب پہ حاوی تھی تیری آواز

یہ گھٹن مجھ کو مار ڈالے گی
بند کرتے ہو کیوں مری آواز

اہلِ دل سارے یہ غور کریں
جسم زندہ ہے مر گئی آواز

ہیں پرندے شجر پہ بیٹھے ہوئے
آ رہی ہے اک اجنبی آواز

میرے من میں بلا ضرورت تھی
میں نے کوزے میں پھینک دی آواز

OOO

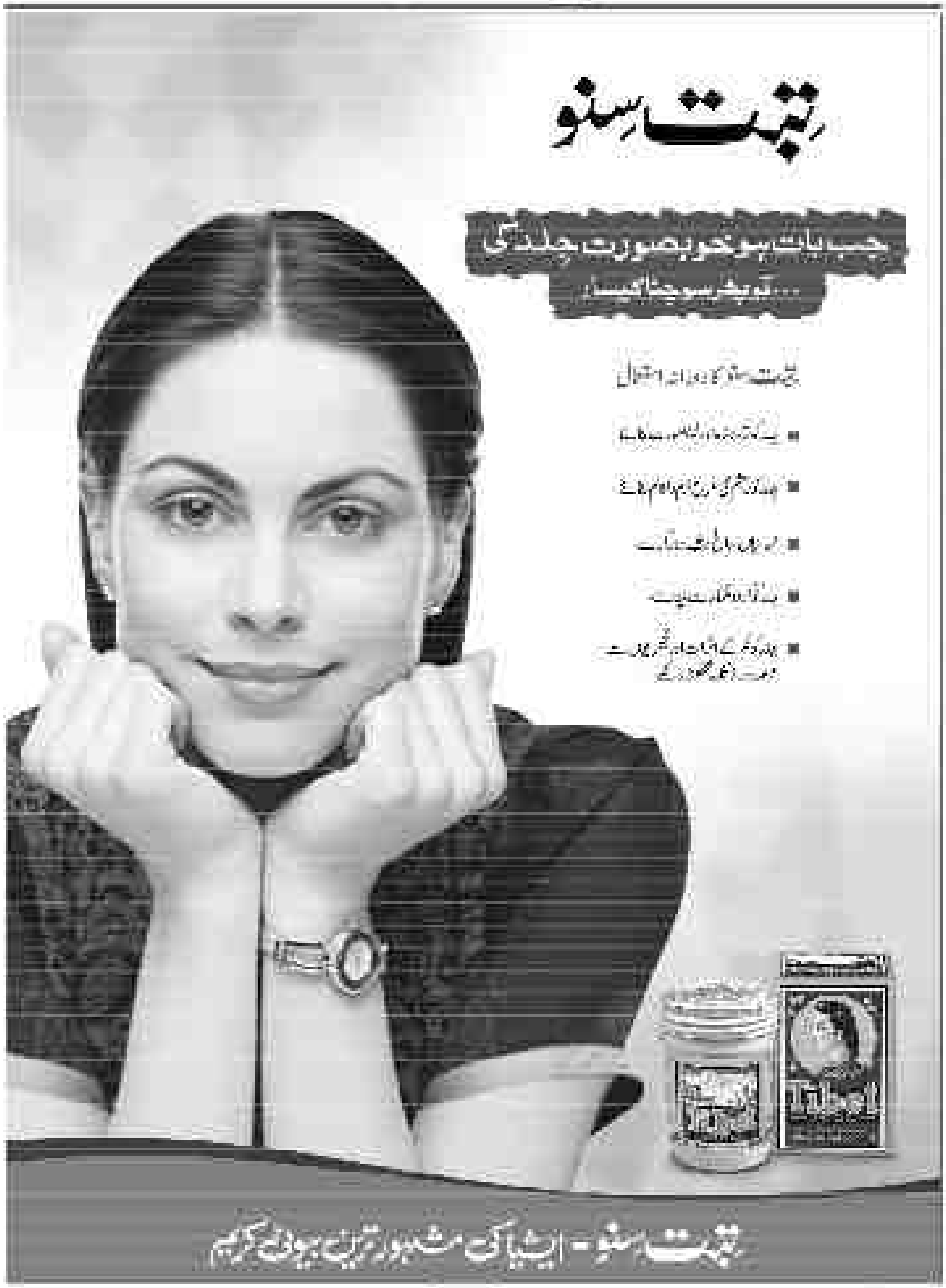
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
Tibet
تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

یادیں

"جی سی یونیورسٹی کی یادیں"

ڈاکٹر اختر شمار

کیا زمانہ تھا گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ اردو میں کمرہ نمبر 7 میں بابو خان کی چائے کے لیے اساتذہ کلاسز کے بعد اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جن دنوں راقم جی سی میں شعبہ اردو سے وابستہ تھا ان دنوں ڈاکٹر معین الرحمٰن صدر شعبہ اردو تھے۔ میں نے دیال سنگھ کالج سے تبادلے کے بعد یہاں جائن کیا تھا۔ ان دنوں میں یہاں مستقل اور پارٹ ٹائم اساتذہ میں اصغر ندیم سید، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر احسان الحق، ڈاکٹر تبسم صدائی، ڈاکٹر سعادت سعید، حق نواز، محمد فاروق، بشیر قادری، محمد اشرف منج، ڈاکٹر محمد خان اشرف، شفیق عجمی، عارف ثاقب، ثاقب نفیس، طارق زیدی، ہارون قادر موجود تھے۔ بعد میں اسی شعبے کے طالب علموں میں سے خالد سنجرانی، محمد سعید، نسیم رحمان بھی منسلک ہو گئے تھے۔ بابو خان کے کمرے میں ایک رونق سی رہتی تھی۔ جس کسی پروفیسر کا پیریڈ ختم ہوتا، چائے کے لئے یہاں پہنچ جاتا۔ یہاں سے سبکدوش ہونے والے اساتذہ میں سے کبھی کبھی: صابر لودھی، جعفر بلوچ، اختر میرٹھی، مرتضیٰ زیدی اور چند دیگر حضرات بھی دکھائی دیتے۔ اشرف منج اور بشیر قادری کی آپس کی نوک جھونک بھی جاری رہتی۔ عارف ثاقب، ڈاکٹر احسان الحق کی گفتگو اور اصغر ندیم سید کے چٹکلے بھی ان محفلوں میں سننے کو ملتے۔ بابو خان خاموشی کے ساتھ ہر آنے والے کے لئے چائے لا رکھتے۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی وہ پروفیسروں کے بحث ومباحثے کو چپ چاپ سنتے اور زیر لب مسکراتے رہتے۔ یہاں سب سے اونچی آواز اشرف منج کی ہوتی۔ خاص طور پر اس وقت جب بشیر قادری اپنے گلے دار اشرف منج کی کوئی بات سنا رہے ہوتے تو اشرف صاحب تپ اٹھتے اور وضاحتوں سے کمرا سر پر اٹھا لیتے۔ "او نہیں قادری صاحب" "آپ ادھوری بات کر رہے ہیں۔ میں ڈاکٹروں کے خلاف نہیں ہوں۔ میں انہیں اگر قصائی کہتا ہوں تو ان کے سفاکانہ رویے کے سبب کہتا ہوں۔ یہ مریض کی جیب دیکھے بغیر اپنی فیس لیتے ہیں۔ میں حکیموں کی تعریف اس لیے کرتا ہوں کہ یہ لوگ مریض کی مالی حیثیت کے مطابق دوا کے پیسے لیتے ہیں۔"

بشیر قادری اس وضاحت پر مسکرا کر پوچھتے: "چلو یہ تو مان لیا کہ آپ ڈاکٹروں پر حکیموں کے علاج کو ترجیح دیتے ہیں لیکن نرسوں اور استانیوں کے کیوں خلاف ہیں؟ یہ بھی تو مقدس پیشوں میں سے ہیں۔" "میں مقدس پیشوں کے خلاف نہیں" اشرف صاحب ہاتھ نچا کر کہتے۔ میں تو ورکنگ لیڈیز سے شادی کے خلاف ہوں۔ یہ خواتین کبھی اچھی بیویاں ثابت نہیں ہوتیں۔ ہارون قادر آتے ہی "ورکنگ لیڈیز اور اچھی بیوی" کے الفاظ سنتے ہی کہتے۔ دیکھو اشرف صاحب ایہہ کوئی کلیہ نہیں۔ نرساں تے میلوں پیدل ٹر کے محکمہ تعلیم وچ ملازمت کرن والیاں ذمہ داریوں ساتھی ہوندیاں نیں۔"

(دیکھو اشرف صاحب یہ کوئی کلیہ نہیں نرس کا مجھے علم نہیں مگر محکمہ تعلیم سے وابستہ خواتین ذمہ داریاں بیویاں ثابت ہوتی ہیں)۔

اتنے میں صدر شعبہ ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب تشریف لے آتے اور دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ فرماتے۔ "مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ

''اشرف صاحب اور قادری صاحب کا پیریڈ ختم ہو چکا ہے اور وہ کمرہ نمبر 7 میں آ چکے ہیں۔ چائے پر، لطیفے، چٹکلے، ادب، ثقافت، سیاست سے لے کر معاشرے کے کئی پہلوؤں پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز اشرف شیخ صاحب بڑی سنجیدگی سے بتا رہے تھے کہ ان کے بچے کا بازو گلی میں بندھے کسی گھوڑے نے چبا ڈالا ہے۔ سبھی ہمہ تن گوش تھے کہ اچانک بڑی فکرمندی سے اصغر ندیم سید نے پوچھا ''تے فیر اوس گھوڑے دا کیہ حال اے؟ (تو پھر اب گھوڑے کا کیا حال ہے؟) میرا مطلب اے بچے کا کیا حال ہے؟'' ان کی جملے کی ادائی سے قبل ہی کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ صاحب نے اس کے باوجود بچے کی طبیعت کے بارے میں تفصیل سے بیان جاری رکھا۔'' اشرف شیخ کا ذکر ہو رہا تھا مرحوم کمال کے آدمی تھے۔ گورنمنٹ کالج آنے سے قبل شیخوپورہ اور ایم اے او کالج لاہور کے اردو شعبوں سے وابستہ رہے۔ گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کے لئے لاہور سے کئی دیگر پروفیسر بھی سفر کیا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں اشرف شیخ کے ساتھ محمد فاروق، بشیر قادری، شفیق عجمی بھی شیخوپورہ کالج روزانہ لاہور سے جایا کرتے تھے۔ اس دور کا واقعہ ہمیں فاروق نے سنایا تھا۔ ہم نے اشرف شیخ کی یادوں میں اس کا تفصیل سے ذکر کر رکھا ہے۔ وہ خاکہ پڑھنے سے پروفیسر اشرف شیخ کی شخصیت کی کچھ اور پرتیں بھی سامنے آ سکتی ہیں۔ فاروق بھی چونکہ شیخوپورہ گروپ میں شامل تھا، سو اکثر اپنی پرانی یادیں دوستوں کے ساتھ شیئر کرتا۔ محمد فاروق ایک طویل قامت پروفیسر ہے۔ میرے ساتھ اس کی قدرے بے تکلفی رہی ہے۔ نہایت شریف النفس اور ''بی با'' دوست ہے۔ سادہ، نرم خو، سب سے پیار سے بات کرنے والا صلح جو فاروق اپنی ڈیوٹی سے کبھی غافل نہیں رہا۔ کلاس کبھی مس نہیں کرتا۔ جن دنوں میں شعبہ اردو گورنمنٹ کالج میں تھا ڈاکٹر خالد آفتاب پرنسپل تھے۔ ان کی گردن بغیر ٹائی کے میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔ چلتے ہوئے بھی ہمیشہ سیدھا سامنے دیکھتے اور گرد کی مخلوق سے قدرے بے نیاز رہتے۔ اس زمانے میں ان کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ قدرے سنجیدہ مگر تخلیقی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے دور میں باقاعدہ کلاس چیک ہوتی تھیں۔ ہر بلاک میں ان کا ایک نمائندہ پروفیسر کلاس چیک کرنے پر مامور تھا۔ ادھر آپ نے کوئی کلاس چھوڑی جیسے کہ آپ کلاس میں لیٹ پہنچے اور کلاس کو چھٹی دی ہی اگلی صبح آپ کو پروانہ غیر حاضری وصول کرایا جائے گا اور آپ کو اس خط کا فی الفور جواب دینا پڑتا اور جواب بھی معقول۔

بارہا پروفیسرز کالج میں آتے اور پڑھانے کے بعد بنا سرزنش وصول ہونے پر اس روز چھٹی لکھ دیتے تھے کہ تاخیر سے کلاس روم میں جانے کے بارے میں بتانے سے کہیں بہتر ہے کہ اس روز کی چھٹی لے لی جائے۔ عالم بچل اس دور میں سائنس والے جایا کرتے تھے۔ اردو والوں پر ان کی ''خصوصی شفقت'' ہوا کرتی تھی پہلا پیریڈ بھی اردو والوں کا ہوتا اور آخری بھی ——— آخری پیریڈ وہ بھی سخت سردیوں کے دنوں میں کالج ہی میں شام ہو جایا کرتی ہے۔ اس وقت پڑھنے والے بھی اکثر غائب رہتے تھے۔ عموماً سائنس کے طلباء نے شام کی ٹیوشن اکیڈمیوں میں جانا ہوتا۔ ساڑھے دو بجے کے بعد کی کلاسوں کے کمرے خالی ہوا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ہم دو بجے والی کلاسوں کا انتظار کرتے اور مقررہ وقت پر چار پانچ اردو کے اساتذہ اکٹھے اس وقت کی کلاسوں کو پڑھانے نکل پڑتے۔ شعبہ اردو اور مین گیٹ میں خاصا فاصلہ ہے ہم اردو شعبہ سے اکٹھے اور اوول کالج روڈ کی جانب عمارات کے کمروں میں پہنچ جایا کرتے تھے۔ ہمیں اردو کی کلاسیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم پہنچتے تو سارا بلاک ''سائیں سائیں'' کر رہا ہوتا۔ میں طارق زیدی، عارف ثاقب، بشیر قادری اور فاروق بھی اکٹھے اس بلاک کو نکلتے تھے۔ کلاس روم کے دروازے سے جھانک کر آواز لگاتے ہاں بھئی کوئی ہے اردو پڑھنے والا ——— کمرہ خالی ہوتا اور ہم ہنستے قہقہے لگاتے پارکنگ کی راہ لیتے۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ فاروق غائب ہے۔ خیر ہم اپنی کلاسوں میں جھانکنے کے بعد جونہی

فاروق کی کلاس میں بھاگے تو آخری ڈیسکوں پر فاروق لیٹا ہوا دکھائی دیا۔ آواز لگائی تو وہ اٹھ بیٹھا اور باہر آ گیا۔ طارق زیدی نے کہا: ''یار کمرے میں کوئی نہ تھا تو وہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم وہ چارٹ دیکھتے ہیں اور اگر کوئی ایک طالب علم بھی نہیں تو واپس چلے جاتے ہیں'' مگر کمال جواب دیا فاروق صاحب نے بولے: ''زیدی صاحب نوکری کرنی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہیں صبح جواب طلبی والا خط نہ مل جائے۔ سو میں اس حد سے کہیں زیادہ بھی کلاس میں بیٹھا رہتا ہوں کیا خبر کوئی کلاس چیک کرنے والا آ جائے۔''

فاروق کو ان فرائض منصبی اور سادگی کا صلہ یہ ملا کہ خالدہ آفتاب نے انہیں پی ایچ ڈی کے لئے سکالرشپ دیا پھر اسی یونیورسٹی کا حصہ بنا دیا۔ اب بھی وہ وزٹنگ پروفیسر کے طور پر وہاں پڑھا رہا ہے اور اب تو ماشاءاللہ ڈاکٹر فاروق ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کو میں لاہور میں اپنے محسنین میں شمار کرتا ہوں۔ ان سے تعارف بس اتنا تھا کہ میں نے انہیں اپنا پہلا مجموعہ کلام ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم'' ارسال کیا تھا۔ اگلے دو روز میں ہی ان کا ایک خوبصورت خط موصول ہو گیا جس میں کتاب کے حوالے سے شکریے کے علاوہ کتاب کی طباعت، شاعری اور میری تصویر تک کی تعریف تھی۔ پھر دوسرا شعری مجموعہ بھی انہیں اردو بازار میں پیش کیا۔ اسی دوران میں نے بتایا کہ میں اب دیال سنگھ میں ہوتا ہوں۔ انہوں نے کہا آپ کو اگر ہم جی سی میں لے آئیں؟ میں نے کہا سر یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ یہ میرے لئے بڑی عزت کی بات ہے۔ انہوں نے کہا ہم جلد آپ کو خط بھجواتے ہیں کچھ عرصہ بعد میں نے شعبہ اردو جائن کر لیا اور پھر الحمد اللہ یہیں رہ کر میری پی ایچ ڈی مکمل ہوئی۔ معین الرحمٰن ایسے شفیق انسان تھے کہ میرے نوٹیفکیشن کے اگلے روز وہ مٹھائی کے ڈبے آفس میں لائے ہوئے تھے۔ میں جیسے ہی ان کے دفتر میں داخل ہوا مجھے گرم جوشی سے مبارکباد سے نوازا اور بولے: ''یہ مٹھائی ہے ہماری طرف سے، ایک ڈبا یہاں کھول کر احباب کو مٹھائی کھلائی جائے اور اکٹھے بیٹھ کر بابو خان کے کمرے میں چائے پیتے ہیں۔ مٹھائی کا دوسرا ڈبا آپ کے ساتھ گھر جائے گا۔'' میرے پی ایچ ڈی کرنے پر والدین کے بعد سب سے زیادہ خوشی جن تین شخصیات کو ہوئی ان میں: ڈاکٹر معین الرحمٰن، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور تخلیق کے مدیر مہربان بزرگ دوست اظہر جاوید شامل تھے بلکہ اظہر جاوید نے تو باقاعدہ ایک ہوٹل میں پندرہ بیس دوستوں کی دعوت کی۔ اس دعوت میں خواجہ زکریا صاحب اور اظہر جاوید میں بل دینے پر تکرار بھی ہوتی رہی، دونوں کہتے رہے یہ دعوت میری طرف سے ہے۔ یہاں اسے جی جوش نے کہا: ''آپ دونوں رہنے دیں بل میں دیتا ہوں'' لیکن اظہر جاوید نہ مانے۔ بعد میں جوش صاحب نے الگ دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہی نہیں میرے سابقہ کالج دیال سنگھ کے شعبہ اردو کے اساتذہ نے بھی میرے لئے ہائی ٹی کا اہتمام کیا اور اس تقریب کی خبریں مختلف اخبارات میں جاری کیں۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ذکر پہلے اس لئے کر رہا ہوں کہ جی سی یونیورسٹی کو یاد کر رہا ہوں۔ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کا سہرا تو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے سر ہے اگر وہ ایک تفصیلی خط لکھ کر نہ دیتے تو مجھے شاید ہی اورینٹل کالج میں پی ایچ ڈی کی رجسٹریشن نصیب ہوتی پھر اس کی تفصیل الگ بیان کروں گا۔

بات ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ہو رہی تھی۔ معین صاحب بہت سنجیدہ محقق، نقاد اور استاد اردو ادب تھے۔ تحقیق میں ان کا اپنا اسلوب تھا۔ بہت آہستہ اور شائستہ گفتگو فرماتے تھے۔ لاہور میں ان کی ناگہانی موت سے اردو ادب اور لاہور ایک مخلص و منتظم شخصیت سے محروم ہو گیا۔ ان کی وفات سے قبل بعض شدت مزاج ناقدین، محققین نے غالب کے نسخہ خواجہ کے حوالے سے انہیں اس قدر دکھی کیا کہ وہ حساس آدمی چند روز بیمار رہ کر چل بسے۔ معین الرحمٰن صاحب کی وفات پر میرا کالم روزنامہ ''ایکسپریس'' میں شائع ہوا تھا۔

◆◆◆

موسیقی

اُستاد نصرت فتح علی خاں

بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکار۔ موسیقار اور قوال

……1……

ڈاکٹر امجد پرویز

یہ قصہ ہے 1940ء اور 1950ء کی دہائیوں کا جب استاد مبارک علی خاں' استاد فتح علی خاں اور پارٹی کا بحیثیت قوال طوطی بولتا تھا۔ استاد فتح علی خاں اس پارٹی کے سربراہ تھے۔ اس پارٹی کا عمومی نام فتح علی خاں مبارک علی خاں اور پارٹی تھا۔ مبارک علی خاں گائیکی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کے ہارمونیم نواز بھی تھے۔ دونوں بھائی سٹوڈیوز اور سٹیج پرفارمنس میں یکساں حصہ ڈالتے تھے۔ اس دور میں یہ پارٹی کلام اقبال کی ادائیگی میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔ ان کا ایک نمونہ 'تو رہ نورد شوق ہے' بہت مقبول ہوا۔ یہ پارٹی صوفیانہ کلام کی ادائیگی میں بھی کمال رکھتی تھی۔ قوالی' جنوبی ایشیا میں صوفی موسیقی کی ایک معروف صنف ہے۔ پاکستان میں یہ صنف صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ میں مقبول ہے۔ بھارت میں اس صنف کو حیدرآباد اور دہلی میں پسند کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ ۔ چٹاگانگ اور سلہٹ میں قوالی کے فن کو پذیرائی ملتی تھی۔ گائیکی کے اس انداز کو حضرت امیر خسرو نے سات صدیاں قبل متعارف کروایا تھا۔ حضرت علامہ اقبال نے اپنی حیات میں' قوالوں کی اس جوڑی کو خراج اس انداز میں دیا کہ ان کے اس کلام کو پیش کرنے سے پیشتر یہ فن صرف سکولوں اور کالجوں تک محدود تھا لیکن اس جوڑی نے اسے ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچا دیا تھا۔ واقعتاً اس جوڑی کو ہمارے قومی شاعر کی طرف سے یہ خراج ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس جوڑی نے اقبال کے کلام 'شکوہ' کو بہت خوبی سے گایا۔ اگر ہم نصرت فتح علی خاں سے یہی کلام سنیں تو ان کے والد اور انکل کی ادائیگی یاد آجاتی ہے جس میں استاد نصرت بھی شمولیت کئے ہوئے تھے اور ایک پرستار ظہیر الدین نے تو خوب اپنے تاثرات کچھ اس انداز میں درج کئے "یہ ایک خدائی (divine) آواز لگتی ہے جو اس مقدس کلام کو پیش کر رہی ہے۔ یہ کمال کا امتزاج ہے ۔ خدا ان تمام فنکاروں کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے جنہوں نے یہ تخلیق پیش کرنے میں حصہ ڈالا"۔ استاد نصرت فتح علی خاں کے پیش کردہ اس کلام میں راحت فتح علی خاں کی خوبصورت تانیں اس امر کی غمازی کر رہی تھیں کہ ایک بڑا فنکار پیدا ہونے جا رہا ہے۔

استاد نصرت فتح علی خاں کے فن اور زندگی پر روشنی ڈالنے سے قبل ہمیں اس امر پر زور دینا چاہیے کہ ان کے ان تھک کام کے علاوہ (جہاں یہ فن اسلام کو پھیلانے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا) عوام تک پہنچایا۔ استاد نصرت فتح علی خاں نے اس فن کو دنیا کے کونے

کونے میں پھیلایا۔ ان فنکاروں کے ساتھ ساتھ چند اور ناموں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنہوں نے قوالی کے فن کو بین الاقوامی وجہ افتخار۔ ان میں صابری برادرز، امجد فرید صابری، بہاؤالدین قطب الدین، بدر میاں داد، فیض علی فیض، منشی رضی الدین، فتح علی خاں، عزیز میاں، سنتو خاں، آغا بشیر اور دیگر بیشتر قوال شامل ہیں۔

پیدائش اور میراث: استاد نصرت فتح علی خاں کا اصل نام پرویز تھا، جیسا کہ متذکرہ بالا سطور میں تحریر کیا جا چکا ہے، ان کے والد استاد فتح علی خاں، موسیقی کے نامی گرامی استاد تھے۔ وہ نہ صرف گلوکار تھے بلکہ ایک نامور قوال اور سازندے بھی تھے۔ نصرت کی چار بڑی بہنیں تھیں اور ایک چھوٹے بھائی، فرخ فتح علی خاں تھے۔ یہ خاندان، قیامِ پاکستان کے وقت اپنے آبائی شہر جالندھر سے پاکستان منتقل ہو گیا تھا۔ تقسیم سے پہلے یہ خاندان شہر جالندھر کے علاقے بستی شیخ میں رہائش پذیر تھے۔ وہ اپنے گھر میں پانچویں اولاد اور پہلے فرزند کا درجہ رکھتے تھے۔ نصرت، اس لحاظ سے سونے کا نوالہ کھا کر پیدا ہوئے تھے کہ ان کا گھرانہ موسیقی کے علم کا ایک زبردست گہوارہ تھا۔ ان کے والد کے دو بھائی استاد مبارک علی خاں اور استاد سلامت علی خاں بھی مشہور قوال تھے۔ نصرت پر باری تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی کہ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤ اجداد اور بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ ہو گئے۔

نصرت فتح علی خاں کی پیدائش 13 اکتوبر 1948 کو بمقام فیصل آباد میں ہوئی۔ ان کا پیدائشی ستارہ (sun sign) لبرا (Libra) تھا۔ حالانکہ نصرت وہ واحد پاکستانی فنکار ہیں جنہوں نے قلیل مدت میں شہرت کے بین الاقوامی ریکارڈ توڑ دیے تھے لیکن ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ ڈاکٹر یا انجینئر بنیں کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایک قوال کا پیشہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نصرت، دنیا کے آسمان پر ایک چمکدار ستارے کی مانند ابھرا۔ وہ بھی اس میدان میں جسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ناپسندیدہ شعبہ، ایک پسندیدہ شعبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا کیونکہ مغربی ممالک میں استاد نصرت علی کو نہ صرف ایک اعلیٰ معیار کے استاد پروفیسر کا درجہ دیا گیا بلکہ انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے بھی نوازا گیا۔

عروج کے عوامل: بہت سارے ناقدین کہتے ہیں، نصرت فتح علی خاں کے عروج کی ایک وجہ ان کے زمانے کے مشہور آرٹسٹ پیٹر گیبریل (Peter Gabriel) کے ساتھ 1988ء میں مشترکہ پروجیکٹ کو گردانتے ہیں۔ ان کی فلم The last temptation of Christ کے ساؤنڈ ٹریک میں نصرت فتح علی خاں نے مغربی موسیقی اور قوالی کے فن کی آمیزش کی تھی۔ ساؤنڈ ٹریک میں انہوں نے راگ درباری الاپ کیا تھا۔ ان دونوں کی ملاقات کا سہرا جناب محمد ایوب، ایم پی آئی، سی ای او، اور [illegible] انجینئر برمنگھم، یو کے، کے سر جاتا ہے جنہوں نے ان بڑے فنکاروں کا آپس میں تعارف کروایا۔ اس وقت تک نصرت فتح علی خاں بحیثیت سولو گلوکار بھی اپنی شناخت کروا چکے تھے۔ نصرت ابھی سولہ برس کی عمر کے تھے جب 1964ء میں، ان کے والد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ والد کے چہلم سے دس دن قبل ان کے والد، نصرت فتح علی خاں کے خواب میں آئے اور انہوں نے اپنے فرزند کو گانے کو کہا۔ لہٰذا نصرت نے اپنے والد کے چہلم پر پہلی مرتبہ پبلک میں سولو پرفارمنس دی۔ اگرچہ نصرت فتح علی خاں، اپنے قوال گروپ کے بیشتر قوالوں کے ہمراہ قوالی کرتے رہے اور اس فن کے اسرار و رموز پر اپنی گرفت مضبوط کرتے رہے، لیکن ان کا اپنا نقطۂ نظر جدت پسندی اور تجرباتی پیوندکاری کی طرف مائل تھا۔ وہ گائیکی میں نئے 'Phrases' چنے اور اپنی تخلیق کاری سے قوالی کے روایتی فن میں اپنی جداگانہ شناخت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس انحراف

کا بہت جلد احاطہ کیا جانے لگا کیونکہ اب ان کی قوالی، معمول سے ذرا ہٹ کے تھی۔ یہ معمول 1971ء تک جاری رہا جب نصرت فتح علی خاں کے انکل، استاد مبارک علی خاں فوت ہوگئے۔ اس موقع پر قوال گروپ کا نام "نصرت فتح علی خاں، مجاہد مبارک علی خاں اینڈ پارٹی" تجویز کیا گیا۔ ساری دنیا اُس نئی پود کے فن کی منتظر تھی۔ ان کا سب سے پہلا پروگرام ریڈیو پاکستان لاہور کا بہاری فیسٹیول "جشنِ بہاراں" تھا۔ انہوں نے مختلف زبانوں میں، اردو، پنجابی، فارسی اور ہندی میں کلام پیش کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ریڈیو پاکستان میں مدعو کیا جانا، ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

<u>فن میں نصرت فتح علی خاں کی انفرادیت:</u> وقت کے ساتھ ساتھ استاد نصرت فتح علی خاں، فن کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ ان کی آواز قدرے باریک تھی لیکن اسکا پھیلاؤ بہت وسیع تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹوں تک مسلسل گاتے، یکساں جذبے کے ساتھ، نہ تھکتے۔ انہوں نے اپنی قوالی اور بعد ازاں غزل گیت کی ادائیگی میں پلٹوں کا کثرت سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پلٹے سُروں کے ناموں سے ادا کئے جاتے ہیں نہ کہ الفاظ، شاعری یا آلاپ کے ذریعے۔ اس کے علاوہ نصرت اپنی گائیکی کو "جھمکے"، "تمک"، کان اور گلے کا جیسے زیورات سے سجانے بھی لگ پڑے۔ اس طرح ان کی گائیکی اور ادائیگی، دلہن کے لباس اور زیورات سے آراستہ ہو گئی تھی۔

اپنی منفرد تانوں اور آواز کے پھیلاؤ کی وجہ سے نصرت فتح علی خاں کی گائیکی، خاص طور سے قوالی پیش کرتے ہوئے، ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ پہ مشہور تو تھی ہی، لیکن اب انہوں نے بجلی، مغربی موسیقی میں گیت یا غزل کمپوز کرتے وقت الیکٹرانک سازوں کا بھی استعمال شروع کر دیا تھا۔ ان سازوں میں الیکٹرک ڈرمز، سیکسوفون اور "کی بورڈ" شامل تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شہرت ہندوستان، جاپان، امریکہ اور یورپی ممالک تک پھیل گئی۔ ان کو قوالی کے فن کو مغربی ممالک کے شائقین تک پہنچانے کا بانی کہا جانے لگا۔ ایسی ویڈیوز دیکھنے کو ملیں جس میں مغربی تماشائی / حاضرین کو سر دھنتے دیکھا گیا ہے اور ان کو شہنشاہِ قوالی کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اگر نصرت فتح علی خاں کی پاکستان سے باہر پرفارمنس کا احاطہ کیا جائے تو انہوں نے صرف چند سالوں میں چالیس ممالک میں اپنے فن کا لوہا منوایا۔ 1985ء میں انہوں نے ورلڈ آف میوزک، آرٹس اینڈ ڈانس (WOMAD) کی دعوت پر لندن فیسٹول میں پرفارم کیا۔ اسی برس وہ پیرس، فرانس گئے اور پھر دوبارہ 1988ء میں بھی فرانس پرفارم کرنے گئے۔ 1987ء ایک یادگار سال ہے جب انہوں نے جاپان میں جاپان فاؤنڈیشن کی دعوت پہ پرفارم کیا۔ پھر 1989ء میں انہوں نے بروک لن (Brooklyn) اکیڈمی آف میوزک کی دعوت پر نیویارک، یو ایس اے، میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

<u>استاد نصرت فتح علی خاں کی فرانس میں پرفارمنس:</u> اگر نیٹ پہ سائٹ انلائٹن (Enlighten) پہ جائیں تو وہاں ایک رپورٹ ملتی ہے جس کا متن ذیل میں درج ہے۔ نصرت فتح علی خاں نے 1985ء میں پیرس میں پرفارم کیا جو ان کے بین الاقوامی دورے کی ابتدا تھی۔ یہ پرفارمنس Theatre de la Ville Pierre میں منعقد کی گئی تھی۔ فرانسیسی محقق ایلین بوڈ (Alain Buod) جو کہ مشہور صحافی اور لکھاری بھی تھے اور ان دنوں ڈھاکا یونیورسٹی میں بحیثیت معاون محقق منسلک تھے، (شعبہ مذہبی امور اور ثقافت) نے استاد نصرت فتح علی خاں کی یہ کنسرٹ attend کی۔ وہ اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے تحقیق کر کے استاد نصرت فتح علی خاں کی زندگی اور فن کا احاطہ کر کے ان کی خود نوشت (biography) کو ایک کتابی شکل دی۔ یہ کتاب سب سے پہلے فرانسیسی زبان میں 2008ء میں،

Nusrat Father Ali Khan: Le Messager de qawwali

کے عنوان سے چھپی۔ بعدازاں، اس کا انگریزی ترجمہ رینوکا جارج **Renuka George** نے کیا۔ پھر **Alliance Francaise de Islamabad** اور **Alliance Francaise de Lahore** کے اشتراک سے 21، فروری 2016ء کو فرانسیسی سفارت خانے کے تعاون **Alliance Francaise de Islamabd** میں ایک شاندار تقریب منعقد کی گئی۔ یہ تقریب شام ساڑھے چار بجے شروع کی گئی۔ تقریب کی ابتدا **Pierre Alian Buod** کی کتاب **'The Voice of Faith'** پر ایک **Presentation** سے کی گئی۔ ترجمہ نگار رینوکا جارج نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا نصرت فتح علی خان پر ڈاکومنٹری پیش کرنے کے بعد صہر علی، شیر علی قوال کی پرفارمنس پیش کی گئی جنھوں نے استاد نصرت فتح علی خان کے فن کی یاد تازہ کر دی۔ ان کا تعلق کوٹلی گھرانے سے ہے اور نصرت کے والد استاد فتح علی خان کے کسی شاگرد سے قوالی کا فن سیکھا ہے۔ اس تقریب کو بعد ازاں میگزین نے قوالی کے فن کا موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے اعادہ قرار دیا۔ قوالی کی تاریخ کے پنے اٹھیں تو استاد نصرت فتح علی خان دنیائے موسیقی (**world music**) کے بانی اور فن قوالی کے ایک جاندار استاد کے طور پر ابھرے ہیں۔ وہ تاریخ میں ہمیشہ اپنی طلسمی آواز جو شائقین موسیقی کو اپنے سحر میں مقید رکھتی ہے کی وجہ سے یاد کیے جائیں گے۔ وہ یقیناً دنیائے موسیقی کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

<u>نصرت فتح علی خان کی امریکہ میں پرفارمنس</u>: استاد نصرت فتح علی خان نے نیویارک کی بروک لن **(Brook lyn)** اکیڈمی آف میوزک میں 1989ء میں پرفارمنس دی، جس کو امریکی سامعین نے بہت پسند کیا۔ 1992-93ء میں خان صاحب نے بحیثیت وزیٹنگ آرٹسٹ **(visiting artist)** کے واشنگٹن یونیورسٹی کے **Ethnomusicology** ڈپارٹمنٹ میں لیکچر دیے۔

<u>اشتراک</u>: ہم نے مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے کہ نصرت فتح علی خان نے پیٹر گیبریل کے اشتراک میں فلم دی لاسٹ ٹیمپٹیشن آف کرائسٹ **(The last temptation of Christ)** کی موسیقی دی تھی۔ پیٹر گیبریل کی ریل ورلڈ لیبل (**Real world Lable**) سے معاہدے کے مطابق، پانچ البمز **(albums)** ریلیز کی گئیں جس میں نصرت فتح علی خان کی روایتی قوالیاں، اور چند تجرباتی دُھنیں شامل تھیں، جیسا کہ مست مست اور سٹار رائز **(Star Rise)**۔ نصرت فتح علی خان نے **(The Prayer Cycle)** کے لئے اپنی آواز کا جادو، ہمراہ جوناتھن ایلیز **(Jonathan Elias)** کے جگایا تھا لیکن آگے عمر نے وفا نہ کی۔ ان کی جگہ پر **Alians Morissette** نے پُر کی۔ پیٹر گیبریل کی معاونت نے نصرت فتح علی خان کو موقع دیا کہ وہ اپنی گائیکی کو مغربی موسیقی کے ساتھ ملا کر ایک نیا انداز دے سکیں۔ اس ضمن میں نصرت فتح علی خان نے کینیڈا کے موسیقار مائیکل بروکس **(Michal Brooks)** کے ہمراہ دو عدد البم مست مست **(1990)** اور نائٹ سانگ **(night song)** 1996ء پر بھی کام کیا۔ اس کے علاوہ نصرت فتح علی خان نے پرل جیم **(Pearl Jam)** کے مرکزی گلوکار، ایڈی ویڈر **(Eddie Veddar)** کے ساتھ، 1995ء میں دو عدد ساؤنڈ ٹریک (**Dead Man Walking**) تیار کیے۔

<u>نصرت فتح علی خان اور جاپان</u>: نصرت فتح علی خان قوال اور پارٹی کی جاپان میں پرفارمنس جاپان، مغربی دنیا میں اتنی سراہی گئیں کہ انھیں سنگنگ بدھا **(Singing Budha)** کے خطاب سے نوازا گیا۔ مورخہ 20، ستمبر 1987ء کو استاد نصرت فتح علی

خاں اور پارٹی نے 'یا ہی یا قیوم' کو قوالی انداز میں جگل تھیٹر' ٹوکیو' جاپان میں پرفارم کر کے داد حاصل کی۔ استاد نصرت فتح علی خاں اس پرفارمنس میں مرکزی گلوکار تھے۔ ان کے آگے ایک قطار میں ہارمونیم ماسٹر فرخ فتح علی خاں اور عطا فرید تشریف فرما تھے۔ کورس میں نمایاں کردار مجاہد مبارک علی اور ساتھی ارشاد حسین قلندری نے ادا کیا۔ طبلہ پر استاد دلدار حسین نے معاونت کی۔ تالیاں بجانے میں نفیس احمد اور محمد اقبال نقش تھے۔ یہ پرفارمنس یا مچی ایشین روایتی پرفارمنگ آرٹ فیسٹیول میں کی گئی۔

جاپان کا دیا ہوا ٹائٹل-The Singing Budha: مورخہ 13ء نومبر 2013ء کو انگریزی اخبار ایکسپریس ٹریبون میں استاد نصرت فتح علی خاں کو The Singing Budha کے لقب سے نوازا گیا۔ اس خبر کے مطابق:

"نصرت کو سننا فقط موسیقی سننا نہیں۔ یہ عبادت کا ایک طریقہ ہے۔ جو شائقین ان کو سنتے ہیں' ان کے مطابق' نصرت موسیقی کے سُروں میں سانس لیتے ہیں۔ موسیقی کی روایتی کمپوزیشنز سے ہٹ کر' نصرت سُر اور تال کی گہرائیوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ ایک عام شخص' ایک عبادت (Devotion) کے عالم میں ڈوب جاتا ہے۔ اس روحانی فضا کو پیدا کرنے میں استاد نصرت کی فنی گرفت (تحریک' مُرکیاں' صاحبے وغیرہ) کا بہت عمل دخل ہے۔ جونہی نصرت فتح علی خاں کی موسیقی اپنے سفر میں آگے بڑھتی ہے ہمارے حواس کھوتے جاتے ہیں' ہماری نبض تیزی کے ساتھ چلنا شروع ہو جاتی ہے اور ہماری شخصیت ایک روحانی عالم (mystical bliss) سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ یہی نصرت کی آواز اور ادائیگی کا جادو ہے۔ پاکستان نے بوچیلی (Bocelli)' پاواروتی (Pavarotti) یا لیڈ زپلین (Led Zepline) یا بیٹلز (Beatles) کے معیار کے فنکار کو پیدا نہیں کیے' لیکن نصرت فتح علی خاں' ان لوگوں کے معیار کو پیچھے چھوڑتا نظر آ رہا تھا۔"

فیصل آباد میں' نصرت کی پیدائش ہوئی تھی اور ان کا جدی سرمایہ' چھ سو سالہ قوالی کی روایت تھی۔ یہ فن انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے مستعار لیا تھا۔ اس سرمائے کی بدولت' ان کو قوالی کے شہنشاہ کا بھی خطاب ملا تھا لیکن ان کی ذہانت صرف یہاں تک ہی محدود نہ تھی۔ انہوں نے پیٹر گیبریل اور ایڈی ویڈار (Edie Veddar) کی معاونت سے' مغربی سازوں جیسا کہ طبلہ' جو شاہکار پیدا کئے۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ایسی (fusion) کسی اور موسیقار کی قسمت میں نہ تھی۔ سُر کی تمام حدوں تک گونجتی آواز' نصرت کی جدت پسندی اور ان کی موسیقی کے سُروں کی شناخت اور ملاپ نے ان کی بین الاقوامی شہرت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ کروڑوں شائقین کے وہ دل کی دھڑکن تھے' وہ ان کی کاوشوں کا لطف اٹھاتے لیکن بہت کم لوگ ان کو ذاتی طور پہ جانتے تھے۔

ڈاکٹر پیئرے ایلین بوڈ (Dr. Pierre-Alain Baud) کے تاثرات: ڈاکٹر پیئرے ایلین بوڈ' ایک محقق تھے۔ "نصرت فتح علی خاں۔ قوالی کا مسیحا" (the Messenger of Qawwali) کے عنوان سے لکھی اور شائع کی۔ لاہور میں آمد کے دوران انہوں نے ایک انٹرویو میں اپنی آمد اور موسیقی کے سحر کو یاد کیا۔ اپنی پہلی کنسرٹ' جو کہ پیرس میں ہوئی تھی کو یاد کیا جو کہ تھیٹر ڈی لا ولے (Theater de la Ville) جس کا اہتمام ایک ایرانی فرانسیسی خاتون (Saudbeh Kia) نے کیا تھا۔ یہ ایک منفرد نوعیت کی کنسرٹ تھی' جس میں قومی احباب کو ایک غیر فرانسیسی آرٹسٹ سے متعارف کروایا گیا تھا۔ اسی طرح کا اہتمام پیٹر گیبریل نے بھی کیا تھا۔

اس وقت تک نصرت فتح علی خاں، ماسوائے اپنے صوفی اور موسیقی کے اشتراک کے ساتھ بجنے والی دھنوں کے ذریعے متعارف تھے اور بالمشافہ یہ کنسرٹ پہلا تعارف ثابت ہوئی۔ اس کنسرٹ میں سامعین زیادہ تر بھارتی اور پاکستانی نسل کے تھے جنہوں نے کھڑے ہو کر استاد کو داد دی اور اسٹیج پر جا کر ویلیں (donations) دیں۔ یہ ماحول ڈاکٹر بوڈ کے لئے ایک حیران کن اچنبھا تھی۔ وہ بھی ہال میں دیگر سامعین کی طرح مسحور تھا۔

اگرچہ ڈاکٹر بوڈ، نصرت کی ریکارڈنگ بار بار سنتا تھا لیکن ان کا ملاپ 1991ء میں پہلی بار ہوا۔ ان کی ملاقات اس وقت ہوئی جب استاد نصرت فتح علی خاں، پرانی فرانسیسی monsetry کی طرف اپنی پرفارمنس کے لئے جا رہے تھے۔ یہ ایک موسم خزاں کی خوبصورت صبح تھی۔ اور بوڈ Tour France کے لئے ریلوے اسٹیشن پر تھے۔ نصرت فتح علی خاں، تھیٹرز ڈی لا ویلے، پیرس سے فونٹے وراڈ ایبے (Fontevraud Abbey) کی طرف اپنی آنے والی پرفارمنس کیلئے، گامزن تھے۔ چند دن قبل ڈاکٹر باڈ کے، اسی منزل کیلئے سفر کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو اور تعارف کے بعد عید و مکانے کی طرف روانہ ہوگئی۔

ابتدا ایک کے دوران خان صاحب، گائیکی کے استعمال سے اپنا موقف بیان کرتے رہے۔ ڈاکٹر باڈ کئی برس تک استاد نصرت فتح علی خاں کی پرفارمنس دیکھتے رہے۔ اگرچہ الفاظ سے وہ واقف تھے لیکن نغموں کی پختگی اور لے کی روانی ایک طلسم کی فضا قائم کئے ہوئے تھی۔ ان دیکھے خدا کے حضور نصرت فتح علی خاں کا نذرانہ رواں دواں تھا۔ فونٹے وراڈ کی ملاقات ان دونوں کے درمیان ایک دائمی دوستی کا باعث بنی۔ نصرت فتح علی خاں نے ڈاکٹر باڈ کو اپنی اگلی میں ہونے والی کنسرٹوں کی دعوت بھی دی اور اس کے بعد پاکستان بھی مدعو کیا اور یہ سلسلہ پانچ برس تک قائم رہا جب کہ ڈاکٹر باڈ ان کے پروموٹر (Promoter) کے نائب کی حیثیت سے معروف رہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تیس (30) برس سے، کیا (Kia) پیرس کے Theater de la Ville کی طرف سے پاکستانی فنکاروں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ڈاکٹر باڈ استاد نصرت کے ہمراہ مختلف یورپی ممالک، برازیل، جاپان اور نیویارک بھی گئے۔ اسکے علاوہ وہ، نصرت کی آدھی درجن پاکستانی کنسرٹوں میں بھی شریک رہے۔ ڈاکٹر باڈ کو یہ موقع بھی ملا کہ وہ نصرت فتح علی خاں کے ساتھ کی وجہ سے پاکستانی معاشرے کو بھی سمجھ سکیں۔ استاد نصرت فتح علی خاں کی شخصیت کی کئی جہتیں تھیں۔ enigmatic اور معصوم، شاندار (colossal) اور صلح پسند (Peaceful)، inspired اور عام۔ یہ تمام خوبیاں ایک ہی انسان میں بیک وقت موجود تھیں، جن کے ہمراہ وہ لاہور، پیرس، مراکش، ٹوکیو اور نیویارک کے دورے کرتے رہے اور ان کا کمال یہ تھا کہ ان خوبیوں کی بدولت، زبان، ثقافت، نسل اور سماجی حدوں کو عبور کرتے رہے۔

<u>ڈاکٹر باڈ کی تصنیف، The Voice of Faith:</u> پیئر ایلین بوڈ کی ایک اور تصنیف، 'The Voice of Faith' 2015ء میں شائع ہوئی تھی۔ ان کے تعارفی مقالے میں استاد نصرت فتح علی خاں کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

<u>نصرت فتح علی خاں اور ان کا ورثہ:</u> ٹوکیو میں بدھ کی نیک روح، جاپان میں انسانی آواز کا معراج، لاس اینجلز میں جنت کی آواز، لندن میں اسلام کی روح، مشرق کا پاواروٹی (Pavarotti) اور لاہور میں شہنشاہ قوالی کے خطابات کے مالک، نصرت فتح علی خاں، چند دہائیوں کے عرصہ میں، یہ پنجابی گائیک، اللہ تعالیٰ کا انتہائی عاجز، اپنی جھلسی اور مسحور کن آواز کے ساتھ آفاقی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ پھر وہ اچانک غائب ہو گیا اپنے لاکھوں مداحوں کو مایوس کر گیا۔ وہ شخص اعلیٰ خوبیوں کا مالک تھا: دل نشین (Impressive) اوکٹیو: Octave:

(Sic Supposedly' البمز (1990ء کی دہائی تک 125 گینز بک آف ریکارڈز کے مطابق جو کہ اب تک دوگنی ہو گئی ہوں گی) ۔ لے یو ٹیوب پر ویڈیوز (تعداد 2000' سالانہ دس لاکھ ناظرین انھیں دیکھتے ہیں)' (گوگل پہ ہزاروں ریفرنس موجود)' کیسٹس اور سی ڈی (Cassettes & CDs) لاکھوں کی تعداد میں سنی جاتی ہیں۔ ان خطابات اور مشہوری کے باوجود' وہ ایک سادہ شخص تھا۔ اس کا واحد مقصد پیغام رسائی تھا۔ ذریعہ صوفی شاعری کو نغموں میں ڈھالنا تھا۔ اسلام میں موجود محبت اور ملاپ کا پیغام پہنچانا تھا۔ نصرت فتح علی خان' زمان و مکاں کی قید سے آزاد شخص تھا۔ اور خدا تعالیٰ کی محبت کے پیغامات اپنی آواز و کلام سے پہنچانے میں سرگرم عمل تھا۔ وہ زمانہ حال سے بھی جڑا ہوا تھا اور ہر قسم کے تجرباتی کام کر رہا تھا' ہر قسم کی fusion' جو کہ زمین سے جڑی ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی بھی تھی۔

نصرت کے دوست' ڈاکٹر یادا کی نظر میں: ڈاکٹر یادا جو کہ ایک خارجی حیثیت کا مالک تھا اور اس نے بہت سا وقت نصرت کے ساتھ گزارا تھا' کو جب احباب نصرت کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ ان میں زیادہ تر' نصرت کے خاندان کے لوگ تھے۔ ان میں قوال پارٹی کے ممبران' چھوٹا بھائی فرخ اور پرانا کزن مجاہد مبارک علی خان اور بہنوئی اور دو گھر یلو ڈاکٹر شامل تھے۔ دراصل لمبے ٹورز (tours) پہ اپنی پارٹی کے افراد سے دوستی' استاد نصرت کی ضرورت بھی تھی۔ استاد نصرت کے موٹاپے کی وجہ' زیادہ کھانا نہیں تھا۔ یہ موروثی بیماری تھی۔ ڈاکٹر یادا' استاد نصرت کی 1990ء کی دہائی کے آخری سالوں میں' پرفارمنس کو یادگار قرار دیتے ہیں جس کا سحر ان پر بہت عرصہ تک طاری رہا۔ ان کی سی ڈی (CDs) سن کر وہ اثر طاری نہیں ہوتا' جتنا کہ ان کو اسٹیج پہ Live سن کر ہوتا تھا۔ اس کی ایک تکنیکی وجہ ہے۔ پرانے دور کے لانگ پلے ریکارڈز میں' گلوکار کی آواز نیچی سے اونچی والی Pitch تک کنٹرول کی جاتی تھی۔ اب Stabilizers اور دیگر مشینری کی وجہ سے صرف درمیانی اور اونچی pitch کو قید کیا جاتا ہے۔ سو مکمل ارتعاش' طاقت اور جذبے سننے کو ملتے۔

میری ذاتی رائے: میری ذاتی رائے کے مطابق یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ نصرت فتح علی خان ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ فنکار کے علاوہ ایک بڑے دل کے بھی مالک تھے اور ایک اعلیٰ اخلاق میزبان بھی تھے۔ میں' لاہور میں ان کے فیصل ٹاؤن' نزد اکبر چوک والے گھر جب بھی جاتا تھا' ان کے ڈرائنگ روم میں ان کے مداح' شاعر اور دوست احباب تشریف فرما ہوتے۔ عموماً استاد نصرت' اپنے سامنے والی میز پہ ہارمونیم رکھے کوئی نہ کوئی دھن تخلیق کرتے نظر آتے۔ انہوں نے مرحوم حسن رضوی کی شاعری پہ بھی' میرے لئے بھی دھنیں ترتیب دی تھیں۔ اور اپنے بیرون ملک دورے سے واپسی پر ریکارڈنگ کرنے کا اور پلان بنایا تھا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ان کا یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ مجھے احباب بتاتے ہیں کہ وہ اپنے مہمانوں کو' چاہے وہ فیصل آباد میں ہوں یا اپنے پالمٹ ہوٹل بھاٹی گیٹ لاہور والے دفتر ہوں یا لاہور میں اپنے گھر میں ہوں' بغیر طعام کے نہ جانے دیتے۔ دیگر فنکاروں سے متضاد' وہ سارے اخراجات خود برداشت کرتے تھے۔ خارجی مہمانوں کیلئے وہ یورپین کیوزین اور مقامی صوفی روحانی اور گنجز آمیز روح کے درمیان ایک پل کا کام دیتے رہے اور ایک اکائی کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ وہ بائی جیل استاد نصرت فتح علی خان اور پٹیالہ گھرانے کے درمیان' استاد نصرت کے سرگم کے بکثرت استعمال پر ایک تنازع نے جنم لیا تھا۔ میں نے مفاہمت کے لئے شیزان ہوٹل' ڈالا سنگھ بلڈنگ میں ایک عشائیے کا انتظام کیا تھا۔ لاہور کے صحافی' شاعر اور موسیقی سے منسلک احباب نے شرکت فرمائی۔ استاد نصرت تشریف لائے مگر پٹیالہ گھرانے سے کوئی بھی شخص نہ آیا۔ اس طرح کچھ عرصے بعد یہ تنازع اپنی موت آپ مر گیا۔

آر ڈا: ڈاکٹر باڈے نے اپنے پاکستان میں قیام کے دوران مندرجہ ذیل شخصیات سے استاد نصرت فتح علی خاں کے متعلق ان کے چاہنے والوں کے تاثرات اکٹھے کئے۔

میاں یوسف صلی: میرے خیال میں جب آپ استاد نصرت فتح علی خاں کے فن کا احاطہ کریں تو سب سے زیادہ ان کا صوفی رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ قوالی کے فن کی ایک لمبی تاریخ ہے' جس کے ذریعے اسلام کی ترویج کی گئی۔ اس ضمن میں نصرت فتح علی خاں کی چار سو سالہ خدمات ہیں۔ میرے خیال میں یہ امر حیران کن ہے کہ جنوبی ایشیا سے نصرت فتح علی خاں وہ پہلا آرٹسٹ ہے جس نے بین الاقوامی شہرت پائی۔ میڈونا (Meddona) اور پاوروٹی (Pavarotti) ان کے ساتھ موسیقی کی البم ریکارڈ کرنے کے خواہاں تھے۔ مک جیگر (Mick Jagger) نے صرف ان کو سننے کی خاطر لاہور کا دورہ کیا۔ اس وقت استاد نصرت فتح علی خاں کی شہرت کا ستارہ بین الاقوامی افق پر بہت تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا۔ شروعات میں نصرت فتح علی خاں اپنے باپ دادا کے فن قوالی کو جلا بخشتے رہے لیکن بین الاقوامی شہرت اس وقت ان کے نصیب کا حصہ بنی جب وہ عمران خاں کے کینسر ہسپتال کے لئے امداد اکٹھا کرنے کیلئے دنیا بھر میں اپنا فن پہنچا رہے۔ بہت قلیل مدت میں پیٹر گیبریل اور ایڈی ویڈر (Eddie Vedder) کے اشتراک سے وہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہو گئے۔ وہ واحد پاکستانی ہیں جو جنوبی ایشیا سے ابھرنے والی بہت ہر دل عزیز شخصیت بن گئے۔

ساحر علی بگا موسیقار و گلوکار: جو خصوصیت نصرت فتح علی خاں کی شخصیت میں اس نے ڈال دی جاتی ہے' وہ ان کا باکمال موسیقار ہونا ہے۔ دراصل جدید موسیقی کو نصرت فتح علی خاں کی ضرورت تھی' نہ کہ نصرت کو جدید موسیقی کی وہ ایک مکمل مجموعہ تھے موسیقی کی تمام اصناف کا۔ ان کی آواز منفرد تھی جو کہ ان لوگوں کو بہت بھاتی تھی' جنہوں نے ان کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ ایک ذہین اور مشاق استاد بھی تھے جو کہ اپنے فن موسیقی کا فن دوسروں تک پہنچانے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ میں ایک موسیقار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں اور میں سازندہ بھی ہوں۔ اس لئے میرا ایک موسیقار ہونا عجوبہ نہیں۔ بہت سے موسیقار ایک دھن تخلیق کرتے ہوئے زیادہ تر ایک لے (rhythem) کا پتا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ فن نصرت کیلئے موروثی اور قدرتی فن تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آر۔ ڈی۔ برمن اور اے۔ آر۔ رحمٰن نے استاد نصرت فتح علی خاں کے فن سے بہت استفادہ کیا ہے۔

کاظم بن حسن عباس: میں نے استاد نصرت فتح علی خاں کے ساتھ دس برس سے زیادہ عرصہ گزارا ہے۔ ان کے چوبیس گھنٹے موسیقی میں ہی گزرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ساری رات تک موسیقی دھنیں کمپوز کرتے رہتے اور کب صبح ہوئی یہ یاد نہیں رہتا تھا۔ جب میں نے سب سے پہلے قوالی شروع کی تو وہ ایک تحریک میں بیہودگی کے عنصر کے خلاف ایک آواز تھی۔ میں فن قوالی کو ایک آرٹسٹ کو خراج دینے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنا فن جب استاد نصرت کے سامنے پیش کیا تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ جب سے وہ میرے سب سے بڑے supporter بن گئے۔ چونکہ میں نے ان کے ساتھ ایک لمبا عرصہ گزارا ہے' یہ امر میں بڑے وثوق کے ساتھ بیان کر سکتا ہوں کہ وہ ایک سچی اور معصوم شخصیت کے مالک تھے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ غصے میں نہیں آتے تھے اور چوبیس گھنٹے موسیقی پر کام کرتے رہتے تھے۔

(جاری ہے)

◆◆◆

پنجاب رنگ

حنیف باوا

پچھلی رُت نوں جھلدیاں

ایس ور ہے
ساون کی آیا
بے کھاتے مینہ
کالی [illegible]
اک دے تے ساں
کالے بدل اِنج ور ہے مینہ
جوگیاں اتے ویہڑیاں دے وچ
[illegible]
پانی پانی
[illegible]
ساہواں وچ تاں رنگیاں
چڑیاں اتے خوشیاں نچن
رونقاں والے
میلے لگے ہوئے سن
دو دیہہ دے
کالے بدل آئیاں
اوہ ٹھہر گیا
جدھر جا نیے
واڑے اندر
اک دے نال تیں
ساہواں دے وچ
جھلدا
اک دوجی [illegible]
تو کیں اِنج
اِنج کیوں [illegible]
گھراں وچ [illegible] روگے
جو کجھ نہ ڈٹھا
اکھے تاں نوں میرے یاد ہیا
اِنج کیوں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
تے
[illegible]
[illegible]
اِنج کیوں [illegible] پانی
کی ایہہ
توں جانیں
حال تیرا رب

OOO

سلیم شہزاد

عُمراں ناہیں عمراں ہوندیاں

تو تاں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
پانی
[illegible]
عمراں [illegible]
[illegible]
عمراں [illegible]
[illegible]
عمراں ساڈیاں
آن [illegible]
عمراں [illegible]
عمراں ہوندیاں

OOO

ماجد وفا عابدی

پنجابی غزل

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

OOO

سرائیکی گوشہ

بشریٰ رحمٰن

بھوک

تتی تتی پئی کرلائے
میڈے ہجر دے لیکھ لائے
رات کھڑی ہے درد ونڈائے
میں ڈھاں کیوڑے پاتے

چندر رات مذاق اڑائے
سب تارے چپ کر دے پاتے
کیویں عشق دا دیوا ڈکھاں
میں کیوڑے پاتے ڈھاں

ایہہ گیڑ چاکل وچ پایم
سارا قرم تے مجرم ڈیوایم
جن لوک گریدن پاتے
میں ڈھاں کیوڑے پاتے

OOO

سرائیکی کافی

میں گولھی دیا سائیاں وے
میڈے دل دا کوڑھ ستا
میں کملی دیا سائیاں وے
میڈی آس مراد پچا

میں بدھی، میں بے دھی!
ذرہ بھری ہاں رلی کملی
توں عشق دا میڈا مولا
میڈے عیباں تے پردہ پا

میں وکھڑے وچھڑے کھاندی ودی
میڈی سنگر ورکیں کوئی بانھدی ودی
تھی صدقے میڈے توں وکاندی ودی
میڈے سوہے بھاگ جگا
میڈی کرلی توڑ چڑھا

میڈا میلا پوش رنگ سائیں
پا اپنے عشق دی ونگ سائیں
ہم نال قس وے ہنگے سائیں
میڈی منزل سکھے ڈکھا
پھیرے پچھڑے وچ تیر چلا
سائیاں وے ———
سائیاں وے ———

OOO

بشریٰ رحمٰن

صوفیانہ کلام

اوہدے ہتھ لیاں میریاں چھڑیاں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں

چوڑیاں وچ سارا رنگ اے
سارا رنگ میتھوں ڈنگا اے
رنگ سارا میرے سجن والا
جیہڑا ملکوں ملکوں وکھرا اے
میں کوڑی بھیکھڑی جہ چاہی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں

چوڑیاں وچ سب دھنک رنگیاں
میرا تن ہے کھوٹ بھرا
در در تے لیندی رہندی میں
میتھوں چنگا جھوٹ لبھ دا پیا
میں رلاڈی رلاڈی پھرائی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں

میری بانہہ تے میرا کال اے
کالے کملاں دی رکھوالی اے
سب کرتوت زمانے میں
میرے متھے تے کلنک دی کالی اے
میں چکر، چکر پھرائی آں
میں کیویں چڑھاواں چوڑیاں

OOO

انشائیہ

ناہمواریاں

سیّد تحسین گیلانی

میری زندگی بہت ہی آسودہ حال ہے...... ارے تو مسئلہ کیا ہے؟؟

ارے یہی تو مسئلہ ہے! کیا مطلب؟...... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ بس جانے کیوں لیکن مجھے ہموار راستے پسند نہیں۔

ہموار اور سپاٹ راستے یا زندگی کسی ٹھہرے ہوئے تالاب کی مانند لگتی ہے مجھے اس منظر میں انسان کتنی دیر رہے جہاں کوئی نظارہ ہی نہ ہو۔ لازم نہیں کہ میں یہاں پہاڑ کے نظاروں کی بابت کہہ رہا ہوں۔ نظارہ صحرا کا بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں جھکڑ ہوں زندگی اور موت کی کشمکش ہو...... آس آئے...... یاس جائے۔ کبھی انسان زندگی موت کی جنگ میں دونوں کی اہمیت و افادیت سے آشنا ہوتا ناہمواریوں سے گزرے تو پیاس بجھے موسموں اور رنگوں سے بے نیاز ایک ایسی زندگی جس میں مجھے اپنی خوشبو اور اپنے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو ...... میں زندگی کی ناہمواریوں سے دست پنجہ ہو کر خود تک رسائی کا سامان کر پاؤں تو اس سے بڑی کامیابی اور خوش بختی کیا ہوگی!!!

عیش اک نشہ ہے سرور تو دیتا ہے لیکن سکون نہیں۔ میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں ارے یہ بھی کوئی زندگی ہوئی بیکار...... بے کار...... بے کار!! کوئی تو مجھے اوپر سے دھکا دے کہ میں جھاڑیوں کانٹوں میں گرتا گرتا ...... زخم کھاتا ...... چھلے ہوئے جسم کے ساتھ زندگی سے پھر جا ملوں تو ہر سانس مہکے اور اپنی قیمت جانے ...... تو میں خود سے ہم کلام ہو کر ایسا امر ہو پاؤں کہ زمان و مکان کے درمیان خود کو پا پاؤں خود سے تادیر مل کر دھاڑیں مار کر روؤں اور روتے روتے اپنی آغوش میں سو جاؤں!! دیکھو تم ناشکری تو نہیں کر رہے؟؟

ہو سکتا ہے ...... لیکن اگر اس میں سکون ہوتا تو میں شکر گزار ضرور ہوتا!! دیکھو سکون وہاں بھی نہیں ملے گا جس کے تم خواہش مند ہو!! نہ ملے ...... !! لیکن پھر میں ناشکری کا مرتکب نہیں ہوں گا ...... لیکن میں اس ہموار راستے کے ایک ہی منظر سے اکتا چکا ہوں ...... میں تخیل میں ہو کر ریگ زار کے خواب دیکھتا ہوں اور مجھے پورا حق ہے خواب دیکھنے کا۔ خواب ہی تو ہیں جو میرے اپنے ہیں جن کا ہونا مجھے "ہونے" کے احساس سے مزین کرتا ہے یوں میں ایک جہان میں رہتے ہوئے بھی جہان دیگر اور کتنی ناہموار زمینوں کی سیر کرتا ہوں...... اور اپنے "نہ ہونے" کو ہوتا دیکھتا ہوں اور کبھی تو میں ان ناہموار خوابوں کی زمینوں پر اپنے جیسے کروڑوں سپاٹ رستوں سے اکتائے چہروں سے ملتا ہوں جو اس قید بے سکونی میں پل پل مرتے ہیں اور سکون کی تلاش میں میرے ساتھ ناہموار خوابوں کی زمینوں پر ان حقیقتوں کو دفنانے کے لئے یک زبان کھڑے ہوتے ہیں اور پھر ایک ایک کر کے وہ اپنی اپنی ہموار زندگی کی لاش کو دفناتے چلے جاتے ہیں اور خود کو لاتعلقوں، کرب ناکیوں اور ہول ناکیوں کے سپرد کر کے سکون و اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

تم پاگل ہو ...... تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے!! ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہتے ہو ...... مگر میں پھر کہے دیتا ہوں میرا دم گھٹتا ہے اس ایک ہی منظر سے ایک ہی جیسی چلتی ہوئی زندگی سے جس میں کوئی ہلچل نہیں سب بس یونہی کیوں ملتا چلا جائے کیوں؟؟ دیکھو دینے والے نے تمہیں سب دیا ہے تو تمہیں اس سے خوش ہونا چاہیے!! ہاں! لیکن وہ اس نے اپنی مرضی سے دیا ہے جب کہ اس نے مجھے اختیار بھی دیا ہے

اور مجھے مرضی، اختیار اور قوتِ فکر سے بھی نوازا ہے تو میں کہ کرنا چاہتا اور اپنی قلبی و روحانی خوشی، سکون اور راحت کی جستجو کرنے کا بھی پورا حق دیا ہے۔ اب تم سنو میں انسان بنیادی طور پر ناہموار رستوں کا ہی مسافر ہوں میری تاریخ میرا وجود میرا اس دنیا میں آنا ـــــ اس سب کا مطالعہ کرو تو میں انسان ناہمواریوں کی ہی دین ہوں تو ان کی محبت کا مجھ میں پایا جانا فطری عمل ہے :

میں انسان سوچوں کی ناہمواریوں سے گزرا / میں زمینی ناہمواریوں سے گزرا / میں شعوری ناہمواریوں سے گزرا / میں رنگی ناہمواریوں سے گزرا / میں مقدم غیر مقدم ناہمواریوں سے گزرا / میں مذہبی ناہمواریوں سے گزرا / میں لسانی ناہمواریوں سے گزرا / میں حقیقی ناہمواریوں سے گزرا / میں وجودی ناہمواریوں سے گزرا / میں عقلی ناہمواریوں سے گزرا / میں اخلاقی ناہمواریوں سے گزرا / میں سائنسی ناہمواریوں سے گزرا / میں موجی ناہمواریوں سے گزرا / اور میں انسان معاشی ناہمواریوں سے گزرا

تو کیا میں ان سب منازل کو طے کرتے ہوئے نہیں آیا تم ہی بتاؤ کیا ایسا نہیں؟؟

لیکن یہ کیا ان سب منازل کو طے کر چکنے کے بعد بھی تم تو وہیں کے وہیں کھڑے لگ رہے ہو!!

ایسا ہی ہے ـــــ یا شاید ایسا ہرگز نہیں ـــــ!!

ضروری نہیں میں اور تم سب صاف صاف دیکھ پائیں یا ممکن ہے جو صاف صاف نظر آ رہا ہے وہ "وہ" نہیں جو دکھایا جا رہا ہے لیکن ناہمواریوں کی مٹی سے گندھے وجود کا اس کی چاہ میں بھٹکنا کچھ معمولی بھی نہیں کہ یہ تو میری سرشت کا حصہ ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں انسان اگر ان سب ناہمواریوں سے گزار ہوں تو ہی سانس لے سکتا ہوں ورنہ شاید نہیں۔ یقیناً میرے وجود و بقا کو ضرور خطرہ لاحق ہوگا۔ دیکھا جائے تو اس حیات بے سود میں جو رنگا رنگی ہے وہ ان ناہمواریوں کی ہی دین ہے کہ جب فکر کو جولانیاں دیتے ہوئے مصائب و آلام سے جتا دی روح "لا حاصل" کو "حاصل" کرتا ہے تو وہ مسرتوں اور شادمانیوں کے گال چومتا ہے اور پھر ایک منزل کو طے کرتے ہوئے انسان کا دوسری منزل کی جانب سفرِ حیات میں لہو برقرار رکھنے کا باعث ہے۔

لیکن میں تمہارے سوالوں کا جواب کیوں دوں!! تم بس سنو اگر سن سکتے ہو تو غور سے سنو!! میں انسان ہوں اس کائنات کا اصل وجود مجھ سے ہے اور میرا وجود میرا ہونا زندگی میں بے قراری سے ہی تو ہے وہ بے قراری جو ـــــ چٹانوں کی ناہمواریوں سے طواف ہے اور مجھے خود چٹان کا حوصلہ دیتی ہے وہ مجھے صحراؤں کی ناہمواریوں سے طواف ہے تو پیاس میں عزم و ہمت ہے، وہ مجھے پہاڑوں کی ناہمواریوں سے طواف ہے تو ہمت دیتی ہے، وہ مجھے سمندروں کی ناہمواریوں سے طواف ہے تو لوہے کا جگر دیتی ہے ـــــ مجھے ہواؤں کی ناہمواریوں سے طواف ہے تو اڑنے کو پر دیتی ہے، یہ بے قراری مجھے اندھیرے کی ناہمواریوں میں اندھے کنوئیں میں بھی ورد دیتی ہے۔ مجھے بحیثیت انسان ان ناہمواریوں کا ہر قدم پر جنبش ممنون و احسان ہونا چاہیے کہ ان کے ہونے نے ہی میرے ہونے کو بے قرار رکھا ہوا ہے اور بے معنی و بے لذت زندگی کو توانا و تر و تازہ کیا ہے ـــــ تو کیا غلط ہے اگر میں آج اپنی ہموار اور سپاٹ زندگی سے اکتاتے ہوئے اس سے ناہمواریوں کی بھیک مانگ رہا ہوں؟؟ لیکن؟ لیکن کیا؟ ـــــ تم کون ہو؟ میں؟ میں تمہاری ہی ایک ناہموار سوچ ہوں ـــــ یعنی تم!!

◆◆◆

طنز و مزاح

ڈاکٹر انعام الحق

کرونائی حقیقت

عہدِ کرونا نے اس بات کو کر دیا ہے اب بالکل واضح
اک موقعے پہ اپنے ساتھی بھی آپ کے دشمن بن سکتے ہیں
باہر سے یہ وائرس لا کر چپکے سے گھر میں پھیلا کر
اب تو آپ کے اپنے بالکل بھی آپ کے دشمن بن سکتے ہیں

منفی، مثبت سے بہتر

نتیجہ مثبت آتا جن کا بھی ماہانہ ٹسٹ میں
سکولوں کالجوں میں وہ کبھی بھی تھے دکھ جھیلے
کرونا میں مگر یہ سوچ کر ہر اک پریشاں ہے
کہ ٹسٹوں میں رزلٹ اس کا کہیں مثبت نہ آ جائے

ظالم کرونا سے خطاب

ہم عمر بھر میں ہوں گے نہائے نہ اتنی بار
اک دن میں ہاتھ دھونے پڑے ہم کو جتنی بار
اوپر سے یہ کہ پانی کی قلت بھی کم نہیں
اب امتحان لے گا ہمارا تو کتنی بار

کراچی اور مہاجر

میں پچھلی پانچ نسلوں سے یہاں ہوں اور مہاجر ہوں
تعجب ہے کہ لوگوں کے لئے پھر بھی مہاجر ہوں
اور اوپر سے میں خود اقرار کر لیتا ہوں حالانکہ
کہیں مزدور ہوں میں اور کہیں پر آپ آجر ہوں

خوفناک خوش خبری

بیوی بھی ڈر رہی ہے شوہر بھی ڈر رہا ہے
ہر چھینک سے اب کرونا یوں وار کر رہا ہے
ہر شے الٹ گئی ہے اور حد یہ ہے کہ اب تو
دفتر میں آج افسر Peon سے ڈر رہا ہے

کرونائی خوف

ادھر امیر اچانک گدا سے ڈرنے لگا
ادھر سے مفلس بے دل خدا سے ڈرنے لگا
ڈرایا اتنا کرونا نے آ کے ٹی وی پہ
مریض الگ سے مسیحا سے ڈرنے لگا

کرونا دیوی

عہدِ قدیم میں تھا مشہور جس کا جلوہ
پر اب کرونا ہی نے اودھم مچا دیا ہے
خوف و ہراس و وحشت پھیلا کے ایک دم سے
ہر شخص کو ہی اس نے لٹو بنا دیا ہے

کرونائی شناخت

ماسک سے چھپ گیا ہر اک چہرہ
دل سے غائب ہوئی جہاں مروت
ہائے اس دور نے تو انساں کی
انفرادی شناخت گم کر دی

ایک ڈاکٹر کے دعوے کا جواب

"سب یہ کہتے کرونا ہے
ہر شخص کو ہونا ہے"
یہ ٹھیک ہے مگر تو پھر
کس بات کا رونا ہے

OOO

ڈاکٹر بدر منیر

محوِ حیرت

بلاتی ہے یہاں جس کو عدالت
اسی کو گھیر لیتی ہے علالت

طلب ہو حکم رہائی مانگنے سے
بگڑ جاتی ہے ہر لیڈر کی حالت

سیاسی جنگجو کا نام دیں گے
نہ دیکھیں گے مگر اپنی رذالت

عوامی خدمتوں کا دے کے جھانسا
یہ کرتے ہیں فقط اپنی کفالت

زمانے میں کرپشن کی وجہ سے
اخلاقی بڑھ رہی ہے ہر جہالت

وکیلوں کے دلائل توبہ توبہ
ملے جن سے مقدموں کو طوالت

عوام الناس کا کیا ذکر کیجے
انہیں مارے ہے خود ان کی جہالت

OOO

گردن

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

گردن ہمیشہ سے موضوعِ سخن رہی ہے۔ ہم سوچتے تھے کہ محبوب کی گردن کو صراحی دار گردن سے کیوں تشبیہ دی جاتی ہے۔ پھر سوچتے گئے کہ صراحی کو کس حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ یوں یاد آیا جہاں جام و سبو کی بات ہوتی ہے وہاں بہت سے دل جلوں کو جام اور سبو ذرا چھوٹے پیالے نظر آتے ہوں گے تبھی تو جام و سبو کی محفل کی فکر میں ایک بہت بڑی صراحی بھری نظر آتی تھی جس سے ان کو ری فل (Refill) کیا جاتا یعنی دوبارہ بھرا جاتا تاکہ تشنگی کا نشہ ٹوٹنے نہ پائے۔ سو جب خوبصورت گردن کو صراحی سے تشبیہ دی جانے کا آغاز کیا گیا ہوگا تو یقیناً صراحی کے اندر کے مشروب کی خصوصیات کو مدِ نظر رکھا گیا ہوگا۔ گردن کی خوبصورتی اگر صراحی سے ہی مماثلت رکھتی ہے تو زرافے کے اس سلسلے میں بہت نمبر ہوں گے۔ کئی ملکوں میں چھوٹی گردن والے بھی زرافے ہوتے ہیں وہ بھی تقریباً خوبصورت ہی ہوتے ہیں مگر بڑی گردن والے زرافوں کی خوبصورتی اپنی جگہ۔ گو کہ اللہ میاں نے محض گردن کی لمبائی خوبصورتی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نہیں رکھی ہوگی بلکہ ماحول کے مطابق ان بیچاروں کی گردنوں کو اونچے اونچے درختوں سے پتوں اور شاخوں کو نوالہ بنا کر پیٹ پوجا کرنے کیلئے ایسا بنایا ہوگا۔ سو صراحی دار گردن کی بات کریں تو زرافے کی گردن کسی بھی لمبی صراحی سے کیا کم ہوگی۔ تاہم اس مقابلے میں بھلا اونٹ اور اونٹنی کیسے پیچھے رہنے والے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ اونٹوں کو کھجوریں بہت پسند آتی ہوں گی اس لئے ان کی گردنیں زرافوں سے بھی لمبی ہوتی گئیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کھجوریں اپنی گردن بچاتی بچاتی لمبی ہوتی گئی ہوں گی تاکہ ان پہ کھجوروں کی صورت میں پھل آتی اونچائی میں لگے کہ اونٹ کی گردن بھی نہ پہنچ سکے۔

گردن کی بات چل نکلی ہے تو ذرا ''گردن زدنی'' کا بھی ذکر ہو جائے۔ خدانخواستہ اس گردن زدنی سے مراد محض گردن کاٹنا نہیں بلکہ گردن کھانا بھی تو ہوسکتا ہے۔ دروغ بر گردنِ راوی کہتے ہیں کہ جب فوج میں بڑا کھانا ہوتا ہے جو فوجی افسر اور کیڈٹ مل کر کھاتے ہیں تو مرغِ مسلم کے جسم کو ''روح افزا'' اور ''صحت افزا'' حصے تو افسروں کے حصے میں آتے ہیں جب کہ بیچارے کیڈٹوں کے نصیب میں مرغ کی گردنیں ہی آتی ہیں۔ وہ بھی ابھی ان گردنوں پہ پوری طرح ٹوٹ ہی نہیں پڑتے کہ بڑے افسر جلدی سے کھانا ختم بھی کر لیتے ہیں۔ کچھ کیڈٹ تو حصے میں آئی یہ گردنیں بھی جلدی سے کھا لیتے ہیں مگر جو راست ہوں انہیں اس ''گردن زدنی'' کا موقع ہی نہیں ملتا۔

جہاں ہمارے معاشرے میں لوگوں کو اپنی ناک کٹنے کا خطرہ ہوتا ہے وہاں ایسے ماحول میں گردن کی بھی خصوصی اہمیت ہے۔ یہاں تو چھوٹے بڑے اور چھوٹے موٹے رسم و رواجوں کی وجہ سے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی ناک کے کٹنے کی فکر ہوتی ہے۔ وہ تو اکثر کہتے سنے گئے ہیں کہ اس نے تو یہ کام کر کے اپنے قبیلے کی ناک ہی کٹوا دی ہے۔ کئی تو اس محاورے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کسی سے کوئی رومانوی غلطی ہو جائے تو اصلی ناک ہی کاٹ دیتے ہیں اور اس بیچارے یا بیچاری کو بعد میں پلاسٹک سرجری کروانی پڑتی ہے۔ شکر ہے کہ اب یہ ناک

کاٹنے کی حرکتوں میں واضح کمی آئی ہے اور لوگوں کو یقین ہو گیا ہے کہ یہ تو محض اردو کا ایک محاورہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کسی کو سزا دینے کے اور بھی کئی طریقے ہیں جن کے بعد کم از کم پلاسٹک سرجری تو نہیں کروانی پڑتی۔ اسی محاورہ کی وجہ ہی سے پہلے دیہاتوں بلکہ کئی چھوٹے شہروں میں یہ رواج بھی تھا کہ کسی کو بے عزتی کرنی ہو تو زمین پر ناک سے لکیریں کھنچوائی (یعنی لگوائی) جاتی تھیں۔

خیر بات تو گردن کی ہو رہی تھی پتہ نہیں ناک بیچ میں کہاں سے آن گھسی۔ گردن کی اہمیت پوچھنی ہو تو افسروں سے پوچھیں۔ بے چاروں کو سارا دن گردن اکڑا کے پھرنا پڑتا ہے۔ ویسے سارا دن گردن کو اکڑا کے پھرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ افسر بننے کے شروع کے دنوں میں تو خاصی مشکل پیش آتی ہے۔ تاہم ایک آدھ ہفتے میں ہی گردن اکڑانے کی عادت سی ہو جاتی ہے اور بعض کو تو ایسی عادت پڑتی ہے کہ سوتے وقت بھی یہ اکڑاہٹ قائم رہتی ہے۔ مسلسل اکڑاہٹ کے بعد جب ریٹائرمنٹ کا وقت آتا ہے تو تب اسے قائم رکھنا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے چند ابتدائی ہفتوں میں تو اسے کسی حد تک قائم رکھا جاتا ہے مگر جب یقین ہو جائے کہ اب کوئی نئی افسرانہ قسم کی نوکری نہیں ملنے والی تو آہستہ آہستہ یہ گردن ڈھیلی پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے ابتدائی دنوں میں گردن کی یہ اکڑاہٹ کم کرنے میں اپنی بیگم بھی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے کیونکہ اب رعب جمانے کو وہ رہ گئی ہوتی ہے یا وہ چند نوکر جو حکومت کی طرف سے واپس لئے جانے والوں کے بعد اصلی (نوکر) بچ جاتے ہیں۔ جب بیگم کو بھی یقین ہو جاتا ہے کہ اب شوہر نامدار نہ ہی افسر رہے ہیں اور نہ ہی مستقبل میں کوئی امکان ہے تو صاحب کی تنی گردن جلد ڈھیلی کرانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

''گردن زنی'' اور ''گردن تنی'' کے علاوہ آج کل ایک نئی بیماری نے جنم لیا ہے جسے ''گردن بگی'' کا نام دیا جاتا ہے۔ ''گردن بگی'' کا شاخسانہ موبائل فون کی آمد شریف ہے۔ جب سے موبائل فون ہماری زندگیوں میں نئی بنیادی ضرورت بن کر ابھرا ہے اس نے بھی گردنیں جھکا دی ہیں۔ اسے استعمال کرنے کے لئے ایسی گردنیں بھی جھک جاتی ہیں جنہیں غرور نے کبھی جھکنے نہ دیا تھا۔ پہلے پہل تو یہ گردنیں موبائل فون کے کثرت استعمال سے محض بگی تھیں مگر اب تو گردنیں اور کمر کا اوپر کا حصہ بھی جھک گیا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ دیکھیں تو بہت خوش ہوں کہ آج کی پود میں عاجزی آ گئی ہے اور گردن جھکا کر اور نگاہیں نیچی کر کے بیٹھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ اب تو یہ عاجزی نہیں بلکہ ایک بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے اسے سائبر نیک سنڈروم **Cyber Neck Syndrome** بھی کہا جاتا ہے پہلے ہمارے پاس مریض گردن میں کھچاؤ کی شکایت کرتے تھے تو ہم کہتے تھے کہ یا تو یہ اعصابی تناؤ ہے یا پھر بلڈ پریشر کی زیادتی کی وجہ سے ایسا ہے۔ اب تو مسلسل گردن جھکانے کی وجہ سے یعنی کثرت استعمال موبائل کے سبب یہ گردن کھچاؤ عام ہو گیا ہے۔ تاہم جس مہارت اور چابکدستی سے پاکستانی قوم مختلف سٹائل اپنا کر موبائل فون سنتی ہے اس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔ آپ بھی موٹر سائیکل چلاتے ہوئے کسی کو گردن ایک طرف ٹیڑھی کر کے موبائل سنتے ہوئے دیکھیں تو عش عش کر اٹھیں گے کہ کس طرح گردن ٹیڑھی کر کے اس نے موبائل فون کو گردن اور شانے کے درمیان اس طرح توازن سے اٹکا رکھا ہے کہ اسے گرنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔ یوں ٹیڑھی گردن کر کے موبائل فون کو سنبھالنا اور نہایت مشاقی سے بھاری اور بے ہنگم ٹریفک میں موٹر سائیکل کو چلانا کسی طور پر مداری کے کرتب دکھانے سے کم نہیں ہوتا۔ گو کہ یہی آج کل ڈاکٹروں کے پاس یہ شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب دیکھیں پتہ نہیں کیوں میری گردن اور کندھے ہر وقت درد کرتے رہتے ہیں۔ اب بھلا آپ کی گردن اور بیچارے کندھے اس زیادتی کی شکایت اور تقاضا ہی بھی نہ کریں تو کیا کریں؟؟

◆◆◆

میرے سرتاج

نور کمال شاہ

گھنٹہ گھر چوک میں بالکل سامنے واقع بڑے شاپنگ سنٹر کی پہلی ہی دکان میں خریداری سے فارغ ہو کر میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پیچھے سے انتہائی مدھم، شفیق اور رسیلی آواز میں بیگم نے بڑے پیار سے پکارا ''سرتاج''۔۔۔!!!

ہیں۔۔۔!! یہ کیا۔۔۔؟ کیا مجھے آواز دی گئی؟''

پہلے تو کانوں پر یقین نہ آیا، گمان ہونے لگا، مجھے نہیں یار۔۔۔!! شاید کسی اور کو پکارا گیا ہوگا مگر جب نظریں ارد گرد کا طواف مکمل کر کے ناکام لوٹ آئیں اور پیچھے کسی اور کو اپنے قریب نہ پایا تو قائل ہونا ہی پڑا کہ مجھے ہی پکارا گیا ہے۔ آنکھیں حیران اور سماعتیں انگشت بدنداں رہ گئیں۔ کانوں پر سے رہا سہا اعتبار جاتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار اس میٹھے لفظ کی حدت، حرمت اور لذت سے آشنائی ہو رہی تھی اور یہ لذت آشنائی بہت ہی مسحور کن تھی۔ بہت ہی عجیب لگا اور نہایت ہی اچھا بھی۔ گھر میں مجھے جس قسم کے القاب و آداب سے اب تک پکارا گیا تھا یا پکارا جا رہا تھا وہ میں ہی جانتا ہوں اور یہاں پر آپ لوگوں کے سامنے اس کا ذکر کر کے میں اپنی سفید پوشی پر حرف نہیں آنے دوں گا کیونکہ آخر عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے ورنہ تو ''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا'' والی صورت حال بن سکتی ہے اور میں کبھی ایسا نہیں چاہوں گا۔۔۔!! بیگم نے میرے مزید سوچنے سمجھنے اور حیران ہونے کو بریک لگاتے ہوئے اسے وہیں پر روک دیا (ایک طرح سے میری سوچوں کا گلا ہی گھونٹ دیا) اور آگے بڑھ کر اسی ناز و ادا کے ساتھ بولیں ''سرتاج!! ذرا وہ سامنے شیلف میں آویزاں لہنگا دیکھیں ذرا، کتنا پیارا لگ رہا ہے، ہائے اللہ! کتنا سجے گا مجھ پر۔۔۔ ہے نا۔۔۔؟؟

''ہاں ہاں بیگم۔۔۔!! کیوں نہیں۔۔۔ واقعی۔۔۔ یقیناً۔۔۔!! میں ہکلایا۔''

اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی ردعمل دکھاتا وہ آہستہ سے میرے بالکل قریب کھنچ کر کان میں چپکے سے بولیں: ''بس اب زیادہ حیران ہونے اور نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں، لہنگا لے لیں اور چلیں آگے مجھے اور بھی خریداری کرنی ہے۔'' صاحبو اور دوستو اور میرے ہمدردو!! خوش فہمی کا جو شیش محل میں نے ان چند سیکنڈوں میں آباد کیا تھا فوراً ہی دھڑام سے زمین پہ آ گرا۔ پل بھر میں میرے ارمانوں کا خون کر دیا گیا۔ میری امیدوں کو بڑی بے دردی سے ماتھے سے اٹھا دیا گیا۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ زیر لب مسکرانے لگے ہیں مگر دوستو! معاملہ صرف مجھ تک ہی محدود نہیں ہے۔ بیویاں سب کی ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ ہاں کسی جگہ۔۔۔۔ کی طرح معمولی فرق ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اس دن ایک بڑے دانشور کا قول پڑھ رہا تھا لکھا تھا مجھ میں اور میری بیگم میں عجب طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ نیند کی گولی وہ کھاتی ہے اور سکون مجھے ملتا ہے۔ میں نے بیگم (ایچ ایچ) کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہوتے دیکھا ہے۔ پرسوں ہی میرا ایک دوست مجھ سے نہایت سادہ انداز میں اپنی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: ''وہ لوگ بزدل ہوتے ہیں جو بیوی کے سامنے خاموش رہتے ہیں اور منہ نہیں کھولتے۔ میں نے تو سیدھا منہ پر صاف صاف کہہ دیا کہ بیگم!! رات میں ٹھنڈ زیادہ ہے میں برتن صبح

ڈھولوں گا۔" اور شرافت ملاحظہ فرمایئے کہ وہ خوش دلی سے مان بھی گئی۔ وہ دوست جو اس متنازعہ موضوع سے گھبرائے گئے ہیں وہ گھبرائیں نہیں اور اپنے حواس درست کر لیں کیونکہ آخر میں میں نے ایک ہی جملے سے اپنی اس گستاخی اور بے ادبی کو دور کرنا ہے وہ جس طرح کہا جاتا ہے کہ ایک سکول میں انسپکٹر صاحب معائنہ کرنے گئے تو وہاں زیادہ انتظامات اور مہمانداری نہ دیکھ کر بددل سے ہو گئے۔ لاگ بک نکال کر نوٹ لکھنے بیٹھ گئے: "سکول کی حالت بہت خراب ہے، بچوں کی پڑھائی بھی بہت کمزور ہے۔ صفائی کا انتظام ناقص ہے، استاد محترم نے اپنے کام پر توجہ نہیں دی ہے ---" ایک ساتھی نے انسپکٹر صاحب کو یہ ریمارکس لکھتے دیکھ کر پیچھے سے اس کے کان میں کہا: "کیا کر رہے ہیں جناب، ہم نے طرف کے گھر میں استاد صاحب نے اتنی تیاری شروع کر رکھی ہے۔ قسم قسم کے پکوان بن رہے ہیں آپ کے لئے، مرغ تل رہے ہیں اور آپ یوں لکھ رہے ہیں۔" انسپکٹر صاحب نے بڑی تحمل سے فرمایا: "فکر کیوں کرتے ہیں، ابھی میں نے لکھنا مکمل تو نہیں کیا۔" اور اس کے بعد صاحب نے اسی عبارت کو جاری رکھتے ہوئے اس کے آگے لکھنا شروع کیا: "مگر موجودہ استاد محترم کے یہاں آنے کے بعد حالت یکدم بدل گئی۔ انقلاب آ گیا۔ انتظام صحیح، صفائی ٹھیک ٹھاک، بچوں کی پڑھائی بہترین اور سکول ترقی کی جانب رواں دواں ---!! بیگم صاحبہ اگرچہ روایتی بیوی ہیں اور میرے ساتھ روایتی سلوک بھی کرتی رہتی ہیں (کبھی کبھی) مگر ایک بات کا مجھے قطعی یقین ہے اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ دل کی بری بالکل بھی نہیں ہیں (اس بات کی گواہی اس کے گھر والے اور میرے ہمسائے بھی دیں گے) روایتی بیگمات کی طرح ---" پکوال میں لے جاتی ہے سسرال کی باتیں" والی خاص اداؤں سے بھی متصف ہیں اور ساتھ ساتھ مجھ سے بے حد پیار کرتی تھیں اگرچہ وہ تو عقد سے پہلے کا قصہ ہے یعنی جب آتش جوان تھا ---" کرتی تھی بہت پیار مگر عقد سے پہلے" مطلب یہ کہ وہ تو ماضی کا ذکر تھا، ماضی بھی کون سا --- ماضی بعید کا، ماضی قطعیہ یا ماضی تمنائی ہوتا پھر بھی کوئی بات ہوتی۔ بہر حال ماضی جو بھی ہو برا ہی ہوتا ہے اور اہل دانش و بینش کے نزدیک اسے جتنا جلد بھلا کر چھٹکارا پا لیا جائے اتنی ہی زندگی (جو تھوڑی بہت باقی رہ گئی ہے) سکون سے گزرے گی ---- اور اب آج کل تو حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں جس کا اشارہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید صاحب نے کیا تھا کہ "اب ہوتی ہیں بس مرچ، نمک، دال کی باتیں" اور نمک مرچ کی باتوں میں مٹھاس اور شیرینی ڈھونڈنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی گنجے کے سر پہ بال تلاش کرنے بیٹھ جائے۔ ان باتوں سے بس کڑواہٹ اور کھٹاس ہی برآمد ہوگا۔

کہتے ہیں تقدیر میں خوار ہونا لکھا ہو تو اس نازک موقعے پہ تدبیر بھی ہاتھ باندھے خاموش کھڑی رہے گی اور آپ کی مدد کو آگے نہیں بڑھے گی۔ ہم اس لمحے کو کوستے رہے جب ان محترمہ کے حضور شاپنگ کرانے کی ہامی بھری تھی اور اب جی بھر کر بھگت رہے تھے۔ بزرگوں اور بہی خواہوں کا وہ قول ہم یکسر بھلا بیٹھے تھے کہ خوشی کے موقعے پر کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہیے۔ مگر ہم تو وعدہ کر بیٹھے تھے اور اب اسے نبھانا ہمارے دائرہ اختیار سے باہر تھا اور آج ہم وعدہ پورا کرنے مارکیٹ میں نشان عبرت بنے موجود تھے۔ قصہ مختصر شاپنگ مال کے دکانوں سے مال اور ہمارے جسم سے ٹھنڈا پسینہ نکلتا رہا۔ بڑے بڑے شاپنگ بیگز مختلف قسم کی اشیاء سے بھرتے رہے اور ہماری جیب کا وزن گھٹتا رہا۔ کپڑے، جوتے، کاسمیٹکس کا سامان، کراکری، دوپٹے سمیت بہت کچھ خریداری ہو گئی۔ آخر کار جب جیب کا وزن نہ ہونے کے قریب پہنچا تب مجبوراً مزید خریداری روک دی گئی بلکہ یوں کہیے کہ ایک طرح سے اگلے وقت تک کے لئے موخر کر دی گئی۔ بھرے ہوئے تھیلوں کی تعداد اور ہماری بے چارگی دیکھ کر بیگم کے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ کی پرچھائیاں لہرانے لگیں تھیں۔ اب پتہ نہیں

انہیں زیادہ خوشی من پسند خریداری کی ہو رہی تھی یا ہماری بے بسی دیکھنے کی.....!! اب ان بھرے تھیلوں کو ٹیکسی سٹینڈ تک پہنچانا مسئلہ بن رہا تھا اور وہ بھی فقط میرے لیے۔ بیگم اس جھنجھٹ سے آزاد تھیں۔ بدقسمتی سے میری گاڑی میں آج ہی کوئی مسئلہ پیدا ہو چکا تھا اور اب وہ مکینک کے پاس کھڑی مرمت کے مرحلے سے گزر رہی تھی اور ہمیں مجبوراً ٹیکسی کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔

بیگم صاحبہ نے گود کا بچہ سنبھالا جو ابھی تک میرے کندھے پر جھول رہا تھا اور میں شاپنگ بیگز اٹھا کر پیچھے پیچھے ٹیکسی سٹینڈ کی طرف بڑھا۔ بھاری اور بڑے شاپنگ بیگز مجھ سے اُٹھائے اور سنبھالے نہیں جا رہے تھے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح سٹینڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ مختلف سائز اور وزن کے چھوٹے بڑے تھیلوں سے لدا پھندا دیکھ کر دو تین ٹیکسی ڈرائیور میری طرف بڑھے اور ان میں سے ایک نے، جو پہلے مجھ تک پہنچا تھا میرے ہاتھوں اور کندھے سے تھیلے اُتار کر گاڑی کی ڈگی اور پچھلی سیٹ پر پھینکے، مجھ پر ایک گہری نظر ڈال کے میری حیثیت اور مرتبے کا تعین کیا اور جب وہ اس فیصلے پر پہنچا کہ یہ کوئی بااختیار مرد تو نہیں ہو سکتا، بلکہ بیگم صاحبہ کا گھریلو ملازم ہوگا شاید، تب بلند آواز سے تحکمانہ لہجے میں پکارا: ''اوئے ------!! ادھر کھڑے کیا منہ دیکھ رہے ہو جلدی کرو، ادھر آ کے سامان کے ساتھ پیچھے بیٹھو۔'' ساتھ ہی وہ اگلا دروازہ کھول کر بیگم صاحبہ سے بڑے ادب سے کہنے لگا: ''آپ بیگم صاحبہ ------! یہاں بیٹھ جائیں، جانا کدھر ہے جی ------!!'' مجھے اس بدتمیز ڈرائیور کی اس حرکت پہ غصہ تو بہت آیا اور جی چاہا کہ مردود کا منہ نوچ لوں یا اس کا گلا دبا دوں۔ مجھے کیا خدمت گار سمجھ رکھا ہے ------!!! وہ تو شکر ہے بیگم صاحبہ نے صورت حال کو سنبھالا اور بولیں ''نہیں ------!! صاحب کو آگے بیٹھنے دو، ہم پیچھے بیٹھ جائیں گے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے ''صاحب'' کے لفظ پہ ہمیں یوں حیرت سے گھورا گویا اسے یہ سن کر صدمہ پہنچا ہو۔ گھر کے احاطے میں داخل ہو کر ہارن کے ذریعے نوکر کو اطلاع دی گئی۔ بیگم صاحبہ تو بچے کو اٹھا کے اندر چلی گئیں اور میں سامان اُتارنے لگا۔ ساتھ ہی ملازم کو چیخ کر پکارتا بھی رہا: ''رفیق ------!! رفیق ق ق ق ------!!! اوئے رفیقے ے ے ------!!! کہاں مر گیا مردود۔'' رفیق دوڑتا ہوا پہنچا، میری حالت کذائی دیکھ کر ٹھٹکا اور فوراً ہی سامان اُٹھانے میں میری مدد کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھپی مسکراہٹ کا پرتو میں خوب دیکھ سکتا تھا۔ رفیق اپنی ہنسی کو روکنے کی ناکام سی کوشش کر رہا تھا اور میں بے بسی سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا------!!

◆◆◆

ادارہ ''تخلیق'' اور اس کے تمام قارئین کو معروف شاعرہ محترمہ ڈاکٹر فوقیہ مشتاق کو

Roger Williams University America

کے شعبہ کیمیا میں بطور پروفیسر تقرری پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

جائزے

ماہنامہ "تخلیق" کا 20 سالہ جائزہ
2001ء سے 2020ء تک

......1......

آفتاب خان

اظہر جاوید نے 1969ء میں جو پودا لگایا تھا وہ اب ایک تناور شجر کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ماہنامہ "تخلیق" اپنی اشاعت کے پچاس برس مکمل کر کے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس قافلے میں بہت سے لوگ ملتے اور بچھڑتے جا رہے ہیں جبکہ بہت سے نئے لوگ اس قافلے میں شامل ہو رہے ہیں۔ "سیپ"، "اوراق" اور "فنون" کے بعد "تخلیق" ہی وہ واحد پرچہ ہے جس میں شائع ہونا ہر شاعر و ادیب اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہے اور جو اس میں شائع نہیں ہوتا اس کی ادبی حیثیت مشکوک تصور کی جاتی ہے۔ اظہر جاوید نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے اور ان کے بعد اب ان کا ہونہار فرزند جیسے ذوق و شوق اور خلوص دل سے اسے جاری رکھے ہوئے ہے بلکہ اسے مزید بہتر کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس دوران بہت سی تبدیلیاں بھی آئی ہیں اور بہت کچھ نیا بھی دیکھنے کو ملا ہے۔ اس مضمون میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ بیس برس میں ادبی افق پر کیا کیا رونما ہوا ہے اور کون کون سے لوگ منظر سے ہٹ گئے ہیں یا منظر پر نمودار ہوئے ہیں۔ اس کے لیے راقم نے دو حصے بنائے ہیں۔ پہلے حصے میں ہم اظہر جاوید کی ادارت کے آخری بارہ سال کا جائزہ لیں گے اس کے بعد سونان اظہر جاوید کے اب تک کے آٹھ سال پر ایک مفصل نظر ڈالیں گے۔ اس جائزے میں ہم "تخلیق" میں شائع شدہ تحریروں پر کوئی رائے ظاہر نہیں کریں گے بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ ان برسوں میں کون کون سے شاعر، ادیب "تخلیق" سے وابستہ رہے اور تاریخ کا حصہ بن گئے۔ ادب کے مختلف شعبوں کو اسی تناظر میں پیش کیا جائے گا جس طرح "تخلیق" کی لے آؤٹ میں ہر شعبے کے مختلف حصے بنائے گئے ہیں اور پھر ان میں شاعروں، ادیبوں کے نام تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے نہیں بلکہ زمانی اعتبار سے درج کیے جائیں گے یعنی 2001ء سے شروع ہو کر جس طرح لکھاری اس کارواں میں شامل ہوتے رہے اسی طرح ان کے نام بالترتیب درج ہوتے رہیں گے۔ آغاز کرتے ہیں 2001ء سے 2012ء تک۔

سرِ ورق: کسی بھی رسالے کا سرورق اس کے ماتھے کا جھومر ہوتا ہے اس لیے ہر رسالے کا مدیر یہی چاہتا ہے کہ اس کے رسالے کی ظاہری صورت بہت خوبصورت ہو اور اسے خوب رنگوں سے سجایا جائے۔ اظہر جاوید ایک فنکارانہ ذہن والے تخلیق کار تھے لہٰذا ان کے رسالوں کے سرورق بہت شاندار ہوا کرتے تھے جو مختلف مصوروں نے بنائے ہوتے۔ ماہِ فروری میں چونکہ فیض احمد فیض کی سالگرہ ہے اس لیے "تخلیق" کے ماہِ فروری کا ہر شمارہ فیض صاحب کی تصویر سے مزین ہوتا تھا۔ فیض صاحب کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی چونکہ مصورہ ہیں

اسی لیے ان کا بنایا ہوا فیض صاحب کا پورٹریٹ ہر سال فروری میں ''تخلیق'' کی زینت بنتا۔ بعض دفعہ یہ کوئی فوٹوگراف بھی ہوتا جو سلیمہ ہاشمی مہیا کرتی تھیں۔ فروری 2009ء کے سرورق پر فیض اور یاسر عرفات کی مشہور زمانہ تصویر لگائی گئی ہے جبکہ فروری 2010ء کا سرورق فیض صاحب کے مستقل مصور اسلم کمال کا بنایا ہوا ہے۔ اس طرح فروری ہمیشہ فیض صاحب کے نام رہتا۔ تخلیق کے دیگر مصوروں میں موجد، سلیم اختر، ریاظ، حمید وحید، انجم یعقوب، طاہر رشید، مسرت مرزا، اے ڈی (بھارت)، تحمینہ محمود، مسرت مرزا، شہلا رحمان، بگن (بھارت) وغیرہ کے نام نمایاں ہیں جبکہ خاقان ساجد، نارنگ ساقی، ضیاء الرحمٰن ضیاء، غلام اللہ سلیمی (گوادر) وغیرہ بھی مختلف مصوروں کے فن پارے تحفتاً تخلیق کو پیش کرتے جو سرورق پر اپنی شان دکھاتے تھے۔

<u>تصاویر</u> : سرورق کے بیک ٹائٹل پر ہمیشہ چند شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں لگائی جاتی تھیں۔ ابتداء میں یہ تصاویر بلیک اینڈ وائٹ ہوتی تھیں۔ 2010ء کے بعد رنگین تصویریں لگانے کا آغاز ہوا۔ جن شاعروں، ادیبوں کی تصاویر اس البم کا حصہ ہیں ان کے نام درج کیے جا رہے ہیں۔ انور سدید، کشمیری لال ذاکر، فیروز عالم، حمیرا رحمان، ظفر عظیم، اخلاق عاطف، ارم سلیم، فرخ صابری، اسپورن سنگھ، شکیلہ رفیق، تسلیم احمد تصور، محمد جنید اکرم، تسنیم کوثر، نوریہ مغل، شفیع عقیل، حمید اختر، قطب شیخ، سرور کاشمیری، عائشہ اسلم، مقصود حسین، نیلم شیخ، ف س اعجاز، خورشید احمر، بلونت کور سرگی، بلونت عالم، سیما شکیب، ضیاء ساجد، نیلم احمد بشیر، عمران مشتاق، آفتاب خان، آصف ثاقب، شکیل عامر، گل صابری، ایوب عنبرین، رمزاق مرزا، واسف حسین، علیم صبا نویدی، رحمہ عثمان، گوپال کرشن شفق، کلدیپ جوشی، زبیر کنجاہی، حمزہ شاہد، عمرانہ مشتاق، فاطمہ احمد، انوار فیروز، جاوید منظور، روبینہ شبنم، نارنگ ساقی، امر جیت آرزو، محمد افضل ہمایوں، سردار پنچھی، امر جیت کور ڈالی، گورچرن کور کوچر، اندرجیت اساعیل، پونم کوثر، عابدہ حسن حنفی، سائرہ حسن، تسنیم انجم، نزہت نگار، زمان کنجاہی، خان پرویز، کنول فیروز، نصرت شکیل سید، خرم خان، خالد اقبال یاسر، نعیمہ ضیاء الدین، روشانے سبطین، صفدر سلیم سیال، نوشی گیلانی، طاہرہ بخاری، نادیہ ملک، صائمہ نورین بخاری، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، حباب ترمذی، جاوید راہی، شہناز نقوی، رومانہ رومی، فرخندہ شمیم، خاطر غزنوی، طاہر لاہوری، راجا رسالو، ناصر شہزاد، اے بی جوش، نیلما ناہید درانی، بشریٰ اعجاز، رشید میاں، نسرین نقاش، طارق بلوچ صحرائی، عرفان امر، طاہر منظور، نائلہ تبسم، صابر آفاقی، خاقان ساجد، نذیر فتح پوری، کمل، راحت تسنیم ملک، دیویندر پریت، دیویندر پارس، خیال کھٹ، فرحت طاہرہ، روانہ شمین خان، اشرف قدسی، سلیمہ ہاشمی، زہرا جبیں، شکیل سروشی، مقدس دار، عباس جوگن، ایس ایم معین قریشی، صدف امتیاز، حنیفہ انجم کریم، گری راج، عمران حیدر، ادیب، امین راحت چغتائی، اعزاز احمد آذر، ضمیر، وشیع رضوی، وشیع سید، عاصم اصغر، شائق حسین شائق، حسین شاہ، مہتاب اکبر راشدی، رخشندہ نوید، کاظم جعفری، نوید فیصل، تجمل احمد تجمل، ساجد اریا، سلیمان غمار، طاہرہ اقبال، رشید امجد، عبدالکریم خالد، ناصر بشیر، شوکت ہاشمی، اصغر مہدی، حنیفہ جالندھری، دیوانی جالندھری، شمیم حنیف، محمد حنیفہ، میاں شہریار (موسیقار)۔

<u>اپنی بات</u> : ہر شمارے میں ''تخلیق'' کا اداریہ اظہر جاوید خود لکھتے اور ایسا لکھتے کہ پڑھنے والے کو رلا دیتے بلکہ جھنجھوڑ کر رکھ دیتے۔ ان کے اداریے عصر حاضر کا نوحہ اور دکھی دلوں کی فریاد تھے۔ وہ اپنے لیے کچھ طلب نہ کرتے کوئی مفاد ملحوظ نظر نہ ہوتا صرف عوام الناس کے دکھ درد کی بات کرتے۔ اپنا کوئی مسئلہ ہوتا بھی تو زیادہ سے زیادہ ڈاک ٹکٹ کے نرخ بڑھنے پر وہ احتجاج کرتے۔ یہ وہ دور تھا جب ''تخلیق'' کی انڈیا میں ایک سو کاپیاں جاتی تھیں۔ قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد کا تعلق انڈیا سے تھا۔ ڈاک خرچ بڑھنے سے ان تک

"تخلیق" کی ترسیل مشکل ہو جاتی اور وہ اداریے میں اپنے دل کا درد بیان کر کے حکومتِ وقت کو شرم دلاتے تھے۔ بعض دفعہ ان کے اداریے منظوم ہوتے۔ کوئی نظم لکھ کر اپنے دل کا حال بیان کرتے۔ اگست 2009ء کا اداریہ ایک نظم پر مشتمل ہے جس کا عنوان ہے "میں اظہر منظر"
اس پابند نظم کے دو شعر دیکھیے :

سو میں گم ہوں نہ الجھن ہوں مجھے سمجھا نہیں کوئی　　محبت کا نہیں گلشن ہوں مجھے سمجھا نہیں کوئی
نظر آتا ہے جس میں جھوٹ اور سچ کا ہر اک چہرہ　　وہی بے عیب درپن ہوں مجھے سمجھا نہیں کوئی

کبھی کبھی ان کا غصہ اتنا عروج پر ہوتا کہ اداریہ ہی نہ لکھتے چنانچہ جون 2009ء میں "اپنی بات" شامل نہیں۔ دسمبر 2010ء کے اداریے میں انہوں نے کہا کہ اکبر نسیم کا یہ شعر کئی بار پہلے بھی لکھ چکا ہوں، پھر ملاحظہ کریں :

جو بھی حساس ہے زمانے میں　　اس سے کہہ دو کہ گھٹ کے مر جائے

مضامین، مقالے : اداریے کے بعد کے صفحات نہایت اہم موضوعات پر مشتمل مقالہ جات اور مضامین کے لیے مختص تھے۔ عموماً اس شعبے میں ایک یا دو مضامین یا مقالے شامل ہوتے جو قدرے طویل بھی ہوتے اور موضوع کے اعتبار سے بھی بہت منفرد و اہمیت کے حامل قرار پاتے۔ اس ضمن میں لکھنے والوں کی ایک بھرپور کہکشاں ہے جس نے 12 سال کے "تخلیق" کے شماروں میں نہایت نادر و نایاب مقالے اور مضامین تحریر کر کے علمی اور ادبی سطح پر دعوتِ فکر و نظر عطا کی۔ ان لکھنے والوں پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کتنے بڑے بڑے نام ان میں شامل ہیں: فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا، حمید اختر، انور سدید، مسلم شمیم، ظفر احمد چودھری، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شکیل رفیق، یونس جاوید، امریل، محمد فروغ نسیم، رشید قیصرانی، ناصر عباس نیّر، کاوش عباسی، عابد حسن منٹو، قدرت اللہ شہاب، ضمیر جعفری، عمر زمان، مجتبیٰ حسین، حاتمی شمیم، جگن ناتھ آزاد، علیم صبا نویدی، قیصر تمکین، امتیاز احمد خان، آصف احمد، شفیق انجم، نسرین نقاش، جاوید زیدی، جوگندر پال، جمال نقوی، سلیمہ ہاشمی، (ترجمہ محمود الحسن جعفری)، شیخ محمد اقبال، لطیف قریشی، قاضی جاوید، فرخ صابری، احمد نبیل، مجتبیٰ اکبر راشدی، احمد عقیل روبی، ظفر سیال، عبدالرؤف ملک، ظفر عظیم، عراق مرزا (عینی)۔

نظمیں، گیت، رباعیات، دوہے وغیرہ : شعری اصناف کی یہ رنگا رنگی ابتدائی صفحات میں ہی نظر آ جاتی تھی۔ خصوصاً نظم لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد "تخلیق" کے ان صفحات میں شامل ہوتی تھی اور ہر شمارے میں یہ حصہ لازماً شامل رہتا۔ اس میں ہر بار شامل ہونے والوں کے علاوہ مختلف شماروں میں نئے لوگ بھی شامل ہوتے رہتے۔ ان سب کے چہروں کے نام درج ذیل ہیں: جگن ناتھ آزاد، عبدالعزیز خالد، محمود سعیدی، شباب للت، خواجہ محمد زکریا، ناصر شہزاد، خان پرویز، مسلم شمیم، سلطانہ مہر، ناصر زیدی، قیصر نجفی، رؤیا صبا، لطیف قریشی، ارشاد عرشی ملک، ماہ طلعت زاہدی، مظفر حسن منصور، کاوش عباسی، خاور اعجاز، صفدر صدیق رضی، فیاض الدین، طاہر سعید ہارون، احمد لطیف، مہندر پرتاپ چاند، آصف بریلوی، شاہینہ ملک، فیصل عظیم، اخلاق عاطف، اشعر خان، مقصودہ حسین، منزہ شاہد، رشید قیصرانی، امیر چند بہار، محمد ضیا اکرم، شہناز مزمل، تسلیم یوسف زادہ، ضمیر ضیاء الدین، تسلیم کوثر، آفاق صدیقی، ظفر گورکھپوری، شائق حسین شائق، سحر علی، افضال فردوس، شاہدہ لطیف، پرویز بزمی، جمیل کھوکھر، بلوندر کور سرگی، اعزاز احمد آذر، ساحرہ حسن، قاضی اعجاز محور، ارشاد احمد صدیقی،

پریا تابیتا، ناظر فرنوی، ابصار عبد العلی، تبسم ریحان، شمیم جاوید، تبسم اخلاق فتح آبادی، ارشد ملک، یونس جاوید، کیدار ناتھ شرما، قدسیہ ندیم لالی، مناظر عاشق ہرگانوی، تحسین گیلانی، اطہر یعقوب ساحر، فاطمہ احمد، جاوید زیدی، ایوب طاہر، ابراہیم اشک، صدیق کلیم، نوید بخاری عرفی، شہناز نقوی، معصومہ شیرازی، طاہرہ بخاری، نظیر فتح پوری، صائمہ نورین بخاری، نادیہ ملک، نوش گیلانی، رشیدہ عیاں، راحت تسیم ملک، تاش کشمیر، فرزند علی شوق، حامد لطیف، ضیاء الرحمان ضیا، سجاد مرزا، محسن سکھیال، روشانے صحین، اشرف قدسی، تصمیم جاوید، قمر جہاں، جیلانی کامران، امتیاز کاظمی، مہ جبین قیصر، تبسم یعقوب، ثروپا، رخشندہ نوید، نیناں جوگن، صوفی انجم تاج، سعید عاصم، اسلم طارق، کاظم جعفری، روحانہ رومی، منظر ایرج، احمد عمر شریف، عامر عثمانی، محمد اقبال شاہ، سرور حسین، ریحانہ پرواز، اطہر نیئر، رابعہ الربا، اعجاز حیدر اسپ پوری، ناصر بشیر، پروین شیر، مرزا شاہد بیگ، گلزار بخاری، اشرف بحری، زیبا بخش، تصمیم عالم، نصیر ابراحت، آفتاب خان، عزیز جبران انصاری، بہرام طارق، حسن عسکری کاظمی، وسی بکرانی واجدی (علیال)، افضل سراج، شاہین، روبینہ گل، کرن گوریہ۔

<u>افسانے</u> : نثری اصناف میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی صنف افسانے کی ہے اور تخلیق میں ہمیشہ بڑے اور جاندار افسانہ نگاروں کو جگہ دی گئی ہے چنانچہ اس میں افسانہ لکھنے والوں کی تعداد کم ہے مگر وہ سب مسلسل لکھنے والے ہیں اور تواتر سے انہیں "تخلیق" کے اکثر و بیشتر شماروں میں شائع ہونے کا موقع ملا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے نام یوں ہیں : کشمیری لال ذاکر، شمشاد احمد، بشریٰ رحمن، بشریٰ اعجاز، مرزا (مسیق)، یاسین احمد (مسیق)، شکیلہ رفیق، رانی قدسیہ، عذرا اصغر، احمد سہیل، سرور، نیلم بشیر، اسلام الدین، مجید عثمان، رشید طراز، شیخ خالد، ثروت خان، کلدیپ جوشی، یونس جاوید، نصرت بخاری، طاہر نقوی، احمد زین الدین، شہناز پروین، بانو ارشد، فیروز عالم، سمیع آہوجہ، نیلما ناہید درانی، صفیہ صدیقی، سلمیٰ جبیں، صابر علی ہاشمی، جوگندر پال، سلطانہ مہر، جاوید اختر چودھری، ڈاکٹر سلیم اختر، بانو قدسیہ، احسان بن مجید، نعیمہ ضیاء الدین، اکمل شمسی، طاہرہ آفریدی، شفیق انجم، اشفاق احمد (ڈرامہ)، قدرت اللہ شہاب (ڈرامہ)، گلشن بخت، مظفر عظیم، نجم الحسن رضوی، فائزہ سعید، مشتاق اعظمی، طارق بلوچ صحرائی، سیما پیروز، خاقان ساجد، ارشاد احمد صدیقی، دیپک کنول، صائمہ نورین بخاری، روحانہ رومی، دردانہ نوشین خان، طاہرہ اقبال، سمیرا نقوی، فرخندہ شمیم، آغا گل، شفیق انجم، علی سدرہ طور، حامد لطیف، جمیل احمد عدیل، نور الحسین، سلطان جمیل نسیم، دیپک بدکی، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، رشید امجد، اشتیاق سعید، فریدہ حفیظ، احسان احمد شیخ، سرور سکھیرا (ناول کا ایک باب)، مقصود الٰہی شیخ، حمیدہ سید، اخلاق احمد، طارق محمود، خالدہ آفتاب، ضیا سعد۔

<u>غزلیں</u> : غزل شاعری کی امام ہے اس لیے اردو غزل کہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور وہ مسلسل "تخلیق" میں شائع ہوتے رہے ہیں اور بہت سے شائع ہو رہے ہیں۔ غزل کے حوالے سے راقم الحروف کا یہ شعر ملاحظہ کریں :

شام ہوتے ہی میں اپنا غم بھلانے کے لیے چل پڑا ہوں کہیں غزلیں سنانے کے لیے

سو مجھ سمیت جو بھی شاعر غزل کہتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ "تخلیق" میں شائع ہو۔ اس تناظر میں 2001ء سے 2012ء تک بیشتر شاعر مسلسل "تخلیق" میں شائع ہوتے رہے اور کچھ کبھی کبھار۔ دونوں کی فہرست پر نظر ڈالیں : انور سدید، اسرار زیدی، سلیم کاشر، ظفر اقبال، عبد العلی شوکت، گوپال کرشن شفق، سرور کاشمیری، حسین شاہد، سلیم حسن مرزا، سیفی سرونجی، ف۔ س۔ اعجاز، کنول فیروز، سالار مسعودی، عمر زمان، ضیاء شبنمی، سردار پنچھی، ضیاء الرحمان ضیا، محمد فصیح ہمایوں، شاہدہ ناز، حمیرا رحمان، پنہاں، کرشن پرویز، طور، جاوید زیدی، سعید اقبال

سعدی، عرفان واثق سکندری، بہت سنگھ ضیا ہاشم، نزہت نگار، رشی الدین رشی، رب نواز مائل، سہیل قادری پوری، عامر سہیل، کلیم احسان بٹ، مشتاق احمد، اظہر مقصود، زویا صبا، ایوب طاہر، سرور امان، مسرت رضا، کوثر ایمن، مسعود تنہا، اسد اعوان، آفتاب خان، ناصر زیدی، سلطان رشک، محمد سبطین شاہجہانی، محسن احسان، رشید دھیاں، مبین سلام، عمران نقوی، مشتاق بلیاوی، عرش صہبائی، احمد صغیر صدیقی، ریاض غلش، خورشید احمر، خورشید بیگ میلسوی، حمیرا راحت، عرفان صادق، بوٹا لیو کرینہ، اعظمی، اوما شری، رئیس الدین رئیس، قیصر تجلی، اشعر خان، کے کے سنگھ مینک، خاطر غزنوی، بیدل پانی پتی، بشیر رزمی، آصف ثاقب، اختر شمار، سلیم حسن مرزا، بہرام طارق، عبدالرحیم اختر، معین نجمی، زبیر کنجاہی، محمد ظہیر، آفاق حیدر، اشرف گل، نعیم رضیسانی، منظور حسین یاد، اعزاز احمد آذر، آفتاب راجا، یاسمین یاس، یاسمین کنول، ادیب سہیل، خالد عبادی، محمود عالم، حسن اعزاز، صابر ظفر، صائمہ امین، بلوعد رعالم، عبدالعزیز خالد، تسنیم سحر، انور رضیا، شہناز مزمل، تسلیم احمد بشیر، فرحت آرا، عاصی کاشمیری، شارا اکبر آبادی، فرخندہ لودھی، مبارک احمد مبارک، منصور ساحر، امین ہاشمی، شاہین مفتی، کنول صابری، نجمہ عثمان، نسرین نقاش، جعفر بلوچ، گستاخ بخاری، روبینہ شبنم، فریدہ خانم، رعمیدر جالحو ساحل، واجد امیر، سلمیٰ ریاض، حباب ترمذی، سرفیش چند شوق، ناصر بشیر، جمال نقوی، احمد حسیب آرزو، نزہت نگار، ارشد محمود ناشاد، شاہدہ ناز، اقبال فردوس، کاوش پرتاپ گڑھی، شوکت جمال، لطف الرحمان، احمد بشر اساحل، ابو تمام کوثر، واصف سجاد، شاہ حسین علی حیدری، رفعت سلطان، وصی بکرانی واجدی (ٹیپال)، منظر اختر، شاہد رضا، روشانے سبطین، امیر الشیخ رضوی، زہرہ جنید زارا، صائمہ نورین بخاری، نازیہ ادا، منظر عابد کمل، اقبال ناظر، نوشی گیلانی، ریاض حسین زیدی، رومانہ رومی، افضل ہزاروی، عرفان احمر، شفیق آصف، کنیز فاطمہ سیماب، واصف علی، شمیم محمد دین ملک، نائلہ تبسم، فرحت طاہر، اقبال طارق، اسلم گورداسپوری، محمود رحیم، سجاد مرزا، محسن مگھیانہ، بلقیس قمر بیزواری، اقبال ساجد، طاہر منظور، مختار بابر، ارشد محمود ارشد، ذوالفقار احسن، سیف الرحمن سیفی، غلام بشیر اسعد، نصرت شکیل سید، سعید احمد اختر، خیال محمد، نوید صادق، شہزادہ بلبل، رئیس باغی، دل نواز دل، شیخ افروزہ طارق ہاشمی، نجی کرن، مقدس ناز، اسلم سحاب ہاشمی، ناصر علی سید، کاظم جعفری، کرن گوریے، جنید احمد، سدرہ امتیاز، صابر عظیم آبادی، اجیت سنگھ حسرت، عاطر عثمانی، ملک رنج پارس، نجیل احمد نجیل، کامران نذیر، عمران اعظم رضا، افضل منگلوری، حنیف نجمی، اختر رضا سلیمی، پربھا پاٹلے پنم، تصور اقبال، کامران راشد نجیل، ادیب سید، زوار حسین نقوی، پروین اختر شاد، روبی جعفری، ظفر علی راجا، بشیر احمد مسعود، نوید سروش، صبیح نوید، شیخ سید، اکرام تبسم، غلام حسین ساجد، ارمان نجمی، بشیر زیدی امیر، سید مقبول حسین، ندیم ہاشمی، اقبال سجاد، عاطف جاوید عاطف، امین ادیبائی، بگلزار بخاری، نوید تشکیل، تسنیم ساحل، آصف ادار، اوصاف شیخ، مقصود عامر، حسین امجد، رحیم احسن، زاہدہ عابد حنا، ایوب ندیم، انجم رانی، شفق رئیس، شاہین عکوس، مومن سیف، مجاہد اکرم۔

جائزے : علم و ادب کے معیار کو پرکھنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کا جائزہ لینا ہر نقاد کا منصب ہوتا ہے۔ نقاد نہ ہونے کے باوجود یہ کام خود شاعر اور ادیب بھی انجام دیتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی تخلیق کا اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ ''تخلیق'' کا یہ سلسلہ بھی ہر شمارے کا جزو لاینفک ہوتا رہا ہے اور اس میں نقادوں کے علاوہ شاعروں، ادیبوں نے ایک دوسرے کی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور تخلیق کار کی تخلیق کی خوبیاں دوسروں تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے جن جن لوگوں نے مختلف کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی تحریریں پیش کیں اُن کے اسمائے گرامی ملاحظہ کریں : ڈاکٹر انور سدید، اقبال ہلا، صابر لودھی،

ڈاکٹر شگفتہ زکریا، ایف ایس اعجاز، ڈاکٹر سعادت سعید، قیصر نجفی، انیقہ شاہین، محمد انجم راحق، شفقت احمد، خالد اقبال یاسر، ارتنگ ساقی، زاہد حسن، شبیر احمد قادری، اعزاز احمد آذر، شفیق احمد خان، علی حیدر ملک، حفیظ خان، امینہ سلیم، اکرم خان، جعفر بلوچ، اشفاق مرزا، قاضی اختر جوناگڑھی، شگفتہ یاسمین، فراز حامدی، ڈاکٹر زریا محمود، واجد رضوی، اطہر فاروقی، ڈاکٹر نجیب جمال، غلام شبیر رانا، جمیل آذر، شبیر احمد شاد، خورشید عالم سید، ناصر عباس نیر، اقبال ندیم، کرشن مہیشوری، اے خیام، شارق عدیل، شمیم صبا متھراوی، پرویز پروازی، فیاض رفعت، ڈاکٹر ضیاء الحسن، سلمیٰ چودھری، رشی عابدی، سہیل سروٹی، رشید قیصرانی، صائمہ نورین بخاری، دردانہ نوشین خان، غلام نبی اعوان، آفتاب اقبال شمیم، کاظم جعفری، ندیم عزیز، شاداب احسانی، فاخرہ تبسم، انوار احمد زئی، افتخار اجمل شاہین، مشتاق، عبدالکریم خالد، جان کاشمیری، رفاقت علی شاہد، شائستہ حمید خان، ڈاکٹر مقصود حسین، عبدالقیوم، عاصمہ اصغر، سحر حفیظ، شاہین، سلیم آغا قزلباش، مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر سید جعفر احمد، ڈاکٹر عزیز حسین، دولت تاج محلی، علی رضا۔

<u>خصوصی مطالعہ</u> : ''تخلیق'' کے بعض شماروں میں کسی ایک ادبی شخصیت کا مختصر سا گوشہ بھی نکالا جاتا رہا ہے۔ اس میں تخلیق کار پر ایک یا دو مضامین لکھوائے جاتے اور اس کی چند تخلیقات پیش کی جاتی تھیں۔ ان میں سے چند معتبر ادیبوں، شاعروں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن کا خصوصی مطالعہ کیا گیا :

ڈاکٹر کیول دھیر : ان پر مظفر احمد نقاش نے مضمون تحریر کیا اور ساتھ کیول دھیر کے دو افسانے شامل کیے گئے۔

ضیاء الرحمان ضیاء : ان پر خورشید احمد، ریحس فاطمہ اور شہناز شورو کے مضامین تھے اور ضیا صاحب کی چند غزلیں۔

رمیندر جاکھو ساحل : ان کی شخصیت پر بشیر بدر کا جامع مضمون تھا اور میندر صاحب کی کچھ غزلیں شامل تھیں۔

کمل صابری : پر سہیل اختر کا مضمون شامل کیا گیا اور کمل صابری کی چند نظمیں، غزلیں موجود تھیں۔

روپا صبا : کی شاعری پر شباب للت کا مضمون تھا اور آخر میں روپا کی کچھ نظمیں شامل اشاعت تھیں۔

یونس جاوید : کے فن پر غلام حسین ساجد اور اظہر جاوید نے اظہار رائے کیا اور یونس جاوید کے دو افسانے اور دو نظمیں بطور نمونہ شامل کی گئیں۔

محمود شام کے لیے ایک الگ سا گوشہ مختص کیا جاتا جس میں ان کی چار، چھ یا آٹھ غزلیں شامل ہوتی تھیں۔

<u>یادِ رفتگاں</u> : جو شاعر، ادیب دنیا سے جا چکے ہیں مگر اہلِ ادب کے دل میں زندہ ہیں ان کی یادیں لگا ہے گاہے منائی جاتی ہیں تو ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے اور یہ فرض اہلِ قلم ادا کرتے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر انور سدید پیش پیش تھے جو نہ صرف وفات پانے والوں پر فوراً کچھ تحریر کرتے بلکہ وہ وقتاً فوقتاً ماضی کے مشاہیر پر مضامین تحریر کرتے رہتے تھے۔ اپنے بزرگوں کو یاد کرنے والوں کی یہ فہرست نظر نواز ہے۔ ڈاکٹر انور سدید، شفیع عقیل، ڈاکٹر فیروز عالم، عذرا اصغر، نسیم انجم، شاہین فصیح ربانی، غلام جیلانی اصغر، فارنگ ساقی، دل نواز، دل، جمیل یوسف، عبدالکریم خالد، عائشہ سلام، عزیز میرٹھی، عقیل اختر، داد، عاشق ق ق، کرن گوہر، سلیمہ ہاشمی، تسلیم الٰہی زلفی، انور ندیم علوی، اختر شمار، کیول سوری، علی حیدر ملک، زاہد علی خان، نجم الحسن رضوی، عبدالمنان طرزی، رشید امجد، منظور حسین یاد، شوکت ہاشمی، اختر حیات، اعزاز احمد آذر، علی تنہا، کشمیری لال ذاکر، مستنصر حسین تارڑ، پروین شیر، ایم اے ملک، کامران ندیم، اظہر جاوید۔

<u>یادنگاری</u> : اپنے ماضی کو یاد کرنا ہر انسان کا فطری عمل ہے اور شاعر ادیب اس حوالے سے بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں بلکہ ناسٹلجیا کا شکار بھی ہوتے ہیں اس لیے ماضی کو یاد بھی کرتے ہیں اور اس کے بارے میں لکھتے بھی ہیں۔ یادنگاری کے حوالے سے یوں تو ہر کسی نے کچھ نہ کچھ تحریر کیا ہے اور وہ ”تخلیق“ میں بھی چھپا۔ یہاں صرف ذکر ان دوستوں کا ہے جنھوں نے اپنی تمام زندگی کی کہانی کو یادنگاری کا حصہ بنا دیا۔ ان میں نذیر فتح پوری اور عزیز میرٹھی شامل ہیں۔ ان کی سوانح حیات کی کچھ قسطیں ”تخلیق“ میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہیں جنھیں بہت پذیرائی ملی۔ خصوصاً فلمی رائٹر عزیز میرٹھی جن کے کریڈٹ پر بشیرا، دل لگی جیسی سپرہٹ فلمیں ہیں ان کی سوانح حیات کو بہت پسند کیا گیا۔ راقم الحروف کو یہ شرف حاصل ہے کہ عزیز میرٹھی کی یہ سوانح اس کی زیرِ ادارت نکلنے والے فلمی پرچے میں کئی سال تک قسط وار شائع ہوتی رہی۔ بعد ازاں اظہر جاوید نے اس کی کچھ قسطیں ”تخلیق“ میں شامل کیں۔ واضح رہے کہ یادنگاری کے سلسلے میں فرخندہ لودھی، بشیر موجد اور محبوب راہی کی یادداشتیں بھی انہی برسوں میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہیں۔

<u>سفرنامے اور رپورتاژ</u> : یہ شعبہ بھی ادب کا ایک اہم حصہ ہے اور جو بھی شاعر ادیب کسی غیر ملک کا سفر کرتا ہے یا اندرونِ ملک بھی سیاحت کے لیے نکلتا ہے تو وہ اپنے سفر کی روداد ضرور تحریر کرتا ہے۔ ”تخلیق“ میں بہت سے قلم کاروں کے یہ سفرنامے اور رپورتاژ شائع ہوتے رہے اور کئی کئی قسطوں میں چلتے رہے۔ اس حوالے سے لکھنے والوں کے نام یہ ہیں : ذہانت حسین، تسلیم کوثر، جاوید منظور، عمرانہ مشتاق، ڈاکٹر کیول دھیر، سلمٰی اعوان، پرویز بخت قاسمی، رشید امجد، جمیل آذر، طارق محمود، سلیمان عبداللہ ڈار۔

<u>طنز و مزاح</u> : اس شعبے میں لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے مگر ”تخلیق“ کے ہر شمارے میں ایک فکاہیہ کالم ضرور شامل ہوتا۔ جب تک ضیا ساجد حیات رہے وہی ہر شمارے کے لیے لکھتے تھے۔ اُن کے علاوہ جنھوں نے طنز و مزاح لکھا وہ چند نام یہ ہیں : نارنگ ساقی، مجتبیٰ حسین، نعیم شاہد رانا، ایس ایم معین قریشی۔

<u>ورق ورق ماضی</u> : یہ حصہ ان شاعروں کے لیے مخصوص تھا جو دنیا سے جا چکے ہیں مگر اپنی شاعری سے زندہ ہیں۔ تقریباً ہر شمارے میں ماضی کے ان شاعروں کے لیے دو تین صفحات مخصوص تھے جن میں ان کی نظمیں یا غزلیں شامل کی جاتی تھیں۔ ان شاعروں میں سے چند کے نام یہ ہیں : حالی، اقبال، قتیل شفائی، جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض، شکیب جلالی، منیر نیازی، ساحر لدھیانوی، سلیم کاشر، عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، ن۔ م۔ راشد، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی وغیرہ وغیرہ۔

<u>پنجاب رنگ</u> : پنجابی ادب کو فروغ دینے کے لیے اظہر جاوید نے ”تخلیق“ کے چند صفحات مخصوص کیے ہوئے تھے۔ یہ کبھی کبھی آٹھ صفحات بھی ہوتے ورنہ چار یا پانچ صفحات تو لازماً مختص رہتے۔ ان میں پنجابی زبان کی شاعروں کی مختلف اصناف گیت، غزل، نظم، دوہڑا، ماہیا وغیرہ شامل ہوتے۔ اظہر جاوید کے دور میں بھارتی پنجاب سے لکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد اس شعبے کا حصہ ہوتی تھی۔ بہر حال سب لکھنے والوں کی یہ طویل فہرست دیکھیے۔ منزہ شاہد، احمد شریف، سلیم کاشر، احسان رانا، سجاد مرزا، امر جیت کور، امر جیت کور ڈاڈا، سمیران سنگھ طوالیا، امر جیت چندن، جیت کور، زاہد حسن، جعفر اقبال، اسد اعوان، انوار فیروز، امر جیت سنگھ، غلام محمد غلام، گورچرن کور کوچر، سلیمان عبداللہ، سردار پنچھی، محمد اسلام شاہ، غضنفر علی ندیم، حنیف شاہد، آصف سہارنی، محمد حسان خالد، محمد شاہد فیروز، کرشن پرویز، عمران مشتاق، بشریٰ کلوانت ڈھلوں، اوشا رانی، اوشا مہندرو ریا، بشیر رانا، شکیل عامر، کرنجن گل، آفتاب راجا، نیلم بھٹو، اعجاز روش، افضل الٰہی بہار، ہرجن سنگھ بیس،

سری رام عرش، صابر آفاقی، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر سنگھ چوہان، مومن راہی، برکت چوہدری، اعزاز احمد آذر، جاوید راہی، نسیم انور، امروز، حفیظ باوا، تحسین گیلانی، ساغر، ارشاد، امجد شریف، آصف ثاقب، انور جمیت، حسن پوری، روبندر پریت، صدا انبالوی، ارشد ملک، مجید سالک، اطہر یعقوب ساحر، سلطان کھاروی، صفدر حسین واثق، رویندر دل زوپ، پرجندر کنگ، مہندر دیپ گریوال، یزدانی، محمود رحیم، غلام حسین ساجد، حسین شاد، اقبال بیلا، دل نواز دل، مشتاق احمد، ہارون عدیم، عبدالکریم قدسی، مسعود چوہدری، شفقت تنویر مرزا، ظفر عارف، راجا نیّر، عرفان صادق، حسین امجد، سید ارسد حسنی، جاوید عارف، تنویر لودھی۔

<u>کچھ ہندوستانی کتابیں۔ ایک پاکستانی کی نظر میں</u> : یہ شعبہ مکمل طور پر ڈاکٹر انور سدید کے سپرد تھا۔ اس دور میں ہندوستان سے بہت زیادہ کتابیں اور ادبی رسائل "تخلیق" کو موصول ہوتے تھے۔ ان سب پر تبصرے کے لیے ڈاکٹر انور سدید کو زحمت دی جاتی تھی اور وہ بہت عرق ریزی سے ہر کتاب اور ادبی جریدے کی خوبیاں اجاگر کرتے تھے۔ یہ مستقل سلسلہ آٹھ سے دس صفحات تک پھیلا ہوتا تھا۔

<u>تبصرے</u> : یہ "تخلیق" کا مقبول ترین شعبہ تھا۔ بھلے کوئی شاعر یا ادیب "تخلیق" میں چھپتا ہو یا نہ چھپتا ہو اگر اس کی کتاب "تخلیق" تک پہنچ گئی تو اس پر تبصرہ ضرور ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔ اظہر جاوید صاحب کے دور میں تبصروں کے لیے 25 سے تیس صفحات مختص تھے۔ وہ خود بھی الف جیم اور ادارہ کے نام سے تبصرے کرتے تھے اور ہر بار بارہ سے چودہ کتب پر ان کے اپنے تبصرے ہوتے تھے۔ اس کے بعد انور سدید، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور عمر زمان کے تبصروں کی بہت تعداد ہے۔ خصوصاً عمر زمان نے اظہر جاوید کے بعد سب سے زیادہ کتابوں پر تبصرے کیے پھر وہ امریکہ منتقل ہو گئے تو یہ سلسلہ ٹوٹ گیا ان کے بعد تبصروں کی زیادہ تعداد راقم الحروف کی ہے۔ راقم نے ایک شمارے میں نو کتابوں پر تبصرہ کیا ویسے عموماً چھ سات کتابوں پر تبصرہ کرتا تھا۔ چونکہ کتابیں بہت زیادہ ہوتی تھیں اس لیے مختلف افراد میں بانٹ کر تبصرے کروائے جاتے۔ "تخلیق" کے اس دور میں جن دیگر اہلِ قلم نے اس میں تبصرے لکھے ان کے نام درج ذیل ہیں : راجا نیّر، مسعود تنہا، زاہد حسن، سالار مسعودی، کاظم جعفری، صائمہ امین، صفدر حسین (المدد والے)، قیصر تمکین، عاصم اصغر، تسلیم منظر، امین حزیں، ڈاکٹر شگفتہ زکریا، عبدالکریم خالد، الیاس عشقی، شہاب صفدر، ذوالفقار احسن، رابعہ الربا، محمد حنیف، سلمیٰ جبیں، ڈاکٹر عزل حسین وغیرہ۔

"تخلیق" میں شامل مخصوص شعبے اختتام پذیر ہوئے۔ آخری شعبہ انجمن خیال ہے۔ اس میں زیادہ تر وہی شاعر ادیب خطوط لکھتے جو اس میں چھپتے تھے لیکن ان میں سے اکثر کے خطوط ادبی رنگ لیے ہوتے اور مختلف مباحث کو جنم دیتے تھے جن پر اگلے شمارے میں مثبت پہلوؤں سے گفتگو کی جاتی تھی۔

قارئین کرام! یہ تھا 2001ء سے 2012ء تک کا مختصر جائزہ جس میں ہم نے دیکھا کہ کون کون سے قلم کار ابھر کر سامنے آئے۔ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو 2001ء سے پہلے بھی "تخلیق" سے وابستہ تھے۔ (جاری ہے)

◆◆◆

زندگی کبھی کبھی ایسی ٹھوکریں مارتی ہے کہ انسان سیدھا سجدے میں جا گرتا ہے۔ (اشفاق احمد)

"تخلیق" لاہور کے دسمبر 2020ء کے شمارے پر ایک نظر

نسیم سحر

اچھے تخلیقی ادب کے قارئین کو نوید ہو کہ اس کرونائی ماحول کی شدید مشکلات اور کاروباری مندی کے باوجود "تخلیق" لاہور کا شمارہ دسمبر 2020ء شائع ہو گیا ہے۔ اسلم کمال کی کمال کی خطاطی کے ساتھ اس کا سرورق پہلی ہی نظر میں مسحور کر لیتا ہے کہ کسی بھی جریدے یا کتاب کا سرورق دراصل اُس کا تشخص ہوتا ہے جس کی دیدہ زیبی قاری کو اندر داخل ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اظہر جاوید کا نصف صدی پیشتر کا لگایا ہوا "تخلیق" کا پودا اُس کی وفات کے بعد 2012ء سے اُس کے ہونہار بیٹے سونان اظہر جاوید کی ادارت میں تیزی سے درخت بننے کے مراحل میں ہے اور سونان اظہر جاوید کی مدیرانہ صلاحیتیں دن بدن نکھر کر "تخلیق" کی حیاتِ نو کے لیے آبِ حیات کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ اظہر جاوید کا نام زندہ رکھنے میں بھی اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ کئی دیگر جرائد کے اداریوں کے برعکس "تخلیق" کے اداریے "پہلی بات" کو ایک معتبر جریدے کی جان اور شایانِ شان سمجھنا چاہیے۔ تازہ اداریے میں سونان اظہر نے تنقید کے منصب اور موجودہ صورتِ حال کے بارے میں بڑی فکر انگیز باتیں کرتے ہوئے نئے دور میں تنقید کی فنی اقدار کا ذکر بھی کیا ہے اور اُن نوآموز شاعروں کا ذکر بھی کیا ہے جو مشاعروں میں داد پا کر شہرت حاصل کرتے ہیں مگر پھر وہ اس لیے وقت کی گرد میں چھپ جاتے ہیں کہ وہ ادبی جرائد سے دور رہ کر اپنی تخلیقات کو تحریری صورت میں محفوظ اس ڈر سے نہیں ہونے دیتے کہ پھر یہ کلام اساتذہ کی نظر سے گزرے گا اور تنقید کی چھلنی میں چھلنے کے بعد بس پھوک ہی رہ جائے گا۔ سونان اظہر کے خیال میں ایسے شعراء صرف ہوائی فائر کی طرح چٹکلی شاعری کو ہی اپنی فتح سمجھتے ہیں اور ان کا مقصد صرف وقتی میلہ لوٹنا ہوتا ہے۔ اس اداریے کا ایک ایک لفظ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے خاص طور پر اُن شعراء کے لیے جو شاعری کو غیر سنجیدہ عمل سمجھتے ہیں۔ حسن عسکری کاظمی، بشریٰ رحمٰن اور ڈاکٹر ایوب ندیم جیسے منجھے ہوئے شعراء کی حمد و نعت پر مشتمل تخلیقات اس شمارے کے ابتدائی صفحات ہی سے ایک جذب و کیف کی حالت طاری کر دیتے ہیں۔ نظموں میں: پروین شیر، جمیل احمد عدیل، سید شہباز گردیزی، طلعت ضمیر، شائستہ مفتی کے علاوہ دیگر نظم نگاروں کے نام بھی شامل ہیں جبکہ مظفر حسن منصوری کی رباعیات بھی رباعی کے معروف اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ اس شمارے میں تقریباً چوبیس شعراء کی غزلیں شامل ہیں، جن میں انور شعور، امین راحت چغتائی، آصف ثاقب، محمود شام، صابر ظفر، حسن عسکری کاظمی، ذیب احمد، حسین مجروح، غلام حسین ساجد، عباس تابش، خالد اقبال یاسر، احمد صفی، گستاخ بخاری (مرحوم) جیسے معروف نام قابلِ ذکر ہیں۔ اسلم کمال خطاط کے علاوہ واقعتاً ہی کمال کے فنکار بھی ہیں، اور اُن کی تحریر "قرطاس اور کینوس" اِن دونوں میدانوں کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔ یہ تحریر قسط کے طور پر دوبارہ شائع ہوئی ہے کہ گذشتہ شمارے میں کچھ حصے شائع ہونے سے رہ گئے تھے، اس لیے اب اس کا مجموعی تاثر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ فلمی اور گلوکاری پر تاریخی انداز کی مضمون نگاری ڈاکٹر امجد پرویز کی تخصیص بن چکی ہے، اس شمارے میں انہوں نے ملکہ ترنم نور جہاں جیسے لیجنڈ پر قلم اٹھایا ہے۔ اہلِ قلم کا تعارف بھی "تخلیق" کا تقریباً ایک مستقل شعبہ ہے، اس شمارے میں اظہر غوری پر شہباز انور خان نے اور حنیف باوا کی کہانیوں پر محمود شام نے لکھا ہے جبکہ سیج آمجد جیسے بے پناہ لکھاری کے افسانوں کے مجموعے "بچا رکھیں انگار خانے کی" پر اُنہی جیسے ایک زرخیز لکھاری غلام حسین ساجد نے تقریباً انہی کے اسلوب میں قلم اٹھایا ہے۔ ہارون الرشید تبسم کا مضمون غالباً "تخلیق" کے گذشتہ شمارے پر کسی اخبار میں شائع ہوتے

والا کالم ہوگا۔ جمیل احمد عدیل نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسی تاریخی شخصیت کی آپ بیتی کا ایک تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ قیصر طراز نے جواز جعفری کی کائناتی شعور پر مبنی نظم "زمین مجھ پر برہم ہوگئی" کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور ایک اچھی نظم کو شاعرہ کے طور پر اس نظم کے مفہوم کی گہرائی تک کامیابی سے اتری ہے۔

مزاح نگاری کے گوشے میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر بدر منیر، پروفیسر نور کمال شاہ جیسے نظم و نثر کے شعبے کے معروف نام شامل ہیں۔ "پنجاب رنگ" کے عنوان سے غلام حسین ساجد، حسین مجروح اور سلیم شہزاد کی نظمیں پنجاب کا ثقافتی حسن سامنے لاتی ہیں۔ "سرائیکی توشہ" کے تحت معروف ہمہ جہت قلم کار و بشریٰ رحمٰن نے سرائیکی لہجے کی مٹھاس اور معرفت کے رنگ میں رنگی ہوئی کافیاں اور نظمیں پیش کی ہیں۔ تبصروں کے گوشے میں پروفیسر فیصل شہزاد نے غلام حسین ساجد، جمیل احمد عدیل، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر رضوان علی نگر، زیدی بخاری اور عاطر شہزاد کی کتب پر تبصرہ کیا ہے جبکہ پروفیسر آغا محمد جمیل الرحمٰن نے ایک طالب علم محمد رحیم الرحمٰن کی انگریزی کتاب "The hope" پر تبصرہ کیا ہے۔ ادب کے کسی بھی فرد کے لیے ڈاکٹر رشید امجد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں اور چونکہ ان کا نام فروری 2021ء میں ہونے والی تقریب میں "تخلیق ایوارڈ 2020ء" کے لیے منتخب ہو چکا ہے اس لیے اس شمارے میں ان پر اہم مضامین اور حیات نامہ شامل ہے۔ سحر حفیظ اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم جیسے معروف لکھاریوں کے ساتھ، راقم السطور کا ایک تاثر یہ بھی شامل ہے جس میں سوہان اظہر، شہزاد قیصر، آفتاب خان اور زید اللہ فہیم کے راولپنڈی آنے اور یہاں سے بریگیڈیئر ایم ڈی ملک، راقم السطور سمیت ایک وفد کی صورت میں ڈاکٹر رشید امجد کے دردولت پر حاضر ہو کر انہیں باقاعدہ طور پر اس نامزدگی کی خوشخبری دینے کی روداد شامل ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر غضنفر اقبال کا ڈاکٹر رشید امجد سے لیا ہوا انٹرویو بھی شامل ہے اور نوجوان شاعر و نقاد آفتاب خان کا ڈاکٹر رشید امجد کی "کہانی نے خواب دیکھا" کے افسانوں کے مجموعے پر لکھا ہوا ایک عمدہ تنقیدی مضمون بھی ہے جسے تنقیدی کے ساتھ ساتھ تحقیقی بھی کہا جا سکتا ہے اور آفتاب خان ان دنوں تنقید کے میدان میں سرگرم ہو کر مستقبل کے ایک اہم نقاد کے طور پر سامنے آنے کی سمت نمائی کر رہے ہیں۔

"تخلیق" کے دیگر اہم مضامین نگاروں میں ڈاکٹر سعادت سعید، پروفیسر حسن عسکری کاظمی اور جاوید عباس جاوید شامل ہیں۔ علاوہ ازیں سید ریاض حسین زیدی کا مضمون "اردو کا نفاذ عملی، افسوس نااہل اقتدار کا شکار" کے عنوان سے بے حد دردمندی اور قومی زبان سے عشق کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں: سمیع آہوجہ، آغا گل، مظہر سیلی، روحی سعید، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن، مسرت کلانچوی، اسلم سحاب ہاشمی، محمد شعیب مرزا، ڈاکٹر عظمیٰ سلیم، اختر سعید مدان، فرزانہ روحی اسلم اپنے قلم کا جادو جگا رہے ہیں۔ ایک خوبصورت افسانچہ خاقان ساجد کا بھی شمارے کی زینت ہے۔ عذرا اصغر کے پنجابی افسانے "تتلاؤں کی بستی" کا اردو میں ترجمہ معروف افسانہ نگار اور نقاد محمد طارق علی نے مہارت سے کیا ہے۔ شمارے کے آخر میں 'انجمن خیال' کے تحت حسب روایت قلم کاروں کی رائے شامل ہے مگر اس سے زیادہ اہم سوہان اظہر کا "انجمن خیال میں رائے درکار ہے" کے عنوان سے اعلان ہے جس کے مطابق کووڈ اور عمر اور رتبہ دونوں لحاظ سے سینئر ادیبوں کو اپنی تحریریں بذریعہ ای میل بھیجنے کی سہولت دیتے ہوئے 2021ء کے آغاز میں ایک پینل قائم کرے گا جبکہ دیگر قلم کار بذریعہ ڈاک ہی اپنی نگارشات بھیج سکیں گے۔ یہ پینل عذرا اصغر، ڈاکٹر ایوب ندیم، غلام حسین ساجد، بریگیڈیئر ایم ڈی ملک اور مظہر سلیم مجوکہ پر مشتمل ہوگا۔ قارئین کرام، ہم یہاں اپنا کالم ختم کرتے ہوئے اس پینل کے اراکین سے رابطہ کر کے یہ درخواست کرنے لگے ہیں کہ ای میل کی یہ سہولت تمام ادیبوں کو دی جائے تاکہ سب موجودہ صورت حال میں کاغذی صورت میں لکھنے اور انہیں سپرد ڈاک کرنے کے تمام مراحل سے بچ سکیں۔ دعا کیجیے کہ ہماری درخواست قبول ہو جائے۔

◆◆◆

تبصرے نسیمِ سحر کے

مختصر تعارف

شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار، صحافی، سوانح نگار اور کالم نگار نسیم سحر کا ادبی سفر پچاس برس سے زائد پر محیط ہے۔ اب تک شاعری کی 16 کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ نثر میں بھی 3 کتابیں ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ انھیں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بے شمار ایوارڈز مل چکے ہیں۔

پاسینگان کا مطلب کیا!

مصنف : آغا گل

صفحات: 118　　قیمت : 400 روپے　　ناشر: مہردر، کوئٹہ

آغا گل کا نام اُردو افسانے، ناول، شاعری اور دیگر اصناف کے حوالے سے معروف ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچستان کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے لیے بھی مشہور ہے۔ انھوں نے ایک سرکاری افسر ہونے کے باوجود ان مظلوم لوگوں کے حق میں قلم اٹھایا جو استحصالی نظام کا شکار رہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے بلوچی زبان کے الفاظ استعمال کر کے اردو کا دامن وسیع کیا اور مشکل الفاظ کی تفہیم کے لیے افسانوں میں ان الفاظ کے معانی بھی تحریر کر دیے۔

زیرِ نظر مجموعے "پاسینگان کا مطلب کیا" میں اُن کے بارہ افسانے شامل ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے مختلف ادبی جرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے کا انتساب ہی آغا گل کے ذہنی رجحان اور قلمی اظہار کی ترجمانی کرتا ہے: "اپنے خون سے حق اور سچائی کی تاریخ رقم کرنے والے منگچر کی حسین چوٹیوں کے مغربی دامن، مستونگ کے جری فرزند شہید پولیس سرجن باقر شاہ بخاری کے نام"۔ گویا ان کا قلم عوام کے دکھ درد اور ان سے بدسلوکی کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ وردی پوش افسران کی قربانیوں کا بھی معترف ہے۔ اپنے پیش لفظ میں وہ اسی مثبت نظریے پر بات کرتے ہوئے اپنی جراتِ اظہار کے حوالے سے کہتے ہیں کہ انھوں نے اس تباہ و برباد ہوتے معاشرے پہ لکھا جس کی گھٹن سے سرور سکھیرا، فہمیدہ ریاض، احمد فراز جیسے تخلیق کار بھی گھبرا کر خود ساختہ جلاوطنی میں چلے گئے تھے۔۔۔ یہاں انھوں نے ڈاکٹر علی شریعتی کا جو یادگار قول دہرایا ہے وہ قابلِ ذکر ہے کہ "اگر آپ حق کے ساتھ نہیں کھڑے تو پھر تاریخ کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ مسجد کے حجرے میں تھے یا طوائف کے بالاخانے پر۔"

آغا گل کے افسانوں میں وہی عصری سچائی اور حق بیانی ملتی ہے جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ "عصری سچائی لکھنے والا ادیب وقت کی آواز بن کر زندہ رہتا ہے۔ لہروں کے ساتھ ساتھ تو لاشیں ہی بہا کرتی ہیں، تیراک نہیں۔" اور کوئی شک نہیں کہ آغا گل ایک ایسے تیراک ہیں جو لہروں یا دھارے کے ساتھ نہیں بلکہ مخالف سمت میں سفر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ۲۰۲۰ء میں شائع ہونے والے ان کے بارہ افسانوں کے اس مجموعے کے آخری افسانے کا عنوان ہی 'پاپیگان کا مطلب کیا ہے'؟ ان کے کچھ افسانوں کے عنوانات بھی بلوچی زبان میں ہیں۔ ایک افسانے عرصہ میدان میں انھوں نے انتہائی جرأت کے ساتھ ایک وزیر اعظم کی گرفتاری، تشدد اور پھانسی کے تختے تک لے جانے کی داستان بیان کی ہے اور بجا طور پر لکھا ہے کہ "پھر ایک نیا مارشل لا ٹوٹ پڑا، امریکی ڈالر، سعودی ریال ہم پر برسنے لگے"۔۔۔۔ افغانستان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ہم انہیں اسلام سکھانے کے لیے امریکی اسلحہ لیے ان پہ نازل ہو گئے"۔ یہی گتھی اور طرح لیہا ایسے نازک حساس موضوعات پر لکھتے ہوئے آغا گل کے قلم کو خون سے تر کر دیتا ہے۔ تمام افسانے اسی موضوع اور اسی فضا میں ہیں تاہم 'کالا بوٹ کالا کوٹ' ان سب میں نمایاں ہے۔ اسی طرح لفظ 'پاپیگان' کا مطلب بھی اسی نام کا افسانہ پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے جب آغا گل اپنے اسلوب میں کہتے ہیں کہ "میں نے وطن کو پاپیگان بنتے دیکھا، اسکولوں کالجوں ہسپتالوں کی دیواریں بلند ہوتی گئیں۔ ان کے اوپر آہنی جال اور خاردار تاریں، پورا ملک ہی جیل خانہ دیواروں، فولادی گیٹوں اور خاردار تاروں سے ڈھانپا گیا"۔۔۔۔۔۔ اور پھر وہ پورے وطن کا المیہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ "تعلیم یافتہ انسان دیوانوں والی باتیں کرنے لگتے ہیں، ان پڑھ اسمبلی میں ان کے لیے قانون بناتے ہیں، حکومتیں قائم کرتے ہیں"۔۔۔۔۔ بس آغا گل ہمارے وطن عزیز کا یہی المیہ پورے دکھ کے ساتھ اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ دکھ درد اور سلوک بلوچستان تک ہی محدود نہیں بلکہ پورے ملک میں ہی ملتا ہے۔

یہ افسانے سرسری انداز میں پڑھنے اور رکھ دینے والے نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ہر افسانے کو بین السطور بھی پڑھا جائے اور اس صورت حال پر نہ صرف غور کیا جائے بلکہ سوچا جائے کہ اسے بدلنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آغا گل خود اسی طویل جہاد میں مصروف ہیں۔ اگرچہ ان کی بعض باتوں یا نظریات سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے لیکن درحقیقت مجموعی طور پر وہ ہماری ہی کہانی لکھ رہے ہیں۔ اب تک وہ افسانوں کے گیارہ مجموعے، چار ناول، چار تحقیقی کتب، ایک شعری مجموعہ اور دو تراجم کر چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کے پنجابی میں اور ایک ناول کا سندھی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے فن و شخصیت پر اب تک چار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اتنا کچھ لکھنے کے باوجود ان کے ذہن اور قلم پر تھکان طاری نہیں ہوئی اور اسی طرح ان کے تخلیقی سفر کا اعتراف کرنے والوں کا حلقہ بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر یونس جاوید فلیپ میں کیا خوب لکھتے ہیں کہ "یہ درد اس سرزمین کا ہے جو اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کے اندر اور باہر بلوچستان کے دکھ درد ہمکتے ہیں، مروڑیاں کلبلاتی ہیں۔" آغا گل کے بے باکانہ انداز پر آفتاب حسن نے گویا اس ایک جملے میں بات سمیٹ دی ہے: "لگتا ہے جو سرکش جن حضرت سلیمان نے کوہ سلیمان کی غاروں میں بند کیے تھے ان میں سے آغا گل آزاد ہو چکا ہے۔" اس پر ہماری دعا ہے کہ آغا گل تا قیامت آزاد رہیں اور یونہی ان لوگوں کے لیے آواز اٹھاتے رہیں جو زبان رکھتے ہوئے بھی بے زبان ہیں۔

....

کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے

مصنف : قیصر نجفی

صفحات: 118 قیمت : 300 روپے ناشر: غالباً مصنف خود

2020ء کے اواخر میں شائع ہونے والی یہ کتاب دیدہ زیب سرورق کے ساتھ مگر کسی قدر ''کمزور'' کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ ناشر کا نام درج نہیں ہے البتہ دیباچے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت میں قیصر نجفی کے ایک ادب پرست دوست سحر اقبال کا تعاون اور کوششیں بھی شامل ہیں۔ کتاب ملنے کا پتہ بھی غالباً جناب سحر اقبال کے گھر ہی کا پتہ ہے۔

قیصر نجفی شاعری اور تنقید کے حوالے سے ایک معروف نام ہے اور ان کی شعری و نثری تخلیقات ایک تسلسل کے ساتھ ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب تک ان کے چار عدد شعری مجموعے 'شہر جاناں'، 'رب آشنا'، 'شمار رگ جاں' اور 'تماشا اور تھا' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جبکہ کلیات 'لہو لہو سورج' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اسی طرح ان کے تنقیدی مضامین کے چار مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک اہم مجموعہ 'اردو مرثیے میں حمد، نعت، منقبت، تحقیق و تنقید' پر مشتمل ہے۔ ''کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے'' بھی ان کی اسی تنقیدی و تحقیقی جہت کا ایک رخ ہے جس میں کل سولہ تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ البتہ حیرت انگیز طور پر ان سولہ مضامین میں سے دو مضامین مصنف کے لکھے ہوئے نہیں بلکہ ان کے بارے میں ڈاکٹر اے بی اشرف کے لکھے ہوئے ہیں جن کا نام فہرست مضامین میں ''بی اے اشرف'' لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں مضامین جو ''اک نئی طرز فکر کا شاعر'' اور ''ایک شاعر تھا۔۔۔۔ قیصر نجفی'' کے عنوان سے ہیں، اگر مربوط کر کے ایک مجموعی انداز کے پیش لفظ کے طور پر اس کتاب کے شروع میں شائع کیے جاتے تو بہتر ہوتا، یا پھر یہ قیصر نجفی کی فن و شخصیت پر مرتب ہونے والی کسی کتاب میں موزوں رہتے۔ موجودہ صورت میں ان مضامین کی وہ اہمیت نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی۔

مصنف اپنے مختصر پیش لفظ میں بجا طور پر لکھتے ہیں کہ ''ہمارے ہاں نقد و نظر معدودے چند نقادوں کے بابرکت وجود کے سبب قائم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نقد و نظر کے حوالے سے ہم خاصی حد تک قلاش ہیں۔۔۔۔'' مقام شکر ہے کہ مصنف جو بیک وقت شاعر بھی ہیں اور تنقید نگار بھی، اپنی تنقیدی کاوشوں کے ذریعے اسی قلاشی اور کمی کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی اچھا تخلیق کار جب تنقید کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی تنقید میں بھی تخلیقی انداز نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے یہ تنقیدی مضامین ڈاکٹر ستیہ پال آنند، شبنم رومانی، علامہ طالب جوہری، نعیم ضیاء الدین جیسے شعراء کے ساتھ ساتھ معروف نثر نگاروں بانو قدسیہ، بشریٰ رحمٰن، ڈاکٹر کیول دھیر جیسے معروف قلمکاروں پر بھی ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند پر دونوں مضامین ان کی دو نظموں 'پیغام رساں' اور ''لا اسلامیں، لا عیسائیں، لا الف'' کے تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہیں۔

''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' کے عنوان سے مضمون میں قیصر نجفی نے ہندوستان کے ایک بلند پایہ محقق، مورخ، ادیب اور ماہر عروض و لسانیات پروفیسر گیان چند جین کے بعض متنازعہ نظریات پر قلم اٹھاتے ہوئے معروف ہندوستانی نقاد ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ''فاروقی صاحب کے مضمون نے ہمارے تمام تر تجسس کو ایک غلط فہمی میں بدل دیا ہے اور احساس دلایا ہے کہ ہم نے جس شخص

کو دریائے فیض سمجھا تھا، وہ دراصل ایک سراب ہے"۔ دیگر مضامین میں شبنم رومانی پر دو مضامین اور "ملکِ سخن کا شہزادہ" کے عنوان سے شکیب جلالی پر لکھے گئے مضمون عمدہ ہیں جن سے ان دونوں اہم شعراء کی شعری جہات واضح ہوتی ہیں۔ پروفیسر سحر انصاری نے فلیپ میں قیصر نجفی کی تنقید نگاری کے بارے میں جو لکھا ہے ہم اس سے سو فیصد متفق ہیں کہ "وہ موضوع کا انتخاب رواداری (روا روی؟) میں نہیں، بلکہ داخلی مطالبے پر کرتے ہیں، اس لیے کہ مضامین ان کے ادبی نگاہ اور ادبی معیارات کی پوری طرح نمائندگی کرتے ہیں۔"

کتاب کا انتساب محبت کے ساتھ قیصر نجفی نے اپنی پیاری پوتیوں فاطمہ اور سیرت کے نام کیا ہے۔ ہماری رائے میں کتاب کے گیٹ اپ، کاغذ اور چھپائی جیسے معاملات پر ذرا مزید توجہ دینے کی ضرورت تھی تا کہ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ قیصر نجفی کے نام اور کام کے شایانِ شان ہوتا۔

میزانِ فکر (مجموعۂ رُباعیات)

شاعر: حسن عسکری کاظمی

صفحات: 160 قیمت: 400 روپے ناشر: مصنف

2020ء میں شائع ہونے والا یہ مجموعہ ایک ایسی صنف یعنی رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں آج کے شعراء نے مشکل سمجھ کر بہت کم سخنوری کی ہے۔ مگر پروفیسر حسن عسکری کاظمی جیسے ہمہ جہت تخلیق کار، شاعر، نقاد اور ماہر عروض کے نزدیک تو یہ گویا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انہوں نے رباعی نگاری کسی قدر تاخیر کے ساتھ شروع کی مگر جب لکھی تو پھر اس نہایت مشکل صنفِ سخن کو بھی مالا مال کر دیا۔

اس مجموعے پر ناشر کا کوئی نام درج نہیں ہے جبکہ کتاب کے حصول کے لیے بھی خود پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا ہی پتہ درج ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے خود ہی یہ کتاب شائع کروائی ہوگی۔ اصل میں حالیہ دنوں میں بہت سے ناشرین جس انداز میں کتاب شائع کروانے والوں سے حد سے زیادہ پیسے طلب کرنے کے باوجود کتاب کے کاغذ اور چھپائی، جلد بندی وغیرہ میں ڈنڈی مار جاتے ہیں، اس کے پیشِ نظر بہت سے ادیبوں شاعروں نے اپنے طور پر کتابیں شائع کروانا شروع کر دی ہیں۔ بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ "میزانِ فکر" کا عنوان ہی کتاب کے فکری و تخلیقی انداز کی ترجمانی کرتا ہے کہ فکر اور وہ بھی میزان پر تلی ہوئی۔ ابتدائی صفحات پر ہی انہوں نے رباعی کے بارے میں موجود رویوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ایک رباعی میں کس سلیقے کے ساتھ کہا ہے:

انداز بیاں ختم جو ہمارا چاہو — ہر گز نہ کبھی ہم سے کنارا چاہو
مشکل تو نہیں ایسی رباعی کہنا — اس صنفِ سخن کو بھی ابھارا چاہو

جناب حسن عسکری کاظمی نے بجا طور پر رباعیات کے اس مجموعے کا انتساب عظیم مرثیہ نگار میر ببر علی انیس کے نام اس اعتراف

کے ساتھ کیا ہے کہ ''۔۔۔ اُن سے بڑا رباعی نگار بھی کوئی نہیں''۔ جو لوگ مرثیے اور رباعی کے حوالے سے میر ببر علی انیسؔ کو جانتے ہیں وہ اس سے سرِ مو انکار کر ہی نہیں سکتے۔ حسن عسکری کاظمی کا پیش لفظ ''قاری سے مکالمہ'' بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ اپنی درج بالا رباعی میں تو اُنھوں نے رباعی نگاری کو آسان ٹھہرایا ہے لیکن پیش لفظ میں کہتے ہیں کہ ''رباعی نہایت مشکل اور سخت یا کٹھن قسم کی چیز ہے۔ اسے وہی شاعر تخلیق کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے جسے اس کے اوزان کا حقیقی علم ہو۔ بحرِ ہزج کے مخصوص اوزان سے بہرہ ور شاعر ہی رباعی کہہ سکتا ہے''۔ پیش لفظ میں انھوں نے جوشؔ ملیح آبادی کا یہ اقتباس دے کر گویا اپنی رباعی نگاری کا جواز مہیا کیا ہے: ''رباعی کم بخت ایسی چیز ہے جو چالیس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر شاعر کی زندگی میں رباعی نویسی کا دور آخر میں ہوتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ جناب حسن عسکری کاظمی کو عمرِ طویل دے کہ وہ ایسی ہی عمدہ اور رواں دواں رباعی نگاری جاری رکھیں اور ہم عصر شاعری کو مالا مال کرتے کے ساتھ ساتھ موجودہ اور آنے والے ادیبوں کے لیے بھی ایک مثال چھوڑ جائیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے کتاب کے فلیپ میں کیا خوب لکھا ہے کہ ''رباعی کی صنفِ دشوار اب تک اُن کی توجہ سے محروم تھی۔ سو اب دیر آید درست آید کے مصداق انھوں نے بڑی تعداد میں رباعیات کہہ ڈالی ہیں۔۔۔ موضوعات کا وہی تنوع جو اُن کی پہچان ہے، رباعیات میں بھی کارفرما ہے۔۔۔''

ڈاکٹر خورشید رضوی نے چند لفظوں میں حسن عسکری کاظمی کی رباعی نگاری پر جو کچھ کہا ہے اس کی صداقت کا اعتراف کتاب کی رباعیات پڑھ کر ہوتا ہے اور قاری متحیر رہ جاتا ہے کہ تنوع کے ساتھ ساتھ مصنف کی موضوعات پر اور رباعی کی بحر پر کیسی استادانہ اور مشاقانہ گرفت ہے۔ حسن عسکری کاظمی نے رباعی نگاری کے سفر میں عہدِ موجود کے ایک اور عمدہ رباعی نگار جناب گلزار بخاری کی رباعی نگاری کی اور ان کی رہنمائی کا بھی بڑے ظرف کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت اُن سے بہتر رباعی نگار کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ بلاشبہ جناب حسن عسکری کاظمی کی یہ رائے مبنی بر حقیقت ہے۔ ''میزانِ فکر'' انتہائی سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔ ہر صفحے پر دو رباعیاں درج ہیں اور ہر رباعی پر ''رباعی'' کا عنوان بھی دیا گیا ہے۔ حسن عسکری کی قادر الکلامی کا کسی حد تک اندازہ فہرست دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس میں رباعیات کے الگ الگ عنوانات کے تحت حمدیہ، نعتیہ، منقبتیہ، رثائی، اخلاقی، ذاتی، سیاسی اور معاشرتی رباعیات دی گئی ہیں جن کی کل تعداد ۴۹۱ ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ رباعی نگاری کچھ اس قدر آسان بھی نہیں تو پھر یہ تعداد کچھ کم نہیں محسوس ہوتی۔ ان کی قادر الکلامی کی بات آ گئی ہے تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ حسن عسکری کاظمی کی اب تک شائع شدہ نظم و نثر پر مشتمل کتب کی تعداد ۳۹ ہے جن میں حمد و ثنا، نعت، غزل، مناقب، سلام، تنقیدی مضامین، تبصرے، وطن کے قومی نغمے/نظمیں، قطعات، سفرنامہ، آپ بیتی، جائزے اور علمی و ادبی کالم شامل ہیں۔ ماشاء اللہ ان کا تخلیقی سفر اور ان کی کتب کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک استاد سخنور شاعر کی ان طویل اور لگاتار ادبی خدمات کے اعتراف اور تحسین کے طور پر انھی کی ایک رباعی کے ساتھ ہم تبصرہ ختم کرتے ہیں:

ہر لفظ تخیل کی فراوانی ہے — قبضے میں مرے تختِ سلیمانی ہے
پرواز مری عرشِ بریں سے آگے — پہچان نہ پایا تری نادانی ہے

اُردو افسانہ : نقش تنقید

مصنف : جمیل احمد عدیل

صفحات: 224 قیمت: 560/روپے ناشر: صریر پبلیکیشنز، لاہور

خوبصورت اور نقش کاری کی نسبت سے معنی خیز ٹائٹل کے ساتھ ۲۰۲۰ء میں شائع ہونے والی یہ کتاب عہد جدید کے ایک ذہین اور ہمہ جہت قلمکار جمیل احمد عدیل کے اردو افسانوں کے مجموعوں پر لکھے گئے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جمیل احمد عدیل کا تنقیدی اور تحقیقی رویئے و یا انتقادات جدید گی کا مظہر ہے۔ ان کا نام محمد جمیل احمد ہے لیکن قلمی نام جمیل احمد عدیل ہی سے ان کی اصل پہچان ہے۔ ان کا تخلیقی فکری اعتبار بطور خاص فکشن، تنقید اور نثری نظم کے میدان میں ہے تاہم دیگر موضوعات پر بھی ان کی توجہ ہے اور اب تک متنوع موضوعات پر ان کی تیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تحاریر کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی منتخب تخلیقات کا انگریزی اور پنجابی زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے پیارے دوست ڈاکٹر اورنگزیب نیازی کے نام کر کے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ڈاکٹر خالد کنبل نے افسانے کے بارے میں مختصر الفاظ میں اہم باتیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی جیسے قد آور نقاد اور محمد حامد سراج مرحوم جیسے نامور افسانہ نگار کی افسانے کی صنف پر مختصر مگر خیال افروز تحریریں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کہتے ہیں کہ مصنف کو اپنی تخلیق اور سمائی کے چھوٹے سے دائرے کے اندر رہ کر اثر انگیزی کے کرشمے دکھانے پڑتے ہیں۔ حامد سراج کہتے ہیں کہ افسانے کی دنیا بہت عجیب و غریب ہے، یہ انسان کا پورا وجود مانگتی ہے۔ ان دونوں کی آراء سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مصنف جمیل احمد عدیل نے اپنے پیش لفظ میں بجا طور پر لکھا ہے کہ "فکشن کا عہد موجود تخلیقی زرخیزی سے تہی نہیں ہے۔ نئی آوازوں کی گونج اپنی توانائی پر شاہد ناطق ہے"۔ چنانچہ انہوں نے اسی تخلیقی زرخیزی کے اعتراف میں اردو افسانے پر یہ مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق آصف جیسے معروف قلمکار نے "افسانے کی تنقید اور جمیل احمد عدیل" کے عنوان سے کیا خوب لکھا ہے کہ "عدیل کا تخلیقی جہان بے پناہ وسعتوں کا حامل ہے۔ ان کا سب سے بڑا حوالہ افسانہ نگاری ہے تاہم تنقید و تحقیق اور کالم نگاری کے میدان میں بھی وہ ایک الگ اسلوب رکھتے ہیں"۔ کتاب کے آغاز میں مصنف نے فن اور روایت کے عنوانات سے اپنی دو تحریروں میں افسانے کی پوری تاریخ نہایت بلیغ اور تفصیلی انداز میں بیان کر دی ہے جسے اہمیت حاصل ہے۔ فن پر بھی اور افسانے کی روایت پر بھی یہ تمام باتیں کسی بھی اردو افسانہ نگار اور نقاد کے لیے اہم ہیں کہ اس میں اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے ماضی کے تقریباً تمام اہم تنقید نگاروں اور ادوار کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ اردو افسانے کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ "روایت" کے عنوان سے طویل تر مقالہ مصنف جمیل احمد عدیل کے نثری حسن کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی گہری نظری اور موضوع پر مطالعے اور احاطے کی گواہی بھی دیتا ہے اور یہی گواہی "آئینہ تعبیر" کے عنوان سے لکھے گئے ان کے چودہ تنقیدی مضامین بھی دیتے ہیں، جن میں ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ کی دو کتابوں اور محمد خلتاپادی کی بھی دو کتابوں پر مضامین شامل ہیں۔ جن دیگر افسانہ نگاروں کی کتب پر مصنف کے تنقیدی مضامین کتاب میں شامل ہیں ان میں ظفر اقبال ہاشمی، ڈاکٹر ناصر شہزاد، محمد عاصم بٹ، ڈاکٹر امجد طفیل، محمد جاوید انور، نسیم سحر، پرویز انجم، نگین کرن، وردانہ نوشین خان اور حمزہ

اعتشام گوندل اور محمد جاوید جیسے معروف افسانہ نگار شامل ہیں۔ کتاب میں دو مضامین دو قد آور افسانہ نگاروں کے فن و شخصیت پر لکھی گئی کتابوں پر ہیں، ایک مضمون احمد اعجاز کی کتاب ''رشید امجد کے منتخب افسانے'' پر اور دوسرا مضمون اسلم سراج الدین کی کتاب ''محمد منشا یاد، شخصیت اور فن'' پر ہے۔ اس طرح افسانے کے ساتھ ساتھ اہم افسانہ نگاروں کے فن و شخصیت کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اردو افسانہ نگاروں، محققین اور تنقید نگاروں کے ساتھ ساتھ نصابی ضروریات کے لیے بھی اہمیت رکھتی ہے۔

میڈرڈ سے ادھوری ملاقات

مصنفہ : سیما پیروز

صفحات: 152 قیمت : 500 روپے ناشر: دستاویز مطبوعات، لاہور

معروف افسانہ نگار سیما پیروز کا یہ سفرنامہ سپین و سکردو کی دلچسپ روداد ہے۔ بے ساختہ اور دلچسپ انداز میں لکھا ہوا یہ مرحلہ در مرحلہ سفرنامہ دو حصوں یعنی ایک بیرونی سفر کی طویل تر اور ایک اندرون ملک سفر کی مختصر روداد پر مشتمل ہے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ انتہائی شگفتہ مزاجی اور روانی کے ساتھ ساتھ اہم معلومات و مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ سیما پیروز کے بہت سے سفرنامے قسط وار مختلف ادبی جرائد میں بھی مطالعے کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے اور ان کے افسانے بھی پڑھتا رہا ہوں۔ دونوں اصناف سخن میں اُن کا انداز جداجدا ہے اور ان کے مابین حد فاصل کو قائم رکھتا ہے۔ سفرنامے میں ان کی ہمسفر ساتھیوں یا سہیلیوں کا بھی تذکرہ ملتا ہے جو خود اپنی اپنی جگہ سفرنامہ نگار بھی ہیں اور جن کے سفرنامے بھی اکثر ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں چنانچہ یوں مختلف سفرنامہ نگار خواتین کے مختلف اسالیب اور انداز بیان سے بھی لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ سفرنامہ 2020ء میں لکھا گیا تھا اور اس کا انتساب سیما پیروز نے یوں لکھا ہے ''عراق کے عبداللہ کے نام، جس کی یاد آج بھی میرے ساتھ ہے''۔ عبداللہ سپین کے ایک ہوٹل میں بیراگیری کرتا تھا اور اس کے باقی گھر والے عراق میں تھے۔

عبداللہ اب ہوٹل میں ملازمت کے ساتھ ساتھ کینسر کا علاج بھی کرا رہا ہے۔ اسی سفر میں سیما پیروز کو مشرقی پاکستان کا ایک بہاری لڑکا بھی ملتا ہے جس کے ساتھ مختصر مکالمے کی روداد میں سیما پیروز نے دردمندی کے ساتھ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کا ایک سبب بنگالیوں کی غداری کے ساتھ ساتھ کچھ مغربی پاکستانیوں کی لالچ، ایک فوجی کا تاحیات صدر رہنے کا خواب اور ایک سویلین کا وزیر اعظم بننے کے شوق کو قرار دیا ہے۔ سفرنامہ لکھنے پر جن اصحاب قلم نے انہیں مجبور کیا ان میں الحمراء کے مدیر شاہد علی خاں اور ایک عمدہ نثر نگار بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر کا نام قابل ذکر ہے جبکہ سکردو کا سفرنامہ لکھنے پر مصنفہ کو سکردو ہی کے ایک فنکار احسان دانش نے اصرار کے ساتھ مجبور کیا۔ گویا ان تینوں افراد کا شکریہ بھی قاری پر واجب ہوا کہ شاید اس کے بغیر سیما پیروز نے دونوں اسفار کی یہ دلچسپ روداد نہ لکھی ہوتی۔ اپنے پیش لفظ ''سفر وسیلۂ ظفر'' میں سیما پیروز نے اس سفر کو خیال سے حقیقت میں ڈھلنے کی مرحلہ وار روداد بھی بیان کی ہے۔ میڈرڈ کے سفر میں ان کی تقریباً مستقل ہم سفر ساتھیوں سلمیٰ اعوان، نیلم احمد بشیر اور عمیرا اقصٰی میں سے نیلم احمد بشیر اپنی کسی مجبوری کی بناء پر نہ جا سکیں چنانچہ یہ ایک سہ نفری گروپ کا سفرنامہ ہے جس کی روداد بیان تو سیما پیروز نے کی ہے مگر شریک سفر باقی دونوں بھی ہیں اور ان کی موجودگی کا

احساس سفرنامے میں جابجا ہوتا ہے۔ جس انداز میں سیما پیروز سفرنامہ لکھتی ہیں اس سے سیر و سیاحت کے شائق قارئین کو کسی بھی ملک کے یا اندرون ملک کے سفر میں پیش آنے والی مشکلات اور ان سے نمٹنے کا سلیقہ بھی آجاتا ہے۔ اور بظاہر تو سیما پیروز صرف دو یا تین ساتھیوں کے ساتھ سفر کررہی ہوتی ہیں مگر اپنے دلچسپ اور بھرپور سفرنامے کی روداد کے ذریعے وہ اس سفر میں اپنے قاری کو بھی شریک رکھتی ہیں۔ گویا وہ ویزے، ٹکٹ اور نقل و حمل کے بغیر ہی سیما پیروز کے ساتھ سفر طے کرتا چلا جاتا ہے۔

سپین ہماری درخشاں اسلامی تہذیب کا ایک حصہ ہے اس لیے سیما پیروز نے اس جگہ کے تمام تر ماضی کے ساتھ امت مسلمہ کے زوال کے وہ تمام پہلو بھی ترتیب کے ساتھ بیان کیے ہیں جن کے بغیر شاید یہ سفرنامہ نامکمل ہی سمجھا جاتا۔ سفرنامے میں سپین میں مسلمانوں کی آمد اور عروج و زوال کی داستان ایسی ہے کہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اس سفرنامے سے بھی اپنے موضوع کے لیے اہم مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ الحمرا، غرناطہ، مسجد قرطبہ کے ابواب مسلمانوں کی درخشاں تاریخ کے پہلو بیان کرتے ہیں اور اس دکھ کا اظہار بھی دردمندی کے ساتھ کرتے ہیں جس کا سامنا مسلمانوں کو سقوط غرناطہ کے بعد کرنا پڑا۔ یہ داستان عروج و زوال انتہائی اختصار سے مصنفہ کو اسی عنوان کے باب میں بیان کرتے ہوئے آخری مسلمان حکمران سلطان ابو عبداللہ یاد آجاتا ہے جو غرناطہ پر آخری نظر ڈالتے ہوئے جب روتے ہوئے رخصت ہو رہا تھا تو اس کی ماں نے کہا تھا: "اس کے لیے عورتوں کی طرح مت رو جس کے لیے تم مردوں کی طرح نہیں لڑ سکے"۔ مصنفہ اس المیے پر اپنا تجزیہ ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں "اندلس کی تباہی کی ذمہ داری صرف اور صرف مسلمانوں کی بزدلی، باہمی چپقلش، اسلام کی بقا کی بجائے ذاتی فائدے اور ذاتی رنجشیں۔ ان سب کی وجہ سے مسلمانوں کا سورج غروب ہو گیا"۔

ایک سو سے زیادہ صفحات پر پھیلے ہوئے میڈرڈ کے سفرنامے کے بعد دوسرا حصہ تیس صفحات پر مشتمل سکردو کا سفرنامہ ہے جس میں مصنفہ کے ساتھ سلمیٰ اعوان اور نیلم احمد بشیر بھی شامل تھیں۔ اس سفر کا اصل مقصد سلمیٰ اعوان کی ایک کتاب کی تقریب رونمائی کے علاوہ دوسری ادبی تقریبات بھی تھیں، اور اس روداد میں زیادہ تر ان کے میزبانوں کی مہمان نوازی اور وہاں کے لوگوں کے رہن سہن کے ساتھ ساتھ ان کی مخلصانہ محبتوں کا ذکر بھی ہے۔ ادبی تنظیم کے احسان دانش اور اسلم حسین سحر کے ذکر کے ساتھ ساتھ سکردو کے رضیہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے سیما پیروز لکھتی ہیں کہ سکردو کے سب راجوں نے اپنے محل سرینا ہوٹل کو دے دیے ہیں اور وہ خود چھوٹے گھروں میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ اس سفرنامے میں دعوتوں کا ذکر کئی مرتبہ آتا ہے اور سیما پیروز اس کے جواز میں یوں کہتی ہیں: "اس میں میرا کوئی قصور نہیں، سلمیٰ بی بی جن کو میں نے اور نیلم نے مادر بلتستان کا خطاب دے رکھا ہے وہاں کے شاعر ادیب اور مقامی لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ نیلم اور میں بھی چوکے اور مہمانی کے مزے لوٹ رہے تھے"۔ اسی حصے میں وہ یہ بھی لکھتی ہیں کہ سکردو میں سرینا ہوٹل کے ساتھ ساتھ آغا خانیوں اور کویتیوں نے چپے چپے پر سکول کھولے ہوئے ہیں۔ اور وہاں سب شیعہ سنی سب مل کر رہتے ہیں۔ مذہبی اور معاشرتی تفاوت بالکل نہیں۔ ایک اچھی محب وطن خاتون کی طرح انہوں نے اس سفر کے بعد ارباب اختیار کو یہ عمدہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ان علاقوں کی طرف توجہ دیں، ان پہاڑوں کو قدرت نے معدنیات اور قیمتی پتھروں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ صرف اور صرف ہمت اور کوشش چاہیے، پھر دیکھیے نہ صرف گلگت بلتستان بلکہ پورا پاکستان خوشحال ہو جائے گا"۔ مگر بی بی سیما پیروز، "کون سنتا ہے فغان درویش!"

سلطان سکون : شخصیت و فن

مصنف : قمر زمان

صفحات: 160 قیمت: 240 روپے ناشر: اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

یہ کتاب میرے کئی حوالوں سے ایک بہت عزیز دوست سلطان سکون کی شخصیت و فن پر ہے جس کے ساتھ میں نے سن اسی کی دہائی میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا اور ہم دونوں کی طرحی اور غیر طرحی غزلیں آج کے کئی معروف شعراء کے ساتھ راولپنڈی کے ایک روزنامہ اخبار "تعمیر" کے ادبی صفحے پر شانہ بہ شانہ شائع ہوا کرتی تھیں۔ تب سے میں ان کے اس رسا کو اور ان کے قلم کو رواں دواں دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں کہ وہ مختلف ادبی و لسانی جہات میں مسلسل کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ جب اکادمی ادبیات پاکستان کے "پاکستانی ادب کے معمار" کے نام سے اشاعتی سلسلہ نمبر 145 میں جناب سلطان سکون کی شخصیت و فن پر یہ کتاب شائع ہوئی تو مجھے ایک خاموش خادم ادب کے اعتراف فن پر دلی خوشی ہوئی۔ اس کتاب کے مصنف جناب قمر زمان ہیں جن کی محنت کتاب کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔ وہ اگرچہ علمی و ادبی حلقوں میں زیادہ معروف نہیں لیکن کتاب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک اچھے محقق کی طرح محبت، محنت اور لگن کے ساتھ اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کیا اور اسے ایک سلیقے اور ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مصنف کی مسلسل ادبی و تحقیقی کاوشوں کے حوالے سے یہ ذکر کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ وہ "ہزارہ میں اردو ادب کے فروغ میں ادبی تنظیموں کا کردار" جیسے اہم موضوع پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ بھی لکھ رہے ہیں۔

"سلطان سکون: شخصیت اور فن" 2020ء میں شائع ہوئی ہے۔ تحریر کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کا سرورق بھی دیدہ زیب اور پُر کشش ہے جس پر سفید اور سبز رنگ کے درمیان ایک چوکھٹے میں سلطان سکون کی باوقار تصویر شائع ہوئی ہے۔ "پیش نامہ" کے عنوان سے اس کا پیش لفظ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر یوسف خشک کا تحریر کردہ ہے جس میں انہوں نے اکادمی کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ اس اشاعتی سلسلے کا بنیادی مقصد جہاں پاکستانی زبانوں کے اہم لکھنے والوں کی خدمات کا اعتراف کرنا اور انہیں عام قارئین تک پہنچانا ہے، وہیں ادب کے محققین، ناقدین اور طالب علموں کو ان کے متعلق بنیادی تحقیقی و تنقیدی مواد فراہم کرنا بھی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اکادمی کی اس پالیسی اور اس معیار پر پوری اترتی ہے کہ اس کی نوعیت ایک طرف جہاں تعارفی ہے وہیں یہ تحقیقی و تنقیدی مقاصد کے لیے بھی موضوع کتاب سلطان سکون کے بارے میں تمام بنیادی معلومات فراہم کرتی ہے۔ خاص طور پر اس زاویے سے کہ موجودہ دور میں انہوں نے جتنا کام ہندکو ادب کے حوالے سے کیا ہے وہ انہیں سب سے منفرد کرتا ہے۔ ہندکو زبان کے حوالے سے ہندکو اردو لغت، ہندکو پہیلیوں، ضرب الامثال، کہاوتوں، محاوروں اور لوک کہانیوں کی تدوین سمیت ان کی بہت سی اہم ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ کتاب ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ بطور شاعر ان کے نصف درجن سے زائد شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مصنف نے کتاب میں "سلطان سکون کا زندگی نامہ" مختلف مراحل یا ادوار کی صورت میں مرتب کیا ہے جن میں خاندانی پس منظر، ملازمت اور عملی زندگی، ازدواجی زندگی کا آغاز، ادبی سفر کا آغاز، اعزازات و اعتراف فن کے بارے میں تفصیلی معلومات دینے کے بعد دیگر ابواب میں سلطان سکون کی تصانیف و تالیفات کا تعارف، اور ان کی اردو شاعری جس میں غزل، منظومات اور مزاحیہ شاعری شامل ہیں۔ اگلے باب میں

ان کی اردو نثر جس میں شخصی مضامین، پیش لفظ، دیباچے، فلیپ شامل ہیں، جبکہ اگلے باب میں ان کی ہندکو ادب کے لیے خدمات کے تحت ان کی ہندکو شاعری اور ہندکو اردو لغت پر تفصیلات دی گئی ہیں۔ آخری باب 'سلطان سکون، مشاہیر و معاصرین کی نظر میں' ہے جس میں بے شمار نامور ادیبوں اور شعرا کی آرا کے ساتھ چند شعرا کا سلطان سکون کو منظوم خراج تحسین اور سلطان سکون کی منتخب شاعری بھی شامل ہے۔ کتاب میں سلطان سکون کی زندگی کی چند یادگار تصاویر کے ساتھ ساتھ مشاہیر کے ساتھ ان کی کچھ رنگین تصاویر بھی اس کتاب کے رنگوں میں اضافہ کر رہی ہیں جن میں احمد ندیم قاسمی، تبسم رومانی، مجنوں گورکھپوری، قتیل شفائی، احمد فراز، منیر نیازی جیسی نادر روزگار ادبی ہستیاں شامل ہیں۔ ہمارے نزدیک تو خود سلطان سکون بھی ادبی مشاہیر میں شامل ہیں جن کے ساتھ وہ جلوہ افروز دکھائی دے رہے ہیں۔

سنگ زیست

مصنف : سائرہ ہاشمی

صفحات: 248 قیمت : 550 روپے ناشر: دستاویز مطبوعات، لاہور

سائرہ ہاشمی اردو افسانے کا ایک ایسا اور معروف نام ہے کہ جس کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کسی زمانے میں اردو کے ہر جریدے کے ہر شمارے میں سائرہ ہاشمی کا افسانہ ضرور شامل ہوتا تھا اور راقم کو اس بات پر فخر بھی ہے کہ اس نے سائرہ ہاشمی کے ادبی سفر کے آغاز سے اب تک کے تمام افسانے پڑھے ہوئے ہیں۔ زیر نظر کتاب جس کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے دستاویز مطبوعات جیسے معتبر ناشر نے شائع کی ہے اور گویا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سائرہ ہاشمی کے افسانے آج بھی پڑھے جاتے ہیں کیونکہ اچھا اور معیاری ادب خواہ نظم میں ہو یا نثر میں، کبھی پرانا نہیں ہوتا۔ سائرہ ہاشمی کے افسانوں کے دس مجموعے شائع ہو کر قبول عام و خاص ہو چکے تھے جن کے عنوانات ریت کی دیوار، سنگ زیست، اور وہ کالی ہو گئی، روزی کا تقدکا مکھ اور زندگی کی بندگلی وغیرہ ہیں۔ زیر نظر مجموعے "سنگ زیست" کا پہلا ایڈیشن 1983ء میں شائع ہوا تھا۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے تین ناول بھی لکھے تھے جن کے عنوانات درد کی رت، سیاہ برف، سائے کی دھوپ ہیں۔ ان کا ایک سفرنامہ کیمبرج او کیمبرج کے عنوان سے 1990ء میں شائع ہوا تھا جبکہ "ایک ناقہ و مخصیں" کے عنوان سے تاریخ پاکستان کے بارے میں بھی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔ ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ زندگی کی بندگلی 1995ء میں شائع ہوا تھا۔

سائرہ ہاشمی کی 1983ء کے اس نقش اول کے 2019ء میں نقش ثانی کے طور پر شائع ہونے والے یہ افسانے پڑھتے ہوئے راقم کو در حقیقت تقدیمکر رکا سا لطف آیا کہ یہ تمام افسانے 1983ء میں کتابی صورت میں شائع ہونے سے بھی پہلے وہ مختلف ادبی جرائد میں ان کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ان کے افسانے افسانے کی جدیدیت کی روش سے اور افسانے کے بہت سے مختلف مراحل اور انداز اختیار کرنے سے بہت پہلے کے ہیں، ان کا اسلوب بیان سادہ اور ان کے موضوعات معاشرے یعنی ہم آپ سے جڑے ہوئے ہیں، اسی لیے ان کے افسانے دلچسپی اور لطف کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس کتاب کے موجودہ ایڈیشن میں بھی پہلے ایڈیشن کی طرح کسی کا تعارف یا پیش لفظ شامل نہیں ہے کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔ اسی طرح ان کے افسانوں کی بنت اور ٹریٹمنٹ بھی سلیس اور عام فہم ہے اور ان کے عنوانات بھی تجریدی یا علامتی نہیں ہیں جس سے قاری کے لیے ابلاغ یا تفہیم کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے رفیق زندگی کے نام

ان خوبصورت الفاظ میں کیا ہے: ''محمد یعقوب خان کے نام جو صحیح معنوں میں میرے رفیقِ زندگی ہیں''۔ کتاب کے بیشتر موضوعات سماجی اور معاشرتی ہیں جن میں سے زیادہ تر میں عورت اور اس کی زندگی کے مسائل پر بات کی گئی ہے۔ مصنفہ کا تعلق چونکہ پنجاب سے ہے اس لیے پنجابی معاشرت کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ ان کے کرداروں کے مکالموں میں پنجابی زبان اور الفاظ کی جھلک بھی صاف محسوس ہوتی ہے۔ کتاب کا ایک افسانہ ''محبت کی صلیب'' افسانے کی جگہ ناولٹ محسوس ہوتا ہے کہ ناولٹ ہی کی طرح اس میں جزئیات بھی دی گئی ہیں۔ ان کے چند افسانوں کے عنوانات سے ہی موضوع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مثلاً اب یہ سوال، شعاعِ بے جاں، سرابِ آرزو، دوسری عورت، وغیرہ۔ سائرہ ہاشمی کے افسانوں میں مکالماتی انداز کم اور بیانیہ انداز زیادہ ہے اور ان میں کوئی فلیش بیک تکنیک استعمال نہیں ہوئی بلکہ یکساں انداز میں بات کی گئی ہے۔ آج کے سہل پسند قاری کے لیے سائرہ ہاشمی کے افسانوں کا مطالعہ کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا اور سائرہ ہاشمی کے یہ افسانے ایسے ہیں جن کی وجہ سے اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

◆◆◆

تبصرہ | **تخلیق دسمبر 2020ء** | **ناصر علی سید**

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا — بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

[illegible] 0321-8899087 [illegible]

انجمنِ خیال (خطوط)

﴾1﴿ عزیزی سلطان!

آپ کا مرتب کردہ پرچہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ آپ نے بلاشبہ اپنے ابا جان کے رسالے کو کئی اطوار پر آگے بڑھایا ہے۔ نئے قارئین بھی پیدا کیے ہیں۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ کہنہ مشق اساتذہ کا کلام بھی توقیر کا باعث ہے۔ جناب حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر رشید امجد اور بشریٰ رحمٰن ایسے نام پرچے کے لیے خیر و برکت کا باعث ہیں۔ علاوہ ازیں میرے ایسے نوے سالہ "بابے" کی دعائیں بھی شاملِ حال سمجھیں۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

﴾2﴿ بہت عزیز و محترم سلطان اظہر صاحب!

"تخلیق" موصول ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ ماسک بھی موصول ہوئے جو آپ نے ایک خوبصورت اور محبت بھری روایت قائم کی ہے۔ بہت بہت نوازش۔ میں نے کچھ دن پہلے ایک غزل ارسال کی تھی شاید وہ آپ تک نہیں پہنچی یا رسالہ کی اشاعت کے دوران میں پہنچی ہو۔ مرزا عزیز اللہ قیم صاحب میر پور نے مجھے یاد دہانی کروائی تھی اور میں نے غزل بھیج دی۔ "تخلیق" کا فی الحال مطالعہ شروع نہیں کیا۔ دراصل میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا رہتا ہوں۔ ایک عارضہ گھٹنوں کے درد کا تو مستقل ہے اور شدید ہے۔ چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ ہاں آپ نے میری کتاب "معمارِ ادب" کو بھی مشتہر فرمایا۔ اس پر بھی آپ کا بہت بہت شکریہ اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور سلامت رکھے اور مزید ہمت عطا فرمائے۔ آمین!

سلطان سکون (ایبٹ آباد)

﴾3﴿ واجب الاحترام سلطان اظہر جاوید!

تازہ "تخلیق" نے اس سخت سردی کے عالم میں بادِ بہاری کا کردار ادا کیا ہے۔ یہ انشاء اللہ خاں انشا کی بادِ بہاری نہیں جسے کہا گیا ہے راہ لگ اپنی۔ عمران خان کی مہنگائی اور اپوزیشن کی "ہڑبونگ" نے دن رات کا چین چھین لیا ہے۔ پنشن پر گزارا ہے جس کا دم گھٹتا جا رہا ہے۔ اب کے رشید امجد "تخلیق" کی کرسیِ قدر شناس میں آئے ہیں اور خوب آئے ہیں۔ محترم پروفیسر رشید امجد کی ادبی اور تدریسی خدمات کا "تناظر" وسیع و وقیع ہے۔ انھوں نے فنِ افسانہ نگری کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ وہ آج کے "ہجوم" میں یکسر الگ دکھائی دیتے ہیں۔ تقریب کی تصویروں میں ایک جگہ "آپ" زید اللہ فہیم سیکرٹری ایڈووکیٹ بھی ایستادہ ہیں۔ کسی نے بتایا ہے کہ موصوف نحیف و نزار ہو چکے ہیں حتیٰ کہ قلم تک

نہیں اٹھا سکتے۔ تصویر میں تو مجھے ہوشیار، چابک دست اور ہمہ تن "تیار" نظر آتے ہیں۔ ماشاء اللہ خوش وضعی کا پیکر ہیں۔ خدا سلامت رکھے۔ آغا گل کے افسانے مزے لے لے کے پڑھتے ہیں۔ وہ بلوچستان کی خاک سے ایسے ایسے چونکا دینے والے ہمہ گیر خاکے اٹھا لیتے ہیں کہ دیکھنا چاہیے۔ جی میں تو آغا گل شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ "افسانوی مشین" سے متعلق ان کی کتاب میرے پاس ہے۔ اس کے بیک ٹائٹل پر میری رائے بھی درج ہے۔ خدا بھلا کرے دوستوں کے کہ نئے کا بہت اثر لیتے ہیں۔ پی میں تو لے لیں میں ماشہ والی بات ہرگز نہیں۔ آغا گل اپنی آنے والی کتاب کا عنوان "ہرگز" رکھ لیں تو کیا ہے۔ پیارے اظہر جاوید کا تخلیقی دفتر دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر کیا کروں کہ محترمی حبیب اللہ، بوٹی روڈ اس قدر خستہ حالت میں ہے کہ چلو تو ٹھوکریں کھاؤ۔ ہمیں "بھولی چک" قسم کے ممبران ملے ہیں جو یا تو جلسے جلوسوں میں مارے مارے پھرتے ہیں یا دربار کے اردلی بنے ہوئے ہیں۔ اس عادت کی پختگی کا یہ حال ہے کہ انھیں ہماری خستگی "ایک آنکھ نہیں بھاتی"۔ لاہور کوئی بلاتا بھی نہیں کہ جاؤں۔ پچھلے دنوں ایک مجھگڑ نے لاہور کے جلسے میں لاہوریوں کو برا بھلا کہا تھا۔ میں نے پنجاب کا پانی جی بھر کے پیا ہے۔ میں نے جواباً ایک نظم کہہ ڈالی ہے بعنوان "لاہوریوں کے نام"۔ قائد اعظم کے مزار پر سیاسی دھما چوکڑی ہوئی تو میں نے دل گرفتگی میں نظم کہی۔ مزار قائد اعظم۔ "فرانس صدر" کی ہرزہ سرائی پر رنجیدہ ہو کے کچھ اشعار کہے ہیں۔ وہ اسلام آباد کے ہفت روزہ "نکھار" میں شائع ہوئے ہیں۔ بد قسمتی کی بدولت کمپوزنگ کچھ غلط ہوئی ہے۔ "پنجاب رنگ" نے رنگ جما رکھا ہے۔ بشریٰ رحمن دی کالی!!

تہاڈی شہنشاہی سارے کوئی فقیری   شاہ شمسے رہندن فقیراں دے کول اجلا

محترم حسن عسکری نے فراق گورکھپوری کی غزل کی آبرو میں "تعلق خاطر" کا حق ادا کیا ہے۔ شعری مثالیں خوب ہیں۔ فراق گورکھپوری میرے بھی پسندیدہ شاعر ہیں۔ "تخلیق" میں پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی موجودگی بقول "سونے پہ سہاگہ ہے"۔ ڈاکٹر صاحب اقبال، پاکستان اور اردو کے لیے وقف ہیں۔ اس خصوص میں ڈاکٹر صاحب نے بے شمار کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ وہ اس ناچیز کو اپنی کتابیں باقاعدگی سے بھیجتے ہیں۔ میں ان کا از حد شکر گزار ہوں۔ حمد اور نعت کا اہتمام دل کو چھو لینے والا ہے۔ بشریٰ رحمن کی نعت کی معصومیت بے مثال ہے۔ مضمون "اردو کا نفاذ کلی" میں محترم ریاض حسین زیدی کے دل کی آواز ہے ہمارے دل کی دھڑکن۔ کراچی میں ایک بگلا بھگت اردو کے خلاف بک بک کی تھی۔ اس کے جواب میں نظم میں نے کہی ہے "اردو میری زبان"۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

﴿4﴾ سوہان بخیر — دعائے عمر درازی!

تمہاری کاوشوں اور کوششوں کا مجھے علم ہوتا رہتا ہے اور دل سے بے اختیار تمہاری کامیابی اور سرخروئی کی دعا نکلتی ہے۔ زندگی میں کچھ کرتے رہنا، جھکتے رہنا اور بے سکون رہنا ہی منزل پر پہنچنے کا ہنر سکھاتا ہے۔ سب سے پہلے تو میں تخلیق کے توسط سے محترم ڈاکٹر امجد رشید صاحب کو مبارکباد پیش کروں گی۔ اس بار انھیں "تخلیق ایوارڈ" کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ بہت خوب فیصلہ ہے۔ ڈاکٹر امجد رشید صاحب کی پوری زندگی حرف و حکایت کی دنیا میں سیاحی کرتے گذری ہے۔ وہ نہ صرف ایک بے مثال اور باکمال استاد ہیں بلکہ انھوں نے کئی نئی نسلوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی کی ہے۔ اس کے ساتھ اپنی دلپذیر تحریروں سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ یہی بات ہے ان کی نثر کی

میں خود بہت بڑی مداح ہوں۔ کہیں ان کا افسانہ یا کوئی نثر پارہ دیکھ لیتی ہوں تو سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ "عاشق صبر طلب" ایک زندہ جاوید تحریر ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے درد کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اس انداز میں تحریر کر دیا ہے کہ زمانوں تک یاد رکھا جائے گا۔ ایسے لوگ معاشرے کا فخر ہوتے ہیں اور تعلیمی اداروں کے لئے ایک روشن چراغ — اللہ تعالیٰ ان کو خوبیٔ صحت کے ساتھ درازیٔ عمر عطا کرے اور ان کے قلم کو رواں دواں رکھے۔ آمین! میری دُعا ہے کہ اس بار بھی "تخلیق ایوارڈ" کا یہ تاریخ ساز فنکشن تم ہمیشہ کی طرح اسی کروفر سے مناسکو جو تمہاری روایت ہے۔ باری تعالیٰ سارے ملک کو، بلکہ ساری انسانیت کو اس ہولناک وبا سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین! ہماری توبہ و استغفار قبول کرے اور معافیاں و تلافیاں عطا فرمائے۔ آمین!

بشریٰ رحمٰن (لاہور)

﴿5﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید

میں الفاظ کی تلاش میں ہوں جو یہ کھلم کھلا اعتراف کر سکیں کہ سونان نے حقِ وراثت نبھانے اور اس کی خوش ولا ادائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی یعنی "تخلیق" خوب سے خوب تر بلکہ یہ کہوں کہ کم و بیش خوب ترین کی منزلوں کو چھو رہا ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ اس دفعہ آپ نے "پہلی بات" میں وہ باتیں کہہ دیں جو سو باتوں پر بھاری ہیں۔ آپ نے نام نہاد شعراء، تشہیر پسند ادبا اور بے تکے دانشوروں کو کھری کھری سنائی ہیں لیکن مجھے یقین ہے اس کا کچھ اثر نہیں ہوگا۔ کیونکہ بیشتر شعراء نے خود ان نام نہاد شعراء کی بے سُری شاعری پر خوبصورت دیباچے لکھے ایسے ایسے شاندار تبصرے لکھے کہ الامان والحفیظ۔ حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور جو حد سے بڑھ کر لکھنے والوں کو شاباش بھی دینی چاہیے لیکن کوڑے کرکٹ اور اوٹ پٹانگ مال کو تھوڑی قدر سے سڈول بنا کر ان سے "خاصی وصولیاں" سے بہرہ مند ہونا تو جرم ہے۔ ایک صاحب کے پچاس سے اوپر شعری مجموعے نہایت آب و تاب کے ساتھ چھپ چکے اور متعدد زیرِ طباعت سے آراستہ ہونے کے لیے مستعد ہیں۔ پتہ ہے اس کثیر تخلیقی دھوکہ بازی میں کون مجرم ہے۔ خود ایک قابلِ احترام شاعر جو پل بھر میں درجنوں اشعار لکھ لکھ کر ایسے نام نہاد شاعر کے نامۂ اعمال کو بظاہر روشن لیکن بباطن تاریک کر رہا ہے۔ آپ کے والدِ گرامی نے ایسے ان گنت شعراء کو اپنی آنکھوں کے سامنے "سربرآوردہ" ہوتے دیکھا لیکن انھیں منہ نہ لگایا۔ آپ بھی اسی روش کو اپنائیں لیکن درخواست ہے کہ ان اعمالِ حسنہ کا ذکر خواہ مخواہ تشہیر بھی نہ کریں۔ آپ اپنا قبلہ درست رکھیں۔ بد اندیشوں اور شہرت پسند "شاعروں" سے تخلیق کو پاک رکھیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کا "تخلیق ادبی ایوارڈ" نہایت موزوں ہے۔ آپ نے سابقہ ایوارڈز بھی نہایت معقول اور موزوں ادباء و شعراء میں تقسیم کیے۔ البتہ حاسدین کی باتوں کو منہ نہ لگائیں۔ مجھے پچھلے ماہ آرٹس کونسل کی طرف سے میری ادبی خدمات کے اعتراف میں مجید امجد ادبی ایوارڈ (2020ء) ملا تو جلنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور حسب معمول گفتنی و ناگفتنی باتیں بھی ہوئیں۔ —— لہٰذا..... کے جاؤ منظر اور کام اپنا اپنا۔

سیّد ریاض حسین زیدی (ساہیوال)

﴿6﴾ میرے پیارے فصیلے شہزادے سونان!

مجھے پتہ ہے تم ناراض ہونے کا ڈھونگ کر رہے ہو۔ مگر خبردار، تم اپنے یاروں دوستوں سے بھلا خفا ہو جاؤ لیکن تمھیں اپنے والد صاحب کے دوستوں سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ کچھ اب مجھے صفائی کا موقع بھی دو۔ کسی سے صفائی سنے بغیر بھی کوئی فیصلہ نہ کیا کرو

اور اگر کسی سے خفا ہو بھی جاؤ تو یاد رکھو صرف تین دن تک ناراض رہنے کی اجازت ہے۔ میرے لیے تو ایک پل بھی نہیں، کوئی شک ہو تو میرے یار، اپنے والد محترم کی روح سے پوچھ لو۔ اب سنو! جب تم لاہور سے اسلام آباد کی طرف آئے تو تمھارا پیغام مل گیا تھا۔ میرے دوست "ڈاکٹر رشید امجد" کا گھر، میرے گھر سے زیادہ دور بھی نہیں۔ تم اُدھر آئے، تمھارا کیا خیال اگر میں بیمار نہ ہوتا تو کیسے نہ اُدھر پہنچتا۔ میں نے کسی کو بتایا نہیں، مگر تمھیں پتہ ہے میں "میڈیکل ڈاکٹر" ہوں۔ کسی اور کی بیماری تشخیص کروں نہ کروں اپنی کر لیتا ہوں۔ تمھیں اشارہ کیا بھی تھا، بخار چڑھا ہوا ہے۔ صرف بخار نہیں تھا "کرونا" تھا۔ ٹیسٹ اس لیے نہیں کرایا کہ وہ پورا علاقہ سیل کر دیتے۔ اب سوچو۔ یہ جانتے ہوئے کہ تمھاری "مس کرونا" چھوڑی ہوئی ہے، میں اُٹھ کے آ کے تمھیں چمٹ جاتا!! ویسے سچ میں بخار کے ساتھ پورا جسم درد سے بے حال تھا۔ میں نے تو اللہ جی سے کہہ دیا تھا "بندہ" حاضر ہے، مجھے کیا، سفید لٹھے میں لپیٹ کے مٹی کے بستر پہ، مٹی کے لحاف میں لٹاتے ہو یا موم جامے میں لپیٹ کے۔ اب "بندہ" ہو اور سنگِ میل پبلشرز کے شوروم جا کے "بندہ" لے آؤ۔ اُدھر "بندہ" لے کر کہنا، وہ "بندہ" کے اکاؤنٹ میں لکھ لیں۔ اب بات کھل ہی گئی ہے تو سنو۔ "دروازہ کھلتا ہے" ناول چھپا تو سب سے پہلے وہ لے کر پتہ کس کے پاس پہنچا؟ پوچھو، تمھارے والد صاحب کے پاس، "اصغر جاوید" "دروازہ کھلتا ہے" دیکھ کے اتنا خوش ہوا کہ آنکھ آنکھ کے یار بار لگنے لگا، کبھی ماتھا چومے، کبھی ہاتھ۔ پھر فون اُٹھا کے سب سے پہلے "انور سدید" کا نمبر لگایا۔ وہ بھی حیران بار بار پوچھے، واقعی 1800 صفحے کا ناول؟ اصغر جاوید کہے، پورے 1800 صفحے۔ ساتھ جو تحریر لکھی ہے، وہ کیا کہوں۔ میں نے تو کبھی اپنی کسی کتاب کی "تقریب رونمائی" نہیں کروائی نہ کسی کو کہا کہ کسی کتاب پہ کوئی مضمون لکھے۔ میرے گرو "ممتاز مفتی" کا حکم تھا کہ تجربہ اور مطالعہ جن کے وہ بن کے اور پڑھ کے نہ دیکھنا بھی۔ کتابیں لکھو جتنی مرضی "شہرت" کا چسکا نہیں پالنا۔ یہ چسکا جسے لگ جائے، اسے "بندہ" سے ججری بنا دیتا ہے۔ ایسا بندہ پھر چھتا پھرتا ہے، کہاں مونا سونا کے دیکھتا کس نے پچھاڑا، کس نے نہیں۔ کہتے تھے، یہ چسکے کھلاڑی کو ہوتے ہیں، اداکاروں کو ہوتے، شاعر کو ہوتے، طوائف کو ہوتے۔ خدا کا واسطہ اس سے دور رہنا۔ "اصغر جاوید" خود ساری عمر ان چسکوں سے دور رہا۔ شاعر ہو کے بھی شاعروں کی طرح کسی منڈی میں نہ بکا۔ "اصغر جاوید" کی بات ہو رہی تھی۔ "دروازہ کھلتا ہے" دیکھ دیکھ کے کہے، دیکھنا اب کیا کیا کھلتا ہے "دروازہ کھلتا ہے" تو دیکھ لیا۔ اب اور بہت کچھ آئے گا۔ میں سر جھکائے شرمندگی سے کہوں، سرکار بس۔ وہ بولیں، نہ نا اب تو معاملہ کچھ اور ہو گیا۔ مجھے سمجھ ہی نہ آئی بات اُس کی۔ اُس کے بعد اس کے چھ ذیلی ناول آ گئے۔ ایک ناول کا میں نے انتساب ہی اصغر جاوید کے نام کیا۔ "ماڈ سیون والی" کا "بھگوان تحریف کے اکھیا اکرشن مہاراج / اصغر جاوید" کے نام۔"

یوں لیں، اب دیکھنا کیا کیا قلم تم سے لکھواتا، "دروازہ کھلتا ہے" کا میرا لکھا انتساب پڑھ پڑھ کے لکھا تھا: "اللہ کے نام جس نے قلم کو لکھنا سکھایا۔ "میرے گرو اور میرے یار اصغر جاوید کی دعاؤں کا اثر دیکھیے یار۔ تیسویں (30th) کتاب آئی آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "1244 صفحے کی۔ مصر، قاہرہ الازہر یونیورسٹی کی "سعید صلاح" نے "آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" پہ ایم۔فل کیا۔ اسی کتاب کا عربی میں ترجمہ بھی کرایا۔ "سیدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کے نام سے۔ اس کتاب کا سندھی میں ترجمہ کر دیا۔ حیدر آباد سندھ کے "یوسف سندھی" نے۔ یہ سب سنگِ میل پبلشرز لاہور شائع کرتا۔ افضال احمد کہتا، تمھاری جس مرضی زبان میں کتابیں ترجمہ ہوں، چھاپوں گا میں۔ اُس نے "دروازہ کھلتا ہے" کا ہندی زبان میں ترجمہ لاہور سے چھاپا۔ پورے ہندوستان میں کھلبلی مچا دی۔ اردو کے بعد ہندی کا بھی سب سے بڑا ناول۔ لوگ اُدھر حیران کہ ہندی، دیوناگری زبان میں سب سے ضخیم ناول نہ ممبئی سے چھپا نہ کلکتہ سے نہ دلی سے، بلکہ

لاہور سے۔ تمہیں پتہ ہندی زبان میں میرے چھاپہ والوں کے ساتھ "دروازہ کھلتا ہے" جب چھپا تو ان سب کی تقریبِ رونمائی کہاں ہوئی؟ آگرہ میں تاج محل کے سامنے۔ میں نے اس لیے منع نہ کیا کہ ترجمہ کرنے والا "ڈاکٹر کیول دھیر" تھا۔ وہ لدھیانہ سے ساتھ ہو گیا۔ سارک کانفرنس میں آٹھ ملکوں کے ادیب تھے۔ ہندوستان کے صدر اُدھر تھے۔ سارک ممالک کے ادیب، شاعر سب موجود۔ سارک والوں نے کہا، یہ حیرت انگیز بات، پاکستان سے دیوناگری میں ضخیم ترین ناول چھاپا کس نے؟ انہیں پبلشر کو بھی ساتھ لے کر آؤ۔ افضال احمد ساتھ گیا، وہ پٹنے ہم اکٹھے آگرہ، دہلی، اجمیر، لدھیانہ ہر جگہ رہے۔ اسی ناول پہ پاکستان میں بے شمار ایم فل ہوئے۔ انڈیا میں ہوئے، بنگلہ دیش، ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالاحد اس کا بنگالی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر کی "ڈاکٹر حنا" اس ناول کو عربی میں ڈھال کے اسے عربی کا بھی ضخیم ترین ناول بنا رہی ہیں۔ عمران یونیورسٹی کے ڈاکٹر علی الحیات اسے فارسی پیرہن دینے میں لگے۔ عیال کی "کیتا" اسے نیپالی میں لا رہی ہے۔ تو بات ہو رہی تھی، "اصغر جاوید" کی دعاؤں کی۔ ساری زبانوں میں افضال احمد چھاپنے پہ مصر لیکن گرمکھی میں ڈاکٹر نگر ار سنگھ چدھر نے اسے چندی گڑھ انڈیا سے "سرہند کنٹھے" کے نام سے چھاپ کے افضال احمد کا قانون توڑا۔ ویسے میری کتاب "من فلاور" الازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر کی "آمرہ" عربی میں ترجمہ کرنے، اس پہ ایم فل کرنے کے بعد مصر سے چھپ چکی، عربی میں۔ یہی کتاب میرے دوست "نصر ملک" نے ڈینش میں ترجمہ کر کے ڈنمارک سے چھپوائی۔ "آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ڈاکٹر نجیبہ عارف پی ایچ۔ ڈی کروا رہی ہیں۔ دو اور لڑکیاں بھی پی ایچ۔ ڈی کر رہی ہیں ادھر۔ وہ درجن ایم۔ فل کر چکی ہیں۔ "آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھپنے کی آرزو میں، اسے چھپی دیکھنے کی دعا کی تھی۔ خدا نے ایسا ترس کھایا، ایسا کرم کیا کہ کتابوں کی برسات کر دی۔ چار کتابیں آ گئیں، "حیرت"، "گندی گڑیا"، "قلوپطرہ" اور "بلاگ" پھر ایک بڑی کتاب "آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گئی۔ "بندہ" اس لیے تمہیں کہا کہ جا کے سنگ میل پبلشرز کے شوروم سے "بندہ" اٹھالو۔ سنگ میل اب ایشیا کا سب سے بڑا لٹریچر چھاپنے والا پبلشر ہے۔ یہ بات انڈیا والوں نے "اون ریکارڈ" کہی۔ شک ہو تو آر ایس ٹی وی انڈیا کی بنائی ہوئی ڈاکومنٹری، انٹرویو دیکھ لینا، یوٹیوب پہ، میرا نام لکھ کے۔ یہ ساری باتیں تمہیں اس لیے بتائیں کہ یہ سب میرے گرو ممتاز مفتی اور میرے یار اصغر جاوید کی دعاؤں کا نتیجہ ہے، ورنہ میرے پاس کیا، کچھ بھی نہیں۔ نہ میں، نہ تین میں نہ تیرہ میں/ میری کوئی حیثیت نہیں/ سنگ میل اب تک میری پینتیس کتابیں چھاپ چکا/ چھ ابھی رستے میں/ اور ہاں، ایک بات تو بتانا بھول گیا/ ابھی میری آنے والی موٹی کتاب، تیار۔ الحمدللہ/ نام پہلے "رستہ" یہ بھی سوا ہزار صفحوں کی/ اس میں تفصیل سے اپنے یار کی بات کی/ اصغر جاوید کی/ اب مجھے پوری بات!/ فیصلے بادشاہ، سوچتے شہزادے تمہیں حق ہے بھائی/ احسن جس کو مل جائے، اسے رونا آ ہی جاتا/ پھر میں کیا کروں/ مجھے منانا ہی نہیں آتا/ یار نہ مانے تو بس ایک کام آتا/ آنسو/ بس رونا آتا اور کوئی کام نہیں آتا/ دیکھا/ آنسو بندے کے ہوں یا قلم کے/ جب تک نکلے/ کچھ لکھا نہیں جاتا، کچھ کہا نہیں جاتا/ اب تو مان جاؤ روٹھے یار۔

ڈاکٹر ابدال بیلا (اسلام آباد)

نوٹ: آپ کو باقاعدہ تحریری جواب ارسال کر چکا ہوں۔ مختصر عرض ہے یاد اور یادیں دونوں الفاظ کے مطلب مختلف ہیں۔ آباد رہیں اور خوش رہیں۔ میں دس سال سے ادبی دنیا کے مارچ شمارے کا منتظر ہوں، آ رہا ہوں۔ ملاقات نہیں ہوئی یہی جرم ہے بس میرا!!

﴿7﴾ برادرِ محترم سلطان اشہر جاوید!

دسمبر 2020ء کا شمارہ کھولتے ہی اندرونِ سرورق پر تین رنگا رنگ تصاویر پر نظر پڑی تو آنکھوں میں اس یادگار کے رنگ تازہ ہو گئے جو ہم آپ نے مل کر کیا تھا۔ مقصد اس سفر کا ارفع و اعلیٰ تھا۔ میں اور آفتاب خان، آپ کی معیت میں راولپنڈی گئے تاکہ نابغۂ روزگار تخلیق کار (ڈاکٹر) رشید امجد کو "تخلیق ایوارڈ" کی اطلاع و تہنیت اور پھول مٹھائی پہنچا سکیں۔ شاید ہی کبھی ہوا ہو (تخلیق ایوارڈ کے علاوہ) کہ ایوارڈ دینے والے خود جا کر ایوارڈ یافتہ کو یہ مژدہ خوش پہنچا گئے۔ بلاشبہ یہ قدم محترم اُدبا کے ضمن میں بہت احسن ہے۔ دورانِ سفر میں ہماری گفتگو آپ کی تواضع، آفتاب خان کی ادبی و علمی معلومات اور پیارے گیتوں نے لطف کی فضا قائم رکھی۔ جناب ڈاکٹر رشید امجد کے دولت کدے پر اُن سے ملاقات اور گفتگو کا اپنا مزا تھا جس کا مفصل اظہار محترم نسیم سحر موجودہ شمارے میں کر چکے اور کیا ہی خوب لکھا انہوں نے۔

اس شمارے میں بجا طور پر کئی صفحات تخلیق ایوارڈ 2020ء پانے والے نامور لکھاری جناب رشید امجد کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ ان کا انٹرویو بھی عمدہ رہا۔ حصہ مضامین میں جناب حسن عسکری کاظمی کا مضمون "فراق گورکھپوری۔ غزل کی آبرو" اور جاوید عباس جاوید کا مضمون "اردو مثنوی کا عروج و زوال" زیادہ پسند آئے۔ حصہ منظومات میں بہتری کی خاصی گنجائش موجود ہے پھر بھی جمیل احمد عدیل اور پروین شیر کی نظمیں مواد اور ہیئت کے لحاظ سے بہتر رہیں۔

آغا گل نے سائنسی، تکنیکی ایجادات کے عہد کے عجوبے "انسان نما روبوٹ" کے موضوع پر نہایت عمدہ، جدید تر افسانہ لکھا۔ ان کا اسلوب دلچسپی بڑھانے والا ہے۔ عنوان بھی حسبِ افسانہ ہے "حقی" کا ماسٹر؟ آغا گل نے اپنی تحقیق سے واضح کیا ہے کہ بات اب Sex Doll سے آگے بڑھ کر مکمل "مشینی جیون ساتھی" تک پہنچ گئی ہے ع محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

محترمہ عذرا اصغر کے عمدہ افسانے "تمناؤں کی بستی" کا خمیر امرتا پریتم کے ایک بیان سے اُٹھا ہے جس کا بجا طور پر حوالہ افسانے کی ابتدائی سطور میں موجود ہے۔ میرے علم کے مطابق عذرا اصغر صاحبہ اردو میں افسانہ تخلیق کرتی ہیں جبکہ اس افسانے پر "ترجمہ: محمد طارق علی" کے الفاظ ہیں۔ اگر یہ ترجمہ ہے تو کس زبان سے؟ براہ کرم وضاحت کیجیے گا۔ ڈاکٹر حبیب الرحمان کا افسانہ "محبت اور حصول" بے حد عمدگی سے لکھا گیا ہے۔ زبان، منظر نگاری، موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے یہ معیاری افسانہ ہے۔ ایسے ہی افسانے "تخلیق" کا معیار بننے چاہئیں۔ اسی طرح کا بے حد عمدہ افسانہ "سگریٹ کا آخری کش" (اختر سعید مدان) ہے۔ اگرچہ اسلوب و انداز پر محمد الیاس کے فن کی چھوٹ پڑتی ہے پھر بھی اپنی دلچسپی، انداز بیان اور مضبوط کہانی کی وجہ سے تادیر یاد رہنے والا افسانہ ہے۔ خاقان ساجد کا افسانچہ "اکلِ حلال" بھی خاصے کی چیز ہے۔ حصہ غزل بھرا بھرا ہے۔ انور شعور تا طاہر منظور، خیابانِ غزل پر نہایت بہتر نام جلوہ نما ہیں۔ جیسا کہ غزل کا عمومی وطیرہ ہے، دو تین اچھے اشعار ہر غزل میں چمک ہی جاتے ہیں پھر بھی انور شعور (عمدہ ردیف) محمود شام و صابر ظفر (نادر قوافی)، حسین مجروح (جدتِ مضامین)، عباس تابش (تغزلِ شعری)، سید ضیاء الحسن (شوخیٔ اظہار) کی غزلیں بے حد خاطر ہوئیں۔ اسی طرح غلام حسین ساجد اور نجیب احمد کی غزلیں فنی مہارت اور تاثیر کے باعث اچھی لگیں۔ نجیب احمد کی غزل کا مقطع سے پہلا شعر کچھ زنگ کی کم از کم دو اغلاط کا شکار ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز گنی آدمی ہیں۔ انہوں نے ملکۂ ترنم پر ایسی وسعت سے لکھا ہے کہ پورا دور متحرک ہوتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے گیتوں کے ایسے سوچے حوالے دیے ہیں کہ میں ہر گیت پہلے گنگنا کر یاد کرتا اور پھر آگے بڑھتا۔ محمود شام، غلام

حسین سحر، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اور جمیل احمد عدیل نے ادبی کتب اور رسالہ "تخلیق" کے بے حد اچھے تجزیے کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی تصنیف کے جائزے کا یہی حق ہوتا اور ایسے ہی لکھا جانا چاہیے۔ صفحہ 129 پر بانو قدسیہ سے منسوب ایک اقتباس درج ہے۔ مجھے یقین کی حد تک گمان ہے کہ یہ ان کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ امکان ہے کہ آپ نے سوشل میڈیا سے اٹھایا ہوگا۔ اس ضمن میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے کہ سوشل میڈیا کا کچھ اعتماد نہیں۔ محمد فقیر کی کئی غزلیں منیر نیازی، محسن نقوی اور پروین شاکر کے نام سے زیرِ گردش ہیں۔ شبہ طراز نے جواز جعفری کی نظم کا گہرائی، عمدگی اور جدید شعور کی روشنی میں بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ انہوں نے نظم کے اطراف کشادہ کر کے اسے وسیع تر تناظر میں دیکھا ہے۔ انجمن خیال کے خطوط بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ حصہ بھی ہمارے "تخلیق" کا بہت اہم اور چمکدار ہے۔ سونان صاحب! "تخلیق" کی ادبی روایت کو آپ تن دہی اور سلیقہ مندی سے لے کر چل رہے ہیں۔ بطور قاری مجھے ان کٹھنائیوں کا اندازہ نہیں تھا جو ایک مدیر کو پرچے کی تدوین و اشاعت میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اب جو میں "ادبِ لطیف" کا معاون مدیر بنا ہوں تو پتہ چلا ہے کہ مواد کی چھان پھٹک اور پروف ریڈنگ سے لے کر پرچے کی ترسیل تک، کتنے مقاماتِ آہ و فغاں آتے ہیں۔ اس لیے آپ کی کاوش کو سلام پیش کرتا ہوں۔ آخر میں اس عزت افزائی کا خاص شکریہ جو آپ نے "تخلیق ایوارڈ پینل" میں مجھے شامل کر کے فرمائی۔ "تخلیق" دل کے قریب ہے اور ایسے ہی آپ بھی نیک تمناؤں کے ساتھ۔

شہزاد نیّر (لاہور)

☆ پس نوشت : اداریے میں آپ نے سوشل میڈیائی "شعر و ادب" پر دردِ دل سے لکھا ہے اور بجا طور پر ادبی معیار کی پامالی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ سے عمومی اتفاق کے باوجود یہ کہوں گا کہ آپ نے جو نام لکھے ہیں ان میں سے بعض شاعروں کے پاس بعض اچھی تخلیقات بھی ہیں۔

> ☆ نوٹ : محترم ادارہ بخوبی واقف ہے جن شعرا کے پاس چند تخلیقات ہیں "اچھی" کے لفظ سے ادارہ اتفاق نہیں کرتا۔ تخلیقات کی فہرست میں تو بہت سے گلوکار، اداکار بھی شامل ہیں۔ جس نقطہ کی طرف توجہ مبذول کروانے کی کوشش کی گئی وہ یہ ہے کہ کسی نامراد انسان نے ان تمام لوگوں کو یہ باور کروا دیا ہے کہ صاحبِ کتاب ہونا وہ اعزاز ہے جو آج ترقی اور شہرت کا شارٹ کٹ ہے۔ جس کی وجہ سے اس دوڑ میں معیاری ادب بہت پیچھے رہ گیا۔ (ادارہ "تخلیق")

﴿8﴾ پیارے سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ "تخلیق" کا سفر اظہر جاوید سے شروع ہو کر سونان اظہر تک نہ صرف جاری ہے بلکہ ارتقا کی منزلیں شاعرانہ طریقے سے طے کرتا ہوا ادب کے افق پر چاند کی طرح روشن ہے۔ اس کی روشنی میں روح کی ٹھنڈک بھی ہے اور اذہان کی خوشبو بھی۔ "تخلیق" کے سرورق سے لے کر آخری صفحے تک محبت، ادب، خلوص، چاہت اور پیار کا ایک زمزم ہے جو بہہ رہا ہے۔ میں اکثر کہتا ہوں یا اللہ سب کے جھنڈے لگا مگر میرے اور میرے قبیلے کے جھنڈے دو انچ اونچے کر کے لگا تا کہ میرے قبیلے کی پہچان رہے۔ مگر یہ دو انچ جو اونچے ہوتے ہیں ان کے

لیے جان سوٹی پرعائلی پڑتی ہے۔ اب باپ کے بعد بیٹا ہر طرح سے سرخرو ہے۔ اگر آپ "تخلیق" کے کسی بھی شمارے کو غور سے پڑھیں گے تو ادیبوں کا ایک گلدستہ ہمیشہ نظر آئے گا اور یہ وہ ادیب ہیں جن کے اندر کوئی چیز جعلی نہیں ہے۔ سب کے سب سچ مچ کے زندہ جیتے جاگتے ادیب ہیں۔ اتنے خوبصورت لوگوں کو اکٹھے رکھنا بہت ہی خوبصورت آدمی کا کام ہے اور سونان کو سو بار مبارکباد کہ اس نے ایسے سارے دوستوں کو محبت کے دھاگے میں پرو کر تخلیق تک منتقل کر دیا۔ اب ہر شمارہ چلتا پھرتا گلستاں ہے جس میں ہر پھول کا رنگ اور خوشبو قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ میری دعا ہے یہ گلشن سدا مہکے اور اس کا مالی ہمیشہ شاد و آباد رہے۔ میری تمام دعائیں اور محبتیں تخلیق کے لیے ہیں۔

شجاعت ہاشمی (لاہور)

﴿۱﴾ عزیزم سونان اظہر سدا سلامت رہو!

دسمبر کا "تخلیق" مع ماسک وصول ہوا۔ سینیٹائزر اور ماسک کے تحفوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمھیں بزرگوں کی صحت کا بڑا خیال ہے۔ جیتے رہو۔ دورِ کرونا کی فرصت میں "تخلیق" کے عمیق مطالعے کا موقع ملا۔ ماشاءاللہ آپ کی ادارت میں رسالہ اوجِ کمال کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ دسمبر کا خوشنما سرورق سحر حنیفہ کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ "پہلی بات" میں آپ نے بے تکے اور بے استاد نام نہاد شعرا کے کان خوب اینٹھے ہیں۔ دراصل فنِ شاعری سے ناآشنا یہ لوگ آسمانِ ادب پر دکھنے والے وہ طلبا ہیں جن کی ادبی روشنی ایک جگنو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے۔ حمد و نعت پر کئی مشاق شعرا مدحت سرا نظر آئے۔ بشریٰ رحمٰن نے چھوٹی بحر میں بڑی اچھی نعت تخلیق کی ہے۔ گوشۂ ڈاکٹر رشید امجد میں سحر حنیفہ نے ان کی شخصیت کے کوائف بڑے سلیقے سے قلمبند کیے ہیں جبکہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، نسیم سحر، ڈاکٹر مظفر اقبال اور آفتاب خان نے اپنے اپنے مضامین میں ڈاکٹر رشید امجد کے فکروفن کو بڑے احسن طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ تخلیق ایوارڈ پینل نے ڈاکٹر رشید امجد ایسے عبقری ادیب کو تخلیق ایوارڈ کے لیے نامزد کرنے کا جو احسن فیصلہ کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ ان کا شمار معمارانِ ادب میں ہوتا ہے۔ یہ اس اعزاز کے یقیناً مستحق تھے۔ آپ کا لاہور سے آ کر ایک وفد کے ہمراہ راولپنڈی میں مقیم ڈاکٹر رشید امجد کے گھر تخلیق ایوارڈ کی پیشگی مبارکباد دینا لائقِ صد تحسین تھا۔ اس وفد کی رابطہ کاری میرے ذمے تھی۔ راقم معروف شاعر نسیم سحر کو اپنے پرانے دفتر لائے۔ میرپور سے معروف شاعر اور عروض دان جناب ذبیح اللہ فہیم از خود تشریف لائے جبکہ بیگم شہزادہ نیر اور آفتاب خان آپ کے ہمسفر تھے۔ ہم سب آپ کی معیت میں محترم ڈاکٹر رشید امجد کے دولت کدے پر مبارکباد کے لیے حاضر ہوئے۔ میں ڈاکٹر صاحب اور اس وفد کے شرکا کے ادبی کارناموں سے تو پہلے ہی آگاہ تھا تاہم ان من موہنی شخصیات سے بالمشافہ ملاقات کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ سچ پوچھیں تو ڈاکٹر صاحب سے وفد کی روبرو گفتگو نے ایک انجمنِ خیال کا روپ دھار لیا تھا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیوں کہ اس تقریب کا مفصل احوال جناب نسیم سحر پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ اس محفل میں ملنے والی نسیم سحر کی کتاب "نعت نگینے" پر راقم نے ایک مفصل عروضی جائزہ لکھ کر تخلیق کو بھجوا دیا ہے۔ امید ہے کہ اسے شاملِ اشاعت کر لیا جائے گا۔

مضامین بھی خاصے معلوماتی تھے۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے "اقبال اور تصورِ آزادی" میں عنوان کی پرتیں بڑے مدلل انداز سے کھولی ہیں۔ ڈاکٹر احسن عسکری کاظمی نے اپنے مضمون میں فراق گورکھپوری کی شخصیت اور ان کی غزل گوئی کو ان کے شعروں کے حوالے کے ساتھ بڑے احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ سید ریاض حسین زیدی اپنے مضمون "اُردو کا نقاد کلیم الدین افسوس ناک اتفاق کا انکار"

میں ارباب وابستگانِ کشاد کے منفی رویوں اور ہٹ دھرمی کو بڑی دل گرفتگی سے سامنے لائے ہیں جبکہ جاوید عباس جاوید نے اپنے مضمون ''اردو مثنوی کا عروج و زوال'' میں دراصل مثنوی کی مختصر ترین تاریخ بیان کر دی ہے۔ منظومات میں شعرا کے خوبصورت خیالات کی جھلمل کی قرأت سے قارئین کا حظ اٹھانا فطری بات ہے۔ اس مرتبہ وافر تعداد میں افسانے پڑھنے کو ملے۔ مسیح آہوجہ کے افسانے ''چھوارے کی چھولانا جھلاؤ'' کے چھوٹے چھوٹے جملے تو بڑے پُر کشش تھے تاہم ان کے تخیل اور مختصر انٹیالات مکالمے کہانی کی یکسوئی متاثر کرتے ہیں۔ آغا گل کے افسانے ''کا ماسوترا'' کی کہانی نہ صرف دلچسپ تھی بلکہ اس کی سحر انگیزی قاری کو اختتام تک اپنی گرفت میں جکڑے رکھتی ہے۔ عذرا اصغر کے افسانے ''ستاروں کی بستی'' کا ترجمہ محمد طارق علی نے بڑی مہارت سے کیا ہے اس کا اختتام قاری کو گہری سوچ میں ڈال دیتا ہے۔ ظفر سپل تاریخ، فلسفہ اور تحقیق پر بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے ''اسیر کمند ہوا'' کی کہانی میں بھی فلسفیانہ لہجے کی جھلک ملتی ہے۔ وحشی سعید نے ''شیشے کا سمندر'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑی گہری باتیں کی ہیں۔ ''محبت اور معمول'' میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نے کہانی میں کمال درجے کی جذبات نگاری کی ہے۔ ''اب پانی نہیں پیوں گی'' میں مسرت کلانچوی نے ایک ماڈل پر دلچسپ کہانی لکھی ہے تاہم ہوا کو قطرہ قطرہ پینے والے مکالمے کا انداز کچھ نیا سا لگتا ہے۔ ''کھیل کا میدان'' میں اسلم سحاب ہاشمی نے جاگیرداروں کی قبیح حرکات پر کہانی کی بہت اچھی بُنت کاری کی ہے۔ ''اکل حلال'' کے افسانچے میں خاقان ساجد نے ایک سرکاری محکمے کے اہل کاروں میں در آنے والے ناپسندیدہ رویوں کو بڑی فنی چابکدستی سے طشت از بام کیا ہے۔

''کشمیر بنے گا پاکستان'' میں محمد شعیب مرزا نے مقبوضہ کشمیری بھائیوں کے دگرگوں حالات کی جو تصویر کشی کی ہے اسے پڑھتے ہوئے قاری کا دل کھنچ جاتا ہے۔ کاش ہمارے ارباب اختیار ان مظلوموں کی کچھ عملی مدد کرتے۔ ''پس دیوار میں'' ڈاکٹر نجمی سلیم نے دھرم کی آواز کے تعاقب میں ایک اچھی کہانی تخلیق کی ہے۔ ''سگریٹ کا آخری کش'' میں اختر سعید اعوان نے میاں بیوی کے فطری طلاپ کو ایک اچھوتے انداز کی کہانی میں سمویا ہے۔ فرزانہ روحی اسلم اپنے افسانے ''محرم راز'' میں بڑی فنی چابکدستی سے یہ بتاتی ہیں کہ ناپسندیدہ ماحول عورت کو کیسے نفسیاتی مریض بناتا ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز کی ملکہ ترنم نور جہاں پر لکھی سحر انگیز اقساط اختتام کو پہنچیں۔ امید ہے کہ وہ اپنی نئی تحقیقات کے ذریعے ''تخلیق'' سے رابطہ برقرار رکھیں گے۔ شہباز انور خان نے اظہر غوری پر لکھے خاکے میں ان کی شخصیت کے کئی مخفی پہلو سامنے لائے ہیں۔ محمود شام جو ادب کا ایک بڑا نام ہیں نے ''حنیف باوا کی کہانیوں کا سحر'' کے عنوان سے بڑے ہی سحر انگیز انداز سے باوا کی ستائش کی ہے۔ ''بجھ میرا انگ کا'' میں غلام حسین ساجد نے مسیح آہوجہ کے مختلف انداز بیان کی توضیح و تصریح کی بھرپور کوشش کی ہے تاہم سچ تو یہ ہے کہ آہوجہ صاحب کے مزاروں مکانوں کا گتھا سمجھنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا ''تخلیق'' ستمبر 2020ء پر لکھا جائزہ خاصے کی چیز تھی۔ جمیل احمد عدیل نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی آپ بیتی کا جو اولیں تعارف نامہ پیش کیا ہے۔ کاش وہ اس نادر نسخے کے ملنے کا پتا بھی بتا دیتے۔ کالم جائزے میں نوید چوہدری کا روزنامہ ''نئی بات'' میں ''تخلیق'' پر لکھا کالم پسند آیا۔ برطانیہ سے سرفراز تبسم ''ادیبوں اور شاعروں سے کچھ ملاقاتیں'' کے عنوان سے اچھی تحریر لکھی ہے تاہم ان کا معروف شاعر اور نعت نگار انور فیروز کے نام کے ساتھ مرحوم کی بجائے آنجہانی لکھنا کچھ نہیں آیا۔ برطانیہ سے سرفراز تبسم نے ''ادیبوں اور شاعروں سے کچھ ملاقاتیں'' کے عنوان سے اچھی تحریر لکھی ہے۔ شاید ایسا سہواً ہوا ہو۔ تجزیاتی مطالعے میں شبہ

طراز نے جواد جعفری کی نظم "زمین مجھ پر برہم ہو گئی" کا بڑی گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ اس نظم کے تخلیقی انتخاب سے شبیہ طراز نے اپنے وجدان سے خلا اور کائنات کی جو پرتیں کھولی ہیں قاری جس تجسس انداز سے اس میں کھو جاتا ہے۔ اس تحریر کے اختتام پر ان کی نظم "ایک خیال کی آنکھیں جلتی ہیں" کے مطالعے کا مزہ دوچند ہو جاتا ہے۔ حصہ غزلیات کی بھی غزلیں رنگ تغزل سے مہکتی دکھائی دیں۔ امین راحت چغتائی کی غزل کا پانچواں، آصف ثاقب، سید عباس تابش کی غزلوں کا چوتھا، ضیاالحسن، رشیدہ آفرین، انور عدیم علوی کی غزلوں کا تیسرا اور توقیر مشتاق کی غزل کا چھٹا شعر مجھے پسند آئے، تاہم خط کی طوالت کے باعث وہ شعر یہاں رقم کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگرچہ اس مرتبہ انجمن خیال کی محفل میں چٹھیاں کچھ کم تھیں تاہم امین راحت چغتائی، آصف ثاقب، آغا گل، شہباز انور خان، آفتاب خان، محمد اسلم، رشیدہ آفریں، ڈاکٹر محمد اقبال صمصام اور ام فروا زیدی کے خطوط میں کئی تحریروں پر اچھے تاثرات پڑھنے کو ملے۔ خط کے اختتام پر اتنا کہوں گا کہ سال گذشتہ صحت انسانی کے لحاظ سے انتہائی مایوس کن تھا کیونکہ کرونا کی وجہ سے نظام زندگی مفلوج رہا۔ قارئین انجمن خیال کو نیا سال مبارک ہو مگر آیئے سب مل کر دعا کریں کہ خدا کرے نیا سال ہم سب کے لیے امید نوید کا باعث ہو۔ کووڈ کا خاتمہ ہو اور روح انسانی کی چھنی مسکراہٹیں واپس آئیں تاکہ معمولات زندگی بحال ہوں۔

ایم ڈی ملک (راولپنڈی)

{10} محترمی و مکرمی سوہان اظہر صاحب!

آپ شاید مجھے نہیں بھولے ہوں گے۔ وحشی سعید صاحب مدیر اعلیٰ "سہ ماہی نگینہ انٹرنیشنل" نے آپ کا تعارف پہلے ماہنامچے نے ہی کرایا تھا۔ ان کا ایک افسانہ "تخلیق" میں اشاعت کے لئے بھیج کر، اور پھر ان کے کئی افسانوں پر ماہنامچے کے مفصل تجزیوں اور تخلیق پر تبصرے کو آپ نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع فرمایا تھا۔ آج آپ سے ڈائریکٹ مخاطب ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پاکستان کے کئی محترم قلمکار دوستوں نے انھیں پسند کیا تھا۔ مکتوبات میں ان کی گراں قدر آرا پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کا بھی شکر گزار ہوں۔ ایک نیا، غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ افسانہ منسلک کر رہا ہوں۔ امید ہے پسند آئے گا اور آپ اسے اپنی کسی قریبی اشاعت میں شامل فرمائیں گے۔ آپ کی رائے اور رسید کا منتظر رہوں گا۔ منسلک افسانہ سال گذشتہ اکتوبر میں روانہ کیا تھا واپس آ گیا تھا۔ پاکستان سے باہر رہنے والوں کے لئے آپ نے ای میل سے تخلیقات وصول کرنے کی سہولت دی ہے جو ایک اچھا قدم ہے۔ ہم ہارڈ کاپی بھیجنے سے قاصر ہیں میرے خیال میں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔ خدا کرے آپ سب بخیر ہوں۔ متعلقین کی خدمت میں سلام کہہ دیجیے گا۔

ڈاکٹر اشرف آثاری (انڈیا)

{11} عزیزم سوہان اظہر صاحب!

سلام و رحمت! جزو لاینفک ماہنامہ "تخلیق" کا ماہ دسمبر 2020ء کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے تحفے کے ساتھ موصول ہوا جو سطر سطر آپ کی محنت، اخلاص اور حسن عمل کا مظہر ہے۔ اس شمارے کے تمام مضامین نظم و نثر بہترین اور معیاری ہیں۔ "پہلی بات" میں آپ نے نئے لکھنے والوں کے رویے اور اس کے حوالے سے ادب کی موجودہ صورت حال پر جس خوبصورتی کے ساتھ آپ نے روشنی ڈالی ہے وہ مجھ

فکر یہ بھی مہیا کرتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے لیے "تخلیق ایوارڈ" درست اور صائب فیصلہ ہے۔ ادب میں ان کی خدمات یقیناً قابلِ تحسین ہیں۔ اس مرتبہ ڈاکٹر سعادت سعید کا اقبال اور تصورِ آزادی، حسن عسکری کاظمی کا "فراق گورکھپوری" اور جاوید عباس جاوید کا "اردو مثنوی کا عروج و زوال" کے زیرِ عنوان مضمون پسند آئے۔ سید ریاض حسین زیدی نے "اردو کا لفظ کُل" کے حوالے سے دل سوزی کے ساتھ مضمون لکھا جو اربابِ بست و کشاد کے "اردو زبان کے لفظ" کے حوالے سے رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ غزلیں اور دیگر منظومات تقریباً تمام ہی اچھی ہیں۔ آپ نے اس ضمن میں معیار قائم کر رکھا ہے۔ وہ "تخلیق" ہی کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ درحقیقت اظہر جاوید مرحوم کے قائم کردہ معیار ہی کا تسلسل ہے جس میں جھول کا امکان ہے نہ گنجائش۔ اس کے لیے آپ اور آپ کی ٹیم ستائش کی مستحق ہے۔ ایک عدد نعت اور ایک غزل پیشِ خدمت ہے۔

شہباز انور خان (لاہور)

﴿12﴾ عزیزم سونان!

تم پہ رب کی رحمتیں بے کنار، بے شمار! کیا خوب کہی "پہلی بات" تم نے۔ جھلک ہوئی، دلیرانہ لہجے میں کچھ نشاندہی کرتی ہوئی۔ بڑے شاعروں ادیبوں کو بھی خوب سراہا دیا گیا۔ حمد، تحریر تمہاری گوشہ رشید امجد ترتیب دینے کے لئے مبارکباد۔ سحر ظہیلہ نے ڈاکٹر رشید امجد کا مفصل تعارف کروا دیا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا ڈاکٹر رشید امجد پر مضمون خاصے کی چیز ہے۔ محترم نسیم سحر نے دلچسپ انداز میں اپنی یادوں کی پٹاری کھولی ہے۔ آفتاب خان کی تحریر کا جواب نہیں وہ جو لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں۔ "تخلیق" میں ان کے لکھے ہوئے تبصرے لکھاری اور قاری کے درمیان ایک پل کا کام کرتے ہیں۔ آفتاب خان کی شاعری بھی بہت عمدہ ہے۔ جی خوش ہوتا ہے، اس نوجوان شاعر کی پختہ شاعری پڑھ کر۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے فراق گورکھپوری پر اچھا مضمون لکھا ہے۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ آمین! ڈاکٹر امجد پرویز نے ملکۂ ترنم نور جہاں کے شایانِ شان تحریر "تخلیق" کے قارئین کو دی ہے۔ جمیل احمد عدیل نے عبدالماجد دریا آبادی کی "آپ بیتی ایک مطالعہ" نے اس آپ بیتی کو پڑھنے کا شوق بڑھا دیا ہے۔ ماشاءاللہ 13 افسانے اس شمارے میں شامل ہیں جو "تخلیق" کی زرخیزی کا پتہ دیتے ہیں۔ سونان کی محبت کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنے ہر لکھنے والے سے رابطے میں رہتے ہیں اور انہیں لکھنے پر اکساتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں بہت خوب۔ پنجاب رنگ میں غلام حسین ساجد، حسین مجروح اور حلیم شہزاد نے شاعری کے رنگ بکھیرے ہیں۔ سرائیکی گوشے میں ہماری پیاری بشریٰ رحمٰن نے لفظوں کے موتی پروئے ہیں۔ اس بار تبصروں میں فیصل شہزاد موجود ہیں۔ محترم ناصر علی سید کی مضمون کہ "سرگوشی" پہ تبصرہ کیا۔ رشیدہ آفرین، ایم ڈی ملک اور محترم شہباز انور خان کی شکر گزار کہ میرے افسانے کو پسند کیا۔ آغا گل جیسے نامور افسانہ نگار کو افسانے کا عنوان پسند آیا!

تسنیم کوثر (لاہور)

﴿13﴾ محترم جناب سونان اظہر صاحب!

ماہنامہ "تخلیق" مناسب وقت پر موصول ہوا۔ آپ کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ ہر طرف ماہنامہ "تخلیق" کی روز افزوں شاندار

اشاعت کے چرچے ہو رہے ہیں۔ پورے ملک میں کوئی دوسرا شمارہ اب تک ماہنامہ "تخلیق" کے معیار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ اسے جذب و شوق کا مظہر ہے۔ موجودہ شمارہ اپنے تمام مضمولات کے اعتبار سے بہت بلند مقام پر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ اور ترقی کے اطوار میں بھی مرحوم اظہر جاوید کی روح متحرک محسوس ہوتی ہے۔ ہم ماہنامہ تخلیق اور تخلیق کے اشاعتی ادارہ کو اس کامیابی پر سلام پیش کرتے ہیں۔ جناب عالی آپ کا ادبی انہماک اور جوش تمنا سلامت رہے جس کی بدولت تخلیق ادبی ایوارڈ کا اجرا ممکن ہوا۔ اب تک یہ ایوارڈ ملک کے انتہائی نامور اور مخلص ادیبوں اور شاعروں کو مل چکے ہیں جو اپنے فیصلے کے لحاظ سے بالکل حقداروں کو ملے ہیں۔ جناب عالی! موجودہ ایوارڈ کے لئے بھی ایک انتہائی موزوں اور غیر متنازعہ شخصیت کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ یہ عالی مرتبت اور پسندیدہ ادبی شخصیت جناب ڈاکٹر رشید امجد صاحب کی ہے جن کا تعلق بھی ہمارے شہر راولپنڈی سے ہے جو ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ ہم اس زبردست روشن حقیقت پر مبنی فیصلے کی دل سے قدر کرتے ہیں اور سابقہ فیصلے کی طرح اس فیصلے کو بھی حق بہ حقدار رسید سمجھتے ہیں اور جناب ڈاکٹر رشید امجد صاحب کی خدمت میں بصد شوق ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ یہ ایوارڈ وہ صحت اور سلامتی کے ساتھ خود وصول کریں۔ انہیں مبارک ہو! جناب عالی! ڈاکٹر رشید امجد صاحب نے ادبی محنت شاق سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ وہ ایک قابل قدر شخصیت اور مجموعہ ادب و اخلاق ہیں۔ ایسا بلند مقام بہت خوش نصیب لوگوں کو زندگی میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ہم ان کو صدق دل سے دوبارہ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کی صحت اور سلامتی کے لئے دعا کرتے ہیں۔ جناب عالی! میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور میں اب سفر کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں، تاہم میری تمنا ہے کہ ایک بن بلائے مہمان کی حیثیت میں اس شاندار تقریب میں شمولیت کرتا اور مبارک باد کے یہ الفاظ اپنی زبان سے پیش کرتا۔ اس کے باوجود میں خود کو اس تقریب میں موجود پاتا ہوں اور اس شاندار اور پُرعظمت تقریب کے انعقاد پر آپ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آخر میں عرض ہے کہ میری یہ تحریر دراصل مرحوم اظہر جاوید کی روح کے لئے ہدیہ عقیدت ہے جن کی قدر و منزلت کا نام اب ماہنامہ "تخلیق" ہے۔

خالد عبداللہ وینس (راولپنڈی)

﴿14﴾ سونان اظہر بھائی!

"تخلیق" کا انتظار تو خیر رہتا ہی ہے مگر پرچہ ملنے سے دو دن پہلے پروفیسر عزیز محترم جمیل احمد عدیل کی پوسٹ فیس بک نظر سے گزری جس میں انہوں نے "تخلیق" کی تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ مالک اور سونیا ٹوٹر لے کا شکریہ ادا کیا تھا۔ جب تو انتظار کو دو چند ہونا ہی تھا مگر ہمارے سونان بھائی ہوئے زیرک ہیں اور ان کو کشمیر کے پہاڑوں میں بہتے ہوئے صاف وشفاف چشموں کے پانی کی برکت و افادیت کا پتہ ہے کہ اس پانی میں بھیگے ہاتھوں کو سونیا ٹوٹر کی بھلا کیا ضرورت۔ چنانچہ پرچہ 19 دسمبر 2020ء کو مسلسل چوتھے دن ڈاک خانے کا چکر لگانے کے بعد وصول کیا مگر سونیا ٹوٹر کے بغیر۔ پوسٹ مین صاحب نے جو شاید ہمارے بے موقع اور بلا وقت آمد سے اُکتا گیا تھا پرچہ حوالے کرتے ہوئے دبے الفاظ میں کہہ ہی دیا "صاحب! اتنا انتظار تو کوئی محبوبہ کے خط کا بھی نہیں کرتا جتنا آپ رسالے (تخلیق) کا کر رہے تھے۔" بہر حال تخلیق مل گیا۔ حسب سابق اس دفعہ بھی سونان بھائی نے افسانوں کی قطار سے مجھے باہر ہی رکھا ہے۔ وہ اتنا ہوا! "ٹو اتری" کا بورڈ لگا کر افسانوں والی قطار کے آگے جوان مردی سے کھڑے ہیں اور ساتھ ساتھ تخلیق چینل (باوجود کوشش کے میں ان قسمتوں

کے فیصلے کرنے والے صاحبانِ اختیار کو معلوم نہ کر سکا) کو بھی ڈھونڈ کے پکڑ کے کھڑا کر دیا ہے۔ نیک اور مختصر کہ مقصد ان سب کا ایک ہی ہے کہ بھائیو! اس بندے کو کسی بھی صورت افسانہ نگاروں کی قطار میں گھسنے نہیں دینا ہے مگر ہم ٹھہرے ضدی اور خودسر —— چنانچہ آس پاس میں ہی خود کو چھپے چھپے لگا کے رکھا ہوا ہے۔ وہ جس طرح کسی بادشاہ کے پاس ایک سائل نوکری مانگنے آیا تو بادشاہ سلامت نے فرمایا نوکری تو نہیں میرے پاس البتہ خود ہی کہیں جا کے لگ جاؤ۔ چند دن بعد بادشاہ کو شکایت ملی کہ راستے میں ایک بندہ بیٹھا ہوا ہے اور وہ لوگوں کو بادشاہ تک آنے نہیں دیتا جب تک کہ اسے پیسے (ٹیکس) نہ دیے جائیں۔ بادشاہ بڑا حیران ہوا اور ساتھ ہی اسے غصہ بھی بہت آیا کہ کون بے وقوف میری اجازت کے بغیر ایسا کر رہا ہے۔ جا کر دیکھا تو وہی شخص تھا جس کو حضور نے کہیں لگنے کا مشورہ دیا تھا اور جب ہی بادشاہ کا فرمان جاری ہوا کہ اے بندۂ خدا اب میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میرے ہی دربار کے باہر لگ جاؤ۔ بہرحال اب لگ گئے رہو! چنانچہ ہم بھی بس لگے ہوئے ہی ہیں۔ کبھی حصۂ غزل میں تو کبھی انجمن خیال میں اور کبھی کبھی طنز و مزاح میں۔ بس خود کو زبردستی جوڑے رکھا ہے "تخلیق" کے ساتھ۔ انجمن خیال سے پرچہ پڑھنے کا آغاز کیا۔ میرا دستور ہے کہ میں الٹی جانب سے آغاز کرتا ہوں۔ جھلے کی داد مشاعروں سے شروع ہوئی تھی۔ جس شاعر نے آپ کو داد دی جواباً اس کو داد دینا فرائض میں شمار ہوتا تھا۔ الحمدللہ ہم نے دیگر شعبوں کی طرح شعبۂ داد و تحسین میں بھی خوب ترقی کی۔ مشاعروں کی ریت روایت، فیس بک، مکھن سے نکل کر خطوط نگاری تک آ پہنچی ہے۔ داد دیں گے تو داد ملے گی۔ کم از کم ہم "تخلیق" کی حد تک تو اس غلط روایت کو ختم کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ ادب کی داد اور چھوٹا بڑا چھوڑ دیں اور جو بھی اچھا کام کرے اسے داد دیں۔ محترم ہارون الرشید تبسم صاحب نے اچھے لفظوں میں یاد کر کے میرا بہت حوصلہ بڑھایا۔ بہت شکریہ سر۔ ایم ڈی ملک صاحب اور آصف ثاقب صاحب نے میری تحریر کو پسند فرمایا ان کا بہت شکریہ اور نوازش۔ اپنی تحریر "شریکِ حیات" پڑھ کر دیکھ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ آخر اس مزاحیہ مضمون کے ساتھ کون سا حشر کر دیا گیا ہے۔ بہت سی سطریں بے ربط ہی نظر آئیں۔ غور کرنے پر پتہ چلا کہ اشعار کے وہ مصرعے جنہیں کٹھن تلاش و جستجو کے بعد ڈھونڈ ڈھانڈ کر لگایا تھا۔ "ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر"

انہیں عام عبارت کے اندر ٹھونس دیا گیا ہے اور اب پڑھنے والا حیران و پریشان رہ جاتا ہے کہ ابھی اگلی عبارت میں یہ جملہ کہاں سے اور کیسے آیا۔ واہ رے میرے سنگدل اور بے حس کاتب! کیا کہنے آپ کے —— !! "تخلیق" کا اصول ایوارڈ جیتنے پر ڈاکٹر رشید امجد صاحب داد اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بہت مبارک ہو ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب کے متعلق لکھے گئے مضامین خوب ہیں اور ان کی زندگی کے کئی پہلو اور ان کے ادبی کارنامے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید، تبسم سحر، ڈاکٹر غضنفر اقبال اور آفتاب خان کے مضامین ڈاکٹر رشید امجد کے فن اور شخصیت کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ افسانوں کے حصے میں اس دفعہ تیرہ افسانے شامل ہیں جن میں سے زیادہ تر روایتی موضوعات پر مبنی ہیں۔ سیج آجمہ صاحب کا افسانہ فنی لحاظ سے بہترین ہے مگر پیچیدہ ہے۔ ہم نے افسانے کو سمجھنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی مگر کچھ پلے نہ پڑا تو اپنی کم فہمی کا ماتم کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ آغا گل کا افسانہ اچھا لگا۔ اس کے علاوہ اسلم سحاب ہاشمی، خاقان ساجد اور اختر سعید مدان کے افسانے اچھے رہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب کا تبصرہ "تخلیق" پر طویل تبصرہ جامع اور بھرپور ہے۔ شکریہ قبول کریں ڈاکٹر صاحب۔ غزلوں میں اس دفعہ بڑے بڑے نام جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ آصف ثاقب، محمود شام، صابر ظفر، حسن عسکری کاظمی، غلام حسین ساجد، حسین مجروح، ممتاز راشد لاہوری، سلیمان خمار، گل صابری، ڈاکٹر عبدالعزیز

چشتی، ڈاکٹر نوفیہ مشتاق، طاہر منظور کی غزلیں دل کو چھوتی ہیں بلکہ نور جہاں کے فن سے متعلق دلچسپ اور معلوماتی تحریر ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے لکھا۔ اس مہینے اختتام کو پہنچی۔ کامیاب کوشش پر ڈاکٹر صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مضامین کے حصے میں اقبال، فراق گورکھپوری، اردو مثنوی، نقاد اور اردو سے متعلق ڈاکٹر سعادت سعید، حسن عسکری کاظمی، جاوید عباس جاوید اور سید ریاض حسین زیدی کے مضامین خوب ہیں۔ تخلیق ایوارڈ کے سلسلے میں سحر حقیقا نے ڈاکٹر رشید امجد کا مکمل تعارفی خاکہ پیش کیا ہے جو کہ بہت ہی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔

نظمیں، حمد و نعت، کتابوں پر تبصرے، علاوہ ازیں حسب معمول شامل ہیں اور خوب ہیں۔ یادیں کے زیر عنوان اسلم کمال کا ''قرطاس اور کینوس'' اختر کمال کے طور پر شامل ہے۔ اسی طرح جالندھر کے زیر عنوان محمود شام کا ''حنیف باوا کی کہانیوں کا سحر'' اور غلام حسین ساجد کا ''بجھ میر امجد کا سیج آہے'' اچھی تحریریں ہیں۔ جمیل احمد عدیل کی ''مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی آپ بیتی، ایک مطالعہ'' خاصے کی چیز ہے۔ شبہ طراز نے جواد جعفری کی نظم کا کامیاب تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ پرچے کے آخر میں انجمن خیال کے تحت قارئین کے خطوط کا مثبت اور تعمیری و تنقیدی سلسلہ کامیابی سے جاری و ساری ہے۔ تخلیق دسمبر 2020 ایک مکمل ادبی دستاویز ہے اور محترم ایڈیٹر سونان اظہر صاحب کی یہ بات حقیقت سے لگا کھاتی ہے کہ جو بڑے بڑے لکھاری تخلیق میں لکھنا اور اس میں شامل ہونا اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہیں۔ ''تخلیق'' میں نہ صرف قارئین کے لئے ادبی ذوق کا سامان موجود ہے بلکہ ادب کے طالب علموں کے لئے بھی بہت سا سرمایہ علم و فن موجود ہے اور وہ یہاں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔!!!

نور کمال شاہ (خیبر پختونخواہ) ....

﴾15﴿ گرامی قدر، محترم سونان اظہر صاحب!

دسمبر 2020ء کا ''تخلیق'' موصول ہوا جسے پڑھ کر ایک خاص ادبی چاشنی کا احساس ہوا۔ یہ ہمہ رنگ اصناف کا گلدستہ آپ کی دن رات کی انتھک محنت شاقہ کا نتیجہ ہے اور ادبی معیار کی کسوٹی پر سہرا اپنی اپنی جگہ چمک رہا ہے۔ پہلی بات میں جس طرح ادب کے خام مال شاعروں اور ادیبوں کو آپ نے آئینہ دکھایا ہے یہ ایک احسن اقدام ہے اور یہ حقیقت ہے آج جعلی قلم کار سستی شہرت کے آسمان پر جا بیٹھا کرتے ہیں۔ اس شمارے میں حمد و نعت کے حوالے سے حسن عسکری کاظمی اور ڈاکٹر ایوب ندیم کے کلام نے متاثر کیا۔ بشریٰ رحمن ایک معتبر نام ہے اس نام سے کون واقف نہیں لیکن ان کی نعت کے دو اشعار کا قافیہ درست نہیں۔ گوشہ رشید امجد پر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی نا قابل فراموش تحریر معلومات کا خزانہ ہے۔ پروفیسر رشید امجد سے گفتگو، ڈاکٹر مظفر اقبال کا مکالمہ زندگی، ادب، افسانہ پر مکمل گرفت کی ادب کے قارئین کے لئے خاصے کی چیز ہے۔ رشید امجد کی کہانی نے خواب دیکھا، آفتاب خان کی تحریر نے اپنی خوبصورت قلم کاری سے جکڑ لیا ہے۔ ایسی تحریریں پھر کہاں پڑھنے کو ملیں گی۔ فراق گورکھپوری پر حسن عسکری کاظمی کا مضمون گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اللہ کرے حسن قلم اور زیادہ۔ باقی حصہ مضامین میں۔ سید ریاض حسین زیدی، جاوید عباس جاوید کے معلوماتی مضامین خوب ہیں۔ افسانے میں سیج آہے، آغا گل، محمد طارق علی، وحشی سعید اور اختر سعید مدان کے افسانے نے تو ایک دل پر کسک چھوڑ دی ہے اور قاری اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔ حصہ غزلیات میں انور شعور، خالد اقبال یاسر، گل صابری، صابر ظفر، محمود شام، حسین مجروح کے اشعار شعور و فکر کے بند دریچے

کھول دیتے ہیں۔ ان شعرا کی غزلیں جدیدیت اور روایت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا سلسلہ ترنم نور جہاں پر مضمون موسیقی کے شائقین کے لیے بڑا ہی دلچسپ رہا۔ موسیقاروں کے بارے میں معلومات پہنچا گئیں۔ ڈاکٹر صاحب خود بڑے زیرک دماغ ہیں۔ موسیقی کے اسرار و رموز کو خوب سمجھتے ہیں۔ گیتوں کے حوالے سے مادام کا ایک گیت "جس دن سے پیا دل لے گئے"۔ اس کو راگ میاں کی ملہار کی بندش لکھا گیا ہے حالاں کہ یہ سدا بہار گیت (راگ ٹوڈی میں ہے) ڈاکٹر صاحب خود تحقیق کر لیں۔ خواجہ خورشید انور موسیقار کے فلمی گیت روح اور دل کو چھونے والے ہیں۔

ماجد وفا عابدی (گوجر خان)

﴿16﴾ مکرمی و محترمی جناب سونان اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون! ماہنامہ "تخلیق" لاہور کا ماہ ستمبر 2020ء کا شمارہ حسب معمول ایک انتخابی تخلیقی اکمل کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ تخلیق پینل کی تشکیل تو ایک احسن اقدام ہے جہاں تک پرچے کی قیمت میں معمولی اضافے کا تعلق ہے تو ہر ادب پرور اور ادب نواز اس مہنگائی کے دور میں اس سے اتفاق کرے گا اور ادارے کی ہدایت کے مطابق اپنی تحریریں بذریعہ ڈاک ارسال کرنے کا بھی پابند ہوگا۔ یہ نہ صرف تخلیق بلکہ ہر جریدے کی طرف سے اپنی کتب برائے تبصرہ کی دو دو جلدیں روانہ کرنے پر زور دیا جاتا ہے لہٰذا امید ہے اپنی کتب روانہ کرنے والے احباب اس کی پابندی ضرور فرمائیں گے۔ میرے خیال کے مطابق ادب سے ہٹ کر ملکی حالات پر آپ کا تبصرہ نہ صرف نہایت درست اور متوازن ہے بلکہ ہر قاری کے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو قومی سطح کے ایوارڈز سے نوازنے کا حکومتی فیصلہ بھی نہایت خوش آئند ہے اور سب اعزازات حاصل کرنے والے احباب بھی یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ادارہ "تخلیق" نے "تخلیق ایوارڈ 2020ء" کے لئے جو 5 عدد ادیب 5 عدد نامور احباب کا انتخاب کر کے ان میں سے ایک کا چناؤ باہمی رضامندی سے کریں گے ان کے علاوہ قارئین کو بھی رائے سے آگاہ کرنے کا حق دیا گیا ہے جو ایک جمہوری قدم ہے۔ امید ہے کہ اس ایوارڈ کے لئے بھی ایک اہم اور نامور ادبی شخصیت کا ہی نام چنا جائے گا جیسا کہ قبل ازیں دیے گئے آٹھ عدد ایوارڈز میں ہوا۔ تخلیق کے حمد و نعت کے باب کو ڈاکٹر محمد اقبال صمصام، امین راحت چغتائی اور سید مبارک علی چشتی کی تخلیقات نے خوب مہکا دیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی نایاب غیر مطبوعہ تحریر واقعی اہم اور بیش قیمت ہے۔ جس انداز سے انہوں نے مختصر الفاظ میں حفیظ جالندھری کی ذات اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شاہنامہ اسلام نظم اور قومی ترانے کی تخلیق نے انہیں حیات جاوداں عطا کی ہے۔ انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیت سے غزل، گیت اور نظم تینوں اصناف کو قادر الکلامی سے جدت آشنا کیا۔ وہ فطری شاعر تھے تو جوان اس دور میں ان کے شیدائی ہو گئے۔ "نغمہ زار"، "سوز و ساز" اور "تلخابۂ شیریں" ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کی آخری کتاب "چیونٹی نامہ" ہے جسے معلومات افزا کتاب کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے مختصر لیکن موثر انداز میں ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کا ایک مختصر مضمون جو ہم سب کے لئے ایک چشم کشا حقیقت ہے۔ بقول ان کے ہم اقبال کو مفکر اسلام اور مصور پاکستان مانتے ہیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو اقبال کی بات ماننے کی بجائے علمائے کرام کے فتوؤں میں راہ فرار ڈھونڈتے ہیں۔ اگست سینتالیس میں

اسلامیانِ ہند نے پاکستان کے نام سے ایک خطۂ ارض حاصل کیا تھا اس کو ارضِ پاک کا رتبہ صرف اسی وقت ملے گا جب ہم اس خطۂ پاک پر علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصورات کا انقلابی معاشرہ قائم کر کے عمل کا آغاز کریں گے۔ کارٹون اور کارٹونسٹ کا فن (صحافتی ادب کے حوالے سے) یہ ہے خالد عبداللہ بٹ کا مختصر مگر جامع مضمون جس میں اس فن پر نہایت عمدہ پیرائے میں بات کی گئی ہے۔ ''غزل کے بانکپن کا شاعر'' اظہر جاوید کی نایاب غیر مطبوعہ تحریر ہے جو قارئین کے لئے انتہائی کارآمد دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول اُن کے بشیر بدر غزل کی توانا آواز ہے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں غزل کو بانکپن اور لہجہ دیا۔ اس میں امکانات پیدا کئے ہیں۔ خوشبو، پھول، چاند، بارش اور روشنی بشیر بدر کے مرغوب الفاظ ہیں۔ غزل کی روایتی لفظیات بھی ان کے کلام میں ہیں۔ مگر یہ الفاظ نمایاں طور پر گونجتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں: اگر حوالے دینا چاہوں اور شعر درج کرنا چاہوں تو بشیر بدر کا ذکر پھیلتا جائے گا اور دیر تک قلم لکھنے کا نہ پڑھنے والے کا جی اکتائے گا۔ یہ تحریر اردو ادب میں غزل کے رسیا اور شناسا حضرات کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ''تخلیق'' کے موسیقی کے باب میں ڈاکٹر امجد پرویز کا مضمون بہ عنوان ملکۂ ترنم نور جہاں ایک لیجنڈ ۔۔۔ 5'' میں انہوں نے نور جہاں کے صدہا گانوں کا ذکر مختلف موسیقاروں رشید عطرے، وزیر علی، سلیم اقبال، وجاہت عطرے، نذیر علی وغیرہ اور نور جہاں کی غزلیں برائے پی ٹی وی پروگرام ''ترنم'' میں فلموں اور گانوں کے مختلف مناظر میں نہایت کامیاب اور دلکش تاثر پیش کرتے ہوئے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا علم نور جہاں، موسیقاروں، فلموں اور گانوں کے تخلیق کاروں سمیت ریڈیو اور فلم انڈسٹری کے عیاں اور نہاں پہلوؤں کے بارے میں اس قدر مکمل ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انسائیکلوپیڈیا کا وجود رکھتے ہیں۔ اس فیلڈ میں ان کا ہم سر ہونے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ''تخلیق'' کے نظم کے باب میں بعنوان اظہر کے لئے فراست بخاری کی نظم امجد اسلام امجد، بشریٰ رحمٰن، آ ساتھ کنول کی نظمیں خوب ہیں۔ غزلوں میں امین راحت چغتائی، امجد اسلام امجد، آصف ثاقب اور نسیم سحر کی غزلیں معیاری ہیں۔ اگرچہ بعض دوسری غزلوں میں بھی اشعار دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ افسانوں میں ڈاکٹر رشید امجد کا ''بہتا پانی''، عذرا اصغر کا طوفان اور تسلیم کوثر کا ''جاپانی سے بندھی عورت'' کا حصہ ہے۔ میری غزل اور خط شامل اشاعت فرمانے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔

رشید آفریں (سیالکوٹ)

﴿17﴾ محترمی و مکرمی سلام مسنون!

ستمبر 2020ء کا ''تخلیق'' موصول ہوا۔ اس میں آپ نے دو ہرتی کا لکھا اور میرا ترجمہ کیا افسانہ ''سنرزو ہیری'' شائع کیا۔ آپ کا بہت شکریہ! حمد و نعت حسبِ روایت روح کو تازگی بخشتا ہے۔ امین راحت چغتائی کی نعت کا یہ شعر دل کو معطر کرتا ہے:

جب درودِ مصطفیٰ سے گونجتا ہے گھر مرا — دل کے آنگن میں مہک اٹھتے ہیں مدحت کے گلاب

اور سید مبارک علی شمس کا یہ شعر خاص ہے:

ہوتی نہ مستجاب کیوں مانگی ہے جو دعا — مانگی دعا ہے آپ کے نعلین چوم کر

"مضامین" میں: ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر فتح محمد ملک اور حسن عسکری کاظمی کی تحریریں ان کی محنت شاقہ پر دلیل ہیں۔ باقی ادبا کی تحاریر کسی طرح کمتر ہیں۔ "منظومات" میں: امجد اسلام امجد، بشریٰ رحمان اور توقیر مشتاق نمایاں ہیں۔ انجم جاوید اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ افسانوں میں: ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ "محبت اور بہتا پانی" آغا گل "کاشوم کا مال" محمد طارق علی کا "فلاور باسکٹ" نمایاں ہیں۔ باقی افسانے زیر مطالعہ ہیں۔ غزلوں میں امین راحت، امجد اسلام امجد، آصف ثاقب، محمود شام، تسنیم سحر، ممتاز راشد لاہوری اور انجم جاوید متاثر کرتے ہیں۔ باقی شعرا بھی اہم ہیں۔ موسیقی پر ڈاکٹر امجد پرویز کی دسترس کسی **Emphasis** کی محتاج نہیں۔ ان کا مضمون "ملکۂ ترنم نور جہاں۔ ایک لیجنڈ (5)" پُر مغز ہے۔ آخر میں ایک گذارش! میرے مختصر تعارف میں "مزمّی کا دیا" کی بجائے "مری کا دیا" لکھا جا رہا ہے۔ براہ کرم تصحیح کر لیں۔ شکریہ

محمد اسلم (لاہور)

{18} عزیزم سوہان اظہر صاحب!

اس بار دسمبر 2020 کے شمارے کے ہمراہ آپ کا تحفہ دو عدد فیس ماسک کی صورت میں موصول ہوا۔ فیس ماسک چھوٹے نفیس اور خوبصورت تھے اور ان پر آپ کا اور تخلیق کا نام بھی پرنٹ تھا چنانچہ میں نے یہ فیس ماسک آپ کا تحفہ اور کورونا کی نشانی سمجھ کر محفوظ کر لئے ہیں۔ ہماری صحت اور سلامتی کے لئے آپ کی یہ پرخلوص پیشکش بے حد قابل ستائش ہے۔ بے شک کرونا سے جہاں ملک کے دیگر تمام شعبے متاثر ہوئے ہیں وہاں ہمارے ادب میں بھی کرونا نے زبردستی قدم جمالئے ہیں۔ اسی دسمبر کے شمارے میں ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے کرونائی قطعات پڑھنے کو ملے۔ سابقہ شمارے میں میری نظم لاک ڈاؤن اور دیگر شاعروں کی کرونائی نظمیں پڑھنے کو ملیں۔ اگر ہم کرونا کا ذکر ادب میں لائیں گے تو لوگ اس کی حقیقت اور ہولناکیت سے آگاہ ہو سکیں گے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر رشید امجد کے بارے میں تفصیلی معلومات اور ان کی تخلیقات سے آگاہی ہوئی۔ جب میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم۔ فل کا طالب علم تھا تو ورکشاپس میں مجھے ان کی تقاریر سننے کا موقع ملا تھا۔ اب ان کی زندگی اور فن کے بارے بہت کچھ پڑھ کر ان کی جدوجہد سے آگاہی ہوئی۔ میڈم نور جہاں کے بارے میں فلمی شاعری اور موسیقی کے حوالے سے دلچسپ معلومات پر مبنی مضمون کی آخری قسط پڑھ کر اس میں پردہ آواز کی بازگشت تادیر گونجتے رہنے کا احساس ہوا ہے۔ کشمیر کی آزادی سے متعلقہ محمد شعیب مرزا کا افسانہ "کشمیر بنے گا پاکستان" اور پانی کی قلت سے متعلقہ مسرت کلانچوی کا افسانہ "اب پانی نہیں" دونوں کی بہت خیال انگیز افسانے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے بارے میں جمیل احمد عدیل کا معلوماتی مضمون بہت جاندار تھا۔ منظومات اور غزلیات کا انتخاب بے حد متاثر کن تھا اور ماحول و زمانی تقاضوں کے مطابق بھی تھا۔ اردو مثنوی کے عروج و زوال سے متعلق میرا مضمون شامل اشاعت کرنے پر شکر گزار ہوں۔ بہر حال تخلیق میں شامل مواد دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر شمارہ واقعی ایک تخلیق ہے جس میں بہت سے قلمکاروں کی ادبی کاوشوں کا انتخاب شامل ہے۔ اس سلسلے کو حسب روایت جاری رکھئے اور اسے ادبی تاریخ کا روشن گوشہ بنانے کی طرف ہمارا آپ کا ارتقائی سفر جاری رہے گا۔ نگارشات کو میل کے ذریعے بھیجنے اور وصول کرنے کا فیصلہ مستحسن اور وقت کے مطابق ہے۔ اس میں ہمارا فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ سے لکھنا وقت طلب کام ہے اور اس میں اغلاط کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کمپوز کرنا آسان ہے اور اس میں ڈاک خانے کے جھنجھٹ سے بھی جان چھوٹ جاتی ہے۔ آپ کا فائدہ یہ ہے کہ اغلاط سے پاک کمپوز شدہ

سواد آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ چوری شدہ اور یاسی تحقیقات کو روکنے کے لئے دیگر اقدامات اور ذرائع استعمال میں لائے جا سکتے ہیں۔

جاوید عباس جاوید (بھکر)

﴾19﴿ سوہان اظہر صاحب!

"تخلیق" کا ماہ ستمبر 2020ء کا خوبصورت شمارہ موصول ہوا۔ دل کش اور جاذب نظر سرورق نے دیر تک اپنے طلسماتی حصار میں بند رکھا۔ خوشنما پرندوں میں رنگوں کی بہار دیکھی۔ نسوانی حُسن کا نظارہ کیا۔ نرگسی رنگ نے دل موہ لیا۔ آسمانی رنگ نے دل لوٹ لیا۔ ویسے بھی آسمانی رنگ فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ دل مسرور ہوا۔ "تخلیق" میں عمدہ تحریروں کا ہر ذائقہ موجود تھا۔ مجلس تخلیق اہل علم وقلم اور بے بدل تخلیق کاروں کی کہکشاں سے سجی ہوئی تھی۔ عمدہ اور معلومات افزا مضامین زرخیز ذہنوں کی پیداوار تھے۔ نعتیں حب رسولؐ میں ڈوبی ہوئی، شاعری واردات قلبی اور گہرے مشاہدے میں ڈھلی ہوئی اور افسانے معاشرتی زندگی کے عکاس تھے۔ ہر تحریر نے دل ودماغ کو معطر کیا گویا گلشن تخلیق میں کھلائے رنگ رنگ کی بارات تھی۔ ہر قاری کے لئے سوغات تھی۔ انجمن خیال میں بھی دل خوب لگا۔ تنقیدی شعور کی آبیاری ہوئی۔ "ادبیات" میں اصولوں اور روایتوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہی اصول اور روایت دراصل انسانی زندگی کا حُسن ہیں۔ یہ مردوں کا زیور ہے۔ سچ بولنا، حق بات کہنا، غیرت اور جرأت مندی سے زندگی بسر کرنا ایک بہترین اور صالح معاشرے کی پہچان ہیں۔ خوش نصیب لوگوں کو ہی یہ سعادت حاصل ہوتی ہے کہ وہ شمع بن کر اندھیروں میں اجالا کرتے رہیں۔ سوہان صاحب! کون کون سا رونا روئیں گے؟ حدیث مبارک ہے کہ خاموشی میں نجات ہے۔ کس کس کو سمجھائیں گے؟ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ وقت اور ذمہ داری کا احساس کسی میں نہیں رہا۔ ہم ناقابل اصلاح ہو چکے ہیں۔ ہم لوگوں کا احساس مردہ ہو چکا ہے اور اجتماعی قبر میں دفن ہو چکا ہے جس پر تخریب کے میدانوں کی طرح خاردار جھاڑیاں اگ چکی ہیں۔ ایسے میں بعض صاحب علم وکمال اور اپنے فن میں ماہر بزرگوں کی موجودگی باعث برکت ہے۔ یہ روشن شمعیں ہیں۔ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ان کے ناز اٹھانا ہمارا فرض ہے۔ آپ بھی اٹھائیے۔ ان کے دم سے ادبی محفلیں آباد ہیں۔ یہ لوگ ہی "تخلیق" کی زینت ہیں۔ آپ نے ملکی حالات کا جائزہ خون دل سے ذکر کیا ہے اور اپنے قلبی کرب کا اظہار کیا ہے۔ عقل وشعور رکھنے والے صحیح معنوں میں زندہ اور بیدار لوگوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ ملک وقوم سے محبت کا یہی تقاضا ہے کہ اس کے لئے انسان کڑھتا رہے۔ اس کی فلاح وبہبود اور تعمیر وترقی کے لئے فکر مند رہے اور اپنی بساط کے مطابق اس نیک عمل میں اپنا حصہ ڈالتا رہے نہ کہ اپنے ہی ہاتھوں اپنا گلشن لوٹتا رہے اور مالی بن کر ایک غارت گر کا کردار ادا کرتا رہے۔ ہمارے ملک میں مخلص اور سچی قیادت کا فقدان ہے۔ ہر لیڈر صرف اپنی پوائنٹ سکورنگ میں متحرک نظر آتا ہے۔ بعض سیاست دان تو بد عنوانی اور رذائل اخلاق سے بہت ہیں۔ ان سے خیر کی توقع رکھنا حماقت ہے۔ ان کے نزدیک ان کی قوم ان کے افراد خانہ اور عزیز واقارب ہیں اور ملک سے مراد ان کے وسیع وعریض رقبے پر پھیلے ہوئے محل نما گھر ہیں۔ پھر بھی یہ بھوکوں مرتے ہیں، سیر نہیں ہوتے۔ آخر میں اپنے ہی اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

رہزن ہیں گلشن کے مالی   دیس مرے کا اللہ والی

محمد اقبال صمصام (مردان)

﴿19﴾ محترم جناب سونان اظہر صاحب!

احوال واقعی یہ ہے کہ میرا بڑھاپا اور بڑھاپے کی تکالیف کا زور بڑھ گیا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں نے فی الحال لکھنا پڑھنا موقوف کر دیا ہے۔ جناب عالی! جو مضامین میں نے پہلے لکھ رکھے ہیں، وہ وقتے وقتے سے آپ کی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔ اگر وہ قابلِ اشاعت ہوں تو آپ ان پر نمبر لگا دیں۔ یہ آپ کی مہربانی ہے۔ جناب عالی! آپ نے اس ناچیز کو بھی اپنے عالمی شہرت یافتہ ماہنامہ ''تخلیق'' کے لکھاریوں میں شامل کر دیا ہے۔ یہ آپ کی از حد مہربانی ہے۔ ورنہ میرا شمار نہ تین میں ہے اور نہ تیرہ میں۔ یہ صرف آپ کی نظرِ کرم ہے۔ جس کا مجھے مکمل احساس ہے۔ امید ہے آپ کی یہ مہربانی آئندہ بھی جاری رہے گی۔

خالد عبداللہ (راولپنڈی) ....

﴿20﴾ جناب سونان اظہر جاوید صاحب!

اُمید ہے آپ کے اہلِ خانہ اور اہلِ تخلیق بالکل خیریت سے ہوں گے۔ ''تخلیق'' ماشاءاللہ وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتا جا رہا ہے۔ آپ بھی اس کے بناؤ سنگھار میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے اور اصل بات یہ کہ اس کے معیار کو بھی قائم و دائم رکھا ہوا ہے۔ روایات سے جڑے رہنا بھی بہت اچھی بات ہوتی ہے تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ''استخارہ'' کر کے اور دوستوں کی مشاورت سے اگر مناسب تبدیلیاں لائی جائیں جیسا کہ آپ کر رہے ہیں تو بہت اچھی بات ہوتی ہے۔ اظہر جاوید صاحب کی یاد کو زندہ رکھتے ہوئے آپ ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں بلاشبہ لائقِ تحسین ہے کیونکہ ہمیں احساس ہے کہ یہ کس قدر جان جوکھوں کا کام ہے جو کہ محض ثواب کے لئے کیا جا رہا ہے۔ ہماری پہلی کتاب ''انوکھا لاڈلا'' 1994ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ہماری آپ بیتی تھی اور ہمارے لئے اعزاز کی بات ہے کہ اس پر تبصرہ ''تخلیق'' میں شائع ہوا تھا۔ بعد کی کتابوں کی اشاعت پر بھی اظہر جاوید صاحب اور اب آپ ایسی مہربانی فرماتے رہتے ہیں۔ ''انوکھا لاڈلا'' ہماری پیدائش سے 1990ء (جھنگ واپس آنے تک) کا قصہ تھا۔ اب یہ جھنگ میں بطور سرجن تعیناتی 1990ء سے بطور چیف سرجن ریٹائرمنٹ تک کا حساب ''کھیلن کو مانگے چاند'' کی صورت میں (1006 صفحات پر مشتمل) شائع ہوا ہے۔ وہی ہلکا پھلکا اسلوب ہے جسے قارئین نے بہت پسند کیا تھا۔ ایک کاپی آپ کی خدمت میں اور ایک محترم تبصرہ نگار کے لئے حاضر ہے۔ اُمید ہے اس ہماری مجرم کتاب کو پڑھ کر کوئی نہ کوئی دوست تبصرہ لکھ کر ثواب دارین حاصل کرے گا۔ یہ اس ناچیز کی 21ویں کتاب ہے۔ 6 پنجابی میں جب کہ 15 اُردو میں ہیں۔ لگے ہاتھوں ایک ہلکا پھلکا مضمون بھی تخلیق کے لئے حاضر ہے۔ ''کرونا'' کی صورت میں جب اور جہاں مناسب سمجھیں جگہ عطا کر دیجئے گا۔ آپ نے ماشاءاللہ ایوارڈز کا سلسلہ شروع کرنے کے احسن قدم اٹھایا ہے اور یہ حق دار تک بھی پہنچ رہا ہے۔ اب تو اللہ کے فضل سے ہندوستان کے رسائل میں بھی تخلیق کی تقاریب کی تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔ یہ آپ کے جہدِ مسلسل کا ثمر ہے۔ (اس بار آپ نے جو مردوزن کے لئے نقاب (ماسک) فراہم کیے ہیں وہ دیکھ کر اور وصول پا کے اچھا لگا۔ اُمید ہے آپ سب دوست اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

ڈاکٹر محسن مگھیانہ (جھنگ)

◆◆◆

ماہنامہ ’تخلیق‘ کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اسی لیے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگِ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ الشرف کراچی ایڈیٹر: محمود شام 0300-8210636	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ: آغا امیر حسین 0300-8440444
ماہنامہ محاسنِ گل لاہور مدیر اعلیٰ: قاری ساجد نعیم 0322-4105048	ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: عارف محمود 0323-4329344	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844
ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8430043	سہ ماہی خیال و فن لاہور مدیر اعلیٰ: ممتاز راشد لاہوری 0331-4387871	دوماہی [illegible] ڈائجسٹ لاہور مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ 0333-4377794
سہ ماہی گلزار سرگودھا مدیر: صدف فاطمہ 0301-6791402	ماہنامہ ہمدرد صحت کراچی مدیر اعلیٰ: سعدیہ راشد 021-36610039	ماہنامہ ارژنگ لاہور مدیر: حسن عباسی 0300-4489310

ماہنامہ ’تخلیق‘ کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	ساحلوں سے دور گلے	اعظم ملک	0300-8478483	کتاب پبلشرز	300/-
2	لاریب (ناول)	اقبال نوال	0304-6474843	الحمد پبلشرز لاہور	350/
3	چاند سے آگے قدم ہو	جسارت خیالی	0336-6467822	رنگِ ادب پبلی کیشنز	300/-
4	سب سے آگے	سرمد صہبائی	0333-4344716	دستاویز مطبوعات	600/-
5	داستان ہونے کے بعد	شیخ خالد	0333-4344716	دستاویز مطبوعات	500/-
6	سیڑھی سے ادھوری ملاقات	سیما پیروز	0333-4344716	دستاویز مطبوعات	500/-
7	محورِ دو جہان	نسیم سحر	0333-5415091	فریاد پبلی کیشنز	650/-
8	قرۃ دوا	ماجدہ وفا عابدی	0322-5359600	وارث پرنٹرز گوجر خان	300/-
9	گلستان کو ملے گے چاند	ڈاکٹر محسن مگھیانہ	0333-6732291	نگری پبلی کیشنز	2500/-
10	دعوتِ شیراز	حسین احمد شیرازی	0423-7228143	سنگِ میل پبلی کیشنز	800/-
11	اسوۂ رسول امینؐ	سید ریاض زیدی	0331-4713208	القلم تحقیقی مرکز (رجسٹرڈ)	600/-
12	جانا ہوتا ہے	رشید امجد	042-3786210	عمر پبلی کیشنز	600/-

نوٹ: تبصرے کے لیے ہمیشہ ادارے کو دو کتب ارسال کریں کیوں کہ بھیجی گئی ایک کتاب پر ادارہ ”تخلیق“ تبصرہ شائع نہیں کرتا۔ (ادارہ ”تخلیق“)

تخلیق ایوارڈ 2020 "ڈاکٹر رشید امجد"

اطلاع عام

2013، محترم شفیق عقیل صاحب

2020 "ڈاکٹر رشید امجد"

[illegible] صاحب

2014، محترمہ [illegible] صاحبہ

2015، محترمہ [illegible] جہاں صاحبہ

قارئین "تخلیق" آپ
سب احباب سے مخاطب ہوتے ہوئے
ایک حوالے سے اطلاعی گفتگو ہو رہی ہے۔
آپ جانتے ہیں اب "تخلیق" اور سالانہ ایوارڈ
تقریب لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس سال
بھی بانی مدیر اظہر جاوید کی برسی کے موقع پر مذکورہ ایوارڈ
تقریب کا انعقاد 14 فروری کو طے شدہ تھا لیکن کورونا کی آفت
نے زندگی کو قدرے بے یقین کر دیا ہے۔ ان شاء اللہ ۔۔۔۔
البتہ حتمی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے یہاں بطور تحدیث
نعمت یہ ذکر کیا جائے گا کہ "تخلیق" ایوارڈ کسی رسمی روایتی ایوارڈ کا نام
نہیں ہے۔ گزشتہ آٹھ برس سے ہر سال یہ ایوارڈ ملک کے کسی ایک
نامور ادبی شخصیت کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جس کا تعین ایک غیر
جانبدار جیوری کرتی ہے اس مرتبہ جیوری ان ناموں پر مشتمل تھی جناب
نسیم سحر، جناب آغا گل، جناب ہارون الرشید تبسم، جناب [illegible]،
جناب [illegible] منصفین نے 2020 کے "تخلیق ایوارڈ" کے
لیے ممتاز فکشن رائٹر اور نقاد ڈاکٹر رشید امجد صاحب کا چناؤ کیا۔
ادارے کی طرف سے تمام تیاریاں مکمل تھیں کہ قضائے
الٰہی نے ڈاکٹر رشید امجد کو اتنی مہلت نہ دی اور وہ دنیائے فانی
سے کوچ کر گئے جس کی وجہ سے وقتی طور پر اس تقریب
کو ملتوی کرنا پڑا ادارہ تخلیق اس تقریب کو بھرپور
طریقے سے منعقد کرنے کا اعلان جلد
کرے گا۔

2016، محترمہ [illegible] صاحبہ

2017، محترم حسن عسکری کاظمی صاحب

2018، محترمہ [illegible] صاحبہ

2019، محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ

آپ کا دوست

سونان اظہر جاوید (مدیر ماہنامہ "تخلیق")

CS CamScanner

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE
MARCH 2021

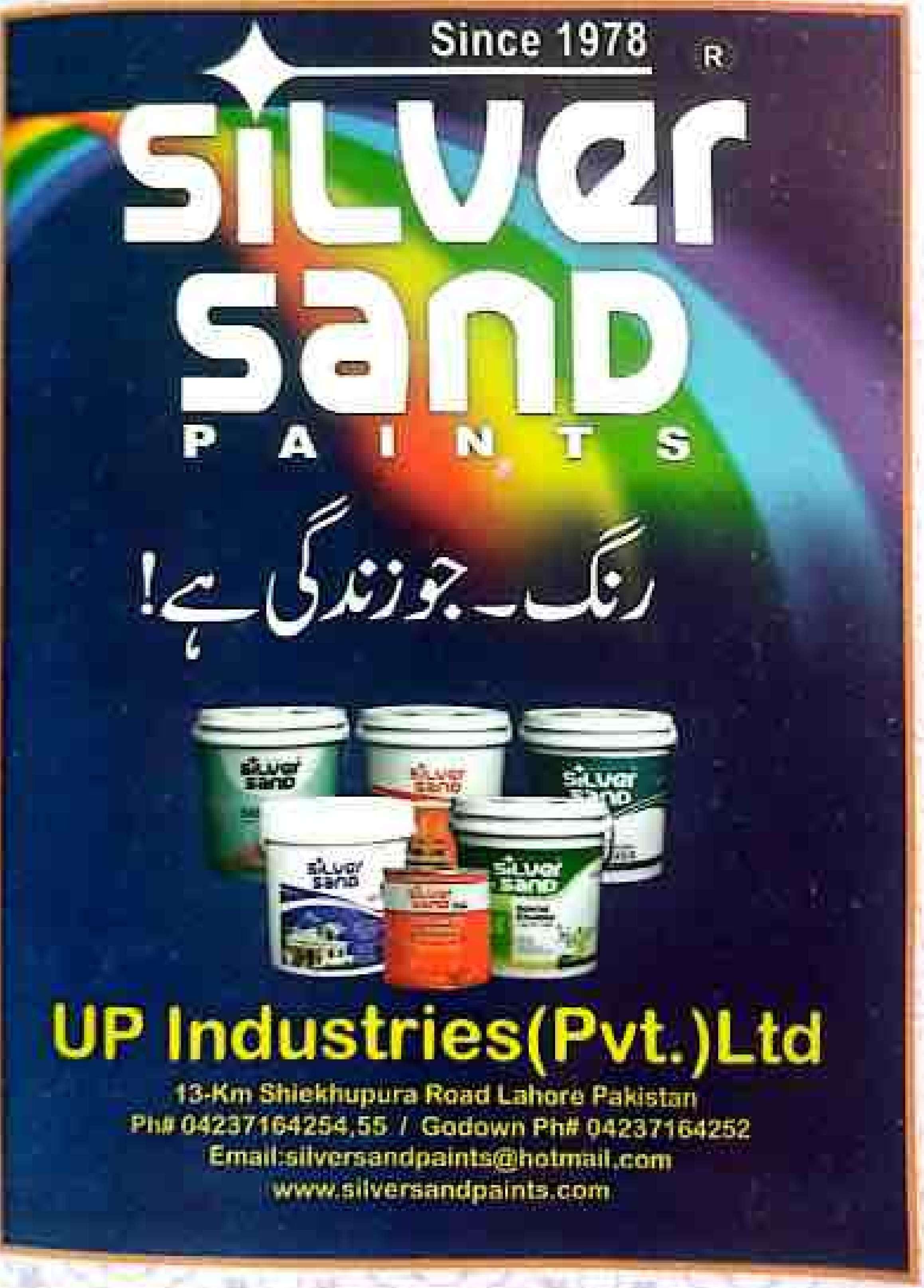

CamScanner

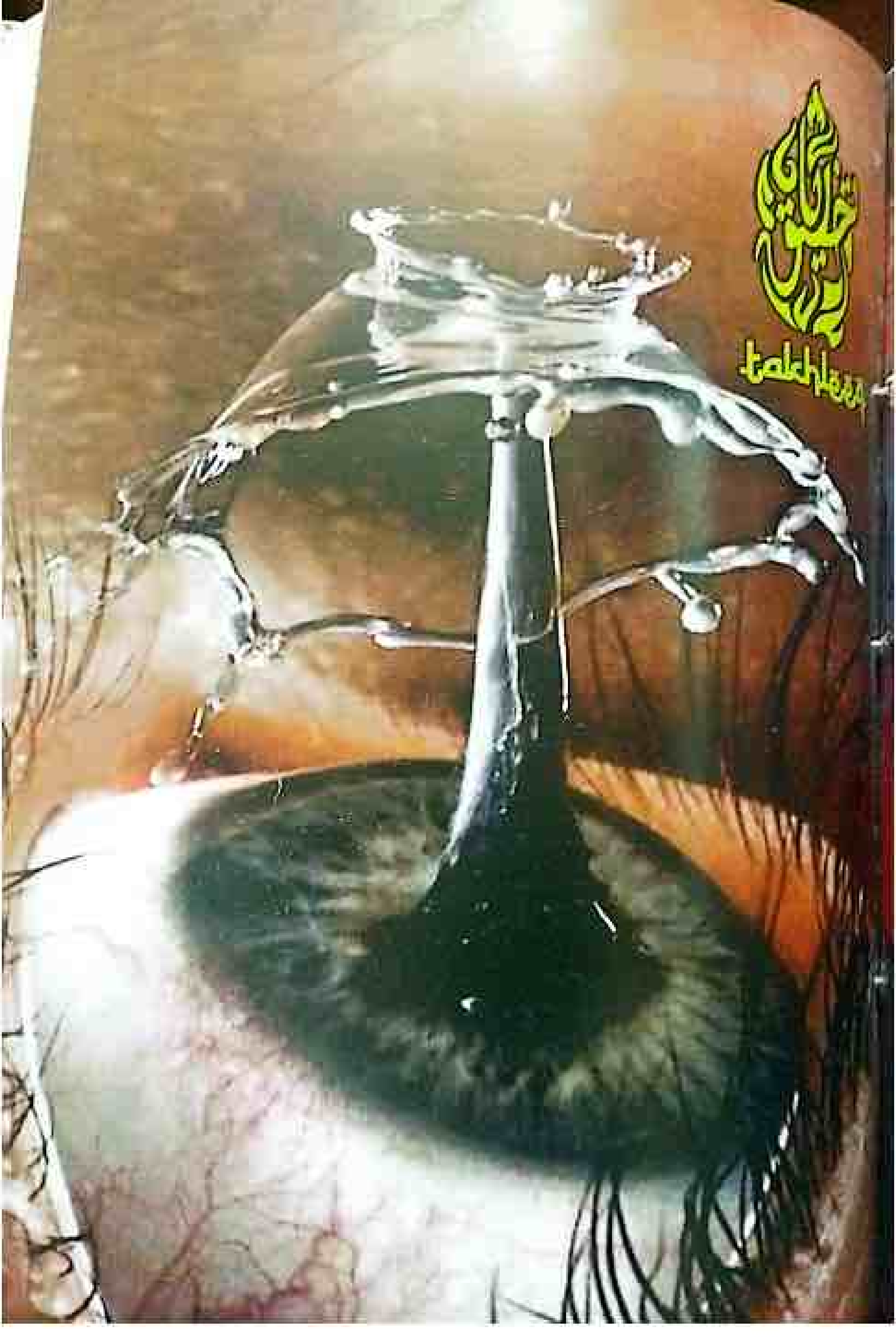

CamScanner

ممتاز شاعر، ادیب اور "ماہنامہ تخلیق" کے مدیر

اظہر جاوید

کی مطبوعات جن پر انہیں 2012 میں "پرائیڈ آف پرفارمنس" دیا گیا

جناب اظہر جاوید اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب، مشہور شاعر اور معروف صحافی ہیں۔ آپ جنوری 1938 میں سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ آپ ... اس وقت لکھنا شروع کیا جب ابھی آپ سترہ سال کے تھے۔ سرگودھا میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے دوران آپ نے بعض ہفت روزہ اخبارات (ضربِ مجاہد، رفیق) کی ادارت کی۔ آپ نے مشہور شاعر جناب الطاف مشہدی کی مدد سے ہفت روزہ "نقوش" کا آغاز کیا۔ اس کے ... آپ نے روزنامہ "امروز" میں ادبی صفحے کے انچارج کے طور پر شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی آپ نے ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کام ... شروع کر دیے۔ 43 سال تک مدیر کے طور پر ادبی جریدے "تخلیق" کی بے لوث ادارت کرتے رہے۔ بطور شاعر اور ادیب بڑی تعداد ... آپ کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کو ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی جانب سے متعدد بین الاقوامی انعامات ملے ہیں۔

CamScanner

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

مسلسل اشاعت کا 52 واں سال

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 51 | ستمبر 2021ء | شمارہ : 9 | CPL نمبر 96

قیمت : -/350روپے .... 1,600روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100ڈالر — ہندوستان کے لیے 2,000روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt. (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نشیر جہاں (امریکہ) — ڈاکٹر توقیر مشتاق (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید اظہر (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب وتدوین اور طباعت واشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رواں رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''عصریہ''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

52 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون سے ہی ممکن ہوئی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون مجھے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے اعزازی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ڈاکٹر فوقیہ مشتاق، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف -/2,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.	U.K.	INDIA	PAKISTAN
Nayyar Jahan	Fouzia Mushtaq	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
2790 South Barrington	5 Sutherland Court	5-4-Connaught Circus, New	78-[illegible] Block, Azam Garden
AVE Los Angeles	River Side Radlie	Delhi-110001, India	Multan Road, Lahore
C.A. USA	Island	Ph: [illegible]	Ph: [illegible]
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Email: [illegible]	Cell: [illegible]
Email: [illegible]	Email: [illegible]		Email: [illegible]
[illegible]			

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات	سونان اظہر جاوید	5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ	خالد اقبال یاسر	7
نعت رسول مقبولؐ	حسن عسکری کاظمی	
نعت رسول مقبولؐ	نسیم سحر	7

مضامین

میں قتیل شفائی کا احسان مند ہوں	ڈاکٹر انور سدید	8
اتنی بستہ تکمیل نہیں ہے؟	ڈاکٹر مبارک علی	12
خطوط کی ترسیل کے ذرائع کا ارتقا	سید نصرت بخاری	14
جوش۔ جہانِ فکر و دانش	مسلم شمیم	18
گلشن دانگی سے اور ہ شعروں...	حسن عسکری کاظمی	24
عادل و بدرف	پروفیسر محمد جمیل الرحمن	30
اردو سے گفتگو۔ سہارا "زوال پذیر"	ظفر سپل	36
محمد حامد سراج محبت میں	ڈاکٹر جمیل حیات	39
غنی خان۔ ایک منفرد پشتو شاعر	خالد عبداللہ	45
ڈاکٹر ادریس آزاد کہاں ہیں؟	سرفراز تبسم	47
جون ایلیا	عمران ستار	49

منظومات

اسلم انصاری، انگارہ بخاری، بشریٰ رحمن، پروین شیر، گلزار بخاری	51
شگفتہ نعیم، امجد بابر، سید ریاض حسین زیدی، توقیر مشتاق	53

افسانے

اپنی مٹی میں مرنے والے	نگہت آرا سید	55
سیاہ کار	آغا گل	60
عجیب کہانی	طاہرہ اقبال	65
کچھ دیر کو کہہ سکتے کہ کتنے مکار	حنیف باوا	67
آگ، درد، آگہی	محمد طارق علی	69
کئی رنگ سے لوگ	وحشی سعید (انڈیا)	74
آوازوں کی ایذا رسانی	اسلم سحاب ہاشمی	78
بلا عنوان	نورین روما	82

غزلیں

اشرف راحت، چشتی، انور شعور، ساجد ظفر، محمود شام اسلم ثاقب، قمر رضا شہزاد، خاور اعجاز، سید ریاض حسین زیدی ڈاکٹر ایوب ندیم، ڈاکٹر اسحاق وردگ، سلیمان خمار، احمد علی شہزاد، شہباز انور، عائشہ مسعود، اظہر جاوید، ممتاز راشد رشیدہ قریشی، اصغر علی سید، محمد عثمان سید، ریاض حسین، اشرف زکی انگارہ بخاری، توقیر علی، تصور اقبال، پروفیسر جاوید عباس جاوید	85
عاصم بخاری	92

سرائیکی گوشۂ خاص

ناول "سنگھ"	بشریٰ رحمن	93

یادیں

قرطاس و نیوش	اسلم کمال	99
کار ساز و پارا کا تخلیقی گریٹ	ڈاکٹر انعام الحق جاوید	103
محسن یا	محمد پرویز تقیم	105
مرد مجاہد بھی نہیں تھا ــــــ اظہر جاوید	اسلام اعظمی	108
لاہور جو ایک شہر تھا	عادل لاہوری	112

طنز و مزاح

ہارا ہوا ہے	ڈاکٹر بدر منیر	114
دھوکے میں	ڈاکٹر بدر منیر	
توبہ	ڈاکٹر بدر منیر	
باکمال لوگ لاجواب	پروفیسر نور کمال	117

تجزیے

عارف فرہاد کی نظم نگاری	خاور اعجاز	118
ڈاکٹر رزاق عرشی کی اقلیم کا کائنات	ڈاکٹر شفیق آصف	121
شعر میں گاؤں: ادا جعفری	شکیل سروری (اوکاڑہ)	124
سرد صہبائی کی ـــــ	محمد نوید مرزا	127

تبصرے ہارون الرشید تبسم کے

خاک زاد (کلیات)	قمر رضا شہزاد	129
آئینہ نظر	حسن عسکری کاظمی	
بیاضِ نظر	کلیم صابری	
ماحصل	عاکف گردونی	
حکمت صدری و دانش	انور محمود علوی	
لاہور زمین (ناول)	اقبال قیوم	
خوشبو	ڈاکٹر بدر منیر	
تعارف	ہارون الرشید تبسم	145

انجمن خیال

قیصر نجفی، آغا گل، حنیف باوا، محمد طارق علی، آصف ثاقب، نور کمال، شاہد وحشی سعید، ڈاکٹر محمد افتخار شفیع، پروفیسر محمد رفیق مغل، ڈاکٹر بدر منیر، محمد اسلم، پرویز تقیم، انور زاہد محمد علوی، ماجد وفا عابدی، اشرف ذکی، افکار زبانی، سید ریاض حسین زیدی — 140–159

تخلیق کو موصول رسائل و کتب

علمی و غیر علمی — 160

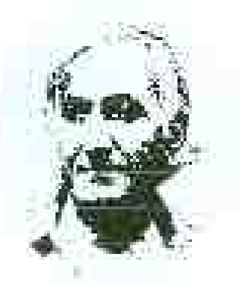

سرورق

ادارہ "تخلیق"

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: سید ارسلان رضی

قانونی مشاورت: حسین مجروح

مطبع: گلکسی پرنٹرز گلشن راوی، لاہور

مقام اشاعت

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(اشاعت کے حقوق محفوظ)

○ بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

پہلی بات

معیاری ادب اور اردو زبان کے فروغ میں ادبی رسائل کو کلیدی حیثیت حاصل ہے مگر اب ادبی رسائل کی ترسیل میں سب سے بڑی رکاوٹ جی پی او کی شرح ڈاک میں بے جا اضافہ ہے۔ عید کارڈ بھیجنے اور خط لکھنے کا رواج تو پہلے ہی قصہ پارینہ ہو گیا تھا۔ اوپر سے رہی سہی کسر موجودہ حکومت کے اقدامات نے پوری کر دی۔ ان تین سال میں جہاں بہت منفی تبدیلیاں دیکھی گئیں وہاں عام ڈاک لفافے کی قیمت 8 روپے سے 20 روپے تک اور کتاب جس پر ٹکٹ 3 روپے تک تھا اس کا اضافہ 65 روپے تک کرنا میری ناقص سمجھ سے باہر ہے۔ اب یہ عام رسائی بھی غریب لوگوں کی پہنچ سے دور ہو گئی ہے۔ اندرون ملک کی رجسٹری ڈاک میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ رجسٹرڈ ڈاک 250 گرام تک 50 سے 65 روپے تک (اندرون ملک) پہنچ گئی ہے جب کہ یو۔ کے، انڈیا اور امریکہ کی ڈاک (250 گرام) تقریباً 350 سے 900 روپے تک پہنچ گئی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ رجسٹرڈ ڈاک کے گم ہونے کا خدشہ بھی عام ڈاک کی طرح موجود ہے۔ ہر دفعہ "تخلیق" پوسٹ کروانے کے بعد 20 سے 25 پرچے لاپتہ / گم ہو جانا عام سی بات ہے اور دوستوں کی تنقید کے بعد دوبارہ بھجوانے پڑتے ہیں۔

محکمہ ڈاک کی غفلت کے علاوہ جو چیز خاص طور پر دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ جو معزز قلمکار خود اخلاقیات کا درس دیتے نہیں تھکتے وہ یہ زحمت بھی نہیں کرتے کہ اگر گھر کا پتہ تبدیل ہو گیا ہے تو ایک فون کر کے نیا پتہ "تخلیق" کے ریکارڈ میں درست کروا دیں۔ دوسرا المیہ یہ ہے کہ اکثر کئی کئی ماہ پرچہ نہ ملنے کے باوجود ایک سال بعد رابطہ کیا جائے تو یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ ہمیں تو پورے سال میں ایک یا دو ہی پرچے وصول ہوئے۔ گویا یہ ذمہ داری بھی مدیر کی ہے کہ وہ گھر تبدیل ہونے اور پرچہ نہ ملنے کی صورت میں خود ہی اس کا کوئی حل تلاش کریں۔ میری ایسے تمام دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ بھی اپنی ادبی ذمہ داری کا احساس کریں۔ تمام بوجھ ادارہ تخلیق کے سر نہ ڈال دیا جائے۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ اردو کے ادبی رسائل اور اردو زبان کا مستقبل دونوں بہت گمبھیر مسائل ہیں۔ ادب تو بعد میں آتا ہے پہلے زبان کو زندہ اور پائندہ رکھنے کے جتن کر لیں۔ ادبی رسائل کو حکومتی سرپرستی نہ ہونا ادب کا زوال ہے۔ پاکستانی حکومتوں کے برعکس ہندوستان میں جب پہلا اخبار جاری ہوا تو اس دور کی انگریزی حکومت نے فروغ تعلیم کے لیے اخبارات، رسائل، رقعہ جات اور مطبوعہ مواد کی ڈاک کی ترسیل کی شرح ارزاں کر دی تھی۔ پاکستان میں ڈاک کی ترسیل میں غیر معمولی اضافے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پاکستان اور ہندوستان میں کتابوں اور رسالوں کی آمد و رفت اور تبادلہ رک گیا ہے۔ اس قسمت سے کوئی دوست سرحد پار سے آ جائے تو رسالوں یا کتابوں کی شکل دیکھنے کو ملتی ہے اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے سیاسی حکومتوں نے ادبی دنیا کو بھی زنگ آلود کر دیا ہے۔ نہ تو کوئی شخص سرحد پار جا رہا ہے اور نہ ہی کسی کو آنے کی اجازت ہے۔ یہاں یہ امر یاد رکھنا ضروری ہے کہ سیاسی ڈیڈ لاک (Covid-19) جیسے سانحے سے پہلے کی صورت حال ہے۔

تمام دنیا میں خود ساختہ تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ سیاست، پرانے اتحادوں، بین الاقوامی مفادات، ملکی پالیسیاں اور سب کی وفاداریاں تبدیل ہو رہی ہیں۔ کل کے دوست آج کے دشمن بن رہے ہیں۔ آنے والے نئے بین الاقوامی اتحاد بن رہے ہیں۔ بہت سے ممالک دوستوں کی صف میں شامل ہو رہے ہیں اور کچھ اپنے راستے جدا کر رہے ہیں۔ ہر کوئی سیاسی بساط پر اپنے مہرے لگائے گھات میں بیٹھا ہے۔ ملک سرحد کے ہر طرف انہی حالات سے دوچار ہے۔ ایک زمانہ بیت گیا قوم کو نئے نئے تجربوں کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ تاریخ ہمیشہ کی طرح ساری قوم کو ہی بھگتنے ہوں گے۔ 72 سالوں سے جو آتا ہے وہ جانے والے کو کھلاڑ اور خود کو فرشتہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ قوم آج بھی پریشان ہے کہ کوئی

تو حکمران ایسا آ جائے جو مجبوروں کے درد کو سمجھے۔ ہمیں صرف تسلی ہی نہیں زندگی کی تجلی بھی دے۔ تبدیلی ہمیشہ کی طرح ایک مخصوص گروہ اور مخصوص طبقے کا مقدر ہی کیوں ہے؟ عام آدمی کی فلاح روٹی، کپڑا اور مکان کب ملے گا؟ ملکی حالات کی بہتری، خوشحالی، ترقی کب نظر آئے گی؟ ہمیشہ کی طرح بچوں کا بہتر مستقبل دکھا کر لوٹنے والے کب مہربان ہوں گے؟ کیا ہم خود بھی اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں؟

ہر نیا چہرہ اُمید کی کرن دل میں پیدا کرتا ہے مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی کارکردگی دماغ اور دل میں پھر بے یقینی اور ناامیدی کے اندھے کنویں میں دھکیل دیتی ہے۔ بہت سے سوال دل و دماغ میں گردش کرتے ہیں۔ ہر کوئی آج بھی انہی مصائب کے بوجھ اور افراتفری کا شکار ہے۔ مصائب میں الجھا ہر انسان آج بھی حکومتِ وقت کی طرف بے بسی سے دیکھ رہا ہے اور رحم کی اپیل کر رہا ہے۔ ان تمام منفی چیزوں سے قطع نظر 14 اگست کے اخبار کا انتظار ہمیشہ شدت سے رہتا ہے تاکہ پتہ چل سکے وہ کون خوش نصیب ہیں جن کی نامزدگی کی گئی اور انہیں 23 مارچ کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ ادب، سائنس، طب، ٹیکنالوجی، دینی خدمات، فنونِ لطیفہ، انجینئرنگ اور دوسرے شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی کے اعتراف میں اس عزت سے نوازا جاتا ہے۔ میں محترم ڈاکٹر شاہ فرشوری کی اس بات سے متفق ہوں کہ 126 میں سے ایک تہائی 42 ایوارڈ سائنس اور انجینئرنگ کو دیے گئے جو کسی طرح منصفانہ فیصلہ نہیں۔ کون ہیں یہ لوگ کہاں ہیں؟ سائنس اور انجینئرنگ میں کیا شاندار کارنامے انجام دیے گئے۔ ان سب سوالات کے جوابات غور طلب ہیں!" لیکن مثبت سوچ کا پہلو یہ ہے کہ میری طرف سے ایوارڈ ملنے والے تمام دوستوں کو خوش آمدید۔ شوبز میں اداکارہ روبینہ، مصطفیٰ قریشی، قلم کار شاہد اور اداکارہ صالحہ نور کو منتخب کیا گیا۔ اسی طرح اسماعیل تارا، تحریر یار، آفریدی اور ساجد حسن کو بھی منتخب کیا گیا۔ پروڈیوسر کا ایوارڈ مومنہ درید کو نصیب ہوا، وردہ نا بیٹ اور عالیہ بیگم کو بعد از مرگ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اسی طرح ادب میں محترمہ کشور ناہید، رفعت عباس اور ایاز گل کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شاعری میں ن۔م۔ راشد اور آزاد نظم کے شاعر مجید امجد کو بھی اعزاز بعد از مرگ نوازا گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ اعزاز ان کی زندگی میں انہیں مہیا ہوتا۔ آخر میں دوستوں سے کچھ گزارشات تخلیق ادارے کی پالیسیوں کے متعلق ہیں۔ یہ بتانا مقصود تھا کہ میں آج بھی ان ہی اصولوں پر کاربند ہوں جو اظہر جاوید نے مرتب کئے۔ شاید ان ہی کٹھن اصولوں کی وجہ سے آج تخلیق کے اعلیٰ معیار کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اور اس کو شائع ہوتے 53 برس ہو گئے۔ وہ چند شرائط یہ ہیں: (1) صرف غیر مطبوعہ تحریریں ہی تخلیق میں شائع کی جائیں گی۔ (2) تبصرے کے لئے 2 کتابوں کا بھیجنا ضروری ہے۔ ایک کتاب پر تبصرہ نہیں ہوگا۔ (3) تخلیق ایسے لکھاریوں کو جو بیک وقت ایک ہی تحریر کئی ادبی پرچوں کو بھیجتے ہیں بلیک لسٹ میں شامل کرتا ہے۔ (4) تخلیق کو ہمیشہ 7 سے 8 اشعار کی غزل یا نظم بھیجئے۔ طویل منظومات، نظمیں اور مضامین شائع کرنا یا نہ کرنا مجلس کی صوابدید ہے۔ (5) الفاظ کی واضح لکھائی سے استعمال کریں۔ طویل مضامین بھیج کر انتخاب میں مشکل نہ پیدا کریں۔ (6) اگر کوئی بھی غزل اور مضمون شامل اشاعت نہ ہو گا تو اگلے صفحے پر صاف اور خوش خطی کی صورت میں وصول نہ ہوگا۔ (7) بیشتر شاعری اور مضامین پر لکھاری جلد بازی میں اپنا نام تک لکھنا بھول جاتے ہیں ایسی تحریریں محفوظ مواد میں شامل کر لی جاتی ہیں۔ (8) "تخلیق" کسی بھی قاری کو اس کی تحریر شائع ہونے یا نہ ہونے کا پیشگی شائع ہونے سے پہلے بتانے کا مجاز نہیں ہو سکتا۔ آپ کے تعاون سے ہی "تخلیق" آج اس مقام تک پہنچ سکا ہے۔ امید ہے اس کے معیار کو قائم رکھنے میں آپ محسن ادب اظہر جاوید کی تحریک اور میرا ساتھ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، اہلِ خانہ کو کرونا جیسے وبائی مرض سے محفوظ رکھے اور زندگی میں آنے والی تمام خوشیوں کو بار بار دیکھنا نصیب فرمائے۔

رب راکھا!

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد و نعت

حمد

ترا ذکر میری دوا میرے اللہ
میں بیمار ہوں اور شفا میرے اللہ

کسی سے بتاؤں کہ بس تو ہی تو ہے
نہیں کوئی تیرے سوا میرے اللہ

بھٹکتا ہی جاتا ہوں میں لمحہ لمحہ
مگر ہر قدم تو ملا میرے اللہ

کہاں یہ غریب یہ عجز و ذلت
کہاں سدرۃ المنتہیٰ میرے اللہ

زمانے کو کچھ بھی کہا ہو تو مجرم
زمانے نے کیا کچھ کیا میرے اللہ

یہاں اپنی مرضی سے آیا نہیں تھا
مجھے اس جہاں سے اٹھا میرے اللہ

کوئی اور مخلوق تخلیق کر کے
نئی ایک دنیا بنا میرے اللہ

خالد اقبال یاسر

ooo

نعت

ذکرِ نبی کا معجزہ دیکھا اذان میں
جیسے شہد کا قطرہ ٹپکتا ہے کان میں

کیسے لکھے گا ان کا قصیدہ کوئی یہاں
قرآں کا حرف حرف ہے آقا کی شان میں

’’کتاب‘‘ [illegible] ’’[illegible]‘‘
تسلیم ہے جو کی ہے صداقت بیان میں

ہر دو جہاں میں رہنا ہے آدابِ زندگی!
آقا کا نام لب پہ ہے جان آئی جان میں

فقر و فنا ہو یا اسے سچ بولنا عزیز
کوئی تو دیکھے ان کا جواب حکمران میں

عید نبی کا تذکرہ اور مصطفیٰ کی بات
لگتا ہے یوں کہ تیر چلا ہے کمان میں

میں نے سنی حرم میں اذانِ سحر حسنؔ
لہجہ بلالؓ کا رہا میرے دھیان میں

حسن عسکری کاظمی

ooo

نعت

یہ دیکھا ہے ہم نے کمالِ مدینہ
جھلکتا ہے ہر سو جمالِ مدینہ

بچھڑ کر مدینے سے رہتا ہے سب کو
خیالِ مدینہ ملالِ مدینہ

اگر نور کے کوئی پوچھے گا معنی
تو دوں گا اسے میں مثالِ مدینہ

وہاں سے پلٹ کر تو آیا ہوں لیکن
نہیں بھولتے ماہ و سالِ مدینہ

عجب یہ سفر ہے کہ دل میں نہیں ہے
مدینے سے پہلے خیالِ مدینہ

جمالِ مدینہ میں جلوے انہی ﷺ کے
انہی سے ہے قائم جمالِ مدینہ

وہی میرے آقا وہی میرے مولا
وہی مجتبیٰ وہ خوش خصالِ مدینہ

اسی کے لیے وقف میرا قلم ہے
وہی جس سے ہے بے مثالِ مدینہ!

نسیم سحر

ooo

مضامین

میں قتیلؔ شفائی کا احسان مند ہوں

انور سدید

نوٹ : انور سدید کی زندگی میں تمام لکھا ہوا اور غیر مطبوعہ مواد "ماہنامہ تخلیق" کے ریکارڈ روم میں محفوظ ہے، جسے وقت اور ضرورت کے پیشِ نظر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (پرانے کاغذات سے بازیافت)

قتیلؔ شفائی کو میں نے ہمیشہ ایک ایسے شاعر کے روپ میں دیکھا ہے جس کی شاعری زمامِ حیات تھام لیتی ہے لیکن جس کی قربت سے میرے جیسے خاک افتادگان کو نہ جانے کیوں خوف آتا ہے۔ "نقوش" کے مدیر محمد طفیل نے ایک دفعہ کہا تھا :

"میں نے بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر مضامین لکھے ہیں اور قلم پر کبھی کپکپی طاری نہیں ہوئی لیکن قتیلؔ ایک ایسا شخص ہے جس پر لکھتے ہوئے دل گھبراتا ہے۔"

میرے دل پر بھی اس وقت کچھ ایسا ہی لرزہ طاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس خوف آمیز لرزش کو ہمہ وقت متحرک رکھنے میں کچھ حصہ "صعود اور دے کے خطوط" کے شہرۂ آفاق مصنف میرزا ادیب کا بھی ہے۔ ایک دن کہنے لگے کہ انھوں نے قتیلؔ شفائی پر ایک مضمون بڑی محبت سے لکھا تھا "ان کے بارے میں ہر بات اچھی لکھی۔ لیکن وہ ناراض ہو گئے" — میرزا ادیب اپنی تمام تحریریں کتابی صورت میں محفوظ کر چکے ہیں لیکن ان کا یہ مضمون تاحال غیر مطبوعہ ہے اور شاید ہمیشہ غیر مطبوعہ ہی رہے۔ مجھے یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے میں قتیلؔ شفائی سے ذرا پرے کھسکنے لگتا ہوں۔ اس کے پاس آنے سے ڈرتا ہوں اس پر لکھنے سے خوف کھاتا ہوں۔ قتیلؔ شفائی کو میں نے قریب سے نہیں دیکھا تاہم ادبی تقریبات اور رائٹرز گلڈ کے جلسوں کی ملاقاتوں اور بحث آمیز باتوں کی کیفیت اتنی ہے تو ارادہ ہے کہ ایک ہزار صفحات کی کتاب لکھ کر بھی شاید احساس ہو کہ قتیلؔ کا حق ادا نہیں ہوا۔ "کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے۔" لیکن خوف کا اور "میرزا ادیب" کا عالم یہ ہے کہ میں قتیلؔ پر ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اب بھی جسارت کر رہا ہوں تو سامنے اظہر جاوید کا خط پڑا ہے کہ مضمون میں لکھوں قتیلؔ کو وہ بخشیں گے۔ اس مضمون کی محرک دوسری بات یہ ہے کہ میں قتیلؔ شفائی کے چند بالواسطہ احسانات سے زیر بار ہوں۔ آج موقع ملا ہے تو کیوں نہ ان کا ذکر کر کے دل کو سبکسار کر لوں۔ قتیلؔ شفائی سے اس افتادہ خاک کی پہلی ملاقات چنداں اہم واقعہ نہیں لیکن میں اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا کہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں حزبِ اختلاف میں تھا اور قتیلؔ نے اپنا مشہور کیمپ الگ قائم کر رکھا تھا۔ لطف کی بات یہ کہ ان کے کیمپ میں ایک ایسا ادیب بھی پناہ گزیں جو ہر صبح دفتر "نقوش" میں محمد طفیل کی چائے نوش جان کرتا۔ رائٹرز گلڈ کے عام انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کی اس منصوبہ بندی میں شریک ہوا جو ہم گلڈ کے سیکرٹری کے انتخاب کے لیے سوچ رہے تھے پنجاب شاخ سے اس عہدے کے لیے ہماری نظر میں محمد طفیل موزوں ترین رکن تھے ان کے مقابلے میں قتیلؔ شفائی صف آرا تھا۔ یہ صاحب

ہمارے منصوبے کے تمام اسرار شام کو قتیل شفائی پر منکشف کرتے' انہیں احساس تک نہ ہونے دیتے کہ وہ اس معرکے میں دونوں امیدواروں کے طرفدار ہیں۔ خدا جانے ان کے قالب میں قائم و جعفری روح کہاں سے آ گئی تھی۔ ان دنوں قتیل شفائی کا یہ شعر اکثر میری زبان پر آتا اور میں اس کی حادثاتی کیفیت پر قتیل کو دل ہی دل میں داد دیتا جو غائبانہ ہوتی تھی یعنی اس میں دوستی کے خلوص کا رعایتی شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں؟   کس نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی؟

اس شعر کے باطن میں جو مفہوم نہاں ہے مجھے اس کی عملی مثال زندگی میں دستیاب نہیں تھی لیکن جب سیکرٹری کا عہدہ قتیل شفائی نے جیت لیا اور میرے سامنے بیٹھے ہوئے ایک ادیب نے اپنی آنکھیں چرانا شروع کر دیں تو مجھے جس مثال کی تلاش تھی وہ مل چکی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے قتیل شفائی کو دل ہی دل میں تحسین کی تھی کہ ظالم نے کیسا سچا شعر کہا تھا۔ معاشرے کو کس گہری نظر سے دیکھا تھا اور اس دور کے انسان کے بارے میں کس پیغمبرانہ بات کہہ دی تھی؟ اس وقت اعصاب پر الیکشن کا نتیجہ حاوی تھا۔ اس لیے میں قتیل شفائی کو بالمشافہ داد نہ دے سکا۔ محمد طفیل کی ناکامی ہماری توقع کے خلاف تھی' رائٹرز گلڈ کے دفتر میں مہابھارت کا سماں تھا۔ خدشہ یہ تھا کہ کہیں نازک صورت اختیار نہ کر جائے لیکن نتیجے کا اعلان ہوتے ہی محمد طفیل اپنی نشست سے اٹھے اور میز کا لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف بیٹھے ہوئے قتیل شفائی سے بغل گیر ہو گئے' اسے مبارکباد پیش کی' اس کی کامیابی کو جمہوری انداز میں قبول کر لیا اور یوں وہ خود ضرب المثل اخلاق کے لیڈر بن گئے۔ قتیل شفائی کے آدمی اندر آئے اور تالیوں کی گونج میں میز کو پرتکلف کھانوں سے سجا دیا۔ یہ ایک لذت انگیز دعوت کا اہتمام تھا۔ کامیابی قتیل شفائی کی توقع کے عین مطابق تھی' محمد طفیل نے انتخاب کو انتخاب سے زیادہ وقعت نہ دی تھی' قتیل شفائی کے لیے یہ عزت کا مسئلہ تھا' محمد طفیل نے انتخابات کا تلخ اور ترش ذائقہ چکھا' قتیل شفائی کی عزت خدا نے محفوظ رکھی جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھی ـــــ یہ واقعہ بظاہر معمولی ہے لیکن دیکھیے اس میں کئی زندگی کے کتنے راز پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ محمد طفیل نے قتیل شفائی کو کہا ''آؤ تمہیں چائے پلاؤں'' قتیل شفائی نے برجستہ جواب دیا ''آپ کا چائے اب مجھے ہضم نہیں ہوتا''...... رائٹرز گلڈ کا انتخاب قتیل شفائی کے باطن پر طویل عرصے تک اثر انداز رہا لیکن جب 1988ء میں محمد طفیل اپنا تمام کام تمام ہی یہیں چھوڑ کر دنیا سے اچانک رخصت ہو گئے تو قتیل شفائی اس روز سب سے زیادہ دکھی تھا۔ وہ سب سے زیادہ غم زدہ تھا۔

یہاں واضح کر دوں کہ قتیل شفائی سے ملاقات بعد میں ہوئی' اس کی شاعری سے تعارف پہلے ہوا۔ آزادی سے قبل جب میں اس دور کے مقبول ترین فلمی رسائل ''چترا'' ''ادا کار'' ''پکچر'' ''ستارہ'' اور ''گورو گھنٹال'' میں بے تحاشا لکھ کر راتوں رات کچھ شہرت حاصل کر رہا تھا اور مصور جذبات حضرت انور سدید میانوی کے مرجع نام سے چھپ رہا تھا تو قتیل شفائی ساقی' ہمایوں' ادب لطیف' ادبی دنیا اور نیرنگ خیال جیسے ممتاز ادبی رسائل میں مقبولیت کی بیشتر منزلیں طے کر چکا تھا۔ اس دور کے شاعروں میں جگر مراد آبادی' عابد علی عابد' اقبال صفی پوری' عبدالحمید عدم' شوکت تھانوی' اختر شیرانی' عبدالمجید سالک' تاجور نجیب آبادی' فیض احمد فیض اور ہری چند اختر کا سکہ چلتا تھا لیکن نوجوان شعرا کو متحد کرنے بزرگوں سے زیادہ قبول عوام حاصل تھا وہ ساحر لدھیانوی اور قتیل شفائی تھے۔ ساحر تحت اللفظ پڑھتا تھا' قتیل شفائی دلنشیں اور فرحت آگیں ترنم سے شاعری کا جادو جگاتا تھا۔ ان دنوں یہ دونوں فلمی دنیا سے دور اپنے فن کے بل بوتے پر نام پیدا کر رہے

تھے اور اس میں آواز کا عنصر شامل تھا تو یہ ان کی اپنی آواز تھی ان دونوں کے لیے مشاعرے کے سامعین گوش بر آواز رہتے ان کے بغیر کوئی مشاعرہ کامیاب نہ ہوتا۔ لوگ برملا کہتے۔ ''ساحر اور قتیل شاعری کے مستقبل کو منور کرنے والے شاعر ہیں۔''

میں نے قتیل شفائی کو آزادی کے بعد منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی سنا ہے اب اس میں ایک نمایاں تبدیلی یہ آ گئی کہ اس نے اپنی شاعری کی مقبولیت سے اپنے دلاویز ترنم کو خارج کر دیا۔ مشاعرے میں غزل تحت اللفظ پڑھنی شروع کر دی۔ اپنے سامع کے تقاضوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور جب پچھلی نشستوں سے آواز آتی ''قتیل صاحب ترنم سے'' ـــ ''قتیل صاحب ترنم سے'' ـــ تو اس کے اندر کا پٹھان جاگ اٹھتا۔ وہ سامعین کو گھور کر دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو ''گانا سننے کا شوق ہے تو ''اس بازار'' میں چلے جاؤ'' ـــ لیکن وہ مشاعرے کی زمام اپنے ہاتھ میں رکھتا۔ آوازوں کے اس شدید تقاضے کو مسترد کرتے ہوئے کہتا ـــ ''آپ میری شاعری ملاحظہ کیجیے۔'' اور پھر یوں ہوتا کہ اس کی غزل کا ہر شعر بار بار سنا جاتا۔ اس کی شاعری کی داخلی موسیقی کا جو لفظوں کے زیر و بم سے پیدا ہوتی اور معنی کو نئے انداز میں کروٹ دیتی تھی لطف اٹھایا جاتا۔ قتیل کی شاعری ان دنوں کانوں کو طراوت بار کرنے کے بجائے دلوں پر مجسم رقم ہو رہی تھی۔ وہ مشاعرہ لوٹ لیتا لیکن یہ حقیقت بھی باور کرا دیتا کہ ''اچھی شاعری ترنم کی محتاج نہیں ہوتی۔'' اب مجھے سرگودھا کا ایک مشاعرہ یاد آ رہا ہے۔

قاسم رضوی ان دنوں اس انتظامی قسمت کے کمشنر اور ڈاکٹر ارشد ملک ڈپٹی کمشنر تھے دونوں کو ادب سے فطری لگاؤ تھا چنانچہ دوسرے تیسرے دن کہیں نہ کہیں مشاعرہ ہو جاتا۔ دور دور سے شعرا بلوائے جاتے انہیں عزت و احترام سے سنا جاتا۔ اسلامیہ ہائی سکول کے یوم تاسیس پر ایک مشاعرہ انور سدیدی صاحب نے کرایا تو انتظامیہ نے خاص طور پر قتیل شفائی کو دعوت دینے کی درخواست کی۔ انور سدیدی نے قتیل سے اپنی دیرینہ دوستی کے ناتے یقین دلا دیا کہ ''وہ ضرور آئیں گے'' وہ مشاعرے کی جان ہے'' ـــ لیکن جب مشاعرہ شروع ہوا تو قتیل شفائی کا دور دور تک نشان نظر نہ آتا تھا۔ قاسم رضوی بار بار انور سدیدی کی طرف دیکھتے اور وہ عذر خواہی کے لیے ناک کی پھننگ سے پھسلتی ہوئی عینک کو سنبھالنے لگتے۔ آخر مشاعرہ ہاتھ سے نکلنے لگا۔ سامعین اٹھنے لگے ہال خالی ہونے لگا۔ عقبی نشستوں سے اشعار کی فی البدیہہ پیروڈی شروع ہوئی ناگاہ دیکھا تو قتیل شفائی دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ انور سدیدی اسے لینے کے لیے دوڑ پڑے۔ قاسم رضوی اس کا استقبال کرنے کے لیے اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے۔ مشاعرہ اکھڑ گیا تھا۔ لیکن اب پھر جم گیا۔ سامعین واپس آنا شروع ہو گئے۔ صدارتی تقریر میں قاسم رضوی نے اسے سرگودھا کا کامیاب ترین مشاعرہ قرار دیا اور اس کی کامیابی کا سہرا قتیل شفائی کے سر باندھا۔

میرے لیے یہ کارروائی مشاعرے کے معمول کی حیثیت رکھتی ہے غیر معمولی بات ہے تو یہ کہ اس مشاعرے میں قتیل شفائی نے جو غزل پڑھی اس کا یہ شعر مجھے نہ صرف ہمیشہ یاد رہا بلکہ کارزارِ زندگی کے خارزار میں خضرِ راہ بھی ثابت ہوا۔

معلوم نہ تھا کیا تجھے سقراط کا انجام　　　ہاتھوں میں ترے ساغرِ سم ہے تو مجھے کیا؟

اس شعر کے بار بار پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ ایک طویل عرصے تک ادبی دنیا سے غائب رہنے اور افسانہ نگاری کے کوچے سے نکل جانے کے بعد جب وزیر آغا مجھے دوبارہ اس میدان میں لے آئے تو نہ جانے کیوں میں نے ادیب کو حزبِ اختلاف کا مستقل رکن سمجھ لیا اپنے ذہن سے سوچنا اور اپنی سوچ کے مطابق لکھنا اپنا حق سمجھا۔ اسی دوران میں ایک جہاں دیدہ شاعر کا یہ شعر پڑھا:

گر میرے منہ میں میری زباں ہے تو کیوں نہ میں　　　جو کچھ کہوں یقیں سے کہوں برملا کہوں

مجھے بہت تقویت ملی کہ میں نے ادیب کے کردار کا درست ادراک کیا تھا لیکن اس پر عمل کیا تو ادب پر قابض حریص اقتدار نے مجھے اپنے طاغوتی نرغے میں لینے میں تاخیر نہ کی۔ ہر نئے وار پر مجھے محسوس ہوتا کہ میرے سامنے ساغرِ سم رکھ دیا گیا ہے۔ اس وقت مجھے قتیل شفائی کا یہ شعر یاد آ جاتا اور ٹوٹا ہوا حوصلہ پھر جڑ جاتا۔ میں انکار کرنے لگا کہ دیا تیرِ ادب کی کس کمیں گاہ سے آتا ہے؟ اور جونہی تیر آتا تو اس وقت مجھے سقراط کا انجام بھلا معلوم ہونے لگا۔ اظہر جاوید نے ایک دفعہ لکھا تھا "غالب زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر کبھی نہ کبھی ہر ذی شعور کی ضرورت بنتا ہے۔ غالب نے ہماری کتنی مشکلیں آسان کی ہیں۔" یہی بات آج میں قتیل شفائی کے بارے میں پورے یقین سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کی شاعری میں وہ سچائی موجود ہے جسے زمانہ گنے چنے شاعروں پر ہی منکشف کرتا ہے۔ قتیل شفائی نے اس زمانی صداقت کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اپنی شاعری میں بھی پیش کر دیا۔ زندگی کے متعدد مقامات پر میری ذہنی پریشانی میں قتیل شفائی میری ضرورت بنا اور وہ میری مشکل آسان کرنے کے لیے آ پہنچا۔ میں نے اس سے استفادہ کیا، اس کے تجربے کو اپنا راہنما بنایا اور زندگی کی دوڑ میں اچانک آ جانے والی رکاوٹ کو عبور کر لیا۔ قتیل شفائی کا مجھ پر یہ احسان ہے جس کا اعتراف ضروری ہے۔ اس کے لیے قتیل شفائی کا شکریہ لازم ہے اور میں یہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

◆◆◆

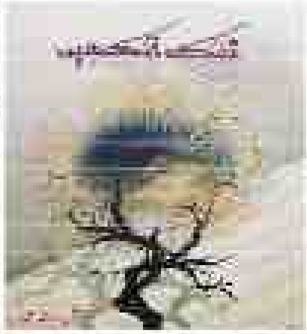

معروف مزاح نگار، شاعر علی رضا احمد کا پہلا شعری مجموعہ

خشک آنکھیں

شائع ہو گیا ہے .... قیمت: -/400 روپے

ملنے کا پتہ: فائن پبلی کیشنز، ڈیوس روڈ، لاہور (0300-09693747)

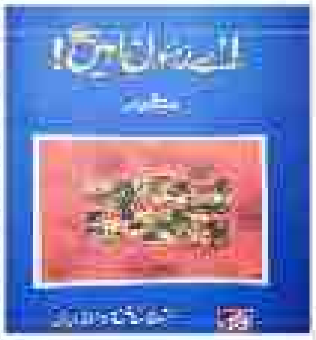

معروف شاعر، نثر نگار، نعت خواں (صدارتی ایوارڈ یافتہ)

سید ریاض حسین زیدی کا چوتھا نعتیہ مجموعہ

اے رسول امیں صلی اللہ علیہ وسلم

شائع ہو گیا ہے .... قیمت: -/600 روپے

ملنے کا پتہ: فائن پبلی کیشنز، ڈیوس روڈ، لاہور (0300-09693747)

بستی بسنا کھیل نہیں ہے!

ڈاکٹر مبارک علی

انسان کے ارتقا اور تہذیب کی مرحلے وار تحقیق کے لئے تاریخ کا مطالعہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ کون سی وجوہات تھیں کہ انسان نے پھل جمع کرنے اور شکار کو چھوڑ کر زراعت کے پیشے کو اختیار کیا۔ مورخ اس پر متفق نہیں کہ کیا یہ آب و ہوا کی تبدیلی تھی۔ غذا اور شکار کی مشکلات تھیں یا انسان کے اندر تبدیلی کی ایک بڑی خواہش تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کو بدلنا چاہتا تھا۔ پھل اور پودوں کی جڑیں جمع کرنے کے دوران عورتوں میں زراعت کے بارے میں آگاہی آ چکی تھی۔ اس لئے جب انسان نے کھیتی باڑی شروع کی اور ایک جماعت یا قبیلے کی صورت میں ایک جگہ آباد ہوئے تو اس کی وجہ سے انسانی سماج میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جس نے انسان کی سوچ، فکر، رویوں، عادات اور باہمی رشتوں کو متاثر کیا۔ سب سے بڑا اثر کھیتی باڑی کا یہ ہوا کہ اس کے کام کے اوقات بڑھ گئے۔ زراعت کی وجہ سے اس کی محنت میں اضافہ ہو گیا کیونکہ اسے زمین میں بیج بونا پڑتے تھے۔ کھیتوں کو پانی دینا ہوتا تھا اور فصل کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ لیکن جب فصل تیار ہوتی ہوگی تو سرسبز کھیت اسے خوشی اور مسرت دیتے ہوں گے۔ دوسری اہم تبدیلی یہ آئی کہ وہ زمین جہاں وہ کھیتی باڑی کرتا تھا اس کی ملکیت ہو گئی اور یوں بھی جائیداد کا ادارہ وجود میں آیا۔ کھیتی باڑی نے دور رس نتائج پیدا کئے۔ اسے موسموں کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ سورج کے نکلنے اور غروب ہونے سے اوقات کا تعین کیا۔ فصلوں کے لئے بارش اور سورج کی گرمی کا احساس کیا۔ جب زائد پیداوار ہوئی تو اسے مستقبل کے لئے محفوظ کرنا شروع کیا۔

زراعتی معاشرے کے لئے عورت اور مرد کے تعلقات پر گہرا اثر پڑا اور دونوں کے درمیان غیر مساویانہ رشتہ بڑھتا چلا گیا۔ اس کی وجہ محنت کی تقسیم تھی۔ مرد کھیتوں میں کام کرتا تھا تو عورت مویشیوں کی دیکھ بھال گھریلو کاموں اور بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی۔ زراعتی معاشرے میں زیادہ بچوں کی ضرورت تھی اور وہ بھی لڑکوں کی۔ اس لئے عورت کا سماجی رتبہ گھٹتا چلا گیا اور پدرسری کا نظام مضبوط ہوتا گیا۔ زراعتی معاشرے کی ساخت میں اس وقت مزید تبدیلی آئی جب خانہ بدوش قبائل (جو آباد نہیں ہوئے تھے اور جن کی معیشت کی بنیاد گلہ بانی تھی) کی خوراک میں کمی ہوتی تو وہ بستیوں پر حملہ کر کے ان کے محفوظ ذخیروں کو لوٹنے کی کوشش کرتے، لہٰذا حفاظت کی خاطر محافظوں کو مقرر کیا گیا۔ جو حملے سے بستی کا دفاع کریں۔ ان کی خدمات کا صلہ انہیں زائد پیداوار سے دیا جاتا تھا۔ اسی طرح اچھی فصلوں کی تیاری کے لئے دیوی دیوتاؤں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ان کو خوش کرنے کے لیے پجاریوں کا طبقہ وجود میں آیا جو دیوی دیوتاؤں کے لئے نغمے اور گیت گاتے تھے تاکہ وہ بستی کی آبادی اور فصلوں کو محفوظ رکھیں۔ آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے قبیلے یا جماعت کا سربراہ مقرر ہوا۔ اس طرح گاؤں کا انتظامی ڈھانچہ تشکیل پایا۔ گاؤں کی حفاظت کے لئے اس کے اردگرد دیوار بھی تعمیر کی گئی۔ ماہرین آثار قدیمہ نے اس قسم کی دیوار سب سے پہلے فلسطین کے گاؤں جیریکو میں دریافت کی۔

لیکن گاؤں کی زندگی کے منفی نتائج بھی نکلے کچے اور تنگ گھروں میں رہنے کی وجہ سے جہاں جانور بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔ مختلف قسم کی بیماریاں اور وبائیں پھوٹ پڑیں۔ کوڑا کرکٹ اٹھانے کا کوئی بندوبست نہ تھا اور نہ ہی گندے پانی کی نکاسی کا انتظام، بیماری کو قدرتی آفت سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے اس کا علاج یا تو دیوی دیوتاؤں کو نذرانے دے کر ہوتا تھا یا جڑی بوٹیوں سے بیماری کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ مستقل آباد ہونے کی وجہ سے انسان کی ضروریات بڑھتی چلی گئیں۔ رہنے کے لئے مکان، کھانا پکانے کے لئے برتن اور پہننے کے لئے لباس کی ضرورت ہوئی، لہٰذا کاریگروں کا طبقہ پیدا ہوا۔ خاص طور سے کمہار جو مٹی کے برتن بناتے تھے۔ خاص طور سے مٹکے جن میں اناج محفوظ کیا جاتا تھا۔ قدیم آبادیوں میں بڑی تعداد میں مٹی کے برتن ملے ہیں جو کھانے پینے میں استعمال ہوتے تھے۔ اناطولیہ جو ترکی میں واقع ہے وہاں شتل ہیوک کی ایک بستی دریافت ہوئی ہے جو تقریباً ایک ہی قطار میں واقع ہے جو 200 مکانات پر مشتمل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان گھروں میں داخلے کے لئے کوئی دروازے نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے مکانوں کے اردگرد نہ تو کوئی گلیاں ہیں اور نہ ہی کوئی فٹ پاتھ۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق ان گھروں میں رہنے والوں کی گذرگاہیں چھت پر ہوتی تھیں اور اگر دعوت کا انعقاد ہو تو اس کے لئے بھی چھتوں کا استعمال ہوتا تھا۔ ہر خاندان کے رہنے کے لئے دو کمرے ہوتے تھے۔ سونے کے لئے ایک کمرے میں چبوترہ بنایا جاتا تھا جس پر سب مل کر سوتے تھے۔ دیواروں پر تصاویر بھی ملی ہیں جن سے ان کی سماجی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہاں کے باشندے کھیتی باڑی کرتے تھے، مگر کھیت ان کی آبادی سے دور تھے۔ یہ لوگ پتھر کے تیز دھار والے ہتھیار اور آلات بنانے میں ماہر تھے۔ ان کی دھار اس قدر تیز ہوتی تھی کہ آج بھی ڈاکٹرز آپریشن کے درمیان ان کو استعمال کرتے ہیں۔

انسانی بستی کی ابتدائی تاریخ اس لئے اہم ہیں کیونکہ اس ارتقائی مرحلے پر آ کر انسانی سماج کی تشکیل ہوئی اور انسان نے اپنے ماحول، مفادات اور ضرورت کے تحت مذہبی عقائد کو تخلیق کیا، سماجی رشتوں کی بنیاد پڑی اور ایک نئے کلچر کی ابتدا ہوئی انہیں بنیادوں پر جب آگے چل کر شہر وجود میں آئے تو انسانی تہذیب مختلف پہلوؤں کے ساتھ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ مکمل شکل میں ابھری۔

◆◆◆

''تخلیق'' مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

لاھور	ایسٹ بک ڈپو، B-6، مال روڈ، لاہور۔ (0320-4343588)
لاھور	سنگ میل پبلی کیشنز، لوئر مال، لاہور۔ (042-37220100)
لاھور	ماورا پبلی کیشنز، 60۔ دی مال، لاہور۔ (0300-4020955)
لاھور	بک ہوم، 46۔ مزنگ روڈ، لاہور۔ (0333-4228920)

خطوط کی ترسیل کے ذرائع کا ارتقا

سید نصرت بخاری

خط کی ایجاد کے بعد حضرت انسان کو یہ جستجو رہی ہوگی کہ اسے کس طرح جلد از جلد مکتوب نگار تک پہنچایا جائے۔ اگر چہ اس بارے میں تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مکتوب نگار سے مکتوب الیہ تک مکتوب پہنچانے کے لیے مختلف ذرائع کو استعمال کیا گیا لیکن اس سفر کا آغاز بھی پہلے قدم سے ہی ہوا ہوگا۔ اول اول جب خطوط یا ڈاک کا شعبہ وجود میں نہیں آیا ہوگا تو خطوط کی ترسیل ذاتی فعل اور شخصی ذمہ داری تصور کی جاتی ہوگی، تو اس ذاتی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے خطوط کی ترسیل کے لیے انسان ہی کو استعمال کیا گیا ہوگا۔ یعنی خط لانے یا لے جانے کے لیے وقتی رقعے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتے جاتے ہوں گے۔ اگرچہ عام شخص کے خطوط کی ترسیل کے لیے مذکورہ طریقے کی کوئی مثال دینا محال ہے تاہم بادشاہوں کے ایلچی اسی کام کے لیے مخصوص ہوتے تھے، جن کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ البتہ خط کو جلد از جلد منزل مقصود پر پہنچانے کے لیے حکومتوں کی طرف سے اقدامات ہوتے رہے۔ برصغیر میں ''غیاث الدین تغلق نے ڈاک کا انتظام اتنے اعلیٰ پیمانے پر پہنچا دیا کہ ہرکارے دو دو میل کا فاصلہ روزانہ طے کر لیتے تھے۔''(1)

دو کوس بعد سڑک کے کنارے ایک کوٹھڑی بنی ہوتی تھی جس میں بادشاہ کے کچھ آدمی بیٹھے رہتے تھے۔ ''ایک چھپر کے پیچھے بہت اچھے سے چار گھوڑے بندھے ہوتے تھے۔ دن میں کسی وقت دور سے ایک نفیری کی آواز آتی اور پھر ایک گھڑ سوار تیزی سے آتا۔ نفیری کی آواز سنتے ہی ایک آدمی فوراً گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔ آنے والے گھڑ سوار نے ایک تھیلا اور سینگ کی بنی نفیری نئے گھڑ سوار کو تھمائی اور یہ گھڑ سوار اسی تیزی سے آگے بڑھ گیا۔''(2)

دستی رقعوں کی ترسیل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مکتوب نگار رقعہ یا خط مکتوب نگار کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور مکتوب نگار بعد میں اس کو پڑھ لیتا ہے۔ مثلاً 2 ہجری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سربمہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا۔''(3)

دستی خط کتابت کا ایک اور واقعہ جو بعد میں ''گنجینۂ مہر'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا مولانا غلام رسول مہر اور محمد عالم مختار حق کا ہے۔ اس بارے میں محمد عالم مختار حق لکھتے ہیں: ''مارچ 1963ء کا ذکر ہے کہ مجھے انھوں نے اپنے کتب خانے کی فہرست سازی کی خدمت سپرد فرمائی۔ ـــ مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ـــ میں اب خط نویسی کے مشغلے سے محروم ہو گیا ہوں۔ چناں چہ میں نے اپنی اس الجھن کا ذکر آں جناب سے کیا تو فرمایا کہ آپ جب آیا کریں اپنا خط میری میز پر رکھ دیا کریں اور جاتے وقت اس کا جواب لے جایا کریں۔ چناں چہ جتنا عرصہ میں فہرست سازی کرتا رہا ہماری دستی خط کتابت اسی نہج پر جاری رہی۔''(4)

اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ منزل مقصود تک خطوط پہنچانے کے لیے انسانوں اور گھوڑوں کے علاوہ کبوتر بھی استعمال

ہوتے رہے۔ "کبوتروں کو تربیت دی جاتی تھی اور ان سے نامہ بر کا کام لیا جاتا تھا۔ اس کی پہلی مثال یہ ہے کہ 816ء میں خلیفہ المعتصم کو تری فرقے کے رہنما بابک کی گرفتاری کی اطلاع نامہ بر کبوتر کے ذریعے سے پہنچائی گئی۔"(5)

اس کے علاوہ ٹیپو سلطان نے بھی پیغام رسانی کے لیے کبوتروں کو استعمال کیا تھا۔ "وہ دارالخلافے سے دیگر مقامات تک پیغام رسانی کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ ایک تیز رفتار گھڑ سوار دارالخلافے سے مطلوبہ مقام تک جو پیغام چار دن میں پہنچاتا تھا، وہی پیغام یہ قاصد کبوتر محض آٹھ گھنٹوں میں مطلوبہ مقام تک پہنچا دیتے تھے۔"(6)

ریشمی کپڑے کے رومال بھی خطوط کی ترسیل کا ایک ذریعہ رہے۔ اپنی نوعیت کا یہ انوکھا واقعہ "تحریک ریشمی رومال" سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریز اگرچہ اپنے مکر و فریب اور چالاکی سے برصغیر پر قابض تو ہو گئے تھے لیکن برصغیر کے مسلمانوں نے اول روز سے انگریزی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ انھوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے تمام مظالم اور سازشوں کا سامنا کیا لیکن ان کے دل ان کی غلامی قبول کرنے کے لیے کبھی بھی تیار نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ 1857ء کی جنگ آزادی سے لے کر تحریک پاکستان تک جتنی بھی مسلمانوں کی تحاریک اٹھیں ان میں سے بیشتر کا نصب العین انگریزوں سے نجات حاصل کرنا تھا۔ حضرت شیخ الہند محمود حسن اور ان کے چند وفادار اور رازدار ساتھیوں نے بھی اسلام کی ترویج و اشاعت اور مسلمانوں کو انگریزوں سے نجات دلوانے کے لیے خفیہ تحریک کا آغاز کیا۔ جسے "تحریک شیخ الہند" کہا جاتا ہے۔ انگریزوں نے اسے "ریشمی خطوط سازش کیس" کا نام دیا اور اب اس کو "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کو "ریشمی رومال" کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ ریشمی رومال پر لکھے ہوئے چند خطوط تھے۔

یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر ہیں۔۔۔ مولوی عبیداللہ نے [یہ] خطوط لکھے تھے۔(7)

ریشمی رومال کی شہرت تو ایک تحریک کی سی ہے لیکن "ریشمی رومال دراصل ایک طرح کا خط تھا جو تحریک کے تمام بڑے عہدے داروں اور ہندو و بیرون کے کمان داروں تک پہنچایا جاتا تھا۔۔۔ اس تحریک کے دوران تمام خفیہ پیغام رسانی کاغذ کی بجائے ریشمی رومالوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ پیغام کو خفیہ اشاروں میں رومال پر ریشم سے کاڑھ دیا جاتا تھا اور پھر پیغام رساں کی صدری کے اندر سی دیا جاتا تھا تاکہ تلاشی ہو تو پکڑا نہ جا سکے۔ اسی باعث یہ تحریک "ریشمی رومال کی تحریک" کے نام سے معروف ہوئی۔"(8)

ان میں پہلا خط جو چھ انچ لمبا اور پانچ انچ چوڑا تھا، شیخ عبدالرحیم کے نام تھا۔۔۔ دوسرا خط جو دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا تھا، حضرت شیخ الہند کے نام تھا، تیسرا خط۔۔۔ بھی حضرت شیخ الہند کے نام تھا، یہ پندرہ انچ لمبا اور دس انچ چوڑا تھا۔(9)

رام سرن نگو محیدہ کے خیال کے مطابق "ریشمی رومال ایک ایسا خوب صورت رومال تھا جس پر وہ ساری بغاوت درج تھی جو مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل میں لکھی تھی۔ عبارت کی زبان عربی تھی اور اسے ایک کاریگر نے رومال پر بُن دیا تھا۔ عبارت کے آخر میں امیر حبیب اللہ خان والیٔ افغانستان، امان اللہ خان، نصر اللہ خان اور عنایت اللہ خان کے دستخط بھی بُن دیے گئے تھے۔ لیکن اس پر زور تک سے ان کے دستخط بھی کروا لیے گئے تھے۔ یہ رومال ایک گز لمبا چوڑا تھا اور دل کش نیل بوٹوں سے بنا گیا تھا۔ ریشمی رومال میں بغاوت کے لیے 19 فروری 1917ء کا دن منتخب کیا گیا تھا۔ اس خط کو ایک نومسلم عبدالحق لے کر پشاور آئے اور پشاور کے خان بہادر حق نواز خان کے حوالے کر دیا۔ پشاور سے یہ رومال سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے پاس پہنچ جاتا ہے لیکن شک کی بنا پر خان بہادر حق نواز خان انگریزی حکم کا

نشانات بن جاتے ہیں۔ ادھر شیخ عبدالرحیم اپنے فقیرانہ بھیس میں اس رومال کو اپنی پرانی میلی گدڑی میں سی رہے ہوتے ہیں کہ اچانک انگریزی فوج ان کے مکان میں داخل ہو جاتی ہے۔ رومال ان کے قبضے میں آ جاتا ہے ۔۔۔ ریشمی رومال کے پکڑے جانے سے بغاوت کا راز کھل گیا۔" (11)

خط ایک آدمی کی دلی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ایک خط پوسٹر کی صورت میں پورے گروہ کی نمائندگی بھی کرنے لگتا ہے۔ اسی خوبی کی وجہ سے کاغذ کا یہ ٹکڑا بعض اوقات کسی تحریک کا اظہاریہ بن جاتا ہے۔ "لال ڈھنڈورا" ایک تحریک نے پوسٹر کی صورت میں اپنا لکھ کر عوام تک اپنی بات پہنچائی۔ "لال ڈھنڈورا" کا اشاعتی مرکز لاہور تھا۔ پنجاب کے انقلابی اسے شائع کر کے عوام میں تقسیم کر دیتے تھے۔ جن دنوں یہ تحریک چل رہی تھی تو سارا پنجاب انقلابی جذبات کی دنیا میں کچھ اس طرح کھو گیا کہ پولیس والے آگ بگولا ہو گئے ۔۔۔ پنجاب میں اس تحریک کے دب جانے سے فرنٹیر میں اس تحریک نے جنم لیا ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ لال ڈھنڈورا کی بجائے "لال جھنڈا" نام تجویز پایا۔ جب پہلا پوسٹر شائع کیا گیا تو اس کے منظر عام پر آتے ہی پولیس کے حلقوں میں افراتفری مچ گئی۔ اتوار کی ایک صبح کو چوک یادگار کے سائن بورڈ پر جو پوسٹر دیکھا گیا اس کا مضمون یہ تھا "لال جھنڈا صوبہ سرحد کے لوگوں کا ترجمان ہے۔ سرحد کے لوگ چاہتے ہیں کہ انگریزوں کو جلد از جلد ہندوستان سے نکال دیا جائے ۔۔۔ سرحد کے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ تمام کام کاج چھوڑ کر حکومت کے خلاف بغاوت کا پرچم اٹھالیں۔" (11)

خط اور اس کے متن کو خفیہ رکھنے کے لیے بھی تجربات کیے گئے۔ ایسا کاغذ جس پر مضمون لکھا ہوا سے لفافے میں بند کیا گیا تو لفافہ کو گرا کر مزید محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی۔ خفیہ خطوط کی ترسیل کا ایک طریقہ یہ بھی رائج رہا کہ صاف سفید کاغذوں کے بنڈل میں خط رکھ کر مکتوب الیہ تک پہنچا دیا جاتا۔ یوں خط اپنے اندر لفظوں کا جہان رکھتے ہوئے بھی بظاہر کورا ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس خط کا استعمال کچھ یوں تھا کہ "ٹاری (ایک کھٹائی) کو گھس کر اس کے لعاب سے سفید کاغذ پر مضمون لکھ دیا جاتا تھا۔ خشک ہونے پر وہ بالکل سفید کاغذ ہی دکھائی دیتا تھا۔ انہی کاغذات کو لوگوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ وہ لوگ کاغذ کو آگ کی روشنی دکھلا کر اسے پڑھتے تھے۔ روشنی سے ٹاری سے لکھے ہوئے حروف کاغذ پر ابھر آتے تھے۔" (12)

گاڑیوں، ریلوے اور جہازوں سے بھی خطوط کی ترسیل ہوتی رہی ہے لیکن موجودہ زمانے میں خط E.mail کے ذریعے بھیجا جانے لگا ہے۔ یہ برق رفتار ذریعہ ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ خط کا جواب فوری طور پر دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے قلم سنبھال کر لکھنے والے بھی بعض اوقات پھسل جاتے ہیں اور ان کے مزاج کا مصنوعی پن نمایاں ہو جاتا ہے۔

خطوط کی ترسیل کا جو بھی طریقہ اختیار کیا گیا ہو اس میں مرکزی کردار ڈاکیا کا ہوتا تھا اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند سطور میں ڈاکیے کی خدمات کا بھی تذکرہ ہو جائے۔

اس کی تنخواہ اور پیشہ تھوڑی رہی ہے لیکن اس نے گرمی، سردی، بارش، دھوپ، آندھی، طوفان، جنگ، امن ہر حالت میں اپنا فرض عمدہ طریقے سے نبھایا۔ آج کل تو فون، واٹس ایپ، مسنجر اور سکائپ وغیرہ پر دور دراز کے عزیز و اقارب سے روبرو بیٹھ کر بات کر لی جاتی ہے لیکن میں آپ کو کچھ عرصہ پہلے کا ایک منظر دکھاتا ہوں۔ یہ منظر پرانے لوگوں کے لیے تو انوکھا نہیں لیکن نئی نسل اسے دیکھ کر یقیناً حیران

ہوگی۔ منظر یہ ہے "لوگ بھی سڑک کے کنارے، آم کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہیں۔ آج ڈاکیے کے آنے کا دن ہے۔ کسی کو اپنے پیارے بھائی کے خط کا انتظار ہے، کوئی ماں اپنے بیٹے کے خط کی راہ تک رہی ہے۔ کتنے دن ہوئے اسے نوکری پر گئے، ابھی تک خط نہیں آیا۔ لو وہ دور سے سڑک پر ایک سایہ نظر آیا۔ لوگوں کی امیدیں بندھ گئیں۔ کون ہو سکتا ہے۔ اس چلچلاتی دھوپ میں آنے والا ڈاکیے کے علاوہ دوسرا ہی موٹے موٹے جوتے، گھٹنوں سے اوپر گھٹنوں تک خاکی پٹی کسی ہوئی، خاکی وردی، بڑا سا صافہ، چمڑے کا بڑا سا تھیلا کندھے پر جھولتا ہوا اور ہاتھ میں موٹا سا لٹھ۔ ہاں آج سے اسی نوے سال پہلے کا ڈاکیا یہی ہے۔ خط لاتا بھی ہے اور لوگوں کے خط لے بھی جاتا ہے۔ ۔۔۔ ڈاکیا بیٹھ گیا۔ کچھ لوگوں نے ۔۔۔ ڈاکیے سے قلم دوات مانگی اور گاؤں کے کسی پڑھے لکھے آدمی سے وہیں جواب لکھوانے لگے۔ ڈاکیے کو جانے کی جلدی ہے، چونکہ اسے ابھی کئی گاؤں اور بھی جانا ہے اور پھر شام تک شہر کے ڈاک خانے بھی پہنچنا ہے۔" (13)

اس وقت بھی جب کہ زمانہ خطوط نگاری کے عہد سے نکلا ہی چاہتا ہے، ڈاکیے کو مرکزی اور خصوصی حیثیت حاصل ہے۔

حوالے

(1) انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم، جلد اول، ولیم ایل لینگر، مترجم: غلام رسول مہر، الوقار پبلی کیشنز واپڈا ٹاؤن، لاہور جون 2010ء، ص 76

(2) غلام حیدر، خط کی کہانی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1994ء، ص 13

(3) علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، جلد اول، دار الاشاعت، اردو بازار کراچی نمبر 1، اگست 1984ء، ص 337

(4) محمد عالم مختار حق، گنجینۂ مہر، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، اگست 2008ء، ص 4

(5) صحافت پاکستان و ہند میں، عبدالسلام خورشید، مکتبہ کاروان، کچہری روڈ لاہور، ص 3

(6) ہسٹوریکل سٹریٹیجک، آرچی میسور، مترجم: محمد زاہد ملک، ادارہ علم و عرفان، اردو بازار لاہور، ص 14، س ن

(7) مولانا سید محمد میاں، تحریک ریشمی رومال، مکتبہ محمودیہ کریم پارک، لاہور اکتوبر 1999ء، ص 183

(8) انجم الشاہدی، مضمون: ریشمی رومال تحریک، شعاع عمل، اپریل 1988ء، کراچی، ص 137

(9) انجم الشاہدی، مضمون: ریشمی رومال تحریک، شعاع عمل، اپریل 1988ء، کراچی، ص 137

(10) رام سراج مجید، اک پار کی یادیں، فکشن ہاؤس لاہور، 2009ء، ص 20

(11) رام سراج مجید، اک پار کی یادیں، فکشن ہاؤس لاہور، 2009ء، ص 71

(12) رام سراج مجید، اک پار کی یادیں، فکشن ہاؤس لاہور، 2009ء، ص 80

(13) غلام حیدر، خط کی کہانی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1994ء، ص 11

◆◆◆

جوشؔ۔ جہانِ فکر و دانش

......1......

مسلم شمیم

حضرت جوشؔ کے سنِ پیدائش کے حوالے سے کوئی متنازع بحث کبھی سامنے نہیں آئی مگر اس باب میں خود حضرت جوشؔ کے یہ فقرے دلچسپی کے بھی حامل ہیں اور معنویت کے بھی:

"**میرا حادثۂ ولادت:** میں اس بوڑھ بھیڑ زندگی کو بھوک لگے اور اس بظاہر رنگین و بباطن خون آلودہ زندانِ کون و فساد اور بجنے کے واسطے کب لایا گیا، اس امر کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا، اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ البتہ میری دادی جان نے، جو خاندان کی مورخ تھیں، مجھے میری ولادت کا جو سنہ بتایا تھا وہ سنہ عیسوی کے حساب سے 1896ء تھا یا 1898ء، یہ بھی یاد نہیں رہا۔ بہرحال اپنی عمر دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے۔ اس سے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں 1896ء میں پیدا ہوا تھا (دو برس اور بوڑھا ہو گیا۔ جانے دیجیے، جوشؔ کی بلا سے!)"۔

مرحوم خلیق ابراہیم خلیق نے اپنی غیر معمولی خود نوشت 'منزلیں گرد کے مانند' کے صفحہ 299 پر حضرت جوشؔ کے حوالے سے ان کا سنِ پیدائش 1898ء لکھا ہے۔ میرے نزدیک 1898ء کا سنہ سر سید احمد خاں کے سالِ وفات کے حوالے سے زیادہ معنویت کا حامل ٹھہرتا ہے۔ میں سر سید احمد خاں کو مسلم تاریخ میں ایک بے حد منفرد منصب پر فائز دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے واحد مفکر، مصلح اور نابغۂ روزگار شخصیت نظر آتے ہیں جو مسلم نشاۃ ثانیہ کے علم بردار رہتے نہ کہ کسی احیائی تحریک کے بانی اور پرچارک۔ سر سید تحریک یا علی گڑھ تحریک میرے نزدیک مسلم معاشرے میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی۔ مذکورہ شخصیت اور تحریک کی پیش رفت میں میرے نقطۂ نظر کے مطابق اس کا روشن ترین اور تاریخ ساز، رجحان ساز پہلو سیکولر اور سائنسی فکر و دانش کی ترویج اور فروغ سے عبارت ہے۔ سر سید نے 1863ء میں اپنے غازی پور کے دورانِ قیام میں جہاں ایک جدید اسکول کی تعمیر و تشکیل کی تھی، وہاں انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی بھی قائم کی تھی اور سائنسی فکر و دانش کے فروغ کے لیے سائنٹفک جرنل کا اجرا بھی اس باب میں پیش رفت کے سفر کا سلسلہ تھا۔ یہاں یہ بات بڑی معنویت کی حامل ہے کہ سر سید کو بھی اپنی اس تحریک اور مبنی بر عقل تفہیمِ دین کے حوالے سے کفر و الحاد کے فتووں سے نوازا گیا تھا۔ انھیں نیچری کہا گیا وغیرہ وغیرہ۔ سر سید کے یہاں یہ سوچ کا دھارا مرزا غالب کی عطا تھا۔ اس ضمن میں "آئینِ اکبری" کی وہ منظوم تقریظ جو مرزا غالب نے سر سید کی درخواست پر لکھی تھی، بڑی کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ اس حوالے سے سید سبطِ حسن کی کتاب 'نویدِ فکر' کے صفحہ 135 سے ایک اقتباس نذرِ قارئین ہے:

"انھوں نے سید احمد خاں کی تصحیح کردہ 'آئینِ اکبری' پر جو منظوم تقریظ لکھی اس کے مطالعے کے بعد تو غالب کی روشن خیالی کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ واقعہ 1855ء کا ہے۔ اس وقت تک

سرسید احمد خاں کو کمپنی کی ملازمت کرتے سولہ سترہ برس گزر چکے تھے مگر ان کی سوچ ہنوز روایتی تھی۔''

تقریظ کی تمہید میں غالب سرسید احمد خاں کی تعریف کرتے ہیں :

''ایک دیدہ ور نے کہنگی کو نیا لباس پہنایا ہے۔ لیکن آئین اکبری کی تصحیح ان کی ہمت والا کے لیے باعث ننگ و عار ہے۔ انھوں نے اس مشغلے سے اپنا دل بے شک خوش کیا مگر میں آئین ریا کا دشمن ہوں لہٰذا ان کے کام پر آفرین نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں تقلید کا چھوڑا ہوں اور اب میں آئین سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ آنکھیں کھولو اور دیر کہن میں دیکھو :

صاحبان انگلستاں را نگر / شیوہ و انداز اینان را نگر / تا چہ آئین ہا پدید آوردہ اند / آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند''

مذکورہ تقریظ کو جو زبان فارسی میں ہے، یہاں نقل کیا ہے۔ اس کا نثری ترجمہ درج ذیل ہے :

''صاحبانِ انگلستان کو اور اس کے شیوہ و انداز کو دیکھو۔ انھوں نے کیسے کیسے آئین وضع کیے ہیں اور ایسے آئین جن کو کسی نے پہلے کبھی نہ دیکھا، یہاں لائے ہیں۔ ان ہنرمندوں نے ہنر کے اصول یکھے ہیں اور اپنے اجداد سے آگے نکل گئے ہیں۔ آئین پر عمل کرنا اس قوم کا حق ہے۔ کسی اور کو ملک کا انتظام اس سے بہتر چلانا نہیں آتا۔ انھوں نے عدل اور داناتی کو ملا دیا ہے اور ہند کو سو گنا ملک آئین بنا دیا ہے۔ لوگ پتھر سے چنگاری پیدا کرتے ہیں مگر یہ ایسے ہنرمند ہیں کہ تنکے سے آگ نکالتے ہیں۔ انھوں نے پانی پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے کہ دھواں کشتی کو پانی پر ہانکتا ہے۔ بھاپ کبھی جہاز کو سمندر میں لے جاتی ہے اور کبھی چیزوں کو بلندی سے زمین پر لے آتی ہے۔ بھاپ کی قوت سے کشتی رفتار پکڑتی ہے اور اس کے سامنے ہوا اور پانی کی لہریں دونوں بے بس ہو جاتی ہیں یہ لوگ ساز بے بلا دستانے کے دھن نکالتے ہیں اور حروف کو پرندوں کی پرواز عطا کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یہ عقل مند لوگ لفظوں کا پیغام لمحوں میں سوکوس تک پہنچا دیتے ہیں۔ ہوا جس کیس کو اس طرح آگ دکھاتے ہیں کہ ہوا انگارے کی طرح دہکنے لگتی ہے۔ یعنی گیس کی روشنی۔ لندن شہر پر نظر ڈالو جو رات کو بغیر چراغ کے جگمگاتا رہتا ہے۔ ہوشیار آدمیوں کے کاروبار کو دیکھو، ایک آئین میں سیکڑوں آئین کی کارفرمائی دیکھو۔ اس آئین کے آگے دوسرے آئین پرانی جنتری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اے میرے بیدار مغز عاقل! کیا تمہاری کتاب میں ایسی دانائی کی باتیں ہیں!! اگر کسی کو موتیوں کا خزانہ دکھائی دے تو وہ کھلیان میں سے ایک بالی کیوں چنے! فیض کے سرچشمے کو مجوس مت جانو! فرمے کے درخت سے سوج رہیے پھل پکا تا ہے۔ مردہ پروری بھی مردہ پرستی کوئی اچھا مشغلہ نہیں تم خود کہو! کیا یہ سب باتیں ہی باتیں نہیں ہیں؟''

گفتگو جوش کے سنِ پیدائش کی چلی تھی یعنی ۱۸۹۸ء میں سرسید کی رحلت کی صورت میں ایک سورج غروب ہوا تھا تو حضرت جوش کی پیدائش کی صورت میں ایک نیا سورج طلوع ہوا تھا میرے نزدیک سرسید کی حیثیت ایک کہکشاں کی تھی جس کے سیارگان میں ایک بڑا سیارہ حضرت جوش تھے۔ جوش کی سوچ کے دھارے اور فکر و دانش کے ڈانڈے سترہ سے شروع ہو کر دائیں روسو بیت پر منتج میں سرسید

سے جانتے ہیں۔ یہ وہ قبیلہ ہے جس کے حوالے سے جرأت انکار کی روایت باتوقیر اور معتبر ہوئی ہے جس کا مسلک و مشرب مذہبی تعصبات سے مبرا اور رسوم و قیود کی پابندیوں سے گریزاں، رنگ و نسل کی تفریق کے منکر، دینی رہنماؤں کی پیروی سے بیزار، فرقے کے گروہ وار توہمات سے متنفر اور اپنے اس مسلک و مشرب پر کاربند رہنے کے لیے ہر قسم کی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے آمادہ و تیار رہا۔ خواہ وہ صبر آزما ہو یا مرحلہ کوفہ و کربلا۔

جوش کی خلاقیت اور شاعرانہ عظمت کا اعتراف جس پیمانے پر ہوا ہے، وہیں ان کی خلاقیت کی وسعت تک نارسائی کے نتیجے میں کچھ ایسی آرا بھی آئی ہیں جو میرے نزدیک محل نظر ہی نہیں بلکہ انھیں میں حتمی رویہ اور جوش کے ساتھ سلوک ناروا سمجھتا ہوں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کی کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' کے صفحہ 447 سے ایک اقتباس پیش کرنا میرے نزدیک معنویت کا حامل ہے:

"جذبہ اور احساس پر عبور حاصل کرنے کے باوجود جوش کا اپنے داخل کے ساتھ رابطہ مضبوطی سے قائم نہیں ہوتا اور وہ اپنی ذات میں گہرا غوطہ لگانے کے بجائے خارجی عوامل سے زندگی متحرک رکھنے اور مایوسی پر غلبہ پانے کی سعی کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ رجائی عمل ہے، تاہم اس قسم کی رومانیت میں شاعری سادہ بیانیہ بن جاتی ہے اور اس کی شخصیت چھپی نہیں رہ سکتی۔ جوش کا المیہ بھی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی پرجلال آواز سے گھن گرج پیدا کی، چھوٹے سے خیال کی وادی کے گرد الفاظ، تشبیہات اور استعارات کا کوئی ہالہ بُن دیا، لیکن جب اس وادی کے داخل میں جھانکنے کی سعی کی گئی تو تخیل گہری تنہائی کے باوجود جلوہ فشاں نہ ہو سکا اور جذبہ لفظوں کی گونج میں گم ہو گیا۔ ڈاکٹر انور سدید کی مذکورہ رائے کی اساس تخلیقی ادب کے بارے میں ان کی معروضیت کے بجائے موضوعیت کو اہم تر منصب دینے پر استوار ہے۔ وہ ایک خاص علاقہ تخلیقی ادب کے ترجمان ہیں جو تخلیقی ادب کو سماجی عمل تصور ہی نہیں کرتا بلکہ تخلیقیت کے جوہر سے متصادم گردانتا ہے۔ ان کے نزدیک معروضی حالات، جنھیں وہ خارجی عوامل کہتے ہیں، عمل تخلیق میں زیادہ قدر و قیمت کے حامل نہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک ذاتی تجربات کی کہیں زیادہ قدر و قیمت ہے۔"

یہاں ان کے ایک معتقد بلکہ پرستار خلیق ابراہیم خلیق کی درج ذیل رائے بھی کچھ اوپر نظر سے میرے نزدیک محل نظر ہے:

"جوش کے تخیل میں جو بلندی ہے، وہی ان کے علم میں وسعت اور فکر میں گہرائی ہوتی تو وہ غالب اور اقبال کے ہم پلہ ہوتے، تاہم وہ بڑے ہی نہیں بہت بڑے شاعر ہیں۔ فراق، جو خود عظمت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں، انھیں شاعر اعظم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ آرائش و زیبائش الفاظ و تراکیب اور نادر و نایاب تشبیہات، استعارات جوش کے سامنے صف بستہ کھڑے رہتے تھے۔ الفاظ کا جو ذخیرہ ان کے پاس تھا، وہ شاید ہی کسی اور کے پاس ہو، یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی وہ ان کی فضول خرچی پر اتر آتے تھے۔"

مجھے جوش کے حوالے سے ان کے علم میں وسعت اور فکر میں گہرائی کے فقدان کی بات بھی تسلیم نہیں اور لفظوں کی فضول خرچی کی بات بھی۔ مجھے وہ اقبال سے جداگانہ جہانِ فن کی شخصیت نظر آتے ہیں، کیونکہ جوش کے یہاں مابعد الطبیعاتی دنیا (Metaphysical

(World) کی جلوہ سامانیاں نظر نہیں آتیں بلکہ وہ جہانِ آب و گل کی جلوہ سامانیوں کے مصور اور نقش نگار ہیں۔ وہ جہانِ غالب کے سرخیلوں میں سے ہیں اور انھیں اس قبیلے میں ایک منفرد اور ممتاز منصب حاصل ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق جوش کا پہلا مجموعہ نظم و نثر 'روحِ ادب' 1921ء میں شائع ہوا تھا اور اس کا دوسرا ایڈیشن 1942ء میں چھپا۔ 1936ء میں ان کے دو شعری مجموعے 'شعلہ و شبنم' اور 'نقش و نگار' اشاعت پذیر ہوئے۔ 1937ء سے 1947ء تک جوش کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہوئے جن کے نام یہ ہیں: 'فکر و نشاط'، 'جنون و حکمت'، 'حرف و حکایت'، 'آیات و نغمات'، 'عرش و فرش'، 'رامش و رنگ'، 'سنبل و سلاسل' اور 'سیف و سبو'۔ آخر الذکر مجموعہ ان کے اس وقت تک کے کلام کا انتخاب تھا۔ "کلیم" دہلی میں چھپنے والے جوش کے تحریر کردہ اداریے 'اشارات' کے نام سے 1942ء میں شائع ہوئے۔ آزادی کے بعد 1980ء تک ان کی نظموں کے تین مجموعے 'سرود و خروش'، 'سموم و صبا'، 'الہام و افکار'، ایک طویل مسدس 'طلوعِ فکر'، رباعیات کا مجموعہ 'نجوم و جواہر'، مراثی کا مجموعہ 'جوش ملیح آبادی کے مرثیے'، ان کی خود نوشت سوانح عمری 'یادوں کی برات' شائع ہوئی۔ طویل نامکمل تصنیف 'حرفِ آخر' بھی شامل ہے جس کے تین ہزار اشعار وہ کہہ چکے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت ہنوز نہیں ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ متعدد غیر مطبوعہ تصانیف محروم توجہ ہیں۔

آج میرا موضوعِ گفتگو جوش اور ان کا جہانِ فکر و دانش ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ان کی شخصیت کی جامعیت اور ہمہ جہتی کا سب سے زیادہ توانا اور روشن اظہار ان کی شاعری میں ہوا اور اس ضمن میں میں یہ کہنے کا استحقاق رکھتا ہوں کہ جوش کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف جس پیمانے اور جن جہتوں میں ہونا چاہیے تھا، وہ یقیناً نہیں ہوا تھا۔ ان کی شاعرانہ خلاقیت کا بہتوں کو ادراک نہیں ہوا جن میں برصغیر کے بیشتر اربابِ نقد و نظر شامل ہیں۔ جوش کے ہاں تخلیقیت اور تخیل کی طغیانی ہم سفر رہتی ہے اور یہ طغیانی کسی تند و تیز دریا کے مانند نظر آتی ہے، چنانچہ بعض ناقدین کو کلامِ جوش میں گھن گرج سنائی دیتی ہے اور بعض کو الفاظ کی فضول خرچی نظر آتی ہے۔ یہ دونوں حلقے جوش کی خلاقانہ جہتوں کی بصیرت سے محروم اور نارسائی کے دام میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ میرا موضوعِ گفتگو کلامِ جوش کی تجزیاتی اور الہاماتی گوشوں کو اجاگر کرنا نہیں ہے بلکہ ان کے جہانِ فکر و دانش کے حوالے سے اپنے تمام تر فکری اور علمی محدودات کے ساتھ کچھ معروضات پیش کرنا مقصود ہے۔ بہرحال میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جوش کی شاعری کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ ہر نگاہِ نقد و نظر شاید اس کے اظہار کی تاب لانے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ اسے محیط کرنے کی جسارت۔ کلامِ جوش میں آغازِ سفر سے انجامِ سفر تک فکر و فن کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ فیضانِ فکر کا کرشمہ تھا، کیونکہ تو بقول جوش: "میں نے شاعری کی تمنا کبھی نہیں کی بلکہ شعر خود خواہش آ کر دروں ملا"۔ یہ اظہار مرزا غالب کا ہے اور برحق ہے۔ یہ کہنا بے محل نہیں کہ حضرت جوش بھی مرزا غالب کی طرح 'عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ' تھے۔ جوش کے جہانِ فکر و دانش کی سرحدیں ان کی شاعری کے علاوہ ان میں بھی پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی نثری نگارشات میں بھی۔ اس باب میں میرا مرکزِ توجہ ان کی خود نوشت 'یادوں کی برات' ہے جس کے بارے میں عمومی رائے یہ ہے کہ "یادوں کی برات" لکھ کر جوش نے اپنی جگ ہنسائی کی ہے۔ حضرت جوش کے معتقد و معترف خلیق ابراہیم خلیق نے بھی کچھ اسی قسم کی رائے کا اظہار درج ذیل اقتباس میں کیا ہے:

"جوش کی زندگی میں جو نظم و ضبط تھا وہ میں نے کسی اور اردو کے شاعر میں نہیں دیکھا۔ وہ وقت کے سختی سے پابند تھے

اور ان کے روز مرہ کے معمولات میں بڑی باقاعدگی تھی۔ ان کی زندگی اور ان کے کلام کو دیکھ کر ان کی شخصیت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، ان کی خود نوشت سوانح حیات 'یادوں کی برات' اسے پاش پاش کرتے ہوئے بھی نظر آتی ہے۔ 'یادوں کی برات' نہایت مایوس کن کتاب ہے۔ اسے عظیم شاعر کی خود نوشت سے پڑھنے والا جو توقعات وابستہ کرتا ہے، وہ نہ صرف پوری نہیں ہوتیں بلکہ اس کے مذاقِ سلیم کو بھی ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے معاشقوں کو جو غیر ضروری اہمیت دی ہے اور ان کا ذکر جس انداز سے کیا ہے، وہ ان کے زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیبی پس منظر کا ایک ناپسندیدہ ورثہ ہے۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ انھوں نے اپنی کمزوریوں کو ذرا بھی لگی لپٹی رکھے بغیر بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ یہ ان کے ظاہر و باطن کے ایک ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔''

مجھے اس قسم کی آرا سے شدید اختلاف ہے اور میں انھیں مسترد کرتا ہوں۔ میرے پاس اس باب میں کہنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میرے مطالعے میں مختلف ادوار میں متعدد خود نوشت سوانح عمریاں آئی ہیں جن میں جوش صاحب سے زیادہ کھلے انداز کلام کے ساتھ اپنی نجی زندگی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن میں جنسی معاملات و تعلقات بھی شامل ہیں۔ عالمی ادب کے کئی نام اس فہرست میں شامل ہیں جن میں گوئٹے اور ٹالسٹائی جیسے معروف نام بھی شامل ہیں۔ گوئٹے نے اپنے سترہ معاشقوں کا بالتفصیل بیان شاملِ داستانِ حیات کیا۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں گوئٹے کی سالگرہ کی تقریب میں جرمن قونصل جنرل نے بڑے فخر اور بڑی صراحت کے ساتھ گوئٹے کے مذکورہ سترہ معاشقوں کا ذکر کیا اور شرکائے اجلاس کو شاد کام کیا جو تھی کہ اس عظیم المرتبت شاعر پر جرمن معاشرے میں کوئی انگشت نمائی نہیں کی جاتی اور وہ جرمن قوم کا قیمتی ثقافتی سرمایہ اور ورثہ ہیں۔ روسی نابغۂ روزگار تخلیق کار ٹالسٹائی کی سوانح حیات میں یہ تحریر درج ہے:

''آج اس کی منگنی ہو رہی تھی۔ محل کے بڑے ہال میں شاہی خاندان سے رابطہ رکھنے والے مہمانوں کا ہجوم تھا۔ اس کی اٹھارہ سالہ ہونے والی بیوی خوب صورت لباس میں اور بھی خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی ڈائری لے کر آگے بڑھا۔ ڈائری جو وہ برسوں سے لکھ رہا تھا جس میں حیا سوزی، نوکرانیوں کے ساتھ اپنی جنسی غلط کاریوں کی بھی تفصیل لکھی ہوئی تھی، ان عورتوں کے نام بھی تھے جن کے ساتھ ان کے ناجائز تعلقات تھے، ایک ناجائز بیٹے کا ذکر بھی تھا، جوا کھیلنے کی تفصیل بھی درج تھی، قحبہ خانوں میں آنے جانے کا ذکر بھی تھا اور وہ سب کچھ تھا جسے پڑھ کر کوئی لڑکی خودکشی تو کر سکتی ہے مگر شادی کے لیے ہاں نہیں کر سکتی۔ بہرحال وہ آگے بڑھا اور ڈائری اپنی منگیتر کے ہاتھ میں دے دی اور کہا اسے پڑھ لو، اگر پھر بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

لڑکی نے رات ڈائری پڑھ کر اور رو رو کر گزاری۔ وہ صبح اٹھی، آنسو پونچھے اور شادی کے لیے ہاں کر دی۔ لڑکی کا نام صوفیہ تھا اور ڈائری دینے والا سچا اور صاف گو آدمی ٹالسٹائی تھا۔ شادی کے بعد دونوں نے بہت خوش گوار زندگی بسر کی۔ ٹالسٹائی روسی زبان کے ادبِ عالیہ کا نشان اور علامت ہے اور روسی قوم کو اس پر اسی طرح فخر ہے جس طرح گوئٹے پر جرمن قوم کو۔ روسو نے جس کا یہ فقرہ کہ Man is born free but everywhere he is in chains زبان زدِ خاص و عام ہے، اپنی زندگی کے حالات کے بیان میں اپنے ان جنسی

تعلقات کا ذکر بھی کیا ہے جو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے سے پہلے کے ہیں، جو ربع صدی پر محیط تھے اور جن کے دوران میں اُن کے متعدد بچے پیدا ہوئے اور زندگی کے آخری ایام میں اُس نے اُس خاتون کے ساتھ رشتۂ ازدواج کی رسوم ادا کیں۔ برطانوی مستشرق رالف رسل نے اپنی کتاب حیات میں بڑی تفصیل سے اپنی جنسی غلط کاریوں اور اپنے جنسی تعلقات کا بیان کیا جو متعدد خواتین کے ساتھ قائم ہوئے تھے۔ مہاتما گاندھی نے بھی اپنی خود نوشت سوانح حیات 'My Early Life' میں اپنے لڑکپن کی غلط کاریوں کا ذکر کیا ہے جن میں کچھ چوریوں کا بیان بھی شامل ہے۔ مذکورہ شخصیات کے حوالے سے جو موقف میں نے اختیار کیا ہے وہ غیر مبہم ہے۔ حضرت جوش عندلیب گلشن ناآفریدہ تو تھے ہی وہ ایک ایسے گلشن کے عندلیب بھی تھے جس کی فضا اور ماحول میں وہ اجنبی تھے اور وہ فضا اور ماحول اُن کے لیے اجنبی۔ سو ''یادوں کی برات'' کے حوالے سے جو ردعمل اور حضرت جوش کے حصے میں جو سنگ وحشت کی برق و باراں آئی، وہ ناقابل فہم نہیں ہونا چاہیے۔

''یادوں کی برات'' کے حوالے سے میری یہ رائے سوچی سمجھی اور سنجیدگی کی ترجمان ہے کہ اردو زبان میں ایک منفرد اور مکمل خود نوشت سوانح حیات ہے، اور تمام کی تمام تحریر Guarded Moments کی بجائے Unguarded Moments کا برجستہ اظہار و بیان ہے اور صاحب تصنیف کو کسی مرحلے میں مصلحت اندیشی اور مذہبی احتساب کی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ مرحوم جسٹس م۔ آر۔ کیانی کی کتاب شائع ہونے والی تھی اور اس کا نام 'Whole Truth' تجویز کیا گیا تھا۔ چونکہ اُس وقت آمر ایوب خان کو اندازہ تھا کہ اس کے مندرجات کیا ہوں گے لہٰذا انھوں نے اُسے کسی مقرب خاص کے ذریعے نام کی تبدیلی کی تجویز کیانی صاحب کی خدمت میں رکھی تو انھوں نے تجویز قبول کرتے ہوئے کتاب کا نام 'Not the hole truth' یعنی پورا سچ ہے، اور پورا سچ لکھنا اور کہنا غیر معمولی شخصیات کے بس کی بات ہوتی ہے۔ اس تناظر میں بھی حضرت جوش ایک غیر معمولی شخص تھے، اور اس منصب پر فائز آدمی کا متنازعہ ہونا قطعی قرین قیاس ہے۔ کیوں کہ بلاشبہ دنیا کے تمام لوگ اور تمام غیر معمولی شخصیات متنازعہ ہوتی ہیں اور وہ اس لیے متنازعہ ہوتی ہیں کہ نئے خیالات اور نئے نظریات کی علم بردار ہوتی ہیں۔ ایسی شخصیات کے خیالات و نظریات جو اُس وقت کے روایات اور تصورات سے متصادم ہوتے ہیں لیکن آگے چل کر وقت اور حالات ان کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں، یعنی کل کی متنازعہ شخصیات آنے والی کل میں عظیم انسان تسلیم کی جاتی ہیں، چاہے وہ مفکر و دانش ور ہوں یا محقق کار، سیاسی اور انقلابی لیڈر ہوں یا سائنس داں۔ اسی پس منظر میں غالباً جارج برنارڈ شا نے کہا تھا کہ All great truths start as blasphemies یعنی تمام بڑے سچ شروع میں کفر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، جوش کا تعلق شیعہ مسلک سے ہے، پر سچائی کے اظہار میں انھوں نے سنت سقراطی کی پیروی کرتے ہوئے اپنے مذہبی معتقدات کے بیان میں بھی کسی مصلحت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا ہے۔ ''یادوں کی برات'' کی بہت ساری جہات ہیں۔ برصغیر کی ثقافت، رسم و رواج اور تہواروں کی داستان سرائی اور ان سے وابستہ اقدار و روایات کی ترجمانی اور تصویر کشی اس کتاب کی نمایاں خصوصیت اور روشن ترگوشے ہیں۔ ''یادوں کی برات'' کے ابتدائی صفحات میں 'خود شناسی' کے عنوان کے تحت حضرت جوش نے اپنے فکر و احساس کی دنیا اور اس کے سرچشموں کا بیان جس بے باکانہ انداز میں کیا ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ اپنے عقائد و افکار کے ارتقائی سفر پر طائرانہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"میرے دل میں جوانی آتے ہی دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا اور میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی کہ میں بعض مسلمات کا مذاق اڑاتا ہوں تو انھوں نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر فرمایا تھا: مجھے اس کا خوف ہو گیا ہے کہ تو آگے چل کر گم راہ ہو جائے گا (اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا اور میں گم راہ ہو گیا۔ اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار)۔

ستاروں کے مشاہدے سے میرے تفکر کی ابتدا ہوئی تھی۔ ستارے دیکھ کر بار بار سوچتا تھا کہ یہ ہیں کیا، ان کی چمک دمک کا راز کیا ہے، انھیں کس نے بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے۔ شاید یہ تارے ہی ہیں جو سب سے پہلے بچوں کا دل موہ کر ان سے پوچھتے ہیں: ننھے میاں! بتاؤ، ہم کیا ہیں؟ جب سن آگے بڑھا فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا۔ پورے نظامِ شمسی پر نظر پڑنے لگی اور اس بات کی دھن لگ گئی کہ علت العلل کا سراغ لگاؤں، ذات و صفات کے تمام مسائل کو آنکوں، پلٹوں، پچھاڑوں، کھرچوں، کریدوں، دیکھوں، تولوں، جانچوں، پرکھوں، ٹھونکوں، بجاؤں، کوٹوں، چھانوں، چکھوں، رساؤں، بچھوڑوں، پچھوں، سونگھوں، چباؤں، دستوں اور دیکھوں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اندھیری راتوں کو جب ستاروں بھرے آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا تو بار بار یہ سوال دل کو برمانے لگتا تھا کہ ارے، یہ سب کچھ کیا ہے، سب کچھ ارادی ہے کہ اتفاقی، یہ سب کچھ کسی حکیم و عادل کا کارخانہ ہے یا کسی اندھی توانائی کی اندھا دھند اچھل کود، اور یہ سب کچھ آخر ہے کیوں، اس کی پشت پر آخر کوئی مقصد ہے کہ نہیں، اور اپنے رب کی موجودگی میں یہ بے چارے مرعوب اس قدر پامال و معتوب کیوں ہیں۔ میں نے ان مسائل پر غور کیا، بار بار غور کیا، دم گھٹنے تک غور کیا۔ اس کوچے میں برسوں پاپڑ بیلے، کتابوں پر کتابیں پڑھیں، ہندو، مسلم، یہودی، زرتشتی، بدھی، جینی اور عیسائی علما کے سامنے برسوں، دریوزہ گروں کے مانند کاسہ بدست علم کی بھیک مانگی، آگاہی کے واسطے ان کے آستانوں پر ناک رگڑی، گڑگڑا کر دامن پھیلایا، لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد مدعیانِ معرفت، یعنی صوفیا و مشائخ کے دروازے کھٹکھٹائے، ان کی جوتیاں سیدھی کیں، لیکن چند اشراقی اشاروں کے سوا کچھ بھی پلے نہ پڑا، اور وہ اشارے بھی کیا سارے کے سارے جذباتی فریب۔"

مندرجہ بالا طویل اقتباس کی روشنی میں حضرت جوش کے جہانِ فکر و دانش کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ اقتباس کے ایک حصے کے مطالعے کے وقت حضرت ابراہیمؑ کے حوالے سے آسمانی صحیفوں میں جو کچھ بیان کیا گیا، وہ لوحِ ذہن پر منقش ہوا اور یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو کن مرحلوں سے گزر کر وجودِ باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوا اور عقیدۂ توحید کی بنیاد پڑی۔ جن مراحلِ فکر و نظر سے حضرت ابراہیمؑ گزرے، میرا خیال ہے کہ تمام بانیانِ ادیان و مذاہب ان جیسے مرحلوں سے دوچار ہوئے ہوں گے اور اپنے اپنے تجربات، مشاہدات اور تجسس کے حاصلات کی روشنی میں اپنے اپنے ایمان و ایقان کی منزلوں پر پہنچے ہوں گے۔ کپل وستو کا شہزادہ سدھارتھ ان مرحلوں سے گزر کر گوتم بدھ (483ق م ۔ 563ق م) بنا ہوگا اور گیان اور نروان کے حصول کا پرچار شروع کیا ہوگا۔ مہاویر جین (527ق م ۔ 599ق م) نے بھی انھی مراحل سے دوچار ہو کر اپنے مسلک و مذہب کا تعین کیا ہوگا۔ چینی فلسفی کنفیوشس (479ق م ۔ 551ق م)، چینی مصلح و مفکر Lao Tzu (چھٹی صدی قبل مسیح) نے بھی اپنے اپنے دور میں معاملاتِ تحیر و تفکر پر ریاضت و استغراق کی منزلیں طے کی ہوں گی اور چینی قوم کی دینی اور دنیوی رہنمائی کے ضوابط اور اوامر و نواہی کے معیارات طے کیے ہوں گے جن کی آج بھی چینی عوام کی ایک بڑی تعداد پیروکار ہے۔ گوتم بدھ نے تصورِ الٰہ اور وجودِ باری کے بارے میں اپنے پیروکاروں کے استفسار کے جواب میں کہا کہ اس باب میں سوچنے اور الجھنے کے بجائے

اپنے عمل خیر پر تقیہ دو اور ثروان کے حصول کے لیے ان اصولوں اور ضابطوں پر کاربند رہو۔ تمہارا اہم مرتبہ یعنی فرائضِ منصبی ٹھہرتے ہیں۔ زرتشت (Zoroaster)(551ق م۔628ق م) نے اس باب میں خیر و شر کے حوالے سے اہرمن و یزداں کے تصورات کی روشنی میں یزداں کی پرستش میں خیر کی راہ اور نجات بتائی۔ حضرت جوشؔ نے مذکورہ اقتباس میں سارے سوالات اٹھائے ہیں جو روزِ اول سے سوچنے والے اذہان کے افق پر ابھرتے رہے ہیں۔ جوشؔ بھی اُن غیر معمولی شخصیات کے افکار و نظریات اور معتقدات کے خوشہ چیں تھے جو تاریخِ انسانی اور تمدن و تہذیبِ انسانی کے ارتقائی سفر میں رہنمائی کے وسیلے ثابت ہوئے۔ بیسویں صدی میں عالمی تناظر میں جوشؔ کے سیکڑوں معاصرین کائنات، تخلیقِ کائنات اور خالقِ کائنات کے بارے میں اپنے اپنے انداز میں اپنی جستجو کے تانے بانے بنتے رہے۔ اُن میں برٹرینڈ رسل بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتاب "Why I am not a Christian?" میں اپنی فکری دنیا کی سرگرانی اور پریشانی کا بیان کرتے ہوئے یہاں تک لکھ ڈالا کہ Bible is a pack of lies۔ یعنی انجیلِ مقدس جھوٹ کا پلندا ہے۔ رسل کی یہ رائے یورپ کی وساطت سے ساری دنیا تک پہنچی، مگر ان کو کسی آزمائش سے گزرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسے مغربی معاشرے کی روشن خیالی، خرد افروزی اور تحقیق پسندی کی روش اور روایت کی پاس داری کہا جائے گا۔ مگر یاد رہے کہ یورپ کے معاشرے کو اس منزل تک پہنچنے میں کم از کم صدیوں کا سفر طے کرنا پڑا تھا ورنہ یورپ میں عموماً اور اسپین میں خصوصی طور پر مذہبی احتساب (Inquisition) کے نتیجے میں ہزاروں لوگوں کو بدعقیدگی کے الزام میں موت کے گھاٹ اتارا گیا اور زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ برونو کو بھی آگ میں زندہ جلا دیا گیا اور گیلیلیو کو بھی قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان جملہ ہائے معترضہ کی روشنی میں 'خود کشائی' کے زیرِ عنوان درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور جوشؔ کے اندیشہ ہائے دور و دراز کا اندازہ لگایئے:

> "ذہنِ انسانی میں مسلسل ارتقا برابر جاری ہے۔ آپ کی موت کے سو دو سو برس کے بعد شاید انسان کا ذہن اس سطح پر آ جائے گا کہ وہ آپ کے متعلق فیصلہ کر سکیں، اس لیے سرِدست دانش مندی یہی ہے کہ آپ گو مگو میں رہیں۔ عقل کا مشورہ یادن تو یہ ہے، پاداری کا ہے۔ اس کی معقولیت میں شبہ کرنا حماقت ہے لیکن میں اس وقت اعراف میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ایک طرف مجھ کو کھلائے شاعرانہ ہے، ایک طرف قوسِ عقلِ سلیم۔ جب انا کی طرف سے ہوا آتی ہے تو ذکریا دون گرتا ہو جاتا ہوں اور جب عقل کی جانب سے ذرا سی تبدیلی آتی ہے تو تشکر کر پاشیہ بن جاتا ہوں۔ دوگمی میں ہمارا آشیانہ ہے۔"

جوشؔ کے اپنی شاعرانہ عظمت کے باب میں اس اظہار کو ان کے جہانِ فکر و دانش پر منطبق کیا جائے اور کسی نتیجے پر پہنچیے کیونکہ ان کی تخلیقات، جن شاعری کی دنیا میں در اصل ان کے متنازعہ افکار و نظریات کی گونج کا ہم بہ ہم سنائی دیتی ہے جو تخلیقات جوشؔ کی متاعِ بے بہا بھی ہے۔ حضرت جوشؔ نے 'خود کشائی' کے باب میں، جو چند صفحات پر محیط ہے، اپنے جہانِ فکر و دانش کی تمام جہات کا اجمالی اختصار کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ ان کے جہانِ فکر و دانش میں انسان دوستی، آفاقیت اور سیکولرازم کے نظریات کی بھرپور عمل داری نظر آتی ہے۔

(جاری ہے)

تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

حسن عسکری کاظمی

ہمارے کلاسیکی اور غزل گو شعرا کی سرپرستی مختلف رئیسوں، نوابوں، درباروں کی طرف سے ہوتی رہی۔ یہ روایت فروغ اردو کا سبب بنی اور سرپرستوں کے ادبی ذوق کا نشان امتیاز بنی۔ مغل حکومت کے آخری ایام میں قلعۂ معلّٰی سے لے کر حیدرآباد (دکن) اور ریاست رام پور تک ہر مقام شاعروں، دانشوروں اور ادیبوں کی آماجگاہ رہی جہاں سے ان کے وظائف یا اعزازی عہدے ادب نوازی کا سبب بنے۔ نواب مرزا داغ کی مثال ہمارے پیش نظر ہے کہ وہ ابتدائی ایام میں قلعۂ معلّٰی ہی میں پرورش پاتے رہے جہاں آخری مغل بادشاہ کے استاد ابراہیم ذوق کے سامنے مرزا داغ نے زانوئے تلمذ تہ کیے۔ ان کی شاعری اور زبان و بیان کی اصلاح کے لیے بہترین مواقع حاصل ہوئے۔ یہ سلسلہ تلمذ تقریباً دس بارہ برس قائم رہا۔ خاقانی ہند حضرت ابراہیم ذوق کی شاگردی میں کیا کچھ سیکھا اس کا اندازہ "گلزار داغ" سے لگایا جا سکتا ہے۔ داغ تک بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ زبان میں نفاست، سلیقہ مندی، رکھ رکھاؤ اور لسانی اوصاف خصوصاً روزمرہ اور محاورہ بندی میں داغ نے ایک منفرد مقام پایا۔ قلعۂ معلّٰی میں جشن و نشاط، عشقیہ روابط اور آزادانہ میل ملاپ سے ان کی شاعری میں رنگ و آہنگ اور طرز احساس کی کارفرمائی سے عوام و خواص کے دلوں کو بہلایا گیا۔ ان کا یہ انداز کہنے کی طرف دھیان ہی نہ گیا۔ نیاز فتح پوری کا یہ کہنا بجا ہے کہ "داغ بہت کم عمر ہی میں قلعہ کی اس فضا میں پہنچ چکے تھے جہاں انسان قبل از وقت جوانی اور جوانی سے پہلے کام اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔" داغ نے اپنے عہد شباب میں ایسے مشاعروں میں بھی شرکت کی جہاں انھیں غالب، مومن، ذوق، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور امام بخش صہبائی جیسے اساتذۂ فن کی صحبت نصیب ہوتی رہی۔ اسی طرح دلی شہر میں ہونے والی تقاریب میں آنا جانا رہا جہاں ان کی بھرپور پذیرائی ہوتی رہی۔ ایسا بھی ہوا کہ سامعین دوسرے شعرا سے بڑھ کر ان کی غزل کو پسند کرتے اور دل کھول کر داد دیتے یہاں تک کہ بادشاہ بہادر شاہ نے داغ کی شاعری سن کر انھیں ذوق کی طرح اپنے پہلو میں جگہ دینے کی خواہش کی اور داغ کی پیشانی چوم لی۔ یہ حسن سلوک اس لیے بھی روا رکھا گیا کہ داغ کے والد گرامی نواب شمس الدین کے انتقال کے بعد ان کی والدہ 1844ء میں ولی عہد سلطنت غلام فخرالدین صاحب عالم کے نکاح میں آ گئیں۔ اس وقت داغ کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ شاہی خاندان کے افراد میں انھی مراعات کے مستحق قرار پائے جو دوسروں کو حاصل تھیں۔ قلعۂ معلّٰی میں عیش کی زندگی اپنی جگہ مگر سب سے اہم بات یہ کہ شعر و سخن میں انھیں استاد تسلیم کیا گیا۔ ان کے اشعار میں ہم عصر شعرا سے بڑھ کر شوخی، تیزی، طراری اور زبان کی جملہ خصوصیات نظر آنے لگیں۔ یہاں تک کہ مرزا غالب نے بھی ان کی غزل کی تعریف کی۔ وہ خود بھی ذوق کے انتقال کے بعد مرزا غالب سے اپنے تعلقات بڑھانے لگے یہاں تک کہ غالب کے ساتھ شطرنج کھیلنے اور غالب کی سہل ممتنع غزلوں کی زمین میں طبع آزمائی کی۔

مرزا داغ دہلوی صورت حالات منقلب ہونے پر رام پور چلے گئے جہاں انھوں نے اپنی شاعری کی قدر دانی اور عزت افزائی کا

یہ رنگ بھی دیکھا کہ نواب کلب علی خان نے ان کو اپنا مصاحب بنایا وہ ان کے معتمد خاص بن کر رہے۔ داغ نے وہاں شاعروں میں خاصی مقبولیت حاصل کی، وہ سامعین کا مزاج پہچانتے اور ایسے اشعار پڑھتے جو سنتے ہی سمجھ میں آ جاتے۔ عام فہم، سادہ اور زبان کی صحت کو پیش نظر رکھتے۔ ان کی شاعری میں کوئی گہرائی یا فلسفیانہ نکتہ آفرینی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ وہ عمومی رویوں اور سیدھی سادہ باتوں کو شعری لبادہ اوڑھا جاتے ہیں۔ محاورہ اور روزمرہ کا استعمال داغ یا ذوق کا کمال فن ہے۔ داغ نے شعر کہتے ہوئے صرف یہ خیال سامنے رکھا کہ اسے پڑھنے یا سننے والا محظوظ ہو جائے۔

ملی ہم کو جنت قیامت کے بعد ملے کیا خدا جانے جنت کے بعد

کہا ظالم نے میرا حال سن کر وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

شب ہجراں سے موت بہتر ہے خواب آرام سے تو آئے گا

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم معاشرہ سطحی انداز فکر کے سبب تعیش پسندی میں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا بیٹھا تھا۔ احساس زیاں سے بیگانہ وار زندگی بسر کرنا اور شاعری میں عشق و محبت اور دل کی بربادی جیسے مضامین باندھے جا رہے تھے۔ داغ کی غزل میں بھی یہی پایا گیا کہ

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا تمام رات قیامت کا انتظار کیا

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ زوال پذیر معاشرے میں فنون لطیفہ خصوصاً شاعری کا معیار تمام تر توجہ کے نتیجے میں اپنے کمال پر نظر آتا ہے مگر یہ خیال جزوی طور پر درست ہوگا ورنہ علوم و فنون عدم سرپرستی کے سبب خستہ و خراب ہو جاتے ہیں البتہ زبان و بیان میں نکھرنے کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ مرزا داغ دہلوی کی غزل میں فکر و خیال یا نفس مضمون میں ندرت نہ ہونے کے برابر نظر آئے گی، وقتی باتیں مگر خالص دہلوی زبان اور محاورہ اور اس کا برمحل استعمال قابل تعریف اور بطور سند دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وصف ان کی شہرت کا باعث بنا کہ برجستگی اور شوخی کے ساتھ محاورہ روزمرہ کا جوہر ان کی پہچان بن گیا۔

کیا کیا ملائے خاک میں ارمان چاہ نے سچ پوچھیے اگر تو زمیں آسماں ہے اب

وصل کے باب میں کی عرض تو ہنس کر بولے کیوں مرے جاتے ہو، ہو جائے گا، ہو جائے گا

یہ شوق یہ ارمان یہ حسرت یہ تمنا کیا ہو مرے قابو میں تم آ جاؤ اگر آج

مرے حال پہ رحم آ ہی گیا   وہ چل کر پلٹ آئے رخصت کے بعد

مرزا داغؔ کی غزل کے پیچیدہ پیچیدہ اشعار باذوق قارئین کو زبانی یاد ہیں۔ ان کے اشعار میں وہی بات اظہار پاتی ہے جو عوام و خواص کی زندگی میں باہمی میل ملاپ میں اور صبح و شام آنے جانے والوں کے احوال سے مطابقت رکھنے کے حوالے سے قابلِ فکر رہتی ہے۔ داغؔ کا طرزِ احساس انہیں کسی ایسی الجھن میں مبتلا ہونے سے مانع ہے جو انہیں رنجیدہ کر دے یا انہیں ناامیدی سے دوچار کر دے اس لئے داغؔ کا لہجہ جانی رہا اور وہ ہمیشہ غزل کہتے ہوئے آسودہ، بےکراں کامیابی کا تصور کرتے رہے۔

وہ کون تھا کہ تمھیں جس نے بے وفا جانا   خیالِ خام یہ سودائے خام کس کا تھا

تم تو ہو جان اک زمانے کی   جان تم پہ نثار کون کرے

عذر آنے میں بھی ہے اور بلاتے بھی نہیں   باعثِ ترکِ تعلقات بتاتے بھی نہیں

آپ کا اعتبار کون کرے   روز کا انتظار کون کرے

مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور سات سمندر پار سے آتے ہوئے سفید فام حکمرانوں کا فرمان جاری ہوا تو بہت سے لوگوں نے عافیت جانی اور وہ شعرا جو کل تک بہادر شاہ کے قصیدے لکھتے رہے، آج وہ ملکہ وکٹوریہ کی شان میں مبالغہ آرائی کرتے ہوئے ایسے قصیدے تیار کرنے لگے جن میں وہی غلو دیکھنے میں آیا جو اب سے پہلے مغلیہ بادشاہ کی شان میں دیکھا گیا۔ یہی حسنِ غلو داغؔ کے ہاں غزل میں رومانوی فضا کو سازگار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ محبوب کے حسن و جمال کا ذکر کرتے یا دل پر گزرنے والی کیفیت کا بیان ہو داغؔ اپنے فنی کمال کے اظہار میں دوسرے معاصر شاعروں سے مختلف اور منفرد نظر آتے ہے۔ داغؔ ایسے اشعار پڑھتے ہوئے سامعین پر سحر طاری کر دیا کرتے۔

دل چرا کر نظر چرائی ہے   لٹ گئے، لٹ گئے دہائی ہے

اس طرح ناز اہلِ ناز کریں   بندگی ہے کہ یہ خدائی ہے

ہجر میں زہر کھا کے مر جاؤں   موت کا انتظار کون کرے

لوگ کہتے ہیں چپ لگی ہے تجھے   حالِ دل بھی سنا کے دیکھ لیا

وہ زمانہ نظر نہیں آتا   کچھ ٹھکانہ نظر نہیں آتا

جان جاتی دکھائی دیتا ہے ان کا آنا نظر نہیں آتا

مرزا داغ بہترین لباس زیب تن رکھتے۔ عمدہ خوراک جیسے پلاؤ، کباب اور قورمہ ان کی پسندیدہ غذا تھی۔ اسی طرح لباس کا خاص خیال رکھتے۔ شیروانی، ترکی ٹوپی یا دستار پہنتے۔ شاعری میں شراب کا ذکر ضرور کیا مگر کبھی پینے کا خیال نہیں آیا۔ ان کے چار مجموعے گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور ایک یادگار داغ جو ان کے بعد اشاعت پذیر ہوا۔ ان کا انداز شعر اور پسند و ناپسند اپنی جگہ مگر ان کی شاعری کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان دانی میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں جذبات کی فراوانی ہے لیکن معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بعض ناقدین نے یہ بھی کہا کہ ان کے اشعار نفسانی خواہشات کو ابھارتے ہیں۔ یہ داغ کے مقام اور مرتبے کو کم نہیں کرتی مگر یہ ثابت ہوتا ہے کہ داغ کو کھل کھیلنے کے مواقع میسر آئے اور شاہد بازی اور ہیجان خیز چیزوں کا دیدار ان کو میسر آیا اس لیے وہ جو کچھ کہہ سکے اس میں شعری سچائی کا اقرار اور اعتراف کرنا ضروری ہے۔ علامہ اقبال نے ابتدا میں اپنا کلام مرزا داغ کو دکھایا۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ زبان کی صفائی اور روزمرہ محاورہ کا برمحل اور درست استعمال ہو۔ مرزا داغ نے بہت سے ہم عصر اور نئے لکھنے والوں کی اصلاح سخن کا بیڑا اٹھایا اور شاعر مشرق کو سند اعتبار دے کر اپنی طرف سے اجازت مرحمت کی۔ آخر میں داغ کا یہ اعتراف پیش کرنا ضروری ہے کہ

ہر چند راہ کعبہ و بت خانہ ایک ہے اے رہبرو! ہے کام یہاں امتیاز کا

کیا پوچھتے ہو کون ہے یہ کس کی ہے شہرت کیا تم نے کبھی داغ کا دیواں نہیں دیکھا

جب جوانی کا مزا جاتا رہا زندگانی کا مزا جاتا رہا

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

◆◆◆

پنجابی نظم

کل مختار

انور ندیم علوی

اوہدے ہتھ پرکار
آر کرے یا پار
کدے اندر رہندا
کدیں کردا باہر
اوہو کل مختار
اوہدی ہے سرکار
آر کرے یا پار

عنادلِ تہِ برف

پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن

کسی معاشرے کا نفسیاتی مزاج اور اجتماعی شعور پرکھنے کے لیے اور تہذیب و ثقافت کا جائزہ لینے کے لیے بہترین ذریعہ وہاں کے ادب کا مطالعہ ہے۔ Nightangales Under the Snow ادبِ عالیہ کی ایک ایسی مثالی تخلیق ہے جسے معروف جرمن مستشرق صوفی سکالر پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل نے تخلیق کیا ہے۔ اسے آفاقی ادب کی نمائندہ تحریر کا درجہ حاصل ہے کہ یہ ہر سلیم الطبع انسان کے ضمیر پر دستک دیتی ہے۔ ادبِ عالیہ یا Higher Literature کے شعور اجاگر کی یہی خاص علامت ہے یا خاص تمائت ہے۔

Nightangales Under the Snow کی خوبصورت شاہکار شاعری انگریزی زبان میں تحریر ہے جسے ممتاز ادیب، نقاد، صوفی مفکر پروفیسر احمد سعید ہمدانی نے نہایت عرق ریزی سے مصنفہ کے فکری ادراک کو اپنی روح میں سمو کر اردو زبان میں منتقل کیا ہے جو بذاتِ خود انتہائی قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ میرے نزدیک ترجمے کی اہلیت چند امور کی متقاضی ہے۔

1۔ اوریجنل تحریر کی زبان پر مکمل عبور۔ 2۔ ترجمے کی زبان کے مروجہ تحریری اسلوب کا علم ہو۔ 3۔ نفسِ مضمون کی صنفِ سخن کا ادراک ہو۔

متذکرہ بالا امور کے بغیر ترجمے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ موسیقی کے مختلف راگ جن کر ان کی تفہیم اور ادراک کے بغیر Appreciation نہیں کی جا سکتی صرف واہ واہ کی جا سکتی ہے جو تعریف ہرگز نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک پروفیسر ہمدانی برصغیر کی واحد شخصیت ہے جو ان امور کی اہلیت کی حامل ہے۔ اردو اور انگریزی ادب کی اعلیٰ ترین ڈگریوں کے حصول کے بعد ان کی تدریس میں نصف صدی گزاری۔ دونوں زبانوں پر عبور اور مہارت قابلِ رشک ہے۔ انگریزی اور اردو زبان میں ان کی تصانیف کی طویل فہرست ہے۔ جسے اہلِ علم کی عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہے اور کئی یونیورسٹیوں (Channels) نے ان کے لیکچرز کا اہتمام کیا ہے۔

پروفیسر ہمدانی صاحب کا تصوف سے وابستگی اور شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ یہی ان کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔ وہ مسلکِ تصوف کے داعی کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیت ہیں۔ اس موضوع پر تقریباً 40 کتب تصنیف کر چکے ہیں۔ وہ ایک دانشور صوفی مفکر ہیں۔ ان کی تحریر واعظانہ خطاب نہیں بلکہ وارداتِ قلبی اور روحانی مکاشفات پر مبنی قلمی تصویریں ہیں۔ ان کے خیال میں فقر و تصوف کی اہمیت اس وقت تک منکشف نہیں ہوتی جب تک ذوق و شوق اور وجدان کی الہامی کیفیت رہنمائی نہیں کرتی۔ اس کے بغیر گوہرِ مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بات انہوں نے برصغیر اور یورپ کے ممتاز مفکرین اور صوفی دانشوروں کی تصنیفات کے گہرے مطالعہ سے بہرہ ور ہو کر کہی ہے۔ یہی بات ہمدانی صاحب اور این میری شمل کے فکری نظریات میں گہرے اشتراک اور فطری ہم آہنگی کا سبب ہے۔ یوں میری نظر میں ترجمے کا استحقاق صرف ہمدانی صاحب کی ہی وراثت ہے کیونکہ وہ زیرِ بحث موضوع کے ادراک کی بخوبی تفہیم رکھتے ہیں۔ ان دونوں ہستیوں میں اندازِ فکر کا یہ

Common interest ان کے درمیان محبت و مودت کا باعث تھا۔ اور زندگی تو چلتے گزر رہی وہ کا تصور پیش کرتے وہ ہر نئی کتاب ہمدانی صاحب کو عقیدت سے پیش کرتیں۔ اسی طرح ہمدانی صاحب بھی اپنی تصنیف انھیں ارسال فرماتے تو Comments کے ساتھ پیش لفظ بھی لکھتیں۔ یہ سلسلہ تا عمر جاری رہا۔ ہمدانی صاحب نے اپنے میری شمل سے پہلی ملاقات کا ذکر کتنے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ "میں ایک صوفی ہستی کے سامنے بیٹھا ہوں۔" اندازہ کیجیے کتنا اعلیٰ و ارفع یہ تصور ہوگا، کتنا خوشگوار یہ احساس ہوگا۔ اور یہ ملاقات کتنی جاں فزا اور سحر زدہ ہوگی۔ گفتگو کا احاطہ مولانا روم، ابن عربی، علامہ اقبال، عبداللطیف بھٹائی، بلھے شاہ اور مجدد الف ثانی تک پھیل گیا۔ شمل کا کمرہ جسے وہ حجرہ کہتی ہیں ان میں اسلم کمال کے فن کے نمونے دیواروں پر آویزاں تھے۔ اور ہمدانی صاحب کے ذوق کی تو ہمدانی کی کئی تصاویر کمرے کو پرکشش بنا رہی تھیں۔ ان کی یہ ملاقات در اصل دو صوفی مفکروں کا روحانی اتصال تھا۔ یا صحبت روشن دلاں کی تمثیل تھی۔ مسائل تصوف پر ان کی گفتگو اہل نظر کے لیے سرمایہ حیات سے کم نہ ہوگی البتہ میرے جیسے کوتاہ نظر کے لیے میر کا یہ کہنا کافی ہے۔

یہ مسئلے تصوف کے امیر کے فہم سے بالا ہیں / کچھ سہل بنا ان کو

ہمدانی صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ پروفیسر شمل کی شاعری پر یہ شبہ کہ مسلم صوفی شاعری الہامی تخلیق کا شاہکار نظر آتا ہے جو صرف ریاضت کے مراحل سے نہیں بلکہ الہامی مکاشفات سے ودیعت ہوتی ہیں۔ وہ مشرق کی شاعری کی دلدادہ تھیں۔ خصوصاً فارسی غزل گوئی کی رمز یعنی علامت پسندی اور تخیل کی بلند پروازی ان کے دل و دماغ میں سرایت کر چکی تھی۔ یوں وہ صحیح معنوں میں Metaphysical Poet تھیں۔

پاکستان انٹرنیشنل فلسفہ کانگریس کی مستقل ممبر کی حیثیت سے پروفیسر شمل کانگریس کے ہر اجلاس میں شرکت کرتیں۔ مجھے ان کے ہر لیکچر سے مستفیض ہونے کا شرف حاصل ہے۔ دھیمے لہجے میں موثر گفتگو، نیم وا آنکھوں میں کمال کے تاثرات اور عجیب اثرات بندھتے سامعین پر شمار کی کیفیت کا گمان ہوتا۔ ان کا لیکچر جاری تو ہمارے سامنے ہوتا مگر محسوس ہوتا وہ کہیں اور کھوئی ہوئی ہیں۔ ہمارے سامنے ان کا سایہ ہے۔ عموماً ان کے لیکچرز کا موضوع مذہب، تصوف، اسلامی تہذیب وثقافت اور مشرقی روایات وغیرہ ہوتے۔ جسے انتہائی دلائل کے ساتھ وضاحت کرتیں کہ بظاہر معلوم ہوتا کہ وہ ایک مسلم صوفی سکالر ہیں اور Metaphysical Poet ہیں۔ میرے خیال میں انھیں کسی حد تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری کی بوقلمونیوں میں تمام رنگ موجود ہیں جس کے باعث وہ ایک Natural Poet کی حیثیت پر فائز ہیں۔ صوفیانہ شاعری کے باوصف غزل کی مانند تخیل کی بلند پروازی اور علامات کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسلامی تہذیب وثقافت اور روایات میں پروفیسر شمل کا گہرا استغراق انہیں مسلم صوفی مفکر اور شاعر تصور کرنے کے لیے کافی دلیل تھی۔ کیا وہ مسلمان تھیں یا نہیں؟ اس کا جواب یوں دیتیں۔ سینٹ آگسٹن کے الفاظ میں "آدمی کسی چیز کو صرف اس حد تک سمجھ سکتا ہے جس حد تک اس سے محبت کرتا ہے۔" "میں نے مسلمانوں سے ان کی زبان میں مکالمہ کیا اور مخاطب کیا ہے" پھر جواب دیتیں رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے "لوگوں کا حشر ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہوگی۔"

میرے خیال میں مغربی تہذیب میں پلنے والے اور مشرقی روایات میں جینے والے افراد کا انداز فکر معاشرتی نفسیاتی مزاج کے باعث مختلف ہے۔ ہم تصنیف سے قبل اس کے مصنف کی تفہیم چاہتے ہیں جب کہ مغربی مفکرین کا انداز تجزیاتی ذہن کی پیداوار ہے۔ وہ

Discursive Reason پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ مرئی کیفیات اور محسوسات کو تجزیاتی ذہن کی چیر و دستیوں سے گزار کر تفہیم چاہتے ہیں۔ سائنس کے جدید نظریات میں کائنات خدا اور انسان کے مسائل بھی ایک فارمولے یعنی Nothing hapens by chance. Everything is calculated. کے تحت عقلی دلائل کے ساتھ حل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مغربی مستشرقین کا انداز فکر بیشتر اثباتی علوم کے تحت ہی پروان چڑھا۔ جب کسی لیڈی ٹیچر نے پروفیسر شمل کو تصوف میں انہماک اور استغراق کا یہ عالم دیکھا تو اسے فکر محسوس ہوئی تو تنبیہ کی کہ اپنی روح کو تصوف کے حوالے نہ کرے اور تحت تنبیہ "دیکھو اسلامی سر چشمے میں ڈوب کر نہ رہ جانا اس کے ساتھ صرف سائنسی رویہ رکھنا" چنانچہ عمر بھر پروفیسر شمل نے اسلام اور تصوف پر جو کام کیا اس کی نج صرف تحقیقی اور سائنسی ہی رہی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ البتہ اسلام اور تصوف پر ان کی دلچسپی نے کچھ لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ شاید وہ مسلمان ہو گئی ہیں۔

پروفیسر شمل کا مذہب اور تصوف خصوصاً تہذیب و ثقافت اور مشرقی روایات میں دلچسپی اور استغراق انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ان کی تخلیق "معاول در تبہ برف" کی شاعری کے موضوعات پر نظر ڈالیے۔ ان کے فکر و نظر کی وسعت کا اندازہ ہو جائے گا۔ برصغیر کے کسی مفکر کا یہ منصب نہیں کہ اتنی تفصیل، ترتیب اور گہرائی سے کوئی تحریر لکھ سکے۔ موضوعات پر نظر ڈالیں۔

1۔ مولانا رومی نے فکر کے ضمن میں — "مولانا بولے" "تمہاری گفتگو کے بغیر" "تفتیش" "آتش نمرود" "کیا میں تم سے محبت کرتی ہوں" "تمام شب"

2۔ خطوط سوئے لامکاں — "ہم ایک جنگلوں سے تارے تھے" "کاش ہم تم سے مخاطب ہو سکتے" "زلیخا کے خطوط" "مظہر کا شکوہ" "فرہاد کا خط شیریں کے نام" "کلی کا خط"

3۔ نیا انگلینڈ — "کوئی ملک نہیں" "طوفان کی یاد میں" "کوئی امید" "کوئی محبت نہیں ہوتی"

4۔ عظیم مغل — "گوالیار" "تین مغل خواتین کے کتبے"

5۔ صوفیاء کی درگاہیں — "اچ شریف" "دیوا شریف" "پھلو چھا شریف" "قصور بلھے شاہ مقبرہ"

6۔ تاثرات سندھ — "ٹھٹھہ آباد" "پاروتی کا مندر" "چار مینار" "فیض آباد" "پرانی حویلیاں"

7۔ تصورات سندھ — "ماروی عمر کوٹ" "ہیر رانجھا" "سسوئی" "لوری کے جھولے کا گیت" "خاموش گفتگو"

بلاشبہ یہ عنوانات پروفیسر شمل کے الہامی محسوسات کی قلمی تصویریں ہیں جو ان کے مشرقی تہذیب و ثقافت میں گہری دلچسپی کی مظہر ہیں۔ اور جس زاویہ فکر سے ان پر قلم اٹھایا گیا، وہ ایک صاحب بصیرت کا انداز ہے۔ صرف ایک عالم کا نہیں۔ اسی Association of Ideas کے تحت اس مجموعے میں موضوعات کے مطابق نظمیں ترتیب دی گئی ہیں۔ اور مترجم نے بھی اسی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

پروفیسر اینے میری شمل کی روحانی کائنات اسلامی تہذیب سے مکمل سرشار نظر آتی ہے۔ اس کے مابعد الطبعیاتی مکاشفات اسلامی سیرت کے عکاس ہیں۔ اس کے عشق وجدان کی تمام کیفیات کا اظہار اور تصوف کے تمام مراحل کے روحانی تجربات میں اسلامی تصوف کا نمونہ ہیں۔ بلاشبہ شاعری کا لباس ان محسوسات کی نمائش کا بہترین ذریعہ ہے۔ مجھے مترجم کی قابل فخر اہلیت اور مہارت پر رشک آتا ہے کہ انہوں نے پروفیسر شمل کے روحانی تجربات اور وجدانی کیفیات کی شاعری کو ذرّے کے تنفس سے مجروح نہیں ہونے دیا، بلکہ اردو

ادب میں قابلِ قدر اضافے کے ساتھ قارئین کے لیے ایک عمدہ دلآویز تحریر عطا کی۔

چند ایک مثالیں مشت از خروارے کے طور پر دیکھیے :

1۔ **مولانا (رومیؒ) کا آخری خط شمس کے نام** : لیکن میں جانتی ہوں / تمہاری زلفوں کے دلکش اور خنک سائے کے نیچے / میرا دل سو رہا ہے / جیسے کسی درخت کے نیچے خاک / میں ہر سانس کے ساتھ تمہارے نام کا خواب بنتی ہوں / سنہری الفاظ اطلس کی عبا پر میرے خون سے نقش ہوتے ہیں /

2۔ **تمہاری گفتگو کے بغیر** : تمہاری روح کی گفتگو کے بغیر کان نہیں ہوتے / تمہاری آنکھوں کے بغیر میں اپنا چہرہ چھپا لیتی ہوں / تمہارے چہرے کے بغیر مجھے آنکھوں کی کیا ضرورت ہے

3۔ **تشنگی** : مجھے اتنی محبت کرنے دو کہ نیند میرے دروازے سے بھاگ جائے۔

4۔ **تمام شب** : تمام شب میں خوابوں کا پارچہ بُنتی رہتی ہوں / ریشمی خیالات کا / اسیر کے نازک دھاگوں کا / بہت ہی حسین خیالات کا جالا۔

5۔ **تم ایک نیلگوں ستارے ہو**

6۔ **اوہ کاش ہم تم سے بغلگیر ہو سکتے** : ہم ساحل اور تم سمندر / ہم پرندے اور تم درخت / ہم پانی پر تحریریں ہیں۔

7۔ **زلیخا کا خط یوسف کے نام** : میں مشرق کے آسمان پر / طلوعِ ماہتاب کا انتظار کرتی ہوں / کہ شاید تم نے اس طرف بھی دیکھا ہو / جب تم جاتے ہو / تو بہار میں بھی صحرا کی رات چھا جاتی ہے

8۔ **فرہاد کا خط شیریں کے نام** : میں ایک حسین پیکر تخلیق کرتا ہوں / اپنے شیریں خوابوں اور آنسوؤں کے پانی سے اس کی پرورش کرتا ہوں

9۔ **شیریں کا خط فرہاد کے نام** : تم خواب دیکھتے ہو ایک باغ کا / اپنے وجود کو کھود ڈالو / یہاں تک کہ پا لو مجھے۔

10۔ **لیلیٰ کا خط مجنوں کے نام** : تم نے طیور سے پوچھنا چھوڑ دیا ہے / کہ وہ تمہیں میرے بارے میں خبر دیں / تم نے انہیں لوٹا دیا ہے / اڑنے کے لیے / اپنے بال نذر دیے ہیں / آشیانے کے لیے

11۔ **نیو انگلینڈ** : یہ کوئی ملک نہیں ہے / بگلے اپنی پکار دہراتے ہیں / "خداوندا بادشاہت تیرے لیے ہے" / کوئی باغ نہیں ہے / جہاں بلبل گلاب سے ملنے کے لیے تمنا کا اظہار کرتا ہے

12۔ **جھیل سیف الملوک** : یہ پہاڑ میرے دل کا حصہ تھے / جہاں میں اپنے دوست کے لیے روتی تھی۔

13۔ **چار مینار** : کبھی ایک بادشاہ نے دریا کی دوسری جانب / اپنی پیاری محبت کا خواب دیکھا / اس کے تمام آنسو دریا کی دوسری جانب / درخشاں موتی بن گئے ہیں۔

14۔ **ماروی عمرکوٹ میں** : میں تم سے پیار کرتی ہوں / میں تمہارا انتظار کرتی ہوں / میں تمہارے لیے دعا کرتی ہوں / وہ

کیونکہ تمہارے قدم چومتا ہے / صحرا کھل اٹھتا ہے / اور ہم اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

15۔ سسی صحرا میں : میں چلتی ہوں اور میرے پاؤں کا خون / پتھروں کو گلاب میں بدل دیتا ہے / اور میری آنکھوں کے آنسو / صحرا کی جھاڑیوں کو سیراب کرتے ہیں

اب قدرے مترجم کی اہلیت اور زبان دانی پر قدرت و مہارت کا لطف لیجئے۔ میں اس کے لیے یہاں انگلش زبان کے دو ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

1- "Yousaf's letter to Zulaykha"

Please don't write any more!/Every day/You shower sweet words upon me like dates/you fill my house with the fragrance of your musk-blank ink/and you spread your tresses under my feet I know/You are more radiant than the sun/more beautiful than the moon/I love you/but I am afraid of you/Your smiling eyes burn my heart/your tears poison me.

براہ کرم۔ مجھے کچھ اور مت لکھو / ہر روز / تم شیریں الفاظ مجھ پر نچھاور کرتی ہو ۔۔۔ خرما کی مانند / تم میرا مکان مشک رنگ سیاہی کی خوشبو سے ۔۔۔ بھر دیتی ہو / تم اپنی زلفیں میرے پاؤں تلے بچھاتی ہو ۔۔۔ مجھے معلوم ہے / تم سورج سے زیادہ تابندہ ہو / چاند سے زیادہ حسین ہو / میں تم سے پیار کرتا ہوں ۔۔۔ لیکن تم سے ڈرتا ہوں۔

2- Zulaykha's First letter to Yousaf/I wait for the moon/to rise on the eastern sky/perhaps you have looked at her/that I mirror her/in the lake of my tears/in the sea of my dreams/

میں مشرق کے آسمان پر / طلوع ماہتاب کا / انتظار کرتی ہوں / کہ شاید تم نے اس کی طرف دیکھا ہو / میں اس کا عکس اتار لیتی ہوں / اپنے آنسوؤں کی جھیل میں / اپنے خوابوں کے سمندر میں

3- Mjnun's Letter to Layla/I love you so much/But you are a scent/that fades away/when the night in spent/I love you so much/But you are a song/on every one's lips/and the nights are long.

میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں / لیکن تم ایسا عطر ہو / جو رات گزرنے پر پھیکا پڑ جاتا ہے / میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں / لیکن تم ایک ایسا گیت ہو / جو ہر ایک کے ہونٹوں پر رہتا ہے / اور راتیں طویل ہو جاتی ہیں

بنظر غائر ان اشعار کو پرکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ ناظر کے رومانی ماحول کو ایک خوبصورت Imagery میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعری فکری رفعت کو مختصر ترین الفاظ کا لباس پہنایا گیا ہے جس سے شاعر کے وسیع مطالعہ فطرت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اس طرح شاعری کے مروجہ اسلوب اور اصناف کی تمام قدر رجحانی اس میں ملتی ہے۔ بلاشبہ مترجم نے مصنف کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کا صحیح حق ادا

کر دیا ہے۔ لیکن سوال اٹھتا ہے کیا بجا طور پر اور جرمن زبان کی شاعری کو دوسری زبان میں انہی احساسات اور کیفیات کے ساتھ من و عن منتقل کیا جا سکتا ہے؟ اسی ذہنی، روحانی اور وجدانی محبت کے جذبات کو دوسری زبان میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ ہرگز ممکن نہیں۔ ہم شعریت کے حسن کا ترجمہ نہیں کر سکتے وہ نفسیاتی کیفیات جو ایک مرتبہ طاری ہوں دوسری بار انہیں صرف Recall کیا جا سکتا ہے طاری نہیں کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ کوئی دوسرا شخص کسی دوسری زبان میں انہیں ترجمہ کر کے سمجھانے کی کوشش کرے۔ شاعری خالصتاً ذاتی فعل ہے، جس کا تعلق بھی القائیہ الہامی کیفیت کے قبیل سے ہے، جس کی اصلیت اور اہمیت ترجمے سے ماند پڑ جاتی ہے۔ ہاں البتہ افادیت، قدرے برقرار رہتی ہے، جیسے تخلیقی علوم کے تراجم کی اہمیت کو دورِ حاضر میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب کے تعارفی کلمات میں معروف دانشور ادیب محترم مدیحہ عارف نے اپنے طرزِ تحریر کے خوبصورت انداز سے تصنیف کے وقار میں اضافہ کیا ہے اور کئی ایسے تحقیقی نکات جن کی شناخت محض لسانی استحقاق کے زمرے میں آتی ہے اس کا اظہار کیا ہے اور یہ ان کی تحریر کا اسلوب نمایاں پہلو ہے جو انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کا ہمارے لیے کافی جواز ہے۔ فرماتی ہیں:

"انہوں نے اپنے مابعد الطبیعاتی تجربات اور کیفیات کو روح کے نسائی پہلوؤں میں سمو کر پیش کیا ہے۔"

"ترجمہ پڑھ کر محسوس ہوا کہ ان کی روح بھی نسائی روشنی سے بیگانہ نہیں ہے۔"

"ان کی نظموں میں ایک عاشقانہ سرشاری ہے اور والہانہ خود سپردگی ہے۔ ان نظموں کا لہجہ رومانی اور تاثر روحانی ہے۔"

"ہمدانی صاحب کے متعلق کیا خوب کہا ہے: "ان کا طرزِ زندگی گوشہ گیری اور علم و ادب کے حصول اور ترسیل سے معمور ہے۔"

اسی طرح دوسری تحریر محترم معین نظامی صاحب کی ہے۔ آپ نے اپنے تحقیقی نکتۂ نظر سے پروفیسر شمل کی تحقیقات کو مغرب و مشرق میں انتہائی معتبر قرار دیا ہے۔ ان کا استشراقی دائرہ مطالعات اپنی موضوعاتی جامعیت کے اعتبار سے بے حد قابلِ قدر ہے۔ جس کے باعث وہ ایک نابغۂ روزگار کی حیثیت سے دنیا میں شناخت رکھتی ہیں۔ ان کی یہ رائے بہت معتبر ہے۔

◆◆◆

معروف شاعر اور ادیب نسیم سحر کی کلیات کی کتاب

کلیاتِ نسیمِ سحر

شائع ہو گئی ہے

قیمت -/6,000 روپے

ملنے کا پتہ: قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، یثرب کالونی بینک سٹاپ، والٹن لاہور (فون نمبر 0300-0515101)

ارنسٹ ہیمنگوے اور ''وداعِ جنگ''

ظفر سپل

امریکہ ہیمنگوے پر بجا طور پر فخر کرتا ہے۔ عالمی ادبی برادری ارنسٹ ہیمنگوے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ''دی اولڈ مین اینڈ دی سی'' (The oldman & the sea) جیسی مختصر مگر پر اثر اور واضح علامتیں رکھنے والا ناول لکھ کر نوبل انعام حاصل کرنے والا ہیمنگوے جولائی 1899ء میں امریکہ کی ریاست الینائے میں ایک ڈاکٹر کے گھر پیدا ہوا۔ اس کی دستیاب تصویریں ظاہر کرتی ہیں کہ اس کے جسم کی ہڈیاں چوڑی تھیں اور طویل قامت رکھنے والے اس باکمال ادیب کا جسم فربہی کی طرف مائل تھا۔ اس کی جچتی ہوئی داڑھی نے اس کو اور بھی پُر اثر شخصیت بنا دیا تھا۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب پیشے کے انتخاب کا وقت آیا تو اس نے اپنے والدین کی خواہشوں کو رد کر دیا۔ اس کا باپ اسے اپنی طرح ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا اور ماں کو موسیقی سے عشق تھا۔ مگر اپنی افتادِ طبع کے عین مطابق اس نے کنساس سٹی کے اخبار ''اسٹار'' میں ملازمت کر لی۔ یہ پہلی جنگِ عظیم سے ذرا پہلے کی بات ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد 1919ء میں اس نے اپنی لڑکپن کی محبوبہ سے شادی کر لی جو طلاق پر منتج ہوئی۔ اس سے اگلی دو شادیوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ مگر جنسی طور پر توانا اس شخص نے ہمت نہیں ہاری اور جلد ہی چوتھی شادی کر لی۔

تو ہم پرست ہیمنگوے شروع میں کیتھولک برادری سے وابستہ رہا مگر بعد میں اس نے کمیونسٹ ہونے سے بھی انکار نہیں کیا۔ ہیمنگوے کا شمار ان خوش قسمت ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنی زندگی میں ہی عالمی شہرت کے ذائقے سے آشنا ہوئے۔ 1954ء میں اسے ''دی اولڈ مین اینڈ دی سی'' لکھنے پر ادب کے نوبل پرائز سے نوازا گیا مگر یہاں میرے پیشِ نظر اس کا یہ ناول نہیں ہے بلکہ ''وداعِ جنگ'' (A Farewell to Arms) ہے۔ جس کا نہایت عمدہ ترجمہ معروف ادیب انتظار حسین نے 1960ء میں کیا تھا۔

ہیمنگوے کا اندازِ بیاں ہمیشہ ہی نہایت سادہ رہا ہے۔ اس ناول میں بھی اس نے اسی ہنر سے کام لیا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقروں کا انتخاب کرتا ہے لیکن اسے اپنی بات Convey کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ بڑی اہم باتیں نہایت سہولت اور روانی سے کہہ جاتا ہے۔ اس سادگی اور راست گوئی سے دھوکہ کھا کر بہت سے لکھنے والوں نے اس کا طرزِ نگارش اپنانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ابھی اس نے اپنے کیریئر کا آغاز ہی کیا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ وہ اپنی تلوّن مزاجی کے ہاتھوں مجبور تھا۔ بطور ایمبولینس ڈرائیور اس نے اٹلی کے محاذ پر جنگ میں حقیقی شرکت کی۔ جنگ کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انسانی جانوں کی بے قدری اور انسانوں کی جذباتی بے حسی کو اس نے بہت قریب سے دیکھا۔ خود بھی زخمی ہوا، صاحبِ فراش رہا، عشق کے لذّتوں سے لطف اندوز ہوا اور یہی سب کچھ اس کے شہرۂ آفاق ناول ''وداعِ جنگ'' میں موجود ہے۔ شاید اسی وجہ سے سویڈش نوبل اکیڈمی کے صدر نے نوبل انعام کی تقریب میں اس کے لیے یہ بامعنی الفاظ کہے تھے:

''ہیمنگوے ہمارے عہد کے عظیم مصنفین میں سے ایک ہیں ـــــ ان لوگوں میں سے ایک جو دیانت داری اور بلا کی

جبر و تشدد کے اس عہد کے کرخت چہرے کے صحیح خدوخال کی عکاسی کرتے ہیں۔"

(2)

""وداعِ جنگ" کا ہیرو ایک لاابالی امریکن فریڈرک ہنری ہے جو دراصل فوجی نہیں ہے، لیکن دورانِ جنگ اطالوی محاذ پر بطور لیفٹیننٹ جنگی سفری شفاخانے میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر اپنے ایک دوست سرجن رینالڈی کے توسط سے اس کی ملاقات ایک لاابالی انگریز نرس کیتھرین بارکلے سے ہوتی ہے۔ کیتھرین ایک دراز قد اور دراز گیسو خوبصورت نرس ہے، جس کا منگیتر مر چکا ہے۔ محاذِ جنگ کے ہسپتال ہی میں ان کی ابتدائی ملاقاتیں ہوتی ہیں مگر جب ہنری زخمی ہو کر میلان کے ہسپتال میں صاحبِ فراش ہوتا ہے تو کیتھرین کی ڈیوٹی بھی اتفاقاً اسی ہسپتال میں لگ جاتی ہے۔ یہیں پر دونوں آتشِ عشق کی حدت اور سرگرمی سے سرشار ہوتے ہیں اور کیتھرین حاملہ ہو جاتی ہے۔ ہسپتال کے قیام کے آخری ایام میں ہنری یرقان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہسپتال کی بوڑھی ہیڈ سپرنٹنڈنٹ مس وان کمپن پہلے اس سے خار کھاتی ہے۔ وہ کثرتِ شراب نوشی کو یرقان کا سبب قرار دے کر اس کی شکایت فوجی حکام سے کرتی ہے۔ ہنری کی چھٹیاں منسوخ ہو جاتی ہیں اور وہ دوبارہ محاذِ جنگ پر روانہ ہو جاتا ہے۔ جب ہنری محاذِ جنگ پر واپس آتا ہے تو یہاں وہ طویل جنگ سے پیدا شدہ اکتاہٹ، اداسی اور بیزاری کے ماحول سے آشنا ہوتا ہے۔ پسپا فوجی کاروان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے وہ اور اس کے دو ساتھی ڈرائیور اپنی رجمنٹ سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس سفر کے دوران ہیمنگوے جنگی صعوبتوں، انسانیت کی ناقدری اور موت کی ارزانی کو کئی دفعہ فنکارانہ چابک دستی سے پورٹرے (Portray) کرتا ہے، مثلاً ایک جگہ ہیرو اور اس کے ساتھی حکم عدولی کرنے والے ایک فوجی کو اس طرح گولی کا نشانہ بنا دیتے ہیں جیسے وہ انسان نہیں جنگل میں گھومنے والا آوارہ کتا ہو۔ اسی طرح ایک جگہ ان کا ایک ساتھی اور دوست ایمو ٹو ممنون سے خوفزدہ اطالوی (اتحادی فوج) کی اندھی گولی کا نشانہ بن کر انجانی بے معنی موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ خود ہنری ایک پل پر ان سپاہیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے جو موت سے ڈرے ہوئے اور اپنی رجمنٹ سے بھاگے ہوئے افسروں کو پکڑ کر اور فوری عدالت لگا کر موقع پر ہی گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہوتے ہیں۔ موت کی ارزانی اور بے معنویت یہاں بہت سے معانی آشکار کرتی ہے۔ ہنری ان لوگوں کو چکمہ دے کر بھاگ نکلتا ہے اور اپنے آپ کو دریا کے سرد پانی کے حوالے کر دیتا ہے۔ دریا سے نکل کر وہ ایک فوجی مال گاڑی کے ذریعے چھپ کر سفر کرتا ہے اور میلان پہنچتا ہے۔ یہاں آ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ کیتھرین تو اپنی ساتھی نرس فرگوسن کے ساتھ سٹریسا جا چکی ہے۔ وہ بھی سٹریسا پہنچ جاتا ہے۔ دونوں ایک ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔ یہاں پر اسے ایک ویٹر بتاتا ہے کہ محاذِ جنگ سے بھاگے ہوئے ہنری کی مخبری ہو چکی ہے اور اسے صبح گرفتار کیا جانا ہے۔ وہ ایک کشتی کے ذریعے ساری رات سفر کر کے سوئٹزرلینڈ بھاگ جاتے ہیں۔ یہاں پر ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ایک مردہ بچے کو جنم دے کر ناول کی ہیروئن بھی موت کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہتی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہیمنگوے اہم سے اہم بات اور واقعے کو بھی نہایت چابک دستی اور سادگی سے کہنے کا فن جانتا ہے۔ وہ کیتھرین کی موت کا ذکر بھی اسی فنکارانہ مہارت سے کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

""نرس دروازہ کھول کر میرے پاس آ کر بولی "میرا خیال ہے مسز ہنری بہت سخت بیمار ہیں۔ مجھے ان کے لیے ڈر لگتا ہے۔" "مر گئی ہیں، وہ ..." "نہیں ... لیکن ان کو ہوش نہیں ہے۔" یوں لگتا ہے کیتھرین کا بچنا نہیں بلکہ

ایک دورے کے بعد دوسرا دورہ پڑتا تھا۔ وہ لوکا بہاؤ تو روک سکے۔ میں اچھا ہو گیا اور کیتھرین کے مرنے تک اس کے پاس ہی رہا۔ وہ سارا وقت بے ہوش رہی اور موت کو قبول کرنے میں اسے بہت زیادہ دیر بھی نہ لگی۔''

سادگی اور پرکاری سے بات کرنے والے ہیمنگوے نے جنگ کے متعلق اپنا نظریہ بھی دو کرداروں کے منہ سے بیان کر دیا ہے:

''ہر ملک پر ایک خاص طبقہ حکومت کرتا ہے۔ اس طبقے کی جہالت اور بے وقوفی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ انہیں کسی بات کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی۔ ان ہی کی مہربانی سے اس لڑائی کا دوام باقی ہے۔'' ''اور تم شاید یہ بات کہنا بھول گئے کہ وہ لوگ اس جنگ کے طفیل لاکھوں کماتے ہیں۔''

جنگ، تشدد اور موت سے نفرت کرنے والے آرنسٹ ارنسٹ ہیمنگوے کا 1961ء میں موت سے آمنا سامنا ہو گیا اور وہ بھی اس کی اپنی مرضی سے۔ ''نوبل انعام یافتہ ادیبوں کے نمائندہ افسانے'' ترتیب دینے والے مترجم جناب وجاہت مسعود نے اس کے بارے میں بڑی پر معنی اور حیرت انگیز بات لکھی ہے: ''عمر کے آخری حصے میں ہیمنگوے خود کو تخلیقی اور جنسی طور پر بانجھ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ ان دونوں میدانوں کا شہسوار رہا تھا۔ اسے یہ صورت کا اتفاق پسند نہیں آیا اور اس نے 2 جولائی 1961ء کو اپنے سر میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔''

◆◆◆

ادیبوں کی نظر میں ظفر سپل

ظفر سپل نے خود کو فلسفے کی ترجمانی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ ''فلسفہ مغرب'' ان کی تیسری تصنیف ہے۔ اس سے پہلے وہ ''ورق ورق دانش یونان'' اور ''مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقا'' کے عنوانوں سے دو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ان کی بیس سال کی محنت کا ثمر ہیں۔ شاید کوئی کہے کہ بیس برس میں صرف تین کتابیں، رفتار بہت سست ہے۔ اس طرح کے اعتراض کرنے والے ہمارے ملک میں ادبی اور علمی تصانیف کے سیاق و سباق کو مد نظر نہیں رکھتے۔ یہ بھی خیال رہے کہ فلسفے سے دل چسپی رکھنے والے حضرات ملک میں بہت کم ہیں جنہیں فلسفے کے اس جائزے کی اہمیت کا احساس تھا انھوں نے ظفر صاحب کی کاوش کو سراہنے میں بخل نہیں برتا۔ محمد ارشاد صاحب اور قاضی جاوید سے انہیں داد ملتی رہی۔ احمد ندیم قاسمی نے ان کے مضامین ''فنون'' میں باقاعدگی سے شائع کیے۔ محمد کاظم ان کے مداح تھے۔ اس تناظر میں ظفر صاحب کی مساعی کو دیکھا جائے تو وہ لائق تحسین معلوم ہوتی ہے۔ (محمد سلیم الرحمٰن)

بہت پیارے دوست ظفر سپل صاحب نے اپنی نئی کتاب ''فلسفہ مغرب'' مجھے عنایت کی۔ فلسفے سے انہیں خاص دلچسپی رہی ہے۔ اس سے پہلے ان کی دو کتابیں ''ورق ورق دانش یونان'' اور ''مسلم فلسفے کا تاریخی ارتقا'' شائع ہو چکی ہیں۔ اب تیسری کتاب ''فلسفہ مغرب'' منظر عام پر آئی ہے۔ قاضی جاوید مرحوم کی آخری تحریر اس کتاب کا دیباچہ ہے۔ (جاوید اختر بھٹی)

سپل صاحب شائستہ زندگی بھی خوش ادا لکھتے ہیں۔ بابا سید انیس شاہ جیلانی سے قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ فلسفہ نگاری ہی نہیں بلکہ سادہ و سلیس انداز میں سیدھے سبھاؤ مشکل تھیوں کو سلجھاتے سمجھاتے ہیں۔ قاری کو ساتھ لے کے چلتے ہیں۔ شخصیت ایسی کہ ان کی صحبت میں خوشگواری اور سرشاری کا احساس رہتا ہے۔ ان کی صحبت میں ایک مہک کا اور حسنِ بیاں ان کے گرد پھیلا رہتا ہے۔ آواز میں خاص رچاؤ ہے۔ صحبت کشش اور دلآویز۔ میں نے سقراط اور افلاطون کی افلاطونیاں سپل صاحب کی سادہ و سلیس کتابیں پڑھ کے سمجھیں۔ ''فلسفہ مغرب'' کتاب شناسوں اور فلسفے کے قارئین کے لیے خاصے کی چیز ہے۔'' (عبدل حسن شاہ)

محمد حامد سراج: محبت میں فراق لمحوں کا داستان گو

......1......

ڈاکٹر جمیل حیات

محمد حامد سراج معاصر اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ ایک ایسا خوب صورت انسان کہ جس نے اردو ادب کو "میّا" کے جیسا لازوال ادبی شاہکار دیا۔ ان کے افسانوی مجموعے "وقت کی فصیل"، "برائے فروخت"، "چوب دار" اور "بخیہ گری" کے ناموں سے شائع ہوئے۔ ان کا افسانوی کینوس بہت وسیع ہے۔ زیر بحث مقالے میں حامد سراج کے افسانوں میں محبت کی بستی تلاؤ میں فراق کے گداز لمحوں کی تلاش کی جائے گی۔ ان کے چار افسانوی مجموعوں میں سے جن افسانوں میں محبت میں فراق کی داستان سرائی کی گئی ہے ان میں ان کے پہلے افسانوی مجموعے "وقت کی فصیل" میں سے "ڈنگ، روشنی اور پہچان، مرتبع آئینے، پچھلا دروازہ، ایک سوالیہ دن، مسافر تو گیا، انتظار اور بچیاں" شامل ہیں۔ "برائے فروخت" حامد سراج کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں سے "عادت ہی بنالی، چائے کی پیالی، جرابوں کی تہ میں، مجھو تھا ہوا تھا، کتنے میرے ہیں اور گھٹن کو ما گئے جانے" تیسرے افسانوی مجموعے "چوب دار" میں سے "ملیٹک کہاں گیا" اور "ڈرائنگ روم اک گزرگاہ ہے" جب کہ چوتھے افسانوی مجموعے "بخیہ گری" میں سے "ایک اور داؤ، ہونٹ کنارے، اکتوبر کے آخری دن، انتظار، قلم، پانچ روپے کا متروک نوٹ اور سناٹا کہاں گیا" شامل ہیں۔ خالد قیوم تنولی حامد سراج کے فنی افسانہ نگاری پر بات کرتے ہوئے ان کے موضوعات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "محمد حامد سراج کا سب سے مرغوب موضوع زندگی ہے یا یوں کہیں، موضوعِ حیات نے خود ان کا پتا دیا تا کہ وہ اسے بیان کریں جو بہت گھمبیں، الجھا گئیں اور کہنے کے ساتھ ساتھ سہہ بھی گئیں۔ اس ذہین و فطین کہانی کار نے بھی زندگی کی کسوٹی اور اس کی پکار کے مطابق خود کو ڈھالا اور جیسا چاہا ویسا ہی اسے اجال لیا۔ کبھی سہل اور بامعنی علامت نگاری تو کبھی قابلِ فہم اور بامقصد تجرید اور کبھی دلنشیں بیانیہ بھی۔۔۔ ان کی کہانیاں اور کردار کسی جنت سے مستعار شدہ نہیں بلکہ ہماری عام زندگی، سماج، ماحول اور معاشرے سے عبارت ہیں۔" [محمد حامد سراج، اردو کا اہم قصہ گو، مشمولہ مجموعہ محمد حامد سراج، لاہور، بک ہوم پبلیشرز، 2013، ص 10]

"ڈنگ" مجھ سے ہوس کی جستجو کی کہانی ہے۔ ماضی کے کرب ناک لمحے ہوں یا دل نشیں یادیں، لاشعور میں پیوست ہو کر جس طرح انسان کا جینا حرام کرتی ہیں، حامد سراج نے اس کو بیانیے کا حصہ بنایا ہے۔ عوام کے ارمانوں کا خون کرنے کی عکاسی عمدگی سے کی گئی ہے۔ حکومت کے کارپرداز صرف اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کیا تعلق کہ جس بستی کو وہ ملیامیٹ بنا کر اس پر اپنی خواہشات کا قلعہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں وہ بستی بہت سے لوگوں کے خون پسینے کی کمائی سے زمانے کی تراش کر کے بنائی گئی۔ لمحوں میں اسے گرا دینے کا فیصلہ تو کر

لیا جاتا ہے لیکن پھر یوں ہوتا ہے کہ وہ ماضی اپنی تمام محرومی اور کھنڈرات سمیت کسی کے ذہن و دل میں اس بری طرح سرایت کر جاتی ہے کہ وہ تمام عمر اس سحر سے نکل نہیں سکتا بالکل بشارت احمد کی طرح۔

ماضی میں زندہ رہنے والے اجڑے ہوؤں کو اور کھوئے ہوؤں کو اپنے ذہن و دل میں بسانے والے کسی بھی حال میں ہوں ان کے اندر پورا جہاں آباد ہوتا ہے وہ کہیں بھی ہوں ماضی ان کے اندر بستا ہے۔ حامد سراج نے کیفیات و احساسات کو جس سلیقے سے افسانے میں برتا ہے اس کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کے ہاں منظر کشی کمال کی ہے تو جزئیات نگاری کا بھی جواب نہیں۔ وہ جب منظر تخلیق کرتے ہیں تو مشاہدے کی گہرائی فنکار کے کہیں اندر اتر کر اس کے شانہ بشانہ چلتی ہے۔ قاری خود کو نہ صرف یہ کہ ان تمام مناظر کا حصہ سمجھتا ہے بلکہ آنسو دروں کی انتہا گہرائیوں کے ابلتے چشموں سے نکل کر اس کی آنکھوں کے گوشوں کو تر کر رہے ہوتے ہیں۔

درد و الم کے مناظر کی تخلیق تو حامد سراج نے کی ہوتی ہے لیکن ان کی قرأت کرتے وقت قاری اس تمام حالت کو خود پر بیتتا ہوا محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو کا فن کار حامد سراج محبت اور فراق کا قصہ گو ہے۔ حکومت کے بے رحمانہ فیصلوں اور کرداروں نہ صرف یہ کہ حامد سراج نے خوبصورت عکاسی کی بلکہ انہوں نے حکومتی پالیسیوں اور مخلوق خدا کے ساتھ کیے گئے ناروا سلوک کی منظر کشی بھی فنکارانہ مشاقی کے ساتھ کی ہے۔ حکومت میں شامل نااہل کار پرداز غریب اور بے آسرا لوگوں کے سروں سے چھت اور پیروں سے زمیں چھین لیتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ جس کا جی آ زمیں پہ بے رحمانہ فیصلے کیے جاتے ہیں ان بستیوں میں یہ کام کیا بھی نہیں جاتا۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اپنے گھر میں وہ اپنے سے داخل ہوا چاہتا تھا جب شام ڈھل رہی ہو اور دلاری کرنیں کیکر سے لپٹ کر کرلا رہی ہوں۔ حکومت نے ہزاروں ایکڑ اراضی خالی کرائی تھی اور فیکٹریاں بہت دور مشرق سمت تعمیر کی گئی تھیں۔ وہ سوچتا رہا اور چلتا رہا۔ اگر یہاں پر کچھ بھی تعمیر نہیں ہوا تھا تو مخلوق خدا کو کیوں اجڑنے کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔'' (ذکر، مجموعہ حامد سراج، ص 73)

اجڑنے والے ابھی پچھلے غم کو بھی نہیں بھولے کہ حکومت انہیں دوبارہ گھر سے بے گھر کرنے کا سوچنے لگی ہے۔ حکمرانوں کی سوچ ان کے فیصلوں اور عوام سے ان کی معمولی ہمدردی اور حقیقی کھلا سلوک کی بے رحمانہ تصویر کشی حامد سراج کے اسلوب نگارش کی خاص خوبی ہے اور اسی طرز ادا کو انہوں نے اس افسانے میں عمدگی سے برتا ہے۔

''روشنی'' اجڑی ہوئی محبت کی یاد اور تنہائی کے طور پر بستے والے انگلاتے ''بوسے'' کی یاد دل میں بسانے والے کی داستان ہوش ربا ہے۔ حامد سراج کا اسلوب اس لحاظ سے ہم عصر افسانہ نگاروں سے الگ تھلگ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا ہے کہ حامد سراج کے ہاں محض لفاظی اور صنعتوں کے استعمال پر ہی اکتفا نہیں ہے بلکہ ان کی تحریر میں بچھڑے ہوؤں کی تشنہ آرزوؤں اور تمام حسرتوں کا دکھ سمٹ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی محض بیانیے کے زور پر آگے نہیں چلتی بلکہ افسانہ نگار کا عمیق مشاہدہ اور کھوئے ہوؤں کی جستجو کی حقیقی تڑپ ان کی تحریر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''لگ جاتا تو اس پر سامان اور مجھ پر یادیں لدی تھیں۔ میری کل متاع ایک بوسہ تھا۔ چلتے ہوئے روشنی کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ کہیں یہ بوسہ گم نہ کر بیٹھنا اسے سنبھال کر رکھنا۔ میں اس بوسے کے سوا تمہیں اور دے ہی کیا سکی

ہوں۔ مجھے ڈر ہے زندگی میں تم پر بوسوں کی بارش ہو تو کہیں تم اس اکیلے بوسے کو بھول نہ جاؤ۔" [روشنی، مجموعہ حامد سراج، ص ۷۶]

حامد سراج کی یہ خوبی ہے کہ وہ جانداروں کے ساتھ ساتھ بے جان چیزوں کے احساسات کو بھی اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور پھر یہ احساس لفظوں میں داخل کر ان کی تحریروں میں یوں جلوہ گر ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کو تحیر زدہ کر دیتا ہے۔ انھوں نے متعدد مکانوں کے اندر ریزہ ریزہ ہو کر الگ تھلگ رہ جانے والوں کا نوحہ دلدوزی کے ساتھ پڑھا ہے۔ انھیں اس بات کا بھی دکھ ہے کہ لوگ اپنے گھروں کی زینت و آرائش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے اور بلاوجہ وقت اور پیسہ ضائع کرتے ہیں لیکن اپنے اندر کو صاف کرنے اور اسے زیب و آرائش سے آراستہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے حالانکہ اصل ضرورت تو اپنے اندر کو سجانے کی ہے۔ حقیقی محبت کی معراج یہ ہے کہ محبوب جس بات میں راضی ہو خود کو اسی حال میں اور اسی ڈھنگ میں رنگ لیا جائے۔ روشنی نے بھی یہی کیا۔

"دروازہ کھلنے اور سامان گھسیٹنے کی آواز پر روشنی آ گئی۔ کچھ کہے بغیر وہ سامان سمیٹنے لگی۔ اسٹور میں سے سامان نکالتے ہوئے اس نے مجھے چائے کی پیالی تھما دی۔ چائے میں وہ اتنی بہت سی باتیں گھول کے لائی کہ میں چائے بھول کر چائے کی بھاپ سے باتیں کرنے لگا۔" [روشنی، ص ۷۹]

حامد سراج کا کمال یہ ہے کہ وہ محبت کے موضوع کو برتتے وقت وصال سے زیادہ فراق کی فکر کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ انھیں ملن میں دلچسپی نہیں یا پھر بات یہ ہے کہ ان کے اندر یادوں کے قبرستان بسے ہیں کہ انھیں فراق سے نسبت ہوگئی ہے۔ ان کی اسی طرز ادا نے وصل کی قدر گھٹا دی ہے۔ محبت میں فراق کی لذت سے روح اور جسم کو سرشار کرنے والے جب ہمت ہار بیٹھتے ہیں تو پھر یا تو خودکشی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے یا وہ پاگل ہو جاتے ہیں یا پھر یادداشت کھو بیٹھتے ہیں لیکن اپنے محبوب سے وابستہ یادوں یا محبوب کو پسندیدہ چند کاموں کو نہیں بھولتے۔ روشنی بھی یادداشت کھو دینے کے باوجود یہ بات نہیں بھولی کہ اس کے محبوب اور عاشق کو غسل خانے کی اونچائی پر لگی ٹونٹی سے وحشت تھی اور یہ کہ اس نے روشنی کے پاؤں پر آتی مٹی بہائی تھی کہ قبر بن گئی تھی۔ [روشنی، ص ۸۲]

وطن سے محبت درہم و دینار کی محتاج نہیں ہوتی۔ "اور یہاں" میں اسی نظریے کا پرچار کیا گیا ہے۔ حامد سراج نے محبت میں فراق کے ایک اور پہلو کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ یہاں فراق کا شکار عورت کسی مرد کی محبت کی متمنی نہیں۔ اس کی روح پیاسی ہے لیکن اس پیاس کا تعلق اس کے وطن پاکستان کی محبت سے جڑا ہے۔ وہ پاکستان کی زرخیز مٹی میں واپس جا کر سیراب ہو سکتی ہے لیکن اس کے شوہر نے اس کو نہ جانے دیا۔ اس افسانے میں حامد سراج نے جہاں عورت کو وفا کی دیوی کے روپ میں پیش کیا ہے وہاں ان کے سحر انگیز قلم نے ایک اور جہت کو بھی طشت از بام کیا ہے۔ اپنے وطن کی محبت کو اپنے دل میں دبا کر ہجر و فراق کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے کا درد جھیلنے والی اپنی اولاد کی روح اور دل کے اندر اپنی محبوب زمین کی محبت اس حد تک جاگزیں کر دیتی ہے کہ جب وہ سن شعور کو پہنچی اور ماں کا انتقال ہوا تو وہ اپنی ماں کی میت سمیت اپنی ماں کی محبوب سرزمین کی طرف پلٹ گئے۔ حامد سراج نے وہ مختلف تہذیبوں کے سائے میں پروان چڑھنے والے سرپھروں کی داستان کو عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"آؤ، میں تمھیں ایک چیز دکھاؤں۔۔۔ عطیہ پاکستان چلی گئی، میں اسے نہ روک سکا۔ وہ خود تو چلی گئی لیکن اپنی

> خوشبو اور کتابیں چھوڑ گئی۔۔۔ وہ کہا کرتی تھی خوشبو، کتاب اور پرندوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ انھیں کہیں بھی جانا ہو، ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کاش میں بھی خوشبو، کتاب یا پرندہ ہوتی اور اپنے دیس لوٹ جاتی۔" [اور یگان ص 100-101]

ماضی پرستی اور دو مختلف تہذیبوں کے تصادم میں کرداروں کی ذہنی کشمکش کا بیان حامد سراج کے مخصوص دل ربایانہ اسلوب میں عجب لطف دیتا ہے۔

"مرضی آپ کی" جزئیات نگاری، منظر کشی، کردار نگاری اور شاندار پلاٹ کا حامل غم فراق کی چاشنی سے لبریز ایسے پر مشتمل عمدہ افسانہ ہے۔ "محبت اور جنگ میں سب جائز ہے" اس جملے کی عکاسی کرتا دلخراش انجام کا حامل افسانہ ہے۔ اختتام نے افسانے کو المیے میں تبدیل کر دیا۔ عورت ایک گتھی ہے جسے سلجھانا اور اسے مکمل طور پر سمجھ جانا مرد کے لیے کسی طور بھی ممکن نہیں ہے۔ علیزہ کہے گئے اس جملے پر پوری اتری۔ امداد کے ساتھ محبت کا دم بھرنے والی نے نفیس سے اس لیے شادی کی کہ وہ کینسر کا مریض تھا۔ چنانچہ شادی کے دوسرے دن ہی اس نے امداد کو بتا دیا کہ نفیس کو کینسر نہیں تھا۔

ماضی پرستی اور بچھڑے ہوؤں کی یاد میں ہجر کی تمازت سے جلتے رہنے کی داستان کو "پچھلا دروازہ" میں حامد سراج نے جس کرب ناکی سے بیان کیا ہے، قابلِ داد ہے۔ انھوں نے ماں کے دم قدم سے زندگی اور ماں کے دائمی رخصت ہو جانے کے بعد زندگی کے بے کیف ہو جانے کی کمال خوبصورتی سے منظر کشی کی ہے۔ ایک ایک منظر ایسا ہے جس میں قاری افسانے کے مرکزی کردار "واحد غائب" کے ساتھ اس کے دکھ کو بانٹتا قدم بقدم ہم رکاب چلتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "ماں کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ دنیا ایک ویران سرائے ہے۔ گھڑونچی پر رکھے گھڑے میں پانی خشک ہو گیا، پنجرے میں چڑیوں کے گھونسلوں میں ان کے بچے مر گئے، آنگن میں لگے شریں اور شیشم کے درختوں کو دیمک چاٹ گئی۔ صحن میں لگے ہینڈ پمپ کا پانی کڑوا ہو گیا، کمروں میں چمگادڑوں نے بسیرا کیا، اس کے والد کی دونالی بندوق کے لکڑی کے دستے کو دیمک خوراک سمجھ کر چٹ کر گئی۔۔۔" [پچھلا دروازہ، ص 115]

محبت میں فراق کے درد سہتے اور کائنات میں محبت کے فطری روپ "ماں" کی ابدی جدائی کا غم سہتے کردار کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کا احوال حامد سراج نے دلخراش انداز میں بیان کیا ہے۔ انسان کتنا ہی مایوس کیوں نہ ہو، خدا کی اس نگری میں اس کی امید بندھانے کے لیے، زندہ رہنے کے لیے اور زندگی اس کی مرضی سے گزارنے کے لیے اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی نعم البدل موجود رکھتا ہے۔ چنانچہ ماں کی محبت سے سرشار اور اس کے فراق سے بے چین مرکزی کردار جب ماں کے پاس جانے کے لیے خودکشی کرنے کا سوچتا ہے تو دور نکل جاتا ہے پھر وہ پلٹ کر دنیا کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے معصوم بچے اس کی راہ دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ واپس پلٹ جاتا ہے۔ افسانے کے مرکزی خیال کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہی افسانہ بعد میں حامد سراج کے معرکۃ الآرا شاہکار "میّا" کی تخلیق کا باعث بنا۔

کھوئے ہوئے محبت زدہ لوگوں کی نشانیوں کو سنبھال کر رکھنا بھی فراق زدہ لوگوں کی زندگی کا نہ صرف یہ کہ بہت بڑا امتحان

ہوتا ہے بلکہ بچھڑے ہوئے لوگوں سے ان کی بے پایاں محبت کا ان مٹ ثبوت بھی۔ ''ایک سوالیہ نشان'' باپ کی محبت سے سرشار ایک ایسے ہی کردار کی دکھ بھری داستان کا خوبصورت اور دلدوز اظہاریہ ہے۔ حامد سراج کا قلم ہجر کی تپتی دھوپ تلے بے سروسامان چلنے والوں کی زندگیوں کا نقشہ کھینچنے میں اپنی مہارت کا عملی ثبوت دیتا ہے۔

حامد سراج کے ہاں محبت اور اس محبت میں فراق کی اذیت سے دوچار ہجر کی تپش جھیلنے کے مناظر کی بہت سی قسمیں ہیں۔ کبھی یہ فراق محبوب سے محبت کے روپ میں سامنے آتی ہے تو کبھی گھر سے بے گھری اور پردیس کی صعوبتیں برداشت کرنے کے مناظر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے وا کرتی ہے۔ کبھی ماں کی محبت اور ہجر کا نوحہ پڑھتی ہے تو کبھی باپ کی محبت اور ابدی جدائی کی دکھ بھری داستان اس کا موضوع بنتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ حامد سراج نے محبت اور فراق کی مختلف جہات کو دردمندی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ یہ افسانہ غم کی چاشنی لیے ہوئے ہے۔

''مسافر تو گیا'' ماضی پرستی کے الم سے دوچار ایک کردار کی کہانی ہے۔ اپنے چاہنے والوں کو کھو دینے والے کی جب آنکھیں کھلیں تو اس کے پاس کچھ باقی نہ بچا تھا سو تنگی کر کے سکون محسوس کرنے میں عافیت جانی لیکن اپنے محبت کرنے والے بھائی کی واپسی کی امید بھی لگائے رکھی۔ زن، زر اور زمین میں سے ایک ''زن'' کی جادوگریوں کا شکار افسانے کا مرکزی کردار عبدالرحمن اپنے بھائی سے جو اس سے شدید محبت کرتا تھا، سے کنارہ کش ہوا۔ محبت اندھی ہوتی ہے اس لیے وہ اس عورت کی عیاری اور مکاری سے آگاہ نہ ہو سکا جس سے شدید محبت کرتا تھا اس لیے بربادی اس کا مقدر بنی۔ محبت میں فراق اس افسانے کا بھی مرکزی نکتہ ہے لیکن یہاں عورت کی محبت میں فراق مرکزی کردار کا المیہ نہیں بلکہ دکھ کی لہر بھائی کی محبت کا نوحہ ہے جس کو اس نے عورت کی خاطر چھوڑ تو دیا لیکن زندگی کی آخری سانس تک اس کے واپس آنے کی امید رہی۔ حامد سراج نے دلدوزی کے ساتھ محبت میں ہجر کی دردمندی اور اذیت کو بخوبی بیان کیا ہے:

> ''عمر بھر کی یادیں سامنے دست بستہ کھڑی ہیں۔ وہ کبھی اور ان کی کا جواب مانگتی ہیں۔ ان یادوں سے کچھ اوٹ میں ہو جاتا ہوں۔ آخری لمحے تو مجھے اذیت کی سولی پر لٹکا گئے۔ ایک عورت کی خاطر میں نے تمہیں رشتوں کے طاقوں میں رکھے چراغ اپنی بدفرمائی اور بے دھرمی کی پھونک سے بجھا دیے بابا۔۔۔ اماں۔۔۔ عبدالحمید۔۔۔ واہ۔ میں نے کتنے دل توڑے۔۔۔ باہر سرد ہوا کا زور اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات تاریک اور خاموش تھی۔ حکیم جی کے اصرار پر کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا گیا۔ انھیں یقین تھا عبدالحمید ضرور آئے گا۔ گدلے آئینوں کے پیچھے شفاف آنکھوں میں امید کی رمق باقی تھی۔'' [مسافر تو گیا، ص 141]

انسان خودسر ہے، وہ جو چاہتا ہے اسے حاصل کرنے کو بے چین رہتا ہے یہ سوچے بغیر کہ جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس کے لیے مضر بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں لاشعوری طور پر قرآن کی آیات کا مفہوم بھی حامد سراج کے ذہن میں ہے کہ ''انسان جس چیز کو اپنے لیے فائدہ مند سوچتا ہے اس کے رب کے نزدیک وہ مضر ہوتی ہے اور جس کو وہ اپنے لیے مضر سوچتا ہے اس کے رب کے نزدیک وہ اس کے لیے سود مند ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان عجلت پسند ہے اور اسی لیے وہ اکثر خسارے میں رہتا ہے۔ یہی اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔

لگن سچی ہو تو منزل خود بخود ڈھونڈنے والے کے قدم چوم لیا کرتی ہے۔ مسلکی تعصب، ادبی تعصب اور پاکستانی معاشرے میں

محبت کے بیوپاریوں کے درمیان سچ کے متلاشی کی داستان ''اعد'' میں بہت عمدگی سے بیان کی گئی ہے۔ جب اس نے اپنے اندر کو پاک کر لیا تو اسے اس کی منزل مل گئی۔ وہ ایک ''انصاری'' کی تلاش میں تھا۔ رب نے اسے بے پایاں عطا کر دیا۔ اس کا نفسیاتی خوف ایک دم ختم ہوا اور وہ اپنے خاندان میں ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہوا۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو اور محبت میں فراق کے ایک نئے رنگ کی مثال لیے حامد سراج کے مخصوص اسلوب کا شاہکار عمدہ افسانہ ہے۔

''پیچاں'' میں ان کہی محبت کی داستان کو جس طرح آخری چند سطروں میں حامد سراج نے بیان کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔ محبوب کی طرف سے تحفے میں دی جانے والی گلاب کی پتیوں کو زبان بنا کر دل سے لگائے رکھے وہ خود میں محبت اور ہجر کا جہاں آباد کیے رکھتا تھا لیکن اپنے آس پاس موجود اس کے دوست اور رشتہ داروں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی۔ غم جاناں پہ لکھا گیا شاہکار افسانہ حامد سراج کے فسوں خیز قلم کا ایک اور رنگ نمایاں کرتا ہے۔ حامد سراج نے ریاست علی کی محبت کا باب نہیں کھولا لیکن آخری سطر میں ہوا کا شریر جھونکا جب اس کے گتے میں رکھی پتیوں کو جب فضا میں بکھیر دیتا ہے تو قاری کو ریاست علی کی ان کہی محبت کی ساری تفصیل سے آگہی ہو جاتی ہے۔ [پیچاں، ص 167]

حامد سراج کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''برائے فروخت'' ہے۔ اس مجموعے میں ''عادت ہی بنالی، چائے کی پیالی، ہجرایوں کی تدفین، جھونکا ہوا کا، کتنے مہرویں اور سلین کو مانگے چاند'' ایسے افسانے ہیں جن میں حامد سراج نے محبت میں فراق اور جدائی کے مناظر کو عکس بند کیا ہے۔ ''عادت ہی بنالی'' بہت عمدہ افسانہ ہے۔ غم کے موسم میں انسان دکھ بانٹنے والے بھی نہیں بھولتے۔ حامد سراج کے اس افسانے کے کردار انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ دکھ درد میں ایک دوسرے کے کام آنے والے۔ حامد سراج نے جہاں ایک طرف انسان کے دکھ درد کو محسوس کرنے والے انسان کی مجبوریوں اور پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں ہجر کی تمازت میں جلنے والی معصوم فاطمہ کی دلگداز داستان کو جتنی عرق ریزی اور فنی مہارت سے قلم بند کیا ہے، یہ طرز ادا ان کو عصر حاضر کا باکمال اور لاجواب افسانہ نگار تو بناتی ہی ہے ساتھ ساتھ ان کے اپنے کرداروں کی ایک جہت سے بھی آشنا کراتی ہے کہ حامد سراج انسان دوست قلم کار ہیں اور ہجر کی آتش میں دھیمی دھیمی آنچ پر مسلسل جلتے رہنے کے ہنر سے آشنا بھی۔ ازدواجی تعلقات کی ناہمواریوں اور عورت کے پندار کی دھجیاں بکھیرنے والے کی داستان الم ''چائے کی پیالی'' میں بہت عمدگی سے بیان کی گئی ہے۔ شک زندگی کو نہ صرف یہ کہ برباد کر دیتا ہے بلکہ اعتبار کا خون بھی کر دیتا ہے۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن یہ بات کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اس کی پاکیزگی، خلوص، وفا اور عصمت پر انگلی اٹھائے۔ حامد سراج نے فنی مہارت سے جہاں ایک طرف مرد کی پست ذہنیت کی عقدہ کشائی کی ہے وہیں عورت کی تذلیل کے بعد انتقامی جذبے کے پیچھے کی روداد کو بھی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس افسانے کی ایک اور جہت بھی ہے۔ مرد کی طرف سے نظر انداز کیے جانے کے بعد عورت نے اپنے تخیل میں اپنا من پسند جہان تخلیق کر لیا۔ یوں خود سے فراریت کی جہت اس افسانے کو اور بھی دلکشی عطا کرتی ہے۔ ''وہ'' میں یہ افسانہ محبت میں فراق کے ایک نئے جہان کی سیر بھی کراتا ہے جہاں بدنصیب شوہر حسن کا خزانہ ملکیت میں ہو جانے کے باوجود اس سے محض اس لیے سیراب نہیں ہو سکتا کہ شک کا بیج اس کے اندر پھل پھول کر تناور درخت بن چکا ہے۔ یوں وصال میں ہی اس نے فراق کا انتخاب کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بھی برباد کر لی۔ اسلوب کے ساتھ ساتھ تخیل کا جہان آباد کیے بہت عمدہ افسانہ ہے۔

(جاری ہے)

◆◆◆

غنی خان: ہردلعزیز پشتو شاعر

خالد عبداللہ

پشتو شاعر غنی خان ایک فلسفی اور دانشور بھی تھے۔ انھیں پشتو ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی تخلیقات پشتو ادب میں ایک اہم مقام بھی رکھتی ہیں لیکن پشتو شاعری کے حوالے سے ان کا نام بہت بلند ہے اور خوشحال خان خٹک کے بعد معتبر تسلیم کیا جاتا ہے۔ غنی خان کسی ایک ادارے یا تنظیم کی ملکیت نہ تھے بلکہ وہ ایک ہردلعزیز قومی اثاثہ تھے۔ ان کی تخلیقات پر تحقیق و تدقیق کے لیے ایک تحقیقی اور ادبی جرگہ کام کر رہا ہے جس کے سرپرست اعلا پروفیسر جہانزیب خان ہیں جو علمی اعتبار سے خود بھی پشتو ادب میں ایک اہم حیثیت کے حامل ہیں اور تحقیقی جرگہ کی کامیابی کے ضامن ہیں۔

غنی خان معروف سیاسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ برٹش انڈیا پارلیمنٹ کے انتہائی خوبصورت اور ذہین ممبر رہے اور دلکش اسلوب کے مالک تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کا دھارا شاعری کی طرف موڑ دیا اور درویشی کو اپنا شعار بنالیا۔ غنی خان پشتو کے صف اول کے شاعر تھے اور شاعری کی اعلا خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کا کلام سادہ ہے لیکن معانی سے بھرپور ہے۔ انھوں نے اپنے دیہات کی خوبصورتی کو موضوع بنایا اور دیہاتیوں کی زندگی میں محبت اور تعاون کو اجاگر کیا اور ان کی محدود ضروریات زندگی کو اطمینان کا باعث قرار دیا۔ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لوگوں کی بہتری چاہتے تھے اور آزادی افکار کے خواہش مند تھے۔ کہیں کہیں اپنے لوگوں کی روز افزوں پسماندگی کے خلاف دبی زبان میں احتجاج بھی کیا ہے لیکن وہ اپنے لوگوں کے مزاج اور نیچر کی تلخی اور زور آوری کو عزم و ارادہ اور جد و جہد سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حقیقت سے قریب تر تصور کیا جاتا ہے۔ ان کا کلام ان کی زندگی میں مشہور ہوا اور زبان زد عام بھی ہوا۔ غنی خان گوشہ نشینی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کی روح خوبصورتی کے اعلا اوصاف سے مرصع تھی۔ جس کا اظہار ان کے کلام اور شغل سنگ تراشی میں ہوا۔ انھوں نے علم و فکر کے زور پر اپنے ہی وجود میں رنگا رنگ باغات آباد کر رکھے تھے جن کے مناظر نے انھیں ایک صاحب دل شاعر اور سچا آرٹسٹ بنادیا۔ غنی خان کے گھر میں سیاست کا ہنگامہ تھا اور تحریکوں کے انبار تھے لیکن غنی خان عالم سکوت میں مستغرق دل کی دنیا کے الوان و اقسام کے جلووں میں مست رہ کر ہر شے سے بے تعلق تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے علامہ اقبال کے اس مصرعہ پر اپنا عمل استوار کر لیا ہے: ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی''۔

اور انھوں نے اپنے من میں ایک ایسی انجمن آباد کر رکھی تھی جس کی رعنائی اور لطافت نے انھیں ماحول سے بے نیاز کر دیا۔ ''غنی خان کا کلام زندگی کے لطیف احساسات کا مرقع ہے۔ ایک عالم مستی کا نغمہ ہے اور رنگین جذبات کا سرود ہے۔ ان کے کلام میں نہ تو محرومیوں کا رونا ہے اور نہ ہی زخم حیات کا واویلا ہے۔ بس ایک دھیمے سُروں کی راگنی ہے جو رنگین تنہائی ہے۔''

ان کے تصورات میں نہ تو کالا باغ ڈیم تھا اور نہ ہی کوئی پختونستان خواہ تھا۔ وہ تو صرف ہندوستان کے لیے آزادی چاہتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جب وہ آزاد ملک وجود میں آئے تو انھیں پاکستان کا قیام غیر فطری تقسیم کا نتیجہ محسوس نہ ہوا۔ نہ ہی انھیں بھارتی کانگریس

سے کوئی دلچسپی رہی بلکہ آزادی کے حصول کو انھوں نے منزل مراد سمجھا اور سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ باقی زندگی کے لئے شاعری اور سنگ تراشی کو اپنا مشغلہ بنالیا۔ لیکن اردو میں غنی خان کے کلام اور زندگی پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ کلام وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو خود پشتو بولتے ہیں۔ کہتے ہیں سچا آرٹسٹ کبھی نہیں مرتا۔ وہ احساسات میں منتقل ہو کر لوگوں کے دلوں میں آباد ہو جاتا ہے۔ دنیا اس کی یاد کو اپنے انمول ذخیرہ میں شامل کر لیتی ہے۔ غنی خان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے سالانہ تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں بڑے بڑے سکالر مقالات پڑھتے ہیں اور غنی خان کے کلام پر روشنی ڈالتے ہیں اور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ غنی خان کے کلام کا مطالعہ کرنے والے اپنی عقیدت کا نذرانہ یوں اس طرح پیش کرتے ہیں: ''تیری شاعری اور سنگ تراشی، تیری روح کے اصل مناظر پیش کرتی ہیں۔ تو نے تو ہر شے کو پردہ خلوت میں چھپا رکھا تھا۔ تیرے کلام کی رعنائی اور تیرے تصورات کی کشش میں اب اضافہ ہوگا۔ اے غنی خان، اے بابا، اے عظیم فنکار! تو کائنات کی رعنائی میں گم ہو جا۔ تیرا جسد خاکی زیر زمین محو آرام ہے۔'' خدا کی تجھ پر رحمتیں!

◆◆◆

معروف افسانہ نگار سائرہ ہاشمی کی افسانوں کی نئی کتاب

سنگ زیست

شائع ہوگئی ہے ---------- قیمت:-/550 روپے

ملنے کا پتہ: دستاویز مطبوعات، ٹمپل روڈ، لاہور (0333-4344716)

معروف نعت خواں، شاعر رشید آفرین کی شاعری کی ساتویں کتاب

چراغ اخوت

شائع ہوگئی ہے ---------- قیمت:-/900 روپے

ملنے کا پتہ: ملک بک پبلشرز، اردو بازار سیالکوٹ (0300-6147077)

معروف کالم نگار، ادیب اور شاعر انور ندیم علوی کا نواں شعری مجموعہ

پلکوں کے گلاب

شائع ہوگیا ہے ---------- قیمت:-/500 روپے

ملنے کا پتہ: زر ملت پبلی کیشنز، ایمان پلازہ، مچھلی منڈی اردو بازار، لاہور (0303-4060515)

ڈاکٹر ڈینس آئزک کہاں ہیں......؟

سرفراز تبسم (انگلینڈ)

ڈراما نگار ہو شاعر ہو موسیقار ہو یا پھر ایک مصور اسے فن کی داد دینے والوں کی ضرورت رہتی ہی ہے اگر فن کار کے فن کو سراہا جائے تو پہلے فن مرتا ہے پھر فنکار اور اگر خوش قسمتی سے کسی تخلیق کار کو کلاس پیار کرنے والے چاہت والے لوگ مل جائیں تو تخلیق کار کی تخلیق یا فن پارہ بے مثال ہو جاتا ہے۔

ایک وقت تھا جب لوگ پی ٹی وی پر چلنے والے ڈراموں کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا کرتے تھے 80ء کے آغاز میں ایک نام ڈرامہ نگار کے طور پر ابھرا ان کا پہلا ڈرامہ سریز 1982ء "دوراہا" کے نام سے ٹیلی وژن پشاور سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔ پھر سلسلہ وار ان کے مشہور ڈرامے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے گئے ان کے ڈراموں کی فہرست میں سلاخیں 1988، کرب، بارش 1990، کروٹ 1992، اور پھر کچھ اقساط گیسٹ ہاؤس 1992 کے علاوہ تھوڑی سی زندگی 1999، شامل رہے ہیں جن کے خالق کا نام آج کہیں نظر نہیں آتا وہ نام ہے ڈاکٹر ڈینس آئزک کا جن کے لکھے ڈرامے ٹیلی پلے اردو کی پروڈکشن میں نشر ہوا کرتے تھے تو لوگ بڑے جوش و جذبے اور عقیدت سے ان کے لکھے ڈرامے اور فلمیں دیکھا کرتے تھے آغاز کے دنوں میں ہی انہوں نے شہرہ آفاق فرانسیسی ناول (Around the World in Eighty Days) کا اردو ترجمہ بھی کیا، اسی دور میں ٹیلی پلے اردو کی پروڈکشن میں ایک فلم (انجام 1999) بھی ریلیز ہوئی جو بہت سراہی گئی اسی فلم کے لیے انہیں بہترین سکرین پلے رائٹر نیشنل فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈز کا باقاعدہ سلسلہ PTV ایوارڈ برائے حسن کارکردگی 1979 ڈرامہ سیریل کروٹ سے شروع ہوا پھر ایوارڈ برائے حسن کارکردگی 1978 ڈرامہ سیریل کرب، نیز ادارہ آرٹس کونسل ایوارڈ 1985، پاکستان گریجویٹ آرٹس کونسل ایوارڈ 1995، ٹی کا شمیری لٹریری ایوارڈ 1996، جوش فضل دین ایوارڈ 1996، PTV گولڈن جوبلی گولڈ میڈل 1997، بزم قالوس ایوارڈ کینیڈا 2010 سے نوازا گیا۔ ایک خاص معلومات کے مطابق ڈاکٹر ڈینس آئزک 11 جنوری 1951 کو پاکستان کے شہر پشاور میں پیدا ہوئے 1970 میں خیبر میڈیکل کالج سے انہوں نے گریجویشن کیا بعد ازاں لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں 25 سال بطور ڈاکٹر خدمات انجام دیں پھر 2000 میں اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا ہجرت کر گئے

تاہم میرے لئے یہ بات باعث فخر ہے کہ 90 کی دہائی میں نئے لکھنے والوں کے لئے ایک پانچ روزہ تربیتی ورکشاپ اور کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مجھے بھی شامل ہونے کا موقع ملا اور یوں مجھے چند دن ڈاکٹر ڈینس آئزک کی قربت نصیب ہوئی مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرا ان سے پہلا تعارف کچھ اس طرح ہوا کہ ہم لوگ ورکشاپ سے ایک دن پہلے ہی پہنچ گئے تھے اور کچھ ذمہ داریاں بھی ہمیں سونپ دی گئیں اس دن اتنا کام کرنا پڑا کہ ہم جلدی ہی سو گئے اور پھر اگلی صبح میں اپنی عادت کے مطابق علی الصبح ہی اٹھ گیا تھا ہوٹل میں ایک ادبی رسالہ اٹھا کے باہر نکل گیا اور ہوٹل کی راہداری کے ساتھ لگی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور (ادبی جریدہ "تسطیر") کی ورق گردانی کرنے لگا کہ اچانک

میرے دوسری جانب ایک گاڑی رکنے کی آواز آئی جس میں سے ڈاکٹر ڈینس آئزک صاحب نمودار ہوئے ایک شخص انکا سامان پکڑے آگے آگے چل رہا تھا میرے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھ کر Hello کہا اور ہلکا سا مسکراتے اچانک ان کی نظر میرے ہاتھ میں پکڑے جریدہ تسطیر پر پڑی تو پوچھنے لگے کیا یہ تسطیر کا نیا شمارہ ہے میں نے کہا جی سر یہ سن کر انہوں نے مثبت انداز میں سر ہلایا اور پروگرام میں ملنے کا کہہ کر چلے گئے۔ اس ورکشاپ میں کوئی 40/50 نئے لکھنے والے شامل رہے ہوں گے مگر اس وقت سب سے زیادہ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ فارغ وقت گزارتا تھا ہم ہر شام فارغ ہو کر ہوٹل کے ساتھ ایک جھیل کے کنارے لگے بنچوں پر بیٹھ جاتے اور دیر تک باتیں کرتے مجھے آج بھی ان کے سنائے لطیفے خاص طور پر یاد ہیں کچھ لطائف میں تو میڈم نور جہاں اور جگجیت سنگھ کا بھی ذکر بھی ہوا کرتا تھا۔ اسی دوران مجھے ڈاکٹر صاحب کی دیگر خصوصیات کا بھی علم ہوا کہ وہ جتنے اچھے ڈرامہ نگار ہیں اتنے ہی باکمال شاعر، مصور، اور موسیقار و گائیک بھی ہیں اسی ورکشاپ کے دوران انہوں نے اپنی شاعری اپنی کمپوزیشن میں گیت اور غزلیں بھی گائیں ان کے اتنے روپ دیکھ کر مجھے دیر تک واقعی حیرت ہوتی رہی۔

چین میں ایک ڈیڑھ دہائی رہنے کے بعد آج کل میں انگلینڈ کے شہر لیسٹر میں مقیم ہوں، اس سال میں نے جناب نذیر قیصر (ہمارے عہد کے باکمال شاعر و دانشور و فلاسفر) کیساتھ ایک شام منانے کا پروگرام ترتیب دینا شروع کیا تو ڈاکٹر ڈینس آئزک صاحب کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کرنے کا خیال آیا میں نے ان کی تلاش شروع کی تو دوران میں نے کئی فون کیے انٹرنیٹ پہ بھی تلاش کی مگر کہیں سے ان کا کوئی پتہ نہ ملا مجھے بہت حیرت ہونے لگی پھر مجھے اچانک اُن کے ایک قریبی دوست جناب ڈاکٹر خالد سہیل (جو عرصہ دراز سے کینیڈا میں مقیم ہیں) کا فون نمبر مل گیا میں نے ان کے نمبر پر دو تین کال کیں میسج بھی چھوڑا مگر بات نہ ہو سکی اگلے روز میں نے پھر کوشش کی تو میری ڈاکٹر خالد سہیل سے بات ہو گئی تو میں نے عرض کیا کہ جی سر مجھے ڈاکٹر ڈینس آئزک صاحب کا کوئی رابطہ نمبر مل سکتا ہے میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں تو ڈاکٹر خالد سہیل مجھے پوچھنے لگے "آپ کون بول رہے ہیں تو میں نے عرض کیا جی میں ان کا ایک چھوٹا سا عقیدت مند سرفراز تبسم انگلینڈ سے عرض کر رہا ہوں وہ فرمانے لگے مدت ہوئی میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی جن دنوں وہ کینیڈا آئے تھے تو ان سے ملاقاتیں رہتی تھیں اب بہت وقت ہوا ان سے ملاقات نہیں ہوئی تاہم میں انکا ایک پرانا نمبر جو میرے پاس ہے آپ کو دیتا ہوں میں نے وہ نمبر نوٹ کیا اور دوسری کال انکے دیئے نمبر پر کی تیسری گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا تو گفتگو کچھ اس طرح ہوئی (جی Good Evening میں سرفراز تبسم انگلینڈ سے عرض کر رہا ہوں ڈاکٹر صاحب کا ایک چاہنے والا کیا میں ان سے بات کر سکتا ہوں فون پر ڈاکٹر ڈینس آئزک صاحب کی اہلیہ مارگریٹ آئزک گویا ہوئیں سوری ڈاکٹر صاحب سو رہے ہیں وہ آپ سے بات نہیں کر سکتے، میں نے پوچھا جی میں کس وقت فون کروں کہ میری ان سے بات ہو سکے تو میڈم کہنے لگیں کہ ڈاکٹر صاحب بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں وہ کسی سے بات نہیں کرتے تو میں نے استفسار کیا تو انہوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو چار سال پہلے (Dementia) ہو گیا اور وہ ذہنی طور پر آسودہ نہیں رہے وہ سب بھول گئے ہیں انہیں اپنے کسی دوست کی کوئی پہچان نہیں رہی، اس گفتگو کے بعد میں سکتے میں آ گیا اور دیر تک ماضی کے جھروکوں میں خیالی تصویریں بناتا رہا اس کے بعد ایک ہفتہ تک اداس و پریشان رہا اور سوچتا رہا کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔۔۔۔؟

◆◆◆

جون ایلیا

عمران ستار

31 دسمبر 1931ء کو پیدا ہونے والے شاعر جون ایلیا نے ترقی پسندی، جدیدیت اور وجودیت سے خود کو الگ کیا انہوں نے میر و مومن کے بعد ایک بار پھر عشق و محبت جیسے موضوعات کو شاعری کا موضوع بنایا اور غم ہجراں، وصال اور درد و الم سے شعر اور غزلیں، نظمیں و قطعات صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔

جون کی شاعری کے مطالعے سے ہمیں محبوب کی یاد کے دلکش پھول جابجا اور کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ انہیں کم سنی ہی میں محبت کے اول تجربے سے گزرنا پڑا۔ جون "شاید" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں کہ میری عمر کا آٹھواں سال میری زندگی کا سب سے اہم اور ماجرا پرور سال تھا اس سال میری زندگی کے سب سے اہم حادثے پیش آئے، پہلا حادثہ یہ تھا کہ میں اپنی نرگسی انا کی پہلی شکست سے دوچار ہوا یعنی ایک قتالہ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا دوسرا حادثہ یہ تھا کہ میں نے پہلا شعر کہا۔

چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

دوسری وجہ جون کی زندگی میں محبت کا دوسرا تجربہ بھی کہی جا سکتی ہے جب زاہدہ حنا جون کی زندگی میں آئی اس طرح بچپن کی سوئی ہوئی محبت نے انگڑائی لی اور اس نے پوری شدت سے زاہدہ کو اپنا لیا۔

ہمیشہ سے محبت کا متلاشی جون کا دل زاہدہ کی محبت میں دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا اور وہ ان کی کل کائنات بن کر رہ گئی اور جب وہ اپنی تمام متاع حیات، وہ محبت میں لٹا کے کنگال سے ہو گئے تو زاہدہ ان کا ساتھ چھوڑ گئی اور اس جدائی نے ایک بکھر کے رہ جانے والے شخص کو پھر سے کرچی کرچی کر کے رکھ دیا اور اس محبت کی یادیں جون کے لیے اوڑھنا بچھونا بن گئی۔

"میں کہ رہتا ہوں بصد ناز گریزاں تجھ سے تو نہ ہوگا تو بہت یاد کروں گا تجھ کو"

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ زاہدہ حنا کی جدائی کا غم ہی تھا جس نے ان کی آخری زندگی میں شاعری کو دوام حاصل کیا۔
ان کی شاعری میں غزلوں کے ساتھ بے شمار ایسی نظمیں سامنے آئیں جن میں جدائی کا غم پوری طرح ابھر کر سامنے آتا ہے۔ محبوب سے جدائی کا درد اور شدت جون کے پہلے مجموعہ شاید میں شامل ان کی پہلی نظم بعنوان "شاید" کے آخری بند میں کچھ اس طرح عیاں ہے۔
"تمہارے اس طرح ہر لمحہ یاد آنے سے دل سہما سہما ہوا ہے / تو پھر تم کم ہی یاد آؤ / متاع دل، متاع جاں تو پھر تم کم ہی یاد آؤ / بہت کچھ بہہ گیا ہے سیل ماہ و سال میں اب تک / سبھی کچھ تو نہ بہہ جائے / کہ میرے پاس رہ بھی کیا گیا ہے / کچھ تو رہ جائے" جون اپنی کھوئی ہوئی محبت کو بہت یاد کرتے ہیں اور کہیں ایسے بھی لگتا ہے کہ اس سوچ سے باہر نکل کے کچھ دیر کے لیے اسے بھولنا بھی چاہتے ہیں۔ "چاہتا ہوں کہ بھول جاؤں تمہیں / اور یہ سب دریچہ ہائے خیال / جو تمہاری ہی سمت کھلتے ہیں / بند کر دوں کچھ اس طرح کہ یہاں / یاد کی اک کرن بھی آ نہ سکے

اچھا تم ہوں کہ بھول جاؤں تمہیں / اور خود بھی نہ یاد آؤں تمہیں / جیسے تم صرف ایک کہانی تھیں / جیسے میں صرف ایک فسانہ تھا"

محبوب کی یاد جون کی شاعری کی ایک خاص خوبی ہے ان کی شاعری میں بکھری اس یاد کا بڑا محرک زاہدہ حنا سے محبت ہے۔ صغیر سنی میں ہونے والی محبت نے ان پر اتنا اثر نہیں کیا جتنا زاہدہ کی محبت نے کیا۔ زاہدہ سے دوری جون ایلیا کے لیے بڑی کرب ناک اور سوہان روح ثابت ہوئی اور یہی کرب یاد کی صورت میں جون کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ بیتے ہوئے محبت کے لمحات جون کو عمر بھر یاد آتے رہے اور اس طرح اردو زبان میں خوشبو میں رنگ بھرنے والی اور بے مثال شاعری وجود میں آئی۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2020ء تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک نو "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ فیروز جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-310987097
-5	2016ء	محترمہ عذرا اصغر صاحبہ	(لاہور)	0300-8839895
-6	2017ء	محترم پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب	(لاہور)	0345-4698398
-7	2018ء	محترم سرفراز سید صاحب	(لاہور)	0333-4148962
-8	2019ء	محترمہ بشریٰ رحمٰن صاحبہ	(لاہور)	0300-9438596
-9	2020ء	محترم رشید امجد صاحب	(راولپنڈی)	0334-5164855

نوٹ : **2021**ء میں "تخلیق ایوارڈ" آپ کی نظر میں کس ادبی شخصیت کو دینا چاہیے۔ انجمن خیال میں نام لکھ کر بھیجئے۔ آپ کے منتخب کردہ نام کو صیغہ راز میں رکھا جائے گا کیونکہ یہ آپ کا بھی فرض ہے کہ ایوارڈ کے انتخاب میں ادارہ تخلیق کی رہنمائی کریں اور اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کریں۔ (ادارہ "تخلیق")

منظومات

اسلم انصاری

فرنٹ لائن مسیحاؤں کو سلامِ تحسین

اس عہدِ غم میں غم کا مداوا وہی تو ہیں
اخلاقِ ایزدی کا اشارہ وہی تو ہیں

بے چارگی میں ہیں وہی انساں کے چارہ گر
دنیا میں رہ کے ساحلِ دریا وہی تو ہیں

اس یاس میں وہی تو ہیں امید کی کرن
اس تیرگی میں صبح کا چہرہ وہی تو ہیں

ہے سر بلند ان کی وفاؤں سے زندگی
سچ ہے کہ عہدِ نو کے مسیحا وہی تو ہیں

اخلاص ان کا دیکھیے کیا بے نظیر ہے
مردانِ خوش نہاد ہیں یکتا وہی تو ہیں

چارہ گر بھی ہیں، مسیحا بھی، دوست بھی
[illegible] ابھی وہی تو ہیں

اے قوم ان کے حق میں دعا مانگ خیر ہو
ان کا خلوص ہمارے لیے بھی نظیر ہو!

OOO

افتخار بخاری

جرم و سزا

میرا دوست بہت اچھا فنکار تھا
اس کے پاس دولت بہت تھی
[illegible]

OOO

بشریٰ رحمٰن

نظم

درد بہت ہے ——
درد مسلسل ——
کرب بہت ہے ——
کرب مسلسل ——
چیخ رہی ہوں پتا ہے کہ زندگی ہے!
[illegible]
حیران ہے یہ —— درد رہے!!
یہ تخلیق کی کون سی ڈگر ہے ——
کیسا سفر ہے ——
کیسا شہر ہے ——
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ——
پھر بھی کرب کا [illegible] ——
پھر بھی میری [illegible] ——
[illegible] ——؟؟؟

OOO

پروین شیر (کینیڈا)

مہجورِ وطن

اس نے ابھی مستول پہ بیٹھا تھا
تھک سا گیا ہے
حدِ نظر تک چاروں طرف سے نیلا پانی
ابھی کنارا کچھ پتہ نہیں ہے
تھکی ہواؤں کے ساتھی اب دوسرے بھی
اس سے بچھڑ کر اداس ہو کر
جانے کس کس دیس میں جا کے بستے ہیں
یادیں اداس سے بھی
اک وہ پنچھی آس یہاں کے ہی اس کا
مقصد ہے شاید
کچھ بھی نہ پا کر تھکے پروں کی سکت گنوا کر
مایوسی میں لوٹ کے پھر مستول پہ آ کر
بیٹھ گیا ہے!

ooo

گلزار بخاری

انارکلی

تو نے سوچا تھا کیا انارکلی
اور کیا ہو گیا انارکلی
شاہزادے کا انتظار نہ کر
وہ کہیں کھو گیا انارکلی
لے گئی اس کو ساتھ نورجہاں
وہ جہانگیر تھا انارکلی
تجھ کو چنوا دیا فصیلوں میں
دیکھ اس کی ادا انارکلی
تو نے جس کو سلیم سمجھا تھا
تخت اسے لے اڑا انارکلی
ایک صحرا تھا جس سے بچ کے
رہ گیا اپنا سا انارکلی
تجھ پہ آیا جہاں کا عتاب
ہے سزا یہ بجا انارکلی
تو کہ ادنیٰ سی تھی حرم کی کنیز
خواب دیکھا بڑا انارکلی
ایسی ہی آگ کے الاؤ میں
تجھ کو جلنا پڑا انارکلی

ooo

شہزاد نیر

جسم کی جھونپڑی

تم اور میں
دانش کی بستی صدی کے کنارے آ گئی
دریچوں پہ بیٹھے
باتوں میں گم ہو کر
ماحول کی گتھی سے اڑان بھری
اور فلسفے کے ستاروں کو جا چھوا
لاہوتی محبت پرواز کرتے ہوئے
عشق یزدانی کی وادیوں سے بھی آگے نکل کر
ہم ایک دوسرے کا بدن دیکھا کیے
شاعری کا بھید افشا کرتے ہوئے
تم نے پہلا حق جتا دیے
میرے سینے کے داغوں کو دیکھا
سکون اور قرار تک آتے آتے
میں تمہاری گود میں آ بیٹھا تھا
اور عقل تو کسی رہگزر کی دھول میں
بدن کی بھوری خاک اڑ رہی تھی
ہم دانش کے مرکزوں میں پہنچتے پہنچتے
جسم کی جھونپڑی میں آ گئے
اپنے لئے تھے ہم بیلی

ooo

امجد بابر

سائن بورڈ پہ لکھی حکایت

گذر جاتا ہے دن
چھا جاتی ہے رات
آنکھوں کے منظر سے پرے
گذر جاتا ہے موسم
بہار سا موسم
چلے جاتے ہیں لوگ
گزران لمحوں کی آغوش میں
وقت کی تہہ میں بھلا
کون یاد رہتا ہے
کون بھول جاتا ہے
سورج اور چاند
ستاروں سے جھلکتی دنیا
بادلوں سے ہم کلام ہوتی ہے
خوابوں کی انگلیوں کے پیچھے
ذہن کی ابتر حالت کو
وہ انگلیاں دیتی ہے
حقیقت کی بے خیالی پہ ہنستا ہے
وہ کون ہے
جو کئے مرے سے
دنیا کو تسخیر کرنے کی سازش میں
لگا ہے
تیز ہنر چھپا کا فنکار
خیال کے ہجرا کو الاؤ کر
خلا کے در دریچے پر چھوڑ آئے گا
تم مرگ نہ کہانی کی گلی کو
آئیے
کہاں دفن کرو گے؟
جہاں کو ادراک سے مجبور ہو آمد ہوتے رہتے
تھا
وقت کے ادراک وہم میں
کشادہ راہوں کی بے وقتی کا محور
تیز آندھیوں پر لٹکنے دیا جائے
اس سے پہلے کہ
وقت کے چوپٹ تختوں میں
خلا پائی کا منظر غائب کر دیا جائے
اور سائن بورڈ پر ۔۔۔ سب ختم ہو جائے

OOO

سید ریاض حسین زیدی

عہد جدید کے منشورات

ہر اک بات پہ نہ ٹھٹھے رہنا
خوبی کو ہے خوب رہنا
راہ راست پر چلی دانش
دن کو رات کے تارے دیکھیں
آپ ساتھی کو کھو دیا گیا
اک دوسرے کو گھورتے جائیں
نفرت کو پروان چڑھا جائیں
سیدھی گلی بات پہ مت ان جائے
بھول کے سب پہ آزادی
جیب تماشا آنکھ میں آئے
دل کا اندر بھی شرمائے
روزانہ اخبار جو دیکھیں
عمت ہر اک بات پہ سمجھیں
چھوڑو وقفے مت کرواتیں
ہر دن نکالیں روح اڑائیں
ہوش آتے ہیں اڑتے جاتیں
جیتے جی اب مرتے جائیں

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

تقریب کے بعد کا منظر

میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں
مجھ کو ایسا لگتا ہے
جیسے مجھ میں
جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہوں
جھوٹے برتن
بکھرے پھول
میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں
مگر تم پہلے ہی جیسے
بہت سے لوگوں کے ہنسنے اور رونے
کی آوازیں تھیں
اور اب گہری خاموشی ہے
جگہ جگہ سگریٹ کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں
جھوٹے برتن
بکھرے پھول
اور ان انجانی آنکھوں کا انجانا پیغام
میں شاید تقریب کے بعد کا منظر ہوں

OOO

تقریب کچھ بھی سہی!
ہمیشہ شاداب
و شگفتہ رہئیے!
Tibet
تبت سنو
ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

افسانے

اپنی مٹی میں بن باس

سمیع آہوجہ

مختصر تعارف

8 دسمبر 1936ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ دہلی جامعہ ملیہ سے تعلیم حاصل کی۔ بیروت سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ میٹرک سے ہی لکھنے کا آغاز کیا۔ "آتش کا جنم" پہلا مشہور افسانہ تھا۔ اب تک 13 افسانوں کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تازہ کتاب "متن گم گشتہ" حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ 9 کتابوں کا مجموعہ "99 کے پھیر میں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

چھوٹی سی لانچ سے نکل کر وہ اور دو دو وقت کے وقفے سے یکے بعد دیگرے اترے، پتھروں کی آڑ میں چھپ گئے۔۔

دونوں کی گھنی چھاؤں میں ایک جانب اونچی نیچی ڈھلوانوں پر پھیلا چپ جنگل، اور دوسری طرف ساحلی چٹانوں پر سر پٹختا گرجتا سمندر۔۔ انجانے اور ان دیکھے دشمن سے ان کے جسم کے تمام عضلات بیدار۔۔۔ چاروں طرف کا پھیلاؤ بے چین تڑپتی آنکھوں میں سمٹا ہوا۔۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد کمانڈر کے اشارے پر جیسے ہی ان کی آنکھوں کی حرکت سے نکلی، ان کے قدم جھاڑیوں، درختوں کے بیچ گہرے تیز رفتار نالے کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھنے لگے۔۔

پہاڑی کے کافی اوپر، گھنے جنگل کے بیچ، سنگلاخ پتھروں کے درمیان، گہری تاریکی میں پوشیدہ غار کے دہانے سے جیسے ہی وہ باہر نکلے، جھرنے کے نشیب میں گھستے پانی پر تیرتی آنکھیں یک دم ان سے لپٹ گئیں۔ کمانڈر کی ان کی طرف اٹھی نالی اور پھنکارتی آوازے ان کے قدم رک گئے۔۔ پاس ہی کونے کے تبادلے سے اٹھی ہی جیسے ہی تھکی، تو بے ہوش کمانڈر بے ساختہ بانہیں پھیلائے اس کی طرف بڑھا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔۔ اتی اتی

تمام آنکھیں ششدر، بغلگیر جسموں کا طواف کرتے ان کی طرف بڑھیں لیکن یک دم ٹھٹک کر رہ گئیں۔۔ چہرے پر دیرینہ جھلی کی چھاؤنی پڑی تھی۔ تو اترتے گریہ کرتی آنکھیں اب خشک ہو چکی تھیں۔۔ سوال شکستہ دہلیز پر رک کر تو کھلے ہونٹوں کے اندر سے سیدھا کوئی کی مسلسل ابھرتی دھمک سنائی دی۔۔ اس کی چشم رو آنکھوں کے سمر کا ب دور، دوسری پہاڑی کے دھندلے ہیولے سے اتر کر دونوں پہاڑیوں کے بیچ پھیلی ہوئی وادی، دریا، رستے اور بستیوں کے لیے پکے اجاڑ باغات پر دھاوا بول کر کے بگاڑی جاتی سڑک پر جا اترے۔۔ تمام پتھریلی سڑکیں آتے جاتے ٹینکوں، بھاری بھرکم بکتر بند گاڑیوں سے اونچے نیچے گڑھوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔۔ بیچ اس پگڈنڈیاں شکستہ دریچ

گھورتے اٹھی۔۔۔ وہ سب اس کو اپنے حلقوں میں لیے، حیرت بھری نظروں سے چاروں اطراف کو زیر و زبر کرتے جادو بھرے گاؤں میں اتر گئے۔ تمام گلیاں کھنڈر، گوبر کے بارود سے گری سیاہ دیواریں، ٹوٹی چھتوں کے ملبے کے ڈھیر۔۔۔

گاؤں کی آخری پھاٹک پر جلے ہوئے گھنے درختوں اور خود رو جھاڑیوں میں چھپے مگر قدرے صاف گھر میں وہ اس کے پیچھے اندر گھس گئے۔ کھانا کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے سب نے کمانڈر کو گھیر لیا تو اس کی نظریں باپ کی طرف اٹھ گئیں اور وہ ان سب کا بازو تھامے گہری رات کے سینے تک اتر گیا۔۔۔ تاروں کی ٹھنڈی روشنی میں پہاڑوں پر پھیلے اونچے نیچے گھنے جنگل کو عبور کرتے وہ آخری ڈھلوان پر پہنچے تو قدیم چرچ کی گھنٹیوں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ رستی در و دیوار مجسم ہوئے تو والہانہ دوڑتے، پکارتے ہر طرف اس کی طرف لپکا۔۔۔ وہ دونوں سسکیاں لیتے ایک دوسرے کی بانہوں میں سمٹ گئے لیکن پیچھے۔۔۔

پیچھے نظروں کے قدم یک دم آہنی کانٹے دار باڑ سے الجھ کر رک گئے۔ کانٹے دار باڑ کے پیچھے دور دور تک پھیلے فوجی بنکر، کیموفلاج جالوں سے ڈھکی توپیں، ٹینک، ہیلی پیڈ اور پارکس کے بڑے بڑے خیمے اور بجلی کو چڑاور پیغیں پر لہراتا ستارہ۔۔۔ سٹار آف ڈیوڈ۔۔۔ اور ان سب کی پشت پر چھوٹا سا کھنڈر گاؤں۔۔۔ وہ دونوں حیران نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے پیچھے اتر رہے ہی تھے۔۔۔ کہ۔۔۔" ان دونوں کو دیکھتے ہی ہچکیاں بھرتا گاؤں مجسم ہو گیا — وہاں۔۔۔! وہ جدید۔ باہیں پھیلائے ان کی طرف لپکا تو قہقہے زن گونجے۔ ساتھ سٹار آف ڈیوڈ، گاؤں سے اٹھتے قہقہوں، شور و غل اور دور دور تک پھیلی کھیتیوں اور باغات کی ہریالی میں غائب ہو گیا۔ ادریس۔۔۔ اقم۔۔۔! اقم۔۔۔!!!

اور وہ ایک دوسرے کے آنچلوں میں اترتے راہوں میں غروب ہو گئے۔۔۔ اب تم بھی ادھر مت آنا۔۔۔ اب۔۔۔! اب یہ آب و گیاہ دیباہ نوں میں پھیلے تصویر کی ہریالی کھلی آنکھوں میں خواب بن گئی ہے۔۔۔" سرسبز تصویر میں کھلے سرخ پھول تراوٹ ہوتے ہوئے بھی اب مرجھا گئے ہیں۔۔۔!! صدیوں پرانے دونوں لب تصویر کے جو بنت اور بو رنگ پھلوں کی حلاوت سے جڑ چکے ہیں۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم اپنی اس زنگلی حلاوت کے ہاتھوں لٹ گئے۔۔۔ اب۔۔۔ اب ہم سہاروں کی کوئی اہمیت نہیں۔۔۔ پرانی دوستیاں، رشتے ناطے تو ان دور دیس سے آنے والوں کی گھاتی خواہشوں نے قید کر ڈالے ہیں۔۔۔ بالکل باریک پیاسمین قید۔۔۔ ایہ عالم ہیں اور ہم اب۔۔۔" وہ روئیں روئیں میں جلتا سسک اٹھا۔۔۔

مختلف شکلوں کے خدوخال میں گھرتے، غراتے، غصے سے بگڑے چہروں کے چاپ گھر میں پشت پر اضافہ کا آواز دیتا تھا۔ دھواں دھار فضا اٹھتی آنکھوں نے ٹھیک اسی جگہ جہاں ان میں بیج لگایا کیا کی کٹے زیتون کے تیل سے مقدس مشعلیں روشن ہو گئیں اور سارا پہاڑ زور زور سے جلنے لگا — مجنون — مجنون — وہ سب مجنون ہیں اس لیے۔۔۔" آرزو، آرزو رشہ آ۔ تعجب کے دھویں سے اٹی آنکھیں پھر پھڑا اٹھیں۔۔۔ جھونپڑے والے کے ہاتھوں میں وہ اپنا گریبان دیکھ رہا تھا۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ اپنے بدن پر گھڑی جانے مت دو، اپنے قانون پر ہی عمل کرو۔۔۔! دریا کی بہتی گزرگاہ کے ساتھ مچھلیاں بھی چلی گئی ہیں اور تم — اقم۔۔۔ اور یک دم۔۔۔

اور سب لوگوں نے بادل گرجتے اور بجلی چمکتے اور قرنا کی آواز ہوتے اور پہاڑوں سے دھواں اٹھتے دیکھا۔ اور قانون اترتے، جب لوگوں نے دیکھا تو کانپ اٹھے اور دور کھڑے ہو گئے۔۔۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ نہ کرنا۔۔۔ تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا۔ اور نہ اپنے پڑوسی کی کسی اور چیز کا لالچ کرنا۔۔۔ لیکن مزید زمینوں کی خواہش میں فوراً سارے غصے سے بگڑے چہروں کے چاپ گھر

قہر آلود آوازوں سے بھر گئے۔۔ زنجیروں میں جکڑے ہوئے، خزاں زدہ جوان کی گردن پر وہ ٹھڈے مارنے لگے۔۔۔ تم ان کا حساب چکاؤ۔۔ اس کی آنکھوں نے ایکا ایکی حیرت و نفرت کی چادر اوڑھ لی۔۔۔ تم۔۔۔؟ تم لوگ جتنا ہانک دو۔۔۔ اور ایک کر کے سارے گاؤں کے گھر اور ان کے کمرے، صحن اور دالان بھر گئے۔ اور آپ کے ملک میں رہے یہ اس عہد سے الگ ہے جو اس نے ان کے ساتھ حوریب میں باندھا تھا۔۔۔!!

لعنت اس پر جو بے گناہ کو قتل کرنے کے لیے انعام لے۔۔۔ اور سب کہیں، آمین۔۔۔ لیکن۔۔۔؟ اگر تو ایسا کرے تو۔۔۔!

اور اس کی چیخوں کو زنجیری حلقوں میں ہی بند کر دیا گیا۔ لیکن اس کی ڈوبتی ابھرتی آواز ٹوٹ ٹوٹ کر اپنے پیچھے گھسیٹتی چلی گئی۔۔۔ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔۔۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا۔۔۔ اور کھیت میں بھی لعنتی ہوگا۔۔۔ اور بس۔۔۔ اور بس، اب تم کبھی نہ آنا اور نہ۔۔۔ فجر کی نماز میں اس روز حاضری پچھلے دنوں سے بھی بہت کم تھی۔ دعا کے بعد تحریں دائیں بائیں آنکھیں تو سارے بدن میں ایک تھکن سی اترتی چلی گئی۔ وہ جیرو کر اٹھا اور سر جھکائے، چپ چاپ، چرمرو قدموں سے مسجد سے نکلا اور گھر کی بجائے باغوں کی طرف چل دیا۔۔۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں میں صرف پچھلی صف میں موجود، چند لوگ تیر رہے تھے اور باقی۔۔۔؟ گلیوں کے اندھیرے میں رچتی روشنی کے ہمرکاب، پہاڑی کے گیرے سبزے میں لپٹی کرید کرتی آنکھیں، پیچھے اترتیں اور پہاڑی سے نیچے دونوں چپ سادھے دیہات میں اٹھل پتھل ٹٹولتے مایوں لوٹ آئیں۔۔۔ اور پھر بیچارگی سے ایک ایک اٹھتے، آہستہ آہستہ تھکن سے بوجھل ہوتے قدموں کے ساتھ گزرتے درختوں کے تنوں کو چھوتی، ماتھا رگڑتی، پھلتی گزرتی رہیں۔۔۔ کہ ایکا ایکی سنا، اس سے لپٹ گیا۔۔۔ تم بھی چلے جاؤ۔۔۔

لوگوں کا اصرار، شہر بدر ہجرت سے عزیزوں کا دیا۔۔۔ اور پھر تُو تُو میں میں۔۔۔؟ اشتیاق آنکھوں سے وہ اپنے بھائیوں کے بیچ کھڑی تھی، اس کے دونوں کمسن بیٹے اس کے ساتھ دبکے ہوئے تھے اور۔۔۔؟ اور۔۔۔ اس کے سامنے پھیلا اس کا چپ سوالی دامن۔۔۔ اور رشتے داروں، پڑوسیوں کے اصرار پر اس کا سراپا احتجاج، اور کڑی کمان انکار۔۔۔ اور آنکھوں میں پھیلے پناہ گیر اور ان پر اجاگر ہوتا۔۔۔؟ کھلے آسمان تلے فلسطینیوں کے کیمپ، آہ و بکا کرتے لوگوں کا ہجوم، غذا کے لیے لڑتا گرتا انبوہ، لمبی قطاریں اور بڑبڑاہٹ، چیخ و پکار، پھیلے ہوئے ہاتھ اور خیرات میں کرنے والی لمبی روٹی اور پنیر کی ٹکیا۔۔۔ اس نے اپنے پھیلے ہوئے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔۔۔ فلسطینیوں کے تو گھر۔۔۔؟ اور میں! اگر ہوں کہ ان کو مصریوں کے ہاتھوں سے چھڑاؤں اور اس ملک سے نکال کر ان کو ایک اچھے اور وسیع ملک میں جہاں دودھ اور شہد بہتا ہے۔ حتیّ کنعانیوں اور حتیوں اور اموریوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کے ملک میں پہنچاؤں۔۔۔ فلسطینیوں کا تو گھر بار، زمین و املاک، سب کچھ ہی چھن گیا ہے۔۔۔ ان کا تو کچھ بھی نہیں بچا۔۔۔ تو بڈھا اور عمر رسیدہ ہے اور قبضہ کرنے کو ابھی بہت سا ملک باقی ہے۔ اور وہ ملک جو باقی ہے سو یہ ہے: فلسطینیوں کی سب اقلیم اور سب جسوری۔۔۔

سیحور سے جو مصر کے سامنے ہے شمال کی طرف عقرون کی حد تک جو کنعانیوں کا گنا جاتا ہے۔۔۔ گرد و پیش کی تمام فضا گھوڑوں کی ہنہناہٹ، رتھوں کی گڑگڑاہٹ، تلواروں کی جھنکار اور سپاہیوں کے شور و غل سے بھر گئی۔ خوشبوؤں کے پاس بے تحاشا پیچھے بھاگتے اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگ رہے ہیں، اس فرار ہوتے اژدہام کے دہشت زدہ قدموں تلے اپنی ہی مقتول عورتوں، بچوں اور لاغر بے کس بوڑھوں کی لاشیں روندی گئی ہیں۔۔۔ گلی کوچے بیوہ اور یتیموں کی لاشوں سے اٹے پڑے ہیں۔۔۔ فلسطینیوں کا تو سارا ہی ملک چھن گیا ہے۔۔۔ گھر میں۔۔۔؟ میں کیسے اپنی ہی زمین پر بے گھر ہو جاؤں۔۔۔؟ اور ڈوبتے ہوئے جسموں میں گھر اہوا سوز کھنکتا، بیوی کا آنسوؤں بھرا چہرا

معدوم ہو گیا۔۔ لیکن میں۔۔۔؟؟ میں کیسے ایلی جی۔۔۔؟؟؟ ایلیا کی اس کے کندھے پر دباؤ بڑھا تو آنسوؤں سے لبریز جوزف کا چہرہ اس کے سامنے عیاں ہو گیا۔۔۔ اور بس۔۔۔ اور سب ختم ہو گئے، وہاں کا سارا گھرانہ تمھارے نام پر ذبح کر دیا گیا۔۔۔ اور اب ان مقتول گھرانوں کے قتل کا الزام۔۔۔ ان احکامات کے بیچ و کار تم پر تھوپ رہے ہیں یہ تم۔۔۔؟؟ تم چلے جاؤ وہ۔۔۔؟؟؟ وہ۔۔۔ وہ آج رات۔۔۔ اور تم۔۔۔؟ میں تو جا رہا ہوں، پچھلا گاؤں تو سارا خالی پڑا ہے، میرا۔۔۔ میرا اب وہاں کیا رہ گیا ہے۔۔۔؟

میں تو۔۔۔ میں تو جا رہا ہوں ابھی۔۔۔ چلتے ہو تو ساتھ ہی چلو۔۔۔ مگر جواب۔۔۔؟ خاموش ہوا ہو گیا۔۔۔ ایلیا پہاڑ کے کافی اوپر، گھنے جنگل کے بیچ بڑے بڑے پتھروں کے درمیان ابلتے چشمے در دتے جھرنے کے پانی کے ساتھ بہتی نظریں سوال ہیں۔۔۔ اور تنگ و تاریک غار میں گرتے پانیوں پر ان کا سوال پھیل جاتا ہے، یہ سب۔۔۔ یہ سب کیوں۔۔۔؟ صدیوں کو مجسم کرتے لمحوں کے پھڑ پھڑاتے اوراق سے صور کے بادشاہ حیرام کا دربار طلوع ہوتا ہے اور قاصد کی آواز میں پیغام گونجتا ہے۔۔۔ جیسا تو نے میرے باپ داؤد کے ساتھ کیا اور اس کے پاس دیوار کی لکڑی بھیجی کہ وہ اپنے رہنے کے لیے ایک گھر بنائے ویسا ہی میرے ساتھ کر۔۔۔ لفظوں اور آواز کے ملے جلے گونجتے نقاروں میں اتنی شدت آتی کہ کانوں میں اترتا شور خود بخود معدوم ہو گیا۔ ہونٹوں سے پھوٹی اک سسکاری جوابی لفظوں میں ڈھل گئی۔ تو کیا۔۔۔؟ تو کیا یہ سب۔۔۔ یہ سب داؤد سے اسی دوستی کا بدلہ ہے۔۔۔؟ سسکاریاں بھرتے ہلتے کو ٹتے ہونٹ یک دم ایک لمحے کے لیے رکے۔ آواز اور کانوں کے بیچ کی فصیل بے حجم ہوتے ہوتے ڈھے گئی۔۔۔ اور دیودار اور صنوبر اور صندل کے تختے لبنان سے میرے پاس بھیجنا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تیرے نوکر لبنان کی لکڑی کاٹنے میں ماہر ہیں۔۔۔

اور پھر جواب بھی اس کے کانوں میں گونج گیا۔۔۔ اور جتنی لکڑی تجھے درکار ہے ہم لبنان سے کاٹیں گے۔۔۔ اور ان کو بیڑے بنا کر سمندر ہی سمندر یافا پہنچا دیں گے۔۔۔ پھر تو ان کو وہاں سے لے جانا۔۔۔ کہ رات کا تیور تن گیا۔۔۔ اور گاؤں پر جگر خراش سناٹا چھا گیا۔۔۔ اس رات تو کتے بھی خاموش ہو گئے تھے۔۔۔ اس نے طویل سانس کھینچا۔۔۔ کہ دفعتاً گولیوں کی لگاتار آوازوں سے سناٹے کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ کھیتوں اور صحنوں میں سوئے ہوئے بچے کچھے لوگ یک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔۔۔ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی گاؤں کے لوگوں کے ریوڑ بھاگتے بھاگتے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔۔۔ اور تاریکی میں گولیوں کے شعلے ان کے سروں سے گزرتے، پہاڑی کے سینے میں گھر بنانے لگے۔ اور آناً فاناً گاؤں کے سارے پیڑ توڑ کر اسے ننگا کر دیا گیا۔۔۔ اور وہ سرسبز درختوں سے اٹی پہاڑی کی آخری پھنگ پر چشمے کے روبرو بیٹھا، پتھر ہو چکا تھا۔ شور وغل اٹھتے ہی بے بس مجبور نظریں اسے لیے چشمے کے بہتے پانی کے ساتھ گہرے تنگ و تاریک غار میں داخل ہو گئیں۔۔۔

وادی کے آخری سانس کو اک نئی پناہ گاہ۔۔۔ اک نیا گھر۔۔۔ وہ سب اس کے سوالوں میں تحفظ سے جب اٹھے تو رات کا پچھلا پہر تھا۔ اور وہ ان کے باہر نکلتے ہی۔۔۔؟ پانی کی تہ میں گمی یا ٹھنڈی کافی میں اتر کر پتھر ہو چکا تھا۔۔۔ پشت پر برسنے والے یوزی دستے کی پہلی ضرب سے جب وہ حواسوں میں لوٹا تو کھلے دروازے سے باہر نیم سوختہ ٹنڈ منڈ درختوں اور جھاڑیوں پر پھیکی دھوپ اٹھل رہی تھی۔۔۔ اور وہ خود۔۔۔؟ وہ یہودی اسرائیلی فوجیوں کے دائرے کے اندر تھا۔۔۔ وہ اسے یوزی کے دستوں سے ٹھوکرتے مسکرا رہے تھے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ وہ ہنس نہیں رہے تھے۔۔۔ چڑھی ہوئی باچھوں میں وہ دانت پیس رہے تھے۔۔۔ بول بڈھے۔۔۔! فلسطینی کمانڈوز کہاں ہیں۔۔۔؟؟ کون فلسطینی۔۔۔؟ وہی جو رات کو یہاں تھے۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو اسرائیلی تھے۔۔۔ مجھے۔۔۔! مجھے ڈر سے ہکلا کر لاتے تھے کہ کافی پی رہا تھا اور۔۔۔ اور وہ

تین دھول مارتے چلے گئے۔۔ کہاں۔۔؟ وہ۔۔وہ۔۔۔ اور بڑی بے قراری سے اس کے پاؤں اسے باہر کھینچ لے گئے۔۔

سورج کی اگلی سمندر کی طرف اٹھ گئی۔۔ ادھر۔۔۔ سب ایک دوسرے کے آنکھوں میں اپنی سوالیہ صورتیں تکتے پھر پلٹ پڑے۔۔۔ وہ کتنے تھے۔۔؟ چھ۔۔ اور کل چھ تھے۔۔۔ وہ۔۔وہ کل صبح لوٹیں گے۔۔ ادھر سے ہی۔۔؟ ہاں ہاں ادھر سے ہی۔۔ اسلحہ کو اور کافی لے کر آئیں گے۔۔۔ ہم بھی تمھیں ڈھیر ساری کافی اور تمباکو دیں گے اگر۔۔۔ اگر کیا۔۔؟ اگر تم ہمارا ایک کام کردو۔۔۔ جلدی بتاؤ۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ آرام سے سنو۔۔ یہاں سے سمندر کی طرف کوئی لمبا سا راستہ ہے۔۔؟ ہاں ہاں ہے کیوں نہیں۔ میں نے ہی تو انھیں بتایا تھا۔۔ اور ادھر ہی سے لانچ میں بیٹھ کر جاتے ہیں۔۔ حملہ کرنے۔۔۔ فلسطینی کیمپوں پر حملہ۔۔ چلو ہمیں بھی وہ راستہ دکھا دو۔۔۔ دیکھو دھوکا نہیں کرنا ورنہ۔۔۔

ذرا صبر کرلو چائے پی لو تو چلتے ہیں۔۔ عشا تک پہنچ ہی جائیں گے۔۔۔ آدھے گھنٹے کے بعد جیسے ہی وہ باہر نکلے تو۔۔۔؟ تو وہ فوجیوں کے ساتھ اسے ایک طرف کھڑا کردیا گیا اور۔۔۔؟؟ دروازوں اور ساری گلی کے آگے پیچھے اور درختوں کی اوٹ میں دو بارودی سرنگیں بچھاتے چلے گئے۔۔۔ یہ۔۔؟ یہ تم کیا کررہے ہو۔۔؟؟ تمھارے چھ دشمنوں کی موت کا بندوبست۔۔ اس کا سینہ یک دم فخر سے بھر گیا۔ لیکن وہ اسے منتقل ہی کیے رہا۔۔ میں کہاں رہوں گا۔۔؟ تمھیں اور گھر بنا دیں گے چلو۔۔ اور وہ ان کے آگے آگے آہستہ آہستہ گھنے نیم تاریک جنگل میں راہ لیتی، پیچی، چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر چلتا رہا۔۔ دوپہر سے مغرب آگئی اور گھٹی اندھیرا تاریکی کے شکم میں اتر گیا تو پندرہ میں سے ایک جھنجھلا اٹھا۔۔ اور کتنی دور ہے۔۔؟ بس یہی کوئی گھنٹے سوا گھنٹے کا راستہ ہے۔۔

اور آدھ گھنٹہ کے بعد وہ ایک گھاٹی سے اترے تو ایک گاؤں کا تاریک کھنڈر اچانک سامنے آگیا۔۔ اس کے قدموں میں یک دم زنجیر پڑ گئی۔۔ کمانڈر کے قریب اس کی سرگوشی پھڑپھڑائی۔۔ آپ سب اس سامنے والی گلی سے نکل کر دیکھیں کہ کوئی دشمن تو نہیں ہے۔۔؟ اگر گلی صاف ہے تو پھر پچھلی ڈھلوان پر اک گھاٹی ہے اور آگے سمندر۔۔ یہی ان کا بھی راستہ ہے۔۔ تو پھر چلو گے۔۔ نہیں نہیں۔۔ اگر ان چھ میں سے کسی نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو گولی۔۔۔ کمانڈر کے حکم سے تین فوجی یک دم دیوار سے چپک گئے۔۔ اور باقی کمانڈر کے پیچھے اسے ساتھ لیے درختوں کی اوٹ میں چلے گئے کہ۔۔ ان ہی کی بچھائی ہوئی ایک بارودی سرنگ پر اس نے قدم رکھ دیا۔۔ اور بارودی سرنگ۔۔؟ خوفناک دھماکا۔۔ اور پھر پے در پے دھماکے۔۔۔!! اور اس کے چند ہی لمحوں بعد پہاڑی سے دوسری طرف ڈھلوان میں ان کے گاؤں سے روشنی کا ایک لاوا چھوٹا اور لرزتی ہوئی زمین پر پے در پے دھماکے ہوتے چلے گئے۔۔۔ صبح جب پرندوں کی ابتدائی چہکار پھوٹی تو وہ تو۔۔ اسٹار آف ڈیوڈ کی دھجیاں بکھیر کر ویران کھنڈر گاؤں میں لوٹ آئے۔۔ لیکن۔۔۔ اس کی مسمار گلی کے قریب قدم ٹھٹک کر رہ گئے۔۔

دیواروں سے لپٹے قہقہوں پر یک دم چپ کی چادر آ پڑی۔۔ شکستہ دیواروں، ملبے، درختوں، جھاڑیوں پر جابجا ان کے کپڑوں کی دھجیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گوشت کے لوتھڑے چپکے ہوئے تھے۔۔ اور ساتھ ہی چاروں طرف پندرہ جسموں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔۔ سب نے حاسد اور دوستی سے کمانڈر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چھلک گئیں۔۔

◆◆◆

سیاہ کار

آغا گل

مختصر تعارف

آغا گل بلوچستان کے سب سے نمایاں فکشن نگار ہیں۔ سب سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ ان کے فکشن میں ڈاڈا ازم، امپریشن ازم اور اساطیری حوالے ملتے ہیں مختلف اسٹائل میں واحد لکھنے والے ہیں۔ بائیں بازو کے نظریہ ساز ہیں۔ ان کا فکشن مزاحمتی ادب کے زمرے میں آتا ہے لہٰذا سرکار دربار کی ناپسندیدہ شخصیت قرار پایا ہے۔ ان کے فکشن میں پاکستان کی عموماً اور بلوچستان کی خصوصاً تحریری تاریخ ملتی ہے۔ 1966ء سے لکھ رہے ہیں۔ 28 کتابیں آ چکی ہیں۔

زمانہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ یاری دس برس بعد قصبے میں لوٹا تو یوں لگا کہ کسی نئی دنیا میں چلا آیا۔ مچ جیل سے اس کے بھائی اسے گاڑیوں میں لینے آئے تھے۔ اس نے قتل کی عمر قید بھگتی۔ جانے قتل کیسے کر بیٹھا حالانکہ تھا شریف نوجوان۔ اسی مقدمے کے دوران اس لڑکی کا بھی بیاہ ہو گیا جس کے لیے قتل کر بیٹھا تھا۔ یاری کو علم نہ تھا کہ زمین گول ہے، دلوں کو بھی گھمائی رکھتی ہے۔ وہ ہونٹے (ٹھوا) پہ سوار تھا کہ اسے شادی کی خبر ملی۔ قیدی بتاتے ہیں کہ ہونٹے سے نیچے جا گرا تھا۔ اس نے ایک دو سال پہ سارا قرآن کریم حفظ کیا اور بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے بھی کر ڈالا۔ جیلر اس سے خوش تھے۔ جیلر کے بچوں کو شام میں ٹیوشن بھی پڑھایا کرتا۔ اکثر جیلر اس کی تعریف کرتے۔ "قتل تو مردوں کا ہی کام ہے۔ تم نے مردوں والا کام کیا شاباش۔ مگر تمہاری شریفی (شرافت) کی بھی تعریف کرتے ہیں۔" قاتل اور مقتول دونوں کے خاندان اس قصبے میں رہتے تھے۔ مقتول خاندان کو بارہا صلح کے لیے کہا گیا۔ شرفا، ملک اور سپین ژیرہ (سفید داڑھی والے) بھی گئے مگر مقتول کا خاندان صلح کے لیے راضی نہ ہوا۔ وہ تو چاہتے تھے کہ پھانسی پہ جھول جائے مگر عدالت نے عمر قید سنا دی جس پر وہ مطمئن ہو گئے کہ پھانسی سے تو پل بھر میں آزاد ہو جاتا۔ اب عمر قید بھگتے گا۔ لمحہ لمحہ مرتا رہے گا۔ مچ جیل تو کوئٹہ کے پہاڑوں والے علاقے میں ہے۔ وہ کوئلہ ملا پانی پی پی کر صحت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ تنہائی کی آگ میں جلتا رہے گا۔ خاندان الگ سے پریشان رہے گا۔ مچ آنا جانا ملاقات کرنا، ملاقات کے لیے نذرانے دینا، مشقت سے بچانے کے لیے بھتہ دینا، کھولی (تنہائی) سے بچانے کے لیے الگ سے مال لگانا اور جیل کے ہسپتال میں داخل رکھنے کے لیے ڈاکٹر کے نخرے اٹھانا۔ غرضیکہ ان پہ ایک پہاڑ آن گرا جس کا مردانہ وار مقابلہ کرتے کنگال ہوتے چلے گئے۔ پہلے تو وکیل کیا تھا، پھر ایک ڈاٹ پیغام اڑایا کہ فیصلہ تو جج نے کرنا ہے۔ وہ وکیلوں کے دن لد گئے۔ اب تو وکیل کی بجائے جج کرتے ہیں۔ لیویز الگ سے جان کھاتی رہی کہ مقدمہ تو انہیں تیار کرنا ہے انہیں مال لگایا جائے۔ کیس میں زیادہ تر پولیس کا اختیار ہے۔ جج تو مثل اور گواہی کی لاٹھی تھام کر ٹٹولتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ قانون کی دیوی والی وہ سیاہ پٹی کب کی پولیس کے ہاتھوں میں آ چکی ہے۔ جو مال

سرو قد کی مانند پولیس کے مال خانے میں پڑی رہتی ہے۔ باری کی آمد پر کسی خوشی کا اظہار نہ کیا گیا تا کہ مقتول خاندان مشتعل نہ ہو۔ مبارک بادوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ باری کے خاندان نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ ان برسوں میں وہ خود بھی بے حد پریشان رہے تھے۔ بھائی جیل میں ہو تو کیسی عید کیسی خوشی۔

مقتول خاندان نے باری کی آمد پر کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ باری کا پورا خاندان بھی سزا بھگت چکا ہے، اگلی دنیا میں جو سزا خدا دے گا، وہ الگ ہے۔ سارے بھائیوں کی یہی رائے تھی مگر شربت بہت جذباتی ہوا جاتا تھا۔ یوں بھی وہ عمر میں سب سے چھوٹا تھا کوئی چھ ماہ پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی بختو نہایت ہی خوش شکل اور حسین و جمیل تھی۔ اس نے بھی شربت سے کہا کہ باری سے قرض نہ لگے۔ بہت سزا بھگت چکا ہے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا ہے۔ وہ خود بھی اپنے جرم پر شرمسار تھا۔ کوئی چیز اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔ روح میں جیسے چھ اسکی (خود رو جنگلی بوٹی) پھیل چکی ہو۔ چہرے پر مٹی ہوا (ہوا جو خزاں کی آمد کا اعلان کرتی ہے) کا بوجھل پن ہو۔ ملا کوٹلے خان نے بھی شربت کو سمجھایا کہ ملزم کو سزا مل چکی ہے۔ اللہ کے حضور قتل کی سخت سزا ہے۔ بھائی کماتے کھاتے ہیں۔ ان پر بوجھ بنا رہا ہی نہیں بلکہ اپنا مستقل صحت۔ امید بھی کم ہی ٹھیک ہو۔ جیل کو دے آیا ہے۔ اب وہ بدلے کا تو سوچے۔ جس دین میں وحشی اور درندہ کو معاف کر دیا جائے وہاں تو معاف کر دینا ہی بڑی نیکی ہے۔ بدلہ لینا تو عام آدمی کا ہی کام ہے۔ سچے مسلمان تو درگزر سے ہی کام لیتے ہیں۔ معاف کر دینا بھی سخاوت کی مانند ہی ایک بڑا عمل ہے۔ ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر شربت کا شرا گسنے والا عمرات بدلہ لینے پر اکساتا رہا۔ دونوں نے باہم اشتراک سے موبائل کی دکان کھولی تھی۔ عمر نے بڑی ہی محنت سے موبائل مرمت کا وہ کام سیکھا جو سارے علاقے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کوئی چھ ماہ عمر کراچی کی گرم مرطوب ہواؤں میں رہا۔ سارا دن گرمی اور پسینہ۔ استاد بھی چائے سے آگے نہ بڑھتا۔ چائے پی پی کے عمر کو لگتا کہ اس کے جسم میں خون کی بجائے چائے موجیں مار رہی ہے۔ کوئی زخم لگے گا تو کراچی کی کڑک چائے رسنے لگے گی۔ تھا محنتی آدمی کام سیکھ ہی گیا۔ ذہانت کے باعث وہ استادی کے مقام پر جا بیٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شربت کسی طور الگ ہو جائے۔ اس کا رویہ لوٹانا بھی مشکل تھا کیونکہ کاروبار کو دھچکا لگتا۔ پاؤں میں جوتا نہ ہو، کھانے کو روٹی نہ ہو مگر ہاتھ میں بڑھیا موبائل ضرور ہو۔ وہ تین موبائل دولت مندی کی علامت سمجھے جاتے جس کے باعث لوگ اس سے خراب موبائل بھی لے جاتے کہ دیکھنے والوں پر دہشت طاری ہو۔ اکثر فجر کی نماز کی بجائے لوگ جھٹ موبائل کھولتے کہ رات بھر میں کتنے نئے میسج آئے ہیں۔ موبائل نے قاصد، پیامبر، رسان کبوتر کی جگہ لے رکھی تھی۔ کسی بھی حسینہ تک رسائی ہو سکتی تھی۔ موٹر سائیکل اور رکشہ چلاتے بھی کان سے موبائل لگائے انارکلی سے محوِ گفتگو رہتے۔ جیسے ہی شربت دکان میں داخل ہوتا عمر علیک سلیک کے بعد پور (بدلہ) کی اہمیت پر تقریر کرتا اور یاد دلاتا کہ قبائلی معاشرت میں بدلہ نہ لینے والوں کو بزدل اور کمزور سمجھا جاتا ہے۔ لوگ ان کے بچوں کو بھی طعنہ (طعنے) دیتے ہیں بلکہ اور شیر ہو جاتے ہیں کہ یہ تو بدلہ لینے والے نہیں ہیں۔ شربت یہ باتیں سن سن کر مشتعل ہوتا رہتا۔ رفتہ رفتہ وہ بدلے کا سوچنے لگا۔ ایک بار اس نے بازار میں باری کو دیکھا بالکل کمزور سا ہڈیوں کا ڈھانچہ، کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا یوں جا رہا تھا لاتعلق سا جیسے اب تک قیدیوں کے احاطے میں پھر رہا ہو۔ پاؤں میں جولان (بیڑیاں) ڈالے۔ ایسے بے ہمت، کمزور، لاغر اور مفلوک دشمن کو مارنا بھی مردانگی نہ تھی۔ مگر عمر کی گفتگو اس کے دل میں آگ لگا دیتی اور وہ من ہی من میں کھولنے لگتا۔ سب سے پہلے اس نے بختو سے اظہار کیا کہ وہ بدلہ لینا چاہتا ہے تو بختو کانپ سی گئی۔ اس نے سختی سے منع کیا کہ باری سزا بھگت چکا

ہے۔ مگر شربت دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ اس کے من میں بدلے کی بھاونا تھی۔ وہ اپنے ارادے مضبوط بناتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ عمر کا ہی ہم خیال ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ موقع پاتے ہی باری کا خاتمہ کر دے۔ عمر نے اسے چھوٹا سا پستول گلاک 26 بھی دلوا دیا۔ جو تھا تو چھوٹا مگر بڑا ہی ہلاکت خیز تھا۔ اس نے بڑی نایاب گولیاں ہائیڈرا شاک بھی منگوا لیں۔ جن سے زندہ بچنا کسی بھی انسان کی بس میں نہ تھی۔ ایسا زلزلہ لاتی کہ انسان پھڑک پھڑک کے مرتا۔

واردات کا بہترین وقت عصر کا ہی تھا۔ نماز عصر کے بعد باری دیر سے باہر نکلتا اور سر جھکائے الجھا الجھا گھر کی راہ لیتا۔ وہ اب تک نارمل نہیں ہو پایا تھا جس کے باعث اسے کسی کام میں نہیں ڈالا گیا تھا۔ اس روز ملا کو لے نے شربت کو بلا بھیجا۔ علیک سلیک کے بعد ملا کو لے نے تشویش کا اظہار کیا کہ شربت کی آنکھوں میں وہ عجیب سی وحشت دیکھ رہا ہے۔ ''باری کو سزا مل چکی ہے اس کی زندگی تباہ ہو گئی کسی کام کاج کا نہیں رہا۔ لگتا ہے کہ جیل والوں نے اس کا ذہن و دماغ کھوکھلا کر کے خالی جسم لوٹا دیا ہے یا پھر تیل کی طرح دماغ اس بدن میں جل کر ختم ہو رہا۔ باری ایک خالی لالٹین ہے۔''

شربت نے ہچکچاتے ہوئے اقرار کیا ''خون کھول اٹھتا ہے جب بھائی کا سوچتا ہوں۔'' الفاظ اس کے غیض و غضب کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ملا کو لے نے اسے سمجھایا ''نماز پابندی سے پڑھو اور چاروں قل پڑھا کرو۔ دل آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا جب بھی فرصت ملے تو میرے حجرے میں چلے آؤ۔ کچھ دین کی باتیں ہوں گی اور کس طرح موبائل کے کاروبار سے نکلو۔ کیا خرافات پھیلا رہا ہے یہ موبائل۔'' ملا کو لے نے پیالی میں سبز چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔ شربت چونکا ''کیا موبائل برا ہے۔''

ملا کو لے نے انکار میں سر ہلایا ''نہیں! اس کا موجودہ استعمال برا ہے۔ کیا کچھ فحش دکھایا جا رہا ہے۔ نوجوانوں کا اخلاق تباہ کیا جا رہا ہے۔ ایمان اور عقیدے کے بغیر تو انسان بھی موبائل بن جاتا ہے۔ مجھے تو یہ لوگ دو ٹانگوں والے موبائل ہی لگتے ہیں۔ کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہو۔'' ملا کے حجرے سے نکل کر شربت کو طمانیت سی محسوس ہوئی۔ دل سے کدورتیں جاتی رہیں۔ لیکن اگلے ہی روز عمر کی تمسخر زنی سے وہ بوکھلا گیا۔ ''یہ اللہ والے تو دنیا کی بات نہیں کرتے۔ ملا کو لے نے کار تو کیا کابلی موٹر سائیکل بھی نہ خریدا۔ وہ سب بھی تو دنیا داروں کو چھوڑ کر پہاڑی میں جا بسے تھے جہاں جنگل تھا اور ایک آب جو۔ اس باقی جو ہو رہے تھے۔ تم کیا درویش بننا چاہتے ہو۔'' شربت کا انسان ڈی لیٹ ہو گیا۔ ''نہیں میں انتقام لوں گا۔'' عمر بہت خوش ہوا۔ ''شاباش میرے شیر! یہ ہوئی نہ مردوں والی بات۔'' اگلے ہی روز عصر کی نماز سے قبل وہ گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ نمازی ایک ایک کر کے رخصت ہوتے چلے گئے۔ ذکر اذکار کے بعد باری مسجد سے باہر نکلا۔ جوتے پہنے اور دنیا مافیہا سے لاتعلق گھر کی راہ لی۔ اسی لمحے شربت کود کر باہر نکلا اور باری پہ پستول خالی کر دیا۔ باری کی زبان سے اللہ نکلا اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز سے خلاف توقع لوگ باہر نکل آئے۔ کسی نے شربت کو پہچان لیا۔ پکڑنے کی بھی کوششیں کی گئیں مگر وہ بھوری پہاڑیوں کی جانب جا نکلا۔ ان پہاڑیوں میں چھپنے کا تجربہ زیادہ تھا۔ جس کے باعث غار اور کھوہ بکثرت تھے۔ موبائل سے اس کا عمر سے رابطہ تھا۔ یہ موبائل اس نے کسی اور کے نام پہ ڈال رکھا تھا۔ جنگل کی آگ کی مانند یہ خبر پھیل گئی۔ قصبے میں وہ دو دھڑے بن گئے۔ باری کے ورثاء نے پرچہ درج کرانے سے انکار کر دیا کہ وہ قاتل سے خود بدلہ لیں گے۔ لیویز والوں کو انہوں نے کوئی بیان نہ دیا۔ تاہم لیویز کی مدعیت میں پرچہ درج ہو گیا۔ بختو پہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ شوہر کو بچانے کے لیے ہر عزیز سے التجا کرتی۔ بھائیوں سے بھی رو رو کر کہا کہ کسی طور اس کے شوہر کو بچا لیں۔ کبھی اس

اقارب سے دنگ کر رہ گئے تھے تاہم انہیں وعدہ کرتے ہی بن پڑی۔ صلح کی بات کچھ عرصہ بعد ہی ہو سکتی تھی۔

شربت کا موبائل پہ رابطہ تھا، کھانا پانی تو اندھیرے میں اسے پہنچا دیا گیا تھا مگر اب خوف اس کے دل میں اترنے لگا تھا۔ وہ اپنی زندگی بچانے کی فکر میں تھا۔ ایک دوست نے تسلی دیتے ہوئے موبائل پہ بتایا کہ صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اسے سیاہ کاری کا کیس بنا دے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہ سیاہ کاری میں قتل قتل میں کیے جاتے ہیں۔ مرد عورت دونوں کو ہی فوراً مار دیا جاتا ہے۔ ایک بار پھر ملا کوٹ ذہن کے دریچے میں چلا آیا "معاف کرنا ہی اصل جذبہ ہے۔ ایک باعفت بیوی کو کیوں بے گناہ مارتے ہو؟ جانتے ہو عذاب خداوندی کیا ہے؟ ہمیشہ رہنے والا۔ یہ دنیا کا حساب نہیں کہ کاٹی وقت ہے۔ اربوں کھربوں سالوں کا عذاب" شربت کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ ایک جرم کے بعد دوسرا جرم۔ ایک قتل کے بعد دوسرا قتل! وہ من ہی من میں کانپ اٹھا۔ مگر انسان تو دوسرے کی موت پر خوش ہے۔ امیر غریبوں کو کھا رہے ہیں، سپاہیوں نے شہریوں کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ وہ بھول گئے کہ تو سردی میں جنس کیسے؟ شیر اگر ہرن پر رحم کھائے تو جیے کیسے۔ صاحب نکالے تو لوگ اسے جھولے کی رسی بنا لیا کریں، کمر بند کی طرح استعمال کریں۔ ملا کوٹ کے سامنے عمر آن کھڑا ہوا۔ جانتے ہو عمر قید؟ دیواروں کے اندر اذیت ناک زندگی، پھانسی کا پھندا، انسان بھول جاتا ہے۔ وزن کم ہو تو پاؤں سے بوری باندھ دیتے ہیں کہ زوردار جھٹکا پڑے۔ گردن کا منکا ٹوٹ جائے۔ ترک کی آواز آئے ورنہ سانس گھٹنے سے جان کنی کا عالم چھتار ہے گا یا بے رحم گولیاں سینے سے گزرتی ہوں گی۔ مرد ذمہ دار ہے تو کتنی شادیاں اور کر سکتا ہے، کنیزیں، لونڈیاں، باندیاں، وہ خود دے کر صلح کی قیمت لائے۔ باری کے بھائی ہو سکتا ہے یہ جی سے اغوا کر کے لے جائیں مثلہ کر دیں یا زندہ کو آگ لگا دیں یا مار کر بچھوؤں کی غار میں پھینک آئیں۔ ایک طویل قید، جیل کا کھانا پینا کر دے جسے حیوان بھی منہ نہ لگائیں اور گیلی جیل کا پانی جو انسان کو اندر ہی اندر کھا جاتا ہے۔ عمر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سیاہ کاروں کو قتل کرنے والا تو غیرت مند مرد کہلاتا ہے۔ قانون بھی معاف کر دیتا ہے یا ہلکی سی سزا۔ یہ قتل عزت کی خاطر کیا گیا۔ مردوں کو عزت ہی تو پیاری ہے۔ اگلی دنیا میں بھی جانتے ہیں کہ عزت سے ہی اٹھائے جائیں۔ نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں ہو۔

شربت نے موبائل سے رابطہ کر کے ایک وفادار دوست کو بلوا لیا۔ پھر بھی اشاروں کنایوں میں سمجھا دیا۔ چہرے پہ چادر لپیٹ کر وہ موٹر سائیکل سوار کے پیچھے آ بیٹھا۔ کچھ سوار کے پیچھے چھپ گیا۔ باقی کمی چادر نے پوری کر دی۔ اب اسے کوئی بھی پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس کا علاقہ بی زون میں آتا تھا جبکہ سڑک کے اس پار اے زون تھا۔ یہ علاقہ پولیس کے پاس تھا۔ بلوچستان کا کوئی صد لیویز کے پاس ہے جبکہ وہ دو برس میں اگر یہ آتا پولیس کو شاید آتشام ہو گئے۔ پولیس والا قربان کار بنا لیتے اور فرشتہ اگری استعمال کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ لیویز کے سپاہی ڈبل کیبن کے ساتھ ہی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ کچھ موبائل پر باتیں کیے جا رہے تھے۔ سگریٹ بھی پھونکے جا رہے تھے۔ شربت حسب روایت شربت ہی کے بھائیوں پہ تھا۔ ان کی بندوقیں وہ چرا لی تھیں، جیسے اناڑی کے ہوتے جنہیں اناڑی پھینک کر چلے جاتے ہیں اگلی صفوں میں جگہ بنانے کے لیے۔ شربت پچھواڑے کی دیوار سے چڑھا اور صحن سے بھی مدد لی اور پھر گھر میں کود پڑا۔ گھر خوفزدہ سہما ہوا سا تھا بالکل دم سادھے جیسے میر ساکت و جامد ہیں اندھیرے میں زمین سے چپکا رہا کہ کیا عجب لیویز پولیس چھپی بیٹھی ہو مگر کوئی آہٹ نہ آئی تو تو دبے پاؤں اپنے پورشن میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ بختو جائے نماز پہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی ہے۔ کب سے آنسو رواں ہیں۔ اس کا دل تیج گیا۔ قدموں کی سرسراہٹ سے بختو کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے متوحش ہو کر دیکھا اور شربت کو سامنے پا کر مبہوت ہی رہ گئی۔ وہ صلح سے

اٹھ بیٹھی اور چاہا کہ بھاگ کر گلے لگ جائے کہ شربت نے ڈب سے پستول نکالا اور بختو پہ تان لیا۔ بختو کی دل دوز چیخ اندھیرے میں کہیں کھو سی گئی۔ شربت کا پستول گولیاں اگل رہا ہے۔ بختو کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچی مگر ساکت ہوگئی۔ شربت کے بھائی بدحواس اور ہراساں دوڑے چلے آئے۔ ایک کے پاؤں میں تو جوتا بھی نہ تھا۔ شربت کا خالی پستول بختو کا لہولہان جسم بھی بیان لکھوا رہا تھا۔ شربت فرطِ جذبات سے نعرے لگا رہا تھا۔ ''سیاہ کاروں کو مار دیا۔'' ساتھ ہی ساتھ وہ خالی پستول ہوا میں لہرا رہا تھا۔ وہ فتح و سرشاری میں سرشار گیٹ سے باہر نکلا تو پورا محلہ جمع ہو چکا تھا۔ غیرت مندوں کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں بھی جوش و ولولہ تھا۔ پولیس بھی دوڑی چلی آئی۔ حالانکہ علاقہ لیویز کا تھا۔ نوجوانوں نے شربت کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ فرطِ عقیدت سے لوگ اس کا پستول والا ہاتھ چوم رہے تھے۔ لیویز کے لیے اسے گرفتار کرنا ناممکن نہ تھا۔ مجمع ان پہ پل پڑتا۔ ہتھکڑی لگاتے تو ہجوم ان پر لوٹ پڑتا۔ ہجوم بپھر چکا تھا۔ حاجی رحیم رسالدار ہمت کر کے آگے بڑھا ''اسے تھانے لے جانا ہے۔ وہیل کیبن میں عزت سے بٹھا دیں۔'' حاجی رحیم کی اپنی شخصیت تھی۔ اس کا احترام کیا جاتا تھا۔ انہوں نے تھانے کا رخ کیا۔ حاجی نے دوبارہ مداخلت کی تو مجمع بھڑک گیا۔ ''آپ سب پیچھے پیچھے آئیں ہم کندھوں پہ اٹھا کر ہی تھانے لے جائیں گے۔''

◆◆◆

بلوچستان کے نمائندہ افسانہ نگار آغا گل کے افسانوں کی نئی کتاب
''لگتا ہے جو سرکش جن حضرت سلیمان نے کوہِ سلیمان کی غاروں میں بند کیے تھے
ان میں سے آغا گل آزاد ہو چکا ہے (آفتاب مہمن)

پاسنگان کا مطلب کیا!
شائع ہوگئی ہے
ملنے کا پتہ: مہردر انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز، کوئٹہ۔ 0333-7832323

بلوچستان کے معروف فکشن نگار آغا گل کی ایک اور نئی کتاب
خقل دما
شائع ہوگئی ہے .... قیمت:-/200 روپے
ملنے کا پتہ: یونیورسٹی بک پوائنٹ شاپ نمبر 10، کبیلہ کوئٹہ (0345-8813838)

"عجیب کہانی"

عذرا اصغر

مختصر تعارف

عذرا اصغر 22 دسمبر کو دہلی (بھارت) میں پیدا ہوئیں۔ ان کی پہلی کتاب 1962ء میں چودہ روزہ "نیا پیام" لاہور میں شائع ہوئی۔ 5 سے زائد ناول، 7 افسانوی مجموعے جن میں "مسافتوں کی تھکن"، ناول اور افسانوی مجموعے "پت جھڑ کا آخری پتہ"، "بیسویں صدی کی لڑکی"، "کھڑکی میں بیٹھا وقت" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے، پنجابی افسانے، بچوں کا ادب، تراجم، انشائیے، رفقا کے مضامین، تبصرے، نظمیں، ہائیکو اور ماہیے تحریر کیے۔ "تجدید نو" کے نام سے ادبی مجلے کی ادارت کے فرائض بھی ادا کرتی رہی ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پاکستانی بینکوں کا نظام نیا نیا آن لائن ہوا تھا۔ جب اس نے بھی سب کی طرح اپنا پنشن اکاؤنٹ ہمارے بینک میں کھلوایا تھا۔ کریڈٹ کارڈ ہوا کے بہت خوش ہوئی نہ بینک جانا پڑتا تھا اور نہ لائن میں لگنا پڑتا۔ گھر بیٹھے اپنے کسی بچے کو کارڈ دیتی اور جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی نکلوا لیتی۔ عرصہ دراز تک معاملہ یونہی آسانی کے ساتھ چلتا رہا۔ البتہ ہر تین مہینے بعد اسے اپنی متعلقہ برانچ میں جانا پڑتا جہاں اس کی شناخت ہوتی۔ "وہ زندہ ہے اور اب تک اس نے دوسری شادی بھی نہیں کی۔" اس شادی والی بات پر وہ خوب ہنستی اور لطیفے کے طور پر دوستوں کو سناتی۔

"لو اب پچاس پچپن برس کی عمر میں میں دوسری شادی کروں گی۔"

"ارے بھئی دل جوان ہونا چاہئے۔ عمر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ابھی اخبار میں ایک خبر چھپی تھی۔ شاید امریکہ کے کسی اسی سالہ بڈھے نے شادی کی ہے۔ دلہن کی عمر ستر برس ہے۔ بہر حال عرصہ دراز تک سلسلہ یونہی چلتا رہا پھر اسے ہمارے شہر میں منتقل ہونا پڑا اور ہر تین مہینے بعد وہ ہماری برانچ میں آ کر اپنی شناخت کرواتی۔ شروع شروع میں کچھ وقت کے بعد اس کی انگلیوں اور انگوٹھے کے نشانات صحیح آ جاتے اور ہم ویری فائی کر کے اس کا کیس اس کے پچھلے والے شہری برانچ کو بھجوا دیتے اور اس کا اکاؤنٹ کھل جاتا۔ اصل میں وہ شناختی دستاویز صحیح تاریخ تک بینک میں بھجوانا بھول جاتی تھی اور بینک یاد داشت کی اطلاع اس کے پرانے پتے پر بھجواتا رہا جو ظاہر ہے اسے موصول نہ ہوتے۔ پتہ بھی تبدیل نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے یہ دقت پیش آتی کہ ہر دو تین مہینے بعد اس کا اکاؤنٹ بھی بند ہو جاتا تھا اور اسے دقت اٹھانا پڑتی۔ تقریباً مہینہ اسی تگ و دو میں گزر جاتا اور اس کچھلے میں دستاویزات جمع کرانے میں کافی تاخیر ہو جاتی اور پھر وہی کہانی دہرائی جانے لگتی۔ وہ اپنے پچھلے والے شہر فون کرتی اور اسے اپنے شہر کی کسی برانچ میں رابطہ کرنے کو کہا جاتا۔ ہم اس کے ہاتھوں کے بھی پوروں کے

تصدیقات دوبارہ لیتے جو صحیح نہ تھے۔ وہ الجھن میں پڑ جاتی۔ بمشکل مسئلہ حل ہوتا کہ تیسرا مہینہ پھر آ جاتا۔ اب اس کی عمر بھی بہت بڑھ چکی تھی اور ملک میں بلکہ ساری دنیا میں کرونا پھیلا ہوا تھا۔ اس دفعہ اس کے عذر کے باوجود اس کے پچھلے شہر والے بینک کے آپریشن منیجر نے کہا۔

''میڈم! آپ کو ہر صورت اپنے شہر کی برانچ میں جانا پڑے گا۔ ہمیں یہی حکم ملا ہے۔ میں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی کہ آپ کے جائے بغیر مسئلہ حل ہو جائے۔ میں نے لاکھ عذر پیش کئے کہ خاتون عمر رسیدہ ہیں اور کرونا کی وبا کے سبب جا نہیں سکیں گی مگر جواب ملا کہ احکامات پر عمل کرنا ضروری ہے اس کے بغیر اکاؤنٹ نہیں کھل سکتا۔ البتہ اب میں یہ کر سکتا ہوں کہ آپ اپنی برانچ سے مجھے فون کروا دیں میں اپنی ذمہ داری پر آپ کا کیس حل کروا دوں گا۔ آپ ہماری پرانی اکاؤنٹ ہولڈر ہیں۔''

یہ تفصیل اس کے ساتھ آئے ہوئے اس کے بیٹے نے مجھے بتائی۔

ہم نے حسب معمول اس کے سب پیپروں کے بار بار تصدیقات لئے لیکن ہر دفعہ نتیجہ وہی برآمد ہوا۔ خاتون باذوق تھی۔ کہنے لگی۔

بیٹا آج جھریاں میرے ہاتھوں میں پڑ چکی ہیں۔ بقول شاعر میر انیس

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے   چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو!

مجھے اس کے ذوق نے بہت متاثر کیا۔ میں نے کہا۔ ''ماں جی! کیا کریں۔ سرکاری کام ہیں اور سرکار بھی کیا کرے۔ لوگوں نے اتنے جعلی اور جھوٹے اکاؤنٹ کھلوا رکھے ہیں اور پنشنیں وصول کر رہے ہیں۔ اس لئے تحقیقات کرنا پڑتی ہے۔ اب چھان بین ہو رہی ہے اور اس کی وجہ سے معزز لوگوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔'' بہر حال ! ہم اس کا مسئلہ حل کرنے میں کسی نہ کسی طور کامیاب ہو گئے۔ اس کا پتہ بھی تبدیل کر لیا گیا تاکہ اسے بروقت اطلاع دی جا سکے۔ کام مکمل ہونے کے بعد اس نے کہا۔ ''بیٹا! میں یوں خاموشی سے نہیں مروں گی۔ ٹی وی چینل پر اگر یہ خبر نہ بھی چلی تو فیس بک پر تو میرے مرنے کی خبر ضرور آ جائے گی۔''

بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''ماں جی! اللہ رحم کرے اور آپ کو سلامت رکھے۔'' اس کے ساتھ آئے اس کے بیٹے نے کہا۔

''سر! میری ماں معروف قلمکار ہیں۔ دراصل۔'' متاثر تو میں اس کی شخصیت سے ہو ہی چکا تھا یہ معلوم کر کے مزید ہوا۔ وہ اپنی عمر کی دیگر بلکہ بیشتر خواتین سے مختلف تھی۔ کہا جاتا تھا کہ ترشیدہ بال اس کو باوقار بناتے تھے۔ گورا رنگ، بڑھاپے کے باوجود چہرے پر نکھار، بولتی ہوئی آنکھیں اور رکھ رکھاؤ میں تمکنت۔ اسے جاذب نظر بناتی تھی۔ اپنی جوانی میں حسین رہی ہوگی۔ اب بھی ایک نظر اسے دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ کرونا کی وجہ سے دفتروں میں روز بروز حاضریاں کم ہوتی جاتی تھیں۔ اگلے دو تین دن مسلسل چھٹیاں آ گئیں۔ موسم بھی یک لخت بدل سا گیا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہتی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں فراغت سے بیٹھا اپنے موبائل فون پر فیس بک پر پیغامات پڑھ رہا تھا کہ ایک پوسٹ پر میں ٹھٹھک گیا۔

''معروف قلمکار، افسانہ، سفر نامہ نگار، ناول نویس اور شاعرہ محترمہ نور آج صبح حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ہم سے جدا ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' خبر پڑھ کر میں کچھ دیر ساکن بیٹھا رہ گیا۔ ''اس کا بینک اکاؤنٹ کھل چکا تھا لیکن اس کی زندگی کا اکاؤنٹ بند ہو گیا تھا۔'' غیر ارادی طور پر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ جانے اس سے میرا کیسا تعلق تھا!

◆◆◆

پھر وہ کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گئے

حنیف باوا

آخر صغیر حسین شاہ ناخلف بیٹوں کے طعنوں، شکووں، شکایتوں اور تلخ ترش جملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے زندگی کی بازی ہار گئے۔ صغیر آباد کے صغیر حسین شاہ کے چار بیٹے تھے۔ انھوں نے ان چاروں کو اعلیٰ تعلیم سے نوازا تھا۔ ان میں سب سے بڑا وکیل تھا جس کا شہر میں اپنا چیمبر تھا، جو خوب چل رہا تھا۔ اس سے چھوٹا بطور سول انجینئر کسی سرکاری محکمے میں ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی اچھی خاصی تنخواہ تھی۔ تیسرے نمبر والا بیٹا والد سے طب کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ان کے ساتھ مطب میں بیٹھتا تھا۔ سب سے چھوٹا بیٹا گھر کی زرعی زمین پر کاشتکاری کرتا تھا۔ یوں صغیر صاحب کے گھرانے کا شمار گاؤں کے خوش حال گھرانوں میں ہوتا تھا۔ صغیر حسین شاہ ہمیشہ سفید قمیض اور شلوار میں ملبوس رہتے تھے۔ ان کے دراز قد پہ یہ لباس خوب جچتا تھا۔ انھوں نے طب کے ساتھ ساتھ شاعری کا شوق بھی پال رکھا تھا۔ اب تک ان کی شاعری کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی تھیں جنھوں نے خوب پذیرائی سمیٹ رکھی تھی۔ انھوں نے اپنے چاروں بیٹوں کے لیے بڑے کشادہ اور صاف ستھرے گھر تعمیر کروا کر ان کے سپرد کر دیے تھے۔

ایک روز انھوں نے سوچا کہ اب میری زندگی کا بھی کیا بھروسا۔ کیوں نا اب میں یہ زرعی زمین بھی بیٹوں میں تقسیم کر دوں۔ ان کی زمین پانچ چھ مربعوں پر مشتمل تھی لیکن یہ ایک جگہ نہ تھی۔ کئی قطعوں پر بکھری ہوئی تھی۔ ایک مربع کہیں تھا تو کہیں پر تھے۔ دو کسی اور جگہ پر تھے۔ اس بکھری زمین کو بیٹوں میں تقسیم کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ لیکن صغیر صاحب نے کسی نہ کسی طرح تقسیم کے اس دشوار مرحلے سے گزر تو گئے تھے لیکن بیٹوں نے اس تقسیم کو دل سے تسلیم نہ کیا تھا۔ چند ہفتے تو بیٹے خاموش رہے لیکن اس کے بعد ان کے مابین کھسر پھسر شروع ہو گئی جو آہستہ آہستہ تلخ چہ میگوئیوں میں تبدیل ہونے لگی۔ بعد ازاں اس نے کڑوے کسیلے جملوں کا روپ دھار لیا۔ یہ جملے کچھ یوں تھے ''خاک انصاف کیا ہے والد نے۔ جو گاؤں کے مشرق کی جانب کی بڑھیا زمین تھی وہ بڑا ہونے کے ناطے مجھے ملنی چاہیے تھی۔ وہ اٹھا کر چھوٹے کو دے دی۔'' ''آپ کو کیوں حق ملے ساری زندگی کاشت کاری میں کرتا رہا۔ اس پر تو حق میرا ہی تھا۔ وہ بڑوں کے آگے زبان درازی کرتے ہوئے تمھیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔'' بڑا غصے میں آ کر کہتا ہے۔ ''اگر اپنا حق مانگنا زبان درازی ہے تو میں یہ زبان درازی کرتا رہوں گا۔'' چھوٹا بھی اسی لہجے میں جواب دیتا ہے۔ جب ان دونوں کے مابین ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی تو تیسرا بیچ میں بول پڑا۔ ''کیوں لڑتے ہو میرے بھائی۔ تم دونوں تو پھر بھی اچھے رہے ہو۔ ادھر میری طرف دیکھو مجھے وہ ٹکڑا دیا گیا ہے جس پر گھاس پھوس کے علاوہ کچھ نہیں اُگ سکتا۔''

پھر چوتھا گویا ہوتا ہے۔ ''جو زمین میرے حصے میں آئی ہے جیسی بھی ہے میں قبول کرتا ہوں لیکن اس کی کاشت کاری پر جو اخراجات آئیں گے میں کہاں سے ادا کروں گا۔ تمام دولت پر تو ابا سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔'' جب یہ مکالمے صغیر حسین شاہ کے در پر دوہرائے جانے لگے تو ان میں شور شرابا اور بدتہذیبی کا عنصر پورے زور و شور سے شامل ہوتا گیا۔ کبھی صبح کبھی دوپہر اور کبھی شام کو ان کا یہ معمول بن گیا تو آہستہ آہستہ صغیر شاہ کے اعصاب شل ہونا شروع ہو گئے۔ آخر کب تک، برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایک روز

جب بیٹوں کی جانب سے صغیر جی کو پیش آنے والے رویے گستاخی کی تمام حدیں عبور کر گئے تو باپ کے شل اعصاب برف کی طرح منجمد ہو گئے تو وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے پیچھے گر گئے۔ بیٹے جو ابھی غصے کی حالت میں وہیں کھڑے تھے۔ تو ان میں سے ایک نے اپنی گاڑی منگوائی اور جلدی سے صغیر جی کو اس میں ڈالا اور انھیں سیدھا ہسپتال لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر نے تمام چیک اپ مکمل کرنے کے بعد کہا کہ ''افسوس آپ کے والد تو پچھلے پندرہ منٹ کے دوران انتقال کر گئے ہیں وہ چاروں دھاڑیں مار کر رونے لگے لیکن ان کی آنکھیں اشک بار کیوں نہ ہو سکیں سوچنے کی بات ہے۔ اب انھوں نے ہسپتال کی ایمبولینس پکڑی اور والد کو مردہ حالت میں گھر لے آئے اسی روز تقریباً رات گیارہ بجے ان چاروں نے گاؤں کے دیگر لوگوں کے ہمراہ باپ کو قبر میں اتارا۔ پھر انھوں نے سات مرتبہ مٹھیوں میں مٹی بھر بھر کر ان کی قبر پر ڈالی۔ اب صغیر شاہ صاحب ان سے بہت دور جا چکے تھے اور اب ان کی روز روز کی چیخ بھی ان کے کانوں تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اگلے روز صبح دس بجے قل خوانی کا وقت مقرر کیا گیا تھا۔ قل خوانی سے پہلے شامیانوں نے بہت وسیع علاقے کو اپنے گھیرے میں لیا پھر قل خوانی کے بعد کثیر تعداد میں آئے لوگوں کی اچھے اچھے کھانوں سے سیوا کی گئی۔ لوگوں نے بھی ان کھانوں کو بڑے مزے لے لے کر کھایا۔ پھر اسی روز تقریباً پانچ بجے کے قریب جب گرمی کا زور ٹوٹا تو لوگ دعا کے لیے آنے لگے۔ دریوں پر سامنے صغیر شاہ صاحب کے چاروں پوت کندھے سے کندھا ملائے نظریں نیچی کیے بیٹھے تھے۔ دعا مانگنے کے بعد جب لوگ انھیں پرسا دینے کے لیے کہتے ''چلو اللہ کی یہی مرضی تھی'' تو کچھ دیر کے لیے ان کی نظریں اوپر اٹھیں تو یہ کہتے ''ہاں جی اللہ کی یہی مرضی تھی'' اس کے بعد پھر ان کی نظریں زمین میں گڑ جاتیں۔ ''بچو آپ سے آپ کا حقیقی اثاثہ چھن گیا ہے۔'' سامنے سے یہ آواز آتی تو وہ خاموش نظریں نیچی کیے بیٹھے رہتے۔ منہ سے کچھ نہ بولتے۔ اگر کبھی کچھ کہتے بھی تو وہ نہ سمجھ میں آنے والا ہوتا۔ ہاں تو جو ان میں سب سے بڑا تھا وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن سے مسلسل دری کو کریدے جا رہا تھا۔ جیسے وہ اس میں سے کچھ ایسا تلاش کر رہا تھا جو اسے دری کے ان بوسیدہ دھاگوں میں کبھی نہیں مل سکے گا۔

◆◆◆

قیدِ مکرر

نعتیہ نظم

حنیف باوا

میں تکدا / اکھاں ہنجواں بھریاں / یا رسول اللہ / کعبہ دے غلافاں دے تے بھجیاں / اکھاں نال / امتاں نوں حق دے تیاوے لا گئے / جدوں جھولی اڈاں / ہتھاں ایہ نفس دی جھولی / کدی نہ اڈی جاوے / پر کیہڑے منہ نال اڈی جاوے / ایجی جھولی ہتھاں / اس کا کلمہ دے قل لبڑی پئی اے / اجہوں میں ساری حیاتی / اپنے عملاں دے حق تے معذرتاں / پر یا رسول اللہ / او ڈک / ہاں تاں میں تیرا / امتی / اصلیا اے / اپنے ہتھیاں نوں تاں کدی ذرا اس تھیں کیہا / میں اماں دی / آپ سرکار دے اگے / ہتھ جوڑ کے عرض کریاں / جو میری ایس / گناہواں بھری جھولی نوں / اپنی رحمت دے پاک چوڑ پانی نال / تو ایں تھوڑا دے ایس جو حشر دیہاڑے دے جد میں / رب سامنے دے لگے / حاضر ہوواں / تاں ماں فخر دا پلا چکر کے / پورے قد دے نال / حاضر ہوواں

اِک دردِ آشنائی

محمد طارق علی

مختصر تعارف

محمد طارق کے خاندان نے 1947ء میں پاکستان آمد کے بعد راولپنڈی میں قیام کیا۔ محمد طارق نے ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی۔ صحافت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ چند افسانے لکھنے کے علاوہ اردو میں درجنوں مضامین، انگلش سے ترجمہ کیے۔ 2010ء میں ادب نگاری کا آغاز کیا۔ افسانے، تبصرہ جات، کتب، مزاح نگاری کی۔ افسانوں کی بڑی تعداد چھپ چکی ہے۔ محمد طارق علی کے افسانے آپ بیتی کے رنگ میں قاری کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کا فن لیے جملوں کی بہترین بُنت اور اظہار کے مجموعے ہیں۔

کالج سے نکل کر راشد نے عملی زندگی کا آغاز کیا ہی تھا کہ مشکلات کے جال میں جکڑا گیا۔ کم تنخواہ کے ساتھ ایک نجی ادارہ فرم کی نوکری اور اس کے ساتھ بہتر جاب کی تلاش مسلسل۔ کرائے کا مکان، آئے دن بوڑھے والدین کی بیماریاں اور چھوٹی بہن کا بوجھ۔ اُسے ان سب مسائل سے تنہا ہی نمٹنا تھا۔ ایک ہیجان خیز پریشانی اور بھی تھی جس سے وہ اندر ہی اندر نبرد آزما تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ کئی سال پیشتر اُس نے اپنی جانِ بہار ''اسما'' کو کھو دیا تھا، وہ یوں کہ اس کا کوئی امیر کزن باہر سے آیا اور جھٹ پٹ اُسے بیاہ کر لے اڑا اور دیسی فضاؤں سے یورپین فضاؤں کی طرف۔۔۔۔ ان دنوں وہ بی اے کا فائنل امتحان دے کر رزلٹ کی طالبہ تھی۔

کیسے بھلایا جا سکتا تھا وہ وقت جب پیار کے پہلے بادل کا سایہ ان دونوں پر پڑا۔ کالج میں بی اے کا آخری سال تھا۔ کلاس فیلو اسما راشد کے چمنِ دل کی ملکۂ بہار بن چکی تھی۔ دونوں اس نوپا فسر خوشی میں سرشار تھے لیکن وہی کزن والی ان ہونی ان کی منتظر تھی۔ وہ وہ کھلا کھلا، اجلا اجلا سا زمانہ زیادہ دیر تھم نہیں سکا اور پلکوں میں بیت گیا۔ اس کی جانِ بہار، بوٹے سے قد، متناسب جسم، چاندنی ایسے نکھرے رنگ اور جھلملاتی آنکھوں والی اسما، اچانک ایسی گئی کہ راشد اسے روک کر اپنا قصور بھی نہ پوچھ سکا۔ چند آنسو اس کے گالوں پر ڈھلکے اور دل میں ملال بھری تیرگی کو بڑھا گئے۔ وہ لاتعلقی کی سی کیفیت لیے دریدہ دل کی رفوکاری کرتا رہا، گہری خاموشی کے ساتھ کہ بعض دفعہ خاموشی ہی دکھ کی دارو ہوتی ہے۔ زندگی کے اسی رنگ میں تین چار سال بیت گئے۔ اسما کہاں اور کیسی ہے، اس بارے راشد نے کبھی کچھ زیادہ سوچا نہیں اس لیے کہ کالج کے زمانے کی اسما کا ان مٹ امیج اس نے دل کی گہرائیوں میں کہیں سب سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ کسی خالی وقفے میں اُسے دھوپ ڈھلے تک، چند لائنوں کی دید، پھر اُسے وہیں تھپک دیتا اور روز مرہ کے امور میں کھو جاتا۔ جانتا تھا کہ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس کے لیے یاد کے یہ مختصر لمحے بھی غنیمت تھے۔ تاہم ایک اور بڑی پریشانی اس کی جان کی دشمن بنی ہوئی تھی، وہ تھی اچھی نوکری، جو تلاش کے باوجود راشد کے لیے ابھی تک ایک بڑا سوالیہ نشان تھی۔ تاہم قوتِ ارادی مضبوط تھی، محنت اس کے مزاج کا حصہ اور ہمیشہ کی طرح

والدین کی دعائیں سائبان کی طرح اس پر سایہ فگن تھیں۔ رہا نتیجہ، سو وہ بہتر رہا۔

پھر یوں ہوا کہ آنے والے دنوں میں ایک دن ایسا بھی تھا کہ راشد کی محنت رنگ لے آئی۔ میڈیکل ریپ کی جاب کے لیے جو اسے پسند تھی، ایک معروف کمپنی کی جانب سے آفر آ گئی۔ اس نے سب سے پہلے ماں کو بتایا اور ڈھیروں دعائیں پائیں۔ مشاہرہ اور سہولتیں اچھی تھیں، تاہم ذمے داریاں بھی زیادہ تھیں۔ شہر سے باہر دوسرے مقامات تک جانا، ڈاکٹروں سے باقاعدہ ملاقاتیں، مارکیٹوں میں اچھے کاروباری کیمسٹس / اسٹاکسٹس تلاش کرنا، اعلیٰ و مختلف دواؤں کے ساتھ ہومیو ادویات کی سیل اور ہر ہفتے دفتر کے شعبہ مارکیٹنگ میں اپنی پراگریس رپورٹ دینا۔ اسے کمپنی کی طرف سے گاڑی بھی مل گئی کہ فرائض کی انجام دہی میں آسانی رہے۔

راشد کو فیلڈ ورک کا اچھا تجربہ حاصل تھا، نئی ذمہ داریاں اس کے لیے مشکل نہ تھیں۔ البتہ ہومیو ادویات کی سیل کا کام اسے پہلی مرتبہ ملا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور طے کیا کہ ان ادویات کے لیے بڑے شہروں کی نسبت، چھوٹے شہروں، مضافاتی قصبوں اور دیہی علاقوں میں زیادہ گھوم پھر کر کام کیا جائے۔ آغاز حوصلہ افزا رہا اور پھر ہواؤں کے رخ پر صبح تا شام آسمان پر بکھرتے ہوئے مختلف الانواع رنگ اس کی آنکھوں میں آ سماتے اور گذر جاتے۔ وہ نئے نئے علاقوں میں جاتا اور اعلیٰ و مختلف ادویات والے کلائنٹس کی تعداد بڑھاتا رہا، تاہم کوشش کے باوجود ہومیو ادویات کی مارکیٹنگ خاطر خواہ نہیں تھی۔ راشد فکر مند تھا، وہ بڑی توجہ سے اس شعبہ کے ڈاکٹروں اور کیمسٹوں کو محفوظ کرنے لگا۔ ایک دن راشد راولپنڈی کے ایک قدیم نواحی قصبے، واہ جا پہنچا۔ پہلے کبھی یہ ایک خوابیدہ سی بستی ہوا کرتی تھی۔ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہی بستی اب صورت بدل کر ایک جدید ماڈل ٹاؤن شپ کا روپ لے چکی ہے۔ اس کے دل میں امید جاگی کہ یہاں اس کا کام بن سکتا ہے۔ بارونق بازار کا چکر لگایا تو صرف ایک ہومیو کلینک نظر آیا۔ ڈاکٹر صاحب اندر موجود اور چند مریض بھی تھے، وہ انھی کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ باری آنے پر اپنا کارڈ پیش کیا، ڈاکٹر صاحب چند لمحے اسے ایک ٹک دیکھا کیے۔

"معاف کیجیے گا، چہرہ کچھ اپنا اپنا سا لگتا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے غلط فہمی ہو، مناسب سمجھیں تو پورا تعارف؟" وہ بولتے ہوئے مسکرائے، چشمہ اتار دیا۔ نوکر چائے لے آیا۔ تعارف شروع ہوا تو والد بہت، موجودہ رہائش کے بعد انھوں نے قدرے تفتیشی لیکن مہذب لہجے میں خاندانی پس منظر اور قیام پاکستان سے پہلے کے حالات جاننا چاہے۔ راشد نے چند ایک جملوں کے بعد معذرت کی کہ وہ زیادہ نہیں جانتا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب بھیگی آنکھیں لیے آہستہ سے اٹھے، اسے گلے لگایا اور رندھی ہوئی آواز میں کہا:

"اب مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا، کیونکہ میں آپ کے خاندانی پس منظر سے واقف ہوں، آپ میرے بچھڑے ہوئے عزیز ہیں، میں نے کافی عرصہ تلاش کیا، مختلف لوگوں سے معلوم کیا لیکن آپ لوگوں کو نہ ملنا تھا، سو نہ ملے۔ اب میں کسی اتوار کے دن مسز کے ساتھ آپ کے ہاں حاضری دوں گا لیکن پہلے فون کر کے۔"

"ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ میری شکل کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے جبکہ میں آپ سے آج پہلی بار ملا ہوں۔"

"ہاں، اچھا سوال کیا، آپ کے نقوش ہو بہو اپنے والد سے ملتے ہیں، پارٹیشن سے پہلے ہمارا ایک ہی گاؤں، ایک ہی ضلع تھا، باہمی رشتہ داری بھی تھی۔" وہ گیلی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولے۔ اسی وقت دو ایک مریض کلینک میں آ گئے۔ "اچھا، باقی باتیں بروز اتوار، آپ کے گھر والوں سے ملنے کے لیے میرا دل ابھی سے بے چین ہو گیا ہے۔" "یو آر ویلکم۔"

چوتھے دن اتوار تھا، ڈاکٹر حکیم قریشی اپنی مسز کے ساتھ راشد کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کے والد سے بہت پرتپاک اور خاصی جذباتی

کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ماضی کو ٹٹول کر دیرینہ باتوں اور اپنے اپنے خاندانی حالات ایک دوسرے سے شیئر کیے۔ ایک اچھے لنچ کے بعد مہمان آئندہ ملتے رہنے کے وعدے وعید کر کے رخصت ہوئے۔

اس پہلی ملاقات سے گھر والے بہت خوش تھے جب کہ راشد نے کوئی خاص تاثر نہیں لیا۔ وہ حسب دستور اپنی روزمرہ والی گردش کی لپیٹ میں تھا۔ گرمی دھوپ اور دھول کے مرغولوں میں شہر شہر، قصبہ قصبہ سڑکیں ناپنے میں لگا رہا۔ البتہ ایک اتوار اس نے ڈاکٹر علیم قریشی کی جوابی دعوت میں اپنے گھر والوں کے ہمراہ شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی تعلیم، کام اور کام کے بارے کافی سوالات کیے۔ سو اس کے لیے یہ ملاقات محض ایک رسمی سا کام تھا اور بورنگ بھی۔ آنے والے دنوں میں یہ پرانے رشتہ دار، جو اب ''نوابے'' تھے بہت خوش دلی سے دیر اور بار دیر والی ملاقاتیں کرتے رہے۔ شروع میں خاصے جھجک جھجک کر لے تکلف آمیز باتیں ہوئیں۔ ان دنوں پنڈی کی شہری خواتین میں پردے کا چلن عام تھا۔ کئی دفعہ کے ملنے ملانے میں دونوں گھرانوں کا یہ تکلف کم ہوتے ہوتے بالآخر ختم ہو گیا اور یوں باہمی شناسائی و بے تکلفی اور بڑھی۔ ایک دوسرے کی پسند و ناپسند کے بارے خوب خوب جان کاری کی گئی۔ نسائی رسالوں، کتابوں، ریڈیو ٹی وی ڈراموں پر بھی ایک دوسرے کو سیر حاصل تبصروں سے نوازا گیا۔ اس سے پہلے کہ تعلق والی ملاقاتوں میں راشد کی موجودگی بھی بھاری تھی۔ قریشی گھرانے کی بیٹا نٹ پانچ لڑکیوں نے راشد کی شخصیت کا خاموشی سے جائزہ لیا، ایک نک نیم رکھا اور اسے چھپا لیا، کسی اگلے وقت استعمال کرنے کے لیے۔ اتوار کا دن، آغاز برسات والی صبح کے گیارہ بجے تھے۔ آسمان پر بادل جمع ہو چکے تھے۔ حسب توقع نرم نرم پھوار برسنے لگی۔ ہلکی ہلکی ہوا اور رم جھم میں موسم بے حد حسین ہو گیا تھا۔ دوات سے مہمان لڑکیاں آ گئیں، ڈاکٹر صاحب کے بغیر۔ آتے ہی شور مچایا کہ ہم پکوان تیار کریں گے، ڈھولکی ساتھ ہے، گیت بھی گائیں گے۔ کوئی اداس چہرہ نظر نہ آئے ورنہ ہم بہت بگڑیں گے۔'' ''اداس چہرہ'' کمرے میں بند، فیملی آغوش میں تھا۔ پکوان تیار ہونے لگے، ڈھولکی پر گیتوں کی تانیں اڑیں۔ کچھ ہی دیر بعد میز پر ڈشیں چن گئیں۔ کھانے کا دور چلا اور بھی بے حد خوش۔ کوالا مات سے تو ایک ادھ۔ راشد کے لیے تیار تھی لیکن مسز قریشی کے اصرار پر اسے برآمدے میں شرکا کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔ ایک پھر کہتے ہوئے گیت کی فرمائش کو اس نے ٹال دیا۔ کام و دہن کی آزمائش کے ساتھ ساتھ گپ شپ میں کئی موضوعات پر زبان کی قینچیاں چلیں اور کئی مزاحیہ ریڈیائی ڈراموں کے خوشگوار مکالمے بھی دہرائے گئے۔ جو باتے شدہ میں مسز قریشی نے راشد کی شادی کے بارے اس کی والدہ سے ایک معمولی سا سوال کیا کہ کب ہو گی۔ ان کا جواب تھا ''یہ مانتا ہی نہیں۔'' ''ان کی کوئی پسند؟'' اگلا سوال

''یہ کسی کو جانتا ہی نہیں، حالانکہ ایسے کالج میں پڑھتا رہا ہے کہ جہاں مخلوط تعلیم تھی۔'' ماں کا جواب

کسی لڑکی نے فوراً فقرہ اچھالا ''پھر تو یہ فلم 'نیچا باورا' کے ہیرو ہوئے۔ آج کل پنڈی کے ایک سینما گھر میں لگی ہے۔''

''فلم دیکھنے کی کیا ضرورت، انھیں یہیں دیکھ لیں، اور ''مس ترپت'' والا گن بھی لا دیں گے۔''

راشد وہیں بیٹھا ہوا اور اسے شرارتی جملوں کی زد میں تھا۔ ''لگتا ہے، راشد صاحب، آپ ''پہلی نظر'' کی اہمیت کے قائل نہیں، جبکہ آپ کئی سال تک مکس کلاسز والے کالج میں پڑھتے رہے۔'' مہمان لڑکیوں میں سے کسی ایک نے کہا۔ ''نہیں تو آخری نظر کا بھی قائل نہیں ہوں۔'' راشد کی بات پر سب ہنس پڑے۔ ''تب تو آپ ''برہم چاری'' ہوئے کہیں دھونی رما کر بیٹھ جائیے۔ آئندہ آپ کو اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے گا۔'' ایک اور اوچھا قہقہہ۔ ان سلسلے وار باہمی ملاقاتوں کا ایک دن نتیجہ یہ نکلا کہ مسز قریشی نے دبے لفظوں میں

راشد کے والدین سے کہا کہ اب دونوں گھرانوں کو مزید قریب آنا اور اس قدیمی رشتے کو مضبوط بنانا چاہیے۔

جواب ملا ''ہاں، سوچا جا سکتا ہے لیکن ابھی ہمارے معاملات اتنے موافق نہیں۔ لڑکے سے بھی پوچھنا ہوگا۔'' ایک آدھ ہفتے بعد قریشی صاحب کے ہاں سے یہ اچھی خبر ملی کہ ان کا بڑا لڑکا چھٹی پر کویت سے آیا ہے، واپسی سے پہلے اس کی شادی کرنی ہے، آپ سب کو شرکت کی دعوت ہے۔ وقت مقررہ پر فنکشن ہوا۔ راشد، اس کے والدین اور بہن نے اپنی حیثیت کے مطابق شرکت کی، ان کا لایا ہوا تحفہ بھی معمولی تھا۔ تاہم انھیں غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ مہمانوں کو بتایا گیا کہ یہ ہمارے ''قدیمی رشتے دار'' ہیں، عرصے کے بعد ملے ہیں۔ اتنی بڑی بات، کیا یہ کوئی مذاق تھا یا دکھاوا، یا حقیقی لگاؤ؟ راشد اور اس کے گھر والوں کو اندازہ نہ ہوا۔ ہفتے بعد ڈاکٹر صاحب کا بیٹا سلیم قریشی بیوی سمیت کویت لوٹ گیا۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے راشد کے والدین اور بہن کا بلاوا آیا کہ بروز اتوار ان کے ہاں قرآن خوانی ہے اور اس کے بعد لنچ۔ وہ خوشی خوشی چلے گئے۔ شام واپسی پر وہ بہت خوش اور متحیر سا تھا لائے اور راشد سے کہا ''مبارک ہو، ہم نے راحیلہ سے تمھاری منگنی کر دی ہے۔'' وہ ہکا بکا کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ فوری طور پر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حواس گم۔ پھر یکا یک اس نے خود کو سمیٹ کر کہا:

''مگر یہ سب اتنا اچانک رشتہ کیسے ہوا؟ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔'' ''ارے نادان، رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں، اس میں کیوں، کیسے والی بات نہیں۔'' ماں نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کا نور تھا اور راشد کی آنکھوں میں اچانک لوڈ شیڈنگ کا اندھیرا۔ ''رہی تمھاری منشا کی بات، ہم نے ڈاکٹر صاحب اور ان کی مسز سے کہا تھا کہ ہم پہلے راشد سے پوچھیں گے، ان کا جواب تھا کہ پوچھنا کیا، گھر کی لڑکی اور گھر کا لڑکا۔'' ''مگر مگر...'' راشد نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ ''اگر مگر کچھ نہیں، تم نہیں دیکھو، تمہارے ابا کے ہاں سے اچانک میرے لیے سوال آیا اور پھر چٹکیوں میں ہی سب کچھ ہوگیا۔ وہ کسی دفتر میں معمولی کلرک اور میں اسکول میں آٹھویں جماعت کی طالبہ، رخصتی بھی ہوگئی۔ ابھی دلوں ایک بڑا حادثہ ہو گیا، اچانک ملک کا بٹوارہ اور ہمیں سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ ہم لوگ پاکستان آگئے اور پھر رب نے آہستہ آہستہ ہمیں سب کچھ دیا، کوئی دکھ نہ رہا، اور تمھیں کیا غم ہے، بتاؤ؟''

مجھے کیا غم ہے، مجھے کیا غم ہے، وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اندر کا دکھ باہر کیسے لاتا، نیم بے ہوشی، زبان بند۔

''آج بات ہوگئی ہے، ہم تین چار روز میں شگن کرنے ان کے ہاں جائیں گے۔'' والد نے مسکرا کر کہا۔ ''مگر تمھارا ابو، انھیں اب پردہ ہے۔'' ''نہیں، انکار اب بھی کیا جا سکتا ہے، میں ذہنی اور مالی لحاظ سے ہرگز تیار نہیں، مری پینک کے قرضے کا بوجھ ہے، آہستہ آہستہ اتار رہا ہوں۔'' ''بھائی، مسائل تو سب کے ساتھ ہیں اور ہاں، ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے واپسی پر ہم جعفر ستارہ شناس سے ملے تھے، یہیں قریب ہی اکال گڑھ میں رہتے ہیں، بہت مشہور ہیں، پیسے کم لیتے اور حساب کھرا کرتے ہیں۔ انھوں نے مبارک باد دے کر کہا لڑکے اور لڑکی کے ستارے کہتے ہیں کہ جوڑی ٹھیک رہے گی۔'' اس کی بہن سلمیٰ نے کہا۔

''اچھا، ستارے اور نجومی سچ کہتے ہیں اور میں جھوٹا ہوں، میرا کہنا ہے کہ یہ بوجھ اٹھا نہیں پاؤں گا۔ انکار کا امکان اب بھی ہے، جب مجھے ہی منظور نہیں تو اس بات کی حیثیت کیا۔'' راشد نے کہا اور عین اسی وقت اس کی امی کی آنکھوں میں خوشی کی چمک کی جگہ دکھ کی دھند چھا گئی۔ ''لگتا ہے کہ اس روز گھر میں فنکشن تو ایک بہانہ تھا، مسز اور مسٹر قریشی نے میرے لیے ایک پھندا تیار کر رکھا تھا، آپ لوگوں کو بلا کر انھوں نے اپنی مرضی چلا دی۔'' راشد کے چہرے پر تناؤ اور غصے کا رنگ۔ ''ہم لوگ اس روز ان کے ہاں منگنی کی غرض سے نہیں گئے تھے۔ فنکشن کے بعد لڑکی والوں نے باتوں باتوں میں اچانک خود ہی سے سوال اٹھا دیا۔ ہم نے ہاں کر دی تو کیا برا کیا؟ اب تم انکار کا کہہ رہے ہو،

ٹھیک ہے میرے سر پر مٹی ڈال دو، میں انکار کر دوں گی۔" ماں نے روہانسی آواز میں کہا۔

"بھائی، راحیلہ باجی میں کمی کیا ہے؟ بہت سگھڑ، بہت خوش سلیقہ، آپ کی طرح نہیں کہ ہر وقت منہ لٹکائے رکھتے۔ دیکھ لینا وہ جب یہاں آئیں گی، اتنا خیال رکھیں گی کہ آپ کو شکوہ کرنے کا موقع نہ دیں گی۔ کیوں امی، میں نے ٹھیک کہا؟"

"یہ میری بہن بھی اسی لڑکی کی وکیل بنی ہوئی ہے اور مجھے ہرگز اچھی نہیں لگ رہی۔" راشد نے منہ پھیر لیا۔

اگلے دنوں میں لڑکی والوں کے ہاں شگن بھی ہو گیا۔ گھر میں راشد کا موڈ بدستور خراب اور کھنچا کھنچا والا ماحول۔ اس نے ایک دن باپ سے کہا "میں لڑکی کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ پھر میرے حالات اچھے نہیں ہیں، میری تیاری بھی نہیں ہے۔" "تم باقی سب اللہ پر چھوڑ دو۔" جواب ملا۔ دو ماہ بعد ڈاکٹر صاحب نے راشد کو بلا بھیجا کہ ضروری بات کرنی ہے، وہ اکیلا آئے۔ وقت مقررہ پر ملاقات ہوئی۔ "منگنی کو کافی وقت گزر چکا ہے، ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔ بڑی بیٹی اپنے گھر کی ہے، راحیلہ چلی جائے تو ہم نے اپنی چھوٹی لڑکی کے لیے کچھ کرنا ہے۔ آپ فلاں دن میں بارات لے آئیں اور ہاں بڑی کو کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے اپنی بڑی بیٹی کو جہیز میں بارہ تولے سونا، اکتیس (۳۱) جوڑے اور دیگر ضروری سامان لے کر دیا تھا۔ خدا کا شکر، وہ بھی خوش اور ہم بھی خوش۔ اگر آپ اتنا سامان نہیں لا سکتے تو اس سے آدھا لے آئیں، ہماری عزت رہ جائے گی۔" ڈاکٹر صاحب کی دو ٹوک بات۔ ان کی مسز بھی بیٹھی تھی لیکن خاموش۔ "آپ کو اتنی ہی جلدی تھی تو منگنی کی بجائے نکاح کر دیتے، رخصتی بعد میں کسی وقت۔" "اس صورت میں بھی بڑی سے متعلق بات تو اسی طرح رہتی، البتہ یہ درست ہے کہ نکاح منگنی سے بہتر ہے۔"

دن بیتتے رہے۔ ایک ماہ، دو ماہ، ادھر تقاضوں میں شدت۔ منگنی گلے کا ہار بن کر رہ گئی۔ راشد کے لیے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ یعنی منگنی بھی ان کی مرضی سے، اور بڑی والی شرائط بھی انھی کی اور جہیز کا تقاضا کاروباری انداز میں۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم نہیں کہ چیزیں محض جسم کے لیے یا زیادہ خوشی کے لیے ہوتی ہیں جبکہ متاہلانہ زندگی صرف اچھے انسان اور ان کی باہمی رضامندی چاہتی ہے۔

انھی دنوں راشد کا ایک پرانا دوست منیر، ڈنمارک میں نوکری پوری کر کے، راولپنڈی واپس آ گیا۔ راشد نے اسے گھر کھانے پر بلایا۔ باتوں باتوں میں یہ مسئلہ اس کے سامنے رکھا اور حل چاہا۔ "خاموشی اختیار کرو، مسئلہ انھوں نے شروع کیا تھا، حل بھی وہی کریں گے، تم دیکھ لینا۔" دیگر موضوعات پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ منیر نے کہا "تمھاری وہ من چاہی خاتون اسما کوپن ہیگن میں تھی، ایک عام سے سکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی۔ اس کا شوہر بیکاری الاؤنس پر موج کرتا پھرتا تھا۔ ایک دن شراب کے نشے میں دھت اس نے گاڑی کہیں دے ماری۔ فل اسپیڈ تھی، بچنا کیسے ــــ میری اطلاع کے مطابق اسما، دو بچوں کے ساتھ واپس پنڈی اپنے گھر آ گئی ہے۔ تم چاہو تو اسے مل لو۔"

راشد خاموش رہا۔ اسما دل کی گہرائیوں میں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب مع بیگم، پھول پھول کرتے راشد کے گھر آئے۔ وہ اپنی ڈیوٹی پر تھا۔ نہ ہونے والے سسر نے بہت سی جا بے جا باتیں کرنے کے بعد منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ راشد کے آنے اور اس کا مسئلہ سننے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ بعد میں راشد نے گھر آ کر یہ فیصلہ سنا تو اسے دکھ ہوا، اپنے سے زیادہ اس بے قصور روح کا، جو ایک جلد بازی والے اور لالچ سے بھرپور فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ جیون بھی کیا ہے، ایک بے چاری نیا، جو منجدھار میں پھنس جائے تو ڈوبے، ویسے چلتی جائے تو بے منزل رہے۔

◆◆◆

نئی سڑک نئے لوگ

وحشی سعید (انڈیا)

مختصر تعارف

اصل نام محمد سعید قریشی 16 نومبر 1946ء کو فتح کدل سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ 1970ء کی دہائی سے باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز کیا۔ 8 کے قریب افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "سڑک جا رہی ہے"، "کنوارے الفاظ کا ذخیرہ"، "خواب حقیقت"، "ماضی اور حال" (تین جلدیں)، "آسمان میری مٹھی میں"، "پتھر پتھر آئینہ" شامل ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا جس میں "اردو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ" اور "محسن اردو ایوارڈ" شامل ہے۔ مسلسل کئی سال سے سہ ماہی "نگینہ" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

میرے شہر کا وہ حصہ جو پرانا شہر کہلاتا ہے اب ڈاؤن ٹاؤن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس ڈاؤن ٹاؤن میں ایک علاقہ فتح کدل کے نام سے مشہور ہے۔ در حقیقت اس علاقے میں دریائے جہلم پر ایک پل "فتح کدل" کے نام سے جانا جاتا ہے اور چونکہ کشمیری میں "کدل" پل کو کہا جاتا ہے، اس لئے اس پل کی مناسبت سے اس علاقے کا نام بھی "فتح کدل" پڑ گیا۔ دریائے جہلم پر بنا یہ فتح کدل کسی زمانے میں تھرڈ برج کے نام سے بھی مشہور تھا۔ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں اسے یہ نام دیا تھا۔

علاقہ فتح کدل میں ایک محلہ "تاشوان" ہے۔ تاشوان کی ایک اپنی تاریخ ہے۔ آج سے سینکڑوں سال پہلے یہاں بازارِ حسن سجا تھا۔ اس محلے کے ایک بڑے مکان میں ایک بڑا کوٹھا ہوا کرتا تھا، جو کسی رئیس کی حویلی سے کم نہ تھا۔ اپنے زمانے کی ایک مشہور گلوکارہ اس کوٹھے کی زینت ہوا کرتی تھی۔ اس کی آواز اتنی سریلی تھی کہ اس کے پرستاروں نے اسے ملکۂ ترنم خطاب دیا تھا۔ وہ نہ صرف ایک اچھی گلوکارہ تھی بلکہ بے حد حسین بھی تھی، اسی لئے وہ لوگوں میں زلیخا کے نام سے جانی جاتی تھی۔ بازارِ حسن میں وہ ایک اعلیٰ مقام رکھتی تھی۔ وہ اپنے آپ میں حسن کی ملکہ تھی۔ ملکۂ حسن، حسین و جمیل ہونے کے ساتھ آدابِ محفل کے رموز سے بھی واقف تھی۔ لوگ اس کے سلام و اکرام اور آؤ بھگت کے انداز سے بہت متاثر تھے۔ شہر کا ایک امیر شخص ملکۂ حسن کی خوبصورتی کا دیوانہ ہو گیا تھا اور روزانہ کوٹھے پر اس کا ناچ گانا سننے آتا تھا۔ وہ ہر دن اسی انتظار میں رہتا کہ کب اگلی شام آئے اور اسے پھر حسن کی ملکہ کا دیدار نصیب ہو۔ اس حسن کی ملکہ کا ناچ گانا سنتے سنتے اس امیر شخص کی زندگی کے دس سال گزر گئے۔ وہ کبھی کبھی سوچ میں پڑ جاتا تھا کہ آخر یہ کشش کس لئے اور کیوں۔۔۔ آخر دس سال کی مدت کے بعد اس امیر شخص نے حسن کی ملکہ کو اپنا بنانے کی ٹھان ہی لی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ امیر شخص نے اس سے کہا

"تمہارے بغیر میرا زندہ رہنا اب دشوار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم صرف اور صرف میری بن کے رہو۔"

حسن کی ملکہ نے مسکراتے ہوئے کہا: "یہ حسن کی ملکہ صرف ایک کے لئے نہیں ہے" اس کڑوے جواب کے بعد بھی وہ امیر شخص حسن کی ملکہ پر اپنی دولت لٹاتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ امیر شخص امیر نہ رہا۔ اب وہ کوٹھے پر آتے جاتے گاہکوں کی چلم بھرتا تھا۔

حسن کی ملکہ کی دنیا چمکتی رہی اور کبھی امیر رہنے والا وہ شخص پل پل اس کی محبت میں مرتا رہا۔ وہ یہ دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا جب حسن کی ملکہ ایک کی باہوں سے نکل کر دوسرے کے باہوں میں چلی جاتی تھی اور جب بھی اس کا یہ عاشق اس پر اعتراض کرتا تو وہ جواب دیتی:

"یہ میری دنیا ہے اور اگر تم کو میری اس دنیا میں رہنا ہے تو خاموش تماشائی بن کے رہو۔ میں کس کے پہلو میں سو جاؤں اور کس کے ساتھ اپنا دل بہلاؤں، یہ میری مرضی ہے۔ تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔"

حسن کی ملکہ کے عاشق کو یہ خلش دن رات ستاتی رہی، یہاں تک کہ وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا۔ چالیس سال کی عمر میں وہ ساٹھ کا بوڑھا لگنے لگا۔ اس کی برداشت جب حد سے پار ہو جاتی تھی تو وہ چرس کی چلم پھونکتا تھا اور پھر کوٹھے کے کسی کونے میں بے سدھ پڑا رہتا تھا۔ حسن کی ملکہ اب چالیس سال کی ہو گئی تھی لیکن اپنے لاجواب حسن کی وجہ سے وہ اب بھی اپنے سے بہت کم عمر چاہنے والوں کی باہوں میں جھولتی تھی۔ اسے پہلی بار ایک ایسے شخص سے عشق ہو گیا جو لگ بھگ اس کی آدھی عمر کا تھا۔ اب وہ دوسروں کی باہوں سے نکل کر اس نوجوان کی باہوں میں قید ہو گئی۔ اس نے دوسرے گاہکوں کے لئے اپنا ناچ گانا بند کیا۔ اس کے گاہکوں کو اس کا یہ طریقہ پسند نہ آیا۔ ان کی تلخی بڑھتی رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ حسن کی ملکہ اور ان کے درمیان جھگڑے کی نوبت بھی آ گئی۔ کبھی زمانے میں امیر رہنے والا اس کا عاشق اپنے آپ سے کہتا رہتا: "میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگا تھا صرف زندگی بھر کا ساتھ ہی مانگا تھا مگر اس نے ۔ ۔ ۔ ۔"

اپنی سچی محبت میں یہ شخص یہ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وقت کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ حسن کی ملکہ اب ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب حسن کی ملکہ کے کوٹھے پر بڑے پیمانے پہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بات چھینا جھپٹی تک پہنچ گئی۔ اس چھینا جھپٹی میں ملکہ نیم عریاں ہو گئی۔ ابھی اس کے عاشق نے چلم بھی نہیں پی تھی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ وہ تانبے کا ایک گلدان لے کر گاہکوں کی طرف دوڑ پڑا۔ کچھ لوگوں نے زبردستی اس کے ہاتھ سے گلدان چھیننا چاہا اور اس ہنگامے میں اچانک وہ گلدان زور سے حسن کی ملکہ کے سر پہ لگا اور وہ زمین پر گر گئی۔ سارا فرش ملکہ کے لال خون سے رنگ گیا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد وہ موت کے آغوش میں چلی گئی۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں پر موجود گاہک سکتے میں آ گئے اور آہستہ آہستہ وہاں سے کھسکنے لگے۔ ملکہ کے عاشق نے اسے اپنی باہوں میں لیا اور چیخ پڑا۔ "ملکہ! ۔ ۔ میں بھی آ رہا ہوں۔" وہ کوٹھے کی بڑی کھڑکی کی طرف دوڑ پڑا۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا وہ کھڑکی سے کود گیا اور اپنی جان دے دی۔

اس دن کے بعد بازار حسن سو گیا اور ایسا سویا کہ پھر کبھی نہ جاگا۔ بازار حسن کی رونق ملکہ کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ ملکہ کی کوٹھی خونی مکان کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اس خونی مکان سے ایک اور حقیقت بھی جڑی تھی جس کا علم بہت کم افراد رکھتے تھے۔ وہ حقیقت یہ تھی کہ کوٹھے میں ایک بچی کی پیدائش بھی ہوئی تھی۔ ملکہ کی وہ بچی رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی تھی۔ اس بچی کا باپ کون تھا؟ یہ راز گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ خونی مکان میں ہی دفن ہو گیا تھا۔

وقت گزرتا گیا اور گزرتے وقت کے ساتھ فتح کدل نے شہر کے مرکز کی حیثیت اختیار کی۔ جہلم کے دونوں کناروں پر کشمیری دستکاریوں کے بڑے اور عمدہ شوروم بن گئے۔ ان شوروموں پر بیرونی سیاح آتے اور خریداری کرتے۔ فتح کدل کی رونق بڑھتی گئی اور اس رونق سے سیاح بہت لطف اندوز ہوتے رہے۔ بہت سارے سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں فتح کدل کی یادوں کو قلمبند کیا۔

وقت مزید آگے بڑھا۔ فتح کدل سے دور ایک نئی جگہ وجود میں آ گئی۔ اس کا نام ریذیڈنسی روڈ رکھا گیا۔ کہتے ہیں انگریزوں کے دورِ حکومت میں "ریذیڈنٹ" ایک وزارتی عہدہ ہوا کرتا تھا اور اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام ریذیڈنسی روڈ رکھا گیا۔ اسی ریذیڈنسی روڈ پر مہاراجہ کے نام سے ایک پارک بنی ہے جس کو پرتاپ پارک کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہاں پر ایس پی کالج بھی وجود میں آ گیا۔ نوکر شاہی کے لئے پرتاپ پارک کے قریب کوارٹر بھی بنائے گئے۔ بعد میں یہ کوارٹر پولیس کالونی میں تبدیل ہوئے۔ پولیس کالونی کے ساتھ محلہ آبی گزر بھی وجود میں آ گیا۔ آبی گذر کے ساتھ ٹنڈل صاحب نے ٹنڈل اسکول کی بنیاد رکھی۔ یہ انگریزی میڈیم کا ایک بڑا اسکول بن کر ابھرا۔ ٹنڈل اسکول کے ساتھ ہی لڑکیوں کے لئے بھی ایک اسکول بنایا گیا جس کا نام مَلِنسن اسکول رکھا گیا۔

محلہ آبی گزر دریائے جہلم کے کنارے پر واقع ہے۔ اس محلے کے ایک خوبصورت مکان میں ایک خوبصورت عورت رہتی تھی جس کا شوہر ایک اعلیٰ سرکاری افسر تھا۔ اس خوبصورت عورت کی ایک خوبصورت بیٹی مَلِنسن اسکول میں زیرِ تعلیم تھی۔ بیٹی نے چھوٹی سی عمر میں ہی نہایت سریلی آواز پائی تھی۔ اس خوبصورت لڑکی کی خوبصورت ماں فتح کدل سے آبی گزر کیسے پہنچ گئی؟ اس بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ فتح کدل کی خوبصورت عورت ایک بڑے افسر کی بیوی کیسے بن گئی! فتح کدل کی یہ عورت ایک نہایت اچھے رکھ رکھاؤ والی تھی۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت بن کر ابھری۔ اس کی خوبصورت بیٹی کی آواز بہت ہی سریلی تھی۔ اسکول میں مختلف تقریبات پر جب وہ گاتی تھی تو اس کی آواز فضاؤں میں رنگ بکھیر دیتی تھی۔ اس وجہ سے وہ اسکول میں سب کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھی۔ دس سال کی عمر میں اس نے پہلی بار ریڈیو کے ذریعے اپنی آواز سے لوگوں کو محظوظ کیا۔ رانی کی کلاس کی ٹیچر نے ایک دن اس کی ماں کو بلا کر کہا "رانی کی آواز بہت میٹھی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اسے باضابطہ موسیقی کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے" رانی کی ماں نے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے موسیقی سیکھنے کے لئے راغب کیا۔ رانی نے پہلے موسیقی میں ایم اے کیا پھر اس میں ڈاکٹریٹ بھی کیا۔ اب وہ کالج میں موسیقی کی پروفیسر بن گئی۔ وہ نہ صرف پروفیسر بن گئی بلکہ موسیقی کی دنیا میں اس کا نام کافی عزت و احترام سے لیا جانے لگا۔ وہ اپنی سریلی آواز کی وجہ سے ہر جگہ بحث کا موضوع بن گئی۔ اب وہ سرکاری پروگراموں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس طرح اب سرکاری حلقوں میں بھی اسے جانا جاتا تھا۔ ایک بار ایک سرکاری تقریب میں اس کی ملاقات ایک خوب رو نوجوان سے ہو گئی۔ سیاست کے میدان میں ابھی وہ نیا ہی تھا۔ اس کی شخصیت پر کشش تھی۔ کچھ ہی ملاقاتوں کے بعد ان کو آپس میں محبت ہو گئی۔ رانی کی ماں نے اسے اس نوجوان سے دور رہنے کو کہا لیکن ماں نے جس قدر ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کی، وہ اتنا ہی ایک دوسرے کے اور زیادہ قریب ہوتے گئے۔ ایک دن رانی کی ماں نے اپنی بیٹی سے کہا "اگلی اتوار کو میں نے ڈاؤن ٹاؤن جانے کا پروگرام بنایا ہے اور تم بھی میرے ساتھ چلو گی" رانی بولی "کیا میرا جانا ضروری ہے۔؟" ماں نے کہا "میں وہاں اپنے بچپن کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم بھی جان لو کہ تمہاری ماں کہاں کی ہے" رانی بولی "میرے لئے آج ضروری ہے۔ میں ایک پروفیسر ہوں، ایک گلوکارہ ہوں، میرا مستقبل روشن ہے۔ میری ماں کا ماضی کیا تھا مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف آپ کا من رکھنے کے لئے آؤں گی" اگلی اتوار کو جب وہ ڈاؤن ٹاؤن پہنچ گئے اور ملاشوان کے محلے سے گزرے تو رانی کی ماں نے ایک پرانے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رانی سے کہا "بہت سال پہلے اس مکان میں اس شہر کی بہترین گلوکارہ رہتی تھی۔ سارے شہر میں وہ ملکہ ترنم کے نام سے مشہور تھی۔ اب یہ مکان ویران ہے اور قصہ پارینہ بن گیا ہے" رانی نے کہا "ماں ایسی مایوس کن باتوں سے میرا حوصلہ کم مت کرو۔ میں رانی ہوں اور رانی ہی رہوں گی" دو سال گزر گئے۔ ایک دن پرنسپل نے رانی کو بلایا اور اسے کہا

"وزیرِ تعلیم ہمارے کالج میں آرہے ہیں۔ آپ موسیقی کا ایک بہترین پروگرام پیش کرنے کی تیاری کریں"

وزیرِ تعلیم آگئے اور ان کے ساتھ وہ خوب رو نوجوان بھی تھا جس کی محبت میں رانی گرفتار تھی۔ اس نوجوان نے سیاسی پارٹی میں ایک اہم پوزیشن حاصل کی تھی۔ رانی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی باقی زندگی اپنے اس چاہنے والے کے ساتھ گزارے گی۔ والدین اس فیصلے کے خلاف تھے لیکن وہ بضد تھی۔ آخر کار والدین نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ شادی بہت سادہ طریقے سے انجام پائی۔ رانی کا چاہنے والا اب اس کا شوہر بن گیا۔ شادی کے بعد رانی کا شوہر اپنی سیاسی سرگرمیوں میں بہت مشغول ہوا۔ اب شادی کو ہوئے دس سال ہو گئے تھے اور رانی دو بچوں کی ماں تھی۔ ان کا مکان اب ایک شاہراہ پر نظا جگہ پر تھا جہاں پر ایک سے بڑھ کر ایک رئیس رہتے تھے۔ یہاں کے مکانات حویلی تھے اور اس علاقے میں ساری عوامی اور سماجی سہولتیں فراہم تھیں۔ رانی کی حویلی بہت شاندار تھی۔ ڈاؤن ٹاؤن کے لوگ اس علاقے کے رہنے والوں کو "نئی سڑک کے نئے لوگ" کہتے تھے۔

رانی کے شوہر کے پاس سڑکوں اور عمارات کا قلمدان تھا۔ ان کی حویلی اب چوبیس گھنٹے سرکاری محافظوں کے گھیرے میں رہتی تھی۔ بڑھتے ہوئے ٹریفک اور عوام کی سہولت کی خاطر سرکار نے ڈاؤن ٹاؤن کی بہت سی سڑکوں کو کشادہ بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے میں فتح کدل کی سڑکیں بھی آتی تھیں۔ چونکہ یہ قلمدان رانی کے شوہر کے پاس تھا اس لئے سارا کام اس کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ سڑک کشادہ کرنے کی خاطر مختلف علاقوں کے ساتھ ساتھ فتح کدل کے بہت سے مکانات بھی منہدم کرنے پڑے۔ ایک دفعہ جب ناشتوان محلے کے کئی مکان سڑک کی کشادگی کے لئے ہٹائے جا رہے تھے تو اس میں مشہور گلوکارہ کا خوبی مکان بھی منہدم ہونے والا تھا۔ علاقے کے لوگوں کے لئے اس خوبی مکان کا منہدم ہونا باعث اطمینان تھا کیونکہ وہاں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ ہر چاندنی رات میں اس سنسان عمارت سے گانے کی آوازیں آتی ہیں جس سے وہ ڈر کے مارے سہم کر رہ جاتے ہیں۔ اب ہوا یوں کہ اگلی چاندنی رات میں ایک خوبصورت عورت رانی کے نئی سڑک والے نئے مکان کا حفاظتی گھیرا توڑ کر دروازے کے سامنے کھڑی ہوگئی اور پھر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ رانی نے غصے میں آ کر خود ہی دروازہ کھولا اور اپنے سامنے ایک خوبصورت عورت کو پایا۔ وہ غصے سے اچھل پڑی: "کون ہو تم اور یہاں تک کیسے پہنچ گئی۔۔۔؟"

عورت نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: "تمہارے لئے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ میں کون ہوں۔ تم اپنے شوہر سے اس یہ کہنا کہ ملکہ آئی تھی اور اس نے تنبیہ کی ہے کہ ناشتوان میں موجود اس کے مکان کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔" اس سے پہلے کہ رانی کوئی جواب دیتی، وہ خوبصورت عورت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ منظر دیکھ کر رانی ہکا بکا رہ گئی اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

◆◆◆

قابلِ ستائش

ادارہ "تخلیق" ادب دوستی اور اردو زبان کے فروغ کے لئے محترم آغا گل (بلوچستان) اور محترم زید اللہ فہیم (آزاد کشمیر) کے اس اقدام کو بہت قدر کی نظر سے دیکھتا ہے جو ہر دفعہ 10 شمارے ذاتی طور پر خریداری کر کے اپنے دوستوں کو بھجواتے ہیں۔ ادارہ ان جیسے بہت سے مخلص دوستوں کے لئے خصوصی دعا گو ہے جن کا مقصد صرف ادب کا فروغ ہے اپنی ذات کی تشہیر نہیں! (ادارہ "تخلیق")

آوازوں کی میزان

اسلم سحاب ہاشمی

مختصر تعارف

اسلم سحاب ہاشمی صادق آباد میں 10 مئی 1970ء کو پیدا ہوئے۔ دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں: شعری مجموعہ ''پہلا خواب'' 2009ء اور ''ہم سب افسانہ ہیں'' 2012ء افسانوی مجموعہ۔ شریف اکیڈمی لاہور نے 2014ء میں ادبی خدمات کے حوالے سے ایوارڈ دیا۔ ادب کے فروغ کے لیے ساہیوال میں ادبی تنظیم بھی چلا رہے ہیں۔

صبح کے روشن سورج نے اپنی روشنی کے ساتھ اسٹیشن کی عمارت کو ایک قلعی کیے ہوئے برتن کی طرح چمکایا ہوا تھا۔ اسٹیشن کا عملہ بھی نئی اجلی اجلی وردیوں میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔ گاڑی اور مال دار سواریوں کے منتظر قلی بھی ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ اور اسٹیشن کے دونوں پلیٹ فارموں پر کافی تعداد میں مسافر بھی اپنے مال اسباب کے ساتھ موجود تھے۔ لیکن ان کے باوجود ریلوے عمارت کی پیلاہٹ پورے ماحول میں کچھ یوں سرایت کیے ہوئے تھی، جیسے کوئی یرقان کا مریض صبح کی سیر کو چل نکلا ہو۔

ریلوے اسٹیشن کی اداسی اور سوگواری کی منظر کشی کئی شعرا کے اشعار اور ادیبوں کی تحریروں میں کی گئی ہے اور یہ منظر ہر حساس اور بے حس انسان کو یکساں طور پر دکھائی دے جاتا ہے۔ لیکن اس دن ایک تازہ دم صبح کے وقت مجھے ریلوے اسٹیشن کا منظر شاید اس لیے اداس اداس نظر آ رہا تھا کہ میں ایک دوست کے بھائی کے جنازے میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ مجھے اگلے ہی اسٹیشن تک جانا تھا۔ جو قریباً ایک پونے گھنٹے کی مسافت تھی۔ یوں تو جانے کو میں کسی تیز رفتار کوچ پر بھی جا سکتا تھا لیکن میں نے گاڑی کو اس لیے ترجیح دی کہ شاید گاڑی میرے مزاج سے لگا کھاتی ہے۔ آمدورفت کے تیز ذرائع، مجھ جیسے سست رو انسان کے سفر کو پُرخوف بنا دیتے ہیں۔ اس لیے شروع سے ہی ریل گاڑی کا سفر مجھے بڑا پُرسکون محسوس ہوتا ہے۔ ویسے بھی گاڑی کے ہر ڈبے میں ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہوتی ہے۔ جہاں انسانی مزاج کے تمام رنگ بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اجنبی چہرے، بھانت بھانت کے لوگ، طرح طرح کی باتیں گویا آوازوں کا ایک جنگل وہاں موجود ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس چھوٹی سی دنیا میں کچھ ایسے رویے دیکھنے کو ملتے ہیں اور کچھ ایسی آوازیں سنائی دے جاتی ہیں کہ جس کے ردعمل میں کسی کہانی کے نقش و نگار ابھر آتے ہیں۔ خلافِ توقع جب گاڑی ساڑھے آٹھ بجے اسٹیشن پر پہنچی تو مجھے بے حد حیرانی ہوئی، دراصل ہم من حیث القوم وقت کے پابند نہیں ہیں نا۔ اس لیے جب کوئی کام بروقت ہو جائے، تو ایسے موقع پر ہمیں بجائے خوشی کے، حیرانی ہوتی ہے۔

گاڑی کے پہنچتے ہی اسٹیشن پر ایک افراتفری کا عالم برپا ہو گیا۔ مسافر نفسانفسی کی حالت میں، اپنے اپنے ڈبوں میں سوار ہونے کی کوشش میں تھے ـــــ سروں پر گٹھڑیاں اٹھائے ـــــ بغلوں میں بیگ دبائے ـــــ کوئی اپنے بچے کی انگلی پکڑے ہوئے ـــــ اور کوئی اپنی جورو

کی کلائی تھامے ہوئے، گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ خیر جیسے تیسے میں گاڑی کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ اور پھر ایک بھلے مانس آدمی نے، بیٹھنے کے لیے ذرا سی جگہ بھی دے دی۔ تو میں اس کا شکریہ ادا کر کے سکون سے بیٹھ گیا۔

اگر وہ شریف مسافر مجھ پر مہربان نہ ہوتا تو بہت برا حال ہوتا تھا۔ عید کا ''رش'' تھا۔ گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سیٹوں، برتھوں اور فرش پر، ہر جگہ انسانوں کا ایک سیلاب امڈا ہوا نظر آتا تھا۔ پسینے سے شرابور جسموں کی بو نے ڈبے کے حبس زدہ ماحول میں سانس لینا مشکل بنا دیا تھا۔ لیکن جب گاڑی چل پڑی تو حبس میں قدرے کمی ہوئی اور سانسوں میں تازگی کا احساس ہونے لگا۔ ہماری سیٹوں کے اوپر والی برتھ سے آواز آئی ''انگریز جس حال میں ریلوے نظام کو چھوڑ گئے تھے، یہ ابھی تک ویسے کا ویسا ہے، جبکہ دوسرے ملکوں میں اتنی ترقی ہو چکی ہے کہ ریل کا سفر بھی ہوائی جہاز کے سفر کی طرح آرام دہ بن چکا ہے''۔ ''اس نظام میں جو ترقی لانے والے ہیں، انھوں نے تو کبھی ریل پر سفر ہی نہیں کیا ہوگا۔ بھلا ان کو کیا پتہ؟ کہ ریلوے نظام میں کیا کیا خرابیاں ہیں''۔ اوھر ہجوم میں پھنسے ہوئے ایک آدمی نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ریلوے کے وزیر کو ایک دن اس طرح سفر کرنا پڑ جائے تو بہت اچھی طرح پتہ چل جائے گا''۔ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک اور مسافر نے جواباً کہا ''لیکن میرے بھائی! ایسی نوبت ہی کبھی نہیں آئے گی۔ اسے کیا پڑی ہے کہ اپنی لمبی لمبی گاڑیاں چھوڑ کر ٹرین پر سفر کرے''۔ پھر اس کے بعد ایک بزرگانہ آواز میرے کانوں میں پڑی، شاید کوئی بزرگ سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے کہیں نیچے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا ''ہمارا ملک شروع دن سے ہی دو حصوں میں بٹا رہا ہے۔ ایک حصے میں امن و دولت والے لوگ بستے ہیں اور دوسرے حصے میں ملک کے غریب عوام مفلسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان دونوں حصوں کے درمیان ایک مضبوط اور اونچی دیوار ہے — اس لیے تم دوسرے حصے میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے جبکہ وہ دولت مند طبقہ تمہارے حصے کی طرف جھانکنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔'' بزرگ کے ان جملوں میں گزشتہ ساٹھ سالوں کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس آواز سے لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ دراصل یہ ایک لمحۂ فکریہ تھا، جس کے دوران سب کے ذہنوں میں یقیناً یہی سوچ پیدا ہوئی ہوگی — آخر اس دیوار کو کیسے گرایا جائے؟

میرے سامنے والی سیٹ پر ایک صاحب ڈائجسٹ کے مطالعے میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ آس پاس گونجنے والی آوازوں سے وہ بالکل لاعلم نہیں لے رہے تھے۔ مسافروں کے اسی ہجوم میں سے ایک جوان سی آواز ابھری ''بابا جی! ہماری بدقسمتی ہے کہ آج تک ہمیں کوئی مخلص قیادت ہی میسر نہیں آ سکی۔'' اس آواز کے جواب میں ایک عالمانہ آواز گونجی ''مخلص قیادت کوئی آسمان سے ٹپکے گی؟ ہم خود ہی تو اپنے ووٹوں کے ذریعے قیادت کا انتخاب کرتے ہیں۔ نبی پاکؐ کا فرمان ہے کہ ایک مرتبہ جس بل سے ڈسے جاؤ، پھر دوبارہ اس بل میں انگلی مت ڈالو۔ ہم بار بار آزمائے ہوئے لوگوں کو آزما رہے ہیں، قصور تو ہمارا اپنا ہے؟'' پھر ایک سندھی اردو لہجے کی آواز ہماری سماعتوں میں گونجی ''اے بابا! ہمارے گوٹھ میں پچھلے ساٹھ سالوں کے دوران ایک سکول بھی نہیں بنا۔ جہاں علم کا اجالا ہی نہ ہو وہاں ووٹ کے صحیح استعمال کا شعور کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟'' اسی اثنا میں ایک پختون بھائی کی آواز سنائی دی ''علم بندے کے واسطے بے حد ضروری ہے لیکن باعزت روزگار، اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ہم اپنے بچوں کے لیے روزی کمانے کراچی جاتا ہے۔ آج تک ہمارے علاقے میں روزگار کے ذریعے پیدا کرنے کا، کسی نے کوشش نہیں کیا۔ جب بھوکا آدمی اپنا ووٹ بیچ کر کسی کو دے گا تو وہ بے تمیز نہیں کرسکے گا، کہ وہ اچھ

ووٹ کسی اٹھائی گیرے کو دے رہا ہے پیارے کو ۔۔۔“ اس آواز کے اندر بھی جو محرومیوں کا احساس تھا، اس کو بھی میرے سمیت تمام مسافروں نے محسوس کیا ہوگا۔ تبھی تو کچھ لمحوں کے لیے ایک بار پھر ڈبے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

اب کی بار میں بھی حالات حاضرہ پر ہونے والے اس ”سفری مذاکرے“ میں حصہ لینا چاہتا تھا کہ آج کل سیاسی رشوتوں کے طور پر جو چولستان کی زمینوں کی بندر بانٹ ہو رہی ہے۔ تو اس ناانصافی سے وہاں کے غریب طبقے کا استحصال ہو رہا ہے۔ بھرے ہوئے پیٹوں کی تھیلیں کو مزید بھرنے کی بجائے، وہاں کے مفلس اور غریب لوگوں کے پیٹ بھرنے کی فکر کیوں نہیں کی جاتی؟ میں اپنی اس آواز کو، آوازوں کے اس جمگھٹے میں شامل کرنا چاہتا تھا ۔۔۔ لیکن کم گوئی کی عادت نے میری قوت گویائی کو اتنا بے بس بنا دیا تھا کہ میری آواز میرے حلق میں ہی دب کر رہ گئی۔ میں اپنی آواز کو لفظوں کا روپ نہ دے سکا، جس کی وجہ سے مجھے اپنے اندر ایک تلملاہٹ سی محسوس ہوئی۔ اسی دوران ایک آدمی نے اپنا ٹکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”صاحب! ذرا دیکھیے، میری سیٹ کا نمبر تو یہاں نہیں ہے؟“ میں نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا تو ایک آدمی اپنے سر پر بھاری گٹھڑ اٹھائے کھڑا تھا۔ گردن اس کے بوجھ سے ٹوٹی جا رہی تھی۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے پرانے میلے کچیلے کپڑے پسینے سے یوں بھیگ چکے تھے جیسے ابھی کسی تالاب میں ڈبکی لگا کر آیا ہو۔ میں نے اس غریب مزدور کے ٹکٹ کا نمبر پڑھا تو اس کی سیٹ میرے بالمقابل تھی اور اس سیٹ پر وہی صاحب بیٹھے تھے، جو تمام آوازوں سے بے نیاز ہو کر رسالے کے مطالعے میں گم تھے۔ اب تک وہ بدستور کسی کہانی میں گم تھے۔ میں نے ان کے مطالعے میں مخل ہوتے ہوئے کہا: ”دیکھیے جناب! آپ اس آدمی کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں، مہربانی کر کے یہ سیٹ خالی کر دیں۔“

وہ صاحب جنہوں نے تازہ تازہ ڈاڑھی کی کٹ کرائی ہوئی تھی اور ملیشیے کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا، میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھ کر بولے: ”تم کون ہوتے ہو؟ مجھ سے سیٹ خالی کروانے والے۔“

اس کے اس عجیب و غریب جواب پر میں دنگ رہ گیا۔ پھر میں نے اسے ٹکٹ دکھاتے ہوئے کہا: ”اس سیٹ کی اس نے بکنگ کرائی ہوئی ہے۔“ ٹکٹ دیکھے بغیر اس صاحب نے یہ کہہ کر سیٹ خالی کرنے سے انکار کر دیا:

”میں کرنل صاحب کا ڈرائیور ہوں، انہوں نے مجھے پنڈی سے بٹھایا ہے۔ اب حیدرآباد تک مجھے یہاں سے کوئی نہیں اٹھا سکتا۔“

اس کی آواز ایسی درشت تھی کہ اگر دوسرا جملہ بولتا تو وہ میرے گریبان گیر ہو جاتا۔ اس لیے میں چپ ہو گیا۔ تبھی اسی وقت اتفاق سے ٹی ٹی صاحب بھی نئے سوار ہونے والے مسافروں کی ٹکٹیں چیک کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے تھے۔ میں نے فوراً وہ ٹکٹ ٹی ٹی صاحب کو دکھا کر مطالبہ کیا کہ وہ اس غریب آدمی کی سیٹ خالی کروا دیں لیکن افسوس انہوں نے صرف یہی کہا:

”اس کی سیٹ کا میں کوئی اور بندوبست کر دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ مسافروں کے ہجوم میں ایسے گم ہوئے کہ دوبارہ دکھائی نہ دیے۔ اس غریب مزدور نے کراچی جانا تھا۔ سر پہ وزنی گٹھڑی اٹھائی ہوئی تھی۔ بوجھ سے گردن ٹوٹی جا رہی تھی۔ سیٹ کی بکنگ کرانے کے باوجود وہ اپنی سیٹ سے محروم ہوا کھڑا تھا۔ مجھے اس کی بڑی فکر ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی ذرا سی سیٹ سے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا تو جب اپنی پچھلی جانب نظر دوڑائی تو ایک امید کی کرن نظر آئی۔

کچھ معلمین حضرات کے نورانی چہرے دکھائی دیے۔ جو کافی کھلے کھلے ہو کر اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں یقیناً ایک مسافر کے بیٹھنے کی گنجائش آسانی سے نکل سکتی تھی۔ میں نے اس غریب مزدور کا ہاتھ پکڑا اور جلدی جلدی ان معلمین کی سیٹوں کی طرف چلا گیا۔

"اس غریب آدمی کو ذرا سی جگہ عنایت فرمائیں گے؟ اس نے کراچی جانا ہے۔"

ان میں سے ایک بزرگ نے میری طرف بڑی ناگوار نظروں سے دیکھا، میرے کلین شیو چہرے اور پتلون کوٹ کو دیکھ کر ان کی ناگواری اور بھی بڑھ گئی، اسی دوران ایک کرخت سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "آگے جاؤ! آگے۔ یہاں کوئی سیٹ نہیں ہے۔"

یہ فرما کر وہ بزرگ اپنے ذکر اذکار میں مشغول ہو گئے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ حلیہ اور لباس میں شریعت کے مطابق، لیکن آواز میں وہ متانت اور شائستگی غائب تھی کہ جس کے بغیر اسوۂ حسنہ کی تصویر ذات کے چوکھٹے میں اتر ہی نہیں سکتی۔

اس لمحے مجھ پر ایک سوگواری کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اب تک میں نے جتنی بھی آوازیں سنی تھیں۔ ان میں سے یہ آواز نجانے کیوں مجھے سب سے زیادہ افسردہ کر گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ایک مذہبی بزرگ سے توقع ہی نہیں تھی کہ وہ اس طرح روکھی آواز میں جواب دیں گے۔ پھر کسی ان پڑھ اور گنوار آدمی کی آواز ہمارے کانوں میں شہد کی سی مٹھاس گھول گئی۔

"بابو جی! میرے پاس ایک سیٹ اور ایک برتھ ہے۔ یہ آپ کا آدمی میرے ساتھ بیٹھ جائے — میں نے بھی کراچی جانا ہے۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص، جس سے پسینے کی بو کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے لیکن اس کی آواز میں مشک و عنبر کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جی چاہا کہ بڑھ کر اسے گلے سے لگا لوں لیکن وہ اپنے غریب مزدور بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی سیٹ کی طرف چلا گیا — گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی، کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو میرا اسٹیشن آ چکا تھا مگر جب نیچے اترا تو پلیٹ فارم پر انسانوں کا ایک جم غفیر تھا۔ پولیس کی کافی نفری دکھائی دے رہی تھی۔ فوج بھی وہاں آئی ہوئی تھی اور ایک شور برپا تھا — "دہشت گرد پکڑا گیا" — "دہشت گرد پکڑا گیا" — "اس کی خود کش جیکٹ بھی قبضے میں لے لی گئی ہے" — "اس نے اسی گاڑی کو خود کش حملے سے اڑانا تھا" — یہ ساری آوازیں جو لپکتے شعلوں کی طرح اسٹیشن کی فضا میں لہرا رہی تھیں۔ ان کی تپش سے میری روح پگھلنے لگی۔ جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ اگر یہ دہشت گرد نہ پکڑا جاتا۔ تو اب یہ اسٹیشن میدان حشر کی صورت دھار چکا ہوتا۔

اب جب دل کی تسلی ہو گئی کہ وہ دہشت گرد پکڑا جا چکا ہے تو پھر نجانے کیوں، مجھے اس دہشت گرد کی شکل دیکھنے کا تجسس ہوا۔ میں انسانوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا گیا کہ اس خطرناک درندے کی صورت دیکھ سکوں۔

کیا؟ یہ ہے وہ دہشت گرد؟ گیارہ بارہ سال کی عمر — میلے کچیلے کپڑے — پسینے کے سفید داغ لباس پر نمایاں — پیٹ اندر کو دھنسا ہوا... جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ — نجانے کس ملک دشمن نے اس غریب مزدور کے بچے کو خرید کر اسے موت کی راہ پر گامزن کر دیا تھا!

ٹرین کے ڈبے میں سنی گئی ایک ایک آواز رات گئے تک میری سماعتوں میں گونجتی رہی۔ میں جب بھی ان آوازوں کی جمع تفریق کے بعد میزان لگانے بیٹھتا تو ہر بار وہی گیارہ بارہ سال کا خود کش حملہ آور آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا تھا۔

◆◆◆

بلاعنوان

نوین روما

مختصر تعارف

نوین روما لاہور میں پیدا ہوئیں۔ دوران تعلیم پنجاب یونیورسٹی کے مجلہ "محور" کی ایڈیٹر رہیں۔ ATV پر پروڈیوسر بھی رہیں۔ تیسری کلاس میں بچوں کی کہانی لکھی۔ پہلا افسانہ "بابلہ" کے نام سے لکھا جس پر انعام بھی حاصل کیا۔ الحمرا آرٹ کونسل میں ڈپٹی ایڈمن آفیسر ہیں۔ روزنامہ "تجزیہ" میں ہفتہ وار کالم بھی لکھتی رہی ہیں۔ افسانوں کی کتاب زیر طبع ہے۔

2020ء پوری دنیا ایک ان دیکھی بیماری میں مبتلا ہے شام کا وقت ہے ایک جدید شہر کے مکان میں ایک چار سالہ بچہ اس کی ماں، بچے کا والد اور ایک بارہ سالہ بہن خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ باپ مسلسل ٹی وی دیکھ رہا ہے اسے گردوپیش کی کوئی خبر نہیں۔ ماں اپنی ڈائری میں کوئی ضروری شیڈول لکھ رہی ہے بہن اپنا سکول کا کام کر رہی ہے اور چھوٹا بچہ کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے میں جا رہا ہے۔ اس کی دلچسپی کا وہاں کچھ نہیں ہے۔ کھلونوں سے کھیل کر تھک چکا ہے باہر جانے پر پابندی ہے لہٰذا وہ سارا دن وہیں گھومتا رہتا ہے۔

چھوٹا بچہ: آپی مجھے میری گاڑی نکال دو۔ آپی: اچھا دیتی ہوں۔ قریب پڑی بچوں کی الماری سے اس کی جیپ کار نکال کر دیتی ہے جو اسے بہت پسند ہے۔ چلو وہاں بیٹھ کر آرام سے کھیلو میں آن لائن کلاس لے رہی ہوں۔ وبا کے دنوں میں کوئی بچہ سکول نہیں جاتا اس لیے وہ بچی آن لائن کام کرنے لگی۔ بچہ کچھ دیر بعد بور ہو جاتا ہے اور اپنی ماں کے پاس جاتا ہے۔ ماما جوس پینا ہے۔ OK میں ابھی لاتی ہوں اپنے سوہنے بیٹے کے لیے۔ ماں بھاگ کر کچن میں جوس کا گلاس تھامے کمرے میں آتی ہے اور بچے کو جوس تھما دیتی ہے۔ تھینک یو۔ بچہ خوش ہو جاتا ہے اور مزے مزے سے جوس پیتا ہے۔ جوس پینے کے بعد وہ ٹی وی دیکھتا ہے مگر وہاں اسے اپنی مرضی کا کچھ نہیں ملتا۔ وبا کے دنوں میں ہر گھر میں تقریباً ہر وقت ٹی وی دیکھا جا رہا ہوتا ہے کیونکہ لوگ نئی خبر کی تلاش میں نیوز سنتے ہیں۔ بچے کے گھر میں تقریباً ہر وقت ہی نیوز چلتی ہیں اس لیے وہ بہت پریشان ہوتا ہے۔ باپ کے پاس جاتا ہے۔ بابا مجھے کارٹون دیکھنے ہیں، بچکی والے معصوم سی شکل بنا کر دیکھتا ہے۔ ابھی نہیں بعد میں ابھی نیوز چل رہی ہے باپ ٹی وی کی طرف دیکھتے دیکھتے جواب دیتا ہے۔ بابا اپنے موبائل میں کارٹون دکھا دیں۔ بچہ باپ کو دوسرا آپشن دیتا ہے۔ باپ: نہیں ابھی نہیں بعد میں ایک ہاتھ میں موبائل جس سے وہ فیس بک، گوگل اور پتہ نہیں کیا کیا دیکھ رہا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے ریموٹ کو اپنے سینے پر رکھے ہوئے جواب دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے موبائل میں ہی دکھا دیں۔ بچہ ہے اسے کیا پتہ دنیا کس آفت میں مبتلا ہے۔ ماں نے اپنا کام روک کر کہا۔

یار حد کرتی ہو تم بھی بچوں والی بات کرتی ہو۔ دنیا ایک ان دیکھے موذی مرض میں مبتلا ہے مرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے ابھی تک کوئی ویکسین تیار نہیں کر سکا دنیا میں اتنا بڑا لاک ڈاؤن آ گیا تم ابھی بھی بچے کو کارٹون دکھانے کا کہہ رہی ہو۔ بچے کے باپ نے ماں کو ہی لیکچر دے ڈالا۔ بچہ ان سب باتوں کو نہیں جانتا۔ ماں نے صفائی دی۔ ارے میرے لیے ٹی وی پر دنیا بھر کے تجزیاتی مقالے سننے بہت ضروری ہیں اور ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کو بھی دیکھنا ہے وہاں کیا خبریں ہیں اپنے دور دراز کے دوست احباب اور عزیز فرینڈز سے بات چیت کرنا بھی ضروری ہے کم آن یار۔ باپ نے یہ ساری باتیں موبائل کی سکرین پر نظریں جمائے ہوئے کہیں   بابا بی بی کی کہانی   بچہ تو نادان تھا پھر بول پڑا۔ اوہو بعد میں کہا نا اچھا اسے بگاڑ رہا ہے چلو بولتا ہی جا رہا ہے مجھے تو بیچ کا بلیٹن سننا ہے ویسے بھی کوئی بریکنگ نیوز آ رہی — اچھا چلو آؤ ہم چھت پر جاتے ہیں۔ بادلوں پر جا کر آئس کریم کھاتے ہیں ماں نے بچے کو اٹھایا۔ بچہ خوشی سے جھوم اٹھا اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ 2040ء   دنیا کا جدید ترین شہر۔ کمرے میں ایک جوان لڑکا بیٹھا الٹرا سپر فاسٹ والی ڈیجیٹل اسائنمنٹ مکمل کر رہا ہے۔ ایک جیلی نما شی اس کے پاس ٹیبل پر پڑا ہے جس کو کچھ دیر بعد وہ ویکسین سینڈ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ کمرے کے تینوں اطراف میں شیشے کی دیواریں ہیں اور دور تک شہر کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔ لڑکے کی ماں کمرے میں داخل ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ میں جوس کا گلاس ہے جو وہ بیٹے کی طرف بڑھاتی ہے بیٹا مسکراتے ہوئے ماں کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لے لیتا ہے۔ ماں پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے اپنی عینک اتار کر کرسی پر ٹیک لگا لیتا ہے۔ ماما آپ کے ہاتھ مجھے لگتے ہی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ لڑکا پیار بھری نظروں سے ماں کو دیکھتا ہے۔

ماں مسکرا کر پاس رکھے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور بیٹے کو جوس پیتے دیکھتی ہے۔ اسی اثنا میں لڑکا جیلی نما شی دباتا ہے تو ایک لڑکی فوراً تھری ڈی کی شکل میں اس کی دیوار پر نمودار ہو کر کمرے میں چلنے پھرنے لگتی ہے اس وقت وہ آن لائن ہوتی ہے اور ایک دور دراز ملک سے اس سے بات کر رہی ہوتی ہے۔ ماں اٹھنے لگتی ہے تو وہ اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ایک غیر ملکی لڑکی زبان بول رہی ہوتی ہے جس کا ترجمہ لڑکے کا الٹرا سپر فاسٹ موبائل ساتھ لگے سپیکر سے کر رہا ہوتا ہے۔ لڑکا کہتا ہے کہ 5 منٹ بعد ہم آن لائن میٹنگ کرتے ہیں اور لڑکی غائب ہو جاتی ہے۔ بیٹا کچھ آرام بھی کر لو کئی دنوں سے کام کر رہے ہو۔ ماں نے فکرمندی سے کہا۔ ماما اس وقت پوری دنیا کو ایک چیلنج ہے ہم ایک موذی مرض میں گرفتار معاشرے میں ہیں اور اس کی دوا تیار کرنا ہمارا مشن ہے ابھی دنیا کے مختلف ملکوں سے ڈاکٹروں کے ساتھ میری آن لائن میٹنگ ہے ہماری کوشش ہے یہ ویکسین جلد سے جلد تیار ہو اور ہماری کمپنی میں دنیا کے بہترین ڈاکٹرز ہیں لڑکے نے سنجیدگی سے ماں کو بتایا۔ اچھا بیٹا تم اپنی میٹنگ کرو میں باہر لاؤنج میں بیٹھی ہوں۔ ٹھیک ہے ماما۔ ہسپتال جاتے ہوئے مل کر جاؤں گا۔ ماں باہر جانے کے لیے ابھی تو کمرے کا دروازہ کھلا لڑکے کا باپ اندر آ رہا تھا۔ بیٹا ایک ضروری بات بتانی تھی تمہیں جو تمہاری ویکسین کے لیے بہت کام آئے گی۔ بابا ابھی میں ایک آن لائن میٹنگ کرنے لگا ہوں کچھ دیر بعد میں بات کرتے ہیں۔ او اچھا ٹھیک ہے۔ باپ دروازے سے ہی باہر چلا گیا۔ او کے بیٹا آپ کام کرو۔ ماں بھی باہر لاؤنج میں چلی گئی۔ پھر دو منٹ تک دنیا کے مختلف ایکسپرٹس کے ساتھ میٹنگ کرنے کے بعد لڑکا جیلی والے شی کو پریس کرتا ہے اور سب کچھ ایک جھٹکے سے بند ہو جاتا ہے وہ اٹھتا ہے اور کمرے سے باہر نکل آتا ہے۔ لاؤنج میں اس کی ماما اور بابا بیٹھے ہوتے ہیں۔ باپ فوراً بولتا ہے کہ بیٹا جب تم چار سال کے تھے اس وقت بھی ایک جان لیوا مرض نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا

جو Pandemic تھا اور میں نے سوشل میڈیا اور مختلف چینلز پر اس کی بہت ریسرچ کی بہت سے آرٹیکلز پڑھے تھے۔ میں تمہیں بہت سی انفارمیشن دے سکتا ہوں۔

بابا! اس زمانے کے وائرس میں اور آج کے وائرس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس وائرس کی Rays ہیں اور یہ سائنس کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور دنوں میں نہیں گھنٹوں میں انسان کو بدل سکتا ہے صرف ٹی وی چینلز پر پروگرام دیکھنے سے اس کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا ہمارے پاس ذہین بھرے ایکسپرٹس ہیں اور ہماری لیبز میں دن رات ریسرچ ہو رہی ہے۔ پوری دنیا ایک پلیٹ فارم پر متحد ہے۔ یقیناً ہم آگے بڑھنے تک اس پر قابو پا لیں گے۔ آپ کے زمانے کے وائرس کے Facts & Figers میں بہت فرق ہے۔ میں پھر بھی آپ سے پرانی سٹوری سنوں گا لیکن بعد میں ابھی مجھے جانا ہے۔ یہ کہہ کر وہ ماں کی طرف بڑھا ماں نے اٹھ کر بیٹے کا ماتھا چوما تو لڑکے کا چہرہ کھل اٹھا۔ باپ دور بیٹھا اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اٹھنے کی کوشش تو بیٹے نے وہیں دور سے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھے رہنے کو کہا اور بولا۔ بیٹھے رہیں بابا پھر بعد میں ملتے ہیں اور وہ اصل دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ باپ کھڑکی سے بیٹے کی کار کو دور جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

◆◆◆

ادیبوں کی نظر میں انور ندیم علوی

- انور ندیم کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور شعر کا مزاج پہچانتے ہیں۔ (رئیس امروہوی ــــ دسمبر ۱۹۸۷ء)
- انور ندیم نوجیز شعراء میں ایک ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ وہ جدید رنگ میں ایسے خوبصورت مطالب بیان کرتے ہیں جو مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ (صبا اکبر آبادی ــــ ۱۹۸۸ء)
- انور ندیم علوی نظم میں سوچ کا ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ ان کی غزل میں روایت اور جدت کا امتزاج ملتا ہے۔ (محسن بھوپالی ــــ ۱۹۸۸ء)
- انور ندیم کے کلام میں اس بات کی پوری شہادت موجود ہے کہ وہ امکانات سے بھرپور ذہن کا مالک ہے اور شاعری کے تقاضوں سے پورے طور پر متھیار بند ہے۔ ندیم علوی نے سندھ کے معروف شاعر شیخ ایاز کی شاعری کے کچھ حصوں کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے شیخ ایاز کے انقلابی لب و لہجہ کو پوری طرح قبول کر لیا ہے جو کہ اس کا شعری منہاج آراستہ کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔ (ظفر اقبال ــــ ۲۰۰۱ء)
- انور ندیم علوی، لطیف بھائی، رسول سرمست، شیخ ایاز اور فیض قبیلے کے بہادر اور حساس دانشور ہیں۔ ان کی شاعری اپنی زمین کے دکھ سکھ سے بھی جڑی ہے اور آفاقی اقدار سے بھی۔ انور ندیم علوی کی شاعری میں انسانوں کو توڑنے کی بجائے آپس میں جوڑنے کا پیغام ملتا ہے۔ (نذیر قیصر ــــ ۲۰۰۱ء)

غزلیں

امین راحت چغتائی

○

بیٹھے ہیں زیرِ آسماں، زمیں پہ کوئی سرا نہیں
کیسے بتائیں کیا ہیں ہم، کیسے بتائیں کیا نہیں

جس نے دیا ہے زخمِ دل، واقفِ حالِ دل بھی ہے
پوچھا نہیں ہے اس نے بھی، ہم نے بھی کچھ کہا نہیں

ایسے ہی مل گئے تھے کل اپنی گلی کے موڑ پر
ہم بھی تھے اپنے دھیان میں، وہ بھی ذرا رکا نہیں

راہِ وفا میں کون تھا دیتا جو عمر بھر کا ساتھ
وہ بھی ہوا جدا ہوا، اس سے کوئی گلہ نہیں

آج وہ پل میں چل دیا صبر و قرار توڑ کر
کیسے بتائیں کیا ہوا، ایسا کبھی ہوا نہیں

کیسے چھپا سکیں گے ہم اس کی اداؤں لطف کو
ہم سے تو ایک راز بھی دل میں کبھی چھپا نہیں

یوں تو کہاں قریب تھے، کچھ بھی قریبِ جاں نہ تھے
وہ بھی ادھر نہ آ سکا، میں بھی ادھر گیا نہیں

ایک گماں ہے یہ تو جانے کہاں سے آ گیا
تب یہ کوئی طلب نہیں، تو یہ سے بھی گیا نہیں

مت اختیار بھی چاہئے ہے کسی [illegible]
جب تک کوئی اٹھا نہ دے، کوئی بھی اٹھا نہیں

خوفِ [illegible] خلق کا اثر ہے [illegible] زبان پر
سب کی زباں پہ ذکر ہے، اس نے کہا نہیں

ذاتِ عرشِ جاں کا حشر ہے سب کے سامنے
جس نے صدا بلند کی، اس کا کہیں پتہ نہیں

کیسے عجیب شہر میں آ کے بسے ہیں ہم یہاں
شہر کی لوٹ کا ذکر کیا، تیر کی بھی روا نہیں

رکھے ہوئے ہیں حرف حرف [illegible]
لب کے عجب سوال بھی، یاد کوئی دعا نہیں

راحتِ ایں کے ہے کراں لطف و کرم کا معجزہ
اس کا دیا ہوا ہے سر، اور کہیں جھکا نہیں

OOO

انور شعور

○

کل رات ہجر کا جاگا ہوا تھا، سویا نہیں تھا
سحر کر کا موقع بھی کہیں سے کھویا نہیں تھا

حیرت ہے، دل میں گل کو کیسے اگا ہے
یہ بیج اپنے ہاتھوں سے ہم نے بویا نہیں تھا

جا کر یہیں سے دنیا میں خوش بھی رہتا ہے کوئی
کس شب مسافر گھر یاد کر کے رویا نہیں تھا

ہم نے تو جانے اس کے لیے کیوں آنسو بہائے
جو ہے مروت ان موتیوں کا پرویا نہیں تھا

انور شعور اب اپنے میں ڈوبا رہنے لگا ہے
محفل میں وہ بھی حاضر ہوں لیکن گویا نہیں تھا

OOO

صابر ظفر

○

ہم جو بے برگ و ثمر راہ گزر دیکھے گئے
بس کافی ہے کہ سرگرمِ سفر دیکھے گئے

جانے کس طور گزارا گیا رستے سے ہمیں
عجب بیچ کی [illegible] دیکھے گئے

عمر بھر دیکھے گئے [illegible] بستیوں کے نقوش
ہم سے جو دیکھے گئے ایک نظر دیکھے گئے

ہم تری یاد کے سائے میں چلے منزل تک
ایسے ہر راہ میں ہے [illegible] دیکھے گئے

یہ بھی دیکھا کہ یہاں صرف ہمارے گھر تھے
وقت کے ساتھ وہاں دوسرے گھر دیکھے گئے

یہ ہے وہ جا کہ جہاں مارے گئے تھے پنچھی
جا بجا بکھرے ہوئے کتنے ہی پر دیکھے گئے

میں نے دیکھا اسے، جس نے بھی شہادت پائی
جانثار ایسے تھے کتنے جو ادھر دیکھے گئے

ریل گاڑی اب ادھر سے ہے گزرتی شاید
پھر سے آ رہی [illegible] دیکھے گئے

ظلم ہوتا ہوا دیکھا تھا اگرچہ سب نے
پتھر اپنے ہی گھر [illegible] دیکھے گئے

راکھ ہوتا ہوا دیکھا گیا بستیوں کو جہاں
راکھ میں بھی تو وہاں کتنے شرر دیکھے گئے

گرد سی [illegible] تم دیکھی ہمیں
[illegible] پہ سر دیکھے گئے

پاسبانوں نے بتایا تو اٹھیں گی آخر
ہم سے دیکھے نہ گئے ہیں، وہ مگر دیکھے گئے

آج کل دوست ہزاروں میں بھی کب آتے ہیں نظر
زندگی اُن کی جو بھر تھی وہ ادھر دیکھے گئے

چلنے والے نظر آتے ہیں کہاں جاتے ہوئے
ہم ایک ذرہ تھے آپ تو نظر دیکھے گئے

OOO

محمود شام

O

حسن، جغرافیہ، سرحدیں، پاکستان
ہر تاریخ، دریا، ادب، پاکستان

کبھی اشراق، گنگ، دلی، دیوان
گھر چلا شہر کا شہر تھی پاکستان

خانہ جنگی میں گلیاں تو بجھ سی گئیں
کھڑکیاں جاگتی ہیں وہی پاکستان

اک سے عشق پر جو ہوں مجبور میں
دھڑکتی ہے مری زندگی پاکستان

یہ زمانہ بھی ہے اک مسلسل غزل
ہر ورق، ڈائری، ہر صدی پاکستان

میری آنکھوں سے دیکھو ذرا پھر کبھی
لالہ و گل، کلیں، شگفتگی، پاکستان

وقت کرتا رہا ہے قوی مشتعل
زندہ رکھتی رہی شاعری پاکستان

OOO

آصف ثاقب

O

دماغ مجھ کو ودیعت ہے جھلملاہٹ سا
کلام ہونٹوں پہ رکھتا ہوں کھنکھناہٹ سا

کسی گمان کی کہکشاں ہوا کا آ گزرے
قیاس پاؤں پہ ہوتا ہے سرسراہٹ سا

مکاں کے چار طرف ہے عجیب سناٹا
کوئی خبر کا وسیلہ نہیں ہے آہٹ سا

فلک سے ایک اشارہ مجھے ملا تو ہے
جو اس کے پاس قرینہ ہے جھلملاہٹ سا

ذرا خیال ہو اضطراب ایسے میں
مجھے نصیب ہو محفل کی جگمگاہٹ سا

کبھی ہو شرم کا منظر بدن چرانے کا
کبھی ادا کا نظارہ ہو چلبلاہٹ سا

کہیں ہے جسم لباسوں میں ادھ کھلے جیسے
گھروں میں شور ہے چڑیوں کی چہچہاہٹ سا

غزل میں پیار کا ثاقب خیال رکھتا ہے
ہر ایک لفظ ہو بچوں کی مسکراہٹ سا

OOO

قمر رضا شہزاد

O

یہ دل نہیں میرے، یہ قبیلہ نہیں میرا
میں جس میں ہوں موجود زمانہ نہیں میرا
جو ہو گئی تاراج وہ شاہی نہیں میری
جو ہو گیا معزول وہ تخت نہیں میرا
ہو جاؤں گا میں اپنے ہی ہاتھوں سے کبھی زیر
دشمن بھی کوئی میرے علاوہ نہیں میرا
آتے نہ ادھر کوئی ملاقات کی خاطر
اس دشت میں اب ایک بھی خیمہ نہیں میرا
میں جنگ کے میدان میں یہ سوچ رہا ہوں
کیا ایک علمدار بھی زندہ نہیں میرا

OOO

خاور اعجاز

O

سوچتے رہتے ہیں ہو آج نہ کل چلتے ہیں
کل میں جب آن پڑی ہے تو کل چلتے ہیں
دل کا کام اٹکے ذرا دکھ سے پریشاں کیوں ہے
اصل جب بیچتے گئے ہیں تو نقل چلتے ہیں
دیکھ بے کار نہ جائے کہیں شوق ترا
یہ مدینہ ہے یہاں پلکوں کے بل چلتے ہیں
اتنا بدلی ہے ماحول سے نکلیں گے جو دیر
اتنا کچھ دیر کو اب شعر غزل چلتے ہیں
لوٹ آنے کا ارادہ نہیں تیرا خاور
کام ہو جائے تو دنیا سے نکل چلتے ہیں

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

سیّد ریاض حسین زیدی

O

تیرہ شبی میں بس کافی ہیں وہ جگنو جو چمکیں
رستوں سے ظلمات ہٹائیں، شب کو سحر آمیز کریں

ہو بے مایہ بھی وہ جو ہم خیال سے بہتر ہے
منزل تو منزل ان کی ہے جو ان تک چلتے جائیں

روٹی بھیک تو بن جاتی ہیں سب طاغوتی چالیں
جیسے ایک شاداب شجر کے نیچے آدھی روٹیں

جانے کیا کچھ رہتا ہے تک ایک عذاب بڑا ہے
رہ رہ جائیں آوازیں بھیگیں جیسے بہت بھی بولیں

ایک بے ساختگی پن سے سوری خط و خال نظر کے
خواب پیدا جس منظر میں آ کے بکھرتے جائیں

کب تک قرنے سہتے جائیں ہم یہ خوب نظر کے
پلکیں بوجھل جائیں، کب تک، کب تک بیٹے تو کھیں

ایک بھاری آواز سے جاگیں خواب تماشا گاہیں
ساری بات ریاض کی ہے یہ آنکھیں ذرا کھولیں

OOO

O

سوچ کی راہ گزر بے سایہ
جیسے سورج کا سفر بے سایہ

شہر کا شہر کڑی دھوپ میں ہے
ہو گئے کتنے ہی سر بے سایہ

اڑ گئے خواب پرندوں کی طرح
آنکھ میں آ گیا گھر بے سایہ

سائباں تم کو مبارک ہو میاں!
ہم تو کر لیں گے بسر بے سایہ

موت کا رقص ضروری تو نہ تھا
ہو گئے کتنے گھر بے سایہ

چھاؤں جو تیری گئی، دھوپ لگی
زندگی کی ہے بسر بے سایہ

اے خدا! چاہیے رحمت کا سحاب
ہو گیا ہے یہ شجر بے "سایہ"

میں کہاں ڈھونڈوں اماں اے ایوبؔ
شہر ہے اور ہے تو گھر بے سایہ

OOO

ڈاکٹر اسحاق وردگ

O

کی کاوش کی تو ادائی نہیں ہے اس وقت
مجھ کو لگتا ہے کہ تنہائی نہیں ہے اس وقت

اے مرے خواب! کبھی اور کوئی پل مجھ سے
آنکھ میں نیند ہے گہرائی نہیں ہے اس وقت

حالت وجد میں دیکھا ہے تجھے سے میاں!
آسمانوں میں تو پہنائی نہیں ہے اس وقت

دیکھ سکتا ہوں ابھی رات کی گہرائی میں
آنکھ میں دور تلک کائی نہیں ہے اس وقت

مجھ سے مانا مری قسمت میں نہیں ہے صاحب!
اب اکیلا ہوں تو تنہائی نہیں ہے اس وقت

اگلے وقتوں کی محبت میں جو رسوائی تھی
لوگ کہتے ہیں کہ رسوائی نہیں ہے اس وقت

آج ماضی کی طرف کیسے پلٹ آیا ہوں
مجھ پہ وہ یاد اگر چھائی نہیں ہے اس وقت

OOO

سلیمان خمار (انڈیا)

○

وہ دل میں ٹوٹ کر کرتا ہے مجھ سے پیار، من والم
مگر منہ سے نہیں کرتا کبھی اظہار، من والم
عمل کرتی ہیں اس کی بولتی خاموشیاں مجھ سے
نہیں کرتا زباں سے وہ کبھی گفتار، من والم
وہ پلکوں کو اٹھا کر دیکھتا ہے جب مری جانب
تصور میں ہی کر لیتا ہے وہ دیدار، من والم
وہ کیسے دیکھ کر اس کی ہنسی محسوس ہوتا ہے
ہے اس کا عشق سے انکار بھی اقرار، من والم
مری غزلوں کی وادی میں بھٹکتا رہتا ہے شب بھر
اسے سونے نہیں دیتے مرے اشعار، من والم
خدا نے آسماں سے اس کی ہستی کو مری خاطر
اتارا ہے بنا کر حسن کا شہکار، من والم
خمار خوش بیاں وہ شخصیت عشق نہیں کس سے ہے
سمجھنا اس کو بے شک ہے بہت دشوار، من والم

○○○

احمد صفی

○

ہم نے مانا جناب گندہ ہے
ہر فساد شراب گندہ ہے
مسئلہ آپ کی طہارت ہے
یہ غلاظت ثواب گندہ ہے
اب وہ ساون کی بارشیں کیسی
کیمیائی سحاب گندہ ہے
ندیوں کی مثال کیا دیجے
دشت میں بھی سراب گندہ ہے
ہے جہالت ثواب کا موجب
آگہی کا عذاب گندہ ہے
شیخ نے جام چھو کے چھوڑا ہے
اس میں دو مست شراب گندہ ہے

○○○

شبیہ طراز

○

ہم، دم اور تتلی خوشبو
پھر بھی ایک پہیلی خوشبو

سارا دن مہکا دیتی ہے
پل میں ایک اکیلی خوشبو

آنکھوں میں وہ پھر لاتا ہے
ہر ان کی نویلی خوشبو

پاؤں کیا دہلیز پہ رکھا
آنگن اور حویلی خوشبو

خواب کا تیر جھنک جھنک
چاندی، رات، چنبیلی خوشبو

کلیوں کے دل خون کیے ہیں
خود کتنی زہریلی خوشبو

برسوں بھول نہیں پاؤں گی
آنکھیں، پھول، ہتھیلی، خوشبو

○○○

شہباز انور خان

○

بس ایک لفظ محبت تھا جو ادا نہ ہوا
وگرنہ ہجر جدائی میں ہم سے کیا نہ ہوا

تمھاری یاد کا زاد سفر تھا ساتھ مرے
ارادہ بادشہ کے گھر سے میں جب روانہ ہوا

شباب میں یاد وہ ہم سے نہ کٹ کر یا تھا وہ دور
گزر گیا ہے ہوئے [illegible] اک زمانہ ہوا

ملامت وہ کسی طور کر نہیں سکتا
حوالہ جس کا ترکوں سے باغیانہ ہوا

ذلیل و خوار ہوا وہ عوام میں اکثر
امیر شہر سے جس کا بھی دوستانہ ہوا

یقین رکھ تجھے مل کر رہے گا ہر صورت
ترے نصیب میں لکھا جو آب و دانہ ہوا

جو دل کی بات تھی دل ہی میں رہ گئی آخر
وہ سامنے تھا مگر عرض مدعا نہ ہوا

عجیب حسن تھا اس کی اداؤں میں انور
کہ شہر سارا ہی اس شوخ کا دیوانہ ہوا

○○○

عائشہ مسعود

O

ہم سوچ رہے ہیں کہیں ایسے تو نہیں ہم
سمجھا ہے جو تم نے کبھی ایسے تھے کہیں ہم
گفتار سے بھری جو تو سے اس پہ اثر ہو
اک عرصے سے کوشش میں ہیں اپنے تو نہیں ہم
دنیا سے الگ مجھ میں کوئی بات تو ہو گی
محفل میں رنگوں کے تو سے اس میں کہیں ہم
چاہت میں مجھے رحم کی لب کیسے کہاں وہ
کہہ دو کہ جہاں ہم کو تو دیکھیں گے وہیں ہم
چاہو گے تو اک خواب کی صورت ہی رہیں گے
سوچو گے اگر ہم کو تو پھر دل کے قریں ہم
یہ چند قدم اگر میں گزرتے ہیں شب و روز
ملتی تو کہیں تو کہ رہیں پھر بھی نہیں ہم
اس گوشۂ الفت میں کبھی پھول کھلے تھے
اب تک ہیں اسی گوشۂ الفت کے مکیں ہم
تم ہم کو قیامت میں ذرا دیکھ تو لیں گو
اب قلم کے ہاتھوں سے نہیں لب کھلیں ہم

OOO

اظہر جاوید

O

خوابوں کی تعبیر ادھوری رہتی ہے
پھر یہ تصویر ادھوری رہتی ہے
ہاتھوں رہتی کوئی رہتی ہے یہ ہم
پھر بھی یہ اک ہیر ادھوری رہتی ہے
حلقہ حلقہ تیرا دام پڑا ہے بھی
وعدوں کی زنجیر ادھوری رہتی ہے
ریکھاؤں کا بھید سمجھتے سمجھاتے
انساں کی تقدیر ادھوری رہتی ہے
دل کہتا ہے، میں دل سے پوچھتی رہتی ہوں
کیوں میری تدبیر ادھوری رہتی ہے

OOO

ممتاز راشد لاہوری

O

کل دنیا پریشاں کر رہی ہے
کہ اب تو آرزو بھی مر رہی ہے

تمنا ہی سے قائم ہے یہ ہستی
تمنا ہی سدا دلبر رہی ہے

وہ پہلو میں رہے ہیں جس گھڑی تک
مری حالت بہت بہتر رہی ہے

بہت اک ٹیس باقی ہے وہ اب تو
مگر ماضی میں نشتر کر رہی ہے

بتائیں کیا بھلا اس نازنیں کا
وہ کیسے ظلم پر اتر رہی ہے

رنگین الفاظ رکھتی تھی کچھ دنیا
وہ شوہر کی بھی کچھ شوہر رہی ہے

تھے تیری رضا کی آرزو تھی
وہ اب تیری رضا سے ڈر رہی ہے

کبھی اس سے بھی مل پائے گا آ کر
وہی جو آپ کی خوگر رہی ہے

بہت کم رہ گئے ہیں اس کے شیدا
وہ مشکل سے گزارا کر رہی ہے

بتائے کوئی راشد کو یہ جا کر
کہ اک پیار آئیں مجھ رہی ہے

OOO

رشید آفریں

O

میرا دل ہے گھائل گھائل
ان کے جلوے محفل محفل

لٹتے ہیں وہ صحرے من میں
جن کو اُمڈا منزل منزل

جن کے لیے گرداب سہانے
ان کو پیارا ساحل ساحل

عشق میں مرنا آساں آساں
ہجر میں جینا مشکل مشکل

اس دنیا میں کس کا بھروسا
تو پگلا ہے اے دل اے دل!

حسن کے جلوے، حسن کی گھاتیں
لیلیٰ لیلیٰ محمل محمل

نغمہ نغمہ آہٹ آہٹ
دل کی دھڑکن پاگل پاگل

آنکھیں سندر مکھڑا آنکھیں
اک مدہوشی شامل شامل

ہر اک قرباں، ہر اک صدقے
کون آیا ہے قاتل قاتل

OOO

ناصر علی سیّد

○

سمندروں کی تہوں میں اترنے والا ہوں
فلک سے چاند کی اک بات کرنے والا ہوں

میں ساتھ لایا ہوں تہذیب اپنے گاؤں کی
سو سر جھکا کے گلی سے گزرنے والا ہوں

نہیں ہے راس مشینوں کا سرد پانی مجھے
میں اک گاؤں کے جھرنے سے بھرنے والا ہوں

اندھیرے کھیتوں میں آسیب جن کے ڈرتے ہیں
خود اپنے پاؤں کی آہٹ سے ڈرنے والا ہوں

لے جو پیار بھری اک تری نظر چاہوں
تو دیکھنا کہ میں کیسا سنورنے والا ہوں

اک ایسے موڑ پہ لے آئے روز و شب مجھ کو
خدا معاف! میں تجھ سے مکرنے والا ہوں

لبوں پہ گر نہیں ہے احتجاج مرا
کسی جلوس میں شامل نہ دھرنے والا ہوں

میں ایلچی ہوں محبت کے دیس کا ناصر
سو پیار، پیار، فقط پیار کرنے والا ہوں

OOO

نجمہ عثمان (انگلستان)

○

اپنے اندر وصال ڈال کے دیکھ
کبھی خوشیوں کو یوں نکال کے دیکھ

آزمائش ہے تیری جمالی
ولا ہے سب ذوالجلال کے دیکھ

تھوڑی خوشیوں کو بھی لے لی بھر کے
پھر تو آ جائے گی ان حال کے دیکھ

ظلم پہ منزل نہیں ہوں گے
درد کو ظلم سے نکال کے دیکھ

ہجر کے ان کٹھن دنوں کے بیچ
لمحے شامل ہیں کچھ وصال کے دیکھ

سب اٹھائے خوشی کے خواب ہوئے
اب تو دکھ وہ سارے حال کے دیکھ

نجمہ چلنا مرا عروج نہیں
تجھ کو جانا ہے جا، سنبھال کے دیکھ

OOO

سیّد ضیا حسین

○

جو بھی سوتے رہتے ہیں بس یونہی
وقت کھوتے رہتے ہیں بس یونہی

یونہی وہ ہی کبھی نہیں روتے
وہ جو روتے رہتے ہیں بس یونہی

پاؤں زخمی تو ان کے ہونے تھے
کانٹے بوتے رہتے ہیں بس یونہی

میرے طوطوں نے کہیں تری باتیں
تیرے طوطے رہتے ہیں بس یونہی

تیری محفل میں جاں بکف حاضر
ہم تو ہوتے رہتے ہیں بس یونہی

ان کو آتی نہیں ذرا ہچکی
تیرے ہوتے رہتے ہیں بس یونہی

خواب ان کے کبھی نہیں آتے
ہم تو سوتے رہتے ہیں بس یونہی

من نے اپنا کیا بہت میلا
تن کو دھوتے رہتے ہیں بس یونہی

OOO

اشرف ذکی

O

پیچھے پیچھے دھیرے دھیرے سے ہم نے جانے والی ہے
اس کے بچھڑ جانے سے آنکھ پیار کی تیر نکالی ہے

ڈالی ڈالی تک پہنچ سکے اور پتے پتے دل کا چین
اس نے آنکھ پہ پلکوں سے دیوار سی بنا لی ہے

وہ جب بات کرے تو مجھ کو جب گماں ہو جاتا ہے
جیسے گل یاقوت کی پیر کے ہونٹوں سے اٹھا لی ہے

ہر شے میں موجود ہے لیکن آنکھ سے اوجھل رہے وہ
اس نے دل کے دروازے میں اپنی تصویر بنا لی ہے

تو رحمٰن و رحیم ہے مالک، تو ہے داتا دنیا کا
تیرے کرم کی خاطر ہم نے بھی جھولی پھیلا لی ہے

ریت پہ یوں ابھی بکھری پڑی ہیں جیسے پتیاں پھولوں کی
حسرت سے جو دیکھ رہا ہے وہ اس باغ کا مالی ہے

وہ بھی ان میں شامل ہے جو ہنستا ہے ہم پر وہ جو ہیں
اشرف کیوں ہم نے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا لی ہے

OOO

انتظار باقی

O

تلاش کی فضا ہے، تو بھی ہے
ایک دل ہے، خدا ہے، تو بھی ہے
ہجر میں دیکھ میرا حال ذرا
عکس ہے، آئینہ ہے، تو بھی ہے
میرا بھولی ہے، مجھ نہیں سکتا
یہ دیا، یہ ہوا ہے، تو بھی ہے
اس سے بڑھ کر نصیب ہو کیسا؟!
بوئے گل ہے، صبا ہے، تو بھی ہے
کاش رک جائے آج وقت یہیں
آنکھ کا در کھلا ہے، تو بھی ہے
میں نے سوچا ہے اب نہیں تو کبھی
رات ہے، خطرہ ہے، تو بھی ہے
ہم سفر! مجھ پہ کوئی جبر نہیں
دشت ہے، راستہ ہے، تو بھی ہے
ہر طرح کا علاج ہے موجود
زخم دل ہے، دوا ہے، تو بھی ہے
کاشی کا مقابلہ ٹھہرا
شاخ پر گل کھلا ہے، تو بھی ہے
راستہ دیکھ کر گماں گزرا
گرد ہے، نقش پا ہے، تو بھی ہے
تلاش ہے، قضا کروں کس کا
اک نماز قضا ہے، تو بھی ہے
ہجر کی شب عجیب ہے باقی
اک جنوں ہے، دیا ہے، تو بھی ہے

OOO

رفیق بھٹی

O

خمار آنکھوں میں ہو یا ابھار سینوں میں
بہار شوق فروزاں ہے ان نگینوں میں

ملے ہیں چاند ستاروں کو پھول کلیوں سے
بپا ہے جب ترے عشوے یہ نازنینوں میں

حکیم اہل خرد کا علاج کرتے رہے
ملی دوا مری الفت کی آبگینوں میں

گرے نہ بجلی کبھی خرمن حیات پہ
بچے نہ قحط کہیں دامن کی زمینوں میں

اگرچہ چلی جفا نے جلا دیا سب کچھ
دبی ہے آگ وفا کی ابھی دفینوں میں

میں شہر شہر عدو کو تلاش کرتا پھرا
ملے ہیں سانپ مجھے اپنی آستینوں میں

نگار خانۂ الفت زوال گیر ہے کیوں؟
نہ عاشقوں میں تجسس نہ دم حسینوں میں

تھپیڑے کھائیں گے، لڑیں گے، ڈوب جائیں گے
سفر کریں گے جو ٹوٹے ہوئے سفینوں میں

کبھی تو محفل میں داد ملی رفیق غزل
کبھی تو شعر کھٹکتا رہا مہینوں میں

OOO

تصور اقبال

O

ہجر میں جینا تو اک پل سا موڑ دے
رات ان آنکھوں کو اب یہ چھوڑ دے

بس بہت ہو گیا خود فریبی ہے یہ
یہ تو مٹی کے بت ہیں انہیں توڑ دے

پھر تو کانٹوں پہ سو جیسے سے رات بھر
پہلے سر خواہشوں کا کہیں پھوڑ دے

میرا دل بھی ہے شیشے سا ٹوٹا ہوا
تو جو ہے شیشہ گر دل مرا جوڑ دے

خواب غفلت میں سوئے ہوئے ہیں ابھی
ان کو فی الوقت اس حال میں چھوڑ دے

دل میں چھائی ہوئی ہے اداسی بہت
اس پہ حسرت کی چادر کوئی اوڑھ دے

اس طرح بھی محبت میں ہوتا ہے کیا
کہہ رہا ہے تصور یہ دل موڑ دے

OOO

جاوید عباس جاوید

O

ہوا عشق سے تیرہ طوفاں تک ساتھ دیتی ہے
زمینوں کی کہانی آسماں تک ساتھ دیتی ہے

حالت منتظر ہے کوئی بے آواز ہیں تھے
دلوں کی بات آ کر اب زباں تک ساتھ دیتی ہے

اثر بے دست و پا ہے قلزم ہستی کی موجوں میں
کوئی طاقت ہے جو کون و مکاں تک ساتھ دیتی ہے

بہت رخصت کیا ہے گاؤں کے پر پیچ رستوں پر
اسے دیکھوں کا دھوکا جہاں تک ساتھ دیتی ہے

حقیقت کا اجالا پھیلتا ہے دور ظلمت میں
محبت روشنی ہے کہکشاں تک ساتھ دیتی ہے

ہوائیں سنسناتی ہیں کہیں پتھر پہاڑوں پر
خوشی ہوتی ہے بے کراں تک ساتھ دیتی ہے

بہت سے کام کرنے کو ابھی جاوید رہتے ہیں
مگر یہ زندگانی بھی کہاں تک ساتھ دیتی ہے

OOO

عاصم بخاری

O

بڑے شہروں میں رہنے سے بڑا کوئی نہیں ہوتا
بڑائی کے لیے کچھ اور بھی درکار ہوتا ہے

قیادت روز محنت اس کی خاطر کرنا پڑتی ہے
ترقی کا ہر اک رستہ کہاں ہموار ہوتا ہے

دل ناداں تجھے کیوں کر سمجھ میری نہیں آتی
ہر اک دکھ بانٹنے والا کہاں غم خوار ہوتا ہے

یہ کیوں ہے کس لیے ہے تیری دنیا میں تضاد ایسا
جسے پل سمجھا جاتا ہے وہی دیوار ہوتا ہے

اگر اکسیر بھی اس کی مٹی ہے تو گلیوں میں
ولایت کا زمانے میں کڑا معیار ہوتا ہے

کسی کا عیب اس کا دل دماغ اچھا لگتی ہے
کوئی رسوا زمانے میں سر بازار ہوتا ہے

حقیقت ماننی پڑتی ہے ہر حال اور ہر صورت
حقائق سے مگر کس کو کہ انکار ہوتا ہے

بظاہر تو نظر آتا نہیں ایسا مگر عاصم
محبت کا ہر اک رستہ بڑا پرخار ہوتا ہے

OOO

توشۂ خاص

ناول

تانگھ

......1......

بشریٰ رحمٰن

علی مرتضیٰ نے اپنے آپ نوں متھے وا گھر پچھیا تیں دیہہ بھر تے پرین پرین تو تیں ڈٹھا، نیچ ہیٹھاں کوئی آواز کوئی کروٹ پیا ٹھہر ایا۔ رات وی کالی اسی، البتہ تارے لشکدے نے پر اُس تے ایں رتے دے وچ تاریاں دا سوجھلا دیوے دا کم دیندا پیا۔ علی مرتضیٰ نوں ڈر یاگی ٹھنڈی پئی اسی۔ کیں ویلے اوہ کجھ جاتے آسمان ودا ہیدا۔ کیں ویلے کالوں ٹل بھوری جوگیں وو دیندا۔ بھوتیں وا کوئی خاص رنگ محسوس نہ ٹھہر ایا۔ اوٹیں دی رات دے دے ویلے بھوگیں متوں رنگ دی گی وی دیندی دیندی اے۔ تے وت ایہہ رتے دے وی بھوتیں رنگی۔ پر سے تو تیں ریت دا ای ریت دا اسدی پئی اسی۔ البتہ ریت دے ذرے کیں ویلے تاں تاریاں دے سوجھلے وچ تے کیں ویلے جیپ دے بیاں وچ چمکن لگدے سے تاں ایویں لگدا جیویں ریتیاں وچ موتی کھنڈ لیٹے ہیں۔ یا شفق چن دیاں کرناں سوہے اتھوں رجھولاں چھنڈ کیریاں اکھیاں ہوون تے ریتیاں وچ موتی تے جڑے رول گیاں ہوون۔ تارے تاں آسمان تے وی ہن۔ واواوں گچی جا کرائیں ڈٹھا۔ آسمان کیہ تماشا تیں آلگیدا پیا۔

آسمان دی ایسہ بیج وچ اوس پہلے کدا ایں تماشا اسی۔ تاریاں دا ایہہ چمکن لشکن دی واقعیں ہاں ڈٹھا۔ تیں اج ای اوہدی سمجھ وچ آیا جو آسمان ایا آکرتھاں کیوں اے؟ تے ایں ویہ تاں تے کیوں کھڑا رہندے اسیدی بھوئیں اتے ٹھے تارے ہوون۔ تے اکاوور ہووے۔ اوہ آ کرتھاں کیوں نہ ہووے؟ پر ایہہ شاعری کرن دا ویلا نہ ہا۔ پچھلے بک فرلانگ توں اوہ جیپ نوں دھکا لیندا آ ندا پیا ہا۔ پہیں دے ٹکے کی مس ریت اسی۔ جیپ دی ریت وچ لابندی دیندی اسی۔ اتے اوہ خود وی گوڈے گوڈے ریت وچ لابندا دیندا ہا۔ رت دی ہرواری چمک کرائیں آپنی اکھاں ریت وچوں کڈھ صیحہ اتے آپنے گٹھڑیاں دا پیراں ڈولا کرائیں جیپ نوں دھکے دتی دیندا۔

جیپ ڈرائیوراں سٹارٹ ٹھہری تے وت کھبی ہوئی گڈی دی کار تھولا جیہیں پھڑکن دے بعد ٹھپ دیندی۔ ڈرائیور محمد طفیل آپنی اکی ہوئی شکل تاں کڑی دیچوں باہر کڈھ کرائیں اوہدو دیندا ''جیپ آیا آ جایا ہووے'' "بھاجی ایا اے" پر علی مرتضیٰ ذات یک توں اداوے نال جیپ نوں دھکا لاون لگدا۔ تے ڈرائیور کولا لا کرائیں سٹارٹ کرن دی کوشش کریندا۔ ایں عمل کوں کئی گھنٹے تھی گئے ہن۔ تے ہن علی مرتضیٰ ہٹ گیا ہا۔ گھر پچھ کرائیں اوہ بک پاسے وچ تے بہہ گیا ہا۔ اوتھوں بیٹھا ڈیکھ کرائیں ڈرائیور نے وی جیپ توں باہر چھوک ڈتا۔

باہروں وسامت دے ای اوریت دے ذریاں تے ٹھلیا۔ سنبھلیا تے اندر وہ لاون لگا۔ وڈی مشکل نال اوہ آپنے آپ نوں پیریں

اے بھر گھڑا کر سے گیا سی۔ دل ای دل وچ صاحب کوں منہ نے کڈھیئے۔ جنیدی غم مغزی نے ایہہ ذہن ڈکھایا ہا۔ وت اوہ روہ ہیجد ا نکلدا۔
اوہ دا پوہ دا اوچ کراہیں علی مرتضیٰ دے کولھوں دی تے پے گیا۔

اوہ موہنوں کجھ نہ آکھیا۔ کھیسے توں ریڈ اینڈ وائٹ دی ڈبی کڈھی علی مرتضیٰ دے اگوں کیتوس۔ اوں انکار وچ سر لوڈیا تاں طفیل نے ہک سگریٹ کڈھ کراہیں موہنہ وچ رکھ گھدی۔ سگریٹ کوں ماچس دا لمبا ڈکھایوں تے اکھیں نوٹ تے لمبا سوٹا چھکیوس۔ سوٹا لیندے ای جیویں اوہدا اچیچا جاوے تے آون لگا۔ اوں اوہیں اکھیں کھول تے پے دی گل سوٹے لاتے۔ دھوں دے جیویں سارے جلے کڈھن توں بعد اوکوں ایویں لگیا جیویں اوہ دی پیا ہووے۔

آہ سگریٹ دی کیا عجب نعمت ہے۔ اوہ دل وچ سوچیا۔ تھوڑی دیر پہلے اوہدی حالت اوہ موتے بندے دی کار ہئی۔ کوڑے دھوں نے اوہدے اندر جان پا ڈتی ہئی۔ جیکر مرن توں پہلے عزرائیل اوکوں ہک سوٹا لاون دی مہلت ڈے ڈیوے۔ تاں وت اوہدی جند اسانی نال نکل ویسی!!! اوں چار ریں پاسے اوں تیج پر کوں ڈٹھا۔ جنگل ای جنگل۔ رتیڑا ای رتیڑا۔ لمبی چپ گڑپ تے ڈراکل ای ڈراکل۔

"ایہہ پڑھے لکھے لوک دی کالے ہوندن۔ اوے مغزے ہوندن۔" اوں منہ پھیر کراہیں علی مرتضیٰ کوں ڈٹھا۔ علی مرتضیٰ اکھیں نوٹ کراہیں کہیں سوچ وچ گم ہا۔ پہلے تاں اوں آپنے صاحب کوں ایں پندھ تے آون کنوں ہٹکیا ہا۔ اوہ جاہ جیہڑے بارے کجھ سنیا ہویا ہووے۔ بندہ کجھ دی ہاں جاندا ہووے۔ ایہہ تاں کیں بھوڑستیاں تے موہیں اینکا پودی ہاں ہووے ہاں اوہ جاہ دکھن گھمپ ٹی ناں پیا لیا ہے؟ تے وت اوہ پچھلے چار گھنٹیاں توں اوکوں آہدا پیا ہا جو اساں رستہ بھل پچھے ہیں۔ رلے ودے ہیں۔ اتھاں کوئی وی کا کی رستہ کالگی پر علی مرتضیٰ کوئی کالھ حلیمہ ای ہاں ہا۔ آہدا پیا ہا۔ رے چلو کوئی تاں کوئی راہ ضرور نکل آسی!!

اوں کیا نکلدا۔ چپ ای جواب ڈے ڈتا۔ سر تے آئی رات، نہ کھاون کوں، نہ پیون کوں، نہ کوئی بندہ نہ بندے دا اولاں۔ پتہ نئی اوکھاں ہن۔ کیڑھی جاہ ہن۔ اتھاں سویلی دی تھیندی اے یا کائیناں۔ تھیندی اے تاں کڈن تھیندی اے۔ ایں تیج بڑے زنا ورتیاں کیڑی وتی دے موہن۔ چیر پھاڑ تے کھاندے ہوسن یا سالم نگل ویندے ہوسن۔

محمد طفیل کوں ہک جھری آ گئی۔ گھڑی تے ڈیکھا نظر نہ آندا ہا۔ پر کسی تے بدھی گھڑی دی ٹک ٹک ضرور سنیندی ہئی۔ "پتہ تھیں اے کیہیں وتیا اے۔" "کسی دھڑی اے۔" محمد طفیل حیران پریشان تھی گیا۔ "صاحب جی" اوں سوالا کراہیں سگریٹ دا ٹکڑا چھوڑیا۔ "کیا ویلا تھئے ہیں؟" علی مرتضیٰ کوڈیاں توں سر چاتا جیویں گوڑی نند سم گیا ہووے۔ اوہدی کہیں دے اندر کسی دی آواز کر کدی پئی ہئی۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ یاوت دل دھڑک کدا پیا ہا۔ دھک دھک۔ دھک دھک۔ دھک۔ ہا چپ گڑپ دی بولیندی پئی ہئی۔ چپ گڑپ دی کوئی حد تھیں ہوندی۔ کوئی آواز نی ہوندی۔ پر چپ گڑپ بولیندی اے۔ ایں طراحوں بولیندی اے جو بندے دا اندر بے پروا تھی ویندے۔ یا بندے دی عقل بچھ مک ویندی اے۔ تے اندر دی عقل بچھ جاگ پوندی اے۔ — جیڑھے راہ ہو ون غم تھی ویندے تے نہ ہو توں سامنے آ ویندے۔ اوں ویلے علی مرتضیٰ نے اکھیں پٹ کراہیں آپنی گھڑی ڈٹھی تے وت "سوئی گل" گھڑی وا اجن دہا ڈتوس۔ دی تی گل کراہیں وسم گئی۔ گھڑی بند تھیاں دے ساتھ چھوڑ گئی۔

"ایں ویلے رات دے ساڑھے یاراں وجن طفیل!" "ساڑھے یاراں؟" طفیل وات پٹ تے آکھیا "ایندا مطلب اے جو

ادھی رات تھی گئی اے تے اٹھ وجے توں اساں رستہ بھلے ہوئے ہیں۔ صاحب میں تہانوں آکھیا ہا جو اتھاں ٹرک ڈیندے ہین۔ اتھاں کجھ کجھ بتیاں وی ڈسدیاں پیاں ہن۔ اگر ونج وی ہن۔ ایہہ چوکھی تاں رڑھ رن دی کا راہ جڑی ہوئی جاپدی اے۔

علی مرتضیٰ نے کوئی ولدا نہ ڈتا۔ علی مرتضیٰ کوں پتہ ہا جو اوہ رستہ بھل تھی چکن۔ اوندی جیپ وچ رتڑے دا اپنا نقشہ ہا پر بھل بہوں پہلے تھی چکی ہئی۔ تیز دھمے اوندا پچھے ٹکی اونیں دے مجبور کرن تے صادق آباد ڈک گیا ہا۔ پر اونیں نے تاں جیویں اوندی آون دی خوشی وچ ہک وڈی دعوت دا بندوبست کر چھوڑیا ہا۔ مرغابیاں، ہرن، تیتر، بٹیرے ہر جاجی دی اکھوں ڈٹھا تھی سگدا ہا۔ اوندے کھاونیں لئے ہوئے ہن اوں توں صاف آکھ ڈتا ہا جو کھاونا نہ کھاوے بغیر اگوں ناں وکھن ڈیسن۔ بس علی مرتضیٰ کوں اتھاں ٹھہرنا پیا۔ تراے دے ڈو پہر ہیں کوں کھاونے توں واندے تھی گئے ہن۔ پر اتے کھانے وچ اتنیاں شئیں کھاون توں بعد ٹرن دی ہمت نہ رہی۔ ڈھلپے تے آلس جیہیں تھیوں گی۔ تاں اوں اونیں کوں آکھیا۔

"یار اتفاقی پیدا اے۔ تیں تاں بہوں کھوا ڈتے ہوا ساں ٹرن جوگے ہی نئیں رہے ـــــ رات اوہ لوک کافی ویلھے سندے ہن۔ بہت گزا ک لیندے رہے۔ کھاونا ہضم کریندے رہے تاں جو ٹرن جوگے تھی سگن۔ چار وجے اتھوں ٹرے۔ اونیں بہوں مجبور کیتا ہا جو اج رات اتھائیں ٹک پوو۔ کل فجریں نماز دے بعد ٹرنے کر پوائے۔ تاں جلدی منزل تے آ ویسو۔"

پر علی مرتضیٰ ارادے دا پکا بندہ ہا۔ اوہ جیہڑے کوئی فیصلہ کر گھندا ہا اوں تے عمل کریندا ہا۔ کل تے ٹالن آلا بندہ نہ ہا۔ اوندے وچ چاڈا ہا، جوش ہا، جذبہ ہا۔ تے بھانویں وڈی عمر دا ہا اوں دے دم تروڑ جانے ہوئے ہن۔ صحرانواں تے پندھاں دے اوکھائیاں توں تاں گھبرا ہا۔ ایں کیتے اتھوں ٹر پیا۔ اگوں ریتلے رستیاں دا کوئی تجربہ ناں ہا۔ ایہہ تاں اوہ جاندا ہا جو پہاڑی رستے شاہری رستیاں توں اوکھے ہوندن۔ پر ریتڑے رستیاں وچ کیا اوکھائیاں ہوندن اوندا ایہہ پہلا تجربہ ہا۔

اوں کڈاہیں سوچیا وی ناں ہا جو ریتلیاں وچ ایویں گلی دی پیالاں ریت دے بستر دے ڈٹھے ہوئے ہوون۔ ہر ہک ہک منٹ دے تھی ویسن۔ واقعی اتھوں اوں کیتے رتڑے دا پہلا آہدن۔ اوہ بیٹھے بیٹھے اوندے بارے سوچن لگا۔ اللہ کریندا اوہ لوک اتھاں آ تے آ تے ہوندے تاں کیڈی وس آ ہندی۔ "صاحب جی اے رات وا کیا کر ہوسوں؟" طفیل نے ڈوجھا سگریٹ دکھا گھدا ہا۔ اوں پچھے تے صاحب دی چپ چاپ توں ڈر ونج پیا ہا۔ "کجھ کریندے ہیں یار!"

علی مرتضیٰ ہک دم گمبھیر تھی گیا۔ ہیں وقت جیپ دے تیز دے وچ گراہیں اڈے دے بھن گیا۔ خیالاں دا سلسلہ وت ٹٹ گیا۔ اوہ تھیا جیہڑا اوں رات سرتے آ گئی۔ اندھارا او وسیا۔ اوہ لوک رستہ بھل گئے۔ شروع شروع وچ کجھ ایہہ تھی آون آلے بوٹیاں ڈسیاں۔ پر ودھرے ودھرے ڈر ہوندے ہرن دی چوکڑیاں بھریندے ہوئیں ڈے جیپ دے سوہنے کوں ڈیکھ گراہیں اوہ ایویں ڈر گراہیں بھجے جیویں ریہاتی ڈنگر بجلی والی ہوائی جہاز ڈیکھ گراہیں ڈر ویندی اے۔ پرے پرے کھیاں کھیاں بتیاں وی ڈسیاں ہن۔ ڈر انھیرا گوڑا اللہ کر اوندا ہا۔ علی مرتضیٰ انگوں پیا گوں ودھن دا آہدا رہیا۔ ایہہ تھیں جو جیپ نے آپ دم تروڑ ڈتا۔

"ریت بہوں وڈی ہئی۔ تے اوندی وجہ نے سخت جان پہیاں کوں جیویں روک تے کر کے رکھ ڈتا ـــــ کافی دیر تو کویں علی مرتضیٰ نے دھکا لایا تے طفیل کوں جیپ وچ بٹھیں بہوں مزہ نہ ڈیا ہا۔ صاحب کوں اپنی ضد دی سزا ملی جا پیندی ہئی۔ تیں اوہ ٹکے آسان

تے کھلی جھوک وچ تے گھر سے ہن۔ پاسیاں دا کوئی پتہ نہیں ہا۔ بے گھر میں اساں نہ ہوندا اتاں جیسے اوہ ایہو جھئے جو اوا گلے جہان وچ ہن۔ ''طفیل! آ ایہہ تیں کنوں کتھ تے اتھاں پورچھوڑ۔'' طفیل اپنی بیت آکڑ تھی گیا۔ ''صاحب! اتھاں تیکوں کیوں لگسی؟'' ''میں تیکوں لاتے ڈکھیندا اں؟'' علی مرتضیٰ جیپ دے اندر ول گیا۔ اوکوں ڈیکھ تے ڈرائیور وی اندر آ گیا۔ پلیوری پال کے اتھاں تھوڑا کلدا ہیا۔ کئی آلے تھیلے کلدے۔ چاہ وچ پانی دے تھرماس کلدے۔ بات کیس کلدا ہیا۔ ضرورت دی ہر شے اوہ نال چا آئے ہن۔

جیپ دے نال ہو کے علی مرتضیٰ نے تمبو لا ڈتا۔ میں ریت اتے اپنا کمبل وانگوں وچھا ڈتا۔ اندر ڈھا ڈھمی ڈرائیور نے وی اوتوں لیٹ۔ ''کھانا وی کھاسوں صاحب؟'' عجیب طفیل کوں گھر لگ گئی ہئی۔ ''توں کھا وتاں کھا۔ میکوں صرف کافی ڈے ڈے ہا۔ ڈیکھیں، سوئیں کیتے پانی بچا رکھیں۔ اتھاں پانی سمر دا کا کمل۔'' کافی پی تے علی مرتضیٰ آپنے بستر تے سدھا لیٹ گیا۔ اوں کھیسے وچوں سگار کڈھیا تے تاریاں دو ہزار ڈاکراپیں سوتا کھن لگا۔ سگار دی خوشبو تیز تھئے طفیل دے ناس وچ چڑھی تاں اوں سوچیا: ''اجھی کیتے صاحب نے ریڈ اینڈ وائیٹ جیہاں سگریٹ پیون توں انکار کر ڈتا ہا۔''

''ایہ اکھوں کیا پتہ اصل مہنگا ہووے تاں ریڈ اینڈ وائیٹ وی امریکی سگار دی جنس ڈیندی اے۔ سو الیتہ لیئے نے طفیل کوں تھل آون گئی۔ بہوں زیادہ تھکا ہویا ہا۔ حالی ڈو پہریں دا کھادا وی ہضم نہ تھیا ہا۔ جو اوں پا کھادا ہاں کھا گھدا۔ ایہہ کھادا ہاں اتھاں کوں اوس نے بات کیس وچ بند کر کے نال ڈے ڈتا ہا۔ رتجے دے دیاں ہوائیں، معصوم نازو جیہا ہریں دی کار تیز تھئے آپنے قلارے پچھوندیاں انہاں میں سوتے کھوتے تھیوں لگیاں تاں محمد طفیل کوں نشہ جیہا آ گیا۔ کجھ منٹیں بعد او ہے گھر ڈرانے لگن لگے۔

ایں ڈراکلی تج چاہ وچ ایہہ گھر ڈرانے دی قیمت ہن۔ علی مرتضیٰ سوچیا۔ حیاتی دا احساس تاں تھیندا ہے جے کراوں کیس آرام آلی جاہ سجھے کچھانے ریسٹ ہاؤس وچ ہوندے تاں او طفیل کوں صاف صاف آکھ ڈیندا: ''جو گھر اتا اے دنج تے پاسیوں آ نے گوارراں وچ ونج سن۔ میں حیڈے گھر ڈرانے برداشت تھی کر سکدا۔'' تھلے تھلے ہوائیں بہوں چنگیاں لگدیاں پیاں ہن۔

اتھاں لیٹ تے علی مرتضیٰ کوں اندازہ تھیا۔ جو ہوا کیڈی پیارا کے تے کیڈی آزاد ہوندی اے۔ تے تاں جتی وچ سکھیندی اے۔ نیویں نیویں رات ڈھلدی پئی ہئی۔ اساں تیں تاریاں دا گوڑھا نا تھیندا ویندا ہا۔ آسمان سرے دی کار کالا تھیندا ویندا ہا۔ اتے تارے ہوش ونجاون دی حد تئیں چمکیں تھیندے ویندے ہن۔

''تاریاں دا اگ۔ سچھ توں ودھ سوہنا ڈسدا پیا ہا۔ صاف لگدا پیا ہا جو تیں ابھی، کوئی نوریاں گولیاں اسمان ودے گئے۔ تیں اسمان تیں وڈ نوروا رستہ وچھا گئے۔ ایویں لگا جیویں او تصوف دی دنیا وچ پج گئے۔ اوں بھوئیں آلوں کھسن تے اسمان تک دی ہر شے بارے سوچیا۔ نیڑ روحت دی ندا آئی۔ کجھ ڈھیر دیں اوہ شرمسار دی ہار دے تے تھئے نال ڈرائیور کوں اتھاں کھسن آیا ہا۔ پر ہن اوکوں کیا تھیسی؟ اے کر سوئیں تیئں اوکیں جنگلی زناور دا خطرہ تھی گئے ـــ ہاں ـــ ''اج دی رات کہوں تاں سوئیں ڈکھسوں۔'' اوں دے تیں وچ نیویں کوئی گاؤں نگ تیر۔ او فکر ہا ایں کیتے موت توں نہ ڈردا ہا ـــ پر جان بجھ تیں آپ کوں موت دے حوالے کرن عجیب جیہاں لگدا ہا۔ کیوں جو حالی تاں ان گن کم اوں کرن آئے۔ ماؤکوں اوندا اکھا ڈکھسن دا ارمان ہا۔ تے اوکوں کیتھی دا خیال آ گیا۔ کیتھی دے خیال کوں اوں چاں بجھ تے سٹ ڈتا ہا۔ اصل وچ اوں ونجے اوکس چا ہندا ہا تے کہن توں پہلے تیز تھئے تو تیں خیال کوئی سوہنا جیہاں سہارا ندیوے اندر تھیں

آ گئی۔

علی مرتضیٰ امریکہ توں جرنلزم دی ڈگری لے کے کراچی آ گیا۔ اتھے آ کے کراچی اوہ کجھ سنگیاں نال رل کے کراچی اک روزنامہ کڈھیا۔ اوہدا ایہہ کم کرن دا جذبہ سی۔ شوق سی جوش سی۔ جنون سی۔ اوہدے دل وچ بھاہ لگی سی۔ جیہدی تپش نال اوہ دنیا نوں جاتو کراون چاہندا سی۔ اوہ ایس حد تے ایس وچ کوئی چنگا کم کرنا چاہندا سی۔ کوئی وڈا کم کر کے مرن چاہندا سی۔ جیہدے لئی اک اخبار کڈھن دا پروگرام بنا لیا۔ اخبار لئی بہوں زیادہ پیسیاں دی لوڑ ہوندی اے۔ ایس پاروں اوہنے اپنے سنگیاں دا آسرا لیا۔ اوہناں نے قابل عمل ہنر رکھیا۔ قومی تبدیلیاں دے نال قومی اصولاں دے نال اوہدا روزنامہ "ابھار" ساہمنے آیا۔ اوہ صحافت نوں لوکاں قدراں نال جاتو کراون چاہندا سی۔ تے جیہڑیاں اخلاقی قدراں ایس وچ رکھیاں ہویاں سن اوہناں نوں آگے کرن چاہندا سی۔

ایہدے نال نال اوہ لوکاں نال ہر قسم دا میل ملاقات رکھیا ہویا اے۔ خاص کر چولستان دے روہیلے علاقیاں تے لوکاں دی چنتا کراون اوہ آپنا فرض سمجھدا سی۔ غریب لوکاں کتھاں کتھاں نیں؟ تے کیہڑے کیہڑے حال وچ نیں؟ اوہ بہوں پہلے توں ایہناں علاقیاں دا چیتا کر چکیا سی۔ لوکاں دے اوہناں مسئلیاں نوں ذہن وچ رکھیا اوہناں دے مسئلیاں دی چول پچول کر دا رہندا سی۔ اوہناں تے اک مورتیں بھر بیٹھا لکھ کراچی ہر مہینے آپنے اخبار دی جھولی پیندا۔ کیوں جو اوہ آپ وی کراچی حال توں ایہہ ذہین ایہہ اشتعال سی۔ ایس لئی اوہدا جیو بہوں اثر کرن والا ہوندا۔ ایس واری اوہنے "چولستان" دورے دا کہیا۔ چولستان اک روہی علاقہ اے۔ جیہڑا بہاولپور توں ہٹ کے میلاں تیک پھیلیا اے۔ اتھاں دی لوک وسدیاں جیہڑے حال وچ نیں شاعری پڑھ کے سوچاں توں وانجے ہوئے نیں۔

علی مرتضیٰ بہوں کجھ سن رکھیا سی۔ پر اوہ سوچیا۔ جو اوہ آپ چولستان دا دورہ کرے گا۔ اتھوں دے لوکاں نوں آپ ملے گا۔ اتھوں دے دکھ ویکھ نوں آپنے اکھیں نال ویکھسی۔ تے اک مورتیں بھر بیٹھا لیسی۔ ہک ایس واری اوہ اپناں موبی کیمرہ وی نال گھن آیا سی۔ اوہ ٹی وی لئی اک فلم بناون چاہندا سی۔ اوہدی ٹیم دے کجھ ہور لوک وی نال آون چاہندے سن۔ پر اوہ ساریاں نوں ٹھیک ڈکیا۔ اوہدا خیال سی جو پہلوں اوہ آپ وچ کراچی دا ویکھسی تکسی۔ اوہ صرف اک ڈرائیور نال رکھیا۔ لمے پینڈے وچ کئے پندھ دا گڈی چلاون دا اوکھا سی ویہڑے تے اوہ ساڈا ہویا سو چیندا رہیا۔ چنگیاں تھیاں جو اوہ تھل نوں نال گھن تک آئے۔ جیپ توں پہلے جتے ای ڈیرہ ورز ڈکیا۔ جد اوتھیں جو تھل کھوج دے سر پیا سی۔ پیدار ایہہ چنگاں سی۔ اوہ چولستان تے تھل روز تھیا۔ تھل ایس کھلے آسمان دے تلے اوہ ایس تھیا پیا جیویں اوہ ہر قسم دے فکراں توں آزاد ہو کے پچھایا ہووے۔

"کیہڑے ہیں تے آئے ہوئے من ایہہ لوک۔ علی مرتضیٰ سوچیا۔ جیہناں دی حیاتی دا مقصد کھاون پیون تے ستن ہے۔" "جیون لئی جیون پئے۔ تک اوہ ہے جو مقصد پا جیون دی ای نہیں ہوندا۔ جیہناں کیہڑے ویلے نوں کوئے کوئے اکھیں نال گوریاں کدھ دی ہوئی۔ رتے جی کری نے اوس تے مسکراہٹ کرن شروع کر دتی تے اوہ سہم گیا ۔۔۔!!" "سوہی دا کوئی پہر ہوئی۔ "مجیٹھ پر وا ٹھنڈی پئی ہوئی۔ ہوا وی ٹور بدل گئی سی۔ رات نوں اوہ ڈاہڈی پوہ دی پئی سی۔ تے ڈنگ کھادی پئی سی۔ سوہی ویلے کولے سیک آں تے ہوئے من آ ہی رہی سی۔ جیویں اک شہر وچ پیلی تازہ ہوندی اے۔ ایہدے وچ تھوڑا دل دی سی تے مٹھاوی۔ کتیں آواز نے علی مرتضیٰ نوں جگا دتا سی۔ "ایہہ کیہی آواز سی؟"

اوس اکھیں کھول کے ایہہ چوہ وہارا تکیا۔ کوئی نشانی آواز نہ جی۔ اسمان وار تک اوڈا یا۔ جوکھے بدلاں وادوں نہ پاڑ پایا۔ اسمان کتیں حد توں صاف سی۔ اتھاں بدل وی نہ ہین جدلاں باجھوں اسمان کیہڑا عجیب لگدے۔ کتے کتے تارے دے نشان جیہوں وچ کار کتھا ہیں لگے ہوئے ہین اوس جنگل بالی وی بے انت حد تکا دیایا۔ وت اوہنوں کتیں آواز مچ کاندا۔ ایہہ کوئی نیڑیوں ٹھیا۔ اوس ریت دوڑ تھا۔ ریت تے تاں کئی نشان ہین پیرے پیرے تو تھیں نشان ای نشان ہین۔ جھٹ الیاں وچ ذرا دواں دے پیراں دے نشان وی ہین۔ لامکاں ندیاں تے معدیاں آندیاں ہین۔ پیرے پیرے توں آندیاں پیاں ہین۔ نٹے پیرے پیرے تو تھیں ویکھیاں پیاں ہین۔ تاں اتھوں ٹولیاں دی تکھدن تے اجڑ وی۔ وت اوہنوں کتیں آواز مچ کاندا۔

اوس کوئی کانیاں یاد۔ جوکھ تے حد کتوں پہلے انہاں کوں آپناں رستہ لبھ کھناں چاہیدا اے۔ ریتریاں دی رات جلی ٹھنڈی ہوندی اے۔ ذرا پابر آکھی ای تپ ہوندی اے او جاندا ایا۔ پیا اوس ویلے اوہنوں پتہ ہی نشت ٹھار آندی پئی ہی تے سوئل وچ ہوا اوی ایلڑی بیہوش کرن والی ہی۔ جداوں پا ساہدیا تے اکھیں لوٹ کھدیاں۔ وت کوئی آواز آئی۔ میں اوس آواز تے غور کیتا۔ کوئی شے وجدی ہی —— تیوں میں تیوں میں —— اوس دل وچ سوچیا۔ ''تیوں میں کتھی وجدی؟'' ''پر کتھی اتھاں کتھوں؟ کوئی رکھوالا ہوسی۔ اوتوں وی چپ کر چپ۔'' خاکو لو ویلدی راہندی اے۔ اوہ وت سہم گیا۔ اوازوت آئی۔ میں اوس سر چا کے ایہہ جیپ ویکھی دوڑ تھا۔ آواز جیپ دے پچھوں تو آندی پئی ہی۔ اوہ سر چا کے اوڈے ذیبھ ادھریا۔ جا کو تکھیڑ ادھریا۔ وت جیپ دے تکے پھٹیاں دے آوَل وچوں اوہنوں دو ٹلیاں دسیاں۔ ''ٹلیاں تے اتھا''۔ ''کون اے بھئی؟'' اوس گلا صاف کر کے پچھیا۔ ٹلیاں سکو گیاں۔ ''کرن ہے سامنے؟'' ٹلیاں لک گیاں۔ اوہ آپ کھڑا اٹھی گیا۔ ٹھگئی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت تے لرداجیپ دے پچھوں لگا گیا۔ یک کھاری ہوئی بچھو بر بوچھن نال ٹکا دون چاہندی ہی۔ علی مرتضیٰ نے پرویڑا کھڑ کے پچھیا۔ ''توں کون ہیں —— اتھاں کیا کرن آئی ہیں؟؟'' اوس کوئی ولدانہ دتا۔ آپنے وڈے وڈے چٹے چٹے اکھیں نال اوہدو ڈیہدی رہ گئی۔ ''میں پچھے توں کون ایں؟'' ''کون ہیں توں؟؟'' علی مرتضیٰ نے آپنے الاکوں رجھش الاندے وت پچھیا۔

علی مرتضیٰ نے آپنے الاکوں رجھش آلا ہٹے وت پچھیا۔ اوس کوئی ولدانہ دتا۔ لمبیاں لمبیاں پلکیاں جھک جھک تیں علی مرتضیٰ کوں ایویں ڈیکھن لگی جیویں بہت چر بعد اوس کسے بندے دی شکل ڈٹھی ہووے۔ ''کمال اے۔'' علی مرتضیٰ نے آپنے دل وچ سوچیا۔ ایہہ ٹی کونگی پئی بوڑی اے۔ وت ایہہ ٹیت اوہنوں خیال آیا۔ ہوسکدا او اردو زبان نہ سمجھدی ہووے۔ کیوں جو او جاندا ایا جو ایہیں علاقے وچ سرائیکی زبان بولی ویندی اے پر او سرائیکی بول نہ سکدا ایا۔ بھاویں جو سمجھ سکدا ایا۔ کجھ عرصہ اوہنوں ملتان وچ وی راہون دا اتفاق تھیا ایا —— او اوں دی واری رحیم یار خان وی گیا ایا۔ ملتان تے رحیم یار خان دے لوکاں دی سرائیکی ہی ہن۔ تے اوہنوں پتہ ہا جو ایں علاقے وچ ایہہ دے وڈے گھٹ وَدھا ایہا زبان بولی ویندی اے۔ ''اوں سوچیا۔ پنجابی الا ونی چاہیدی اے۔ شیت ایہہ سمجھ ونجے۔ وت اوں وڈی جھک تو اُتی نال مسکرا پئی کیتا آکھیا۔ ''توں کون ہیں تے اتھاں کتھوں آئی ہیں؟'' او تھوڑا جیہا ٹھکی تے اوں ہرن دا پال اکوں کر دتا۔ جیہڑا ہن تا ئیں پکڑ پا تا ہویا ہس۔ علی مرتضیٰ نے ہرن دو تکا۔ موٹے موٹے نرم سے رنگیاں اکھیں کو لاکو لا بدا ہی ہم۔ مشوم مشوم مکھڑا۔ ہرن دا پال وی جیویں پلیاں جھک جھک کے ایہیں تا اڑا او نہ وڈیکھن لگا۔

(جاری ہے)

***

یادیں

قرطاس و کینوس

اسلم کمال

قارئین کرام! پی آئی اے کا چارٹرڈ طیارہ لندن کے دوسرے سول ایئرپورٹ گیٹ وِک سے اوسلو ناروے کے لئے روانہ ہوتا تھا۔ ہم سب ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھے ہوئے سامان بورڈ پر نظریں جمائے فلائیٹ کا اعلان روشن ہونے کے انتظار میں تھے کہ میں اچانک محسوس کرنے لگا جیسے میرا شعور، میرا لاشعور، میرا تصور اور میرا تخیل میرے احساس کے ساتھ آپس میں ہم آہنگ ہو کر میرے لئے مختلف سوالات بنتے جا رہے ہیں۔ جبکہ اپنا دستی سامان لئے طیارے کی طرف تمام مسافر روانہ ہو چکے ہیں۔ مگر پورے لاؤنج میں اب صرف ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ اور پھر خود میرے وجود سے میرا لاوجود بھی اپنے رابطے اور اپنے سلسلے توڑتا ہوا خالی لاؤنج میں معدوم ہو کر ایک انوکھی گمشدگی کا غبار بن گیا اور آہستہ آہستہ یہ گمشدگی مجھ پہ طاری ہو گئی اور یہ گیٹ وِک جو ایک سائلنٹ ایئرپورٹ ہے اس کی فضا میں ایک اعلان گونجنے لگا: مسٹر اسلم کمال ۔۔۔ مسٹر اسلم کمال آف اوسلو ناروے؟

قارئین! میرے کان یہ اعلان جو بار بار ہو رہا تھا سن رہے تھے مگر میرا دل مسلسل انکار کر رہا تھا کہ میں اسلم کمال نہیں ہوں، ہو گا کوئی اسلم کمال ۔۔۔ لیکن میں ہرگز وہ اسلم کمال نہیں ہوں!

قارئین! یہ عجیب گمشدگی تھی ۔۔۔ میں گم ہو گیا تھا مگر اس گمشدگی میں کچھ میں نے گم نہیں کیا تھا۔ الٹا میں نے بہت کچھ پا لیا تھا۔ اتنا کچھ کہ جس کا بیان نہیں کر سکتا، اقرار ہی اقرار کر سکتا ہوں۔ اور وہ سب کچھ میرے پاس ہے میں دکھا نہیں سکتا، تو ابھی نہیں سکتا کہ وہ سب کچھ میرے وجود کی بجائے میرے لاوجود میں محفوظ ہے۔

قارئین! لاہور میوزیم لاہور کے زیر اہتمام مال روڈ لاہور کی پرانی ٹولنٹن مارکیٹ اب ہسٹری میوزیم لاہور کے نام سے جانی جاتی ہے اس میں لاہور شہر کے ایک فضل محمود کی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو آویزاں کی گئی ہے۔ اور لاہور کے قذافی سٹیڈیم کا ایک انکلوژر فضل محمود کے نام سے منسوب ہے۔ باقی پورے لاہور میں کوئی سڑک کوئی چوک اوول کے ہیرو سے منسوب نہیں۔ جبکہ آسٹریلین کرکٹ کے نامور کپتان رچی بینو نے اپنی کتاب میں لاہور کے چیئرنگ کراس (فیصل سکوائر) چوک میں ڈی ایس پی ٹریفک 6 فٹ 2 انچ قد اور نیلی آنکھوں والے فضل محمود کا جو انگریزی زبان میں پورٹریٹ پیش کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قارئین! ڈیلی ڈان کراچی کی 30-5-2021 اور 2-6-2021 کی اشاعتوں میں لیٹرز ٹو ایڈیٹر میں دو خط شائع ہوئے ہیں۔ اور دونوں خطوط میں فضل محمود کی فتوحات اور اس کے مردانہ حسن و جمال کو دل کھول کر خراج پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس حاسدانہ روش کا بھی ماتم کیا گیا ہے جو ناقابل فراموش فضل محمود کو جلد از جلد فراموش کر دینے پر نہ جانے کیوں مُصر رہتی ہے کہ آج تک اس کے نام پر

ایک دائک تحت بھی جاری نہیں کیا جا سکا۔ راقم ان دونوں خطوط نویسوں کا شکر گزار ہے کہ ان کے خطوط میں معلومات سے راقم کی فضل محمود کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ اور راقم اس احسان کے تشکر میں ان حضرات کی خدمت میں دنیائے کرکٹ کے حسین ترین کرکٹر المعروف اوول ہیرو کی زندگی کے عظیم ترین روحانی انقلاب کی حقیقت کا انکشاف چاہتا ہے۔ کہ فضل محمود اللہ پاک کا سچا بندہ بھی تھا۔ اس نے حج کیا اور URGE TO FAITH کے عنوان سے وہ ایک اعلیٰ کتاب کا قابلِ قدر مصنف بھی ہے۔"

قارئین! گیٹ وِک ایئرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج کے معلوماتی کاؤنٹر پر خاتون کے پاس سنہری بالوں اور براؤن آنکھوں والا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ جس کا نام مائیکل تھا۔ وہ سنارلو ٹرز کا ڈرائیور تھا۔ ہوٹل الالفا واپس جا رہا تھا۔ خاتون کے کہنے پر وہ مجھے ساتھ لے جا کر سنارلو ٹرز کی اگلی فلائٹ جو رات ۱۱ بجے کے بعد متوقع تھی۔ اس میں ادا کرنے کے لئے روانگی میں مدد دے گا۔ مائیکل مجھے ساتھ لے کر اپنی گاڑی تک میری فلائٹ کے مس ہو جانے پر افسوس کا اظہار کرتا رہا اور اگلی فلائٹ میں مجھے سیٹ دلوا دینے کے بارے میں کافی پُر امید تھا۔ اس کے اطوار و انداز بات چیت اور چال ڈھال میں ایک کھلاڑی کی سی بے تکلفی اور خلوص جھلکتا تھا۔ اس نے ڈرائیور سیٹ کا دروازہ کھولا، اچک کر سیٹ پر بیٹھا اور اپنے ساتھ کی سیٹ کا دروازہ ہاتھ بڑھا کر ان لاک کیا اور مجھے سوار ہونے کا اشارہ کیا اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو گلے میں پیلا گرم سکارف لگائے، مالٹی رنگ کا خوبصورت لمبا کوٹ اور نیچے سفید کورٹ شوز پہنے ایک موزوں قد، پُروقار اور مجسمۂ حسن و جمال تیس پینتیس برس کی عورت نے میری سیٹ کی جانب کھڑکی سے اندر جھانک کر مائیکل سے لفٹ مانگی۔ مائیکل نے بغیر منہ سے کچھ بولے اسے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور وہ ہمارے عقب کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے سنہرے گھنے بالوں کا اپنے سر کی پشت پر بہت خوبصورت اور بڑا سا جوڑا بنائے بڑی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ستر کی دہائی کے آغاز کا زمانہ اور خواتین کے لئے لاہور سے شائع ہونے والا ایک ماہوار رسالہ چمن یاد آ گیا جس کے سرورق پر ہر ماہ اپنے مخصوص انداز میں ایک نسوانی چہرہ بنایا کرتا تھا اور بالوں کے جوڑے کے نت نئے انداز خصوصی دلچسپی سے تخلیق کیا کرتا تھا۔ ان میں خاص طور پر بڑے سائز کا جوڑا اور اس میں نمایاں سا کوئی پھول لگا خواتین میں خاصا مقبول ہوا تھا۔

قارئین! مائیکل نے بس سٹارٹ کی تو سامنے اندھیرے سے ایک سیاہ فام حسینہ بھاگتی ہوئی نکلی اور مائیکل کو ہاتھ کے انگوٹھے سے لفٹ کا اشارہ دیا۔ مائیکل نے اسے بھی سوار ہونے کی سر ہلا کر ہامی بھر دی۔ وہ ایک کرسی میں سوار ہو کر پُروقار عورت کی عقبی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مائیکل نے گھوم کر اسے دیکھا اور ایک آنکھ سے بڑی شوخ اشارہ کر کے مجھ سے بولا میلکم مارشل کی بھتیجی ہے۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگا تم میلکم مارشل کو جانتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو پوچھنے لگا تم کس طرح میلکم مارشل کو جانتے ہو؟ میں نے بتایا کہ میں فضل محمود اور عمران خان کے پاکستان کا خوش قسمت پاکستانی ہوں۔ یہ سن کر وہ کھل اٹھا۔ اس نے بس ڈرائیو کرتے ہوئے نہایت گرمجوشی سے میرے ہاتھ سے ہاتھ ملایا اور بتانے لگا کہ کرکٹ کا وہ جنون کی حد تک شوقین اور خود بہت اچھا سپورٹس مین ہے اور عمران خان اس کا آئیڈیل باؤلر اور جاوید میاں داد پسندیدہ بیٹسمین ہے۔ اس کا باپ بھی فرسٹ کلاس کرکٹ آل راؤنڈر تھا اور پاکستان کے فضل محمود کو وہ تاریخ کے چند اعلیٰ باؤلروں میں شمار کرتا تھا اور اس کی ماں اوول ٹیسٹ میچ دیکھنے والوں میں ایسی تماشائی تھی جس نے پاکستان کی فتح پر سب سے پہلے آگے بڑھ کر اوول ہیرو فضل محمود کو تہنیتی بوسہ دیا تھا اور بتایا کرتی تھی کہ ایک زمانے تک کرکٹ کی صحافتی انگریزی میں فضل بطور وصف استعمال ہوتا رہا

تھا۔

قارئین! مجھے یاد آیا کہ آسٹریلیا نے غالباً 1958ء میں انگلینڈ سے ایشز ہارنے کے بعد کراچی میں پاکستان سے ایک ٹیسٹ میچ کھیلا۔ کراچی کے لوگ آسٹریلیا کے اونیل اور نیل ہاروے کو بیٹنگ کرتے دیکھنے جوق در جوق پہنچے۔ مگر سب کی نظریں فضل محمود پر جم کر رہ گئیں جس کے لیگ کٹرز کوئی آسٹریلین بھی نہ کھیل سکا۔ وہ ان کے بیٹ کو چھوڑ کر سیدھے بے مثال وکٹ کیپر امتیاز احمد کے دستانوں میں چلے جاتے تھے۔ اس پر انگلینڈ کے ڈیلی ٹیلیگراف کا یہ تبصرہ تقریباً تمام پاکستانی اخباروں نے نقل کیا تھا:

"Spare some pity for Austrailian Cricketers. in England they lost Ashes and now on their way home they are being "Fazaled"."

قارئین! سٹار لورز کا دفتر ہوٹل انٹالکف کے قریب ہی واقع تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو دفتر بند ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ مائیکل نے گاڑی کا سوئچ آف کر کے جلدی سے کاؤنٹر پر پہنچ کر میرا کیس بتایا۔ جسے سن کر کاؤنٹر پر موجود نہایت موٹے سفید مونچھوں اور گنجے سر والے گورے نے رجسٹر کا کالم ساتھ لے کر پہلے میرا ٹکٹ دیکھا پھر اس پر ٹائپ میں سے ٹکٹ کا حوالہ چیک کر کے کہا یہ ٹکٹ بیکار ہو چکا ہے، سوری!

اس مایوس کن جواب پر مجھ سے زیادہ مائیکل کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ چند لمحے خاموش کھڑا رہا، پھر مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا تمہارے پاس نیا ٹکٹ خریدنے کے لئے پیسے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دے کر اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور اسے حوصلہ دیا کہ وہ جو کر سکتا تھا اس نے کوشش کی، اب مجھے اپنی غلطی کی سزا بھگتنی چاہئے۔ میں نے مائیکل سے ہاتھ ملایا اور گڈ بائی کہہ کر ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ چند قدم چل کر میں ہاتھ کی طرف مڑا تو کانوں میں نسوانی آواز آئی۔ میں نے تھوڑا سا گھوم کر دیکھا سڑک کنارے ایک بڑے سے درخت کے نیچے درمیانے سے بالوں کے خوبصورت چہرے والی باوقار عورت کھڑی تھی۔ مجھے متوجہ پا کر بولی۔ سر آئی ہیلپ یو؟

تم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟ میں نے رکے بغیر چلتے ہوئے پوچھا اور وہ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگی، میں نے تمہاری باتیں سنی ہیں۔ تمہاری فلائٹ مس ہو گئی ہے۔ تم بہت پریشان ہو۔ تمہیں ایسا ماحول چاہئے جو تمہیں سکون دے سکے۔ تم یہاں کسی بھی اکانومی ہوٹل میں ٹھہرو گے، کم از کم پینتیس پاؤنڈ کرایہ ایک رات کا ادا کرو گے اور رات بھر فلائٹ مس ہو جانے کی کلفت تمہیں سونے نہیں دے گی۔ تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں بہت پرسکون ماحول میں لے جاؤں گی، مجھے تم صرف چالیس پاؤنڈ دے دینا۔

میں خاموش رہا۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اس سے معذرت کر لوں، یہ خیال آیا اور میں نے مناسب الفاظ کی تلاش کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی:

''تم میرے ساتھ بہت سکون سے رہو گے۔ انگلش کلاسیکل لٹریچر مجھے ازبر ہے۔ شیکسپیئر کے کرداروں کی کہانیاں، بائرن کے معاشقے اور شرلاک ہومز کے کارنامے تمہیں سناؤں گی۔ تم شیلے اور کیٹس کی شاعری میں میرے ساتھ رات بسر کرو گے اور صبح میں تمہیں تھامس کک سے ٹکٹ خریدنے میں بھی مدد دوں گی۔ تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ میں پر لطف ناشتہ بھی تیار کر دوں گی۔''

اب ہم سڑک پر درخت کے سائے سے نکل کر روشنی میں آ گئے اور تھوڑے ہی فاصلے پر ہوٹل انٹالکف تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس

سے معذرت کر لینی چاہیے کہیں یہ اپنی آس میں ہوٹل تک نہ چلی جائے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنی رفتار از خود بہت آہستہ کر لی اور قدم بہ روک روک کر چلنے لگی ہے۔ میں رک گیا اور وہ میرے مقابل کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کی شخصیت قابلِ اعتبار اور چہرے پر تو ابھی تک آوارگی کا کوئی رنگ نمایاں ہونے کے بجائے خوابوں کے بے تعبیر نکلنے کا تاسف تھا، ورنہ ایک پچھتاوا تھا غربت، احتیاج اور افلاس کا غبار تھا جو اس کے خدوخال پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے چھپا کر جیب سے پانچ پاؤنڈ کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ـــ اگر تم پسند کرو تو یہ قبول کر لو معذرت کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا ـــ میری طرف گھما کر دیکھتے ہوئے اس نے نوٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ تھینکس، فار یو آر سو کائنڈ ـــ اور نوٹ پرس میں ڈالا اور جانے کی اجازت مانگی۔ میں نے کچھ بولے بغیر سر ہلایا اور وہ جس گداز اور لرزیدہ آواز میں گڈ بائی کہہ کر سڑک عبور کر کے دوسری جانب کو چلی گئی گویا مجھے ایک اور عالم گم شدگی میں چھوڑ کر روانہ ہو گئی۔ میں نے سگریٹ نکالا، سلگایا پھر دوسرے پھر تیسرے سگریٹ کی راکھ اڑا کر وہیں کھڑے کھڑے سوچا اگر یہ خاتون کسی معتبر سیاق و سباق یا کسی روشن منظر میں یا کسی جزیرۂ جمالیات کے مقامات غمزہ و عشوہ و ادا پر مجھے ملی ہوتی تو میں اس کے لیے شاعری کرتے بھی نہ تھکتا، جیسے عشق آموزی کے لیے عاشق لوگ اپنی محبوباؤں کو میرے اشعار تحفے میں دیا کرتے!!

قارئین! مصور اسلم کمال ان کی تصویریں بنایا کرتا اور اس کے چہرے کے نقوش اور اس کے پیکر کے خطوط کے مطالعہ و مشاہدہ سے اپنی کوتاہی فن کا ازالہ کرتا رہتا!

◆◆◆

اسلم کمال ادب کی شان

مصور اسلم کمال کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پاکستان میں مصورانہ خطاطی کے بانی ہیں۔ آپ کی مصورانہ خدمات 50 سال پر محیط ہیں۔ آپ کثیر الجہات مصور ہیں۔ منفرد باکمال فن پارہ اسلم کمال کا وہ شاہکار ہے جو انھوں نے حال ہی میں [illegible] کیا ہے۔ اسلم کمال وہ خوش قسمت مصور ہیں جنھوں نے کلام اقبال کو مصوری کا نیا آہنگ دیا۔ کلام اقبال کی مصوری کی قدر افزائی میں ان کو کلام فیض مصور کرنے کی دعوت خود فیض احمد فیض نے دی۔ سال 2000ء میں اسلم کمال نے 20 ہزار سے زائد کتب و رسائل کے سرورق تخلیق کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ صدرِ پاکستان نے غیر ملکی سربراہوں اور اداروں کو اسلم کمال کے فن پاروں کے تحائف دیے۔ 1993ء میں انھیں "تمغۂ حسنِ کارکردگی" سے نوازا گیا۔ آپ کا ایک منفرد اعزاز یہ بھی ہے کہ آپ کی کلام اقبال کی مصوری اور مصورانہ خطاطی کی 4 نمائشوں کا افتتاح صدرِ پاکستان نے کیا۔ حال ہی میں ان کو حکومتِ پنجاب نے "پرائیڈ آف پنجاب" ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اسلم کمال پاکستان کے واحد مصور ہیں جو عالم انسانیت کی بہبود میں اپنا احساس پینٹنگ میں بیان کر کے ڈالتے ہیں اور عالمی امن و انصاف کو لاحق خطرات کے خلاف احتجاج بھی اپنے فن پارے کے ذریعے برسرِ عام ہیں۔

کارخانو بازار کا خفیہ گیٹ

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

کچھ عرصہ قبل اپنی فیملی کے ساتھ ٹریننگ کے لئے پشاور پہنچا تو وہاں کا ایک مقامی جگری دوست، جو بہت اچھے عہدے پر تھا، اپنی فیملی سمیت ہمیں چپلی کے تکے کھلانے کے بعد کارخانو بازار دکھانے لے گیا۔ عورتیں جب کسی بازار میں خریداری کے لیے جاتی ہیں تو شوہروں کے لئے یہ ایک صبر آزما اور حوصلہ شکن مرحلہ ہوتا ہے کیونکہ عورتوں نے ہر دکان میں داخل ہونا ہوتا ہے اور وہاں پڑی ہوئی ہر وہ چیز الٹ پلٹ کر دیکھنی ہوتی ہے جو انہوں نے نہیں خریدنی ہوتی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ قیمت بھی پوچھتی جاتی ہیں اور متعلقہ آئٹم پر بے لاگ و بے لحاظ تبصرہ و تنقید بھی کرتی جاتی ہیں جب کہ دکاندار بیچارہ آئیں بائیں کرتا ہوا کبھی کسی چیز کی خوبیاں گنوا رہا ہوتا ہے اور کبھی کسی شے کی نزاکتیں۔۔۔۔ اور پھر رسمی انداز سے مختلف دکانیں گھومنے کے بعد جب خواتین کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کیا خریدنا ہے تو بھاؤ تاؤ کا مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے جو بہت ہی کٹھن ہو کر اس قدر باریک بینی سے طے کیا جاتا ہے جیسے شملہ معاہدہ طے ہو رہا ہوتا ہے ہم ہماری بیگم ایسی نہیں ہیں، کم از کم اس دوسرے مرحلے یعنی قیمت کے سلسلے میں۔ (واضح رہے کہ یہ جھوٹ میں اپنی بیگم کے خوف سے لکھ رہا ہوں) اگر (یہاں "اگر" کا لفظ بہت اہم ہے کیونکہ انہیں مشکل سے ہی کوئی چیز پسند آتی ہے، خود میں انہیں بڑی مشکل سے پسند آیا تھا) انہیں کوئی چیز پسند آ جائے تو قیمت پوچھ کر فوراً مجھے اشارہ کر دیتی ہیں کہ ادا کر دیجئے۔

کارخانو بازار میں بھی ہمارے ساتھ یہی ہوا۔ خواتین اور بچے تو دکان کے اندر داخل ہو گئے اور میں دکان کے باہر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس "ادھر ادھر دیکھنے" سے میری کیا مراد ہے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ اس دکان والے نے باہر کی طرف برآمدے میں بہت عمدہ ہینڈ بیگ رکھے ہوئے ہیں۔ بحیثیت ادیب، دانشور و شاعر ہونے کے ناطے مجھے ہینڈ بیگ بہت پسند ہیں چنانچہ وقت گزاری کے لئے میں انہیں دیکھنے میں مصروف ہو گیا اور چمڑے کا ایک ہینڈ بیگ مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ میں اسے ہینڈل سے پکڑ کر ابھی تول ہی رہا تھا کہ بیگم مع تمام پارٹی کے باہر نکل آئیں۔۔۔۔ اور پھر عجلت کے باعث بے دھیانی میں اس ہینڈ بیگ سمیت میں گھر والوں کے ساتھ ہو لیا۔ دراصل میں ہر وقت ایک ہینڈ بیگ اپنے ساتھ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہوں اور یہ ایک طرح سے میرے وجود کا جزو لاینفک بن چکا ہے مگر اس روز چونکہ بیگم کے ساتھ شاپنگ پر جانا تھا اس لئے گھر سے چلتے وقت اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور میں لاشعوری طور پر اس نئے ہینڈ بیگ کو اپنا بیگ سمجھ کر ہاتھ میں اٹھائے پھرا۔ مالک کے علاوہ اس دکان میں چار پانچ ملازم اور بھی تھے مگر ان میں سے کسی نے یاد نہ کرایا اور مجھے تو خیر اس صورت حال کا شعور ہی نہیں تھا۔ بیگم مختلف دکانوں سے چیزیں خریدتی جا رہی تھیں اور ڈرائیور انہیں اٹھا اٹھا کر گاڑی بھرتا جا رہا تھا۔ بعد ازاں بھی میں یہی بریف کیس ہاتھ میں پکڑے کم از کم دو بار پوری پارٹی سمیت اسی دکان کے آگے سے گزرا ہوں گا مگر دکان والوں کو دھیان نہ آیا۔ چار پانچ گھنٹے کارخانو بازار میں گزارنے کے بعد ہم کار میں بیٹھے اور اسلام آباد واپس آ گئے۔ گھر آ کر بیگم نے جب سامان اندر رکھوایا تو اچانک اس ہینڈ بیگ کو دیکھ کر بولیں "یہ آپ نے کب خریدا؟" اب چونکہ میرے ہوش

کھلانے آ پہنچے تھے چنانچہ میں نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ہم دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ یہ تو دکاندار کے ساتھ بڑی زیادتی ہو گئی ہے حالانکہ اس نے ہمارے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا تھا مگر اب اس کی تلافی کیسے کی جائے؟ کہاں پشاور اور کہاں اسلام آباد۔ اچانک بیگم کچھ سوچ کر بولیں، ٹھہریے! میں بل دیکھتی ہوں اگر اس پر دکان دار کا فون درج ہے تو فون کر کے اس بیگ کی قیمت پوچھ لیتے ہیں اور اسے آن لائن پے منٹ کر دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے پرس کھولا تو اس میں سے رسید نکل آئی۔ میں نے فوراً فون ملایا اور ندامت بھرے لہجے میں سارا قصہ سنا کر ابھی قیمت پوچھی ہی تھی کہ آگے سے حاجی امین صاحب فرمانے لگے دیکھیں! آپ ایک مشہور و معروف شاعر اور ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ہم نے آپ کو پہچان لیا تھا اور اندر ہی اندر یہ دیکھ رہے تھے کہ آپ مختلف بیگوں کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے ہیں اور پھر جب آپ ایک بیگ اٹھا کر چل پڑے تو دل خوش ہو گیا کہ اتنے بڑے آدمی کے ہاتھ میں ہماری دکان کا بیگ ہے جو ہر وقت اس کے ساتھ رہے گا۔ قیمت شیمت کو چھوڑو۔ بس یہ ہمارے طرف سے آپ کے لیے تحفہ درویش ہے۔ قیمت لینی ہوتی تو اسی وقت آپ کو روک کر لے لیتے۔ میں نے مزید تھوڑی سی کوشش کی مگر خان صاحب نے ایک نہ سنی اور بولے ہم خاندانی لوگ ہیں اور آپ ایک شریف آدمی۔ ہمیں پتہ تھا کہ آپ دانستہ نہیں بلکہ شاعرانہ بے خیالی میں غلطی سے اسے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ میں حاجی امین گل آف کارخانو بازار کی اس گفتگو سے بے حد متاثر ہوا اور دوبارہ ان کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے لاہور کے بیٹے اور حاجی امین گل جیسے خاندانی لوگوں کی عظمت اجاگر کرنے کے لیے اپنے ایک پشاوری دوست کو فون کر کے حاجی صاحب کی گفتگو دہرائی تو وہ حضرت زور زور سے قہقہے لگانے لگا اور تھوڑی دیر بعد جب اس کی ہنسی رکی اور سانس بحال ہوا تو بولا! کوئی ماہر نفسیات کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو، ایک گونگے کا نفسیاتی تجزیہ نہیں کر سکتا۔ حاجی امین گل میرا پرانا واقف ہے اور ہمیشہ قاعدے کی بجائے فائدے کی بات کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آدمی تو ایک پیسے کا نہیں مگر اس کے پاس پیسہ بہت ہے۔ میرے اور آپ جیسے لوگ 8 کے ہندسے کی طرح ہوتے ہیں۔ کہ 8 سیدھا دیکھیں یا الٹا وہ 8 ہی رہتے ہیں لیکن حاجی امین گل جیسے لوگ 6 کے ہندسے کی طرح ہوتے ہیں، جنہیں الٹا دیکھیں تو 9 بن جاتے ہیں یعنی پھر بھی فائدے میں ہی رہتے ہیں۔ اس نے اسی وقت مجھ سے اس بیگ کے ساڑھے پانچ ہزار روپے بھروا لیے تھے یہ کہہ کر کہ وہ تمہارا دوست قیمت ادا کیے بغیر چپکے سے ہمارا بیگ اٹھا کر لے جا رہا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم پر میرا ابھی تو کوئی حق بنتا تھا۔ آخر تم میرے شہر میں آئے تھے چنانچہ اب اس بیگ کو میری طرف سے گفٹ سمجھو خیر گفت۔

◆◆◆

معروف شاعر، ادیب، طنز و مزاح نگار ڈاکٹر انعام الحق جاوید کی 16 ویں نئی کتاب

بل آخر

شائع ہو گئی ہے............ قیمت:- /600 روپے

ملنے کا پتہ: دوست پبلی کیشنز، سٹریٹ 1-9/215، اسلام آباد (051-902784-85)

فلمیریا

محمد پرویز کلیم

نوٹ : یہ یادداشت سچے کرداروں پر مشتمل ہے۔ صرف فرضی ناموں سے تحریر لکھی گئی ہے۔

جن خواتین و حضرات کو فلمیریا ہو جائے وہ فلم کا کردار بن کے جینے مرنے لگتے ہیں۔ چند کسی باتھ روم سنگر کی طرح چھپ کے گاتے ہیں، چند اپنی عام زندگی میں بھی فلموں کے گیت اور مکالمے مناسب یا غیر مناسب سچوایشن پہ دہراتے ہوئے انھیں ذرا شرم نہیں آتی۔ یہاں تک رہے سے ڈرتے ہیں کوئی سر پھرا لوٹ کے تو کسی فلمی سی ہیروئن یا ہیرو کی طرح زخمی ہو کر کسی فلاپ فلم کے زرے سے سین کے مکالمے اپنی بے سری آواز میں بولتے ہوئے سمع خراشی کا باعث بھی بنتے ہیں۔ چند فلمیریا کی مریض خواتین تو گدھوں جیسی آواز میں گیت بھی سناتی ہیں۔ ان کی مکروہ آواز سماعتوں کو زخمی کر دیتی ہے پر وہ احمق کبھی نہیں جان پاتی کہ اس کا لیک کر جھٹتے ہوئے بے سرا گانا اور سستی شاعری کسی کی جان بھی لے سکتی ہے۔ ایسے بکواس نیم فلمی دیوانے چھوٹے شہروں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ راقم کو یاد ہے فیصل آباد جو 40 برس قبل لائل پور کہلواتا تھا وہاں سے ایک لڑکا لاہور کے ایک نامور فلم سٹوڈیوز میں وارد ہوا تھا وہ شوٹنگ فلور کے باہر بیٹھے کسی بان پہ مشتمل چوکیدار کو کچھ رقم دے کر روزانہ اندر آتا۔ شوٹنگ دیکھتا یک ہام میں جونیئر آرٹسٹوں کو کھلایا جاتا۔ چھوٹے موٹے اداکاروں کو تھری کیسل پلیئر تھری کے سگریٹ آفر کر کے ان کے ساتھ فری ہونے کی کوشش کرتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تعلقات سٹوڈیوز کے متعلقہ لوگوں سے بڑھتے چلے گئے۔ جس دن وہ غیر حاضر ہوتا چند فلمی جونیئرز اسے بہت مس کرتے بلکہ سرگوشیوں میں گفتگو کرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے کہ وہ پیٹو بھیا آج نہیں آیا۔ ان دنوں مفت میں کھانے پانے والے کے لیے پیٹو کا کوڈ استعمال کیا جاتا تھا۔ نیم فلمی مفت بر حضرات میں سٹوڈیوز سے رائل پارک تک یہ کوڈ مروج تھا۔ پیٹو حضرات اندر سے ادھورے اداکار ہوا کرتے تھے پر وہ لوگ فلمی لوگوں میں بیٹھ کر بڑے اداکاروں کی پرفارمنس پہ بے ربط سا تبصرہ فرماتے تو ان کے پاس بیٹھ کر چائے و منسٹری کھانے والے داد دیتے واہ واہ کا بازار گرم کر کے یہ ثابت کرتے کہ ان سے زیادہ باریک اور سمجھدار وہ اداکار بھی نہیں جو زیر تبصرہ ہے۔ داد جب حد سے بڑھ جاتی تو پیٹو بھیا عاجزی کی اداکاری کرتا ہوا ہاتھ باندھ کر کہتا میں اس قابل نہیں یہ علم سب آپ استاد صاحبان کی مہربانی سے ملا ہے ورنہ یہ فن تو سمندر ہے۔

رائل پارک میکلوڈ روڈ پہ واقع تھا۔ فلم ڈسٹری بیوشن آفسز اور چند اداکاروں کی رہائش گاہ کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ چوک میں فرنٹ پہ چھوٹا پان شاپ کے سامنے ہر شام جونیئر اداکاروں کا میلہ لگ جاتا۔ شاہنواز جونیئر، حامد گجا، ایام منظور، علی اعجاز شوز اور ریحہ ریاض، ساون صاحب ان دنوں ساون صاحب ابھی کوئی ٹائٹل رول نہیں کر پائے تھے۔ ان اداکاروں کو دیکھ کر فلم بین حضرات اور راہ چلتے اکا دکا پیار لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ ناکام ہدایت کار اور نیم اداکار اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہو بچپن کا نعرہ بلند کرتے ہوئے کسی نہ کسی اداکار کی بغل میں ہاتھ ڈال کے اسے کنگ سرکل ریسٹورنٹ کے اندر لے جاتے۔ پیٹو حضرات بھی ان کے پیچھے لپکتے اور جو اداکار کے ساتھ بیٹھنے چپکنے سے ہدایت کار کے ساتھ اس طرح جھک کے ہاتھ ملاتے جیسے وہ کوئی پیر بابا ہے۔ وہ ہدایت کار کسی مرغے کی طرح گردن اکڑا کر دیکھتے ہوئے اداکار کو چائے کی آفر کرتا اور گفتگو میں ثابت کر لیتا کہ میں آپ کو لے کر اعلان کرتا تو آپ کے فن آپ کے پیچھے سے پہاڑ

دیتے۔ اس پر وہ جونیئر اداکار ایک خاص انداز میں اترا کے کہتا کہ یہ مشہور ہو جانا بھی ایک مصیبت ہے جبکہ سب اس کے محلے والے بھی پوری طرح نہیں جانتے تھے۔ میٹر بھیا فیصل کا مل اداکار تھا تو غیر معروف جونیئر اداکار کی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے میٹر کی شکل و صورت یاد کر لیتا۔ یہ 1972 کا دور تھا۔ راقم ان دنوں اسسٹنٹ ہدایت کار رہا کرتا تھا۔ اس حوالے سے سٹوڈیوز سے رائل پارک بھی گاہے گاہے آنا جانا ہو جاتا۔ کنگ سرکل ریسٹورنٹ میں ہر محفل میں ایک میٹر تابش ہوا کرتا جو ہر دو گھنٹے بعد ہاف سیٹ چائے نہ منگواتا تو ریسٹورنٹ کا مالک جو کہ میمن بچہ تھا وہ گڑ رہتا ہوا اپنی زبان میں مغلظات کا استعمال کثرت سے کرتے ہوئے ادھر ادھر گھومتا اپنی ڈیوٹی سمجھتا تھا۔ ہر محفل پر بیکار اداکار اور نیم ہدایت کار براجمان رہتے جو دن بھر بیٹھے بیکار فلمی باتوں کی دھول چاٹتے رہتے۔ چند ایک تو میٹر مستقل اپنا سیر کرنے کے لیے کوئی ایسی کہانی یا کوئی سین رو رو کے سناتے ہوئے اس قدر جذباتی ہو جاتے کہ میٹر کا گریبان پکڑ لیتے کہ اس کی آنکھیں بھر آ جاتیں۔ پھر اتنی زور سے میز پہ ہاتھ مارتے کہ ریسٹورنٹ کا مالک سیٹھ الہ دین کے جن کی طرح حاضر ہو جایا کرتا پھر سیٹھ غصے سے بولتا تو میز توڑ دے گا تو کل کو ادھر بیٹھے گا کس پہ۔ خود ہی دیہاڑی کو آرڈر دیتا ادھر چائے لگا دو، یہ چھوٹ میں دو گھنٹے سے یہ چوہدری بن کر رہا ہے۔ کنگ سرکل کی ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی لکھوں گا۔

ایک دن ہم نے مسلسل شوٹنگ دیکھنے والے میٹر سے پوچھا میاں تم روز ہی سے روز اسٹوڈیوز آتے ہو آخر ماجرا کیا ہے۔ اس نے مجھے اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے بتایا کہ اسے فلمیریا ہو گیا ہے۔ یہ الفاظ ان دنوں ہمارے لیے بہت نیا تھا۔ ہم نے پوچھا یہ فلمیریا کیا ہوتا ہے؟ تو موصوف نے بتایا کہ ملیریا کی طرح فلمیریا بھی ایک مرض ہے۔ ملیریا مچھر کاٹنے سے اور فلمیریا فلم کاٹنے سے ہوتا ہے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، نہاتے دھوتے جس کا اوڑھنا بچھونا فلم ہو جائے جو فلم کے ساتھ سوئے فلم کے ساتھ جاگے اسے فلمیریا کا مریض کہتے ہیں اور میں اس شعبے میں نمبر ون ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میری ماں کی میت گھر کے صحن میں رکھی تھی، تمام رشتے دار اور محلے دار وہاں موجود تھے۔ میں نے وہاں ایسی اداکاری کی کہ فیصل آباد والوں نے مجھے دلیپ کمار کہنا شروع کر دیا۔ جب میں نے ماں کی لاش کے پاس جا کر محلے کی ایک جوان لڑکی سے کہا کہ "یارو میری ماں مر گئی میری ماں مر گئی" جو دلیپ نے کیا رول ادا کیا تھا میں نے ایکسٹرا بار کر کے اس کا ریکارڈ توڑ دیا اور اس کے بعد لڑکی کے لواحقین نے مجھے توڑ پھوڑ کے رکھ دیا اور مجھے ولیس انکال کیا تو پھر میں فیصل آباد چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے سٹوڈیوز میں آ گیا۔ مجھے یقین ہے میں اداکار نہ بن سکا تو ایک اچھا ہدایت کار ضرور بن جاؤں گا۔ فلمیریا کے مریض لڑکیاں اس وقت بھی موجود تھیں اور آج بھی ہیں۔ بس وقت کے ساتھ تھوڑا انداز بدل گیا ہے۔ ٹی وی اور یوٹیوب پہ ہم بڑھ کر اور یوں انھیں دیکھ کر اس قدر عاشق مزاج ہو جاتی ہیں کہ راتوں کو بیڈ پہ لیٹے کے فلمی پوز بناتے دوستوں کو فون کر کہ ان کا جنون بن چکا ہے۔ روشنی کے اشتعال انگیز مکالمے از بر ہو چکے ہیں۔ شادی بیاہ ہو یا صف ماتم بھی ہو وہ اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے رہتی ہیں۔ ایک ہماری واقف کار بھی فلمیریا کی پرانی مریضہ ہے۔ 50 سال کی عمر ہو چکی پر اس کمبخت کے اندر کی ہیروئن نہیں مرتی۔ بات بات پہ فلمی گیتوں کا حوالہ دینا، سستے مکالمے بول کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ وہ صاحب علم ہے جبکہ وہ خاتون سر سے پیر تک جہالت کی وہ تصویر ہے جس پر ہر جاہل ناز کر سکتا ہے۔ ہیروئنز کی تصویریں دیکھ کر ان جیسا گیٹ اپ کرنا، حلیہ بنانا اور اپنے جیسے جاہل مردوں کے منہ سے بے جاب تعریفیں سن کر اتراتے ہوئے مزید حماقتیں کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اداکار محمد علی کا عاشق یہ عورت اس کے مرنے سے پہلے اس پر مرتی تھی۔ محمد علی پہ اس قدر فریفتہ تھی کہ اس کا دل چاہتا تھا وہ علی بھائی کے پہلو میں بیٹھی دنیا کی گردن مروڑ دے اور کسی بکرے دان میں پھینک دے پر اس کا بس نہیں چلتا۔ ایک دن اس نے

کمال کر دکھایا۔ دیا بیگم کے چہرے پر اپنا چہرہ کسی فوٹو شاپ پر سے لگوا کر اپنے جیسی بے ہودہ دوستوں کو دکھاتی اور کوئی منحوس گیت اپنی کوے جیسی آواز میں مسلسل گا گا کر سناتی رہتی وہ غیر مردوں کے درمیان بیٹھ کر اکثر فلمی اداکاروں کی باتیں کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہے۔ روز انہ ذبح ہوتے شوہروں کو ہر صبح مسیج کر کے ان کے جواب دینا ان سے اپنی گھٹیا آواز میں جنسی باتیں کرنا وہ معیوب نہیں سمجھتی۔ کسی بھی شادی میں رقص کے نام پر بے ہنگم ٹھمکے لگا کر اپنے اندر کی بیہودگی کی دل لگی کا سامان پیدا کر کے وہ اپنے حسن اخلاق کا حصہ جانتی ہے۔ وہ خود کو مجسم آزاد ریکھا اور مدیحہ شاہ و ماہرہ و موش حیات سے آگے کی اداکارہ مانتی ہے۔ اس پہ یہ کہنا کہ میں شریف زادی ہوں ورنہ ساری محفل میں نیک پروین کا روپ دھار کے جا بیٹھا کرتی ہے۔ ہر تہوار ہر ایونٹ پر دوپٹی ہاتھ آگے رکھتے ہوئے موقعے کی مناسبت سے ڈریس اپ ہو کر محلے گلی میں کسی جھلّی کی طرح ادھر سے ادھر چکر لگاتی ہے۔ کھوپڑی اس قدر احمق ہے کہ عقل کے پردے ہٹا لی جائے تو وہ آڑا دیتی ہے۔ کوئی شخص اس کے سامنے روزے نماز کا ذکر کرے تو وہ اپنا مخصوص جملہ دہراتی ہے کہ آپ کی عادات مجھ پہ لگی ہیں میں بھی پورے روزے رکھتی ہوں کوئی نذر نیاز کی بات کرے تو اپنی حماقت کی پوری توانائی کو اپنے لہجے میں سمیٹ کر گھمبیر آواز میں کہتی ہے کہ انیسویں روزے والے دن ہم نے دو پہر میں ہی دیگوں کے منہ کھول کر لوگوں کو نیاز کھلا دی تھی جو یہ بات سنتا ہے اس کا منہ پہلے کھلا رہ جاتا ہے۔ ذرا سوچیے روزے میں دو پہر کی نیاز کون دیتا ہے۔ ایک دن وہ ایک لکھاری کی کتاب پہ تبصرہ کرتے ہوئے بولی آپ کی تحریر عصمت چغتائی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ لکھاری نے پوچھا آپ نے عصمت چغتائی کا لکھا کیا پڑھا ہے وہ الو کی طرح آنکھیں جھپکے کے بولیں میں نے اس کی کوئی کتاب نہیں پڑھی بس لوگوں سے اس کے بارے سنا ہے۔ لکھاری کا جی چاہتا کہ وہ اپنے سر میں ان گنت جوتے مارے اور گنتی بھول جائے۔

ظلمیر یے کی شکار یہ گدھی لوگوں سے اکثر پوچھتی ہے کہ پنجاب میں بھی سمندر ہے۔ بد بخت قل کے ختم شریف کو نیاز شریف کہہ کر سامنے والے کو بال نوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ حکومت نے لاک ڈاؤن میں نرمی کرتے ہوئے سینما شادی ہال تھیٹر کھولنے کا اعلان کیا تو مس ظلمیر یا نے انتہائی سوچ بچار کے بعد یہ تجزیہ پیش کیا کہ محرم کی آمد کی وجہ سے یہ چھوٹ ملی ہے۔ ظلمیر یے کے مریض اکثر سائیکو ہو جاتے ہیں۔ اس لیے زندگی کو ظلم سمجھ کر گزارنے والے حقیقت اور واقعے قبل سے وہ خوابوں خیالوں کی دھند میں چلتے چلتے پاگل خانے تک جا پہنچتے ہیں اور وہی ان کا آخری ٹھکانہ بن جاتا ہے میرا لفیس میری لیک سے۔

◆◆◆

محبت اور خواہش

وہ محبت ہوتی نہیں جو فتح ہو جائے وہ خواہش ہوتی ہے جو ختم ہو جائے۔ محبت بدلتی بھی نہیں ہے خواہش بدلتی ہے۔ لوگ محبت اور خواہش کو مکس کر دیتے ہیں۔ جو بدل جائے وہ خواہش ہے جو رہ جائے وہ محبت ہے اور محبت سدا بہار ہوتی ہے۔ یہ External Lasting ہوتی ہے۔ یہ مستقل ہوتی ہے۔ یہ بدلتی نہیں۔ محبت اصلی بات ہے روح کی کوالٹی ہے۔ جب جسم نہیں تھی روح تب بھی تھی، جسم نہیں ہوگا روح تب بھی ہوگی۔

وہ جو اجنبی نہیں تھا...... اظہر جاوید

اسلام عظمی

وقت کا دریا بہتا چلا جاتا ہے۔ انسانوں میں سے کوئی اس بہاؤ کے ساتھ رہ کر آسودہ رہتا ہے اور کوئی مخالف سمت میں بہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ شہر بھی وقت دریا کے بہاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انھیں ان کی روایات زندہ رکھتی ہیں۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ آج کون آیا اور کون اسے چھوڑ گیا۔ لاہور کی شہرت اس کی روایات سے تھی۔ یہ آنے والوں کو اپنے سحر میں اسیر کر لیتا۔ اس کی اسیری میں آنے والے بہت سے ایسے لوگ بھی تھے، جو لاہور کی پہچان بن گئے۔ ان میں ایک مرحوم اظہر جاوید بھی تھے جو لاہور میں آئے اور پھر اس کی پہچان بن گئے۔ لاہور کے نمایاں ادبی پرچوں میں سے ایک ''تخلیق'' تھا اور ہے۔

1970ء کا کوئی دن تھا۔ میں لاہور میں نو وارد تھا اور اجنبی بھی۔ لکھاریوں کی تصویریں اخبارات میں نہیں چھپتی تھیں، ان کی پہچان ان کی تحریریں تھیں یا ان کے رسالے۔ کم و بیش سبھی ادبی پرچے برسوں سے میرے زیرِ مطالعہ تھے۔ کوئی ادبی شخصیت مجھ سے چھپی نہ تھی۔ ساتھ ہی لکھنے کا شوق بھی تھا۔ جو لکھتا تو بذریعہ ڈاک کسی مناسب ادبی پرچے کو بھیج دیتا۔ میرا لکھا چھپ جاتا، میرے لیے یہی کافی تھا۔ پھر ہوا یوں کہ میں میکلوڈ روڈ سے گزر رہا تھا۔ رٹز ہال روڈ کی طرف تھا۔ دائیں طرف دو منزلہ مکانات تھے اور ٹمپل بنک ان کے پیچھے۔ ایک دو منزلہ عمارت کی سیڑھیوں کے ساتھ ''تخلیق'' کا بورڈ لگا تھا اور میں ''تخلیق'' کا قاری تھا۔

''سامنے آ ہی گیا ہے تو تخلیق کا دفتر کیوں نہ دیکھ لیا جائے''۔۔۔ خواہش جاگی اور میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بڑے میز والی کرسی خالی تھی اور اس کے سامنے ایک دبلے، دراز قد شخص کسی دوسرے شخص سے محوِ گفتگو تھا۔ ''اظہر جاوید صاحب کہاں ہیں؟''۔۔۔ قدرے تذبذب کے بعد میں نے پوچھ لیا۔

پاؤں پھیلائے شخص نے فوراً جواب دیا ''میں ہی اظہر جاوید ہوں، فرمایئے؟''

''تخلیق کے لیے ایک افسانہ دینا ہے''۔۔۔ اتفاقاً ایک افسانہ میرے پاس موجود تھا۔

''تو دے دیجیے''۔۔۔ میں نے افسانہ ان کے حوالے کیا اور الٹے پاؤں سیڑھیاں اتر آیا۔ روکا انھوں نے بھی نہیں کہ بڑے شہروں میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اگلے ماہ وہ افسانہ چھپ گیا اور مجھے ''تخلیق'' کا شمارہ بذریعہ ڈاک مل گیا۔

ادبی لوگوں سے ملاقات کا شوق مجھے اس لیے بھی نہ تھا کہ دفتر میں اچھا ادبی ذوق رکھنے والے کئی ساتھی تھے۔ افسانہ لکھتا تو انھیں سنا کر اور ان کی داد وصول کر کے میرا 'ٹھرک' پورا ہو جاتا۔ کئی برس بعد ادبی حلقوں میں جانا شروع کیا تو اظہر جاوید سے پھر ملاقات ہوگی۔ پوچھنے لگے ''اسلام عظمی افسانہ چھپنے کے بعد پھر تخلیق کے دفتر کیوں نہیں آئے؟''۔۔۔ پھر یاد دلایا کہ انھوں ہی نے میرا افسانہ چھاپا تھا۔

''ملنے ملانے کی مجھے عادت نہیں۔ لیکن تخلیق کے دفتر کسی روز ضرور حاضری دوں گا۔''

ادبی حلقوں سے روشناس ہونے کے بعد بھی تخلیق میں میرے افسانے چھپے۔ کب؟ افسانوں کے نام کیا تھے؟ اب یاد نہیں۔ شفیق سلیمی نے "اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے" والی غزل کہی تو سوال اٹھا کہ اسے کہاں چھپوایا جائے؟ "تخلیق" کا نام فائنل ہوا اور شاہد شیدائی اور شفیق سلیمی کی معیت میں میں بھی تخلیق کے دفتر میں حاضر ہوا۔ شفیق سلیمی کی کسی ادبی پرچے میں شائع ہونے والی یہ پہلی غزل تھی۔ شاہد شیدائی نے اس غزل کو اس سال کی غزلوں کے انتخاب میں بحوالہ "تخلیق" شامل کیا۔ اور یوں میں تخلیق کے بھگوان داس سٹریٹ والے دفتر میں گاہے بگاہے جانے لگا۔

وہ دور تخلیق، اوراق اور فنون کا دور تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ان پرچوں کے مدیر اظہر جاوید، ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کچے شیشے لہو کے نہیں تھے۔ چار پانچ سال تخلیق میں حاضری ہوتی رہی۔ پھر میں دبئی جا پہنچا اور اگلے سال شفیق سلیمی بھی۔ پنجابی کا ایک اکھان "کھلن گیا تے کھٹ کے لیایا" کے مطابق ہم وہیں سے ایک عرب شاعر ڈاکٹر زبیر فاروق کو لائے۔ ڈاکٹر زبیر فاروق پاکستان آیا تو کہنے لگا کہ تخلیق کے دفتر جا کر سونان اظہر سے ملنا ہے۔ کیوں کہ گراؤنڈ پہنچے تو سونان اظہر سے فون کر کے رہنمائی چاہی اور اس نے ایک موٹر سائیکل سوار کو رہنمائی کے لیے بھیج دیا کہ گھڑ سوار بھیجنے کا زمانہ لد چکا تھا۔ سونان اظہر کو پہلی بار دیکھا تو اظہر جاوید کی صورت سامنے آ گئی۔ جیسا باپ ویسا بیٹا۔ تخلیق کے دفتر میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ سرفراز سید، تسنیم کوثر اور آفتاب خان وہاں پہلے سے موجود تھے۔ پھر حسین مجروح بھی آ گئے۔ جنگل میں منگل کی طرح تخلیق کے دفتر میں ادبی محفل جم گئی۔

متحدہ عرب امارات سے سال کے سال چھٹی پر آتا تو بھگوان داس سٹریٹ میں تخلیق کے دفتر میں حاضری ضرور دیتا۔ سدا کے ہنس مکھ اظہر جاوید کے چہرے کی اپنائیت / سونان کو آواز / چائے کا آنا / چائے پینا / آج کل کیا ہو رہا ہے / وغیرہ وغیرہ پوچھنا ـــ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔

اچھا وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے مگر پتھر پر لکیر کی طرح اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ گزرے دن یاد آتے ہیں تو دل میں اک ہول سا اٹھتا ہے۔ میل ملاپ کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر وزیر آغا سے کبھی نہیں ملا مگر اوراق میں چھپا۔ احمد ندیم قاسمی کی شخصیت بزرگانہ تھی مگر انھوں نے چار لوگوں کی چار پانچ غزلیں ایک ساتھ الگ گوشے میں شائع کر کے مجھے شاعر بھی بنا دیا۔ (غالباً) ایوب خاور، شفیق سلیمی اور عباس تابش کے ساتھ چوتھا میں تھا۔ اظہر جاوید کچھ کچھ میرے ہم عمر تھے۔ ان سے کوئی قریبی تعلق نہ ہونے کے باوجود کبھی اجنبیت محسوس نہ کی۔ وہ دور بھی اچھا تھا اور لوگ بھی اچھے۔ ادبی رسالے کی پرورش جان جوکھوں کا کام ہے۔ باپ کی طرح بیٹا سونان اظہر بھی تخلیق کی پرورش کر رہا ہے۔ یہ کام کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ مجھے بھی ہے۔ پاکستان واپسی کے بعد "عظمیٰ پبلیکیشنز" کے نام سے ادارہ بنایا۔ اور پھر ایک اخباری انٹرویو میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "ادبی پبلشنگ سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔" سوچتا ہوں کہ ادبی پرچا چھاپنے والے کس طرح یہ مشکل مرحلے طے کرتے ہیں۔ ادبی پرچے کی اشاعت کوہ کنی سے کہیں مشکل ہے۔ وہاں تو مزدور آتے جاتے رہتے ہیں اور یہاں ہر جانے والا شاعر اور ادیب من موجی۔ "انا" بھرے غبارے ـــ "میں ہی میں" کے پجاری۔

اے اظہر جاوید! تو بہت یاد آتا ہے۔ تیرا چہرہ مسکراتا رہتا تھا۔ گلے شکوے ہوتے ہیں مگر میں نے کبھی تیری زبان سے کسی کا گلہ شکوہ نہیں سنا۔ کمبل کی طرح شائستہ۔ میرا دوسرا افسانوی مجموعہ "بہت پرانی کہانی" چھپا تو چند دوست شیراز میں جمع ہو گئے۔ اظہر جاوید کو

بھی ان میں تھا۔ چھٹی ختم ہونے کے بعد واپس چلے جانے کے بعد قائم نقوی نے اطلاع دی کہ اظہر جاوید نے امروز میں "بہت پرانی کہانی" بارے کالم لکھا ہے اور میں نے وہ تمہارے لیے سنبھال لیا ہے۔ آپ بھی لطف لیجیے۔

19 اگست 1990ء شیزان لاہور میں میرے یعنی اسلام عظمی کے افسانوی مجموعے "بہت پرانی کہانی" کے سلسلے میں ایک غیر رسمی تقریب منعقد ہوئی جس کے صدر احمد ندیم قاسمی تھے۔ بہت سے شاعروں ادیبوں اور پرتو روہیلہ نے خصوصی طور پر شرکت کی۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال اظہر جاوید نے "امروز" میں اپنے کالم مستقل محفل میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"بہت پرانی کہانی تو یہ ہے کہ پہلے جب — پہلے جب سے مراد صدیوں پہلے کی بات ہے کہ لوگ سفر سے واپس آیا کرتے تھے تو اپنے ساتھ قسم قسم کی کہانیاں اور رنگا رنگ قصے لاتے تھے، ہماری کئی لوک کہانیاں ایسی ہیں جو یہاں بھی اسی طرح سنائی جاتی ہیں جیسے مشرقی یورپ کے کسی دور افتادہ علاقے میں — میں نے وہاں کی ایک لوک کہانی پڑھی تھی وہ بالکل ویسی تھی جیسے کہ میں نے اپنے بچپن میں سنی تھی۔ یہ لوک کہانیاں بھی سیاحوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بہت کچھ بدل گیا مگر یہ روایت نہیں بدلی۔ باہر سے آنے والے مسافر کہانیاں اب بھی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اب یہ سیدھی سیدھی نہیں چلتیں کتابوں میں شامل ہو کر زندہ رہتی ہیں۔ پاکستان سے باہر جو لوگ روٹی روزگار کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں وہ وہاں پیسہ ہی نہیں کماتے اپنا نام بھی زندہ رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کوئی دو تین سال پہلے ادھر تک جرمنی سے سلمیٰ جبیں آیا کرتی تھی۔ وہ یہاں کی کہانیاں چھوڑ جاتی اور وہاں جا کر نئی نئی کہانیاں تخلیق کرتی۔ ساجدہ ہاشمی نے سلمیٰ کو اپنے ایک ناولٹ کا کردار بنایا تھا۔ تبسم کاشمیری جاپان سے ایک نئی کتاب تیار کر کے آتا ہے۔ پہلے ایک نظم لوح تخلیق کیا — "لوح تخت لاہور ہے" اور اب اپنی نظموں کا مجموعہ پاکستان میں اپنے دوستوں کو دے کر گیا ہے۔ کتاب کا نام یاد نہیں کیونکہ تبسم کاشمیری کے دوستوں میں اب میرا نام نہیں رہا۔ اختر حسین شیخ بھی جب آئے تو کتاب چھاپ کر واپس گئے یا ان کے آنے اور جانے کے بعد ایک کتاب چھپ گئی۔ اب وہ (کچھ عرصے کے لیے) مستقلاً لاہور آ گئے ہیں اور چار کتابوں کو بیک وقت چھاپنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ یہ نظمیں غزلیں بھی تو کہانیاں ہوتی ہیں مگر اب کے جب اسلام عظمی عرب امارات سے آیا تو اپنے افسانوں (کہانیوں) کی کتاب "بہت پرانی کہانی" کا تحفہ ساتھ لایا ہے۔ دو ایک برس پہلے وہ آیا تھا تو اس کے افسانوں کا مجموعہ "جوگ اور جوگ" کے نام سے چھپ کر آیا تھا۔ وہ شاعری بھی کرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اگلے پھیرے میں شعری مجموعے کی اشاعت کی خبر سنائے گا۔ ان کتابوں سے پہلے وہ ابوظہبی میں مقیم اردو شعرا کا کلام "ریت اور شبنم" کے عنوان سے مرتب کر چکا ہے۔ چند روز قبل قائم نقوی نے حسب معمول اور حسب عادت بہت کم وقفے کے نوٹس پر دوستوں کو شیزان میں اکٹھا کیا کہ اسلام عظمی اپنی کتاب دوستوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد تقریب تھی جس میں نہ کوئی مضمون پڑھا گیا نہ تقریر ہوئی — رسمی طور پر اس تقریب کے صدر احمد ندیم قاسمی اور مہمان خصوصی پرتو روہیلہ تھے۔

وہیں بیٹھے بیٹھے پرتو روہیلہ نے اسلام عظمی اور احمد ندیم قاسمی سے (تقریباً) سوال کیا کہ اس کتاب "بہت پرانی کہانی" کا موضوع کیا ہے کیا وطن سے دوری اور مجبوری کی کوئی گونج ہے؟ ندیم صاحب نے مختصر لفظوں میں جس خوبصورتی سے کہانیوں اور مصنف کے مزاج کے بارے میں بتایا، اسلام عظمی نے اس کتاب کا جو مختصر سا ابتدائیہ لکھا ہے اسے حاصل مطالعہ کہنا چاہیے۔

کہانی بہت پرانی: گھڑا جس کی تہہ میں تھوڑا سا پانی ۔۔۔ اور پیاسا کوا۔ میں اپنے بچوں کو یہ کہانی یاد دلا کر انہیں عصری صداقتوں سے روشناس کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ پیاسے کوے والی کہانی اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب جو کوئی بھی محنت کرتا تھا اس کا اجر پاتا تھا۔ مگر آج کا دور مختلف ہے۔ آج کا انسان بھی محنت کرتا ہے مگر اس کا صلہ نہیں پاتا اور آج کے ایک لکھنے والے نے اس کہانی کو یوں لکھا ہے۔

”ایک کوا بہت پیاسا تھا اور پانی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اچانک اسے ایک گھڑا نظر آیا۔ وہ لپک کر اس کی طرف گیا مگر یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ گھڑے میں پانی بہت کم ہے اور پیندے کا پانی اس کی رسائی سے بہت دور ہے۔ اس نے پیاسے کوے والی کہانی سن رکھی تھی۔ چنانچہ اس نے پیاسے کوے کی کہانی کی طرح بکھرے ہوئے ٹیلے پر پڑی ہوئی کنکریاں لا لا کر گھڑے میں ڈالنا شروع کر دیں۔ گھڑا کنکریوں سے بھر گیا مگر پانی اوپر نہیں آیا کیونکہ کنکریاں بھی پیاسی تھیں۔ وہ سارے کا سارا پانی جذب کر گئیں اور یوں کوا جو پہلے ہی پیاس سے نڈھال تھا بہت زیادہ محنت کی تاب نہ لا کر مر گیا۔“

میرا بڑا بیٹا کاشف جس کی عمر اس وقت بمشکل گیارہ سال تھی ہنس کر کہنے لگا: ”بیوقوف تھا کوا۔ اسے اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ سٹرا (Straw) لے آتا اور کسی دشواری کے بغیر پانی پی لیتا۔“

جب مجھے احساس ہوا کہ میں جو عصری صداقتوں کی بات کر رہا ہوں خود ان سے کتنا بے خبر ہوں۔ یہ کہانی اس دور میں لکھی گئی تھی جب محنت کا پھل ضرور ملتا تھا۔ سادگی سے زندگی بسر کرنے والا معمولی ملازم بھی ریٹائرمنٹ کے بعد آسودہ زندگی گزار سکتا ہے۔ میں نے وہ کہانی پڑھی اور اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ سٹرا سے پانی پینے والی نسل آسائشوں میں زندگی بسر کر رہی ہے اور محنت کی عظمت سے ناآشنا ہے۔ میری نسل نے اکثر جو کمایا اسے امر بیل ہڑپ کر گئی۔ روایتیں اور قدریں آتی پیڑھی سے ٹوٹ رہی ہیں کہ جیسے دم توڑ رہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والے لمحے کب اور کیسے رنگ بدل جائے۔ کہانیاں بدلتی رہتی ہیں۔ کہانیاں سننے سنانے اور پڑھنے کا دور لگتا ہے کہ گزر چکا۔ پھر بھی کہانی لکھنے کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ ہم جو خواب مسافر ہیں۔ ہمیں اپنے خواب لکھنے دو ۔۔۔ خواب نہ ہوں تو آنکھیں کس کام کی!

اس کہانی کو پڑھنے کے بعد قاسم نقوی نے ”ایک باشعور افسانہ نگار“ کے عنوان سے دیباچہ لکھا ہے۔ اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی اچھی کہانیاں موجود ہیں۔“

اپنے بابا اظہر جاوید کی یاد میں ”تخلیق“ کو جاری رکھنے کی کاوش میری تعریف کی محتاج نہیں۔ یہ تو ایسا جادو ہے جو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ برسوں بعد پھر سے تخلیق کا ازسرِنو اجرا ہوا تو مجھے محض تین چار پرچے ہی مل پائے۔ پھر ایک دوست نے پرکھ مارکیٹ میں واقع پوسٹ آفس میں جا کر شکایت کرنے کو کہا تو معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ حتیٰ کہ سونان اظہر کے یکے بعد دیگرے بھیجے ہوئے دو اعزازی پرچے بھی مل گئے۔

ہاں تو شکریہ۔ تخلیق کی خریداری کا چندہ ادا کر دیا ہے۔ اعزازی پرچا لے تو دو تین شکلوں میں یہ مضمون لکھ ڈالا ہے۔ مگر یہ طے نہیں کر پا رہا ہوں کہ میرا یہ مضمون شکریے کا خط ہے یا کچھ اور۔ تاہم یہ میری آنے والی کتاب ”دیارِ دوستاں“ کا حصہ ضرور بنے گا۔

سونان اظہر ۔۔۔ Well done boy

◆◆◆

لاہور جو ایک شہر تھا

عادل لاہوری

نوٹ: ''تخلیق'' نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ تاریخ کے شعبے کے ایک نئے لکھاری کو متعارف کروایا جا رہا ہے۔ امید ہے اس کاوش کو میرٹ پر دیکھا جائے گا۔

ابھی کچھ لمحے پہلے موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ میں نے بائیک نکالی اور لمبے روٹ پر نکل پڑا۔ سب سے پہلے میاں میر دربار پر حاضری دی پھر میاں میر قبرستان گیا اور اس کے بعد دھرم پورہ کے علاقے اور پھر اندرون شہر تقریباً آدھے لاہور کا چکر لگایا۔ میاں میر کے دربار پر جو سکون ہے اور جو پراسراریت ہے مجھے وہ لاہور کے دوسرے درباروں میں نصیب نہیں۔ کورونا کی سختی کی وجہ سے عام بندوں کا داخلہ منع ہے جبکہ خاص بندوں کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس لیے اندر کی تصاویر نہیں بنا سکا۔ میاں میر دربار کے اندر داخل ہوتے ساتھ ہی مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں چار سو سال پرانے عرصے میں چلا گیا ہوں۔ خاص طور پر یہ درخت ہمیشہ ہی سے مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مسجد میں اکلاول پتھر مجھے دارا شکوہ کی یاد دلاتا ہے۔

میاں میر سیہون میں پیدا ہوئے، ان کا اصل نام میر محمد تھا۔ وہ آگے چل کر اسلام اور سکھ مت کی ہم آہنگی کی علامت بن گئے۔ آج بھی سکھ مت کے پیروکار قلندری گدی کے اس بزرگ سے اپنے گروؤں جتنی عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ اکبر بادشاہ کے دور میں 25 سال کی عمر میں میاں میر نے سیہون کو خیر باد کہا تھا، پھر جہانگیر کی ان سے عقیدت مندی رہی، شاہ جہاں تو اکثر ان کی سلامی پر آیا کرتے تھے۔ شاہ جہاں کے بڑے بیٹے دارا شکوہ تو میاں میر کے روحانی اثر سے بھی فیض یاب ہوئے۔ سکھ مت کے پانچویں گرو ارجن دیو جی کی ان سے اتنی محبت و عقیدت تھی کہ اکثر ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ گرو ارجن دیو نے ہی میاں میر سے متاثر ہو کر ان سے امرتسر میں ہرمندر صاحب کا سنگ بنیاد رکھنے کی درخواست کی تھی، جو میاں میر نے قبول کی اور گولڈن ٹیمپل کی جگہ چار اینٹیں رکھ کر اس مذہبی عبادت گاہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ یہ سکھ مت کے پیروکاروں کی محبت اور عقیدت کا تقاضا ہے کہ آج بھی لاہور میں میاں میر کے سالانہ عرس پر مسلمانوں کے ساتھ سکھ یاتری بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

میاں میر کا مقبرہ بھی گولڈن ٹیمپل کی طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ چاروں اطراف مسجد، بیٹھک، مدرسہ اور قبرستان ہیں جبکہ بیچ میں مزار ہے۔ پہلے یہاں بہت رونق رہتی تھی۔ مزار ہر ___ کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اب تو جیسے ہی میاں میر مزار کی گلی میں داخل ہوتے ہیں تو خادمین میاں میر دربار اور المعروف قبضہ گروپ کی دیواروں پر تصویریں ایسی چسپاں ہوتی ہیں جیسے یہ دربار ان ہی کی وجہ سے موجود ہے ورنہ وہاں بھی مکانات بن جاتے۔ افسوس یہ وہ میاں میر ہیں جنھوں نے جہانگیر سے تحفے لینے سے انکار کیا تھا، شاہ جہاں میاں میر کی اجازت کے بغیر ان کی خانقاہ میں داخل نہیں ہو پاتا تھا، لیکن ارجن دیو پر مغلیہ دور میں ہوئے مظالم کو دیکھ کر میاں میر نے یہ پیشکش کی کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی جان بخشی کے لیے مغل بادشاہ سے بات کروں لیکن ارجن دیو نے کہا کہ میں رضا پر راضی ہوں۔ مجھے کچھ نہیں

چاہیے میرے بیٹے کی بخشش کے لیے کچھ کریں۔

ارجن دیو کے بیٹے گرو ہرگوبند سنگھ اپنی جوانی میں میاں میر صاحب کے پاس آتے رہے۔ اس کے بعد پھر ہرگوبند کے بیٹے تیغ بہادر کی بھی بچپن میں میاں میر سے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اس طرح میاں میر اور ارجن دیو کی تین پشتوں کی تعلق داری بھی سکھ مت کے پیروکاروں کی میاں میر سے عقیدت مندی کا سبب ہے۔ لاہور کا ایک بہت ہی مشہور ہندو حلوائی، جوہری جھجو رام اس کی دیانت داری بلخ و بخارا میں مشہور تھی۔ میاں میر کا مرید خاص تھا۔ دنیاداری کو ترک کیا شہر سے باہر جہاں آج میو ہسپتال ہے اپنے لیے ایک اونچا چوبارہ تعمیر کروایا اور وہاں بیٹھ کر لوگوں کی خدمت کرنے لگا۔ اب وہ جھجو رام سے جھجو بھگت بن چکا تھا جس کی سخاوت کے چرچے بلخ و بخارا میں مشہور تھے۔ جو سکھ جھجو کے چوبارے میں دفن بخارا میں۔

داراشکوہ نے اپنی کتاب "سکینۃ الاولیاء" میں میاں میر کے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔ داراشکوہ کو حضرت میاں میر بالا پیر سے اتنی عقیدت تھی کہ داراشکوہ لاہور کا گورنر ہوا تو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد دہلی دروازے سے نکل کر روزانہ ننگے پاؤں چلتا میاں میر صاحب کے مزار پر حاضری دیتا۔ اس نے خصوصی طور پر راجپوتانہ سے سنگ سرخ منگوایا تاکہ دہلی دروازے سے مزار تک ایک راستہ تعمیر کیا جا سکے اور اس کے گرد خوبصورت باغ لگائے جائیں لیکن چھوٹا بھائی زیادہ طاقت ور تھا۔ اورنگ زیب نے اسے قتل کروا دیا اور خود تخت شاہی پر قابض ہو گیا۔ ابن انشاء کی "اردو کی آخری کتاب" کا وہ فقرہ یاد آتا ہے کہ بچو اورنگ زیب نہایت دین دار اور پارسا بادشاہ تھا۔ اس نے ساری عمر کوئی نماز نہیں چھوڑی اور نہ کوئی بھائی۔ اسی سنگ سرخ سے اس نے بادشاہی مسجد تعمیر کی لیکن میاں میر صاحب کے مزار کو بھی مکمل کیا۔ آج بھی آپ مزار کے احاطے میں جو قدیم مسجد ہے وہاں کچھ مقامات پر وہی سنگ سرخ دیکھ سکتے ہیں چنانچہ جن پتھروں پر چلتا شہزادہ داراشکوہ ہر صبح اپنے مرشد کی قبر پر حاضر ہوتا تھا انہی پتھروں سے اورنگ زیب کی بادشاہی مسجد پر چلتا ہے۔ وہ لال پتھر قبر پر جاتا تھا یہی لال پتھر مسجد کی طرف جاتا ہے۔ میاں میر میں جمعرات کی رونقیں مجھ کو آج بھی یاد ہے۔ شام ڈھلے قوالی والے آ بیٹھتے تھے۔ رات گئے تک قوالیاں ہی چلتی تھیں۔ کیا خوبصورت سماں تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں اور خاص طور پر چودھویں کی رات تو ایک الگ ہی سماں ہوتا تھا۔ خاص طور پر جب رات کی تاریکی میں ریل گاڑی میرگ اپنی سیٹی بجاتی ہوئی گزرتی ہے تو میں پرانے دور میں واپس چلا جاتا ہوں۔ اس درخت کو دیکھ کر مجھے وہ پرانی باتیں یاد آ گئیں اب نہ وہ لوگ رہے نہ وہ رونق رہی اور نہ وہ ہواؤں میں تازگی رہی۔

◆◆◆

معروف تنقید نگار، تاریخ دان، کالم نگار، ادیب، شاعرہ ڈاکٹر ناظر شہزادی کی کل 21 کتابیں آ چکی ہیں

ان کا نیا ناول **مکلی میر مرگ**

شائع ہو گیا ہے..........قیمت:-/450 روپے

ملنے کا پتہ: بک سٹریٹ، 68۔ مرگ روڈ، لاہور (فون: 042-36307550)

طنز و مزاح

ڈاکٹر بدر منیر

ماراہوا ہے

کوئی ماضی کا کوئی حال کا مارا ہوا ہے
کوئی فردا کے استقبال کا مارا ہوا ہے

بھلا محبوب پہلے سے کرے کیوں قربتِ طلسمی
تنے دیکھو وہی حسنِ کمال کا مارا ہوا ہے

حقائق کی طرف آنا بہت مشکل ہے اس کا
جو بندہ قیس کی کی دال کا مارا ہوا ہے

ہٹے جو آ کے یہ سے یہ بجلی بار لے
یہ دل اپنے ہی خد و خال کا مارا ہوا ہے

ضمیر اپنی سیاست کا کبھی زندہ تھا لیکن
نہ جانے اب یہ کتنے سال کا مارا ہوا ہے

OOO

ڈاکٹر بدر منیر

دھوکے میں

تیرا مشکل میں 100 سے آسانی کے دھوکے میں
اب ڈاکٹر سے آئے ہیں اجالی کے دھوکے میں

عقد کے بعد بہت تھوڑی مدت میں یہ احساس ہوا
گھر والی وہ لے آئے ہیں جاپانی کے دھوکے میں

ہر محلے کے وارڈ والا سیدھا کر کے بھاگ گیا
ان کے ہم کو مارے گھاوڑ ساتھی کے دھوکے میں

میرا یہ بطالا بھی سوشل ہو لیکن اتنا دھیان رہے
آنکھ پہ پٹی بندھ جاتی ہے عریانی کے دھوکے میں

دل کا چچا سیاست والوں کے دیکھے تو یہ راز کھلا
ایک مرب کے پیچھے ہو گئے ہمسائی کے دھوکے میں

OOO

ڈاکٹر بدر منیر

توبہ

تیری اندھی کمائیاں توبہ
ہاتھ کی ہیں صفائیاں توبہ
روز و شب مجھ سے ہیں انوار
چمن میں بھی رسوائیاں توبہ

شاعروں کی لڑائیاں توبہ
شعر میں تو ہنسائیاں توبہ
سامنے شاعر ہے بیٹا باقی
آدمی ہیں ہنسائیاں توبہ

ساتھیوں کی دہائیاں توبہ
افسروں کی ملائیاں توبہ
کچھ میں جو گرگٹ ہیں ان کی
منتی منتی مٹھائیاں توبہ

حسن کی کج ادائیاں توبہ
ایک پہ جلوہ نمائیاں توبہ
شعر ہے وزن ہے مگر ان کی
ویلیو مجھ سے بڑھائیاں توبہ

ہر طرح کی برائیاں توبہ
کیوں نہ ہوں جگ ہنسائیاں توبہ
کل نہیں جن کی ایک بھی سیدھی
ان کی مدحت سرائیاں توبہ

OOO

باکمال لوگ لاجواب کارنامے

پروفیسر نور کمال شاہ

اپنی قوم کا شمار بلاشبہ دنیا کی انوکھی اور عجیب و غریب قوموں میں ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات تو ہماری حرکات اور کارناموں کو دیکھ کر اہل عالم دنگ رہ جاتے ہیں بلکہ اپنی دانتوں تلے انگلیاں تک دبا لیتے ہیں۔ توضیح کی شاید ضرورت نہیں کیوں کہ اس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں اور ہم تو اپنی ان خداداد صفات اور صلاحیتوں کے شاہد ہیں اور مشہور بھی۔ مثال کے طور پر دنیا میں شاید سب سے زیادہ قرضہ ہماری بیچاری قوم کے اوپر چڑھا ہوا ہے۔ پھر بھی ہم اپنی عیش و عشرت میں کوئی کمی لانے کو تیار نہیں۔ انتہائی ناداری اور پسماندگی کے باوجود دنیا کے مالدار انسانوں میں سے چند ایک کا تعلق ہمارے ہی بدحال قوم سے ہے۔ ہم بھی غالب کی طرح قرض کی مے پی کر فاقہ مستی ہی میں زیادہ سکون محسوس کرتے ہیں اور یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن ۔۔۔!!! کسی موقع پر عیش کدے تک رسائی نہ پانے پر لبوں پر نالے اور شکایتیں تک سجا لیتے ہیں: واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں!!!

تہی دامن اور تنگ دست ہونے کے باوجود ہماری دولت روز افزوں بیرونی بینکوں میں تیزی سے منتقل ہو رہی ہے۔ بلکہ اگر ذرا سا مبالغے کو شامل کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں کی معیشت ہمارے ہی پیسوں سے سانس لے رہی ہے اور نہ صرف بھرپور زندگی گزار رہی ہے بلکہ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کے شرارتیں بھی کر رہی ہے اور پسماندہ دنیا کو بغل کا داغ بھی لگائے جا رہی ہے۔ ہماری آبادی بڑھنے کی رفتار کافی تیز ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آبادی میں خطرناک شرح سے اضافہ ہماری، آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے مصنوعی تنفس کے ذریعے سانس لیتی معیشت کے لئے تباہ کن ہے، پھر بھی ہم ہر فکر سے آزاد ہو کر آبادی بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس چشم کشا حقیقت کے باوجود کہ ہمارے ہاں افرادی قوت دیگر قوموں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے، پھر بھی ہمارے یہاں کوئی کام ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ لازوال قوم اسلام کا پیرہن پہنے پیدا ہوئی تو ہاتھوں میں زراعت کا کاسہ تھامے تھی۔ اسلام کا تو ہم نے جو حال کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں، زراعت میں بھی ہمارے کرتوت بے مثال ہی رہے۔ ہم ہر سال اپنا اناج باہر برآمد کر کے قلت پیدا کر دیتے ہیں اور پھر تین چار ماہ بعد وہی اناج مہنگے داموں واپس درآمد کر کے عوام کی مشکلات حل کرتے ہیں۔ زرعی ملک ہونے کے باوجود آج بھی ہم ہر قسم کا غلہ اور غذائی اجناس باہر سے ہی منگواتے ہیں۔ پھر بھی ہم خوش ہیں اور بغلیں بجا رہے ہیں:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

ہم دنیا کے سپر پاور سے اس بنا پر نفرت کرتے ہیں کہ انہوں نے کیوں قرضے دے دے کے ہماری عادتیں بگاڑیں اور دفاعی ہتھیار فراہم کر کے ہمیں غلامی کی زنجیریں پہنا کر گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ پھر بھی ہم اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے وہاں ان کے پاس ہی بھیجتے

پسند کرتے ہیں۔ آج بھی اگر اسی فی صد ہم وطنوں کو اپنی پسند کے ملک جانے کی سہولت اور موقع فراہم کیا جائے تو وہ امریکہ جانا ہی پسند فرمائیں گے۔ آج بھی ہمارے نوجوان ہونٹوں پہ یہی شکوہ سجائے آسمان کی جانب دیکھتے نظر آتے ہیں کہ اے مالک ہمیں اگر یہاں کی بجائے یورپ میں پیدا فرماتے تو آپ کے خزانوں میں کیا کمی آتی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کبھی بھی ذہن اور استعداد کو اکٹھے استعمال کرنے کے قابل ہی نہیں ہوئے۔ استعداد اور توانائی کو استعمال کرنا ہو تو عقل کو تالے لگا دیتے ہیں اور جب ذہن کو استعمال کرتے ہیں تو اس وقت استعداد اور توانائی کو چھٹی پر بھیج دیتے ہیں۔ اس بات کو ذرا آسان انداز میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم کوئی کام کرنے لگ جاتے ہیں تو سوچنا بند کر دیتے ہیں اور عمل معکوس کے طور پر سوچتے وقت کام بند کرنا پڑتا ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں تباہی پھیلانے اور اہل عالم کو تگنی کا ناچ نچانے کے بعد کورونا وائرس تیزی سے ہمارے ہاں بھی پہنچ گیا۔ مگر اسے شاید اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس نے کون سی قوم کو للکارا ہے اور اس کا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے پڑنے والا ہے۔ یہاں ہم نے اس عالمی وبا کے ساتھ جو کھیل کھیلے اور جس طرح کورونا وائرس کو جتنا پریشان کیا، کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ یقینی امر ہے کہ یہاں آ کر یہ وہ پشیمان ضرور ہوگا بلکہ پچھتا رہا ہوگا (میرا اشارہ کورونا وائرس کی جانب ہے)۔ پوری انتظامیہ بچارے وائرس کے پیچھے لگا دی گئی۔ ہر مشتبہ شخص کو مرض کا شکار ظاہر کر کے قرنطینہ کیا گیا۔ آبادیوں کے باہر ناکے لگا کر باہر آنے جانے کا نزلہ زکام اور درجہ حرارت چیک کیا گیا۔ جس پہ ذرا برابر بھی شبہ ہوا فوراً ہی وہاں کھڑی ایمبولینس میں زبردستی ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ اتنی بڑی تعداد میں جدید آلات سے لیس عملہ مع پولیس دیکھ کر بھی اگر آپ کا فشار خون بلند نہ ہو تو آپ کی بہادری قابل ستائش ہے۔ شہر کے بڑے ہسپتال سے بھاگنے والا مشتبہ مریض تین چار سٹیشن آگے ریل گاڑی سے اتار کر دوبارہ ہسپتال پہنچایا گیا۔ کورونا کی آمد کے ساتھ ہی ہر فن مولا قسم کے ماہر بازی گر میدان میں اتر پڑے۔ معجزات اور کرامات کے دعوے لیے اپنی قوم کی مدد کے لیے سامنے آئے۔ پتے والی سرکار ہسپتالوں میں کورونا وارڈوں کے اندر جا کر مریضوں کو دم کرنے لگے۔ خاندانی حکیم ایک ہی خوراک سے وائرس کو ختم کرنے کے شرطیہ دعوے کرنے لگے۔ پیاز سے علاج ڈھونڈے جانے لگے اور بے تحاشا پیاز کھانے کو اس وائرس کا تیر بہدف علاج قرار دیا جانے لگا۔ وہ تو شکر ہے مارکیٹ میں سے پیاز غائب ہونے سے پہلے ہی کسی ولی اللہ نے تنبیہ کر دی کہ اللہ کے بندو! کیوں پیاز اور اپنے عوام کے دشمن بن رہے ہو۔ اب ایک قسم کی سبز چائے کو کورونا کا علاج قرار دیا گیا تو دس بیس روپے والی چائے کی قیمتیں ہزاروں روپے تک پہنچ گئیں۔ گھر میں لازمی طور آکسیجن سلنڈر رکھنے کی بات چلی تو ہماری زندہ و پائندہ قوم نے مارکیٹ سے سلنڈر ہی غائب کروا دیے۔ یہاں تک معاملہ بگڑا کہ ایک بڑے سرکاری ہسپتال میں آکسیجن ختم ہونے سے قیمتی جانیں بھی ضائع ہو گئیں مگر ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ وائرس کو پھیپھڑوں تک پہنچنے سے قبل ہی گلے میں ہلاک کرنے کے لیے بھاپ کو مفید قرار دیا گیا تو اس زندہ دل اور طرحدار قوم نے بھاپ لینے کے وہ وہ طریقے ایجاد کیے کہ واہ واہ۔ ایلفی پریشر ککر سے پوری بھاپ اپنے گلے تک منتقل کرنے کے لیے ربڑ کی نلکی یا پائپ تک کے استعمال کی راہیں بھی دیں۔ نا ہنجار کورونا وائرس کو کڑی سزا دینے کی خاطر کئی اہل وطن نے سینیٹائزر پی کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ صحت کے اداروں نے ماسک کا استعمال لازمی قرار دیا تو مارکیٹ سے ماسک ہی غائب ہو گئے اور دیہاڑی بڑھنے سے دو روپے میں ملنے والے ماسک پچاس میں بھی دستیاب نہیں ہو سکے۔ قانون اہمیت کے مطابق اگر کسی شے کی اہمیت ثابت کرنی ہو تو اس کی قلت پیدا کرو۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مطلوبہ شے کتنی اہم اور ضروری ہے۔ اسی قانون کے مطابق ہم وقتاً فوقتاً مارکیٹ سے اشیا غائب کرتے رہتے ہیں تاکہ اہمیت برقرار

رہے۔ اس کا تجربہ ہم لوگ چینی، آٹے اور پٹرول کے ساتھ کر چکے تھے اور وہ تجربہ خاصا کامیاب رہا تھا۔ زلزلے کے دنوں میں ہمارے ہاں کمبلوں سے بھرے جہاز تک ایئرپورٹ پر لینڈنگ کے بعد سے غائب ہو گئے تھے۔ الغرض ماسک مارکیٹ سے غائب ہو گئے۔ جنہیں ضرورت تھی انہیں ملے نہیں اور جن کو ہاتھ لگے وہ عجیب و غریب انداز سے استعمال کرتے پائے گئے۔ کوئی عینک کی طرح ماتھے پر چڑھا لیتا تو کسی نے منہ سے پہلے گردن اگر ٹھوڑی کا لبادہ بنا ڈالا!!! کوئی رومال کی طرح آنکھوں پر باندھ کر روشنی کھاتے آرام کے عکس میں ہے۔ کسی جگہ کتوں اور بلیوں کو ماسک پہنا دیئے گئے تو کسی نے جوتے کی چبھن سے بچانے کے لئے ماسک کو اپنی ایڑی کے گرد لپیٹا۔ ساتھ ہی عجیب و غریب قسم اور شکل کے ماسک نظر کو خیرہ کرنے لگے۔ دیگر شعبوں کی طرح ہمارے شاعر، ادیب اور لسانیات کے ماہر بھی اپنا فرض ادا نبھانے میدان میں جا اترے۔ کورونا کی شان میں قصیدے، مرثیے اور تنقیدی مضامین لکھے جانے لگے۔ ماہرین لسانیات جنم لینے والے نئے الفاظ اور اصطلاحات پر بحث میں مصروف ہو گئے۔ الغرض کورونائی ادب کا ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آ گیا۔ وبا کی شدت میں اضافے کے ساتھ تعلیمی ادارے بند اور تجارتی و کاروباری سرگرمیاں محدود کر دی گئیں۔ مسجدوں میں بھی آنا جانا محدود کر دیا گیا اور لوگوں کو فاصلہ اختیار کرنا پڑا۔ دلوں کے فاصلے تو پہلے سے برقرار تھے سو جسمانی فاصلہ بھی ناگوار بالکل نہ لگا۔ نادار اور کمزور طبقوں نے تو اسے مالدار اور بڑے لوگوں کا مرض قرار دے کر سرے سے سنجیدہ ہی نہیں لیا۔ ان کے خیال میں بھوک کا وائرس کورونا سے زیادہ خطرناک اور جان لیوا تھا۔ آن لائن تعلیم کے لئے بچوں کو موبائل فون تھما دیئے گئے۔ اساتذہ اور والدین جو ابھی تک موبائل کو بچوں کے لئے زہر قاتل قرار دے رہے تھے اب خود ہی بیٹھ کر انہیں اس کا استعمال اور فیچرز سمجھانے لگے۔ اساتذہ کو پڑھائی سے ہٹ کر بچوں تک کتابوں کی ترسیل پر مامور کیا گیا، کیوں کہ بچوں کی کتابیں ان کے گھروں تک پہنچانا ازحد ضروری تھا۔ چونکہ تمام بچے بغیر کسی محنت اور امتحان کے کامیاب قرار دیئے گئے تھے اس لئے ان کو سکولوں کی جانب سے فری کتابیں گھروں تک پہنچانا تھیں اور یہ کام اساتذہ سے بہتر کون کر سکتا تھا۔ انہیں بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا تھا، مفت کی تنخواہ کب تک لیتے۔ چنانچہ قوم کی درد میں ڈوبے اساتذہ صاحبان نے سائیکلیں اور موٹرسائیکلیں نکالیں، کتابوں کے بنڈل لٹکائے اور طالب علموں کی تلاش میں نکل پڑے۔۔۔ پتے معلوم کئے جانے لگے اور انہیں گلی گلی ڈھونڈا جانے لگا۔۔۔!!! تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ مکتب کا پتہ ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی گنگناتے رہے:

یاد کیا دل نے کہاں ہو تم۔۔۔ پیار سے پکار لو جہاں ہو تم۔۔۔!!!

تعلیمی ادارے بند اور بچے گھروں پر محفوظ کرانے کے بعد اساتذہ کرام کو مصروف رکھنا بھی ضروری تھا چنانچہ حکم شاہی جاری ہوا کہ بچوں کے ہوم ورک کے لئے ان کے والدین سکول آئیں گے اور اساتذہ سے ہوم ورک لے کر اپنے بچوں تک پہنچائیں گے۔ اگلے ہفتے ان کو اسی صورت میں نیا ہوم ورک ملے گا جب وہ پرانا چیک کرائیں گے۔ درجہ بندی کے بعد ستر، ساٹھ اور اب پچاس سال سے زائد عمر کے شہریوں کو ویکسین دینے کی منصوبہ بندی ہو چکی ہے اور بچوں، نوجوانوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اپنے بزرگوں کو ویکسین فراہمی کے مراکز میں پہنچا آئیں۔ احسان کا بدلہ احسان ہی ہوا کرتا ہے۔ آخر انہیں بھی تو ان کے بزرگوں اور بڑوں نے پولیو، خناق، تپ دق اور کالی کھانسی جیسے امراض کی ویکسین لگوانے انہیں مراکز پہنچایا تھا۔۔۔!!!!!!!

◆◆◆

تجزیے

عارف فرہاد کی نظم نگاری

خاور اعجاز

تاریخی طور پر نظم کے ابتدائی دور میں شاہ حاتم کی موضوعاتی نظموں کا سراغ ملتا ہے جبکہ نظیر اکبرآبادی نے عوامی مسائل سے روشناس کرا کے نمائندہ شاعر ہونے کا اعزاز حاصل کیا تاہم نئی اردو نظم کے جو خد و خال محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی کوششوں سے ظاہر ہوئے وہ ہیئت کے مختلف تجربوں سے گزرتے ہوئے رومان پسندوں، ترقی پسندوں اور ایوانِ حلقۂ اربابِ ذوق کے حوالے سے بہت نکھر کر سامنے آئے۔ زندگی کے جو بنیادی سماجی اور معاشرتی مسائل عرصہ دراز سے شعرا کی توجہ حاصل نہ کر سکے تھے اور غزل کے آہنگ میں نہ سما سکتے تھے انھیں ان تحریکوں کے جدید شعرا نے نظم کے پیرائے میں ڈھال کر فرسودہ روایت سے نجات دہندگی کی صورت نکالنے کے ساتھ ساتھ عوامی جذبات کی ترجمانی کا فریضہ بھی ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد محقق اور معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی سے نظم کے موضوعات میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں اور عشق محبت کے ہمراہ معاشرتی پہلوؤں کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھنے کا رجحان نمایاں ہوا۔

اس پس منظر میں جب ہم عارف فرہاد کی نظموں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہئیتی اعتبار سے پابند اور معریٰ نظم کی دونوں انتہاؤں سے گریز کرتے ہوئے معریٰ اور آزاد نظم کا درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ موضوعاتی سطح پر اس کے ہاں جذبے اور ذاتی تجربے کو اہمیت حاصل ہے۔ وہ انھی دو ذرائع سے اپنے محسوسات دوسروں تک منتقل کرتا ہے۔ ماضی قریب کی لسانی تشکیلات نے اس کے مزاج میں وہ ایک نظموں کی حد تک سرایت کی ہے جن میں وہ خیال کو لفظ کے وسیلے سے آگے بڑھاتا ہوا نظر آتا ہے لیکن عمومی طور پر وہ اپنے رومانی رویے کے باعث احمد فراز اور قتیل شفائی کی صف کا شاعر معلوم ہوتا ہے جس کے ہاں محبت کا دکھ اس کی ذات کے نہاں خانے سے ہوتا ہوا خارج کے آئینہ خانوں میں منعکس ہو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس نے بیرون کی وحشت اور تلخ حقائق کو جذب و انجذاب سے گزار کر دروں کی محبت بھری فضا میں بسا لیا ہے۔ کہیں کہیں اس نے رومان کے ساتھ ساتھ عصری تجربے پر بھی انحصار کیا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ بیک وقت ذات کی تلاش میں محوِ طواف اور حقیقت کی دریافت میں محوِ پرواز نظر آتا ہے۔ یہ ایک مسلسل دو سمتی سفر ہے جس کی ایک سمت اس کی شخصیت ہے اور دوسری سمت آفاق کی پہنائیاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ اپنی ذات کے کسی کونے میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی نادیدہ حقائق کی کھوج میں نکلے ہوئے مسافر کے روپ میں۔ جب وہ اپنی ذات میں محو ہوتا ہے تو اس کی نظم میں غنائی اور داخلی عناصر کی فراوانی نظر آتی ہے اور جب وہ آفاق کی حدوں میں گھوم رہا ہوتا ہے تو اس کی علامتیں نسبتاً پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور امیجری میں تہ داری آنے لگتی ہے۔

جدید نظم جس ارتکاز، ایجاز اور جامعیت کا تقاضا کرتی ہے وہ تمام نظم نگاروں پر واضح ہے۔ وضاحت، صراحت اور کسی منطقی تکملیت کو میں ذاتی طور پر نظم کی کمزوریاں تصور کرتا ہوں۔ موضوع کی وسعت یا پھیلاؤ کتنا بھی کیوں نہ ہو اس کی شرح نظم کے تاثر کو بکھر

زائل کر دیتی ہے۔ کہانی یا قصہ بھی جدید نظم کی روایت کا حصہ نہیں رہا کیونکہ یہ سب محض بیانیہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک اچھا تخلیقی ذہن دوسرے اذہان کے لیے جمالیاتی سوچ کا مواد مہیا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو نظم کا بڑا موضوع بھی نظم میں تاثیر پیدا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ عارف فرہاد کی نظموں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر حشو و زوائد آ جانے کے باوجود اس کی نظم نہ تو بے جا طوالت کا شکار ہوئی ہے اور نہ حساب کا سوال بن کر رہ گئی ہے۔ اس نے زبان کی رمزیت کو حتی المقدور ملحوظ نظر رکھا ہے اور مرکزی خیال کی کڑیوں کو ڈھیلا نہیں پڑنے دیا۔ اس کی واردات جب مصرعوں میں ڈھلتی ہے تو ہمیں ایسی واردات لگنے لگتی ہے جسے اس کی لفظیاتی سمجھ بوجھ کی کامیابی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک شعریت کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نظم اس پیمانے کی بھی تشفی کر رہی ہے۔ اس نے ایک مضمون کو مختلف انداز سے دہرا کر نظم نہیں بنائی بلکہ قدم بہ قدم آگے بڑھا کر قاری کو تخلیق کی منزل کی طرف جانے میں راہنمائی کی ہے۔

عارف فرہاد کی نظموں کا انفرادی جائزہ تو اس مختصر پیش لفظ میں ممکن نہ ہوگا تاہم اس کی نظموں کے مطالعے کے دوران مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ اس کی بیشتر نظموں میں آنکھ کا ذکر بڑے تواتر سے آیا ہے۔

یہ بات کہ اشک بن گئی تھی رات آنکھ کی بات کر نہ پائی (وہ آنکھ کہ جس میں ٹوٹے پھوٹے کچھ خواب تھے، صرف خواب تیرے (خوابوں سے بھرے ہوئے جہاں میں)

پھول چنتے چنتے ہی راہ گزر کے دریچے سے میری آنکھ الجھی ہے (تتلیاں تخیل کی)

تجھ سے ہی رواں دواں تھا دل کا دریا تو ہی میری آنکھ کی چمک تھی (اے میرے اجنبی مسافر)

ایک دو خواب جو کہ تیرے تھے آج تیری نظر بدلتے ہی میری آنکھوں سے گر گئے شاید (خواب آنکھوں سے گر گئے شاید)

روٹھی ہوئی آنکھ کے بدن سے اشکوں کے سمجھنے چننے والے اب تو ہی بتا کہ اس میں تو نے کس حرف کو باوضو دیکھا (اے عمر تخن کے شاہزادے) بہار کے جب شگوفے مہکیں مہکتے آنگن میں چڑیاں چہکیں تو میری یادوں کے سارے جگنو مری وفاؤں کے سب دھنک رنگ دریچی ہی آنکھوں میں گھر بنا لیں (نئے سال کی دعا)

یہ چاند اور سورج یہ روشن ستارے مری آنکھ کی اس کٹی پیاس سے سب کے سب بے خبر ہیں (کیا کٹی پیاس ہے)

میں پتھر دیکھ کر بھیگی ہوئی آنکھوں میں خود کو ریتوں کی طرح بکھرا ہوا محسوس کرتا ہوں (تمہیں جب یاد کرتا ہوں)

غرضیکہ آنکھ ایک پہیلی کی طرح اس کی نظموں میں اول تا آخر، بچی اور خواب کا جوڑا پہنے بادل کے پیچھے سے یہ جاتے کسی تو ہجر جھونکے کی منتظر دکھائی دیتی ہے۔ ایسی پہیلی جس میں ہجر و وصال کے دکھ سکھ رومان کی ایک ہی لہر کے ساتھ دریائے محبت کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلے ہوئے ہیں۔

رومان کے علاوہ اس کی نظم میں کئی دوسری زیریں لہریں بھی چل رہی ہیں جن میں کائنات، وقت، دنیا اور خود اس کی ذات کے متعدد پہلو منعکس ہو رہے ہیں۔ ایسی ثانوی لہروں کی حامل نظموں میں 'عجب مجذوب صحرا ہے'، 'ایسا ہوتا کائنات کو میں کیا کروں' اور 'دستک' وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں کہیں وہ ساقی وراہ پہ بیٹھا مجذوب نظر آنے لگتا ہے جو آنے والی کل اک نئی روشنی کے سفر پہ نکل جانے کا منتظر ہے۔ کہیں سمندر کی آنکھ سے یاقوت و مرجان چنتا نظر آتا ہے اور کہیں حسرت بھر کر اپنے جہان ہست کی حد پار کرنے کا متمنی

دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی نظم "کھینچتا ہے مجھے اک اور جہاں" کی یہ لائنیں قابلِ غور ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس جوہرِ صد رنگ کی جیالی میں رکھ کر کھا ہے یہ کس نے کہ جہانِ موجود ورو تخلیق جہاں تو میں ایک دن زاد سفر باندھا ہے اور یہ مرحلہ بھی مجھ کو ہی طے کرنا ہے

عارف فرہاد کی بعض نظموں میں بہت خوبصورت لائنیں، شاعری کی روح سے اس کی گہری آشنائی کی خبر دیتی ہیں جیسے:

تجھ کو جو سنائی دے رہا ہے، یہ شور ہے گفتگو نہیں ہے (آ بیٹھ دل کے باغ میں)

او پر سے گلابی پیرہن میں رقص کرتی، پیار کے سُر گنگناتی رات کے پچھلے پہر کھلتے ہوئے پھولوں سے شبنم گر رہی ہے اک رنگیلی مئی پر سنتے چہرے سے اگ آتی جا رہی ہے (ہوا چہرے سے اگ آتی ہے)

مجھے ذاتی طور پر اس کی جن نظموں نے متاثر کیا ہے ان میں "تمہیں سورج سنہری کر رہا ہے"، "زمیں بھی کرب سہتی ہے"، "کھینچتا ہے مجھے اک اور جہاں"، "جو آنسو میں آگ لگی تھی"، "کرب کا جنگل اگ آیا ہے" اور "محبت کچھ نہیں ہوتی" خاص طور سے شامل ہیں۔ میری خواہش ہو گی کہ آپ بھی ان نظموں کو خصوصی توجہ سے پڑھیں۔ موضوعاتی نظموں میں کشمیر کے موضوع پر ایک الگ حصہ اس کتاب میں شامل ہے جو شاعر کی اس خطۂ زمین کے ساتھ جذباتی وابستگی اور دلی محبت کا مظہر ہوتا ثبوت ہے۔ اس بین الاقوامی تناظر کے حامل موضوع کے علاوہ علاقائی اہمیت کے حامل موضوعات بھی اس کی توجہ کا مرکز بنے ہیں جن میں آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کا قیامت خیز زلزلہ، پاک چین دوستی، حتیٰ کہ ایک تحقیقی مجلہ کا اجرا بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں رہ سکا۔ ان موضوعات سے شاعری دلچسپیوں اور وابستگیوں کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں اور اس کے کثیر الجہاتی مطالعہ کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ کا آخری حصہ مختصر اصناف سخن یعنی ماہیا اور ہائیکو پر مشتمل ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں اصناف کی پہچان ان کی ہیئت سے زیادہ ان کے مزاج سے ہوتی چاہیے تاہم ماہیے کی حد تک عارف فرہاد نے اس صنف کی معروف فارم استعمال کی ہے اور ہائیکو میں بھی ۵۔۷۔۵ کے ساتھ مساوی الاوزان ہائیکو تخلیق کی ہیں۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ اس نے ان دونوں اصناف کے ساتھ مزاج کے اعتبار سے تخلیقی انصاف کیا ہے۔ اس کا ماہیا یا ہائیکو ایسی ادعائی حد تک نہیں پہنچے کہ پڑھنے والے کو شبہ ہو وہ ماہیا پڑھ رہا ہے، ہائیکو یا پھر مختصر نظم۔ اس پیش لفظ میں ان اصناف کی ہیئتی یا مزاجی بحث میں جانے کا موقع نہیں، ذیل میں دیے گئے عارف فرہاد کے مصرعے از خود اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اس بات کا اظہار کر دیں گے کہ ان کا تعلق کس صنف سے ہے

جب آنکھ چھلکتی ہے / دل کے آنگن میں / تری یاد سلگتی ہے

یہ تیری بڑی آنکھیں / دل کو ستاتی ہیں / خوابوں سے بھری آنکھیں

اس نے آنکھیں اٹھا کے دیکھا تو / یوں لگا جیسے آسمانوں کو / میں نے کروٹ بدلتے دیکھا ہو

اگر کسی کو یہ بتانے کی ضرورت پڑے کہ پہلی دو لائنیں دو ماہیے اور آخری تین لائنیں ہائیکو ہے تو میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ پھر اس شخص کو اپنے مطالعے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ عارف فرہاد نظم کا مزاج دان اور رمز شناس ہے۔ نظم اس کے دل میں دھڑکتی اور اس کی رگوں میں سرخ خلیوں کی طرح دوڑتی ہے۔ اگر آپ نے زیرِ نظر مجموعے کی نظموں کو ٹھہر ٹھہر کر اور رک رک کر پڑھنے کی کوشش نہیں کی تو آپ اس "زنجیر" کی جھنکار سے محروم رہ جائیں گے۔

◆◆◆

ڈاکٹر اکرم عتیق کی نظمیہ کائنات

ڈاکٹر شفیق آصف

نظم شاعری کی ایک توانا صنف ہے۔ اردو میں نظم کے لغوی معنی موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کے ہیں، تاہم یہ ایک اہم شعری اصطلاح کے طور پر ادب میں مقبول ہوئی ہے۔ دوسری شعری اصناف کے مقابلے میں نظم کو بیسویں صدی میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی البتہ اردو نظم کی مختلف اشکال اور ہیئتیں اس کے تخلیقی سفر کا حصہ رہیں۔ اردو نظم کی مقبول ترین ہیئتوں میں مخمس، مسدس، معریٰ نظم، آزاد اور نثری نظم شامل ہیں۔ نظم کے حوالے سے معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بہت سچے کی بات کی ہے: ''دراصل نظم وہی ہے جو ہر بار اپنی ایک نئی ہیئت لے کر آتا ہو۔''

(فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ''اردو شاعری کا فنی ارتقا''، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۳)

اردو ادب میں بیسویں صدی اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں مختلف ادبی تحریکوں کے زیرِ اثر بہت عمدہ نظمیں منصۂ شہود پر آئیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک اور پھر دوسری عالمی جنگ نے اردو کی نظمیہ شاعری کو ایک نیا موڑ دیا۔ ترقی پسند نظم نگاروں نے اپنی نظم میں ترقی پسندانہ خیالات اور موضوعات کو موثر پیرایے میں بیان کیا۔ اس سلسلے میں فیض احمد فیض، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، حمایت علی شاعر اور مجروح سلطان پوری کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے فوراً بعد حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک نمودار ہوئی، جس میں داخلیت، رومانیت اور خارجیت جیسے عصری میلانات کو نظمیہ پیرایے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی۔ حلقہ اربابِ ذوق کے شاعروں میں میراجی، ن۔ م راشد، مجید امجد، ضیا جالندھری، قیوم نظر، وزیر آغا اور یوسف ظفر جیسے نظم نگاروں کے نام نمایاں ہیں۔

اردو نظم میں راشد اس لیے بھی اہم شاعر ہے کہ اس نے آزاد نظم کی ہیئت کو مقبولیت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ نئے شعری تجربات کو بھی موثر انداز میں پیش کیا۔ جدید اردو نظم پر طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ بیسویں صدی کے وسط سے لے کے اکیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں تک اردو نظم کے موثر ترین میڈیم آزاد نظم اور نثری نظم ہی ہیں۔ گزشتہ تیس سال کی نظمیہ شاعری میں نوجوان نسل کے نظم نگاروں کا کردار بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم نام ڈاکٹر اکرم عتیق کا ہے۔

ڈاکٹر اکرم عتیق وہ اہم شاعر ہے جس نے غزل میں نام پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی نظمیہ شاعری کو بھی ایک منفرد اسلوب عطا کیا ہے۔ ڈاکٹر اکرم عتیق کی شعری کتب شائع ہو کر پذیرائی کے مراحل سے گزریں، تاہم ان کی نظمیہ شاعری ''ماہِ نو، ادبِ لطیف، سیپ، نمود، تخلیق، نگارشات، پاک جمہوریت، ہفت روزہ زندگی اور روزنامہ جنگ'' جیسے موقر رسائل و جرائد میں تسلسل سے شائع ہوئی۔ اکرم عتیق عصرِ حاضر کے وہ اہم نظم نگار ہیں جن کی نظمیں فکری، فنی اور اسلوبیاتی سطح پر اپنا ایک الگ تشخص قائم کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہر چند کہ انھوں

نے بیسویں صدی کے تمام اہم نظم نگاروں کی شاعری کو بھی پڑھا ہے تاہم ان کا فکری کینوس اپنے عصر سے مکمل طور پر مربوط ہے۔ وہ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور نفسیاتی صورت حال کی تخلیقی سطح پر تشکیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک ترقی پسند اور حقیقت نگار شاعر ہیں۔ وہ اپنے عہد کی جمہوری صورت حال کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک روشن فکر اور سوچ ایک عصری سچائی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظم "روشنی کھوگئی" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

> اسے ہم نے دیکھا! / وہ جذبوں سے بھرپور / امنگوں کی تصویر و تحریک میں پیارے وطن کی محبت سے سرشار لوٹی / /
> دلوں کو مسخر کیے جارہی تھی / وہ جلسوں، جلوسوں میں / انبوہِ انساں سے ہوتی مخاطب / تو کانوں میں گویا الہام بن
> لوٹنے کی صدا گونجتی تھی / دلوں میں نئے ولولوں کا جہاں جاگتا تھا / اور آنکھوں کو آتے دنوں کے اجالے کی نوید کی
> جگمگاہٹ / نیا حسن تھی / مگر کیا ہوا / پھر وہی تو ہوا / جو کہ میرے وطن کی سیاست میں ہوتا چلا آرہا ہے / اجالے کی
> کرنوں سے محروم کرنا / امیدوں کے پھولوں کو بے دردی سے کچلنا / امنگوں کے محلوں کو مسمار کرنا / وہی تو ہوا / روشنی
> کی کرن پر سیاہی کے عفریت کا پھر سے حملہ ہوا / روشنی کھوگئی!

اکرم عتیق کی مذکورہ بالا نظم کے فکری پھیلاؤ کو دیکھیں تو اس میں بے نظیر بھٹو کی تصویر جھلملاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس نظم میں عوام کی امنگوں، وطن کی محبت، نئے ولولوں کا جہان اور پھر روشنی کی کرن پر سیاہی کے عفریت کا حملہ ایسی صورت حال کا بیانیہ ہے جو وطن پاک پر شروع دن سے مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ اس گمبھیر سوال کے جواب کو اپنی نظم کے بطن سے ظاہر کرنے کی تخلیقی کاوش کرتے ہیں:

> مگر اک سوال ایسا گمبھیر ہے / جو ہمیشہ سے میرے وطن کا مقدر رہا ہے: / آخر کس نے چاہا! / یہ کس نے بتایا؟ /
> درندے کہاں ہیں، / درندوں کی آماج گاہیں کہاں ہیں / درندوں کی آماج گاہوں کے پیچھے / وہ دستانے
> پہنے ہاتھوں کو اوڑھے ہوئے کون ہیں؟

ڈاکٹر اکرم عتیق کی یہ نظم ترقی پسندانہ سوچ اور عوامی رویوں کی آئینہ دار ہے۔ وہ روشنی کی حکمرانی کے خواہاں ہیں اور ظلمتوں کے خلاف ایک موثر آواز بن کر ابھرے ہیں۔ ڈاکٹر اکرم عتیق کی نظم نگاری کا سفر خوش رنگ بھی ہے اور خوش فکر بھی۔ وہ اپنی نظموں کے بطون میں صدیوں میں پھیلے ہوئے لمحوں کو قید کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ ان کی شعری کائنات میں احساسات کا ایک ایسا جہان معنی آباد ہے جو ان کے محسوسات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم "ڈائری کے جو اوراق لکھے گئے" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

> یکم جنوری سے دسمبر کی اکتیس تاریخ تک / ڈائری کے جو اوراق لکھے گئے / تجھ سے منسوب ہیں / میرے اطوار اور
> میری باتوں پہ / تیرے عمل، تیرے ردعمل کے اشاروں کنایوں سے / معمور ہیں / تیرے انداز و گفتار سے مرتعش
> ہوتی چاہت سے / مسحور ہیں / تیری ناراضی، تیرے شکووں میں پنہاں محبت سے / مسرور ہیں / سال میں ڈائری کے
> جو اوراق لکھے گئے / تجھ سے منسوب ہیں

ڈاکٹر اکرم عتیق کی یہ نظم ہمیں انگریزی زبان کے ان رومانوی نظم نگاروں کی نظمیہ کائنات میں لے جاتی ہے جو انگریزی ادب کا معتبر ترین حوالہ ہیں۔ ڈاکٹر اکرم عتیق اپنی اس نظم میں جو رومانوی فضا پیدا کرتے ہیں، وہ انسان سے کائنات کی محبت تک پھیلی ہوئی ہے۔

اس نظم میں انسانی احساسات اور محبت کی کرشمہ سازی کو اہلِ دل بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسی نظمیں زندگی کا جواز بنتی ہیں۔ ایک ایسی زندگی جو انسان کے اندر گداز اور احساس کو فزوں تر کر دیتی ہے اور یہ ڈاکٹر اکرم عتیق کا تخلیقی امتیاز ہے۔

ڈاکٹر اکرم عتیق کی نظمیہ کائنات میں اس نوع کی اور نظمیں بھی جھلملا رہی ہیں، جن میں ان کی نظم "بھول نہ جانا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

> پچھلے سال کی باتیں/ بھول نہ جانا/ اور اگر تم بھولنا چاہو/ دھیان میں رکھنا/ عہد بھلانے کا کرنا تو/ عہد کو بھول نہ
> جانا/ اور اگر پھر گزرے دن اور بیتے لمحے/ بھول بھی جاؤ/ تو میں سمجھوں گا/ بات کوئی تو اس نے میری یاد رکھی تھی

اکرم عتیق کی اس نظم کا موضوع عمومی ہونے کے باوجود بہت خاص بھی ہے اور اس خاصیت میں ان کا اسلوب بنیادی کردار ادا کرتا ہے کیوں کہ ڈاکٹر اکرم عتیق اس بات کا مکمل ادراک رکھتے ہیں کہ کسی نظم کو کس طرح Twist دینا ہے اور ان کا یہی Twist ان کے شعری اسلوب کو مستحکم کرتا ہے۔ ڈاکٹر اکرم عتیق کی نظم "بھول نہ جانا" کا موضوع بہت عام ہونے کے باوجود اظہاریت کے اعتبار سے خاصیت کا حامل ہے اور یہی وصف انھیں اسلوبیاتی حوالے سے اپنے ہم عصروں سے الگ کرتا ہے۔

ڈاکٹر اکرم عتیق معروضی زندگی سے جڑا ہوا نظم نگار ہے۔ وہ بساطِ زیست پر ہونے والے کھیل تماشوں کی حقیقت سے بھی مکمل جانکاری رکھتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی یہ نظم دیکھیے:

> بساطِ زیست پر اپنی بھلا اوقات ہی کیا ہے/ ابھی پٹتے ہوئے مہرے/ ابھی ہم کارگر ٹھہرے ہیں/ اگر پٹ جائیں تو رو
> دیں/ اگر ہوں کارگر ہنس دیں/ اگر مہرے تو بس مہرے ہی ہوتے ہیں/ کھلاڑی کھیلتا ہے/ کھیل میں مصروف رہتا
> ہے/ وہ اپنے کھیل سے محظوظ ہوتا ہے/ ہمارے رونے ہنسنے کی حقیقت ہی بھلا کیا ہے! (بساطِ زیست پر)

ڈاکٹر اکرم عتیق کی اس نظم کا موضوع سیاسی اور سماجی نوعیت کا ہے۔ وہ کھلاڑی کی چالوں اور مہروں کے پٹنے اور پھر کارگر ہونے کو نہ صرف محدود نظری سے دیکھتے ہیں بلکہ وہ اسے انسانی زندگی کے وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اکرم عتیق کی یہ نظم عالمی تناظر بھی رکھتی ہے کیوں کہ نوآبادیاتی عہد کے بعد عالمی سطح پر جو نئی سامراجی پالیسیاں وضع کی جا رہی ہیں ڈاکٹر اکرم عتیق ان سے بے خبر نہیں ہیں۔ ان کا نظمیہ کینوس بے حد وسیع اور بسیط ہے۔ ڈاکٹر اکرم عتیق موسموں اور مزاج کی ہم آہنگی سے بخوبی آگاہ ہے کیوں کہ وہ فطری شاعر ہے اور فطرت سے منسلک نظم نگار ہوتے ہوئے موسموں اور منظروں کو ہمہ وقت دھیان میں رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظموں "دسمبر جا رہا ہے"، "دسمبر جاتا ہے"، "دسمبر کیسے گزرا ہے" کا تذکرہ از حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر اکرم عتیق کی یہ تینوں نظمیں دسمبر کے حوالے سے ہونے والی نظمیہ شاعری سے قدرے مختلف ہیں۔ ان نظموں میں ڈاکٹر اکرم عتیق موسم، وقت، مظاہر اور محبوب کو ایک ہی آئینے میں دیکھتے ہیں۔

اکرم عتیق کی نظمیہ کائنات ایک ایسے شعری مطلعے کی سرگزشت ہے جو مجھے اپنے احساس کے قریب محسوس ہوتی ہے اور بلاشبہ ہر اہلِ دل اس کی تصدیق کرے گا۔

◆◆◆

شہر میں گاؤں: ندا فاضلی

سیفی سرونجی (انڈیا)

پدم شری ندا فاضلی کی یہ کلیات شہر میں گاؤں ان کے تمام شعری مجموعوں کا انتخاب ہے۔ جن میں لفظوں کا پل ،مورناچ ،آنکھ اور خواب کے درمیان ،کھویا ہوا سا کچھ ،شہر میرے ساتھ چل ،زندگی کی طرف جیسے نایاب مجموعوں کا انتخاب ہے مورناچ اور لفظوں کا پل اب تلاش کے بعد بھی نہیں ملتے ندا فاضلی جدید شاعری کا ایک معتبر نام تسلیم کیا جاتا ہے ان کے شعری مجموعے لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں لیکن ان کی ہر کتاب شائع ہوتے ہی فروخت ہو جاتی ہے اس کی کلیات سے ایسے تمام لوگوں کی تلاش کا سلسلہ یقیناً ختم ہو گیا کہ انہیں ایک ساتھ ندا فاضلی کے تمام شعری مجموعوں کا کلام ایک ساتھ مل جاتا ہے دراصل اب یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ ہر کوئی شاعر اپنی کلیات چھپوانے کے چکر میں ہے لیکن ان میں یہ شعور نہیں ہوتا کہ لوگ کسے پڑھنا چاہتے ہیں اور کیوں ندا فاضلی ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ہندوستانی تہذیب کو اپنی شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ کوئی تہوار میلے ٹھیلے ،رسم و رواج کے علاوہ ہندوستانی تہذیب کو زندہ جاوید بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت بھی بہت مشہور ہیں یہاں کی زمین یہاں کی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو ان کے ذہن میں رچ بس گئی ہے جس طرح گوپی چند نارنگ کی نثری تحریروں میں ہندوستانی تہذیب پائی جاتی ہے اسی طرح ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں اس کی عکاسی کی ہے اور تعریف کی بات یہ ہے کہ ندا فاضلی کے یہاں زبان بہت سادہ روزمرہ کے استعمال میں آنے والے الفاظ سے ندا فاضلی نے ایک ایسی گہری فکر اور معنویت پیدا کر دی ہے کہ ان کے شعر اردو ادب میں زندہ رہنے والے شعر بن گئے ہیں ندا ایک ایسے خوددار شاعر ہیں کہ جنہوں نے آج تک اپنی شاعری سے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کیا نہ آج تک کسی ایوارڈ کے لیے کسی سیاسی اثر رسوخ کا استعمال کیا حالانکہ انہیں درجنوں ایوارڈ مل چکے ہیں پدم شری ویسے میں کسی ملاقات ورنہ بڑے بڑے شاعروں کو ایوارڈ کے لیے سفارشیں اور جوڑ توڑ کرتے ہوئے دیکھا ہے ندا فاضلی نے لفظوں کے پل سے لیکر آج تک جس تخلیقی شعور کے ساتھ کام کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے عام فہم لفظوں میں بڑی باتیں کہنے کا ہنر ندا فاضلی خوب جانتے ہیں چاہے وہ دوہے ہوں غزل ہو یا نظم ہو ندا فاضلی کی شاعری میں ایک گہری فکر اور معنویت پائی جاتی ہے ان کے کئی شعر اتنے مقبول ہیں جو لوگوں کے ذہن و دل میں بسے ہیں یہاں چند شعر پیش کرتا ہوں۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں　　کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ　　دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

جلنے لگے ہیں زخم چھلکنے لگے ہیں غم　　بازار میں کے نکلے تو بکنے لگے ہیں ہم

بیٹھے ہیں دوستوں میں ضروری ہیں قہقہے
سب کو ہنسا رہے ہیں مگر رو رہے ہیں ہم

بات کم کیجیے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے یہ دوست بناتے رہیے

گھر سے چلے تھے پوچھنے موسم کا حال چال
چھو کے ہوا کے بالوں میں چاندی پرو گئے

دکھ میں نیر بہا دیتے تھے سکھ میں ہنسنے لگتے تھے
سیدھے سادے لوگ تھے لیکن کتنے اچھے لگتے تھے

وہ جن کے ذہن میں گہرائیاں ہیں
جہاں جائیں وہاں تنہائیاں ہیں

ندا فاضلی کے ان میں چند شعر تو وہ ہیں جو ان کی پہچان بن گئے ہیں۔ ذہانت کو چھپاتے رہیے یا دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ وغیرہ یہ وہ شعر ہیں جن میں ندا فاضلی ایک بڑے مفکر کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جس طرح فراق گورکھپوری نے اپنی پوری طبیعت کو شاعری میں صرف نہ کر سکے۔ یہی بات ندا فاضلی کے یہاں ہے۔ ان کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ انگریزی ہندی فارسی کے علاوہ دوسری گجراتی کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے جتنا ان کے پاس علم ہے وہ بھی فراق کی طرح اپنی شاعری کو نہیں دے سکے ان کے ہمعصروں میں دور دور تک نظر نہیں آتا جس نے کہ شاعری میں اتنا کچھ دیا ہو لفظوں کا ملی اور موسیقی کے بعد ندا فاضلی ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے نظم نثر پر انہیں یکساں عبور رکھنے والے شاعر ندا فاضلی کی یہ شاعری یہ کلیات شہر میں گاؤں ندا فاضلی کے شائقین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے ندا فاضلی کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زمین سے رشتہ ہمیشہ استوار رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شہر اور گاؤں نئی نئی علامتوں کے ساتھ معنویت کی پرتیں کھولتا چلا جاتا ہے گاؤں ان کی ایک الگ پہچان بن گیا ہے کہ گاؤں شہر گھر اور گھر تو خاص طور پر ندا کے یہاں اپنا لے گا۔ ندا کی شاعری میں دور سے پہچان لیا جاتا ہے۔

تمام شہر میں پہلے بھی کون اپنا تھا
مگر یہ حال کسی سے بھی دشمنی نہ رہی

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

کیا ہوا شہر کو کچھ تو دکھائی دے کہیں
یوں کیا جائے کبھی خود کو رلایا جائے

گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاؤ گے
ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

اتنا آسان نہیں لفظوں پہ بھروسا کرنا
گھر کی دہلیز پکارے گی جدھر جاؤ گے

ہر نئے شہر میں کچھ راتیں کڑی ہوتی ہیں
چھت سے دیواریں جدا ہوں گی تو ڈر جاؤ گے

نہ جانے کون سے لمحے کی بددعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں کہیں آسماں نہیں ملتا

تمام شہر میں ایسا نہیں خلوص نہ ہو
جہاں امید ہو اس کی وہاں نہیں ملتا

کہاں چراغ جلائیں کہاں گلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں لیکن مکاں نہیں ملتا

اس طرح کے بے شمار شعر ندا فاضلی کے یہاں موجود ہیں جن نے گھر کی کمی میں استعمال کیا گیا ہے اس لیے کہ ندا کی زندگی میں گھر بہت اہمیت رکھتا ہے جب ان سے گھر چھین لیا گیا تھا اور وہ ساری رات سردی میں ٹرک کے ایک ہم کے پیچھے ٹھٹھرتے رہے وہ کتنی بھیانک رات تھی جب وہ اپنے گھر پہنچے تھے اور گھر پر دوسروں کا قبضہ تھا۔ گوالیار کی وہ سرد رات جب ان سے اپنا گھر چھوٹا تھا پھر بھلا ندا فاضلی کی شاعری میں گھر کیسے جا سکتا ہے وہ تو تمام عمر انہیں تڑپاتا رہا اور گھر چھوڑنے کی یہ تڑپ ندا فاضلی کی شاعری میں ایک ایسی گہری معنویت پیدا کرتی چلی گئی جس نیا ایک تڑپ نمایاں ہوگئی اور یہی ندا فاضلی کی شاعری کی پہچان بن گئی شہر میں گاؤں یا گاؤں میں شہر ندا فاضلی کے لیے لازم و ملزوم بن گیا۔ ندا فاضلی کی یہ کلیات شہر میں گاؤں ان کے تمام شعری مجموعوں کا ایک ایسا انتخاب ہے جو شعر و ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا ندا فاضلی کو طویل عمر عطا فرمائے تا کہ وہ اسی طرح شعر و ادب میں اضافہ کرتے رہیں۔

◆◆◆

ضروری وضاحت

"تخلیق" کے ڈاکٹر رشید امجد نمبر کے لیے ایک مضمون ان کے ناشر دوست شاعر کرنل (ر) سید مقبول حسین نے لکھا جو کہ غلطی سے محترم نسیم سحر کے نام سے شائع ہوگیا۔ مضمون کا عنوان تھا "رشید امجد راولپنڈی کی رونق"۔ اس مضمون کو کرنل (ر) سید مقبول کی تخلیق سمجھا جائے۔ ادارہ اس غلطی پر معذرت خواہ ہے اور نسیم سحر صاحب کی نشاندہی پر ان کا شکر گزار ہے۔

(ادارہ "تخلیق")

سرمد صہبائی کی ''سب سے الگ'' غزلیں

محمد نوید مرزا

سرمد صہبائی پاکستان کے نامور شاعر، ڈرامہ نگار اور ہدایت کار ہیں۔ انہوں نے پی ٹی وی کے ساتھ ساتھ فلم اور تھیٹر کے لیے بھی بحیثیت سکرپٹ رائٹر اور ڈائریکٹر اردو، انگریزی اور پنجابی زبانوں میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ سرمد صہبائی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور ان کی اولین پہچان بھی یہی صنف ہے لیکن ان کی غزل بھی اردو ادب کی اعلیٰ روایت کی پاسداری کرتی دکھائی دیتی ہے۔ سرمد صہبائی کے شعری مجموعوں میں ''نیلی کے سو رنگ''، ''ان کہی باتوں کی تھکن''، ''ماہ عریاں'' اور ''پل بھر کا بہشت'' شامل ہیں۔ ان کتابوں کے منفرد ناموں کی طرح شاعری بھی ایک الگ مزاج کی حامل ہے۔ بحیثیت ڈرامہ نگار انہوں نے پی ٹی وی کے لیے ''منٹو۔ نیا قانون'' اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کے نام سے منٹو کی کہانیوں کی ڈرامائی تشکیل دی۔ سرمد صہبائی اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ڈرامے لکھتے رہے ہیں۔ انہوں نے پی ٹی وی اور سٹیج پر ڈراموں کی ہدایات بھی دی ہیں۔ ان کے مشہور ڈراموں میں ''تو کون''، ''بجھاں چراغ''، ''طوطا رام''، ''بچوں کا پارک''، ''آخری دن'' اور ''سرگندھی'' شامل ہیں۔ صہبائی صاحب کی لکھی ہوئی فلم ''ماہ میر'' 2016 میں عالمی ایوارڈ کے لیے بھی نامزد ہوئی تھی۔ یہ فلم کلاسیکی شاعر میر تقی میر کے حوالے سے ہے۔ اس کے علاوہ سرمد صاحب نے ''فنکار گلی'' کے نام سے ایک ٹیلی فلم بھی بنائی ہے۔

سرمد صہبائی 1945 میں لاہور پیدا ہوئے۔ ان کے والد اثر صہبائی بھی صاحبِ دیوان شاعر کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جب کہ ایک بھائی منظر صہبائی کا تعلق شوبز سے ہے۔ سرمد صہبائی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی اور اسی ادارے کے مشہور مجلے ''راوی'' کے مدیر بھی رہے۔ ان کے اندر زمانہ طالب علمی میں ہی شاعری کا ذوق پیدا ہو چکا تھا۔ سرمد صہبائی کی نظمیں اپنی منفرد پہچان رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے تعارف کے بعد اب ہم یہاں حال ہی میں شائع ہونے والے ان کی غزلوں کے انتخاب ''سب سے الگ'' کے حوالے سے اپنی گفتگو جاری رکھیں گے۔ ''سب سے الگ'' صہبائی صاحب کی ان غزلوں کا انتخاب ہے، جو ان کی اب تک شائع ہونے والی کتابوں میں شامل ہیں۔ ''سب سے الگ'' کا انتخاب معروف شاعر اشرف سلیم نے کیا ہے جو خود بھی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اس صنف کے مزاج کو سمجھتے ہیں۔ ان خوبصورت غزلوں کے انتخاب کی وجہ بتاتے ہوئے اشرف سلیم کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''نیلی کے سو رنگ'' میں کافیوں کا ذائقہ اور ایک لسانی تجربہ تھا مگر ''ان کہی باتوں کی تھکن'' میں نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں اور وہ بھی جدید غزل، جس پر حلقوں میں اکثر بحث ہوا کرتی کہ غزل کے خدوخال ایسے ہونے چاہئیں۔ میری دلچسپی اور میلانِ طبع زیادہ تر غزل کی طرف مائل تھی اور یہی خواہش مجھے ان سے ملنے پی ٹی وی بھی لے گئی۔ ان سے مل کر دل اور بھی خوش ہوا اور ان کی طبیعت مجھے بھلی لگی۔''

آگے چل کر اشرف سلیم لکھتے ہیں ''میں نے ان کی غزلوں کو یکجا کر کے پڑھنا شروع کیا تو وہ اپنی نظم کے برابر کھڑے نظر آئے۔''

میرا خیال ہی نہیں آخری سطر ہی اس انتخاب کی اشاعت کا باعث بنی۔ دراصل مرتب نے سرمد صہبائی کو بحیثیت غزل گو تلاش کر لیا

تھا جس کی وجہ سے "سب سے الگ" کی اشاعت ممکن تھی۔ میرے نزدیک صہبائی صاحب کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور جدید ترین فکری و شعری آہنگ بھی ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کی رنگارنگی ہے۔ صہبائی صاحب کا طرزِ تحریر متاثر کرتا ہے۔ الفاظ ان کے غلام ہیں اور وہ ایک بادشاہ کی طرح انہیں ان کے صحیح مقام پر تعینات کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان غزلوں کی اہمیت اور انفرادیت کا اندازہ شاعر کے مجموعے "پل بھر کا بہشت" کے دیباچے میں شامل آفتاب اقبال شمیم کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے، وہ فرماتے ہیں: "پل بھر کا بہشت" میں 16 غزلیں شامل ہیں۔ میرے نزدیک یہ غزلیں کئی مجموعوں پر حاوی ہیں۔ اب کون سرمد سے پوچھے کہ میاں ان غزلوں کے کہنے میں تم نے کشٹ کاٹا اور کتنی ریاضتیں جھیلیں۔ ایسی غزلیں آسانی میں تو نہیں ہوتیں۔ ایک طویل روایت کے ذیل میں رہ کر سب سے الگ غزلیں کہنے کی خواہش بھی ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان 16 غزلوں میں سرمد اپنے قائم کردہ معیار سے کہیں بھی نیچے نہیں اترتا۔ کہیں بھی بھلا شعر سرزد نہیں ہوتا اور یہ معیار غزل کی کلاسیکی سے ہم سری کا معیار ہے۔"

آفتاب اقبال شمیم کی اس رائے کے بعد جب ہم سرمد صہبائی کی غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ اردو غزل کی اس روایت سے جڑے نظر آتے ہیں جو میر، غالب، فیض، احمد فراز، منیر نیازی، ناصر کاظمی، شہزاد احمد، ظفر اقبال اور کئی دوسرے اہم شاعروں کی بھرپور تخلیقی قوت اور مسلسل ریاضت سے بامِ عروج تک پہنچی۔ زبان و بیان اور اظہار کی خوبصورتی سے رچی بسی یہ غزلیں یقینی طور پر اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ اس انفرادیت کی طرف ڈاکٹر ضیاء الحسن بھی بڑی خوبصورتی سے "سب سے الگ" میں تحریر فرماتے ہیں: "سرمد کی غزلیں اردو غزل کی عظیم روایت کا تسلسل ہیں۔ روایت کا تسلسل صرف وہی شاعری ہوتی ہے جس کی جڑیں روایت میں پیوست ہوتی ہیں لیکن اس کا شجر بالکل نیا اور ان دیکھا ہوتا ہے۔ غزلوں کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ یہ ایک قرات میں قاری پر نہیں کھلتیں بلکہ بار بار پڑھے جانے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان غزلوں کو مکمل یکسوئی کے بغیر پڑھنا بھی ممکن نہیں ہے کیوں کہ ایسی صورت میں یہ اپنے تخلیقی حسن کے باوجود معنی کے در وا نہیں کرتیں۔ یہ غزلیں معاصر غزل کے تجربے سے یوں بھی مختلف ہیں کہ غزل کی ساخت سے نہیں پھوٹیں بلکہ وجود کے تقاضوں سے طلوع ہوئی ہیں۔"

میرے نزدیک یہ شاعری اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے تھم تھم اور سوچ سمجھ کر پڑھا جائے تاکہ اس کی تفہیم میں آسانی ہو سکے۔ سرمد صہبائی ایک پڑھے لکھے اور وسیع مطالعہ رکھنے والے حساس شاعر ہیں۔ وہ کافی، نظم اور غزل تینوں اصناف میں بڑی سہولت اور روانی کے ساتھ شعری اظہار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بقول قاسم یعقوب: "سرمد کا سارا تخلیقی سرمایہ ایک حساس شاعر کا تجربہ ہے۔ آپ کہتے ہوں گے شاعر تو حساس ہی ہوتا ہے مگر میری مراد حساسِ جسم (Sense of body) سے ہے۔ سرمد کا تخلیقی وجود مابعد الطبیعات کے بطن سے نہیں جسم کی حیاتی سطح سے جنم لیتا اور پھر طویل مسافت کے بعد مابعد الطبیعات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔" اس رائے کی روشنی میں سرمد صہبائی کی تمام شاعری کے اندر چھپی ہوئی تخلیقی خوبصورتی اور حساسیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ "سب سے الگ" کی غزلیں واقعی الگ اور منفرد ہیں یہ شاعری اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے وقت نکالا جائے اور مصرعہ مصرعہ ان غزلوں کو سمجھا جائے۔ سرمد صہبائی اپنی شاعری سے پورے طرح جڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا شاعری کو بھی ایک مقدس فریضہ سمجھتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں: "شاعری ادھوری اور خالی جگہوں کی زیارت ہے۔" سرمد صہبائی صاحب نے اردو غزل میں اپنی ایک الگ آواز اور شناخت بنائی ہے——— وہ دلی ذہن سلامت رکھیں۔

◆◆◆

تبصرے ہارون الرشید تبسم کے

خاک زاد (کلیات)

مصنف : قمر رضا شہزاد

صفحات: 512 قیمت: 2,500 روپے ناشر: کتاب دوست، 62۔ مجاہد سٹریٹ، رضوان پارک، لاہور

معروف شاعر، دانش ور، مورخ، نکتہ شناس اور محقق قمر رضا شہزاد کی شعری کلیات "خاک زاد" نے ادبی حلقوں میں اپنی خوشبو بکھیر دی ہے۔ قمر رضا شہزاد نے اپنے شعری مجموعوں "پیاس بھرا مشکیزہ"، "ہارا ہوا عشق"، "یاددہانی"، "خامشی"، "بارگاہ" اور "شش جہات" کو یکجا کر دیا ہے۔ غزلیات کا یہ گلدستہ شاعر کے جذبات کی صداقت اور معصوم تاثرات کا عکاس ہے۔ انھوں نے معاشرتی اقدار کو جہاں خوش آمدید کہا ہے تو وہاں ماضی کے تجربات سے استفادہ بھی کیا ہے۔ بہترین شاعر وہ جو جدیدیت کی چھری سے روایات کا قتل نہ کرے۔ قمر رضا شہزاد کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس نے وہ سب کچھ شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے جو اسے تخلیقی عمل سے غزل کے گوہر نایاب کی صورت ملتا ہے۔ ان کی سوچ کی کستوری احساس کی آہٹ سے لرز جاتی ہے۔ سادگی قمر رضا شہزاد کا طرۂ امتیاز ہے۔ ماضی، حال، مستقبل ان کی غزل میں ایک دوسرے سے جڑے دکھائی دیتے ہیں۔ "خاک زاد" کا عمیق مطالعہ ان کے فنی ارتقا کا آئینہ ہے۔ معاشرے کے استحصالی طبقے سے ان کا گریز فطری ہے۔

شکستہ خواب، دعا، پھول، زخم اور چراغ   مرے الاؤں کی بھی چھان بین ہوتی ہے
ہر ایک شخص پہ تلوار کھینچنے والے   لہو سے سرخ تری بھی جبین ہوتی ہے

ان کے لفظوں کی پھلجھڑیاں افق تک رسائی کرتی ہیں۔ ان کے ہاں محبوب کا تصور منفرد دکھائی دیتا ہے۔ ایمان و تصوف کی مہک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔

کبھی قتیل، کبھی بادشاہ ہوا تھا   محبتوں میں بھلے یوں تباہ ہوا تھا
میں اس قبیلۂ عشاق کا مجاہد ہوں   تپتی ریت کو جس کا گواہ ہوا تھا

قمر رضا شہزاد جو بڑی استقامت اور عقلیات کی کہکشاں تھامے شاعری کی پگڈنڈی پر رواں دواں ہے۔ ان کے ہاں کئی امکانات اور مجاہدے نئے رویوں کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ محبت ان کا مرکزی نقطہ ہے۔ وہ رجائیت اور قنوطیت کے درمیان بڑے تسلسل سے محوِ سفر ہیں۔ مشاہدات اور لفظوں کا تم ضمیر ان کے ہمنوا ہیں۔ حسنِ تخیل کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ سوچ کا دھارا جب فنی اقدار میں ڈھل کر شعری

آہنگ اختیار کرتا ہے تو قمر رضا شہزاد کا انفرادی رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان کا دائرہ احباب بہت وسیع ہے۔ وہ جس بڑے شاعر سے چاہیں اپنے لیے تحریر لکھوا سکتے ہیں لیکن "خاک زاد" کے لیے انھوں نے خاک نوردی کی اور تہی دست طلب دراز کیا۔ قمر رضا شہزاد رقم طراز ہیں: "میری زندگی کی حیرانیاں اور میری غزلیات کے مجموعے میرے لیے اس حد تک تو اطمینان کا باعث ہیں کہ میں نے جس راستے کو اپنے اظہار کے لیے منتخب کیا اس پر ابھی تک نہایت حوصلے سے رواں دواں ہوں۔ میری غزل نے کس حد تک اردو غزل کے سرمائے میں اضافہ کیا اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ میری غزل کی عمارت میں زیادہ تر میری اپنی ہی مٹی استعمال ہوئی اور یقیناً میری یہ ساری کوشش شعوری بھی نہیں ہے۔ میں جیسا ہوں ویسا ہی اپنی غزل میں جھلکتا ہوں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اکتساب لینے کی بجائے خود کو اور دنیا کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی اور اپنے ہی دل کی بات مانی۔"

زندگی کا سفر دائرہ در دائرہ پھیل رہا ہے۔ حالات نے واقعات کو ہوا دی ہے۔ پوری دنیا تغیر و تبدل کا شکار ہے۔ قمر رضا شہزاد نے بچھڑی ساعتوں، ہفت افلاک، چراغوں کی لو، سکوت مرگ، گلاب وصل، نشاد رستوں، آغاز جنگ، صف دوستاں، حلقہ بیارگاں، کاسۂ آشنیں، دیدہ تو قیر، شبانہ غم ناک، نمود ادراک، عمر گلاب، حلقہ مہتاب، کتاب عشق، آئینہ کف، چشم نم، قریہ افلاک، دیدہ نم ناک، جہان خاک، سایہ دیوار، شان فاتحانہ، جہان خشت، جہان فنا، صدائے عدل اور ایسی ہی سادہ تراکیب و اصطلاحوں سے "خاک زاد" کو فکر رسائی کا ذریعہ بنایا ہے۔ قمر رضا شہزاد کے دل میں محبت کا ایک نیا آلاؤ اور ایک نیا سورج ہے۔ وہ فنی سادگی سے گہری بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اہل بیت سے ان کی محبت کا اظہار کئی اشعار میں ملتا ہے۔ وہ استحصالی قوتوں کے خلاف برسر پیکار رہنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

یہ کیا خبر کہ مٹی پہ رہنے والوں کو — اسیر گردش افلاک کر دیا گیا ہے

قمر رضا شہزاد مزید لکھتے ہیں:

میں پھول بانٹتا تسبیح کرتا رہتا ہوں — ازل سے میرا یہی ہے چلن خدا کا شکر
کسی یزید کے دربار سے نہیں نسبت — مری شناخت در پنجتن خدا کا شکر

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

مشکیزہ لیے پھرتے ہیں ہم لوگ شب و روز — اک دشت میں پیاسا ہے علمدار ہمارا

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سچ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ رنگ خوشبو بن جائے تو وہ اپنا راستہ خود تراشتی ہے۔ دار و رسن کا خوف سے بالاتر جرأتوں کے مٹنے کا شاعر قمر رضا شہزاد بے خوف و خطر منزل کی طرف رواں ہے۔ وہ اچھے دنوں کا خواہش مند ہے۔ اس کی شاعری سنجیدگی سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں ذات کا ادھورا پن محسوس ہوتا ہے جس کی تکمیل کے لیے "خاک زاد" کی آبیاری جاری ہے۔ سوال اظہر نے ذاتی شہرت سے بالاتر ہو کر مشق سخن کرنے والے قمر رضا شہزاد سے متعارف کروایا۔ ان کی شاعری میں تہذیبی، ثقافتی، ملی، قومی اور اسلامی امکانات کی روشنی ابھر آ رہی ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

ہر ایک سمت چھلکتی ہے روشنی میری — کسی نے اتنا اجالوں سے بھر دیا ہے مجھے
یہ کاروبار محبت بھی خوب ہے شہزاد — جو میں نے اس میں گنوایا وہی بچا ہے مجھے

آثار ہنر

مصنف : حسن عسکری کاظمی

صفحات: 240 قیمت: 600 روپے ناشر: رضا جعفر پرنٹرز، لاہور

حسن عسکری کاظمی اپنے نام کی طرح ادبی دنیا میں "عسکری" انداز تحریر رکھتے ہیں۔ ان کی گفت گو ان کی تحریر اور ان کا انداز دوستی ایک سا ہے۔ محافل میں شرکت کرنے اور محافل سجانے کا "آثار ہنر" بخوبی جانتے ہیں۔ سوہان اظہر ہوں یا انجینئر عنایت علی چودھری سب کے ساتھ ان کی یاد اللہ کی کرنیں خاکسار (ہارون الرشید تبسم) تک پہنچتی رہتی ہیں۔ حسن عسکری کاظمی اپنی ذات میں ایک ادبی تحریک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور فکر و فن پر کئی احباب نے قلم اٹھایا ہے۔ یہی نہیں ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر سندی کام بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ حسن عسکری کاظمی کی خدمات جلیلہ کو مختلف حوالوں سے اعزازات سے نوازا گیا۔ حسن عسکری کاظمی کے فکر و فن پر ایم فل کی سطح کے چار اور ایم اے کی سطح کے تین مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں۔ تحقیق کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری و ساری ہے۔ ڈاکٹر شبیہ الحسن نے ان کے فکر و فن پر ایک کتاب بعنوان "حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں" تحریر کر کے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ آثار و افکار اکادمی پاکستان کراچی کی طرف سے حرف ہنر، دیدۂ نم، ناک لہو لہو ہے، حرف عقیدت، جمال مصطفیٰ ﷺ، موسم کبھی بدلے اور مدینہ دل ہے پر اول انعام سے سرفراز کیا گیا۔ یوم آزادی کے موقع پر پاکستان ٹیلی ویژن نے ان کے تحریر کردہ ملی ترانے کو اول انعام سے نوازا۔ حضرت امام خمینی سیمینار منعقدہ تہران میں شریک ہوئے۔ دہلی میں منعقدہ اولین رحمت للعالمین ﷺ کانفرنس میں بحیثیت نعت نگار شریک ہوئے۔ نیز بہار رست انجمن بین الاقوامی مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ اسی طرح جشنوارہ امام علی ابن موسیٰ الرضا مشہد مقدس (ایران) میں خانہ فرہنگ لاہور کی خصوصی دعوت پر شریک ہوئے۔ ماہنامہ "تخلیق" لاہور ہر سال ادب میں نمایاں کارکردگی پر ایوارڈ دے رہا ہے۔ 2017ء میں تخلیق ادبی ایوارڈ حسن عسکری کو دیا گیا۔ ان کا تخلیقی سرمایہ ایک لائبریری کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اردو کی مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ کتابوں پر سیر حاصل تنقید کرنا وسعت مطالعہ اور مشاہدے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے چالیس تبصروں اور بے لاگ تنقید میں اپنے فن کا بطریق احسن مظاہرہ کیا ہے۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب ڈاکٹر خورشید رضوی نے "آثار ہنر" پر خوبصورت رائے کا اظہار کیا ہے۔

> "جناب حسن عسکری کاظمی اب مطالعے سے آگے بڑھ کر حاصل مطالعہ کی جانب آ رہے ہیں جس کی آئینہ دار ان کی تازہ تصنیف "آثار ہنر" ہے۔ یہ کتاب دنیائے نظم و نثر کی بچیس سربرآوردہ شخصیات اور ان کے فن پر مختصر مگر جامع تبصروں سے عبارت ہے۔ جن میں قدما سے لے کر معاصرین تک کی نمائندگی ملتی ہے۔ اکثریت شعرا کی ہے جن کا منتخب کلام بھی پیش منظر قاری کے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ یہ جائزے اقتباسات کے بجائے ذاتی آرا پر مشتمل ہیں اور محض کلمہ تحسین یا مدح سرائی سے ہٹ کر ایک معتدل ناقدانہ زاویہ نگاہ کے عکاس ہیں۔ موجودہ دور میں جو کاظمی صاحب کی نظر میں "دور صحافت" ہے، ادبی ذوق کی پرورش اور مطالعے کی عادت کو فروغ دینا "آثار ہنر" کا مطلوب و مقصود ہے۔"

"آثارِ ہنر" حسن عسکری کاظمی کے تجزیاتی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اردو غزل کے بابا آدم، ولی اللہ ولی دکنی تا احمد فراز اپنے تخلیق کاروں کے فکر و فن پر تجزیاتی محاکمہ کیا ہے۔ ادبی دنیا میں "حرفِ ہنر"، "معیارِ ہنر" اور "وقارِ ہنر" کے بعد "آثارِ ہنر" کی اشاعت حسن عسکری کاظمی کے ذوقِ ہنر کا آئینہ ہے۔ وہ "قاری کا مکالمہ" میں رقم طراز ہیں:

> "آثارِ ہنر میں کلاسیکی تخلیق کاروں، شاعروں اور نثر نگاروں میں سے صرف اکتالیس کو منتخب اور قدآور ادیبوں اور قلم کاروں پر قلم اٹھایا۔ اردو زبان و ادب کے طلبا اور طالبات نیز صاحبانِ ذوق کے روبرو تقریباً پچیس تخلیق کاروں کی نگارشات کا جائزہ پیش کر کے اپنی رائے سے آگاہ کرنے کی سعی کی ہے۔ ہمارے شعرا اور نثر نگاروں کے ساتھ بے توجہی برتنے کی ناقابلِ رشک روایت کے خلاف آواز بلند کرنا ضروری ہے مگر اس سے بڑھ کر ان کے بارے میں لکھنا، پڑھنا اور ضبطِ تحریر میں لائی ہوئی آرا کی اشاعت کا اہتمام کرنا اس لیے لازمی ہے کہ ہم نئی نسل کی علمی و ادبی تہذیب سے قدرے بے نیاز ہونے لگے ہیں۔"

"آثارِ ہنر" میں کل پچیس مضامین شامل ہیں۔ ہر مضمون مختصر مگر جامع ہے۔ ہر مضمون کا اسلوب اپنا انداز رکھتا ہے۔ انھوں نے عنوان کو سیاق و سباق اور متون سے واضح کر کے حسنِ تحریر کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان مضامین کی بازگشت ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ حسن عسکری کاظمی ثقیل لفظوں کے بجائے سادہ انداز اپناتے ہیں جس سے قاری ان کے تبصروں اور تجزیوں سے استغراق، مشاہدہ سے فیض یاب ہوتا ہے۔ وہ ہر تخلیق کار کے داخل تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ حسن عسکری کاظمی کی اہلِ بیت سے محبت کا اظہار کئی مضامین کی زینت ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان مضامین کی رعنائیِ خیال اور محاسن کو ادبی حلقوں میں خوب سراہا جائے گا۔

بیاض نظر

شاعرہ : بسمل صابری

صفحات: 128 قیمت: 600 روپے ناشر: جمہوری پبلی کیشنز، لاہور

اردو ادب میں بسمل صابری کا نام کسی طرح بھی محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے اردو صنفِ شاعری میں کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اردو غزل کے افق پر شفق کی مانند لفظوں کی دھنک لیے بیشتر کرب سے بکھرے لفظوں کو تجسیم کے سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ روح کی غذائیت کے لیے انھوں نے تاجدارِ کائنات، سرورِ کائنات، محمد مصطفی ﷺ کے حضور گلہائے نعت پیش کرنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا موقع انھی لوگوں کو عطا کرتا ہے جن میں اس کی تڑپ ہوتی ہے۔ ادب خواہ کسی بھی زبان کا ہو، شاعری دنیا کی مادری زبان ہے۔ شاعری زندگی کے حسن کو حسنِ لازوال بخشتی ہے۔ شبستانِ رنگ و نور میں لفظوں کی حقیقت، صداقت، امانت، دیانت اور زندگی کی قدروں کا تعین کرتی ہے۔ سلطانِ جمال و کمال، وجہِ تخلیقِ کائنات، مقصودِ کائنات، مبداءِ کائنات محمد

مصطفیٰ ﷺ کے حضور لفظوں کا نذرانہ پیش کرنا عشقِ حقیقی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب جب رسول ﷺ ذہن کے دروازے پر دستک دینے لگے تو تخلیق براہِ راست دل میں جنم لینے لگتی ہے۔ لفظ سلیقے اور قرینے سے لبوں کی دہلیز سے ہوتے ہوئے قرطاس و قلم کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایک صوفی منش قندیل داخل و خارج دنیا میں انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ کنول صابری کا نعتیہ مجموعہ "ریاضِ نظر" نظر نواز ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور تین حمد ہیں، 35 گلہائے عقیدت بحضور سرورِ کونینؐ بہار دکھا رہے ہیں۔ دو قطعات اور دو سلام شامل ہیں۔ ان کے نعتیہ لفظ دل و دماغ کے در پر نہ صرف دستک دیتے ہیں بلکہ سکون کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ جب وہ نعتیہ لفظوں کی معراج لیے ربِ کون و مکاں اور رونقِ ہر دو جہاں محبوبِ کبریا محمد مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتی ہیں تو دریا کے ماہ و انجم مسکرا اٹھتے ہیں۔ سیارگانِ فلک انھیں تقدیس و تکریم سے دیکھتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں حلاوت اور شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔ پروفیسر اقبال جاوید نے ان کی نعت گوئی کو یوں اس انداز سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

> "ایک غزل گو کو جب اللہ تعالیٰ نعت گوئی کی توفیق عطا کرتا ہے تو ادا کے تیور اور اظہار کے اسلوب اس کی نعت کو بھی تاثر کی ایک ایسی کیفیت بخش دیتے ہیں کہ اس پر دلِ نظر نظر انداز کر سکتے ہیں نہ تماشائی۔ ویسے بھی نعت کے لیے غزل کی ہیئت اس لیے موزوں ہے کہ غزل فکر کی ہر رفعت، نگاہ کے ہر رنگ اور دل کی ہر دھڑکن کا ساتھ دے سکتی ہے مگر شاعر کے دل میں محبت کی جو شدت ہوتی ہے اس کی حدت کو کسی حد تک محسوس تو کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہم صرف یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک ہی بات کو کس انداز سے بیان کیا گیا ہے گویا کہی گئی بات سے ہم لطف تو لے سکتے ہیں مگر اس کی لطافت کو ناپ نہیں سکتے بالکل ویسے ہی جیسے صبا کے دوش پر سوار خوشبو کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے دیکھا نہیں جا سکتا۔"

یہ قرینہ گویائی ربِ کائنات کا بڑا احسان اور سرورِ رسالت مآب ﷺ کی چشمِ عنایت کا کرشمہ ہے کہ انسان کو تحسینِ رسول پاک ﷺ کے لیے حسنِ زبان و ادب میسر آتی ہے۔ حضور ﷺ کی ستائش کا کوئی بھی انداز اپنا لیا جائے وہ بارگاہِ رسولِ کائنات، ختمِ المرسلین ﷺ میں ضرور قبول ہو جاتا ہے۔ قافلۂ حسان کے شہسواروں میں جو شامل ہوا، اس کی بخشش کو کون روک سکتا ہے؟ "ریاضِ نظر" کا مطالعہ کرتے ہوئے دھڑکنیں تیز ہونے لگتی ہیں اور گلستانِ نعت سے آنے والی خوشبوؤں سے دل معطر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ابوالبیان ظہور احمد فاتح تونسہ شریف، کنول صابری کی نعت گوئی کے حوالے رقم طراز ہیں:

> "کنول صابری جنھیں اپنے دور میں مقامِ مقبولیت حاصل ہے اور جنھیں نسائی ادب کا نوحہ نما اداکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ بھی بفضلِ تعالیٰ حمد و نعت اور قصیدہ و منقبت میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں جہاں انھوں نے نظم و غزل میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں اور متعدد شعری مجموعے شائقینِ ادب کی تواضعِ طبع کے لیے پیش کیے ہیں وہاں کی یہ کتاب "ریاضِ نظر" بھی ایک وقیع اضافہ ہے جو اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ ان کا کلام ادب و احترام اور عقیدت و محبت سے معمور ہے۔"

محترمہ کنول صابری نے وارفتگی کے عالم میں ایسے اشعار کہے ہیں جن سے ان کے عشقِ رسول ﷺ کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔

بصد خلوص و کرم احترام لکھ دینا   کہ میرے دل پہ محمدؐ کا نام لکھ دینا
رضائے ذاتِ الٰہی جو ساتھ رکھتی ہے   ہر ایک سانس میں ہے اُن کا نام لکھ دینا
فقیرِ درد ہوں مر جاؤں تیری چوکھٹ پہ   مرے نصیب میں زم زم کا جام لکھ دینا
خدا کرے ہو ٹھکانہ مرا مدینے میں   قضا کے بعد بھی اذنِ قیام لکھ دینا

نگین صابری محافل کی رونق ہیں۔ ان کی تحریر میں ان کے عشقِ رسول ﷺ کو خاص عمل دخل حاصل ہے۔ نعت کے صدقے ہی زبان و بیان کو توقیر ملتی ہے۔ لفظوں کی تقدیس نعت میں پناہ لیتی ہے۔ زندگی کی رعنائی اور تمام روشنیاں دیارِ رسولِ پاک ﷺ سے فیض حاصل کرتی ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ گنبدِ رسول ﷺ سے بڑی دنیا میں کوئی نخلستان نہیں ہے۔ گدائے رسول ﷺ سے بڑھ کر کوئی شہنشاہ نہیں ہے۔ مدینے کی گلیوں میں گھومنے والا دنیا کے امراء سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کائناتِ ہست و بود میں نعت لکھنے سے بڑی کوئی سعادت نہیں۔ نگین صابری پر نظرِ کرم ہے کہ وہ نعت کے پاکیزہ لفظوں کو قرطاس و قلم کے توسط سے ہماری روحانی غذا کا اہتمام کر رہی ہیں۔ یہ دل کی وہ دھڑکنیں ہیں جسے صرف شاعری محسوس کر سکتی ہے۔ یہ لفظ روشنی ہیں اور روشنی ایمان راستہ تو روشن کرتی ہے۔ حبِ رسول ﷺ، اللہ تعالیٰ تک رسائی کا وسیلہ ہے۔ عشقِ رسول ﷺ سے مزین جذبات و احساسات حضور ﷺ کی بارگاہ میں نہ صرف قبول ہوتے ہیں بلکہ بارگاہِ الٰہی میں ان کی دھوم محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے قلوب و اذہان کی سیرابی کے لیے "ریاضِ نظر" ایک بہت بڑا تحفہ ہے۔ نگین صابری کے نعتیہ شعری مجموعہ میں عقیدت کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

مجھ کو عطا ہوئی ہیں یہ کیسی بلندیاں؟   میں جا رہی ہوں یادِ حرمِ مصطفیٰ ﷺ
یہ اور بات ہے مرا کعبہ قیام ہے   دل میں بسا ہوا ہے حرمِ مصطفیٰ ﷺ

نعت گوئی آقائے کریم ﷺ سے عقیدت، محبت اور اپنی عاجزی کا اظہار ہے۔ نعت ربّ العالمین کا عطا کردہ تحفۂ عظیم ہے۔ رشحاتِ قلم کو خالقِ کائنات ہی وجہِ تسکین بناتا ہے۔ مدحت و توصیفِ رسول ﷺ کے لیے مناسب الفاظ آج تک منظرِ عام پر نہ آ سکے۔ کیوں کہ محشر میں شفاعتِ رسول ﷺ کی سب سے بڑی شرط مدحتِ سراج السالکین ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں۔ شیخ عبدالعزیز شریف نے نگین صابری کے نعتیہ مجموعہ "ریاضِ نظر" کے بارے میں لکھا ہے:

"نگین صابری کی نعت حب اور عقیدت سے عبارت ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے زبان و بیان کا ایک عمدہ معیار قائم کیا ہے مگر کہیں کہیں بہتری کے امکانات بھی موجود ہیں۔ امید افزا بات یہ ہے کہ فیض کا سامان بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری کا وزن مزید قرات میں بڑھا جائے گا اور سراہا جائے گا۔ اگر ان کا تخلیقی سفر اسی ذوق و شوق سے جاری رہا تو نسائی شاعری منفرد حیثیت حاصل کر لیں گی۔"

پاکستان میں خواتین نعت گو کی تعداد میں دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا ہے۔ نگین صابری نے غزل سے ہٹ کر نعت گوئی کا سلسلہ شروع کر کے اپنے لیے توشۂ آخرت کا اہتمام کر لیا ہے۔ یہ سعادت صرف مسلمان خواتین و حضرات کو ہی حاصل نہیں بلکہ غیر مسلموں نے بھی نعت کہہ کر رونقِ عالم محمد عربی ﷺ سے اپنی دلی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ نگین صابری چوں کہ شیریں لب و لہجہ کی مالک ہیں اس لیے ان کی

کی نعتوں میں ترنم پایا جانا فطری ہے۔ وہ نہ صرف خود بلکہ دیگر خواتین بھی ان کا نعتیہ کلام ترنم سے پیش کر کے رحمت و نعت کی دولت سمیٹ رہی ہیں۔ دنیا میں آج تک کوئی اسلوب ایسا نظر نہیں آیا جو مدحت خیر الوریٰ ﷺ پر پورا اتر سکے۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے، قلم ٹوٹ جاتے ہیں، زمانے بیت جاتے ہیں لیکن جہانِ عالم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ مکمل طور پر بیان نہیں ہو پاتے۔ نبیل صابری کا نعتیہ اسلوب نہایت سادہ ہے۔ انھوں نے نعت میں جہاں حضور اکرم ﷺ کی شخصی عظمت، اخلاقِ حمیدہ و فرقانِ حمید اور علمی رفعت کو اپنی بخشش کے لیے بیان کیا ہے، وہاں ماحول میں پھیلی ہوئی گھٹن کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کے کلام میں معاشرتی ناہمواریوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔

منبعِ فیضانات، خلاصۂ موجودات، فخرِ موجودات، صاحبِ آیات، صاحبِ معجزات، جامعِ صفات، ارفع الدرجات، آیاتِ بیّنات، لطافتِ نیساں، گہربارِ حمایت، اکمل البرکات، واصلِ ذات، رونقِ مسندِ نبوت، پیشرِ علم و حکمت، نازشِ سموات، غنچۂ رازِ وحدت، جوہرِ فردِ عزت، ختمِ دورِ رسالت، محبوبِ رب العزت، مالکِ کوثر و جنت، سلطانِ دین و ملت، شمعِ بزمِ ہدایت ﷺ کے حضور نبیل صابری نے مسلمانوں پر خصوصی رحم و کرم کے لیے دست بستہ عرض بھی کی ہے۔ عشقِ رسول ﷺ کے بغیر نعت کہنا نہ صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ نبیل صابری کی نعتوں میں سہلِ ممتنع پایا جاتا ہے۔ نبیل صابری نے اپنی جودتِ طبع کا وہ فقید المثال مظاہرہ کیا ہے جو عصرِ حاضر کے شعرا میں کم کم پایا جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے عقیدت کا چراغ ان کے من میں روشن ہوتا ہے۔ من کی روشنی ہی تن کے اجالے کا باعث بنتی ہے۔ نبیل صابری نے "ریاضِ نظر" میں جو نعتیہ گلستان سجایا ہے وہ ہمیشہ معطر رہے گا۔ اس کی خوشبو ہمارے دلوں کو سکون اور طبیعت کو سرور دیتی رہے گی۔

حاصل

شاعر: عاکف گمریانی

صفحات: 126 قیمت: 480 روپے ناشر: باہو پبلی کیشنز، پشاور

شاعری کا ذوق قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ وہ لوگ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں جنھیں الفاظ کی حرمت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ عاکف گمریانی بنیادی طور پر سائنسدان ہیں۔ ایک سائنسدان کائنات پر بہتر انداز میں غور و فکر کر سکتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں کیسے سفر کیا جا سکتا ہے۔ وہ چیزوں کی ہیئت اور ان کی ساخت پر بھی غور کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لفظوں کی شیرازہ بندی بھی نہایت عرق ریزی سے کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سائنس اور ادب دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ عاکف گمریانی نے اردو غزل اور نظم دونوں میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ "حاصل" کے نام سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اس مجموعہ میں ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قطعات بھی اس میں شامل ہیں۔ ان کے اس شعری مجموعہ پر نامور شاعر و ادیب افتخار عارف لکھتے ہیں:

"عاکف گمریانی ایک سائنسدان اور شاعر اپنا پہلا شعری مجموعہ "حاصل" جہانِ ادب میں لے کر آ رہے ہیں تو ہم حرف و

لوگوں کے لیے طمانیت کا باعث ہے۔ دنیا مادیت کے سیل بے لگام و بے تحاشا میں فن ہنر شعر کو بھی حاصل سمجھ رہی ہے او رایسے عالی دماغ سائنسدان اپنے جذبات و احساسات کا گوشوارہ لیے "حاصل" کی شکل میں آتے ہیں۔ مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی سوچتی سوال کرتی ہوئی نظمیں اور احساس و جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی غزلیں عاکف گریانی کے تخلیقی جوہر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ دل اور دماغ کا ایسا حسین امتزاج کم کم دیکھنے میں آیا ہے میں بارگاہ علم و فن میں عاکف کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

عاکف گریانی کے شعروں میں بھی سائنسی اصطلاحات کا استعمال ملتا ہے۔ ان کے شعر پڑھتے ہوئے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ سائنسی لیبارٹری میں شعری تجربے کر رہے ہوں۔ ذرے کو توڑنے پر کیا ہوتا ہے اور اس کی پہچان ہر کسی کے بس میں نہیں یا ایک سائنسدان ہی جان سکتا ہے اور وہ یہ بھی جان سکتا ہے کہ اس کی تقسیم کے نتائج کیا ہوتے ہیں اقبال نے اس کا نتیجہ یوں اخذ کیا ہے:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اس ضمن میں عاکف کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر ایک ذرے کی تقسیم پر یہ عقدہ کھلا ہم آج ذرے کی پہچان سے پرے پہنچے
مرے شعور میں افسردگی کے سارے عمل کسی توقع کے امکان سے پرے پہنچے

ہمارے خلیوں میں دکھ کے مادے چھپ رہے ہیں بس اس تناظر میں جان دل کا خیال رکھنا

سبزہ و گل نے جس کی آمد پہ راستوں میں کشیدہ کاری کی
آج خوشبو سے ایسے پتا ہے جیسے صورت ہو تابکاری کی

مذکورہ بالا اشعار میں "ذرے"، "افسردگی"، "خلیوں"، "مادے"، اور پھر "تابکاری" ایسے الفاظ سائنس کی عطا ہیں جن کو عاکف گریانی نے اپنے شعروں میں نہایت عمدگی سے باندھا ہے۔ عاکف گریانی کی غزلوں کے علاوہ یہی صورت ان کی نظموں میں بھی عیاں ہے ایک نظم "فطری فرعون" میں انھوں نے "سوچ کے تولیدی مرکز" کی نشاندہی بڑی عمدگی سے کی ہے۔ عاکف گریانی کے ہاں رومانویت سے بھرپور شعر ملتے ہیں۔ سائنسدان ہونے کے باوجود ان کے ہاں رنگ تغزل بھی دکھائی دیتا ہے وہ محبت کی نزاکتوں کو نہایت سلیقے سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے شعروں میں ہجر فراق اور وصال کے لمحات کو نہایت عمدگی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تمہارا حسن مرے ذہن میں سمو پائے کبھی کے قرب صورت کا انعطاف کریں
لحاظ وصل کی کیفیتیں بیان نہ ہوں لبان زیر تلفظ ہی اعتراف کریں

وفا کی تحصیل میں فکر نہ چھلکا جاناں   جنھیں آپ نے صورت قدی سہانی ہے

عاکف گریانی کی نظموں میں بھی رومانویت بھرپور انداز میں موجود ہے۔ وہ محبت کے احساسات و محسوسات کو بڑے سلیقے اور قرینے سے بیان کرتے ہیں۔ وہ محبت میں بھی لکھنوی تہذیب کے پروردہ محسوس ہوتے ہیں ان کی ایک نظم "تمھیں بتلانا پڑتا ہے" کی چند سطور ملاحظہ ہوں

> تمھیں ماضی میں رہنا اچھا لگتا ہے / تو میں ہر رات یادوں کی مہک تعمیر کرتا ہوں / تمہارے ذہن کو معمور کرتا ہوں / وہ نغمے جو ہم نے فرصتوں میں گنگنائے تھے / کسی لے پر جنھیں اک ساتھ سنتے تھے /
> تمھیں سنوانا پڑتے ہیں

عاکف گریانی کی شاعری دیگر ہم عصر شعرا سے بہت مختلف ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عامر سہیل لکھتے ہیں:

> "حاصل" کی شعری فضا روایتی شاعری سے یکسر مختلف ہے اس لیے قاری کی ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے۔ عاکف کی شاعری کا حاصل حسن یہ ہے کہ اس نے شعری روایت کے ایسے چراغ جلائے ہیں جو پچھلے تھے ان میں جدت اور ندرت پیدا کر دی ہے۔ ہمارے یہ شاعر دوست زندگی کے ہر معاملے میں اپنا راستہ خود بنانے کا قائل ہے بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ اردو ادب کا مجتہد شاعر بھی ہے کہ جس نے فلکیات و نظریات میں ایسے ایسے انچھوتے شعر اور نظمیں لکھی ہیں جو قاری کو بار بار حیرت اور خوشی سے دوچار کرتی ہیں۔ عاکف ایک جادوگر شاعر بھی ہے جو شعری لطافت اور سائنسی صداقت کو باہم آمیز کر کے ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے جس میں فکر و نظر کے ابعاد (Dimensions) اور امکانات جدید شعری وسعتوں کا پتہ دیتے ہیں۔"

وحدت الشہود کے نظریے نے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں ہر ایک شے میں اللہ پاک کا وجود موجود ہے۔ سائنس اور جدید تھیوری نے جب تجربات و مشاہدات کے ذریعے ثابت کیا ہے تو اللہ پاک پر اور بھی ایمان پختہ ہو گیا ہے۔ عاکف گریانی چونکہ سائنس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں انھوں نے بھی اپنی سائنس کے ذریعے اللہ پاک کی وحدانیت کو تسلیم کیا ہے اس کا اظہار ان کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔
عاکف گریانی نے پیش لفظ "لاحاصل سے حاصل تک" میں لکھا ہے:

> "حاصل ایک اضافی لفظ ہے۔ ایک کا حاصل دوسرے کے لیے لاحاصل ہو سکتا ہے۔ بچپن کا حاصل جوانی میں لاحاصل ہو جاتا ہے جب بڑھاپا آتا ہے تو اس کی ترجیحیں اور ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہر جہت اور مکان کا اپنا حاصل ہے یعنی فرد، زمان اور مکان حاصل کی شرح کرتا ہے۔ شاعر کا بھی اب تک کوئی معتبر "حاصل" موزوں نہیں ہو پایا۔ اس لیے اگر اس "حاصل" سے کچھ حصول نہ بھی ہو تو شاعری بھی ذریعہ حصول رہائی نہیں، کہ یہ تو فقط جذبوں کا ترجمان ہے۔"

عاکف گریانی نے کائنات کے سولر سسٹم میں شاعری کے بے جان لفظوں کو اس انداز سے متحرک کیا ہے کہ ذرہ ذرہ اپنی چمک دکھا رہا ہے۔ جس طرح زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اسی طرح عاکف کے لفظ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مدار میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ بزم علم و فن کے صدر واحد سراج نے بھی ان کے جذبے اور اسلوب کی تعریف کی ہے۔

اس شعری مجموعہ کے مطالعہ سے قاری نئے تازہ وکشیدہ وجود اعظم کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے اور کہیں شریانوں میں بچھی محسوسات سے گزرتا ہے۔ زمین کے دکھوں کا اندازہ کرتا ہے تو کہیں اندھیرے اجالے کی تیز کے عمل سے گزرتا ہے۔ حالات کی تابکاری ہو یا ہجرتوں کی وحشت کا عالم ''کیٹ واک'' اور ''آئینہ'' شعور پر کس انداز سے سایہ فگن ہوتے ہیں یہ کمال عاطف کو حاصل ہے۔ احمد حسین مجاہد رقم طراز:

> ''عاطف گرداتی کی شعری اشارات، حضرت کا آئینہ مرقع ہے جس کے صفحات علوے فکر و شائستگی بیان کے آئینے میں مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے یہاں اجتہاد فکر اور صلابت فکر کے کرشموں کی ہم ذات ہے۔ عظمت خیال کے ساتھ انتخاب الفاظ اور ندرت بیان کے قرینے بھی ہاتھ آ جائیں تو سمندروں میں جزیرے اور صحراؤں میں نخلستان نمودار ہونے لگتے ہیں۔ عاطف ان جزیروں میں رحمدلی کے بیج بوتا ہے انھیں خون جگر سے سینچتا ہے اور جب یہ بیج تن آور شجر بن جاتے ہیں تو وہ ان کے سائے میں بیٹھ کر سمندوں کے ادھر کہیں دیکھنے لگتا ہے۔ جستجو ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، سفر ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ عاطف ان تمام مراحل سے سرخرو گزرا ہے۔ اس لیے اس کی شاعری جہاں تمہ طرف اذہان کو انگیخت کرتی ہے وہیں سیرابی قلب اور وسعت نظر کا بھی باعث بنتی ہے۔''

نصف صدی دا قصہ

مصنف : انور ندیم علوی

صفحات: 128   قیمت: 500 روپے   ناشر: [illegible] پبلی کیشنز، لاہور

انور ندیم علوی کالم نویسی کے حوالے سے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو اور پنجابی کالم نویسی میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔ زیر نظر کتاب ۳۷ کالموں پر مشتمل ہے۔ کالموں کے علاوہ کئی مضامین بھی کتاب کی زینت ہیں۔ روزنامہ ''خلیفہ'' لاہور، ''سائبان'' لاہور، ''تجزیہ'' لاہور اور کئی دوسرے اخبارات میں شائع ہونے والے یہ مضامین ملی وقومی، معاشرتی، تجسسی اور ادبی نوعیت کے ہیں۔

محسن بھوپالی دی یاد وچ۔ پروفیسر مظفر عارفی۔ پروفیسر مظفر عارفی دا اردو کلام۔ وزروں دی دولت نال مالو مال —— مسعود چودھری۔ جیک منگنا جرم اے۔ کالا باغ ڈیم۔ ادھی مربعی۔ دل جیہے کیہ دیکھو۔ عشق دی کتاب دا اک ورقہ —— امرتا پریتم دی یاد وچ۔ آکھاں وارث شاہ نوں بابائے ادب —— احمد ندیم قاسمی دی یاد وچ۔ بابائے ادب احمد ندیم قاسمی۔ سانجھاں۔ وقت دولت اے۔ ویلے دی اگ۔ آبادی نے منصوبہ بندی۔ رمضان عید تے مہنگیائی۔ حضرت امیر چناں نوں یاد کرن دی لوڑ۔ میاں ہدایت اللہ۔ ایاز امیر جی! رب کولوں خیر منگو۔ کتاب عشق۔ سخت جان لوگ۔ بی بی عابدہ دے وچار۔ دانش دا دریا۔ پنجابی ماں بولی۔ شیخ ایاز دی شاعری دے پنجابی ترجمے۔

احمد سلیم ۔ شیخ ایاز (پنجابی ترجمے) ۔ مذہب تے دھرتی ماں ۔ کامیابی دور نہیں ۔ ملا روے خدا ـــــ وسعت اللہ خان ۔ رنجیر سنگھ پھلوں بھرا واڈا شاعر ۔ منیر نیازی ۔ کرتار سنگھ ـــــ پاکستان وی کہانی ۔ بابائے پنجابی ـــــ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ۔ منو بھائی! اے قیامت کیوں آئی ۔ ہیرا تی ۔ استاد دامن ایسے مضامین ہیں جو انور ندیم علوی نے کتاب کی زینت بنائے ہیں ۔ پنجابی کالم نویسی میں جن احباب نے قومی سطح پر شہرت حاصل کی ہے ان میں انور ندیم علوی صف اول میں ہیں ۔ کتاب کا انتساب حضرت بابا بلھے شاہ، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر اور ڈاکٹر صغریٰ صدف کے نام کر کے انھوں نے ادب شناسی اور انسان شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

مضامین و کالم میں اشعار کے برجستہ استعمال نے کتاب کی زینت میں اضافہ کیا ہے ۔ طنز و مزاح کا عنصر بہت سے کالموں اور مضامین پر سائبان کی طرح چھایا ہوا ہے ۔ یہ کالم وقت کی اہم ضرورت ہیں ۔ سیاسی اور سماجی عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انور ندیم علوی معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ انھیں پاکستان کے مسائل کا علم ہے اور وہ ان کا حل تلاش کرنے کے لیے سرگرداں ہیں ۔ تجربات و مشاہدات سے بھرپور ایک منظم کالم نویس انور ندیم علوی نے صحافت اور ادب دونوں میں جگہ بنائی ہے۔

ناھموار زمین (ناول)

مصنف : اقبال فیروز

صفحات: 184 قیمت: 500 روپے ناشر: ورق بُک پبلشرز، چکوال

ناول، کسی بھی زبان کا ہو اپنے دامن میں کئی باتیں رکھتا ہے ۔ اردو ناول کا آغاز ۱۸۶۹ء سے تصور کیا جاتا ہے ۔ ڈپٹی نذیر احمد نے "مراۃ العروس" تحریر کر کے اصلاحی تحریک کا انداز اپنایا ۔ اردو ناول کا کینوس بہت وسیع ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات سما جاتے ہیں ۔ اقبال فیروز کا تعلق چکوال سے ہے ۔ چکوال ادبی اعتبار سے ایک زرخیز خطہ ہے ۔ اقبال فیروز نے افسانے سے ناول کی راہ اختیار کی ہے ۔ ان کا ناول "ناھموار زمین" جنگ عظیم کے خطہ پھوہاڑ پر اثرات کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے ۔ جنگ نسل انسانی کے لیے بھیانک نقصان دہ ہوتی ہے ۔ ایٹمی ہتھیاروں نے جنگ کی ہولناکی میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے ۔ اس کی تباہی و بربادی کے نقصانات انسانی عقل سے ماورا ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکی B28 بمبار طیاروں نے ۹ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے دو حسین شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرا کر انھیں مسمار کر دیا ۔ امریکی پائلٹ کو شاید خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے اثرات کتنے خطرناک اور مہلک ہو سکتے ہیں ۔ اس کے بعد آج تک اس کی تباہ کاری کے اثرات موجود ہیں ۔ اس ناول میں اسی ماحول اور ایٹمی جنگ کے واقعات کو بڑی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے ۔ دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء کے عرصہ پر محیط ہے ۔ اقبال فیروز کا یہ ناول "ناھموار زمین" جنگی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ اقبال فیروز کے دادا انور خان اس جنگ میں برما کے محاذ پر لڑتے ہوئے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے تھے ۔ مصنف نے ناول کا انتساب اپنے دادا کے

نام کچھ یوں کیا ہے:

"میرے دادا انور خان کے نام جو جنگ عظیم دوم میں برما کے محاذ سے اپنے گھر واپس نہ آ سکے"

اس انتساب میں وہ دکھ اور کرب بھی موجود ہے جو کہ ان کے دادا جان کے واپس نہ آنے کا ہے۔ یہ ناول بھی اسی دکھ اور کرب کے انہی احساسات کے نتیجہ میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول "ناہموار زمین" میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جنگ عظیم دوم کے اثرات پوٹھوہاری زمین پر کیسے مرتسم ہوئے۔ اس حوالے سے مصنف خود لکھتا ہے:

"جنگ عظیم اول اور دوم ہمارے خطے میں تو نہیں لڑی گئی تھی لیکن اس کے بھیانک اثرات ہماری تاریخ کے سینے پہ بھی پیوست ہوئے اور پوٹھوہار کی اس سرزمین پہ ماؤں کے کتنے لال اس جنگ کا ایندھن بنے اور کتنے ہی وطن سے دور جرمن اور جاپان کے کیمپوں میں ایک ایسی اذیت ناک صورت حال سے دوچار رہے جس کا تصور کرتے ہوئے بھی انسانی روح کانپتی ہے۔ یہ جنگ چھیڑنے والے ناعاقبت اندیش انگریز اور جرمن تھے جن میں سے ایک اپنی نوآبادیوں کو سورج کے طلوع اور غروب ہونے کی حدود اور قیود سے بھی آگے تک دیکھنا چاہتا تھا اور دوسرا اپنی سرحدوں میں مقید اس نظریے کا حامی تھا کہ رات اسی سورج کے پیچھا پے اقتدار کے لیے زمین چاہیے۔"

اس اقتباس میں مصنف نے بتایا ہے کہ دونوں ممالک نے اپنے اقتدار کی ہوس میں انسانیت سوز مظالم اور تاریخی بدترین تباہی اور بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ناول کا اسلوب نہایت سادہ اور رواں ہے۔ کہیں بھی کوئی ابہام موجود نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کو ناول کا حصہ بنا کر مصنف نے ناول میں حقیقت نگاری کو اجاگر کیا ہے۔ مصنف نے اس ناول کو ایک تاریخی دستاویز بنا دیا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے نہایت عمدگی اور عرق ریزی سے برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کے تسلط کے خلاف مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں میں مزاحمتی رویے بھی ابھر کر سامنے آئے۔ بھگت سنگھ بھی ایسا ہی کردار تھا جس نے آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ بھگت سنگھ ایسے بہادر اور دلیر لوگوں کی وجہ سے انگریز اس خطے سے نکلنے پر مجبور ہوا تھا۔ ناول نگار نے آزادی کی قدر و قیمت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک جگہ بھگت سنگھ کے حوالے سے لکھا ہے:

"ایسا نہیں ہے ہر قربانی کے بعد آزادی کی منزل تھوڑی ہی قریب آ جاتی ہے۔ جدوجہد میں تیزی آ جاتی ہے۔ حکمران جن حربوں کو اپنے لیے سود مند سمجھتا ہے دراصل یہی حربے آزادی کی راہ میں تعمیر کی جانے والی دیواروں میں شگاف ڈال دیتے ہیں" بھگت سنگھ نے جیل کے اندر سے وائسرائے ہند لارڈ ارون کو خط لکھا تھا کہ اس کی پھانسی سے سامراجی حکومت کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا تم ہمیں مار تو سکتے ہو لیکن ہماری قوم سے آزادی کا جذبہ ہرگز نہیں چھین سکتے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو جنگی قیدی کا درجہ دیا جائے اور انہیں پھانسی پر لٹکانے کی بجائے گولی مار کر ختم کیا جائے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس کی پھانسی سے چند دن قبل اس کا ایک دوست پران ناتھ مہتہ اس سے ملا اور اس سے رحم کی اپیل پر دستخط کرنے کی درخواست کی مگر بھگت سنگھ نے انکار کر دیا۔"

اقبال محمود نے یہ ناول جن کرداروں کے بل بوتے پر تاریخ میں ڈھالا ہے وہ مرزا شہسوار بیگ، مرزا سلطان بیگ، صوبیدار

اللہ دتہ، نور دین عرف نورا، نوراں بیگم، بیلا ماسٹر مولوی احمد دین، سردار کرم سنگھ، اللہ بخش، نیک محمد، زرینہ، گاما بھنگی، امیت سنگھ، بھاگاں، الف دین، احمد خان، غلام محمد، موتی، بشنو، بیگم اور دیگر شامل ہیں۔ اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ مناسب مقامات پر تواریخ درج ہیں۔ ایک خاندان کی کہانی تغیر و تبدل کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ۱۸۴ صفحات پر چھ سالہ دوسری جنگ عظیم کے حالات جاندار کرداروں سے مزین ہیں۔ اقبال فیروز نے ۲۰ جنوری ۲۰۲۱ء (مدتوں پہلے) کا آغاز بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

''ہندوستان کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو سری لنکا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ نے یہیں سے جنم لیا تھا اور اس سے ذرا آگے برصغیر ہند پاک جس کی تہذیب کی کڑیاں اسی خطے سے جڑی ہوئی ہیں۔ تاریخ سے پہلے یہ پہلا دوسرا خطہ تھا جہاں سے نسل انسانی نے اپنی بقا کی خاطر سب سے پہلے ہجرت کی ہوگی۔ یہیں پر ہی خطہ پوٹھوہار بھی موجود تھا جس کی تہذیب کتنی ہی صدیوں کے قصے بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں آج سے دس ہزار سال پہلے کی آبادیوں کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ سکندر اعظم وسط ایشیا کی ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد جب سمرقند، بخارا اور سمرنا سے ہوتا ہوا ٹیکسلا اور وہاں سے راولپنڈی پہنچا تو اس کے لشکر نے نالہ لئی کے کنارے ڈیرے ڈالے اور یہاں کی وادیوں کو یونان کی سرزمین سے تشبیہ دی۔ ہندوستان پہ مغلوں کی حکومت تھی، سکھوں کا دور تھا یا انگریزوں کا راج تھا اس علاقے کی ہمیشہ ایک نمایاں حیثیت برقرار رہی۔''

برما خصوصاً رنگون میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم و ستم آج کل کی بات نہیں یہ قدیم روایت ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے لاتعداد مسلمانوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک ہوتا رہا۔ رنگون سے جاپان جانے والے قیدیوں کی حالت زار بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ۱۸۱۱ زخمی جنگی قیدی جاپانیوں کے رحم و کرم پر تھے اور بھوک پیاس سے مرنے والے ۱۲۹۲ افراد پر ماحول بھی نوحہ کناں تھا۔ اقبال فیروز نے جنگ کے اختتام پر حالات کی عکاسی یوں کی ہے۔

''یہ فروری ۱۹۴۵ء کی ایک منحوس شام تھی کیمپ میں جاپانی فوجی نوجوان قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹرکوں میں بھر رہے تھے جو جس حالت میں تھا اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ٹرک میں دھکیل دیا جاتا۔ جو ذرا سی کوتاہی یا سستی دکھاتا اسے بندوقوں کے بٹ سیدھے راستے پر ڈال دیتے۔ یہ مصیبت اس وقت نازل ہوئی جب خان اور بھولا چاچا الف دین کے پاس بیٹھے اسے تسلی دے رہے تھے۔ دونوں ایک ساتھ ٹرک میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب ان کی منزل کہاں ہے۔''

ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر ارشد محمود نے ناول کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

''ناول کا پلاٹ اور بیانیہ بظاہر ان کرداروں اور ان کی صورت حال کی مانند سادہ ہی نظر آتا ہے مگر سادہ کاری کا یہ پیرایہ ناظر ایک خاص قسم کی معنویت کا ابلاغ بھی کرتا ہے۔ ناول کے پلاٹ میں اگرچہ کچھ نئے قصے بھی ضمنی طور پر بیان کیے گئے ہیں لیکن اس میں وحدت تاثر کی کیفیت پائی جاتی ہے اور کہانی پر گرفت مضبوط نظر آتی ہے جو بہرحال ایک نیم تاریخی، نیم تہذیبی اور نیم رومانی ناول کی کامیابی کی دلیل ہے۔ مصنف کے شگفتہ اسلوب بیان، برجستہ برجستہ سادہ جملوں نے نثری حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ ناول کا اختتامیہ بھی بڑا خوبصورت ہے کہ ایک طرف ہزار دکھوں کے باوجود محمد

خان اور ریکھا کا ملاپ قاری کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بن جاتا ہے اور دوسری طرف قیامِ پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی آزادی کے آفتاب کی کرنیں ماحول کو تابناک بنا دیتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ چھلاں کے ادبی منظر نامے پر جہاں شاعری کے کئی مجموعے اکثر و بیشتر اپنی جھلک دکھلاتے رہتے ہیں وہاں ایک منفرد موضوع پر تحریر کیا ناول بھی طلوع ہوا ہے۔''

نسلِ نو کے لیے ورق ہی نہیں کیشتر چھلاں کی یہ کاوش قابلِ تعریف ہے۔ اقبال فیروز نے قرطاس و قلم کے توسط سے دوسری جنگ عظیم کا نقش اس انداز سے کھینچا ہے کہ جیسا قاری اس کا ہم سفر ہو اور اس بات سے انکار مشکل ہے کہ

''وقت کے دھارے میں قدامت اور جدت متوازی بہتے ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی کشش ہے یعنی انسان ماضی کو حال میں بھی زندہ رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اقبال فیروز بھی ان میں سے ایک ہیں لیکن ان کا کام عام افسانوں کی بہ نسبت مشکل ہے کہ انھوں نے اپنی تحریر کے ذریعے ماضی کے بہت سے درد محسوس کر کے قاری کے سامنے رکھے ہوتے ہیں جو محض ادبی میں ہونے پانے لکھنے سے بے حد مشکل کام ہے مگر اقبال فیروز اس کام کے ماہر ہیں۔''

مختصر ناول میں ایک طویل داستان مقید کرنا اقبال فیروز کا گراں قدر ادبی معرکہ ہے۔

خندہ نواز

شاعر: ڈاکٹر بدر منیر

صفحات: 176 قیمت: 500 روپے ناشر: مثال پبلشرز، فیصل آباد

عالمی شہرت یافتہ نقاد، شاعر و ادیب ڈرائیڈن کا کہنا ہے کہ حسِ لطافت کے بغیر زندگی میں چاشنی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم کسی نہ کسی انداز میں دوسروں پر یا خود پر ضرور ہنستے ہیں۔ مزاح زندگی کی ناہمواریوں سے پیدا ہوتا ہے۔ مزاح زندگی کی تلخیوں کا مداوا ہی نہیں کرتا بلکہ معاشرے کے بگاڑ کی درستی کا باعث بھی بنتا ہے۔ دوسرے کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیرنے والے اپنے ذاتی آنسوؤں کو چھپا کر ہمیشہ مزاح کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے چہرے پر دکھاوے کا تبسم رقص کناں ہوتا ہے لیکن پلکوں پر دل کے دیے جلتے ہیں۔ مزاح زندگی کی علامت ہے۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں، کے مصداق معاشرے کے بگاڑ کو درست کرنے کے لیے مزاح نگاروں نے تلخ حالات سے مزاح کشید کیا ہے۔ موجودہ دور میں شاگردِ رشید ڈاکٹر بدر منیر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ عصرِ حاضر میں وہ بدرِ مزاح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے سنجیدہ شاعری کرتے کرتے اچانک مزاح کی کروٹ لی تو پھر وہ مزاح ہی مزاح میں بہت آگے نکل گئے۔ ''اڑاوے'' سے شروع ہونے والا سفر ''خندہ بازار'' تک پہنچ کر ''خندہ نواز'' ہوا ہے۔ بدر منیر خوش قسمت ہیں کہ انھیں اس میدان میں بہت کامیابی و شہرت نصیب ہوئی۔ وہ عالمی شہرت یافتہ مزاح نویسوں میں شمار کیے جانے لگے۔ مجھے فخر ہے کہ ۱۹۸۱ء میں وہ

گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں میرے شاگرد رہے اور بزم ادب کے زیر اہتمام مجالس سجانے میں پیش پیش رہے۔ پھر یوں ہوا کہ ہر مزاحیہ مشاعرے، ہر ٹی وی چینل پر بدر منیر کی شرکت لازمی تصور کی جانے لگی۔ بدر منیر کی شہرت کا گراف ملکی سرحدوں کو پھلانگتا ہوا دیگر ممالک میں بھی جا پہنچا۔ نیویارک میں مقیم اردو کے ممتاز مزاح گو شاعر خالد عرفان ان کے طنز و مزاح کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر بدر منیر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں زورِ بیان اور شگفتگی دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام خوبیوں سے نوازا ہے۔ ان کے فن میں شاعری اپنے تمام لوازمات کے ساتھ نمایاں ہے۔ وہ ایک ایسے مزاح گو ہیں جو داد و تحسین سے قطع نظر مزاحیہ شاعری میں گرتے ہوئے معیار کو سنبھالا دینے کے لیے بہت عرصے سے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہیں اور بحر کی تنگی سے مصرع کھینچنے کا فن جانتے ہیں۔"

بدر منیر کے فکر و فن خصوصاً مزاح نگاری کے حوالے سے اخبارات و رسائل نے کئی مضامین شائع کیے ہیں۔ ان کے ہم عصروں نے بھی ان کی انفرادیت کو سراہا ہے۔ سوشل میڈیا ہو یا اخبارات و جرائد بدر منیر اپنی مسکراہٹوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ معروف ناقدین، مبصرین، مفکرین، محترم جمیل احمد عدیل، پروفیسر اسرار احمد، طالب انصاری، ڈاکٹر اختر شمار، ادریس آزاد اور دیگر نے عزیزم ڈاکٹر بدر منیر کی شگفتہ بیانی اور مزاحیہ اسلوب کی خوبصورت لفظوں میں تعریف کی ہے۔ بدر منیر کا مشاہدہ اور تجربہ ان کے اسلوب میں جھلکتا ہے۔ وہ معاشرے کے جن پہلوؤں کو بہ نظر غائر دیکھتے ہیں قرطاس و قلم انھیں اپنے دامن میں سمو لیتا ہے۔ انھوں نے مزاح کی روشنی مہیا کرنے کے لیے اندھیروں کے دامن چاک کیے اور اداؤں سے حقائق حاصل کر کے تذکار رنگین کر دیے۔ بدر منیر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کی مہمان نوازی ہے سمجھ سے باہر — کاٹ کے آم کھلاتا ہے جو تلوار کے ساتھ

ملتا نہیں سکھ چین لگاتار مسلسل — رہتا جو سینے میں ہے آزار مسلسل

ہم کو پوچھے کے سوالات پہ رونا آیا — رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

اس لیے ہیں مجھے ناپسند چوڑی فروش — تمہارا ہاتھ ہمیشہ پکڑ کے دیکھتے تھا

بندہ نواز، بدر منیر نے بندہ نوازی کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ ظاہری خد و خال سے مزاح کے کسی زاویے پر پورے نہیں اترتے لیکن ان کی مزاحیہ شاعری سے پتا چلتا ہے کہ ان کی ذات میں گدگدی کرتے جذبوں کا خزینہ مقیم ہے۔ جب وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی ناہمواریوں اور چھپ چھپا کر ملک لوٹنے والوں کو دیکھتے ہیں تو وہ مزاح کے خنجر سے انھیں نہ صرف ذبح کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ سنگین غزلوں کا بارود اس انداز سے پھینکتے ہیں کہ ان کا حلیہ اتنا بگڑ جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بن جاتے ہیں۔

"اردو مزاح امید سے ہے" میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے ڈاکٹر بدر منیر کے فکر و فن کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ حقیقت ہے کہ شاعری لطافتیں تلاشنے کا نام ہے اور مزاح شرارتیں تراشنے کا کام۔ ڈاکٹر بدر منیر دونوں کی نہایت

مناسب تدبیر کرتا آتی ہے۔ اچھے مزاح نگار کا کمال ہی یہ ہوتا ہے کہ جن چیزوں کے تذکرے پر آنسو نکلتے ہوتے ہیں وہ وہاں گدگدی کا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔''

مولا مری دعا کو اتنا تو ویٹ دے دے　　گر وہ نہیں تو اس کی فوٹو سٹیٹ دے دے

ڈاکٹر بدر منیر کی غزلوں میں متنوع موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ظالم حسینہ کے گیسو، سرمئی آنکھوں کا کاجل، محبوبہ کی بے وفائی، ماڈرن ہیئر اسٹائل کا عشق، وجود زن، آن لائن تدریس، دانت سے نکلتے بال، ست الوجود ولبس، زلفوں کے پیچ و خم، گھریلو داؤ پیچ اور روزمرہ زندگی کی پتنگ بازی میں کبھی ناکامیاں اور ذوق کی حد سے ڈالے گئے ڈورے، بدر منیر کے ہاں کثرت سے موجود ہیں۔ دیگر شاعروں کی طرح بدر منیر کے ہاں بھی 'عورت' کثرت سے موضوع سخن ہے۔ ہم عورت کے عہد سے گزر رہے ہیں۔ بدر منیر نے اسی تناظر میں عورت کو اپنے کلام کی زینت بنایا ہے۔

شادی ہو جائے تو اتنا فرق زیادہ ہو جاتا ہے　　بیوی دگنی ہو جاتی ہے، شوہر آدھا ہو جاتا ہے

وجود زن کا حسین فلسفہ بجا لیکن　　سکوت زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

جو اہلیہ سے مجھے بحث میں شکست ہوئی　　تو میں گلی میں بڑی شان سے نکل آیا

پڑنے والے ہیں امتحان میں کیا　　بیگم آیا ترے گمان میں کیا

بیویاں چار اگر میرے مقدر میں نہیں　　کوئی گپ شپ ہی کرا دے میری دو چار کے ساتھ

غزلوں کے علاوہ موضوعاتی قطعات میں بھی بدر منیر نے اپنے سادہ اور پُرلطف اسلوب کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُن کے کلام میں خوشاب کے ڈھوڈے، وطیبے کی مٹھاس سے تو اپنی ذات کی شیرینی کا اظہار ہے۔ اُن کے کلام میں مٹھاس ہے کہ وہ بڑا آدمی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

عمومی طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ مزاح نگار شعرا موضوعات کے گلشن میں کسی ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں لیکن بدر منیر کا گلشن مزاح بڑا وسیع ہے۔ وہ تتلیوں سے اٹھکیلیاں بھی کرتا ہے اور ماحول کی ہمہ رنگی اور اپنے رنگ کی رنگارنگی میں بھی محو رہتا ہے۔ مزاح لکھنا دو دھاری تلوار ہے۔ ذرا سی لغزش سے حسن معانی کا تختہ الٹ جاتا ہے۔ بدر منیر نے مذہبی حوالوں سے بہت گریز کیا ہے۔ اسی لیے فقیہان شہر کی نظروں سے محفوظ رہا۔ مزاح، شگفتہ بیانی کا دوسرا نام ہے۔ مزاحیہ شاعری میں شگفتہ بیانی کے ساتھ شگفتگی کا ذکر کرتا ہوا شیر لانے کے مترادف ہے۔ بدر منیر کے ہاں اسلوب کا انوکھا پن اس کی کامیابی ہے۔ تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں مروجہ طنز و مزاح سے رشتہ الفت جوڑ کر بدر منیر میدان مزاح میں موجود ہیں۔

کون کہتا ہے غزل خوانی کی داد   مل رہی ہے حشر سامانی کی داد
چشم و لب سے وہ رہے ہیں اہلِ دل   مرغزارِ حسن، نسوانی کی داد

بدر منیر نے اندھیروں سے حسن کشید کیا ہے۔ محبوب سے لوگ بھی بچھڑا صرف خندہ نوازی کے لیے، کورونا کے رونا سے لے کر چمن پھیلائی مہنگائی تک بدر منیر لفظوں کو احتجاج پر اکسا رہے ہیں۔ ان کے الفاظ حکمرانوں کو آنکھیں دکھانے کے ساتھ معاشرہ کے غیر ذمہ دار شہریوں کے لیے آنسو گیس کا درجہ رکھتے ہیں لیکن چند لمحوں کے بعد آنسو گیس فضا میں اڑتے ہنسی فواروں میں بدل جاتی ہے۔

کر رہے ہیں جو جلسوں جلسوں میں خطاب   جادۂ فکر و عمل کی سمت چل سکتے نہیں
کیسے لائیں گے زندگی میں انقلاب   گھر میں مرضی سے جو کھچڑی بھی بدل سکتے نہیں

مختصر "خندہ ولا" ہر شخص کے لیے مسکراہٹوں کی بندہ نوازی ہے۔ بدر منیر کے اس مزاحیہ شعری مجموعہ کی پذیرائی آپ کے من میں بیٹھے تبسم کی بازیابی ہے۔

◆◆◆

مختصر تعارف

ہارون الرشید تبسم

شاہینوں کے شہر سرگودھا کو جن شخصیات پر بہت فخر ہے اُن میں پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم آج سر فہرست ہیں۔ ان کی 130 ادبی اور 27 نصابی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ یہ بات قابلِ فخر ہے کہ ان کتب میں تیس کتب کا تعلق پاکستان سے ہے۔ جشنِ آزادی 2021ء کے موقع پر ان کی دو کتب "وقارِ پاکستان" اور "قائداعظم شناسی" منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ماہرِ تعلیم، ماہرِ اقبالیات، مقرر، کمپیئر اور عسکری حلقوں سے اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ ادبی تقریبات میں انھوں نے اپنے جوشِ خطابت سے اپنا منفرد انداز منوایا ہے۔ گزشتہ 51 سال سے سرگودھا میں ہونے والی ملی و قومی تقریبات کی کمپیئرنگ ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔ تجزیوں اور تبصروں پر مشتمل ان کی بہت سی کتابیں ادبی حلقوں میں مقبولِ عام ہیں۔ مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے ادبی و قومی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پاکستان سے محبت ان کا اہم ترین وصف ہے۔ ان کی زندگی نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ وہ بحیثیت پروفیسر 20ویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے اور اب تحریر و تقریر میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ مرکز سے دور ہونے کے باوجود وہ سرگودھا سے علم و ادب کی جو آبیاری کر رہے ہیں اس پر ادارہ "تخلیق" انھیں مبارک باد پیش کرتا ہے۔ توقع ہے کہ ان کا تعاون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔

نوٹ: تمام دوستوں کا اخلاقی فرض ہے کہ جس محنت اور محبت سے ان کی کتابوں پر موجودہ دور کے عظیم لکھاری ہارون الرشید تبسم تبصرہ کرتے ہیں وہ انھیں فون کر کے ضرور ان کا شکریہ ادا کریں۔ فون نمبر: 03458637888   (ادارۂ تخلیق)

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿۱﴾ عزیزم سوہان اظہر جاوید!

نئی زمانہ ادبی جریدہ شائع کرنا ہی نہیں، اس کی ادارت بھی کارِ دشوار ہے۔ عزیزم سوہان اظہر جاوید لائقِ تحسین ہیں کہ وہ یہ دونوں کام بطریقِ احسن انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے جب تازہ شمارے پر اظہارِ رائے کرنے کو کہا تو مجھے خوشی ہوئی کیونکہ میں اس شمارے کے معیار سے اس قدر متاثر ہوا کہ از خود تبصرہ آرائی کا فیصلہ کر چکا تھا مگر افسوس کہ کچھ روز میری طبیعت ناساز رہی اور میں جو چاہتا تھا وہ نہ کر سکا البتہ رشید امجد صاحب کے گوشے میں شامل مضامین پر اپنی رائے دینے سے گریز نہ کر سکا۔

"تخلیق" کو ممیز و ممتاز رکھنے کے لئے عزیزم سوہان کو جس قدر صبر آزما سخت محنت کرنی پڑتی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ بہر حال پیشِ نظر شمارہ مقامِ اعتبار پر فائز ہے۔ خاص طور پر اس شمارے کی اہمیت اس بنا پر دوچند ہو جاتی ہے کہ یہ ایک ایسے افسانہ نگار کے گوشے سے مزین ہے جس نے اردو افسانے کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا۔ یہ گوشہ منفرد افسانہ نگار رشید امجد کی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ گوشے کا پہلا مضمون "رشید امجد اور تخلیقِ کائنات کے اسرار" کا پرچم کشا ہے۔ یہ مضمون "قرۃ العین طاہرہ" کی تحریر ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے انفرادی و اجتماعی لحاظ سے کرداروں کی تجزیہ کاری کی ہے اور خوب کی ہے۔ اس مضمون کو اہم گوشے کا بہترین انتخاب کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ دوسرا مضمون "پروفیسر امجد کی افسانہ نگاری" کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ مضمون "پروفیسر جلیل عالی" کی تخلیق ہے۔ عالی صاحب کا تخلیقی شعور مستحکم اور مشاہدہ وسیع ہے۔ خاص کر ان کی نفسیاتی تجزیہ کاری منفرد نوعیت کی ہے۔ ماورائے تعقل باتیں کرتے کرتے زندگی کی طرف لوٹنا عالی کا خاص فنی اسلوب ہے۔ آغا گل کا عنوان "علی بابا" ہی ان کے تخلیقی ارتفاع کا مظہر ہے۔ ایک مرحوم ہم عصر کے لئے کلماتِ تحسین کا چراغ روشن کرنا درویشانہ وصف ہے۔ ہمارے نزدیک ابدال بیلا کی طرح آغا گل کے اندر بھی ایک درویش متمکن ہے جو دنیوی اشیاء کو روحانی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید نے رشید امجد کا خاکہ تحریر کیا ہے جو یقیناً عقیدت مندی کے جذبات سے سرشار ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کے بعض نکات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ "رشید امجد ایک شخص، ایک عہد" حسین مجروح کا رقم کردہ مضمون ہے۔ انھوں نے روایتی افسانہ کا حوالہ دیتے ہوئے علامتی افسانے کا پس منظر بیان کیا ہے۔ علامتی افسانہ ایک کڑوی گولی ہے مگر رشید امجد نے اسے قبول کر لیا اور پھر اس میں نام بھی پیدا کیا جو یقیناً ایک کارنامہ ہے۔

رشید امجد کے دوسرے کوائف بیان کرنے کے بعد خاور اعجاز نے ان کے افسانوں پر خیال آرائی کی ہے۔ یہ ایک دشوار گزار کام تھا جسے اعجاز پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے اور یوں اپنے قلم کا لوہا منوا لیا۔ ان مضامین کے بعد مجھے افسوس ہے کہ ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے میں مزید قلم کاروں کو ان کی محنت کے ذکر سے نہ نواز سکا۔ معذرت!

قیصر نجفی (کراچی)

﴿2﴾ ایم سوہان ا

بہت ہی متاثر کن رشید امجد نمبر نکال کر حیران کر دیا۔ کیونکہ ہمارے ہاں سرکار دربار اور لابی والے ادیب ہی نام پاتے ہیں۔ "جان کی امان پاؤں" والے ادیب ہی مال بناتے ہیں۔ وطنِ عزیز کے کمرشل ازم نے ادب و تحقیق کو بھی سرکاروں ہی بنا دیا ہے۔ جبکہ ارشد امجد دربار اور درباریوں سے دور ہی رہتے تھے۔ میرے دوست اجمال ہلا بہت دنوں سے کم کم لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ شہزاد نیر اپنی عمر سے بڑے دانشور ہیں۔ شاعر تو بے بدل ہیں۔ علم پڑھنے سے شعور پیدا ہونے سے تخلیق کا عمل شروع ہونے لگتا ہے۔ پنڈت پادری کا مشترکہ ہتھیار 15 اگست 1890 سے اٹھا ہوا تھا۔ جو ساری کتابوں پر غالب آیا۔ سلطنت عثمانیہ کے سلیم اول نے کتاب چھاپنے پر پابندی عائد کر دی۔ کتاب چھاپنے پر سزائے موت مقرر کی گئی۔ اس ایک قانون کے باعث مسلمان باقی دنیا سے ہزار پیچھے رہ گئے۔ بلوچستان سے واپڈا کے کھمبے ہٹا دیئے جائیں تو پتہ نہیں چلتا کہ کون سی صدی چل رہی ہے۔ یہ واحد صوبہ ہے جہاں وال چاکنگ ملتی ہے "میرٹ کی لعنت ختم کرو"۔ لیاقت علی خان کا 1948ء والا کوٹہ سسٹم کبھی بھی ختم نہ ہو پایا۔ مسلم ملکوں میں دو ارب ان پڑھ ہیں۔ ان پڑھوں کا تناسب پینتالیس فی صد ہے۔ علم و ادب کیلئے تعلیم ضروری ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں ادبی رسالے دم توڑتے چلے گئے۔ سرکار چاہتی ہے کہ ٹیلی ویژن ڈراموں جیسا ادب تخلیق ہو۔ آپ نے بطور ایڈیٹر دیکھا ہوگا کہ فکشن کم ہوا جاتا ہے۔ ادبی رسائل میں بھی فکشن بہت کم ہوتا ہے۔ ادبی رسالہ جاری رکھنا ایک ادبی جہاد ہے۔ باہمت لوگوں کا ہی کام ہے۔ میں آپ کے لئے دعا گو ہوں۔

آغا گل (کوئٹہ)

﴿3﴾ پیارے سوہان اظہر جاوید جی، جو ایہاں ناواں اتے وسدے نے وسدے رہو

سوہنا اتے من موہنا تخلیق ملیا جنہوں پڑھ کے بڑا روح راضی ہویا۔ ایہہ سچ تہچھی ہر تحقیق، اوہ بھاویں افسانہ ہووے، نظم اتے غزل ہووے جاں کوئی ہور ایہو جیہا مضمون ہووے۔ ہر اک جون ہمسے وکھرے تے اوہ چنگا سوادلوں میں مانیا۔ ایس توں وکھ ایہہ کریں اینہاں بارے کجھ کہن دی گل کراں وی ہر سے ایس لکھے ہوئے نوں کیتے پڑھنا اے۔ پیارا اوہ پڑھن دی کیوں۔ ایہہ سچ کیہڑا میں کوئی تیر ماریا ہووے اے۔ فرض کرو کوئی تیر ماریا وی ہووے تاں اوہ ایہو کہے گے جو تخلیق سچی میری کے دی لکھت بارے جناب جمیل یوسف، ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، ڈاکٹر خورشید رضوی، جناب آصف ثاقب، بلوچستان وچ وسدے قاری آغا گل جی، محترمہ عذرا اصغر تے سیماب ودیڈ، ڈاکٹر ہارون الرشید تے ہور بہت سارے دوستاں نیں اپنے خطاں راہیں کدی کجھ نہیں لکھیا تاں اوہ میرے لکھے نوں کیویں پروان کرن۔ چلو ایہہ وی ٹھیک۔ پر میں ایہہ وی نہیں کہندا جو میری تحریراں تعریفاں دے قابل ہون تے جان پر بلدی جڑ دی صفت کرن نہ جاں کوئی اوگن نہیں۔ چلو ایہہ وی نہ سہی۔ ایہہ سچ کیہ سے دی گل کدھرے تے جان ہاں میں سمجھاں گا جو میری تحریراں وچ دھیان دے قابل ہان سمجھیا گیا۔ پر اجاتلی ایہہ کرنا وی گوارہ نہیں۔ ہے کہ میریاں چیزاں اینہاں دی ہونیاں نیں۔ تاں میں اوہناں اگے ہتھ جوڑ کے بینتی کرناں جو اوہ سوہان اظہر جی نوں کہہ دین جو ہر پاسی کر کے اینہاں تحریراں نوں تخلیق دا حصہ نہ بنایا کرن۔ ایہی صورت سچ ہے کہ میں آغا گل دیاں افسانیاں بارے ایہہ کیہاں جو اینہاں وچ پورا بلوچستان بولدا جاگدا آوندا اے۔ اے محترمہ عذرا اصغر دی اتے سیماب ودیڈ دے افسانے

حیاتی دے سارے رنگاں نوں ساہمنے لیاؤندے نیں۔ صبیح آ ہجیا اپنے افسانیاں نوں اکھراں دی کھمبیں ناول اگے وِکھاؤندے نیں۔ تے سلیم شہزاد دی نظم دیاں گلاں کھیاں سطراں چوں وڈیاں وڈیاں گلاں لبھدیاں نیں۔ ایسے طراں محمد انیس انصاری دی غزل اتے نظم وچ حالات حاضرہ وارا لا گولا اے تے شورستانی ویڈا اے۔ جمیل احمد عدیل دے افسانے اپنی مثال آپ ہوندے نیں۔ تسنیم کوثر اپنے افسانے نوں بڑی سادگی دے گھیرے وچ آکھدیاں نیں۔ جناب محمود شام دی غزل بڑے گھمبیر مسئلیاں نوں اجاگر کردی اے بھلاں میراں لہماں سوچاں نوں قاری کول وی ضرور کیتا اے۔ اودے حسن نوں پہلاں ایہہ ضرور سوچ گا جو جیہڑے افسانیاں جاں ہور دوجیاں لکھتاں نوں کے وڈے ایڈیشن معروف لکاری نیں کدی لکھ نہیں پایا اوہ وی ہے دو جہاں دیاں تحریراں دے بیکر جھاڑن گی۔ آخر جیہڑے وڈیاں واسطے ویروا کیتا اے اوہ تاں وی اپنی وٹے دی آج کل اوہ وڈے دی مداں وچ آ گئے نیں جنہاں نیں ایدھروں اودھروں ہو کجھ پانچ کے کجھ سرکاری تے کجھ غیر سرکاری ایوارڈ اکٹھے کر لئے ہوئے نیں اتے اپنی وڈیائی نوں لوکاں نوں ایہہ وکھاؤندے پھر دے نیں۔ ایہہ تاں ہوئی سادے دن دے اخساں واعمال۔ تن ذرا حکمت شہود فوٹل پر آئیے۔ دل آ جاؤ۔ ایہہ پرائیز دی اوہدوں بھٹائی بھارا ہو گیا سی جدوں ایہہ ایوارڈ شولاں ستاروں مالاں دی مالا یوسف زئی نوں ملیا۔ سلیا اے تے پڑھیا وی جو اس ایوارڈ دی میرا تی لئی بڑے جھٹر جا نیں چھوڑے نیں۔ ایہہ سائی بہت پڑھنا تے کجھ اجیہا لکھنا پیندا اے جیہڑا کردو جیاں کولوں بہت حد تائیں وکھرا کے ڈاڈا ہووے۔ اس گلوں مالا وی بہت پچھیں رہ گیاں نیں انہاں نوں نہ کجھ پڑھنا آیا تے نہ ای لکھنا۔ بس جیب کر کے انہاں نیں تے ایوارڈ لے کے اودھیاں سے اج کل۔ ایسے ایوارڈاں دے سر نے موجاں چواں مانڈیاں نیں۔ باقی رہ گیا میں۔ میرے کی ایہہ ایوارڈ دا ستے وچ دل نہیں مل سکدا۔ ہاں میں اپنے دن دلوں ایہہ امید ضرور رکھناں جو اللہ کرے کیوں دی کوئی انکا ساڈا ایوارڈ مل جائے تاں جو میں دی وڈیاں وچ شمار ہون لگ جاواں۔

حنیف باوا (جھنگ)

﴾4﴿ مدیرِ محترم! سلام مسنون!

تازہ "تخلیق" (جون ۲۰۲۱ء) زیرِ نظر ہے۔ تمام مندرجات مدیر کی عمدہ ادارت کے غماز ہیں۔ .... اداریہ حسبِ معمول عمدہ، خاصا کاٹ دار ہے اور اصلاحِ احوال کا خواست گار بھی۔ کاٹ دار اس لیے کہ اس میں آج کی ادبی دنیا میں موجود کئی بظاہر مخفی لیکن درِ اصل نمایاں اور اہم عیوب کی نشان دہی کی گئی ہے۔ مثلاً دولت کے زور پر غیر معیاری تحریروں کی اشاعت کروانا اور اسی بنیاد پر شہرت کے حصول کا شوق فراواں رکھنا۔ مدیرِ محترم کی طرف سے اس سلسلے میں ایک وارننگ بھی ہے کہ "میں ان سب بے وزن شاعروں اور بے ربط لکھاریوں کو ایکسپوز کرتا رہوں گا۔" صفحہ ۱۴ پر ایک دوسری وارننگ بھی ہے۔ وہ یہ کہ کئی کئی منزلہ نظمیں / غزلیں بھیج کر "ادارہ تخلیق" کو امتحان میں نہ ڈالیں"۔ اس کے ساتھ ایک ضروری گزارش کہ "الفاظ کی دولت کو کفایت سے استعمال کریں۔" ورنہ ردی کی ٹوکری کھلی آغوش لئے موجود ہے۔ پرچے کی ابتدا میں رشید امجد مرحوم کی حیات و فن پر گوشہ موجود ہے۔ بارہ عمدہ مضامین ہیں اہلِ قلم کاروں کے لکھے ہوئے اور سبھی ایک بات پر متفق کہ "رشید امجد ایک کہانی کار کی صورت میں آسمانِ ادب پر زندہ رہے گا۔" درحقیقت ان کی شخصیت راولپنڈی شہر سے مربوط تھی۔ وہ شروع سے ہی راولپنڈی کے تھے اور اسی شہر کے ہو کر رہے۔ گوشے میں ان پر بہت کچھ لکھا گیا لیکن ابھی اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ وقت اپنے اوراق پلٹتا رہے گا۔ مزید لکھنے والے آتے آئیں گے اور لکھت میں اپنا حصہ ڈالتے جائیں گے۔ تاہم

"تخلیق" کا "رشید امجد نمبر" جو بہت وقیع ہے، خود میں کافی کچھ سموئے ہوئے ہے اور ایک اچھی حوالہ جاتی حیثیت رکھتا ہے۔

حصہ مضامین میں غلام حسین ساجد نے معروف شاعر ایوب خاور کی تخلیقی صفات پر ان کی کتب کے حوالے دے کر ہمیں ایک عمدہ مضمون سے نوازا ہے۔ اپنی گراں قدر تحریر "تحقیقی انحطاط" میں ڈاکٹر ایوب ندیم نے ایک اہم مسئلے کی نشان دہی کی ہے اور وہ یہ کہ آج کل تحقیقی مقالوں کے موضوعات نئے اور اچھوتے نہیں ہوتے۔ وہ "ڈاکٹر طلبا" پارٹ ٹائم "اقسم" کے ہوتے ہیں، انھیں صرف ڈگری چاہیے، حوالوں کی تلاش، مواد اور معیاری تحریر سے کوئی مطلب نہیں۔ نتیجتاً اردو زبان و ادب کو ایسی نیم واندہ کاوشوں سے کوئی فائدہ نہیں اور یہ افسانہ سرائے میں "گیدڑ سنگھی" (آغا گل) بلوچستانی مہک میں رچا ہوا افسانہ لگا۔ کہیں کہیں وہی مخصوص احتجاجی اظہار رنگ والے "لولے" بھی ہیں، تاہم آغا گل ایسا منجھا ہوا لکھاری اپنی ہنرکاری سے اس کا اہتمام بخوبی کرتا ہے۔ "ان مرن شپ" (جمیل احمد عدیل) ایک خوبصورت و دل چسپ تحریر اور "دیا" تسنیم کوثر کی ماہرانہ اسلوب کے ساتھ گھریلو ماحول والی ایک اچھی پیش کش ہے۔ حصہ شعر میں خوب چمک دمک ہے۔ چونتیس شعرائے کرام کا کلام بلاغت نظام کہ جس سے قاری ذہنی بالیدگی پاتا ہے۔

محمد طارق علی (راولپنڈی)

﴿5﴾ پیارے مدیر تخلیق سونان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم۔ رشید امجد (مرحوم) نمبر معیاری اور پسندیدہ شمارہ ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد رنگ جدید کے پانچ بہار افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانے اپنی نوعیت اور اسلوب میں ممتاز ہیں۔ اردو ادب میں ان کا نام درخشندہ رہے گا۔ تخلیق ایوارڈ 2020 ڈاکٹر رشید امجد کے نام سے ذی وقار ہوا ہے۔ ایوارڈ کے معاملے آپ خاصے محتاط ہیں۔ آپ تخلیق کو معیار انتخاب کا مرقع بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تقسیم اور خطاطے کون خالی ہے۔ کوئی بھی رسالہ اٹھا کر دیکھیں کہیں کوئی جملہ بے سرو پا نظر آئے گا، کہیں کوئی شعر کھٹکتا محسوس ہوگا۔ بے وزن بھی تو شاعری ہوتا ہے یا افسانہ نگار تو نہیں ہوتا۔ کمپوزنگ بھی اپنی جگہ "سر بر آوردہ" ہے۔ اب یہی دیکھئے میری غزل کا شعر ہے۔

افق پر ہی تو بچھی ہے لہو کی سرخی — عاشقی [illegible] اخبار نہیں ہونے کی

تخلیق کی شاعری دل کو چھونے والی ہوتی ہے۔ بدشکلی کی وجہ سے بھی لفظوں کی شناخت میں فرق پڑتا ہے۔ زیب اللہ فہیم صاحب نے ڈاکٹر رشید امجد سے ایک ملاقات کا ذکر ایک پرخلوص انداز میں کیا ہے۔ آپ جانئے میرزا صاحب معصوم شاعر بھی ہیں اور معصوم نثر نگار بھی ہیں۔ شہباز انور صاحب نے نجیب احمد مرحوم کو محبت کے پردرد لہجے میں یاد کیا ہے۔ "یاد رفتگاں" کے کرب اور نجیب احمد کی شاعری کے خیال نے آنسو آنسو کر دیا۔

آصف ثاقب (ہزارہ بوئی)

﴿6﴾ محترم سونان اظہر صاحب

السلام علیکم! جون کا تخلیق ملا، حسب روایت شاندار اور جاندار۔ ڈاکٹر رشید امجد صاحب مرحوم کی خدمت کے اعتراف میں ڈاکٹر رشید امجد نمبر شائع کر کے تخلیق نے اپنی ان شاندار روایات کا پاس رکھا جو اس مجلّے سے منسوب ہیں اور وہ یہ کہ تخلیق اپنی آبیاری کرنے والے

ادیبوں کو بھی بھولے گا نہیں بلکہ ہمیشہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر رشید امجد صاحب کے ادبی کارناموں اور خدمات کو اجاگر کرنے کے لئے ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، جلیل عالی، آغا گل، ہارون الرشید تبسم، حسین مجروح، حماد اعجاز، ڈاکٹر امجد طفیل، عذرا اصغر، ڈاکٹر بدر منیر، نسیم سحر، شاہین آفریدی اور ید اللہ قیم کی تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ ان دانشوروں کی تحریروں سے ڈاکٹر رشید امجد صاحب کے علمی و ادبی کارنامے اور ان کی شخصیت کے بہت سے گوشے خوب اجاگر ہوئے ہیں۔ ادب کے طالب علموں کے لیے یہ شمارہ ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ڈاکٹر رشید امجد صاحب کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ اس سے پہلے تخلیق ڈاکٹر انور سدید پر بھی ایک یادگار شمارہ پیش کر چکا ہے۔ مضامین کے حصے میں ڈاکٹر احتشام الحق جاوید، غلام حسین ساجد، ڈاکٹر ایوب ندیم، قاضی عطا اور خالد عبداللہ کی نگارشات تخلیق کی اہمیت و افادیت کو دوچند بنا رہی ہیں تو دوسری طرف قارئین کے ذوق کی تسکین کے لئے مسیح آہوجہ، آغا گل، جمیل احمد عدیل اور تسنیم کوثر جیسے بڑے قلم کاروں کے افسانے بھی تخلیق کی قدر و قیمت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ غزلیات کا جاندار حصہ جس میں بڑے بڑے قد آور شاعر لفظ و آہنگ سے اس میں بوقلموں نظر آتے ہیں تخلیق کا حصہ ہے۔ یادرفتگاں، طنز و مزاح، موسیقی، تجزیے جانے اور کتابوں پر تبصرے کے مستقل حصے بدستور تخلیق کی شان بڑھا رہے ہیں۔ انجمن خیال کا دلچسپ حصہ اور پنجابی رنگ کا بھی حصہ شامل ہے۔ رسالے کا نقطۂ آغاز اور اہم جز "ہوچلی بات" اس بار بھی اپنے قارئین کے لئے پیچیدہ سوال رکھ رہا ہے اور سونان اظہر صاحب کا دوٹوک عہد کہ تخلیق یوں ہی قائم رواں رہے گا، قارئین کے لئے خوش کن پیغام ہے۔ دعا ہے تخلیق یوں ہی اردو ادب کی کرنیں بکھیرتا رہے۔

نور کمال شاہ (بونیر)

#7 برادرم محترم

السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بہ عافیت ہوں گے۔ میں یہ بات کسی تمہید کے بغیر کہنا چاہوں گا کہ رسالہ "تخلیق" ایک گلستان کی مانند ہے جس کی ہر سطر پھولوں جیسے ہر کلی مہک سے لبریز ہے۔ "تخلیق" میں شائع شدہ تخلیقات، شعری یا نثری، دونوں بلند معیار کو چھوتی ہیں اور ان تخلیقات کو پڑھ کر نہ صرف ذہنی سکون میسر آتا ہے بلکہ دل بھی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اکثر تخلیقات معلوماتی ہوتی ہیں اور مختلف اصناف سخن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تخلیقات میں ایک نیا پن نظر آتا ہے، ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس تازگی اور نئے پن کی بدولت "تخلیق" نہ صرف اپنے ملک بلکہ دوسرے ملکوں کے ادبی حلقوں کی ایک ضرورت بن چکا ہے۔ اردو بستیوں کے ادب نوازوں کے لئے "تخلیق" اب ایک اعلیٰ مقام بنا چکا ہے۔ شاید اس لئے کہ آپ "نام" کو نہیں "قلم" کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں "تخلیق" میں شائع شدہ ہر تخلیق اس کے قلم کار یا تخلیق کار کو ایک نئی شناخت دینے میں مدد کرتی ہے اور یہ ایک قلم کار کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے۔ تخلیقات کو آپ جس انداز اور نئے پن کے ساتھ ترتیب دیتے ہیں وہ آپ کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ آپ کی ذہنی کشادگی کی جانب ایک بھرپور اشارہ ہے۔ میں آپ کی صلاحیتوں کی داد دیتا ہوں۔ یہ خط لکھنے سے قبل میں "تخلیق" کے چند پرانے شماروں کی ورق گردانی کر رہا تھا تا کہ اپنی یادداشت کو تازہ کر سکوں۔ ہر شمارہ مواد اور ترتیب کے تعلق سے جاذب نظر ہے اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا "تخلیق" ادبی اونچائیوں کو چھو چکا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ اور آپ کی ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ اپنے والد محترم کا نام روشن کر رہے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کو

ایک نئے رنگ و روپ کے ساتھ آگے جا رہے ہیں۔ اللہ کرے انھیں کروٹ کروٹ جشن نصیب ہو (آمین)

وحشی سعید (انڈیا)

﴿8﴾ مکرمی و محترمی جناب سونان اظہر جاوید صاحب!

ایک زمانہ تھا جب ادبی رسائل و جرائد کسی بھی زبان و ادب کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔ ان کے مدیران رسالوں کی اشاعت کا بار گراں اٹھانے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ اچھا دور تھا لوگ علم و ادب کے رسیا تھے۔ صحیح معنوں میں لفظوں کی تلاش چاہتے تھے۔ ان کی حرمت کا خیال رکھتے تھے۔ جستجو زیادہ تھی اس لیے ادب کی کیفیت بھی نمایاں تھی۔ اخبارات کے ادبی صفحات نے اپنا کردار ادا کیا۔ اب تو سوشل میڈیا نے رابطے کی صورت حال میں انقلاب پیدا کر دیا، ہم انھی انقلابات کے چشم دید گواہ ہیں۔ ایک نوجوان سے ایک روز عرض کیا عزیز من اشعار کہتے ہو، کسی استاد کو دکھایا کرو، اکثر بے وزن ہو جاتے ہیں۔ غصے میں آگ بگولہ ہو کر فرمانے لگے، آپ تو واقعی پروفیسر بن کر خشک مغز ہو گئے ہیں۔ یہ دیکھیے یہ غزل فیس بک پہ لگائی تھی۔ ایک سو بارہ تبصرے ہیں اور اتنے کتنی زیادہ پسند کی گئی ہے ہماری غزل۔ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔ ادبی رسائل دیکھ کر (تخلیق سمیت) ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی جیسے لوگ ادبی جرائد کے مدیران تھے۔ خط و کتابت کے ذریعے شاعری کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ معیار پر سمجھوتا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یہ سب باتیں "تخلیق" کا تازہ شمارہ دیکھ کر ذہن میں آ گئیں۔ یہ بات طمانیت کا باعث ہے کہ آپ نے جناب اظہر جاوید کی اس نشانی کو ابھی تک سینے سے لگا رکھا ہے۔ بیٹے کو باپ کا علم از بر ہونا ضروری ہے۔ تبھی میراث پدر ہونا ممکن ہے۔ محترم اسلم کمال کے حوالے سے آپ نے جس خواب کا اداریے میں تذکرہ کیا یہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔ میں وفات کے بعد بزرگوں خاص طور پر والدین کے تصرف کا قائل ہوں۔ آپ نے "تخلیق" کا رشید امجد نمبر شائع کر کے حق بحق دار رسید کا اہتمام کیا ہے۔ مجھے اسلام آباد میں جز وقتی طور پر ڈاکٹر رشید امجد مرحوم کی شاگردی کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کی محافل میں حاضری کا شرف بھی ملا۔ ان کے پاس بیٹھ کر آپ خود کو بڑا محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنی گفتگو سے طالب علموں کا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ دسمبر 2000ء میں میرا ایم فل کا زبانی امتحان تھا۔ اتفاق سے ڈاکٹر رشید امجد بیرونی ممتحن بن کر تشریف لائے۔ انھوں نے میرے کام کی نہ صرف ستائش کی بلکہ فرمایا کہ یہ اتنا عمدہ کام ہے کہ مقالہ نگار کو اس پر ایم فل کی بجائے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جانی چاہیے۔ ایسے حوصلہ افزا جملے اکثر ہم جیسے مبتدیوں کا دل بڑھاتے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی جہد و جہد سے عبارت تھی۔ بقول عامر کا شعر ہے:

وحشت یہ آپ سے پوچھے کہ بیاباں کے اشجار   کن مراحل سے گزرتے ہیں نمو پانے تک

وہ معنوں کشمیر کے پہاڑوں کے بیٹے تھے لیکن ان کی زندگی لالہ صحرا سے عبارت تھی۔ رشید امجد مرحوم کے حوالے سے ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، جلیل عالی، آغا گل، ہارون الرشید تبسم، حسین مجروح، خاور اعجاز، امجد طفیل، عذرا اصغر، بدر منیر، نسیم سحر، شاہین زیدی اور رضاء اللہ نعیم صاحبان کی تحریریں یادگار ہیں۔ غلام حسین ساجد صاحب کا مضمون (ایوب خاور کے لیے) بہت عمدہ ہے۔ میرا خیال ہے یہ ایک طویل مضمون کی دوسری قسط ہے۔ اس میں اقتباسات کے حوالے شاید آخری قسط میں آئیں۔ ڈاکٹر ایوب ندیم صاحب نے دیال سنگھ کالج سے وابستہ احمد

سعید مرحوم کی ادبی بازیافت کی۔ ہمارے ہاں ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے علمی و ادبی کام کا نئے سرے سے تعارف ہونا چاہیے۔ میں نے پروفیسر جعفر بلوچ مرحوم سے ایک بات سیکھی، اور وہ تھی "کھوئے ہوؤں کی جستجو"۔ ڈاکٹر ایوب ندیم صاحب نے کمال کیا۔ محسن مگھیانہ صاحب کی مزاح نگاری کے تو ہم شروع سے قتیل ہیں۔ آغا گل، جمیل احمد عدیم صاحبان اور تسنیم کوثر صاحبہ کی افسانہ نگاری کا تو ایک زمانہ معترف ہے۔ "تخلیق" کی شاعری میں سے ایک انتخاب دیکھیے:

دل کش و دل فریب نظارے | بوستاں بوستاں ہیں کیا کیا کچھ | (انور شعور)
یہ راستہ ترے قدموں کو چھونے والا ہے | ہرا بھرا کوئی قالین سا بچھا ہوا | (نذیر قیصر)
آمد آمد ہے پھر زمستاں کی | پھر سے تو تیز برف اترتی ہے | (خالد اقبال یاسر)
میں ساتھ لایا ہوں تہذیب اپنے گاؤں کی | سو سر جھکائے گلی سے گزرنے والا ہوں | (اصغر علی سید)
چھوٹی خبروں پہ بڑے مسئلے حل ہوتے تھے | پچھلے اخبار کے صفحات میں ہم ہوتا تھا | (اسحاق وردگ)
اچھا ہوا کہ آپ نے پوچھا ہمارا حال | ہم کو ہمارے حال کی کچھ تو خبر ہوئی | (ارم عتیق)

بہ حیثیت مجموعی "تخلیق" کے مشمولات نے مجھ ایسے طالب علم کے علم میں اضافہ کیا ہے۔ اللہ آپ کے والد گرامی مرحوم کے اس چراغ کو ہمیشہ روشن رکھے۔ اس رسالے کا شمار بھی اردو کے طویل العمر رسالوں میں کیا جائے (آمین)

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع (ساہیوال)

﴿9﴾ محترم برادرم سونان اظہر جاوید صاحب!

جناب زیب اللہ فہیم صاحب کی وساطت سے تخلیق کے اعزازی شمارہ 6، جلد 51 برائے جون 2021 کی ارسالگی کا شکر گزار ہوں۔ میں رسالوں، اخباروں اور مجلوں کی وساطت سے اپنی علمی، تحقیقی اور تخلیقی قلم کاری کا قائل نہیں رہا۔ الحمدللہ اب تک ایک درجن سے زاید کتابوں کی تصنیف و تالیف کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ پہلے بڑا شوق ہوتا تھا کہ کسی معروف اخبار میں میری کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔ لیکن بعد میں علم ہوا کہ یہ بھی ایک وہم ہے یا خوش فہمی۔ میں گزشتہ پچاس سالوں سے قرطاس و قلم سے پوری قلبی، ذہنی اور فکری ایمانداری سے جڑا ہوا ہوں۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک سکالر نے میری ادبی خدمات پر ایم فل کی ڈگری 2018ء میں حاصل کی تھی۔ ایک اور سکالر نے پشاور یونیورسٹی میں اسی حوالے سے پی ایچ ڈی کا تھیسس جمع کروا رکھا ہے۔

مجھے کئی بار زیب اللہ فہیم صاحب نے کہا کہ اپنی تحریریں اخبارات میں بھیجا کریں۔ میں اپنی تین کتابیں: "خیال محمد بخش شخصیت و فن"، "یادوں کی سوغات" اور "ساقی نامہ" آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ انھیں اپنی لائبریری کے کسی کونے میں بلا کرایہ رہائش پذیر ہونے کی اجازت فرمائیں۔ اور اگر پڑھنے کا موقع ملے تو میری دلجوئی کے لیے کچھ سطریں لکھ بھی دیں۔ یا کسی "دیمک" کتاب خوان کی نذر کر دیں تو ہو سکتا ہے جناب شمشیر حیدر جیسا کوئی قاری ہوا جعفری صاحب کی نظم کی طرح "میرا عقیدہ تخلیق کی زد پر ہے" جیسا جاندار لکھنے پر آمادہ ہو جائے۔ میری کتاب "یادوں کی سوغات" کی آخری نظم اسی سوچ کی حامل ہے۔ ان کتابوں پر جناب کی رائے

آنے پر مزید کتب جناب کی خدمت میں ارسال کی جا سکتی ہیں۔ ایک تازہ غزل بھی ارسال کر رہا ہوں۔

پروفیسر محمد رفیق بھٹی (میرپور کشمیر)

﴿10﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ جشنِ آزادی مبارک۔ اللہ ہمارے ملک کو سلامت رکھے اور اسے ہر طرح کی مشکلات سے باہر نکالے۔ آپ کی ادب اور ادیب پروری تعریف و توصیف کی مستحق ہے۔ اللہ آپ کو توفیقات مزید دے۔ زیرِ ترتیب تخلیق کے لیے تضمین کلام حاضر ہے۔ کمپوز کر دیا ہے۔ اس کی سیٹنگ آپ کے کمپوزر کر دے۔ شکریہ۔ نیک خواہشات کے ساتھ اجازت۔

ڈاکٹر بدر منیر (خوشاب)

﴿11﴾ مکرمی و محترمی سلام مسنون!

جون 2021 کا ''تخلیق'' موصول ہوا۔ شکریہ۔ یہ شمارہ ڈاکٹر رشید امجد نمبر ہے اور آپ کی ادب پروری کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ، پروفیسر جلیل عالی، آغا گل، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، حسین مجروح، شاہدہ لطیف، ڈاکٹر امجد طفیل، منظر اصغر، ڈاکٹر بدر منیر، نسیم سحر، شاہین زیدی اور زیب اللہ قیم جیسے قلمکاروں نے ڈاکٹر صاحب کی ادبی اور معاشرتی زندگی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ہمارے دور کے بڑے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے اور آپ نے ان کے فن پر یہ خاص نمبر شائع کر کے ایک احسن اقدام کیا ہے۔ باقی شمارہ بھی اپنی روایتی سج دھج قائم رکھے ہوئے ہے۔ نصرت فتح علی خان کی موسیقی کی دنیا میں فتوحات کا دوسرا حصہ بھی خوب ہے۔ یہ محنت شاقہ صرف ڈاکٹر امجد پرویز ہی کے حصے میں آتی ہے۔ اتنے بڑے فنکار پر اتنا پر مغز مضمون لکھنا انہی کی محنت شاقہ ہو سکتی ہے۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خالد عبداللہ کا کرشن چندر کی کہانی ''پیرا بابا'' پر مقالے کا دوسرا حصہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ اس میں انہوں نے کرشن چندر کے اندر چھپا ہوا نفسیات دان باہر نکالا ہے اور معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ شمارے کا حمدیہ اور نعتیہ حصہ بھی روح کی بالیدگی کرتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ قلمکار جن کے قلم سے حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسولِ مقبول بیان ہوتی ہے۔ شمارے کے باقی مندرجات بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آپ کی صحت و ترقی کیلئے دعاؤں کے ساتھ۔

محمد اسلم (لاہور)

﴿12﴾ محترم سونان اظہر صاحب

میں ''تخلیق'' کے تازہ شمارے کی ادبی تخلیق پہ آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ تخلیق اپنے سرورق سے لے کر آخری ورق تک آپ کے پختہ ارادوں کی تصویر دکھائی دیتا ہے۔ نئی نسل کتاب سے ناطہ توڑ کے گوگل کی پیچ دار گلیوں میں الجھ چکی ہے۔ اظہر جاوید صاحب کے سپوت کو داد ہے اس نے اپنے والد کے ادبی جریدے کا پڑھنے والوں سے رابطہ بحال رکھا ہے۔ اس غیر ادبی ماحول میں تخلیق کا وجود کسی نعمت

سے کم نہیں۔ مجلہ ملتا ہے تو تنگی حالات کی دھوپ کچھ دیر کے لیے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ میرے اور دیگر تخلیق ادب کے ساتھ کیے ہوئے آپ کے اور معتبر لکھاریوں کے وعدوں کو پورا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ کی ہمت، حوصلے، جذبوں کے مزید ہو جانے کے لیے دعا گو ہوں۔

محمد پرویز کلیم (لاہور)

﴿13﴾ محترم سونان اظہر صاحب

آداب! آپ سے مورخہ 21-7-19 دوپہر دفتر تخلیق میں ملاقات ہوئی۔ اگرچہ یہ پہلی ملاقات تھی تاہم آپ کے خلوص اور محبت کے اظہار نے اپنائیت کا گہرا نقش چھوڑا۔ فون پر بہت سارے دوستوں سے بات کروائی اور میری چار کتابوں کا بھی تذکرہ کر دیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، عظیم باپ کے عظیم ادبی ورثے (تخلیق) کو جاری رکھنے کی توفیق ملے۔ آپ دوستوں کی "محبت" سے ہمیشہ "ثروت مند" ہیں۔

انور ندیم علوی (نواب شاہ)

﴿14﴾ محترم سونان اظہر صاحب!

سلام مسنون۔ تخلیق جون 2021ء موصول ہوا۔ جسے پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ خوشامد نہیں بلکہ میرے دل کی آواز ہے۔ جس طرح آپ نے علم و ادب کی کہکشاں سجا رکھی ہے یہ آپ ہی کا عشق ہے، حوصلہ ہے، جرأت ہے ورنہ کئی ادبی رسائل جو آسمان ادب کے درخشندہ ستارے تھے معاش کی چکی کی نذر ہو گئے اور اس بے حسی منافقت کے دور میں جب ہر طرف مادیت پرستی کی دوڑ لگی ہوئی ہے اس عالم میں ادب کی شمع جلانا انتہائی دشوار ہے یہ آپ ہی جیسوں نے اس گھاٹے کی دکان کو چلنے سے لگا رکھا ہے۔ جون کا شمارہ (ڈاکٹر رشید امجد نمبر) ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ تخلیق کا سرورق بہت ہی جاذب نظر اور اس پر دو بڑی شخصیات کی تصاویر۔ ایسی نادر چیز اب دیکھنے کو کہاں ملتی ہے۔ موجودہ شمارے میں رشید امجد پر جو مضامین شائع کیے گئے ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ ہر مصنف کی تحریر سچائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ افسانوں میں سیج آ عجب کا افسانہ (تتلی کا جنم) واقعی بڑا افسانہ ہے۔ جمیل احمد عدیل کا افسانہ (اندر شب) نے کافی متاثر کیا (گیلی سکھی) آپا گل کا افسانہ روایت سے جڑا ہوا ہے اور ذہن پر ایک نقش چھوڑ گیا۔ حصہ غزلیات میں نذیر قیصر، انور شعور، سلطان سکون، ممتاز راشد لاہوری کی غزلیں جدیدیت اور روایت کا خوبصورت سنگم ہے۔ اللہ کرے (تخلیق) کی اشاعت جاری رہے اور اپنے باپ کی یادیں (تخلیق) کی نشو و نما کرتے رہیں اور یہ شجر سایہ دار رہے ادب والوں کے لیے چھاؤں دیتا رہے۔

ماجد وفا عابدی (گلیانہ گوجر خان)

﴿15﴾ قابل فخر سونان اظہر جاوید! سلامتی ہو۔

بوجوہ یعنی کچھ ذاتی مصروفیات، صحت کے مسائل اور ملک سے باہر رہنے کی بنا پر گذشتہ دو تین شماروں میں شمولیت سے قاصر رہا معذرت خواہ ہوں۔ شمارہ جون 2021ء ڈاکٹر رشید امجد توقع سے بڑھ کر ہے۔ گوشہ ڈاکٹر رشید امجد نے محترم ڈاکٹر صاحب کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں محاسبہ کا تصور اگر سرے سے ناپید نہیں تو یہ سچ ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلاشبہ ادب بھی ایک کمرشل

اضطراری کی صورت اختیار کر چکا ہے ایسے میں ''پیسے لے کر لکھ دینے والے بہت سے محترم حضرات کا محاسبہ کون کرے؟''۔ سمجھوتوں کی اس دنیا میں سچ کہنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔

رزق، ملبوس، مکاں، سانس، قرض، مرض، دوا — منقسم ہو گیا انساں انہی افکار کے بیچ

جناب حسن عسکری کاظمی کا حمدیہ شعر:

مجھ میں کیا وصف ہے ایسا بھی کہ تو نے یا رب — دل میں مخلوق کے ڈالی ہے محبت میری

محترمہ بشریٰ رحمن کا نعتیہ شعر:

ہزار کو ہاں سے عشق چپکے — جہاں نے اُڑنا ادو کر ای چیلے

بہت اچھے لگے۔

محترمہ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ نے بجا فرمایا ''افسانہ واقعات و حوادث کے تسلسل کا نام ہے جس میں کردار، مکالمہ، ماحول، وقت، فضا اور منظر نگاری لازمی جزو ہیں۔'' ''انکشاف ذات کا مرحلہ ہو یا تخلیق کا، تنہائی اور خاموشی میں جنم لیتی ہے'' محترم رشید امجد کو اس کا بدرجہ اتم ادراک حاصل تھا۔ ان کے افسانوں کا اصل حوالہ علامتی ہوتا ہے۔ بقول ان کے ''وحشت گری ہو جائے تو بیچ دل کے درمیان سمجھوتا تو ہوتی جاتا ہے۔'' آپ کے افسانوں کی پہلی شناخت انسان کی عدم شناخت اور اس کے تشخص کے حوالے سے ابھری۔ بسا اوقات رشید امجد کے لاشعوری مکالمے کرداروں کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ کائنات سے مکالمہ افسانے کی بنت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بعض افسانے مکمل طور پر اور بعض جزوی طور پر ان کی ذاتی زندگی کی ہی روداد کا تاثر چھوڑتے ہیں۔ وہ حتی الامکان الفاظ کے کم سے کم استعمال کے حامی اور اس پر عمل پیرا رہے ہیں۔ جہاں ایک لفظ اپنا مفہوم بیان کر سکتا ہو وہاں جملے کی کیا ضرورت؟ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب نے مختصراً ان کے سوانحی خاکہ کو خوبصورت انداز میں نذر قارئین کیا ہے۔ ان کی ادبی کارکردگی پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ بقول ڈاکٹر ہارون الرشید وہ افسانوں میں فلیش بیک کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ ان کے یہاں معاشرتی مکالمہ نظر آتی ہے۔ ان کے افسانے عصر حاضر سے ہم آہنگ اور عصری آگہی کے بیدار شعور کا حصہ ہیں۔ ان کا سفر ذات جبر مسلسل اور عمل پیہم سے عبارت ہے۔ بقول ڈاکٹر ہارون الرشید ''ڈاکٹر رشید امجد ادب کا کوہ ہمالیہ تھے'' فن کار مر جاتا ہے لیکن اس کا فن اسے مرنے نہیں دیتا۔ ڈاکٹر رشید امجد کے حوالے سے آغا گل نے بڑی خوبصورت بات کی ہے ''ہمارا قبیلہ یک تو ہمزاد کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی پسند و ناپسند کی نظریاتی عینک لگائے رکھتے ہیں'' دیگر مضامین میں بھی قارئین کے لیے اپنے اندر بہت کچھ سموئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کا ''تجزیہ'' بہت ہی خاصے کی چیز ہے۔ ''ہر ایک کے پاس صرف خوف کی یا پھر لالچ کی حس موجود ہے۔'' ''کوئی عمل فائدہ حاصل کرنے یا نقصان سے بچنے کے دائرہ سے باہر نہیں'' نکتہ نتیجہ یہ کہ 20 فیصد ذہین ترین اور طاقتور ترین لوگوں نے 80 فیصد کم ذہین، کند ذہن اور کمزور لوگوں کو اصل الاصل بنا رکھا ہے۔'' انہوں نے اس حوالے سے اپنی تازہ غزل درج کی ہے۔ جس کے درج ذیل اشعار سیدھے دل میں اترتے چلے گئے۔

دماغوں سے ابھی تک سوچ تاتاری نہیں نکلی — مہذب ہو کے بھی اندر کی خونخواری نہیں نکلی

شہنشاہتیں تو ہو گئیں دربار سے باہر — مگر درباریوں کی خوئے درباری نہیں جاتی

برادرِ محترم اظہر جاوید کی غیر مطبوعہ بہت ہی خوبصورت غزل قارئین کی نذر کرنا قابلِ قدر ہے۔ دو شعر نذرِ قارئین

باقی بچے جو مال وہ گزریں گے اس طرح ۔۔۔ چہرے سے تیرے صبح لوں زلفوں سے شام لوں
شہرت ہی کیا ہے پاؤں میں دولت کا ڈھیر ہو ۔۔۔ اظہر جو مصلحت سے کبھی میں بھی کام لوں

''گیدڑ سنگھی'' نے آغا گل کے ہر افسانے کی طرح میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ منفرد انداز، عام ڈگر سے ہٹ کر بہت ہی خوبصورت کہانی۔ محترمہ تسنیم کوثر نے اپنے افسانے ''وبا'' میں بہت ہی خوبصورت بات کی ہے ''گھر برادری سے نہیں سمجھوتے سے چلتے ہیں۔ گھر ضد اور مقابلے سے نہیں برداشت سے چلتے ہیں'' حصہ غزل ہمیشہ کی طرح بہت ہی جاندار ہے۔ اپنی پسند کے چند اشعار نذرِ قارئین

اپنے محبوب و بشر معاذ اللہ ۔۔۔ ہم خدا ساز ہیں کیا کیا کچھ (انور شعور)
ہم ان کے کچھ نہیں جنہیں مسند نشیں کیا ۔۔۔ یوں گھر گئے ہیں اپنی پریشانیوں میں ہم (امین راحت چغتائی مرحوم)
شکستہ رہا ہے مری خواب گاہ تک قیصر ۔۔۔ کسی کے ہاتھوں دیئے سے دیا جلایا ہوا (نذیر قیصر)
تھی ہی رخ موڑتے رہے طوفان ۔۔۔ نقش تھا اپنا بادبان پہ حرف (محمود شام)
وہ تو جھک جاتا ہے ہر زیر و زبر کے آگے ۔۔۔ جس کے سر پہ کوئی دستار نہیں ہونے کی (آصف ثاقب)
وضع داری بھی ہے یہ اور شرف بھی تیرا ۔۔۔ پالتا ہے تجھے پودوں کو شجر ہونے تک (گلزار بخاری)
ہر اک سے ذکر کی کرے گا وضاحتیں کیا کیا ۔۔۔ کسی کے سامنے آئیں نہ جو ہوا سو ہوا (سلطان سکون)
پہنچنے کے لیے جو مجھ کو یہاں لائے ہیں ۔۔۔ میں یہاں ان کا خریدار بھی ہو سکتا ہوں (ممتاز راشد لاہوری)
اگر تخلیق عملی اس کی طلب ہے تو کر لیں ہم ۔۔۔ وفاؤں کا زمانے میں کڑا معیار ہوتا ہے (عاصم بخاری)
دھیرے دھیرے جذبوں کے چھلکے اترے ۔۔۔ مسئلہ قرابت میں تبدیل ہوا (صائمہ اسحاق)

آفتاب خان نے ماہنامہ ''تخلیق'' 2001ء تا 2020ء بہت جامع جائزہ پیش کیا ہے۔ ''انجمن خیال'' یعنی اظہار خیال ہمیشہ کی طرح تخلیق ترجیح کا حامل۔ ایک غزل ارسال کر رہا ہوں۔ اگر ''تخلیق'' کے معیار پر پوری اتر سکے تو ستمبر 21ء کے شمارے میں شامل کریں۔ شکریہ۔ آپ نے جس محنت اور لگن سے اپنے عظیم والد کے ورثے کا تحفظ کیا ہے بلکہ اضافہ کیا ہے قابلِ ستائش ہے۔

اشرف ذکی اعوان (چکوال)

﴿16﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

امید ہے بخیریت ہوں گے۔ بحمد اللہ میں بھی بخیریت ہوں۔ آپ جیسے بیٹے اللہ پاک سب کو عطا فرمائے جو اپنے مرحوم والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان کے شروع کیے ہوئے ادھورے کام کو جامۂ تکمیل پہنانے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ خدا آپ کو عزیمت اور طاقت عطا فرمائے۔ (آمین)

شمارہ ملتے ہی سب سے پہلے گوشۂ غزل پر توجہ مبذول ہوئی۔ اس گوشے کے حوالے سے اپنے تاثرات قلم بند کر رہا ہوں۔ پورا

گوشہ ماشاءاللہ خوبصورت شاعروں کی خوبصورت غزلیات پر مشتمل ہے۔ محترم انور شعوری کی غزل ہمیشہ کی طرح خوبصورت ہے۔ زبان و بیان کی پاکیزگی رواں بحروں کی ساتھ ہے۔ حشو و زوائد سے پاک ہے۔ زبان میں کہیں کوئی سقم موجود نہیں ہے اور مضامین میں ندرت پائی جاتی ہے۔ محترم امین راحت چغتائی کی غزل بھی اچھی ہے لیکن ان کے مقطع کے مصرعہ ثانی (گمنام ہو گئے ہیں ادب و دیانتوں میں ہم) خارج از بحر ہے شاید کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ اس میں شاید لفظ "ہیں" غلطی سے ٹائپ ہو گیا۔ لیکن اگر اس لفظ کو نکال بھی دیا جائے تب بھی مصرعہ رواں نہیں ہوتا۔ نذیر قیصر کی غزل خوبصورت ہے۔ اس کے درج ذیل اشعار دل کو چھو لیتے ہیں۔

مجھے بھی لگتا ہے شاید میں اس زمیں کا نہیں — وہ شخص بھی ہے کسی آسماں سے آیا ہوا
میں اس اندھیرے میں خیمے سے جا نہیں سکتا — کہ سانس لیتا ہے مجھ میں دیا بجھایا ہوا

محمود شام جو ہمیشہ سے شہر باسی رہے ہیں۔ ان کی غزل کے درج ذیل شعر ملاحظہ ہوں۔

بول اٹھتی ہیں سنگ اینٹیں بھی — لوگ لکھتے ہیں جب مکاں پہ حرف
سطح والوں کے دل ہوئے گیلے — ہم چھپاتے رہے کہاں پہ حرف

خوبصورت غزل ہے۔ لیکن اگر ردیف میں لفظ "پہ" کی بجائے لفظ "پر" لکھتے تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ اگر "پہ" کو یک رکنی پڑھا جائے تو لفظ "حرف" بروزن "فعو" ہو جاتا ہے جو زبان کے اعتبار سے غلط ہے۔ کیونکہ یہ بروزن "فعل" ہی درست ہے۔ اس کے لیے لفظ "پہ" کو دو رکنی پڑھنا پڑے گا۔ جس سے ایک سقم پیدا ہو جائے گا۔ معذرت کے ساتھ آصف ثاقب کی غزل کے ایک مصرعے میں کمپوزنگ کی غلطی ہے اس میں مرغی اشعار کی بجائے مرغیِ اشعار کمپوز ہو گیا۔ خالد اقبال یاسر نے اپنی غزل میں ایک بار گلی تک ردیف لکھی ہے (برف اڑتی ہے) اور اسے نبھانے کی کوشش بھی کی ہے اور کئی اشعار میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کے دو خوبصورت شعر ملاحظہ ہوں۔

آمد آمد ہے پھر زمستاں کی — پھر سے نوخیز برف اڑتی ہے
اور دہکاؤ میں کی انگیٹھی — ہے ہوا تیز برف اڑتی ہے

گلزار بخاری نے غالب کی زمین میں غزل کہی ہے اور خوبصورت اشعار نکالنے کی کوشش کی ہے۔ سلطان سکون نے بھی خوبصورت ردیف نبھائی ہے اور اچھے شعر نکالے ہیں لیکن معذرت کے ساتھ ان کے مطلع کے مصرعہ اولیٰ میں لفظ "حد" کو بروزن "فا" باندھا گیا ہے۔ حالانکہ زبان کے اعتبار سے یہ لفظ بروزن "فعل" زیادہ درست ہے۔ لیکن آج کل اکثر شعرا حضرات اسے بروزن "فا" ہی باندھ رہے ہیں۔ راشد حسین نے اپنی غزل میں دو قافیے اور دو ردیف چلائے ہیں اور اس مشکل کام کو نبھانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور کامیاب نظر آتے ہیں۔ ناصر علی سید کی غزل کا مطلع دو لخت محسوس ہوتا ہے۔ یہ شاید مجھے سمجھ نہیں آیا۔ ممتاز راشد لاہوری کے ایک شعر میں لفظ "سمجھے" غلطی سے "سمجھا" کمپوز ہو گیا۔ قافیے کی خوبصورتی کے لیے "حرف روی" متعین کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ غزل ایک ایسی آزاد نظم کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو پورے مصرعوں کی حامل ہوتی ہے۔ رشید آفرین کی غزل میں بھی یہی صورت حال ہے۔ جس میں انہوں نے "حرف روی" سے انحراف کیا ہے۔

اسحاق وردگ کی غزل کے مطلع کے مصرعہ اولیٰ میں لفظ "اہم" کو بروزن "فعو" باندھا گیا ہے جو غلط ہے یہ لفظ بروزن "فعل" ہی

وسعت ہے۔ انہوں نے درج ذیل خوبصورت شعر کہا ہے جو حسبِ حال ہے۔

پچھلی تجربوں پہ ہمارے مسئلے حل ہوتے تھے پہلے اخبار کے صفحات میں دم ہوتا تھا

ڈاکٹر اکرم عتیق کی غزل خوبصورت غزل ہے جو ندرتِ خیال کی حامل ہے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

زیر و زبر ہوئی تو کبھی در بدر ہوئی پوچھے کوئی تو کہتے ہیں اچھی بسر ہوئی
اچھا کیا کہ آپ نے پوچھا ہمارا حال ہم کو ہمارے حال کی کچھ تو خبر ہوئی

ڈاکٹر محمد رفیق خان کی غزل کے مطلع کا مصرعہ اولیٰ خارج از بحر ہے۔ عاصم بخاری کی خوبصورت غزل کا مطلع کمال ہے۔ محترمہ شبہ طراز جو خود ایک خوبصورت ادبی جریدہ شائع کر رہی ہیں۔ خدا انہیں ہمت عطا فرمائے کہ وہ دوبارہ اس جریدے کا اجراء کریں۔ آمین۔ ان کی غزل نے واقعی دل و دماغ پر اثر چھوڑا ہے۔ "فعلن فعلن فعلن فعلن" کی بحر اور "خوشبو" ردیف۔ کیا بات ہے! ردیف آئینے میں عکسِ یار کی طرح فٹ بیٹھی ہے اور ہر شعر میں ردیف بولتی محسوس ہوتی ہے۔ سارا ان کا مقطع دیتی ہے دل میں ایک اکیلی خوشبو" "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" محترمہ صائمہ اسحاق کی غزل بھی خوب ہے جس میں انہوں نے قافیے کی مجبوری کے تحت شعوری یا لاشعوری طور پر کچھ الفاظ ایجاد کر دیے ہیں۔ جو شاید نامانوس محسوس نہیں ہو رہے۔ عائشہ مسعود کی غزل حسبِ حال ہے جو کرونا کے تناظر میں لکھی گئی ہے جس میں رجائی پہلو نمایاں ہے۔ طاہر منظور نے اپنی غزل میں صوتی قافیے کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ جس میں حرفِ روی صوتی آہنگ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ محترم محمد اسلم کا "میں ایک خوبصورت کا شوہر ہوں" آپ بیتی کے انداز میں لکھا گیا خوبصورت انشائیہ ہے۔ جس میں انہوں نے تجزیاتی طور پر انشائیے کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ ان کا انشائیہ پڑھتے ہوئے کئی بار زیرِ لب اور زیرِ چشم مسکراہٹ رقص کرتی ہے۔

گوشۂ غزل اور انشائیہ پڑھنے کے بعد آپ کا اداریہ پڑھا۔ حالانکہ یہ بے اصولی ہے لیکن اس میں شاید میرا قصور نہیں کیونکہ شاعر اور انشائیہ نگار ہونے کی حیثیت سے میری توجہ سب سے پہلے انہی دو گوشوں کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ پیارے سلطان! آپ نے اداریے میں ایک کڑوا سچ بیان کیا ہے۔ جو شاید ان لوگوں پر گراں گزرے گا جو صرف آزاد تخلیق کے قائل ہیں۔ حالانکہ اس کائنات میں موجود ہر شے کسی نہ کسی اصول اور قاعدے کے تحت ہوتی ہے۔ اور اگر یہ اصول و قواعد ختم کر دیے جائیں تو کائنات میں وہ بگاڑ پیدا ہو گا کہ الحفیظ و الاماں۔ اداریے کے دوسرے حصے میں آپ نے کرونا کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا ہے جو بہت سارے انسانوں اور تخلیق کاروں کو نگل چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ بہت سارے ایسے تخلیق کار بھی ہیں جن کی موت کا یقین ہی نہیں آتا۔ مثلاً ناصر زیدی مرحوم۔ جن کی وفات کا مجھے علم بھی تھا لیکن پھر بھی میں نے انہیں اپنی کتاب بھیج دی۔ جو واپس آ گئی اور اس پر لکھا تھا کہ ان کی وفات ہو گئی ہے۔ حسن عسکری کاظمی کی خوبصورت حمد اور حنیف باوا کی نثری (پنجابی) نعت نے دل کو چھو لیا۔ بشریٰ رحمان کی پنجابی نعت بھی خوب ہے۔ لیکن ایک دو جگہ کمپوزنگ کی غلطیاں ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کا گوشہ ان کی ادبی خدمات اور پوشیدہ تخلیقی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

باقی جریدے کا بھی چیدہ چیدہ مطالعہ کیا ہے اور ماشاءاللہ آپ نے اس کے معیار پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقیاں

حفاظت فرمائے۔ آمین۔ میں آپ کو اپنی کتاب ''شہر اور سائے'' برائے تبصرہ اور ایک غیر مطبوعہ غزل برائے اشاعت پہلے ہی بھیج چکا ہوں۔ لیکن اس خط کے ساتھ ایک اور کتاب ارسال کر رہا ہوں تاکہ تبصرے میں آسانی رہے۔ جیسا کہ آپ نے مجھے فون پر کہا تھا۔

انتظار باقی (جھنگ)

17 جون

محترمی سلطان اظہر جاوید صاحب!

جب بھی ''تخلیق'' کا نیا شمارہ نظروں سے گزرتا ہے، جناب اظہر جاوید مرحوم کی روح کو سرشار ہوتا محسوس کرتا ہوں کہ ان کا فرزند ارجمند اپنے والد کے ورثے کو خوب سے خوب تر اور پھر خوب ترین کے مقام پر بطریق احسن پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا۔ اس دفعہ آپ نے ڈاکٹر رشید امجد نمبر نکال کر ایک ایسے لاجواب اور عدیم النظیر ادیب کے احوال و آثار اور ان کے فکری و فنی اعزازات کو منصہ شہود پر لانے کا اعزاز حاصل کیا ہے جو واقعتاً ان اعزازات کا سو فیصد حقدار تھا۔ رشید امجد شناسوں نے اپنے اپنے انداز سے مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ان مضامین سے رشید امجد کی شناسائیوں میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ اب مناسب وقت دیکھ کر ان کے ایوارڈ کی تقریب شایان شان طریقے سے منائیے (بے شک مجھے بھی اطلاع دیجئے کہ میں تخلیق کا دیرینہ خیرخواہ اور آپ سے بے پناہ لگاؤ رکھتا ہوں)۔

آپ نے پہلی بات میں پھر ان مرحوم شعراء اور ادباء کا تذکرہ چھیڑ دیا ہے۔ میں نے تو پچھلی اشاعت میں ان کی غلط کاریوں پر روشنی ڈالی تھی۔ اب آپ نے مزید الم انگیز پہلوؤں کی نشاندہی کر کے مجھے مزید سنجیدہ کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے آپ ان اشتہاروں کا بار بار ذکر نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ جناب آفتاب خان کا خدا بھلا کرے، بڑی محنت اور لگن سے تخلیق کے تیس سالوں پر محیط پرچوں کی تمام تر تفصیلات کا خوبصورت گوشوارہ تیار کر دکھایا ہے۔ اگر میرے بس میں کسی ایوارڈ کو دینے کی آزادی ہوتی تو جناب آفتاب خان کو میں اعلیٰ ایوارڈ ضرور دے ڈالتا۔ وہ یہ سمجھیں گے ان کے حق کا میں نے اعتراف کر لیا ہے۔ آغا گل کا افسانہ ''کیدو سنگھی'' بڑا معرکۃ الآرا ہے۔ ان کی خوبصورت افسانہ نگاری میں یہ حسین اضافہ ہے۔ جناب جمیل احمد عدیل ہر لحاظ سے اسم با مسمیٰ ہیں۔ اطہر شیب کے افسانے میں ان کے جادو نگار قلم نے ایسی کہانی لکھنے کا اعزاز حاصل پایا ہے جو غالباً ان کے علاوہ اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔ پہلی بات میں آپ جس بات کا رونا رو رہے تھے۔ کم از کم یہ غزلیں اور نظمیں ان کا خوبصورت ازالہ ہیں۔ ایک درخواست ہے کہ حمد و نعت کے صفحات میں اضافہ کریں۔ یہ اصناف تمام اصناف پر حاوی ہیں، پسندیدہ ہیں اور ان کی طرف لکھنے کا رجحان فروغ پذیر ہے۔ جریدہ تخلیق ان تخلیقات کو سرسری نہ سمجھے، وسعت کا مظاہرہ کرے اور اپنے دامن میں ان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کا اعزاز حاصل کرے۔

•••

سیّد ریاض حسین زیدی (جھنگ)

نوٹ: ادارۂ تخلیق سب قارئین کا ''ڈاکٹر امجد رشید نمبر'' کے لئے اتنی معلوماتی تحریریں بھیجنے پر شکرگزار ہے۔ اظہر جاوید نمبر اور انور سدید نمبر کے بعد ڈاکٹر امجد رشید نمبر کی ریکارڈ سیل کامیابی کا سہرا آپ سب دوستوں کے تعاون کے مرہون منت ہے۔ اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ (ادارۂ تخلیق)

ماھنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ تیر فکر خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی ایڈیٹر : محمود شام 0300-8210636	سہ ماہی نوادر لاہور مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شاہین زیدی 0333-4722999
ماہنامہ حکایت لاہور مدیر : عارف محمود 0323-4329344	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر : شاہد علی خان 0301-4001844	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر : عمران منظور 0300-8430043

ماھنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	رقصِ آوارگی	سید الطاف بخاری	0300-4020955	ادارہ پبلشرز، لاہور	850/-
2	بیاضِ نظر	شکیل صابری	0300-4358160	جمہوری پبلی کیشنز، لاہور	600/-
3	شہر بے سائے	انتظار باقی	0322-4381192	تحریری پبلشرز، فیصل آباد	500/-
4	تیری نظر سے انجان	سحول شہزاد	0423-6307551	فکشن ہاؤس، لاہور	500/-
5	قلم سے پاگلدستہ	انور رحیم علوی	0344-7448084	ارزبان پبلی کیشنز	500/-
6	سنگِ زیست	سائرہ باقی	0333-4344716	اسلامیہ مطبوعات، لاہور	350/-
7	خاک زار	قمر رضا شہزاد	0300-6343293	کتاب دوست، لاہور	2,500/-
8	زرداغ	شاہین	0300-449310	تخلیق مطبوعات، لاہور	300/-
9	چراغِ اخوت	رشیدہ آفرین	0301-6101210	فدا پبلی کیشنز	900/-
10	تصویر	تصور اقبال	0302-7844094	ہانی پبلی کیشنز، لاہور	400/-
11	مشکل میرے مرگ	نائلہ شہزاد	0423-6307550	فکشن ہاؤس، لاہور	450/-
12	خندہ اوراق	ڈاکٹر جاوید شمیم	0300-6668284	رنگِ ادب، فیصل آباد	500/-
13	خشک آنکھیں	علی رضا احمد	0300-0969374	ہانی پبلی کیشنز، لاہور	400/-
14	شگفتہ تیرے ہاتھوں میں	اکمل شاکر	0333-5050302	سیاحی پبلی کیشنز، بلوچستان	300/-
15	شعر کے ساحل پر	اکمل شاکر	0321-5440882	بک کارنر، جہلم	500/-

نوٹ: ادارہ "تخلیق" اپنی تمام پالیسیاں کمیٹی ممبران کی باہمی رضامندی سے مرتب کرتا ہے۔ ادارے کو بغرضِ تبصرہ کے لئے دو کتابیں ارسال کریں۔ کسی بھی وصول ہونے والی ایک کتاب پر ادارہ تبصرہ نہیں کروا سکتا۔ (ادارہ تخلیق)

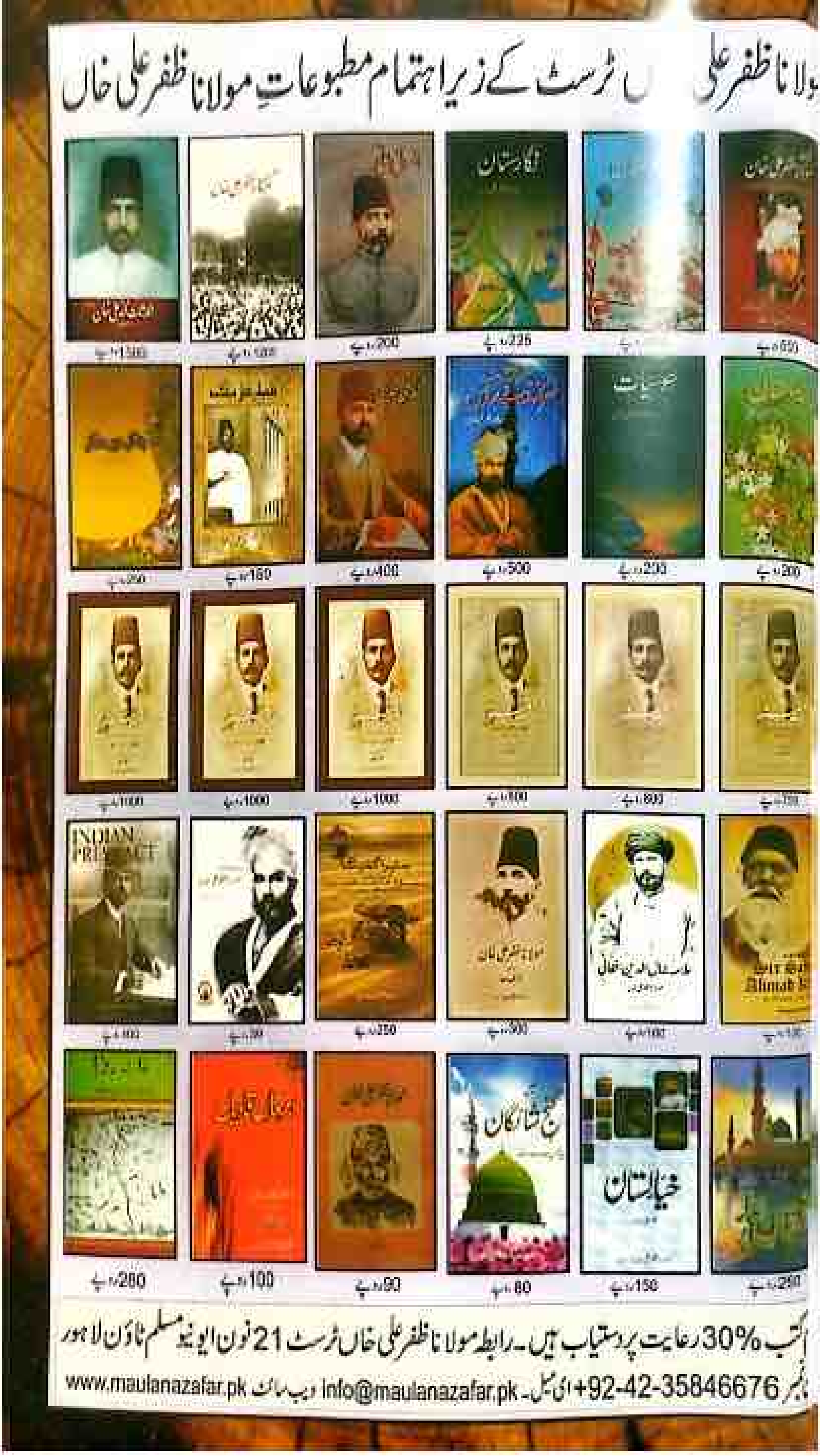

مولانا ظفر علی ... ٹرسٹ کے زیر اہتمام مطبوعاتِ مولانا ظفر علی خاں
خیالستان
... کتب 30% رعایت پر دستیاب ہیں۔ رابطہ مولانا ظفر علی خاں ٹرسٹ 21 نون ایونیو مسلم ٹاؤن لاہور
... نمبر +92-42-35846676 ای میل۔ info@maulanazafar.pk ویب سائٹ www.maulanazafar.pk

CamScanner

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE

September 2021